عقیل عبّاس جعفری

کروڑوں قسمتوں پر قابض سیاست پیشہ خاندان

سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے انتخابی وڈیروں کے افسانے،

جو آج بھی مسندِ اقتدار پر مسلّط ہیں

پاکستان کے سیاسی وڈیرے

مکمل اضافہ اور نظرثانی شدہ ایڈیشن

عقیل عبّاس جعفری

کروڑوں قسمتوں پر قابض سیاست پیشہ خاندان
سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے انتخابی وڈیروں کے افسانے،
جو آج بھی مسندِ اقتدار پر مسلّط ہیں

پاکستان کے سیاسی وڈیرے

مکمل اضافہ اور نظرثانی شدہ ایڈیشن

کہانی ایک مُلک کی

راج محل کے دروازے پر
آ کے رُکی اک کار
پہلے نکلا بھدّا، بے ڈھب، بودا،
میل کچیل کا تودا
عمر اُس کی کوئی اسّی بیاسی
حُقّہ تھامے اک میراسی،
پیچھے اُس کا نائب، تمباکو بردار،
باہر رینگے اُس کے بعد قطار، قطار
عنبر بار
نمبردار
ساتھ سب اُن کے دُم چھلّے
ایم ایل اے

کروڑوں قسمتوں پر قابض سیاست پیشہ خاندان

سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے انتخابی وڈیروں کے افسانے

جو آج بھی مسندِ اقتدار پر مسلط ہیں

پاکستان کے سیاسی وڈیرے

مکمل اضافہ اور نظرثانی شدہ ایڈیشن

عقیل عباس جعفری

جہانگیر بکس

لاہور ۔ راولپنڈی ۔ ملتان ۔ فیصل آباد ۔ حیدرآباد ۔ کراچی

کروڑوں قسمتوں پر قابض سیاست پیشہ خاندان

سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے انتخابی وڈیروں کے افسانے،

جو آج بھی مسندِ اقتدار پر مسلّط ہیں

پاکستان کے سیاسی وڈیرے

مکمل اضافہ اور نظر ثانی شدہ ایڈیشن

عقیل عبّاس جعفری

جہانگیر بُکس

• لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدر آباد • کراچی

ناشر : فواز نیاز

اشاعت : اپریل 2007ء

قیمت : -/600 روپے

آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
تقسیم کنندہ : سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار، فون: 042-7220879
سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔فون: 021-2765086
سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک۔فون: 051-5539609
سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781
سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار۔فون: 041-2627568
سیلز ڈپو حیدر آباد: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ۔ فون: 0300-3012131

جہانگیر بکس

Web Site:http://www.jbdpress.com E-mail:info@jbdpress.com

پاکستان کے سیاسی ہاریوں کے نام

نظمانہ:

تعبیر

اپنے ملک پہ اک مدت سے قائم ہے
گنتی کے ان سرداروں اور جاگیروں کے پانے والوں
کی نسلوں کا راج

آزادی سے بڑھ کر جن کو پیارا تھا
انگریزوں کا تاج!

سوچ رہا ہوں شاید اب کے،
قسمت دے دے مظلوموں کا ساتھ
اِستحصالی ٹولے سے ----- پائے قوم نجات!

صبح ہوئی تو گونج رہا تھا
بے ہنگم نعروں کا شور:

اپنے خواب کی ہم نے کی ----- من مانی تعبیر!
پھر ہے اپنے قبضے میں -----مِلّت کی تقدیر!!
پاکستان کا مطلب کیا -----موروثی جاگیر!!!

محسن بھوپالی

(۳۱ دسمبر ۱۹۹۳ء)

(کراچی میں "پاکستان کے سیاسی وڈیرے" کی تقریب پذیرائی میں پڑھا گیا)

فہرست

پہلا حصہ: شمال مغربی سرحدی صوبہ

دوسرا حصہ: صوبہ پنجاب

تیسرا حصّہ: صوبہ سندھ

چوتھا حصّہ: صوبہ بلوچستان

حرفِ آغاز

۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۳ء تک پاکستانی سیاست تجربات کی بھٹی بنی رہی، جمہوریت، مارشل لاء کنٹرولڈ جمہوریت، جماعتی انتخاب، غیر جماعتی انتخاب غرض کون سا نظام ہے جو ہم نے نہیں اپنایا۔ مگر کسی بھی سیاسی تجربے نے ہمیں صحیح اور صحت مند سیاسی قیادت مہیا نہیں کی۔ لوگ آتے رہے جاتے رہے لیکن قیادت میں تسلسل اور استحکام پیدا نہ ہو سکا اور نہ اس قیادت میں داخلی اور بیرونی چیلنجوں سے عہدہ برآء ہونے کی سکت پیدا ہو سکی۔ حالانکہ جب پاکستان بنا تھا تو اس ملک کے لوگوں میں جوش، جذبہ، ایثار و قربانی اور ان صفات کی کمی نہیں تھی جو ایک زندہ قوم کی زندگی کے لئے درکار ہوتی ہیں۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ اگرچہ صنعتی، تجارتی، تعلیمی اور معاشرتی ارتقاء زیادہ نہیں ہوا تھا اور پسماندگی بہت تھی۔ پھر بھی متوسط طبقے کے افراد سیاست پر حاوی تھے، انہوں نے نہ پنجاب کے یونینسٹ جاگیرداروں کا چراغ جلنے دیا اور نہ سندھ کے وڈیرے، سرحد کے خوانین اور بلوچستان کے سردار مسلمان عوام کو ملّی اور قومی تحریکوں سے الگ تھلگ رکھنے میں کامیاب ہوسکے۔ تحریکِ خلافت سے تحریک پاکستان تک ہر مرحلے پر جاگیردار طبقے کے مقابلے میں عوام اور متوسط طبقے کے نمائندہ افراد سیاست پر چھائے رہے۔ سرحد میں بڑے بڑے خان تھے لیکن ان کے قلعے سردار عبد الرب نشتر جیسے متوسط طبقے کے وکیل نے مسمار کر دیئے۔ بلوچستان میں ایک قاضی عیسیٰ تمام سرداروں پر بھاری تھا۔ پنجاب میں یونینسٹوں کی ٹوانہ حکومت کو عام مسلمانوں نے اپنی ٹھوکر سے گرایا۔ سندھ میں ایک نو مسلم عبد المجید سندھی، ایک عام تاجر عبداللہ ہارون اور ایک عام سیاسی کارکن ہاشم گزدر سندھ کے بڑے سے بڑے وڈیروں سے زیادہ طاقتور تھے۔ لیکن جب پاکستان بن گیا تو وہ سب زمیندار، جاگیردار، خان اور سردار جو عوام یا متوسط طبقے کے ہاتھوں پٹ گئے تھے، بساطِ سیاست پر نہ صرف نظر آنے لگے بلکہ دن بدن ان کا اقتدار اور اختیار بڑھتا چلا گیا اور بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

پاکستانی عوام کے لئے اُلجھن کی بات یہ ہے کہ انتخاب ہو یا انقلاب، جمہوری سیاست کا دور آئے یا مارشل لاء کے ڈنڈے کی حکمرانی، ہر صورت میں قیادت جاگیردار طبقے کی ہوتی ہے۔ کبھی یہ ری پبلکن کا نام اختیار کرتے ہیں، کبھی کنونشن لیگ کے پرچم تلے جمع ہوتے ہیں، کبھی بھٹو

کے اسلامی سوشلزم میں محفل سجاتے ہیں، کبھی ضیاء الحق کی مجلسِ شوریٰ میں نظر آتے ہیں اور کبھی نواز شریف کا نفسِ ناطقہ بن جاتے ہیں۔ غرض ہر عہد اور ہر اُلٹ پھیر میں انہی کا سکہ رواں ہوتا ہے۔ اور حد یہ ہے کہ حزبِ اقتدار ہی نہیں، حزبِ اختلاف بھی انہی سرداروں، وڈیروں، نوابوں اور خوانین پر مشتمل ہوتا ہے۔ عام یا متوسط طبقہ صرف جدوجہد کرنے یا قربانیاں دینے کے موقع پر آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ ورنہ اصل کھیل اسی فیوڈل طبقے کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ اس کھیل کے نتیجے میں اگر حکومت بدل جاتی ہے تو ایک آدھ شخصیت کو چھوڑ کر باقی سارا پرانا نظام پرانے افراد کے ساتھ دوبارہ حکمرانی کرتا نظر آتا ہے، اور ہر تبدیلی کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرانا نظام اور پرانے طبقے کی قیادت کمزور نہیں ہوئی ہے بلکہ زیادہ مستحکم ہوگئی ہے۔

پاکستانی فوج نے جب پہلی مرتبہ مارشل لاء نافذ کیا تو عوام النّاس نے اس کا خیر مقدم کیا تھا کیونکہ وہ اس مغالطے میں مبتلا تھے کہ مسلم لیگ اور پھر ری پبلکن پارٹی کے نام پر جاگیرداروں، وڈیروں اور سرداروں نے جو گندگی جمع کی ہے، مارشل لاء اسے صاف کر دے گا اور یہ لوگ حکومت اور قیادت کے مناصب سے ہٹا دیئے جائیں گے۔ مگر ہوا یہ کہ ایوب خاں نے نواب کالا باغ جیسے جاگیردار کو اپنا دستِ راست مقرر کر دیا، جس کی سرکردگی میں زمیندار اور جاگیردار طبقے نے ایک مرتبہ پھر خود کو مستحکم کر لیا۔ ایوب خان کے دور کا ایک کارنامہ بنیادی جمہورتیوں کا نظام تھا جس نے فیوڈل عناصر کو نئی توانائی فراہم کر دی۔

ایوب خان کے بعد بھٹو صاحب آئے۔ انہوں نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو برا بھلا کہہ کر اور اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کر کے اقتدار تو حاصل کر لیا مگر وہ خود جاگیردار کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے عملی طور پر یہ ہُوا کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے سوشلسٹ ساتھیوں سے کٹتے چلے گئے اور جاگیر دار طبقہ ایک مرتبہ پھر کاروبارِ مملکت پر حاوی آ گیا۔ ۷۷ء کے عام انتخابات کے بعد اسمبلی وجود میں آئی۔ اس میں صرف سندھ اور پنجاب کے ہی ۶۱ جاگیردار تھے، سرحد اور بلوچستان کے خوانین سردار اور جام صاحبان الگ تھے۔

بھٹو صاحب چاہتے تو ایک وار میں جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ کر سکتے تھے کیونکہ ۷۰ء کے انتخابات میں پنجاب میں پیپلز پارٹی نے جو کامیابی حاصل کی تھی، اس میں پنجاب کے جاگیرداروں کا کوئی کردار نہیں تھا اور پارٹی کی فتح کا سبب عوام یا متوسط طبقہ کی قیادت تھی۔ مگر پھر بھی بھٹو صاحب نے انہیں چھوڑ کر جاگیرداروں کو اپنے سینے سے لگا لیا اور مقتدر کیا۔

اور پھر تاریخ نے یہ بھی دیکھا کہ ۷۷ء کے انتخاب کے بعد جب قومی اتحاد کی تحریک چلی تو اس وقت جس ٹولے نے پیپلز پارٹی کو سب سے پہلے خیر باد کہا وہ انہیں جاگیرداروں کا ٹولہ تھا۔ میر بلخ مزاری، سردار نصر اللہ خان دریشک، سردار شوکت حیات اور سردار احمد علی وہ پہلے ارکانِ

اسمبلی تھے جنہوں نے قومی اتحاد سے اظہارِ یکجہتی کے طور پر (اسمبلیوں سے نہیں بلکہ) پارٹی سے استعفیٰ دینے کا اعلان کیا تھا۔

• بھٹو صاحب کو چھوڑیئے۔ ضیاء الحق کا تعلق تو کسی جاگیردار گھرانے سے نہیں تھا وہ تو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے مگر جب انہوں نے مجلس شوریٰ تشکیل دی تو اس میں ہر طرف جاگیردار اور زمیندار ہی نظر آتے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے سیاستدانوں کی جو کھیپ ایوانوں میں پہنچی وہ بھی جاگیرداروں، وڈیروں اور سجادہ نشینوں ہی کے نمائندے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں بے نظیر کی آمد کا امکان پیدا ہوا تو یہی جاگیردار ٹولہ راتوں رات پیپلز پارٹی میں شامل ہوگیا اور ایک مرتبہ پھر اسمبلیوں میں شب خون مارنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہی جاگیردار ٹولہ تھا جس نے بے نظیر کو زوال کا راستہ دکھایا۔ بے نظیر کو برطرف کرتے ہوئے غلام اسحٰق خان نے جو فردِ جرم سنائی تھی اس میں زیادہ تر جرائم اسی جاگیردار ٹولے نے سرانجام دیئے تھے۔

۱۹۹۰ء میں یہی طبقہ نواز شریف کو برسرِ اقتدار لایا اور پھر اسی طبقے کے باعث نواز شریف کا بستر بھی گول ہوگیا۔ پھر اپریل ۱۹۹۳ء میں نواز شریف کی برطرفی کے بعد قبضہ گروپ کی جو کابینہ تشکیل دی گئی اس میں بھی اول سے آخر تک (ماسوا چند وزراء کے) اسی طبقہ کے افراد چھائے ہوئے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا ترقی کر رہی ہے اور خود پاکستان میں بھی تجارت، صنعت اور تعلیم میں کایا پلٹی ہُوئی نظر آتی ہے، لیکن نئی زندگی، نئی معیشت اور نئی تہذیب کے ارتقاء سے نئی قیادت پیدا نہیں ہو رہی اور اُلٹا یہ ہو رہا ہے کہ یونینسٹوں کے عہد کے مُردے جی اُٹھے ہیں اور ہر طرف نواب، جاگیردار، زمیندار، مخدوم، سجادہ نشین، وڈیرے اور سردار طاقتور نظر آتے ہیں۔

بے نظیر اور نواز شریف کا اقتدار ختم ہوسکتا ہے مگر اس طبقے کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ طبقہ ماضی میں بھی حکمران تھا، آج بھی حکمران ہے اور آئندہ بھی حکمران رہے گا۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اگرچہ مسئلے کا حل تو پیش نہیں کرتی مگر اس کتاب کے مطالعہ سے آپ وطنِ عزیز میں جمہوریت کے قاتلوں کے چہروں سے واقف ضرور ہو سکتے ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو ہر دور میں بھیس بدل بدل کر عوام کا استحصال کرتے رہے ہیں اور اب پھر جمہوریت کے نام پر آپ کے سامنے اپنی ڈفلی بجا رہے ہیں۔

یہ کتاب تقریباً ایک سال کی شب و روز محنت کا نتیجہ ہے۔ ایسے معاشرے میں جہاں کتابیں ناپید ہوں، اخبارات کی فائلیں اخبارات کے دفاتر سے بھی دستیاب نہ ہوتی ہوں، لائبریریوں میں فوٹو اسٹیٹ کروانے کا نظام عنقا ہو۔ ایسے میں اس کتاب کو تحریر کرنے میں مجھے کیا کیا ہفت خواں نہ طے کرنے پڑے ہوں گے۔ آپ اس کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

مگر یہ دور اہلِ کرم سے خالی نہیں۔ مجھے اپنی اس کتاب کی تیاری میں جن احباب سے مدد ملی ان میں سے سرفہرست نام محترم احمد سلیم کا ہے۔ وہ اگرچہ رہتے لاہور میں ہیں مگر اس کتاب کی تحریر کے دوران وہ جس طرح میرے رابطے میں رہے اور جس جس طرح وہ مجھے مطلوبہ کتابیں، ریکارڈز اور نایاب تراشے فراہم کرتے رہے۔ اس کا شکریہ ادا نہ کرنا ناسپاسی ہوگی۔

میرے عزیز احباب الطاف احمد نے جس طرح شب و روز سندھی زبان کی نامور کتابوں سے ترجمہ کرنے میں میری مدد کی اور غلام مسیح الدین نے جس طرح میری خاطر اپنے دن رات ایک کیئے رکھے اور ہر طرح سے میری امداد پر کمر بستہ رہے، اس کا ادراک تو کیا جا سکتا ہے شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔

محترم خالد شمس الحسن، محترم خالد اسحٰق، محترم شیر باز خاں مزاری، محترم حسین شاہ راشدی اور سب سے بڑھ کر محترم غلام محمد میمن نے ، جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے، اپنے کتب خانوں کے دروازے مجھ پر ہمیشہ وا رکھے، اور جاگیرداروں بالخصوص سندھ کے وڈیروں کے بارے میں مجھے قیمتی مواد فراہم کرتے رہے۔ یہ مواد اگر مجھے میسر نہ آتا تو شاید یہ کتاب اتنی جلد مکمل نہ ہو پاتی۔

نذیر لغاری، ریاض پیکر، رانا غلام ارتضٰی خان، مدبر رضوی، نیر ندیم، محمد شبر جعفری، شکیل عادل زادہ اور ادریس غازی مجھے قیمتی مشوروں سے ہی نہیں، نادر اور نایاب کتابوں سے بھی نوازتے رہے۔ جن سے کتاب کو بہتر بنانے میں بڑی مدد ملی۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان سندھ کے محفوظ، عالم اور اسلام آباد میں مقیم میرے بھائیوں جیسے دوست اخلاق حسین زیدی کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے جنہوں نے اسمبلیوں اور سینٹ کا قیمتی ریکارڈ مجھے فراہم کیا۔

روزنامہ جنگ کراچی کے ریکارڈ کیپر خالد نے مجھے ہمیشہ مطلوبہ اخبارات بڑی سرعت اور تندہی سے فراہم کیئے، اور روزنامہ جنگ کراچی کے ہی جناب محمد سلیمان ہمیشہ مجھے اپنی مشفقانہ سرپرستی سے نوازتے رہے، اس نے بھی میرے کام کو بڑا سہل بنا دیا۔

ان کے علاوہ کراچی کی جن لائبریریوں سے میں نے بطور خاص استفادہ کیا ان میں بیت الحکمت، اسٹیٹ بینک آف پاکستان، پاکستان ٹیلی ویژن، لیاقت نیشنل لائبریری، قائد اعظم اکیڈمی، آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ، سندھ اسمبلی سیکرٹریٹ، نیپا اور روزنامہ جنگ کی لائبریری کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ان تمام لائبریوں کے اسٹاف کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے کہ میں مسلسل انہیں زحمتیں دیتا رہا اور وہ مجھ پر مطلوبہ کتابوں کی رحمتیں برساتے رہے۔

آخری میں اپنی شریک حیات اُم ارباب اور اپنی بچیوں ، خوشبو، روشنی اور چاندنی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی تکمیل کے پورے عرصہ تک اپنی ہر خوشی میری کتاب کی

خاطر پس پشت ڈالے رکھی، اپنی ہر خواہش پر میرے سکون کو مقدم رکھا اور مجھے مسلسل ایسا ماحول فراہم کئے رکھا، جس کے بغیر اس کتاب کی تکمیل ممکن ہی نہیں تھی۔

احمد فراز کا شعر ہے:۔

شکوہ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصّے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

میں نے اپنے حصے کی شمع روشن کر دی ہے راستہ تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔

آپ کا
عقیل عباس جعفری
۳۰ ر ستمبر ۱۹۹۳ء

حکمرانی

کیسے جمہور کیا عوام اے دوست
ملک و ملت کی یہ کہانی ہے
چند افراد کی قیادت میں
چند کنبوں کی حکمرانی ہے

رئیسؔ امروہوی

حرفِ مکرر

"پاکستان کے سیاسی وڈیرے" کا مکمل نظرِ ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کے پہلے دو ایڈیشنز بالترتیب 1993ء اور 1994ء میں شائع ہوئے تھے۔ بعد میں اس دوسرے ایڈیشن کے کئی مزید ری پرنٹ شائع ہوئے۔ تاہم پچھلے کئی برس سے اس کتاب کا کوئی نیا ایڈیشن یا ری پرنٹ شائع نہیں ہوا تھا۔ سبب صرف اتنا سا تھا کہ 1994ء کے بعد ملک میں دو عام انتخابات منعقد ہو چکے تھے اور پانچ وزرائے اعظم تبدیل ہو چکے تھے۔ ان سیاسی تبدیلیوں کے باعث کتاب میں اضافہ ناگزیر ہو چکا تھا اور مجھے نامناسب لگتا تھا کہ اپنے قارئین کو ان اضافوں اور تبدیلیوں سے محروم رکھوں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے فیصلہ کیا کہ نا صرف "پاکستان کے سیاسی وڈیرے" کے پرانے ایڈیشنوں میں شامل سیاسی خاندانوں کے احوال کو اَپ ڈیٹ کیا جائے، بلکہ اس دوران جو مزید خاندان سیاسی اُفق پر نمایاں ہوئے ہیں، ان کا احوال بھی کتاب میں شامل کر لیا جائے۔

شروع شروع میں یہ کام آسان محسوس ہوا مگر جب کام کا سلسلہ شروع ہوا تو پھیلتا ہی چلا گیا اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ڈیڑھ برس اس کام کی نذر ہوگئے۔ کام کے پھیلاؤ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ پچھلے دس بارہ برس میں نہ صرف یہ کہ سیاست کے موضوع پر لاتعداد کتابیں شائع ہوئی ہیں، بلکہ انٹرنیٹ نے حوالہ جاتی مواد سے رسائی قدرے آسان کر دی ہے۔

"پاکستان کے سیاسی وڈیرے" کے اوّلین دو ایڈیشنوں میں پاکستان کے ۸۱ سیاسی خانوادوں کا احوال شامل کیا گیا تھا موجودہ ایڈیشن میں ان خانوادوں کی تعداد بڑھ کر ۱۰۲ ہوگئی ہے۔ خانوادوں کی ترتیب حسب سابق حروفِ تہجی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ تاکہ اسے تلاش کرنا بھی آسان ہو اور کسی کو تقدیم و تاخیر کی شکایت بھی نہ ہو۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے ان احباب کا ذکر نہ کروں جنھوں نے اس نئے ایڈیشن کی

ترتیب و تدوین میں میرا ہاتھ بٹایا۔ اس سلسلہ میں جناب راغب تحسین، جناب فہیم شناس کاظمی، ڈاکٹر منیر احمد سلیچ اور جناب زاہد کاظمی کا بطورِ خاص شکرگزار ہوں جنہوں نے ملک بھر میں پھیلے ہوئے سیاسی خانوادوں کے حوالے سے قیمتی لوازمہ فراہم کیا۔ ایک شکریہ جہانگیر بک ڈپو کے جناب فواز نیاز کا بھی واجب ہے، جن کی مستقل دلچسپی اور توجہ کے باعث یہ کتاب اس قدر سلیقے اور اہتمام کے ساتھ آپ تک پہنچ رہی ہے۔

اور ہاں آخر میں ایک شکریہ اُن مرتبین اور ناشرین کا بھی جنہوں نے ''پاکستان کے سیاسی وڈیرے'' کے پورے پورے ابواب نقل کر کے نہ صرف اپنی کتابیں ''تیار'' کیں بلکہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ انہیں اپنے نام سے پیش بھی کر دیا۔ ان کی خدمت میں، میرانیس اعلیٰ اللہ مقامہ، کا یہ شعر پیش کرنا چاہوں گا:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

آپ کا
عقیل عباس جعفری
۱۰/اگست ۲۰۰۶ء

مصنف سے براہ راست رابطے کے لیے:

خط کتابت کا پتا — ۱/۹۴، ۲۶ ویں اسٹریٹ،
فیز ٦، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی،
کراچی ۷۵۵۰۰

فون — ۰۳۰۰-۹۲۴۲۰۹۸

ای میل — aqeelabbasjafri@hotmail.com

پہلا حصّہ

شمال مغربی سرحدی صوبہ

ارباب

انگریزوں کی آمد سے پہلے صوبہ سرحد کے ہر قبیلے کا ایک خانوادہ "خان خیل" کہلاتا تھا۔ یہی خانوادہ حکمران تصور کیا جاتا اور سیاسی اور ملکی امور کی انجام دہی کرتا تھا۔ تہکال بالا اور نواحی علاقے خلیل میں مثھاخیل لوگ سربراہ قوم سمجھے جاتے تھے اور انہیں ارباب کہا جاتا تھا۔ ارباب خاندان کا شمار صوبہ سرحد کے چند سربر آوردہ خاندانوں میں ہوتا ہے۔ (۱)

یہ ایک بہت بڑا خاندان ہے اور ارباب اقتدار کے لئے اس کی خدمات کا سلسلہ عہد شاہجہانی تک پھیلا ہوا ہے۔ جس نے اس خاندان کے جد امجد آسل خان کو ارباب کا لقب اور تہکال کی جاگیر عطا کی تھی، جس کی آمدنی اس زمانے کے ساٹھ ہزار روپے بیان کی جاتی ہے خیبر اور اس کے گرد و نواح کی اقوام کا انتظام اس کے سپرد تھا اس کا بیٹا ارباب عبدالرحمٰن نادر شاہ کے عہد میں خیبر کا خود مختار حاکم تھا اور اس کے ذمے صرف یہی خدمت تھی کہ جب شہنشاہ براہ درہ، ہندوستان کو جائیں یا ہندوستان سے آئیں تو یہ ہم رکاب رہے۔

ارباب عبدالرحمٰن کا جانشین اس کا بیٹا ارباب نور محمد خان ہوا۔ نور محمد خان کی وفات پر جاگیر بحصص مساوی اس کے بیٹوں ارباب گل خان اور ارباب دوست محمد اور بھائیوں ارباب محمد سعید اور ارباب عبدالقادر میں تقسیم ہو گئی۔ (۲)

ارباب دوست محمد کا پوتا ارباب فتح خان تھا۔ یہ وائسریگل درباری تھا۔ اسے بہ صلہ حسن خدمات جو اس نے بہت موقعوں پر کی تھیں دو ہزار روپے کی جاگیر اور ارباب خطاب ملا۔ مشہور کتاب "روسائے با اختیار و نامی خاندان" کا مصنف کرنل چارلس میسی اس کے بارے میں لکھتا ہے۔

"بہت سے سرکاری افسر، جو اس سے (ارباب فتح خان سے) واقفیت رکھتے ہیں، اس سبب سے اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کے خیر خواہ ہیں کہ یہ ہمیشہ وفاداری اور راست بازی کے سبب مشہور رہا ہے۔ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ جو کام اس سے کرنے کو کہا جائے خواہ وہ کتنا ہی

مشکل کام ہو اسے مستعدی سے کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔" (۳)

ارباب فتح خان کے بیٹے کا نام ارباب دوست محمد خان تھا۔ یہ صوبہ سرحد کے قیام کے وقت چیف آف تہکال تھا۔ اس کا شمار صاجزادہ سر عبدالقیوم خان کے معتمد رفقا میں ہوتا تھا۔ تحریک خلافت کے دنوں میں اسی کی کوششوں کے باعث مولانا محمد علی جوہر کا صوبہ سرحد آنا ممکن ہوا تھا۔ (۴)

ارباب دوست محمد خان کے بعد ان کی وراثت ارباب شیر علی خان نے سنبھالی۔ یہ کٹر مسلم لیگی تھے۔ ۱۹۳۶ء کے صوبائی انتخابات میں ارباب شیر علی خان نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر حصہ لیا مگروہ خدائی خدمت گار تحریک کے ارباب عبدالغفور خان سے شکست کھا گئے۔ (۵) ارباب شیر علی خان نے بعد ازاں ۱۹۴۶ء کے صوبائی انتخاب میں بھی حصہ لیا مگر اس انتخاب میں وہ کانگریس کے امین جان خان سے فقط ۱۸۱ ووٹوں سے ہار گئے (۶)

ارباب شیر علی خان نے ۱۹۴۷ء کے ریفرنڈم میں صوبہ سرحد کو پاکستان میں شامل کروانے کے لئے بڑا فعال کردار ادا کیا۔ ارباب شیر علی خان قیام پاکستان کے بعد سرحد اسمبلی کے رکن بھی رہے مگر بعدازاں عبدالقیوم خان کے معاندانہ رویے کی وجہ سے سیاست سے ریٹائر ہو گئے (۷)

ارباب شیر علی خان کے دو بیٹوں نے پاکستان کی سیاست میں نام کمایا۔ بڑے بیٹے ارباب نیاز محمد خاں نے نسبتاً کم اور چھوٹے بیٹے ارباب جہانگیر خاں نے نسبتاً زیادہ۔

ارباب نیاز محمد خان ۲۰ر فروری ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اس مشہور مقدمے میں ملوث رہے جو راولپنڈی سازش کیس کے نام سے معروف ہوا۔ اس مقدمے کے سلسلہ میں وہ میجر جنرل اکبر خاں، سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کے ہمراہ پابند سلاسل بھی رہے۔

رہائی کے بعد وہ طویل عرصہ تک سیاسی میدان سے دور رہے اور پہلی مرتبہ ۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لے کر پشاور میونسپل کارپوریشن کے میئر منتخب ہوئے (۸) وہ اسی عہدے پر فائز تھے کہ ۹ر مارچ ۱۹۸۱ء کو انہیں ثقافت، سیاحت اور کھیلوں کا وفاقی وزیر بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ فروری ۱۹۸۵ء تک فائز رہے (۹) ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے این اے ۲ پشاور ۲ کے حلقے سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے (۱۰)۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۱۱)

ارباب نیاز محمد خان کے چھوٹے بھائی ارباب محمد جہانگیر خاں (پ ۱۹۳۷ء) کی سیاست کا آغاز ۱۹۷۰ء میں ہوا۔ جب انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان گروپ) کے ٹکٹ پر سرحد اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں ارباب سکندر خاں خلیل کے

صوبہ سرحد کے گورنر بننے کے بعد ارباب جہانگیر ان کے سیاسی مشیر مقرر ہوئے (۱۲)
۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں ارباب جہانگیر خان نے قلابازی کھائی اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ارباب سیف الرحمٰن کو شکست دے کر نہ صرف قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے بلکہ ذوالفقار علی بھٹو کی آخری کابینہ کے رکن بننے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ اس کابینہ میں انہیں ہاؤسنگ اور تعمیرات کا قلمدان تفویض کیا گیا تھا۔ (۱۳)

بھٹو کے زوال کے بعد ارباب جہانگیر خاں ایک مرتبہ پھر بھٹو مخالف کیمپ سے جا ملے اور ۱۹۷۶ء میں گورنر سرحد جنرل فضل حق کی کابینہ میں سینئر وزیر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پی ایف ۳ پشاور ۳ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور نہ صرف صوبائی اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی بلکہ صوبہ کے وزیر اعلیٰ بننے میں بھی کامیاب ہو گئے اس عہدے پر وہ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء تک فائز رہے۔ (۱۴)

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں ارباب جہانگیر خاں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور اپنے عزیز ارباب ہمایوں خاں کو شکست دے کر اپنی نشست برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ (۱۵) ۱۹۹۰ء میں وہ عوامی نیشنل پارٹی میں شامل ہو گئے اور اس پارٹی کے ٹکٹ پر این اے ۲، پشاور ۲ سے، جہاں ۱۹۸۵ء میں ان کے بھائی ارباب نیاز محمد خان نے شکست کھائی تھی، سابق صوبائی وزیر اعلیٰ آفتاب شیر پاؤ کو شکست دے کر قومی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جبکہ ان کی اپنی صوبائی نشست (پی ایف ۳ پشاور ۳) سے ان کے ایک قریبی عزیز ارباب سیف الرحمٰن خان صوبائی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ (۱۶) ۱۹۹۳ء میں نواز شریف حکومت کے خاتمے کے بعد ارباب جہانگیر نے نگراں کابینہ میں شمولیت اختیار کی۔ تاہم ان کے اس اقدام کے باعث انہیں اے این پی سے فارغ کر دیا گیا۔ (۱۷) مگر ہر مرتبہ اقتدار کا مزا لوٹنے والے ارباب جہانگیر کو اس تادیبی کارروائی سے کوئی فرق نہیں پڑا اور انہوں نے ۱۹۹۳ء کے انتخاب سے پہلے پہلے ایک مرتبہ پھر پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ان کے اس اقدام پر معروف جریدے ہیرالڈ نے اپنے الیکشن اسپیشل ۱۹۹۳ء کے شمارے میں ارباب جہانگیر کو گولڈن لوٹا ایوارڈ فار دی کنگ آف لوٹاز،، سے نوازا۔ (۱۸) یہ بتانے کی غالباً ضرورت نہیں کہ ہمیشہ کی طرح ارباب جہانگیر ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں بھی کامیاب ہو گئے۔ ان کا حلقہ انتخاب تھا این اے ۲ پشاور ۲ اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ انتخاب انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر لڑا تھا (۱۹) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد ارباب جہانگیر وزیر مملکت برائے نارکوٹکس کے منصب پر فائز ہوئے تاہم ۱۹۹۷ء کے انتخابات سے قبل وہ دوبارہ اے این پی میں شامل ہو گئے اور اپنی نشست پر ایک اور مرتبہ کامیاب ہونے کے بعد قومی اسمبلی کی مجلس قائمہ برائے ماحولیات،

بلدیات ودہی ترقی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے رکن بنائے گئے (۲۰) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں ارباب جہانگیر گریجویشن کی شرط کی وجہ سے حصّہ نہ لے سکے ان کی نشست پر ان کے صاجزادے ارباب عالمگیر خان نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا مگر وہ متحدہ مجلس عمل کے مولانا رحمت اللہ خلیل سے تقریباً ۲۲ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۲۱)

صوبہ سرحد کی سیاست میں ارباب خاندان کے ایک اور رکن ارباب سکندر خاں خلیل کا بھی بڑا اہم کردار رہا ہے۔ وہ ارباب محمد جہانگیر خاں کے مورث اعلیٰ ارباب دوست محمد خاں کے عم زاد ارباب بہرام خاں کی اولاد میں سے ہیں۔ جن کی ساری عمر انگریزوں سے تصادم میں بسر ہوئی۔ (۲۲)

ارباب سکندر خاں خلیل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور پھر اپنی آخری سانس تک وہ اس پارٹی سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۰ء میں وہ صوبہ سرحد کی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بھٹو کے دور میں وہ ۲۶/اپریل ۱۹۷۲ء کو صوبہ سرحد کے گورنر مقرر ہوئے۔ وہ تقریباً ایک سال اس عہدے پر فائز رہے۔ (۲۳) ۷/مارچ ۱۹۸۲ء کو انہیں ان کے گاؤں میں گولی مارکر ہلاک کردیا گیا۔ (۲۴)

ارباب سکندر خاں خلیل کے بھائی ارباب ہمایوں خاں نے ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا تھا مگر وہ کامیابی حاصل نہ کرسکے تھے۔ ان کے ایک اور بھائی ارباب سیف الرحمٰن ۱۹۷۰ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۸ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر ناکام رہے۔ (۲۵) البتہ ۱۹۹۰ء میں وہ ارباب جہانگیر کی نشست پر کامیاب ہوکر صوبائی اسمبلی تک ضرور پہنچ گئے۔ (۲۶)

ارباب سیف الرحمٰن ۱۹۷۰ء میں بھی سرحد اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بنے تھے اور ۱۹۹۰ء میں اسی عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے ڈپٹی اسپیکر شپ سے اس وقت استعفیٰ دے دیا تھا جب بلوچستان میں نیپ کی حکومت توڑنے کے خلاف صوبہ سرحد میں نیپ، جمعیت مخلوط حکومت مستعفی ہوگئی تھی۔ ارباب سیف الرحمٰن نے اپنی یہی روایت ۱۹۹۳ء میں بھی دہرائی اور مرکز میں نواز شریف حکومت کی برطرفی کے بعد جب اے این پی نے بطور احتجاج سرحد حکومت سے علیحدگی اختیار کی تو انہوں نے بھی اسمبلی کی ڈپٹی اسپیکر شپ سے استعفیٰ دے دیا (۲۷) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں ارباب سیف الرحمٰن نے پی ایف ۳ پشاور ۳ سے انتخاب لڑا اور کامیاب رہے (۲۸)۔

ارباب سیف الرحمٰن ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں ایک مرتبہ پھر سرحد اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے اور صوبائی اسمبلی میں ڈپٹی اسپیکر کے منصب پر فائز ہوئے (۲۹)

لنڈی کے ارباب خاندان کے ایک فرد ارباب نور محمد خان ہیں۔ وہ ۱۲ر فروری ۱۹۲۴ء کو پشاور میں پیدا ہوئے ۱۹۴۴ء میں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور یوں ان کے سیاسی کیریئر کا آغاز ہوا۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۷۷ء میں وہ سرحد اسمبلی اور ۱۹۵۶ میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ دریں اثناء ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک وہ سرحد اسمبلی کے چیف پارلیمانی سیکرٹری ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک مغربی پاکستان کے صوبائی وزیر اور ۱۹۷۰ء میں صوبائی مسلم لیگ کے صدر رہے ستمبر ۱۹۸۶ء میں وہ پہلی مرتب اور مارچ ۱۹۸۸ء میں دوسری مرتبہ سینٹ کے رکن منتخب ہوئے (۳۰) ایوب خان کے عہد حکومت میں وہ کچھ عرصہ ایبڈو کی پابندیوں کا شکار بھی رہے (۳۱) ارباب نور محمد خان کے صاحبزادے ارباب محمد طاہر خاں ۱۹۸۳ء میں ڈسٹرکٹ کونسل پشاور کے چیئر مین منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں وہ سرحد اسمبلی کے رکن بنے۔ ۱۹۸۸ء میں وہ کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ (۳۲) ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں وہ عوامی نیشنل پارٹی کا ٹکٹ حاصل کر کے این اے ۳ پشاور ونوشہرہ سے قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوئے۔ (۳۳) ۱۹۹۳ء میں بھی انہوں نے اسی حلقہ سے کامیابی حاصل کی (۳۴)

ارباب خاندان کے ارباب عبدالغفور خان نے بھی تحریک پاکستان میں بڑا نمایاں اور فعال کردار ادا کیا۔ یہ ارباب دوست محمد خان کے نواسے تھے۔ (۳۵) انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز خلافت تحریک سے کیا۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے خان عبدالغفار خان کے ساتھ افغان جرگہ کی طرح ڈالی پھر خدائی خدمت گار تحریک میں خان عبدالغفار خان کے دست راست بن گئے۔ (۳۶) ۱۹۳۶ء کے صوبائی انتخابات میں انہوں نے اپنے ماموں ارباب شیر علی خان، کو شکست دی (جس کا احوال ہم اوپر بیان کر چکے ہیں)۔

۱۹۴۲ء میں انہوں نے خدائی خدمت تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی ان دنوں انہوں نے پشاور سے عصمت فروشی کے اڈے ختم کروائے۔ (۳۷) جناب یوسف خٹک نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ

''میں سمجھتا ہوں کہ سرخپوشوں کا زوال اس وقت شروع ہو گیا جب ارباب عبدالغفور خان مسلم لیگ میں آئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے لیے بڑا ہی زبردست کردار ادا کیا۔ انتھک آدمی تھے۔ دن رات کام کرتے۔ دفتر میں ہی بیٹھتے تھے، وہیں سوتے، وہی ایک طرح سے ان کا گھر تھا...... وہ ایک سیاسی دماغ تھے۔ ہر لمحہ وہ اسی سوچ میں رہتے تھے۔ سرحد میں پاکستان کے لیے ان کی کنٹری بیوشن سب سے زیادہ تھی۔ میں یہ کہتا کہ ارباب عبدالغفور نہ ہوتے تو پاکستان نہ بنتا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کو ہم پر فضل فرمانا تھا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ارباب عبدالغفور خان کی وہاں قیادت نہ ہوتی تو صوبہ سرحد میں مسلم لیگ اتنی فعال نہ ہوتی''۔ (۳۸)

ارباب عبدالغفور خان ایک مخلص سیاسی رہنما تھے مگر پاکستان کی بدقسمتی کہ اہل پاکستان نے ان کی قدر نہ کی اور آزادی کے بعد خان عبدالقیوم خان نے محض ذاتی اختلافات کی بنا پر انہیں ۸ برس تک پابند سلاسل رکھا۔ کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ (۳۹)

سرحد ہی میں ایک اور خاندان خالقہ کا ارباب خاندان ہے۔ اس خاندان کے ارباب ایوب جان، جو سابق ڈی آئی جی پولیس ارباب عطاء اللہ کے صاحبزادے ہیں ۱۹۸۵ء میں سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور ارباب جہانگیر کی کابینہ میں بھی شامل کیے گئے تھے (۴۰) ۱۹۸۸ء کے انتخابات سے قبل انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء تینوں انتخابات میں کامیابی حاصل کی (۴۱) انہی کے ایک عزیز ارباب سعد اللہ خان ہیں جنہوں نے ۱۹۹۰ اور ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لیا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکے تھے (۴۲)

حوالہ جات

۱۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص۵۴۹

۲۔ چارلس میسی۔ روسائے بااختیار و نامی خاندان پنجاب (ترجمہ لالہ بھگوان داس) لاہور ص۱۸۲، ۱۸۴

۳۔ ایضاً ص۱۸۷

۴۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص۵۴۹

۵۔ خان عبدالغفار خاں۔ میری زندگی اور جدوجہد۔ پشاور۔ ص۵۳۰

۶۔ عبدالواحد قریشی۔ تاریخی فیصلہ۔ اسلام آباد ص۱۳۰

۷۔ ہیرالڈ کراچی۔ نومبر ۱۹۸۸ء۔ ص۱۲۴

۸۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص۱۴۷

۹۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص۴۹۵

۱۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸/مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص۲۴۳۶

۱۱۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات اعیان پاکستان۔ لاہور۔ ص۱۰۱

۱۲۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص۷۵۹

۱۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص۱۶۳، ۴۸۷

۱۴۔ رحیم اللہ یوسف زئی۔ دی ایورگرین ارباب۔ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۴/۔۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ ص۵

۱۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔۳ر دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۳۷۰۸
۱۶۔ ایضاً۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۱۹۰۔ ۹۳۶۰
۱۷۔ طارق سعید۔ اور یہ بھی ارباب ہیں۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۱۴ر تا ۲۰ر مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۸، ۲۹
۱۸۔ ادارہ۔ دی ہیرالڈ لوٹا ایوارڈز۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن سپیشل ۹۳ء۔ ص ۶۱
۱۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۲ء۔ ص ۱۲۴۶
۲۰۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور ص ۲۲
۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۸۸۶
۲۲۔ چارلس مسیی۔ روسائے بااختیار ونامی خاندان پنجاب (ترجمہ بھگوان داس) لاہور۔ ص ۱۸۲
۲۳۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۶۸۹، ۶۹۰
۲۴۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات مشاہیر پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۹۸
۲۵۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء ص ۸۶
۲۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۶۰
۲۷۔ طارق سعید۔ اور یہ بھی ارباب ہیں۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۱۴ر تا ۲۰ر مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۸، ۲۹
۲۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۰۷
۲۹۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۲۰۱
۳۰۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائریکٹری آف ممبرز ۹۴۔۱۹۹۱ء۔ اسلام آباد۔ ص ۳۸، ۳۹
۳۱۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۷۵
۳۲۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۸۶
۳۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۱۹۰
۳۴۔ ایضاً۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۴۶
۳۵۔ منیر احمد منیر۔ سیاسی اتار چڑھاؤ۔ لاہور۔ ص ۲۲۷
۳۶۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۶۶۹، ۶۷۰
۳۷۔ ایضاً۔ ص ۶۷۰
۳۸۔ منیر احمد منیر۔ سیاسی اتار چڑھاؤ۔ لاہور۔ ۲۲۶، ۲۲۷

۳۹۔ ایضاً۔ ۲۲۷، ۲۲۸

۴۰۔ رشید یوسف زئی۔ سرحد کے ۳۰ خاندان جو ۵۰ سال سے سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ روزنامہ خبریں لاہور۔ ۲۴/اگست ۱۹۹۳ء

۴۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۸۸ء جلداوّل ص ۲۵۱، دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱/نومبر ۱۹۹۰۔ ص ۹۳۶۱۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۵۰۸

۴۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱/نومبر ۱۹۹۰۔ ص ۹۳۶۱، ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳۔ ص ۱۵۰۹

بلور

پشاور کا بلور خاندان، گزشتہ کئی دہائیوں سے سیاست کے میدان میں نمایاں ہے۔ اس خاندان کا تعلق، باجوڑ کے ماموند قبیلے سے ہے۔ پاکستان بننے سے قبل اس خاندان کے جو افراد سیاست کے حوالے سے معروف ہوئے ان میں پیر بخش خان ایڈووکیٹ، تاج محمد خان اور عبدالقیوم خان کے نام سرفہرست ہیں۔ اسی خاندان کے گل محمد خان، ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے جب کہ بلور دین خان، باچا خان کی خدائی خدمت گار تحریک کے رکن تھے۔

انہی بلور دین خان کے بیٹے حاجی غلام احمد بلور ہیں۔ غلام احمد بلور ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں جب محترمہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کے مقابلے میں صدارتی انتخاب لڑا تو غلام احمد بلور نے ان کی انتخابی مہم میں حصہ لیا۔ ۱۹۶۹ء میں وہ نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) میں شامل ہو گئے اور ۱۹۷۲ء میں نیپ، پشاور کے صدر بنے۔ ۱۹۷۴ء میں انہیں پارٹی کا صوبائی صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں وہ پہلی مرتبہ سینٹ آف پاکستان کے رکن بنے تاہم جلد ہی انہیں گرفتار کرلیا گیا اور وہ حیدر آباد ٹربیونل کے سلسلے میں کئی سال تک اسیر رہے۔ نیپ پر پابندی عائد ہونے کے بعد وہ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہو گئے اور اس کے صوبائی صدر اور مرکزی سیکرٹری جنرل بھی رہے۔ ضیا الحق کے مارشل لا کے خلاف تحریک بحالی جمہوریت میں انہوں نے فعال کردار ادا کیا اور تین مرتبہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں (۱)۔

حاجی غلام احمد بلور نے ۱۹۸۸ء میں پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر آفتاب احمد شیر پاؤ سے شکست کھا گئے۔ آفتاب احمد شیر پاؤ، صوبائی اسمبلی کی نشست پر بھی کامیاب ہوئے تھے۔ انتخابات کے بعد انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست خالی کردی۔ سرحد اسمبلی میں پیپلز پارٹی اور عوامی نیشنل پارٹی میں اتحاد ہونے کے باعث جب حاجی غلام احمد بلور نے این اے

1 پشاور سے ضمنی انتخاب میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو پیپلز پارٹی نے بھی ان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ یوں حاجی غلام احمد بلور، قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔(۲)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات سے پہلے پاکستان پیپلز پارٹی اور عوامی نیشنل پارٹی کے راستے الگ الگ ہو گئے اور عوامی نیشنل پارٹی اسلامی جمہوری اتحاد کی حلیف بن گئی۔ ان انتخابات میں این اے پشاور 1 سے محترمہ بے نظیر بھٹو نے خود انتخاب لڑنے کا اعلان کیا تو یہ نشست پورے ملک کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ تاہم اس مرتبہ پاکستان پیپلز پارٹی اس نشست پر اپنی گرفت مضبوط نہ رکھ سکی اور حاجی غلام احمد بلور نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو تقریباً ۱۲ ہزار ووٹوں سے شکست دے دی (۳)۔ انتخابات میں کامیابی کے بعد وہ نواز شریف کی کابینہ میں ریلوے کے وزیر بھی رہے (۴)۔

۱۹۹۳ء میں غلام احمد بلور، اس نشست پر پاکستان پیپلز پارٹی کے سید ظفر علی شاہ سے شکست کھا گئے (۵) ۱۹۹۷ء میں ایک امیدوار کی وفات کی وجہ سے اس حلقے میں انتخابات ملتوی ہو گئے تھے بعد میں منعقد ہونے والے ضمنی انتخاب میں غلام احمد بلور نے نامور شاعر فارغ بخاری کے صاحبزادے قمر عباس کو شکست دی تاہم انتخابی مہم کے دوران ایک ناخوشگوار واقعے میں ان کے جواں سال اکلوتے فرزند شبیر احمد بلور شہید ہو گئے (۶)۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں غلام احمد بلور، گریجویشن کی شرط کی وجہ سے حصہ نہ لے سکے۔(۷)

حاجی غلام احمد بلور کے دو بھائی بھی سیاست کے میدان میں موجود ہیں۔ ان میں الیاس احمد بلور ایک طویل عرصہ سے صنعت و تجارت کے شعبے سے وابستہ ہیں وہ راولپنڈی چیمبر آف کامرس اور پشاور چیمبر آف کامرس کے صدر رہ چکے ہیں۔ وہ مارچ ۱۹۹۴ء میں پہلی مرتبہ سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے تھے (۸)۔ ۲۰۰۳ء میں وہ دوسری مرتبہ سینیٹر بنے (۹) اور ۶ / مارچ ۲۰۰۶ء کو تیسری مرتبہ سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے (۱۰)

حاجی غلام احمد بلور اور الیاس احمد بلور کے تیسرے بھائی بشیر احمد بلور ہیں۔ وہ یکم اگست ۱۹۴۳ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کے پلیٹ فارم سے سیاست کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے اپنے بھائی غلام احمد بلور کے ہمراہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ وہ صوبہ سرحد کے حلقہ پی ایف 1 پشاور سے انتخاب لڑتے رہے ہیں اور ۱۹۹۰ اور اس کے بعد منعقد ہونے والے ہر انتخاب میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ تین مرتبہ وزارت میں بھی رہے۔ ۱۹۹۰ء میں ان کے پاس مواصلات و تعمیرات کے ۱۹۹۳ء میں فزیکل پلاننگ اور ۱۹۹۷ء میں آب پاشی، پبلک ہیلتھ، قانون اور پارلیمانی امور کے قلم دان رہے۔(۱۱)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، ۲۰۰۲ء کے عام انتخاب میں غلام احمد بلور گریجویشن کی

شرط کی وجہ سے حصہ نہیں لے سکے تھے اس لیے اس مرتبہ اے این پی نے ان کی نشست پر ان کے بھتیجے اور بشیر احمد بلور کے صاحبزادے عثمان بشیر بلور کو ٹکٹ دیا جو انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی لہر کی وجہ سے اپنے حریف امیدوار شبیر احمد سے تقریباً چودہ ہزار ووٹ سے شکست کھا گئے (۱۲)

بشیر احمد بلور کے ایک اور صاحبزادے ہارون بلور ہیں جو ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۵ء تک پشاور کے ٹاون ناظم رہ چکے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں انہوں نے ضلعی ناظم کا انتخاب لڑا مگر مولانا فضل الرحمٰن کے داماد حاجی غلام علی کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۱۳)

بلور خاندان' بہت سے دوسرے سیاسی خانوادوں سے رشتوں میں بھی بندھا ہوا ہے۔ مثلاً غلام احمد بلور کے بھائی بشیر احمد بلور' گل محمد خان کے داماد ہیں۔ گل محمد خان کی ہمشیرہ کی شادی محمد اشرف خان سے ہوئی ہے جن کے صاحبزادے حاجی محمد جاوید' میر افضل کی کابینہ میں وزیر رہے ہیں۔ (۱۴)

خود گل محمد خان' پشاور کے ممتاز قانون دان پیر بخش خان کے داماد ہیں جنہوں نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں خان عبدالقیوم خان اور سردار عبدالرب نشتر جیسی شخصیات کو شکست دی تھی۔

پیر بخش خان کے ایک صاحبزادے طارق خان کی شادی غلام احمد بلور کی ہمشیرہ سے اور دوسرے صاحبزادے کی شادی جنرل حبیب اللہ خٹک کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ بشیر احمد بلور کے صاحبزادے ہارون بلور عرفان اللہ مروت کے داماد ہیں جو خود سابق صدر پاکستان غلام اسحٰق خان کے داماد ہیں۔ بالفاظ دیگر گل محمد خان کے نواسے کی شادی غلام اسحٰق خان کی نواسی سے ہوئی ہے یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ حاجی غلام احمد بلور کے مرحوم صاحبزادے شبیر احمد بلور کی شادی سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان کی پوتی اور طاہر ایوب خان کی صاحبزادی سے ہوئی تھی (۱۵)۔

حوالہ جات

۱۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۲۱۔

۲۔ طارق اسماعیل الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۵۸، ۵۵۶۔

۳۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۳۴۷

۴۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۲۱

۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۴۵۔

۶۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۲۱

۷۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۱۲/ جولائی ۲۰۰۲ء۔

۸۔ پارلیمنٹ ہاؤس' اسلام آباد' سینٹ آف پاکستان' ڈائریکٹری آف ممبرز' چوتھا ایڈیشن۔

ص ۶۳، ۶۴
۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد جنرل الیکشنز ۲۰۰۲، رپورٹ جلد اول۔ ص ۲۹۰
۱۰۔ روزنامہ ڈان کراچی ۷ مارچ ۲۰۰۶ء
۱۱۔ فرید احمد خان صوبہ سرحد کے اہم سیاستدان روزنامہ اوصاف آف ڈے ایڈیشن اسلام آباد ۱۶۔ جون ۲۰۰۲ء ص ۶
۱۲۔ دی گزٹ آف پاکستان اسلام آباد۔ ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۸۸۶
۱۳۔ رونامہ ڈان کراچی ۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء
۱۴۔ رشید یوسف زئی۔ سرحد کے ۳۰ خاندان جو ۵۰ سال سے سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ روزنامہ خبریں اسلام آباد ۲۴ اگست ۱۹۹۳ء۔
۱۵۔ ایم ریاض پاکستان کا سدا بہار خاندان جو ہمیشہ اقتدار کے مزے لوٹتا ہے۔ (خصوصی رپورٹ)۔ نوائے وقت لاہور ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۴ء

ترین

ترین سرزمین ہزارہ کا ایک نامور پختون قبیلہ ہے۔ پاکستان کے سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، سابق قائد حزب اختلاف سردار بہادر خان اور قومی اسمبلی کے ــــــــ اسپیکر گوہر ایوب خان اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قبیلے کی مختصر تاریخ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اپنی سیاسی سوانح عمری ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' میں کچھ یوں رقم کی ہے۔

" میرا تعلق ترین قبیلے سے ہے جو ہزارہ اور کیمبل پور اضلاع کے بعض حصوں پر حکمران تھا اور مدتوں سکھوں اور انگریزوں کے خلاف بر سرپیکار رہا۔ اس قبیلے کے لوگ پشین سے آئے تھے جو اب بلوچستان میں ہے اور ابتداء میں افغانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ اپنے بزرگوں میں سے ایک شخص کے حالات زندگی مجھے بہت محو حیرت کرتے تھے۔ اس شخص کا نام سردار محمد خان ترین تھا۔ یہ شجاعت اور بلند ہمتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ یہ سردار نجیب اللہ خان ترین کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور ریاست کا حکمراں بن کر گل ڈھیری میں مقیم ہو گیا تھا۔ اسے مقامی قبائل گوجر، دلازاک، جدون، اور اتمان زئی کے ہاتھوں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں مگر اس نے ان بغاوتوں کو کچل کر انہیں زیر کر لیا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس سالوں میں سکھوں نے کئی مرتبہ اس پر چڑھائی کی مگر اس نے کمال شجاعت سے ان کا مقابلہ کیا۔ ۱۸۲۲ء میں ہری سنگھ نلوہ جو کشمیر کا گورنر تھا، ترین سردار کو نیچا دکھانے کے لئے ہزارہ پر چڑھ آیا، مگر اس کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو طیش آیا اور اس نے خود ایک بھاری فوج لے کر ہزارہ پر چڑھائی کر دی۔ سردار محمد خان گرفتار ہو کر لاہور میں لایا گیا۔ ہری سنگھ نے اسے پچاس ہزار روپے میں خرید لیا۔ اور ضلع راول پنڈی کے مقام روات میں لے گیا۔ ہری سنگھ چاہتا تھا کہ سردار اپنے علاقے میں سکھوں کی فرماں روائی قبول کر لے مگر اس نے منظور نہ کیا۔ آخر اسے ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔ وہاں اسے نمکین روٹی کھانے کو دی جاتی مگر پینے کو پانی نہ دیا جاتا۔ سردار نے بھوک پیاس سے جان دے دی مگر سکھوں کی اطاعت قبول نہ کی۔

کچھ عرصے بعد جب انگریزوں نے ضلع ہزارہ پر قبضہ کرنا چاہا تو ہمارے قبیلے کے لوگوں نے ان کا بھی سخت مقابلہ کیا۔ خاندان کے سردار اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور الہٰ آباد کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ میں نے ۱۹۲۶ء میں ان کی قبریں دیکھیں۔ میں نے سنا کہ سردار قبیلہ کو توپ کے دھانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا تھا اور باقیوں کو سخت اذیتیں پہنچائی گئی تھیں۔ (۱)

بیسویں صدی میں ترین خاندان کے جس فرزند نے سیاسی میدان میں سب سے پہلے قدم رکھا۔ وہ سردار بہادر خان ترین تھے۔ وہ ۵ر جولائی ۱۹۰۸ء کو ہری پور ہزارہ کے نواحی گاؤں ریحانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہوں نے وکالت کو اپنا پیشہ بنایا۔ ۱۹۳۹ میں وہ پہلی مرتبہ سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اگست ۱۹۴۳ء سے مارچ ۱۹۴۶ء تک اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ ایک مرتبہ پھر سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۲) بعد ازاں انہیں سرحد اسمبلی نے پاکستان کی مجلس دستور ساز میں اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کیا اور یوں وہ پاکستان کی پہلی مجلس دستور ساز کے رکن بن گئے۔ (۳)

قیام پاکستان کے بعد سردار بہادر خان فروری ۱۹۴۸ء میں مجلس دستور ساز میں مسلم لیگ پارٹی کے چیف وہپ مقرر ہوئے۔ اسی برس انہوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ واپسی پر انہیں حکومت پاکستان نے امور خارجہ اور دولت مشترکہ تعلقات کا نائب وزیر بنا دیا۔ (۴)

۱۹۴۹ء میں جب سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے گورنر بنے تو سردار بہادر خان مرکزی وزیر مواصلات کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ اس عہدہ پر رہ کر انہوں نے ہری پور میں ٹیلی فون بنانے کا کارخانہ لگوایا جس سے ضلع ہزارہ کے ہزاروں لوگوں کو روزگار مہیا ہوا۔ (۵)

۱۹۵۴ء تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۵۴ء میں انہیں بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کے طور پر تعینات کیا گیا۔ اگلے برس وہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے وہ ون یونٹ کے شدید حامی تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کا قیام عمل میں آیا تو وہ ڈاکٹر خان صاحب کی کابینہ میں وزیر ترقیات کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ (۶)

مغربی پاکستان اسمبلی کے ارکان اگرچہ غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب کیے گئے تھے اور امیدواروں کی کامیابی سربسران کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھی لیکن ڈاکٹر خان صاحب کے وزیر اعلیٰ بنتے ہی ان کے مخالف کیمپ نے انہیں نیچا دکھانے کی صلاح کی اور مسلم لیگ کے صدر سردار عبدالرب نشتر کی ایما پر اسمبلی کے اندر مسلم لیگی ارکان کی ایک پارٹی وجود میں آ گئی۔ اس پارٹی نے، جس کے قائد سردار بہادر خان تھے، ایک قرارداد کے ذریعہ ڈاکٹر خان صاحب کی بطور وزیر اعلیٰ قبولیت کو نامنظور کر دیا اور سردار بہادر خان نے گورنر مغربی پاکستان مشتاق احمد گورمانی کو ڈاکٹر خان صاحب کی جگہ وزیر اعلیٰ بننے کے لئے خط لکھا۔ (۷)

محمد فاروق قریشی اپنی کتاب پاکستان۔ جمہوریت کا زوال میں لکھتے ہیں۔
"جمہوری اخلاق کے تقاضہ کی رو سے انہیں (سردار بہادر خان کو) خط لکھنے سے قبل کابینہ سے علیحدگی اختیار کرنی چاہیے تھی۔ دراصل انہوں نے دوہری چال چلی تھی کہ اگر گورنر دھمکی سے مرعوب ہو گیا تو مغربی پاکستان کی وزارت عظمٰی پر قبضہ ہو جائے گا۔ بصورت دیگر کابینہ کی رکنیت تو برقرار رہے گی"۔ (۸)

مگر ڈاکٹر خان صاحب کی پشت پر گورمانی کے ساتھ ساتھ اسکندر مرزا بھی تھے۔ وہ ان دھمکیوں کو بھلا کیا خاطر میں لاتے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ سردار بہادر خان، ممتاز محمد خان دولتانہ اور محمد ایوب کھوڑو کو ہی کابینہ سے نکلنا پڑا (۹)

سردار بہادر خان ۱۹۶۲ء میں ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اب ان کے بھائی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ملک کے مطلق العنان صدر تھے لیکن سردار بہادر خان نے بڑی جرأت مندی کے ساتھ قائد حزب اختلاف کا فریضہ انجام دیا۔ (۱۰)

صدر ایوب خان اور سردار بہادر خان کے مابین سیاسی اختلاف کی بازگشت جب ان کے آبائی گاؤں ریحانہ میں بستر علالت پر دراز بوڑھی والدہ کے کانوں سے ٹکرائی تو بزرگ خاتون نے سردار بہادر خان کو بلا بھیجا اور ان کی سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ اگر بادشاہی کا جھگڑا ہے تو آدھی آدھی کر لو۔ مگر سگے بھائی سے ٹکرانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ سردار بہادر خان پر مسلسل دباؤ رہا کہ وہ اپوزیشن بنچوں سے دستبردار ہو جائیں۔ بالاخر انہوں نے قومی اسمبلی کے ایوان میں ایک مختصر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں گزشتہ دنوں کراچی میں شادی کی ایک تقریب میں موجود تھا۔ جہاں ایک شاعر اپنا کلام سنا رہے تھے۔ ان کے کلام کا ایک شعر مجھے یاد ہے جو میں ایوان کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔

یہ راز کوئی اب راز نہیں سب اہل گلستان جان گئے
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستان کیا ہو گا۔ (۱۱)

۲ر دسمبر ۱۹۶۳ء کو سردار بہادر خان قائد حزب اختلاف کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے (۱۲) اور ان کی جگہ پر جناب یوسف خٹک کو منتخب کر لیا گیا۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں سردار بہادر خان نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ وہ خان عبدالقیوم خان سے شکست کھا گئے۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو وہ دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ (۱۳)

انہی سردار بہادر خاں کے چھوٹے بھائی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان تھے جو دس برس سے زیادہ پاکستان کے سیاہ و سفید کے مالک رہے۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ۱۴ر مئی ۱۹۰۷ء کو ریحانہ میں پیدا ہوئے۔ وہ بھی اپنے بڑے

بھائی کی طرح مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ تاہم تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہی انہوں نے فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۱۹۲۸ء میں انہیں فوج میں کمیشن ملا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران انہوں نے برما کے محاذ پر خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے اپنی خدمات پاکستان کے حوالے کر دیں۔ ۱۹۴۸ء میں انہیں میجر جنرل کا عہدہ دے کر مشرقی پاکستان میں جنرل آفیسر کمانڈنگ مقرر کیا گیا۔ (۱۴)

۶ر ستمبر ۱۹۵۱ء کو انہیں پاکستانی فوج کا پہلا پاکستانی اور پہلا مسلمان کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ (۱۵) ۱۷ر جنوری ۱۹۵۱ء وہ تاریخی دن تھا جب ایوب خاں نے اپنا یہ عہدہ سنبھالا (۱۶)

جنرل ایوب خان کے کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز ہونے کے چند ماہ کے اندر اندر تین بڑے اہم واقعات پیش آئے۔ ایک تو اس مشہور "سازش" کیس کا انکشاف تھا۔ جو بعد میں راولپنڈی سازش کیس کے نام سے معروف ہوا اور دوسرا پاکستان کے پہلے وزیراعظم اور قائداعظم کے دست راست نوابزادہ لیاقت علی خان کی شہادت کا واقعہ۔ اس سانحے کے کچھ دنوں بعد ایوب خان کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے۔ اس سفر کے دوران ہی ایک ایسا اہم واقعہ پیش آیا۔ جس نے آگے چل کر پاکستان کی تاریخ پر بڑے دور رس اثرات مرتب کیے۔ اس واقعہ کے راوی خود ایوب خان ہیں۔ وہ اپنی خود نوشت "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" میں لکھتے ہیں۔

"مجھے آغا خان مرحوم سے اپنی ایک دل چسپ ملاقات اب تک یاد ہے' جو لیاقت علی خان کے قتل کے کچھ ہی دن بعد ہوئی تھی۔ میں جب کبھی کسی کانفرنس کے سلسلے میں انگلستان جاتا تھا تو آغا خان مجھے خط لکھا کرتے تھے۔ اس موقع پر میں نیس گیا اور یاکی مور میں جو سمندر کے کنارے ایک پر فضا مقام ہے ان کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ آغا خاں کو ان دنوں دل کا مرض تھا۔ وہ ایک زبردست شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں واقعات عالم پر بڑا عبور حاصل تھا۔ میں ان کی معلومات اور دور اندیشی سے بڑا متاثر تھا۔ مجھے ان سے بارہا گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ میں یہاں کچھ باتیں یاد کر کے لکھتا ہوں۔

میں نے ان سے کہا: "جناب والا! اگر آپ کی عمر ذرا کم ہوتی تو آپ ہمارے لئے بڑے مفید ثابت ہوتے"۔

انہوں نے جواب دیا: "کاش ایسا ہی ہوتا۔ پاکستان میرا ایک خواب تھا اور اب جبکہ یہ خواب حقیقت بن گیا ہے تو مجھے حسرت آتی ہے کہ اس کی کچھ خدمت کرتا"۔ آگے چل کر انہوں نے کہا: "آپ لوگوں نے بڑی قربانیوں کے بعد پاکستان حاصل کیا ہے۔ آپ ہرگز اسے گنوانا نہ چاہیں گے۔ لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے پارلیمانی نظام اختیار کیا تو اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ دراصل میں نے یہی بتانے کے لئے تمہیں یہاں بلوایا ہے اور تنہا تم ہی وہ شخص ہو جو

پاکستان کو بچا سکتے ہو"۔

میں نے پوچھا: "آپ کے خیال میں میں کس طرح بچا سکتا ہوں؟"

وہ بولے: "اس نظام کو بدل دو۔ کوئی ایسا نظام سوچو جو تمہاری تاریخ، تمہاری روایات اور تمہارے نظریہ حیات سے ہم آہنگ ہو اور یہ کام حقیقت میں تم ہی کر سکتے ہو"۔

میں نے کہا: "دیکھیئے آغا"۔ میں ایک عرصے کی ملاقات کے بعد انہیں "آغا" کہنے لگا تھا۔۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ کے دل میں پاکستان کو پھلتا پھولتا ہوا دیکھنے کی آرزو تڑپ رہی ہے، لیکن ذرا صبر کیجئے حالات ضرور سدھر جائیں گے"۔

انہوں نے جواب دیا: "نہیں تم ابھی نادان ہو۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ حالات یوں نہیں سدھرا کرتے"۔ (۱۷)

اس واقعہ کے حوالے سے م۔ب۔خالد۔ اپنی کتاب "ایوان صدر میں سولہ سال" میں لکھتے ہیں۔

"سر آغا خان کی نصیحت یا پیش گوئی نے ایوب خان کے دل و دماغ پر کیا اثرات چھوڑے (اس ضمن میں ان کی) سوانح خاموش ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایوب خان کے دل کے کسی نہاں خانے میں اقتدار کی خواہش کا بیج بویا گیا ہو گا"۔ (۱۸)

چند برس بعد ایوب خان نے پاکستانی سیاست کے حوالے سے سنجیدگی سے سوچ بچار کا آغاز کیا۔ وہ اپنی سوانح میں رقم طراز ہیں

"۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو میں لندن کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں امریکہ جاتے ہوئے دو دن کے لئے لندن رک گیا تھا۔ رات گرم گرم سی تھی مجھے نیند نہ آئی لیکن اس کی وجہ محض گرمی نہ تھی۔ وطن سے بری بری خبریں آ رہی تھیں۔ شگون کچھ اچھے نہ تھے۔ میں مضطرب تھا کیونکہ میں نے سنا تھا کہ گورنر جنرل غلام محمد نہ جانے کیا کر بیٹھنے والے ہیں۔ ان میں اور وزیر اعظم محمد علی بوگرہ میں ٹھن گئی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ غلام محمد مجھے سیاسیات میں گھسیٹنا چاہیں گے، جس سے میں خاص طور پر بچنا چاہتا تھا۔

میں کمرے میں ٹہل رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ سے کہا "آؤ ذرا فوجی طریق پر اپنے خیالات تو قلم بند کریں۔ ملک میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟" میں نے اس معاملے کو اس انداز سے دیکھا جس طرح کوئی فوجی صورت حال کا جائزہ لیتا ہے۔ مسئلہ کیا ہے؟ کن عناصر نے اسے الجھا رکھا ہے؟ اور اگر اس کا کوئی حل ہو سکتا ہے تو وہ حل کیا ہے؟ چنانچہ میں اپنے کمرے میں، میز کے پاس بیٹھ گیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں میرے خیالات الجھے الجھے سے تھے لیکن جلد ہی ہر بات روشن ہو گئی۔ چند گھنٹوں میں، میں نے ایک دستاویز تیار کر لی، جس میں، میں نے ملک کے موجودہ مسائل پر خیال آرائی کی تھی اور اپنا نقطہ

نگاہ پیش کیا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ملک کے حالات ابتر ضرور ہیں لیکن ایسے نہیں کہ ان کی اصلاح نہ ہو سکے...." (۱۹)

احمد سلیم اپنی کتاب ٹوٹی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیورو کریسی میں لکھتے ہیں۔

"صدر ایوب نے قومی خدمت' قوم کی درخواست کے بغیر کر ڈالی تھی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو سچ مچ اس ملک کا نجات دہندہ تصور کر رہے تھے لیکن انہوں نے جو تباہ کن خیالات رقم کئے وہ اس ملک کو تباہی اور انتشار کی راہ پر لے جانے والے تھے' جس کی محبت کا وہ دم بھرتے تھے۔ وہ پاکستان کے نیک دل عوام کی جمہوریت اور نمائندہ حکومت کی امنگوں کو برباد کرنے والے تھے۔ وہ بالغ رائے دہی اور آزاد انتخابات کے ذریعے "محدود جمہوریت" کے بارے میں سوچ رہے تھے پارلیمانی نظام کو ختم کرنا مقصود تھا۔ ایوب خان کی اس دستاویز میں صدر مملکت کو اقتدار کا اعلیٰ ترین منبع قرار دیا گیا تھا۔ اس میں مشرقی بنگال کے عوام کے خلاف نفرت کا پہلو بھی شامل تھا'... لیکن یہ "حقیر و ذلیل" بنگالی' مغربی پاکستان میں رہنے والے ہر فاتح نسل کے سپوتوں سے تعداد میں زیادہ تھے۔ جنرل صاحب کا استدلال یہ تھا کہ اس ناپسندیدہ صورت حال سے' صرف اس طرح نمٹا جا سکتا ہے کہ ون یونٹ نافذ کر دیا جائے اور تمام "مصنوعی" حد بندیاں ختم کر دی جائیں۔ وینکٹسے رامانی سوال کرتے ہیں کہ اچھا تو کیا سندھیوں' پنجابیوں' پٹھانوں اور بلوچوں کی امتیازی ثقافتیں' ورثے اور زبانیں اس قدر مصنوعی تھیں کہ انہیں لندن کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک بے خواب جنرل کے قلم کی ایک جنبش سے ختم کیا جا سکے؟ اور وہ خود ہی اس سوال کا جواب اگلے ہی فقرے میں دیتے ہیں کہ پاکستان کے بدنصیب عوام کا مقدر یہی تھا کہ وہ آنے والے مہینوں اور برسوں میں ایک خود ساختہ نجات دہندہ کے ظالمانہ جھوٹ کا تختہ مشق بنیں۔ اس دستاویز میں کہا گیا تھا کہ سروسز کے لئے جائنٹ اسٹاف کو معرض وجود میں لایا جائے جس کا سربراہ سپریم کمانڈر ہو' جو دیگر فرائض کے علاوہ دفاعی رکن اور بلحاظ عہدہ مرکزی کابینہ کا رکن اور بالاخر صدر کے ماتحت ہو۔ یہ سپریم کمانڈر خود ایوب خان کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ رامانی کے مطابق اکتوبر کی اس گرم رات لندن کے ہوٹل کے کمرے میں چکر لگاتے ہوئے' ایوب خان صاف طور پر اس نتیجے تک پہنچ گئے تھے کہ مسلح افواج پر اپنی گرفت کو مستحکم کرنے کے لئے اب وہ مزید کسی سویلین کو وزیر دفاع کی حیثیت سے اپنا سربراہ قبول نہیں کر سکتے ... یہاں تک کہ اپنے پرانے دوست اسکندر مرزا کو بھی نہیں' جنہیں وہ پسند کرتے تھے اور کسی حد تک جن سے خوفزدہ بھی تھے۔ گویا ایوب خان سپریم کمانڈر اور وزیر دفاع بھی ہوں گے' جو صرف "صدر" کے آگے جواب دہ ہو گا۔ خیر' اس وقت تو صدر کوئی تھا بھی نہیں۔ غلام محمد ملک کے سربراہ تھے اور وہ بھی بیمار تھے۔ یہ توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی تھی کہ وہ کافی عرصہ تک مسلط رہیں گے۔ ان کے بعد میدان میں صرف دو ہی رہ جائیں گے... دوست اسکندر مرزا اور خود

سپریم کمانڈر اور وزیر دفاع ایوب خان۔

جس شخص نے یہ دستاویز لکھی، وہ کم از کم ۱۹۵۱ء سے اس یقین کا حامل تھا کہ اس کے ملک کو امریکہ کے ساتھ ایک فوجی تعلق استوار کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے حاصل ہونے کے چند ماہ کے اندر اور اس وقت، جبکہ امریکی ہتھیاروں کی پہلی قسط ابھی راستے ہی میں تھی، وہ ایک ایسا منصوبہ تیار کر رہا تھا جو پاکستان میں جمہوریت اور آزادی کے لئے زہر قاتل تھا۔ علاوہ ازیں اس وقت بھی جب کہ اس کا وزیراعظم (محمد علی بوگرہ) خوف کے عالم میں کراچی کے واپسی سفر کی تیاری کر رہا تھا، اس نے امریکی جوائنٹ چیفس آف سٹاف کے چیئرمین سے ایک ایسی یادداشت وصول کی جس میں پاکستان کو امریکی فوجی امداد کی شرائط درج تھیں۔ یہ ہے وہ خطرہ جو فوج پر سول اختیار اور خود نمائندہ حکومت کو لاحق ہو جاتا ہے جب کوئی کمزور ملک خود کو کسی طاقتور ملک کے ساتھ غیر مساوی فوجی تعلق میں الجھالیتا ہے.... اگر اس کمزور ملک کو صاف ذہن والی قیادت میسر نہ ہو، جسے بڑی حد تک عوامی تائید حاصل ہو نیز آزاد اور چوکس مقننہ اور پریس کا بھی فقدان ہو تو پھر اس کے فوجی آدمی پر "خیالات" نازل ہونے لگتے ہیں۔

ان خیالات کے نزول کے صرف تیسرے ہفتے ۲۴ر اکتوبر کی تاریخ آگئی جس میں گورنر جنرل نے ایوب خان سے اقتدار پر قبضہ کرنے کی درخواست کی تھی اور جو ان کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے مسترد کر دی تھی۔ اپنی سوانح عمری میں انہوں نے لکھا تھا کہ گورنر جنرل نے انہیں کاغذ دیا۔ جس پر تحریر تھا کہ گورنر جنرل ایوب خان کو "فلاں فلاں اختیارات سونپ رہے ہیں" اور اس کے ساتھ ہی "تین ماہ کے اندر ایک آئین تیار کرنے" کا حکم دے رہے ہیں۔ ایوب خان کہتے ہیں کہ جب انہوں نے اس تجویز کو غیر محتاط اور نقصان دہ قرار دیا اور "پکے دشمن" بھارت کے خلاف پاکستانی فوج کو تیار کرنے کے مقصد سے اپنی مکمل وابستگی کا اظہار کیا تو انہیں گورنر جنرل کی "دشنام طرازی کی ایک اور بوچھاڑ" کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ سچی بات غالباً یہ ہے کہ اگرچہ ایوب خان اقتدار اعلیٰ کے حصول کے امکان سے بہت پر جوش ہوئے تھے لیکن ابھی انہیں یقین نہ تھا کہ اقتدار پر قبضہ کرنے کی ان کی کوشش کو، ان کے دوست اسکندر مرزا خوش دلی سے قبول کر لیں گے۔ بہرحال انہوں نے "حب الوطنی کے جذبے" کے تحت وزیر دفاع بننا مجبوراً منظور کر لیا۔ جس پر امریکیوں کو بڑی مسرت ہوئی۔ روزنامہ "ڈان" کے مطابق نئی کابینہ میں دفاع کے شعبے کے لئے ایوب خان کے انتخاب پر امریکی حکام خوش ہوئے تھے۔ وزیراعظم کے امریکی دورے کے دوران ایوب خان نے اچھا تاثر چھوڑا تھا اور امریکی فوجی حکام نے اس عہدے کے لئے انہیں بہترین خیال کیا تھا۔" (۲۰)

بوگرا کے بعد جب چوہدری محمد علی وزیراعظم بنے تو ایوب خان واپس جی ایچ کیو میں چلے گئے اور ایک سال تک وزارت دفاع کا قلمدان چوہدری صاحب کے پاس ہی رہا۔ ایک سال بعد

اسکندر مرزا کی ریشہ دوانیوں کے باعث چوہدری صاحب کی وزارت ڈوبنے لگی تو خود انہوں نے بھی بڑے محتاط انداز میں ایوب خان کو دعوت عمل دی۔ ایوب خان اپنی سوانح میں لکھتے ہیں۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس شخص نے آئین بنایا' وہی اس کا پہلا شکار بنا۔ اس زمانے میں ایک دفعہ میں نے انہیں بڑی بے بسی کی حالت میں ان کے دفتر میں دیکھا۔ چونکہ وہ وزارت دفاع کا قلمدان بھی خود ہی سنبھالے ہوئے تھے اس لئے مجھے ایک دفاعی مسئلے کے سلسلے میں ان سے ملنے کے لئے جانا پڑا۔ انہوں نے مجھ سے کہا "میری جماعت نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ بس اب معاملہ ختم ہے"۔ میں نے ان کی ہمت بندھانے کے لئے چند الفاظ کہے مگر ان کی تشفی نہ ہوئی۔ "نہیں نہیں۔ یہ معاملہ بہت سنجیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ تم یہ کام کیوں نہیں سنبھال لیتے اور مجھے اس سے چھٹکارا کیوں نہیں دلا دیتے؟" میں نے کہا "دیکھئے ان باتوں کا ذکر مجھ سے نہیں اپنے صدر سے کیجئے اور اس الجھن سے نکلنے کا کوئی مناسب طریقہ سوچئے"۔ (۲۱)

چوہدری صاحب اور جنرل صاحب کے درمیان اس گفتگو کی صداقت شک و شبہ سے بالا ہے کیونکہ ایوب خان کی خود نوشت سوانح حیات ۱۹۶۷ء میں مارکیٹ میں آچکی تھی۔ جب چوہدری صاحب اللہ کے فضل سے زندہ سلامت تھے اور گفتگو کی تردید کر سکتے تھے۔ چوہدری صاحب ایوب خاں کے خلاف بیان دیتے رہتے تھے۔ مگر اس گفتگو کی انہوں نے کبھی تردید نہ کی۔

سر آغا خاں اور غلام محمد کے بعد یہ تیسری آواز تھی جس سے ایوب خان کے کان آشنا ہوئے مگر تعجب ہے کہ وہ برابر پہلو تہی کرتے رہے حالانکہ ان کے ذہن میں ملک کی فلاح کا ایک حل بھی موجود تھا۔ جسے انہوں نے بوگرا کی وزارت میں شمولیت کے وقت کابینہ کو پیش بھی کر دیا تھا اور کابینہ نے ون یونٹ کے قیام کا آئیڈیا وہیں سے لیا تھا۔ (۲۲)

احمد سلیم نے اپنی کتاب "سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں" میں خیال ظاہر کیا ہے کہ ایوب خان کا اصل منصوبہ یہ تھا کہ سیاستدانوں کی طرف سے بار بار فوج کو مدد کے لئے پکارا جائے تاکہ اگر ملک میں مارشل لاء کا نفاذ ناگزیر ہو جائے تو اس کا ذمہ دار فوج کی بجائے سیاسی رہنماؤں کو ٹھہرایا جا سکے اور خوش قسمتی سے حالات اسی ڈگر پر چلتے رہے' جس پر ایوب خاں انہیں چلانا چاہتے تھے۔ (۲۳)

ایوب خان کو اسکندر مرزا کی اقتدار پرستی اور ہوس جاہ کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس لئے انہوں نے "انقلاب" کی ذمہ داری اسکندر مرزا کو سونپنے کا منصوبہ بنایا... اس کے ساتھ دیگر تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ اس نے سیاسی شطرنج کی بساط کا بغور مطالعہ کیا اور اپنا ٹائم ٹیبل ترتیب دیا۔ اس نے فوج کو خوب مضبوط کیا اور اپنے خاص اعتماد کے افسران کو مناسب پوزیشنوں پر فائز کیا۔ اندرون ملک ان سیاستدانوں اور بیوروکریٹ صاحبان کی فہرست مرتب کی جو اس کے پروگرام پر معترض ہو سکتے تھے اور ان کی بھی' جو آسانی سے اپنے ساتھ ملائے جا سکتے تھے۔ اس

تمام عرصہ میں وہ سیاسی حکومتوں سے نہایت خوشگوار تعلقات رکھتا رہا تاکہ اس کی مدت ملازمت میں توسیع ہوتی رہے۔ بیرون ملک بھی مناسب مقامات پر دوست بنائے۔ بیرون ملک اپنے لئے حمایت پیدا کرنے کے لئے اس نے پاکستان کے جغرافیائی اور فوجی نقطہ نگاہ سے اہم محل وقوع پر زور دیا۔ اپنے ملکی مفاد سے قطع نظر' دوسرے ممالک کو ایسی ایسی سہولتیں دینے پر رضامندی ظاہر کی جو کوئی آزاد ملک کسی دوسرے کو نہیں دیا کرتا۔

یہی نہیں پنجاب کی بارڈر پولیس' سندھ کے رینجرز اور ایسٹ پاکستان رائفلز جیسے نیم فوجی دستے' ایوب خان کے منصوبے کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے' اس لئے صوبائی حکومتوں کی چیخ و پکار کے باوجود ان دستوں کو براہ راست فوج کے حوالے کر دیا اور انہیں پولیس افسران کی بجائے فوجی افسروں کی کمان میں دے دیا گیا۔ (۲۴)

ستمبر ۱۹۵۸ء تک ملک کی صورتحال ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ خان آف قلات نے پاکستان سے علیحدہ ہونے کی دھمکی دے دی تھی۔ جس کے پس پردہ ایوب خان کی اطلاعات کے مطابق اسکندر مرزا کا اپنا ہاتھ تھا۔ ملک خانہ جنگی کے دہانے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ فوج بھی تنقید کا نشانہ بننے لگی تھی۔ (۲۵)

بعض روایات کے مطابق فوج کی طرف سے قیوم خان کو اسکندر مرزا کے خلاف آگے بڑھایا گیا قیوم خان' ایوب کی خواہش کے مطابق فوجی انقلاب کی دھمکیاں دے کر حالات کو بگاڑ رہا تھا۔ (۲۶)

ادھر مغربی اور مشرقی پاکستان کے سیاست دان بدستور' محلاتی جوڑ توڑ میں مصروف تھے۔ فیروز خان نون اپنی وزارت عظمیٰ بچانے کے لئے کبھی حمید الحق چوہدری کی کرشک سرامک پارٹی سے پینگیں بڑھاتے تھے اور کبھی حسین شہید سہروردی کی عوامی لیگ کو وزارتیں قبول کرنے پر رضامند کرتے نظر آتے تھے۔ (۲۷)

اب اسکندر مرزا سنجیدگی سے ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کی بات کرنے لگا تھا۔ اس نے بعض سیاستدانوں سے بھی اس سلسلہ میں گفتگو کی اور ان سے مشورت کا طالب ہوا۔ مگر بقول انور شعور

پہلے سب سے مشورت کی بیٹھ کر
اور اس کے بعد جو چاہا کیا

سیاستدانوں نے اسے مارشل لاء کے نفاذ سے باز رکھنا چاہا۔ مگر مارشل لاء لگائے بغیر نہ اسکندر مرزا اپنے اقتدار کو طول دے سکتا تھا نہ ہی ایوب خان ملک کا سربراہ بن سکتا تھا۔ اس لئے ہوا وہی جو یہ دونوں طالع آزما چاہتے تھے۔ بقول احمد سلیم کے۔

"آمر کو کٹھ پتلیوں کا کھیل بہت اچھا لگتا ہے لیکن کبھی کبھی وہ کسی زیادہ شاطر مداری کے

ہاتھوں خود بھی ایک کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسکندر مرزا' غیر محسوس طور پر' ایوب خان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے اور ایوب خان' امریکہ کے ہاتھوں میں۔" (۲۸)

احمد سلیم کے ان خیالات کی تائید ایوب خان کی خود نوشت سوانح سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ایک فوجی کی حیثیت سے مجھ پر یہ بات بخوبی عیاں ہو گئی تھی کہ انتخابات میں دو بدو جنگ کا نقشہ سامنے آئے گا اور ملک بھر میں فساد پھوٹ پڑیں گے۔ سول حکام جو سیاست دانوں کے آگے پہلے ہی بے دست و پا ہو چکے ہیں' صورت حال پر قابو نہ پا سکیں گے۔ فوج خواہ پسند کرے یا ناپسند' اسے دخل دینا ہی پڑے گا' کیونکہ آخر ملک میں نظم و ضبط تو قائم رکھنا ہی ہو گا۔

گرد و پیش جو حالات پیدا ہو گئے تھے فوج ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ نہ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ فوجی افسر اور جوان زندگی کے ہر شعبے میں جو سیاسی جوڑ توڑ' چال بازی' بے ایمانی اور بد نظمی دیکھتے تھے اس سے کوئی اثر قبول نہ کریں گے۔ ان کے عزیز و اقارب بھی تھے' وہ اخبار بھی پڑھتے تھے اور بعض اپنے اپنے تعلقات کا سلسلہ بھی رکھتے تھے۔ چونکہ فوج محب وطن تھی اور ایک قومی فوج تھی اس لئے لازمی بات تھی کہ وہ عوام کے خیالات کا ساتھ دے۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے فوجی افسر اور جوان بڑے مایوس اور دل شکستہ ہیں۔ ان سے اکثر کہا جاتا کہ "اے فوج کے لوگو! خود کو نمک حلال ثابت کرو۔ ملک کا یہ حشر ہو رہا ہے اور تم مزے اڑا رہے ہو"۔ کچھ مجھی کو نہیں' ہر وردی پوش کو یہی الزام دیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے معزز لوگ مجھ سے ملنے آتے اور کہتے "تم چاہو تو ملک کی حالت سنبھال سکتے ہو۔ مگر تم جوکھوں میں پڑنا نہیں چاہتے"۔ میرے بعض دوستوں نے اور بھی منہ پھٹ ہو کر یہی بات مجھ سے کہی۔ میں نے کہا "بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری مجھ پر تو نہیں آتی۔ تم تو میری انہی باتوں پر نکتہ چینی کر سکتے ہو جن کا میں ذمہ دار ہوں"۔

جوں جوں حالات خراب ہوتے گئے' زیادہ سے زیادہ لوگ میرے پاس آئے اور اسی لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں بڑی مایوسی جھلکتی نظر آتی تھی۔ میں جہاں کہیں جاتا' اور میں اکثر دورے پر رہا کرتا' کبھی ایک چھاؤنی کا معائنہ کرنے کے لئے کبھی دوسری کا' اور جب کبھی لوگ جمع ہوتے' مجھے ان میں وہی حرماں زدگی دکھائی دیتی' پست ہمتی کا احساس عوام میں تیزی سے سرایت کرتا جاتا تھا اور انہوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا تھا کہ "کاش کوئی اللہ کا بندہ آئے' اور ملک کو بچائے"۔ ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ فوج کی طرف تھا کیونکہ فوج ہی اس خلا کو بھر سکتی تھی۔ فوج ہی وہ واحد منظم ادارہ تھی جو مشکل کے وقت ان کی سپر بن سکتی تھی' ان کو سہارا دے سکتی تھی' تاکہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکیں' اور ان مصیبتوں سے نجات حاصل کر سکیں جن میں وہ گھرے ہوئے تھے۔" (۲۹)

جلد ہی نقارے پر چوٹ پڑ ہی گئی اور بقول ایوب خان کے وہ لمحہ جس کا مدت سے انتظار تھا آخر کار آ پہنچا تھا۔ اب "ذمہ داری" سے جان چرانا ممکن نہیں رہا تھا۔

اسکندر مرزا نے ایوب خان کو بتایا کہ انہوں نے ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ ۷؍ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اس فیصلہ پر عملدر آمد کر لیا گیا۔ اسکندر مرزا نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا' آئین کو منسوخ کر دیا اور ایوب خان کو مارشل لاء کا منتظم اعلیٰ مقرر کر دیا۔ (۳۰)

فیروز خان نون جو مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے کے وزیر اعظم تھے۔ اپنی خود نوشت سوانح "چشم دید" میں لکھتے ہیں۔

"آئین کی تنسیخ کے بعد بعض لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ سکندر نے شیر پر سواری کی ہے (ان کا اشارہ سابق کمانڈر انچیف جنرل ایوب خاں کی طرف تھا' جنہیں وزیر اعظم بنایا گیا تھا) دیکھنا چاہیے کہ یہ شیر انہیں کب اپنا لقمہ بناتا ہے؟ اور بعض دوسرے لوگ سوال کرتے کہ جس آئین کے تحت سکندر کو صدر منتخب کیا گیا تھا' جب اس نے وہ آئین ہی منسوخ کر دیا تو صدر کہاں رہا؟" (۳۱)

اسی سے ملتی جلتی بات ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان نے اپنی کتاب "جرنیل' سیاست میں" تحریر کی ہے خیال رہے کہ ایئر مارشل اصغر خان ان دنوں پاک فضائیہ کے سربراہ تھے اور یوں نئی حکومت کے ایک اہم رکن تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ایوب خان کو حکومت چلانے کے مکمل اختیارات حاصل تھے' لیکن اسکندر مرزا کی موجودگی انہیں ناگوار سی لگتی تھی۔ ناگواری کا یہ احساس جلد ہی دونوں طرف محسوس ہونے لگا۔ دونوں کے مشیروں نے مشورہ دینا شروع کر دیا۔ طاقت کے استعمال میں ساجھے داری برداشت نہیں کی جا سکتی۔ بد اعتمادی بڑھتی چلی گئی اور یہ حقیقت جلد واضح ہو گئی کہ مفادات کے طابع یہ اتحاد زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ انہی دنوں ایوان صدر میں ایک استقبالئے کے دوران ایک انتہائی زیرک سفارت کار' کینیڈا کے ہائی کمشنر مورن نے ایوب خان سے سوال کیا "جناب وزیر اعظم! آپ اگلا قدم کب اٹھا رہے ہیں۔" "کیا مطلب؟" ایوب خان نے حاضر جوابی سے کہا۔ ہائی کمشنر بغیر کچھ بولے مسکرا دیئے لیکن ایوب خان سمیت وہاں موجود ہر فرد یہ سمجھ گیا کہ مورن کا مطلب کیا تھا"۔ (۳۲)

فوج کے شعبہ قانون کے ماہرین نے صاف طور پر یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ آئین کی منسوخی کے ساتھ ہی صدر کا عہدہ بھی ختم ہو گیا ہے اور اب حکومت کا واحد سربراہ چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر ہے۔ میجر جنرل اسکندر مرزا نے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے بڑے ہاتھ پاؤں مارے۔ کچھ سول افسروں کو ساتھ ملا کر انہوں نے کراچی کے مزدوروں سے اپنے حق میں ایک

پھسپھسا سا مظاہرہ بھی کروایا۔ تاکہ جنرل ایوب خان پر عوام میں اپنی ہر دلعزیزی کا رعب گانٹھ سکیں۔ مسلح افواج میں پھوٹ ڈالنے کے لئے انہوں نے پاک فضائیہ کے ایئر کموڈور مقبول رب کے ذریعہ چند فوجی جرنیلوں کو گرفتار کرنے کی بھونڈی سی ناکام کوشش بھی کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جنرل ایوب خاں کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے اپنی روایتی محلاتی سازشوں کے تانے بانے بھی بڑی چالاکی سے بننا شروع کر دیئے لیکن جس محلسرا پر آئین کا سایہ قائم نہ رہے' اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ مارشل لاء میں حکومت اس کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو۔ یہ فوقیت ایوب خاں کو حاصل تھی۔ چنانچہ عین بیس روز بعد رات کے وقت فوج کے ایک دستے نے ایوان صدر کو گھیرے میں لے لیا۔ تین جرنیل اور ایک مسلح بریگیڈیئر اسکندر مرزا کے پاس گئے اور انہیں کرسی صدارت سے اتار کر پہلے کوئٹہ اور پھر لندن روانہ کر دیا۔ (۳۳)

۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جنرل ایوب خان نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور سپریم کمانڈر کے ساتھ صدر پاکستان کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ اب وہ بری فوج کے کمانڈر انچیف' تینوں افواج کے سپریم کمانڈر' سی ایم ایل اے اور صدر پاکستان سبھی کچھ تھے۔ (۳۴)

ایوب خان نے اپنی کتاب "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" میں لکھا ہے کہ "مارشل لاء کے فوری مقاصد بھی تھے اور طویل المیعاد مقاصد بھی۔ ایک فوری مقصد یہ تھا کہ سول اور آئینی اداروں کو بحال کیا جائے۔ یہ ادارے غلط اور خود غرضانہ استعمال کے باعث ناکارہ اور بے جان ہو چکے تھے۔ ان کو مارشل لاء کی نگرانی کی ضرورت تھی تاکہ وہ آئین کے تحت پھر سے اپنے اپنے اصلی کاموں میں مصروف ہو جائیں جبکہ مارشل لاء کے طویل المیعاد مقاصد میں ایسی بڑی بڑی اصلاحات کا جاری کرنا شامل تھا جن کے ذریعہ ملک کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں ابتری اور ناہمواری کو دور کیا جاسکے۔ ان اصلاحات کی غایت ملک میں ایک مناسب آئین کا اجراء اور آئینی زندگی کی بحالی تھا۔ (۳۵)

مگر پنجاب اور مغربی پاکستان کے سابق گورنر اور پاکستان کے سابق وزیر داخلہ اور وزیر امور کشمیر جناب مشتاق احمد گورمانی' صدر ایوب خان سے اتفاق نہیں کرتے۔ مارشل لاء کے نفاذ کے کوئی ساڑھے گیارہ برس بعد انہوں نے ممتاز صحافی مجیب الرحمٰن شامی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے الزام لگایا کہ "۵۸ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے وقت اس کی جو وجوہ بیان کی گئی تھیں اور جو مقاصد عوام کے سامنے رکھے گئے تھے بعد میں ان پر عمل نہیں ہوا اور ان مقاصد کو پس پشت ڈالا گیا۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مارشل لاء کا مقصد وہ نہیں تھا جو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے بیان کیا۔ اگر آپ ۵۸ء کے بعد پیش آنے والے واقعات کا جائزہ لیں تو دو واقعات ایسے ہیں جن سے حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور مارشل لاء لگانے والوں کے عزائم اور اس فعل کے محرکات کی نقاب کشائی ہو جاتی ہے۔ یہ دو واقعات تھے۔ بڈبیر میں امریکی اڈے کا

قیام اور ایوب خان کی طرف سے بھارت کو مشترکہ دفاع کی پیش کش"۔ (۳۶)

مشتاق مرزا نے اپنی کتاب "ایوب خان' تخت نشینی سے تختہ الٹنے تک" میں مشتاق احمد گورمانی کے ان الزامات کی بالواسطہ طور پر تائید کی ہے اور ایسے شواہد پیش کئے ہیں جن کے مطابق صدر ایوب خان کو سی آئی اے کی جانب سے ہر سال مبینہ طور پر ۷۰ ہزار ڈالر کی رقم بطور سیاسی رشوت پیش کی جاتی تھی اور یہ سلسلہ ان کے انتقال کے بعد تک جاری رہا ہے۔ (۳۷) ایوب خان نے تو سیاستدانوں پر مالی بے قاعدگیوں اور بدعنوانیوں کا الزام لگا کر انہیں سیاست اور اقتدار سے چلتا کر دیا تھا لیکن اقتدار میں آنے کے دو سال کے اندر اندر انہوں نے پاکستان کے مفادات کے خلاف بہت بڑی رشوت قبول کر کے خود اپنے عائد کردہ الزامات کی عملی تردید کر دی۔

ایوب خان سیاستدانوں کے بارے میں جو رائے اور رویہ رکھتے تھے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ انہوں نے اپنی خود نوشت میں جا بجا سیاستدانوں کو ملک کی ابتری کا مورد الزام ٹھہرایا ہے سیاست اور سیاستدانوں کے خلاف ایوب خان کا رویہ کسی گہری سوچ بچار' کسی استدلالی چھان بین اور بالغ نظری کا نتیجہ نہ تھا ان کے ذہن نے بہت سے متفرق اکا دکا اور اتفاقی واقعات کو جو کہیں کہیں اور کبھی کبھی رونما ہو چکے تھے' یکجا کر کے کنٹھ مالہ کی طرح گلے میں پہن رکھا تھا۔ ان واقعات کی روشنی میں وہ سیاست اور سیاستدانوں کے خلاف ہر قسم کے الزامات' مفروضات اور نظریات قائم کر کے انہیں حد درجہ ناقص' ناکارہ اور بد راہ ثابت کرنے میں ہمہ وقت کمربستہ رہتے تھے۔ (۳۸)

عنان اقتدار سنبھالتے ہی صدر ایوب نے سیاستدانوں کا قلع قمع کرنے کے لئے یکے بعد دیگرے دو قانون نافذ کئے۔ پہلا قانون عرف عام میں "پوڈو" کہلایا۔۔ یعنی

Public Offices (Disqualification) Order, 21 March 1959.

اپنے پیشرو منسوخ شدہ "پروڈا" کی طرح اس کا اطلاق صرف سیاسی عہدیداروں پر ہوتا تھا اور فرد جرم ثابت ہونے پر پندرہ سال تک سیاسی عہدوں پر فائز ہونے سے نااہلیت کی سزا ملتی تھی۔

لیکن صدر ایوب کا مقصد صرف سیاسی عہدیداروں کی بیخ کنی ہی نہ تھا بلکہ وہ سیاست کے میدان میں سرگرم عمل عناصر کو کانٹے کی طرح نکال کر باہر پھینک دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد ایک دوسرا قانون بھی نافذ کر دیا۔ جسے "ایبڈو" کے مخفف نام سے شہرت عام نصیب ہوئی۔ یعنی

Elective Bodies (Disqualification) Order, 7 August, 1959.

اس آرڈر کا اطلاق ان سب افراد پر ہوتا تھا' جو کسی سیاسی عہدے پر رہے ہوں یا کسی منتخب شدہ اسمبلی یا ادارے کے رکن بنے ہوں۔ یہ قانون بھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے نافذ العمل قرار دیا گیا

تھا۔ تاکہ نئے اور پرانے سب سیاستدان اس کے پھندے میں جکڑے رہیں۔

"ایبڈو" کے تحت فرد جرم ثابت ہونے پر ملزم کو چھ برس تک سیاست سے کنارہ کش رہنے کی سزا ملتی تھی۔ البتہ اتنی رعایت ضرور تھی کہ اگر کوئی صاحب عدالت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا نہ چاہتے ہوں، تو وہ رضا کارانہ طور پر چھ سال کے لئے سیاست سے دست برداری کا اعلان کر کے اپنی گلو خلاصی کرا سکتے تھے۔

مشرقی پاکستان سمیت قومی اور صوبائی سطح کے ۹۸ ممتاز سیاستدانوں کے خلاف ایبڈو کی کاروائی شروع کی گئی تھی۔ ان میں سے ۷۰ نے رضاکارانہ طور پر چھ سال کے لئے سیاست سے توبہ کر کے اپنی جان چھڑا لی۔ ان میں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، مسٹر محمد ایوب کھوڑو اور خان عبدالقیوم خان کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ۲۸ سیاستدانوں نے اپنی صفائی پیش کر کے مقدمہ لڑا۔ ۲۲ ہار گئے جن میں ایک سابق وزیر اعظم مسٹر حسین شہید سہروردی مغربی پاکستان کے سابق گورنر میاں مشتاق احمد گورمانی اور سید عابد حسین شامل تھے۔ صرف چھ سیاستدان ایسے تھے جو بری ہوئے۔

بڑے اور مشہور سیاستدانوں کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں دو ہزار سے اوپر نچلی سطح کے سیاسی کارکن بھی "ایبڈو" کا شکار ہوئے۔ یہ وہ حضرات تھے جو ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک کسی وقت بھی کسی اسمبلی، میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ یا دیگر منتخب شدہ ادارے کے رکن رہ چکے تھے۔

ان اعداد و شمار سے صرف ایک بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ایک فوجی افسر چھاؤنیوں کی محدود فضا میں اپنی عمر عزیز کے باون سال گزارنے کے بعد اچانک مسلح افواج کے ناجائز استعمال سے ایک نہتی سول حکومت کو زبردستی نکال باہر کرتا ہے اور خود مسند اقتدار پر قبضہ جما کے بیٹھ جاتا ہے لیکن اس ایک عمل سے یہ لازمی نہیں کہ اس پر عقل و دانش کی ایسی بارش شروع ہو جائے کہ وہ ملک بھر کے تمام اکابرین اور کارکنوں کو بیک جنبش قلم نا اہل، ناکارہ اور نالائق ثابت کرنے میں حق بجانب بھی ہو۔ (۳۹)

ایبڈو کا کالا قانون ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو اپنی مدت پوری کرنے پر ختم ہو گیا۔ اب تک پاکستان میں سیاسی نا اہلیوں کے تین قوانین ... پروڈا، پوڈو اور ایبڈو... نافذ کئے گئے تھے۔ سیاسی اثرات کے اعتبار سے ایبڈو سب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا اس نے ملک میں ہر طرح کی جمہوری نشوونما کو روک دیا۔ یہی نہیں اس نے علیحدگی پسند قوتوں کو سر اٹھانے اور پنپنے کا موقع دیا خصوصاً مشرقی پاکستان میں اس کے اثرات تباہ کن ثابت ہوئے۔ وہاں پہلے ہی احساس محرومی جڑ پکڑ چکا تھا اب ایبڈو کے نتیجے میں وہ پورے طور پر سیاسی عمل سے کٹ گیا اب سیاسی حکومت کی جگہ فوجی بیورو کریسی کا راج تھا جس کا تعلق پنجاب سے تھا عوام اور فوجی افسر شاہی کی ٹکر ناگزیر

تھی چنانچہ علیحدگی پسند رجحانات کی آبیاری ہونے لگی جس کا حتمی نتیجہ بنگلہ دیش کی صورت میں سامنے آیا۔

سیاست دانوں اور سیاسی کارکنوں کی ایک پوری نسل، جس کی جڑیں عوام میں تھیں، سیاست سے الگ کر دی گئی ایوب خان کے اس عمل کے نتیجے میں ایک خوفناک سیاسی خلا پیدا ہو گیا جسے دوسرے درجے کے فرمانبردار سیاست دانوں سے پر کرنے کی کوشش کی گئی۔ عبدالصبور خان یا منعم خان جیسے فدوی سہروردی کی جگہ کس طرح پر کر سکتے تھے۔ ایوب خان فوج کی مدد سے برسر اقتدار آیا تھا جس میں مشرقی پاکستان کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ چنانچہ بنگالی عوام کا یہ احساس شدید تر ہو گیا کہ اقتدار میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے ایوب کے دور اقتدار کی طوالت کے ساتھ ساتھ یہ احساس محرومی بھی بڑھتا گیا۔

ایوب خان کے ایبڈو کے قانون کے جو نتائج نکل سکتے تھے وہ ایوب کے مشیران کرام کی نظروں سے پوشیدہ رہے یا انہوں نے جان بوجھ کر انہیں ایوب خان سے پوشیدہ رکھا۔ ایوب خان نے مقبول اور متحدہ پاکستان کے حامی بنگالی سیاستدانوں کو نا اہل قرار دے کر جو سیاسی خلا پیدا کر دیا تھا وہ شیخ مجیب الرحمان اور اس جیسی دوسری علیحدگی پسند قوتوں سے بھرنے لگا۔ ایوب خان کے طول طویل دور حکومت میں عوام کو جو شکائتیں پیدا ہوئیں انہیں ایک جمہوری حکومت ہی دور کر سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ مجیب الرحمٰن چھوٹے درجے کے سیاست دان سے ابھر کر نئی نسل اور پوری بنگالی قوم کی آرزوؤں اور امنگوں کا ترجمان بن گیا۔ جو بنگالی سیاست دان ان شکایات اور مسائل کو متحدہ پاکستان کے تناظر میں حل کر سکتے تھے وہ ایوب خان کے ایبڈو کا شکار ہو گئے۔.... فضا پر بنگالی قوم پرستی چھا گئی اور جب ایوب خان کا اقتدار ختم ہوا تو حالات بہت دور جا چکے تھے۔

ایبڈو کے منفی اثرات مغربی پاکستان میں بھی دیکھنے میں آئے صوبہ سندھ جو پہلے سے ون یونٹ کے خلاف تھا اب اس نئی افتاد پر کھول اٹھا۔ بلوچستان میں تو نوروز خان کی قیادت میں مسلح بغاوت ہوئی صوبہ سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت بھی ان غیر جمہوری ہتھکنڈوں سے نالاں تھی۔ قوم پرست قوتوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا اگرچہ یہ قوتیں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کر رہی تھیں اور خان عبدالغفار خان، جی ایم سید، عطاء اللہ مینگل، غوث بخش بزنجو، عبدالصمد اچکزئی اور اسی سطح کے کئی بڑے رہنما مارشل لاء کے دوران جیلوں میں بند رہے لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ ان رہنماؤں کو ایبڈو کے تحت پانچ یا چھ سال کے لئے نا اہل قرار نہ دیا گیا حکومت نے ان پر ایبڈو کے علاوہ ہر وار کیا سیاست دانوں کو نا اہل قرار دینے کے اس قانون کی تاریخ میں یہ سوال آج بھی جواب طلب ہے کہ ایوب خان نے قوم پرست سیاست دانوں کو نا اہلی کے قوانین سے مستثنیٰ کیوں قرار دے دیا تھا؟ (۴۰)

سیاست دانوں سے نجات پانے کے بعد جنرل ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کا نظام رائج کر کے سرتوڑ کوشش کی کہ ملک میں پرانی طرز سیاست کی جگہ ایک بالکل نئی اور انوکھی سیاست کو جنم دیا جائے۔ ان کو یقین تھا کہ بنیادی جمہوریتوں کے جو اسی ہزار نمائندے منتخب ہوں گے ان میں کم از کم کچھ لوگ تو ایسے ضرور نکلیں گے جو قابلیت' ذہانت' وجاہت اور صلاحیت میں پرانے سیاستدانوں کے ہم پلہ یا ان سے بھی ارفع و اعلیٰ ہوں لیکن ان کی یہ امید بر نہ آئی۔ البتہ لگے ہاتھوں بنیادی جمہوریتوں کے ان اسی ہزار منتخب اراکین کا اتنا فائدہ اٹھایا گیا کہ ان کے ووٹ حاصل کر کے ایوب خان نے اپنی صدارت پر مہر تصدیق ثبت کروالی۔

یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو صدر ایوب نے اپنے نئے آئین کا اعلان کیا۔ یہ آئین ۸ر جون ۱۹۶۲ء کو نافذ ہوا۔ اسی دن صدر ایوب نے قومی اسمبلی میں مارشل لاء اٹھانے کا اعلان کر دیا۔

معاشرے کو سیاسی جماعتوں سے نجات دلانا ان کا ایک نہایت بلند بانگ دعویٰ تھا' لیکن مارشل لاء اٹھے ہوئے ابھی چالیس دن بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ صدر کی منظوری کے ساتھ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ جاری ہوا جس کی رو سے اسمبلیوں کے اندر اور باہر سیاسی جماعتیں از سر نو بحال ہو گئیں۔ اس قانون کے نافذ ہوتے ہی صدر ایوب اپنے نام نہاد انقلابی نصب العین کے بلند پایہ ستون سے لڑھک کر دھڑام سے نیچے گرے اور سیاست کی اسی دلدل میں آ پھنسے جس کی سڑاند اور عفونت مٹانے کے لئے انہوں نے مارشل لاء کا سارا کھڑاگ کھڑا کیا تھا۔

اس نئی صورت حال میں صدر ایوب کا زاویہ نگاہ یکسر بدل گیا اور جو پرانے سیاستدان "ایبڈو" کی زد میں آ کر چھ سال کے لئے معطل ہو چکے تھے' ان کی نظر میں وہ لوگ بھی یکایک پسندیدہ اور قابل اعتماد بن گئے۔ چنانچہ صدر ایوب کے ایما سے قومی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا کہ "ایبڈو" کے تحت سیاست دانوں پر عائد کی ہوئی پابندیاں اٹھائی جائیں' لیکن اسمبلی میں آئے ہوئے نئے سیاستدانوں کو اس میں اپنے لئے شدید خطرات نظر آئے۔ چنانچہ انہوں نے اس بل کو مسترد کر دیا۔ ان نئے حالات میں صدر ایوب نے پہلے اپنی ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ اس میں دال گلتی نہ دیکھی' تو پھر ان کی نگاہ انتخاب مسلم لیگ پر پڑی۔ دل ہی دل میں وہ اس جماعت کی قیادت کو ایک طرح سے اپنی جائز وراثت بھی سمجھتے تھے۔ ان کے گرد روز افزوں بڑھتے ہوئے خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں کا ایک گروہ رفتہ رفتہ انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا کر رہا تھا کہ صدر ایوب قائداعظمؒ کے صحیح جانشین پیدا ہوئے ہیں اور جو کام محمد علی جناح ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں پورا کرنا ایوب خان کے مقدر میں لکھا ہے۔ (۴۱)

آہستہ آہستہ صدر ایوب خان نے سیاست کے علاوہ نظم و نسق کے شعبوں میں بھی طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے اگلا صدارتی انتخاب ہر قیمت پر جیتنے کا جال بچھانا شروع کیا۔ جونہی انتخابی مہم کا آغاز ہوا۔ ملک کے بہت سے سربرآوردہ سیاسی لیڈر صدر ایوب کی

مخالفت کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ ان میں خواجہ ناظم الدین، میاں ممتاز محمد دولتانہ، شیخ مجیب الرحمان، مولانا بھاشانی، خاں عبدالولی خاں، چوہدری محمد علی اور مولانا مودودی کے نام سرفہرست تھے۔ ان رہنماؤں کی قیادت میں کونسل مسلم لیگ، عوامی لیگ، نیشنل عوامی پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کے اتحاد سے "کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز" کی تنظیم قائم ہوئی جس کا واحد مقصد صدر ایوب کو صدارتی انتخاب میں شکست دینا تھا۔ اس کے علاوہ ان کا اور کوئی مشترکہ لائحہ عمل یا منشور نہ تھا۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے یہ لازمی تھا کہ یہ متحدہ محاذ ایک ایسا صدارتی امیدوار نامزد کرے جو ایوب خاں کو شکست دینے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ان کے سامنے ایک نام تو مس فاطمہ جناح کا تھا جو قائداعظم کی بہن ہونے کے ناطے سے ملک بھر میں ایک خاص عزت و احترام اور جذباتی قدر و منزلت کی حامل تھیں۔ دوسرا امکان جنرل محمد اعظم خاں کے نام کا تھا گورنر کے طور پر وہ مشرقی پاکستان میں نمایاں ہر دلعزیزی حاصل کر چکے تھے اور وزیر مہاجرین و بحالیات کی حیثیت سے وہ مغربی پاکستان میں بھی خاصے نیک نام تھے۔ مس جناح کی جگہ اگر جنرل اعظم کو صدارتی امیدوار نامزد کیا جاتا۔ تو یقیناً صدر ایوب کو بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ لیکن وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اس موقع پر ایک عجیب ترپ کی چال چلی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے ایک ممتاز رکن مسٹر مسیح الرحمٰن سے ان کا گہرا یارانہ تھا، مسیح الرحمٰن بھٹو صاحب کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کے علاوہ مولانا بھاشانی کے دست راست بھی تھے۔ ذاتی طور پر وہ اچھی شہرت کے مالک نہ تھے اور سیاست میں مول تول کرنے کے اسرار و رموز سے واقف تھے کہا جاتا ہے کہ مسٹر بھٹو نے انہیں پانچ لاکھ روپے کے عوض خرید لیا۔ بعض ذرائع تو اس پانچ لاکھ روپے کی بانٹ میں مولانا بھاشانی کو بھی شراکت کا حصہ دار ٹھہراتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مسیح الرحمٰن کے داؤ پیچ میں آ کر مولانا بھاشانی نے کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز پر شرط عائد کر دی کہ وہ صرف ایسی شخصیت کو صدارتی امیدوار نامزد کریں جس کا مارشل لاء کی حکومت سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ جنرل اعظم خاں مارشل لاء کی حکومت کا ایک نہایت اہم رکن رہ چکے تھے۔ اس لئے یہ شرط عائد ہونے کے بعد صدارتی امیدوار کی حیثیت سے ان کا نام خودبخود خارج از بحث ہو گیا۔

اسی طرح کا پیچدار حربہ استعمال کر کے صدارتی انتخاب کے سلسلے میں مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کی ایک اور اہم خدمت بھی سرانجام دی تھی۔ چند قانونی ماہرین کے مشورے سے کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز نے یہ خفیہ فیصلہ کیا کہ ایوب خاں کی صدارتی امیدوار کی حیثیت کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے کیونکہ فیلڈ مارشل کے طور پر ان کی تقرری کے جو احکام جاری ہوئے تھے ان کے پیش نظر وہ آئینی طور پر کسی انتخاب میں حصہ لینے کے اہل نہیں رہے۔ اپنی قیمت وصول

کر کے مسیح الرحمٰن نے متحدہ محاذ کا یہ راز درون خانہ بھی مسٹر بھٹو پر فاش کر دیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر صدر ایوب نے فوراً اپنی تقرری کے احکامات میں موثر بر ماضی رد و بدل کر کے انہیں آئینی تقاضوں کے ہم آہنگ کر لیا۔

صدر ایوب اپنے انتخاب کی راہ میں ہر رکاوٹ کو دور کرنا اپنا حق سمجھنے لگے تھے۔ اس عمل میں ان کے نزدیک جائز یا ناجائز طریق کار کی کوئی تمیز باقی نہ رہی تھی۔ زوال کی طرف یہ ان کا ایک یقینی قدم تھا۔

صدارتی الیکشن کے دوران صدر ایوب نے دین اور دنیا دونوں سے بے دریغ فائدہ اٹھایا۔ پہلے تو ایک مشہور پیر صاحب نے اعلان فرما دیا کہ انہیں بذریعہ کشف یہ الہام ہوا ہے کہ کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل نہیں۔ اس کے بعد چند علمائے کرام نے یہ فتویٰ بھی صادر کر دیا کہ اسلام کی رو سے کسی عورت کا سربراہ مملکت کے عہدے پر فائز ہونا جائز نہیں۔ اس مسئلہ پر جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کی یہ رائے تھی کہ اسلام میں عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی اجازت تو ہے لیکن مناسب نہیں۔ صدر ایوب کے حواریوں نے مس فاطمہ جناح کو نیچا دکھانے کے لئے حسب توفیق اسلام کا ہر ممکن استعمال یا استحصال کیا۔

صدارتی الیکشن کے دوران دین کے علاوہ دنیا بھی بے حساب کمائی اور لٹائی گئی۔ ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کے ہاتھ میں کروڑوں کا الیکشن فنڈ موجود تھا۔ اسے جمع کرنے کے لئے ہر طرح کے حربے استعمال کئے گئے تھے۔ اکثر تاجروں اور صنعتکاروں کو امپورٹ لائسنسوں پر مقررہ شرح سے الیکشن فنڈ میں چندہ دینا ہوتا تھا۔ کچھ لائسنس فرضی ناموں پر جاری کر کے بھاری قیمت پر ضرورت مند تاجروں اور صنعتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ پٹ سن کے کارخانوں اور سوتی اور اونی ٹیکسٹائل ملوں سے بھی بھاری بھرکم چندے وصول کئے گئے تھے۔ اس بہتی گنگا میں ہر کوئی ننگا اشنان کر رہا تھا اور بہت سے کارکن اپنا اپنا ہاتھ رنگنے میں نہایت بے حجابی سے بر سر عام مصروف تھے۔ صدر ایوب کے صدارتی انتخاب کی مہم میں پیسے کی ریل پیل نے سیاسی گلن اور سڑن کو ایسا فروغ بخشا جس کی مثال ہماری تاریخ میں پہلے نہیں ملتی انہوں نے سیاست کی تطہیر کی خاطر پوری فوج کے ساتھ سیاستدانوں پر چڑھائی کی تھی اور اب ان کی پارٹی خود ہی الیکشن کے تالاب میں گندی مچھلی کا روایتی کردار ادا کرنے میں سرگرم عمل تھی۔

الیکشن کے بعد ۳، جنوری ۱۹۶۵ء کو جب نتیجہ برآمد ہوا تو صدر ایوب کے حق میں ۴۹۶۴۷ ووٹ اور مس فاطمہ جناح کے حق میں ۲۸۳۴۵ ووٹوں کا اعلان ہوا۔ بظاہر ایوب خاں صاحب ۲۱۳۰۲ ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے تھے لیکن اس تعداد سے کئی گنا زیادہ عوام کی نظر میں دراصل وہ بازی ہار بیٹھے تھے کیونکہ اب وہ اس طرح کا امیج لے کر نہیں ابھرے تھے جس کے

ساتھ وہ پہلے پہل اقتدار میں آئے تھے۔

انتخاب میں ڈھاکہ اور کراچی نے بھاری اکثریت سے صدر ایوب کے خلاف ووٹ ڈالے تھے۔ ڈھاکہ کے متعلق تو وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے لیکن کراچی میں ان کے فرزند دلپذیر گوہر ایوب نے اہالیان شہر کی گوشمالی کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ ۵ر جنوری کو جشن فتح یابی کے نام پر کراچی میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ جس کی قیادت گوہر ایوب کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے جلو میں سڑکوں' جیپوں' ویگنوں' بسوں اور رکشاؤں کی طویل قطار تھی۔ ان سب کے ڈرائیور اور سواریاں زیادہ تر پٹھانوں پر مشتمل تھیں۔ صدارتی الیکشن سے کئی ماہ قبل کراچی میں ضلع ہزارہ کے پٹھانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی اور جشن فتح یابی کے روز وہ شہر کی فضا پر ایک دہشتناک غبار کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ لیاقت آباد اور چند دوسرے علاقوں میں جلوس اور شہریوں کے درمیان کچھ جھڑپیں ہوئیں اس کا بدلہ چکانے کے لئے رات کے اندھیرے میں ان بستیوں پر شدید حملے کئے گئے۔ آگ لگائی گئی اور کافی جانی اور مالی نقصان پہنچایا گیا۔ اس نقصان کا صحیح اندازہ کسی کو نہیں لیکن "شہیدان لیاقت آباد" کی یاد منانے کے لئے ہر سال ۵ر جنوری کو ایک تقریب منائی جانے لگی۔ کئی روز تک کراچی میں خوف و ہراس طاری رہا اور پٹھانوں اور مہاجرین کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہو گئی کچھ راویوں کے مطابق اس زمانے میں ایک بار پھر ہندو مسلم فسادات کے واقعات کی یاد تازہ ہو گئی۔ صدارتی انتخاب جیتنے کے فوراً بعد یہ صورت حال صدر ایوب کے نئے دور حکومت کے لئے صریحاً ایک شدید بدشگونی کی علامت تھی۔

گوہر ایوب کے اس کارنامے نے صدر ایوب کی ساکھ پر بدنامی' بدسگالی' بدفالی اور نحوست کی گہری دھول اڑائی۔ اس کے بعد اس فرزند دلپذیر نے مزید کل پرزے نکالنا شروع کئے جس سے بادی النظر میں یہ گمان گزرتا تھا کہ شاید صدر ایوب اس برخودار کو اپنی ولی عہدی کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ کراچی کے نظم و نسق میں بڑی حد تک دخیل ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب انہیں کراچی مسلم لیگ کی رابطہ کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا گیا تو فی الفور یہ افواہ پھیل گئی کہ اس تقرری کے پردے میں اس نوجوان کو اگلا صدارتی انتخاب لڑنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ کراچی میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جن کے دل میں گوہر ایوب کے خلاف غم و غصے کی آگ پہلے ہی سے سلگ رہی تھی۔ اس افواہ نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ اس صورت حال کا علم نہ صدر ایوب کو تھا نہ گوہر ایوب کو' کیونکہ بیشتر سرکاری اور سیاسی ادارے ان دونوں کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگے ہوئے تھے۔ اہالیان کراچی کی آشفتگی' برہمی اور جھلاہٹ کا بھانڈا اس وقت پھوٹا جب دسمبر ۱۹۶۷ء میں رمضان المبارک کے پہلے جمعہ کے موقع پر گوہر ایوب نے کراچی کی میمن مسجد میں تقریر کرنے کی کوشش کی۔ اس پر مسجد میں زبردست ہنگامہ ہو گیا۔ لوگوں نے تقریر سننے سے صاف انکار کر دیا۔ کسی قدر ہاتھاپائی بھی ہوئی اور گوہر ایوب کو بمشکل پولیس کی حفاظت میں

مسجد سے باہر لایا گیا۔ اس احتجاجی واقعہ نے ایک طرف تو گوہر ایوب کی بڑھتی ہوئی توقعات اور خواہشات کی بساط الٹ دی۔ دوسری جانب صدر ایوب کے اقتدار کی سیڑھی کے پائدان کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

یوں بھی اقتدار کی سیڑھی کے اس پائدان میں پہلے ہی سے بہت سی دراڑیں پڑ چکی تھیں میمن مسجد والے حادثہ سے تقریباً چار ماہ قبل کراچی میں ایک اور واقعہ بھی رونما ہو چکا تھا۔ جولائی ۱۹۶۷ء میں مادر ملت مس فاطمہ جناح کی وفات پر کراچی میں لاکھوں شہری ان کے جنازے میں شامل ہوئے جلوس کے ایک حصے نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ کچھ نعرے حکومت کے خلاف بلند ہوئے۔ کچھ نعروں میں "ایوب خان مردہ باد" کہا گیا۔ اس پر پولیس کی مشینری حرکت میں آئی اور لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے علاوہ گولی بھی چلائی گئی۔ مرنے والوں کی صحیح تعداد مصدقہ طور پر کبھی متعین نہیں ہوئی لیکن خون کی جس قدر مقدار بھی اس موقعہ پر بہائی گئی بلاشبہ اس نے صدر ایوب کے زوال کی راہ کو ہموار کرنے میں بدنصیبی کا چھڑکاؤ کیا۔ (۴۲)

پھر اگر تلہ سازش کیس، ایوب خان کی بیماری ... ۱۹۶۸ء میں صدر پاکستان نے امریکہ کو یہ نوٹس دیا کہ بڈبیر پشاور میں جاسوسی کے امریکی اڈے کو بند کر دیا جائے۔ اس اڈے سے ۱۹۶۰ء میں گیری پاورز نے اپنا رسوائے عالم جاسوسی جہاز یو- 2 اڑایا تھا جسے روس نے اپنی مملکت کی حدود میں مار گرایا تھا اور خرد شیف نے ماسکو میں، غیر ملکی اخباری نمائندوں کو بتایا کہ پشاور کے گرد سرخ دائرہ کھینچ دیا گیا ہے۔ امریکی انتظامیہ ابھی اس نوٹس پر ششدر تھی کہ کوسیگن کے دورہ پاکستان نے واشنگٹن کو اور بھی سراسیمہ کر دیا۔

۶۱ر سالہ ایوب خان جنوری ۶۸ء میں شدید بیمار پڑے اور دوبار ہونے والے ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں ان کا رابطہ اپنے سول افسروں سے کٹ گیا ... قصر صدارت کا محاصرہ کر لیا گیا اور کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان نے ایک نجی چوکی بٹھا دی تاکہ وہ صورت حال سے باخبر رہے۔ اس کی ہدایات کے مطابق "لب مرگ" صدر کا اس کے فوجی اور غیر فوجی ساتھیوں کے ساتھ رابطہ ختم ہو گیا۔ فوجی عملے کے چند مخصوص افراد کے علاوہ کسی اور شخص کو ایوان صدر میں داخل ہونے کی بالکل اجازت نہ تھی ... ان دنوں یہ خیال عام تھا کہ شاید راتوں رات کسی نوعیت کا ہنگامی انقلاب برپا ہو چکا ہے اور اب صدر ایوب معزول ہو کر ایوان صدر میں محبوس یا مقتول پڑے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں کہ اس روز صبح سویرے ایوان صدر کا ایک ڈرائیور محفوظ علی میرے پاس آیا... اس روز وہ گھبرایا ہوا اور کسی قدر پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے نہایت رازداری سے مجھے بتایا کہ رات بھر ایوان صدر میں قیامت کا سا سماں رہا ہے۔ بیگم ایوب سمیت سب بیٹے اور بیٹیاں غمگین، پریشان اور گم صم ہیں۔ ڈاکٹروں کے آنے جانے کا تانتا بندھا ہوا ہے ... چار دیواری کے سارے گیٹ بند کر کے قفل چڑھا دیئے گئے ہیں۔ جنرل یحییٰ اور ایڈمرل

اے آر خان بار بار آکر کچھ کھسر پھسر کرتے ہیں ... صاحب، ہمیں تو یہ بھی یقین نہیں کہ صدر صاحب زندہ ہیں، مر چکے ہیں یا مار ڈالے گئے ہیں۔ ہاں، ہم یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ صدر کے مکان پر اب چیف صاحب کا قبضہ ہے۔

بعد میں ساری افواہیں بے بنیاد ثابت ہوئیں۔ ایوب خان شدید علیل تھے اور یحییٰ خان اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے کسی لمحے کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دے رہا تھا۔ ان کی بیماری دنوں سے ہفتوں پر پھیل گئی تھی۔ بیماری سے افاقہ ہونے پر بھی انہیں کئی دن آرام کرنا تھا اور ۲۳ر مارچ کی سلامی ان کی جگہ ایڈمرل اے آر خان نے لی۔ بیماری سے اٹھتے ہی انہیں شدت سے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ ان کا اور ان کے اقتدار کا محافظ ان کا بنایا ہوا آئین اور تشکیل دی ہوئی قومی اسمبلی نہیں بلکہ ان کے اقتدار میں رہنے نہ رہنے اور جینے یا مرنے کا انحصار جنرل یحییٰ خان کے ایک اشارے پر ہے.... "جس آئین کے تحت انہوں نے صدارت کا حلف اٹھایا تھا۔ اس میں صاف طور پر درج تھا کہ بیماری کی صورت میں اگر مملکت کا سربراہ اپنے فرائض ادا کرنے سے معذور ہو جائے تو قومی اسمبلی کا سپیکر ان کی قائم مقامی کرے گا۔ صدر ایوب ڈیڑھ دو ماہ تک صاحب فراش رہے لیکن اس تمام عرصہ میں قومی اسمبلی کے سپیکر عبدالجبار خان سے کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ میاں تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ بیماری کے ابتدائی چند ایام میں جب صدر ایوب زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہے تھے، اس وقت جنرل یحییٰ ان کے تن بدن پر بنفس نفیس منڈلاتے رہے کہ جونہی یہ ٹھنڈا ہو تو وہ فوراً گدھ کی طرح اس پر جھپٹیں۔

ایوب خان صحت مند ہوئے تو ان کے اقتدار کا دس سالہ جشن شروع ہو چکا تھا... یہ جشن اپنے جلو میں مہنگائی اور اشیاء کی قلت لے کر آیا تھا۔ چینی کی راشن بندی نے وزیر تجارت نواب عبدالغفور خان ہوتی کو خوب رسوا کیا۔ عوام نے اسے محض "چینی چور" کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "عبدالغفور ہوتی .... ایوب خان دی کھوتی" جیسے آوازے بھی زبان زد عام ہو گئے۔ دس سالہ جشن نے عوام کی نفرت میں زبردست اضافہ کر دیا۔

اب پھر نقارے پر چوٹ پڑی ... ملک بھر کے عوام ایوب آمریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایوب کی بنائی ہوئی اسمبلیاں اسے بچانے میں ناکام رہیں ... فوج نے انہیں اپنی حمایت سے محروم کر دیا اب وہ سیاست دانوں کی طرف بڑھے۔ بھٹو کو میجر جنرل پیرزادہ سمیت جی ایچ کیو کے بعض عناصر کی پشت پناہی حاصل ہو چکی تھی۔ وہ جلسوں میں تاشقند کی "خفیہ کہانی" کا ذکر کرتے اور وعدہ فردا پر ٹال دیتے۔ عوام کے ہنگاموں کو کچلنے کے لئے فوج کو میدان میں اتار دیا گیا۔ جلد ہی یہ بات سامنے آگئی کہ فوجی افسر کسی "خفیہ ہدایت" کے تحت مظاہرین پر سختی نہیں کر رہے تھے۔۔ انہی دنوں شہر کی سڑکوں پر ایک اشتہار نظر آنے لگا۔ یہ ایک اپیل تھی، جس میں جنرل یحییٰ سے کہا گیا تھا کہ ملکی سلامتی کی خاطر یحییٰ خان کو اقتدار سنبھال لینا چاہیے۔ یہ کارنامہ

جنرل یحییٰ کے ایک قریبی دوست اور سٹینڈرڈ بنک کے مالک مسٹر علوی کا تھا۔ کھاریاں کی خانم کے سانحہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ خانم کو پولیس نے اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ اس سے چند روز قبل پشاور میں ایوب خان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ مشرقی پاکستان میں اگر تلہ سازش کیس کے ایک جج ایس اے رحمان کو ڈھاکہ سے ننگے پاؤں بھاگ کر ایئرپورٹ پہنچنا پڑا۔

ملک کے دونوں حصوں میں گلی گلی، شہر شہر ''ایوب کتا ہائے ہائے'' اور ''ایوب کتا مردہ باد'' کے نعرے لگ رہے تھے۔ ایک دن ایوب خان نے یہی نعرہ اپنے پوتے کو دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر لگاتے سنا تو وہ بالکل ٹوٹ گئے۔ (۴۳)

۲۵ر مارچ سے دو تین روز قبل پاکستان میں متعین امریکی سفیر واشنگٹن روانہ ہو گیا۔ ایک سفارتی تقریب میں قدرت اللہ شہاب نے ایک انگریز صحافی سے پوچھا ''پاکستان میں اس شدید بحران کے دوران یہ امریکی سفیر واشنگٹن کیا کرنے گیا ہے؟'' برطانوی صحافی نے مسکرا کر جواب دیا: ''کیوں نہیں؟ اقتدار کی منتقلی پر عملدر آمد سے پہلے واشنگٹن سے ''اوکے'' حاصل کرنا بھی تو لازمی ہے۔'' معلوم نہیں، اس کا یہ جواب فکاہیہ تھا یا سنجیدہ لیکن یہ حقیقت ہے کہ امریکی سفیر کے واپس آتے ہی ۲۵ر مارچ کو صدارت کی کرسی بدل گئی تھی .... اس سے تھوڑے دن قبل گول میز کانفرنس کا سوانگ رچایا جا رہا تھا۔ اس میں نہ حکومت سنجیدہ تھی، نہ سیاستدان۔ دونوں گروپوں نے یحییٰ خان کو آگے بڑھنے کا راستہ دے دیا۔ ملٹری انٹیلی جنس تو ان کے قبضے میں تھی ہی۔ سول انٹیلی جنس بھی بڑی حد تک ان کے کنٹرول میں تھی۔ انہوں نے سول اور ملٹری انٹیلی جنس کے ذریعے گول میز کانفرنس کو سبوتاژ کرا دیا۔ ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ء کو انہوں نے ایوب خان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو دس سال پہلے ایوب نے اسکندر مرزا کے ساتھ کیا تھا۔ اس روز صبح دس بجے ایوان صدر میں ایوب نے اپنا آخری پیغام ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے ریکارڈ کروایا۔ ریکارڈنگ کے دوران جنرل یحییٰ غمگین صورت بنائے ٹسوے بہانے کے انداز میں سر جھکائے بیٹھا رہا لیکن جونہی ریکارڈنگ کے ٹیپ ان کے قبضہ میں آگئے، ان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ وہ ہشاش بشاش، جھومتے جھامتے کمانڈر انچیف ہاؤس واپس آئے۔ اپنے چند لنگوٹیے دوستوں اور منظور نظر خواتین کو طلب کیا۔ شراب ناب کا دور چلا اور دیر تک سب نے ''ہے جمالو'' کی تان پر آپس میں مل جل کر دیر تک بھنگڑا ڈالا۔

صدر ایوب کی شخصیت چنار کے درخت کی طرح خوبصورت، تناور اور شاندار تھی لیکن گرتے وقت اس کا تنا کافی حد تک کھوکھلا ہو چکا تھا۔

ذاتی طور پر وہ نیکی، شرافت، عدل پسندی اور رحمدلی کے خوگر تھے۔ اقتدار میں آکر انہوں نے ایک محنتی طالب علم کی لگن سے اپنا کام سیکھا اور اس میں نمایاں مہارت حاصل کی۔ ان کی

رگ رگ میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خارجہ پالیسیوں میں نئے زاویے قبول کر کے انہوں نے دنیا بھر میں پاکستان کا وقار بلند کیا۔ اندرون ملک انہیں زرعی اور صنعتی اور تجارتی ترقی کو بام عروج تک پہنچانے کا جنون تھا۔ ان شعبوں میں انہوں نے اتنی کامیابی ضرور حاصل کی کہ بہت سے لوگ ان کے دور حکومت کو پاکستان کی مادی ترقی کا سنہری زمانہ کہتے ہیں۔

سیاست میں وہ ناکام رہے

تینوں مسلح افواج نے بڑی حد تک ان کا بھرپور ساتھ دیا لیکن اقتدار کے آخری ایام میں ان کے پروردہ چند بڑے افسران کے ساتھ بے وفائی کر گئے۔

اقتدار سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کے ایام نہایت خاموشی اور وقار سے گذارے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں ان کی اچھی اور خوشگوار یادیں ہمیشہ تازہ رہیں۔ اسلام آباد میں جب کبھی وہ عید کی نماز پڑھنے عید گاہ میں آتے تھے تو ایک بڑا ہجوم ان کے ساتھ گلے ملنے یا ہاتھ ملانے کے شوق میں انہیں گھیر لیتا تھا۔

ایک روز وہ راولپنڈی میں ایک کتابوں کی دکان سے باہر نکل رہے تھے تو کچھ طلباء نے انہیں گھیر لیا۔ ایک لڑکے نے کہا۔ "سر آپ دوبارہ صدارت کیوں نہیں سنبھالتے؟؟"

ایوب خاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بیٹا' اب ایوب کتنا بڈھا ہو گیا ہے"۔

کئی جگہ ٹیکسیوں کے اندر' بسوں کے اڈوں پر اور چھوٹی چھوٹی دکانوں میں اب تک ان کی تصویریں آویزاں نظر آ جاتی ہیں۔ جب کبھی وطن عزیز پر کسی خطرے کے بادل منڈلانے لگتے ہیں تو کئی دیہاتی علاقوں میں فوجی وردی میں ملبوس پاکستان کا علم بلند کئے ایوب خاں کی تصویر کے نیچے ایک فلمی گیت کے یہ بول درج ہوتے ہیں۔ "تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد!" (۴۴)

فیلڈ مارشل ایوب خان نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے گوہر ایوب خان کو اپنا سیاسی جانشین بنانے کے لئے تیاری شروع کر دی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ حالات اتنے خراب ہوئے کہ ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

ایوب خان جب صدارت پر فائز ہوئے تو بری فوج کی طرف سے ان کے بیٹے کیپٹن گوہر ایوب بطور اے ڈی سی تعینات ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد گوہر ایوب خان نے پاک فوج سے ریلیز لے لی اور نجی کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ ان کی جگہ ایوب خان کے دوسرے صاحبزادے کیپٹن ڈاکٹر اختر ایوب نے لے لی اور وہ اپنے والد کے اے ڈی سی بن کر ایوان صدر تشریف لے آئے۔ تھوڑے دن بعد انہوں نے بھی فوج سے ریلیز لے لی اور کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ ایوب خان کے دوسرے دو لڑکے شوکت ایوب خان اور طاہر ایوب خان ان دنوں زیر تعلیم تھے انہوں نے بھی تعلیم مکمل کر کے فوج کی طرف رخ نہ کیا۔ (۴۵)

ایوب خان کا اپنے دونوں بیٹوں کو یکے بعد دیگرے فوج سے نکال کر کاروبار میں جھونک دینا

کوئی معمولی قدم نہ تھا۔ اس کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے اور یہ سودا ایوب خان کو بڑا مہنگا پڑا۔ (۴۶) جس شخص کا پشتوں سے پیشہ آباسپہ گری رہا ہوا۔ جس نے مملکت خداداد پاکستان کے پہلے پاکستانی سپہ سالار ہونے کا بلند ترین اعزاز حاصل کیا ہو جس نے اپنے خون پسینے سے بری فوج جیسے مقدس ادارے کی آبیاری کی ہو اور جو صرف اور صرف اپنے فوجی عہدے کی بدولت صدر پاکستان کے بلند ترین منصب پر پہنچا ہو وہ اپنے لڑکوں کو عین عالم شباب میں' جب وہ تقریباً پچیس یا چھبیس برس کے ہوں اور صرف چار پانچ سال کی سروس کی ہو فوج سے ریلیز کر کے نجی کاروبار میں لگا دے' ناقابل فہم ہے۔ والد کے صدر پاکستان بن جانے کے بعد اولاد کے لئے فوج سے وابستگی کیا مقدس پیشہ نہیں رہا تھا؟ صدر پاکستان کے لڑکوں کا فوج میں رہنا غیر محفوظ یا غیر منافع بخش ہو گیا تھا؟ ایک کیڈٹ کی تعلیم و تربیت پر حکومت کا زر کثیر خرچ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام حالات میں اتنی کم سروس کے بعد فوج سے ریلیز لینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اگر صدر پاکستان کے علاوہ کسی عام شہری کے لڑکے ہوتے تو کیا وہ بھی یوں آسانی سے ریلیز حاصل کر سکتے تھے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب صدر ایوب خان نے عہد صدارت میں یا باقی ماندہ زندگی میں کبھی نہ دیا۔ خود تو جنرل کے عہدے سے فیلڈ مارشل بن گئے مگر اپنی اولاد کو فوج سے نکل جانے کی اجازت دی' بلکہ نکال لیا۔ ان کے صدر بننے کے بعد یہ پہلی لغزش تھی جو ان سے سرزد ہوئی اور جس کی انہیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ (۴۷)

گوہر ایوب خان کی شادی لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی (جنرل حبیب اللہ خاں خود بھی پاکستان کے ایک بڑے سیاسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں ان کا تذکرہ ان کے اپنے خاندان (خٹک خاندان) کے ذیل میں بالتفصیل درج کیا گیا ہے) گوہر ایوب خان کو پاکستان کے وزیر خزانہ ایم شعیب نے امریکہ کی مشہور فرم جنرل موٹرز کی ایجنسی لے دی۔ یوں سسر داماد نے مل کر گندھارا موٹرز کے نام سے کاروبار شروع کر دیا۔ گندھارا موٹرز جلد ہی گندھارا انڈسٹریز میں تبدیل ہو گئی اور مالکان کا شمار ملک کے امیر ترین خاندانوں میں ہونے لگا۔ (۴۸) ۱۹۷۲ء میں شائع ہونے والی کتاب ۲۲ خانوادے میں گندھارا گروپ امارت کے لحاظ سے دسویں نمبر پر تھا۔ (۴۹) اگست ۱۹۹۰ء میں ماہنامہ بینکاری کراچی میں شائع ہونے والے ایک آرٹیکل "پاکستان کے ۲۵ امیر ترین خاندان" میں بھی یہ گروپ اپنی اسی پوزیشن پر موجود ہے۔ (۵۰)

نومبر ۱۹۶۷ء میں ایوب خان نے کئی سرکاری/نیم سرکاری محکموں کو اس مضمون کے خطوط لکھے کہ اگر ان کے افراد خاندان کسی قسم کے مراعات یا فوائد کے لئے انہیں اپروچ کریں تو اس کی انہیں فوراً اطلاع دی جائے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس طرح کی ہدایت سے کیا فرق پڑ سکتا تھا جبکہ ایوب خان اور ان کا خاندان مالی بے قاعدگیوں کے حوالے سے انتہائی بدنام ہو چکا تھا۔ اقتدار

کے ساتھ ساتھ ان کی پیسے کی ہوس اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اقتدار سے ہٹنے سے تقریباً ایک سال قبل جب وہ انگلینڈ کے دورے پر گئے تو وہ نئے نئے اپنی بیماری سے اٹھے تھے۔ راؤ عبدالرشید راوی ہیں کہ اس وقت گوہر ایوب بھی ان کے ساتھ تھے۔ الطاف گوہر بھی تھے۔"لندن سے باہر کنٹری سائیڈ پر جگہ تھی۔ وہاں انتظام کیا گیا تھا وہاں اسلحہ کا ایک بڑا مشہور انٹر نیشنل فیم کا ڈیلر تھا... ایوب خان کی اس سے گفت و شنید چل رہی تھی۔ کچھ پاکستان کے جو ٹینک وغیرہ تھے' ان کے متعلق بھی سلسلہ چل رہا تھا۔ اس سارے سلسلے میں گوہر ایوب صاحب پیش پیش تھے۔ کوئی کمیشن وغیرہ کا چکر تھا تو اس سے انسان کو بڑی نفرت ہوتی تھی کہ اس شخص کو ملک میں سب سے بڑا عہدہ حاصل ہے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے لیکن اس بیماری کی حالت میں بھی یہ خیال ہے کہ اس سودے میں اس کے بیٹے کو کیا مل سکتا ہے۔"

جب ایوب خان اپنے عہدے سے برطرف ہوئے تو ڈاکٹر فرانز پک کے تخمینے کے مطابق وہ دس سے بیس ملین ڈالر تک دولت کے مالک تھے۔ ڈاکٹر پک کا یہ محتاط تخمینہ ۶۹ ـ ۱۹۵۸ء کے عرصہ کے لئے اتنا کم بھی نہیں تھا۔ گوہر ایوب نے اس سلسلے میں جو تگ و دو کی اس کے نتیجے میں وہ جولائی ۱۹۶۸ء کے اختتام پر کئی اداروں کے چیئرمین' ایم ڈی اور ڈائریکٹر تھے۔ فیلڈ مین کی اطلاعات کے مطابق وہ عروسہ انو یسٹمنٹ لمیٹڈ' عروسہ انڈسٹریز لمیٹڈ اور ہاشمی کین کمپنی لمیٹڈ کے چیئرمین' گندھارا انڈسٹریز لمیٹڈ' گندھارا انڈسٹریز کے مینجنگ ایجنٹس' گوہر حبیب لمیٹڈ کے ایم ڈی اور گندھارا منرل اینڈ ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ اور جانانہ ڈی مالوچو ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کے ڈائریکٹر تھے۔ اور ان کی مجموعی دولت ۴ ملین ڈالر کے لگ بھگ تھی۔ (۵۱)

گوہر ایوب خان نے اپنے والد کی زندگی ہی میں عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا تھا۔ ۱۹۶۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس انتخاب میں انہوں نے پاکستان بھر میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ (۵۲)

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ تاہم ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان قومی اتحاد کے ٹکٹ پر این اے ۱۴ ایبٹ آباد ۳ سے الیکشن لڑا اور تقریباً چالیس ہزار ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی۔ (۵۳)

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں گوہر ایوب خان نے ایک بار پھر اسی حلقہ سے انتخاب لڑا اور راجہ سکندر زماں کو شکست دے کر کامیابی حاصل کی۔ (۵۴)

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں گوہر ایوب خاں اور راجہ سکندر زماں میں نہ صرف صلح ہو گئی بلکہ گوہر ایوب ان کے حق میں مقابلے ہی سے دستبردار ہو گئے چنانچہ نتیجہ راجہ سکندر زماں کی کامیابی کی صورت میں نکلا۔ (۵۵)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں گوہر ایوب این اے ۱۳ ایبٹ آباد ۳ سے آئی جے آئی کا ٹکٹ

حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے مد مقابل پی ڈی اے کے عمر اصغر خاں تھے۔ گوہر ایوب نے عمر اصغر خاں کو تقریباً ۲۲ ہزار ووٹوں سے شکست دی (۵۶)

ان انتخابات میں کامیابی کے بعد انہوں نے قومی اسمبلی کے اسپیکر کا انتخاب لڑا۔ انہیں آئی جے آئی کی حمایت حاصل تھی۔ جس کے باعث وہ باسانی قومی اسمبلی کے اسپیکر منتخب ہو گئے (۵۷) نواز شریف کے دور حکومت میں جب جناب گوہر ایوب قومی اسمبلی کے اسپیکر تھے۔ ان کا کیا سیاسی کردار رہا اس سلسلہ میں جناب اظہر سہیل اپنی کتاب "ایجنسیوں کی حکومت" میں لکھتے ہیں:

"قومی اسمبلی کے اسپیکر گوہر ایوب خان بھی اپنی جگہ ایک عجیب کردار تھے اور واقعہ یہ ہے کہ قومی بحران کو تخلیق کر کے اسے بڑھاوا دینے میں گوہر ایوب خان کا کردار اپنی جگہ یادگار اہمیت کا حامل ہے۔ شروع شروع میں تو انہوں نے کوشش کی کہ بے نظیر بھٹو اور وزیر اعظم نواز شریف کے درمیان مصالحت کے چیمپئن بن کر اپنے لئے صدارت کی راہ ہموار کریں' پھر جب جنرل آصف نواز چیف آف آرمی شاف بنے تو گوہر ایوب پر اچانک انکشاف ہوا کہ جنرل آصف نواز ان کے بچپن کے دوست ہیں' اور قومی اسمبلی کی تاریخ میں یہ تاریخ ساز واقعہ ہوا کہ قومی اسمبلی کے اسپیکر کیپٹن گوہر ایوب خان نے چیف آف آرمی شاف کے اعزاز میں پارلیمنٹ ہاؤس کے اندر استقبالیہ دیا' جس میں مسلح افواج کے تمام اعلیٰ علیین نے شرکت کی۔ پھر یہ تماشا بھی ہوا کہ اسپیکر نے اپنے گاؤں ہری پور میں وزیر اعظم کے اعزاز میں جلسہ برپا کر کے آبائی گاؤں کا نام تبدیل کرنے اور اسے ہری پور کی بجائے "شریف پورہ" قرار دینے کا اعلان کر دیا۔ اپنی تقاریر میں پارلیمنٹ کی بالادستی کا راگ الاپنے والے اسپیکر کے یہ تمام اقدامات صرف ایک ہی بات کے لئے ان کی بے چینی کے مظہر تھے اور وہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح انہیں پاکستان کا صدر بنا دیا جائے۔ اس حوالے سے ان کے واحد رقیب ظاہر ہے کہ غلام اسحاق خان تھے جن کے خلاف کسی بھی اقدام کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے اسلام آباد کے پارلیمنٹ کو ایوان صدر کے قدموں میں جگہ دی گئی اور اس کا صدر دروازہ ایوان صدر کے داخلی دروازہ کے ساتھ مشترک رکھا گیا۔ اس سے ایوب خان کا مقصد جو بھی ہو مگر آخر کار یہ روایت تشکیل پائی کہ جب کبھی صدر مملکت کو رسمی انداز میں پارلیمنٹ ہاؤس آنا ہو تو ان کی بگھی' ایوان صدر کے اس داخلی دروازہ سے گزر کر آتی جو پارلیمنٹ ہاؤس کی پشت پر کھلتا تھا' اور پارلیمنٹ ہاؤس کے صدر دروازہ کے عین سامنے واقع ہونے کے باعث ایوان صدر والے اسے روزمرہ استعمال کے لئے بھی جائز تصور کرتے تھے۔ ایک روز ایوان صدر کے دروازہ سے صدر مملکت کے اہل خانہ کی گاڑیاں نکل رہی تھیں جن کے لیے اسپیکر گوہر ایوب کی گاڑی کو چندے توقف کرنا پڑا اور یہ توقف گویا قیامت ہو گیا۔ گوہر ایوب خان نے اگلے ہی روز حکم نکال دیا کہ ایوان صدر والوں کا

پارلیمنٹ کے صدر دروازہ سے داخلہ یا خروج بند کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ "فرمان امروز" بھی جاری کر دیا کہ ایوان صدر کے عملہ کو روکنے کے لئے پارلیمنٹ کے سارجنٹ ایٹ آرمز اپنے عملہ کو صدر دروازہ پر متعین کر دیں جو کسی بھی ممکنہ خلاف ورزی کرنے والے کو بہ زور روک کر واپس بھجوا دے۔ چیئر مین سینٹ وسیم سجاد کو اس شاخسانہ کا علم ہوا تو انہوں نے حکم جاری کیا کہ پارلیمنٹ ہاؤس کا صدر دروازہ صرف قومی اسمبلی جاگیر نہیں بلکہ اس پر سینٹ کا بھی اتنا ہی حق ہے اور وہ بطور چیئر مین سینٹ یہ حکم دیتے ہیں کہ ایوان صدر والوں کو بھی یہ دروازہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس کے بعد اسپیکر نے وزارت داخلہ سے مدد چاہی کہ وہ خلاف ورزی کے مرتکب ہونے والے کی راہ میں مزاحم ہونے کے لئے پولیس فورس فراہم کریں۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ایوان صدر کی طرف سے اس دروازہ کو عام طور پر فوج کے ان دستوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا ــــــ جو صدر مملکت کی مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کے طور پر حفاظت کے لئے متعین تھے۔ یوں ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ سول اور عسکری قوتوں میں تصادم کا خدشہ بھی پیدا ہوا۔ جس کے بعد ایوان صدر نے قومی اسمبلی کے سیکرٹری جنرل کو طلب کر کے تمام ضوابط کار ان کے سامنے رکھے اور بتایا کہ گوہر ایوب خان اس قسم کے احمقانہ احکامات جاری کرنے کے مجاز نہیں۔ گوہر ایوب خان چونکہ صدر مملکت کے قریبی رشتہ دار بھی تھے اور صدر مملکت کے داماد انور سیف اللہ کے چھوٹے بھائی اقبال سیف اللہ گوہر ایوب کے داماد تھے۔ اس لئے انہوں نے جب معاملہ کو حد سے بڑھتے دیکھا تو سیدھے ایوان صدر گئے اور صدر غلام اسحاق خان کو بتایا کہ یہ حکم قومی اسمبلی کے عملہ نے محض حماقت کی بناء پر جاری کر دیا تھا۔ جس کا خود انہیں بعد میں علم ہوا۔ اس موقع پر گوہر ایوب خان نے باقاعدہ طور پر روتے ہوئے صدر غلام اسحاق خان سے کہا، "آپ میرے بزرگ ہیں، جنہیں میں اپنے والد کے برابر سمجھتا ہوں، میرے والد فیلڈ مارشل ایوب خان آپ کا بہت احترام کیا کرتے تھے، ایک روز میں ان کی پرانی ڈائریاں دیکھ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی ایک ڈائری میں بھی آپ کے تدبر اور حب الوطنی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے...... میں بھلا آپ کی توہین کے بارے میں سوچ بھی کیسے سکتا ہوں" بعد میں گوہر ایوب خان نے اپنے والد مرحوم کی مذکورہ ڈائری کے مندرجات صدر مملکت کی صاحبزادی کو بھی دکھائے۔

یوں پارلیمنٹ کے صدر دروازہ کا وہ تنازعہ ختم ہوا جو گوہر ایوب خان کی سُپر سمجھ داری کے باعث ایک باقاعدہ قومی بحران کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی ان کی وارداتیں اور گھاتیں جاری رہیں، اپوزیشن کے ساتھ ان کا رویہ کبھی سرتاپا فولاد ہوتا کبھی سرتاسر ریشم۔ جاہ پرستی کی خواہش اور ہوس نے انہیں اتنا مغلوب کر رکھا تھا کہ وہ خود بھی اپنے رویہ کی کوئی توجیہہ شاید کر پاتے۔ اپنی گاڑی کے لیے گوجرانوالہ کی ضلعی انتظامیہ پر پورا دباؤ ڈلوا کر "گوجرانوالہ ون" یعنی جی اے کے ون نمبر لینے والے گوہر ایوب خان کو گوہر ایوب خان نمبر

ون بننے کی آرزو کسی بھی طور پر چین نہ لینے دیتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہیں ایوان کے اندر اپنے بدلتے ہوئے رویوں کے باعث اپوزیشن کی طرف سے کبھی کبھی ایسی سخت سست کا سامنا کرنا پڑتا کہ الامان والحفیظ' ان کی طبیعت کا احوال اپنے اندر عجیب پیغمبری انداز لیے ہوئے تھے اور وہ اس شعر کا نقشہ بن کر رہ گئے تھے کہ۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم

گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

وہ روزنت نئے احکام جاری کرتے۔ کبھی اخبار نویسوں سے شکایت پیدا ہوتی کہ وہ ان کی طرف پاؤں کر کے کیوں بیٹھتے ہیں' کبھی انہیں اپنے ہی ساتھیوں سے گلہ ہوتا کہ وہ ان کی مناسب تکریم کیوں نہیں کرتے' حالانکہ اصل خرابی ان کی طبیعت میں تھی جس کی بوقلمونی' کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آسکی۔

فی الجملہ وہ قومی اسمبلی کی تاریخ کا ایک عجیب وغریب کردار تھے (۵۸) گوہر ایوب خان پاکستان کے صدر تو نہ بن سکے تاہم ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر این اے ۱۳ ہری پور سے قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوگئے (۵۹) اور قومی اسمبلی میں ڈپٹی اپوزیشن لیڈر کے منصب پر بھی فائز ہوگئے۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں گوہر ایوب خان نے قومی اسمبلی کے انتخابات میں ایک مرتبہ پھر کامیابی حاصل کی۔ اس مرتبہ وہ وزیر خارجہ اور پانی اور بجلی کے وزیر کے منصب پر فائز رہے۔(۶۰)

۱۹۹۹ء میں میاں نواز شریف کی معزولی کے بعد گوہر ایوب خان قائداعظم مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ گریجویشن کی شرط کی وجہ سے حصہ نہ لے سکے۔ انہوں نے اپنی نشست پر اپنے صاحبزادے عمر ایوب خان کو انتخاب لڑوایا جو این اے ۱۹ ہری پور سے قائداعظم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر محمد صابر شاہ کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۶۱) ان انتخابات کے بعد خواتین کی مخصوص نشستوں پر وہ اپنی اہلیہ زیب گوہر ایوب کو بھی قومی اسمبلی کا رکن بنوانے میں کامیاب ہوگئے زیب گوہر ایوب' جنرل حبیب اللہ خٹک کی صاحبزادی اور اسلم خٹک' یوسف خٹک اور کلثوم سیف اللہ کی بھتیجی ہیں۔(۶۲)

گوہر ایوب خاں کے چھوٹے بھائی اختر ایوب مرحوم نے ۱۹۶۵ء میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور ہزارہ ۳ سے مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۶۳) ان کی صاحبزادی کی شادی سینیٹر امیر عبداللہ روکڑی کے صاحبزادے عامر حیات روکڑی سے ہوئی جو ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں حلقہ پی پی ۳۷ میانوالی ۳ سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب

ہوئے۔ انہیں آئی جی آئی کی حمایت حاصل تھی۔ (۶۴)

۱۹۸۸ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان کے پوتے اور شوکت ایوب مرحوم کے صاحبزادے یوسف ایوب خان نے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ انہوں نے پی ایف ۴۰ ایبٹ آباد ے سے انتخاب لڑا اور ۱۸۳۲۴ ووٹ لے کر اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ (۶۵) ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا تاہم ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر پی ایف ۴۰ ہری پور ۲ سے سرحد اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۶۶) یوسف ایوب خان ۱۹۹۷ء میں بھی اسی نشست پر کامیاب ہوئے (۶۷) تاہم ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ قاضی محمد اسد سے تقریباً پانچ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۶۸) ۲۰۰۵ء میں انہوں نے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا اور ایک سخت مقابلے کے بعد ہری پور کے ضلعی ناظم منتخب ہو گئے۔ انہیں وطن نواز پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ (۶۹)

فیلڈ مارشل ایوب خاں کے چھوٹے صاحبزادے طاہر ایوب عملی سیاست سے تو دور دور ہی رہے مگر رشتوں کے حوالے سے وہ بھی کئی سیاستدانوں سے وابستہ رہے ہیں۔ صاحبزادہ فیض الحسن ان کے سسر ہیں اور غلام احمد بلور ان کے سمدھی ہیں۔

گوہر ایوب کے ماموں زاد بھائی اختر نواز خان بھی عملی سیاست کے میدان میں ہیں۔ ۱۹۸۵ء کے انتخاب میں صوبہ سرحد سے سینٹ کے رکن منتخب ہوئے (۷۰) ان کی ایک صاحبزادی کی شادی چوہدری ظہور الٰہی کے چھوٹے بیٹے چودھری وجاہت حسین سے ہوئی۔ جب کہ صوبہ سرحد کے ممتاز سیاسی رہنما امان اللہ جدون ان کے بہنوئی ہیں۔

سردار بہادر خان اور فیلڈ مارشل ایوب خان کے ایک بھائی میجر سلطان احمد خان تھے جو ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۷۱)

ترین خاندان کے ایک اور فرد میجر (ریٹائرڈ) حبیب اللہ ترین ہیں۔ جو ۱۹۹۰ میں سرحد اسمبلی کے رکن اور بعدازاں اسپیکر منتخب ہوئے۔ انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت حاصل تھی۔ (۷۲) ۱۹۹۳ء میں نواز شریف اور غلام اسحٰق خان کی جنگ میں انہوں نے غلام اسحٰق خان کی لابی کا ساتھ دیا تھا۔ (۷۳)

حوالہ جات

۱۔ محمد ایوب خان، جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔ ترجمہ غلام عباس۔ اسلام آباد۔ ص ۴، ۵

۲۔ تہور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان۔ ۶۱۔ ۱۹۶۰ء۔ ص ۹۲

۳۔ کے ایچ چوہان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۱۵۲

۴۔ نریش کمار جین۔ مُسلم ان انڈیا۔ جلد اول ۔ نئی دہلی۔ ص ۱۱۵
۵۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد، پشاور۔ ص ۶۴۹
۶۔ نریش کمار جین۔ مُسلم ان انڈیا۔ جلد اول۔ نئی دہلی۔ ۱۱۵
۷۔ محمد فاروق قریشی۔ پاکستان جمہوریت کا زوال۔ لاہور۔ ص ۱۶۱
۸۔ ایضاً۔ ص ۱۶۱۔۱۶۲
۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۸ اپریل ۱۹۵۶ء
۱۰۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد پشاور۔ ص ۵۰۔۶۴۹
۱۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۶۸
۱۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۳ء
۱۳۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد پشاور۔ ص ۶۵۰
۱۴۔ ایضاً ص ۶۳۳
۱۵۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۸ ستمبر ۱۹۵۰ء
۱۶۔ محمد ایوب خان۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی ۔ ترجمہ غلام عباس۔ اسلام آباد۔ ص ۶۰
۱۷۔ ایضاً۔ ص ۳۱۹، ۳۲۰
۱۸۔ م۔ ب۔ خالد۔ ایوان صدر میں سولہ سال۔ لاہور۔ ص ۱۱۵
۱۹۔ محمد ایوب خان۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی ۔ ترجمہ غلام عباس۔ اسلام آباد۔ ص ۳۰۷، ۳۰۸
۲۰۔ احمد سلیم۔ ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیورو کریسی۔ لاہور۔ ص ۲۲۰ تا ۲۲۲
۲۱۔ محمد ایوب خان۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی ۔ ترجمہ غلام عباس۔ اسلام آباد۔ ص ۹۲
۲۲۔ م۔ ب۔ خالد۔ ایوان صدر میں سولہ سال۔ لاہور۔ ص ۱۱۷، ۱۱۸
۲۳۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۵۰ تا ۵۳
۲۴۔ احمد سلیم۔ ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیورو کریسی۔ ص ۲۵۶، ۲۵۷
۲۵۔ م۔ ب خالد۔ ایوان صدر میں سولہ سال۔ لاہور۔ ص ۱۱۸
۲۶۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۵۰
۲۷۔ سید نور احمد۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ لاہور۔ ص ۵۱۷، ۵۱۸
۲۸۔ احمد سلیم۔ ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیورو کریسی۔ ص ۲۵۶
۲۹۔ محمد ایوب خان۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی ۔ ترجمہ غلام عباس۔ اسلام

آباد۔ص ۹۷، ۹۸
۳۰۔ ایضاً۔ص ۱۱۶، ۱۱۷
۳۱۔ فیروز خان نون۔ چشم دید۔ لاہور۔ص ۴۳۷
۳۲۔ محمد اصغر خان۔ جنرلز ان پالیٹکس۔ دہلی۔ص ۷
۳۳۔ قدرت اللہ شہاب۔ شہاب نامہ۔ لاہور۔ص ۶۹۶
۳۴۔ م۔ب۔خالد۔ ایوان صدر میں سولہ سال۔ لاہور۔ص ۱۲۵
۳۵۔ محمد ایوب خان۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی ۔ ترجمہ غلام عباس۔ اسلام آباد۔ص ۱۲۸، ۱۲۹
۳۶۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۲۹ جون ۱۹۷۰ء ص ۷ / ۱۳ جولائی ۱۹۷۰ء ص ۱۸
۳۷۔ مشتاق مرزا۔ ایوب خان تخت نشینی سے تختہ الٹنے تک۔ کراچی۔ص ۷۵ تا ۷۸
۳۸۔ قدرت اللہ شہاب۔ شہاب نامہ۔ لاہور ص ۸۱۷
۳۹۔ ایضاً۔ص ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۴
۴۰۔ احمد سلیم ۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ص ۷۷ تا ۷۹
۴۱۔ قدرت اللہ شہاب۔ شہاب نامہ۔ لاہور ص ۸۲۷ تا ۸۳۴
۴۲۔ ایضاً۔ص ۹۶۵ تا ۹۷۰
۴۳۔ احمد سلیم۔ ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں۔ لاہور۔ص ۲۷۵ تا ۲۸۰
۴۴۔ قدرت اللہ شہاب۔ شہاب نامہ۔ لاہور۔ص ۹۹۰ تا ۹۹۲
۴۵۔ م۔ب۔خالد۔ایوان صدر میں سولہ سال۔ لاہور۔ص ۱۳۹
۴۶۔ ایضاً۔ص ۱۳۷
۴۷۔ ایضاً۔ص ۱۴۰، ۱۴۱
۴۸۔ ایضاً۔ ۱۳۲، ۱۳۷
۴۹۔ اے آر شبلی۔ ۲۲ خانوادے۔ لاہور۔ص ۴۳
۵۰۔ ماہنامہ بینکاری کراچی۔ اگست ۱۹۹۰ء
۵۱۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ص ۸۴
۵۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۶۵ء
۵۳۔ کے ایچ چوہان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ص ۱۷۴
۵۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء اسلام آباد ص ۲۴۳۹
۵۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ص ۶۸
۵۶۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰۔ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ص ۹

۵۷۔ موسیٰ خان جلالزئی۔ کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟ لاہور۔ ص ۴۸۳

۵۸۔ اظہر سہیل۔ ایجنسیوں کی حکومت۔ لاہور۔ ص ۹۸ تا ۱۰۰

۵۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۴۹

۶۰۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۴۰۰

۶۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۸۹۱

۶۲۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان ص ۴۰۱' ۴۰۲

۶۳۔ ایم آئی صدیقی رزم۔ ہمارے نمائندے۔ لاہور۔ ص ۵۸

۶۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم ص ۱۷۷

۶۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۷۲۰

۶۶۔ ایضاً۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۶۰

۶۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۵۸۶

۶۸۔ دی گزٹ آف پاکستان اسلام آباد۔ ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۳۱۴۸

۶۹۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۷۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۷۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵۔ لاہور۔ ص ۳۱۴

۷۱۔ محمد شفیع صابر۔ مشاہیر سرحد۔ پشاور۔ ص ۵۰۳

۷۲۔ ڈوگر برادرز۔ پاکستان اور دنیا میں کون کیا ہے؟ لاہور۔ ص ۱۹

۷۳۔ طارق سعید۔ اور یہ بھی ارباب ہیں۔ ہفت روزہ حرمت' اسلام آباد۔ ۱۴ تا ۲۰ مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۹۔

تنولی

مانسہرہ کا تنولی یا تناولی خاندان عملی سیاست میں ۱۹۸۵ء سے پہلے غیر معروف تھا لیکن ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۳ء تک چاروں عام انتخابات میں اس خاندان کے نوابزادہ صلاح الدین سعید تنولی نے کامیابی حاصل کر کے، سیاسی مبصرین کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی ہے۔

نوابزادہ صلاح الدین سعید کا تعلق نوابان امب کے خاندان سے ہے۔ ان کے خاندان نے سات پشتوں تک علاقہ تناول پر حکمرانی کی۔ یہ علاقہ ایبٹ آباد اور مانسہرہ کے شمال مغرب میں واقع ہے اور اپر تناول اور لوئر تناول دو حصوں میں منقسم ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اس قوم کا قدیم مسکن افغانستان کے صوبہ کابل اور غزنی کے مابین درہ تناول کے اردگرد کا علاقہ جہاں سے امیر سبکتگین اور سلطان محمود کے ہمراہ تنولی وارد ہندوستان ہوئے اور موجودہ علاقوں میں رہائش اختیار کرلی۔ اپنے دو بڑے سرداروں (ہندو خان اور پال خان) کے نام پر اس قبیلہ کی شاخیں ہندوال اور پلال کے نام سے موسوم ہوئیں مغلیہ سلطنت کے زوال کے دنوں میں خان ہیبت خان ہندوال قبیلے کا سربراہ تھا۔ جو ۱۸۳۰ء میں فوت ہوا۔ اس کی جگہ نواب خان نے سنبھالی۔ ان دنوں ہزارہ ولایت کشمیر کا ایک حصہ تصور ہوتا تھا اور عظیم خان درانی گورنر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ نواب خان کے تعلقات پہلے پہل تو درانی گورنر سے بڑے خوشگوار تھے لیکن بعد میں دوستی دشمنی میں بدل گئی۔ عظیم خان درانی جب سکھوں سے شکست کھا کر کابل کو جا رہا تھا تو اس نے نواب خان کو کسی بہانے اپنے پاس بلایا، اسے قیدی بنالیا اور پھر ایک کشتی میں بٹھا کر جہانگیرہ کے نواح میں لے گیا اور دریائے لنڈہ میں پھینک دیا۔ یہ سانحہ ۱۸۱۷ء میں پیش آیا۔

نواب خان کے بعد زمام ریاست پائندہ خان تنولی کے ہاتھ آئی۔ اس نے اپنے اقتدار کو مضبوط کیا اور دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ سارے تناول کا مطلق العنان حاکم بن گیا۔ پائندہ خان نے اپنے ملازموں اور زر پرست لوگوں کی مدد سے اپنے تمام ہم قوم آدمیوں کے حقوق چھین لئے

اور ان کو اپنا مزارعہ بنا لیا۔ جن افراد نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی انہیں دریائے سندھ میں ڈبو دیا۔ (۲)

پائندہ خان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مشہور سکھ جرنیل سردار ہری سنگھ نلوہ (جو ان دنوں ہری پور ہزارہ میں مقیم تھا) نے بار بار پائندہ خان پر حملے کئے لیکن اسے دبا نہ سکا۔ اسی اثنا میں تحریک مجاہدین کا غلغلہ بلند ہوا۔ تاہم پائندہ خاں نے اس اسلامی تحریک کا ساتھ نہ دیا۔ بلکہ مجاہدین کے خلاف محاذ آرا ہوا۔ ایک معرکہ میں پائندہ خان کو شکست ہوئی اور امب دربند مجاہدین کے تسلط میں آ گئے۔

انقلابات زمانہ دیکھئے کہ وہی پائندہ خاں جو کل تک سکھوں کے خلاف شمشیر برہنہ بنا ہوا تھا اب اپنے انہی دشمنوں سے مدد مانگنے پر مجبور ہو گیا۔ سکھوں نے اس شرط پر پائندہ خان کا ساتھ دینا منظور کیا کہ وہ اپنے بیٹے جہانداد خاں کو ضمانت کے طور پر سکھوں کے حوالے کر دے گا۔ پائندہ خان نے بادل ناخواستہ یہ شرط بھی منظور کر لی۔ ادھر تناول میں بہت سے افراد نے پائندہ خان کے بھائی مدد خان کی سرکردگی میں (جو پائندہ خان کا مخالف تھا) مجاہدین کا ساتھ دیا۔ سکھوں نے سردار ہری سنگھ نلوہ کی سرکردگی میں اپنی فوج بھیرڑہ روانہ کی۔ پائندہ خان بھی سکھوں کے ہمراہ تھا۔ چونکہ سکھ سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ جدید اسلحہ سے لیس تھے اس لئے میدان جنگ انہی کے ہاتھ رہا مجاہدین آزادی جو مولوی احمد علی کی قیادت میں لڑ رہے تھے کثیر تعداد میں شہید ہوئے۔ اس لڑائی کے نتیجے میں پائندہ خاں اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا (۳)

جونہی پائندہ خان کو طاقت حاصل ہوئی۔ اس نے حکمت عملی سے سکھوں سے اپنا بیٹا جہاں داد بھی آزاد کروا لیا اور دوبارہ سکھوں سے نبرد آزما ہو گیا (۴) پائندہ خان نے ۱۸۴۰ء میں وفات پائی اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جہاں داد خاں اس کا جانشین بنا۔ (۵)

جہانداد خاں اگرچہ اپنے باپ کے برابر صاحب ہمت اور طاقت ور نہ تھا پھر سکھوں سے مسلسل نبرد آزما رہا۔ تاہم ۱۸۴۶ء کے فساد میں اس نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے سکھوں کی ان فوجوں کی جو اس کے علاقے کے قلعوں میں تھیں، جان بچائی۔ جس کے نتیجے میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے اسے چھ ہزار روپے کی جاگیر عطا کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران جہاں داد خان نے کھل کر انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس نے اپنے علاقے میں مسلسل امن قائم کئے رکھا اور لڑائی کے واسطے انگریزوں کو سپاہی بھی فراہم کئے۔ ایسے وقت میں جب عوام الناس، انگریزوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے فقط اشارے کے منتظر تھے۔ جہاں داد خاں کے اطوار اور رفاقت نے انگریزوں کو بڑی قوت بخشی۔ ۱۸۵۸ء میں بھی، جب انگریزوں نے سر سڈنی کاٹن کے حکم پر ستانا کے پرجوش سیدوں اور ہندوستانیوں پر

یورش کی تو جہاں داد خاں اپنی قوم کے ساتھ سرکاری فوج میں شامل تھا۔ انگریزی فوج کے جرنیل نے اپنے خطوط میں اس کی خدمات کا جابجا شکریہ ادا کیا ہے (٦)

جہاں داد خاں نے ٦ر نومبر ۱۸۵۸ء کو وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا اکلوتا بیٹا محمد اکرم خاں، جس کی عمر اس وقت فقط نو برس تھی، اس کا جانشین ہوا۔ یہ خدشہ تھا کہ پائندہ خان کا چھوٹا بھائی جو پھلڑا کا خان تھا نوابی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن انگریزوں نے اس خطرہ کا سدباب کر دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ پائندہ خان کے اسی چھوٹے بھائی مدد خان نے ہی اکرم خان کے سر پر خانی کی پگڑی باندھی اور اس کی اطاعت قبول کی۔ ریاست کی باگ ڈور پائندہ خان کی بیوہ یعنی اکرم خان کی دادی کے ہاتھ میں رہی جس نے ریاست کا انتظام بڑی خوبی سے چلایا (٧) اکرم خان نے بھی اپنے باپ کی روایت کو زندہ رکھا اور ۱۸٦۸ء میں جب حسن زئی، اکازئی اور چغرزئی اقوام کے آدمیوں نے انگریز ڈپٹی کمشنر اور اس کی فوج کو اگرور کے مقام پر گھیر رکھا تھا۔ ان کی مدد کر کے ان کی جان بچائی۔ انگریز اس کے بڑے ممنون ہوئے اور انہوں نے اظہار ممنونیت کے طور پر محمد اکرم خاں کو ۵۰۰ روپے ماہانہ اعزازیہ اور نواب کے خطاب سے نوازا (٨) ۱۸۷۱ء میں اسے سی ایس آئی کا اعزاز ملا اور ۱۸۸۸ء میں سر کا خطاب عطا ہوا ساتھ ہی ساتھ اسے ضلع ہزارہ میں تحصیل ہری پور کے علاقے میں نو ہزار روپے سالانہ کی ایک جاگیر سے بھی نوازا گیا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں نواب محمد اکرم خان تنولی ۲۰۴ مربع میل کے رقبے کا مالک تھا جس کی آبادی ۳۱،٦۲۲ نفوس پر مشتمل تھی (۹) ان کے علاوہ وہ تنول کے جنوب میں دریائے سندھ کے کنارے آباد ۴۲ مواضعات کا جاگیردار بھی تھا۔ اس کی کل سالانہ آمدنی کا تخمینہ ۵۰ ہزار روپے کے لگ بھگ تھا اور اسے ضلع میں سب سے زیادہ متمول شخص خیال کیا جاتا تھا (۱۰)

نواب محمد اکرم خان نے جنوری ۱۹۰۷ء میں وفات پائی تو زمام ریاست نواب خانی زمان خان کے ہاتھ آئی۔ تخت نشینی کے وقت وہ ۲۵ سالہ ناتجربہ کار نوجوان تھا تاہم اسے سید عبدالجبار شاہ ستھانوی جیسے مدبر کی راہنمائی حاصل تھی، یہ وہی رہنما تھے جنہیں ۱۹۱۵ء میں قبائل سرحد نے سوات کا بادشاہ منتخب کیا تھا۔ سید عبدالجبار شاہ نے ریاست کی تعمیر و ترقی میں اہم حصہ لیا۔ دربند اور شیر گڑھ میں جامع مساجد سکول اور دفاتر تعمیر کئے، مقدمات کا شرعی فیصلہ کرنے کے لئے ریاست میں قاضی القضاۃ مقرر کئے اور امن و امان کی بحالی کے لئے ضروری اقدامات کئے۔ (۱۱)

۱۹۳۰ء میں جب کوہ سیاہ کے آزاد قبائل نے اوگی قلعہ پر دھاوا بولا اور فوج کا اسلحہ اور بارود لوٹ کر لے گئے تو نواب خان زمان خان نے انگریزوں کے کہنے پر بڑی حکمت عملی سے آزاد قبائل سے تمام اسلحہ وغیرہ واپس منگوا لیا اور ان کے لشکر کو منتشر کر دیا۔ اس خدمت کے صلے میں نواب خانی زمان خان کو نسلاً" بعد نسلاً" نوابی کا خطاب دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک ہزار

بندوقیں' ایک لاکھ کارتوس اور ایک لاکھ روپے نقد انعام ملا۔ اور پندرہ ہزار روپے سالانہ الاؤنس مقرر ہوا۔

نواب خانی زمان نے اپنے بیٹے محمد فرید خاں کو ولی عہد مقرر کیا اور انگریزی حکومت کو اطلاع دے دی لیکن بعد میں نواب خانی زمان کو خود غرض لوگوں نے ورغلایا اور ولی عہد محمد فرید خاں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ انگریزوں نے محمد فرید خاں کو تین سال حراست میں رکھا۔ سید مبارک شاہ' علی گوہر خان سواتی اور محمد عباس خاں آف پھلڑہ ہنگو میں محمد فرید خاں کی نگرانی اور حفاظت کرتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں اس جلا وطنی کے زمانے میں محمد فرید خاں کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام محمد سعید خاں رکھا گیا۔

فروری ۱۹۳۶ء میں جب نواب خانی زماں خاں نے وفات پائی تو انگریزی حکومت نے محمد فرید خاں کو تخت امب کا وارث قرار دے دیا۔ نواب محمد فرید خاں بڑے تزک و احتشام سے ریاست امب میں داخل ہوئے اور ریاست کے سرمائی دارالحکومت دربند میں ریاست کی باگ ڈور باضابطہ طور سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ (۱۲)

۱۹۴۶ء میں نواب سر محمد فرید خان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۳)

فرید خان ایک درویش صفت' مرنجاں مرنج انسان تھے۔ قیام پاکستان کے بعد عوام میں سیاسی بیداری کی لہر اٹھی تو انہوں نے شخصی ریاستوں کے خاتمے کی تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک کے نتیجے میں صوبہ سرحد کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان نے عوامی اصلاحات کے لئے اقدام کیا اور تناول کے علاقہ کو براہ راست ہزارہ میں مدغم کر دیا گیا۔

سر محمد خان ریاست امب دربند کے آخری نواب تھے۔ وہ بڑے خوش ذوق' ادب نواز اور ماہر فن باغبانی تھے۔ شیر گڑھ میں انہوں نے پھلوں کے باغ لگوائے۔ دریائے ہرو کے کنارے ٹیکسلا کے نواح میں ان کا قائم کردہ "فریدیہ فارم" ایک مثالی باغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نواب محمد فرید خان کے بعد ان کے صاحبزادے نواب زادہ محمد سعید خان نے ان کی جگہ لی' وہ نیک دل اور مخیر انسان تھے انہوں نے دربند کے ان عوام کو جن کی اراضی یا مکانات تو تربیلا ڈیم سکیم سے متاثر ہوتے تھے۔ مالکانہ حقوق عطا کر دیئے۔ نواب زادہ محمد سعید خان عالم شباب ہی میں راہی ملک بقا ہو گئے۔ (۱۴)

نوابزادہ محمد سعید خاں تنولی کے صاحبزادے نواب زادہ صلاح الدین سعید خان ہیں انہوں نے ۱۹۸۵ء ۱۹۸۸ء ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء چاروں عام انتخابات میں حصہ لیا اور چاروں میں کامیابی حاصل کی (۱۵) ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۸ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کے طور پر حصہ لیا تھا ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت حاصل تھی۔ انتخابات کے بعد ۱۸ر اکتوبر

۱۹۹۱ء کو انہیں نواز شریف کابینہ میں پیداوار کا وفاقی پارلیمانی سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ (۱۶) جبکہ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر حصہ لیا تھا۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں نوابزادہ صلاح الدین سعید نے مسلسل پانچویں مرتبہ قومی اسمبلی کی نشست (این اے ۱۵، مانسہرہ، ہری پور) پر کامیابی حاصل کی۔ انتخابات میں کامیابی کے بعد وہ قومی اسمبلی کی مجلس قائمہ برائے سیاحت وثقافت وسپورٹس کے چیئرمین اور مجلس قائمہ برائے داخلہ کے رکن بنائے گئے (۱۷)۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں وہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے امیدوار تھے مگر متحدہ مجلس عمل کے مولانا عبدالمالک کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا گئے۔ (۱۸)

اسی قبیلہ کے ایک اور رکن محمد ایوب تنولی بھی ۱۹۸۵ء سے پی ایف ۳۸ ایبٹ آباد ۵ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب مسلسل لڑ رہے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں وہ انتخاب جیتنے کے بعد صوبائی کابینہ کے رکن بھی بنے۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے آئی جی آئی کے ٹکٹ پر حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔ (۱۹) ۱۹۹۰ء میں وہ آئی جے آئی کی حمایت حاصل نہ کر سکے یوں ان کے مدمقابل جو ان کے ہم نام بھی تھے، انہیں تقریباً سات ہزار ووٹوں سے شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ (۲۰) یہی نتائج ۱۹۹۳ء کے انتخابات کے رہے اور محمد ایوب تنولی کے حریف محمد ایوب خان آفریدی نے انہیں دس ہزار سے زائد ووٹوں سے شکست دے دی۔ (۲۱)

۱۹۹۷ء انہوں نے ایک مرتبہ پھر محمد ایوب خان آفریدی کے ہاتھوں شکست کھائی (۲۲) ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۳۸۵
۲۔ کرنل چارلس میسی۔ روسائے با اختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔ لاہور۔ ص ۱۲۷، ۱۲۸
۳۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۳۸۵، ۳۸۶
۴۔ کرنل چارلس میسی۔ روسائے با اختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔ لاہور۔ ص ۲۸
۵۔ سید مراد علی (علی گڑھ)۔ تاریخ تناولیاں۔ لاہور۔ ص ۷۰، ۷۱
۶۔ کرنل چارلس میسی۔ روسائے با اختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔ لاہور۔ ص ۱۲۸، ۱۲۹

۷۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی۔ تاریخ ہزارہ۔ ایبٹ آباد۔ ص ۷۰،۷۱

۸۔ کرنل چارلس میسی۔ روسائے با اختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔ لاہور۔ ص ۱۲۹

۹۔ امپیرل گزیٹیر آف انڈیا۔ پروانشل سیریز۔ نارتھ ایسٹ فرنٹیئر پراونس (انگریزی)۔ لاہور۔ ص ۱۳۸، ۱۳۹

۱۰۔ کرنل چارلس میسی۔ روسائے با اختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔ لاہور۔ ص ۱۳۰، ۱۳۱

۱۱۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۴۰۷

۱۲۔ نصر اللہ خاں نصر۔ ریاستیں۔ سنگ میل پاور (سرحد نمبر) جنوری ۱۹۵۰ء۔ ص ۵۲۹، ۵۳۰

۱۳۔ ولی مظہر ایڈووکیٹ۔ عظیم قائد اعظم تحریک (جلد اول)۔ ملتان۔ ص ۴۲۲

۱۴۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۴۰۷، ۴۰۸

۱۵۔ دی ہیرالڈ اسپیشل ایشو۔ الیکشن ۹۳ء۔ کراچی۔ نومبر دسمبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۴۴

۱۶۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۵۰۱

۱۷۔ ارشاد اٹین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۳۵

۱۸۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۲۲

۱۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۸۳

۲۰۔ الیکشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز۔ ۱۹۹۰ء۔ اسلام آباد۔ جلد دوم ص ۴۱۳

۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۱۹۔

۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ، جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۵۸۴

جدون

جدون یا گدون قبیلہ بھی صوبہ سرحد کی سیاست میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔ اس قبیلے کی دو شاخیں ہیں ایک سالار اور دوسرے منصور۔ سالار شاخ کے لوگ زیادہ تر ہزارے کے پہاڑوں میں "رش" تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا علاقہ بڑا ذرخیز و سرسبز ہے۔ گدون کی دونوں شاخوں کے درمیان اکثر بگاڑ اور اختلاف رہتا ہے۔ روایات کے مطابق گدون قبائل کے مورث اعلیٰ کا نام اشرف خان تھا۔ جو "گدانے" کہلاتا تھا۔ بعد میں یہ نام گدون یا جدون ہو گیا۔ دوسری شاخ کے لوگ زیادہ تر مہابن کے پہاڑ میں آباد ہیں۔ ضلع مردان کے گاؤں "بابیٹری" میں بھی ان کی آبادی پائی جاتی ہے۔ تھوڑے تھوڑے کشمیر اور کیمبل پور کے علاقے میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ علاقہ چھچھ میں غور غشتی گاؤں اشرف خان گدون کا آباد کیا ہوا ہے۔ (۱)

بیسویں صدی میں اس قبیلے کے جس فرد نے سب سے پہلے سیاست کے میدان میں قدم رکھا وہ فقیرا خان جدون تھے۔ وہ ہزارہ کے ایک گاؤں دھتوڑ میں ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق جدون قبیلے کی منصور شاخ کے حسن زئی خاندان سے تھا (۲) تحریک آزادی کے دنوں میں وہ کانگریس میں شامل تھے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء کے صوبائی انتخابات میں انہوں نے کانگریس کے ٹکٹ پر حصہ بھی لیا تھا ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں تو وہ کامیاب ہو گئے تھے لیکن ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے محمد عباس خان کے مقابلے میں ضمانت ضبط کروا بیٹھے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد فقیرا خان جدون نے ۱۹۵۱ء میں سرحد اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی ۱۹۵۶ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے۔ (۳) اور ایوب خان کے مارشل لاء تک اس کے رکن رہے۔ ۶ر جنوری ۱۹۵۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۴)

فقیرا خان جدون کے بعد جدون قبیلے کے خان گوہر الرحمٰن خاں جدون کے صاحبزادوں اقبال خان جدون، امان اللہ جدون اور فرید جدون نے بھی سیاست کے میدان میں نام کمایا۔ اقبال خان

جدون ۱۵ر جنوری ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے۔ (۵) انہوں نے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز ۱۹۶۴ء میں بلدیاتی انتخاب سے کیا۔ (۶) تھوڑے ہی دنوں بعد ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور مواصلات و تعمیرات کے پارلیمانی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ (۷)

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں وہ سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور صوبائی کابینہ میں وزیر خزانہ اور سینئر وزیر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ (۸) ۱۹۷۷ء میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر بیک وقت قومی اور صوبائی' دونوں اسمبلیوں کے انتخاب میں حصہ لیا۔

وہ دونوں انتخابات میں کامیاب رہے حالانکہ قومی اسمبلی کی نشست پر ان کا مقابلہ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں اور خان عبدالقیوم خان جیسی دیو قامت شخصیات سے تھا۔ (۹) اقبال خان جدون نے بعد ازاں صوبائی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی اور صوبے کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء تک وہ اسی عہدے پر فائز تھے۔ (۱۰)

۱۸ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۱۱) ان کے بعد ان کی سیاسی وراثت ان کے بھائی امان اللہ جدون نے سنبھالی۔ امان اللہ جدون سینیٹر اختر نواز خاں کے بہنوئی ہیں۔

۱۹۸۵ء میں انہوں نے اپنے بڑے بھائی کی طرح بیک وقت قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کے انتخاب میں حصہ لیا اور انہی کی طرح دونوں انتخابات میں کامیاب رہے۔ بعد میں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست چھوڑ دی۔ (۱۲)

۱۹۸۸ء میں امان اللہ جدون نے نگراں وزیر اعلیٰ جنرل فضل حق سے اپنے اور اپنے بھائی فرید جدون کے لئے آئی جے آئی کا ٹکٹ مانگا لیکن جنرل فضل حق نے انہیں تو ٹکٹ دے دیا ان کے بھائی کو نہیں دیا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے آزادانہ طور پر انتخاب میں حصہ لیا اور امان اللہ جدون صوبائی اسمبلی کے اور فرید جدون قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ امان اللہ جدون انتخاب کے بعد آفتاب شیرپاؤ کی کابینہ میں مواصلات اور تعمیرات کے وزیر بھی رہے۔ (۱۳)

۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء میں امان اللہ جدون نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر دونوں مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ آئی جے آئی کے سردار مہتاب خان عباسی سے شکست کھا گئے (۱۴) ۱۹۹۳ء میں نواز شریف حکومت کے خاتمے کے بعد انہیں جناب بلخ شیر مزاری کی نگراں حکومت میں وزیر مقرر کیا گیا۔ (۱۵)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں امان اللہ جدون کو قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر تیسری مرتبہ شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ انتخاب انہوں نے آزاد حیثیت میں لڑا تھا۔ (۱۶) تاہم ۲۰۰۲ء میں امان اللہ خان کے ستارے یاوری کر گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر این اے ۱۷ ایبٹ آباد ا سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور ڈاکٹر اظہر خان جدون اور الحاج حبیب الرحمٰن عباسی کو

شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔(۱۷) یکم ستمبر ۲۰۰۴ء کو وزیر اعظم شوکت عزیز نے انہیں اپنی کابینہ میں شامل کر لیا۔ انہیں پٹرولیم اور قدرتی وسائل کا قلم دان دیا گیا (۱۸) امان اللہ جدون کا بیٹا سیف اللہ جدون ۲۰۰۵ء میں ایبٹ آباد کا تحصیل ناظم منتخب ہوا ہے (۱۹)

۱۹۹۰ء کے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں ان کے خاندان کے علی افضل خان جدون، ظفر اقبال جدون کو شکست دے کر کامیاب رہے (۲۰) انہیں آئی جے آئی کی حمایت حاصل تھی۔ وہ بعدازاں صوبہ سرحد کی کابینہ میں شامل ہوئے۔ انہیں قانون اور پارلیمانی امور کا قلم دان تضویض کیا گیا۔(۲۱) تاہم ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور شمروز خان سے شکست کھا گئے (۲۲)۔ ۱۹۹۷ء میں علی افضل خان جدون نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر ایک مرتبہ پھر کامیابی حاصل کی اور سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۳)۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔

جدون قبیلے ہی کے ایک اور فرد حاجی غفور خان جدون ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء تینوں انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو کر اپنی ہیٹ ٹرک مکمل کر چکے ہیں۔ ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں انہوں نے پی ایف ۲۳ مردان ۷ سے حصہ لیا تھا جب کہ ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء میں انہوں نے پی ایف ۲۵ صوابی ۲ سے کامیابی حاصل کی تھی (۲۴)۔ وہ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں بھی کھڑے ہوئے تھے مگر اس مرتبہ عنایت اللہ خان سے شکست کھا گئے تھے (۲۵)۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی نشست دوبارہ حاصل کر لی (۲۶) ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

حوالہ جات

۱۔ سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل۔ پشتون تاریخ کے آئینہ میں ۔ ترجمہ سید انوار الحق جیلانی۔ پشاور۔ ص ۹۴۴

۲۔ عزیز جاوید۔ قائد اعظم اور سرحد۔ پشاور۔ ص ۴۷۹

۳۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی۔ تاریخ ہزارہ۔ ایبٹ آباد۔ ص ۱۷۶ تا ۱۸۰

۴۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات۔ مشاہیر پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۱۹۳

۵۔ ایم آئی صدیقی رزم۔ ہمارے نمائندے۔ لاہور۔ ص ۵۱

۶۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور ص ۱۷۷

۷۔ ایم آئی صدیقی رزم۔ ہمارے نمائندے۔ لاہور۔ ص ۵۱

۸۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور ص ۱۷۷

۹۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۱۷۴

۱۰۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور ص ۱۷

۱۱۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات مشاہیر پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۲۶

۱۲۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ ص ۵۶۳

۱۳۔ ایضاً۔ ص ۵۶۴

۱۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱رنومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۱۹۲ ۔ ۱۴را کتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۴۸

۱۵۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳۰راپریل ۱۹۹۳ء

۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۵۸۸۔

۱۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد ۲۵را کتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۸۹۱۔

۱۸۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳رستمبر ۲۰۰۴ء

۱۹۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۷را کتوبر ۲۰۰۵ء

۲۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱رنومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۶۷

۲۱۔ موسیٰ خان جلالزئی۔ کون کون ہے؟ اور کیا کیا ہے؟۔ لاہور۔ ص ۴۴۵

۲۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷را کتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۱۸

۲۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ، جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۵۸۰

۲۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸رمارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۴۹۷، ۳ردسمبر ۱۹۸۸ء ص ۳۷۱۵، ۱۱رنومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۶۵

۲۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷را کتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۱۴

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۵۷۰

خٹک

"این خانہ ہمہ آفتاب است" کا مقولہ کسی گھرانے پر پوری طرح صادق آتا ہے تو وہ ہے صوبہ سرحد کے خان بہادر محمد قلی خان خٹک کا گھرانہ۔ ان کے صاحبزادگان محمد اسلم خان خٹک، جنرل حبیب اللہ خان اور محمد یوسف خان خٹک اور صاحبزادی بیگم کلثوم سیف اللہ ایک طویل عرصے سے پاکستان کے آسمان سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔

محمد قلی خان کا آبائی گاؤں زرگئی ضلع کوہاٹ تھا جو اب ضلع کرک بن گیا ہے۔ جب ان کے دادا کو ان کے رشتے داروں نے وہاں سے نکال دیا انہوں نے بنوں جا کر ایک نیا گاؤں آباد کر لیا۔ انگریزوں کے قانون کی رو سے باہر کے لوگ بنوں میں گاؤں آباد نہیں کر سکتے تھے تاہم کچھ بھاگ دوڑ کے بعد قلی خان کے خاندان کو نیا گاؤں آباد کرنے کی اجازت مل گئی۔ جس دن یہ اجازت ملی اسی دن قلی خان کی ولادت ہوئی۔ پشتو میں گاؤں کو قلعہ کہتے ہیں اس لئے نو مولود کا نام محمد قلی خان رکھ دیا گیا یعنی "گاؤں کا خان" قلی خان سے پھر ان کا نام قُلی خان ہو گیا۔ کیونکہ پشتو میں تو قلی خان سمجھ میں آتا تھا۔ لیکن ہندوستان کے باقی علاقوں میں قُلی رائج تھا۔ (۱)

برطانوی حکومت کے زمانے میں قلی خان نے بڑا عروج پایا۔ انہیں خان بہادر کا خطاب ملا اور انہوں نے پولیٹیکل ایجنٹ کے عہدے تک ترقی کی۔ انہیں حکام بالا سے بنا کر رکھنے کا گر خوب آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک مرتبہ جب وہ مہمندوں کے پولیٹیکل افسر تھے اور ان کے تعلقات مہمند ملیشیا کے کمانڈر میجر ٹنکاک سے بگڑنے لگے تھے انہوں نے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ٹنکاک کو قرآن پاک کے نسخے جمع کرنے کا شوق ہے اسے قرآن پاک کے دو بہترین نسخے بطور "تحفہ" (یا رشوت؟) پیش کر کے رام کیا تھا۔ با الفاظ دیگر انہیں اپنا کام نکالنے کے لئے قرآن پاک کو بھی استعمال کرنے سے عار نہ تھا۔ (۲)

اپریل ۱۹۲۳ء میں جب عجب خان آفریدی نے ایک انگریز لڑکی مس ایلس کو اغوا کیا تھا تو اس کی بازیابی میں بھی قلی خاں نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا اور انہی کی کوششوں سے مس ایلس

کوئی گزند پہنچے بغیر اپنے گھر واپس لوٹ آئی تھیں (۳)

۱۹۲۰ء کے عشرے کے اواخر اور ۱۹۴۰ء کے عشرے کے اوائل میں انگریزوں نے قلی خان کو ملاؤں سے رابطہ قائم کرنے کے سلسلہ میں استعمال کیا۔ (۴) سر جارج کننگھم نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ خفیہ طور پر قبائلی ملاؤں اور ان دیگر افراد کو اپنا ہم خیال بنائیں جو کھلے بندوں انگریزوں کی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران حکومت نے حکومت کے حامی ملاؤں کے ایک خفیہ جال کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا چلایا۔ یہ منصوبہ کننگھم اور اس زمانے کے آئی سی ایس افسر اسکندر مرزا کے مابین اگست ۱۹۳۹ء میں تیار کیا گیا تھا۔

اس منصوبہ کو سر آرتھر پارسنز نے خان بہادر قلی خان کی مدد سے (جو اس وقت ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے) عملی جامہ پہنایا۔ سر آرتھر پارسنز کننگھم کی عدم موجودگی میں قائم مقام گورنر کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ آرتھر پارسنز نے مکمل رازداری کی خاطر، جہاں تک ممکن ہو سکا۔ خان بہادر قلی خان کو زبانی ہدایات دیں اور قلی خان نے ان ہدایات کی روشنی میں ملاؤں کا ایک مربوط جال قائم کیا۔ جنہیں انگریزوں کی حمایت اور جرمنوں اور روسیوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے عوض معقول رقم ادا کی جاتی تھی۔

قلی خان نے موقف یہ اختیار کیا کہ انتہا پسندی اسلام کی سب سے بڑی دشمن ہے اور جرمن اسلام اور مذہب کے خلاف انتہا پسندوں سے تعاون کر رہے ہیں۔ قلی خان نے اپنے اس موقف سے بہت سے ملاؤں اور مقامی رہنماؤں کو ہم خیال بنا لیا جنہیں ملا مروت، ملا پاوندہ کا بیٹا فضل دین، حاجی صاحب ترنگ زئی کا بیٹا بادشاہ گل اور پیر آف مانکی شریف سرفہرست تھے۔ انہوں نے فقیر آف ایپی کو بھی اپنے ساتھ ملانا چاہا مگر وہ ان کے دام میں نہ آئے۔

قلی خان اور ان کے ساتھیوں نے صوبہ میں نیشنل لبریشن موومنٹ کے خلاف بھی بھرپور حصہ لیا۔ بادشاہ گل نے قبائلی علاقوں میں کانگریس اور جاپان کے خلاف پروپیگنڈہ پھیلانے میں بھرپور مدد دی۔ کننگھم کے ان تمام ایجنٹوں نے بعد میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ قلی خان کا نام ان میں سرفہرست تھا۔ (۵)

قلی خان اور ان کے اہل خانہ نے دنیا میں تو کامیابی حاصل کی۔ مگر وہ اپنا اعتبار بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انہیں ہمیشہ ناقابل اعتماد اور انگریزوں کا ایجنٹ ہی سمجھا جاتا رہا۔ اس سلسلہ میں اس انٹرویو کا حوالہ بے محل نہ ہو گا جو راولپنڈی سازش کیس کے روح رواں میجر جنرل محمد اکبر خاں نے جناب علی حسن کو دیا تھا۔ علی حسن کے سوالات اور میجر جنرل اکبر خاں کے جوابات حسب ذیل تھے۔

"س۔ سازش کھلی کیسے تھی؟

ج۔ اصل میں ایک پولیس افسر تھا جس نے ان کو سازش سے متعلق اطلاعات فراہم کی تھیں۔ دوسرے بریگیڈیر حبیب اللہ خان کو بھی ہم نے اعتماد میں لیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے بھی حکومت سے مخبری کی۔

س۔ یہ کون سے حبیب اللہ تھے ؟

ج۔ حبیب اللہ خٹک جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے

س۔ ایوب خان کے سمدھی بھی بنے؟

ج۔ جی ہاں

س۔ انہوں نے ایوب خان کو اس سازش کی اطلاع دی تھی ؟

ج۔ جی ہاں۔ انہوں نے اطلاع دی تھی۔

س۔ اس زمانے میں ایوب خاں کس عہدے پر فائز تھے ؟

ج۔ وہ کمانڈر انچیف تھے"

اسی انٹرویو میں ایک اور سوال کے جواب میں میجر جنرل محمد اکبر خان نے بتایا

"۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ اسکندر مرزا نے مجھ سے کہا تھا کہ حکومت کے خلاف سازش میں تم نے حبیب اللہ خاں کو اعتماد میں کیوں لیا تھا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ حبیب اللہ خان کا تعلق قلی خان فیملی سے ہے۔ جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

س۔ قلی خان فیملی نا قابل اعتماد تصور کی جاتی ہے؟

ج۔ عام لوگ قلی خان فیملی کو نا قابل اعتماد اور انگریز ان کو—— با اعتماد تصور کرتے تھے۔ اس زمانے میں قلی خان فیملی انگریزوں کی Stooge تھی۔ اب بھی اس روایت پر لوگ یقین رکھتے ہیں اور قلی خان فیملی سے وفاداری کی توقع نہیں رکھتے۔

س۔ اچھا اس وجہ سے کہ قلی خان انگریزوں کا آلہ کار تھا۔ اسکندر مرزا نے آپ سے کہا کہ تم نے حبیب اللہ پر بھروسہ کیوں کیا۔ آپ نے اس کے جواب میں کیا کہا تھا۔

ج۔ میں نے کہا کہ یہ ہماری غلطی تھی" (٦)

(یہاں اس بات کا تذکرہ عبرت سے خالی نہیں کہ قلی خان کو انگریزوں کا پٹھو اور آلہ کار قرار دینے والا اسکندر مرزا' خود میر جعفر کی اولاد میں سے تھا۔ ایم اے کے چودھری اپنی کتاب "مارشل لاء کا سیاسی انداز" میں لکھتے ہیں۔

"میر جعفر جس نے بنگال میں تحریک آزادی کے وقت سراج الدولہ سے غداری کی تھی' اسکندر مرزا کے اجداد میں سے تھا' یہ وہ میر جعفر تھا جسے اقبالؒ نے ننگ دنیا" ننگ دیں' ننگ وطن کہا ہے اور ہر تاریخ کی کتاب میں اس کا نام غدار کی حیثیت سے لکھا جاتا ہے۔ ساری زندگی اور خصوصاً اپنی ملازمت کے دوران اسکندر مرزا کی کوشش رہی کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ میر

جعفر کی اولاد میں سے ہے جب ایوب خان نے اسکندر مرزا کو ذلیل کر کے نکال دیا تو وہ اپنے آقاؤں کے دیس یعنی انگلینڈ چلا گیا اور لندن کے پکاڈلی ہوٹل (Piccadlly Hotel) میں قیام پذیر ہوا۔ ایک ماہ بعد اسے ایک فلیٹ مل گیا اور وہ اس میں منتقل ہو گیا۔ جس وقت وہ ہوٹل چھوڑ رہا تھا تو حکومت برطانیہ کا ایک افسر بکار خاص وہاں آیا اور اسکندر مرزا کا ہوٹل کا بل ادا کر دیا۔ جب اسکندر مرزا نے احتجاج کیا تو اس افسر نے کہا کہ ملکہ برطانیہ مرزا اور اس کے اجداد کی خدمت کے صلے میں حق میزبانی ادا کر رہی ہے۔ جھینپ کر مرزا نے یہ ادنیٰ سی خیرات قبول کر لی اور وہاں سے چلا گیا۔ برطانیہ نے اپنا دیرینہ قرض چکا دیا اور سمجھا کہ اب اس پر اسکندر مرزا اور میر جعفر کی خدمات کے صلے کا اور کوئی بار نہیں رہا لہٰذا اس واقعہ کے بعد انہوں نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ مسٹر جے۔ حصواری جو ایک ممتاز انشورنس کمپنی کے جنرل مینجر ہیں۔ اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔ غداری کا یہ حقیر صلہ دیکھ کر انسان کانپ جاتا ہے"۔ (۷))

محمد قلی خان خود بھی مسلم لیگ میں شامل رہے اور ان کے بعد ان کی اولاد بھی، ماسوا کلثوم سیف اللہ کے، جو ایک مختصر عرصہ کے لئے پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل رہیں، قیام پاکستان سے اب تک مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے عملی سیاست میں متحرک رہی ہے اور ہر عہد میں اقتدار میں شامل رہی ہے۔

محمد اسلم خان خٹک ۵ر اپریل ۱۹۰۸ء کو چترال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد خان بہادر محمد قلی خان ملازمت کے سلسلہ میں مقیم تھے۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اسی زمانے میں انہیں چوہدری رحمت علی کے مشہور کتابچے Now or Never کی تدوین میں ہاتھ بٹانے کا موقع ملا۔ یہ وہی تاریخی کتابچہ تھا۔ جس میں پہلی مرتبہ لفظ "پاکستان" تجویز کیا گیا تھا۔

اسلم خٹک نے اپنے کیریئر کا آغاز سول سروس سے کیا۔ وہ پشاور ریڈیو کے پہلے اسٹیشن ڈائریکٹر مقرر ہوئے اس دوران انہوں نے پشتو زبان کے پہلے ڈرامے "دو پیو جام" لکھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ بعد ازاں وہ محکمہ تعلیم صوبہ سرحد کے ڈائریکٹر بنے۔ وہ ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

اسلم خٹک افغانستان اور ایران میں پاکستان کے سفیر رہے۔ ۱۹۶۵ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں وہ سرحد اسمبلی کے رکن بنے۔ مئی ۱۹۷۲ء سے فروری ۱۹۷۳ء تک وہ سرحد اسمبلی کے اسپیکر اور فروری ۱۹۷۳ء سے مئی ۱۹۷۴ء تک صوبہ سرحد کے گورنر رہے۔ (۸)

جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں وہ مجلس شوریٰ کے رکن اور صوبہ سرحد سے مجلس شوریٰ کے نائب چیئرمین نامزد ہوئے۔ ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے این اے ۱۱ کوہاٹ،

کرک اسے کامیابی حاصل کی۔ وہ شروع سے آخر تک محمد خاں جونیجو کی ہر وزارت میں شامل رہے ان کے پاس داخلہ امور اور مواصلات جیسی اہم وزارتوں کے قلم دان رہے۔ (۹)

۱۰ر اپریل ۱۹۸۸ء کو جب راولپنڈی اسلام آباد کے جڑواں شہروں پر اوجڑی کیمپ کی قیامت ٹوٹی تو ایک جانب تو علاقے کے کور کمانڈر جنرل عمران اللہ کی قیادت میں ایک تحقیقاتی ٹیم مقرر ہوئی جسے سانحہ اوجڑی کیمپ کے بارے میں رپورٹ دینی تھی دوسری جانب وزیراعظم جونیجو نے پانچ وزراء کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا کام اس رپورٹ کا جائزہ لے کر اپنی سفارشات مرتب کر کے وزیراعظم کے سامنے پیش کرنا تھیں۔ اس کمیٹی کے سربراہ جناب اسلم خٹک اور دیگر ارکان نسیم احمد آہیر، قاضی عبدالمجید عابد، محمد ابراہیم خان بلوچ اور رانا نعیم محمود تھے۔

اس کمیٹی نے جنرل عمران اللہ کی رپورٹ پڑھنے کے بعد خود بھی ایک رپورٹ تیار کی جسے جناب اسلم خٹک نے تحریر کیا۔ اس رپورٹ میں فوج کی طرف داری کی گئی تھی اور یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ افغانستان کی موجودہ صورتحال میں پاکستانی حکومت کی جانب سے جو قربانیاں دی جا رہی ہیں اور جہاد افغانستان کو جاری و ساری رکھنے کے لئے جو کردار ادا کیا جا رہا ہے اس کے حوالے اس قسم کے حادثے کو پاکستانی جوانوں کے سر کا صدقہ سمجھ کر درگزر کر دینا چاہیے کیونکہ زندہ قوموں کی زندگیوں میں ایسے مواقع آتے ہی رہتے ہیں اور یہ قربانی تو کچھ بھی نہیں اس سے بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ خٹک صاحب نے اس بحث میں الجھے بغیر کہ حادثہ کس کی غلطی سے اور کیوں ہوا صرف اس قدر تجویز پیش کی تھی کہ شعبہ جاتی انکوائری میں جن چھوٹے چھوٹے دو چار افسروں کے خلاف تساہل یا سہو نظر کا الزام ہے انہیں حسب دستور سزا دے کر معاملہ ختم کر دیا جائے کیونکہ اس میں کوئی اتنی اہم یا پریشانی کی بات نہیں۔

خٹک صاحب نے اپنی رپورٹ میں اوجڑی کیمپ کے متعلق برپا ہونے والے واویلا کو غیر ضروری اور ملک دشمن سیاستدانوں کی سازش سے زیادہ کوئی بھی مرتبہ دینے سے انکار کرتے ہوئے ان باتوں کو نظرانداز کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

رپورٹ کے مطالعہ کے بعد نسیم احمد آہیر نے تو اس کی خوب تعریف کی مگر رانا نعیم محمود نے اس کی شدید مخالفت کی اور قاضی عابد اور ابراہیم بلوچ نے بھی ان کی ہمنوائی کی۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس رپورٹ میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ انہوں نے اس رپورٹ میں کاٹ چھانٹ کر کے ایک نئی اور نسبتاً قابل قبول رپورٹ تیار کی کہ اسے متفقہ رپورٹ کے طور پر پیش کر دیا جائے۔ اسلم خٹک نے اس دوسری رپورٹ کو دیکھا تو ایک دم آگ بگولہ ہو گئے اور انہوں نے اس رپورٹ کو واپس پھینکتے ہوئے کہا "میں اپنی رپورٹ میں ایک نقطہ یا ایک شوشہ بھی بدلنے کو تیار نہیں ہوں اگر آپ لوگ اپنی رپورٹ الگ ارسال کرنے چاہتے ہیں تو شوق سے کریں مگر میں آپ کی اس کوشش کو حماقت محض کے سوا کچھ نہیں

سمجھتا۔ آخر آپ لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ فوج کے ساتھ جھگڑا کرنا ہمارے لئے کسی بھی طرح مناسب نہیں"۔

اور پھر ہوا بھی۔ خٹک صاحب نے اپنی رپورٹ کو تو متفقہ رپورٹ کے طور پر ارسال کر دیا اور اختلافی نوٹس کو محض نظرے خوش گزرے کے سے انداز میں الگ بھیج دیا۔ جس پر وزیراعظم کے ایما پر یا ازخود رانا نعیم محمود نے ایک تیسری رپورٹ تیار کی جس میں جنرل عمران اللہ کے ان جوابات کی روشنی میں جو انہوں نے کمیٹی کے روبرو دیئے تھے، بعض "بڑے" افسروں پر اس سانحہ کی ذمہ داری عائد کرتے ہوئے ان کے خلاف کاروائی کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

رانا نعیم محمود کی یہی تیسری رپورٹ جونیجو حکومت کی برطرفی اور قومی اسمبلی کی تحلیل کا فوری سبب بنی کیونکہ جونیجو صاحب اس رپورٹ کی بنیاد پر بعض انتہائی سینئر فوجی افسران (مثلاً اختر عبدالرحمٰن اور حمید گل وغیرہ) کے خلاف کاروائی کرنے کا نہ صرف پروگرام بنا چکے تھے بلکہ اپنی یہ خواہش اپنی سادہ لوحی (یا حماقت) میں جنرل ضیاء الحق کے علم میں لا چکے تھے۔

جنرل ضیاء کو اپنے ان قریبی افسران کے خلاف کوئی ایکشن بھلا کسی طرح گوارا ہو سکتا تھا چنانچہ انہوں نے جونیجو حکومت کو ہی برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اور اس پر عملدرآمد کر کے ہی دم لیا۔

جونیجو صاحب نے اپنی برطرفی کے بعد جناب اسلم خٹک سے درخواست کی وہ عبوری حکومت میں شامل نہ ہوں۔ مگر اسلم خٹک صاحب تو اپنی "خدمات" کے صلہ میں نگران وزیراعظم بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس بات کا عندیہ پیر پگارا کو بھی دیا تھا چنانچہ انہوں نے جونیجو صاحب کی خواہش کے باوجود عبوری نگران حکومت میں شمولیت اختیار کر ہی لی۔ یہ بات الگ ہے کہ جنرل ضیاء الحق ان سے بھی زیادہ ہوشیار تھے اور انہوں نے آئین کی مبینہ طور پر خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی کو بھی نگران وزیراعظم بنانے کا رسک نہیں لیا اور اسلم خٹک محض سینئر وفاقی وزیر ہی بن کر رہ گئے۔ (۱۰)

نومبر ۸۸ء کے انتخابات میں جناب اسلم خٹک نے این اے ۱۰ کرک سے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا لیکن اس مرتبہ انہیں جمعیت علمائے اسلام (درخواستی گروپ) کے امیدوار مولانا شہید احمد المعروف نرملا کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حلقے سے اسلم خٹک کے بھائی یوسف خٹک بھی بطور آزاد امیدوار کھڑے ہوئے تھے مگر وہ انتخاب ہی سے دستبردار ہو گئے۔ (۱۱)

اکتوبر ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں جناب اسلم خٹک نے ایک مرتبہ پھر اسی حلقے کو اپنے انتخاب کے لئے منتخب کیا مگر اس مرتبہ حالات قدرے مختلف تھے اس مرتبہ آئی جے آئی کا ٹکٹ اسلم خٹک کی بجائے ان کے سابقہ حریف مولانا شہید احمد کو دے دیا گیا اور جمعیت علمائے اسلام (فضل

الرحمٰن گروپ) نے حافظ ابن آمین کو کھڑا کیا چنانچہ جناب اسلم خٹک نے آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا اور حیرت انگیز طور پر کامیاب رہے۔ (۱۲)

انتخابات میں کامیابی کے بعد جناب اسلم خٹک کی نظر اسمبلی کی اسپیکر شپ پر تھی۔ خود آئی جے آئی کی پارلیمانی پارٹی بھی ان کا نام اسپیکر کے عہدے کے لئے تجویز کر چکی تھی اور اس نام کو متفقہ طور پر منظور کر کے اخبار نویسوں تک پہنچا چکی تھی لیکن فوجی بیورو کریسی نے اسی رات فیلڈ مارشل ایوب خاں مرحوم کے ریٹائرڈ فوجی بیٹے گوہر ایوب کو اسپیکر بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور یوں اسلم خٹک اسپیکر بنتے بنتے رہ گئے۔ احمد سلیم نے اپنی کتاب ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیورو کریسی میں اعتزاز احسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ "چھوٹی طاقت" نے اسلم خٹک کو اسپیکر بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن "بڑی طاقت" سے گوہر ایوب کے لئے حکم آگیا۔

احمد سلیم مزید لکھتے ہیں۔

اسپیکر شپ کے سلسلے میں کچھ دوسری کہانیاں بھی سننے میں آئیں، ایک کہانی کے مطابق اسپیکر کے نام کی تبدیلی کے پیچھے کچھ خاندانی معاملات کارفرما ہو سکتے ہیں کیونکہ اسلم خٹک اور گوہر ایوب دونوں کا تعلق صدر اسحٰق کے خاندان سے ہے...... لیکن اس ڈرامائی تبدیلی میں محمد خان جونیجو کی ناراضگی بھی شامل ہو سکتی ہے۔ سنا ہے اس موقع پر جونیجو نے آئی جے آئی کے لیڈروں کو اسلم خٹک کی گزشتہ کارگزاری کا قصہ یاد دلایا اور کہا کہ اگر وہ لوگ اسمبلیاں جلد تڑوانا چاہتے ہیں تو بیشک اسلم خٹک کو اسپیکر بنا دیں کیونکہ اسی شخص نے ۱۹۸۸ء میں ان (جونیجو) کی برطرفی کا نسخہ تیار کیا تھا۔ اسلم خٹک جونیجو کابینہ میں ایک طاقتور وزیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ضیاء کی نوازشوں کے مزے لینے والے گروپ کے اہم رکن تھے۔ وہ جونیجو کی افغان پالیسی کے سخت مخالف تھے اور اکثر و بیشتر جنرل اختر عبدالرحمٰن کے ساتھ ملاقات کا شرف حاصل کرتے رہتے تھے۔ (۱۳) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی ٹوٹنے سے پہلے اور بعد میں جناب اسلم خٹک نے کھل کر جناب نواز شریف کا ساتھ دیا اور ایسے میں جب بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے تھے انہوں نے وزیر اعظم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر این اے ۱۰ کرک ہی کو اپنی معرکہ آرائی کے لیے منتخب کیا مگر اس مرتبہ وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اپنے دیرینہ حریف مولانا شہید احمد سے شکست کھا گئے (۱۴) وہ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں بھی اسی نشست پر آزاد امیدوار تھے مگر اے این پی کے امیدوار حاجی شمس الرحمٰن خٹک کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۱۵)۔

جناب اسلم خٹک کے داماد نواب زادہ محسن علی خان بھی ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۰ تک صوبائی اسمبلی کا انتخاب مسلسل جیتتے رہے۔ انہیں ۱۹۹۰ء میں صوبہ سرحد کی کابینہ میں وزارت خزانہ کا

قلمدان سونپا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں جب وزیراعظم اور صدر کے درمیان محاذ آرائی اپنے عروج پر پہنچی تو صوبائی وزیراعلیٰ نے انہیں اپنے خلاف تحریک عدم اعتماد کی تیاری کے الزام میں برطرف کر دیا۔ (۱۶) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر حصہ لیا مگر اس مرتبہ وہ کامیاب نہ ہو سکے اور ملک ظفر اعظم کے ہاتھوں تقریباً پونے دو ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۱۷) ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں وہ اپنی کھوئی ہوئی نشست دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے (۱۸) تاہم ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

جناب اسلم خٹک کے چھوٹے بھائی لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) حبیب اللہ خان اگرچہ انتخابات سے دور دور ہی رہے مگر وہ بھی اقتدار کا نشہ چکھتے رہے ہیں اور اپنی اولاد کے حوالے سے سیاسی رشتہ داریوں میں بندھے ہوئے ہیں۔

یہ وہی حبیب اللہ ہیں جن کے بارے میں راولپنڈی مقدمہ سازش کے روحِ رواں میجر جنرل اکبر خان نے ایک انٹرویو میں خیال ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے ہی حکومت سے سازش کے بارے میں مخبری کی تھی اور یوں نہ صرف تمام سازشی پابند سلاسل ہوئے بلکہ سازش بھی اپنے انجام کو نہ پہنچ سکی (۱۹)۔ جناب م ب خالد اپنی کتاب ایوان صدر میں سولہ سال میں لکھتے ہیں:

"لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ خاں جو بری فوج کے چیف آف جنرل سٹاف اور سب سے سینئر افسر تھے امپریل ڈیفنس کالج لندن سے کورس کر کے واپس آئے تو ایوان صدر میں ایوب خاں کے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے افواہ گرم تھی کہ وہی ایوب خاں کی جگہ کمانڈر انچیف بننے والے ہیں۔ ایوان صدر میں ان کے قیام سے اس افواہ کو مزید تقویت ملی جس کی وجہ سے ان کی عزت اور اثر ورسوخ میں کثیر اضافہ ہوا۔ ایوب خان نے اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ خاں کو فوج سے ریٹائرڈ کر دیا اور اُن کے بجائے جنرل محمد موسیٰ کو کمانڈر انچیف بنایا جن کی وفاداریاں شک و شبہ سے بالا تھیں۔ لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ خاں کی بیٹی کیپٹن گوہر ایوب خاں سے منسوب تھیں اور خدشہ تھا کہ ان کی ایوب خان سے ناراضگی اس رشتے پر اثر انداز ہو مگر فریقین نے دانش مندی کا ثبوت دیا اور شادی بخیر خوبی انجام پذیر ہوئی۔ گوہر ایوب خاں نے بری فوج سے ریلیز لے لی اور ایم شعیب نے انہیں امریکہ کی مشہور فرم جنرل موٹرز کی ایجنسی لے دی۔ یوں سسر اور داماد نے مل کر گندھارا موٹرز کے نام سے کاروبار شروع کر دیا۔ گندھارا موٹرز جلد ہی گندھارا انڈسٹریز میں تبدیل ہو گئی اور مالکان کا شمار پاکستان کے امیر ترین خاندانوں میں ہونے لگا"۔ (۲۰)

۱۹۷۰ء اوائل تک لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) حبیب اللہ جن صنعتی اداروں کے چیئرمین بن چکے تھے ان میں گندھارا انڈسٹریز کے علاوہ جنانہ ڈی ملوچہ ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ، گوہر حبیب لمیٹڈ، اٹلس آٹوز لمیٹڈ، گلفر احبیب لمیٹڈ، بیوجی سروسز لمیٹڈ، اٹلس ای پاک لمیٹڈ، ایم کے فونڈری انجینئرنگ ورکس لمیٹڈ، اٹلس بیٹریز لمیٹڈ، بنوں وولن ملز لمیٹڈ، پریمیرا یجنسیز لمیٹڈ اور یونیورسل لائف انشورنس لمیٹڈ شامل تھیں۔ اس کے علاوہ وہ گندھارا منرل لمیٹڈ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ اور گیمن (پاک) کے وائس چیئرمین اور اسٹیٹ بنک آف پاکستان اور ملک بیوریجز کے ڈائریکٹران میں شامل تھے۔ (۲۱)

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) حبیب اللہ خٹک کو بھٹو نے برسر اقتدار آتے ہی اپنے انتقام کا نشانہ بنایا اور انہیں کچھ دن جیل میں بھی رکھا۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے عہد اقتدار میں اس زیادتی کا ازالہ کرنا چاہا اور یوں حبیب اللہ خٹک ۱۴ر جنوری ۱۹۷۸ء سے ۲۳ر اگست ۱۹۷۸ء تک صنعتوں اور پیداوار کے مرکزی وزیر رہے۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ (۲۲)

لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ خٹک کے ایک صاحبزادے عوامی نیشنل پارٹی میں شامل ہیں جب کہ دوسرے صاحبزادے ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان کے داماد ہیں۔ (۲۳)

لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ کی صاحبزادی زیب، جو گوہر ایوب خان کی اہلیہ ہیں، ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے بعد خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی ہیں (۲۴)

جناب محمد اسلم خٹک اور لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) حبیب اللہ خان کے سب سے چھوٹے بھائی یوسف خٹک مرحوم (تاریخ وفات: ۲۹ر جولائی ۱۹۹۱ء)۔ (۲۵) نے بھی بڑی بھرپور سیاسی زندگی گزاری وہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۷ء کو اوغی، ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ (۲۶) انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور، گورنمنٹ کالج لاہور، آکسفورڈ یونیورسٹی اور لنکنز ان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ۱۹۴۴ء میں جب تحریک پاکستان اپنے نقطہ عروج پر تھی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرکے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے وہ صوبائی مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری اور قیام پاکستان کے بعد جنرل سیکرٹری بنے۔ بعدازاں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے طور پر بھی خدمات انجام دیں (۲۷)۔

۱۹۵۸ء میں جناب یوسف خٹک مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ (۲۸) وہ ممتاز محمد خان دولتانہ کی کونسل مسلم لیگ کے رکن تھے۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں جب سردار بہادر خان قائد حزب اختلاف کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے تو جناب یوسف خٹک نے یہ عہدہ سنبھالا (۲۹)۔

جناب یوسف خٹک ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں کامیاب نہ ہوسکے۔ انہیں کوہاٹ کے حلقہ سے پاکستان مسلم لیگ کے امیدوار عظمت علی خاں نے شکست دی تھی (۳۰)۔

۱۹۷۱ء میں انہوں نے مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے ٹکٹ پر ضمنی انتخاب لڑا اور کامیاب رہے۔ (۳۱) ۱۳؍مئی ۱۹۷۱ء کو عدالت نے جناب یوسف خٹک کے حلقے کا انتخاب کالعدم قرار دے دیا مگر جب اس حلقے کا انتخاب دوبارہ منعقد ہوا تو وہ ایک بار پھر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے (۳۲)۔

اسی دوران مسلم لیگ (قیوم گروپ) پاکستان پیپلز پارٹی سے اشتراک عمل کا فیصلہ کر چکی تھی چنانچہ ۲۲؍اکتوبر ۱۹۷۴ء کو جناب یوسف خٹک کو ایندھن، بجلی اور قدرتی وسائل کا مرکزی وزیر بنا دیا گیا (۳۳)۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں جناب یوسف خٹک نے ایک مرتبہ پھر این اے 1 پشاور 1 مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے ٹکٹ پر حصہ لیا۔ اس مرتبہ ان کے مدمقابل ایئر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان تھے۔ یوسف خٹک انہیں بھی شکست دینے میں کامیاب رہے اور قومی اسمبلی کے رکن بن گئے۔ (۳۴)

یوسف خٹک نے عمر کا آخری حصہ سیاست کے میدان سے دور بسر کیا۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے این اے ۱۰ کرک کے کاغذات نامزدگی داخل ضرور کروائے تھے مگر پھر اپنے بڑے بھائی اسلم خٹک کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی اس قربانی کے باوجود اسلم خٹک اس نشست پر منتخب ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ (۳۵)

خٹک برادران کی ہمشیرہ کلثوم خٹک بھی، جو اب کلثوم سیف اللہ کہلاتی ہیں، ایک طویل عرصہ سے عملی سیاست میں ہیں۔

مگر ان سے پہلے کچھ تذکرہ ان کے شوہر سیف اللہ خان کا......سیف اللہ خان کا تعلق غزنی خیل سے تھا انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن اور انگلستان سے بار ایٹ لاء کیا۔ وطن واپس آنے کے بعد سن چالیس کی دھائی میں انہوں نے تجارت کے میدان میں قدم رکھا اور اوج کمال حاصل کیا۔ ۱۹۶۲ء میں وہ بنوں سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور یوں انہوں نے سیاسی میدان میں بھی قدم رکھا۔ (۳۶) ۴؍اپریل ۱۹۶۴ء کو ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ (۳۷)

سیف اللہ خان کے ایک چچا نعمت اللہ خان بھی میدان سیاست کے پرانے کھلاڑی ہیں اور صوبائی اسمبلی اور مجلس شوریٰ کے رکن رہ چکے ہیں۔ (۳۸)

بیگم کلثوم سیف اللہ ۱۹۷۲ء میں سرحد اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ (۳۹) اس اسمبلی میں

ان کے صاحبزادے ہمایوں سیف اللہ بھی موجود تھے...... ابتدا میں ان کی وابستگی نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ تھی مگر بعدازاں وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئیں اور ۱۹۷۷ء میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن بنیں(۴۰)۔ اسمبلی کے جن ارکان نے ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو وزیراعظم نامزد کیا تھا ان میں کلثوم سیف اللہ شامل تھیں(۴۱)۔

بیگم کلثوم سیف اللہ ۱۹۸۵ء کے انتخاب میں حصہ لیا اور صوبہ سرحد سے قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں(۴۲)۔ بعدازاں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور ایک مختصر مدت کے لے مرکزی وزیر بھی رہیں(۴۳)۔

بیگم کلثوم سیف اللہ ۱۹۸۸ء میں بھی اسمبلی کی رکن بنیں(۴۴)۔ مگر چونکہ اس مرتبہ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت تھی اس لیے وہ کابینہ میں شامل نہ ہو سکیں۔ ۱۹۹۰ء کی قومی اسمبلی میں چونکہ خواتین کی نشستیں ختم کردی گئی تھیں اس لیے اس کے بعد وہ قومی اسمبلی کی رکن نہ بن سکیں۔

بیگم کلثوم سیف اللہ کے تین بیٹے بھی اس وقت عملی سیاست میں سرگرم ہیں۔

ان کے بڑے بیٹے ہمایوں سیف اللہ نے ۱۹۷۰ء میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیتا۔ پہلے نیپ کے ساتھ رہے پھر پاکستان پیپلز پارٹی میں چلے گئے (۴۵) اور ۱۹۷۷ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے(۴۶)۔

۱۹۸۸ء میں وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۴۷) مگر سرحد اسمبلی کی اکھاڑ پچھاڑ انہیں ثابت قدم نہ رکھ سکی اور وہ صوبائی وزیر بن گئے۔ ۱۹۹۰ء میں انہیں آئی جے آئی کا ٹکٹ نہیں ملا۔ چنانچہ انہوں نے انتخاب میں حصہ بھی نہیں لیا(۴۸)۔ البتہ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں انہوں نے پی ایف ۶۱ لکی مروت سے انتخاب لڑا تاہم اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے(۴۹)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں ہمایوں سیف اللہ پاکستان مسلم لیگ (ج) کے ٹکٹ پر پی ایف ۶۱ لکی مروت سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۵۰) ۲۰۰۵ء میں وہ لوکل باڈیز کے انتخابات میں لکی مروت کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے(۵۱)۔

ہمایوں سیف اللہ خان، سابق صدر مملکت غلام اسحٰق خان کے سمدھی ہیں اور وہ یوں غلام اسحٰق خان کے اکلوتے صاحبزادے مامون خان ان کے داماد ہیں۔ (۵۲)

ہمایوں سیف اللہ کے چھوٹے بھائی سلیم سیف اللہ نے جنرل فضل حق کی صوبائی کابینہ سے اپنے سیاسی سفر کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۵ء میں وہ سینٹ کے رکن منتخب ہوئے اور جونیجو حکومت میں ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ کے وفاق وزیر رہے۔ (۵۳) ۱۹۹۰ء میں انہوں نے آئی

جے آئی کے ٹکٹ پر سرحد اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے۔ وہ میر افضل خان کی کابینہ میں صنعت' کامرس اور معدنی ترقیات کے صوبائی وزیر بنے (۵۴)۔ ۱۹۹۳ء میں جب نواز شریف کی حکومت کے خلاف استعفوں کی مہم چلی تو انہوں نے بھی اپنا استعفیٰ پیش کر دیا (۵۵)۔ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں وہ پی ایف ۶۲ لکی مروت ۲ سے ایک مرتبہ پھر سرحد اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۵۶)۔ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں بھی انہوں نے اپنی کامیابی کا تسلسل جاری رکھا۔ (۵۷) تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ ملک عمران خان سے صرف ۳۰۹ ووٹوں کے فرق سے شکست کھا گئے (۵۸)۔ سلیم سیف اللہ اپنے ماموں اسلم خٹک کے داماد ہیں (۵۹)۔

ہمایوں سیف اللہ اور سلیم سیف اللہ کے تیسرے بھائی انور سیف اللہ پاکستان کے سابق صدر جناب غلام اسحٰق خان کے داماد ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں وہ این اے ۶۰ بنوں ۲ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۶۰)۔ ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا البتہ دسمبر ۱۹۹۰ء میں سینٹ کے ضمنی انتخابات میں وہ صوبہ سرحد سے بلامقابلہ سینٹ کے رکن منتخب ہو گئے۔ یہ نشست ان کے بھائی سلیم سیف اللہ کے ایم پی اے بننے کی وجہ سے خالی ہوئی تھی مارچ ۱۹۹۱ء میں وہ ایک مرتبہ پھر چھ سال کے لیے سینٹ کے رکن منتخب ہو گئے (۶۱)۔ نواز شریف کی پہلی حکومت میں وہ ماحولیات اور شہری امور کے وفاقی وزیر بنائے گئے۔ (۶۲) ۲۸/ مارچ ۱۹۹۳ء کو انہوں نے وزیراعظم نواز شریف کو مسلم لیگ کا صدر نامزد کرنے کے فیصلے پر عدم اعتماد اور احتجاج کرتے ہوئے اپنا استعفیٰ صدر مملکت کو پیش کر دیا۔ (۶۳) یہیں سے وفاقی اور صوبائی وزراء کے استعفوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو نواز شریف کی حکومت کے خاتمے پر منتج ہوا۔

میر بلخ شیر مزاری کی نگراں کابینہ میں جناب انور سیف اللہ کو ایک مرتبہ پھر وفاقی وزیر بنالیا گیا اور انہیں ماحولیات' تعمیرات اور ورکس کے قلمدان سونپے گئے۔ (۶۴) تاہم ۲۶/ مئی ۱۹۹۳ء کو نواز شریف حکومت کی بحالی کے ساتھ ہی ان کے وزارت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ جنوری ۱۹۹۴ء میں وہ ایک مرتبہ پھر وفاقی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ اس مرتبہ انہیں پٹرولیم کا قلمدان سونپا گیا۔ (۶۵)

جناب انور سیف اللہ نے ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ دونوں مرتبہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۹۷ء میں انہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے محمد کبیر خان مروت نے ہرایا تھا جب کہ ۲۰۰۲ء میں انہیں متحدہ مجلس عمل کے مولانا امان اللہ خان نے شکست سے ہمکنار کیا (۶۶)۔ جناب انور سیف اللہ کی ایک صاحبزادی جناب گوہر ایوب کی بہو ہیں۔ بالالفاظ دیگر صدر غلام اسحٰق خان کی نواسی کی شادی صدر ایوب خان کے پوتے

سے ہوئی ہے (۶۷)۔ بیگم کلثوم سیف اللہ کے ایک اور صاحبزادے اقبال سیف اللہ ہیں وہ جناب گوہر ایوب کے داماد ہیں۔ (۶۸)

حوالہ جات

۱۔ منیر احمد منیر۔ سیاسی اتار چڑھاؤ۔ لاہور۔ ص ۲۱۵

۲۔ اللہ بخش یوسفی۔ سرحد اور جدوجہد آزادی۔ لاہور۔ ص ۱۹۷، ۱۹۸

۳۔ محمد شفیع صابر۔ تاریخ صوبہ سرحد۔ پشاور۔ ۸۳۲ تا ۸۳۴

۴۔ خان عبدالولی خان۔ حقائق حقائق ہیں۔ پشاور۔ ص ۱۲۱

۵۔ احمد سلیم۔ خان بہادر قلی خان اینڈ دی ملاز۔ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ یکم تا ۷ جولائی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۶۔ علی حسن۔ پاکستان جرنیل اور سیاست۔ لاہور۔ ص ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۰

۷۔ ایم اے کے چودھری۔ مارشل لاء کا سیاسی انداز۔ لاہور۔ ص ۹۵

۸۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۷۵۵، ۷۵۶

۹۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۵۱، ۴۹۶، ۴۹۷

۱۰۔ اظہر سہیل۔ سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک۔ لاہور۔

۱۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۶۵

۱۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز۔ جلد دوم۔ ص ۸

۱۳۔ احمد سلیم۔ ٹوٹی بنتی اسمبلیاں۔ لاہور۔ ص ۳۵۲، ۳۵۳

۱۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ را کتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۴۸

۱۵۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء۔ (جلد اول) لاہور۔ ص ۳۰

۱۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۴ راپریل ۱۹۹۳ء

۱۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ را کتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۱۸

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم اسلام آباد۔ ص ۵۷۹

۱۹۔ علی حسن۔ پاکستان، جرنیل اور سیاست۔ لاہور۔ ص ۲۹۷، ۲۹۸

۲۰۔ م۔ ب۔ خالد۔ ایوان صدر میں سولہ سال۔ لاہور۔ ص ۱۳۶، ۱۳۷

۲۱۔ صدیق الحسن گیلانی۔ ''صنعت کار سرمایہ لگائے بغیر کروڑ پتی بن جاتے ہیں''۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۲۶ رجنوری ۱۹۷۰ء۔ ص ۴۱، ۴۲

۲۲۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۲۵۴

۲۳۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۸۸ء۔ ص ۱۲۵
۲۴۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص۴۰۰' ۴۰۱
۲۵۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۸۰۳
۲۶۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان۔ (۶۱۔۱۹۶۰ء)۔ لاہور۔ ص ۸۱
۲۷۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۷۷۹
۲۸۔ منیر احمد منیر۔ سیاسی اتار چڑھاؤ۔ لاہور۔ ص ۲۱۳
۲۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۶۸
۳۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۳/مارچ ۱۹۶۵ء
۳۱۔ منیر احمد منیر۔ سیاسی اتار چڑھاؤ۔ لاہور۔ ص ۲۱۳
۳۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔
۳۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۸۵
۳۴۔ ایضاً۔ ص ۱۶۳
۳۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۶۵
۳۶۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۶۰۷' ۶۰۸
۳۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۶/اپریل ۱۹۶۴ء
۳۸۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۶۰۷
۳۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۴/مئی ۱۹۷۲ء
۴۰۔ ایضاً۔ ۲۸/مارچ ۱۹۷۷ء
۴۱۔ ایضاً۔ ۲۹/مارچ ۱۹۷۷ء
۴۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵۔ لاہور۔ ص ۲۹۷
۴۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۹۷
۴۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۴۲۳
۴۵۔ ادارہ۔ اے پولیٹکل پروفائل آف سیف اللہ ز۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۰/تا ۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۶
۴۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴/مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۳۵۲
۴۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۸۸۔
۴۸۔ ایس اے جعفری۔ پولیٹکل فیملیز آف این ڈبلیو ایف پی۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۸۸

۴۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۲۸
۵۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۶۰۷
۵۱۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء
۵۲۔ وکیل انجم۔ سیاست پر چھائے ہوئے حکمران گھرانے۔ روزنامہ جنگ۔ کراچی (سنڈے میگزین) ۷/اگست ۲۰۰۵ء
۵۳۔ ایس اے جعفری۔ پولیٹکل فیملیز آف این ڈبلیو ایف پی۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۸۷
۵۴۔ موسیٰ خان جلالی زئی۔ کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟ لاہور۔ ص ۴۸۹
۵۵۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۶/اپریل ۱۹۹۳ء
۵۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر۱۹۹۳ء۔ ص۱۵۲۹
۵۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۲۰۸
۵۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵/اکتوبر۲۰۰۲ء۔ ص ۳۱۵۵
۵۹۔ احمد سلیم۔ خان بہادر قلی خان اینڈ دی ملاز۔ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ یکم تا ۷/جولائی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳
۶۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص۲۷
۶۱۔ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائریکٹری آف ممبرز ۹۴-۱۹۹۳ء۔ ص ۳۷
۶۲۔ ڈوگر برادرز۔ پاکستان اور دنیا میں کون کیا ہے؟ لاہور۔ ص۴۸۳
۶۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۹/ مارچ ۱۹۹۲ء
۶۴۔ ہفت روزہ اخبار جہاں۔ کراچی۔ ۱۰/تا ۱۶/مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۸
۶۵۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۶۷/جنوری ۱۹۹۴ء۔
۶۶۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور ص ۲۲۰
۶۷۔ محمد ریاض۔ پاکستان کا سدا بہار خاندان (رپورٹ)۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۴ء
۶۸۔ اظہر سہیل۔ ایجنسیوں کی حکومت۔ لاہور۔ ص ۹۹

راجگان گکھڑ

ہزارہ میں آباد گکھڑ کے راجگان بھی ایک طویل سیاسی پس منظر کے حامل ہیں اور عرصہ دراز سے سرحد کے سیاسی منظرنامے پر چھائے ہوئے ہیں۔

اس خاندان کے جد امجد سلطان سارنگ تھے جن کا پوتا سلطان فتح خان سولھویں صدی میں خان پور میں آباد ہوا۔ یہ علاقہ سلطان سارنگ نے اپنے پوتے کو عطا کیا تھا چنانچہ اس وقت سے اب تک یہ علاقہ اس کی اولاد کے قبضے میں چلا آ رہا ہے۔ خان پور گکھڑوں نے اپنی خودمختاری ۱۸۳۱ء تک برقرار رکھی یعنی اس وقت تک، جب سکھوں کا ہزارہ پر اچھی طرح تسلط ہو گیا۔

اس دوران احمد شاہ درانی کے عہد میں، اس ضلع کے زیریں حصہ میں امن رکھنے کا انتظام گکھڑوں کے سپرد ہوا اور ان کو جنگی خدمات کے صلے میں بڑی بڑی تنخواہیں ملیں۔ جب درانیوں کی سلطنت میں ضعف آ گیا تو یہ اقوام اگرچہ اتنی جرات تو نہ کر سکیں کہ اپنے آپ کو خودمختار ظاہر کریں مگر اپنے قدیمی حاکموں سے نفرت کرنے لگیں۔ اس زمانے میں راجہ سلطان جعفر خان نے علاقے میں امن وامان قائم رکھا۔

درانیوں کے بعد اس علاقے پر سکھوں کا قبضہ ہوا۔ ابتداء میں گکھڑوں نے سکھوں کا ساتھ دیا مگر سکھ سردار بڑے اکھڑ، بے رحم اور بے درد نکلے۔ انہوں نے ہزارے کے عوام کو ایسا پیسا کہ پہلے کسی نے ایسا پیسا نہ تھا۔ نتیجہ ہزارے کے عوام کی بغاوت کی شکل میں نکلا۔ ابتدا میں سکھوں نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے طاقت کا سہارا لیا مگر جب پے در پے ان کے کئی سردار مارے گئے تو سردار امر سنگھ مجیٹھ نے اپنے حسن سلوک سے رئیسان گکھڑ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس وقت تک خان پور کے گکھڑوں کو خودمختار جاگیرداروں کا منصب حاصل تھا۔ انہوں نے سکھوں کی حکومت کو تسلیم کیا مگر خراج کبھی کسی کو نہیں دیا۔

۱۸۲۰ء میں ہزارہ کا علاقہ سردار ہری سنگھ نلوہ ناظم کشمیر کے سپرد کیا گیا مگر اس سے یہ انتظام نہ چل سکا۔ سردار ہری سنگھ نے ہزارہ پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے ہر ایک پر بلا تمیز

حملہ کیا۔ چنانچہ گکھڑوں کی حالت خراب سے خراب ہوتی گئی۔ سردار ہری سنگھ نے وقت پر نذرانہ ادا نہ کرنے پر راجہ نجف خان کو علاقے سے باہر نکال دیا اور خان پور میں ایک قلعہ تعمیر کروایا۔ چند برس بعد راجہ نجف خان کی غلطی معاف ہوئی اور پہلے اسے پینشن اور پھر جاگیر عطا کی گئی۔

راجہ نجف خان کا بیٹا راجہ حیدر بخش تھا۔ جس نے ۱۸۴۶ء میں برطانوی حکومت اور دربار لاہور کے مابین ہونے والے عہدنامہ کے نتیجے میں دربار لاہور کی اطاعت قبول کی۔

۱۸۴۷ء میں اس علاقے پر دربار لاہور کا قبضہ ہوگیا۔ لاہور سے کیپٹن جیمز ایبٹ ہزارہ آئے اور ان کے انتظام کے سبب علاقے میں امن وامان قائم ہوگیا۔

مگر یہ امن وامان زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا اور جنوری ۱۸۴۸ء میں امیر کابل دوست محمد خان کے لیے غلام حیدر خان نے کشمیر پر قبضے کی نیت سے ہزارہ پر حملہ کر دیا۔ ضلع ہزارہ کے کئی روسانے جن میں گکھڑ شامل نہ تھے' اس کا ساتھ دیا مگر انگریزوں نے جلد ہی ان باغیوں میں آپس میں پھوٹ پڑوادی اور یہ پورا علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔

خان پور کے گکھڑوں نے اس مشکل وقت میں جیمز ایبٹ کا ساتھ دیا اور اسے افرادی قوت کے علاوہ مالی امداد بھی فراہم کی۔ علاقے پر قبضے کے بعد جیمز ایبٹ نے گکھڑوں کی قدیمی جاگیریں واگزار کردیں اور وعدہ کیا کہ گکھڑوں نے جن مزید علاقوں کی ملکیت کے بارے میں دعوے کیے ہیں' وہ بھی انہیں عطا کر دیے جائیں گے' چناچہ گکھڑ بدستور انگریزوں کے وفادار رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔

انگریزوں نے بھی اپنے وعدوں کے ایفا میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ انہوں نے راجہ نجف خان کے بیٹے راجہ حیدر بخش خان اور اس کے رشتے کے چچا راجہ علی گوہر خان کو اپنے علاقے کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا اور اس خاندان کے کئی افراد کو جن میں راجہ عطا علی خان اور راجہ محمد خان کے نام سرفہرست تھے' دوامی جاگیریں عطا کیں۔

راجہ حیدر بخش خان کا بیٹا راجہ جہانداد خان (۱۸۵۱ء۔۱۹۰۲ء) تھا۔ اسے انگریزوں نے ۱۸۷۷ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور اس کی سالانہ تنخواہ ۴۸۰۰ روپے مقرر کی۔ راجہ جہانداد خان نے کابل میں پولیٹیکل افسر کے فرائض بھی انجام دیئے جس کے صلے میں اس کو خان بہادر کا خطاب اور چھ سو روپے کی جاگیر عطا ہوئی۔ (۱)

راجہ جہاں داد خان کے تین بیٹے ہوئے۔ راجہ حیدر زمان' راجہ صفدر زمان اور راجہ منوچہر خان۔ ان میں راجہ حیدر زماں اس کی اولاد اب تک خاندان کی سربراہ ہے۔

راجہ حیدر زماں ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ۱۹۴۶ء میں صوبہ سرحد کی قانون ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا۔ یہ انتخاب اس نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر جیتا تھا اور اپنے علاقے میں ڈاکٹر خان

تھا کہ قصور پیپلز پارٹی کا مضبوط گڑھ ہے اور وہ پیپلز پارٹی کی مدد کے بغیر انتخابات میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ قصوری نے دھوم دھڑکے کے ساتھ پیپلز پارٹی میں واپس آنے کا اہتمام کیا۔ اس نے بیگم نصرت بھٹو سے درخواست کی کہ وہ پارٹی میں اس کی واپسی کے موقع کو اپنی موجودگی سے عزت بخشیں۔ اس استقبالیہ میں اس نے وزیراعظم کی بے حد تعریف کی۔ اس کی ماں نے سرعام اعلان کیا کہ وہ وزیراعظم پر اپنے تمام بیٹے قربان کردیں گی کیونکہ وزیراعظم بھٹو کے بغیر پاکستان باقی نہیں رہے گا(۸)۔

احمد رضا قصوری' آئندہ انتخابات میں پارٹی کے ٹکٹ کے حصول کی خواہش میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ جنوری ۱۹۷۷ء میں اس نے قومی اسمبلی میں وزیراعظم کی زرعی اصلاحات کی ان الفاظ میں تعریف کی۔

''میں قومی اسمبلی سے ایسے تاریخی موقع پر خطاب کر رہا ہوں جب ہم پاکستان میں انقلابی زرعی اصلاحات کو متعارف کروا رہے ہیں۔ مسٹر اسپیکر' اگر میں وزیراعظم بھٹو اور ان کی حکومت کو پاکستان میں انقلابی اصلاحات کے نفاذ پر مبارکباد نہ دوں تو میں اپنے فرائض میں کوتاہی برتوں گا۔''

قصوری کو احساس تھا کہ لوگ اس کی ان باتوں پر حیران ہوں گے اس لئے اس نے مزید کہا ''میں راست باز اور کھرے آدمی کی شہرت رکھتا ہوں۔ میں ایوان کے اس طرف سے اس حکومت کا سخت نکتہ چین تھا اس لئے کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ جب میں اس حکومت کی تعریف کرتا ہوں تو یہ چاپلوسی ہے۔ اس ملک میں بہت سے وزرائے اعظم آئے لیکن موجودہ وزیراعظم جو اس ملک کے ناؤ کو کھے رہے ہیں' ان کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا(۹)

کیا قصوری اسمبلی کے فلور پر جھوٹ بول رہے تھے یا یہ اُس کا آئندہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنے کا ایک حربہ تھا۔ اس کے بارے میں خود وہی بہتر بتا سکتا ہے۔

بہرحال مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے لئے پاکستان پیپلز پارٹی نے احمد رضا قصوری کو ٹکٹ نہیں دیا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس کی چالبازی اسے کچھ نہ دلاسکی پارٹی کے پارلیمانی بورڈ نے اس کو متلون مزاج قرار دے دیا اور کہا کہ اس کے دوست بھی اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے۔

بھٹو نے لکھا ہے کہ قصوری کے باپ کے قتل کے حوالے سے انہیں کوئی احساس جرم ہوتا تو وہ اس کا منہ ٹکٹ دے کر بند کر دیتے جس کے لئے وہ بھیک مانگ رہا تھا۔ انہوں نے ایسا غیر جماعتی انتخابات میں اس نے این اے ۱۴ ایبٹ آباد ۳ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر گوہر ایوب خان کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں اس نے گوہر ایوب خان سے صلح کرلی اور آئی جے آئی کے ٹکٹ پر ایک مرتبہ پھر اسی حلقے سے انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ اس کے مقابل

امیدوار بیگم بلقیس نصر من اللہ اور عمر اصغر خان تھے جنہیں اس نے خاصے بڑے مارجن سے شکست دی اور یوں پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہوگیا(۱۰) ان انتخابات میں اس نے صوبائی اسمبلی کی نشست پی ایف ۳۹ ایبٹ آباد ۶ پر بھی کامیابی حاصل کی۔ جسے اس نے قومی اسمبلی کی نشست برقرار رکھنے کے لیے خالی کردیا۔ بعدازاں اس نشست پر ضمنی انتخابات منعقد ہوئے جن پر پاکستان پیپلز پارٹی کا سید بیدار حسین شاہ کامیاب ہوگیا۔(۱۱)

۱۹۹۰ء میں اس نے قومی اسمبلی کی بجائے صرف صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا یہ انتخاب اس نے ایک مرتبہ آئی جے آئی کے ٹکٹ پر لڑا اس کے مدمقابل پیپلز پارٹی کا سید کے بعد اسے صوبہ سرحد کی کابینہ میں سینیئر وزیر مقرر کیا گیا۔(۱۲)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں راجہ سکندر زمان نے اپنی بجائے اپنے بیٹے راجہ عامر الزماں کو صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑوایا۔ جس نے یہ انتخاب پاکستان مسلم لیگ (ج) کے ٹکٹ پر لڑا۔ دوسری طرف پاکستان مسلم لیگ (ن) نے سردار محمد مشتاق خان کو اپنا امیدوار نامزد کیا۔ جو یہ انتخاب تقریباً ۱۴۰۰ ووٹوں سے جیت گیا۔(۱۳)

نومبر ۱۹۹۶ء میں جب صدر فاروق لغاری نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر از سر نو انتخابات کا فیصلہ کیا تو انہوں نے راجہ سکندر زمان کو صوبہ سرحد کا نگراں وزیر اعلیٰ مقرر کیا۔ وہ اس عہدے پر ۱۲/نومبر ۱۹۹۶ء سے ۲۱/فروری ۱۹۹۷ء تک فائز رہا۔(۱۴)

راجہ سکندر زمان جب صوبے کا نگران وزیر اعلیٰ تھا تو اسی زمانے میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد ہوئے۔ راجہ سکندر زماں کے صاحبزادے راجہ عامر الزماں نے ایک مرتبہ پھر پی ایف ۳۹ ہری پورون سے سرحد اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سردار محمد مشتاق خان سے دوبارہ شکست کھا گیا اس مرتبہ اس نے یہ انتخاب آزاد حیثیت سے لڑا تھا۔(۱۵)

۲۰۰۱ء میں راجہ عامر الزماں نے ہری پور کے ضلعی ناظم کے انتخاب میں کامیابی حاصل کی۔ تاہم ۲۰۰۵ء میں وہ اس نشست پر بھی شکست کھا گیا۔(۱۶)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں راجہ عامر الزماں کے چھوٹے بھائی راجہ فیصل زماں نے پی ایف ۴۹ ہری پور سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس نے یہ انتخاب آزاد حیثیت میں لڑا اور اپنے بھتیجے راجہ شیراز حیدر کو شکست دے کر نہ صرف سرحد اسمبلی کا رکن بنا بلکہ صوبائی کابینہ میں بھی جگہ پانے میں کامیاب ہوگیا جہاں اسے کھیل اور ثقافت کا قلم دان دیا گیا۔(۱۷)

راجہ جہاں داد خان کے چھوٹے بیٹے راجہ منوچہر خان نے بھی ایک مختصر عرصہ سیاست کے میدان میں گزارا۔ انہوں نے ۱۹۴۶ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر سرحد اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر اپنے بڑے بھائی راجہ حیدر زماں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ راجہ منوچہر خان نے ۱۹۵۵ء میں وفات

پائی۔ راجہ منوچہر خان کی ایک بیٹی کی شادی اس کے بھتیجے راجہ سکندر زمان سے ہوئی تھی جب کہ اس کی دو پوتیوں (راجہ بشارت ملک کی بیٹیوں) کی شادیاں راجہ سکندر زمان کے صاحبزادگان راجہ شاداب خان اور راجہ فیصل زمان سے ہوئی ہیں یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ راجہ بشارت ملک کی اہلیہ راجہ سکندر زمان کی بہن تھیں۔ (۱۸)

راجہ حیدر زمان اور حیدر منوچہر کے منجھلے بھائی راجہ صفدر زمان خان (۱۸۹۷ء۱۹۴۴ء) تھے انہوں نے خود تو سیاست کے میدان میں نام نہیں کمایا البتہ ان کے برادر نسبتی مہدی زمان خان نے کئی مرتبہ عام انتخابات میں حصہ لیا۔

مہدی زمان خان نے قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے خان بہادر سلطان محمد خان کو شکست دی۔ (۱۹)

۱۹۶۲ء میں وہ صوبائی اور قومی دونوں اسمبلیوں کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ قومی اسمبلی کی نشست پر انہوں نے صدر ایوب خان کے بھائی سردار بہادر خان سے شکست کھائی جب کہ صوبائی اسمبلی کی نشست پر انہیں سلطان محمد خان نے ہرایا۔ ۱۹۶۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست پر صدر ایوب خان کے صاحبزادے گوہر ایوب خان کا مقابلہ کیا مگر اس مرتبہ بھی وہ کامیاب نہ ہوسکے (۲۰) خاں مہدی زماں خان سابق وزیر اعظم پاکستان چودھری محمد علی کی سیاسی جماعت نظام اسمبلی پارٹی سے بطور نائب صدر منسلک تھے۔ بعدازاں وہ پاکستان جمہوری پارٹی میں بھی اسی منصب پر فائز رہے۔ نومبر ۱۹۷۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ (۲۱)

مہدی زمان خان کے کزن خان بہادر محمد زمان خان ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں سرحد کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے تھے جب کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں وہ کامیاب نہیں ہوسکے تھے (۲۲) خان بہادر محمد زمان خان نے ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر صدر ایوب خان کے بھائی سلطان احمد خان کے ہاتھوں شکست کھا گئے تھے (۲۳) خان بہادر محمد زمان خان نے ۱۹۶۷ء میں وفات پائی (۲۴) ان کی وفات کے دس برس بعد ان کا بیٹا شوکت زمان پاکستان پیپلز کے ٹکٹ پر سرحد اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا۔ (۲۵)

خان بہادر محمد زمان کے دادا کا نام میر زمان خان تھا جو انگریزوں کا بڑا دلیر اور وفادار معاون تھا اس کی مدد سے جیمز ایبٹ نے سکھوں کو شکست دی تھی اور اس کے صلے اسے پندرہ سو روپے سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی۔

کرنل چارلس میسی نے اپنی کتاب پنجاب چیفس میں لکھا ہے کہ پنجاب کے الحاق کے وقت سے کھلابٹ کا خاندان سید خانی بڑا وفادار اور نیک چلن رہا ہے اور انگریزی حکومت کے قیام میں ہزارے کے کسی رئیس نے میر زمان خان اور اس کے بھائیوں، میر قلندر خان اور عبداللہ خان سے زیادہ مدد نہیں دی ہے۔ ان بھائیوں نے ۱۸۵۲ء کی فوج کشی میں بھی ایبٹ کی مدد کی تھی اور ۱۸۵۷ء

کی جنگ میں بھی سوار اور پیادے فراہم کیے تھے۔

ان خدمات کے بدلے میں انگریزوں نے میر زمان خان کو آنریری مجسٹریٹ اور قلندر خان اور اس کے چچازاد بھائی علی اکبر خان کو جاگیریں عطا کیں اور اس کے خاندان کے کئی اور قلندر خان اور اُس کے چچازاد بھائی علی اکبر خان کو جاگریں عطا کیں اور اُس کے خاندان کے کئی افراد کو بنگال اور پنجاب کے فوجی دستوں میں ملازمتیں فراہم کیں۔ انگریزوں کے زمانے میں خان زماں خان اور اس کا بھائی علی بہادر خان' وائسریگل درباری تھے۔(۲۶)

حوالہ جات

۱۔ کرنل چارلس میسی۔ روسائے بااختیار ونامی خاندان (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔ لاہور۔ ص۱۳۳ تا۱۴۱

۲۔ راجہ دائرالزمان گکھڑخانپوری۔تاریخ گکھڑاں۔راولپنڈی۔ص۴۶۰تا۴۶۲

۳۔ ایضاً۔ص۴۶۲'۴۶۳

۴۔ ایضاً۔ص۴۶۲ تا۴۶۷

۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان' اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۳۱۵

۶۔ راجہ دائرالزمان۔ تاریخ گکھڑاں۔راولپنڈی۔ص۴۷۱'۴۷۲

۷۔ وکیل انجم۔ سیاستدانوں کی قلابازیاں۔ جلداول۔ص۷۰۷

۸۔ راجہ دائرالزماں۔ تاریخ گکھڑاں۔راولپنڈی ص۴۷۲

۹۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان (حصہ اول)۔ کراچی۔ ص۴۹۴

۱۰۔ طارق اسمٰعیل۔الیکشن ۸۸ء۔لاہور۔ص۱۱۸۔

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان' اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۸۸ء' جلد اول۔ ص۲۵۱

۱۲۔ ایضاً رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص۴۱۴

۱۳۔ ایضاً۔ایضاً۔۱۹۹۳ء جلد دوم۔ص۶۱۴

۱۴۔ ولی محمد ڈوگر' شاہد محمود ڈوگر۔ ہواز ہو اینڈ وہاٹ از وہاٹ۔ لاہور۔ص۱۷

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد' جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ص۵۸۵

۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کی ویب سائٹ www.ecp.gov.pk

۱۷۔ صوبہ سرحد کی ویب سائٹ www.nwfp.com.pk

۱۸۔ راجہ دائرالزماں۔تاریخ گکھڑاں۔راولپنڈی۔ص ۴۸۸ تا ۴۹۱
۱۹۔ اسٹیفن ایلن رٹن برگ۔ دی انڈی پنڈنس موومنٹ ان انڈیاز نارتھ ویسٹ فرنیٹر پراونس، ۱۹۰۱ء تا ۱۹۴۷ء (غیر مطبوعہ مقالہ) کولمبیا یونیورسٹی۔ص ۲۲۲، ۳۵۴
۲۰۔ وکیل انجم\سیاستدانوں کی قلابازیاں، جلد اول لاہور۔ص ۳۶۲، ۳۷۱، ۴۴۹
۲۱۔ محمد شفیع صابر۔شخصیات سرحد۔پشاور۔ص ۶۳۵، ۶۳۶
۲۲۔ اسٹیفن ایلن رٹن برگ۔ دی انڈی پنڈنس موومنٹ ان انڈیاز نارتھ ویسٹ فرنیٹر پراونس، ۱۹۰۱ء تا ۱۹۴۷ء (غیر مطبوعہ مقالہ)۔کولمبیا یونیورسٹی ص ۲۲۲، ۲۲۸، ۳۵۴
۲۳۔ وکیل انجم۔سیاستدانوں کی قلابازیاں۔جلد اول لاہور۔ص ۳۷۱
۲۴۔ سید آل احمد رضوی۔عظمت رفتہ۔ایبٹ آباد۔ص ۳۳۷
۲۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔اسلام آباد۔۲۴/مارچ ۱۹۷۷ء۔ص ۳۳۵۱
۲۶۔ کرنل چارلس میسی۔روسائے بااختیار اور نامی خاندان (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔لاہور۔ ص۔۱۵۲، ۱۵۳

شیرپاؤ

صوبہ سرحد کی مقامی سیاست میں شیرپاؤ خاندان' گزشتہ نصف دہائی سے متحرک ہے۔ اور سیاست میں نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔

اس خاندان کے سربراہ غلام حیدر خان شیرپاؤ کا تعلق ہشت نگر کے شیرپاؤ گاؤں سے تھا۔ وہ صاحبزادہ عبدالقیوم کے متعدد ساتھیوں میں شامل تھے اور انگریزوں کی وفاداری اور بعض "اہم" خدمات کی انجام دہی کے باعث خان بہادر کا خطاب حاصل کر چکے تھے ان کی ان اہم خدمات کی تفصیل خان عبدالولی خان نے اپنی کتاب "حقائق حقائق ہیں" میں سر جارج کننگھم کی غیر مطبوعہ ڈائری کے حوالے سے بڑی تفصیل سے رقم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے بعد یہاں ہندوستان میں انگریز اور کانگریس کے مابین اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ کانگریس کے آٹھ صوبوں کی وزارتیں مستعفی ہو گئیں اور حالات آہستہ آہستہ محاذ آرائی کی طرف جانے لگے تو صوبے کے گورنر (سر جارج کننگھم) نے یہ ضروری جانا کہ قبائلی علاقوں اور افغانستان کے علاوہ صوبہ سرحد میں بھی ملاوں کو منظم کرے اور اپنا رابطہ ان سے قائم کرے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت تک جنگ میں صرف اٹلی اور جرمنی ہی کودے تھے۔ انگریز نے یہ بہتر جانا کہ روس کے متعلق اپنا مخالفانہ پروپیگنڈا ذرا کم کر دے اور پورا زور اٹلی اور جرمنی کی مخالفت پر صرف کر دے۔ کننگھم نے ملاوں کے تین گروپ بنائے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ملا' علاقے کے خوانین اور بااعتبار خان بہادروں کے حوالے کر دیئے تھے' جو ان سے ذرا اونچے مرتبے کے تھے ان سے رابطہ ڈپٹی کمشنر کے ذریعہ قائم کر رکھا تھا اور جو سب سے بڑے یعنی "کبریٰ" تھے' ان سے گورنر نے خود رابطہ قائم کر رکھا تھا۔

چھوٹے ملا' ہشت نگر کے شیرپاؤ گاؤں کے غلام حیدر خاں' خان بہادر کے حوالے تھے اس نے نو دس ملاوں کو اکٹھا کیا جو وہیں یعنی راجہ' کوٹ' ترناب' تنگی' اتمان زئی' عمرزئی' پرانگ اور چارسدہ کے تھے۔ غلام حیدر شیرپاؤ ہر ملا سے الگ الگ ملتا تھا اور انہیں ۴۰ یا ۵۰ روپے کے

عوض "اسلام" کی خدمت کرنے کے لئے تیار کرتا تھا۔ ہر ملا تین چار ماہ بعد آ کر اپنی کارگزاری بیان کرتا تھا کہ اس نے کیا کچھ کیا ہے لارڈ کننگھم نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا کہ میں نے خان بہادر غلام حیدر شیرپاؤ کو چھ سو روپے دیئے جو اس نے ملاؤں میں تقسیم کر دیئے"۔ (۱)

ولی خان مزید لکھتے ہیں۔ "جب انگریزوں نے محسوس کیا کہ وہ دینی اور مذہبی محاذ پر تو اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ قابو پا چکا ہے مگر سیاسی اور دنیاوی محاذ ابھی اس کے قبضے میں نہیں آیا تو اس نے انہی خان بہادروں اور نوابوں کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کی ہدایت کی اور بہت جلد انگریزوں کے یہ ایجنٹ جن میں خان بہادر قلی خان، خان بہادر غلام حیدر شیرپاؤ، نواب ظفر علی اور تاج علی (بنوں) کے نام نمایاں تھے۔ مسلم لیگ کے اہم رہنماؤں میں شمار ہونے لگے" (۲)

خان بہادر غلام حیدر شیرپاؤ نے بعد ازاں مسلم لیگ کی ہدایت پر خان بہادر کا خطاب واپس کر دیا اور ۱۹۴۷ء کی سول نافرمانی کی تحریک کے دوران قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کی (۳) قیام پاکستان کے بعد جب قائد ملت لیاقت علی خان پشاور کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ خان صاحب اس دورے میں ان کے ہمراہ تھے۔ اس دورے کے دوران ان پر اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ اسی وقت انتقال کر گئے (۴)

انہی خان بہادر غلام حیدر خان شیرپاؤ کے بڑے صاحبزادے حیات محمد خاں شیرپاؤ تھے۔ وہ یکم فروری ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ دور طالب علمی سے ہی انہوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہ کونسل مسلم لیگ کے اسٹیج سے سیاسی میدان میں وارد ہوئے لیکن ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخاب میں انہوں نے کھل کر مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا (۵)

نومبر ۱۹۶۷ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلزپارٹی کی بنیاد رکھی تو حیات محمد خاں شیرپاؤ اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں پیپلزپارٹی کی تنظیم میں بھرپور حصہ لیا۔ دسمبر ۱۹۶۷ء میں انہیں پیپلزپارٹی صوبہ سرحد کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ (۶)

دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں وہ سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے قیام کے بعد صوبہ سرحد کے گورنر بنائے گئے۔ ۲ر مئی ۱۹۷۲ء کو وہ مرکزی کابینہ میں شامل ہوئے (۷) وہ تقریباً دو برس مرکزی کابینہ میں شامل رہے پھر انہیں سرحد کی صوبائی کابینہ میں سینئر وزیر کے طور پر شامل کر لیا گیا۔ (۹)

حیات محمد خان شیرپاؤ کی جرات، محنت اور جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان پیپلزپارٹی نے صوبہ سرحد میں اپنے لئے ایک باوقار مقام پیدا کر لیا اور اس کی مقبولیت کسانوں مزدوروں اور عام طبقات تک پھیلتی چلی گئی۔ یہ یقین پیدا ہو چلا تھا کہ آئندہ عام انتخابات میں پاکستان پیپلزپارٹی سرحد کی واحد نمائندہ پارٹی کے طور پر ابھر کر سامنے آئے گی اور خوانین کی مخصوص بورژوائی سیاست کا خاتمہ کر دے گی۔ (۱۰)۔ مگر اس سے پہلے کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوتا وہ ۸ر فروری

۱۹۷۵ء کو پشاور یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کی ایک تقریب میں بم کے دھماکے کے ذریعے شہید کر دیئے گئے۔ (۱۱) اس واقعہ کے پیش نظر نیشنل عوامی پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور حکومت نے اس جماعت کے ارکان کو گرفتار کر کے' ان کے خلاف سپریم کورٹ میں ریفرنس پیش کیا۔ (۱۲)

حیات محمد خاں شیرپاؤ کی شہادت کے بعد ان کے چھوٹے بھائی آفتاب احمد خاں شیرپاؤ نے جو اس وقت پاکستان بریہ میں میجر کے عہدے پر فائز تھے اپنے بھائی کے بلند کئے ہوئے پرچم کو تھام لیا۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں آفتاب احمد شیرپاؤ نے این اے ۳ پشاور ۳ سے قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا۔ ان کے مد مقابل سردار شیر باز خاں مزاری تھے۔ لیکن آفتاب شیرپاؤ نے انہیں شکست دے کر یہ نشست باسانی جیت لی۔ (۱۳) وہ صوبائی اسمبلی کی ایک نشست پر بھی امیدوار تھے اور اس نشست پر بھی انہیں کوئی شکست نہ دے سکا۔ (۱۴) انتخابات کے بعد آفتاب شیرپاؤ نے صوبائی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی اور صوبہ سرحد کی کابینہ میں لوکل باڈیز کے وزیر بن گئے۔ (۱۵)

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کے بعد آفتاب احمد شیرپاؤ نے بڑی ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کی جو کسی بھی سیاسی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا پرجوش کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی انہوں نے دیگر صوبوں کے مقابلے میں پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی تنظیم پر بھرپور توجہ دی۔ جس کے نتائج ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں سامنے آئے۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا اور دونوں میں ہی کامیاب رہے۔ بعد ازاں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست چھوڑ کر صوبائی سیاست کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا اور ۲؍ دسمبر ۱۹۸۸ء کو وہ سرحد کی وزارت اعلیٰ پر متمکن ہو گئے۔ ابتدا میں انہیں عوامی نیشنل پارٹی کے ارکان کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن وزارت سے اے این پی کے وزراء کی علیحدگی کے بعد بھی ان کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی اور ۶؍ اگست ۱۹۹۰ء یعنی اسمبلیاں ٹوٹنے تک وہی صوبہ کے وزیراعلیٰ رہے۔ (۱۷)

اسمبلی ٹوٹنے کے بعد آفتاب احمد شیرپاؤ نے پشاور ہائی کورٹ میں گورنر کے اس اقدام کو چیلنج کر دیا۔ ہائی کورٹ کے ایک فل بنچ نے ۲۶؍ ستمبر ۱۹۹۰ء کو اس رٹ پٹیشن کو منظور کرتے ہوئے گورنر سرحد کے اس اقدام کو' جس کے تحت صوبائی اسمبلی توڑ دی گئی تھی' کالعدم قرار دے کر سرحد اسمبلی اور کابینہ کو بحال کرنے کا حکم دے دیا۔ پشاور ہائی کورٹ کا فل بینچ جسٹس

سوار فخر عالم، جسٹس عنایت علی خان، جسٹس نذیر احمد بھٹی، جسٹس قاضی محمد جمیل اور جسٹس سید ابن علی پر مشتمل تھا۔ آفتاب احمد شیرپاؤ نے یہ فیصلہ ملتے ہی ۲۸ ارکان اسمبلی کی جانب سے اسپیکر سرحد اسمبلی بیرسٹر مسعود کوثر کو اسمبلی کا اجلاس بلانے کی ریکوزیشن پہنچادی مگر اس سے قبل کہ اسپیکر وہ اجلاس طلب کرتے، صوبائی ایڈووکیٹ جنرل نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جسٹس عثمان علی شاہ سے، جو اتفاقاً پشاور میں ہی موجود تھے، حکم امتناعی حاصل کرلیا اور یوں ایک بحال ہوتی ہوئی اسمبلی پھر ٹوٹ گئی۔ (۱۸)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں آفتاب احمد خاں شیرپاؤ نے ایک مرتبہ پھر قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا۔ مگر اس مرتبہ وہ قومی اسمبلی کا انتخاب نہیں جیت سکے۔ البتہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیت کر وہ صوبائی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف ضرور بن گئے۔ (۱۹)

۱۹۹۳ء میں جب صدر غلام اسحٰق خان نے قومی اسمبلی توڑی اور نواز شریف کابینہ برطرف کی تو جناب آفتاب شیرپاؤ نے نگراں کابینہ میں وزیر کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ (۲۰) انہیں دفاعی پیداوار کا قلمدان سونپا گیا۔ (۲۱) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں آفتاب احمد شیرپاؤ نے فقط صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اور کامیاب ہوئے (۲۲) ابتدا میں وہ اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کے منصب پر فائز ہوئے تاہم بعد ازاں انہوں نے ۳؍ فروری ۱۹۹۴ء کو آزاد ارکان اسمبلی کو اپنے ساتھ ملا کر وزیر اعلیٰ صابر شاہ کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کردی۔ اس قرارداد پر ۲۳ فروری ۱۹۹۴ء کو رائے شماری ہونی تھی مگر اس سے قبل کہ یہ رائے شماری ہوتی۔ اسپیکر نے دو ایسے ارکان اسمبلی، جنہوں نے فلور کراسنگ کی تھی نااہل قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صوبہ میں گورنر راج نافذ ہوگیا۔ ۲۲؍اپریل ۱۹۹۴ء کو سرحد اسمبلی بحال ہوئی اور زبردست اکھاڑ پچھاڑ کے بعد آفتاب شیر پاؤ ایک مرتبہ پھر صوبہ کی وزارت اعلیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ آفتاب شیرپاؤ صوبہ سرحد کی تاریخ کے واحد شخص ہیں جو دو مرتبہ صوبہ کے وزیراعلیٰ منتخب ہوئے (۳۳)۔ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۳۴)۔

۱۹۹۹ء میں ملک میں جمہوری حکومتوں کے خاتمے اور قومی احتساب بیورو (نیب) کی جانب سے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد آفتاب شیرپاؤ ڈرامائی انداز میں ملک سے باہر چلے گئے۔ نیب نے ان کی غیر موجودگی میں ان کے خلاف کاروائی جاری رکھی اور عدالت میں حاضر نہ ہونے پر اشتہاری ملزم قرار دینے کے ساتھ ساتھ تین سال قید کی سزا بھی سنائی چنانچہ جنوری ۲۰۰۲ء میں جب وہ وطن واپس لوٹے تو انہیں پشاور ایئرپورٹ پر ہی حراست میں لے لیا۔ رہائی کے بعد انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی (شیرپاؤ گروپ) قائم کیا جس کے وہ

بلامقابلہ چیئرمین منتخب ہوئے۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ صوبائی اور قومی دونوں اسمبلیوں کے رکن منتخب ہوئے تاہم بعد میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کردی۔

نومبر ۲۰۰۲ء میں آفتاب شیر پاؤ نے وفاقی وزیر پانی اور بجلی کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ بعدازاں انہیں صوبائی رابطے، کشمیر اور شمالی علاقہ جات کے وفاقی وزیر کا چارج بھی دے دیا گیا۔ دسمبر ۲۰۰۲ء میں انہوں نے چیف ایگزیکٹو شمالی علاقہ جات کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔

جون ۲۰۰۴ء میں وہ چودھری شجاعت حسین کی کابینہ میں بھی شامل رہے جون ۲۰۰۴ء میں جب پاکستان پیپلز پارٹی کے دو دھڑوں شیر پاؤ اور پیٹریاٹس کا باہمی ادغام ہوگیا تو آفتاب شیر پاؤ اس کے صدر منتخب ہو گئے۔ اسی مہینے انہوں نے اپنی اس جماعت کو بطور پاکستان پیپلز پارٹی رجسٹر کروالیا (۲۵) ستمبر ۲۰۰۴ء میں وہ شوکت عزیز کی کابینہ میں بھی شامل کر لیے گئے تاہم اس مرتبہ انہیں امور داخلہ کا قلمدان سونپا گیا (۲۶)۔

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں آفتاب احمد خان شیر پاؤ کے صاحبزادے سکندر حیات خان شیر پاؤ نے بھی انتخاب میں حصہ لیا اور پی ایف ۲۱ چارسدہ ۵ سے سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے (۲۷)۔

آفتاب شیر پاؤ کی بلور خاندان سے بھی رشتہ داری ہے اور اس حوالے سے قومی اسمبلی کے اسپیکر جناب گوہر ایوب بھی ان کے قرابت دار ہوتے ہیں۔ آفتاب شیر پاؤ کی شادی بھی پاکستان کے مشہور رہنما جناب عبدالرب نشتر کے خاندان میں ہوئی ہے اور یوں پاکستان کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل عبدالوحید کاکڑ سے بھی ان کی رشتہ داری نکلتی ہے۔ (۲۸) پاکستان کے سابق صدر فاروق لغاری کی اہلیہ بھی آفتاب شیر پاؤ کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ آفتاب شیر پاؤ کے بڑے بھائی ولی محمد خان شیر پاؤ کی صاحبزادی ہیں۔ ولی محمد خان شیر پاؤ کی اہلیہ فاروق لغاری کی خالہ تھیں۔ (۲۹)

حوالہ جات

۱۔ خان عبدولی خاں۔ حقائق حقائق ہیں۔ (اردو ترجمہ)۔ پشاور۔ ص ۱۲۳ تا ۱۲۵

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۳۶

۳۔ محمد شفیع صابر۔ تحریک پاکستان میں صوبہ سرحد کا حصہ۔ پشاور۔ ص ۲۴۷

۴۔ سید قاسم محمود۔ انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا۔ قسط ۱۳۔ کراچی۔ ص ۴۰۶

۵۔ ایضاً

۶۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور ص ۸۸۰

۷۔ ایضاً۔ص ۸۸۰
۸۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۸۳
۹۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۸۸۰
۱۰۔ ہفت روزہ الفتح کراچی۔ ۴رتا۱۱رمارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۲
۱۱۔ ایضاً۔ ۱۳۔۲۰رفروری ۱۹۷۶۔ ص ۴۲
۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ ص ۵۸
۱۳۔ عقیل عباس جعفری پاکستان کے انتخابی سیاست۔ اسلام آباد ص ۹۲
۱۴۔ سید قاسم محمود۔ انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا۔ قسط ۱۳۔ کراچی ص ۴۰۷
۱۵۔ خالد حسن۔ ہمارے نمائندوں کا تعارف ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور ۱۸رتا۲۴رمارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۸
۱۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکسن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۵۷،۷۸
۱۷۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد پشاور۔ ص ۴۶۸
۱۸۔ احمد سلیم۔ ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیوروکریسی۔ لاہور۔ ص ۳۴۸
۱۹۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۶۰۰،۶۲۴
۲۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۳راپریل ۱۹۹۳ء
۲۱۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۸راپریل ۱۹۹۳ء
۲۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷راکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۱۲
۲۳۔ رحیم اللہ یوسف زئی۔ دی گریٹ گیم ان این ڈبلیو ایف پی (اسپیشل رپورٹ) روزنامہ دی نیوز کراچی۔ ۱۳رمئی ۱۹۹۴ء
۲۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۵۶۲
۲۵۔ اردو انسائیکلوپیڈیا۔ (فیروزسنز)۔ لاہور۔ ص ۱۵۲۹،۱۵۳۰
۲۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳رستمبر ۲۰۰۴ء
۲۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵راکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۳۱۴۱
۲۸۔ خالد حسن۔ ہمارے نمائندوں کا تعارف ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۸تا۲۴رمارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۸
۲۹۔ ایم ریاض۔ پاکستان کا سدا بہار خاندان (خصوصی رپورٹ)۔ مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۵راکتوبر ۱۹۹۴ء۔

کنڈی

کنڈی ایک چھوٹا سا پوندہ قبیلہ ہے جو ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں رہتا ہے۔ وہ نیازی قبیلے کے مورث اعلیٰ کو اپنا مورث مانتے ہیں اور روایتاً قدیم ڈاڈکئی کی باقیات سمجھے جاتے ہیں۔ وہ لوہانی قبیلہ دولت خیل کے ساتھ ہی ٹانک میں آباد ہوئے۔(۱)

سر ڈیزل ابٹسن نے اپنی کتاب پنجاب کاسٹس میں لکھا ہے کہ وہ بڑے بڑے ڈاکوؤں پر مشتمل ایک لاقانونی گروہ ہیں اور یہ محاورہ عام ہے کہ مردہ کنڈی، زندہ کنڈی سے بہتر ہے(۲) تاہم میجر آر ٹی اے رجوئے نے اپنی کتاب ''پٹھانز'' میں لکھا ہے کہ کنڈی کسی زمانے میں قانون شکن اور دزد پیشہ سمجھے جاتے تھے لیکن اب وہ ایک بے ضرر اور غیر جارح قبیلہ ہیں۔(۳)

کنڈی خاندان نے سیاست کے میدان میں آزادی کے بعد قدم رکھا۔ اس خاندان کا جو فرد سیاست کے میدان میں سب سے زیادہ مشہور ہوا وہ میجر (ر) سردار فضل کریم خان کنڈی ہیں۔

فضل کریم کنڈی نے ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ صوبہ سرحد کی صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنا چاہا تھا مگر خان عبدالقیوم خان کی مداخلت کی وجہ سے انہیں انتخاب سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں فضل کریم خان کنڈی نے ڈیرہ اسمٰعیل خان سے مغربی پاکستان اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ تاہم جب ۱۹۶۵ء میں انہوں نے کنونشن مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تو وہ مفتی محمود جیسے قد آور امیدوار کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۴) ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا تاہم ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں انہوں نے این اے ۱۸ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے انتخاب لڑا مگر وہ اس مرتبہ صابر شاہ کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے آئی جے آئی کا ٹکٹ حاصل کرنے

میں کامیابی حاصل کی مگر انتخاب میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ۱۹۹۰ء میں وہ قلابازی کھا کر پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے۔ اس مرتبہ کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ تاہم ۱۹۹۳ء میں جب انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا تو مولانا فضل الرحمٰن کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۵) ۱۹۹۷ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر این اے ۱۸ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ اس نشست پر مولانا فضل الرحمٰن، عمران خان اور مسرت شاہین بھی امیدوار تھے مگر کامیابی پاکستان مسلم لیگ (ن) کے الحاج سردار عمر فاروق خان کے حصے میں آئی (۶)

۲۰۰۲ کے عام انتخابات میں فضل کریم خان کنڈی نے اپنے صاحبزادے فیصل کریم کنڈی کو قومی اسمبلی کا انتخاب لڑوایا اور خود صوبائی اسمبلی کی نشست پر امیدوار بنے۔ تاہم دونوں ہی کامیاب نہ ہو سکے (۷) فضل کریم خان کنڈی نے ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب بھی لڑا تھا مگر وہ قومی اسمبلی کے ساتھ ساتھ اس نشست پر بھی شکست کھا گئے تھے۔(۸)

۱۹۵۱ء میں ڈیرہ اسمٰعیل خان سے رب نواز کنڈی نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے (۹) ۱۹۶۲ء میں محمد اسحٰق کنڈی نے مغربی پاکستان اسمبلی کے انتخاب میں نہ صرف کامیابی حاصل کی بلکہ اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کے منصب پر بھی فائز ہوئے۔(۱۰)

محمد اسحٰق کنڈی کی ایک بھتیجی کی شادی حبیب اللہ کنڈی سے ہوئی ہے(۱۱) حبیب اللہ کنڈی ۱۹۶۵ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے، جب کہ ۱۹۸۵ء، ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء میں سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے تھے (۱۲) ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

حبیب اللہ کنڈی کی پہلی اہلیہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا محمد اسحٰق کنڈی کی بھتیجی ہیں جب کہ ان کی دوسری بیوی کرنل امیر خان ہوتی کی صاحبزادی ہیں۔ دوسری جانب حبیب اللہ کنڈی کی بھتیجی (ثنا اللہ کنڈی کی صاحبزادی) خرم نواز گنڈا پور کی اہلیہ ہیں۔ خرم نواز گنڈا پور کے ایک بھائی جاوید نواز گنڈا پور پشاور ہائی کورٹ کے جج اور دوسرے بھائی سلیم نواز گنڈا پور سنگا پور میں پاکستان کی ہائی کمشنر رہ چکے ہیں۔

محمد اسحٰق کنڈی کے خالہ زاد بھائی جسٹس فیض اللہ کنڈی ہیں۔ جو سیاست کے میدان میں تو کامیاب نہ ہو سکے تاہم فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین اور کئی دیگر اہم عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ جسٹس فیض اللہ کنڈی کے والد پیر سر عبدالرحیم کنڈی سرحد اسمبلی کے اسپیکر رہ چکے ہیں (۱۳)۔

فیض اللہ کنڈی کے داماد اور حبیب اللہ کنڈی کے صاحبزادے امان اللہ کنڈی ہیں۔ امان اللہ کنڈی ۱۹۷۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر اور ۱۹۸۸ء میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۱۴) ان کی دوسری اہلیہ بلوچستان کی خاتون سیاستدان محترمہ فضیلہ عالیانی ہیں جو سابق جام آف لسبیلہ جام میر غلام قادر خان مرحوم کے چچازاد بھائی جام نور اللہ کی صاحبزادی ہیں محترمہ فضیلہ عالیانی' بلوچستان اسمبلی کی رکن اور بلوچستان کی وزیر تعلیم رہ چکی ہیں (۱۵)۔

امان اللہ کنڈی ۱۹۸۸ء میں آفتاب احمد خان شیرپاؤ کی حکومت میں وزیر خوراک بھی رہے تھے۔ ۱۹۹۱ء میں وہ کراچی میں ایک جرمن ڈیلر کو ۵۰ کلوگرام ہیروئن کی کھیپ دیتے ہوئے گرفتار کیے گئے جس پر انہیں ۴۵ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۹۴ء کو وہ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال' ڈیرہ اسمٰعیل خان سے فرار ہو کر جنوبی وزیرستان چلے گئے جہاں وہ تقریباً ۹ سال مقیم رہے ۲۲ر اپریل ۲۰۰۳ء کو ایک ڈیل کے نتیجے میں فضل کریم کنڈی نے انہیں سرحد پولیس کے حوالے کر دیا۔ (۱۶)

حوالہ جات

۱۔ میجر آر ٹی اے رجوئے۔ پٹھان (ترجمہ پروفیسر ایم انور رومان) کوئٹہ۔ ص ۱۹۰

۲۔ ڈینزل ابٹسن۔ پنجاب کی ذاتیں (ترجمہ یاسر جواد)۔ لاہور۔ ص ۱۵۳' ۱۵۴

۳۔ میجر آر ٹی اے رجوئے۔ پٹھان (ترجمہ پروفیسر ایم انور رومان)۔ کوئٹہ۔ ص ۱۹۱

۴۔ این اے حسنین چودھری۔ ہمارے نمائندے۔ کراچی۔ ص ۲۵۳' ۲۵۴

۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان' اسلام آباد رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء جلد دوم' ص ۲۰

۶۔ ایضاً۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ' جلد دوم۔ ص ۱۲

۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۲۸۹۳' ۳۱۵۳

۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ' جلد دوم۔ ص ۶۰۱

۹۔ وکیل انجم۔ سیاست دانوں کی قلابازیاں (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۱۹۵

۱۰۔ پنجاب پروانشل اسمبلی سکریٹریٹ۔ لاہور۔ دی پنجاب لیجسلیچرز۔ ص ۳۵

۱۱۔ ایم ریاض۔ پاکستان کا سدا بہار خاندان...... خصوصی رپورٹ مطبوعہ' روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۴ء

۱۲۔ (i) وکیل انجم۔ سیاست دانوں کی قلابازیاں (جلد سوم)۔ لاہور۔ ص ۶۵۹
(ii) الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ' جلد دوم۔ ص ۶۰۳

۱۳۔ ایم ریاض۔ پاکستان کا سدا بہار خاندان...... (خصوصی رپورٹ) مطبوعہ روزنامہ نوائے لاہور۔۱۵/اکتوبر۱۹۹۴ء
۱۴۔ طارق اسمٰعیل۔الیکشن ۸۸ء۔لاہور۔ص ۸۷
۱۵۔ اختر علی خان بلوچ۔بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد سوم) کراچی۔ص ۳۷۶
۱۶۔ روزنامہ ڈان کراچی۔۲۳/اپریل ۲۰۰۳ء

گنڈاپور

گنڈاپور صوبہ سرحد کا ایک نامور اور معزز قبیلہ ہے۔ جو ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان کی تحصیل کلاچی میں ۶۳ مربع میل کے رقبے پر پھیلے چالیس دیہاتوں میں آباد ہے۔ ان کی آبادی تقریباً نصف لاکھ نفوس کے لگ بھگ ہے(۱)

اس قوم کی تاریخ کے بارے میں کرنل چارلس میسی اپنی کتاب "روسائے با اختیار و نامی خاندان" میں لکھتا ہے۔

گنڈاپوری اصل میں ایک غریب پوندہ قوم تھی۔ یہ لوگ صرف گلوں پر اپنا گزارہ کرتے تھے اور قندھار کے مشرقی پہاڑوں میں رہتے تھے مگر وہاں کاکڑوں نے ان کو نکال دیا۔ کچھ عرصے تک تو یہ آوارہ پھرتے رہے پھر سترھویں صدی کے آغاز میں دولت خیل کے سردار خان زمان نے انہیں روڑی میں آباد ہونے کی ترغیب دی کیونکہ اس کو مروتوں کے مقابلے کے لئے ان کی مدد درکار تھی۔ یہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد لونی میں آباد ہو گئے اور رفتہ رفتہ دریس خیل اور دوسرے قدیم باشندوں کو نکال کر اس ملک پر قابض ہو گئے جو اب ان کے پاس ہے اور جس کی سرحد ٹکورا سے میاں خیل تک ہے۔ یہ ہمیشہ اپنے پڑوسیوں خصوصاً میاں خیلیوں سے لڑتے رہے۔ ہاں گنڈاپور اور میاں خیل اکثر ٹانک کے سرور خان یا ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ہوت حاکم کو روکنے کے واسطے یا جب کبھی کابل کا بادشاہ بقایا مالگزاری وصول کرنے کے واسطے اپنا وزیر بھیجتا تھا تو اس کی مزاحمت کرنے کے لئے آپس میں مل جایا کرتے تھے۔ ان کی خود مختاری میں اول ڈیرہ کے نواب شاہ نواز خان نے مداخلت کی اور اس نے ان پر دس ہزار روپے خراج مقرر کیا۔ پانچ چھ سال کے بعد یہ خراج پندرہ ہزار کر دیا گیا اور پھر تیس ہزار اور جب تک یہ ملک نواب کے قبضہ سے نکل کر سکھوں کے پاس نہ گیا اسی قدر خراج رہا مگر شہزادہ نونہال سنگھ نے اسے یکبارگی بڑھا کر ۵۰ ہزار روپے کر دیا۔

۱۸۴۷ء میں ہربرٹ ایڈورڈس صاحب اس ملک میں آئے تو انہوں نے گنڈاپوریوں کو بہت

مظلوم پایا چنانچہ انہوں نے فوراً ان کو آرائش دینے کے لئے زر مالگزاری میں کمی کر دی۔ اس وقت گل داد خان ان کا سردار تھا۔ دوسرے سرسری بندوبست میں اس کا وظیفہ کم کر کے سات ہزار روپے کر دیا گیا اور ۱۸۵۵ء میں یہ قرار پایا کہ جس قدر اصل زر مالگزاری وصول ہو اس پر ۲۵ فی صد مواجب اس کو ملا کرے۔

جب ملتان میں غدر ہوا تو گل داد ایڈورڈس صاحب کے پاس بجا آوری خدمات کے لئے حاضر ہوا۔ چنانچہ اسے اپنے ضلع میں امن و امان قائم رکھنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ جب دہلی میں غدر ہوا تو اس وقت بھی اس کو اپنے وطن ہی میں رہنے دیا گیا۔ اس کی نمک حلالی میں کسی طرح کا شک نہ تھا۔ نیز اس کے چچا زاد بھائی بھی عمدہ خدمات بجا لائے۔ ۱۸۶۰ء میں یہ چار سو آدمیوں کے ساتھ محسود وزیری مہم میں شریک ہوا۔ اس کے بعد اس نے حکام کو شیرانیوں کے معاملات کے تصفیے میں امداد دی چنانچہ اس خدمت کے صلے میں اسے ایک دربار میں پیش بہا خلعت ملا۔ بعد ازاں اس نے سرحد زرکنی سے چار میل پرے شیرانیوں سے کچھ زمین خریدی۔ اس کے سبب سے اس کی عزت میں فرق آ گیا کیونکہ اس زمین میں اس نے اپنے لئے ایک قلعہ بنانا چاہا تھا۔ شیرانی ملکوں نے اعتراض کیا۔ اس پر جھگڑا ہو گیا جس میں گل داد خان کے پندرہ آدمی مارے گئے اور گیارہ زخمی ہوئے اور اس کا گل داد خان ہی قصور وار سمجھا گیا۔ اس سبب سے یہ سرداری سے علیحدہ کیا گیا اور اس کا بیٹا محمد افضل خان اس کا جانشین مقرر ہوا۔ اس کے چچا زاد بھائیوں کالو خان اور نورنگ خان پر بھی اس سبب سے جرمانہ کیا گیا کہ انہوں نے وقت پر حکام کو خبر نہیں دی تھی۔ (۲)

افضل خان گنڈا پور نہایت تعلیم یافتہ انسان تھا۔ انگریزوں نے اس کی صلاحیتوں کے اعتراف میں اسے ڈپٹی کمشنر بنا دیا۔ امیر عبدالرحمٰن کے عہد حکومت میں وہ افغانستان میں برطانوی حکومت کا سفیر بھی رہا۔

سردار افضل خان کی وفات کے بعد گنڈا پور قبیلہ کی قیادت سردار اسد اللہ گنڈا پور نے سنبھالی۔ وہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور انہیں علامہ اقبال کی شاگردی کا اعزاز بھی حاصل تھا۔

سردار اسد اللہ خان نے صوبہ سرحد کو آئینی اصلاحات دلانے کی مہم میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی اسمبلی کے لئے انتخاب ہوا تو وہ کلاچی کے حلقہ نیابت سے ممبر منتخب ہوئے۔ جب تک زندہ رہے مسلسل صوبائی اسمبلی کے ممبر رہے۔ عموماً وہ آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑتے تھے صرف ایک بار حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی خواہش پر جمعیت العلمائے ہند کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا۔ اسی انتخابی مہم کے سلسلے میں مولانا مدنی کلاچی تشریف لائے تو انہوں نے نوجوان سردار عنایت اللہ خان گنڈا پور کو جمعیت کے رضا کاروں کا سالار مقرر کیا۔

اگرچہ سردار اسد اللہ خان گنڈہ پور کبھی کانگرس یا خدائی خدمت گار تحریک کے ممبر نہیں رہے تاہم وہ ہمیشہ خان عبدالغفار خان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ عمر بھر ان کے درمیان دوستانہ مراسم رہے۔ شاید اسی لئے جمعیت کا رکن رہتے ہوئے بھی انہوں نے ہمیشہ کانگریس سے تعاون کیا۔ (۳) قیام پاکستان کے بعد سرحد کی صوبائی اسمبلی سے تین اصحاب کو ملک کی آئین ساز اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا ان میں سردار اسد اللہ خان بھی شامل تھے۔ (۴)

سردار اسد اللہ خان نے ۷۸ برس کی عمر پائی اور ۱۶ر ستمبر ۱۹۶۶ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ (۵)

سردار اسد اللہ خان گنڈا پور کے بعد ان کے بیٹے عنائت اللہ خان گنڈا پور قبیلے کے سردار بنے۔

سردار عنایت اللہ خان گنڈا پور ۲۷ء اگست ۱۹۱۹ء کو کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک کی تعلیم اپنے آبائی قصبہ کلاچی میں حاصل کی۔ بی اے تک ڈیرہ اسماعیل خان کالج میں پڑھتے رہے اور پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۵۸ء میں صدر محمد ایوب خان نے زرعی اصلاحات کا اعلان کیا تو سردار عنایت اللہ خان شاید صوبہ سرحد کے واحد زمیندار تھے جنہوں نے ستتر ہزار کنال زمین حکومت کے حوالے کی اور صرف تیئس ہزار ______ کنال زمین اپنے پاس رکھی۔ آغاز شباب ہی سے وہ سماجی خدمت اور قومی سیاست کے میدان میں سرگرم عمل رہے۔ ان کی زندگی ہمیشہ عوام کی بھلائی کے لئے وقف رہی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ آزاد امیدوار کے طور پر صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ان کا مقابلہ پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور جمعیت العلمائے اسلام سے تھا۔ جمعیت کے نمائندے قاضی عبداللطیف تھے۔ صوبائی اسمبلی میں سردار صاحب نے محمد اسلم خاں خٹک کی قیادت میں "متحدہ محاذ" قائم کیا۔ ۹ر مئی کو نیشنل عوامی پارٹی، جمعیت العلماء اور متحدہ محاذ پر مشتمل مخلوط وزارت بنی تو سردار عنایت اللہ خان کو محکمہ مال، آبکاری اور ٹرانسپورٹ کے محکموں کا وزیر بنایا گیا۔ وہ ۲۱ر فروری ۱۹۷۳ء تک اس منصب پر متمکن رہے۔ صوبے میں گورنر راج کے دوران ۲۸ر اپریل ۱۹۷۳ء تک وہ گورنر کے مشیر کے طور پر فرائض انجام دیتے رہے۔ اس عرصے میں بہت سے دوسرے ارکان اسمبلی بھی "متحدہ محاذ" سے آملے تو ۲۹ر اپریل ۱۹۷۳ء کو سردار عنایت اللہ خان گنڈا پور کو وزیر اعلیٰ چن لیا گیا۔ (۶) ان کی وزارت کے دوران حیات محمد شیر پاؤ کا قتل ہوا جس کے باعث انہیں ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا (۷) بعد ازاں وہ نصر اللہ خاں خٹک کی کابینہ میں صوبائی وزیر کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ (۸)

اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو کی خواہش پر سردار عنایت اللہ گنڈا پور پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا

(۹) اور پی ایف ۵۷ ڈیرہ اسمٰعیل خان اسے سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۰) جن دنوں نصراللہ خٹک صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ تھے انہی دنوں ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے ایئرپورٹ پر ایک سازش کے تحت سردار عنایت اللہ گنڈا پور پر قاتلانہ حملہ ہوا لیکن سردار صاحب بال بال بچ گئے۔ اس حملے میں سردار صاحب نے دو حملہ آوروں کو خود ختم کیا۔ سردار صاحب کی دشمنی میں دونوں طرف کے اب تک کوئی ۱۰۹ افراد ہلاک ہو چکے ہیں (۱۱)

ایک طویل عرصہ تک' سیاست سے دست کش رہنے کے بعد سردار عنایت اللہ خان نے ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں این اے۔ ۱۸ ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اگرچہ انہوں نے ۵۱ ہزار سے زیادہ ووٹ حاصل کئے مگر پھر بھی وہ محمد صابر شاہ کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۱۲)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں سردار صاحب نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے پی ایف ۵۶ ڈیرہ اسمٰعیل خاں ۴ سے آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب میں حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔ (۱۳)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں وہ پھر اسی حلقہ سے آزاد امیدوار کے طور پر صوبائی اسمبلی کے لئے کھڑے ہوئے مگر اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہیں کر سکے اور وہ اس انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۴)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں سردار صاحب نے ایک مرتبہ پھر آزاد امیدوار کی حیثیت سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کا حلقہ انتخاب وہی پرانا تھا یعنی پی ایف ۵۶ ڈیرہ اسمٰعیل خان ۴۔ اس مرتبہ وہ کامیاب رہے اور انہوں نے اپنے حریف فتح اللہ خاں میاں خیل کو تقریباً پونے سات ہزار ووٹوں سے ہرا دیا (۱۵) انتخابات کے بعد سردار صاحب نے اسمبلی کے ۸ آزاد ارکان کی قیادت سنبھالی اور ایک ۱۳ نکاتی معاہدے کے بعد، جو قرآن مجید کو درمیان میں لا کر کیا گیا تھا، پیر صابر شاہ کی مخلوط حکومت میں شمولیت اختیار کر لی۔ سردار صاحب کو اس حکومت میں زراعت کا قلمدان سونپا گیا۔ ابھی وزارت کو دو ماہ ہی ہوئے تھے ان کے بعض سخت اقدامات پر وزیراعلیٰ کو مداخلت کرنی پڑ گئی۔ یہ مداخلت سردار صاحب کو ناگوار گزری اور انہوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۹۳ء کو اپنے ساتھی غنی الرحمٰن کے ہمراہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ان استعفوں سے پیر صابر شاہ کی حکومت میں دراڑ پڑ گئی اور پھر دو ہی ماہ میں اسے بھی رخصت ہونا پڑ گیا۔ صابر شاہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد سردار عنایت اللہ گنڈا پور نے، آفتاب شیر پاؤ کی حمایت شروع کر دی اور یوں آفتاب شیر پاؤ صوبہ کے وزیراعلیٰ بن گئے (۱۶)

۱۹۹۷ء کے عام انتخاب میں سردار عنایت اللہ خان گنڈا پور نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا مگر انہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے فتح اللہ خان کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی

پڑی۔(۱۷) ۲۰۰۲ کے انتخابات میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے پی ایف ۶۶ ڈی آئی جی ۳ اور پی ایف ۶۷، ڈی آئی جی ۴ سے بیک وقت انتخاب لڑا اور دونوں نشستوں پر کامیابی حاصل کی (۱۸) بعدازاں انہوں نے پی ایف ۶۷، ڈی آئی خان ۴ کی نشست خالی کر دی۔ جس پر ان کے صاحبزادے اسرار اللہ خان گنڈاپور سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ انہوں نے یہ انتخاب پاکستان پیپلز پارٹی (شیر پاؤ) کے ٹکٹ پر لڑا تھا۔ (۱۹) سردار عنایت اللہ گنڈاپور نے ۲۸/اپریل ۲۰۰۵ء کو وفات پائی (۲۰) سردار عنایت اللہ گنڈاپور کی وفات کے بعد ان کی خالی ہونے والی نشست (پی ایف ۶۶ ڈی آئی خان ۳) پر ۱۸/جون ۲۰۰۵ء کو ضمنی انتخاب منعقد ہوا۔ اس ضمنی انتخاب میں سردار صاحب کے صاحبزادے سردار اکرام اللہ گنڈاپور نے آزاد حیثیت میں حصہ لیا مگر وہ متحدہ مجلس عمل کے مولانا لطف الرحمٰن سے شکست کھا گئے۔ مولانا لطف الرحمٰن، مفتی محمود کے صاحبزادے اور مولانا فضل الرحمٰن کے چھوٹے بھائی ہیں۔ (۲۱)

سردار عنایت اللہ خان گنڈاپور کے والد سردار اسد اللہ خان گنڈاپور کے ایک عم زاد سردار اورنگ زیب خان گنڈاپور نے بھی صوبہ سرحد کی سیاست میں بڑا نام کمایا۔

سردار اورنگ زیب خاں ۱۸۹۱ء میں کلاچی ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے (۲۲) وہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے اور دوران طالب علمی علی گڑھ مسلم اسٹوڈنٹس یونین کے صدر بھی رہے تھے۔

سردار اورنگ زیب کی قائدانہ صلاحیتوں کو صاحبزادہ عبدالقیوم نے جلا بخشی۔ انہوں نے سردار صاحب کو اپنا پرسنل سیکرٹری بنا لیا۔ سردار صاحب کو اس حیثیت میں لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کا موقع بھی ملا۔ ۱۹۳۷ء میں سردار صاحب مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور صوبائی کابینہ کے رکن منتخب ہوئے۔ صاحبزادہ عبدالقیوم کی وفات کے بعد سردار اورنگ زیب سرحد اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کا فریضہ انجام دینے لگے۔ (۲۳)

۱۹۴۰ء میں سردار صاحب نے لاہور میں اس تاریخی اجلاس میں مسلمانان سرحد کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیا، جس میں مشہور قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی (۲۴) ۱۹۴۲ میں وہ ایک مرتبہ پھر سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۲۵) یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری عالمی جنگ اپنے نقطہ عروج پر تھی اور صوبہ سرحد میں کانگریس نے وزارت سے استعفیٰ دیا ہوا تھا۔ قائداعظم چاہتے تھے کہ مسلم لیگ اس موقع سے فائدہ اٹھائے اور صوبہ سرحد میں اپنی وزارت تشکیل دے۔ قائداعظم نے اس سلسلہ میں صوبہ سرحد کے گورنر کننگھم اور پشاور کے ڈپٹی کمشنر اسکندر مرزا کو اعتماد میں لیا اور انہیں وزارت کی تشکیل میں مدد دینے کے لیے کہا۔ چنانچہ صوبے

کے ان دو بڑے عہدیداروں کی مدد سے سردار اورنگ زیب خان سرحد میں پہلی مسلم لیگی وزارت تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے (۲۶) ۱۵ رمئی ۱۹۴۳ء کو سردار اورنگ زیب خان اور ان کی کابینہ نے حلف اٹھایا۔ اس کابینہ میں سردار عبدالرب نشتر، ثمین جان، اجیت سنگھ اور راجہ عبدالرحمٰن شامل تھے۔ (۲۷)

مگر جلد ہی یہ وزارت ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ سردار صاحب اور ان کے ساتھیوں کو معلوم تھا کہ یہ وزارت انگریز کے ہاتھوں بنی ہے۔ ایسی اسمبلی میں جس میں مسلم لیگ کے نام پر ایک ممبر منتخب نہ ہوا ہو۔ مسلم لیگ کی وزارت بنانا، انگریز اور اس کے ڈپٹی کمشنر ہی کا کام تھا۔ ان ممبروں میں آپس میں ذاتی جھگڑے اور گروہ بندیاں تھیں۔ اسی وزارت کے سلسلہ میں سردار اورنگ زیب خان اور مسلم لیگ کے صوبائی صدر خان بہادر سعداللہ خان میں سخت ناچاقی تھی۔ (۲۸) ادھر پشاور کا ڈپٹی کمشنر اسکندر مرزا بھی سردار صاحب کا شدید مخالف بن چکا تھا اور اس کے نتیجہ میں اپنا تبادلہ بھی کروا چکا تھا۔ (۲۹)

انگریز گورنر نے کافی کوشش کی کہ حکومت برقرار رہے۔ اسی سبب سے اس نے ۱۹۴۴ء میں خزاں کا اجلاس بھی طلب نہیں کیا۔ مگر یہ صورتحال کب تک چل سکتی تھی۔ ۱۹۴۵ء کے موسم بہار میں جب اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا تو کانگریس نے سردار صاحب کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دی اور یوں سردار اورنگ زیب خاں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ اس تحریک میں مسلم لیگ کے بعض اکابر نے بھی کانگریس کا ساتھ دیا تھا (۳۰)۔

مگر پیر علی محمد راشدی اس واقعہ کو ایک اور نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''روداد چمن'' میں لکھتے ہیں۔

''صوبہ سرحد میں مرحوم سردار اورنگ زیب خان نے اس وقت مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں جہاد کیا جب کہ ان کا نام لینے والا کوئی شخص وہاں نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے خود اپنے ابتدائی زمانے میں وہاں بھیجا گیا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ اورنگ زیب خاں تنہا اپنی چھوٹی سی مورس موٹر میں (جس کا مولانا شوکت علی مرحوم نے ابابیل نام رکھا تھا) تحریک کو بڑھانے کے لیے صوبہ بھر دوڑ رہے تھے۔ کانگریسی وزارت کے عارضی طور پر مستعفی ہونے کے بعد (ابھی انگریز کا زمانہ تھا) یہی اورنگ زیب اس قابل نظر آیا کہ وہاں کی مسلم لیگی وزارت اعلیٰ ان کے سپرد کی جائے۔ یہاں تک تو اس کی خیر رہی مگر پاکستان بن جانے اور قائد کی رحلت کے بعد اسی اورنگ زیب کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔ بعد از بسیار آہ وزاری ان کو تھوڑے سے عرصہ کے لیے سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیجا گیا۔ مگر نوکر شاہی سفارت کے اعلیٰ عہدوں کو اپنی جاگیر قرار دے چکی تھی اور اپنے لُولے لنگڑوں کو ان میں کھپانے کے لیے سر

سے کفن باندھے بیٹھے تھی۔ اس نے حسب عادت اس باہر کے سیاستدان سفارت کار پر بے سروپا اتہام لگا کر اس کو وہاں سے بھی نکلوا دیا۔ مقامی سیاست سے وہ پہلے ہی بے دخل کر دیئے گئے تھے۔ آخر بے چارہ مرتا مر گیا۔ مگر سنبھل نہیں سکا" (۳۱)۔

۱۹۶۰ء کی دہائی کے اواخر میں گنڈا پور قبیلے کے ایک اور فرد سردار حق نواز گنڈا پور نے بھی سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ صوبہ سرحد میں پاکستان پیپلز پارٹی کے آرگنائزر تھے۔ مگر اس سے قبل کہ وہ سیاست میں کوئی فعال کردار ادا کر سکتے۔ ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء کو ایک ناگہانی حادثے میں ان کی وفات ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آسمانی بجلی گرنے کے باعث فوت ہوئے مگر پارٹی کے اکابر اسے سیاسی قتل قرار دیتے رہے (۳۲) آہستہ آہستہ یہ معاملہ بھی رفت گذشت ہو گیا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۴۱۵
۲۔ چارلس میسی۔ روسائے بااختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔ لاہور۔ ص ۳۴۳ تا ۳۴۵
۳۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۴۱۶
۴۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن پاکستان۔ کراچی۔ ص ۱۵۲
۵۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۴۱۶
۶۔ ایضاً۔ ص ۴۷۰
۷۔ شیراز پراچہ۔ عنایت اللہ گنڈہ پور کا پینل انٹرویو ہفت روزہ تصویر پاکستان۔ لاہور۔ ۲۱/ جنوری ۱۹۹۴ء۔ ص ۲
۸۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۴۷۰
۹۔ شیراز پراچہ۔ عنایت اللہ گنڈہ پور کا پینل انٹرویو ہفت روزہ تصویر پاکستان لاہور ۲۱/ جنوری ۱۹۹۴ء۔ ص ۲، ۳
۱۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴/ مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۳۵۲
۱۱۔ شیراز پراچہ۔ عنایت اللہ گنڈہ پور کا پینل انٹرویو ہفت روزہ تصویر پاکستان لاہور۔ ۲۱/ جنوری ۱۹۹۴ء۔ ص ۳
۱۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۲۸/ مارچ ۱۹۸۵ء۔ اسلام آباد۔ ص ۲۴۴۰
۱۳۔ ایضاً۔ ۳/ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۷۲۶
۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشن۔ ۱۹۹۰۔ جلد دوم۔ ص ۴۲۲

۱۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔اسلام آباد۔۱۷/اکتوبر۱۹۹۳ءص۱۵۲۵
۱۶۔ رحمت اللہ یوسف زئی،عبداللہ جان۔دی گریٹ گیم ان فرنیٹر (اسپیشل رپورٹ) روزنامہ دی نیوز کراچی۔۱۳/مئی۱۹۹۴ء۔ص۱۱
۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان'اسلام آباد۔۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلددوم۔ص۶۰۲
۱۸۔ دی گزٹ آف پاکستان'اسلام آباد۔۲۵/اکتوبر۲۰۰۲ء۔ص۳۱۵۲
۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان'اسلام آباد۔۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلددوم'ص ۳۸۷
۲۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔۲۹/اپریل۲۰۰۵ء
۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کی ویب سائٹwww.ecp.gov.pk
۲۲۔ لیپل گریفن۔پنجاب چیفس۔لاہورص۲۹۲
۲۳۔ عزیز جاوید۔قائداعظم اورسرحد۔پشاور۔ص۳۸۰۔۳۸۱
۲۴۔ محمد علی چراغ۔اکابرین تحریک پاکستان۔لاہورص۷۹۸
۲۵۔ عزیز جاوید۔قائداعظم اورسرحد۔پشاور۔ص۸۹
۲۶۔ خان عبدالولی خان۔حقائق حقائق ہیں۔پشاور۔ص۱۳۷تا۱۴۰
۲۷۔ عزیز جاوید۔قاعداعظم اورسرحد۔پشاور۔ص۸۹
۲۸۔ خان عبدالولی خان۔حقائق حقائق ہیں۔پشاور۔ص۱۴۱
۲۹۔ اسکندر مرزا۔اسکندر مرزا کی کہانی خود ان کی زبانی۔ترجمہ۔اشرف شاد۔قسط نمبر۲۔ ہفت روزہ معیار کراچی۳۔۱۰/اپریل۱۹۷۶ءص۴۵۔
۳۰۔ خان عبدالولی خان۔حقائق حقائق ہیں۔پشاور۔ص۱۴۳
۳۱۔ پیر علی محمد راشدی۔روداد چمن۔کراچی ص۶۴'۶۵
۳۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔۲۸/اگست۱۹۷۰ء

محمد زئی

پشاور سے بیس میل دور چار سدہ ایک مشہور، معروف گاؤں ہے اس سے دو میل آگے ایک چھوٹا سا مگر اہم موضع اتمان زئی ہے۔ جو دریائے سوات کے کنارے واقع ہے۔ اس چھوٹے سے موضع کا صوبہ سرحد کی تاریخ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ (۱)

اتمان زئی کے ایک بہت بڑے خان اور زمیندار خان بہرام خان تھے۔ بہرام خان کو خودداری اور حریت پروری ورثہ میں ملی تھی۔ بہرام خان کے والد سیف اللہ خان نے انگریزوں کے خلاف اس موقع پر زبردست مزاحمت کی تھی جب وہ علاقے کے دیگر خوانین کی مدد اور تعاون سے بونیر پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ سیف اللہ خان بذات خود مورچہ بند ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑے۔ دیگر کئی موقعوں پر بھی وہ انگریزوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ سیف اللہ خان کے والد عبیداللہ خان بھی اپنی قوم پروری کے جرم کی پاداش میں درانیوں کے ہاتھوں تختہ دار کے سزاوار گردانے گئے تھے۔ (۲)

خان بہرام خان کے دو بیٹوں نے سیاست میں نام کمایا۔ بڑے بیٹے کا نام خان عبدالجبار خاں اور چھوٹے بیٹے کا نام خاں عبدالغفار خان تھا۔ سیاسی دنیا میں خان عبدالجبار خان ڈاکٹر خان صاحب کے نام سے اور خان عبدالغفار خان باچا خان کے نام سے مشہور ہوئے۔

ڈاکٹر خان صاحب ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے انہوں نے میٹرک کا امتحان پشاور سے پاس کرنے کے بعد انگلستان کا رخ کیا جہاں انہوں نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس آنے کے بعد وہ آرمی میڈیکل کور میں بھرتی ہو گئے اور ریٹائر ہونے کے بعد وہ قصہ خوانی بازار پشاور میں مطب کرنے لگے۔ (۳)

پشاور میں ان کی پریکٹس بہت اچھی چلتی تھی۔ ان کی شادی ایک انگریز عورت سے ہوئی تھی اور انگریزوں سے ان کے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ یہاں تک کہ انہیں پشاور کلب کا، جس کا رکن بننے کی عام ہندوستانیوں کو اجازت نہ تھی، رکن بننے کی بھی اجازت دے دی گئی

تھی۔ (۴)

۱۹۳۰ء میں جب انگریزوں نے خدائی خدمتگار تحریک کو، جس کی قیادت ڈاکٹر خان صاحب کے چھوٹے بھائی، خان عبدالغفار خان کے ہاتھ میں تھی، کچلنے کے لئے سرخ پوشوں کا قتل عام کیا، تو ڈاکٹر خان صاحب اس صورتحال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ (۵) ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر خان صاحب سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی پاداش میں پہلی مرتبہ پابند سلاسل ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں رہا ہوئے تو حکومت نے صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب میں ان کے داخلہ پر پابندی عائد کر دی۔

۱۹۳۷ء کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد گورنر سرحد نے صاحبزادہ عبدالقیوم کو صوبہ کا وزیر اعلیٰ بنا دیا مگر جلد ہی عدم اعتماد کی ایک تحریک کے ذریعہ ان کی وزارت کا خاتمہ ہو گیا اور یوں صوبہ سرحد میں پہلی مرتبہ سرخپوشوں کی وزارت قائم ہوئی۔ (۶) صاحبزادہ عبدالقیوم اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے اور ۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو انتقال کر گئے ۱۹۳۹ء میں انگریزوں کی جنگی پالیسی کے خلاف جب ہندوستان کی آٹھ صوبوں کے وزارتوں نے بطور احتجاج استعفٰی دیا تو ان میں صوبہ سرحد کی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت بھی شامل تھی۔ (۷)

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد صوبہ سرحد میں ایک مرتبہ پھر خدائی خدمت گار تحریک کی وزارت قائم ہوئی اور ڈاکٹر خان صاحب ایک مرتبہ پھر صوبہ کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ قیام پاکستان سے کچھ پہلے صوبہ سرحد میں پاکستان میں شمولیت اور عدم شمولیت کے سوال پر ایک ریفرینڈم منعقد ہوا۔ خدائی خدمت گار تحریک نے اس ریفرینڈم کا بائیکاٹ کیا یوں یہ ریفرینڈم مسلم لیگ نے بآسانی جیت لیا اور صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہو گیا۔

قیام پاکستان کے وقت ڈاکٹر خان صاحب صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ مگر فقط ۸ دن بعد ۲۲ر اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے ان کی وزارت برطرف کر دی۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا جھنڈا لہرانے کی تقریب میں شرکت نہ کر کے ملک سے عدم وفاداری کا ثبوت دیا ہے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے گورنر سرحد کے منع کرنے پر تقریب میں شرکت نہ کی تھی۔ (۸)

اس کے بعد ڈاکٹر خان صاحب عرصہ دراز تک ہزارہ میں نظر بند رہے۔ ۱۹۵۴ء میں جب محمد علی بوگرا ملک کے وزیر اعظم بنے تو انہوں نے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر خان صاحب کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا۔ (۹) یہاں سے ڈاکٹر صاحب کی سیاسی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

۱۹۵۴ء کے اواخر اور ۱۹۵۵ء کے اوائل میں پاکستان کے مغربی صوبائی یونٹوں کے اتحاد کی جانب بڑی تیزی سے قدم اٹھایا گیا اور مارچ ۱۹۵۵ء میں گورنر جنرل نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ نہ صرف ون یونٹ کے قیام کا اعلان کر دیا بلکہ ۱۴ر اپریل ۱۹۵۵ء کو مشتاق احمد گورمانی کو اس نئے

صوبہ کا گورنر اور ڈاکٹر خان صاحب کو اس نئے صوبے کا وزیر اعلیٰ بھی نامزد کر دیا۔ (۱۰)

ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان اسمبلی میں بلوچستان کی اکلوتی نشست پر نامزد ہوئے تھے بلوچستان کے رہنماؤں نے اس بات پر بہت احتجاج کیا اور یہ نشست بلوچستان کے کسی باشندے کو دیئے جانے پر اصرار کیا مگر ڈاکٹر خان صاحب نے ایک نہ سنی اور اسی نشست پر براجمان رہے۔ (۱۱)

۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ختم کر کے ایک صوبہ بنا دیا گیا اور گورمانی اور ڈاکٹر خان صاحب نے اپنے اپنے عہدے سنبھال لئے۔ (۱۲)

مغربی پاکستان کی وزارت اعلیٰ پر ڈاکٹر خان صاحب کی تقرری سے مسلم لیگیوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ڈاکٹر خان صاحب کو مسلم لیگ کا مخالف اور اپنا کٹر حریف سمجھتے تھے۔ اسی دوران ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ قائداعظم کے دیرینہ ساتھی سردار عبدالرب نشتر کو اتفاق رائے سے مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ (۱۳)

اس سے پہلے مغربی پاکستان کی نئی اسمبلی کا انتخاب ہو چکا تھا۔ یہ انتخابات اگرچہ غیر جماعتی بنیادوں پر منعقد ہوئے مگر انتخاب کا طریقہ کار کچھ ایسا تھا کہ وہی لوگ بھاری اکثریت میں منتخب ہوئے تھے جو شروع میں اپنی اپنی صوبائی اسمبلیوں میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہو چکے تھے چنانچہ سردار عبدالرب نشتر نے اپنے انتخاب سے اگلے ہی دن یہ ہدایت جاری کر دی کہ مغربی پاکستان کی نئی اسمبلی کے جو ارکان، مسلم لیگ سے وابستہ ہیں وہ جلد از جلد اسمبلی کے اندر خود کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کر لیں۔

یہ ہدایت اپنے ساتھ بعض لازمی نتائج لاتی تھی۔ صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم ہو گی تو لازماً اس پارٹی کا لیڈر بھی ہو گا اور اگر مسلم لیگ پارٹی کی اکثریت ہوئی۔ جیسا کہ صاف نظر آتا تھا تو وزارت سازی کا حق عام پارلیمانی آداب کے مطابق اسی پارٹی کے لیڈر کو حاصل ہو گا۔ پھر ڈاکٹر خان صاحب کی پوزیشن کیا ہو گی؟ یہ سوال نہ صرف چودھری محمد علی کے لئے بلکہ گورنر جنرل اسکندر مرزا کے لئے بھی بڑا پریشان کن تھا۔ جو ہر حال میں وزیر اعلیٰ کے عہدے پر ڈاکٹر خان صاحب ہی کو براجمان دیکھنا چاہتے تھے۔ (۱۴)

اس صورت حال میں چودھری محمد علی نے مفاہمت کی غرض سے یہ پروگرام بنایا کہ ڈاکٹر خان صاحب اپنی کوئی پارٹی نہ بنائیں مسلم لیگ ان کی شخصی افادیت کے پیش نظر انہیں وزیر اعلیٰ کے طور پر قبول کر لے اور ڈاکٹر خان صاحب اپنی وزرات مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کے مشورے کے مطابق بنائیں۔ یعنی برائے نام وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب ہوں اور اصل وزیر اعلیٰ مسلم لیگ پارٹی کا لیڈر ہو۔ چودھری محمد علی نے اسی پروگرام کی بنیاد پر سرکردہ مسلم لیگی رہنماؤں کے گفت و شنید کا آغاز کیا۔ مگر گورنر جنرل اسکندر مرزا کا ذہن بالکل مختلف سمت میں کام کر رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر

خان صاحب کو پوری سیاسی قوت اور اثر و رسوخ کا حامل وزیر اعلیٰ بنانا چاہتے تھے۔ (۱۵) لا محالہ ڈاکٹر خان صاحب بھی یہی کچھ چاہتے تھے۔ وہ اس بنیادی حقیقت کو بالکل فراموش کر رہے تھے کہ وہ صرف ایک نگراں وزارت کے سربراہ تھے چنانچہ جب ایک پریس کانفرنس میں ڈاکٹر خان صاحب نے یہ دعویٰ کیا کہ اگر نئی اسمبلی کی اکثریت نے میرا ساتھ نہ دیا تو مجھے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے یہ حق حاصل ہے کہ میں گورنر کو اس اسمبلی کو توڑ دینے کا مشورہ دوں تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ (۱۶)

ان حالات میں ۲۰ر اپریل ۱۹۵۶ء کو لاہور میں مغربی پاکستان اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کا اجلاس شروع ہوا۔ اسمبلی کے کل ارکان کی تعداد ۳۱۰ تھی۔ جن میں سے ۲۴۵ ارکان نے مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کئے اور ۲۲۷ افراد پارٹی کے اجلاس میں شریک ہوئے۔

اگلے دن خفیہ رائے شماری کے ذریعہ مسلم لیگی ارکان کی اکثریت نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ پارٹی کو کسی ایسے وزیر اعلیٰ کی حمایت نہ کرنی چاہیے جو مسلم لیگی نہ ہو' اس کے بعد پارٹی نے اتفاق رائے سے سردار بہادر خان کو (جو ملک کی بری فوج کے سربراہ جنرل محمد ایوب خان کے بڑے بھائی تھے) اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ (۱۷)

ادھر یہ فیصلے ہوئے ادھر مسلم لیگ پارٹی کے وہ ارکان جو کسی نہ کسی وجہ سے ڈاکٹر خان صاحب کو وزیر اعلیٰ بنانے کے حامی تھے۔ راتوں رات ڈاکٹر خان صاحب کے گرد جمع ہو کر انہیں ایک نئی پارٹی بنانے کی ترغیب دینے لگے۔ ڈاکٹر خان صاحب تو ہر حالت میں وزارت اعلیٰ سے چمٹے رہنا چاہتے ہی تھے چنانچہ انہوں نے گورمانی کی تجویز اور اسکندر مرزا کی تائید پر (۱۸) ۲۳ر اپریل ۱۹۵۶ء ایک نئی پارٹی کی داغ بیل ڈال دی جس کا نام ری پبلکن پارٹی رکھا گیا۔ (۱۹)

اب صورتحال یہ تھی کہ عبوری نگراں وزارت کی معیاد ختم ہو چکی تھی۔ نئے انتخاب کے ذریعہ جو اسمبلی وجود میں آئی تھی اس میں ایک پارٹی نے اپنی بھاری اکثریت کا عملی ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ وزیر اعظم خود ایک اخباری بیان میں یہ تسلیم کر چکے تھے کہ مسلم لیگ پارٹی کو ایوان میں قطعی اکثریت حاصل ہے۔ ۲۲۷ ارکان متفقہ طور پر سردار بہادر خان کو اپنا لیڈر چن چکے تھے اور سردار بہادر خان گورنر کو ایک چٹھی کے ذریعہ اس صورتحال سے مطلع کر چکے تھے اور خود کو ایک ممکنہ وزیر اعلیٰ کے طور پر پیش کر چکے تھے لیکن گورنر (مشتاق احمد گورمانی) آئینی پوزیشن کی یہ عجیب تاویل پیش کر رہے تھے کہ ڈاکٹر خان صاحب چونکہ وزیر اعلیٰ ہیں (حالانکہ وہ محض عارضی نگراں وزارت کے وزیر اعلیٰ تھے) لہٰذا جب تک نئی اسمبلی میں انہیں شکست نہ ہو گورنر ان کا ہر مشورہ ماننے کا پابند ہے۔ (۲۰)

مسلم لیگ کے ارکان اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے اسمبلی کا اجلاس طلب کرنا چاہتے تھے مگر گورنر کوئی ایک ماہ تک لیت و لال سے کام لیتے رہے۔ اس دوران جب ری پبلکن پارٹی نے

ہر قسم کے حربے استعمال کر کے اپنی طاقت مستحکم کر لی تو مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کو باہمی زور آزمائی کا موقع مہیا کرنے کے لئے ۱۹؍ مئی ۱۹۵۶ء کو مغربی پاکستان کا پہلا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ (۲۱)

یہ اجلاس جس کشیدگی کی فضا میں منعقد ہوا۔ وہ محتاج بیان نہیں پہلا معرکہ نئی اسمبلی کے اسپیکر کے انتخاب پر ہوا۔ اسپیکر کے انتخاب تک اسمبلی کی صدارت کرنے کے لئے گورنر گورمانی نے ریاست خیرپور کے ممتاز حسن قزلباش کو صدر نامزد کر دیا۔ (۲۲)

۱۹؍ مئی کا دن ممبروں سے حلف لینے میں گزر گیا' ووٹوں کی جنگ اس سے اگلے دن ہوئی۔ مسلم لیگ پارٹی نے میر غلام علی تالپور کو اور ری پبلکن پارٹی نے چودھری فضل الٰہی کو اپنا امیدوار نامزد کر دیا تھا۔ رائے شماری کے وقت ممبروں کے درمیان کھینچا تانی اور ہاتھا پائی بھی ہوئی۔ مسلم لیگی ممبران چیخ پکار کرتے رہے لیکن صدر نے یہ فیصلہ دے دیا کہ دونوں طرف کے ووٹ برابر ہیں اور پھر اپنا کاسٹنگ ووٹ ری پبلکن امیدوار کے حق میں دے کر اسے کامیاب کرا دیا۔ (۲۳)

اگلے دن روزنامہ جنگ کراچی نے سرخی جمائی۔

"مغربی پاکستان اسمبلی میں دھاندلی کی انتہا۔ ری پبلکن فضل الٰہی کو اسپیکر قرار دے دیا گیا۔ تحریک عدم اعتماد کی تیاریاں"۔ (۲۴)

اس سرخی ہی سے اسپیکر کے انتخاب کے لئے ہونے والی جوڑ توڑ کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اگلے دن مسلم لیگ نے انتخاب کے خلاف ہائی کورٹ میں عذر داری دائر کر دی۔ پیرزادہ عبدالستار مسلم لیگ کے وکیل تھے۔ وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے مسلم لیگی رکن تھے۔ وہ ہائی کورٹ میں عذر داری داخل کرنے کے بعد سیدھے گورنر ہاؤس پہنچے حلف وفاداری اٹھایا' وزیر قانون و پارلیمانی امور بن کر تالیوں کی گونج میں ایوان میں داخل ہوئے اور سرکاری بنچوں پر براجمان ہوئے۔ اسپیکر کے انتخاب کے خلاف درخواست کی مزاحمت ان کی وزارت قانون کی ذمہ داری تھی۔ ہائی کورٹ نے مسلم لیگ کی عذر داری خارج کر دی۔ (۲۵) اور ۵؍ جون ۱۹۵۶ء کو ہائی کورٹ نے چودھری فضل الٰہی کا انتخاب جائز قرار دے دیا۔ (۲۶)

ڈاکٹر خان صاحب یہ معرکہ تو جیتنے میں کامیاب ہو گئے مگر چند ماہ کے اندر اندر جب مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی حکومت قائم ہو گئی اور مرکز میں ری پبلکن عوامی لیگ اشتراک سے سہروردی وزیر اعظم بن گئے تو ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت ایک مرتبہ پھر ڈولنے لگی۔ جی ایم سید جو اسپیکر کے انتخاب کے وقت ری پبلکن پارٹی کے ساتھ تھے' اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسلم لیگ سے جا ملے۔ یہاں تک کہ ۲۰؍ مارچ ۱۹۵۷ء کو سردار بہادر خان نے ری پبلکن وزارت کو اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے باقاعدہ چیلنج دے دیا۔ (۲۷)

ڈاکٹر خان صاحب کو عافیت اسی میں نظر آئی کہ وہ گورنر سے اسمبلی توڑنے کے لئے کہیں۔ مگر اسکندر مرزا اسمبلی کے نئے انتخابات سے بہت گھبراتے تھے۔ چنانچہ ایک درمیانی راستہ نکالا گیا اور ۲۱ر مارچ ۱۹۵۷ء کو دو ماہ کے لئے اسمبلی اور ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو معطل کر کے صوبے میں گورنر راج قائم کر دیا گیا۔ (۲۸)

ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کی وزارت اعلیٰ سے برطرفی کے بعد بھی سیاست میں متحرک رہے اور اگلے ہی مہینے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ تقریباً ایک برس بعد ۹ر مئی ۱۹۵۸ء کو عطا محمد نامی ایک سابقہ پٹواری نے انہیں لاہور میں قتل کر دیا اور یوں ڈاکٹر خان صاحب کے ہنگامہ خیز سیاسی کیریر کا المناک خاتمہ ہو گیا۔ (۲۹)

مغربی پاکستان کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کی شہادت کا سانحہ مارشل لاء پس منظر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سانحہ سے کچھ عرصہ پہلے صدر اسکندر مرزا کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو گئے تھے اور انہوں نے صدر سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا تھا میر علی احمد تالپور جو ان دنوں مغربی پاکستان کابینہ میں وزیر تھے۔ بتاتے ہیں۔ "صوبہ کے ایک اور وزیر کرنل عابد حسین میری موجودگی میں ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ جنرل صاحب (اسکندر مرزا) نے فرمائش کی ہے کہ آپ ان سے ضرور ملیں' ڈاکٹر خان صاحب نے جواب دیا کہ' میں اس سے کیوں ملوں۔ میں تو اب اپنے صوبے کے عوام سے ملوں گا۔

صدر اسکندر مرزا سے قطع روابط کرنے کے بعد ڈاکٹر خاں صاحب نے جو اپنی ذات میں ایک بے حد عوام دوست شخصیت تھے' پنجاب کے گاؤں میں جگہ جگہ جلسے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا' وہ سازشی سیاست دانوں اور سامراج کے نقطہ نظر سے "خطرناک" ہو سکتا تھا۔"

میر علی احمد تالپور نے بتایا کہ جس صبح ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کا سانحہ رونما ہوا' اس سے پہلی رات میں' وہ ہمارے یہاں مہمان تھے۔ اس رات کھانے پر جو لوگ موجود تھے' ان میں ڈاکٹر بھیک' ایوب اعوان' میر علی بخش تالپور اور مشہور ریڈیو سنگر ماسٹر عنایت حسین بھی شامل تھے' ڈاکٹر صاحب پنجاب کے دورے سے واپس ہوئے تھے اور بہت دیر سے آئے تھے' رات میں دیر سے ہی ان کی واپسی ہوئی۔ چنانچہ بعد میں ان کے قاتل نے بتایا کہ وہ رات اس نے درخت پر جاگ کر گزاری تھی۔

بہرحال اس دعوت میں' ادھر ادھر کی گفتگو کے دوران' ڈاکٹر خان صاحب نے کسی بات پر ایوب اعوان سے اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں کہا "یارا' اپنے پنجاب کے دیہاتی تو بہت اچھے لوگ ہیں وہ تو اپنے پٹھانوں سے بھی زیادہ اچھے ہیں۔" میر تالپور کا بیان ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب کا یہ فقرہ' ان کی غیر معمولی وسیع القلبی اور پنجاب کے عوام سے والہانہ محبت کا آئینہ دار

تھا۔ میں اس فقرہ سے بے حد متاثر ہوا۔ دوسری صبح' ان کے قتل کی خبر' ٹیلیفون پر ملی۔ میر تالپور کو پختہ یقین تھا کہ یہ سانحہ قتل' غیر ملکی سامراج اور بعض سازشی سیاست دانوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ اس میں کسی ایک فرد کا نہیں' بلکہ بہت سے افراد کا ہاتھ تھا۔ جس طرح سندھ میں مرحوم اللہ بخش کا قتل اس وقت کے سامراج اور سیاست دانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ بات سے بات نکلتی ہے' میر تالپور نے کہا کہ میرے دل میں مرحوم اللہ بخش کے لئے غیر معمولی احترام کا جذبہ موجزن ہے۔ ان کے ساتھ میرے تعلقات نیاز مندانہ تھے اور وہ بھی اسی طرح سامراج کی سازش کا شکار ہوئے تھے' جس طرح ڈاکٹر خاں صاحب۔ (۳۰)

ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کے بعد ان کے صاحبزادے سعد اللہ خان کو مغربی پاکستان کا وزیر مقرر کیا گیا تاہم انہیں زیادہ دیر تک کام کرنے کا موقع نہ ملا اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ (۳۱) سعد اللہ خان اس سے قبل ۱۹۳۱ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات مسترد کرنے کی تحریک میں قید و بند کی صعوبت برداشت کر چکے تھے اور بنارس جیل میں اسیر رہے تھے۔ (۳۲)

ڈاکٹر خان صاحب کے چھوٹے بھائی خان عبدالغفار خان کا' جو باچا خان کے نام سے زیادہ معروف ہیں' سیاسی کیریر اپنے بڑے بھائی کے سیاسی کیریر سے زیادہ ہنگامہ خیز گزرا۔ پاکستانی سیاست پر ان کے نقوش بڑے گہرے ہیں۔ جتنی تعداد ان کے عقیدت مندوں کی ہے اتنی ہی تعداد ان کے نکتہ چینوں کی ہے۔

باچا خان ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ ہشت نگر کے گاؤں اتمان زئی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی پھر پشاور اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے استفادہ کیا۔ جب وہ تعلیم فارغ ______ ہوئے تو پورا ہندوستان رولٹ ایکٹ جیسے کالے قانون کی منظوری کی وجہ سے سراپا احتجاج بنا ہوا تھا۔ اب تک خان عبدالغفار خان خاموش کارکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے لیکن رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک میں ان کی خطیبانہ صلاحیتیں کھلیں اور انہیں پہلی مرتبہ قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑی۔ رہائی کے بعد باچا خان تحریک ہجرت میں شامل ہوئے۔ اور کابل ہجرت کر گئے۔ تحریک ہجرت حالات کی سنگینی سے ٹکرائی تو غفار خاں بھی دوسرے مہاجرین سمیت اس احساس کے ساتھ وطن لوٹے کہ آزادی ایسے جذباتی اقدامات سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ وطن واپسی کے بعد انہوں نے اپنے گاؤں اتمان زئی میں آزاد قومی مدرسہ قائم کیا اور اسے پوری توجہ اور محنت سے چلانے لگے جس پر انہیں پھر گرفتار کر لیا۔ اس مرتبہ انہیں تین برس اسیری میں گزارنے پڑے۔ (۳۳)

اسی دوران پورے برصغیر میں خلافت تحریک اپنے نقطہ عروج کو پہنچی۔ اس کے اثرات پشاور تک پہنچے چنانچہ جب غفار خان رہا ہوئے تو انہوں نے تحریک خلافت کے لئے کام کرنا

شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے پرانے کام یعنی پشتونوں کو زیور علم سے آراستہ کرنے کی مہم میں بھی منہمک ہوئے اور اس سلسلے میں انہوں نے انجمن اصلاح الافاغنہ کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام صوبہ سرحد میں جگہ جگہ قومی مدرسے قائم کئے گئے جہاں بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جاتی تھی جس سے ان کے دل میں آزادی کی لگن' وطن کی محبت اور قومی خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ یہاں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہیں تھی اور ان مدرسوں میں دونوں مذاہب کے بچے مل جل کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

۱۹۲۶ء میں باچا خان کو آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کا موقع ملا۔ اس اجلاس میں شرکت سے باچا خان کا ذہنی افق بہت وسیع ہوا۔

۱۹۲۸ء میں انہوں نے پشتون نامی ایک اخبار جاری کیا جس کا مقصد ان کی انجمن "انجمن اصلاح افاغنہ" کے مقاصد کی اشاعت و ترویج تھی۔ اسی برس ان کی ملاقات علامہ اقبال' مولانا ظفر علی خان' جواہر لال نہرو' چودھری خلیق الزماں اور علی برادران سے ہوئی۔ ان ملاقاتوں کے دوران باچا خان کو مسلم لیگی رہنماؤں کی بہ نسبت کانگریسی رہنماؤں کے رویہ نے زیادہ متاثر کیا اور یوں وہ کانگریس کے قریب تر ہوتے گئے۔ (۳۴)

۱۹۳۰ء میں باچا خان نے اپنی اصلاحی تحریک انجمن اصلاح الافاغنہ کے لئے رضاکار بھرتی کرنے کی مہم شروع کی اور ان رضاکاروں کا نام "خدائی خدمت گار" تجویز کیا۔ ان کی وردی پہلے سفید رنگ کی تجویز ہوئی۔ پھر اس کے جلدی میلے ہو جانے کے باعث وردی کے لئے چاکلٹی رنگ منظور کیا گیا۔ اگرچہ یہ رنگ سرخ نہ تھا۔ اس میں سیاہ رنگ کی آمیزش تھی۔ مگر انگریزوں نے جان بوجھ کر اسے سرخ اور خدائی خدمتگاروں کو سرخ پوش کہنا شروع کر دیا۔ تاکہ تحریک کے ڈانڈے سوویت یونین سے ملائے جا سکیں۔

انجمن اصلاح الافاغنہ میں کثرت یا نمایاں حیثیت میاں قبیلہ کے افراد کو حاصل تھی۔ وہ اپنی رسم کے مطابق آپس میں ایک دوسرے کو "باچا" کے لقب سے پکارتے تھے۔ چنانچہ اس انجمن میں جب سب اکٹھے ہوئے تھے تو میاں اور غیر میاں سب ہی "باچا" پکارے جانے لگے۔ پٹھانوں میں یہ لفظ عزت و احترام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ہر سید و ملا کو باچا کے لقب سے خطاب کیا جاتا ہے حتیٰ کہ جب کوئی سوالی دست سوال دراز کرے تو کہہ دیا جاتا ہے "باچا' معاف کرو" بعد میں اس لفظ کو ہندو پریس نے "بادشاہ" (حکمراں) کے معنوں میں استعمال کرنا شروع کیا تو اس لفظ سے یہی مفہوم لیا جانے لگا اور یوں یہ لفظ خان عبد الغفار خاں کے نام کا نعم البدل بن گیا۔ (۳۵)

شروع میں خدائی خدمت گاروں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی لیکن اپریل ۱۹۳۰ء میں باچا خان کی گرفتاری کے بعد ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ سرحد میں یہ تحریک اتنی وسعت اختیار کر گئی کہ حکومت بوکھلا گئی۔ مردوں کے علاوہ عورتیں' بچے' بوڑھے نہایت ذوق و شوق سے اس

تحریک میں شامل ہوتے، سرخ کپڑے پہنتے اور حکومت کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے لئے پروانہ وار اپنی جان نثار کرتے۔

خدائی خدمت گار تحریک نے کانگریس کی عدم تعاون کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قربانی کے وہ نمونے پیش کیئے جن کی مثال متحدہ ہندوستان میں نہیں ملتی انگریزوں نے ان کی بڑھتی ہوئی تعداد اور مضبوط تنظیم سے گھبرا کر انہیں کچلنے کا تہیہ کر لیا اور ان پر ایسے ایسے انسانیت سوز ظلم کیئے، جن کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (۳۶)

باچا خان اپنے کام میں مگن تھے۔ ان کی دور رس نگاہ سے حکومت کے عزائم او جھل نہ تھے۔ وہ اس موقعہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ آخر کار وہ دن آن پہنچا۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں اتمان زئی میں خدائی خدمت گاروں کا عظیم اجتماع منعقد ہوا جہاں باچا خان نے حریت پرور خطاب کیا اور وہ پشاور روانہ ہوئے۔ راستہ میں انہیں ناکی تھانہ کے قریب حراست میں لے لیا گیا۔ ان کے ساتھیوں عبدالاکبر خاں، سالار سرفراز خاں اور حاجی شاہنواز منتظم جلسہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں رسالپور کے علاقہ مجسٹریٹ خان بہادر قلی خان کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے فرنٹیر کرائمز ریگولیشن کی دفعہ ۴۰ کے تحت تین تین برس کی قید کا حکم سنایا اور انہیں پنجاب کی جیل گجرات میں پہنچا دیا۔ سرحد میں تحریک حریت کو کچلنے کے لئے پوری حکومتی مشینری حرکت میں آ گئی۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کے اوائل میں یہاں قیامت ٹوٹ پڑی۔ ظلم و استبداد اور جو روستم کے تمام حربے بے دریغانہ استعمال ہوئے۔ بے گناہوں کے لہو سے سرزمین سرحد لالہ زار بن گئی۔ جیل خانے حریت پروروں سے بھر گئے۔ ۲۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کو قصہ خوانی بازار میں نہتے اور پر امن شہریوں پر مسلسل فائرنگ سے ان گنت معصوم جاں بحق ہوئے۔

اس عظیم سانحہ کے بعد صوبہ عملی طور پر فوج کی تحویل میں تھا۔ حکومت نے یہاں کے خونی واقعات سے باہر کی دنیا کو بے خبر رکھنے کے لئے سخت ترین اقدامات کیئے۔ کسی شخص کو صوبہ سے نکلنے اور داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ مسٹر اتم چند نے تمام واقعات قلم بند کر کے عبدالعزیز خوش باش کے حوالے کیے جس نے لاہور میں پنجاب کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری سردار سردول سنگھ کو پہنچائے۔ اس طرح مظالم کی داستان ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت سے ملک میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ انہی دنوں بازار کلاں پشاور، ٹکر اور چار سدہ میں بھی فائرنگ کے واقعات ہوئے اور کئی بے گناہ لقمہ اجل بنے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف پشاور جیل میں ۳۵۰۰ سیاسی قیدی تھے۔ صوبہ کی جیلوں میں مزید قیدی رکھنے کی گنجائش نہ رہی تو سیاسی قیدیوں کو پاؤں میں زنجیریں ڈال کر جیل سے باہر رکھا جاتا تھا۔ ان میں بچے، بوڑھے، جوان اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ (۳۷)

اسی دوران باچا خان کو صاحبزادہ عبدالقیوم خان کا پیغام ملا۔

انہوں نے کہا تھا کہ یہ خدائی خدمت گار اپنا تعلق فوراً ملک کی کسی بڑی جماعت کے ساتھ جوڑیں کیونکہ حکومت خدائی خدمت گاروں کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ اگر حکومت اپنے عزائم میں کامیاب ہو گئی تو اس سے پشتونوں کے علاوہ ملک کی تحریک آزادی کو بھی بے اندازہ نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ باچا خاں کے مشورہ سے ایک وفد تشکیل دیا گیا۔ جو دہلی' لاہور اور شملہ جا کر مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں سے رابطہ قائم کرے' انہیں اپنے مصائب سے آگاہ کرے اور ان کا تعاون و مدد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ وفد دو ماہ تک مسلم لیگیوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا رہا لیکن کسی نے ان کی فریاد نہ سنی۔ خدائی خدمت گاروں کی مدد کرنا حکومت کے قہر کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وفد نے واپس آ کر اپنی ناکامی اور مسلم لیگیوں کی بے رخی کا حال اپنے رفقاء کو بتایا۔ مسلم لیگ کے رویہ سے مایوس ہو کر خدائی خدمت گاروں نے کانگریس کی طرف رجوع کیا اور کانگریس سے ان کا سمجھوتہ طے پا گیا۔ انہی ایام میں گاندھی اردن پیکٹ کی رو سے تمام کانگریسی جیلوں سے رہا ہو گئے لیکن باچا خان کی رہائی نہ ہوئی۔ جب گاندھی جی نے لارڈ اردن کو خدائی خدمت گاروں کے کانگریس میں الحاق کے بارے میں بتایا تو حکومت اس سے پریشان ہو گئی۔ اس نے خدائی خدمت گاروں سے مفاہمت کرنے کی سر توڑ کوششیں کیں۔ صوبہ سرحد کو مراعات دینے کا لالچ دیا لیکن اسے اپنے عزائم میں کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار حکومت نے مجبور ہو کر باچا خان کو رہا کر دیا۔ حکومت کے مظالم کی تحقیقات کرنے کے لئے کانگریس نے ایک تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دی۔ حکومت نے کمیٹی کے ارکان کا داخلہ صوبہ میں ممنوع قرار دے دیا۔ کمیٹی نے کیمبل پور میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر کے تحقیقات کا کام مکمل کیا۔ کانگریس کمیٹی کی رپورٹ کی وسیع پیمانہ پر تشہیر کی۔ اس سے حکومت کی پوزیشن سخت خراب ہوئی اور اس کا انداز مدافعانہ ہو گیا۔ (۳۸)

خان عبدالغفار خان اس کے بعد بھی کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۴ء میں ان کا اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کا داخلہ صوبہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس غریب الوطنی میں کسی مسلمان رہنما یا تنظیم نے ان کو اپنے یہاں نہ بلایا جبکہ سیٹھ جمنا لال بجاج نے انہیں اپنے ہاں واردھا آنے کی دعوت دی۔ ان دنوں گاندھی جی بھی وہیں مقیم تھے۔ یہی وہ دور تھا جب خان برادران گاندھی کے قریب آئے۔

۱۹۳۷ء میں وہ گھر واپس آئے۔ اسی برس ان کی قربانیوں کا ثمر انہیں اس طرح ملا کہ جب ان کی جماعت سرحد اسمبلی کے پہلے عام انتخابات میں سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری اور پچاس میں سے انیس نشستوں پر کامیاب ہوئی۔ (۳۹) مگر ہوا یہ کہ اس اکثریت کے باوجود صاحبزادہ عبدالقیوم صوبے کے وزیر اعلیٰ بنا دیئے گئے۔ چنانچہ خدائی خدمتگاروں نے انہیں تحریک عدم اعتماد کے ذریعہ رخصت کر دیا اور صوبہ میں ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں سرخپوشوں کی

وزارت قائم ہو گئی۔

باچا خان کے نزدیک عدم تشدد سیاسی حکمت عملی نہ تھی۔ وہ اس پر بطور عقیدہ کاربند تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے دوسری جنگ عظیم میں بعض شرائط کے تحت انگریزوں کی حمایت کرنے کا ریزولیوشن منظور کیا۔ یہ فیصلہ باچا خان کے عقیدہ عدم تشدد کے سراسر منافی تھا۔ انہوں نے اس کی پرزور مخالفت کی اور کانگریس سے اپنی جماعت خدائی خدمت گاروں سمیت علیحدگی اختیار کر لی۔ گاندھی جی نے اپنے اخبار "ہریجن" میں باچا خان کی اصول پسندی کی تائید میں زبردست آرٹیکل لکھے۔ انہیں عدم تشدد کا سچا اور عظیم پیرو کار قرار دیا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ پوری کانگریس ورکنگ کمیٹی عدم تشدد کے اصول سے پھسل گئی لیکن صرف باچا خان اس پر قائم رہے۔ بلد ہی کانگریس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ انہوں نے جنگ میں تعاون کرنے کا ریزولیوشن واپس لے لیا اور عدم تشدد کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے حکومت سے تعاون نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر باچا خان نے پھر کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔ حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی رائے معلوم کئے بغیر اسے جنگ میں ملوث کر دیا تو ہندوستان کے آٹھ صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا جن میں سرحد کی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت بھی شامل تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور باچا خان صوبہ سرحد کی طرف سے ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۴۰) ادھر ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں دوبارہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت بن گئی۔ ۳؍ جون ۱۹۴۷ء کے فارمولے کے بعد صوبہ سرحد کا پاکستان یا ہندوستان میں شامل ہونے کے لئے ریفرنڈم کا سوال آیا تو باچا خان نے اس بنیاد پر ریفرنڈم کی مخالفت کی کہ خدائی خدمت گار کانگریس کے اتحادی ہیں تقسیم ہند منصوبہ کو کانگریس اور مسلم لیگ نے تسلیم کر لیا ہے لہٰذا خدائی خدمت گار بھی اس کے پابند ہیں اور پاکستان کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہیں لیکن ماؤنٹ بیٹن اور مسلم لیگ ریفرنڈم کی رٹ پر قائم رہے۔ جب باچا خان کی کسی دلیل کو نہ سنا گیا تو انہوں نے مجبور ہو کر اس شرط پر ریفرنڈم کو تسلیم کر لیا کہ ہندوستان یا پاکستان میں شمولیت کے ساتھ ساتھ آزاد پختونستان کے نکتے کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے۔ مسلم لیگ اور ماؤنٹ بیٹن نے یہ شرط ماننے سے انکار اور خدائی خدمتگاروں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر دیا۔ سرحد کے عوام نے یک طرفہ ریفرنڈم میں پچاس اعشاریہ ایک فی صد ووٹ پاکستان کے حق میں ڈالے اس طرح صوبہ سرحد کا پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ ہوا۔ اگر ریفرنڈم میں پختونستان کا نکتہ بھی شامل کر لیا جاتا یا خدائی خدمتگار ریفرنڈم کا بائیکاٹ نہ کرتے تو شاید نتائج مختلف ہوتے لیکن چونکہ ریفرنڈم کے بغیر خدائی خدمت گار پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے اس لئے انہوں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر دیا۔

باچا خان کا اصولی موقف یہ تھا کہ چونکہ خدائی خدمت گار کانگریس کے اتحادی ہیں اور کانگریس ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کے اصول کو مان چکی ہے اس لئے منطقی نتیجے کے طور پر خدائی خدمت گار بھی پاکستان کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہی منطقی بنیاد تھی جس کی بنیاد پر باچا خان نے ہندوستان کی بجائے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شمولیت کا فیصلہ کیا صوبہ سرحد میں ان کی حکومت تھی نئے حکمرانوں کا پہلا نشانہ یہی حکومت بنی۔ اس کے باوجود خدائی خدمت گاروں نے برداشت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنے ہیڈ کوارٹر سردریاب میں پاکستان سے وفاداری اور اس کی خدمت کا عہد نبھایا انہوں نے ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف کرنے کے غیر جمہوری اقدام کے خلاف احتجاج کیا لیکن نئی مرکزی اور صوبائی حکومت کے لئے کسی قسم کی مشکلات پیدا نہ کرنے کا اعلان کیا۔ یہی نہیں مارچ ۱۹۴۸ء میں باچا خان نے دستور ساز اسمبلی کے اجلاسوں میں بھرپور شرکت کی۔ ان اجلاسوں میں پاکستان سے وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے انہوں نے اپنے اس عزم کو دہرایا کہ ان کا پروگرام تخریبی نہیں، تعمیری ہے اور خدائی خدمت گار تحریک بنیادی طور پر اصلاحی اور سماجی تحریک ہے جسے انگریزوں نے سیاسی عمل اور کانگریس کے ساتھ اشتراک کی جانب دھکیل دیا تھا۔

باچا خان کا کہنا تھا کہ پاکستان پانچ بھائیوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ پانچ بھائی پنجابی، سندھی، بنگالی، بلوچی اور پشتون ہیں۔ پنجابیوں کے صوبے کا نام پنجاب، اسی طرح بنگالیوں کے صوبے کا نام بنگال بلوچوں کے صوبے کا نام بلوچستان اور سندھیوں کا نام سندھ تھا۔ باچا خان کا مطالبہ صرف اتنا تھا کہ پختونوں کے صوبے کو شمال مغربی سرحدی صوبہ کہنے کے بجائے پختونستان کہا جائے۔

انہی دنوں پارلیمینٹ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ انگریزوں کو تمام کلیدی اسامیوں سے ہٹا دیا جائے۔ صوبہ سرحد کے انگریز گورنر اور اس کے مسلم لیگی گماشتوں کو اس مطالبے کی منظوری میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ انہوں نے صوبے کے سیاسی طالع آزماؤں سے کھسر پھسر کر کے قائداعظم سے باچا خان کی مفاہمت کو مکمل طور پر ختم کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس سے قبل مارچ ۱۹۴۸ء میں قائداعظم نے باچا خان کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا تو دونوں کے درمیان دل کھول کر باتیں ہوئی تھیں انہوں نے قائداعظم کو ایک بار پھر یقین دلایا تھا کہ وہ پاکستان کے وفادار ہیں اور چونکہ ان کے متعلق بعض حلقوں میں شکوک ہیں اس لئے جب تک وہ شکوک رفع نہیں ہو جاتے وہ سیاست میں عملی حصہ نہیں لیں گے اور اپنی سرگرمیوں کو صرف اصلاحی پروگرام تک محدود رکھیں گے "میری صاف صاف باتوں سے، جو میں نے نہایت دیانت داری سے کہی تھیں، قائداعظم کی بالکل تسلی ہو گئی اور انہوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے نہایت پیار سے رخصت کیا۔" باچا خان نے ایک انٹرویو میں بتایا۔ لیکن اپریل میں جب قائداعظم پشاور کے دورے پر تشریف لائے تو انہی سیاسی طالع آزماؤں نے قائداعظم کے

کان میں یہ ڈالا کہ باچا خان اور ان کی تنظیم کے لوگ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ یہاں تک سنا جاتا ہے کہ انہوں نے قائداعظم کو یہ تک کہا کہ اگر وہ خدائی خدمت گاروں کی دعوت پر ان کی کسی تقریب میں گئے تو ان کی زندگی تک کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ یہ سب قیوم خان کا پھیلایا ہوا جھوٹ تھا۔ "چنانچہ جب میں گورنمنٹ ہاؤس میں قائداعظم کے پاس یہ دعوت نامہ لے کر گیا کہ وہ خدائی خدمت گاروں کی طرف سے دی جانے والی ایک تقریب میں شمولیت فرمائیں تو قائداعظم نے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔۔۔" (۴۱) باچا خان، جو مفاہمت کے لئے کوشاں تھے، الٹا حکومت کے معتوب بن گئے اور قیوم خان ایک آمر مطلق بن کر انتقامی کارروائیوں میں مصروف ہو گیا۔

۸ر مئی ۱۹۴۸ء کو باچا خان نے کراچی میں سیاسی کارکنوں کے ایک اجلاس میں شرکت کی۔ جس میں ایک نئی سیاسی تنظیم "پیپلز پارٹی" کو تشکیل دینے کا اصولی فیصلہ کیا گیا۔ یہ پارٹی ایک آئینی اپوزیشن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے تشکیل دی جا رہی تھی۔ باچا خان کے دیگر ساتھیوں میں جی ایم سید اور عبدالصمد خان اچکزئی بھی شامل تھے۔ غفار خان، اس نئی تنظیم کے صدر اور جی ایم سید جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ ہر برادری کے افراد اس کے رکن بن سکتے تھے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے اغراض و مقاصد میں صوبائی خودمختاری عوام کی تائید و رضامندی سے ترقی پسند سماجی تبدیلیاں اور ہندوستان سمیت تمام پڑوسی ملکوں سے دوستانہ ثقافتی تعلقات شامل تھے۔ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ خدائی خدمت گار تحریک کا اپنا الگ تشخص قائم رہے گا۔ یہ نئی سیاسی جماعت کے لئے والنٹیر کور کی خدمات انجام دے گی اور اسے تمام صوبوں میں پھیلایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے باچا خان سرحد واپس آئے اور صوبے کا دورہ شروع کر دیا لیکن ایک ماہ کے اندر ہی ۱۵ر جون کو، وہ اپنے بیٹے عبدالولی خان اور قاضی عطاء اللہ خان سمیت گرفتار کر لئے گئے۔ عبدالصمد اچکزئی کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ جی ایم سید کو کراچی سے نکال دیا گیا۔ یوں ایک نئی سیاسی تنظیم، جو جمہوری عمل اور سیاسی آزادیوں کی جدوجہد کے ذریعے پورے ملک میں قومی یکجہتی کے لئے اپنے کام کا آغاز کر رہی تھی، اپنی پیدائش کے ساتھ ہی دم توڑ گئی۔

لیکن جو کچھ ہوا، اس سے کہیں زیادہ تھا۔ جولائی میں صوبہ سرحد کی حکومت نے ایک آرڈیننس کے ذریعے خدائی خدمت تحریک کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا۔ ۱۲ر اگست ۱۹۴۸ء کو قیوم خان نے چارسدہ کے گاؤں بابڑہ میں اس بیدردی سے فائرنگ کروائی کہ لوگ انگریزی عہد کے مظالم بھول گئے۔ اس وحشیانہ فائرنگ میں سینکڑوں لوگ شہید اور زخمی ہو گئے۔ زخمیوں کو سرکاری ہسپتال میں داخلے کی اجازت نہ دی گئی اور اس طرح اموات میں مزید اضافہ ہوا۔ باچا خان، ڈاکٹر خان صاحب، عبدالولی خان، عبدالصمد اچکزئی، ماسٹر عبدالکریم، حسین بخش کوثر اور امیر محمد خان سمیت، متعدد رہنما جیلوں میں برسوں لمبی قیدیں کاٹ رہے تھے۔

بابڑہ میں رضاکاروں کو برہنہ کر کے ان کے جلوس نکالے گئے ان کے مال و املاک ضبط کئے گئے۔ خانہ تلاشیاں' عورتوں کی بے عزتی' سر عام مار پیٹ اور اس قسم کے دوسرے واقعات نے پورے صوبے میں دہشت پھیلا دی۔ صوبہ سرحد کے جنرل ڈائر قیوم خان نے فائرنگ کے فوراً بعد چوک یادگار پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اس نے بابڑہ میں خدائی خدمت گاروں کو وہ سبق دیا ہے جسے وہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔" یہ انگریزوں کی نہیں مسلم لیگ کی حکومت ہے اور اس حکومت کا نام قیوم خان ہے۔ خدائی خدمت گار ملک کے غدار ہیں۔ میں ان کا نام و نشان مٹا دوں گا" ۔(۴۲) تاریخ گواہ ہے کہ قیوم خان نے زندگی بھر اپنا یہ وعدہ پورا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے نتیجے میں خود اس کا نام مٹ گیا۔ خدائی خدمت گار تحریک پر پابندی لگا کر اور اس کے رہنماؤں کو برسوں تک جیلوں میں بند رکھنے کے باوجود' انہیں عوام سے جدا نہ کیا جا سکا۔ (۴۳)

چھ سال کی مسلسل اسیری کے بعد رہا ہوئے تو ان دنوں کراچی میں مرکزی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں باچا خان نے شرکت کی۔ ان دنوں مغربی پاکستان کو ون یونٹ بنانے کا منصوبہ زیر غور تھا۔ اس مسئلہ پر چوہدری محمد علی' مشتاق احمد گورمانی' سردار بہادر خان اور ملک فیروز خان نون نے باچا خاں سے مذاکرات کئے۔ باچا خان نے اسے غیر جمہوری قرار دیا بنگالیوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ بعد ازاں مغربی پاکستان کی علاقائی فیڈریشن قائم کرنے کا منصوبہ پیش ہوا۔ سردار بہادر خان کے بنگلہ پر ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں باچا خان کے علاوہ سردار عبدالرب نشتر' سردار اسد جان اور سردار بہادر خان نے شرکت کی۔ اجلاس میں علاقائی فیڈریشن کے منصوبہ پر عمل درآمد پر غور کیا گیا۔ باچا خان نے بعض شرائط کے ساتھ اس منصوبے کے حق میں رائے دی لیکن بنگالیوں نے اسے بھی مسترد کر دیا۔ اس طرح یہ منصوبہ بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ حکمران طبقہ از سر نو ون یونٹ سکیم کی طرف متوجہ ہوا۔ سردار بہادر خان کے مکان پر ایک اور اجلاس منعقد ہوا جس میں باچا خان کے علاوہ ڈاکٹر خان صاحب' میجر جنرل اسکندر مرزا اور سردار عبدالرشید نے شرکت کی۔ باچا خان کی تجویز پر متفقہ طور پر طے پایا کہ ون یونٹ قائم کرنے سے پہلے عوام کی رائے معلوم کی جائے گی۔

غلام محمد نے پارلیمنٹ کو توڑ دیا۔ نئی دستوریہ معرض وجود میں آئی۔ اس کا اجلاس (۱۹۵۵ء) مری میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے ایک خفیہ دستاویز تقسیم کی جس میں کہا گیا تھا کہ اگر باچا خان کے ساتھ سمجھوتہ کیا گیا تو ون یونٹ پلان خطرہ میں پڑ جائے گا۔ باچا خان اس وقت مری میں موجود تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں بعض وزراء نے باچا خان سے ملاقات کی۔ مسٹر گورمانی نے ون یونٹ کی افادیت بیان کی لیکن باچا خان نے ان کے استدلال سے اتفاق نہیں کیا اور وہ عوام کی رائے معلوم کرنے پر مصر رہے۔ چوہدری محمد علی نے باچا خان کو اپنی دیہی

ترقی کی اسکیم سے آگاہ کیا اور باچا خان کو اس کا انتظام سنبھالنے کی دعوت دی۔ باچا خان نے اس ذمہ داری کو اس شرط کے ساتھ قبول کرنے کی حامی بھری کہ ون یونٹ کے مسئلہ پر عوام کی رائے معلوم کی جائے۔ مسٹر سہروردی نے اپنے دلائل میں باچا خان کو کہا کہ حکومت کی امداد اور سرمایہ کی فراہمی کے بغیر کوئی نمایاں کام نہیں ہو سکتا۔ یعنی وہ باچا خان کو ہمنوا بنانے کے لئے مالی ترغیب کو بطور ہتھیار استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہ اجلاس بغیر کسی نتیجہ کے ختم ہو گیا۔ جنرل اسکندر مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب سرکاری دورے پر صوبہ سرحد آئے۔ قربان علی خان کے مکان پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں باچا خان کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ جنرل اسکندر مرزا نے دیہی ترقی کی سکیم کا تفصیلی تذکرہ کیا اور ترغیبات و ترجیحات پر خاص زور دیا لیکن باچا خان نے اس کا انچارج بننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا مجھے سرمائے کی نہیں اعتماد کی ضرورت ہے۔

باچا خان نے اینٹی یونٹ فرنٹ پر زور و شور سے کام شروع کر دیا۔ ان کے حقیقی بھائی ون یونٹ کے وزیراعلیٰ تھے۔ باچا خان کو حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج مسٹر شبیر احمد کی عدالت میں مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ انہیں تا برخاست عدالت سزائے قید اور چودہ ہزار روپے جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔

مسلم لیگ نے اپنے عہد اقتدار میں حزب اقتدار کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کیا۔ جس نے اختلاف رائے کا اظہار کیا اسے ملک دشمن اور غدار قرار دے کر معتوب بنا دیا۔ بغیر مقدمہ چلائے غیر معینہ مدت تک جیل میں ڈال دیا۔ اس نا مساعد حالات کے باوجود کئی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اپنے حلقہ ہائے اثر میں جمہوری اقدار کی آبیاری میں مصروف رہیں۔ ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے نتائج نے انقلاب بپا کر دیا۔ بنگالیوں نے صوبہ میں مسلم لیگ کا تختہ الٹ دیا۔ ۳۱۰ کے ایوان میں مسلم لیگ صرف نو سیٹیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکی۔ صوبائی وزیراعظم مسٹر نور الامین ایک نوجوان طالب علم کے ہاتھوں اپنی ضمانت ضبط کرا بیٹھے۔ اس صورت حال سے ملک کے جمہوری عناصر کو بڑی تقویت ملی۔ چنانچہ مغربی پاکستان کی چھ چھوٹی چھوٹی جمہوریت پسند اور ہم خیال جماعتوں نے آپس میں مدغم ہو کر پاکستان نیشنل پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ ان میں آزاد پاکستان پارٹی' سندھ عوامی محاذ' سندھ ہاری کمیٹی' رستمان گل' درورے پختون اور باچا خان کی سرخ پوش جماعت شامل تھی۔ مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کے مسٹر حسین شہید سہروردی کے ساتھ اختلافات رونما ہوئے تو انہوں نے عوامی لیگ کو خیرباد کہہ دیا۔ پاکستان نیشنل پارٹی سے مل کر ملک گیر جماعت کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نام نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) رکھا گیا۔ اس کی تشکیل کے سلسلہ میں ڈھاکہ میں اجلاس ہوا جس میں باچا خان نے بھی شرکت کی تھی۔ عوامی لیگ کے غنڈوں نے باچا خان پر حملہ کرنے کی کوشش کی جسے ناکام بنا دیا گیا۔ باچا خان مغربی پاکستان نیپ کے صدر بنے۔ (۴۴)

مارچ ۱۹۵۸ء میں نیپ اور مسلم لیگ کے درمیان یونٹ کی تنسیخ کے مسئلہ پر معاہدہ طے پایا گیا۔ یہ معاہدہ میاں محمود علی قصوری کی رہائش گاہ پر ہوا۔ گفتگو میں مسلم لیگ کے "مرد آہن" مسٹر قیوم خان بھی شریک تھے۔ انہی ایام میں باچا خاں بھی یہیں رہائش پذیر تھے۔ "مرد آہن" نے باچا خان کو دیکھا تو پاؤں پکڑ لئے اور معافی مانگنے لگے معاہدہ میں کہا گیا تھا کہ:

۱۔ "مسلم لیگ آئندہ انتخابات مخلوط بنیادوں پر کرانے کے مطالبے کی حمایت کرے گی"۔

۲۔ "مغربی پاکستان کا وزیر اعلیٰ مسلم لیگی ہوگا اور یہ نیپ کے رہنما جی۔ ایم۔ سید کا نامزد کردہ ہوگا"۔

۳۔ کابینہ میں نصف تعداد نیپ کے ممبروں سے شامل کی جائے گی۔

معاہدہ پر مسلم لیگ کی جانب سے ممتاز دولتانہ، سردار بہادر خان، ایوب کھوڑو اور قیوم خان نے دستخط کئے جبکہ نیپ کی طرف سے مسٹر جی۔ ایم۔ سید، پیر الٰہی بخش اور غلام مصطفیٰ بھرگری کے دستخط تھے۔

مشرقی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی نے صوبائی عوامی لیگ وزارت کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا تو باچا خان نے اسے شدید ہدف تنقید بنایا۔ انہوں نے ون یونٹ کی تنسیخ کے مسئلہ پر سول نافرمانی جاری کرنے کی اجازت مرکزی جماعت سے طلب کی لیکن ہائی کمان نے انہیں اجازت نہ دی۔ اس پر انہوں نے جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ باچا خان کی تقلید کرتے ہوئے جی۔ ایم۔ سید بھی مستعفی ہو گئے۔ انہوں نے ایوب کھوڑو اور دوسرے سندھی لیڈروں کے ساتھ اینٹی یونٹ فرنٹ قائم کرلیا۔ اس کے ٹکٹ پر آئندہ انتخاب میں حصہ لینے کا پروگرام بنایا۔

باچا خان نے نیپ سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد اینٹی یونٹ سرگرمیاں تیز تر کردیں۔ انہوں نے پشاور کے جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا۔

ان کی جماعت آئندہ انتخاب میں اس وقت تک حصہ نہیں لے گی جب تک آئین میں ان کے مطالبات کے مطابق ترامیم شامل نہیں کی جاتیں"۔

ان کا سب سے بڑا مطالبہ ون یونٹ کی تنسیخ تھا۔ مزید برآں ان کا کہنا تھا کہ آئین میں اس امر کی ترمیم بھی شامل کی جائے جس کے ذریعہ چھوٹے صوبوں کے نمائندوں کو یہ اختیار حاصل ہو کہ ان کی اکثریت اگر یونٹ کو توڑنے کے حق میں ووٹ دے تو مرکزی حکومت اس کو عملی جامہ پہنانے کی پابند ہو گی۔ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اینٹی یونٹ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن اس سے قبل ہی ۷ر اکتوبر کو ایوب خان نے تمام جمہوری اداروں کو ختم کرکے ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا اور عنان حکومت فوج نے سنبھال لی۔

اس غیر جمہوری طرز عمل اور مارشل لاء کے خلاف خان عبدالغفار خاں نے انفرادی جدوجہد گری شروع کی۔ مارشل لاء کے خاتمہ اور جمہوریت کی بحالی کے لئے باچا خان کے پیروکار

ہزاروں خدائی خدمت گار جیلوں میں گئے۔ مارشل لاء کے ضابطوں کے تحت ان کو طویل مدت کی سزائیں سنائی گئیں۔ کروڑوں روپوں کی جائیدادیں ضبط ہوئیں متعدد جنازے جیلوں سے باہر آئے۔

مولانا عبدالحمید خان بھاشانی اور ایوب خان کے درمیان ملاقات سے خان عبدالغفار خان کی رہائی عمل میں آئی۔ وہ جیل میں شدید بیمار رہے۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۶۴ء کو رہا ہوئے لیکن علاج کے باوجود انہیں افاقہ نہ ہوا۔ وہ بغرض علاج ستمبر ۱۹۶۴ء میں بیرون ملک تشریف لے گئے۔ کراچی میں انہوں نے مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح سے ملاقات کرکے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے پر آمادہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ خان عبدالولی خاں مادر ملت کی الیکشن مہم صوبہ سرحد کے انچارج تھے۔ صوبہ سرحد میں پہلا جلسہ چوک یادگار پشاور میں انہی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں تقریر کرتے ہوئے مادر ملت نے کہا تھا۔

"حب الوطنی کسی کی اجارہ داری نہیں"۔

جیل کی زندگی نے باچا خان کی صحت پر نہایت برا اثر ڈالا۔ وہ کئی مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لندن میں بھی علاج سے انہیں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ وہ لندن سے کابل چلے آئے اور جلال آباد میں مقیم ہو گئے۔ (۴۵)

باچا خان نے ایک طویل عرصہ خود ساختہ جلا وطنی میں گزارا۔ ۱۹۸۶ء میں جب جی ایم سید نے انہیں اپنی سالگرہ میں شرکت کے لئے سندھ آنے کی دعوت دی تو باچا خان تھرڈ کلاس ڈبے میں ٹرین کے ذریعہ سندھ گئے۔ عمر کے آخری ایام میں باچا خاں نے کالا باغ ڈیم کے خلاف موقف اختیار کرکے صوبے کے لوگوں کو منظم کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ جب تک وہ یا پختون قوم کا ایک فرد بھی زندہ ہے کالا باغ ڈیم کو بننے نہیں دیا جائے گا۔ وہ اسے پختونوں کی بربادی اور تباہی کا منصوبہ سمجھتے تھے۔

۲۰ر جنوری ۱۹۸۸ء کو ۹۸ برس کی عمر میں باچا خان کا انتقال ہو گیا ان کی وصیت کے مطابق انہیں جلال آباد میں ان کے اس مکان کے سبزہ زار میں دفن کیا گیا جو انہیں افغانستان میں قیام کے دوران افغان حکومت نے بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ (۴۶)

خان عبدالغفار خان کے تین بیٹے ہیں۔ خان عبدالغنی خان، خان عبدالولی خان اور خان عبدالعلی خاں۔ خان عبدالغنی خان ابتدا ہی سے شعر و سخن اور فنون لطیفہ کے دلدادہ ہیں۔ تاہم وہ سیاست کے میدان سے بالکل ہی بیگانہ نہیں رہے انہوں نے خدائی خدمت گار تحریک پر ظلم و تشدد کے دنوں میں سیاست میں بھرپور حصہ لیا ہے اور اپنے والد کو رہا کرانے کے جرم کی پاداش میں قید و بند کی صعوبت برداشت کی ہے بعد ازاں انہوں نے پختون زلمے کے نام سے نوجوانوں کی ایک تنظیم بھی قائم کی۔ جس کے سپہ سالار وہ خود تھے۔ ۱۹۴۵ء میں وہ مرکزی مجلس قانون

ساز کے رکن منتخب ہوئے اور بھرپور انداز میں اپنے صوبے کی نمائندگی کی۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد انہوں نے اپنا بیشتر حصہ سیاست سے دور فنون لطیفہ اور ادب و شعر کے کوچے میں بسر کیا۔ (۴۷)

خان عبدالغفار خان کے دوسرے بیٹے خان عبدالولی خاں دسمبر ۱۹۱۵ء میں اتمان زئی میں پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے وہ اپنے والد کی سیاسی تنظیم خدائی خدمت گار تحریک سے وابستہ رہے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں اٹھاتے رہے ہیں۔ (۴۸)

خان عبدالولی خان ایک طویل عرصے سے نیشنل عوامی پارٹی جسے عرف عام میں نیپ کہا جاتا تھا' شامل تھے۔ اس پارٹی کے قائد عبدالحمید بھاشانی تھے۔ مگر جب ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات میں بھاشانی نے کھل کر محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی اور ان کا یہ اقدام ایوب خان کو تقویت پہنچانے کا باعث بنا تو نیشنل عوامی پارٹی واضح طور پر بھاشانی اور ولی خان کی قیادت میں دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ ولی خان اس انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح کے حامی تھے۔ (۴۹)

نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں دھڑوں کی پالیسی بظاہر یکساں نظر آتی تھی۔ دونوں دھڑے سوشلزم کے حق میں اور مغرب نواز پالیسی کے خلاف تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں کی پالیسیوں میں واضح فرق نمایاں ہوتا گیا۔ پہلا فرق بین الاقوامی سطح پر چین اور روس نوازی کا واضح ہوا۔ اس کے بعد ۶۹۔۱۹۶۸ء میں ولی گروپ نے پی ڈی ایم (پاکستان ڈیمو کریٹک موومنٹ) میں شامل ہو کر صدر ایوب کے ساتھ مذاکرات میں حصہ لیا۔ جبکہ مولانا بھاشانی نے مذاکرات کے بائیکاٹ اور انتخابات کے انعقاد کا نعرہ لگایا اور صدر ایوب کے ساتھ گول میز کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ بعد ازاں ولی گروپ نے سوشلزم کا نعرہ چھوڑ کر جمہوریت اور آزاد خارجہ پالیسی کا نعرہ اپنا لیا اور مغربی پاکستان میں ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے بعد سب سے بڑی جماعت کے طور پر ابھرا۔ تاہم اسے یہ تمام نشستیں صوبہ سرحد اور بلوچستان سے حاصل ہوئیں۔ پنجاب اور سندھ میں وہ کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ (۵۰)

جن دنوں مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ بھی کر چکا تھا۔ انہی دنوں ۲۷ نومبر ۱۹۷۱ء کو صدر یحییٰ خان نے نیپ کے تمام دھڑوں پر پابندی عائد کر دی۔ ان کا جرم یہ تھا کہ جب یحییٰ خان نے عوامی لیگ کو خلاف قانون قرار دیا اور اپنے ہی عوام کے خلاف فوج کشی کی تو نیپ کے علاوہ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے اس اقدام کی تائید کی۔ یحییٰ خاں کی نظر میں نیپ کا یہ جرم ناقابل معافی تھا اس لئے انہوں نے اس جماعت پر پابندی عائد کرتے ہوئے اس کے تمام اہم رہنماؤں کو ملک دشمن اور غدار قرار دے ڈالا۔

تیسرے مارشل لاء کے دوران جمہوریت کا پانچ سالہ دور آیا اس دور کا آغاز شیخ مجیب کی

رہائی اور نیپ پر سے پابندی کے خاتمے سے ہوا۔ ۲۰؍ دسمبر ۱۹۷۱ء کو قوم سے اپنے پہلے طویل خطاب میں بھٹو نے اور بہت سے موضوعات کے علاوہ نیپ پر سے پابندی ختم کرنے کی بات بھی کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ نیشنل عوامی پارٹی پر سے پابندی اٹھا رہے ہیں اس سلسلے میں بہت سی غلط فہمیاں اور تنازعات موجود ہیں لیکن انہوں نے یہ قدم اچھی نیت سے اٹھایا ہے۔ "میں کہتا ہوں کہ سب محب وطن ہیں اور ہم سب پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اس لئے میں نیپ پر سے پابندی اٹھا رہا ہوں اور میں نیپ کے رہنماؤں کو بہت جلد بلواؤں گا.... کسی سیاسی رہنما اور سیاسی پارٹی کو یہ خوف نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کوئی یک طرفہ فیصلہ کریں گے میں ان تمام سے مشورے کروں گا لیکن اگر کوئی غیر ضروری شرارت کی گئی تو مجھے خطرہ ہے کہ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

ایسا لگتا ہے جناب بھٹو کی نیک نیتی کے باوجود شرارت پہلے سے ان کے ذہن میں تھی اسی لئے بہت جلد حکومت کو بلوچستان کے خلاف انتہائی قدم اٹھانا پڑا مرکز کی طرف سے ۱۳؍ فروری ۱۹۷۳ء کو "عراقی اسلحے کی سازش" کی پاداش میں بلوچستان کی نمائندہ حکومت کو انتہائی غیر جمہوری طریقے سے برطرف کر کے وہاں گورنر راج نافذ کر دیا گیا بلوچستان اسمبلی کو توڑا تو نہیں گیا لیکن اسے عملاً" معطل بنا کر رکھ دیا گیا۔ بلوچستان اور سرحد کے گورنروں سے استعفیٰ طلب کر لئے گئے۔ مرکز کے ان غیر جمہوری اقدامات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے صوبہ سرحد کی حکومت نے بھی جس کے سربراہ مفتی محمود تھے، استعفیٰ دے دیا اب دونوں صوبوں میں نیپ اور جمیعت العلمائے اسلام کی اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کے ہتھکنڈے شروع کئے گئے۔ بلوچستان کے عوام پر فوج کشی کر دی گئی۔

۸؍ فروری ۱۹۷۳ء کو حیات محمد خان شیرپاؤ کو پشاور میں قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی عائد کرنے کا ایک سبب بن گیا۔ نیپ کے تمام بڑے رہنما اور ارکان اسمبلی... ولی خاں، ارباب اسکندر خان خلیل، ہاشم غلزئی، جنرل جیلانی، امیر زادہ خان، سردار عطاء اللہ مینگل، غوث بخش بزنجو، نواب خیر بخش مری اور ڈاکٹر عبدالحئ گرفتار کر لئے گئے۔ سنٹرل جیل حیدر آباد میں نیپ کے ۵۳ اراکین کے خلاف بغاوت اور پاکستان دشمنی کے مقدمات کی سماعت شروع ہوئی یہ کارروائی اڑھائی سال تک جاری رہی لیکن حکومت کوئی الزام ثابت نہ کر سکی۔ (۵۱)

۵؍ جولائی ۱۹۷۷ء کو ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو ملک کے حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ اب اس سازش کیس کا بھی از سر نو جائزہ لیا گیا۔ ۱۵؍ نومبر ۱۹۷۷ء کو سندھ ہائی کورٹ نے ولی خاں اور دیگر رہنماؤں کی حبس بیجا کی درخواست باقاعدہ سماعت کے لئے منظور کر لی۔ درخواست میں حیدر آباد کی خصوصی عدالت کی قانونی حیثیت، نیز ولی خاں اور دیگر افراد کی نظر

بندی کو چیلنج کیا گیا تھا۔

۲۹ر نومبر کو سماعت کے دوران ولی خان نے عدالت عالیہ میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے خلاف فرد جرم کی آج تک وضاحت نہیں کی گئی۔ یہ مقدمہ سازش اور بدنیتی کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی پاکستانی شہری تسلیم کیا جائے۔ میں نے بھٹو کے خلاف آواز اٹھائی تو غدار ٹھہرا۔ اب جو لوگ بھٹو کی مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ محب وطن سمجھے جاتے ہیں۔

جناب جسٹس مشتاق علی قاضی کی سربراہی میں خصوصی ٹریبونل نے ۶ر دسمبر کو سازش کیس میں ملوث کالعدم نیپ کے ولی خان اور ۱۴ر دیگر افراد کی ضمانت کی درخواست منظور کر کے ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک لاکھ روپے کی ضمانت پر رہائی کا حکم دیا۔ ۸ر دسمبر کو ولی خان اور دیگر افراد کو رہا کر دیا گیا۔

۲۹ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو ولی خان نے جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران اہم سیاسی امور پر تبادلہ خیال ہوا۔ بعد میں ولی خاں نے کہا کہ مارشل لاء کے بغیر بھٹو کو ہٹانا ممکن نہ تھا۔ سیاستدانوں کے محاسبہ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ محاسبہ کو آئین کا حصہ بنایا جائے۔ انتخابات موجودہ محاسبہ کے عمل کی تکمیل کے بعد کرائے جائیں۔ پاکستان کی ۳۰ر سالہ تاریخ میں پہلی بار حکمرانوں کا محاسبہ شروع ہوا ہے' اس سے پہلے یہ ہوتا رہا ہے کہ جو بھی آتا رہا' وہ پہلے حکمران کو تحفظ فراہم کرتا رہا اور خود پہلے سے بڑھ کر ملکی خزانے کو لوٹتا رہا۔

یکم جنوری ۱۹۷۸ء کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے حیدر آباد ٹریبونل توڑنے اور اس ٹریبونل کے زیر سماعت مقدمہ میں ملوث تمام افراد کو عام معافی دینے کا اعلان کیا۔ (۵۲) اسی دن ولی خان نے کراچی میں اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ انہیں خوشی ہے کہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو غداروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ جنرل صاحب کا یہ اقدام بروقت اور درست ہے۔ ولی خان نے مزید کہا کہ مسٹر بھٹو نے اپنی غداری چھپانے کی خاطر' ان پر اور ان کے ساتھیوں پر غلط اور بے بنیاد الزامات عائد کئے تھے اس اقدام کا ملک کی سیاست پر اچھا اثر پڑے گا اپنے بیان میں ولی خان اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے بھٹو کے خلاف ملک توڑنے' خلاف آئین اقدامات کرنے اور قوم و ملک کے ساتھ غداری کرنے پر فوری کارروائی کا مطالبہ کیا.... ولی خان جیسے با اصول سیاسی رہنما نے ضیاء الحق جیسے طالع آزما فوجی جرنیل کے ہاتھوں استعمال ہوتے ہوئے انتخابات کی بجائے احتسابی عمل پر زور دیا انہوں نے اصرار کیا کہ سیاست کی تطہیر کے بغیر انتخابات وجہ تنازعہ بن جائیں گے۔

ولی خان خود تو رہا ہو گئے مگر ان کے مطالبہ احتساب نے فوجی حکمرانوں کو ملک پر ایک طویل

عرصہ تک حکمرانی کا ایک خوبصورت جواز فراہم کر دیا۔ چنانچہ فوجی حکومت نے بدعنوان سیاستدانوں کے خلاف مقدمات چلانے کے لئے سارے ملک میں خصوصی عدالتوں کا جال بچھا دیا۔ مگر احتساب کا یہ عمل کبھی اختتام پذیر نہ ہو سکا اور فوجی حکمران گیارہ برس تک ملک کے سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ (۵۳)

ولی خان کچھ عرصہ ملک سے باہر رہے لندن میں انہوں نے اپنا خاصا عرصہ انڈیا آفس لائبریری میں گزارا اور جب وہ وطن واپس لوٹے تو ان کے پاس ان کی کتاب Fact are Facts کا مسودہ تیار تھا۔ ان کی اس کتاب میں انگریزوں کی چند بہت ہی خفیہ دستاویزات اور کاغذات کی مدد سے تحریک پاکستان کے بہت سے اہم گوشے بے نقاب کئے گئے تھے۔ اس کتاب سے پاکستان میں بہت ہلچل مچی۔ (۵۴)

۱۹۸۱ء میں پاکستان کی ۹ سیاسی جماعتوں نے ایک سیاسی اتحاد تشکیل دیا۔ جس کا نام تحریک بحالی جمہوریت یا ایم آر ڈی رکھا گیا۔ اس اتحاد میں پاکستان پیپلز پارٹی' تحریک استقلال' پاکستان ڈیمو کریٹک پارٹی' پاکستان مزدور کسان پارٹی' قومی محاذ آزادی' جمعیت علماء اسلام' آزاد جموں کشمیر مسلم کانفرنس' پاکستان مسلم لیگ (خواجہ خیر الدین گروپ) اور نیشنل ڈیمو کریٹک پارٹی شامل تھیں۔ آخر الذکر پارٹی کے سربراہ سردار شیر باز خاں مزاری تھے اور خان عبدالولی خاں اس پارٹی کے ایک عام رکن تھے۔ یہ ولی خاں کے سیاسی کیریر کا ایک نیا موڑ تھا۔ جس میں وہ اپنے بدترین حریف ذوالفقار علی بھٹو کی بیوہ اور بیٹی کے ساتھ ساتھ شریک تھے۔ (۵۵)

ولی خاں اور پیپلز پارٹی کا اشتراک عمل ۱۹۸۸ء کے انتخابات تک جاری رہا۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں ولی خان نے قومی اور صوبائی دونوں نشستوں سے انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی کی نشست پر پیپلز پارٹی نے ان کے خلاف کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا۔ ولی خان یہ انتخاب بڑی آسانی سے جیت گئے۔ جبکہ صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں وہ پی ایف ۱۵ چارسدہ ۳ سے پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار امیر خسرو خان سے شکست کھا گئے۔ (۵۶)

انتخابات کے بعد انہوں نے بے نظیر حکومت کی حمایت جاری رکھی۔ مگر جلد ہی وہ مقام آ گیا جب دونوں جماعتوں کی راہیں مختلف ہو گئیں۔ یہ اختلاف صوبہ سرحد میں ان کے نمائندے کے گورنر نہ بنائے جانے کے سوال پر پیدا ہوا تھا۔ اب ولی خان پیپلز پارٹی کی مخالف قوتوں سے جا ملے۔ ۱۹۸۹ء کی تحریک عدم اعتماد کے موقع پر وہ وطن سے باہر تھے اس لئے ووٹنگ میں حصہ نہ لے سکے تاہم ان کی جماعت عوامی نیشنل پارٹی نے اس تحریک کی حمایت میں ووٹ دیا۔ (۵۷)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں خان عبدالولی خان نے ایک مرتبہ پھر اسی حلقے سے جہاں سے وہ ۱۹۸۸ء میں کامیاب ہوئے تھے (یعنی این اے ۵ چارسدہ) سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر اس مرتبہ وہ جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کے مولوی حسن جان سے شکست کھا گئے۔

(۵۸)

ولی خاں خود تو اسمبلی میں نہیں پہنچ سکے مگر انتخابات کے بعد انہوں نے نواز شریف حکومت کی تائید جاری رکھی۔ ان کا یہ اتحاد اس وقت بھی قائم رہا جب ایک ایک کر کے نواز شریف کی تمام حلیف جماعتیں ان کا ساتھ چھوڑ گئیں اور صدر غلام اسحٰق خان نے ان کی حکومت برطرف کردی۔

عبدالولی خان عمر کے آخری ایام میں عوامی نیشنل پارٹی کے رہبر کے منصب پر فائز رہے ان کی بیگم نسیم ولی خان اسی جماعت کی ایک صوبائی شاخ کی صدر اور سرحد اسمبلی میں اے این پی کے پارلیمانی گروپ کی قائد تھیں جبکہ ان کے پرانے رفیق اجمل خٹک اے این پی کے صدر تھے۔ بقول ایک صحافی کے' پچاس برسوں پر محیط سیاسی زندگی میں اپنے سیاسی کردار کے فیصلے خود کرنے اور پھر ان اچھے برے فیصلوں پر ڈٹ جانے والے عبدالولی خان کی سیاست پر جب سے بیگم نسیم ولی خان کی سیاست نے بالادستی حاصل کی اس وقت سے وہ نہ صرف ارادت مندوں اور دوستوں سے محروم ہونے کے صدمات سہہ رہے تھے بلکہ ان کی سیاست بھی صوبہ سرحد تک محدود ہوکر رہ گئی تھی (۵۹) ۲۶ جنوری ۲۰۰۶ء کو ایک طویل علالت کے بعد خان عبدالولی خان کا انتقال ہوگیا(۶۰)

خان عبدالولی خان کی اہلیہ بیگم نسیم ولی خان بھی ایک عرصہ سے میدان سیاست میں ہیں۔ وہ سرحد ے معروف کانگریسی سیاستدان لالہ امیر محمد خان ہوتی کی صاحبزادی ہیں۔ وہ ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئیں اور خان عبدالولی خان کی پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد ان سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ برس تھی۔(۶۱)

بیگم نسیم ولی خان کے سیاسی کیریر کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب ذوالفقار علی بھٹو نے نیپ کو غیر قانونی قرار دے کر خاں عبدالولی خان اور ان کے ساتھیوں کو نظر بند کر دیا تھا۔ بیگم نسیم ولی خاں نے اس عالم میں سردار شیر باز خاں مزاری کے دوش بدوش نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی قائم کی (۶۲)۔

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں بیگم نسیم ولی خان نے دو حلقوں سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور دونوں ہی حلقوں سے کامیاب ہوئیں۔ ایک حلقہ تھا این اے ۴ پشاور ۴ اور دوسرا حلقہ تھا این اے ۸ مردان ۳ (۶۳)۔ بعدازاں انہوں نے ۱۹۷۷ء میں بھٹو کے خلاف چلنے والی پاکستان قومی اتحاد کی تحریک میں بھی بڑا فعال حصہ لیا اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

اپنے شوہر کی رہائی کے بعد وہ ایم آر ڈی اور پھر اے این پی میں ان کے دوش بدوش

رہیں۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پی ایف ۱۳ چارسدہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کے امیدوار مولانا گوہر شاہ کو شکست دے کر اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئیں (۶۴)۔

۱۹۹۰ء میں بھی انہوں نے اپنی یہ نشست برقرار رکھی اور اس مرتبہ بھی مولانا گوہر شاہ کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن بنیں (۶۵)۔ ۱۹۹۳ء میں انہوں نے پی ایف ۱۵ چارسدہ ۳ کو اپنی معرکہ آرائی کے لیے منتخب کیا اور کامیاب ہوئیں (۶۶) اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا وہ اس مرتبہ اے این پی کی پارلیمانی پارٹی کی قائد بھی منتخب ہوئیں۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں بیگم نسیم ولی خان، اپنے اسی روائتی حلقے سے ایک مرتبہ پھر سرحد اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں (۶۷) اس مرتبہ انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے اشتراک سے صوبہ سرحد میں حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ تاہم ۱۹۹۹ء میں اس حکومت میں اختلافات نمایاں ہو گئے (۶۸) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں بیگم نسیم ولی خان نے حصہ نہیں لیا۔

خان عبدالولی خان کی پہلی اہلیہ کے صاحبزادے اسفند یار ولی بھی سیاست کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں انہوں نے پی ایف ۱۵ چارسدہ ۳ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے (۶۹)۔ یہ وہی حلقہ تھا جہاں ۱۹۸۸ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار امیر خسرو خان نے خان عبدالولی خان کو ہرایا تھا۔ ۱۹۹۳ء میں وہ این اے ۵ چارسدہ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۷۰)۔ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ این اے ۵ چارسدہ سے دوسری مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۷۱)

۲۰۰۱ء میں نائن الیون کے واقعات کے بعد جب پاکستان کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی آئی تو اے این پی نے اس فیصلے کی حمایت کی۔ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں این پی کو اپنی اس حمایت کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی، جب قومی اسمبلی میں ان کا ایک امیدوار بھی کامیاب نہ ہوسکا اور صوبائی اسمبلی میں اسے صرف ۸ نشستوں پر کامیابی نصیب ہوئی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے بیگم نسیم ولی خان ان انتخابات میں خود تو امیدوار نہیں تھیں تاہم ولی خان کے صاحبزادوں اسفند یار ولی اور سنگین ولی خاں کو جو بالترتیب قومی اور صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑ رہے تھے، سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسفند یار ولی بعدازاں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوگئے (۷۲)۔

حوالہ جات

۱۔ سنگ میل سرحد نمبر۔ پشاور۔ ص ۵۴۳

۲۔ محمد فاروق قریشی ۔ باچا خان۔ لاہور۔ ص ۸

۳۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۵۸۷

۴۔ اسکندر مرزا۔ اسکندر مرزا کی کہانی خود ان کی زبانی۔ مترجم اشرف شاد مطبوعہ ہفت روزہ معیار کراچی۔ ۲۷ مارچ تا ۳/اپریل ۱۹۷۶ء۔ ص ۱۰

۵۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد پشاور۔ ص ۵۸۷

۶۔ محمد فاروق قریشی۔ باچا خان۔ لاہور۔ ص ۱۷

۷۔ سنگ میل۔ سرحد نمبر۔ پشاور۔ ص ۵۴۴

۸۔ محمد فاروق قریشی۔ پاکستان۔ جمہوریت کا زوال۔ لاہور۔ ص ۲۱۲ تا ۲۱۴

۹۔ کے ایچ اعوان ۔ الیکشن ان پاکستان ۔ کراچی۔ ص ۴۷۲

۱۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲ اپریل ۱۹۵۵ء

۱۱۔ نذیر لغاری۔ بلوچستان کے سابق گورنر نواب اکبر بگٹی سے بات چیت۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۵ء

۱۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۵ء

۱۳۔ سید نور احمد۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک ۔ لاہور ص ۴۴۴

۱۴۔ ایضاً۔ ص ۴۴۴۔۴۴۵

۱۵۔ ایضاً۔ ص ۴۴۵۔۴۴۶

۱۶۔ ایضاً۔ ص ۴۴۷

۱۷۔ ایضاً۔ ص ۴۴۸۔۴۴۹

۱۸۔ اسکندر مرزا۔ اسکندر مرزا کی کہانی خود ان کی زبانی۔ مترجم اشرف شاد مطبوعہ ہفت روزہ معیار کراچی۔ ۱۵ تا ۲۲ مئی ۱۹۷۶ء۔ ص ۲۷

۱۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۵ اپریل ۱۹۵۶ء

۲۰۔ سید نور احمد۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک لاہور۔ ص ۴۴۹۔۴۵۰

۲۱۔ ایضاً۔ ص ۴۵۰

۲۲۔ ایضاً۔ ص ۴۵۱

۲۳۔ ایضاً۔ ص ۴۵۱

۲۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۲ مئی ۱۹۵۶ء

۲۵۔ محمد فاروق قریشی۔ پاکستان۔ جمہوریت کا زاول۔ لاہور۔ ص ۱۶۳

۲۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۷ جون ۱۹۵۶ء

۲۷۔ سید نور احمد۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ لاہور۔ ص ۴۶۱

۲۸۔ ایضاً۔ ص ۴۶۱ تا ۴۶۳

۲۹۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۵۸۸

۳۰۔ احمد سلیم۔ ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیوروکریسی۔ لاہور۔ ص ۲۵۴، ۲۵۵

۳۱۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۵۸۸

۳۲۔ محمد فاروق قریشی۔ باچا خان۔ ص ۱۶

۳۳۔ مختار حسن۔ میرا پختونستان پاکستان کے اندر ہے۔ خان عبد الغفار خان کا انٹرویو۔ ہفت روزہ رفاقت (لاہور)۔ ۷ نومبر ۱۹۷۲ء۔ مشمولہ۔ خان عبد الغفار خان، غدار یا محبّ وطن مرتبہ جاوید احمد صدیقی۔ کراچی ۔ ص ۶۳، ۲۴

۳۴۔ فارغ بخاری۔ باچا خان۔ لاہور۔ ۵۹ تا ۹۶

۳۵۔ اللہ بخش یوسفی۔ سرحد اور جدوجہد آزادی۔ لاہور۔ ص ۴۹۷، ۴۹۸

۳۶۔ فارغ بخاری۔ باچا خان۔ لاہور۔ ص ۱۰۳

۳۷۔ محمد فاروق قریشی۔۔ باچا خان۔ لاہور۔ ص ۱۲، ۱۳

۳۸۔ ایضاً۔ ص ۱۴، ۱۵

۳۹۔ مختار حسن۔ ''میرا پختونستان پاکستان کے اندر ہے''۔ خان عبدالغفار خان کا انٹرویو۔ ہفت روزہ رفاقت (لاہور) ۔ ۷ نومبر ۱۹۷۲ء ۔ مشمولہ۔ خان عبد الغفار خان، غدار یا محبّ وطن ۔ مرتبہ جاوید احمد صدیقی۔ کراچی۔ ص ۲۵

۴۰۔ محمد فاروق قریشی۔ باچا خان۔ لاہور۔ ص ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۲

۴۱۔ میم شین۔ پاکستان پانچ بھائیوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ (غفار خان سے تعارفی انٹروی) ۔ مطبوعہ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۱۳ نومبر ۱۹۷۳ء۔ مشمولہ خان عبد الغفار خان غدار یا محبّ وطن مرتبہ جاوید احمد صدیقی۔ کراچی۔ ص ۷، ۸

۴۲۔ فارغ بخاری۔ باچا خان۔ لاہور۔ ص ۲۷۳

۴۳۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۱۹۶

۴۴۔ محمد فاروق قریشی۔ باچا خان۔ لاہور۔ ص ۲۴ تا ۲۷

۴۵۔ ایضاً۔ ص ۲۸ تا ۳۱

۴۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۱ جنوری ۱۹۸۸ء ۲۳ جنوری ۱۹۸۸ء

۴۷۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۷۷۱، ۷۷۲
۴۸۔ ایضاً۔ ص ۷۵۷
۴۹۔ مہدی حسن۔ پاکستان کی سیاسی جماعتیں۔ لاہور۔ ص ۲۳۰، ۲۳۱
۵۰۔ ایضاً۔ ص ۲۳۳
۵۱۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۲۱۹، ۲۲۰
۵۲۔ شبیر ابن عادل۔ جنرل ضیاء کے دس سال۔ کراچی۔ ص ۵۲ تا ۵۸
۵۳۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۲۲۲، ۲۲۳
۵۴۔ خان عبدالولی خان۔ حقائق حقائق ہیں۔ پشاور۔ ص ۱ تا ۱۰
۵۵۔ منیر احمد۔ پاکستان کے سیاسی اتحاد۔ لاہور۔ ص ۱۱۸، ۱۱۹
۵۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۶۴
۵۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲ نومبر ۱۹۸۹ء
۵۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۔ ۱۹۹۰ء ۔ جلد دوم ص ۷
۵۹۔ حیدر جاوید سید۔ عبدالولی خان کی ولیانہ سیاست کے پچاس سال۔ مشرق میگزین۔ (روزنامہ مشرق) کراچی ۔ ۲۶ فروری ۱۹۹۳ء
۶۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۷ جنوری ۲۰۰۶ء
۶۱۔ رحمت اللہ یوسف زئی۔ اررسپونسبل بیگم۔ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمنر۔ لاہور۔ ۴/۔۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۵
۶۲۔ جگنو محسن۔ پروفائل، نسیم ولیخان۔ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمنر لاہور۔ ۴/۔ ۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۵
۶۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۱۶۴، ۱۶۸
۶۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۷۷۵
۶۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل، الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۴۰۲
۶۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۱۲
۶۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۵۶۱
۶۸۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۴۷، ۱۴۸
۶۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۱۱۔ نومبر ۱۹۹۰ء ص ۹۳۶۳

۷۰۔ ایضاً۔۱۴۔اکتوبر۱۹۹۳۔ص ۱۲۴۷
۷۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ' جلد دوم۔ اسلام آباد۔ص ۳
۷۲۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور ص ۱۴۸

میاں گل

قیام پاکستان کے وقت صوبہ سرحد میں ایسی پانچ ریاستیں شامل تھیں جو اپنا آزادانہ وجود برقرار رکھے ہوئے تھیں ان ریاستوں کے نام تھے سوات' دیر' چترال' امب اور پھلڑہ۔ ان ریاستوں کے خود مختار حکمراں تھے۔ گویا نظام حکومت کی اندھی لاٹھی ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور وہ جس طرح چاہے ریاست کے لاکھوں عوام کو اپنی مرضی کے مطابق ہانکتا رہتا تھا۔ ان لاکھوں انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ جمہوریت کا نام بھی لے سکیں۔ یہاں حکمران طبقے کے تشدد کے خلاف آواز اٹھانا ایسا گناہ تھا جو ناقابل معافی تھا۔ یہاں عوام کی رائے کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی انہیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ ریاست کے کسی کام میں دخل اندازی کر سکیں۔ (ا)

ان ریاستوں میں سوات کا حال نسبتاً بہتر تھا کیونکہ یہاں اخوند صاحب سوات حافظ عبدالغفور کے ورثاء کی حکومت تھی۔ جو ایک نیک دل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ اخوند صاحب سوات کے حالات اولف کیرو نے اپنی مشہور کتاب "دی پٹھانز" میں بڑی تفصیل سے رقم کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"۱۷۸۴ء میں (یہ تاریخ یقینی نہیں ہے) بالائی سوات کے گاؤں جبرانے میں صافی قبیلہ کے ایک چرواہے کے گھر جس نے کسی وجہ سے اپنا قبیلہ چھوڑ دیا تھا اور یوسف زئیوں میں آ بسا تھا ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عبدالغفور رکھا گیا۔ یہ خاندان صافیوں کے قندھاری خیل سے تعلق رکھتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس قندھاری نام کا تعلق پرانے گندھارا سے ہو یہی وجہ ہے کہ صافی خود بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ دوسرے قبائل کے مقابلہ میں بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں اور اسی لئے مذہب کے سختی سے پابند ہیں۔ عبدالغفور نے بھی چرواہے کی حیثیت سے زندگی شروع کی وہ اپنے باپ کے ریوڑ کی نگرانی کرتے ہوئے پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ وہ نماز پڑھتا تھا روزے رکھتا تھا اور تنہائی پسند تھا۔ جب اس نے سنا کہ دریائے سندھ کے کنارے بیکا گاؤں

میں ایک خدا رسیدہ استاد رہتے ہیں تو اس نے اپنا بستہ سنبھالا سوات سے درہ میں ہوتا ہوا بنیر میں پیر بابا پہنچا اور وہاں سے میدان میں اتر کر بیکا پہنچ گیا۔ وہاں وہ کنویں پر بیٹھا رہتا تھا مویشیوں کی بڑی پیار سے دیکھ بھال کرتا تھا اور گاؤں والوں کی باتیں سنا کرتا تھا۔ وہاں سے وہ ہنڈ اور اس کے آگے مہابن کے سایہ میں سلیم خان پہنچ گیا۔ یہاں اس نے پوچھ گچھ کے موقع پر گول مول جواب دیئے چنانچہ اس پر یہ جھوٹی تہمت لگ گئی کہ ہنڈ کے خان کے قتل میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہنڈ کے خان کو سید احمد شاہ بریلوی کے ایما پر قتل کیا گیا تھا جو ان ہی دنوں یوسف زئی علاقہ میں پہنچے تھے۔ عبدالغفور سزا سے بچنے کے لئے بھاگ کر مردان کے قریب گوجر گڑھی اور پھر وہاں سے تور ڈھیر پہنچ گئے جو اکوڑہ کے قریب خٹک قبیلہ کا ایک گاؤں ہے۔ وہ جہاں بھی جاتے تھے ان کا پراسرار تبسم اور معصومانہ اداسی لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا لیتی تھی یہاں تک کہ وہ زبرگ مشہور ہو گئے۔ یہ فارسی لفظ بزرگ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دوست محمد نے بھی ان کی شہرت سنی اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ سکھوں کے خلاف میری کامیابی کے لئے دعا کیجئے۔ سکھوں کی فتح کے بعد جب عبدالغفور کو سکون نصیب نہ ہوا جس کے لئے وہ مارے مارے پھرتے تھے تو وہ پہلے تو مالا کنڈ سے تھوڑی دور نیچے کی طرف سم رانی زئی اور پھر تھوڑے دنوں کے بعد زیریں سوات میں بٹ خیلا چلے گئے لیکن یہاں بھی سکھ شہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز گونجتی رہتی تھی اور آخر انہیں وادی کے بالائی حصہ میں سیدو کے مقام پر مسکن مل گیا یہ جگہ دریائے سوات کے جنوب کی طرف اس مقام پر تھی جہاں دریا کا ایک معاون چشمہ ایلم پہاڑ کی بلندی سے اتر کر اصل وادی میں داخل ہوتا ہے۔ آخر کار انہیں یہاں سکون نصیب ہوا اور یہیں انہوں نے ترانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔

سیدو میں انہوں نے نکپی خیل کی ایک یوسف زئی عورت سے شادی کر لی جس کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ یہ دونوں بیٹے اس میاں گل خاندان کے مورث اعلیٰ تھے جس سے سوات کے والی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات کئی موقعوں پر بیان کی جا چکی ہے کہ پٹھانوں میں جب کوئی اپنے قبیلہ سے باہر شادی کرتا ہے تو اپنی بیوی کے خاندان سے جا ملتا ہے۔ یوسف زئی عام طور پر غیروں کو اپنی بیٹیاں نہیں دیتے البتہ سادات اور دوسرے بزرگوں کو بیٹیاں دے دیتے ہیں ایسا بھی شاذ و نادر ہوتا ہے۔ نکپی خیل میں عبدالغفور کی شادی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی اولاد کو اس پٹھان معاشرہ نے کس طرح اپنا لیا۔

عبدالغفور جب سے سیدو آئے تھے بلا شبہ یوسف زئیوں میں ان کا شمار سربر آوردہ لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ ان کا حکم ناطق نہیں تھا لیکن ایک شخص اخوند کے لقب سے اسی وقت یاد کیا جاتا ہے جب اس کی بہت ہی زیادہ عزت کی جاتی ہو (اخوند فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی استاد ہیں لیکن اس کا مفہوم وہی ہے جو گورو کا ہے) ان کی پیار بھری اور بھولی بھالی باتوں کی داستانیں

ابھی تک زباں زدعام ہیں مثلاً کم کے لاما کی طرح وہ کس طرح ایک چنار کے سایہ میں مراقبہ میں بیٹھے رہتے تھے ان کی روح اس مقدس روح میں سمانے کے لئے بے چین تھی جو اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اسی کہانی کے ایک اور کردار محبوب کی طرح یوسف زئیوں پر بھی ان کی روحانیت کا اثر پڑا وہ کشت و خون بھول گئے اور جان گئے کہ پاکیزگی اور روحانیت کیا ہوتی ہے "میں بعد میں خلا میں داخل ہوں گا' میرے اعمال اسی لئے ہیں۔ عظیم محرکات آپ ہی کی سادگی کا نتیجہ ہیں"۔

اخوند کی زندگی میں ان کا دنیاوی اقتدار حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے خود یہ تجویز پیش کی تھی کہ سوات کا بادشاہ ستانہ کے اکبر شاہ کو بنایا جائے اس لئے کہ اول تو وہ سید ہیں (اخوند سید نہیں تھے) اور پھر انہوں نے سکھوں کے خلاف جہاد میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اس کا اعتراف بھی ضروری ہے" (۲) یہ واقعہ ۱۸۴۹ء کا ہے۔ (۳)

۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء کو یعنی جس دن دہلی میں شروع ہونے والی جنگ آزادی کی خبر پشاور پہنچی' سید اکبر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کی جگہ ان کے بھائی سید عمران کے بیٹے مبارک اور ان کے بھتیجے (اور داماد) محمود نے لی۔ (۴)

اخوند صاحب سوات نے ۱۸۷۷ء میں وفات پائی۔ انہیں سیدو بابا بھی کہا جاتا تھا چنانچہ جس مقام پر انہیں دفن کیا گیا وہ مقام سیدو شریف کہلانے لگا۔ سیدو شریف میں ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔

اخوند صاحب کے دو بیٹے تھے ایک کا نام میاں گل عبدالحنان اور دوسر کا نام میاں گل عبدالخالق تھا۔ یہ دونوں بھائی میاں گلز کے نام سے مشہور ہوئے۔ میاں گل عبدالحنان' سوات کے والی بننے کے خواہش مند تھے مگر ان کے والد نے کبھی ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ میاں گل عبدالخالق اپنے والد کی طرح درویش منش اور گوشہ نشین آدمی تھے انہوں نے کبھی دنیوی بادشاہت کی تمنا نہیں کی مگر اہل سوات کے نزدیک وہ ہمیشہ ان کے روحانی بادشاہ ہی رہے۔

بدقسمتی سے دونوں "میاں گلز" نے ۳۵' ۳۵ برس عمر پائی۔ ان کی عمر میں چھ سال کا فرق تھا' یہی فرق ان کی وفات کی تاریخ میں بھی رہا میاں گل عبدالحنان نے ۱۸۸۷ء میں اور میاں گل عبدالخالق نے ۱۸۹۳ء میں وفات پائی۔

میاں گل عبدالحنان اور میاں گل عبدالخالق دونوں کے دو دو بیٹے تھے۔ میاں گل عبدالحنان کے دونوں بیٹے یعنی میاں گل عبدالرزاق المعروف سید بادشاہ اور میاں گل عبدالوحید المعروف امیر بادشاہ دونوں ہی اپنے والد کی طرح سوات کی بادشاہی کے دعوے دار تھے۔ مگر بدقسمتی سے دونوں ہی بڑی کم عمری میں قتل کر دیئے گئے۔ (سید بادشاہ کا قتل ۱۹۰۳ء میں اور امیر بادشاہ کا قتل ۱۹۰۷ء میں ہوا) جبکہ میاں گل عبدالخالق کے دونوں بیٹے یعنی میاں گل گل شہزادہ عبدالودود اور میاں گل عبدالمنان عرف شیریں صاحب' دونوں اختلافات کے باوجود ساتھ ساتھ

رہے۔ (۵)

خان عبدالغفار خان اپنی خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں:

"انہی دنوں کوہستان کے ملا صاحب' جنہیں کوہستان ملا صاحب ہی کہا جاتا تھا' انہوں نے نواب دیر کے ظلم و ستم سے سواتیوں کو بچانے کی غرض سے سوات ہجرت کی تھی اور نواب صاحب کے کافی حصے پر قابض ہو گئے تھے۔ ملا صاحب نے سیتان کے ایک سید عبدالجبار شاہ (جو سید اکبر بادشاہ کے نواسے تھے) ان پر بادشاہ بنا کر مسلط کیا تھا۔ انہیں چاہیے تھا کہ یہاں کسی سواتی کو بادشاہ بناتے تو مسائل پیدا نہ ہوتے' کیونکہ سوات' سواتیوں کا ہے اور ان لوگوں نے اس کے لئے خون کی قربانیاں دی ہیں۔ اچھا طریقہ تو یہ ہوتا کہ ملا صاحب نے یہاں مدینے کی طرز پر لوگوں کی آرا کے مطابق جمہوری نظام قائم کیا ہوتا لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پختون قوم کی بے اتفاقی کے باعث ملا صاحب ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ پختونوں کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب بھی انہیں اقتدار ہاتھ آیا ہے' انہوں نے پختون کے بجائے میاں یا ملا کو اپنے آپ پر مسلط کیا ہے' کیونکہ وہ اپنے بھائی کو عزت دینا برداشت کر ہی نہیں سکتے اور ایسے مواقع پر بدنیت ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنت نما وطن میں اکثر بھوکے رہے ہیں۔ وہ قدرت کے ان پوشیدہ خزانوں سے محروم رہے ہیں' جو قدرت نے ان کے ملک میں پیدا کیے ہیں۔ ان کی یہ حالت اس وقت تک رہے گی' جب تک کہ وہ اپنی قبائلی زندگی کو ملی اور قومی زندگی میں تبدیل نہیں کریں گے اور محبت' بھائی چارہ اور قوم پرستی پیدا کر کے ایک ملت نہیں بنیں گے۔ ہم دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی طرف جب دیکھتے ہیں تو رشک آتا ہے۔ وہ بھی تو ہماری طرح کے لوگ ہیں۔ ہم سے بہتر پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن ان میں بھائی چارے' قوم پرستی اور محبت کا جو جذبہ موجود ہے' وہ ہم میں نہیں ہے۔ یہ ترقی انہیں دعاؤں' وظیفوں اور نفل پڑھنے سے نہیں ملی بلکہ دیانت داری' ایمانداری اور بے غرضی سے کام کرنے پر ملی ہے۔ انہوں نے قوم کی خدمت کی ہے' قوم کو سمجھایا ہے' جگایا ہے اور اس میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا کر کے اسے آباد کیا ہے۔

سید عبدالجبار شاہ نے جب سوات میں کچھ مدت تک بادشاہی کی تو اس کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ وہ قادیانی ہے مجھے اس سے بحث نہیں' لیکن اس بات کی تحقیق اس وقت کیوں نہ کی گئی' جب اسے سوات کا بادشاہ بنایا جا رہا تھا۔ مجھے یہ پروپیگنڈا لگتا تھا' علاوہ ازیں اس کی حکومت کمزور تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام اختیارات کوہستان ملا کے پاس تھے۔ چونکہ ملا صاحب انگریزوں کے خلاف تھے' اس لئے انگریز چاہتے تھے کہ اختیارات سید عبدالجبار کے پاس زیادہ ہوں' تاکہ اس علاقے میں بھی فرنگی کے خلاف آواز نہ اٹھ سکے۔

سید عبدالجبار شاہ کی مخالفت زیادہ ہوئی تو کوہستان ملا اسے بادشاہت سے ہٹانے پر مجبور ہو گئے ادھر حاجی صاحب آف ترنگ زئی کے بیٹے باچا گل بھی بادشاہی کے خواہشمند تھے اور ان کے

امکانات بھی تھے، کیونکہ کوہستان ملا، حاجی صاحب کے بڑے معتقد تھے۔ باچا گل نے موقع غنیمت جان کر ملا صاحب سے بات کی، ملا صاحب رضامند ہو گئے۔ لہٰذا باچا گل چار پانچ سو آدمیوں کو ساتھ لینے کی غرض سے مومند قبیلے پہنچے۔ ادھر مولوی عبدالعزیز، باچا گل سے سخت ناراض تھے اور جانتے تھے کہ ان کی وجہ سے ان کے ساتھ کونسا سلوک ہوا ہے۔ اس لئے انہوں نے کوہستان ملا کو مشورہ دیا کہ باچا گل کے بجائے میاں گل عبدالودود کو بادشاہ بنایا جائے۔ چونکہ مولوی عبدالعزیز کوہستان ملا کے مصاحب تھے اور ان کا کافی اثر تھا، اس لئے کوہستان ملا اس بات پر رضامند ہو گئے اور جب باچا گل مومند قبیلے سے یہاں واپس پہنچے تو میاں گل گل شہزاد عبدالودود کو بادشاہ بنایا جا چکا تھا"۔ (۶)

ابتداء میں میاں گل گل شہزادہ عبدالودود کو سوات پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ انہیں والی دیر کی جانب سے متعدد مرتبہ حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے ہی ایک حملے میں ان کے بھائی شیریں صاحب جو ان کی فوج کے کمانڈر انچیف تھے، شہید ہو گئے۔ میاں گل عبدالودود نے ہمت نہیں ہاری اور ۱۹۱۹ء میں نواب دیر کو سخت شکست دے کر اس کے علاقے اویزائی کے نصف حصے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے میاں گل صاحب اور نواب دیر کے درمیان صلح کروائی اور اویزائی کا علاقہ نواب دیر کو واپس دلایا مارچ ۱۹۲۶ء میں حکومت ہند نے میاں گل گل شہزادہ عبدالودود کو والی سوات تسلیم کر لیا اور ۳ر مئی ۱۹۲۶ء کو چیف کمشنر صوبہ سرحد نے سیدو شریف میں ایک دربار منعقد کر کے ان کے فرماں روائے سوات ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ یہی میاں گل گل شہزادہ عبدالودود قیام پاکستان کے وقت تک سوات کے والی تھے۔ (۷) وہ کوئی ۳۳ برس سوات کے حکمران رہے اور اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے میاں گل عبدالحق جہاں زیب (تاریخ پیدائش: ۵ر جون ۱۹۰۸ء) کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو وزیراعظم پاکستان جناب لیاقت علی خان نے باقاعدہ طور پر ان کی رسم تاج پوشی انجام دی۔ (۸)

میاں گل عبدالحق جہاں زیب نے ریاست سوات کو صحیح معنوں میں ایک ترقی یافتہ اور فلاحی علاقہ بنا دیا۔ جگہ جگہ اسکولوں کی خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ صوبہ سرحد میں بچوں کا پہلا ہسپتال سوات ہی میں قائم ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں جہاں زیب ڈگری کالج کا قیام عمل میں آیا۔ تعلیم مفت کر دی گئی۔ سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا اور سیاحت کو بھی بے حد فروغ ملا۔

۲۸ر جولائی ۱۹۶۹ء کو حکومت پاکستان نے ریاستوں کے خاتمے کا اعلان کیا تو سوات صوبہ سرحد کا ایک ضلع قرار پایا۔ تاہم والی سوات کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کم ہونے کی بجائے دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ (۹) اپنی وفات (۱۴ر ستمبر ۱۹۸۷ء) تک وہ اہل سوات میں اسی طرح مقبول تھے۔ (۱۰)

میاں گل عبدالحق جہاں زیب کے تین بیٹے ہوئے۔ میاں گل اورنگ زیب، میاں گل عالم

زیب اور میاں گل امیر زیب۔ میاں گل اورنگ زیب اور میاں گل امیر زیب، دونوں سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان کے داماد ہیں اور دونوں ہی سیاست میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ (۱۱)

میاں گل اورنگ زیب ۲۸ر مئی ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ (۱۲) وہ سیاست کا ایک وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں وہ قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں بھی وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۳)

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں میاں گل اورنگ زیب نے مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ اس انتخاب کا احوال میاں گل عبدالحق جہاں زیب نے اپنی سوانح "دی لاسٹ والی آف سوات" میں یوں رقم کیا ہے۔

"۱۹۷۰ء کے انتخابات میں میرے علاقہ سے قومی اسمبلی کی دو اور صوبائی اسمبلی کی چھ نشستیں تھیں۔ انتخاب سے پہلے خان عبدالقیوم خان میرے پاس آیا اور اس نے ان تمام نشستوں پر میری مشورت سے امیدواروں کا انتخاب کیا۔ مگر بعد میں قیوم خاں اپنے وعدے سے پھر گیا اور اس نے دو امیدوار بدل دیئے۔ میرے دو بیٹے اورنگ زیب اور امیر زیب بھی قیوم خان کے ساتھ مل گئے۔ اورنگ زیب اور امیر زیب اور قیوم خان کے ساتھ مل کر جن امیدواروں کی حمایت کا فیصلہ تبدیل کیا تھا ان میں ایک ضیاء اللہ تھا، جو میرے والد میاں گل عبدالودود کے اور میرے سیکرٹری اور میرے استاد عطاء اللہ کا بیٹا تھا۔ یہ صورتحال مجھے بہت ناگوار گزری اور میں نے اپنے بیٹوں کی حمایت سے ہاتھ اٹھا کر ضیاء اللہ کی حمایت کا فیصلہ برقرار رکھا۔

کہتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء سے زیادہ منصفانہ انتخابات آج تک نہیں ہوئے، یقیناً یہ سچ ہی ہو گا، مگر میرے ساتھ یہ ہوا کہ مجھے سوات سے بے دخل کر راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ کاروائی یحییٰ خان کے حکم پر عمل میں آئی جسے اس کا مشورہ، یقیناً قیوم خان نے ہی دیا ہو گا۔ میں نے اس ہوٹل میں ۳۴ دن گزارے اور میری واپسی ۱۸ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو ممکن ہوئی۔ جب صوبائی اسمبلی کے انتخابات بھی منعقد ہو چکے تھے۔

اس انتخاب میں اورنگ زیب جیت گیا۔ عطاء اللہ صوبائی اسمبلی کی نشست کا امیدوار تھا۔ وہ یقیناً جیت جاتا تھا۔ مگر میری "جلاوطنی" کے باعث اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا اور یوں میرے اور اورنگ زیب کے درمیان اختلافات کی خلیج حائل ہو گئی۔

۱۹۷۷ء کے انتخاب سے کچھ پہلے امیر زیب نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور پارٹی کے ٹکٹ پر اپنے بڑے بھائی اورنگ زیب کے مقابلے میں قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس معرکے میں اپنے چھوٹے بیٹے کا ساتھ دیا اور وہ اورنگ زیب کو ہرا کر بڑی آسانی سے قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا"۔ (۱۴)

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں میاں گل اورنگ زیب نے این اے ۲۱ سوات ا سے انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب رہے۔ (۱۵) اسی برس ان کے داماد اور بھتیجے میاں گل امان روم سینٹ کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ (۱۶)

میاں گل امان روم کی سینٹ کی رکنیت ۱۹۸۸ء میں ختم ہوئی تو انہوں نے اسی برس منعقد ہونے والے قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے کی ٹھانی۔ انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کا ٹکٹ بھی مل گیا چنانچہ انہوں نے میاں گل اورنگ زیب سے ان کی قدیم نشست پر مقابلہ کیا اور انہیں شکست دے دی۔ میاں گل اورنگ زیب کو ان انتخابات میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت حاصل تھی۔ (۱۷)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں میاں گل اورنگ زیب کے صاحبزادے عدنان اورنگ زیب نے صوبائی نشست پی ایف ۶۵ سوات ۳ سے انتخاب میں حصہ لیا۔ انہیں بھی آئی ۔جے آئی کی حمایت حاصل تھی۔ وہ بھی اس انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۸)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں میاں گل اورنگ زیب نے آزاد امیدوار کے طور پر اور ان کے داماد اور بھتیجے شہزادہ امان روم نے پی ڈی اے کے ٹکٹ پر حصہ لیا۔ نشست وہی ان کی آبائی تھی یعنی این اے ۲۱ سوات ا۔ مگر اس مرتبہ دونوں میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہوسکا اور بازی آئی جے آئی کے امیدوار حاجی خالق داد خان نے جیت لی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں میاں گلز کے مجموعی ووٹ' حاجی خالق داد خان کے ووٹوں سے تقریباً تین ہزار زیادہ تھے۔ (۱۹) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں میاں گل اورنگ زیب پاکستان مسلم لیگ (ن) کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے یہ معرکہ اپنے حریف جناب عبدالرحمٰن کو تقریباً سات ہزار ووٹوں سے شکست دے کر سر کرلیا(۲۰)۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں میاں گل اورنگ زیب نے این اے ۲۱ سوات سے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ مگر کچھ عرصہ بعد جب انہیں بلوچستان کا گورنر مقرر کیا گیا تو انہیں اپنی یہ نشست خالی کرنی پڑی۔ (۲۱) میاں گل اورنگ زیب کے گورنر بنائے جانے پر بلوچستان کے قوم پرست رہنماوں نے احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ یہ منصب کسی بلوچ رہنما کو ملنا چاہیے چنانچہ اگست ۱۹۹۹ء میں میاں گل اورنگ زیب کو بلوچستان سے تبدیل کر کے صوبہ سرحد کا گورنر مقرر کردیا گیا(۶۲)

اس دوران ان کے صاحبزادے میاں گل عدنان اورنگ زیب حلقہ میں عوامی مسائل کے حل اور لوگوں سے براہ راست رابطے کا کام سنبھال چکے تھے۔ ان کی تنظیمی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر میاں نواز شریف نے انہیں دسمبر ۱۹۹۵ء میں مسلم لیگ کی مرکزی ورکنگ کمیٹی کا رکن بھی بنالیا تھا۔

چنانچہ جب میاں گل اورنگ زیب نے بلوچستان کے گورنر کا منصب سنبھالنے کے لیے اپنی نشست خالی کی تو عدنان اورنگ زیب بڑی آسانی سے قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہو گئے (۶۳) عدنان اورنگ زیب نے اسی نشست پر ۲۰۰۲ء میں بھی انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ وہ متحدہ مجلس عمل کی لہر کا مقابلہ نہ کر پائے اور قاری عبدالباعث صدیقی سے تقریباً ۴۷ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔(۶۴)

اسی خاندان کے ایک اور نوجوان میاں گل اسفند یار امیر زیب ہیں جو میاں گل امیر زیب کے صاحبزادے ہیں۔

وہ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں پی ایف ۶۵ سوات سے سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۶۵) تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ اسی نشست پر متحدہ مجلس عمل کے مولانا نظام الدین سے بری طرح شکست کھا گئے (۲۶)

حوالہ جات

۱۔ نصر اللہ خاں نصر۔ ریاستیں۔ ماہنامہ سنگ میل (پشاور) سرحد نمبر۔ جنوری ۱۹۵۰ء ۔ص ۵۰۷، ۵۳۵، ۵۳۶

۲۔ سر اولف کیرو۔ پٹھان۔ ترجمہ سید محبوب علی۔ پشاور۔ ص ۵۰۴ تا ۵۰۶

۳۔ فریڈرک بارتھ۔ دی لاسٹ والی آف سوات۔ اوسلو۔ ص ۱۸۲

۴۔ سر اولف کیرو۔ پٹھان۔ ترجمہ سید محبوب علی ۔ پشاور ۔ ص ۵۰۳

۵۔ فریڈرک بارتھ۔ دی لاسٹ والی آف سوات۔ اوسلو۔ ص ۱۵، ۱۶

۶۔ خان عبد الغفار خان۔ ''غفار خان کی آپ بیتی'' ۔ ترجمہ یونس قیاسی۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ۔ لاہور۔ نومبر ۱۹۸۴ء ۔ ص ۴۶، ۴۸

۷۔ نصر اللہ خاں نصر۔ ریاستیں۔ ماہنامہ سنگ میل (پشاور) ۔ سرحد نمبر۔ جنوری ۱۹۵۰ء ص ۵۱۵، ۵۱۶

۸۔ فریڈرک بارتھ۔ دی لاسٹ والی آف سوات۔ اوسلو ۔ ص ۱۱، ۱۰۶

۹۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۶۹۱، ۶۹۲

۱۰۔ محمد اسلم ۔ وفیات اعیان پاکستان۔ لاہور۔ ص ۹۷

۱۱۔ فریڈرک باتھ۔ دی لاسٹ والی آف سوات۔ اوسلو۔ ص ۱۸۲، ۱۸۳

۱۲۔ ایضاً۔ ص ۴۱

۱۳۔ خان تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان ۔ ۷۰-۱۹۶۹ء۔ لاہور۔ ص ۱۶-بی

۱۴۔ فریڈرک باتھ۔ دی لاسٹ والی آف سوات۔ اوسلو۔ ص ۴۱، ۱۳۹ تا ۱۴۳
۱۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۲۸/مارچ ۱۹۸۵ء۔ اسلام آباد۔ ص ۲۴۴۱
۱۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵۔ لاہور۔ ص ۳۱۴
۱۷۔ ماہنامہ ہیرالڈ۔ الیکشن ۱۹۹۰ اسپیشل ایشو۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ کراچی۔ ص ۸۸، ۸۹
۱۸۔ ایضاً۔ ص ۸۹
۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز۔ ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۲
۲۰۔ دی گزٹ آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۵۲
۲۱۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۴۱
۲۲۔ وکیل انجم۔ سیاست پر چھائے ہوئے حکمران گھرانے۔ روزنامہ جنگ کراچی (سنڈے ایڈیشن)۔ ۷ اگست ۲۰۰۴ء
۲۳۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۴۱
۲۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۶۸۹۴
۲۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۶۱۱
۲۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۳۱۵۶

ناصر

پاکستان کے سیاسی وڈیرے کے ابتدائی ایڈیشنوں میں اُن خاندانوں کا احوال کتاب میں شامل کیا گیا تھا جو جاگیردارانہ پس منظر کے حامل تھے۔ مگر اس ایڈیشن میں بعض ایسے خاندانوں کا ذکر بھی شامل کیا جا رہا ہے جو سیاست کے میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت نمایاں ہوئے مگر اب دو یا دو سے زیادہ نسلوں کے بعد اپنے علاقے میں ''سیاسی وڈیرے'' بن چکے ہیں۔ ایسا ہی ایک خاندان سرحد کے معروف عالم دین مولانا مفتی محمود کا خاندان ہے۔

مولانا مفتی محمود ڈیرہ اسمٰعیل خان کے موضع عبدالخیل پنیالہ کے ایک مذہبی گھرانے میں جنوری ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام خلیفہ محمد صدیق نقش بندی تھا جو قبیلہ ناصر قوم افغان یحییٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ترک وطن کے بعد ڈیرہ اسمٰعیل خان آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔(۱)

مفتی محمود نے ابتدائی تعیلم پنیالہ ہی سے حاصل کی اور عربی زبان اور علوم شرقیہ کے حصول کے لیے مراد آباد دیوبند اور دہلی کا سفر اختیار کیا۔ ۱۹۴۱ء میں مسند فراغت کے حصول کے بعد وہ وطن واپس آ گئے جہاں چار سال تک اپنے ہی گاؤں میں تدریس کے فرائض انجام دیئے پھر عیسیٰ خیل میں تین سال تک پڑھانے کے بعد ۱۹۵۰ء میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس ادارے میں وہ صدر مدرس، شیخ الحدیث اور ناظم تعلیمات کے عہدوں پر فائز رہے۔ دارالافتاء بھی ان کے سپرد تھا۔ انہوں نے اس منصب پر رہ کر تقریباً ۲۲ ہزار فتاویٰ جاری کیے۔

مولانا مفتی محمود کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت سے ہوا۔ اس تحریک کے سلسلہ میں وہ ایک سال تک پابند سلاسل رہے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ جمعیت علمائے اسلام کے نائب امیر منتخب ہوئے اور جب مولانا احمد علی گرفتار ہوئے تو ان کی جگہ امیر

جماعت بھی بنا دیئے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲) ۱۹۶۵ء میں نواب کالا باغ نے اس انداز سے حلقہ بندیاں کروائیں کہ مولانا مفتی محمود، فضل کریم کنڈی سے شکست کھا گئے۔ ۶۹۔۱۹۶۸ء میں انہوں نے ایوب خان کے خلاف ملک گیر تحریک میں متحدہ اپوزیشن کا بھرپور ساتھ دیا (۳) ۱۹۷۰ء میں جب پورے مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی اپنی مقبولیت کے نقطہ عروج پر تھی تو انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے حلقے سے انتخاب لڑنے کا چیلنج دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے مغربی پاکستان میں چھ حلقوں سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ دیگر پانچ حلقوں میں انہوں نے ڈاکٹر جاوید اقبال، مولانا حامد علی خان، ایوب کھوڑو، قاضی نجم الدین سریوال اور محمد یوسف خان چانڈیو جیسے تجربہ کار سیاستدانوں کو شکست سے ہم کنار کیا مگر ڈیرہ اسمٰعیل خان کا حلقہ این ڈبلیو۱۳ ملک کا وہ واحد حلقہ تھا جہاں انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں شکست دینے والی یہ شخصیت مولانا مفتی محمود کی تھی (۴)۔

۱۹۷۱ء جب ذوالفقار علی بھٹو، پاکستان کے صدر بنے تو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں کسی جماعت کی واضح اکثریت نہ ہونے کے باعث دونوں صوبوں میں جمعیت علمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی مخلوط حکومتیں قائم کی گئیں۔ یکم مئی ۱۹۷۲ء مولانا مفتی محمود نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے منصب کا حلف اٹھایا۔ ۲۱ فروری ۱۹۷۳ء کو مفتی محمود نے بلوچستان میں عطاللہ مینگل کی وزارت کی برطرفی کے خلاف بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا۔

صوبہ سرحد میں مولانا مفتی محمود کی وزارت تقریباً پونے دس ماہ جاری رہی مگر اس قلیل مدت میں انہوں نے صوبہ میں ایسے قوانین نافذ کیے جن کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے اردو کو صوبے کی سرکاری زبان قرار دیا، شراب پر پابندی عائد کی۔ احترام رمضان آرڈی نینس نافذ کیا، جہیز پر پابندی عائد کی، جمعہ کو عام تعطیل قرار دیا اور خواتین کو پردے کا حکم دیا (۵)

۱۹۷۷ء کے عام انتخاب میں مولانا مفتی محمود، دائیں بازو کی نو سیاسی جماعتوں کے اتحاد، پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ بنے۔ ان انتخابات میں دھاندلیوں کے نتیجے میں جب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ملک گیر تحریک چلی تو مفتی محمود اس تحریک کے روح رواں قرار پائے۔ انہوں نے بھٹو سے مذاکرات میں قومی اتحاد کی ٹیم کی سربراہی بھی کی مگر مذاکرات کی یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور جنرل ضیاالحق کے مارشل لاء پر منتج ہوئی (۶)

ضیاء الحق نوے دن میں انتخابات کروانے کے وعدے پر برسر اقتدار آئے تھے مگر اقتدار ملتے ہی انہیں اس کا نشہ ہوگیا۔ پہلے تو انہوں نے مختلف بہانوں کی آڑ لے کر انتخابات ملتوی کیے پھر ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کے ایک مقدمے میں ملوث کرلیا اور پھر اپنی حکومت کو سیاسی بچ

دینے کے لیے پاکستان قومی اتحاد کو وفاقی کابینہ میں وزارتوں کی پیشکش کردی۔ پاکستان قومی اتحاد نے اس پیشکش کو قبول کرلیا اور جب ۲۳ اگست ۱۹۷۸ء کو اس نیم فوجی، نیم سیاسی کابینہ نے حلف اٹھایا تو اس میں پاکستان قومی اتحاد کے وزرا بھی شامل تھے۔ ان وزرا میں سے دو کا تعلق جمعیت علمائے اسلام سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مولانا مفتی محمود کی سیاسی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی (۷)۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو مولانا مفتی محمود کراچی میں دارالعلوم بنوریہ میں دل کا دورہ پڑنے کے باعث انتقال کر گئے۔ اگلے روز انہیں ان کے آبائی گاؤں میں سپرد خاک کردیا گیا۔

مولانا مفتی محمود کی زندگی ہی میں جمعیت علمائے اسلام کا ایک علیحدہ دھڑا وجود میں آ گیا تھا۔ جسے مولانا کے ایک رفیق سفر مولانا عبداللہ درخواستی کی نسبت سے درخواستی گروپ کہا جانے لگا تھا۔

مولانا مفتی محمود کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن ان کے سیاسی جانشین کے طور پر ابھرے۔ وہ ۲۲ اگست ۱۹۵۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد انہوں نے جمعیت علمائے اسلام کی سربراہی سنبھالی۔ مولانا فضل الرحمٰن کے عہد سربراہی میں جمعیت کا ایک اور دھڑا بنا جسے سمیع الحق گروپ کا نام دیا گیا (۸)۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف سیاسی جماعتوں نے تحریک بحالی جمہوریت کا آغاز کیا تو مولانا فضل الرحمٰن نے اس میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔ اس تحریک میں زیادہ تر بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں شامل تھیں اس لیے بہت سے لوگوں کے لیے اس تحریک میں مولانا کی شمولیت تعجب خیز تھی۔ خود مولانا صاحب کو بھی اپنی اس نازک پوزیشن کا احساس تھا چنانچہ انہوں نے پورے ملک کے دورے کیے اور ہر جگہ اپنی تقریر میں یہی کہا کہ یہ اتحاد ایک خاص مقصد کے حصول تک محدود ہے۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے غیر جماعتی انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ مگر جب ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیا الحق کی وفات کے بعد ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے تو انہوں نے اس میں بھرپور حصہ لیا (۹)۔

ان انتخابات میں انہوں نے اپنے والد کے حلقہ انتخاب این اے ۱۸ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے انتخاب لڑا اور بڑی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ انتخابات کے بعد ان کا جھکاؤ نواز شریف کی طرف رہا اور انہوں نے تحریک عدم اعتماد کے دوران بھی نواز شریف کا ساتھ دیا۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں وہ پی ڈی اے کے امیدوار فضل کریم خان کنڈی سے شکست کھا گئے۔ ۱۹۹۳ء میں وہ ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کی نشست این اے ۱۸ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اب انہوں نے کھل کر بے نظیر بھٹو کا ساتھ دینا شروع

کیا جس کے جواب میں بے نظیر بھٹو نے انہیں امور خارجہ کی اسٹینڈنگ کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا۔ ۱۹۹۷ء وہ قومی اسمبلی کے انتخابات میں شکست کھا گئے لیکن ۲۰۰۲ء میں ان کی سیاسی جماعت نے مذہبی تنظیموں کے سیاسی اتحاد متحدہ مجلس عمل میں شامل ہو کر انتخاب لڑا۔ اس اتحاد نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھاری اکثریت حاصل کی۔ خود مولانا فضل الرحمٰن نے قومی اسمبلی کی دو نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ پاکستان مسلم لیگ (ق) نے ان کے اشتراک سے حکومت بنانا چاہی مگر متحدہ مجلس عمل وزیراعظم سے کم کسی عہدے پر تیار نہیں ہوئی۔ یہ صورتحال نہ مسلم لیگ (ق) کے لیے قابل قبول تھی، نہ صدر پرویز مشرف کے لیے اور نہ ہی امریکا کے لیے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متحدہ مجلس عمل کو حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھنا پڑا اور مولانا فضل الرحمٰن، قائد حزب اختلاف بن گئے۔ (۱۰)

ضمنی انتخابات میں انہوں نے اپنی خالی کردہ نشست پر اپنے بھائی مولانا عطاء الرحمٰن کو کھڑا کیا جو یہ انتخاب باآسانی جیت گئے (۱۱) اسی دوران خواتین کی مخصوص نشستوں پر مختلف سیاسی جماعتوں نے اپنی نمائندگان کو نامزد کیا تو ان میں مولانا فضل الرحمٰن کی دو خواہران نسبتی نیز سلطانہ اور شاہدہ بیگم قومی اسمبلی اور ایک خواہر نسبت ریحانہ اسمٰعیل سرحد اسمبلی کی رکن منتخب ہو گئی۔ (۱۲)

۱۸/جون ۲۰۰۵ء کو ان کے خاندان کا ایک اور فرد اسمبلیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ یہ مولانا فضل الرحمٰن کے ایک اور چھوٹے بھائی مولانا لطف الرحمٰن تھے جو سردار عنایت اللہ گنڈاپور کی وفات کے بعد ان کی خالی ہونے والی نشست پی ایف ۶۶ ڈی آئی خان ۳ پر منعقد ہونے والے ضمنی انتخاب میں سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۳)

اکتوبر ۲۰۰۵ء میں مولانا فضل الرحمٰن کے خاندان کو ایک اور سیاسی عہدہ نصیب ہوا یہ عہدہ پشاور کے ضلعی ناظم کا عہدہ تھا جس پر مولانا فضل الرحمٰن کے داماد حاجی غلام علی کامیاب ہوئے۔ حاجی غلام علی کو جمعیت علمائے اسلام (ف) کے ساتھ ساتھ پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ کی حمایت بھی حاصل تھی جب کہ ان کے مخالف امیدوار ہارون بلور عوامی نیشنل پارٹی اور جماعت اسلامی کے مشترکہ امیدوار تھے (۱۴)

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ مولانا مفتی محمود کا تعلق ناصر قبیلے سے ہے۔ یہ وہی قبیلہ ہے جس کے سردار، بلوچستان کے مشہور سیاسی رہنما سردار محمد یعقوب خان ناصر ہیں (۱۵) وہ ۱۹۸۵ء میں بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء میں قومی اسمبلی کے رکن بنے اور ۱۹۹۴ء میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی جانب سے سینٹ آف پاکستان کے رکن بنائے گئے (۱۶)۔

حوالہ جات

۱۔ سید قاسم محمود۔ انسائیکلوپیڈیا پاکستان کا۔ کراچی۔ ص ۸۹۴

۲۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد، پشاور۔ ص ۳۲۲

۳۔ وکیل انجم۔ سلطنت پر چھائے ہوئے حکمران گھرانے۔ روزنامہ جنگ، سنڈے میگزین ۷ اگست ۲۰۰۵ء ص ۲۴

۴۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۲۷ تا ۳۷

۵۔ سید قاسم محمود۔ انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا۔ کراچی ص ۸۹۴، ۸۹۵

۶۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان یک انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۸۵ تا ۹۱

۷۔ پروفیسر غفور احمد۔ اور الیکشن نہ ہو سکے۔ لاہور۔ ص ۷ تا ۱۲۷

۸۔ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ انسائیکلو پیڈیا۔ (چوتھا ایڈیشن)۔ لاہور۔ ص ۱۰۵۵، ۱۵۷۶

۹۔ سید قاسم محمود۔ انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا۔ کراچی۔ ص ۱۳۷

۱۰۔ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ انسائیکلو پیڈیا۔ (چوتھا ایڈیشن)۔ لاہور۔ ص ۱۰۵۵، ۱۵۷۶

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۷۷

۱۲۔ خاور گھمن۔ ارتھمیٹک آف پولیٹیکل فیملیز ان نیشنل، پراونشل اسمبلیز۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۲۰ دسمبر ۲۰۰۲ء

۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان (ویب سائٹ) www.ecp.gov.pk/comtest

۱۴۔ روز نامہ ڈان کراچی، ۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۱۵۔ طارق اسماعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ روز نامہ نوائے وقت۔ کراچی۔ ۲۰ مئی ۱۹۸۷ء

۱۶۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۹۳۴۔

ہوتی

اس خاندان کے لوگ بیان کرتے ہیں کہ قریب ایک ہزار سال کے گزرے کہ ہمارے بزرگ قندھار اور کابل سے اس ملک میں جس کو اب یوسف زئی کہتے ہیں آئے تھے اور ان میں سے کمال خان سلطان محمود کے ساتھ جب اس نے ہندوستان پر حملہ کیا یہاں آیا اور اس کا خاندان ہوتی میں اس وقت آباد ہوا جب دلازکوں کو جو اس ملک پر قابض تھے یوسف زئیوں نے نکال دیا۔

کہتے ہیں کہ کمال خان کے پاس ستر ہزار روپے سالانہ آمدنی کی زمینیں تھیں چونکہ اس کا کچھ ثبوت نہیں ہے اس لئے غالباً یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ جب کمال خان فوت ہو گیا تو اس کا ایک بیٹا تو ہوتی کا خان بنا اور دوسرا بیٹا طورو میں آباد ہوا اور اس طرح سے اس خاندان کی دو شاخیں ہو گئیں جو آج تک علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں۔ ایک کو مشران زئی یا طورو کہتے ہیں' دوسری کو کشران زئی یا ہوتی کہتے ہیں۔

۱۵۶۰ء میں شہباز خان نے اپنے آپ کو شاہ اکبر کا فرماں بردار ظاہر کیا۔ اس لئے شاہ نے یوسف زئی کی جاگیر ایک سند کی رو سے جو آج تک اس خاندان کے پاس ہے اس کو عطا کی۔ شہباز خان نے بادشاہ کو کتنے ہی موقعوں پر فوج سے مدد دی۔ اس کی اولاد میں سے جلال خان اور ناظر خان نے بھی ایسی ہی امداد کی جنہیں یوسف زئی کے خراج کا اجارہ دار رہنے دیا گیا۔

جب احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تو فتح خان جو اس خاندان میں سے تھا پانچ سو سوار اور ایک بڑی فوج پیادہ لے کر اس کے ساتھ شریک ہوا اور عمدہ خدمات بجا لایا۔ اس کے صلے میں مال گزاری کے ٹھیکے اسی کے پاس رہنے دیئے گئے۔ ۱۸۱۷ء میں بارک زئی سرداروں کے عہد میں پتہ میں جسے اب کشران زئی کہتے ہیں بارہ ہزار روپے کی جاگیر اس خاندان کو دی گئی۔

انہی دنوں میں فتح خان کے پڑپوتے محمد خان نے اپنا فرض سمجھ کر اپنے آقاؤں بارکزئی سرداروں کی طرف سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مقابلہ کیا اور بمقام ہوتی سکھوں سے لڑا مگر شکست

کھائی اور سکھوں نے اسے سوات کی طرف بھگا دیا۔ بعد ازاں اس نے واپس آکر مہاراجہ سے صلح کرلی اور مہاراجہ نے اس کو چار ہزار روپے کی جاگیر دی۔

۱۸۴۴ء میں محمد خان نے پھر سکھوں سے بغاوت کی اور سردار شیر سنگھ پر بمقام ہوتی حملہ کیا مگر پھر شکست کھائی اور اپنے ملک سے نکال دیا گیا۔ اب کی دفعہ پھر اس کا قصور معاف کیا گیا کیونکہ گو وہ کامیاب نہیں ہوا تھا تاہم خوفناک دشمن تھا۔ اسے اپنے وطن میں آنے کی اجازت دی گئی مگر اس کی جاگیر بجائے چار ہزار کے دو ہزار کردی گئی۔

۱۸۴۹ء میں سرکار انگریزی نے اس جاگیر کو بحال رکھا البتہ یہ مناسب سمجھا گیا کہ محمد خان اور اس کے چچا زاد بھائی میر افضل خان رئیس مردان میں یہ جاگیر بحصص مساوی تقسیم کردی جائے۔

محمد خان ۱۸۵۱ء میں فوت ہوا اور سربلند خان اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ اس کو ہزار روپیہ مواجب برابر ملتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر اس کی خدمت کے صلے میں ڈھائی سو روپے کی جاگیر اسے اور دی گئی اور اس کی کل جاگیر بموجب حکم گورنمنٹ ہند مصدرہ ۱۸۵۹ء دوامی کردی گئی۔

جنگ آزادی کے ایام میں جب پلٹن نمبر ۵۵ احاطہ بنگال نے بغاوت کی تو سربلند خان نے لیفٹیننٹ ہارن کو جو مردان میں سول افسر تھا تین دن تک ہوتی میں اپنی پناہ دے کر اس کی جان بچائی اور باغیوں کو سوات کی طرف بھگانے میں یوں مدد دی کہ میدان کے دہقانوں کو ترغیب دی کہ باغیوں کو دق کریں اور اشیائے خوردنی نہ دیں۔

کچھ عرصے میں اس پلٹن کے بہت سے سپاہی اس وقت ضائع ہوئے جب انہوں نے سوات سے کشمیر کی طرف جانے کی کوشش کی۔ پھر مفسدے کے وقت سربلند خان نے ہندوستان میں لڑنے کے واسطے دس سوار اور پچاس پیادے دے کر اظہار وفاداری کیا۔ ۱۸۶۳ء کی مہم کالا ڈھاکہ کے لئے اور پھر ۱۹۶۵ء میں اتمان خیل میں اس نے کچھ سوار اور پیادے دیئے۔ جن سے کئی طرح کے مفید کام نکلے۔ سربلند خان دشمن کی کارروائیوں کی معتبر خبریں بھی پہنچاتا رہا۔ ان خدمتوں کے صلے میں مقام پشاور اور لاہور کے تین درباروں میں اس کو خلعت دیئے گئے۔ مقامی حکام اس کی عزت کرتے تھے۔ ۱۸۷۲ء میں جب یہ فوت ہوا تو سب کو اس کے مرجانے سے رنج ہوا۔ یہ وائسریگل درباری تھا اس کے بعد اس کا بیٹا خواجہ محمد خان خاندان کا سرکردہ بنا اور اس کو اس کے باپ کی ۱۲۵۰ روپے کی جاگیر مل گئی۔ یہ بھی سرکاری خدمات بجالاتا رہا۔ ۱۸۷۹ء میں اس کو آٹھ سو ایکڑ زمین جس کی آمدنی ۳۷۴ روپے تھی دوامی جاگیر میں ملی اس کے پانچ سال بعد مواضعات مہودھیری اور بجمتار میں اسے دو سو روپے آمدنی کی اور دو دوامی جاگیر ملی۔ علاوہ بریں اس کی خدمات کے صلے میں وقتاً فوقتاً اسے درباروں میں بیش بہا خلعت ملتے رہے۔ (۱)

۵ر فروری ۱۹۰۰ء کو خان بہادر محمد خان ہوتی کو جنوبی افریقہ میں اعلیٰ جنگی خدمات انجام دینے کے عوض دو گھوڑوں اور دو ہزار روپے نقد کے انعام سے نوازا گیا اور پشاور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر بن بیوری نے ہوتیوں کی وفاداری کو بنفس نفیس سراہا(۲)

نواب خواجہ محمد خان کے دو بیٹے تھے۔ فتح محمد خان اور محمد اکبر خان۔ فتح محمد خان ۱۸۷۷ء میں اور محمد اکبر خان ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ آخر الذکر وہی نواب سر محمد اکبر خان ہوتی ہیں جو ۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ کے نفاذ سے قبل صاحبزادہ عبدالقیوم خان کے ہمراہ ہندوستان کی مرکزی مجلس قانون ساز میں صوبہ سرحد کی نمائندگی کیا کرتے تھے۔(۳)

نواب سر محمد اکبر خان ایک مثالی اور غیور پٹھان رئیس تھے۔ ساری عمر اپنے قبائلی لباس میں گزار دی۔ بدن پر کھلا کرتہ' اس پر نہایت قیمتی چغہ' پاؤں میں پشاور کا زری جوتا' سر پر زری کا کلاہ اور لنگی۔ اسمبلی میں بھی اسی وضع قطع میں جاتے۔ جسم مضبوط گٹھا ہوا' مائل بہ فربہی' بڑے بارعب اور طاقتور' پختون اسلاف کا نمونہ' خوش خوراک اتنے کہ جوانی میں پورا دنبہ نوش جان کر جاتے اور طاقتور اتنے کہ کھڑے گھوڑے کو اٹھا لیتے۔

ان کی جوانی کا واقعہ مردان میں زبان زد عوام ہے کہ ایک دن نواب صاحب خواجہ گنج بازار ہوتی میں جا رہے تھے کہ ایک بدمست بھینسا سامنے سے آن نکلا' لوگ تو جان بچا کر ادھر ادھر بھاگ نکلے لیکن نواب صاحب مطلق گھبرائے نہیں' انہوں نے دونوں سینگوں سے بھینسے کو پکڑا اور پیچھے دھکیل دیا۔ بھینسے نے بتیرا زور لگایا لیکن نواب صاحب سے جان نہ چھڑا سکا۔ تھک ہار کر بے دم ہو گیا تو نواب صاحب نے چھوڑ دیا' ساتھ ہی نواب صاحب کہتے جاتے۔ "جانتے نہیں ہو' تم بھینسے ہو تو میں اکبر خان ہوں"۔

ان کی شہ زوری کا ذکر نواب سر محمد یامین خان نے اپنی کتاب "نامہ اعمال" میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ "نواب اکبر خان بڑے طاقتور تھے۔ ایک بار ڈنر کے موقع پر وائسریگل لاج میں بات چھڑی کہ وہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلیوں پر کسی مرد یا عورت کو کھڑا کر کے اوپر اٹھا لیتے ہیں۔ وائسرائے کی بھانجی نے جو تقریباً چھ فٹ اونچی تھی' یہ سن کر نواب اکبر خان سے کہا۔ "مجھے اٹھاؤ تو دیکھوں!" نواب صاحب نے کہا۔ "جوتے اتار دو اور میری ہتھیلی پر کھڑی ہو جاؤ! سب مہمانوں کے سامنے نواب صاحب نے اسے اٹھا کر دکھا دیا' جس پر سب واہ واہ کرنے لگے"۔

یہ تو ان کی شخصیت کا ایک پہلو تھا' دیکھنے میں وہ کھرے دیہاتی نظر آتے لیکن فی الاصل علم کا وسیع سمندر تھے۔ ان کا ذاتی کتاب خانہ ہزاروں کتابوں پر مشتمل تھا۔ خصوصاً تاریخ کے موضوع پر شمالی ہند میں اتنا بڑا کتب خانہ دوسرا نہ تھا۔ (۴)۔ انہوں نے خود بھی کئی کتابچے تحریر کیے۔ انگریزی کا ایک کتابچہ جس میں انہوں نے افغان اور پٹھان پر بحث کی ہے خصوصی طور پر ان کی علمیت کا شاہکار ہے۔(۵)

نواب سر محمد اکبر خان مسلم لیگ سے وابستگی رکھتے تھے اور ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں گوجر گڑھی کے میاں شاکر اللہ کو شکست دے کر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۶) اس انتخاب کے دوران نواب اکبر ہوتی نے مسلم لیگ کے صوبائی فنانس بورڈ کے سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اس مقصد کے لیے اُنہوں نے خاصا چندہ اکٹھا کیا جس میں ان کے اپنے ذاتی پانچ سو روپے بھی شامل تھے۔

۱۹۴۶ کے انتخابات کے بعد جب مسلم لیگ نے یوم راست اقدام منایا اور انگریزوں کے دیئے ہوئے خطابات واپس کرنے شروع کیے تو نواب سر اکبر خان نے بجائے اس کے کہ وہ اپنے خطابات واپس کرتے۔ اُنہوں نے مسلم لیگ اور اسمبلی دونوں ہی سے مستعفی ہونے کو ترجیح دی۔ اس سلسلہ میں اُنہوں نے گورنر سرحد کو بتایا کہ ''حکومت وقت کی مخالفت نہ کرنا ان کی خاندانی روایت ہے، اور وہ مسلم لیگ کی بجائے اپنی خاندانی روایت کی پاسداری کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔'' (۷) نواب سر محمد اکبر خان نے ۶/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو وفات پائی۔ ان کے پانچ صاحبزادے تھے۔ محمد عمر خان، کرنل محمد امیر خان، عبدالغفور خان، منیر خان اور خالد خان۔ ان میں سے کرنل امیر محمد خان اور عبدالغفور خان نے سیاست کے میدان میں نام کمایا۔ (۸)

نواب زادہ کرنل امیر محمد خان ہوتی ۸/ستمبر ۱۹۱۸ء کو ہوتی (مردان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے فوج میں شمولیت اختیار کی۔ وہ ایک طویل عرصہ تک فوج سے وابستہ رہے پھر ذاتی وجوہ کی بنا پر فوج سے سبکدوشی اختیار کرلی۔ ۱۹۵۶ء میں وہ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے اور ۱۹۵۷ء میں انہیں مغربی پاکستان کا وزیر بنا دیا گیا (۹)۔ ایوب خان کے عہد میں وہ ایبڈو کی پابندیوں کا شکار ہوئے۔ (۱۰) ان پابندیوں کے باعث وہ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں خود تو حصہ نہیں لے سکے لیکن ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی نوابزادہ عبدالغفور خان کی کامیابی میں فعال کردار ادا کیا۔

نوابزادہ کرنل امیر محمد خان نے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں قیوم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر این اے ۹ مردان سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان انتخابات کے دوران ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور نے اپنے ایک سیاسی تجزیے میں نوابزادہ امیر محمد خاں کا جو تعارف کروایا تھا۔ وہ اپنی دلچسپی کے پیش نظر ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔ تجزیہ نگار اردو ڈائجسٹ کے مدیر الطاف حسن قریشی تھے۔ انہوں نے تحریر کیا تھا۔

''ریٹائرڈ کرنل امیر خان بہت با اثر اور مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں۔ ۶۵ء کے انتخابات میں عبدالغفور ہوتی کا انتخاب بھی ان ہی کے ہاتھوں سر ہوا تھا۔ بہت میٹھے اور مرنجا مرنج آدمی ہیں۔ ووٹ لینے کا انہیں خوب ڈھنگ آتا ہے شاید ان سے بہتر ووٹر پر اثر انداز ہونے والا کوئی اور نہ ہو۔ گذشتہ انتخابات میں یہ ایک ووٹر کے تعاقب میں حیرت انگیز کارنامہ سر انجام دے گئے

ایک ووٹر گھر سے باہر نہ آیا تو امیر خاں نے اس کے گھر کے سامنے درخت کے نیچے دو راتیں گزار دیں کہ کبھی تو باہر نکلے گا اور بالاخر اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ امیر خان کا ایک لطیفہ بھی مشہور ہے۔ انتخابات کے دنوں میں یہ جہاں جاتے' لوگوں سے گلے ملتے' ایک بار یہ گاڑی سے اترے اور ان کا ڈرائیور دوسری طرف سے ہو کر ان کے سامنے آیا انہوں نے سمجھا یہ بھی کوئی ووٹر ہے چنانچہ اسے گلے لگالیا"۔ (۱۱)

مگر اتنی خوبیوں کے باوجود نوابزادہ کرنل امیر محمد خان ان انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار عبدالخالق کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۱۲)

نوابزادہ امیر محمد خاں کے چھوٹے بھائی نوابزادہ عبدالغفور خاں ہوتی یوں تو بنیادی طور پر صنعت کار ہیں اور ان کا شمار ملک کے بائیس بڑے خانوادوں میں ہوتا ہے۔ (۱۳) تاہم انہیں بھی سیاست کا چسکا ہے اور وہ بھی مختلف ادوار میں اہم مناصب پر فائز رہ چکے ہیں۔

نوابزادہ عبدالغفور ہوتی نے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کی رکنیت سے کیا۔ اس انتخاب میں انہوں نے مغربی پاکستان میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کا ریکارڈ بھی قائم کیا تھا۔ (۱۴) ۱۹۶۵ء میں وہ دوبارہ قومی اسمبلی کے رکن بنے اور ۶؍ جولائی ۱۹۶۷ء کو صدر ایوب خاں کی مرکزی کابینہ میں وزیر تجارت کے طور پر شامل ہوئے ایوب خان کے زوال یعنی ۲۵؍ مارچ ۱۹۶۹ء تک وہ کابینہ کے رکن رہے۔ (۱۵) نوابزادہ عبدالغفور ہوتی ملک کے ایک بہت بڑے قند ساز کارخانے چارسدہ شوگر ملز کے مالکان میں شامل تھے۔ (۱۶) شاید یہی وجہ تھی کہ جب ان کی وزارت کے زمانے میں چینی کی شدید گرانی اور قلت پیدا ہوئی تو لوگوں نے نوابزادہ صاحب کو ہدف تنقید بنالیا۔ اس حوالے سے قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں۔

(ایوب خان کے آخری ایام میں) "چینی کی شدید گرانی اور قلت کے پیش نظر کراچی اور لاہور میں چینی کی راشن بندی کر دی گئی۔ مرکزی تجارت نواب (زادہ) عبدالغفور خاں ہوتی کے اس اقدام پر بہت سی الزام تراشیاں ہوئیں اور عوام الناس میں ان کا لقب "چینی چور" مشہور ہو گیا۔ یوں بھی عوام میں ان پر کئی طرح کے آوازے کسے جانے لگے۔ ایک آوازہ جس نے کافی زور پکڑا' یہ تھا عبدالغفور ہوتی۔ ایوب خاں دی کھوتی"۔ (۱۷)

ایوب خان کے بعد نوابزادہ صاحب عرصہ دراز تک سیاسی افق سے غائب رہے۔ ان کا نام دوسری مرتبہ اس وقت سامنے آیا جب ۲۴؍ دسمبر ۱۹۸۱ء کو جنرل محمد ضیاء الحق نے خود ساختہ مجلس شوریٰ کے ارکان کے ناموں کا اعلان کیا۔ (۱۸)

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں نوابزادہ عبدالغفور ہوتی نے این اے ۶ مردان ا سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور ایک مرتبہ پھر مرکزی کابینہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس مرتبہ انہیں ریلوے کی وزارت کا قلمدان سونپا گیا۔ (۱۹)

نوابزادہ عبدالغفور ہوتی کی افتاد طبع کا اندازہ کرنے کے لئے ایک واقعہ کا ذکر کرنا ضروری ہے جو اظہر سہیل نے اپنی کتاب "سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک" میں رقم کیا ہے۔ اظہر سہیل لکھتے ہیں۔

"یادش بخیر نوابزادہ عبدالغفور خان ہوتی، جنہیں ایوب دور میں پہلی بار عروج و زوال دونوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی مارشل لائی کابینہ کے بعد جمہوری عہد میں تشکیل پانے والی کابینہ میں بھی بطور وزیر ریلوے شامل تھے۔ اسمبلیوں کے شروع شروع کا زمانہ تھا، قومی اسمبلی کے اراکین اکثر و بیشتر ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ چونکہ ابھی جماعتی ڈسپلن لاگو نہیں ہوا تھا، اس لئے ہر کوئی خود کو دوسرے سے بڑا تیس مار خان سمجھتا تھا، اسمبلی میں سوالات کا وقفہ وزراء کے لئے گویا وبال جان تھا۔ ایک تو وزارت نئی، دوسرے بیوروکریسی ڈانواڈول، تیسرے وزیر نہ بن سکنے والے اراکین کی تیاریاں اور نوکیلے کٹیلے سوالات اور ان سب پر ستم بالائے ستم اسپیکر سید فخر امام کا رویہ کہ وہ ہر رکن کو زیادہ سے زیادہ سوالات کا موقع فراہم کیا کرتے۔ نوابزادہ عبدالغفور خاں ہوتی نے اس اسمبلی سے کچھ ہی عرصہ قبل نامزد مجلس شوریٰ کو بھی دیکھا تھا۔ وہاں تو ایسے سوالات نہیں ہوتے تھے اور نہ خواجہ صفدر بطور چیئرمین کسی کو زیادہ سوالات اٹھانے دیتے۔ دو چار روز تک تو ہوتی صاحب جوں توں اپنے سوالات کا وقفہ خود نمٹاتے رہے مگر پھر انہوں نے یہ فریضہ کسی اور وزیر کے ذمہ ڈال دیا تاہم کبھی نہ کبھی وہ خود بھی نرغے میں آجاتے اور اراکین جو پہلے ہی سے ادھار کھائے بیٹھے ہوتے، انہیں خوب خوب زچ کرتے۔ ایک روز کراچی کے بلبل ہزار داستان مولانا تراب الحق کے جی میں جانے کیا آئی، ہوتی صاحب کو اسمبلی ہال میں داخل ہوتے دیکھ کر بل کھاتے ہوئے اٹھے اور پوائنٹ آف آرڈر کی آڑ میں لہرا لہرا کر یہ شعر پڑھ ڈالا؎

سب جگہ تو وزیر "ہوتا" ہے
ریلوے میں وزیر "ہوتی" ہے

اس پر ایک فراٹے کا قہقہہ پڑا، ہوتی صاحب کو تاؤ تو بہت آیا، مگر ساتھ کے وزیر نے انہیں پکڑ کر بٹھا لیا اور ہوتی صاحب مولانا تراب الحق کے جواب میں اپنی پٹھنولی نہ دکھا سکے، لیکن چند لمحوں بعد انہیں اس کا موقع مل گیا، ایک رکن نے ان سے کوئی چبھتا ہوا سا سوال کیا تو ہوتی صاحب نے اپنے غصہ کو دباتے ہوئے، پورے ظاہری تحمل سے اس کا جواب دے دیا، ان رکن کے جی میں جانے کیا آئی کہ ایک اور ضمنی سوال کر دیا، ہوتی صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا، مگر پھر خاموشی سے اٹھے اور اس سوال کا جواب بھی دے دیا۔ ان رکن نے اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ ایک اور سوال داغ دیا۔ ہوتی صاحب کسمسا کر اٹھے، زناٹے سے جواب دیا اور ان رکن کی طرف گھورتے ہوئے بیٹھ رہے تھے کہ رکن موصوف کی ہنسی نکل گئی، ہوتی صاحب نے پلٹ کر

انتہائی نفرت سے ان کی طرف دیکھا اور بڑبڑانے کے انداز میں تڑ سے ایک گالی لڑھکا دی' راولپنڈی سے قومی اسمبلی کے ایک رکن نے یہ گالی سن لی اور سن کر چپکے نہیں بیٹھے بلکہ اٹھ کر ایوان کے سامنے اعلان کر دیا کہ ہوتی صاحب نے سوال کرنے والے رکن کو بہن کی گالی دی ہے۔ اس پر ایوان میں وہ غلغلہ مچا کہ الامان' کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی' آخر کار وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ چند اراکین نے واک آؤٹ کا اعلان کر دیا اور لمحوں میں پورا ایوان خالی ہو گیا۔ بے چارے وزیر البتہ بیٹھے رہ گئے مگر وہ بھی عجیب چکنم کی حالت میں ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ میر ظفر اللہ خان جمالی اپنی نشست سے اٹھے اور ہوتی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر چند منٹ تک انہیں سمجھاتے رہے' ہوتی صاحب نے بہت سر مارا' مگر ادھر بھی ظفر اللہ جمالی تھے' ہوتی صاحب کو اٹھتے ہی بنی۔ ظفر اللہ جمالی انہیں لابی سے ملحق مسجد میں لے گئے اور خود ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "بھائیو! میں ہوتی صاحب کی جانب سے آپ سے معافی کا خواستگار ہوں' اب آپ اس قصہ کو جانے دیں" اس کے بعد دو چار منٹ تو تو میں میں کا سلسلہ جاری رہا مگر فیصلہ یہی ہوا کہ اراکین واپس چلیں اور کوئی نصف گھنٹہ بعد جب اسمبلی کا اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو وقفہ سوالات ختم ہو چکا تھا۔" (۲۰)

۳۱ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو جب ملک سے مارشل لاء کا خاتمہ ہوا تو نواب زادہ عبدالغفور ہوتی صوبہ سرحد کے سویلین گورنر مقرر ہوئے (۲۱) اس عہدے پر تقرری کے بعد انہیں اپنی قومی اسمبلی کی نشست چھوڑنی پڑی اور اس نشست پر ان کے بھائی نوابزادہ امیر محمد خان ہوتی نے ضمنی انتخاب لڑا۔ اس ضمنی انتخاب میں نوابزادہ امیر محمد خان ہوتی ایک مرتبہ پھر شکست کھا گئے۔ (۲۲) حالانکہ یہ نشست بقول نوابزادہ عبدالغفور ہوتی کے' ان کی خاندانی نشست سمجھی جاتی تھی۔ (۲۳)

نوابزادہ عبدالغفور ہوتی کو سرحد کے گورنر کا عہدہ سنبھالے ہوئے ابھی تین ساڑھے تین ماہ ہی گزرے تھے کہ ان کے صاحبزادے اورنگ زیب ہوتی' امریکہ میں اسمگلنگ کے الزام میں گرفتار ہو گئے۔ (۲۴) بیٹے کی گرفتاری کا خمیازہ باپ کو استعفیٰ (یا برطرفی؟) کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ مگر یہ واقعہ بجائے خود بڑا عبرت انگیز ہے اس کے راوی بھی اظہر سہیل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"بیٹے کی گرفتاری کے بارے میں خبر اخبارات کے صفحات کی زینت بنتے ہی ہوتی صاحب نے اس وقت کے وزیر اعظم جونیجو سے رابطہ قائم کر کے ملاقات کا وقت مانگا اور ان کے ملٹری سیکرٹری کی طرف سے ملاقات کی توثیق کا انتظار کئے بغیر ہی اسلام آباد پہنچ گئے جہاں صبح سے شام ہو گئی مگر انہیں ملاقات کا بلاوا موصول نہیں ہوا بلکہ عین سورج غروب ہونے کے سمے ان کے بھائی کرنل امیر خان کے داماد عباس خان جو تب سرحد پولیس کے ڈی آئی جی تھے' ہوتی صاحب سے ملنے آئے۔ میں اس وقت اسلام آباد کے ہوتی ہاؤس میں ہوتی صاحب کے پاس موجود تھا۔ عباس خان نے ایک طرف لے جا کر پیغام دیا کہ وزیر اعظم کے سیکرٹری مسٹر عیسانی نے انہیں

ہوتی صاحب سے استعفیٰ لینے کے لئے بھیجا ہے۔

یہ گویا نواب زادہ عبدالغفور خان ہوتی کے لئے ایک تازیانہ تھا' جس سے مراد محض ان کی توہین ہی ہو سکتی تھی' ایک تو خود وزیراعظم کی بجائے ان کے سیکرٹری نے استعفیٰ طلب کیا تھا' دوسرے استعفیٰ کی وصولی کے لئے ہوتی خاندان کے داماد کا انتخاب کیا گیا تھا۔

ہوتی صاحب نے عباس خان سے انتظار کے لئے کہا اور اوپر چلے گئے جہاں انہوں نے خود اپنے بقول 'گرین فون پر صدر مملکت سے بات کی' جنہوں نے ہوتی صاحب ہی کے بقول یہ کہا کہ "نواب صاحب گورنر کا تقرر وزیراعظم نہیں' صدر کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس کی برطرفی بھی صدر ہی کی مرضی سے ہو سکتی ہے' آپ جونیجو صاحب کی بات پر توجہ نہ دیں اور عباس خان کو بتا دیں کہ آپ مستعفی نہیں ہو رہے' جونیجو صاحب کے جی میں جو آئے کر لیں۔

تقریباً یہی پیغام ہوتی صاحب نے عباس خان کو دے دیا اور اس کے بعد انہوں نے جونیجو صاحب اور اسلم خان خٹک کو جو بے نقط سنانا شروع کی ہیں تو الامان و الحفیظ۔ اتنے میں اوپر سے پیغام آیا کہ گرین فون پر صدر مملکت بات کرنا چاہتے ہیں۔ صدر صاحب نے کہا "ہوتی صاحب! آپ اور آپ کی بیگم آج شام میرے مہمان ہیں مہربانی کر کے کھانا ہمارے ساتھ تناول کیجئے"۔

ہوتی صاحب صدر سے ملنے گئے اور رات گئے واپس آئے تو نہایت خوش تھے۔ کہنے لگے صبح میں لندن روانہ ہو رہا ہوں' آپ بھی آیئے' میرے ساتھ ایئر پورٹ پر چلئے گا' میں آپ کو ایک بڑی خبر دوں گا۔

صبح سات بجے ہوتی صاحب کے گھر پہنچا تو وہ روانگی کے لئے تیار تھے۔ اسلام آباد ایئر پورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں پہنچے تو جہاز کی روانگی میں ابھی نصف گھنٹہ باقی تھا۔ لاؤنج کے باقی کونے میں مسجد کے لئے بنے ہوئے چبوترے سے متصل صوفوں پر بیٹھے ہی تھے کہ مرحوم خاقان عباسی جو تب وزیر پیداوار تھے' لاؤنج میں داخل ہوئے' ہمیں دیکھا تو پاس آ بیٹھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں اور میں نے ہوتی صاحب کو یاد کرایا کہ انہوں نے مجھے ایک بڑی خبر کے لئے بلایا ہوا ہے۔

"بڑی خبر" ہوتی صاحب مسکرائے "سکوپ ہے سہیل صاحب سکوپ" اور اس کے بعد انہوں نے مجھے جو تفصیل بتائی وہ بجائے خود ایک لرزہ خیز کہانی کا درجہ رکھتی تھی۔ ہوتی صاحب نے کہا "محمد خان جونیجو مجھے اس لئے گورنری کے عہدہ سے برطرف کرنا چاہتے ہیں کہ میں نے ان کے اشارے پر ایک اہم مخالف سیاسی شخصیت کو قتل کروانے سے انکار کر دیا ہے" ہوتی صاحب کی اس بات سے خاقان عباسی مرحوم بھی چونک گئے کہنے لگے۔

"نواب صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں بالکل درست کہہ رہا ہوں" ہوتی صاحب نے جواب دیا

"محمد خان جونیجو نے مجھے پشاور بلا کر بطور خاص حکم دیا تھا کہ میں قبائلی علاقہ جات میں پہنچنے پر کسی قبائلی سردار سے کہہ کر اپوزیشن کی اس اہم سیاسی شخصیت کو گولی مروا دوں تاکہ وہ قتل بھی ہو جائے اور اس الزام میں کسی پر مقدمہ بھی نہ چلانا پڑے۔ آپ کو معلوم ہے تاکہ قبائلی علاقہ جات پر پاکستانی حکومت کے جرم و سزا سے متعلق قوانین لاگو نہیں ہوتے" ہوتی صاحب کا یہ لرزہ خیز بیان سن کر مرحوم خاقان عباسی نے کہا "نواب صاحب خدا کا خوف کریں' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں- یہ تو ہو سکتا ہے کہ خود آپ نے جونیجو صاحب کو اس قسم کا مشورہ دیا ہو مگر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جونیجو صاحب نے آپ کو اس نوعیت کا کوئی حکم دیا ہو"۔

مگر ہوتی صاحب اپنی بات پر اصرار کرتے رہے' حتیٰ کہ ان کے جہاز کا وقت ہو گیا اور وہ ایپرن کی جانب روانہ ہو گئے۔

ہوتی صاحب کی روانگی کے بعد میں گویا خاقان عباسی کے "قابو" میں آ گیا انہوں نے میرے گلے میں بازو ڈالا اور اپنے ساتھ لے کر ایپرن کی جانب چل دیئے' جہاں پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف اپنے ذاتی طیارے سے اتر رہے تھے۔ عباسی صاحب میرے گلے میں بازو حائل کیے ہوئے' مجھے بھی ان کے پاس لے گئے اور اس تمام تفصیل سے آگاہ کیا جو ہوتی صاحب مجھے بتا کر روانہ ہو گئے تھے۔ میاں صاحب نے بھی عباسی صاحب کی طرح یہی درخواست کی کہ مجھے اس خبر کی اشاعت سے اجتناب کرنا چاہیئے' میں نے انہیں سمجھایا کہ ہوتی صاحب یہی بیان لندن پہنچ کر بھی تو دے سکتے ہیں۔ میاں صاحب نے یقین دلایا کہ اس امر کا بھی انتظام کر دیا جائے گا کہ وہ لندن میں اس نوعیت کا کوئی بیان نہ دے سکیں۔ بعد میں ہوتی صاحب نے مجھے بتایا کہ لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر پاکستان سفیر نے جہاز سے اترتے ہی انہیں "قابو" کر کے اس قسم کی بیان بازی سے باز رہنے پر آمادہ کر لیا۔

یہ الگ بات ہے کہ چند ہی دنوں بعد صدر مملکت نے صوبہ سرحد کی گورنری سے ہوتی صاحب کا استعفیٰ منظور کرنے کا اعلان جاری کر دیا(۲۵)۔

نوابزادہ عبدالغفور ہوتی نے اس کے بعد کسی انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ تاہم وہ مسلم لیگ کے سینئر نائب صدر کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ محمد خان جونیجو کی وفات کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ قائم مقام صدر کی حیثیت سے بھی گزارا۔ وہ مسلم لیگ (چٹھہ گروپ) کی صدارت کے امیدوار تھے مگر جب قرعہ فال حامد ناصر چٹھہ کے نام نکلا تو عبدالغفور ہوتی مسلم لیگ ہی سے مستعفیٰ ہو گئے اور اسی دن مرکز میں نگراں وزیر کے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ ان کی یہ وزارت فقط ۱۷ دن جاری رہی (۲۶)۔ عبدالغفور خان ہوتی نے ۷ جنوری ۱۹۹۸ء کو وفات پائی۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں نواب زادہ عبدالغفور ہوتی کے بھتیجے خواجہ محمد خاں ہوتی المعروف طوطی خان نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پی ایف ۱۸ مردان سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کے مدمقابل نگراں صوبائی وزیراعلیٰ جنرل فضل حق تھے۔ خواجہ محمد خان عرف طوطی خان یہ انتخاب تین ہزار سے زائد ووٹوں سے جیت گئے۔(۲۷)

بعدازاں ان کے صوبائی وزیراعلیٰ آفتاب شیر پاؤ سے کچھ اختلافات ہو گئے اور انہوں نے صوبائی اسمبلی میں اپنے ہم خیال ارکان کو ساتھ ملا کر ایک فارورڈ بلاک تشکیل دے دیا۔ (۲۸) ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں محمد خان ہوتی نے ایک مرتبہ پھر اسی حلقہ سے انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کے مدمقابل نگراں وزیراعلیٰ سرحد اے این پی اور آئی جے آئی کے مشترکہ امیدوار میر افضل خاں تھے۔ اس مرتبہ وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ (۲۹) تاہم ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں وہ نشست واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے(۳۰)۔

محمد خان ہوتی ۱۹۹۷ء میں اسی نشست پر ایک مرتبہ پھر پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے مگر وہ یہ انتخاب جیت نہیں سکے۔ انہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سید منظور حسین کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی(۳۱) ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں انہوں نے خود حصہ نہیں لیا تاہم انہوں نے اپنی نشست پر اپنے صاحبزادے نواب زادہ عمر فاروق ہوتی کو انتخاب لڑا دیا۔ جو متحدہ مجلس عمل کے امانت شاہ سے تقریباً دس ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۳۲)۔

نوابزادہ محمد خان ہوتی اور نوبزادہ عبدالغفور خان ہوتی کے ایک کزن، جناب محمد علی خان ہوتی بھی ایک طویل عرصہ سے سیاست کے میدان میں سرگرم عمل ہیں۔ وہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ہوتی مردان میں پیدا ہوئے ۱۹۴۵ء میں صوبہ سرحد کی صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے سب سے کم عمر رکن تھے۔

محمد علی خان ہوتی ۱۹۶۵ء کے عام انتخابات میں مردان کے حلقے سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور صوبائی کابینہ میں وزیر صحت کے عہدے پر فائز ہوئے۔

وہ جنرل ضیاالحق کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے اور ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۳ء تک ضیاء الحق کی ہر کابینہ کے رکن رہے تھے۔

۱۹۸۵ء میں وہ صوبہ سرحد سے ایوان بالا (سینٹ) کے رکن منتخب ہوئے اور میاں محمد نواز شریف کے عہد حکومت میں اس ایوان میں قائد ایوان کے فرائض انجام دیتے رہے۔ تاہم جب میاں نواز شریف کی حکومت برطرف ہوئی تو وہ میاں صاحب کی ہدایت پر قائد حزب اختلاف کا فریضہ انجام دیتے رہے تھے(۳۳)۔ جناب محمد علی خان ہوتی ۱۹۹۱ء میں بھی تین برس کے لیے سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے تھے۔(۳۴)

ہوتی خاندان کی ایک اور شاخ بھی صوبہ سرحد کی سیاست میں فعال ہے اور اس شاخ سے تعلق رکھنے والی بیگم نسیم ولی خان پورے ملک میں احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔

بیگم نسیم ولی خان کے والد لالہ امیر محمد خان ہوتی کا تعلق انڈین کانگریس سے تھا اور وہ کانگریس کے ٹکٹ پر ۱۹۳۷ء میں سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ اس انتخاب میں انہیں خان عبدالغفار خان کی بھی مکمل حمایت حاصل تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس انتخاب میں انہوں نے نواب سر محمد اکبر خان جیسے مضبوط امیدوار کو شکست دی تھی۔ (۳۵)

لالہ امیر محمد خان ہوتی قیام پاکستان سے قبل انگریزوں کی قید میں رہے اور قیام پاکستان کے بعد خان عبدالقیوم خان کے زمانہ اقتدار میں بھی تقریباً ڈیڑھ برس تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ (۳۶) لالہ امیر محمد خان ہوتی کی صاحبزادی بیگم نسیم ولی کا ذکر تو ہم محمد زئی خاندان کے ذیل میں تفصیل سے رقم کر چکے ہیں۔ یہاں ہم ذکر کریں گے ان کے صاحبزادے اعظم خان ہوتی کا۔

اعظم خان ہوتی عوامی نیشنل پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز ۱۹۸۸ء کے انتخابات سے کیا۔ ان انتخابات میں انہوں نے این اے ۶ مردان اسے انتخاب لڑا۔ مگر وہ اس انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار حاجی محمد یعقوب کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۳۷) دوسری مرتبہ انہوں نے اپنا مقدر ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں آزمایا اس مرتبہ بھی ان کا حلقہ اور ان کی پارٹی وہی تھی مگر حالات بدل چکے تھے اس مرتبہ وہ نہ صرف قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے (۳۸) بلکہ نواز شریف کی حکومت میں مواصلات کے وزیر مملکت کے طور پر بھی شریک ہوئے (۳۹) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں اعظم خان ہوتی نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تاہم اس مرتبہ ان کا حلقہ این اے ۷ مردان ۲ تھا اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ اپنے حریف حاجی یعقوب خان سے فقط ۴۱۰ ووٹ سے شکست کھا گئے (۴۰) مارچ ۱۹۹۴ء میں جناب اعظم خان ہوتی چھ برس کے لیے سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے ہیں (۴۱) ۱۹۹۷ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۴۲) قومی اسمبلی کا رکن بننے کے بعد انہوں نے سینٹ کی نشست سے استعفیٰ دے دیا اور وفاقی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ تاہم جب اے این پی نے مسلم لیگ (ن) کے ساتھ اپنا اتحاد ختم کر دیا تو اعظم خان ہوتی وزارت سے مستعفی ہو گئے (۴۳)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں ان کے صاحبزادے امیر حیدر خان ہوتی نے پی ایف ۲۳ مردان سے سرحد اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ متحدہ مجلس عمل کے اکرام اللہ شاہ سے تقریباً ۵ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۴۴)۔

حوالہ جات

۱۔ چارلس میسی۔ روسائے با اختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔ لاہور۔ ص ۱۹۱ تا ۱۹۴

۲۔ احمد سلیم۔ دی ہوتیز آف مردان ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۸ اکتوبر۔ ۳ نومبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۳۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۴۰۱

۴۔ ایضاً۔ ص ۴۰۱، ۴۰۲

۵۔ ایضاً۔ ص ۶۱ ۷

۶۔ اسٹیفن ایلن رتن برگ۔ دی انڈی پینڈنس مومنٹ ان انڈیاز نارتھ ویسٹ فرنیئر پراونس (۱۹۴۷ء۔ ۱۹۰۱ء)۔ (غیر مطبوعہ مقالہ)۔ کولمبیا یونیورسٹی ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۵۶

۷۔ احمد سلیم۔ دی ہوتیز آف مردان ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۸ اکتوبر۔ ۳ نومبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۸۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۴۰۲

۹۔ ایضاً۔ ص ۹۶ ۷

۱۰۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۷۵

۱۱۔ الطاف حسن قریشی۔ قیوم اور ولی کے درمیان ایک تیسری طاقت ابھر رہی ہے۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۳۰ نومبر تا ۲ دسمبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۵

۱۲۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۱۶۸

۱۳۔ اے آر شبلی۔ ۲۲ خانوادے۔ لاہور۔ ص ۴۳

۱۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۰ اپریل ۱۹۶۲ء

۱۵۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۸۰

۱۶۔ اے آر شبلی۔ ۲۲ خانوادے۔ لاہور۔ ص ۴۹

۱۷۔ قدرت اللہ شہاب۔ شہاب نامہ۔ لاہور۔ ص ۹۷۸

۱۸۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۱ء

۱۹۔ اظہر سہیل۔ سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک۔ لاہور۔ ص ۳۱

۲۰۔ ایضاً۔ ص ۳۱، ۳۲

۲۱۔ محمد شفیع صابر۔ شخصیات سرحد۔ پشاور۔ ص ۶۱ ۷

۲۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۶۴
۲۳۔ اظہر سہیل۔ سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک۔ لاہور۔ ص ۳۴
۲۴۔ ماہنامہ ہیرالڈ۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۸۷
۲۵۔ اظہر سہیل۔ سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک۔ لاہور۔ ص ۳۷ تا ۳۹
۲۶۔ روزنامہ جنگ۔ کراچی ۱۰ مئی ۱۹۹۳ء
۲۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۷۹، ۵۳۳
۲۸۔ ہیرالڈ کراچی۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۸۷
۲۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۶۳
۳۰۔ ایضاً۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۱۲
۳۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان' اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم ص ۵۶۴
۳۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ۳۱۴۲
۳۳۔ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائریکٹری آف ممبرز۔ ۱۹۹۱ء۔ ۱۹۹۴ء۔ ص ۴۲
۳۴۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائریکٹری آف ممبرز (چوتھا ایڈیشن)۔ ص ۲۲۱
۳۵۔ اسٹیفن ایلن رٹن برگ۔ دی انڈی پینڈنس موومنٹ ان انڈیاز نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پروانس۔ ۱۹۰۱۔ ۱۹۴۷ء۔ (غیر مطبوعہ مقالہ) کولمبیا یونیورسٹی ۱۹۷۷ء۔ ص ۲۲۹' ۲۳۰
۳۶۔ جگنو محسن۔ پروفائیل' نسیم ولی خاں۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۲۹/جون۔ ۵/جولائی ۱۹۸۹ء۔ ص ۱۷
۳۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۳/دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۵۲۹
۳۸۔ ایضاً۔ ۱۱/نموبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۱۹۱
۳۹۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۵۰۰
۴۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۴۷
۴۱۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳/مارچ ۱۹۹۴ء
۴۲۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷۔ (جلد اول)۔ لاہور ص ۲۷
۴۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۴۵۶
۴۴۔ ایضاً۔ ص ۴۵۶

یوسف زئی

صوبہ سرحد کے سیاسی خاندان میں ایک خاندان مردان کے یوسف زئی پٹھانوں کا خاندان ہے جس کے افراد میر افضل خان، زری سرفراز اور عباس سرفراز خان گزشتہ کئی دہائیوں سے پاکستانی سیاست میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

اس خاندان کے لوگ بیان کرتے ہیں کہ تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہمارے بزرگ قندھار اور کابل سے اس علاقے میں، جسے اب یوسف زئی کہتے ہیں، آئے تھے۔ ان بزرگوں میں سے ایک بزرگ کا نام کمال خان تھا جو محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ اس کا خاندان ہوتی میں آباد ہوا اور انہوں نے اس علاقے میں آباد ولازکوں کو باہر نکال دیا۔

کمال خان کے انتقال کے بعد اس کا ایک بیٹا تو ہوتی کا خان بنا اور دوسرا بیٹا طورو میں آباد ہوا۔ اس طرح اس خاندان کی دو شاخیں ہو گئیں اول الذکر کشران زئی یا ہوتی کہلائے اور آخر الذکر مشران زئی یا طورو کے نام سے معروف ہوئے۔

کمال خان کی جو اولاد طورو میں آباد ہوئی ان کی اولاد میں سے ایک سردار شہباز خان تھا۔ وہ جلال الدین اکبر کا ہم عصر تھا۔ شہباز خان نے جلال الدین اکبر کی اطاعت کو قبول کیا اور اس کی فرماں برداری سے متاثر ہو کر اکبر نے اسے یوسف زئی کی جاگیر کی ایک سند عطاء کی۔ شہباز خان نے اکبر کو متعدد مرتبہ فوجی امداد فراہم کی۔ اس کی اولاد میں جلال خان اور ناظر خان بھی مغل بادشاہوں کے باج گزار رہے جس کی وجہ سے انہیں یوسف زئی کے خراج کا اجارہ دار رہنے دیا گیا۔

۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس خاندان کی سربراہی فتح خان کے پاس تھی۔ وہ پانچ سو سوار اور ایک بڑی پیادہ فوج لے کر اس کے ساتھ شریک

ہوا(۱) اس نے پانی پت کے میدان میں بے شمار مرہٹوں کے علاوہ مرہٹوں کے سردار کو بھی تہ تیغ کیا۔ احمد شاہ درانی نے اس کی بے پناہ بہادری کی داد دیتے ہوئے نہ صرف اسے مرہٹہ سردار کی زرہ، دستار، تلوار اور جنگی قیدی بطور انعام عطا کئے۔(۲) بلکہ مال گزاری کے متعدد ٹھیکے بھی اس کے پاس رہنے دیئے گئے۔

فتح خان کے بعد اس کی جاگیر اس کے بیٹے لشکر خان کے بیٹے احمد خان کو ملی اور اسے مردان کا خان قرار دیا گیا۔ اس کی مواضعات شاہی، نستہ، گانگو، نرناب اور درگئی (واقع ہشت نگر) میں پانچ سو سوار اور ایک ہزار پیادے رکھنے کی شرط پر حقوق جاگیرداری ملے ہوئے تھے۔

احمد خان نے ۱۸۵۰ء میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا میر نضل خان اس کا جانشین ہوا۔ اس کا مواجب ایک ہزار روپے سالانہ مقرر ہوا جب کہ مزید ایک ہزار روپے پہلے اس کے چچا محمد خان اور پھر اس کے چچا زاد بھائی سر بلند خان کو ملتے رہے۔ میر افضل خان نے مردان کا خان بننے کے بعد عمدہ خدمات انجام دیں اس لئے اسے پتہ بائی زئی کا جاگیردار بنا دیا گیا۔ میر افضل خان نے ۱۸۵۳ء میں وفات پائی۔ اس وقت اس کا بیٹا شاد محمد خان بہت صغیر سن تھا اس لئے اس کا جائیداد کورٹ آف وارڈس میں چلی گئی۔(۳)

شاد محمد خان پشتو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے تین بیٹے ہوئے۔ دوست محمد خان، فتح محمد خان اور سرفراز خان(۴) سرفراز خان نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی وہ اپنے زمانے میں کرکٹ کے مشہور کھلاڑی تھے۔ انگریزوں نے انہیں خان بہادر کا خطاب عطا کیا تھا، انہوں نے صوبہ سرحد خصوصاً مردان کانگریس کا اثر زائل کرنے کے لئے مسلم لیگ کو مضبوط کیا۔ قائداعظم ان کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔

۱۹۱۹ء میں خان بہادر سرفراز خان کی شادی سردار محمد عمر خان کی صاحبزادی کوکب سلطانہ سے ہوئی سردار محمد عمر خان کے والد سردار محمد شریف، افغانستان کے بادشاہ امیر دوست محمد خان کے درباری تھے۔ امیر دوست محمد خان نے اس خوف سے کہ کہیں سردار محمد شریف، اس کا تخت نہ چھین لے انگریزوں سے ساز باز کر کے اسے ہندوستان بھجوا دیا۔ سردار محمد شریف نے ہندوستان میں زندگی گزارنے کے بجائے عمر کا بقیہ حصہ عراق میں گزارنے کو ترجیح دی چنانچہ وہ عراق چلے گئے۔ ان کا انتقال بھی عراق میں ہوا۔ وہ وہیں شیخ عبدالقادر گیلانی کے مزار کے قریب دفن کئے گئے۔

خان بہادر سرفراز خان اور کوکب سلطانہ کے تین بچے ہوئے۔ زرنگار۔ جو زری سرفراز کے نام سے مشہور ہوئیں۔ میر افضل خان اور عزیز سرفراز خان۔

زری سرفراز ۲۸ جولائی ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والدین نے انہیں اعلیٰ تعلیم بھی دلوائی اور ان میں سیاسی شعور بھی بیدار کیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے جس جلسے میں قرار داد پاکستان پیش ہوئی تھی اس میں زری سرفراز نے اپنے والد کی معیت میں شرکت کی تھی۔

۱۹۴۲ء میں ان کی شادی ان کے پھوپھی زاد بھائی خان محمد اعظم سے ہوئی جو عمر زئی کے ایک مشہور خان اور برطانوی دور اقتدار میں صوبہ سرحد کے سب سے پہلے ڈپٹی کمشنر خان بہادر سعد اللہ خان کے صاحبزادے تھے مگر شادی کے ایک سال بعد ان کے شوہر وفات پا گئے۔

شوہر کی وفات کے بعد زری سرفراز نے سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور صوبہ سرحد کی خواتین میں حصول پاکستان کی امنگ بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ انہی کی کوشش تھی جس کے باعث ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مردان میں مسلم لیگ کے امیدواروں نے یکے بعد دیگرے دو مرتبہ کامیابی حاصل کی۔ قائد اعظم نے زری سرفراز کی ان خدمات کے پیش نظر پہلے انہیں مردان خواتین مسلم لیگ کا صدر مقرر کیا اور پھر قیام پاکستان کے بعد سرحد خواتین مسلم لیگ کی صدر بنا دیا۔(۵)

۱۹۵۲ء میں محترمہ زری سرفراز کو خواتین کی مخصوص نشستوں پر سرحد اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ مغربی پاکستان اسمبلی کی رکن رہیں۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں انہیں قومی اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا۔(۶)

صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے علاوہ محترمہ زری سرفراز اور بھی کئی اداروں سے منسلک رہیں جن میں پاک کمیشن آن دی اسٹیٹس آف ویمن، پاک ٹی بی ایسوسی ایشن اور فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن کے نام سرفہرست ہیں۔(۷)

زری سرفراز کے چھوٹے بھائی میر افضل خان تھے۔

میر افضل خان ۲۰ فروری ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے تھے جو ایچی سن کالج لاہور کے فارغ التحصیل ہیں تکمیل تعلیم کے بعد انہوں نے تجارت کو پیشہ اپنایا۔ ان کا شمار پاکستان کے ممتاز صنعت کاروں میں ہوتا تھا۔ ان کا کاروباری ادارہ ''پریمیر'' پاکستان کے صف اول کے کاروباری اداروں میں سے ایک ہے اور پاکستان کے ایک بہت بڑے شکر ساز کارخانے پریمیر شوگر مل مردان کا مالک ہے۔(۹)

میر افضل خان نے سیاست کے میدان میں ۱۹۶۲ء میں قدم رکھا جب وہ پہلی بار مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں وہ دوبارہ اس اسمبلی کے رکن بنے دونوں مرتبہ ان کی سیاسی جماعت پاکستان مسلم لیگ (کنونشن) تھی۔(۱۰)

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں ان کا نام نظر نہیں آیا تاہم ۱۹۷۳ء میں انہیں ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر نہ صرف سینٹ آف پاکستان کا رکن بنالیا بلکہ انہیں وفاقی وزیر تجارت کا قلم دان بھی سونپ دیا۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں وہ این اے ۶ مردان سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس مرتبہ وفاقی کابینہ میں انہیں بجلی اور پانی کا قلم دان سونپا گیا۔(۱۱)

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں ان کا نام نظر نہیں آیا تاہم ۱۹۸۸ء میں انہیں ایک مرتبہ پھر سینٹ آف پاکستان کا رکن منتخب کرلیا گیا۔

۶ راگست ۱۹۹۰ء کو جب غلام اسحاق خان نے قومی اور صوبائی اسمبلیاں کو تحلیل کرنے کا اعلان کیا تو انہیں صوبہ سرحد کا نگراں وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ اس منصب کو سنبھالنے کے لئے انہوں نے سینٹ کی رکنیت سے استعفیٰ دیدیا۔

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں میر افضل خان نے، جو اس وقت صوبہ سرحد کے نگران وزیر اعلیٰ بھی تھے، بڑے بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ ان انتخابات میں انہوں نے آئی جے آئی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی ایک اور صوبائی اسمبلیوں کی دو نشستوں پر کامیابی حاصل کی اور انتخابات کے بعد صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو گئے۔ اس عہدے پر وہ ۱۹ رجولائی ۱۹۹۳ء تک فائز رہے۔

۱۹۹۴ء میں وہ تیسری مرتبہ سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب کئے گئے۔(۱۲) ۱۱ رجنوری ۱۹۹۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت وہ سرحد اسمبلی کی دو نشستوں پر انتخاب لڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ جو ان کی ناگہانی وفات کے باعث ملتوی ہو گئے۔(۱۳)

میر افضل خان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے عباس سرفراز خان، سیاست کے میدان میں نمایاں ہوئے۔ عباس سرفراز خان، زری سرفراز اور میر افضل خان کے سب سے چھوٹے بھائی عزیز سرفراز خان کے فرزند ہیں۔ عزیز سرفراز خان کی شادی، سندھ کے نامور سیاست دان، سر عبداللہ ہارون کی سب سے چھوٹی بیٹی لیلیٰ سے ہوئی تھی۔ یوں محمود ہارون، یوسف ہارون اور سعید ہارون رشتے میں عزیز سرفراز خان کے ماموں ہوتے ہیں۔(۱۴)

عباس سرفراز خان ۱۹۹۷ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۹ء میں انہیں جناب پرویز مشرف نے امور کشمیر اور سرحدی علاقہ جات کا وفاقی وزیر مقرر کیا۔ ۲۰۰۲ء میں انہوں نے وزارت سے مستعفی ہو کر مردان اور کوہستان سے دو نشستوں پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر دونوں پر وہ متحدہ مجلس عمل کے امیدواروں سے بری طرح شکست کھا گئے۔ این اے ۹ مردان پر انہیں شجاع الملک نے ہرایا جب کہ این اے ۲۳ کوہستان پر انہیں مولوی عبدالحلیم نے شکست سے ہم کنار کیا۔(۱۵)

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ عزیز سرفراز خان کی ایک صاحبزادی اور عباس سرفراز

خان کی ہمشیرہ زہرا کی شادی، پاکستان کے ایک بہت بڑے بزنس ٹائیکون آصف سہگل سے ہوئی تھی اور انہیں جہیز میں ایک ٹیکسٹائل مل عطاء کی گئی تھی (۱۶) آصف سہگل، یوسف سہگل کے پوتے اور رفیق سہگل کے صاحبزادے ہیں۔(۱۷) رفیق سہگل ۱۹۶۵ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔(۱۸)

میر افضل خان کے ایک بھانجے یا بھتیجے، حاجی محمد یعقوب ہیں(۱۹) جو پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۳ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ان دونوں انتخابات میں انہوں نے بیگم نسیم ولی خان کے بھائی اعظم ہوتی کو شکست سے ہم کنار کیا تھا۔۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ حاجی نسیم الرحمٰن سے شکست کھا گئے۔(۲۰) ۔۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

میر افضل خان کے ایک داماد شہزاد محمد گستاسپ خان بھی عملی سیاست کے میدان میں ہیں۔(۲۱) وہ ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء میں مانسہرہ کے صوبائی حلقے پی ایف ۴۴ مانسہرہ ۳ سے اور ۲۰۰۲ء میں پی ایف ۵۵ مانسہرہ ۳ سے سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے جب کہ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔(۲۲)

شہزاد محمد گستاسپ خان کے والد محمد ہارون خان بادشاہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں پی ایف ۴۵ مانسہرہ ۳ سے سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے جب کہ اس سے قبل ۱۹۶۲ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے انتخابات میں شکست کھا گئے تھے۔(۲۳)

حوالہ جات

۱۔ کرنل چارلس میسی۔ روسائے بااختیار رو نامی خاندان (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔لاہور۔ ص ۱۹۱،۱۹۲

۲۔ عزیز جاوید۔ پاکستان کی نامور خواتین۔ پشاور ص ۲۶۰

۳۔ کرنل چارلس میسی۔ روسائے با اختیار و نامی خاندان پنجاب (ترجمہ لالہ بھگوان داس)۔ لاہور۔ص ۱۹۲ تا ۱۹۵

۴۔ گریفنز پنجاب چیفس (شجرہ ہائے نسب)۔لاہور۔ص ۲۵۸

۵۔ عزیز جاوید۔ پاکستان کی نامور خواتین۔ پشاور۔ص ۲۵۹،۲۶۰

۶۔ سید قاسم محمود۔ انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا، کراچی۔ص ۵۳۴

۷۔ زینب رضوی۔ آئرن لیڈی (زری سرفراز)۔ پروفائل ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور ۲۶/ اکتوبر تا یکم نومبر ۱۹۹۵ء۔ص ۲۴

۸۔ سید قاسم محمود۔انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا۔کراچی۔ص ۹۱۸
۹۔ شاہد الرحمن۔ہواونز پاکستان؟۔اسلام آباد۔ص ۱۷۱
۱۰۔ پنجاب پراونشل اسمبلی سیکرٹریٹ۔دی پنجاب لیجسلیچرز۔لاہور۔ص ۳۷، ۴۲
۱۱۔ کے ایچ اعوان۔الیکشن آف پاکستان۔کراچی۔ص ۳۹، ۱۶۸، ۴۸۵ تا ۴۸۷
۱۲۔ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد، سینٹ آف پاکستان، ڈائریکٹری آف ممبرز (تیسرا ایڈیشن)۔ص ۴۴
۱۳۔ روزنامہ جنگ، راولپنڈی، ۱۲رجنوری ۱۹۹۷ء
۱۴۔ پارلیمنٹ ہاؤس، اسلام آباد سینٹ آف پاکستان۔ڈائرکٹری آف ممبرز (چوتھا ایڈیشن)۔ص ۵۱
۱۵۔ شفقت تنویر مرزا۔ہمارے سیاستدان اوران کی داستان۔لاہور۔ص ۳۵۴
۱۶۔ شاہد الرحمن۔ہواونز پاکستان؟ اسلام آباد۔ص ۸۶
۱۷۔ مینا حسن۔اے تھرڈ جنریشن انڈسٹریلسٹ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔۱۱ر۔۱۹رفروری ۱۹۹۳۔ص ۱۹
۱۸۔ این اے حسنین چودھری۔جمہوری نمائندے۔کراچی۔ص ۵۴
۱۹۔ ویب سائٹ www.khyber.org
۲۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔جلد دوم۔ص ۴، ۵
۲۱۔ طارق اسماعیل ساگر۔الیکشن ۹۰۔لاہور ص ۲۳۱
۲۲۔ (i) الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔جلد دوم۔ص ۶۱۸، ۶۱۹
(ii) ایضاً۔۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ص ۵۹۰
(iii) ایضاً۔۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ص ۳۱۶
۲۳۔ وکیل انجم سیاست دانوں کی قلابازیاں۔جلد دوم۔لاہور۔ص ۳۷۱، ۵۴۵، ۷۱۸

دوسرا حصّہ

صوبہ پنجاب

الپیال

الپیال قوم کے افراد کا تعلق راجپوتوں سے ہے اور یہ چودھویں صدی عیسوی سے فتح جنگ تحصیل کے جنوب میں دریائے سوہاں کے کنارے آباد ہیں۔ سر لپیل گریفن نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ خوبصورت لوگ دلیر اور فسادی ہیں۔ پہلے شدید جرائم کے مرتکب ہوا کرتے تھے مگر اس کے باوجود بڑے اچھے کاشت کار ہیں۔

وہ مزید لکھتا ہے:

"الپیالیوں میں سب سے بڑا خاندان چکری کے چوہدریوں کا خاندان ہے۔ الحاق پنجاب کے وقت اس خاندان کا بزرگ چوہدری شیر خان تھا۔ اس نے بڈھا خاں ملل کے ساتھ مل کر اپنے حریف ہمسایہ سردار فتح خان رئیس کوٹ سے مقابلہ کرنا چاہا تھا مگر رئیس کوٹ اپنے دونوں دشمنوں سے زیادہ زبردست ثابت ہوا۔ شیر خاں سرکار انگریزی کا بڑا حامی تھا اور گجرات کی لڑائی کے بعد جو ۲۱ فروری ۱۸۴۹ء کو ہوئی نکلسن صاحب بہادر نے دو آبہ سندھ ساگر میں واپس آکر بہت سے کام اس کے سپرد کئے جن میں یہ مفید ثابت ہوا۔ جب ۱۸۵۳ء میں نادر خاں گکھڑ نے بلوہ کرنے کی کوشش کی تو شیر خاں بہت سے دوسروں کی طرح شش و پنج میں نہیں پڑا۔ اتفاق سے یہ اس وقت راولپنڈی میں تھا جہاں یہ اس معاملے کی نسبت سرسری طور پر سن کر ایک ہی یورپین سول افسر کے پاس جو اس وقت راولپنڈی میں موجود تھا چلا گیا اور سارا حال کہہ سنایا۔ اس کے صلہ میں اسے ۲۵۰ روپیہ سالانہ پنشن عطا ہوئی اور وہ معافیات جو اس وقت ۴۹۲ روپیہ تھیں اور جو سکھوں کے زمانہ میں اسے ملتی تھیں اس کے اور اس کے بھتیجوں کے نام جاری رکھی گئیں۔

۱۸۵۷ء میں بھی اس نے اس طرح نمایاں وفاداری کی اور وقتاً فوقتاً بڑی مفید مطلب خبریں دیتا رہا۔ فوج مہیا کی۔ کمشنر صاحب بہادر کے ہمراہ مری گیا اور جب وہاں بغاوت ہوئی تو خدمات سرانجام دیں۔ اس نے کچھ باغی سپاہیوں کے تعاقب میں بھی امداد دی جو بڑا سخت مقابلہ

کرنے کے بعد مارے گئے اور بعد ازاں یہ عمر قیدیوں کو لے کر ملتان گیا اس کے مالیہ کی معافی ۴۹۲ روپیہ سے بڑھا کر ۷۵۰ روپیہ کر دی گئی جس میں سے ۵۰۰ روپیہ کی پنشن تاحیات منظور ہوئی۔ نیز اسے ۵۰۰ روپیہ کا خلعت بھی عطا کیا گیا۔ غدر کے بعد جبکہ رعایا سے ہتھیار لے لئے گئے تو اسے ۱۵ بندوقیں اور ۱۵ ڈھالیں رکھنے کی اجازت مل گئی۔

چودھری شیر خاں کا انتقال ۱۸۷۵ء میں ہوا اور اس کی ۵۹۴ روپیہ سالانہ کی موروثی جاگیر اور درباری کرسی اس کے نیک طینت اور نیک چلن احمد خاں کو ملی جو ذیلدار اور اپنے علاقہ میں بڑا بارسوخ آدمی تھا۔ اس کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا اور دو بیٹے سلطان خاں اور حیات خاں چھوڑے جو دونوں پنجاب رجمنٹ میں صوبیدار ہو گئے۔ جنگ عظیم کے دوران میں دونوں عراق میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ چودھری سلطان خاں نے جنگ مذکور کے شروع میں ۱۰۰ رنگروٹ مہیا کئے تھے اور بعد میں وہ خود ۲۸ر جولائی ۱۹۱۸ء کو نصیرا کی لڑائی میں مارا گیا اور اس کی بیش قیمت خدمات کا ذکر رجمنٹل آرڈر میں کیا گیا۔ چودھری حیات خاں کو خرابی صحت کی وجہ سے میدان جنگ سے ہندوستان واپس آنا پڑا اور اس نے واپسی کے بعد ۶۰۰ سے زیادہ رنگروٹ دیئے جن کے صلہ میں اسے کئی سندات اور تمغہ بھرتی عطا ہوئے۔ یہ ۱۹۱۸ء میں بحیرۂ اسود کے مقام پر اپنی رجمنٹ میں پھر واپس چلا گیا اور اس کے صوبیدار میجر کے عہدہ پر کام کرتا رہا۔ اس کی رجمنٹ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان واپس آئی۔ ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کیناٹ کے ہندوستان میں تشریف آوری کے موقع پر چودھری حیات خاں ان پانچ منتخب شدہ ہندوستانی افسروں میں سے تھا جو اس گارڈن پارٹی کی نگہداشت کیلئے منتخب کئے گئے تھے جو ڈیوک مذکور کو دی گئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں چودھری حیات خاں دہلی کے اس دربار میں شامل ہوا جو ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلز کی آمد پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس کو کئی تمغہ جات ملے ہوئے تھے جن میں وزیرستان کی لڑائی کا تمغہ بھی تھا۔ ۱۹۲۹ء میں اس کے پنشن پر آنے کے بعد اسے آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔

چودھری سلطان خاں کا سب سے بڑا بیٹا چودھری فتح خاں ۱۹۲۵ء میں ایچیسن کالج لاہور سے ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد فوج میں بطور جمعدار بھرتی ہوا مگر ۱۹۳۳ء میں اسے انڈین ملٹری اکیڈیمی ڈیرہ دون کیلئے بطور کیڈٹ منتخب کر لیا گیا۔ اس اکیڈیمی کا آخری امتحان اس نے ۱۹۳۵ء میں سب سے اول رہ کر پاس کیا اور لیفٹیننٹ کا عہدہ دے کر اسے ایک سال کے لئے برطانوی فوج میں رکھا گیا۔ گورنمنٹ نے اسے خاندان کا سرکردہ تسلیم کیا اور سات مربعہ جات اراضی عطا کئے۔ (۱)

چودھری فتح خان نے فوج میں بریگیڈیئر کے عہدے تک ترقی پائی اور ۱۹۵۵ء میں فوج سے ریٹائر ہو گئے۔ فوج سے سبکدوشی کے بعد وہ بلامقابلہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے اور دو سال تک اس کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور بلامقابلہ کامیابی حاصل کی۔ (۲)

چودھری فتح علی کے دو بیٹوں میں سے ایک چوہدری افتخار علی تو فوج میں چلے گئے جبکہ دوسرے چوہدری نثار علی نے سیاست کے میدان میں شہرت کمائی۔ وہ ۱۹۷۷ء میں سیاسی افق پر نمودار ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں وہ جنرل ضیاء الحق کی خود ساختہ مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے این اے ۴۰ راولپنڈی ۵ سے کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور پیپلز پارٹی کے امیدوار کرنل حبیب احمد کو تقریباً چھ ہزار ووٹوں سے شکست دے دی۔ کرنل حبیب اس سے قبل ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء میں اسی حلقہ سے ایم این اے منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۹۰ء میں چوہدری نثار علی نے تیسری مرتبہ اسی حلقے سے کامیابی حاصل کی۔ (۳) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں وہ اسی حلقہ سے چوتھی مرتبہ۔ (۴) اور ۱۹۹۷ء میں پانچویں مرتبہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔ انتخابات کے بعد مسلم لیگ کی حکومت بنی تو انہیں پٹرولیم و قدرتی وسائل اور پانی وہ بجلی جیسی وزارتوں کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ (۵)

۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء، چاروں انتخابات میں چوہدری نثار علی اس توقع پر پی پی ۲ راولپنڈی ۲ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب بھی لڑتے اور جیتتے رہے کہ شاید اس مرتبہ پنجاب کی وزارت اعلیٰ ان کے حصے میں آجائے مگر چاروں مرتبہ، قومی اسمبلی کی نشست برقرار رکھنے کے باعث انہیں یہ نشست خالی کرنی پڑی جس پر ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء کے ضمنی انتخابات میں ان کے کزن چوہدری وقار علی کامیاب ہوئے جبکہ ۱۹۹۷ء میں یہ نشست سردار محمد اقبال کے حصے میں آئی۔ (۶)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں کامیابی کے بعد چوہدری نثار علی کی نظریں بھی اور بہت سے ارکان اسمبلی کی طرح پنجاب کی وزارت اعلیٰ پر تھیں۔ مگر جب فیصلہ ہوا کہ غلام حیدر وائیں پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہوں گے تو دیگر ارکان کی طرح چوہدری نثار علی کو بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ بہرحال چوہدری نثار علی نواز شریف کابینہ میں شامل ہوئے اور اس شان سے شامل ہوئے کہ نواز شریف کابینہ کا زوال کا باعث بھی بن گئے۔

چوہدری نثار علی ان پانچ وزراء میں شامل تھے۔ جنہیں نواز شریف کے "پانچ پیارے" کا خطاب دیا گیا (بقیہ چار وزرا ملک نعیم، صدیق کانجو، رانا نذیر اور عبدالستار لالیکا تھے) چوہدری نثار علی کا ایک "پلس پوائنٹ" ان کے بھائی میجر جنرل افتخار علی تھے جو نیشنل ڈیفنس کالج کے کمانڈنٹ تھے۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ وہ اس طرح فوج کے اعلیٰ حکام سے اچھے تعلقات قائم رکھ سکتے تھے۔

چوہدری نثار علی نے نواز شریف کے ڈھائی سالہ دور اقتدار میں ایوان وزارت عظمیٰ میں اپنا عمل دخل اس حد تک بڑھا لیا تھا کہ لوگ انہیں نائب وزیراعظم بھی کہنے لگے تھے۔ کچن کیبنٹ کی پھبتی تو پہلے ہی زبان زد خاص و عام ہو چکی تھی۔ یہ چوہدری نثار علی ہی تھے جن کی ناراضی کی بنا پر انور زاہد کو وزیراعظم سیکرٹریٹ چھوڑنا پڑا تھا اور یہ چوہدری نثار علی ہی تھے جو مسلم لیگ اور اے این پی کے

اختلافات اور مسلم لیگ اور ایم کیو ایم اختلافات کے درمیان مصالحت کا فریضہ انجام دیتے رہے تھے۔

چوہدری نثار علی پر ایک سنگین الزام یہ بھی عائد کیا گیا تھا کہ انہوں نے آئی بی کے سربراہ، بریگیڈیئر امتیاز کے ساتھ مل کر بعض اختلافات کی بنا پر فوج کے سربراہ آصف نواز جنجوعہ کو ایک خاص قسم کا زہر کھلا کر ہلاک کیا ہے۔ یہ الزام مرحوم کی بیوہ نے سرعام عائد کیا اور اس کی بازگشت صدر غلام اسحٰق کی اس چارج شیٹ میں بھی سنائی دی جو انہوں نے ۱۸؍اپریل ۱۹۹۳ء کو نواز شریف حکومت کی برطرفی کے موقع پر پیش کی تھی۔ مگر ظاہر ہے اس الزام کا کوئی ثبوت نہیں تھا اس لئے یہ الزام، الزام ہی رہا۔ (۷)

اکتوبر ۱۹۹۹ء میں نواز شریف کی برطرفی کے بعد انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں مگر انہوں نے مسلم لیگ (ن) کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر دو نشستوں پر انتخاب لڑا۔ ایک تو ان کی وہی پرانی نشست تھی جو اب نئی حلقہ بندیوں کے نتیجے میں این اے ۸۲ راولپنڈی ۳ بن گئی تھی اور دوسری اس سے متصل این اے ۵۳ راولپنڈی ۴۔

چوہدری نثار علی این اے ۵۲ راولپنڈی ۳ سے تو بآسانی کامیاب ہو گئے۔ یہ اس حلقے سے ان کی چھٹی مسلسل کامیابی تھی مگر وہ دوسری نشست پر کامیاب نہ ہو سکے اور ایک سخت مقابلے کے بعد پاکستان مسلم لیگ (ق) کے غلام سرور خان سے شکست کھا گئے۔ (۸)

حوالہ جات

۱۔ سر لیپل ایچ گریفن، کرنل میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور جلد دوم۔ ص ۴۳۹ تا ۴۴۱

۲۔ ایم آئی صدیقی رزم۔ ہمارے نمائندے۔ لاہور۔ ص ۷۷، ۷۸

۳۔ احمد سلیم۔ چوہدری نثار علی خان، ہز ماسٹرز وائس۔ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۹ جولائی تا ۴؍اگست ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۱۴؍اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۶۱

۵۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۶۰

۶۔ (i) طارق اسمٰعیل الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۵۶۸، ۵۶۹

(ii) دی گزٹ آف پاکستان۔ ۲۰؍جنوری ۱۹۷۱ء۔ ص ۷۰

(iii) روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳؍دسمبر ۱۹۹۳ء

(iv) الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ (جلد دوم) اسلام آباد۔ ص ۳۱۷

۷۔ احمد سلیم۔ چوہدری نثار علی خان، ہز ماسٹرز وائس۔ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۹ ہز جولائی

تا ۴؍اگست ۱۹۹۳ء۔ص ۱۳

۸۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ص ۴۳۵

بابر پٹھان

ضلع مظفر گڑھ میں خان گڑھ کے مقام پر آباد ایک خاندان ایسا بھی ہے جسے نہ تو سیاست میں قدم رکھے زیادہ عرصہ ہوا ہے اور نہ ہی اس خاندان کے افراد بڑی تعداد میں سیاست سے وابستہ ہوئے۔ مگر اس خاندان کا ذکر کئے بغیر پاکستان کی کوئی سیاسی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ خاندان خان گڑھ کے بابر پٹھانوں کا خاندان ہے جس کے نوابزادہ نصراللہ خان اکیلے کئی خاندانوں پر بھاری ہیں۔

نوابزادہ نصراللہ خان کا خاندان اٹھارویں صدی کے آخر میں اس علاقے میں آباد ہوا تھا۔ اس جگہ انہیں ان کے افغان رشتہ مظفر خان سدوزئی نے بسایا تھا جو ۱۸۱۸ء تک ملتان کا نواب رہا تھا۔ ۱۸۱۸ء میں اسے سکھوں نے بے دخل کیا۔

نوابزادہ نصراللہ خان کے دادا کا نام الہ داد خان تھا۔ اس نے سکھوں کی بغاوت کے زمانے میں انگریزوں کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۸۵۷ء میں بھی وہ انگریزوں کی خیر خواہی میں پیش پیش رہا اور جب بنگال رجمنٹ نمبر ۶۸ کے حریت پسند سپاہیوں نے ہندوستان کی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو اس نے ان حریت پسندوں کو کچلنے میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔

جنگ آزادی کے خاتمے کے بعد جب انگریزوں نے اپنے جن وفاداروں میں انعام تقسیم کئے ان میں اللہ داد خان کا نام بھی شامل تھا۔ انگریزوں نے اسے دربار عام میں دو مرتبہ خلعت عطا کی خان صاحب کا خطاب عطا کیا اور اس کو اپنے علاقہ خان گڑھ کا اعزازی مجسٹریٹ بنا دیا۔

خان صاحب اللہ داد خان نے ۱۸۸۵ء میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا نواب محمد سیف اللہ خان اس کا جانشین ہوا۔ انگریزوں نے اسے آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز کیا اور اسے مجسٹریٹ درجہ اول اور منصف درجہ دوم کے اختیارات عطا کئے۔ یہ صوبائی درباری بھی تھا۔ انگریزوں نے اس کی وفاداری اور خیر خواہی کے صلے میں ۱۸۹۴ء میں اسے اعزازی مجسٹریٹ بھی بنا دیا اور اسی برس اسے خان بہادر کے خطاب سے بھی نوازا ۱۹۱۰ء میں اسے نواب کا

خطاب عطا ہوا۔ اس وقت خان گڑھ کے اطراف میں آباد ۱۱ گاؤں اس کی ملکیت تھے جن کی سالانہ آمدنی اس زمانے میں تقریباً چھ ہزار روپے تھی۔ نواب خان بہادر محمد سیف اللہ خان نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ اس کے نو بیٹے ہوئے۔ جن میں سے چھ بیٹے اس کی وفات کے وقت زندہ تھے۔

خان بہادر سیف اللہ خان کی وراثت اس کے سب سے بڑے بیٹے نوابزادہ محمد عبداللہ خان نے سنبھالی۔ جو اعزازی مجسٹریٹ، چار موضعات کا نمبردار اور زمیندار بنک کا صدر رہا۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران اس نے بھی انگریزوں کی خیر خواہی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جس کے عوض اسے سند، بندوق اور عمر بھر کے لئے پونے دو سو روپے سالانہ انعام سے نوازا گیا۔ (۱)

نوابزادہ نصراللہ خان انہی نوابزادہ محمد عبداللہ خان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے اور فقط پندرہ برس کی عمر میں ۱۹۳۳ء میں عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب سر فضل حسین کی قیادت میں یونینسٹ پارٹی کی تشکیل پا چکی تھی اور پنجاب کے مسلمان، ہندو اور سکھ جاگیردار اور انگریزوں کے خطاب یافتہ اور مراعات یافتہ سبھی افراد، اس پارٹی میں شامل تھے۔ دوسری طرف مجلس احرار اسلام کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔

اس پارٹی کے اکابرین نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر کے ایک خالصتاً مسلم تنظیم قائم کرنے کی ضرورت کا احساس کیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ برصغیر کی آزادی کی جدوجہد کے ساتھ اسلامیان ہند کے مفادات کا تحفظ بھی ہونا چاہیے اور اس کے لئے مسلمانوں کو اپنے پلیٹ فارم سے آواز بلند کرنی چاہیے۔

جس زمیندار طبقے سے نوابزادہ نصراللہ خان کا یاان کے خاندان کا تعلق تھا۔ وہ اجتماعی طور پر یونینسٹ پارٹی کا ہمنوا تھا مگر نوجوان نصراللہ خاں نے اس طبقے کی عام روش کے برعکس مجلس احرار میں شمولیت اختیار کی اور اپنی استطاعت کے مطابق اسلامیان ہند میں بالعموم اور پنجاب کے مسلمانوں میں بالخصوص تحریک آزادی اور اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے کام کیا۔ (۲)

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات تک نوابزادہ نصراللہ خاں مجلس احرار ہی سے وابستہ تھے۔ اس انتخاب میں انہوں نے مظفر گڑھ حلقہ ۲ سے پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا اور مسلم لیگ کے عبدالحمید خان دستی اور یونینسٹ پارٹی کے کریم بخش قریشی کے بعد تیسرے نمبر پر آئے۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور بلا مقابلہ منتخب ہوئے مگر وہ جلد ہی مسلم لیگ کی سیاست سے بیزار ہو گئے، انہوں نے سید حسین شہید سہروردی کی قیادت کو قبول کر لیا اور عوامی لیگ میں چلے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ اپنے علاقے سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اپوزیشن بنچوں پر بیٹھے۔ (۳) ان انتخابات سے پہلے ہی ایوب خان نے حفظ ماتقدم کے طور پر ملک کے معروف سیاستدانوں کو ایبڈو کے قانون کے تحت نااہل قرار دے دیا مگر ان انتخابات میں بھی ایسے ارکان کامیاب ہو گئے جنہوں نے ایوب

خان کی آمریت کو پارلیمانی ایوانوں میں ایسے للکارا کہ ایوب خاں کا سکون اور آرام غارت ہو گیا۔ ایوب خاں نے اپنی آمریت کو مستحکم کرنے کے لئے نواب امیر محمد خاں آف کالا باغ اور اعظم خان جیسے گورنروں کا سہارا لیا مگر ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات میں اپوزیشن ایک بار پھر منتظم ہوئی اور سی او پی کے نام سے ایک نیا اتحاد قائم کیا گیا۔ اس اتحاد میں جن جماعتوں نے شمولیت اختیار کی ان میں عوامی لیگ کونسل مسلم لیگ، جماعت اسلامی، نظام اسلام پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی شامل تھیں۔ ان انتخابات سے قبل ہی مسٹر سہروردی اور کونسل مسلم لیگ کے سربراہ خواجہ ناظم الدین انتقال کر چکے تھے اور نیپ کے سربراہ مولانا بھاشانی نے اعلان کیا کہ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح اپوزیشن کی صدارتی امیدوار ہوں گی مگر جب مادر ملت نے صدارتی امیدوار بننے کا فیصلہ کر لیا تو سب سے پہلے بھاشانی نے بیک آوٹ کیا اور وہ اپنی بیماری کا بہانہ بنا کر اپنے گاؤں سنتوش چلے گئے۔ ان کی پارٹی کے ایک سرکردہ رہنما مسٹر مسیح الرحمٰن نے اس وقت کے مرکزی وزیر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے ذریعے ایوب خاں کو یقین دہانی کرائی تھی کہ مولانا بھاشانی انتخابی مہم میں ہرگز متحرک نہیں ہوں گے۔ دوسری طرف شیخ مجیب الرحمٰن نے بھی کوئی سرگرمی نہ دکھائی۔ البتہ سردار شوکت حیات، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، چودھری محمد علی، مولوی فرید احمد، خواجہ خیر الدین، نوابزادہ نصراللہ خاں، خان عبدالولی خاں، چودھری محمد حسین چٹھہ، ملک غلام جیلانی، میاں محمود علی قصوری اور حبیب جالب نے بڑی سرگرمی سے اپوزیشن کے صدارتی امیدواروں کے حق میں مہم چلائی مگر ایوب خاں کو ریاستی تشدد، جبرو استبداد اور دھونس و دھاندلی سے کامیاب کرایا گیا۔ ان انتخابات کے بعد ۱۹۶۵ء میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا مرحلہ آیا تو ان انتخابات میں حصہ لینے کے سوال پر سی او پی ہی ٹوٹ گئی۔ قومی اسمبلی میں بھی وسیع پیمانے پر دھاندلیاں ہوئیں اور دونوں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی دھونس اور دھاندلی سے سرکاری امیدواروں کو کامیاب بنایا گیا ان انتخابات کے بعد صدر ایوب خاں کے خلاف عوام میں شدید نفرت کے جذبات پیدا ہوئے مگر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پوری قوم نے دفاعی تقاضے پورے کرنے کے لئے بے مثال اتحاد و یگانگت کا ثبوت دیا مگر جب اعلان تاشقند سے قوم کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تو قوم کی مایوسی دور کرنے کے لئے نظام اسلام پارٹی کے سربراہ چودھری محمد علی نے اپنی اقامت گاہ واقع گلبرگ میں ملک کے دونوں حصوں سے تعلق رکھنے والے اپوزیشن ارکان کی ایک نیشنل کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا مگر اس کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنا چھ نکاتی پروگرام پیش کر دیا جسے حکومت کے کنٹرول میں کام کرنے والے ذرائع ابلاغ نے خوب اچھالا نتیجہ کے طور پر چھ نکاتی پروگرام کے خلاف سیاسی حلقوں میں ہیجان پیدا ہو گیا اس وقت بھی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے بطور وزیر خارجہ چھ نکاتی پروگرام کے خالق کو مناظرے کا چیلنج دے دیا۔ چھ نکاتی پروگرام کے منظر عام پر آنے کے بعد عوامی لیگ دو

حصوں میں تقسیم ہو گئی اور نواب زادہ نصراللہ خان کی سربراہی میں آٹھ نکاتی عوامی لیگ قائم کی گئی۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۶۸ء کو حکومت کے خلاف ایک نیا اتحاد تحریک جمہوریت پاکستان (پی ڈی ایم) کے نام سے قائم ہوا جس میں کونسل مسلم لیگ، قومی جمہوری محاذ، جماعت اسلامی، آٹھ نکاتی عوامی لیگ اور نظام اسلام پارٹی شامل تھیں۔ قومی جمہوری محاذ میں نور الامین حمید الحق چودھری، عطاء الرحمٰن خاں اور ابو حسین سرکار شامل تھے کونسل مسلم لیگ میں میاں ممتاز دولتانہ، تفضل علی، خواجہ محمد صفدر اور خواجہ خیر الدین، جماعت اسلامی میں میاں طفیل محمد، مولانا محمد عبد الرحیم اور مولانا غلام اعظم، عوامی لیگ میں نوابزادہ نصراللہ خاں، خان غلام محمد لونڈ خوڑ اور عبد السلام خاں اور نظام اسلام پارٹی میں چودھری محمد علی، مولوی فرید احمد اور ایم آر خاں شامل تھے۔ یہ وہ دور تھا جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو بھی ایوب خاں کی کابینہ سے مستعفی ہو چکے تھے۔ یکم اکتوبر سے ۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۸ء تک تحریک جمہوریت پاکستان کے پلیٹ فارم سے اپوزیشن لیڈروں نے ملک کے طوفانی دورے کیے اور چھ اکتوبر کو پورے ملک میں یوم جمہوریت بھی منایا گیا۔

پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم سے ایوب خان کی آمریت کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیا جاتا رہا۔ جمعہ کو عید منانے کے مسئلہ پر ایوب خاں کا علمائے کرام سے اختلاف ہوا جس کے نتیجے میں پانچ جید علمائے کرام کو گرفتار کر لیا گیا۔ پریس پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ نوائے وقت کے اشتہارات بند کر دیئے گئے۔ مدیر چٹان شورش کاشمیری کو گرفتار کرنے سے اپوزیشن کو تقویت ملی۔ عائلی قوانین کے بارے میں دینی حلقوں میں ہیجان پیدا ہوا۔

صدر ایوب خاں کے بیٹوں کی بدعنوانیوں کے بارے میں بڑی بڑی داستانیں سنائی دینے لگی مگر جب ۸ر نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں طلبہ کے ایک جلوس پر فائرنگ کا واقعہ پیش آیا تو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خاں کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کر لیا اس وقت کے گورنر موسیٰ خاں نے مسٹر بھٹو کے الزامات کے جواب میں جو موقف اختیار کیا اسے تو نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات سمیت تمام اخبارات نے من و عن شائع کر دیا مگر مسٹر بھٹو کے الزامات جب نوائے وقت میں شائع ہوئے تو ہیجان برپا ہو گیا۔ مسٹر بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا اور ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان نے ان کی گرفتاری کے فوراً بعد عملی سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا اس سے اپوزیشن کو مزید تقویت ملی۔ بعد میں ڈھاکہ میں پی ڈی ایم کا اجلاس منعقد ہوا جس میں مزید جماعتوں اے این پی (ولی خاں گروپ) جمعیت علمائے اسلام اور چھ نکاتی عوامی لیگ نے بھی شرکت کی، انہیں جماعتوں کی شرکت کے باعث پی ڈی ایم ختم ہو گئی اور آٹھ جماعتوں کے اشتراک سے ایک نیا اتحاد جمہوری مجلس عمل (ڈیک) قائم ہوا۔ اس اتحاد کے پلیٹ فارم سے آٹھ نکاتی فارمولہ تیار کیا گیا۔ ڈیک نے فیصلہ کیا کہ جب تک ان کے آٹھ نکاتی مطالبات کو تسلیم نہیں کیا جاتا اس وقت تک وہ انتخابات کا بائیکاٹ کرے گی۔ مسٹر بھٹو چونکہ نظر بند تھے ان کی غیر موجودگی میں مسٹر جے

اے رحیم نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعے مسٹر بھٹو کے آئندہ صدارتی امیدوار ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی جلسوں اور جلوسوں میں تشدد کی نئی لہر آئی۔ جب حالات بے قابو ہو گئے تو صدر ایوب خان نے ڈیک کے سربراہ نواب زادہ نصراللہ خان کو مذاکرات کی دعوت دی اس وقت شیخ مجیب الرحمٰن بھی اگرتلا سازش کیس کے سلسلہ میں جیل میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیک نے مذاکرات سے پہلے شرط عائد کر دی کہ ہنگامی حالت کے خاتمے' سیاسی نظر بندوں کی رہائی اور شہری آزادیوں کی بحالی کا اعلان کیا جائے۔ مسٹر بھٹو' ولی خاں' احمد خٹک اور رسول بخش تالپور کو رہا کیا گیا۔ نواب زادہ نصراللہ خان نے دعوت قبول کر لی مگر مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ شیخ مجیب کو پیرول پر رہائی ملی تاکہ وہ بھی اس کانفرنس میں شرکت کر سکیں مگر یہ کانفرنس بھی ناکام ہو گئی۔ پورے ملک کو مظاہروں نے اس قدر لپیٹ میں لے لیا کہ ایوب خان گیارہ سال بعد اقتدار سے محروم کر دیئے گئے کہاں چھ ماہ قبل ان کے دور کی ترقی کے جشن منائے جا رہے تھے اور کہاں انہیں اقتدار سے ہی محروم کر دیا گیا۔ یحیٰی خاں نے اقتدار سنبھال لیا اور ایوب خاں کے اقتدار کے ساتھ ان کا بنایا ہوا ۱۹۶۲ء کا آئین بھی کالعدم ہو گیا۔ یحیٰی خان کے دور میں دسمبر ۱۹۷۰ء میں انتخابات منعقد کرائے گئے مگر دائیں بازو کی حامی جماعتوں میں کوئی اشتراک نہ ہو سکا مسلم لیگ تین دھڑوں میں بٹ گئی۔ مسٹر بھٹو لاہور سے پیپلز پارٹی کی طرف سے قومی اسمبلی کے امیدوار بنے مگر کونسل مسلم لیگ نے ان کے مقابلے میں ڈاکٹر جاوید اقبال کو کھڑا کر دیا جماعت اسلامی نے ان کا ساتھ دیا جبکہ نوابزادہ نصراللہ خان نے ریٹائرڈ میجر جنرل سرفراز خاں کی حمایت کا اعلان کیا اس سے بھی دائیں بازو کی جماعتوں کے "اختلافات میں شدت سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابی نتائج نے ملک کو عملاً" تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی قیادت میں مشرقی پاکستان میں انتخابی طوفان نے نامور سیاستدانوں کو ناکام بنا دیا۔ صرف نورالامین اس طوفان کی زد سے محفوظ رہے۔ پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کو فقید المثال کامیابی ملی باقی دو صوبوں بلوچستان اور سرحد میں نیپ (ولی خاں گروپ) اور جمیعت علمائے اسلام جیت گئیں۔ انتقال اقتدار کے مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوا۔ شیخ مجیب اور مسٹر بھٹو میں اشتراک و تعاون نہ ہونے کے باعث مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی گئی مگر بھارتی حکمرانوں نے اس مسئلہ پر شیخ مجیب کا ساتھ دیا اور نتیجہ کے طور پر مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ باقی ماندہ پاکستان کا اقتدار مسٹر بھٹو کو سونپ دیا گیا۔ ان کے دور میں اپوزیشن جماعتوں نے یو ڈی ایف کے نام سے ایک نیا اتحاد قائم کیا جس کی سربراہی پیر صاحب پگاڑو کو سونپ دی گئی۔ اس اتحاد میں شامل جماعتوں میں مسلم لیگ' جماعت اسلامی' این ڈی پی' جمیعت علمائے اسلام شامل تھیں جبکہ تحریک استقلال اور جمیعت علمائے پاکستان اس اتحاد سے باہر رہیں۔ شروع میں یو ڈی ایف نے مسٹر بھٹو کے خلاف منظم تحریک چلانے کا فیصلہ کر لیا مگر

جماعت اسلامی نے واضح کر دیا کہ چونکہ پنجاب اور سندھ میں سیلاب آیا ہوا ہے اس لئے وہ سیلاب زدگان کی امداد کے لئے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو معطل کرتی ہے۔ ۱۹۷۶ء کے دوران مسٹر بھٹو نے بطور وزیر اعظم وقتی طور پر فیصلہ کر لیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ملک میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے از سر نو انتخابات کرائے جائیں۔ انہوں نے انتخابی عمل سے قبل ہی چاول چھڑنے والی فیکٹریوں، کاٹن اور آئل ملوں کو سرکاری تحویل میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ سے کاروباری حلقوں میں سخت اضطراب پیدا ہوا۔ مسٹر بھٹو کی اپنی سوچ تھی کہ ماضی کی طرح اپوزیشن جماعتیں متحد نہیں ہو سکیں گی مگر جب انہوں نے جنوری ۱۹۷۷ء کے پہلے ہفتے میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑنے کا اعلان کیا تو مخالف سیاسی جماعتیں بھی غیر متوقع طور پر متحد ہو گئیں اور پاکستان قومی اتحاد کے نام سے ایک نئے اتحاد نے جنم لیا۔ اس کی سربراہی مولانا مفتی محمود کو سونپ دی گئی۔ جن نو جماعتوں نے اس اتحاد میں شرکت کی ان میں مسلم لیگ، جماعت اسلامی، تحریک استقلال، جمیعت علمائے پاکستان، این ڈی پی، پی ڈی پی، جمیعت علمائے اسلام، جموں و کشمیر مسلم کانفرنس اور خاکسار تحریک شامل تھیں۔ پاکستان قومی اتحاد نے پیپلز پارٹی کے مقابلہ میں تمام نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کر دیئے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں وسیع دھاندلیاں کرائی گئیں اور جب ان دھاندلیوں کے خلاف تحریک چلائی گئی تو یہ تحریک نظام مصطفیٰؐ میں بدل گئی۔ بعد میں مسٹر بھٹو اور قومی اتحاد کے قائدین کے مابین مذاکرات ہوئے مگر یہ مذاکرات بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے اور بالاخر مسٹر بھٹو کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں نے اقتدار سے محروم کر دیا اور قومی اتحاد نے جو تحریک چلائی تھی اس کے نتیجے میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ مگر عوام جمہوریت سے محروم کر دیئے گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے انتخابی عمل سے فرار کا راستہ اختیار کرنے کے لئے وفاقی مجلس شوریٰ جیسا نامزد ادارہ تو قائم کر دیا مگر اس دوران پیپلز پارٹی کے تعاون سے ایک نیا اتحاد قائم ہوا جسے ایم آر ڈی سے موسوم کیا گیا۔ ایم آر ڈی بنانے میں شروع میں پیر صاحب پگاڑو اور سردار عبدالقیوم خان نے بھی دلچسپی لی مگر بعد میں یہ دونوں اصحاب علیحدہ ہو گئے۔ ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں میں پیپلز پارٹی، اے این پی، جمیعت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) تحریک استقلال، پی ڈی پی، مسلم لیگ خواجہ خیر الدین گروپ، مزدور کسان پارٹی، پاکستان نیشنل پارٹی، این ڈی پی، قومی محاذ آزادی، سندھی عوامی تحریک اور پختون خواہ نیپ شامل تھیں۔ ایم آر ڈی نے اپنی تحریک کے لئے ۱۹۷۳ء کے آئین جمہوریت کی بحالی، مارشل لاء کے خاتمے اور صوبائی خود مختاری دینے کا چار نکاتی فارمولہ پیش کیا۔

۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کو پشاور کے جلسہ عام میں جنرل ضیاء الحق نے عام انتخابات منعقد کرانے کا پروگرام پیش کر دیا۔ ایم آر ڈی نے ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور تحریک چلانے کا اعلان کر دیا مگر عوام نے انتخابی عمل میں زبردست جوش و خروش دکھایا اور ایم آر ڈی کو سخت

مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ (۴)

۲۹ر مئی ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء الحق نے جونیجو حکومت کی چھٹی کر دی۔ اب وقت آیا تھا کہ ایم آر ڈی کے عمائدین ایک پلیٹ فارم سے انتخاب لڑتے مگر ایم آر ڈی میں ٹکٹوں کی تقسیم پر پھوٹ پڑ گئی اور بے نظیر بھٹو نے اتحاد میں شامل جماعتوں کے ٹکٹوں کے معاملے میں مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔

اسی دوران جنرل ضیاء الحق ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو گئے اور سپریم کورٹ نے نومبر ۱۹۸۸ء کے موعودہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر کروانے کا فیصلہ سنا دیا۔ پیپلز پارٹی نے اعلان کیا کہ وہ ایم آر ڈی کی جماعتوں کو ان کی مطلوبہ نشستیں تو فراہم نہیں کرے گی البتہ جن جن نشستوں پر ایم آر ڈی کے جماعتی سربراہان انتخاب لڑیں گے وہاں اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔ چنانچہ ان انتخابات میں نوابزادہ نصراللہ خان نے پی ڈی پی کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا اور این اے ۱۳۶ مظفر گڑھ ۲ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔

۱۹۸۸ء کے الیکشن میں جب پیپلز پارٹی کو مرکز میں اکثریت حاصل ہو گئی تو غلام اسحاق خاں نے انہیں اقتدار منتقل نہ کیا۔ اس دوران وہ بے نظیر بھٹو سے سودے بازی کرتے رہے۔ صدر غلام اسحاق خاں نے اپنی بھرپور کوشش کی کہ بے نظیر بھٹو کسی طرح اقتدار میں نہ آئیں۔ اس ضمن میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کو اتنا موقع دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مطلوبہ اکثریت حاصل کر لے۔ میاں نواز شریف اور ان کے ساتھیوں نے ہارس ٹریڈنگ کے ذریعے آزاد ارکان اسمبلی اور دوسری سیاسی جماعتوں کے ارکان کی وفاداری خریدنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کے باوجود وہ مرکز میں اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ دوسری طرف ایم کیو ایم نے پیپلز پارٹی کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ غلام اسحاق خان نے ۱۹۸۸ء کے الیکشن کے بعد ایک روز خصوصی طور پر نواب زادہ نصراللہ خاں کو مشورے کے لئے بلایا اور ان سے پوچھا "مجھے کیا کرنا چاہیے؟" جس پر نواب زادہ نصراللہ خاں کے بقول انہوں نے صدر سے کہا "اس سوال کا جواب تو پرائمری جماعت کا طالب علم بھی دے سکتا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہونے دیں"۔ جس وقت نواب زادہ نصراللہ خاں کو غلام اسحاق خاں کی طرف سے بلاوا آیا تھا' اس وقت بے نظیر بھی ان کے ساتھ ملاقات کی خواہش مند تھیں۔ انہیں علم ہو گیا تھا کہ نواب زادہ نصراللہ خاں کو غلام اسحاق خاں نے یاد کیا ہے پیپلز پارٹی کے دو رہنماؤں اعتزاز احسن اور راؤ عبدالرشید نے نواب زادہ نصراللہ سے رابطہ قائم کیا اور اسلام آباد ایئرپورٹ پر پہنچ کر ان سے کہا کہ آپ پہلے بے نظیر بھٹو سے ملاقات کر لیں لیکن نواب زادہ نصراللہ کو جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ وقت اور قول کے انتہائی پابند ہیں۔ چونکہ نواب زادہ نصراللہ خاں کا جہاز اسلام آباد تاخیر سے پہنچا تھا اور طے شدہ وقت کے مطابق غلام اسحاق خاں ان کا انتظار کر رہے تھے' اس لئے

انہوں نے اعتزاز احسن اور راؤ رشید سے کہا کہ وہ غلام اسحاق خاں کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد بے نظیر سے ملیں گے۔ جب نواب زادہ نصراللہ خاں نے غلام اسحاق خاں کو واضح الفاظ میں کہا کہ آپ پیپلزپارٹی کو حکومت بنانے کی دعوت دیں تو صدر اسحاق کو ان کے جواب سے مایوسی ہوئی۔ نواب زادہ نصراللہ خاں نے صدر اسحاق سے کہا "اس وقت ۱۹۷۰ء والا ڈرامہ رچانے سے پرہیز کیا جائے"۔ جس پر غلام اسحاق خاں نے کہا "پنجاب والے (میاں نواز شریف) چاہتے ہیں کہ پیپلزپارٹی کو حکومت بنانے کا موقع نہ دیا جائے کیونکہ یہ ملک دشمن جماعت ہے"۔ غلام اسحاق خاں نے نواب زادہ نصراللہ خاں سے کہا کہ پنجاب والوں کی خواہش ہے کہ وزیراعظم کے انتخاب سے قبل ہی صوبائی اسمبلیاں حلف اٹھالیں۔ جس پر نواب زادہ نصراللہ خاں نے کہا ایسی کوئی مثال دنیا کی پارلیمانی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد بے نظیر بھٹو نے نواب زادہ نصراللہ خاں سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ غلام اسحاق خاں اس موڈ میں نظر آرہے ہیں کہ وہ پیپلزپارٹی کو حکومت بنانے کی پیشکش کریں گے۔ نوابزادہ نے اپنے پچاس سالہ سیاسی تجربہ کی روشنی میں بے نظیر کو مشورہ دیا "آپ اپوزیشن میں بیٹھنے کا اعلان کردیں"۔ نواب زادہ نصراللہ خاں کا یہ مشورہ درست تھا کیونکہ آئی جے آئی اول تو حکومت بنانے میں کامیاب نہ ہوتا۔ اگر ایسا ہو بھی جاتا تو یہ حکومت چند ہفتوں سے زیادہ دیر تک نہ چل سکتی اور پیپلزپارٹی جب چاہتی' آئی جے آئی کی حکومت کو تحریک عدم اعتماد کے ذریعے ختم کردیتی۔ بے نظیر بھٹو کو چونکہ پہلی مرتبہ ایوان کے اندر آنا تھا اس لئے اپوزیشن لیڈر کے طور پر ان کی سیاسی تربیت ہوتی اور اس کی وجہ سے انہیں حکومتی معاملات کو سمجھنے میں مدد ملتی۔ نواب زادہ نصراللہ خاں کے مطابق بے نظیر بھٹو اقتدار نہ ملنے پر مشتعل تھیں وہ چاہتی تھیں کہ کسی نہ کسی طرح وزیراعظم ہاؤس میں پہنچ جائیں۔ اس لئے انہوں نے میرے مشورے پر کان نہ دھرا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیس ماہ کے اندر ہی وہ اپنی حکومت ختم کروا بیٹھیں۔ نواب زادہ نصراللہ خاں کے مطابق بے نظیر بھٹو کی عادت ہے کہ وہ اپنے فیصلے پارٹی پر تھوپتی اور وہی کرتی ہیں جو ان کا دل چاہتا ہے اس لئے اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے غلطیاں کیں۔ سب سے پہلی غلطی بلوچستان اسمبلی کا توڑنا تھا۔

نواب زادہ نصراللہ خاں نے غلام اسحاق خان کے ساتھ ۱۹۸۸ء کے الیکشن کے بعد جو ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد صدر اسحاق کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار نہ رہے۔ پیپلزپارٹی نے صدارتی الیکشن میں نواب زادہ نصراللہ خاں کی بجائے غلام اسحاق خاں کی حمایت کی اور انہی کو ووٹ دیئے تھے۔ صدارتی انتخاب سے قبل بے نظیر بھٹو نے ایک دن نواب زادہ نصراللہ خاں سے قومی اسمبلی میں اپنے چیمبر میں ملاقات کی۔ جنرل نصیراللہ بابر اور اعتزاز احسن بھی اس موقع پر موجود تھے۔ بے نظیر بھٹو نے نواب زادہ نصراللہ خاں سے معذرت کی کہ پیپلزپارٹی ان کو ووٹ

دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ نواب زادہ نصراللہ خاں کے بقول بے نظیر نے کہا میں مجبور ہوں' جس پر میں نے کہا "کوئی بات نہیں میں تو مجبور نہیں ہوں۔ میں غلام اسحاق خاں کا مقابلہ ضرور کروں گا۔ غلام اسحاق خاں کو لڑے بغیر کامیاب نہیں ہونا چاہیے"۔ پیپلز پارٹی کی شریک چیئر پرسن کے اصرار کے باوجود نواب زادہ نصراللہ خاں نے غلام اسحاق خاں کے مقابلے میں ریٹائر ہونے سے انکار کر دیا اور ۱۲ر دسمبر کو ہونے والے صدارتی انتخاب میں ۳۴۸ ووٹوں کے مقابلے میں انہیں ۹۱ ووٹ ملے۔ غلام اسحاق خاں کی حمایت کر کے بے نظیر بھٹو نے جو غلطی کی تھی' وہ اس پر بعد ازاں نادم ہوئیں۔ نواب زادہ نصراللہ خاں نے کہا کہ بے نظیر بھٹو نے صدر غلام اسحاق خاں کی تمام شرائط مان لی تھیں جن میں ۸ ویں ترمیم کو برقرار رکھنا' صدارتی الیکشن میں غلام اسحاق خاں کی حمایت اور دفاعی (فوجی) معاملات میں پیپلز پارٹی کی حکومت کی عدم مداخلت کی یقین دہانی تھی۔

بابائے جمہوریت نواب زادہ نصراللہ خاں کو جب بے نظیر بھٹو نے صدارتی انتخابات میں اپنا امیدوار نامزد نہ کیا تو وہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور پیپلز پارٹی سے ناراض ہو گئے۔ تاہم انہوں نے قومی اسمبلی کے "فلور" سے اعلان کیا کہ ان کے دل میں اس کی کوئی رنجش نہیں ہے کہ پیپلز پارٹی نے ان کی حمایت نہیں کی۔ نواب زادہ نصراللہ نے اپنے ظرف کا مظاہر کرتے ہوئے بیان کی حد تک بات تو کر دی لیکن وہ بھٹو کی بیٹی اور سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے بدظن ہو گئے۔ جس کا عملی مظاہرہ انہوں نے متحدہ حزب اختلاف میں شمولیت کر کے کیا۔

نواب زادہ نصراللہ خاں کے مطابق ان کے پیپلز پارٹی کے ساتھ اختلافات بڑھتے گئے کیونکہ بے نظیر بھٹو نے جمہوری اداروں کو مذاق بنا کر رکھ دیا تھا۔ حکومت نے پیپلز ورکس پروگرام اور پلیسمنٹ بیورو کے ذریعے غلط روایات ڈالیں۔ پیپلز ورکس پروگرام کے فنڈز کا غلط استعمال ہوا اور پلیسمنٹ بیورو نے سفارشوں پر نااہل افراد کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنا شروع کر دیا۔

نواب زادہ نصراللہ خاں نے پیپلز پارٹی کی حکومت کی مخالفت اس کی برطرفی تک جاری رکھی۔ ۶ر اگست ۱۹۹۰ء کو جب غلام اسحاق خان نے اسمبلیوں کو توڑنے کا اعلان کیا تو بے نظیر بھٹو نے آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کے لئے پی ڈی اے کے نام سے ایک اتحاد بنا لیا مگر نواب زادہ نصراللہ حاں کو اس میں شامل نہ کیا گیا۔

نواب زادہ نصراللہ خاں ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں اپنے ہی دوستوں کی سازش کا شکار ہوئے اور سی او پی کے رہنماؤں کی بے وفائی کی وجہ سے وہ شکست کھا گئے جس کے بعد پی ڈی اے نے ضمنی انتخابات میں ان کی حمایت کی لیکن وہ اس کے باوجود دوبارہ منتخب نہ ہو سکے۔ نواب زادہ نصراللہ خاں کا مقابلہ غلام مصطفیٰ کھر نے کیا اور انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ بوڑھے سیاستدانوں کے ہاتھوں میں دم نہیں مگر وہ سیاست سے الگ ہونے پر تیار نہیں ہیں۔ ان کا اشارہ

نواب زادہ نصراللہ خاں کی طرف تھا۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں متحدہ حزب اختلاف کے رہنماؤں نے بھی نواب زادہ نصراللہ کے ساتھ بے وفائی کی جس کا نوابزادہ کو بہت رنج تھا لیکن تھوڑے عرصے بعد جب حکومت نے کھر کو رگڑا دیا تو انہوں نے اپنے پرانے ساتھیوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور اس کے بعد غلام مصطفیٰ کھر نے رفتہ رفتہ نواب زادہ کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے شروع کر دیئے۔ جب کہ غلام مصطفیٰ جتوئی نے بھی اپنی غلطیاں معاف کروانے کے لئے نواب زادہ کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا۔ انہی دنوں عراق نے کویت پر حملہ کر دیا تھا جس کے بعد امریکہ نے عراق پر کئی ملکوں کی مشترکہ فوج کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ نواب زادہ نصراللہ خان نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آل پارٹیز کانفرنس طلب کر لی۔ جس میں اپوزیشن کی تقریباً تمام جماعتوں نے شرکت کی۔ عراق کے خلاف امریکی جارحیت کی مذمت کے لئے تمام مذہبی جماعتوں نے مظاہروں کا سلسلہ اگست ۱۹۹۰ء میں ہی شروع کر دیا تھا۔ نواب زادہ نے اس صورت حال پر غور کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۹۰ء میں آل پارٹیز کانفرنس طلب کر لی جس میں پی ڈی اے کے علاوہ دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے بھی شرکت کی۔ یہ ایک کامیاب ترین کانفرنس تھی جس میں اپوزیشن نے کھل کر حکومتی پالیسی کی مخالفت کی اور عراقی صدر صدام حسین کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ستمبر ۱۹۹۰ء میں ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس نے پی ڈی اے اور نوابزادہ نصراللہ خاں کے درمیان اختلافات ختم کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

کچھ عرصہ بعد دوسری آل پارٹیز کانفرنس طلب کر کے نوابزادہ نے اپریل ۱۹۹۱ء میں حکومت کے لئے پریشانی پیدا کی۔ کیونکہ کانفرنس میں شریک پچیس سے زائد سیاسی جماعتوں اور تجربہ کار سیاستدانوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت کے خلاف جدوجہد کا اعلان کر دیا۔ آئی جے آئی کے آغا مرتضیٰ پویا اور غلام مصطفیٰ جتوئی نے بھی نواب زادہ نصراللہ خاں کے ساتھ تعاون کرنے کا اعلان کیا۔ جس کے بعد آل پارٹیز کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ملک میں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نواب زادہ کی طلب کردہ تیسری آل پارٹیز کانفرنس کے دوران اپوزیشن نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں حکومت کے ساتھ تعاون نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ پر نواب اکبر بگتی خصوصی طور پر خوش ہوئے کیونکہ ان کا مسلسل یہ مطالبہ تھا کہ پی ڈی اے اپنے ارکان اسمبلی کو بلوچستان کابینہ سے الگ کر لے۔ اس فیصلہ پر ایک سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود عمل نہ ہو سکا جس کی وجہ سے نواب اکبر بگتی نے خود کو آل پارٹیز کانفرنس سے الگ کر لیا۔ ان کا اصرار تھا کہ آل پارٹیز کانفرنس پہلے اپنے پرانے فیصلوں پر عمل درآمد کرائے یعنی پی ڈی اے بلوچستان حکومت سے الگ ہو جائے۔ آل پارٹیز کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اپوزیشن نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں سے مستعفی ہونے کا اعلان بھی کیا۔ مگر اس فیصلہ پر چھ ماہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود

عمل نہ ہو سکا جس کی وجہ آل پارٹیز کانفرنس کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی۔ نواب زادہ نصراللہ خاں نے جب دیکھا کہ پی ڈی اے کی وجہ سے اے پی سی بدنام ہو رہی ہے۔ تو انہوں نے بے نظیر بھٹو کو کہہ دیا کہ وہ آل پارٹیز کانفرنس کو توڑ رہے ہیں۔ نواب زادہ نے ملک حاکمین کے ذریعے بے نظیر بھٹو کو پیغام بھیجا کہ اگر اسلامی جمہوری اتحاد ٹوٹ سکتا ہے تو آل پارٹیز کانفرنس بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ نواب زادہ نصراللہ خاں کو بے نظیر بھٹو پر غصہ اس لئے تھا کہ انہوں نے عین وقت پر آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت سے معذوری ظاہر کر دی تھی لیکن بعد ازاں بے نظیر نے آل پارٹیز کانفرنس میں رسمی طور پر شمولیت اختیار کی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے نواب زادہ نے سنجیدگی سے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک الگ اتحاد کے قیام کی کوششیں شروع کر دیں۔ بے نظیر بھٹو کو جب علم ہوا کہ نوابزادہ نصراللہ خاں ایک نیا سیاسی اتحاد قائم کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور نواب زادہ نصراللہ خاں کو پیغام بھیجا کہ وہ نئے اتحاد کی بجائے آل پارٹیز کانفرنس کا پلیٹ فارم استعمال کرتے رہیں تو پھر پی ڈی اے ان کا ساتھ دے گا۔ ایک طرف تو بے نظیر بھٹو نے نواب زادہ نصراللہ خاں کو اتحاد نہ بنانے کا مشورہ دیا' دوسری طرف پی ڈی اے کے سربراہی اجلاس نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ کوئی بھی احتجاجی تحریک آل پارٹیز کانفرنس کے پلیٹ فارم سے شروع نہیں کی جائے گی بلکہ پی ڈی اے اپنے پلیٹ فارم سے احتجاجی جلسے کرے گا۔

اسی دوران پی ڈی اے نے ۱۴ر اگست ۱۹۹۲ء کو بھی لاہور میں احتجاجی جلسہ کرنے کا اعلان کیا اور بے نظیر بھٹو نے نواب زادہ نصراللہ خاں کو پیغام بھجوایا کہ وہ پی ڈی اے کے جلسے میں شامل ہوں لیکن نواب زادہ نے اپنی مصروفیات کا بہانہ کر کے معذرت کر دی۔ جس پر بے نظیر بھٹو کو قدرے پریشانی ہوئی اور انہوں نے کہا کہ وہ ۱۴ر اگست کو لاہور میں ہونے والے اے پی سی کے احتجاجی جلسہ میں شرکت کریں گی۔ یوں بے نظیر بھٹو نے نواب زادہ نصراللہ خاں کی ناراضگی سے بچنے کے لئے اپنے جلسے کو آل پارٹیز کانفرنس کے کھاتے میں ڈال دیا۔

۱۴ر اگست ۱۹۹۲ء کی شام آل پارٹیز کانفرنس کا ناصر باغ کے سامنے تاریخی جلسہ ہوا جس میں آغا مرتضیٰ پویا' نوید ملک' غلام مصطفیٰ کھر' جہانگیر بدر' مہناز رفیع' اصغر خاں' نواب زادہ نصراللہ خاں اور بے نظیر بھٹو نے بھی شرکت کی۔ اس جلسے کو ناصر باغ میں ہونے والے جلسوں میں سے سب سے کامیاب جلسہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے خلاف توقع جلسہ عام میں اپنی تقریر سے عوام کو مایوس کیا جو توقع کر رہے تھے کہ وہ اسمبلیوں سے مستعفی ہونے کا اعلان کریں گی۔

۱۴ر اگست ۱۹۹۲ء کے جلسہ کے بعد آل پارٹیز کانفرنس اور پی ڈی اے کے درمیان اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ کیونکہ بے نظیر بھٹو نے اپنے وعدے کے مطابق نہ تو اسمبلیوں سے استعفیٰ دیا اور نہ ہی بلوچستان حکومت سے خود کو الگ کیا۔ پی ڈی اے کی پالیسی کے تضاد نے اے پی سی کو غیر موثر کر دیا۔ تحریک استقلال کے سربراہ اصغر خاں نے ہمیشہ کوشش کی کہ کوئی

بھی آل پارٹیز کانفرنس کامیاب نہ ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے بے نظیر بھٹو پر بھی دباؤ ڈالا اور ان سے کہا کہ ہمیں اے پی سی کی بجائے پی ڈی اے کا پلیٹ فارم استعمال کرنا چاہیے۔ اصغر خاں کی فرمائش پر بے نظیر بھٹو نے فیصلہ کیا کہ پی ڈی اے آئندہ الیکشن میں اے پی سی کے ساتھ انتخابی اتحاد نہیں بنائے گا بلکہ پی ڈی اے اپنے ہی پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لے گا۔ یوں پی ڈی اے اور اے پی سی کے درمیان منزل پر پہنچنے سے قبل ہی اختلافات پیدا ہو گئے اور نواب زادہ نصراللہ خاں نے آل پارٹیز کانفرنس کی جگہ ایک الگ سیاسی اتحاد قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شروع میں جن چند ایک سیاستدانوں نے نواب زادہ کو اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا، ان میں نواب اکبر بگتی اور غلام مصطفیٰ جتوئی شامل تھے۔ اس سے حوصلہ پا کر نوابزادہ نصراللہ خاں نے دوسری جماعتوں کے ساتھ رابطے شروع کر دیئے اور اپریل ۱۹۹۲ء کو کراچی میں ہونے والے ایک اجلاس کے دوران وہ این ڈی اے قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جمہوری وطن پارٹی، نیشنل پیپلز پارٹی، عوامی جمہوری پارٹی، این پی پی (کھر گروپ)، پی این پی، مولانا کوثر نیازی، مزدور کسان پارٹی اور راؤ عبدالرشید نے انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ این ڈی اے کے رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ ۱۷ اور ۱۸ ستمبر کو لاہور میں ایک کنونشن بلا کر این ڈی اے کے قیام کا اعلان کر دیا جائے گا۔ لیکن پورے ملک میں شدید سیلابوں کے باعث این ڈی اے کا کنونشن منسوخ کر دیا گیا اور دوبارہ یہ کنونشن یکم اور ۲ نومبر ۱۹۹۲ء کو آواری ہوٹل لاہور میں منعقد ہوا جس میں ۵۰۰ مندوبین نے شرکت کی۔ نواب زادہ نصراللہ خاں نے تمام سیاسی جماعتوں کو دعوت دی تھی کہ وہ بحیثیت مبصر این ڈی اے کے کنونشن میں شرکت کریں لیکن کنونشن کے انعقاد سے دو دن قبل بے نظیر بھٹو نے فیصلہ کیا کہ پی ڈی اے کا کوئی رہنما کنونشن میں بحیثیت مبصر بھی شرکت نہیں کرے گا۔ پی ڈی اے کے جنرل سیکرٹری خورشید قصوری اس سے قبل نواب زادہ نصراللہ خاں کو یقین دلا چکے تھے کہ وہ کنونشن میں شرکت کریں گے۔ بعد ازاں انہوں نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر کنونشن میں آنے سے انکار کر دیا اور یوں بے نظیر نے این ڈی اے کی لیڈر شپ کو اس کے قیام کے شروع ہی میں یہ سگنل دے دیا کہ وہ اس کے قیام سے خوش نہیں ہیں۔ اس کے باوجود این ڈی اے کا کنونشن انتہائی کامیاب رہا۔ کنونشن میں نواب زادہ نصراللہ خاں کو چیئرمین منتخب کیا گیا۔ جب کہ ۲۷ نومبر کو کراچی میں منعقدہ ایک اجلاس میں عبدالحفیظ پیرزادہ جنرل سیکرٹری چن لئے گئے۔ یکم نومبر کو این ڈی اے کے اجلاس میں الائنس کے منشور پر شق وار بحث ہوئی اور منشور اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا جس میں ۸ ویں ترمیم کے خاتمہ کی تجویز بھی شامل کر لی۔ ایسا کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ چند سیاسی حلقوں کی طرف سے مسلسل یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ این ڈی اے حقیقت میں صدر غلام اسحاق خاں کی بی ٹیم ہے۔ ۸ ویں ترمیم کے خاتمہ کی بات کر کے این ڈی اے نے یہ ثابت کیا کہ وہ صدر کے حامی نہیں ہیں۔ تاہم کنونشن کے دوران سپریم

اسمبلی سے۔ رکن غلام مصطفیٰ جتوئی، معراج محمد خاں، غلام مصطفیٰ کھر اور عبدالحفیظ پیرزادہ نے نہایت ہوشیاری سے صدر کا دفاع کیا۔ انہوں نے کہا کہ صدر کو ہٹانے کا آئین میں ایک طریقہ موجود ہے۔ اپوزیشن غلام اسحاق خاں کو ہٹانے کی پوزیشن میں نہیں ہے کیونکہ اسے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل نہیں جب کہ صدر جسمانی اور ذہنی طور پر بھی کمزور نہیں ہیں کہ انہیں رخصت کیا جائے۔ اب صدر کو ہٹانے کا واحد راستہ مارشل لاء ہے جو ہمیں منظور نہیں۔ چنانچہ این ڈی اے نے اعلان کیا کہ وہ اپنی احتجاجی تحریک کے دوران وزیراعظم میاں نواز شریف کو تنقید کا نشانہ بنائیں گے اور صدر غلام اسحاق خاں سے مسلسل مطالبہ کرتے رہیں گے کہ وہ موجودہ اسمبلیوں کو ختم کرکے قومی حکومت قائم کریں جو آزادانہ اور منصفانہ ماحول میں نئے انتخابات کرائے۔ (۶)

۱۹۹۳ء میں این ڈی اے اور پی ڈی اے نے نواز شریف حکومت کے خلاف اپنی تحریک نقطہ عروج پر پہنچا دی۔ ادھر نواز شریف کے بعض انتہاپسند اقدامات کی وجہ سے مسلم لیگ کا بھی ایک گروپ جو جونیجو گروپ کہلانے لگا تھا مسلم لیگ سے الگ ہو کر این ڈی اے اور پی ڈی اے کے ساتھ مل کر صدر غلام اسحاق پر یہ پریشر ڈالنے لگا کہ وہ نواز شریف حکومت کو برطرف کر دیں۔

۱۸ر اپریل ۱۹۹۳ء کو غلام اسحاق خان نے نواز شریف کو برطرف کر دیا۔ تاہم قومی اسمبلی کے اسپیکر گوہر ایوب خان نے صدر کے اس اقدام کو عدالت عالیہ میں چیلنج کر دیا۔ عدالت عالیہ نے ۳۸ دن بعد نواز شریف حکومت بحال کر دی۔ مگر صدر اور وزیراعظم کے تعلقات کی سرد مہری میں کوئی کمی نہ آئی اور بالاخر ۱۸ر جولائی ۱۹۹۳ء کو صدر اور وزیراعظم دونوں ہی کو رخصت ہونا پڑ گیا۔

شروع شروع میں نوابزادہ نصراللہ خان کو امید تھی کہ نواز شریف کی رخصتی کے بعد جو قومی حکومت تشکیل دی جائے گی وہ اس میں نگران وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور نوابزادہ صاحب کی بجائے امریکہ سے درامد کردہ معین قریشی کو نگران وزیراعظم بنا دیا گیا۔ جس پر نوابزادہ صاحب بڑے دلبرداشتہ ہوئے (۷)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں نوابزادہ نصراللہ خان نے این اے ۱۳۶ مظفر گڑھ ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (ج) نے ان کے مقابلے میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا۔ جبکہ پاکستان مسلم لیگ (ن) نے ان کے مقابلے کے لیے میاں عطا محمد قریشی کو ٹکٹ دیا تھا۔ یہ معرکہ نوابزادہ صاحب نے بڑی آسانی سے سر کر لیا اور اپنے حریف کو تقریباً ساڑھے چودہ ہزار ووٹوں سے ہرا دیا۔ (۸)

بے نظیر کے اس دوسرے دور حکومت میں وہ کشمیر کمیٹی کے چیئرمین کے منصب پر فائز ہوئے۔

یہ ان کی سیاسی زندگی کا واحد موقع تھا جب انہوں نے کوئی حکومتی منصب قبول کیا تھا۔ (۹)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر این اے ۱۳۶ مظفر گڑھ ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ وہ کامیاب نہ ہو سکے اور ایک سخت مقابلے کے بعد پاکستان مسلم لیگ (ن) کے میاں عطا محمد قریشی کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۱۰)

۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جب جنرل پرویز مشرف نے ملک میں چوتھی مرتبہ فوجی حکومت قائم کی تو نوابزادہ نصراللہ خان اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اس کی مخالفت کرنے سے باز نہ آسکے۔ اس مرتبہ انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے درمیان اتحاد قائم کروایا جس کا نام ''الائنس فار دی ریسٹوریشن آف ڈیموکریسی'' (اے آر ڈی) رکھا گیا۔ (۱۱)

نوابزادہ نصراللہ خان، ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے تاہم انہوں نے اپنی نشست پر، جواب این اے ۱۷۸ مظفر گڑھ ۳ ہو چکی تھی اپنے بھتیجے نوابزادہ سلطان احمد خان کو کھڑا کیا۔ اس نشست پر پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) نے کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا تاہم اس کے باوجود سلطان احمد خان، پاکستان مسلم لیگ (ق) کے محمد شاہد جمیل قریشی سے تقریباً ساڑھے تین ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۲)

نوابزادہ نصراللہ خان ایک طویل سیاسی کیریئر کے بعد ۲۷؍ستمبر ۲۰۰۳ء کو اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ (۱۳)

نوابزادہ نصراللہ خان کے صاحبزادے نوابزادہ منصور احمد خاں بھی ۱۹۸۸ء سے عملی سیاست کے میدان میں ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء تینوں انتخاب میں پی پی ۲۱۰ مظفر گڑھ ۴ سے انتخاب لڑا اور تینوں انتخاب میں کامیاب ہو کر کامیابی کی ہیٹ ٹرک مکمل کی۔ ۱۹۹۳ء میں وہ میاں منظور احمد وٹو کی کابینہ میں بورڈ آف ریونیو کے وزیر مقرر کئے گئے۔ (۱۴)

وہ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں بھی اپنی نشست برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں جب وہ گریجویشن کی شرط عائد ہونے کی وجہ سے حصہ نہ لے سکے تو انہوں نے اپنی نشست پر اپنی صاحبزادی سنیعہ منصور کو کھڑا کر دیا۔ سنیعہ منصور نے اس نشست پر بھرپور مقابلہ کیا۔ انہیں پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس کے باوجود وہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے امتیاز علیم قریشی سے تقریباً سوا دو ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئیں۔ (۱۵)

حوالہ جات

۱۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیفس اینڈ فیمیلز آف نوٹ دی پنجاب۔ لاہور۔ ایڈیشن ۱۹۴۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۴۰۱، ۴۰۲

۲۔ ممتاز اقبال ملک۔ نوابزادہ نصراللہ خان کی آپ بیتی۔ کراچی۔ ص ۷

۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ ص ۲۹۴

۴۔ طارق اسمٰعیل۔ سیاسی اتحاد ہمیں کہاں لے جائیں گے۔ ہفت روزہ تصویر پاکستان لاہور۔ ۲ نومبر ۱۹۹۲ء۔ ص ۸

۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۲۹۴، ۲۹۵

۶۔ منیر احمد۔ پاکستان کے سیاسی اتحاد۔ لاہور۔ ص ۱۵۳ تا ۱۸۰

۷۔ منیر احمد۔ جرنیل شاہی۔ لاہور۔ ص ۱۷۷، ۱۷۸

۸۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۲۹۴

۹۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۴۴۱

۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۱۰۲

۱۱۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۴۴۱

۱۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۶۳

۱۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۸/ستمبر ۲۰۰۳ء

۱۴۔ امان اللہ خان (مرتب) ڈائریکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۳ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۸، ۳۲۷

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۲۰۵

پراچہ

۱۹۸۸ء کے انتخابات سے پہلے کی بات ہے۔ پنجاب کی نگران کابینہ کے وزیر ٹرانسپورٹ اور ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے وجود میں آنے والی سینٹ کے ایک رکن اپنی فلیگ کار میں ۷۰ کلفٹن میں داخل ہوئے اور جب واپس آئے تو ان کی کار سے فلیگ اتر چکا تھا اور وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت کو تسلیم کر چکے تھے۔ یہ محترم احسان الحق پراچہ تھے۔ (۱) جو اس سے پہلے بھی اپنی سیاسی وا بستگیاں تبدیل کرنے کا خاصا "اچھا" ریکارڈ رکھتے تھے۔

مگر اس سے پہلے کہ احسان الحق پراچہ کا تذکرہ کیا جائے، مناسب ہو گا کہ پہلے ان کا خاندانی پس منظر بیان کر دیا جائے۔ اس حوالے سے پراچہ قبیلے کے ممتاز مورخ حاجی فیض بخش پراچہ رینال اپنی کتاب "تذکرہ پراچہ قبیلہ" میں لکھتے ہیں۔

"پراچہ برادری اور تجارت لازم و ملزوم ہیں۔ عرصہ دراز سے پراچہ برادری عموی طور پر تاجر اور خصوصی طور پر کپڑے کے تاجر کے لحاظ سے معروف چلی آرہی ہے زمانہ قدیم میں تجارت کے بڑے مراکز وہ بستیاں ہیں جو دریاؤں کے کنارے آباد تھیں اور جہاں ذرائع نقل و حمل کی فراہمی کی بناء پر کاروباری منڈیاں خوب جمتی تھیں اس لئے پراچہ برادری بھی عموماً ایسی ہی بستیوں میں آباد رہی ہے۔ مثلاً کوہاٹ، کھڈ، بھیرہ، شاہ پور، خوشاب، کالا باغ، نوشہرہ، اٹک، لاہور، دہلی، فرخ آباد، آگرہ وغیرہ۔ پھر رفتہ رفتہ انہی علاقوں سے پراچہ قبیلہ کے افراد مختلف کاروباری مراکز کی طرف منتقل ہو گئے۔

پراچہ قوم کے جد اعلیٰ حضرت عزیز یمنیؓ تھے جو رسول مقبول علیہ و آلہ وسلم کے صحابی اور خدمتگار تھے۔ چونکہ ان کے ذمہ فرش و نشست کا اہتمام تھا اس لئے وہ فراش کہلائے۔ یہ لقب ان کے خاندان بلکہ قبیلہ میں بھی معروف ہوا۔ ان کے بیٹے ابوالعاصؓ لشکر اسلام کے یمنی دستہ کے نگران مقرر ہوئے۔ خلافت فاروقیؓ کے دوران جب فتح ایران کے لئے لشکر روانہ ہوا تو حضرت ابوالعاصؓ بھی اس لشکر اسلام میں شامل تھے۔ بعد میں وہ ایران میں ہی آباد ہو گئے اور

یہیں شادی کرلی ایران میں ہی ان کا لقب فراشہ سے پراچہ تبدیل ہوا۔

خلافت فاروقیؓ کی ابتدا میں ۱۵ ہجری یا اس کے بعد حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ نے بحرین کی امارت و ولایت کے بعد اپنے بھائی حضرت حکم بن ابی العاص ثقفیؓ کو تھانہ اور بروچ کی مہم پر اور دوسرے بھائی مغیرہ بن ابی العاص کو دیبل پر بھیجا۔ اس سے ہندوستان میں مسلمان لشکر کی آمد کے ساتھ ابوالعاصؓ کے صاحبزادوں کا تذکرہ موجود ہے۔ ابوالعاص ثقفیؓ کی اولاد کے بارے میں امام ابن حزم نے جمہرہ انساب العرب میں لکھا ہے۔ "ابوالعاص ثقفی کی اولاد میں حضرت عثمان خیار صحابہ میں سے تھے۔ انہوں نے ایران اور ہندوستان کے تین شہروں میں جہاد کیا۔ عثمان بن ابوالعاصؓ کے ساتھ ان کے اہل خاندان اور قبیلے کے تاجر ہندوستان میں آباد ہو گئے جیساکہ مسعودی نے لکھا ہے۔ "یہاں تقریباً دس ہزار عرب آباد ہیں جن میں بڑے بڑے مسلمان تاجروں کی ایک برادری ہے۔" ابوزید سیرافی نے لکھا ہے "ہندوستان میں آباد ہو جانے والے مسلم تاجر عرب وغیرہ جایا کرتے تھے۔ یہاں کے مسلمان تاجروں کی بیرونی تجارت عام تھی۔"

کابل کی فتح کے دوران میں بھی ایک سردار امیر مہلب فراشہ مشہور ہوئے۔ انہوں نے اپنا لشکر اطراف کابل میں پھیلا دیا تاکہ اطراف کابل میں جو کافر سیاہ پوش یعنی لشکر ابوجہل مشہور ہے اس کا مقابلہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اطراف کابل میں کوہستان شمال کا جو بڑا بھاری درہ تھا اب تک درہ پراچہ کے نام سے مشہور ہے امیر مہلب فراشہ نے لشکر کا کچھ حصہ اپنے ہمراہ دریائے اٹک کے کنارے ڈھنگوٹ کے مقام پر آباد کیا۔ تاکہ راجگان ہند سے کافر سیاہ پوش کو امداد نہ پہنچے۔ ڈھنگوٹ جو دریائے اٹک کے کنارے ضلع بنوں میں کالا باغ کے نزدیک ایک مقام ہے' وہاں قوم پراچگان مغلیہ دور تک خود حکمران رہی۔ جب ہمایوں شیر شاہ سوری کے مقابلے میں دہلی سے بھاگا' تب ڈھنگوٹ بھی پہنچا اور مدد چاہی۔ پراچگان نے انکار کر دیا کہ دونوں طرف مسلمان ہیں۔ بعد میں جب ہمایوں تخت نشین ہوا تو اس نے پراچگان کو ڈھنگوٹ سے مختلف مقامات ہندوستان کی طرف جلاوطن کر دیا۔

یہ پراچہ حضرات قالین اور کپڑا فروخت کرنے کا کاروبار کرتے تھے۔ قالین کی نسبت سے فراش اور کپڑے کی نسبت سے پراچہ کہلائے بعد میں دونوں الفاظ تلفظ کی تبدیلی کے بعد ایک ہی بن گئے اور پراچہ کا لفظ وجود میں آیا۔ بعد میں یہ لفظ مسلم تاجر اور بالخصوص پارچہ فروش کے لئے ایسا مخصوص ہوا کہ برادری کی بجائے پیشہ کا نام بن گیا۔ فراش عربی میں قالین بچھانے والے کو کہتے ہیں۔ اسی نسبت سے بغداد کے نواح میں ایک گاؤں کا نام بھی فراشہ ہے۔(۲)

سرگودھا میں آباد پراچہ خاندان کا جو فرد سب سے پہلے افق سیاست پر نمودار ہوا وہ شیخ فضل

حق پراچہ تھے۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ انہوں نے اپنی سیاست کا آغاز مسلم لیگ سے کیا اور قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلسل مرکزی مجلس قانون کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ انہیں انگریزوں نے نہ صرف جاگیر سے بلکہ خان اور خان بہادر کے خطابات سے بھی نوازا تھا مگر جب قائداعظم نے مسلمانوں کو انگریزوں کے عطاکردہ خطابات واپس کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور فوراً اپنے تمام خطابات سے دستبردار ہو گئے (۳)

قیام پاکستان کے بعد شیخ فضل حق پراچہ کے بڑے بھائی شیخ فضل الٰہی پراچہ نے عملی سیاست میں قدم رکھا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ الٰہ آباد یونیورسٹی کے بھی فارغ التحصیل تھے اور متحدہ ہندوستان اور پھر پاکستان میں متعدد انتظامی عہدوں پر فائز رہے تھے۔ ۱۹۵۱ء کے لگ بھگ جب وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ اسی برس وہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور پہلے ممتاز محمد خان دولتانہ اور پھر عبدالحمید دستی کی وزارتوں میں شامل رہے (۴)

شیخ فضل الٰہی پراچہ کے بھتیجے اور شیخ فضل حق پراچہ کے بیٹے شیخ احسان الحق پراچہ ۱۹۷۰ء میں کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ مگر حنیف رامے کے دور وزارت اعلیٰ میں جب سینٹ کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو پنجاب اسمبلی میں کونسل مسلم لیگ اور دیگر اپوزیشن پارٹیوں کے بہت سے ارکان پیپلز پارٹی میں چلے گئے اس موقع پر شیخ احسان الحق پراچہ نے بھی کونسل مسلم لیگ کو خیرباد کہا اور پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس اقدام کے صلے میں شیخ احسان الحق پراچہ کے چچا شیخ فضل الٰہی پراچہ کو سینٹ کا رکن بنا دیا گیا۔ (۵)

۱۹۷۷ء کے عام انتخاب میں شیخ احسان الحق پراچہ نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہونے کے بعد کچھ عرصہ صوبائی کابینہ کے رکن رہے۔ (۶)

۱۹۸۱ء میں شیخ احسان الحق پراچہ کے چھوٹے بھائی شیخ انوار الحق کو مجلس شوریٰ کا رکن بنا لیا گیا۔

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں احسان الحق پراچہ نے خود تو حصہ نہیں لیا البتہ ان کے چھوٹے بھائی شیخ انوار الحق پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ اب احسان الحق پراچہ کو ٹرین مس ہونے کا احساس ہوا چنانچہ انہوں نے ٹیکنوکریٹس کی نشستوں پر سینٹ کا انتخاب لڑا۔ تاہم وہ سینیٹر منتخب ہونے کے باوجود مسلم لیگ میں شامل نہ ہوئے۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کے اقدام کے بعد جب مرکز اور صوبوں میں نگراں حکومتیں قائم ہوئیں تو وہ پنجاب کی نگراں حکومت میں ٹرانسپورٹ کے وزیر بنا دیئے گئے۔ اگرچہ ان کا پیپلز پارٹی کی قیادت سے جوڑ توڑ کا سلسلہ جاری رہا

اور بالآخر وہ پیپلز پارٹی میں چلے گئے جس کا تذکرہ ہم شروع میں رقم کر چکے ہیں۔ (۷)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں شیخ احسان الحق پراچہ اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ انوار الحق پراچہ، دونوں نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ شیخ احسان الحق پراچہ تو یہ انتخاب جیت گئے مگر شیخ انوار الحق پراچہ کامیاب نہ ہو سکے۔ بعد ازاں شیخ احسان الحق پراچہ بے نظیر کے دور حکومت میں وزیر خزانہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔

اسی دوران شیخ احسان الحق پراچہ پر بدعنوانیوں کے کئی الزامات لگے۔ فروری ۱۹۸۹ء میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے متعدد کواپریٹو سوسائٹیوں کے خلاف تحقیقات کرکے انہیں شوکاز نوٹس جاری کئے تو ان کواپریٹو سوسائٹیوں میں شیخ احسان الحق پراچہ کی مرکنٹائل کواپریٹو سوسائٹی بھی شامل تھی چنانچہ شیخ احسان الحق پراچہ نے اسٹیٹ بنک کو ہدایت جاری کی کہ ان کی منظوری کے بغیر کسی کواپریٹو کارپوریشن کو کوئی نوٹس جاری کیا جائے۔ اس پر بعض اخبارات نے ان کے لئے "دودھ کی رکھوالی کے لیے بلا" کی پھبتی بھی کسی۔ (۹)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں بھی شیخ احسان الحق پراچہ اور انوار الحق پراچہ نے پی ڈی اے کے ٹکٹ پر ہی انتخاب لڑا اور دونوں بھائی ایک مرتبہ پھر علی الترتیب قومی اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۰)

اپریل ۱۹۹۳ء میں میر بلخ شیر مزاری کی نگراں کابینہ میں شیخ احسان الحق پراچہ کو وزیر تجارت کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ وہ اس احتساب کمیٹی کے بھی رکن بنائے گئے۔ جس کے سربراہ زاہد سرفراز تھے اور جس کے ذمہ نواز شریف اور حکومت کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنا تھا۔ (۱۱)

اکتوبر ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں شیخ احسان الحق پراچہ اور انوار الحق پراچہ نے ایک مرتبہ پھر پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر علی الترتیب قومی اور صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور شیخ احسان الحق پراچہ کو غلام حسین چیمہ نے اور انوار الحق پراچہ کو ڈاکٹر اعجاز احمد ملک برتھ نے ہرا دیا۔ (۱۲)

احسان الحق پراچہ ۱۹۹۴ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے ہیں (۱۳)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں احسان الحق پراچہ کے چھوٹے بھائی انعام الحق پراچہ نے این اے ۴۷ سرگودھا ا سے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا مگر وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے عدنان حیات نون سے تقریباً ۱۶ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۱۴)۔ ۲۰۰۲ء میں انہوں نے اپنی نشست پر (جواب این اے ۶۴ سرگودھا ا ہو گئی تھی) پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر دوبارہ انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کا مقابلہ پاکستان مسلم لیگ (ن) میجر (ر) پیرزادہ محمد ابراہیم شاہ اور پاکستان مسلم لیگ (ق) کے چودھری محمد علی سے تھا۔ یہ معرکہ انعام الحق پراچہ نے ۶۹۸۱۵ ووٹ لے کر سر کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے دونوں حریفوں پیرزادہ محمد ابراہیم شاہ اور چودھری محمد علی کے

حاصل کردہ ووٹوں کا مجموعہ، ان کے حاصل کردہ ووٹوں سے ۱۶ ہزار سے بھی زیادہ تھا۔ (۱۵) ۲۰۰۵ء کے بلدیاتی انتخابات سے قبل انعام الحق پراچہ نے پاکستان پیپلز پارٹی چھوڑ کر پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کر لی۔ انہوں نے سرگودھا کے ضلعی ناظم کا انتخاب لڑا اور متحدہ مجلس عمل کے ملک محمود حسین اعوان کو شکست دے کر یہ عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۶)

۲۰۰۳ء کے عام انتخابات میں احسان الحق پراچہ کے صاحبزادے ہارون احسان پراچہ نے پی پی ۲۸ سرگودھا ا سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے امیدوار تھے مگر وہ ایک بے حد سخت مقابلے کے بعد پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ڈاکٹر مختار احمد بھرتھ سے صرف ۴۲۵ ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۷)

پراچہ خاندان ہی کے ایک فرد سیف اللہ خان پراچہ ہیں جو ایک طویل عرصہ سے میدان سیاست میں فعال ہیں تاہم ان کا صوبہ نیابت ہمیشہ سے بلوچستان رہا ہے۔

سیف اللہ خان پراچہ پیشے کے اعتبار سے مکینیکل اور مائننگ انجینئر ہیں اور بلوچستان میں کان کنی کے ایک بڑے ادارے کے مالک ہیں۔

سیف اللہ خان پراچہ سیاست کے میدان میں ۱۹۵۹ء میں وارد ہوئے جب وہ میونسپل کارپوریشن کوئٹہ کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی اور ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۵ء میں بلوچستان اسمبلی کے رکن بنے۔ (۱۸)

۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۷ء تک وہ صوبہ بلوچستان کی کابینہ میں شامل رہے۔ جہاں ان کے پاس صنعت، کامرس، لوکل گورنمنٹ، پارلیمانی امور قانون، تعمیراتی شعبہ اور مواصلات کے قلمدان رہے۔ (۱۹) ۱۹۸۸ء میں وہ ایک مرتبہ پھر صوبائی وزیر بنائے گئے۔

اپریل ۱۹۷۷ء میں وہ پہلی مرتبہ اور مارچ ۱۹۹۴ء میں دوسری مرتبہ سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے۔ (۲۰)

۲۰۰۲ء میں جناب سیف اللہ پراچہ نے این اے ۲۵۹ کوئٹہ ا سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ انہیں پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کی حمایت حاصل تھی۔ تاہم اس انتخاب میں وہ بمشکل پانچویں پوزیشن حاصل کر سکے۔ (۲۱) بعد ازاں انہوں نے سینٹ کی رکنیت حاصل کرنے کی بھی کوشش کی مگر وہ اپنی اس کوشش میں بھی ناکام رہے۔ (۲۲)

جناب سیف اللہ پراچہ کے والد جناب حافظ محمد حبیب اللہ پراچہ تھے وہ بھی ایک عرصہ تک سیاست میں خاصے فعال رہے، وہ بلدیہ کراچی کے وائس چیئرمین اور میئر بھی رہے تھے پھر کچھ عرصہ انہوں نے مغربی پاکستان اسمبلی میں اور کچھ عرصہ ملائیشیا میں سفیر کی حیثیت سے گزارا۔ (۲۳) ۸ر جون ۱۹۸۸ء کو انہوں نے امریکا میں وفات پائی اور کراچی میں آسودۂ خاک ہوئے (۲۴)

حوالہ جات

۱۔ طارق اسمٰعیل۔ سیاست کے صنم کدے میں برادریوں کے بت۔ نوائے وقت میگزین۔ (روزنامہ نوائے وقت) لاہور۔ ۱۱؍نومبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳

۲۔ فیض بخش پراچہ۔ تذکرہ پراچہ قبیلہ۔ فیصل آباد۔ ص ۸۶ تا ۸۸

۳۔ ایضاً۔ ص ۲۶۱ تا ۲۶۵

۴۔ ایضاً۔ ص ۲۲۳ تا ۲۲۵

۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۱۸، ۱۱۹

۶۔ ایضاً۔ ص ۱۱۸

۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۸۵، ۸۶

۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۹

۹۔ خالد سیال۔ احتساب کمیٹی یا انتقال کمیٹی۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۲۰؍مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۷

۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز۔ جلد دوم ص۔ ۳۰، ۱۷۵

۱۱۔ محمود غزنوی، قبضہ گروپ کی کابینہ۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۲۰؍مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۱۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴؍اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۲۳ء، ۱۷؍اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۶۶۔

۱۳۔ سینٹ آف پاکستان کے ارکان کے سوانحی خاکے (غیر مطبوعہ) فراہم کردہ ڈائریکٹریٹ آف پبلک ریلیشنز۔ سینٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔

۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز۔ رپورٹ۔ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۴۴

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء (جلد دوم) اسلام آباد۔ ص ۲۹

۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ویب سائٹ www.ecp.gov.pk.

۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد دوم اسلام آباد۔ ص ۱۲۷

۱۸۔ سینٹ آف پاکستان کے ارکان کے سوانحی خاکے (غیر مطبوعہ) فراہم کردہ ڈائریکٹریٹ آف پبلک ریلیشنز سینٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد

۱۹۔ فیض بخش پراچہ۔ تذکرہ پراچہ قبیلہ۔ فیصل آباد۔ ص ۲۳۸

۲۰۔ سینٹ آف پاکستان کے ارکان کے سوانحی خاکے (غیر مطبوعہ) فراہم کردہ ڈائریکٹریٹ آف پبلک ریلیشنز۔ سینٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد

۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد دوم۔ اسلام آباد ص ۹۷

۲۲۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۲۴۵

۲۳۔ فیض بخش پراچہ۔ تذکرہ پراچہ قبیلہ۔ فیصل آباد۔ ص ۲۱۲ تا ۲۲۱
۲۴۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۲۵۴

ٹوانے

اضلاع سرگودھا اور خوشاب کے علاقوں میں آباد ٹوانوں کا شمار پنجاب کے بڑے جاگیردار خاندانوں میں ہوتا ہے کہا جاتا ہے ٹوانے آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت بابا فرید گنج شکر کے ہاتھ میں ایک ٹوانہ سردار مشرف بہ اسلام ہوا۔ جس کے بعد ٹوانوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ٹوانوں میں ایک دو خاندانوں نے انگریزوں کی وفاداریوں کے صلے میں بڑی جاگیریں حاصل کیں دونوں اضلاع میں کالرہ اسٹیٹ' خواجہ آباد اور جہان آباد کے تین بڑے جاگیردار ٹوانوں کو قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں بااثر حیثیت حاصل رہی۔ قیام پاکستان سے قبل کالرہ اسٹیٹ کے مالک نواب سر عمر حیات خان ٹوانہ انگریز کے خطاب یافتہ ایسے جاگیردار تھے جن کا شمار پنجاب اور دیگر صوبوں کے بااثر ترین جاگیرداروں اور وڈیروں میں ہوتا تھا۔(۱)

اے آر شبلی اپنی کتاب "پاکستان کے دیہہ خدا" میں لکھتے ہیں:

"مٹھا ٹوانہ کی بنیاد ۱۶۸۰ء میں احمد خاں نے رکھی جو ایک ہندو راجپوت رائے شنکر کی اولاد میں سے تھا۔ یہ لوگ مسلمان ہونے کے بعد دریائے سندھ کے کنارے جہانگیر کے مقام پر آکر آباد ہو گئے تھے۔ قریب ہی ڈنڈا کے علاقہ میں ایک جگہ میٹھا پانی دریافت ہوا تو میر احمد خاں نے وہیں آکر ڈیرے ڈال دیئے۔ رفتہ رفتہ یہ گاؤں بہت پھیل گیا اور اس میں کئی قبیلوں نے (جو دراصل ایک دوسرے کی شاخ ہیں) رہائش اختیار کر لی۔ مٹھا ٹوانہ کے شمال میں پانچ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہڈیالی ہے وہاں اعوان قبیلہ رہتا تھا۔ میر احمد خاں نے اس کے بے شمار افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر اردگرد کے علاقہ میں اپنی سرداری قائم کر لی حتیٰ کہ اس کی اولاد میں سے ایک شخص شیر خاں "ملک" بھی کہلانے لگا اس نے اپنے بھائی عالم شیر خان سے مل کر نہ صرف اپنے چچا کو قتل کیا بلکہ ایک جھڑپ میں باپ کو بھی مار ڈالا۔ اس کے بعد اردگرد کی پہاڑیوں میں آباد اعوانوں کا "شکار" کھیل کر پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ کہتے ہیں کہ عالم شیر خاں اکثر صبح سویرے اپنی بندوق لے کر آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھ جاتا اور جہاں کہیں کوئی اعوان نظر آتا پہلے

اس کا شکار کھیلتا پھر واپس آ کر ناشتہ کرتا۔ جب شیر خاں نے طاقت پکڑ لی۔ تو اس نے ڈیرہ اسماعیل خاں کے گورنر کو خراج دینا بھی بند کر دیا۔

۱۷۴۵ء میں شیر خاں نے نور پور ٹوانہ کی بنیاد رکھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں جھنگ کے سیالوں کو مار بھگایا اس کی موت کے بعد اس کے دونوں بیٹے آپس میں اقتدار کی کش مکش میں مصروف رہے۔ اس کے علاوہ ہمسایوں سے بھی جنگ جاری رہی۔

۱۸۱۷ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نور پور ٹوانوں پر چڑھائی کی اور اس علاقہ کو فتح کر کے جسونت سنگھ موکل کی فوجی نگرانی میں دے دیا۔ تاہم اس وقت کے ملک احمد یار خاں نے اپنا علاقہ پھر واپس لے لیا لیکن اسے منکیرا کے نواب نے ٹکنے نہ دیا اور اس کے بیٹوں کو قید کر لیا اس پر ملک احمد یار خاں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے پناہ طلب کی۔ اس نے اسے جھاوڑیاں کی جاگیر عطا کر دی اور ساٹھ سوار بھی دیئے۔ ۱۸۲۱ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے منکیرا کے نواب پر فوج کشی کی جس میں ملک ٹوانہ نے اس کی پوری مدد کی۔ مہاراجہ نے خوش ہو کر ٹوانوں کا ایک رسالہ اور اپنی فوج میں شامل کر لیا۔ اس رسالہ کے ٹوانہ سردار نے مہاراجہ کی بڑی خدمت کی۔ جس کے صلہ میں اسے نہ صرف جاگیر ملی بلکہ "چابک سوار" کا عہدہ بھی پایا۔ ۱۸۳۸ء میں راجہ دھیان سنگھ نے فتح خاں ٹوانہ کو نہ صرف مٹھا ٹوانہ کا منیجر مقرر کر دیا بلکہ وڑچھہ اور چوا نام نمک کی کانیں بھی اس کے سپرد کر دیں۔ تاہم فتح ٹوانہ کا حقیقی عروج راجہ نونہال سنگھ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے فتح خاں کے رشتہ داروں کو میاں والا' شیخووال اور نور پور ٹوانہ کا "کاردار" مقرر کر دیا۔ اور خود فتح خاں کو مختلف زمینداروں سے مالیہ وصول کرنے پر لگا دیا۔ تاہم وہ سکھ سرداروں کو آپس میں لڑانے کی سازشیں بھی کرتا رہا۔ اخیر اسے جان بچانے کے لئے دریائے سندھ کے پار بھاگنا پڑا۔ اس کی عدم موجودگی میں سکھوں نے مٹھا ٹوانہ کو خوب خوب لوٹا۔ آخر جب جواہر سنگھ نے زور پکڑا تو فتح خاں واپس آیا اور اپنے سکھ محسن سے انعام و اکرام پانے کے علاوہ مٹھا ٹوانہ کی گورنری بھی لے لی اور اس طرح جہلم' راولپنڈی' ڈیرہ غازی خاں اور بنوں وغیرہ کے علاقوں کا بہت سا حصہ اس کے زیر اقتدار آ گیا۔ جواہر سنگھ نے اس کی قیمت یہ وصول کی کہ فتح خاں کو اپنے دشمن پشورا سنگھ کے پیچھے لگا دیا۔ پشورا سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ایک بیٹا تھا اور اس نے مسلمان سرداروں کو ساتھ ملا کر قلعہ اٹک پر قبضہ کر رکھا تھا۔ فتح خاں نے نہ صرف قلعہ فتح کر لیا بلکہ پشورا سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش دریائے اٹک میں بہا دی۔ "چیفس آف دی پنجاب" کے مصنف نے لکھا ہے کہ تاریخ پنجاب میں اس سے زیادہ دردناک قتل کوئی نہیں ہوا۔

فتح خاں ٹوانہ اسی مار دھاڑ میں مصروف تھا کہ انگریز پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خاں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء میں اسے بنوں کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا۔ یہاں

اس نے قبائلی سرداروں کے ساتھ ملا کر سکھوں کا مقابلہ کرنا چاہا۔ لیکن اسے قلعہ کے دروازے پر گولی مار دی گئی۔

گجرات میں سکھوں کو شکست دینے کے بعد جب پورا پنجاب انگریز کے قبضہ میں آیا تو اس نے ملک فتح خاں کی جاگیر اور زمینوں کو اس کے بیٹے اور بھتیجے میں تقسیم کر دیا۔ فتح خاں کا لڑکا فتح شیر خاں چونکہ میجر ایڈورڈس کی خدمت میں بھی رہا۔ اس لئے حکومت نے ٹوانوں کو جاگیروں اور معاوضوں سے مالا مال کر دیا۔ تاہم اس قبیلہ کے ملک فتح شیر خاں اور ملک شیر محمد خاں کی دشمنی بدستور قائم رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خاندان کئی شاخوں میں بٹ کر رہ گیا۔

ملک فتح شیر خاں نے انگریز کی سب سے نمایاں خدمات جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں سرانجام دیں۔ چنانچہ اسے نہ صرف خان بہادر کا خطاب دیا گیا بلکہ پنشن اور جاگیر بھی عطا ہوئی۔

ملک فتح شیر خاں کے بعد اس کے بیٹے محمد شیر خاں کو ایچی سن کالج لاہور میں تعلیم دی گئی۔ جنگ آزادی کے زمانہ میں ٹوانہ ملکوں نے نہ صرف تین سو سواروں کی ایک فوج انگریز کے حوالے کی بلکہ خود بھی کئی مہمات میں گورا فوج کے ساتھ مل کر حریت پسندوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہے۔ اس کے عوض ان کو جو کچھ ملا اسی کی بدولت وہ پنجاب کے امیر ترین زمیندار بن گئے۔ ملک شیر محمد کو جاگیروں اور پنشنوں کے علاوہ تیس ہزار ایکڑ زمین خوشاب میں اور پندرہ سو ایکڑ زمین جہلم میں دی گئی۔ ملک شیر محمد خان کے چچا ملک صاحب خاں نے بھی جنگ آزادی میں تین سو گھوڑا سوار دیئے اور کوپر کے زیر کمان جہلم، انبالہ اور کانپور کی مختلف لڑائیوں میں حریت پسندوں کا خون بہایا۔

ملک صاحب خان نے بھی انگریز سے خان بہادر اور سی ایس آئی کے خطابات اور پنشن کے علاوہ جاگیر اور وسیع قطعات اراضی پائے۔ اس کی زمین کی آبپاشی کے لئے دریائے جہلم سے خاص طور پر ایک نہر نکالی گئی۔

"اسی طرح ملک صاحب خان کے بھائی ملک جہان خان نے بھی انگریز کی خدمات کا پورا معاوضہ وصول کیا۔ وہ ساٹھ سوار لے کر ایڈورڈس کی فوج میں شامل ہو گیا اور اس نے ملتان اور سی پی کی جنگوں میں انگریز کا پورا پورا ساتھ دیا اسے بھی پنشن ملی اور اس کے بیٹے ملک محمد خان کو قیمتی زمین دی گئی۔ ملک صاحب خان کے بھائی ملک فتح خاں پر بھی انگریزی نوازشوں کی بارش ہوتی رہی۔ اس نے چچھراں اور چنیوٹ کے علاوہ جنگ آزادی میں جہلم، اجنالہ اور فیروز شاہ میں حریت پسندوں پر ظلم ڈھائے۔ اس کے عوض اسے ڈیڑھ سو ایکڑ زمین معافی ملی۔ ملک فتح خاں کا بیٹا ملک مظفر خان تھا جو درباری ہونے کے علاوہ ایک ہزار ایکڑ کا مالک تھا۔"(۲)

خان بہادر ملک صاحب خان نے ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔ ان کے بعد ان کی تمام تر جاگیر کے وارث ان کے اکلوتے بیٹے عمر حیات خان بنے۔ عمر حیات خان نے ایچی سن (چیفس) کالج

لاہور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۵ء میں جب انہوں نے جاگیر کا انتظام سنبھالا تو ان کے علاقے کے ڈپٹی کمشنر نے انہیں کہا کہ اگر وہ اپنے والد کے نقش قدم پر چلے تو انہیں اپنے والد کو ملنے والے تمام اعزازات منتقل ہو جائیں گے۔ عمر حیات خان نے یہ مشورہ دل پر لکھ لیا اور ہمیشہ اسی مشورے کو رہنما بنائے رہے۔

عمر حیات خان ٹوانہ نے اپنے علاقے کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے متعدد اقدامات کئے انہوں نے کئی مفت اور خیراتی ادارے قائم کئے۔ مسلمانوں کی شادیوں کی رجسٹریشن کا نظام متعارف کروایا اور مختلف کھیلوں کو فروغ دیا۔ وہ گھوڑوں کے زبردست شیدائی تھے اور انہوں نے گھوڑوں کی نسل کشی کے لئے ایک بہت بڑا فارم تعمیر کروایا تھا۔ ان کے فارم سے فوج کو بھی گھوڑے فراہم کئے جاتے تھے جو ۱۸ ویں ٹوانہ لانسر کے نام سے معروف تھی۔ ۱۹۰۱ء میں انہیں فوج میں کمیشن ملا۔ گھوڑوں سے ان کی دلچسپی کے باعث انہیں نیشنل ہارس بریڈنگ اینڈ شو سوسائٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ پنجاب کونسل کے رکن بھی رہے جہاں انہوں نے مشہور نو آبادیاتی بل کے خلاف تقریر کی اسی طرح انہوں نے پنجاب کے جاگیرداری ایکٹ کو منظور کروانے میں بھی فعال کردار ادا کیا۔ وہ کئی تنظیموں کے رکن رہے جن میں پنجاب ایگزی بیشن، پنجاب چیفس ایسوسی ایشن اور انجمن حمایت اسلام کے نام سر فہرست تھے۔ وہ ان چھ ہندوستانیوں میں شامل تھے جو ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کی گولڈن جوبلی تقریبات میں شریک ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ جب افغانستان کے امیر ہندوستان آئے تو انہوں نے سینئر اتاشی کی خدمات انجام دیں جس کے عوض انہیں گھڑی اور ریوالور کا تحفہ عنایت کیا گیا۔

عمر حیات خان ٹوانہ انگریزوں کے بڑے وفادار تھے جس کا ثبوت انہوں نے متعدد مواقع پر پیش کیا۔ انگریزوں نے بھی ان کی خدمات کا صلہ دینے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا اور انہیں متعدد مرتبہ انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں انہیں آئی ای کا خطاب عطا ہوا۔ جارج پنجم کی تاج پوشی کے موقع پر انہیں "ہز میجسٹی انڈین ہیرالڈ" کی حیثیت عطا ہوئی۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ منصب عطا ہوا تھا۔ انہیں ایم وی او سے بھی نوازا گیا۔ وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن بھی نامزد ہوئے۔ جس کے وہ ۱۹۲۰ء تک رکن رہے۔ بعد ازاں وہ کونسل آف اسٹیٹ کے رکن بنائے گئے۔ انہیں یہ رکنیت ۱۹۲۹ء تک حاصل رہی ۱۹۲۹ء میں انہیں سیکرٹری آف دی اسٹیٹس کونسل کے رکن کے طور پر انگلستان بھیجا گیا۔ جہاں وہ ۱۹۳۴ء تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

عمر حیات خاں ٹوانہ نے انڈین لیجسلیچر اور انڈین کونسل میں ۳۰ برس خدمات انجام دیں۔ جو بذات خود ایک ریکارڈ تھا۔ انہیں اس خدمت کی انجام دہی کے عوض نواب کے خطاب سے نوازا گیا۔ (۳)

پہلی عالمی جنگ کے دوران بھی عمر حیات خاں ٹوانہ نے انگریزوں کی متعدد خدمات انجام دیں۔ جن کے عوض انگریزوں نے انہیں کے سی آئی ای اور سی بی ای کے خطابات اور ۱۵ مربع زمین عطا کی۔ (۴)

نواب خان بہادر سر محمد حیات ٹوانہ کے اکلوتے بیٹے خضر حیات خان تھے وہ ۷ر اگست ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایچی سن (چیفس) کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے دوران انہوں نے مشہور دہلی دربار میں شرکت کی جہاں انہیں تمغے سے نوازا گیا۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی انگریزوں کے زبردست مددگار رہے اور انگریزوں نے بھی انہیں نوازنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ ۱۹۳۱ء میں انہیں او بی ای اور ۱۹۴۶ء میں انہیں کے سی ایس آئی کے خطاب سے نوازا گیا۔ جارج پنجم کی سلور جوبلی کے موقع پر وہ بطور خاص انگلستان مدعو کئے گئے۔ جہاں انہیں کورونیشن میڈل عطا کیا گیا۔ (۵)

۱۹۳۷ء میں برصغیر کے دیگر صوبوں کی طرح جب متحدہ پنجاب کی اسمبلی کے انتخابات کا دور آیا تو خضر حیات خاں ٹوانہ نے بھی ان انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ ان انتخابات میں کامیاب ہوئے انہیں سر سکندر حیات نے اپنی کابینہ میں شامل کر لیا اور انہیں پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کا قلمدان سونپا۔ سر سکندر حیات کی وفات (۱۹۴۲ء) تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ (۶) سر سکندر حیات کی وفات کے بعد سر خضر حیات پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنا دیئے گئے اور سر سکندر حیات کے صاحبزادے سردار شوکت حیات کابینہ میں بطور وزیر شامل کر لئے گئے۔

اس وقت نواب افتخار حسین ممدوٹ، میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات پنجاب کے جاگیرداروں میں ایسے نوجوان ارکان پنجاب اسمبلی تھے جنہوں نے صوبہ کی قیادت کو مسلم لیگ اور قائداعظم کے تابع کرنے کی کوشش کی، سردار سکندر حیات اپنے جانشین ملک خضر حیات ٹوانہ کے مقابلے میں سیاسی لحاظ سے زیادہ باشعور اور بالغ تھے۔ لکھنؤ پیکٹ میں ان کے اور قائداعظم کے مابین یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ پنجاب اسمبلی میں مسلم ارکان یونینسٹ پارٹی کے ارکان ہوں گے جبکہ باہر وہ مسلم لیگ کے ارکان متصور ہوں گے۔ ملک خضر حیات ٹوانہ دل سے اس معاہدے کے خلاف تھے دوسرے متحدہ پنجاب کے مسلمان نوجوانوں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پلیٹ فارم سے یونینسٹ پارٹی کی ریشہ دوانیوں کو طشت ازبام کرنے کا فرض ادا کیا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کو فعال بنانے کے لئے نوجوانوں نے صوبے کے بڑے شہروں میں کانفرنسیں منعقد کیں۔ ملک خضر حیات ٹوانہ مسلم لیگ میں جواں خون سے بے حد الرجک تھے۔ انہوں نجی محفلوں میں مسلم لیگ کی افادیت کو ختم کرنے کے لئے باتیں کیں مسلم لیگ کے حامی نوجوان ارکان اسمبلی سے ان کے اختلافات نمایاں ہوئے اور ایک روز انہوں نے سردار شوکت حیات کو اپنی کابینہ سے نکال دیا۔ قائداعظم نے مسلم لیگیوں کو حکم دیا کہ وہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ

اسمبلی پارٹی قائم کریں اس پر بہت سے ارکان نے قائداعظم کے حکم پر عمل کیا۔ خضر حیات نے مسلم لیگ سے بے وفائی کی اور انہوں نے متحدہ پنجاب کے بڑے مسلم جاگیرداروں سے مل کر مسلم لیگ اور قائداعظم سے بغاوت کی۔ یہ وہ دور تھا جب متحدہ پنجاب میں مسلم لیگ کو بے حد استحکام حاصل ہوا ملک خضر حیات ٹوانہ نے مسلم لیگ کی مقبولیت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں مگر ہر آنے والا دن ان کی ناکامی پر مہر تصدیق ثبت کرتا رہا ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی پٹ گئی اور بڑے بڑے جاگیرداروں اور پشتینی ارکان اسمبلی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا متحدہ پنجاب کے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے قائداعظم کی قیادت پر لبیک کہا ان انتخابات میں ضلع سرگودھا سے قریشی اور پراچے مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر ملک خضر حیات ٹوانہ نواب سر اللہ بخش ٹوانہ اور میاں سلطان علی ننگیانہ کامیاب قرار دیئے گئے اور اس ضلع سے ایک نشست پر مسلم لیگ کے امیدوار شیخ فضل حق پراچہ کامیاب ہوئے۔ یونینسٹ پارٹی نے خضر حیات ٹوانہ اور ان کے ساتھیوں کو کامیاب بنانے کے لئے سنگین قسم کی دھاندلیوں کا ارتکاب کیا۔ خضر حیات ٹوانہ نے مسلم یونینسٹ ارکان اسمبلی کی ایک قلیل تعداد اور سکھ اور ہندو ارکان پنجاب اسمبلی ———— سے مل کر کابینہ بنائی مگر مسلم لیگ نے خضر حیات ٹوانہ کے خلاف ایسی موثر اور منظم تحریک چلائی کہ وہ مستعفی ہو گئے اور ہمیشہ کے لئے گوشہ نشین ہو گئے۔ ملک خضر حیات ٹوانہ قیام پاکستان کے بعد کسی سیاسی پلیٹ فارم پر نہیں آئے۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک بدنام زمانہ ری پبلکن دور حکومت میں ملک فیروز خان نون اور نواب مظفر علی قزلباش نے ان سے پرانے مراسم کا احیا کیا ایوب خان کے زمانے میں انہیں دو تین بار اعلیٰ ترین عہدوں کی پیش کش ہوئی مگر انہوں نے ان پیش کشوں کو ٹھکرا دیا۔———— سیاست سے ریٹائر ہونے کے بعد ملک خضر حیات نے باقی عمر کتوں سے پیار میں گزار دی۔ انہوں نے زرعی اصلاحات سے بچنے کے لئے شیخوپورہ اور فیصل آباد میں اپنی جاگیروں کو فروخت کر دیا۔ (۷) ۲۰ر جنوری ۱۹۷۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۸)

سر اللہ بخش ٹوانہ بھی قیام پاکستان کے بعد سیاست سے ریٹائر ہو گئے اور ۱۹۴۸ء میں وفات پا گئے۔

ان کی جاگیر جہان آباد میں تھی وہ اولاد نرینہ سے محروم رہے جب وہ فوت ہوئے تو ان کی نصف اراضی ان کی بیٹی کو مل گئی جبکہ باقی نصف اراضی ان کے رشتے داروں ملک فتح محمد ٹوانہ اور ملک عبدالعلی ٹوانہ کو ملی تینوں بھائی رشتے کے اعتبار سے پاکستان کے سابق وزیراعظم ملک فیروز خان نون کے ماموں اور نواب سر محمد حیات خان نون کے نسبتی بھائی تھے۔

پاکستان بننے کے بعد ٹوانوں کے کئی اور خاندان پاکستان کے سیاسی افق پر نمایاں ہوئے۔

پاکستان بننے سے پہلے ملک خضر حیات ٹوانہ کے مقابلے میں مسلم لیگ کا ٹکٹ خواجہ آباد کے ممتاز احمد ٹوانہ کو دیا گیا انہیں ناکام بنانے کے لئے متحدہ پنجاب کی سرکاری مشینری حرکت میں آئی۔ سرکاری ٹرانسپورٹ کا بے تحاشا استعمال کیا گیا جعلی ووٹ ڈالے گئے اگرچہ مسٹر ممتاز احمد ٹوانہ ناکام بنا دیئے گئے مگر پنجاب کی سیاسی تاریخ میں ان کا نام روشن ہو گیا پاکستان بننے کے بعد یونینسٹ ٹوانوں کے اقتدار کا سورج ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا مگر ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مسٹر ممتاز احمد ٹوانہ کے صاحب زادے خان بہادر حبیب اللہ ٹوانہ اور ملک فتح محمد ٹوانہ کو ٹکٹ دیئے گئے اور وہ کامیاب ہوئے ملک فتح محمد ٹوانہ کا اصل گاؤں ضلع خوشاب میں موضع ہموکا ہے ان انتخابات کے دو تین سال بعد ضلع سرگودھا میں نئی دھڑے بندی ہوئی۔ میاں ممتاز دولتانہ کی جگہ ۱۹۵۳ء میں ملک فیروز خان نون کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا جس کے بعد ممتاز دولتانہ سے سرگودھا کے قریشیوں کی رشتے داری کے باعث ٹوانے اور نون علیحدہ گروپ میں چلے گئے اور بھیرہ کے پراچوں نے قریشیوں کا ساتھ دیا ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں خان بہادر شیخ فضل الٰہی پراچہ بھی منتخب ہونے کے بعد صوبائی وزیر بنے تھے۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں سرگودھا اور خوشاب کے علاقوں میں میاں محمد ذاکر قریشی اور مہر خداداد خان قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے جبکہ بھلوال تحصیل سے ملک فیروز خان نون کے صاحب زادے ملک نور حیات نون کامیاب ہوئے ان انتخابات میں پہلی بار ٹوانے کوئی نشست حاصل نہ کر سکے۔ مگر کنونشن لیگ کے پلیٹ فارم پر ٹوانوں کو بڑی اہمیت دی گئی ملک فتح محمد ٹوانہ ضلع کنونشن مسلم لیگ کے صدر بنائے گئے۔ ۱۹۶۵ء تک میاں محمد ذاکر قریشی اور مہر خداداد خان لک کنونشن مسلم لیگ میں رہنے کے باوجود نواب امیر محمد خاں آف کالا باغ کے عتاب کا شکار رہے مگر موخر الذکر ایم این اے نے حافظ آباد کے ایم این اے چودھری ارشاد اللہ تارڑ سے گہری دوستی کے باعث نواب امیر محمد خان آف کالا باغ کا قرب حاصل کر لیا ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں نواب امیر محمد خان آف کالا باغ نے ضلع سرگودھا میں قریشی گروپ کو کنونشن مسلم لیگ کی ٹکٹوں میں نظر انداز کر دیا اور میاں محمد ذاکر قریشی کی نشست پر ملک فتح محمد ٹوانہ کے صاحب زادے ملک محمد انور ٹوانہ کو نہ صرف قومی اسمبلی کا ٹکٹ تفویض کیا گیا بلکہ انہیں بلا مقابلہ رکن منتخب کرانے میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں ٹوانوں میں کوئی امیدوار کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا (۹)

تاہم ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں ٹوانوں کو دو صوبائی نشستیں ملیں ایک نشست پر ملک خدا بخش ٹوانہ کامیاب ہوئے جبکہ دوسری نشست پر ملک خضر حیات ٹوانہ کے انتخابی حریف ملک ممتاز ٹوانہ کے پوتے اور وفاقی مجلس شوریٰ کے رکن ملک احمد اقبال ٹوانہ کامیاب ہوئے یہ وہی خاندان ہیں جو ملک خضر حیات ٹوانہ کے سیاسی زوال کے بعد پاکستان کی سیاست میں نمایاں رہے۔ ملک خدا بخش ٹوانہ کو صوبائی وزیر اور مسٹر احمد اقبال ٹوانہ کو پارلیمانی سیکرٹری بنایا گیا۔ عام انتخابات

کے بعد قریشی گروپ کو شکست سے دوچار کرنے والوں نے مہرخداداد خان لک کو سینٹ کے لئے اپنا امیدوار نامزد کر دیا سینٹ کے انتخابات کے موقع پر قریشیوں کے مخالفین میں اختلاف کی ہلکی سی لہر بھی آئی۔ ٹوانوں کی کوشش تھی کہ ملک محمد انور ٹوانہ کو آگے لایا جائے مگر اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔

انتخابات کے بعد بھی ایک بار پھر حالات نے کروٹ لی اور جن عناصر نے قریشیوں کو ناکام بنایا تھا وہ پھر دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے مگر مہر خداداد لک اور ملک نور حیات نون نے بقائے باہم کے سمجھوتہ کے تحت فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک ساتھ رہیں گے، عملی طور پر اس ایک گروپ سے ملک نور حیات نون وفاقی وزیر بنائے گئے۔ مہر خداداد خان لک سینٹ میں قائد ایوان لئے گئے ملک خدا بخش ٹوانہ اور مہر غلام دستگیر لک صوبائی وزراء کی صف میں شامل ہو گئے۔ (۱۰)

۱۹۸۸ء میں ملک خدا بخش ٹوانہ نواز شریف کی نگراں کابینہ میں بھی وزیر رہے وہ ۱۹۸۸ء میں آئی جے آئی کی جانب سے انتخابات لڑنے کے خواہاں تھے۔ مگر آئی جے آئی نے قومی اسمبلی کی نشست پر انہیں نظر انداز کر کے نسیم احمد آہیر کو ٹکٹ دینے کا فیصلہ کیا۔

ملک خدا بخش ٹوانہ نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا انہوں نے نگراں وزارت سے استعفیٰ دے کر صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ بھی واپس کر دیا اور دونوں نشستوں پر آزادانہ طور پر لڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ دونوں نشستوں پر کامیاب رہے، بعد ازاں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی جس پر ضمنی انتخاب میں ملک غلام محمد ٹوانہ کامیاب ہو گئے۔ جو ملک خدا بخش ٹوانہ کے بھائی ہیں۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں پی پی ۲۳ سرگودھا ا سے ملک احمد اقبال ٹوانہ نے بھی انتخاب لڑا۔ انہیں آئی جے آئی کا ٹکٹ بھی حاصل تھا مگر اس انتخاب میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۱)

۱۹۹۰ء میں ملک خدا بخش ٹوانہ کو آئی جے آئی نے قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر ٹکٹ عطا کر دیا اور وہ دونوں نشستوں پر کامیاب بھی ہو گئے۔ (۱۲) ۱۹۸۸ء کے برعکس اس مرتبہ ملک خدا بخش ٹوانہ نے صوبائی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی اور غلام حیدر وائیں کی کابینہ میں ایکسائز اور ٹیکسیشن کے وزیر مقرر ہوئے۔ (۱۳) جبکہ ان کی خالی کردہ قومی اسمبلی کی نشست (این اے ۵۲) خوشاب پر ضمنی انتخاب میں ملک غلام محمد ٹوانہ کامیاب ہو گئے۔ (۱۴)

۱۹۹۰ء ہی میں پی پی ۳۴ خوشاب ۲ سے ملک خدا بخش وڈل ٹوانہ بھی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ ملک خدا بخش ٹوانہ کے کزن اور برادر نسبتی ہیں انہوں نے اس انتخاب میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ (۱۵)

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں غلام محمد ٹوانہ اور خدا بخش ٹوانہ دونوں ہی نے پاکستان مسلم لیگ (ج) کے ٹکٹ پر علی الترتیب قومی اور صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر دونوں ہی کامیاب نہ ہو سکے۔ غلام محمد

ٹوانہ کو سردار شجاع محمد نے اور خدا بخش ٹوانہ کو الحاج ملک صالح محمد گنجیال نے شکست دی۔ کامیاب ہونے والے دونوں امیدواروں کا تعلق پاکستان مسلم لیگ (ن) سے تھا۔

۱۹۹۷ء میں خدا بخش ٹوانہ نے صوبائی اسمبلی کا اور غلام محمد ٹوانہ نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ دونوں ہی پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدواروں کا مقابلہ نہ کر سکے (۱۶) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے اپنے تیسرے بھائی ملک محمد سیف اللہ ٹوانہ کو این اے ۷۰ خوشاب ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑوایا جو حریفوں کے ووٹ تقسیم ہو جانے کے باعث بآسانی جیت گئے (۱۷) ملک خدا بخش ٹوانہ کے صاحبزادے احسان الحق ٹوانہ ہیں جو خوشاب کی ضلعی سیاست میں سرگرم رہے ہیں۔ انہوں نے ۲۰۰۱ء کے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا تھا اور خوشاب کے ضلعی ناظم کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ (۱۸) ۲۰۰۵ء کے بلدیاتی انتخابات میں غلام محمد ٹوانہ، خوشاب کے ضلعی ناظم کا انتخاب جیتے ہیں۔ (۱۹)

۲۰۰۲ء میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن بننے والی خاتون شہزادی عمرزادی ٹوانہ میر خضر حیات ٹوانہ کی صاحبزادی ہیں۔ انہیں اس رکنیت کے لیے پاکستان مسلم لیگ (ق) نے نامزد کیا تھا۔ (۲۰)

حوالہ جات

۱۔ طارق اسمٰعیل۔ ٹوانوں کے سیاسی نشیب و فراز کی کہانی۔ نوائے وقت میگزین (روزنامہ نوائے وقت) لاہور۔ ۲۶/ جولائی تا یکم اگست ۱۹۸۵ء۔ ص ۲

۲۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۸۱ تا ۸۷

۳۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیفس اینڈ فیمیلز آف نوٹ ان دی پنجاب۔ جلد دوم۔ لاہور۔ ص ۲۰۵ تا ۲۰۷

۴۔ ایم ایس لیغ۔ دی پنجاب اینڈ دی وار۔ لاہور۔ ص ۱۶۴

۵۔ دی پاکستان ایر بک اینڈ ہواز ہو۔ ۱۹۴۹ء۔ کراچی۔ ص ۸۲۲، ۸۲۷

۶۔ دی انڈین ایر بک اینڈ ہواز ہو۔ ۱۹۴۷ء۔ بمبئی۔ ص ۱۲۳۲

۷۔ طارق اسمٰعیل۔ ٹوانوں کے سیاسی نشیب و فراز کی کہانی۔ نوائے وقت میگزین (روزنامہ نوائے وقت) لاہور۔ ۲۶ جولائی تا یکم اگست ۱۹۸۵ء۔ ص ۲

۸۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات مشاہیرِ پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۴۷

۹۔ طارق اسمٰعیل، ٹوانوں کے سیاسی نشیب و فراز کی کہانی۔ نائے وقت میگزین، روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۲۶/ جولائی تا یکم اگست ۱۹۸۵ء/ص ۲، ۳

۱۰۔ حسنین شیرازی۔ ٹوانوں کے اقتدار کے مدراج، طلوع و غروب کی روداد، نوائے وقت میگزین

(روزنامہ نوائے وقت) لاہور۔۲۳ر تا ۲۹ر اگست ۱۹۸۵ء۔
۱۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۷، ۵۷۲
۱۲۔ احمد سلیم۔ دی ٹوانانز آف سرگودھا۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۶ر اگست۔ یکم ستمبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳
۱۳۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائریکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۵۰
۱۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص ۶۸
۱۵۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائریکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۵۱
۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ اسلام آباد ص ۲۱۲ اور ۴۷
۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲۔ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۳۱
۱۸۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۸۵
۱۹۔ روزنامہ ڈان، کراچی۔ ۸ر اکتوبر ۲۰۰۵ء
۲۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز ۲۰۰۲۔ جلد اول۔ ص ۳۰۷

جنجوعے

زمانہ حال میں پنجاب میں جو سب سے پرانی قومیں آباد ہیں وہ دراصل راجپوت نسل کی ہیں۔ تاریخ اور روایت سے غالباً یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب میں تین مرتبہ راجپوت اپنا اصلی وطن ترک کر کے آئے اور اسی جگہ آباد ہو گئے۔ پہلی آمد اس زمانے سے پہلے ہوئی کہ جس کا کوئی تاریخی حال موجود نہیں اور غالباً یہ حضرت عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار برس پہلے ہوئی۔ کٹوچ اور چمبہ اور کوہستان جالندھر کے راجگان جن کے بزرگ باری رچنا دو آبوں پر حکمران تھے اب تک ان کی نسل سے موجود ہیں۔ دوسری آمد پہلی سے کم از کم ایک ہزار برس بعد ہوئی جبکہ ہستنا پور کے بانی کا بیٹا اجمید اپنے جادو راجپوتوں کو جہلم کے شمال کی جانب لے گیا اور وہاں ایک خاندان قائم کیا جو راولپنڈی سے ملتان تک حکمرانی کرتا رہا۔ سب سے آخر میں دکن سے دسویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک مختلف نسلوں کے راجپوت پنجاب میں آباد ہوتے رہے جن کی اولاد جٹ، ٹوانہ، سیال، گھیبہ، کھوکھر اور بہت سی دوسری مشہور قومیں ہیں۔

یہ بات کسی قدر تحقیق کے ساتھ کہنی مشکل ہے کہ جنجوعے پنجاب میں کتنی مدت سے آباد ہیں مگر غالباً وہ جادو راجپوتوں کی اولاد ہیں جو اجمید کے ہمراہ آئے تھے۔ یہ بات کہ قوم اور راجپوتانہ کے جوہیے اور جودہی ایک ہی شناخت کئے گئے ہیں اور بھی مشکل کو بڑھاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ دریائے جہلم کے شمال کی طرف جو نمک کے کوہستان ہیں وہاں جادو راجپوت ابتداء میں آباد ہوئے تھے اور اب تک ان کا پرانا نام کوہستان جودہ ہے لیکن بیکانیر کے جوہیے جو اب مفقود ہو گئے ہیں تین سو برس ہوئے بھروپال کے گردونواح میں بہت کثرت سے آباد تھے، معلوم ہوتا ہے کہ جہلم کے جنجوعوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے تھے (ا)

اے آر شبلی اپنی کتاب پاکستان کے دستہ خدا میں لکھتے ہیں:۔

"جنجوعوں کے متعلق تاریخی شہادت یہ ہے کہ وہ راجپوتوں کی قدیم ترین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس خود جنجوعوں کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ایک پانڈو راجہ مل کی اولاد ہیں

اور پنجاب میں ۹۸۰ء کے لگ بھگ آئے تھے۔ ان کا ابتدائی وطن جودھ پور یا قنوج ہے۔ جن پر اسی زمانہ میں راٹھوروں کی حکومت تھی۔ جب راٹھور کے راجہ کو پتہ چلا کہ ایک پانڈو بھاگ کر جہلم کی شمالی پہاڑیوں میں جا چھپا تھا تو وہ بھی اپنے ساتھیوں سمیت اس علاقہ میں آکر آباد ہو گیا اس نے راج گڑھ کے نام سے ایک گاؤں کی بنیاد رکھی جو آجکل ملوٹ کہلاتا ہے۔

جب سلطان محمود غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا تو اس نے راجہ مل کو بلا بھیجا۔ لیکن اس نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ اس سے برافروختہ ہو کر سلطان محمود غزنوی نے اس پر چڑھائی کی اور شکست دے کر اسے قید کر لیا۔ اتنے میں راجہ مل نے اسلام قبول کر لیا جس کے بعد اس کی جائداد اسے واپس کر دی گئی۔ اس نے چونکہ "جنیئو" (ہندوؤں کا نشان دھاگہ) اتار پھینکا تھا اس لئے اس کا خاندان جنجوعہ کہلانے لگا۔

راجہ مل کے دو بیٹے تھے۔ جودھ اور ویر۔ انہوں نے باپ کی جائداد آپس میں بانٹ لی۔ جودھ نے مکراج کی نمک کی کانوں پر قبضہ کر لیا اور ویر نے پنڈ دادنخاں کے قریب کھورا کا علاقہ لے لیا۔ ان لوگوں کی اولاد پھیلتی رہی اور اڑوس پڑوس پر قابض ہوتی رہی۔ ۱۳۵۸ء میں جب تیمور نے حملہ کیا تو جنجوعوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اسی طرح ۱۵۲۶ء میں انہوں نے بابر کے سامنے گھٹنے ٹیکے۔ بابر نے اپنی توزک میں ان کا ذکر کیا ہے۔ جنجوعوں کے سب سے بڑے دشمن گکھڑ تھے۔ انہوں نے جنجوعوں کو کئی دیہات سے نکالا اور ان کی اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح اعوان بھی جنجوعوں کو پیچھے دھکیلتے رہے۔ اس کے بعد سکھ آئے تو وہ بھی جنجوعوں پر چڑھ دوڑے۔

انگریز کے زمانہ میں جس جنجوعے نے نام پایا اس کا نام ملک زمان مہدی خاں تھا۔ اس نے جہلم کے انگریز ڈپٹی کمشنر کو مجاہدین کے بارے میں خفیہ اطلاعات بہم پہنچائیں۔ جن کی بنا پر کئی مجاہد جو کشتی پر دریا پار کر رہے تھے گرفتار ہو گئے۔ اس کے بعد ملک زماں مہدی نے افغان جنگ میں حصہ لیا۔ ان خدمات کے عوض اسے انگریز کی بارگاہ سے تعریفی سند ملی اور اسے درباری بنا لیا گیا۔ ملک زماں مہدی خاں کے بعد اس کی اولاد نے بھی انگریز کی اطاعت و وفاداری کو جزو ایمان بنائے رکھا۔ جس کے صلہ میں ان کو فوجی عہدے، جاگیریں اور خطابات ملے۔ کوہستان نمک میں اب بھی ایسے جنجوعے آباد ہیں جن کے پاس انگریز کی دی ہوئی زمینیں اور جاگیریں ہیں۔" (۲)

خان بہادر ملک زمان مہدی خان نے ۱۸۹۴ء میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا ملک طالب مہدی اس کا جانشین ہوا۔ ۱۸۹۶ء میں ملک زمان مہدی نے صوبائی سول سروس میں شمولیت اختیار کی اور ترقی کرتے ہوئے ۱۹۰۱ء میں مستقل طور پر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا۔ وہ کچھ عرصہ ممدوٹ اسٹیٹ کا مینجر بھی رہا اور بہاولپور کونسل آف ریجنسی میں ریونیو ممبر کے عہدے پر فائز ہوا۔ وہ صوبائی درباری تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب انگریزوں نے اسے اپنا ایجنٹ بنا کر کابل بھیجا تھا۔ اس خدمت کے عوض اسے نواب کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں وہ

ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوا بعد ازاں وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل اور ہندوستان کی مرکزی مجلس قانون ساز کا رکن بھی رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران نواب طالب مہدی خان کو انگریزوں نے میجر کا رینک دے کر ایک خصوصی مہم پر ایران روانہ کیا۔ اس دوران اس کی ریاست کا نظم و نسق اس کے چچا خان بہادر راجہ پائندہ خان نے سنبھالا۔ راجہ پائندہ خان نے بھی انگریزوں کی خوشنودی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا اور جنگ کے موقع پر نہ صرف ایک ہزار رنگروٹ بھرتی کروائے بلکہ وار فنڈ میں بھی ایک خاصی معقول رقم بطور چندہ روانہ کی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے راجہ طالب مہدی خان کی خدمات کے صلے میں اسے آرڈر آف دی برٹش ایمپائر کے تمغے سے نوازا۔ جب کہ اس کے چچا پائندہ خان کو دو خلعتیں، اعزازی پیٹی، شمشیر اعزازی، ریکوگنگ بیج اور خان صاحب اور خان بہادر کے خطابات عطا ہوئے۔

نواب میجر طالب مہدی خان کے کئی اور رشتہ دار بھی انگریزوں کی خدمت میں نمایاں رہے جن میں اس کے دو سگے بھائی صوبیدار کریم اللہ خان اور راجہ حفیظ اللہ خان اور دو کزن حبیب اللہ خان اور نجیب اللہ خان کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ نواب طالب مہدی خان کا ایک اور بھائی رسالدار میجر فضل مہدی خان پنجاب سول سروس کا رکن رہا۔ اس نے خان بہادر راجہ پائندہ خان کے بیٹے راجہ رحیم اللہ خان کے ہمراہ ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج پنجم کی تخت نشینی کی تقریب میں بھی شرکت کی تھی جو ایک بڑا اعزاز سمجھا گیا تھا۔ (۳)

نواب میجر طالب مہدی خان کے چار بیٹے ہوئے۔ محمد مہدی خاں، محمد زمان مہدی خاں، محمد احمد نواز مہدی خاں اور ملک افضل مہدی خان۔ محمد مہدی خان دارا پور جنجوعہ خاندان کے سردار تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۰ء تک وہ ریاست بہاولپور میں وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے۔ (۴)

راجہ محمد مہدی خان کے صاحبزادے افضال مہدی تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا ان کے مقابل چودھری الطاف حسین اور راجہ غضنفر علی خان جیسے سرکردہ سیاست دان تھے مگر راجہ افضال مہدی نے ان دونوں سیاستدانوں کو شکست دی اور قومی اسمبلی کے رکن بن گئے۔ وہ ۱۹۶۵ء میں بھی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ مگر دو ہی برس بعد ۱۹۶۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی خالی ہونے والی نشست پر بعد ازاں ان کے کزن راجہ لہراسب خان قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۵)

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں راجہ لہراسب نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کے مدمقابل پاکستان پیپلز پارٹی کے ڈاکٹر غلام حسین تھے۔ انتخابی مہم کے دوران راجہ لہراسب کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تجزیہ نگار نے لکھا تھا۔

"ان کا دستر خوان کھلا رہتا ہے، لوگوں کے کام آتے ہیں مگر عام تاثر یہ ہے کہ زیادہ تر مجرم

پیشہ افراد کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں"۔ (٦)

راجہ لہراسب اس انتخاب میں ڈاکٹر غلام حسین کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۸۵ء میں راجہ لہراسب خان نے این اے ۴۶ جہلم ۳ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ مگر انہوں نے اپنی انتخابی مہم خاصی دیر سے شروع کی۔ اس حلقے سے دیگر امیدواروں میں راجہ محمد افسر اور راجہ محمد منور احمد شامل تھے۔ ابتدا میں راجہ منور احمد کی پوزیشن بہتر تھی اور راجہ محمد افسر کا خیال تھا کہ اگر راجہ منور احمد کے مقابلے میں کوئی آزاد امیدوار آیا تو وہ اس کے حق میں دستبردار ہو جائیں گے۔ راجہ لہراسب خان اس حلقہ کے کاغذات نامزدگی تو جمع کروا چکے تھے مگر انہوں نے اپنی انتخابی مہم بروقت شروع کرنے سے گریز کیا جس کے باعث راجہ محمد افسر کو اپنی کامیابی کی راہ ہموار کرنے کا موقع مل گیا۔ راجہ لہراسب نے پولنگ سے ۲۷ دن پہلے اپنی کنویسنگ شروع کی مگر وہ اپنی ٹرین مس کر چکے تھے۔ چنانچہ اس نشست پر راجہ محمد افسر جیت گئے اور راجہ لہراسب خان دوسرے اور راجہ منور احمد تیسرے نمبر پر رہے'(۷)

انہی انتخابات میں راجہ لہراسب خان کے بھتیجے اور راجہ افضال مہدی خاں کے صاحبزادے راجہ اقبال مہدی خاں نے پی پی ۲۰ جہلم ۳ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے ۱۹۸۵-۸٦ء میں وہ پنجاب کے صوبائی وزیر رہے ان کے پاس جنگی' وائلڈ لائف اور فشریز کے قلمدان تھے۔ ۱۹۸٦ء میں وہ وزیر اعلیٰ پنجاب کے مشیر بنائے گئے۔ (۸)

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں راجہ اقبال مہدی این اے ۴٦ جہلم ۲ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انہوں نے آزاد امیدوار ڈاکٹر غلام حسین سمیت پیپلز پارٹی کے امیدوار راجہ ممتاز احمد خاں اور سابق ایم این اے راجہ محمد افسر خاں کو شکست دی۔ اس حلقے میں اسلامی جمہوری اتحاد کا ٹکٹ بھی متنازعہ رہا۔ اگرچہ اسلامی جمہوری اتحاد نے راجہ افسر خاں کو ٹکٹ دیا تھا جو ۱۹۸۵ء میں اس حلقے سے ایم این اے منتخب ہوئے تھے مگر انہیں اتحاد کا انتخابی نشان نہ مل سکا۔ راجہ اقبال مہدی خاں اور ان کے ساتھی دعوے دار رہے کہ اتحاد کا ٹکٹ انہیں ملا ہے۔ وزیر اعلیٰ کے دورہ جہلم کے موقع پر این اے ۴۵ سے اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار راجہ محمد افضل خان نے اعلان کیا کہ این اے ۴٦ سے راجہ اقبال مہدی ہی اسلامی اتحاد کے امیدوار ہیں راجہ افسر خاں نے اس صورتحال سے پاکستان مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد خان جونیجو کو آگاہ کیا جنہوں نے انتخابی مہم کے دوران اس حلقہ کا دورہ کیا اور راجہ افسر خان کے جلسے میں لوگوں سے اپیل کی کہ وہ راجہ افسر کو ووٹ دیں مگر محمد خان جونیجو کی یہ اپیل بھی رائیگاں گئی اور راجہ اقبال مہدی اس حلقے سے ایم این اے منتخب ہو گئے۔ (۹)

۱۹۹۰ء کے انتخابات سے قبل آئی جے آئی اور پیپلز پارٹی' دونوں کو اپنی اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا چنانچہ اس انتخاب کے موقع پر آئی جے آئی نے راجہ اقبال مہدی کو اور پیپلز پارٹی نے

ڈاکٹر غلام حسین کو ٹکٹ دینے کا اعلان کیا۔ دونوں میں بہت زبردست معرکہ آرائی ہوئی اور راجہ اقبال مہدی یہ معرکہ تقریباً پونے چار ہزار ووٹوں سے جیت گئے۔ (۱۰)

۱۹۹۳ء میں راجہ اقبال مہدی کو ایک سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے مدمقابل شاہد نواز جنجوعہ تھے۔ جو پاکستان آرمی کے مرحوم چیف آف سٹاف آصف نواز جنجوعہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ شاہد نواز جنجوعہ کو پاکستان پیپلز پارٹی نے ٹکٹ دیا تھا۔ تاہم یہ مقابلہ راجہ اقبال مہدی ہی کے ہاتھ رہا جنھوں نے یہ معرکہ تقریباً پانچ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے سر کر لیا (۱۱)

راجہ اقبال مہدی نے اپنی کامیابیوں کا تسلسل ۱۹۹۷ء میں بھی برقرار رکھا اور چوتھی مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۲) تاہم ۲۰۰۲ء میں گریجویشن کی شرط عاید ہونے کی وجہ سے وہ انتخابات میں حصہ نہ لے سکے (۱۳)

راجہ اقبال مہدی کے مخالفین ان پر رسہ گیر ہونے کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ چوریوں کے منصوبہ بندی کرتے ہیں اور چوروں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس الزام میں کتنی صداقت ہے مگر راجہ اقبال مہدی کے مخالفین اس الزام کو شدومد سے اچھالتے ہیں۔ (۱۴)

راجہ اقبال مہدی کے خاندان کے ایک اور رکن راجہ محمد افضل خان ہیں۔ وہ ایک طویل عرصہ سے مسلم لیگ سے وابستہ ہیں ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۹ء میں میونسپل کمیٹی جہلم کے رکن اور ۱۹۷۹ء، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۷ء میں میونسپل کمیٹی جہلم کے چیئرمین منتخب ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۸ء میں وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تاہم ۱۹۹۰ء میں وہ اپنے دیرینہ حریف چودھری الطاف حسین سے فقط ساڑھے تین سو ووٹوں سے شکست کھا گئے تھے۔ ۱۹۹۱ء میں وہ سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۵) انہوں نے ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں بھی حصہ لیا اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ڈاکٹر غلام حسین کو شکست دے کر ایم این اے منتخب ہو گئے۔ (۱۶) راجہ محمد افضل خان نے ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں بھی حصہ لیا اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۷) ۲۰۰۲ء میں ان کے صاحبزادے راجہ محمد اسد خاں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ بھی اس انتخاب میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدوار تھے۔ (۱۸)

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے پاکستان کی بری فوج کے مایہ ناز چیف آف اسٹاف راجہ آصف نواز جنجوعہ کا تعلق بھی راجپوتوں کی جنجوعہ شاخ سے ہی تھا۔ ان کے علاوہ صوبہ سرحد کے سابق گورنر بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) امیر گلستان جنجوعہ بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ (۱۹)

حوالہ جات

۱۔ کرنل چارلس میسن۔ روسائے بااختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس) لاہور۔ ص ۵۲۱، ۵۲۲

۲۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۱۵۰ تا ۱۵۲

۳۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیفس اینڈ فیمیلز آف نوٹ ان دی پنجاب۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۲۶۲ تا ۲۶۴

۴۔ وکیل انجم۔ سیاست کے فرعون۔ لاہور ص ۳۲۵

۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۵۲، ۵۳

۶۔ الطاف حسن قریشی۔ پنجاب کا انتخابی جائزہ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۷ تا ۱۳ دسمبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۷

۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۵۸۔ لاہور۔ ص ۵۳، ۵۴

۸۔ پنجاب اسمبلی ۱۹۸۷ء۔ گولڈن جوبلی سوونیئر۔ لاہور۔ ص ۵۲

۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۱۴، ۱۱۵

۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۔۱۹۹۰ء جلد دوم۔ ص ۳۰

۱۱۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۶۳

۱۲۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء۔ لاہور۔ ص ۶۶

۱۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور، ص ۲۱۵

۱۴۔ ادارہ۔ گورنر رول۔ دی نیشن لاہور۔ الیکشن ۹۳ء اسپیشل۔ ۹ اگست ۱۹۹۳ء۔

۱۵۔ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان، ڈائریکٹری آف ممبرز ۹۴۔۱۹۹۱ء۔ ص ۶۶

۱۶۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۶۲

۱۷۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء۔ لاہور۔ ص ۶۵

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲۔ جلد دوم۔ ص ۲۹

۱۹۔ ظفر جھنڈیر، ارشاد علی، ایم اکبر رانا۔ تاریخ راجپوت۔ کراچی۔ ص ۸۱

چٹھے

چٹھے مسلمانوں کی ایک بڑی قوم ہے جو ضلع گوجرانوالہ کے پرگنہ حافظ آباد اور وزیر آباد میں آباد ہے۔ جہاں ان کے ۷۸ دیہات ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہم دراصل چوہان راجپوت ہیں اور ضلع دہلی سے پنجاب میں آئے تھے، یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ کب آئے مگر غالباً ساڑھے تین سو برس ہوئے۔ تھوڑے عرصے میں وہ تعداد میں بڑھ گئے اور دریائے چناب کے کنارے کنارے پھیل گئے اور نڈالہ، منچر، بنگلی، پنڈوریاں اور دوسرے گاؤں آباد کئے۔ بتایا جاتا ہے کہ پہلے پہل ان کا ایک بزرگ گاگو نامی ۱۶۰۰ء کے قریب مسلمان ہوا تھا اور باقی قوم نے رفتہ رفتہ اس کی تقلید کی۔ نور محمد ۱۷۰۴ء میں پیدا ہوا تھا جب وہ بالغ ہوا تو راجہ رنجیت دیو والی جموں اور رئیسان ملتان نے اس کی رفاقت چاہی کیونکہ چٹھے اب طاقتور ہو گئے تھے اور نور محمد ان کا مسلم رئیس تھا۔

جب نور محمد ضعیف ہو گیا تو اس کا چھوٹا بیٹا احمد خان جو ہوشیار اور بہادر سردار تھا چٹھوں کو میدان جنگ میں لے جاتا رہا۔ اس قوم کے بڑے دشمن گوجرانوالہ کے سکر چکیہ سردار تھے جو ہمیشہ اپنے علاقہ کو بڑھانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ سردار چڑت سنگھ کے عہد میں چٹھوں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا اور احمد خان نے ۱۷۶۵ء میں مشہور بھنگی توپ لے لی جس کو چڑت سنگھ گوجرانوالہ میں لایا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد احمد خان اور اس کے بھائی پیر محمد میں فساد ہو گیا اور کچھ عرصے تک لڑائی ہوتی رہی جس میں کبھی ایک غالب آجاتا تھا اور کبھی دوسرا اور احمد خان کے بیٹے بہرام خان اور قادر بخش اور اس کا بھتیجا فتح محمد خان مارے گئے۔ آخرکار پیر محمد نے گوجر سنگھ اور صاحب سنگھ بھنگی سے مدد چاہی اور ان سرداروں نے احمد خان کو مشورے کرنے کے لئے بلا کر قید کر لیا اور پانی دینے کے بغیر اس کو بند کر رکھا تاوقتیکہ اس نے بڑی توپ کے دینے کا اقرار کیا جو قلعہ گجرات کو بھیجی گئی۔ (۱)

احمد شاہ درانی کے وائسرائے میر منو نے چند ماہ تک مانچر کے قلعہ کا محاصرہ رکھا مگر کچھ

کامیابی نہ ہوئی تو شہنشاہ نے خود پنجاب پر چڑھائی کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت شہنشاہ نے چٹھہ سرداران کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا اور ان کو ان کے علاقوں پر مستقل کر دیا۔ چٹھوں کا دشمن سردار چڑت سنگھ ۱۷۷۴ء میں فوت ہوا اور اس کے بعد ہی نور محمد اور اس کے بیٹے پیر محمد کا بھی انتقال ہو گیا۔

ضلع گوجرانوالہ میں ان سرداروں نے بہت سے بڑے بڑے قصبے آباد کئے۔ نور محمد نے تو احمد نگر، گڑھی گل محمد اور رسول نگر (جس کا نام بعد میں سکھوں نے رام نگر رکھ دیا) آباد کئے اور پیر محمد نے تین مختلف قلعے بنوائے جن کے نام اپنے نام پر رکھے اور نیز کوٹ میاں خاں۔ علی پور (جس کا نام پھر سکھوں نے اکال گڑھ رکھ دیا) نائی والا کوٹ سلیم۔ کوٹ علی محمد اور فتح پور آباد کئے۔ غلام محمد کی اس وقت سے جس وقت سے کہ وہ اپنے باپ کا جانشین ہوا سو کر چکیہ سرداروں سے دشمنی شروع ہو گئی۔ چڑت سنگھ کا بیٹا سردار مہاں سنگھ اور غلام محمد دونوں قابل اور بہادر آدمی تھی اور یہ بات مسلمہ تھی کہ سکھوں اور چٹھوں میں اس وقت تک امن قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک فوت نہ ہو جائے۔ ایک عرصہ تک چٹھے بڑے بااقتدار رہے اور مہاں سنگھ کو کئی مواقع پر شکست دی۔ مہاں سنگھ نے ایک دفعہ جوکیاں کا جو غلام محمد کے چچا میاں خاں کے قبضہ میں تھا محاصرہ کیا اور میاں خاں اس کے بچانے کے لئے فوراً پہنچ گیا۔ ایک سخت لڑائی کے بعد طرفین صلح کر لینے پر راضی ہو گئے مگر ایک موقع پر چال باز سکھ (مہاں سنگھ) نے میاں خاں کو غافل پا کر پکڑ لیا اور قید کر کے اپنے ساتھ لے آیا اور توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا۔ آخر کار ۱۷۹۰ء میں مہاں سنگھ بڑا زبردست ہو گیا اور اپنی تمام فوجیں جمع کر کے مانچر کا محاصرہ کر دیا۔ یہ محاصرہ چھ مہینہ سے زیادہ عرصہ تک رہا اور اس میں سکھوں کے بہت سے آدمی ضائع ہوئے۔ خود رنجیت سنگھ جو اس وقت نوعمر تھا خطرہ میں پڑ گیا تھا کیونکہ غلام محمد کے چچا حشمت خاں نے چند سواروں کے ساتھ اس کے ہمراہیوں پر حملہ کیا اور اس کے ہاتھی پر چڑھ کر قریب تھا کہ اس بچہ کو ہلاک کر دے مگر رنجیت سنگھ کے ساتھیوں نے حشمت خاں کو مار گرایا۔ غلام محمد نے یہ دیکھ کر کہ وہ اب قلعہ مانچر کو زیادہ عرصہ تک بچا نہیں سکتا اس شرط پر شکست مان لی کہ اسے بلاخوف و خطر مکہ معظمہ جانے کی اجازت مل جائے۔ مہاں سنگھ نے حلف دے دیا مگر حلف دینے کے بعد ہی اس کے کسی سپاہی نے اس کے حکم سے یا اس کے ایما سے بہادر چٹھہ سردار کے سر میں گولی مار کر اس کا کام تمام کر دیا۔ اس پر مہاں سنگھ نے مانچر کو لوٹ لینے کا حکم دے دیا اور چٹھوں کے بہت سے علاقوں پر قابض ہو گیا۔

غلام محمد کا لڑکا جان محمد کابل کی طرف بھاگ گیا اور پھر ۱۷۹۷ء میں شاہ زمان کے ہمراہ واپس آیا اور افغانوں کی مدد سے اپنے چناب کے علاقوں پر قابض ہو گیا مگر جب شاہ زمان افغانستان واپس چلا گیا تو رنجیت سنگھ نے چٹھوں کے زور کو ہمیشہ کے لئے توڑ دینے کے ارادہ سے رسول نگر

پر حملہ کیا۔ ان لوگوں نے جو رسول نگر میں محصور ہو گئے تھے رنجیت سنگھ کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر دن بدن ان کی جمعیت اور طاقت کم ہوتی گئی۔ روم میں تو وہ پیر جو توام بھائی تھے اپنے مریدوں کے ساتھ جھیل ریگیلس پر آخر دم تک لڑتے رہے اس کے برعکس یہاں مسلمان پیروں نے اپنے مریدوں (چٹھوں) کا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ یہ ایک روایت ہے کہ جب چٹھوں نے ایک مشہور فقیر سے جو رسول نگر میں رہتا تھا مدد کرنے کے لئے کہا تو اس نے جواب دیا کہ "میں تمہاری کیونکر مدد کر سکتا ہوں جبکہ حضرت محبوب سبحانی (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ) سبز پوشاک زیب تن کئے رنجیت سنگھ کی طرف سے لڑ رہے ہیں" آخرکار جان محمد ایک توپ کے گولے سے مارا گیا اور اس کے مرتے ہی قلعہ کے دروازے سکھوں کے لئے کھل گئے۔ (۲)

رسول نگر فتح ہو جانے کے بعد خاندان کی تاریخ میں کوئی بات قابل بیان نہیں کیونکہ جان محمد کے بیٹوں کو رنجیت سنگھ نے تھوڑی سی جاگیر دے دی تھی اور اسے اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا تھا۔ مگر جان محمد کے اہل خاندان کبھی دل سے رنجیت سنگھ کے وفادار نہیں ہوئے اور انگریزوں کی آمد کے بعد ان کے ساتھ جا ملے۔

۴۹-۱۸۴۸ء کے زمانے میں چٹھوں کی دوسری شاخ، جس کی سربراہی خدا بخش کے ہاتھ میں تھی انگریزوں سے وفادار رہی اس عمل کے نتیجے میں خدا بخش کے دو پوتوں غلام حیدر اور شمس الدین کو تھانیدار اور نائب تھانیدار بنا دیا گیا اور خدا بخش کو عمر بھر کے لئے ۱۵ ہزار روپے کی جاگیر عطا ہوئی۔

خدا بخش چٹھہ نے ۱۸۷۷ء میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے جانشین کرم الٰہی کو ۲۷۰۰ ایکڑ زمین عطا ہوئی۔ اس کے علاوہ سردار کرم الٰہی کو انعام میں معافی (نوے روپے سالانہ) بارہ سو گھماؤں اراضی اور لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے بعض مکانوں اور دکانوں کی ملکیت ملی جس سے ۱۹۱۰ء میں پانچ ہزار دو سو روپے سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔

سردار کرم الٰہی ضلع بورڈ کے رکن، احمد نگر کے ذیل دار اور ڈویژنل درباری تھے۔ ۱۹۱۴ء میں انہیں خان بہادر کا اور چار سال بعد ایم بی ای کا خطاب ملا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران بھی انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں جس کے بدلے میں انہیں انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ وہ دو دہائیوں تک اعزازی مجسٹریٹ اور سول جج درجہ اول کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء تک وہ پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رکن رہے انہوں نے ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

سردار کرم الٰہی کی وفات کے بعد ان کا ورثہ ان کے بیٹے چودھری نصیر الدین (پ ۱۸۸۲) نے سنبھالا۔ وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ وہ گوجرانوالہ کے ضلعی بورڈ کے چیئرمین اور صوبائی درباری تھے۔ (۳) ۱۹۳۷ء میں پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے (۴)

اسی خاندان کے ایک اور سپوت چودھری ریاست علی چٹھہ تھے۔ وہ سردار کرم الٰہی کے چچازاد بھائی غلام قادر کے فرزند تھے۔ ۱۹۲۴ء کے بعد وہ کئی مرتبہ گوجرانوالہ میونسپلٹی کے رکن رہے۔ ۱۹۳۴ء میں وہ گوجرانوالہ میونسپلٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں انہیں خان صاحب کا خطاب عطا ہوا۔ (۵) اور ۱۹۳۷ء میں وہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۶)

چودھری نصیر الدین چٹھہ کے صاحبزادے چودھری صلاح الدین چٹھہ تھے۔ وہ ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کا مقابلہ راجہ محمد عبداللہ خاں نے کیا۔ اگرچہ راجہ صاحب بھی تحریک پاکستان کے قافلے میں شامل تھے مگر انہوں نے احتجاجاً" اس نشست کے لئے مقابلہ کیا تھا کہ انہیں مسلم لیگ نے ٹکٹ نہیں دیا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں چودھری صلاح الدین چٹھہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر بلامقابلہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ وسطی پنجاب کے واحد مسلم لیگی تھے جو بلامقابلہ منتخب ہوئے تھے۔ چودھری صلاح الدین چٹھہ قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں پاکستان مسلم لیگ کے مرکزی سیکرٹری جنرل اور پنجاب کے صوبائی وزیر بھی رہے (۷) ۱۹۵۶ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۸) ۱۹۶۲ء میں انہوں نے پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کا انتخاب جیتا۔ مگر انتخاب کے بعد انہوں نے کونسل مسلم لیگ میں رہنے کو ترجیح دی۔ چودھری صلاح الدین چٹھہ محترمہ فاطمہ جناح کے انتخاب میں ان کے ساتھ تھے۔ اسی باعث نواب کالاباغ امیر محمد خان ان سے خاصی پرخاش رکھتے تھے۔

۱۹۶۵ء کے انتخابات نواب امیر محمد خاں نے ضلع گوجرانوالہ سے ان کی قومی اسمبلی کی نشست ہی ختم کروا دی اور ان کے حلقے کا ایک حصہ تحصیل حافظ آباد اور دوسرا حصہ تحصیل گوجرانوالہ اور گوجرانوالہ شہر سے منسلک کر دیا۔ اگرچہ مرحوم چودھری صلاح الدین چٹھہ نے قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ نہ لیا مگر انہوں نے تحصیل وزیر آباد سے اپنے ایک پرانے دوست راجہ محمد عبداللہ خان کو کنونشن مسلم لیگ کے امیدوار چودھری منظور حسین آف مرید کے کے مقابلے میں کامیاب کرایا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل چودھری صلاح الدین چٹھہ اور راجہ محمد عبداللہ خان وفات پا گئے اور ان کی جگہ ان کے بیٹوں نے لے لی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں چودھری صلاح الدین کے صاحبزادے حامد ناصر چٹھہ اور راجہ محمد عبداللہ خاں کے صاحبزادے کرنل ریٹائرڈ راجہ جمیل اللہ خان کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر بالترتیب قومی اور صوبائی اسمبلی کے امیدوار بنے۔ حامد ناصر چٹھہ اس انتخاب میں پیپلزپارٹی کے امیدوار غلام حیدر چیمہ سے شکست کھا گئے۔ مگر کرنل راجہ جمیل اللہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں راجہ جمیل اللہ خاں پیپلزپارٹی میں شامل ہو گئے مگر حامد ناصر چٹھہ نے ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلزپارٹی کے دیگر عمائدین کے شدید دباؤ کے باوجود مسلم لیگ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

یہی حال کرنل راجہ جمیل اللہ خان کے کزن راجہ خلیق اللہ کا تھا انہوں نے بھی مسلم لیگ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ حامد ناصر چٹھہ نے ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں پاکستان قومی اتحاد کے ٹکٹ پر حصہ لیا مگر اس مرتبہ بھی ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ اپنے دیرینہ حریف غلام حیدر چیمہ کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔

حامد ناصر چٹھہ کی قسمت کا ستارہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں چمکا۔ جب انہیں پنجاب کی صوبائی کابینہ میں شامل کیا گیا اور وہ صوبائی وزیر تعلیم بنے۔ ۱۹۸۵ء میں گوجرانوالہ کی چیمہ برادری نے پارٹی ڈسپلن کی وجہ سے انتخاب کا بائیکاٹ کیا۔ مگر انہوں نے حامد ناصر چٹھہ کے لئے میدان کھلا نہ چھوڑا اور ان کے مقابلے میں قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر چودھری سیف علی چٹھہ کو کھڑا کر دیا۔ انتخابی مہم کے دوران علاقے کے بعض سرکردہ اراکین کے دونوں امیدواروں میں اس شرط پر سمجھوتہ کروانے کی کوشش کی کہ حامد ناصر چٹھہ کو قومی اور سیف اللہ چٹھہ کو صوبائی اسمبلی میں مشترکہ امیدوار کے طور پر اپنا لیا جائے۔ مگر یہ شرط حامد ناصر چٹھہ نے ماننے سے انکار کر دی اور دونوں نشستوں پر سیف علی چٹھہ کو شکست فاش دی۔ (۹) انتخابات کے بعد حامد ناصر چٹھہ نے قومی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی اور صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی۔ بعد میں جب اس نشست پر ضمنی انتخابات منعقد ہوئے تو سیف علی چٹھہ نے دوبارہ انتخاب لڑا مگر وہ اس مرتبہ بھی حامد ناصر چٹھہ کے حمایت یافتہ امیدوار چودھری شوکت حیات چٹھہ سے شکست کھا گئے۔ (۱۰)

حامد ناصر چٹھہ محمد خان جونیجو کی کابینہ میں پہلے وزیر اطلاعات و نشریات کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وزارت پر فائز ہونے کے بعد انہوں نے اخبارات کو ایڈوائس دینے کا سلسلہ بند کر دیا اور انہوں نے وزیراعظم جونیجو پر واضح کر دیا کہ خبر کو روکنے سے افواہیں جنم لیتی ہیں۔ اخبارات پر پابندیاں عاید کرنے سے جمہوری اقدار کو نقصان پہنچتا ہے اس لئے اخبارات کو سچ لکھنے اور تنقید کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ بعد میں جب قومی اسمبلی کے اسپیکر جناب فخر امام کے خلاف مسلم لیگ کی حکومت نے عدم اعتماد کی تحریک منظور کی تو حامد ناصر چٹھہ کو قومی اسمبلی کا اسپیکر بنایا گیا۔ وہ دسمبر ۱۹۸۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ (۱۱)

۱۹۸۸ء میں حامد ناصر چٹھہ نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا مگر بدقسمتی سے وہ اپنی سابقہ مقبولیت برقرار نہ رکھ سکے اور دونوں نشستوں پر پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدواروں سے شکست کھا گئے۔ قومی اسمبلی کی نشست پر انہیں ان کے پرانے حریف غلام حیدر چیمہ کے صاحبزادے غلام سرور چیمہ نے شکست دی جبکہ صوبائی اسمبلی کی نشست پر انہیں ۱۹۸۵ء میں ان سے دونوں نشستوں پر شکست کھانے والے چودھری سیف علی چٹھہ نے شکست دے دی۔ (۱۲)

حامد ناصر چٹھہ دو برس سیاست سے باہر رہے مگر اپنے سابقہ تجربے کے پیش نظر اس دوران وہ اپنے حلقہ کے ووٹرز سے مسلسل رابطے میں رہے۔ اس کا نتیجہ بڑا خوش کن برآمد ہوا اور ۱۹۹۰ء میں وہ باآسانی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے' انہوں نے اپنے حریف کرنل (ریٹائرڈ) غلام سرور چیمہ کو ۳۵ ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دی تھی۔ صوبائی اسمبلی میں بھی انہوں نے اپنی کارکردگی برقرار رکھی۔ یہاں انہوں نے پی ڈی اے کے میاں ساجد حسین تارڑ کو ۲۰ ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دی (۱۳) بعد میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی۔ جس پر ان کے حمایت یافتہ امیدوار نوازش علی چیمہ بلامقابلہ منتخب ہوئے (۱۴) بعد ازاں حامد ناصر چٹھہ میاں نواز شریف کی کابینہ میں بطور وزیر شامل ہوئے۔ انہیں منصوبہ بندی اور ترقیات کا قلم دان سونپا گیا۔ کابینہ میں رہنے کے باوجود حامد ناصر چٹھہ بعض امور پر وزیراعظم میاں نواز شریف سے اختلاف کرتے رہے۔ ان کے اختلافات اس وقت نقطۂ عروج پر پہنچ گئے جب میاں نواز شریف نے سابق وزیراعظم اور مسلم لیگ کے صدر محمد خان جونیجو کی وفات کے بعد مسلم لیگ کا صدر بننا چاہا۔ (۱۵) جب ان کی مخالفت کے باوجود نواز شریف مسلم لیگ کے صدر بننے میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے ۲۸ر مارچ ۱۹۹۳ء کو انور سیف اللہ اور اسد جونیجو کے ہمراہ وفاقی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا۔ (۱۶) بعد ازاں حامد ناصر چٹھہ نواز شریف کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ مگر ان کی یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ۱۸ر اپریل ۱۹۹۳ء کو غلام اسحٰق خان نے قومی اسمبلی برطرف کر کے نگراں حکومت تشکیل دے دی۔ حامد ناصر چٹھہ اس نگراں کابینہ کے ان دو ابتدائی وزراء میں شامل تھے جنہوں نے پہلے ہی دن حلف وفاداری اٹھالیا تھا۔ (۱۷) ۹ر مئی ۱۹۹۳ء کو حامد ناصر چٹھہ مسلم لیگ کے صدر اور اسد جونیجو چیف آرگنائزر منتخب ہوئے۔ (۱۸) یوں اب ان کی مناسبت سے مسلم لیگ کا یہ گروپ' جو محمد خاں جونیجو کے حامیوں پر مشتمل تھا' چٹھہ لیگ کہلانے لگا۔

چونکہ حامد ناصر چٹھہ نے ۱۸ر اپریل ۱۹۹۳ء کو نواز شریف حکومت کی برطرفی اور اسمبلیوں کے ٹوٹنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا اس لئے ایک سیاسی ہفت روزے نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے یاد دلایا کہ حامد ناصر چٹھہ کے والد چوہدری صلاح الدین چٹھہ نے بھی ملک غلام محمد کی جانب سے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو توڑنے کا خیرمقدم کیا تھا۔ (۱۹) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں حامد ناصر چٹھہ نے خود تو قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر کامیاب ہوئے ہی تھے (۲۰) ان کی جماعت پاکستان مسلم لیگ (ج) بھی' ایک بادشاہ گر جماعت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس جماعت نے قومی اسمبلی میں ۶ (۲۱) اور پنجاب اسمبلی میں ۱۸ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ (۲۲) نواز شریف نے حسب عادت انہیں ساتھ آنے کے لئے متعدد ترغیبات دیں مگر حامد ناصر چٹھہ ثابت قدم رہے۔ اور ان کی جماعت نے قومی اور صوبائی حکومتوں کی تشکیل میں پاکستان

پیپلز پارٹی کا بھرپور ساتھ دیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے اس کی قیمت بھی ادا کی اور نہ صرف پنجاب کا وزیراعلیٰ، پاکستان مسلم لیگ (ج) سے تعلق رکھنے والے شخص کو بنا دیا بلکہ مرکز میں بھی اس جماعت کو کئی اہم وزارتوں سے نوازا۔

۱۹۹۳ء کے ضمنی انتخابات میں چٹھہ خاندان کے ایک اور فرد محمد عارف چٹھہ بھی پنجاب اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے۔ سیاسی لحاظ سے ان کا تعلق پاکستان مسلم لیگ (ج) سے تھا اور وہ حامد ناصر چٹھہ کی خالی کردہ صوبائی نشست پر ایم پی اے منتخب ہوئے تھے۔ (۲۳)

فروری ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں حامد ناصر چٹھہ نے این اے ۴۷، گوجرانوالہ ا سے انتخاب لڑا مگر اپنے دیرینہ حریف کرنل (ر) غلام سرور چیمہ کے ہاتھوں، جو اب پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدوار تھے، شکست کھا گئے۔ (۲۴)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے گوجرانوالہ سے قومی اسمبلی کی دو اور صوبائی اسمبلی کی ایک نشست پر انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی کی ایک نشست پر وہ مسلم لیگ (ق) کے چودھری بلال اعجاز سے شکست کھا گئے تاہم دوسری نشست پر انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کی اسماء شاہنواز کو شکست دے دی۔ (۲۵) صوبائی اسمبلی کی نشست پی پی ۱۰۳، گوجرانوالہ ۱۳ پر بھی کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ (۲۶) تاہم بعد ازاں انہوں نے یہ نشست خالی کردی جس پر ضمنی انتخابات میں اکمل سیف چٹھہ کامیاب ہو گئے۔ (۲۷) اکمل سیف چٹھہ، حامد ناصر چٹھہ کے دیرینہ حریف سیف علی چٹھہ کے فرزند ہیں۔ (۲۸) تاہم اس انتخاب میں انہیں حامد ناصر چٹھہ کی حمایت حاصل تھی۔ (۲۹)

حامد ناصر چٹھہ کے صاحبزادے محمد فیاض چٹھہ گوجرانوالہ کی بلدیاتی سیاست میں سرگرم ہیں۔ وہ ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۵ء دونوں انتخابات میں گوجرانوالہ کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے ہیں انہیں ان انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کی حمایت حاصل تھی۔ (۳۰)

گوجرانوالہ میں چٹھوں کا ایک اور خاندان جو سیاست میں ہے۔ چودھری بشیر احمد چٹھہ کا خاندان ہے۔ چودھری بشیر احمد چٹھہ چودھری محمد حسین چٹھہ سے رشتہ داری کے باعث کونسل مسلم لیگ میں تھے۔ جب کونسل مسلم لیگ کی ٹکٹوں کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ ہونے لگا تو چودھری بشیر احمد چٹھہ نے صوبائی اسمبلی کے ٹکٹ کے لئے درخواست دی۔ اسی حلقہ سے کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ کے حصول کے لئے وزیر آباد کے ایک مستعدد وکیل چودھری محمد عارف چٹھہ آف بھاگے کوٹ نے بھی درخواست دے دی۔ چودھری محمد حسین چٹھہ نے سیاسی اصول پرستی کے باعث اپنے کزن چودھری بشیر احمد چٹھہ کو نظر انداز کر دیا اور یہ ٹکٹ چودھری محمد عارف چٹھہ کو اس لئے دے دیا گیا کہ انہوں نے چودھری صلاح الدین چٹھہ سے مل کر تحصیل وزیر آباد میں صدر ایوب خان کے مقابلے میں مادر ملت کا بھرپور ساتھ دیا تھا اس صورت حال میں چودھری بشیر احمد چٹھہ نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب

پارٹی کے چیئرمین کے انتخابی حلقہ میں بھی امیدوار تھے' بڑے معرکے کی تیاریاں ہوئیں مگر یہ انتخابات ملتوی ہو گئے۔ اس کے بعد پھر اگلے سال انتخابات کا ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا اس میں بھی وہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین کے مقابل امیدوار تھے۔

جولائی ۱۹۷۸ء میں چوہدری صاحب جنرل محمد ضیاء الحق کی اس کابینہ میں وفاقی وزیر محنت و افرادی قوت مقرر ہوئے جس میں پاکستان قومی اتحاد کے نمائندوں کو نمائندگی دی گئی۔ (۹)

جنرل ضیاء الحق کا عہد حکومت چوہدری ظہور الٰہی کو ہر لحاظ سے بڑا راس آیا۔ ایک جانب تو وہ مرکزی کابینہ میں وزارت کے مزے لوٹتے رہے اور دوسری جانب جنرل ضیاء نے بھٹو دشمنی میں انہیں نہ صرف لاکھوں روپوں کے نئے قرضوں سے نوازا بلکہ چالیس لاکھ روپے کے پرانے قرضے بھی معاف کر دیے (۱۰)

چوہدری صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے' وہ سیاست میں ہمیشہ اپنا راستہ خود بناتے تھے۔ ۸۰ کی دہائی کے شروع میں ایم آر ڈی کا چرچا جب زیادہ ہوا تو وہ اس کے مقابل پاکستان قومی اتحاد کی طرز پر ایک اتحاد قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کئی ماہ تک مختلف مکاتب فکر کے بے شمار لیڈروں اور سیاسی کارکنوں سے مسلسل مشورے کئے اور ایک متفقہ لائحہ عمل طے کر کے اس کا عنقریب اعلان کرنے والے تھے کہ ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۱ء کو لاہور میں انہیں قتل کر دیا گیا۔ (۱۱) اس وقت بھٹو کو سزائے موت سنانے والے جج جسٹس مولوی مشتاق احمد اور بھٹو کے مقدمہ قتل کے اسپیشل پبلک پراسیکیوٹر ایم اے رحمٰن بھی ان کی کار میں سفر کر رہے تھے۔ بعد میں اس قتل کی ذمہ داری میر مرتضٰی بھٹو نے قبول کر لی اور کہا کہ یہ ان کی تنظیم الذوالفقار کا کارنامہ ہے۔ (۱۲)

چوہدری ظہور الٰہی کی ناگہانی موت کے بعد ان کے بیٹے چودھری شجاعت حسین اور بھتیجے اور داماد چودھری پرویز الٰہی ان کے سیاسی جانشین کے طور پر ابھرے۔

چودھری شجاعت حسین ۱۹۴۵ء میں گجرات میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے لندن سے انڈسٹریل مینجمنٹ کا کورس پاس کیا اور پھر پاکستان واپس آ کر اپنے والد کے کاروبار کی نگرانی کرتے رہے۔ ۱۹۷۷ء میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کروائے تھے۔ ان کے جیتنے کے امکانات بھی روشن تھے مگر جب قومی اسمبلی کے نتائج کے اعلان کے بعد پاکستان قومی اتحاد نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا تو چودھری شجاعت حسین بھی اس مقابلے سے دستبردار ہو گئے۔ ۱۹۸۱ء میں ان کے والد کی وفات کے بعد انہیں مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا گیا۔

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات سے پہلے گجرات کی نوابزادہ خاندان اور چوہدری خاندان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے پیش نظر دونوں خاندانوں کے درمیان وفاقی حکومت کی ایماء پر

ایک معاہدہ کروایا گیا۔ جس کی رو سے گجرات کی دو نشستیں نوابزادہ خاندان کو اور دو نشستیں چوہدری خاندان کو دے دی گئیں۔ نوابزادہ خاندان کو تفویض کردہ دو نشستوں پر تو ان کے نمائندے بلامقابلہ منتخب ہو گئے۔ مگر چودھری شجاعت حسین کے مقابلے پر ایک خاتون نے کاغذات نامزدگی داخل کروا دیئے۔ جس کی بنا پر اس نشست پر مقابلہ تو ہوا مگر بازی پھر بھی چودھری شجاعت حسین ہی کے ہاتھ رہی۔ (۱۳)

انتخاب میں کامیابی کے بعد چودھری شجاعت جونیجو کابینہ میں وزیر صنعت بنائے گئے۔ انہوں نے اپنے دور وزارت میں گجرات کے عوام کی بھرپور خدمت کی جس کے صلہ میں ۱۹۸۸ء میں گجرات کے عوام کی بھاری اکثریت نے ان پر ایک بار پھر اعتماد کا اظہار کیا۔ (۱۴)

۱۹۸۹ء میں چودھری شجاعت حسین نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرنے میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔ ۱۹۹۰ء میں جب بے نظیر حکومت ختم ہوئی تو انہیں نگران کابینہ میں بطور وزیر شامل کر لیا گیا۔ (۱۵) اسی برس منعقد ہونے والے عام انتخابات میں ان کا مقابلہ چوہدری احمد مختار نے کیا۔ جنہیں پی ڈی اے کے علاوہ گجرات میں چوہدری خاندان کے دیرینہ حریف سروس گروپ کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس مرتبہ مقابلہ بڑا سخت رہا اور چودھری شجاعت اپنے قریب ترین حریف چوہدری احمد مختار سے فقط ۶ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے ہی کامیاب ہو سکے۔

یہاں یہ بات خصوصاً قابل ذکر ہے کہ چودھری شجاعت کے حاصل کردہ ووٹوں (۸۰،۸۶۱) کے مقابلے میں ان کے مخالفین کو ان سے ۳۲۶،۳۰ ووٹ زیادہ ملے تھے۔ مگر ان کے مخالفین کے ووٹ چونکہ آپس میں تقسیم ہو گئے تھے۔ اس لئے یہ بازی چوہدری شجاعت جیت گئے تھے۔ (۱۶)

۱۹۹۰ء میں نواز شریف حکومت کے قیام کے بعد چوہدری شجاعت ان کی کابینہ میں بطور وزیر داخلہ شامل کئے گئے۔ (۱۷) ۱۹۹۳ء کے بحران میں انہوں نے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ نواز شریف کا ساتھ دیا۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں چودھری شجاعت حسین نے دو حلقوں این اے ۸۰ گجرات ۱ اور این اے ۸۱ گجرات ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ دونوں حلقوں سے شکست کھا گئے۔ این اے ۸۰ میں انہیں نوابزادہ غضنفر علی گل نے اور این اے ۸۱ میں انہیں چوہدری احمد مختار نے شکست سے دوچار کیا (۱۸) ان انتخابات کے بعد انہوں نے سینٹ کا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا اور یہ انتخاب بلامقابلہ جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۹)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں چوہدری شجاعت حسین نے ایک مرتبہ پھر این اے ۸۱ گجرات ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور بڑی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ انتخابات کے بعد وہ نواز شریف کی کابینہ میں وزیر داخلہ کے منصب پر فائز ہوئے (۲۰) تاہم وہ اپنے کزن اور برادر نسبتی

چودھری پرویز الٰہی کو پنجاب کی وزارت اعلیٰ نہ ملنے پر کبیدہ خاطر ضرور ہوئے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں جونہی نواز شریف کی حکومت کا خاتمہ ہوا انہوں نے اسے نواز شریف سے جان چھڑانے کا سنہرا موقع جانا اور جنرل پرویز مشرف کی ایما پر پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ناراض امکان پر مشتمل ایک دھڑا بنا ڈالا۔ جس کا نام پاکستان مُسلم لیگ (قائداعظم) رکھا گیا اور جس کے سربراہ میاں محمد اظہر بنائے گئے۔

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں میاں اظہر خود تو کامیاب نہ ہو سکے تاہم مسلم لیگ (ق) نے اتنی نشستیں ضرور حاصل کر لیں کہ وہ پنجاب میں اکثریت سے اور مرکز میں جوڑ توڑ کے بعد حکومت بنا سکے۔ اس موقع پر چودھری شجاعت حسین کا وزارت عظمیٰ پر متمکن کیے جانے کی پیشکش ہوئی تاہم انہوں نے اپنے خاندان کے لیے پنجاب کی وزارت اعلیٰ لینے پر اکتفا کی اور مرکز میں حکومت میر ظفر اللہ جمالی کو سونپ دی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے پاکستان مُسلم لیگ (ق) کی سربراہی بھی خود حاصل کر لی۔

جون ۲۰۰۴ء میں جب میر ظفر اللہ جمالی مستعفی ہونے پر مجبور ہوئے تو فیصلہ ہوا کہ آئندہ وزیر اعظم جناب شوکت عزیز ہوں گے۔ مگر چونکہ جناب شوکت عزیز قومی اسمبلی کے رکن نہیں تھے اس لیے اس درمیانی عرصے کے لیے وزارت عظمیٰ کے عہدے پر چودھری شجاعت حسین فائز ہوئے اور جناب شوکت عزیز کے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے کے بعد اس عہدے سے از خود مستعفی ہوگئے (۲۱)

چودھری شجاعت کے بھائی چودھری وجاہت حسین نے ۱۹۸۷ء میں ڈسٹرکٹ کونسل کے انتخاب میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۸۸ء میں وہ پی پی ۹۳ گجرات ۳ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۲۲) ۱۹۹۰ء میں بھی انہوں نے اسی حلقے سے کامیابی حاصل کی۔ (۲۳)

چودھری وجاہت حسین نے ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں حصہ نہیں لیا تاہم ۱۹۹۷ء میں وہ پی پی ۹۳ گجرات ۳ سے ایک مرتبہ پھر پنجاب اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوگئے (۲۴)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر نوابزادہ غضنفر علی گل کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے (۲۵)

چودھری شجاعت حسین اور چودھری وجاہت حسین کے ایک بھائی چودھری شفاعت حسین ہیں جو ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۵ء میں گجرات کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے ہیں (۲۶)

چودھری شجاعت حسین، چودھری وجاہت حسین اور چودھری شفاعت حسین کے بہنوئی اور تایا زاد بھائی چوہدری پرویز الٰہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چودھری ظہور الٰہی کے خاندان میں وہی مرحوم چوہدری صاحب کے اصل سیاسی جانشین ہیں جو نہ صرف اپنے ضلع کی وسیع گروہی سیاست کے اسرار و رموز سے واقف ہیں بلکہ ان میں مخالف نقطۂ نظر رکھنے والے کو قائل کرنے کی بھی صلاحیتیں موجود

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چوہدری ظہور الٰہی مرحوم اپنی زندگی میں اکثر کہا کرتے تھے کہ پرویز میں شجاعت کے مقابلے میں سیاسی اہلیت اور قابلیت زیادہ ہے۔(۲۷)

چوہدری پرویز الٰہی ۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات میں پہلی مرتبہ ضلع کونسل گجرات کے رکن منتخب ہوئے۔۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۷ء کے بلدیاتی انتخابات میں وہ ضلع کونسل گجرات کے چیئرمین بنے۔۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں وہ بلا مقابلہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور وزیر بلدیات کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔(۲۸) ۱۹۸۶ء میں انہوں نے وزیر اعلیٰ نواز شریف کے خلاف محاذ آرائی کی اور ان کے خلاف پنجاب اسمبلی میں ایک مضبوط گروپ تشکیل دیا۔ جس میں پنجاب اسمبلی کے بعض معروف جاگیردار ارکان مثلاً ملک اللہ یار، نصر اللہ دریشک اور سردار رفیق حیدر لغاری بھی شامل تھے۔ اس محاذ آرائی کے نتیجے میں نواز شریف کا تو کچھ نہیں بگڑا البتہ چودھری پرویز الٰہی کو اپنی وزارت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ چودھری پرویز الٰہی کی حمایت میں ایک وزیر مخدوم الطاف احمد اور ایک مشیر سردار محمد صادق بھی مستعفی ہوگئے تھے مگر بعد میں چودھری شجاعت نے درمیان میں پڑ کر یہ معاملہ رفع دفع کروا دیا۔(۲۹)

۱۹۸۸ء میں پرویز الٰہی دوبارہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس مرتبہ بھی وہ صوبائی کابینہ کے رکن بنائے گئے اور انہیں ان کے وہی پرانے قلمدان (بلدیات اور دیہی ترقیات) سونپے گئے۔(۳۰)

۱۹۹۰ء میں چودھری پرویز الٰہی تیسری مرتبہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۸ء کی طرح اس مرتبہ بھی ان کی نظریں پنجاب کی وزارت اعلیٰ پر تھیں۔ مگر نواز شریف نے ان کی بجائے اپنے بااعتماد ساتھی غلام حیدر وائیں کو وزیر اعلیٰ بنا دیا اور چودھری پرویز الٰہی وائین کابینہ میں بھی بلدیات اور دیہی ترقیات کے وزیر کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔(۳۱)

۱۹۹۳ء میں چودھری پرویز الٰہی کا نام اس وقت پریس کی خبروں کا مرکز بنا جب انہوں نے نواز شریف حکومت کی بحالی کے بعد منظور وٹو کی حکومت کو تحریک عدم اعتماد کے ذریعہ الٹنے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے منظور وٹو کی وزارت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرنا چاہی مگر اس سے پیشتر کہ وہ تحریک ایوان تک پہنچتی، منظور وٹو نے اسمبلی ہی توڑ دی۔ اس کے بعد پنجاب میں تاریخ کی بدترین ہارس ٹریڈنگ دیکھنے میں آئی اور پرویز الٰہی نے اپنے حامی ارکان اسمبلی کو اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل پہنچا دیا۔ جہاں وہ کئی دن ''مقید'' رہے۔ اس کارروائی کے دوران متعدد ارکان اسمبلی کی سیاسی وابستگی کبھی ایک گروپ کے ساتھ ہو جاتی تھی کبھی دوسرے گروپ کے ساتھ۔ ارکان اسمبلی کے اس رجحان کی وجہ سے پریس میں ''لوٹا کریسی'' کی اصطلاح نے جنم لیا اور ایسے ارکان کو جو اپنی وابستگی باربار تبدیل کر رہے تھے۔ ''لوٹا'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان ارکان اسمبلی میں چوہدری محمد ریاض

(راولپنڈی)، تاج محمد خان زادہ (اٹک)، راجہ نصیر علی خان (جہلم)، چوہدری فرخ جاوید گھمن (سرگودھا)، احمد خان کھرل (سرگودھا)، ڈاکٹر محمد شفیق چوہدری (فیصل آباد)، خالد محمود خان (فیصل آباد)،نواز خان کلیار (فیصل آباد)، چوہدری محمد اکرم (فیصل آباد)، چودھری مظہر علی گل (فیصل آباد)، میاں شاہد نذیر (فیصل آباد)، محمد انور علی خاں (فیصل آباد)، سردار مراد گادھی (ٹوبہ ٹیک سنگھ)، مہر محمد سلیم (گوجرانوالہ)، چوہدری سکندر حیات ملہی (گجرات)، ایم نصیر خاں (گجرات)، حاکم علی بھٹی (لاہور)، واجد علی خاں (شیخوپورہ)، سردار طفیل خان (قصور)، ممتاز علی (قصور)، صلاح الدین ڈوگر (ملتان)، نواب لیاقت علی خاں (ملتان)، خضر حیات سیال (خانیوال)، لطیف مغل (ساہیوال)، جلال دین ڈھکو اور محمد طاہر محمود (بہاولنگر) کے نام سرفہرست تھے۔ چوہدری پرویز الٰہی اور منظور وٹو کی یہ محاذ آرائی نہیں معلوم کب تک جاری رہتی کہ ۱۸ر جولائی ۱۹۹۳ء کو ملک کی تمام اسمبلیاں ٹوٹ جانے سے اس کیفیت کا اختتام ہوگیا۔ (۳۲) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں چودھری پرویز الٰہی دو حلقوں سے صوبائی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ ان میں ایک حلقہ پی پی ۹۳ گجرات ۴ تھا جہاں وہ محمد سردار جوڑا کو شکست دے کر پنجاب اسمبلی کی رکن بننے میں کامیاب ہوگئے۔(۳۳) ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۶ء تک کا عرصہ انہوں نے پنجاب کے قائد حزب اختلاف کے طور پر گزارا۔ ۱۹۹۷ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر پی پی ۹۴ گجرات ۴ سے پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ اس مرتبہ وہ پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے امیدوار تھے مگر ان کی توقع کے برعکس یہ عہدہ میاں شہباز شریف کو مل گیا اور انہیں پنجاب اسمبلی کے اسپیکر کے عہدے پر قناعت کرنی پڑی ۱۹۹۹ء میں جب پاکستان مسلم لیگ (ق) کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کی پنجاب شاخ کے صدر بنے۔ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ دو حلقوں سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور حسب توقع پنجاب کے وزیر اعلیٰ بننے میں کامیاب ہوگئے۔ (۳۴)

چوہدری شجاعت حسین اور چوہدری پرویز الٰہی کے ایک کزن چوہدری تجمل حسین بھی گزشتہ کئی سال سے سیاست میں ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے این اے ۴۷ گجرات سے نوابزادہ مظہر علی کے مقابلے میں کاغذات نامزدگی داخل کروائے تھے مگر بعد میں نوابزادہ خاندان اور چوہدری خاندان کے درمیان انتخابی مفاہمت ہوجانے کے باعث انہوں نے اپنے کاغذات نامزدگی واپس لے گئے اور یوں نوابزادہ مظہر علی بلا مقابلہ رکن اسمبلی منتخب ہوگئے تھے۔ (۳۵)

۱۹۸۷ء میں چوہدری تجمل حسین نے ایک دیہی نشست پر بلدیاتی انتخاب لڑا اور اس نشست پر نواب زادہ مظہر علی کو شکست دی۔ چوہدری تجمل کی اس جیت نے ان کے حوصلوں کو مزید بڑھایا اور ۱۹۸۸ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ انہیں اسلامی جمہوری اتحاد نے اپنا امیدوار نامزد کیا جب کہ ان کے مخالف امیدوار نوابزادہ مظہر علی کو پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنا امیدوار

بنایا یہ معرکہ چودھری تجمل حسین کے ہاتھ رہا اور وہ ایک سخت مقابلے کے بعد قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے (۳۶) ۱۹۹۰ء میں پی ڈی اے نے چوہدری تجمل حسین کے مقابلے میں نوابزادہ غضنفر علی گل کو اپنا امیدوار نامزد کیا مگر وہ بھی چوہدری تجمل حسین کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور تقریباً ۳۰ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۳۷)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں چودھری تجمل حسین نے حصہ نہیں لیا جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ان کی نشست پر چودھری شجاعت حسین نے انتخاب لڑا جو نوابزادہ غضنفر علی گل سے شکست کھا گئے۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں چودھری تجمل حسین کے صاحبزادے چودھری مبشر حسین این اے ۸۰ گجرات سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۳۸)

چودھری تجمل حسین کی صاحبزادی اور چودھری مبشر حسین کی بہن تنزیلہ عامر ۲۰۰۲ء میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی ہیں (۳۹)

اس وقت چوہدری ظہور الٰہی کا خاندان رشتہ داریوں کے اعتبار سے پنجاب کا انتہائی بااثر خاندان بن چکا ہے اور اس خاندان کی رشتہ داریاں پنجاب بھر کے بڑے سیاسی اور غیر سیاسی خاندانوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چوہدری ظہور الٰہی وزیر آباد کے چوہدری ریاست علی چٹھہ کے سمدھی بھی تھے۔ اسی طرح پیپلز پارٹی کے سابقہ ایم این اے اور ضلع سیالکوٹ پیپلز پارٹی کے سابق صدر خورشید عالم چیمہ بھی اس خاندان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ سابق رکن صوبائی اسمبلی اور پیپلز پارٹی گجرات کے رہنما سرور جوڑا چوہدری تجمل حسین کے بہنوئی ہیں (۴۰) چودھری تجمل حسین کی صاحبزادی تنزیلہ عامر چودھری انور علی چیمہ کی بہو اور عامر سلطان چیمہ کی اہلیہ ہیں (۴۱) (انور علی چیمہ اور عامر سلطان چیمہ کا احوال چیمہ خاندان کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے)

چودھری ظہور الٰہی کے گھرانے کی رشتہ داری میانوالی کے روکڑی خاندان سے بھی قائم ہو چکی ہے۔ چودھری شجاعت حسین کے بھائی، سینئر امیر عبداللہ خان روکڑی کے بھانجے اور سابق صوبائی وزیر گل حمید خاں روکڑی کے داماد ہیں۔ چودھری خاندان کی ایک اور رشتہ داری اٹک کے کھٹڑ خاندان سے بھی ہے۔ اس خاندان کے سردار محمد صادق کے بیٹے میجر (ریٹائرڈ) طاہر صادق چودھری خاندان کے داماد ہیں (۴۲) طاہر صادق ۱۹۹۷ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۴۳) جب کہ ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۵ء میں وہ چکوال کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے (۴۴)

میجر (ر) طاہر صادق کی صاحبزادی ایمان وسیم ہیں جو ۲۰۰۲ء میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھیں مگر بعد میں انہوں نے اپنی یہ نشست جناب شوکت عزیز کو قومی اسمبلی کا رکن منتخب کروانے کے لیے خالی کر دی تھی۔ (۴۵)

چودھری ظہور الٰہی کے ایک اور داماد سابق جسٹس کرم الٰہی چوہان کے فرزند ہیں (۴۶)

حوالہ جات

۱۔ احمد سلیم۔ کیپنگ اٹ ان دی فیملی (انگریزی)۔ ویک اینڈ پوسٹ (روزنامہ فرنٹیر پوسٹ، لاہور)۔ ۲۵ر جون ۱۹۹۳ء۔ ص ۸

۲۔ پرویز حمید۔ چودھری ظہور الٰہی۔ جنگ میگزین (روزنامہ جنگ) لاہور۔ ۴ر تا ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۱ء۔ ص ۵

۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ۱۸۲، ۱۸۳

۴۔ پرویز حمید۔ چودھری ظہور الٰہی۔ جنگ میگزین (روزنامہ جنگ) لاہور۔ ۴ر تا ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۱ء۔ ص ۵

۵۔ احمد سلیم۔ کیپنگ اٹ ان دی فیملی (انگریزی)۔ ویک اینڈ پوسٹ (روزنامہ فرنٹیر پوسٹ، لاہور)۔ ۲۵ر جون ۱۹۹۳ء۔ ص ۸

۶۔ قدرت اللہ شہاب۔ شہاب نامہ۔ لاہور۔ ص ۹۰، ۹۱، ۷

۷۔ پرویز حمید۔ چودھری ظہور الٰہی۔ جنگ میگزین (روزنامہ جنگ) لاہور۔ ۴ر تا ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۱ء۔ ص ۶، ۷

۸۔ ادارہ۔ دی چوہدریز۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۳ر تا ۹ر اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۶

۹۔ پرویز حمید۔ چودھری ظہور الٰہی۔ جنگ میگزین (روزنامہ جنگ) لاہور۔ ۴ر تا ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۱ء۔ ص ۶، ۷

۱۰۔ ادارہ۔ دی چوہدریز۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۳ر تا ۹ر اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۲

۱۱۔ پرویز حمید۔ چودھری ظہور الٰہی۔ جنگ میگزین (روزنامہ جنگ) لاہور۔ ۴ر تا ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۱ء۔ ص ۶، ۷

۱۲۔ احمد سلیم۔ کیپنگ اٹ ان دی فیملی (انگریزی)۔ ویک اینڈ پوسٹ (روزنامہ فرنٹیر پوسٹ، لاہور)۔ ۲۵ر جون ۱۹۹۳ء۔ ص ۸

۱۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵۔ لاہور۔ ص ۶۰، ۶۲

۱۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵۔ لاہور۔ ص ۱۸۱، ۱۸۲

۱۵۔ طلعت اسلم، مظہر عارف۔ پولیٹیکل فیملیز آف پنجاب۔ ماہنامہ ہیرالڈ (کراچی)۔ الیکشن ۹۰ء اسپیشل ایشو۔ ص ۴۷

۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰۔ جلد دوم۔ ص ۴۲

۱۷۔ موسیٰ خان جلال زئی۔ کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟۔ لاہور۔ ص ۴۸۶

۱۸۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۷۴

۱۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۹۳ء

۲۰۔ ارشاد امین ۔ پارلیمینٹ بک ۱۹۹۷ء (جلد اول) لاہور۔ ص ۱۰۱
۲۱۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۳۱،۳۳۲
۲۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۸۹،۱۹۰
۲۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۶۱۱
۲۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۲۷۱
۲۵۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ ص ۲۵۴
۲۶۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء
۲۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ ص ۲۰۷
۲۸۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائریکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۰۔ لاہور۔ ص ۸۳
۲۹۔ احمد سلیم۔ کیپنگ اٹ ان دی فیملی (انگریزی)۔ ویک اینڈ پوسٹ (روزنامہ فرنٹیر پوسٹ، لاہور)۔ ۲۵ر جون ۱۹۹۳ء۔ ص ۸
۳۰۔ طاہر محمود ڈوگر۔ ہواز ہو اینڈ وہاٹ از وہاٹ۔ لاہور۔ ص ۶
۳۱۔ احمد سلیم۔ قریشیز آف ملتان۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور ۱۵ تا ۲۱ جولائی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳
۳۲۔ عدنان عادل۔ دی لوٹا گروپ۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور ۲۴ر تا ۳۰ جون ۱۹۹۳ء ص ۳
۳۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۳۹۱
۳۴۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۲۴۵
۳۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۶۳
۳۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۷۹،۱۸۱
۳۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۔ حصہ دوم۔ ص ۴۱
۳۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۶۶
۳۹۔ عابد تہامی۔ الیکشن ۲۰۰۲ء ۔ لاہور۔ ص ۴۴۱
۴۰۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۷ر اگست ۱۹۹۱ء
۴۱۔ عابد تہامی۔ الیکشن ۲۰۰۲ء لاہور۔ ص ۴۴۱
۴۲۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۷ر اگست ۱۹۹۱ء
۴۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۴۶
۴۴۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸ر اکتوبر ۲۰۰۵ء
۴۵۔ اورنگزیب۔ لاہور نامہ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۲۶ ستمبر تا ۲ اکتوبر ۲۰۰۵ء
۴۶۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۷ر اگست ۱۹۹۱ء

چیمے

سرگودھا ڈویژن کی سیاست پر گذشتہ کئی دہائیوں سے ٹوانے اور نون چھائے ہوئے ہیں مگر ان بڑے گھرانوں کی سیاست کے درمیان جن آباد کار گھرانوں نے آہستہ آہستہ اپنا مقام پیدا کیا ہے ان میں رانجھے' باجوہ' پراچہ' قریشی اور چیمے خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

چیمے راجپوت نسل سے تعلق رکھتے ہیں وہ پرتھوی راج چوہان کی شکست کے بعد پنجاب میں آباد ہوئے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ چھوٹو مل چوہان نے علاؤ الدین خلجی کے دور حکومت میں دریائے بیاس کے کنارے ایک شہر آباد کیا تھا۔ چھوٹو مل کے بعد اس کا پڑپوتا رانا کانگ اس خاندان کے سربراہ کے طور پر ابھر کر سامنے آیا اور چیمہ خاندان کا بانی کہلایا۔ چیمہ خاندان کی اکثریت نے اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ (۱) اس وقت اس خاندان کے افراد سرگودھا اور گوجرانوالہ سے لے کر پورے پنجاب میں پھیلے ہوئے ہیں۔

چیمہ خاندان سرگودھا کی سیاست میں اس وقت نمایاں ہوا جو ذوالفقار علی بھٹو نے اس خاندان کے حفیظ اللہ چیمہ کو قومی اسمبلی کا ٹکٹ عطا کیا۔ حفیظ اللہ چیمہ نے اس انتخاب کونسل مسلم لیگ کے چوہدری ظفر اللہ خان اور جماعت اسلامی کے محمد سلیم کو شکست فاش دی۔ (۲) حفیظ اللہ چیمہ بعد ازاں ذوالفقار علی بھٹو کی کابینہ میں بھی شامل ہوئے اور ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۴ء سے ۲۳ر مارچ ۱۹۷۷ء تک مسلسل مرکزی وزیر رہے۔ پہلے انہیں محنت' صحت اور سماجی بہبود کا قلم دان سونپا گیا پھر انہیں ریلوے کے محکمہ دے دیا گیا۔ (۳)

وفاقی وزارت کے دوران حفیظ اللہ چیمہ نے دارالاحسان سالار والا ضلع فیصل آباد کے صوفی برکت علی المعروف باوا جی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور وہ نماز پنجگانہ کے پابند ہو گئے۔ انہوں نے ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ اس مرتبہ بھی مسلم لیگی رہنما چوہدری ظفر اللہ خاں ان کے مدمقابل تھے۔ حفیظ اللہ چیمہ نے یہ معرکہ تقریباً ۴۱ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے جیت لیا۔ حفیظ اللہ

چیمہ کے مخالفین نے ان پر شدید دھاندلی کے الزمات عائد کیے۔ ان الزامات کی بازگشت پاکستان الیکشن کمیشن کے کانوں سے بھی ٹکرائی جس نے حفیظ اللہ چیمہ کے انتخاب کو کالعدم قرار دے دیا۔ ۱۹۷۷ء کے اس انتخاب کے بعد حفیظ اللہ چیمہ سیاست میں دوبارہ نمایاں نہ ہو سکے۔ (۴)

تاہم ایک طویل عرصے کے بعد ان کا نام ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں نظر آیا۔ ان انتخابات میں انہوں نے این اے ۶۷ سرگودھا ۴ سے پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹرین کے ٹکٹ پر حصہ لیا لیکن چوہدری انور چیمہ کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا گئے (۵)

چوہدری انور علی چیمہ ۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخاباتی سے سرگودھا کی سیاست میں نمایاں ہوئے اور ڈسٹرکٹ کونسل سرگودھا کے وائس چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں جب سرگودھا کی تحصیل خوشاب کو ضلع کا درجہ دیا گیا تو وہ ڈسٹرکٹ کونسل سرگودھا کے چیئرمین منتخب ہو گئے۔ انور علی چیمہ نے اس عہدے پر اہل سرگودھا کی بڑی خدمات انجام دیں اور پورے ضلع میں سڑکوں کا جال بچھا دیا۔ چنانچہ جب ۱۹۸۵ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تو اہل سرگودھا نے ان کی خدمات کو یاد رکھا اور نہ صرف قومی اسمبلی کا رکن منتخب کروا دیا بلکہ ان کے بہنوئی چودھری فرخ جاوید گھمن کو بھی پنجاب اسمبلی کا رکن بنوا دیا۔ (۶) چودھری فرخ جاوید گھمن بعد ازاں پنجاب اسمبلی میں زراعت اور بجلی کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ (۷)

۱۹۸۷ء کے بلدیاتی انتخابات میں چودھری انور علی چیمہ اور چودھری فرخ جاوید گھمن میں اختلافات پیدا ہوئے اور چودھری فرخ جاوید گھمن ضلع کونسل سرگودھا کے چیئرمین منتخب ہو گئے۔ یہیں سے ان کی راہیں جدا ہو گئیں۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات سے پہلے چودھری فرخ جاوید گھمن نے اپنی سیاسی وابستگی تبدیل کی اور پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے چودھری انور علی چیمہ کو نیچا دکھانے کیلئے انہیں قومی اسمبلی کے اسی حلقہ سے ٹکٹ دے دیا جس میں چودھری انور علی چیمہ انتخابات لڑ رہے تھے۔ یہ معرکہ چوہدری انور علی چیمہ نے تقریباً ۲۵ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے جیت لیا۔ (۸)

۱۹۹۰ء میں پیپلز پارٹی نے چودھری ریاض امیر عرف عبدالحق بھٹی کو این اے ۵۰ سرگودھا ۴ سے چودھری انور علی چیمہ کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ یہ مقابلہ چودھری انور علی چیمہ ہی کے ہاتھ رہا۔ (۹) ۱۹۹۳ء میں انور علی چیمہ نے ایک مرتبہ پھر این اے ۵۰ سرگودھا ۴ سے انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ بھی معرکہ انہی کے ہاتھ رہا اور یوں وہ مسلسل چوتھی مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۱۰)

چوہدری انور علی چیمہ نے اپنی کامیابیوں کا یہ تسلسل ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء میں بھی جاری رکھا۔ ۱۹۹۷ء کا انتخاب انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر لڑا تھا جبکہ ۲۰۰۲ء کے انتخابات سے پہلے وہ اپنی سیاسی رشتہ داریوں کی وجہ سے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ہم سفر بن چکے تھے (۱۱) انور علی

چیمہ ۲۰۰۵ء میں سرگودھا کے ضلعی ناظم کے عہدے کے امیدوار بھی تھے۔ مگر انتخابات سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے انعام الحق پراچہ نے اس شرط پر پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کر لی کہ انہیں سرگودھا کے ضلعی ناظم کے عہدے پر کامیاب کروایا جائے گا۔ انعام الحق پراچہ کو ایوان صدر کی آشیر واد حاصل تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انور علی چیمہ کو بڑی بدمزگی کے بعد ضلعی ناظم کے عہدے سے دستبردار ہونا پڑا اور انعام الحق پراچہ بڑی آسانی کے ساتھ سرگودھا کے ضلعی ناظم منتخب ہو گئے (۱۲)

۱۹۸۸ء میں این اے ۲۸ سے انور علی چیمہ کے بھائی صغیر سلطان انور چیمہ نے بھی انتخاب لڑا تھا مگر وہ پیپلز پارٹی کے چودھری قادر بخش میلہ سے شکست کھا گئے اس حلقے میں پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی کامیابی میں سب سے موثر پروپیگنڈا یہ تھا کہ وہ سرگودھا کو چیمہ اسٹیٹ نہیں بننے دیں گے۔ (۱۳)

۱۹۸۸ء ہی میں پی پی ۲۸ سرگودھا ۶ سے چودھری انور علی چیمہ کے بیٹے چودھری عامر سلطان چیمہ بھی صوبائی نشست کے لئے امیدوار تھے۔ وہ آزاد امیدوار چودھری ریاض امیر عرف عبدالحق بھٹی اور پیپلز پارٹی کے نثار احمد کو شکست دے کر یہ نشست جیتنے میں کامیاب رہے۔ (۱۴)

عامر سلطان چیمہ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں بھی کامیاب ہوئے اور غلام حیدر وائیں کی کابینہ میں لائیو اسٹاک کے وزیر بھی رہے۔ (۱۵)

عامر سلطان چیمہ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں کامیاب نہ ہو سکے اور وہ چودھری سراج الدین گوجر سے ۲۰۰۲ ووٹوں سے شکست کھا گئے (۱۶) تاہم ۱۹۹۷ کا انتخاب انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ن) اور ۲۰۰۲ کا انتخاب پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر جیتا تھا (۱۷)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں عامر سلطان چیمہ کی اہلیہ تنزیلہ عامر چیمہ بھی پاکستان مسلم لیگ (ق) کی نامزدگی پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہو گئیں۔ تنزیلہ عامر چیمہ، چودھری ظہور الٰہی کے بھتیجے چودھری تجمل حسین کی صاحبزادی اور چودھری مبشر حسین کی بہن ہیں۔ چودھری تجمل حسین اور چودھری مبشر حسین دونوں ہی مختلف ادوار میں قومی اسمبلی کے رکن رہ چکے ہیں۔ (۱۸)

ادھر چودھری فرخ جاوید گھمن نے اب قومی اسمبلی کی بجائے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا یہ فیصلہ درست ثابت ہوا اور وہ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء دونوں مرتبہ بآسانی پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ ۱۹۹۰ء کا انتخاب انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑا تھا۔ (۱۹) جبکہ ۱۹۹۳ کے انتخابات کے وقت انہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کا ٹکٹ حاصل تھا (۲۰) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ پاکستان مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے انہوں نے یہ انتخاب آزاد حیثیت میں لڑا۔ مگر مسلم لیگ (ن) کے امیدوار حاجی محمد اشرف کلیار کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۲۱) ۲۰۰۲ء میں عام انتخابات میں فرخ جاوید گھمن کا نام تو کہیں نظر نہیں آیا البتہ پی پی ۳۶ سرگودھا ۹ سے

چودھری فیصل جاوید گھمن نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا۔ وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدوار میاں محمد خالد کلیار سے شکست کھا گئے۔ ۲۰۰۳ء کے عام انتخابات میں چوہدری انور علی چیمہ کے بھتیجے اور چوہدری فرخ جاوید گھمن کے داماد چوہدری فیصل فاروق چیمہ نے بھی پاکستان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا اور سردار کامل شائل گوجر کو شکست دے کر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کا حلقہ انتخاب تھا پی پی ۳۵ سرگودھا ۸ (۲۲)

فرخ جاوید گھمن کی ہمشیرہ مسز رخسانہ بیگم ضلع سیالکوٹ سے سابق ایم این اے چودھری محمد سرفراز خان گواریہ کی بہو ہیں اور ۱۹۸۵ء میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھیں (۲۳)

سرگودھا ہی سے چیمہ برادری کے ایک اور فرد جاوید اقبال چیمہ بھی کامیابیوں کی ہیٹ ٹرک قائم کر چکے ہیں تاہم ۱۹۸۵ء میں وہ صوبائی اسمبلی کی نشست پر اور ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء میں قومی اسمبلی کی نشست پر کامیاب ہوئے تھے۔ (۲۴) جاوید اقبال چیمہ کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات کے لئے انہیں پاکستان اسلامک فرنٹ نے اپنا نمائندہ نامزد کیا تھا اس لئے وہ اس مرتبہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۵)

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں این اے ۴۷ سرگودھا سے بریگیڈیر (ریٹائرڈ) غلام حسین چیمہ بھی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ہیں۔ انکا تعلق بھی پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) سے ہے۔ (۲۶)

چوہدری انور علی چیمہ کا خاندان پنجاب کے کئی اور معروف گھرانوں سے رشتہ داریوں کے ذریعہ بھی جڑا ہوا ہے۔ انور علی چیمہ کے بیٹے چودھری عامر سلطان چیمہ، چودھری ظہور الٰہی کے بھتیجے چودھری تجمل حسین کے داماد ہیں۔ قصور کے سردار عارف نکئی انور علی چیمہ کے برادر نسبتی تھے۔ سردار عارف نکئی پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے تھے جبکہ انکے داماد طالب حسین نکئی قومی اسمبلی کے رکن رہ چکے ہیں۔ (۲۷)

سرگودھا میں آباد چیموں کے علاوہ گوجرانوالہ میں آباد چیمے بھی عرصہ دراز سے میدان سیاست میں ہیں۔

ایڈورڈ ایچ لنکن نے گوجرونوالہ ڈسٹرکٹ گزیٹئر (۱۹۳۶) میں لکھا ہے کہ تحصیل وزیر آباد کے مشرقی نصف حصے میں اور تحصیل گوجرانوالہ کے شمال مشرقی حصے میں چیموں کے ۱۳ گاؤں ہیں یہ ضلع کا سب سے اہم زراعت پیشہ قبیلہ ہے اور تمام کا تمام مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ تقسیم سے پہلے اس قبیلے کا جو فرد سیاست میں نمایاں ہوا وہ چوہدری علی احمد چیمہ تھا۔ وہ مجلس قانون ساز کا رکن بھی رہا اور میونسپل کمیٹی کے وائس چیئرمین کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔

اس قبیلے کے ایک فرد غلام حیدر چیمہ تھے انہوں نے ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں حامد ناصر چٹھہ کو شکست دی۔ انہی غلام حیدر

چیمہ کے صاحبزادے کرنل (ریٹائرڈ) غلام سرور چیمہ ہیں۔ جنہوں نے ۱۹۸۸ء میں حامد ناصر چٹھہ کو تقریباً چھ ہزار ووٹوں سے شکست دی تاہم ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں وہ اپنی کامیابی کا تسلسل برقرار نہ رکھ سکے اور انہی حامد ناصر چٹھہ سے قریباً ۳۵ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۲۸)

۱۹۹۳ء کے انتخاب کے موقع پر چونکہ حامد ناسر چٹھہ کا پاکستان پیپلز پارٹی سے انتخابی اتحاد تھا اس لیے پیپلز پارٹی نے ان کے مقابلہ میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا البتہ کرنل (ریٹائرڈ) غلام سرور چیمہ جو اپنے طور پر آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہو گئے تھے انہیں سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ حامد ناصر چٹھہ کے ۷۹ ہزار ووٹوں کے مقابلے میں فقط ۴ ہزار کے لگ بھگ ووٹ ہی حاصل کر سکے۔ (۲۹)

پیپلز پارٹی کی سرد مہری کے باعث کرنل غلام سردار چیمہ ۱۹۹۷ء میں اپنی جماعتی وابستگی بدلنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ یہ انتخاب انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر لڑا اور حامد ناصر چٹھہ کو شکست دے کر دو سابقہ ناکامیوں کا بدلہ لے لیا۔ (۳۰) وہ صوبائی اسمبلی کی نشست پر بھی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے (۳۱) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے خود حصہ نہیں لیا تھا لیکن انتخابات کے بعد اپنی صاحبزادی سائرہ طارق کو مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا رکن بنا دیا (۳۲) صوبائی اور قومی اسمبلی کے انتخابات میں ان کے بیٹے سرور چیمہ نے آزاد امیدوار کے طور پر حصہ لیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا (۳۳)

گوجرانوالہ سے چیمہ برادری ہی کے دو دیگر افراد سیاست کے میدان میں نمایاں ہیں۔ ان میں پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) کے ظفر اللہ چیمہ' محمد اعظم چیمہ اور نوازش علی چیمہ وار پاکستان پیپلز پارٹی کے چوہدری محمد شاہنواز چیمہ کے نام نمایاں ہیں۔

ظفر اللہ چیمہ اور محمد اعظم چیمہ ۱۹۸۵ء' ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء تینوں انتخابات میں ایم پی اے منتخب ہوئے تھے (۳۴) تاہم دونوں ہی امیدوار ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں شکست کھا گئے (۳۵)

ظفر اللہ چیمہ اور محمد اعظم چیمہ ۱۹۹۷ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب رہے (۳۶) ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں ظفر اللہ چیمہ کے صاحبزادے ڈاکٹر سہیل ظفر چیمہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۳۷) محمد اعظم چیمہ نے این اے ۹۸ گوجرانوالہ ۴ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر پاکستان پیپلز پارٹی کے امتیاز صفدر کے ہاتھوں شکست کھا گئے انہی انتخابات میں اعظم چیمہ کے بھائی ناصر چیمہ بھی صوبائی اسمبلی کی نشست کے امیدوار تھے۔ مگر وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے (۳۸)

نوازش علی چیمہ ۱۹۹۰ء کے ضمنی انتخابات میں حامد چٹھہ کی خالی کردہ نشست پر بلا مقابلہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۳۹) تاہم ۱۹۹۳ء میں جب ان کا مقابلہ حامد ناصر چٹھہ سے ہوا تو وہ تقریباً سات ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۴۰)

محمد شاہنواز چیمہ ۱۹۸۸ء میں پی پی ۷۷ گوجرانوالہ ا سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر حصہ لیا اور اس مرتبہ بھی نہ صرف کامیابی ان کا مقدر بنی بلکہ وہ منظور احمد وٹو کی کابینہ میں وزیر بھی بن گئے۔ انہیں اوقاف کا قلمدان سونپا گیا (۴۱)

شاہنواز چیمہ ۱۹۹۷ء میں پہلے غلام سرور چیمہ سے عام انتخابات میں اور پھر ظفر اقبال ملک سے ضمنی انتخابات میں شکست کھا گئے۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں انہوں نے گریجویشن کی شرط عاید ہونیکی وجہ سے خود تو حصہ نہیں لیا مگر اپنی صاحبزادی اسماء شاہنواز کو این اے ۱۰۱ گوجرانوالہ سے پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر لڑوا دیا۔ جو حامد ناصر چٹھہ سے شکست کھا گئیں۔ (۴۲)

سرگودھا اور گوجرانوالہ کے چیموں کے علاوہ گزشتہ چند برس میں سیالکوٹ کی سیاست کے افق پر بھی ایک چیمہ خاندان نمایاں ہوا ہے۔ اس خاندان کے اکمل چیمہ ۲۰۰۱ء میں تحصیل ناظم اور ۲۰۰۵ء میں ضلع ناظم کا انتخاب جیتے ہیں (۴۳) ان کے بڑے بھائی اجمل چیمہ نے ۲۰۰۲ء میں سیالکوٹ سے پی پی ۱۲۱ سیالکوٹ ا سے پنجاب اسمبلی کی نشست سے جیتی اور پرویز الٰہی کی کابینہ میں وزیر صنعت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ (۴۴) اجمل چیمہ کے ایک بیٹے کی شادی میجر (ر) طاہر صادق کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ (۴۵) طاہر صادق چودھری شجاعت حسین کے بہنوئی اور چودھری پرویز الٰہی کے ہم زلف ہیں۔ طاہر صادق کی ایک اور بیٹی ایمان وسیم ۲۰۰۲ء میں اٹک سے قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھیں مگر انہوں نے اپنی یہ نشست جناب شوکت عزیز کے لیے خالی کر دی تھی (۴۶) میجر (ر) طاہر صادق ۱۹۹۷ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن اور ۲۰۰۱ء میں اٹک کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے تھے (۴۷) ۲۰۰۵ء میں انہیں دوبارہ ضلعی ناظم منتخب کروا لیا گیا (۴۸) طاہر صادق کے والد سردار محمد صادق خاں کھٹڑ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے اور قائداعظم کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دینے کا اعزاز رکھتے تھے۔ وہ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۰ء میں اٹک سے پنجاب اسمبلی کے رکن اور چھ مرتبہ کونسل اٹک کے رکن منتخب ہوئے تھے (۴۹)

ابھی سردار محمد صادق کا دور رکنیت جاری تھا کہ طویل عرصہ تک بیمار رہنے کے بعد ۱۵ فروری ۱۹۹۱ء کو ان کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ سردار صاحب اٹک میں آسودہ خاک ہوئے (۵۰) ان کے انتقال کے بعد ان کی نشست پر منعقد ہونے والے ضمنی انتخاب میں انکی بیوہ بیگم مسرت سلطان نے حصہ لیا اور بڑی آسانی سے ساتھ پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہو گئیں۔ انہوں نے ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں بھی حصہ لیا اور ایک مرتبہ پھر اپنی نشست (پی پی ۱۲ اٹک ا) سے پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں (۵۱) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں میجر (ر) طاہر صادق اسی نشست پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۵۲)

حوالہ جات

۱۔ ظفر جھنڈیر، ارشاد علی، ایم اکبر رانا۔ تاریخ راجپوت۔ کراچی۔ ص۱۰۰، ۱۰۱

۲۔ ادارہ۔ پنجاب کے انتخابی نتائج کی غیر سرکاری تفصیلات۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۱۴ر تا ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۰ء۔ ص۱۲ تا ۱۴

۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص۴۸۵، ۴۸۶

۴۔ طارق اسمٰعیل۔ ٹوانوں کے سیاسی نشیب و فراز کی کہانی۔ نوائے وقت میگزین (روزنامہ نوائے وقت) لاہور۔ ۲۶ر جولائی تا یکم اگست ۱۹۸۵۔ ص ۳

۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ (جلد دوم) اسلام آباد۔ ص ۳۰

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۷۹ تا ۸۵

۷۔ پنجاب اسمبلی ۱۹۸۷ء۔ گولڈن جوبلی سووینیر۔ لاہور۔ ص ۶۲

۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۲۰، ۴۴۲

۹۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۴۴۳

۱۰۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۶۴

۱۱۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۲۷۴

۱۲۔ اورنگ زیب۔ لاہور نامہ۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۲۶ر ستمبر تا ۲ر اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ ص ۱۶

۱۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۱۹

۱۴۔ ایضاً۔ ص ۱۲۴

۱۵۔ موسیٰ خان جلال زئی۔ کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟۔ لاہور۔ ص ۴۸۸

۱۶۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام اباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳۔ ص ۱۳۶۴

۱۷۔ (i) گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰ر فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۲۷۲

(ii) گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۹۹۶

۱۸۔ عابد تہامی۔ الیکشن ۲۔ لاہور۔ ص ۴۴۱

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰۔ جلد دوم۔ ص ۱۷۴

۲۰۔ روزنامہ دی نیشن لاہور۔ ۲۳ر ستمبر ۱۹۹۳ء

۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰ر فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۲۷۲

۲۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۹۹۸

۲۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۳۰۰

۲۴۔ گزٹ آف پاکستان۔ ۲۸/مارچ ۱۹۸۵ء ص ۲۵۶۶، ۳/دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۳۵۴۰۔ ۱۱/نومبر ۱۹۹۰۔ص ۹۲۰۳

۲۵۔ ایضا۔۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۲۶۴

۲۶۔ ایضا۔۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۲۶۳

۲۷۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ خصوصی ایڈیشن روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۷/اگست ۱۹۹۱ء

۲۸۔ احمد سلیم۔ دی چٹھاز اینڈ چیماز آف گوجرانوالہ۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۲۳/۔ ۲۹/ستمبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۳

۲۹۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۲۷۱

۳۰۔ ارشاد امین۔ پارلیمینٹ بک ۱۹۹۷ء۔ لاہور۔ص ۹۴

۳۱۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰ فروری ۱۹۹۷ء۔ص ۲۹۲

۳۲۔ عابد تہامی۔ الیکشن ۲۔ لاہور۔ص ۴۴۱

۳۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ص ۴۰، ۱۵۲

۳۴۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔ص ۷۵

۳۵۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۳۸۶، ۱۳۸۷

۳۶۔ ایضاً۔۲۰/فروری ۱۹۹۷ء۔ص ۲۹۵

۳۷۔ ایضاً۔۲۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ص ۳۰۱۷

۳۸۔ ایضاً۔۲۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء ۔ص ۲۹۲۰، ۳۰۱۶

۳۹۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر)۔ ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔ص ۷۹

۴۰۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۳۸۳

۴۱۔ امان اللہ خان (مرتب) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۳ء۔ لاہور۔ص ۱۵۹، ۳۲۸

۴۲۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ص ۲۷۵

۴۳۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۹/اکتوبر ۲۰۰۵ء

۴۴۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۵/جنوری ۲۰۰۳ء

۴۵۔ روزنامہ دی نیشن لاہور۔ ۴/ستمبر ۲۰۰۵ء

۴۶۔ اورنگ زیب، لاہور نامہ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۲۶/ستمبر تا ۲/اکتوبر ۲۰۰۵ء

۴۷۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ص ۳۴۶

۴۸۔ روزنامہ ڈان۔ کراچی۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء
۴۹۔ امان اللہ (ایڈیٹر) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۱۵
۵۰۔ امان اللہ (ایڈیٹر) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۳۵
۵۱۔ امان اللہ (ایڈیٹر) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۳ء۔ لاہور۔ ص ۹۵
۵۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰ فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۲۶۷

خلف زئی پٹھان

نواب محمد احمد خان کا قتل پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ یہ وہی قتل ہے جس کے الزام میں پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت دی گئی تھی۔ نواب محمد احمد خان کا تعلق قصور کے خلف زئی رئیسوں کے خاندان سے تھا جو اس علاقے میں اکبر اعظم کے عہد میں آباد ہوئے تھے۔

سر لیپل ایچ گریفین، کرنل چارلس فرانسس میسی، میجر کونران اور سر ایچ ڈی کریک کی معرکہ آرا تصنیف چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب میں اس خاندان کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ سید نوازش علی نے ''تذکرہ روسائے پنجاب'' کے نام سے کیا تھا۔ اس کتاب کے مصنفین، خلف زئی رئیسوں کی تاریخ کے باب میں لکھتے ہیں۔

''خلف زئی رئیسوں کے جد امجد خویشگی افغان تھے۔ ۱۵۲۵ء میں اپنی خانہ جنگیوں اور آئے دن کے جھگڑوں سے تنگ آ کر انہوں نے اپنے وطن ارغستان اور یکاتوت سے پنجاب کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا۔ راستے میں اتفاقیہ طور پر ان کی ملاقات ظہیر الدین بابر سے ہوئی جو ہندوستان فتح کرنے کے ارادے سے ہندوستان آ رہا تھا۔ بابر نے سلطان سلیم خان جمند جیسے قابل کمانڈر کے ماتحت بہت سے چست و چالاک ہتھیار بند اور تلوار کے دھنی دیکھ کر انہیں اس وعدے کے تحت اپنی فوج میں شامل کر لیا کہ دہلی کے مالیہ کی ایک چوتھائی رقم ان کے حوالے کر دی جایا کرے گی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وعدے کے مطابق ایک سند لکھ دی گئی۔ اس وعدے کی ایفا کی غرض سے خویشگی افغانوں نے کرائے کے سپاہی بننا قبول کر لیا اور بابر کی قیادت میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کی فوج کا نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں خویشگی افغانوں کے سات سو جوان کام آئے۔ اسی جاں نثارانہ خدمت کی وجہ سے مغل شہنشاہ خویشگی افغانوں کی خاص قدر و منزلت کرتے رہے اور ان

کو بڑی بڑی ذمہ داریوں کے عہدے عطا کرتے رہے۔

۱۵۶۹ء میں جب شہنشاہ اکبر کے یہاں شہزادہ سلیم پیدا ہوا تو اکبر نے اس کی پیدائش کی خوشی میں ایک دربار منعقد کیا۔ اس دربار میں خویشگی سردار شریک نہیں ہو سکے کیونکہ اس وقت وہ بنگال میں فتوحات میں مشغول تھے۔ ان کی اس غیر حاضری کا ابوالفضل اور ٹوڈرمل نے فائدہ اٹھایا اور وہ اکبر کو خویشگی سرداروں سے بدظن کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے شہنشاہ اکبر کی خدمت میں عرض کی کہ خویشگی سردار اس کے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں منعقد ہونے والے دربار میں جان بوجھ کر حاضر نہیں ہوئے ہیں۔ اکبر نے حکم صادر کیا کہ خویشگی افغانوں کی جاگیروں میں آہستہ آہستہ کمی کر دی جائے۔ اکبر نے یہ حکم بھی دیا کہ یہ لوگ دارالحکومت سے دور، جہاں چاہیں رہائش اختیار کر لیں چنانچہ ۱۵۸۰ء کے قریب یہ پورا قبیلہ دہلی سے نقل مکانی کر کے اس مقام پر آ گیا جہاں شکر پور (اب قصور) کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نقل مکانی اور نئی آبادکاری کا یہ پورا عمل ابوالفضل کی نگرانی میں اپنے انجام کو پہنچا۔

اس وقت اس علاقے کا ناظم راجہ رائے سنگھ تھا جس نے خویشگی افغانوں کو خوش آمدید کہا اور ان سے اپنے علاقے کے ڈاکوؤں اور لیٹروں کے خلاف مدد مانگی جو اسے اس کے علاقے میں مالیہ جمع نہ کرنے دیتے تھے خویشگی افغانوں نے ان ڈاکوؤں کے سرغنہ پیرا بلوچ کو زندہ گرفتار کر کے راجہ رائے سنگھ کے حوالے کر دیا اور اس طرح لکھی کا جنگل ان ڈاکوؤں کے چنگل سے آزاد کروالیا۔ اس واقعے کے بعد شہنشاہ اکبر نے راجہ رائے سنگھ کو دہلی بلا لیا اور ستلج اور راوی کا درمیانی علاقہ، جو چالیس لاکھ مالیت کا تھا، بطور جاگیر علی الدوام، نواب نظر بہادر خان اتمان زئی خویشگی کو عطا کر دیا جو اس وقت اس خاندان کا بزرگ اعلیٰ تھا۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسی جاگیر کے ملنے پر خویشگی سرداروں نے نئے شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام اپنے محلات کی بنا پر قصور رکھ دیا۔ (قصور، قصر کی جمع ہے جو عربی زبان میں محل کو کہتے ہیں) نواب نظر بہادر کی وفات کے بعد نواب شمس الدین اور نواب قطب الدین علی الترتیب وادی کانگڑہ، جونا گڑھ اور سورت وٹھٹھہ کے فوجدار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے چتوڑ گڑھ کے قلعہ کو بھی فتح کیا جس کے عوض انہیں ہانسی اور حصار میں بھی جاگیریں عطا ہوئیں۔ قطب الدین نے دکن اور بیجاپور میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں نواب خان زادہ خان خلف زئی، ڈیرہ دین پناہ کا فوجدار تھا اور اس خاندان کے کئی افراد شش ہزاری اور ہفت ہزاری کی بڑی بڑی منصب داریوں پر فائز تھے۔

جب سلطنت مغلیہ میں زوال کے آثار نمودار ہوئے تھے تو نواب حسین خان خلف زئی

اور لاہور کے مغل گورنر نواب عبدالصمد خان میں بڑی دشمنی تھی۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان بہت سی لڑائیاں ہوئیں ان تمام لڑائیوں میں خویشگی افغان ہی فتح یاب رہے مگر جب ان روہیلہ افغانوں کو جو ہندوستان اور افغانستان کے درمیان تجارت کرتے تھے، خویشگی افغانوں نے قتل کیا اور قصور سے بے دخل کر دیا تو نواب عبدالصمد خان نے انہیں اپنی فوج میں بھرتی کر لیا اور ستر ہزار افراد کو فوج لے کر قصور پر حملہ کر دیا۔ اس نازک وقت میں خویشگی افغان صرف دس ہزار افراد جمع کر سکے اگرچہ انہوں نے حملہ آور فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر ان کے سربراہ خاندان نواب حسین خلف زئی خویشگی کے مارے جانے سے جنگ کا منظر نامہ بدل گیا۔ اس جنگ میں خویشگی افغانوں کے اور بھی بہت سے سردار مارے گئے۔

جب نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو بچے کھچے خویشگی افغانوں نے مغلیہ سلطنت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا مگر جب احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں سے لڑنے کے لیے پنجاب میں وارد ہوا تو خویشگی سردار نواب ولی داد خان نے اپنی فوج کے ساتھ خود کو حملہ آور کے حوالے کر دیا اور اپنے نئے آقا کے ہمراہ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی۔ اس امداد کے صلے میں احمد شاہ ابدالی نے نواب ولی داد خان کو نواب اور سیف الدولہ کے خطابات، ایک اصفہانی تلوار اور بڑا قیمتی خلعت عطا کیا۔

نواب ولی داد خان کی وفات کے بعد ۱۷۶۴ء میں سردار ہری سنگھ بھنگی اور جسا سنگھ آہلو والیہ نے قصور پر حملہ کیا اور شہر کو آگ لگا دی۔ اس حملے میں بہت سے خویشگی افغان مارے گئے اور جو باقی بچے وہ مفلسی اور گمنامی کا شکار ہو گئے۔ اس وقت نواب ولی داد کے بیٹے سردار شہباز خاں نے ملتان کے پٹھان گورنر نواب مظفر خان سدوزئی کی مدد سے قصور پر دوبارہ قبضہ کرنا چاہا مگر ناکام رہا اس کے بعد سردار شہباز خان نے پلٹ کر اٹاری اور ڈنڈیانوالی پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور وہاں ایک قلعہ اور تھانہ قائم کر لیا۔ سردار شہباز خان نے دریائے ستلج کے اردگرد کچھ مضافات پر بھی قبضہ کر لیا۔ اسکے بعد سردار گلاب سنگھ نے سردار شہباز کی جاگیر واپس کر دی یوں ۱۸۰۴ء میں خویشگی افغان دوبارہ قصور کے حاکم ہو گئے۔

ابھی انہیں قصور کا قبضہ دوبارہ حاصل کیے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ۰۸۔۱۸۰۷ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے قصور پر حملہ کر کے پہلے تو سردار شہباز خان کی جاگیر ضبط کر لی مگر پھر چند مواضعات گزارے کے لیے واپس کر دیئے۔ سردار شہباز خان کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سردار قمر الدین نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کر لی۔ مہاراجہ نے اسے خلعت عطا کیا اور بدلے میں وہ اصفہانی تلوار حاصل کر لی جو احمد شاہ ابدالی نے نواب ولی داد خان کو عطا کی تھی۔ سردار قمر الدین کے بعد اس کا بیٹا ناصر الدین خان بھی رنجیت سنگھ کا وفادار

رہا۔

سردار ناصر الدین نے پہلے تو کشمیر کی بغاوت فرو کرنے میں خالصہ دربار کی خدمت سرانجام دی اور بعد میں پانچ سو سواروں کی امداد سے دیوان ساون مل کے ایک کاردار، دیوان سورج بھان کو قتل کر دیا۔ دیوان سورج بھان کا جرم یہ تھا کہ اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بعض املاک کو لوٹ لیا تھا ان خدمات کے صلے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار ناصر الدین کو قصور کے قریب ایک موضع بطور جاگیر عطا کیا۔

کچھ دن بعد جب انگریزوں نے پنجاب میں فتوحات کا آغاز کیا تو سردار ناصرالدین نے ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے انگریزوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ ۱۸۴۸ء میں اس نے میجر ایڈورڈز کی ماتحتی میں چنیوٹ کا قلعہ فتح کیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس نے انگریز فوج میں ۱۳۵ سوار بھرتی کروائے اور خود بھی کئی لڑائیوں میں جنگی خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کے صلے میں انگریزوں نے اس کی قصور کی جاگیر بحال رکھی اور جنگ کے خاتمے پر اسے وائسریگل درباری کا منصب عطا کیا۔(۱)"

سردار ناصر خان نے ۱۸۵۷ء میں وفات پائی اس کے دو بیٹے تھے۔ سائیں میر باز خان اور سردار محمد ذوالفقار خان۔ سائیں میر باز خان مفلوج ہونے کی وجہ سے عملی طور پر کچھ کرنے کے قابل نہ تھا۔ ادھر سردار محمد ذوالفقار خان ۱۸۸۶ء میں قصور میونسپلٹی کا صدر بن گیا۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر اسے خلعت عطا ہوا۔

سردار محمد ذوالفقار خان نے ۱۹۰۲ء میں وفات پائی۔ اس وقت سائیں میر باز خان زندہ تھا تاہم خاندان کی سرداری کا حق دار سردار ذوالفقار خان کے صاحبزادے سردار شہباز خان کو سمجھا گیا۔

سردار شہباز خان نے بھی انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ۱۹۰۷ء کی سیاسی افراتفری کے دنوں میں اس نے پنجاب کے کسانوں کی بغاوت کچلنے میں انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اس نے انگریزی فوج میں سینکڑوں سپاہی بھرتی کروائے اور مالی طور پر بھی انگریزی حکومت کی امداد کی۔ ان خدمات کے بدلے میں اسے ڈھائی سو روپے سالانہ کی جاگیر' ایک تلوار' خان صاحب کا خطاب اور جنگی بیج عطا ہوا۔

۱۹۱۹ء میں جب انگریزوں نے جلیانوالہ باغ میں ہندوستانیوں کا قتل عام کیا تو سردار شہباز خان نے ایک انگریز عورت مسز شیروڈ کی جان بچائی اور اپنی نگرانی میں ہندوستانیوں کو کوڑے لگوائے۔ ان خدمات کے بدلے میں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے اسے ۲۰۰ روپے کا

خلعت اور ۲۵۰ روپے کی مزید جاگیر عطا کی۔ فروری ۱۹۲۲ء میں اسے ہز رائل ہائنس دی پرنس آف ویلز سے ملاقات کے لئے بھی منتخب کیا گیا۔ وہ لگاتار چار مرتبہ قصور میونسپلٹی کا صدر منتخب ہوا۔ اسے آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، اعزازی مجسٹریٹ اور قصور کے واحد پراونشل درباری کے مناصب عطا کئے گئے یہی نہیں، انگریزوں نے اس کے چھوٹے بھائی سردار فتح باز خان کو پہلے پولیس میں سب انسپکٹر کے عہدے پر بھرتی کیا پھر اسے فوج میں کمیشن دیا گیا۔ لیکن وہ بیماری کے باعث ان عہدوں پر زیادہ عرصہ کام نہ کر سکا اور ۱۹۲۶ء میں لاولد وفات پا گیا۔

ادھر سائیں میر باز خان نے ۱۹۱۳ء میں وفات پائی۔ اس کے انتقال کے بعد لوگ اسے ایک پیر کی طرح پوجنے لگے۔ قصور میں آج بھی اس کے مزار پر منتیں مرادیں مانی جاتی ہیں۔

سائیں میر باز خان کا بیٹا سردار شیر باز خان تھا۔ انگریزوں نے اسے بھی اعزازی مجسٹریٹ اور سول جج کے مناصب اور خان بہادر اور سی آئی ای کے خطابات عطا کئے۔ ۱۸۸۶ء میں اس نے برما میں فوجی خدمات انجام دیں۔ اپنے باپ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۲۶ء میں اس کا بھی انتقال ہو گیا (۲)۔

سردار شیر باز خان کے چار بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام غلام احمد خان تھا جو میونسپل کمشنر اور وائسرائے کا درباری تھا۔ تاہم سردار شیر باز خان کے جس بیٹے نے زیادہ شہرت حاصل کی وہ اس کا دوسرا بیٹا نواب محمد احمد خان تھا۔

نواب محمد احمد خان ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ۱۹۲۶ء کی عام ہڑتال کے دوران انگلستان میں بطور اسپیشل کانسٹیبل کام کیا۔ اس خدمت کے صلے میں اسے انگلستان کے وزیر اعظم اسٹینلے بالڈون اور ہوم سیکرٹری سر ولیم جانسن ہکس نے خصوصی سندات سے نوازا۔ وطن واپسی کے بعد انگریزوں نے اسے آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر کے مناصب عطا کئے (۳)۔

نواب محمد احمد خان کا ایک کارنامہ یہ تھا کہ جب ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو لاہور کی ڈسٹرکٹ جیل میں سردار بھگت سنگھ اور اس کے دو ساتھیوں (سکھدیو اور راج گرو) کو پھانسی کی سزا دی گئی تو ہندوستان بھر سے کوئی ہندو مسلمان یا سکھ مجسٹریٹ ان کے ڈیتھ وارنٹ پر دستخط کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ایسے میں انگریزوں کو اپنے وفادار نواب محمد احمد خان کی یاد آئی جو اس وقت قصور میں تعینات تھا۔ نواب محمد احمد خان نے بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے ڈیتھ وارنٹ پر بخوشی دستخط کئے اور پھانسی کے عمل کی نگرانی بھی کی۔ پھانسی کے بعد بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے جسد ہائے خاکی بھی نواب محمد احمد خان کی موجودگی میں دریائے ستلج کے

کنارے نذر آتش کئے گئے۔

لاہور کی یہ ڈسٹرکٹ جیل، جس میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو تختہ دار پر چڑھایا گیا اس مقام پر واقع تھی جہاں آج شادمان ٹاؤن اور شاہ جمال کی آبادیاں واقع ہے۔ اس ڈسٹرکٹ کے وسط میں ایک بہت بڑا گھر تھا۔ لہنا سنگھ نے اپنے اس گھر میں نواب محمد احمد خان کے ایک عزیز کو غداری کے الزام میں قتل کیا تھا۔ بعد میں اس چھاؤنی کے مقام پر جیل اور لہنا سنگھ کے گھر کی جگہ پر اس جیل کا پھانسی گھاٹ تعمیر کیا گیا۔ جب جیل منہدم ہوئی تو یہ علاقہ شادمان ٹاؤن کہلانے لگا اور پھانسی گھاٹ کی جگہ پر شادمان ٹاؤن کا چوراہا (راؤنڈ اباؤٹ) تعمیر ہوا۔ یہی وہ چوراہا تھا جہاں ۱۱رنومبر ۱۹۷۴ء کو نامعلوم افراد کی فائرنگ کے نتیجے میں نواب محمد احمد خان لقمہ اجل بنے تھے۔ نواب محمد خان کے قتل کے الزام میں ذوالفقار علی بھٹو تختہ دار پر چڑھے اور یوں تاریخ کا ایک عجیب وغریب دائرہ مکمل ہوا (۴)۔

نواب محمد احمد خان کے چھ بیٹے ہوئے جن میں سے دو خضر حیات خان اور احمد رضا خان سیاست کے میدان میں نمایاں ہوئے۔

خضر حیات خان نے ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۵ء میں این اے ۸۹ قصور سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر ۱۹۷۷ء میں سردار احمد علی اور ۱۹۸۵ء میں سردار آصف احمد علی کے ہاتھوں شکست کھا گئے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں سردار آصف احمد علی کو پاکستان پیپلز پارٹی نے ٹکٹ دیا تو خضر حیات خان نے ان کے مقابلے میں آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑا اور اسی حلقے سے جس پر ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۵ء میں ہارے تھے، سردار آصف احمد علی کو تقریباً ۲۴ ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء میں ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور ان دونوں انتخابات میں وہ سردار آصف احمد علی کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت حاصل تھی جبکہ ۱۹۹۳ء کا انتخاب انہوں نے آزاد حیثیت میں لڑا تھا (۵) اس کے بعد کسی انتخابی مہم میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

خضر حیات خان کے بھائی احمد رضا قصوری ہیں۔ وہ ۲ ستمبر ۱۹۳۸ء کو قصور میں پیدا ہوا۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی میں ایام طالب علمی میں اس نے اسٹوڈنٹ پالیٹکس میں نمایاں کردار ادا کیا اور قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ۱۹۶۶ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو، ایوب خان کی کابینہ سے مستعفی ہو کر بذریعہ ٹرین، لاہور آئے تو ان کا استقبال کرنے والوں میں احمد رضا قصوری نمایاں تھا۔ ۲۷رنومبر ۱۹۶۷ء کو قصور میں احمد رضا قصوری کی قیام گاہ پر بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ بہت جلد ایک سیاسی جماعت قائم کرنے والے ہیں جس کا نام پاکستان پیپلز پارٹی ہو گا۔ تین دن بعد ۳۰رنومبر ۱۹۶۷ء کو بھٹو نے لاہور میں ایک سیاسی کنونشن

میں اس جماعت کا قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں احمد رضا قصوری نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قصور سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور جمیعت علمائے پاکستان کے میاں جمیل احمد شرقپوری اور میاں افتخار الدین کے صاحبزادے میاں عارف افتخار کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوا۔ مگر انتخابات کے کچھ عرصہ بعد پارٹی کے چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو سے اس کے اختلافات شروع ہو گئے۔

ان اختلافات کا آغاز ذوالفقار علی بھٹو کے اس اعلان سے ہوا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ ۳/مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں بلائے جانے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کریں گے مگر اس اعلان کے علی الرغم احمد رضا قصوری اس اجلاس میں شرکت کے لئے ڈھاکہ پہنچ گیا۔ بھٹو کے مقاطعے کی وجہ سے یہ اجلاس کبھی منعقد ہی نہیں ہوا مگر یہیں سے بھٹو اور قصوری کے درمیانی فاصلے بڑھنے شروع ہو گئے۔ ۲/مئی ۱۹۷۱ء کو بھٹو نے قصوری کو پاکستان پیپلز پارٹی سے نکالنے کا اعلان کر دیا۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پیپلز پارٹی سے نکالے جانے کے بعد قصوری' قومی اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیتا اور کسی اور پارٹی کی طرف سے یا آزاد حیثیت میں دوبارہ انتخاب لڑتا مگر پاکستان میں اس قسم کی کوئی جمہوری اقدار موجود ہی نہیں ہیں۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں جب قومی اسمبلی کے اجلاس شروع ہوئے تو احمد رضا قصوری نے تحریک استقلال میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۷۳ء کا آئین جب منظوری کے لئے ایوان کے سامنے پیش ہوا تو احمد رضا قصوری ان ۹ افراد میں شامل تھا جنہوں نے اس آئین پر دستخط نہیں کئے تھے۔ اسمبلی میں احمد رضا قصوری کی بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف توہین آمیز اور اشتعال انگیز تقاریر کا سلسلہ جاری رہا۔

۴/جون ۱۹۷۴ء کو بھٹو اسمبلی میں تقریر کر رہے تھے۔ دوران تقریر انہوں نے کہا کہ ''آئین پر حزب اختلاف کا شور اور واویلا بلاجواز ہے کیونکہ حزب اختلاف کے تمام ارکان نے آئین پر دستخط کئے ہیں اور یہ آئین ایک متفقہ آئین ہے۔'' اس پر احمد رضا قصوری نے اسپیکر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''جناب اسپیکر' رتوڈیرو سے آنے والے فاضل مقرر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں ساری دنیا جانتی ہے کہ میں نے آئین پر دستخط نہیں کئے ہیں۔ اس نے اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا۔ پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آئین پر سب نے دستخط کئے ہیں اور یہ متفقہ آئین ہے۔'' قصوری کی مداخلت اور ان ریمارکس پر بھٹو طیش میں آ گئے اور انہوں نے قصوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلاتے ہوئے کہا۔

I have had enough of this man. He is absolute poison. We will not tolerate him any more.

(میں نے اس شخص کو بہت برداشت کیا۔ یہ مجسّم زہر قاتل ہے۔ اب میں اس کو قطعی برداشت نہیں کروں گا)

اس واقعے کے کوئی پانچ ماہ بعد ۱۱رنومبر۱۹۷۴ء کو وہ واقعہ پیش آیا جس نے پاکستان کی سیاسی تاریخ کا رخ ہی بدل ڈالا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ تھی کہ اس رات احمد رضا قصوری' اپنے والد نواب محمد احمد خان قصوری' اپنی والدہ (صاحبزادی میمونہ بانو بیگم) اور خالہ (بیگم آغا مہدی خان) کے ہمراہ اپنے ایک دوست سید بشیر شاہ کی دعوت سے گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ گاڑی احمد رضا قصوری چلا رہا تھا۔ وہ جب شادمان اور شاہ جمال کے سنگم پر واقع چوک میں پہنچے تو اچانک نامعلوم افراد نے ان کی گاڑی پر فائرنگ شروع کردی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں احمد رضا قصوری تو محفوظ رہا مگر اس کے والد نواب محمد احمد قصوری شدید زخمی ہو گیا۔ احمد رضا قصوری فوراً اپنے والد کو لے کر یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال پہنچ گیا جہاں نواب محمد احمد قصوری نے دم توڑ دیا۔

احمد رضا قصوری نے اسی رات قتل کی ایف آئی آر درج کروائی جس میں اس نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو اس قتل کا بڑا ملزم ٹھہرایا(۶)۔

بھٹو نے فوراً اس قتل کی تفتیش کے لئے لاہور ہائی کورٹ کے جج جسٹس شفیع الرحمٰن کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی ٹربیونل قائم کیا اس ٹربیونل نے ۲۶رفروری۱۹۷۵ء کو اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کردہ جس میں مقدمہ کی چھان بین کے لئے چند رہنما خطوط تجویز کئے گئے تھے حکومت نے وہ رپورٹ منظر عام پر نہیں آنے دی۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں مقدمہ کو عدم سراغ یابی کی بنا پر داخل دفتر کر دیا گیا(۷)۔

ذوالفقار علی بھٹو نے پھانسی سے چند ماہ قبل چھوٹی چھوٹی چٹوں پر اپنی یادداشتوں پر مبنی کتاب Rumour and Reality (افواہ اور حقیقت) میں اس مقدمہ قتل پر کئی جگہ روشنی ڈالی ہے ان کے بقول نہ احمد رضا قصوری نے اور نہ ہی اس کے خاندان کے کسی فرد نے ۱۹۷۰ء سے قبل قومی' صوبائی اور بلدیاتی انتخاب جیتا۔ احمد رضا قصوری کو ۱۹۷۰ء میں محض اس لئے کامیابی حاصل ہوئی کہ اسے پیپلز پارٹی نے ٹکٹ دیا تھا۔ بھٹو کے بقول دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب پیپلز پارٹی نے اقتدار سنبھالا تو یہ راز ظاہر ہو گیا تھا کہ احمد رضا قصوری' خفیہ ایجنسیوں کا تنخواہ دار ملازم تھا وہ جنرل یحییٰ کی فوجی حکومت سے فوائد حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ تعاون کرتا رہا۔ بعد میں اس نے جنرل ضیاء الحق کا آلہ کار بننا منظور کر لیا۔

بھٹو نے اپنی اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ابھی محمد احمد قصوری کا لہو بھی خشک نہ ہوا تھا کہ

اس کا بیٹا چیختا چلاتا' بھٹو مخالفین کے پاس گیا اور ان سے مشورہ کیا کہ وہ اپنے باپ کی موت سے کیسے فائدہ اٹھائے۔ چوہدری ظہور الٰہی بھاگے بھاگے ہسپتال پہنچے۔ ہسپتال کے برامدوں میں سازش ہوئی کہ اس افسوس ناک واقعہ کو اقتدار کے ایوانوں میں پہنچنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ چنانچہ بھٹو پر قتل کی سازش کا الزام عائد کر دیا گیا وہ بھٹو سے وزارت لینے میں ناکام رہا تھا اور یہی بات دشمنی کا سبب بنی تھی۔ وہ وزیراعظم کو نیچا دکھانے کے لئے موقع کی تلاش میں تھا انہی ذرائع کے مطابق اچانک ہی اسے یہ موقع اپنے باپ کی موت کی شکل میں مل گیا۔ قصوری نے ہر ممکن حد تک جذبات انگیز ڈرامائی صورت اختیار کی اور اس نے جتنے بھی ناشائستہ الزامات لگائے وہ انتہائی ڈرامائی تھے۔ قصوری اور اس کے ساتھی ظہور الٰہی نے فیصلہ کیا کہ مقدمہ میں وزیراعظم کا نام یہ کہہ کر ملوث کر دیا جائے کہ قصوری کی صرف انہی کے ساتھ دشمنی ہے اس طرح انہوں نے ایک اسکینڈل کو ہوا دی اور وزیراعظم کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا۔

بھٹو نے محمد احمد قصوری کی موت کی تحقیقات کے لئے ٹربیونل قائم کر دیا۔ مولوی مشتاق کے ایک قریبی دوست جسٹس شفیع الرحمٰن کو اس کی سربراہی کے لئے چنا گیا۔ چونکہ یہ بات ہر کسی کو معلوم تھی کہ جسٹس شفیع الرحمٰن وزیراعظم کو پسند نہیں کرتا اس لئے قصوری کو ٹربیونل پر مکمل اعتماد تھا اور وہ اس کے سامنے پیش ہوا۔ ٹربیونل نے اس واقعے کی پوری تحقیقات کی۔ قصوری نے ٹربیونل میں بیان حلفی میں تسلیم کیا کہ یہ ضروری نہیں کہ حملہ وزیراعظم کے ساتھ اس کی دشمنی کے نتیجے میں ہوا ہو۔ اس نے چار قسم کے لوگوں کے بارے میں بتایا جو اس کے بارے میں بری نیت رکھتے تھے۔ اس نے قادیانیوں کا ذکر کیا جن پر اس نے اس وقت شدید حملے کئے جب قادیانی مسئلہ اپنی انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔ اس نے قصور میں اپنے ان مخالفین کا ذکر کیا جن کے ساتھ اس کی دیرینہ دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اس نے حزب اختلاف کے چند ارکان اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا ذکر کیا جن کے ساتھ اس کے تعلقات انتہائی کشیدہ تھے۔ ٹربیونل کی رپورٹ کے اختتام پر قصوری نے ٹربیونل کے اخذ کئے ہوئے نتائج پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔

جونہی ٹربیونل کی رپورٹ مکمل ہوئی۔ قصوری نے وزیراعظم سے ملاقات کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ بھٹو نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ قصوری نے وزیراعظم کو رقت آمیز خطوط لکھے۔ وزیراعظم نے آخر کار قصوری کو پارٹی کی صفوں میں واپس لینے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔

پیپلز پارٹی میں واپسی کے لئے احمد رضا قصوری کی بے چینی کا مقصد واضح تھا۔ وہ آنے والے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کا سہارا لے کر دوبارہ ایم این اے بننا چاہتا تھا۔ اسے علم

تھا کہ قصور پیپلز پارٹی کا مضبوط گڑھ ہے اور وہ پیپلز پارٹی کی مدد کے بغیر انتخابات میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ قصوری نے دھوم دھڑکے کے ساتھ پیپلز پارٹی میں واپس آنے کا اہتمام کیا۔ اس نے بیگم نصرت بھٹو سے درخواست کی کہ وہ پارٹی میں اس کی واپسی کے موقع کو اپنی موجودگی سے عزت بخشیں۔ اس استقبالیہ میں اس نے وزیراعظم کی بے حد تعریف کی۔ اس کی ماں نے سرعام اعلان کیا کہ وہ وزیراعظم پر اپنے تمام بیٹے قربان کر دیں گی کیونکہ وزیراعظم بھٹو کے بغیر پاکستان باقی نہیں رہے گا (۸)۔

احمد رضا قصوری، آئندہ انتخابات میں پارٹی کے ٹکٹ کے حصول کی خواہش میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ جنوری ۱۹۷۷ء میں اس نے قومی اسمبلی میں وزیراعظم کی زرعی اصلاحات کی ان الفاظ میں تعریف کی۔

''میں قومی اسمبلی سے ایسے تاریخی موقع پر خطاب کر رہا ہوں جب ہم پاکستان میں انقلابی زرعی اصلاحات کو متعارف کروا رہے ہیں۔ مسٹر اسپیکر، اگر میں وزیراعظم بھٹو اور ان کی حکومت کو پاکستان میں انقلابی اصلاحات کے نفاذ پر مبارک باد نہ دوں تو میں اپنے فرائض میں کوتاہی برتوں گا۔''

قصوری کو احساس تھا کہ لوگ اس کی ان باتوں پر حیران ہوں گے اس لئے اس نے مزید کہا

''میں راست باز اور کھرے آدمی کی شہرت رکھتا ہوں۔ میں ایوان کے اس طرف سے اس حکومت کا سخت نکتہ چین تھا اس لئے کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ جب میں اس حکومت کی تعریف کرتا ہوں تو یہ چاپلوسی ہے۔ اس ملک میں بہت سے وزرائے اعظم آئے لیکن موجودہ وزیراعظم جو اس ملک کے ناؤ کو کھے رہے ہیں، ان کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا (۹)

کیا قصوری اسمبلی کے فلور پر جھوٹ بول رہے تھا یا یہ اُس کا آئندہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنے کا ایک حربہ تھا۔ اس کے بارے میں خود وہی بہتر بتا سکتا ہے۔

بہر حال مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے لئے پاکستان پیپلز پارٹی نے احمد رضا قصوری کو ٹکٹ نہیں دیا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس کی چالبازی اسے کچھ نہ دلاسکی پارٹی کے پارلیمانی بورڈ نے اس کو متلون مزاج قرار دے دیا اور کہا کہ اس کے دوست بھی اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے۔

بھٹو نے لکھا ہے کہ قصوری کے باپ کے قتل کے حوالے سے انہیں کوئی احساس جرم ہوتا تو وہ اس کا منہ ٹکٹ دے کر بند کر دیتے جس کے لئے وہ بھیک مانگ رہا تھا۔ انہوں نے ایسا

تہیں کیا کیونکہ انہیں کوئی احساس جرم نہیں تھا(۱۰)۔

۵/جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا اس واقعے کے چند دن بعد احمد رضا قصوری، حیدرآباد آیا۔ وہاں اس نے رسول بخش تالپور کی طرف سے دی گئی ایک دعوت میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

''پیپلز پارٹی سے ناراض اور روٹھا ہوا عنصر قومی اتحاد میں شامل کسی جماعت میں شمولیت اختیار نہیں کرے گا بلکہ پیپلز پارٹی کے بائیں بازو کا یہ گروپ پنجاب میں عوامی جمہوری پارٹی کو متحرک کرے گا۔''

احمد رضا قصوری سے پوچھا گیا کہ وہ پیپلز پارٹی میں دوبارہ کیوں شامل ہوئے اُس نے جواب دیا۔

''عبدالحفیظ پیرزادہ اور صادق حسین قریشی کے بعد بیگم نصرت بھٹو ان کے گھر آئی تھیں اور کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر میری والدہ کو یقین دلایا تھا کہ ان کے شوہر کے قتل میں بھٹو کا ہاتھ نہیں تھا۔ اس یقین دہانی کے بعد انہوں نے میری والدہ کو مجبور کیا کہ میں پیپلز پارٹی میں دوبارہ شامل ہو جاؤں چنانچہ پنجاب کی ریت کے مطابق ہم سے انکار نہ بن پڑا اور ہمارے صوبے کی یہ ریت رہی ہے کہ جب کسی کی بہن، بیٹی، بیوی یا ماں کسی کے گھر چل کر آئیں تو تمام گلے شکوے جاتے رہتے ہیں۔'' (۱۱)

مگر چند ہی ہفتے بعد فوجی حکومت کی آشیرباد پر، احمد رضا قصوری کو بھٹو دوبارہ اپنے باپ کا قاتل نظر آنے لگا اور محمد احمد قصوری کی بیوہ نے جس وزیراعظم بھٹو پر اپنے تمام بیٹے قربان کر دینے کا اعلان کیا تھا، جنرل ضیاء کو ایک درخواست دی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ سابق وزیراعظم کے خلاف مقدمہ دوبارہ شروع کیا جائے۔

احمد رضا قصوری نے جسٹس شفیع الرحمٰن ٹریبونل کی رپورٹ پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ اس دوران نوے دنوں کے اندر انتخابات کے نام نہاد ڈرامے کا اعلان ہوا تو اس نے لاہور کے حلقہ نمبر ۳ سے بھٹو کے خلاف انتخاب لڑنے کا اعلان کیا۔ اس نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ جنرل ضیاء نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ بھٹو کے خلاف درخواست دائر کرے تو معاوضہ کے طور پر اسے اس حلقے سے کامیاب کروا دیا جائے گا۔ احمد رضا قصوری نے جنرل ضیاء کے ساتھ اپنے تعلقات پر فخر کا اظہار کیا اور کہا کہ انتخابات کے بعد جنرل ضیا نے اسے وزیر بنانے کا بھی وعدہ کیا ہے(۱۲)۔

اس کے بعد جو ہوا وہ پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلوں کے نتیجے میں بھٹو کو نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل کے الزام میں پھانسی

دے دی گئی اور یوں ملک اپنے ایک ذہین مگر متنازع سیاستدان سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

احمد رضا قصوری اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک سیاست کے میدان سے دور رہا۔ ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں اس نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا مگر ہر مرتبہ بری طرح شکست سے دوچار ہوا۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات سے قبل وہ تحریک انصاف میں شامل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ۲۰۰۲ء میں اس نے قصور اور اسلام آباد دو حلقوں سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ بھی دونوں حلقوں سے اس کی ضمانت ضبط ہو گئی (۱۴) ان نتائج سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اس کی کامیابی اس کا ذاتی کمال تھا یا بھٹو کا احسان تھا۔

احمد رضا خان قصوری کا خاندان' سیاسی رشتہ داریوں کے ایک وسیع جال میں بندھا ہوا ہے۔ نواب محمد احمد خان قصوری کی اہلیہ صاحبزادی میمونہ بانو بیگم' نواب آف لوہارو نواب سر امیرالدین احمد خان کے بھتیجے صاحبزادے صمصام الدین فیروز کی صاحبزادی تھیں (۱۵)۔ صاحبزادے صمصام الدین فیروز کی پہلی بیوی انور زمانی بیگم نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کی پوتی' نواب اسحٰق خان کی بیٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے نامور رہنما نواب اسمٰعیل خان کی ہمشیرہ تھیں۔ وہ بیگم مولانا محمد علی جوہر کی رضاعی بیٹی اور گلنار بیگم (بیگم شعیب قریشی' سابق سفارت کار پاکستان) کی رضاعی بہن تھیں۔ یہی انور زمانی بیگم' میمونہ بانو بیگم کی والدہ تھیں (۱۶)۔

صمصام الدین فیروز کی دوسری بیوی حلیمہ بانو آف لوہارو تھیں جن کی صاحبزادی طیبہ بانو' نامور شاعر جمیل الدین عالی کی اہلیہ ہیں (۱۷)۔ جمیل الدین عالی' شاعری اور نثر نگاری کے علاوہ سیاست کے میدان میں بھی دخیل رہے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں انہوں نے کراچی کے حلقہ ۱۹۱ سے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر پاکستان قومی اتحاد کے سید منور حسن سے شکست کھا گئے تھے۔ ۱۹۹۷ء میں وہ ایم کیو ایم کے رکن بنے بغیر اس کے حمایت یافتہ امیدوار کی حیثیت سے سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے تھے (۱۸)۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا کہ جمیل الدین عالی کی بڑی صاحبزادی حمیرا کی شادی نواب محمد احمد قصوری کے سب سے چھوٹے صاحبزادے احمد مصطفےٰ خان قصوری سے ہوئی ہے (۱۹)۔

قصوری خاندان کی رشتہ داریوں کا ایک اور سلسلہ ممدوٹ خاندان سے بھی جڑا ہوا ہے اور وہ یوں کہ نواب محمد احمد خان قصوری کی اہلیہ میمونہ بانو بیگم کے والد کی چچا زاد اور جمیل الدین عالی کی سوتیلی بہن مہر بانو بیگم نواب سر قطب الدین والی ممدوٹ سے بیاہی گئی تھیں۔

نواب قطب الدین کے اولاد نرینہ نہ ہونے کے بعد ان کی وراثت ان کے بھائی نواب عطاء الدین خان ممدوٹ کے فرزند شاہنواز ممدوٹ نے سنبھالی شاہنواز ممدوٹ آل انڈیا مسلم لیگ کے صف اول کے رہنما تھے اور ان کے صاحبزادے نواب افتخار حسین ممدوٹ' قیام پاکستان کے بعد پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے تھے۔

مہر بانو بیگم کی ایک بہن فخر بانو بیگم نواب محمد ابراہیم خان آف مانگر دل سے بیاہی تھیں' دوسری بہن بلقیس بانو بیگم نواب سر احمد نواز خان آف ڈیرہ اسماعیل خان اور تیسری بہن شہر بانو بیگم نواب ابراہیم علی خان آف پٹودی سے بیاہی گئی تھیں (۲۰)۔ چنانچہ شہنشاہ جارج پنجم نے ایک مرتبہ ان کے والد نواب امیر الدین سے مذاقاً کہا تھا۔

"If you carry on your daughters marriages that way, I fear to sooner lose my Indian Empire to you.''

(۲۱)۔ شہر بانو بیگم اور نواب ابراہیم علی خان آف پٹودی کے صاحبزادے نوابزادہ شیر علی خان' جنرل یحییٰ خان کے دور اقتدار میں مرکزی وزیر اطلاعات کے منصب پر فائز رہے تھے (۲۲)۔

حوالہ جات

۱۔ سر لیپل ایچ گرفین' کرنل چارلس میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب' جلد اول (ترجمہ سید نوازش علی) لاہور۔ ص ۶۲۴ تا ۶۳۲

۲۔ احمد سلیم۔ بھگت سنگھ سے بھٹو کی پھانسی تک ایک ہی مہر لگی ہے۔ ماہنامہ دستک کراچی۔ مئی ۱۹۹۵ء ص ۳۷ تا ۴۰

۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر لاہور ڈویژن (۱۹۴۷ء) لاہور۔ ص ۱۲۰، ۱۲۱

۴۔ ماجد شیخ۔ بھگت سنگھ اینڈ دی سرکل آف بلڈ۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸/اپریل ۲۰۰۲ء

۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء (جلد دوم) ص ۱۰۲

۶۔ محمد ایوب خان۔ تاریخ پنجاب اور افاعنۂ قصور کا کردار۔ لاہور۔ ص ۲۹۰'۲۹۱

۷۔ مجاہد لاہوری۔ بھٹو کیس' قانونی پھانسی یا عدالتی قتل۔ لاہور ص ۴۰

۸۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ افواہ اور حقیقت (ترجمہ: الطاف احمد قریشی) لاہور۔ ص ۹۵ تا ۹۷

۹۔ احمد سلیم۔ پاکستان کے سیاسی قتل۔ اسلام آباد۔ ص ۵۵

۱۰۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ افواہ اور حقیقت (ترجمہ: الطاف احمد قریشی) لاہور۔ ص ۹۷

۱۱۔ حسن کامران۔ رسول بخش تالپور کی دعوت میں احمد رضا قصوری سے بات چیت ۔ہفت روزہ معیار کراچی ۔ ۱۶۔۲۳ جولائی ۱۹۷۷ء۔ص ۱۸
۱۲۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ افواہ اور حقیقت (ترجمہ: الطاف احمد قریشی) لاہور۔ص۔ ۹۹
۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ص ۸۳
۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ رپورٹ (جلد دوم)۔ص ۲۱‘۵۲
۱۵۔ طاہرہ بانو حجاب۔ خاندان لوہارو۔ اسلام آباد۔ص ۱۲۴
۱۶۔ احمد رضا خان قصوری ۔ ادھر ہم ادھر تم۔ لاہور۔ص ۱۸‘۲۲
۱۷۔ طاہرہ بانو حجاب۔ خاندان لوہارو۔ اسلام آباد۔ص ۱۲۴
۱۸۔ ماہنامہ دنیائے ادب کراچی۔ جمیل الدین عالی نمبر ۲۰۰۱ء۔ص ۱۷
۱۹۔ احمد رضا خان قصوری۔ ادھر ہم ادھر تم۔ لاہور۔ص ۳۳
۲۰۔ طاہرہ بانو حجاب۔ خاندان لوہارو۔ اسلام آباد۔ص ۴۶ تا ۴۹
۲۱۔ عبداللہ ملک۔ داستان خانزادہ میاں محمود علی قصوری۔ لاہور۔ص ۱۹۱
۲۲۔ طاہرہ بانو حجاب۔ خاندان لوہارو۔ اسلام آباد۔ص ۱۲۱

دریشک

دریشکوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ہوت خاں کی اولاد سے ہیں جو قوم بلوچ کی چند بڑی شاخوں میں سے ایک شاخ کا بانی ہوا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ میر چاکر کی حالت خانہ بدوشی میں دریشک برابر اس کے ساتھ رہے اور یہ اس کے بڑے معتبر اور جاں نثار سپاہی تھے۔ ایک موقعہ پر میر چاکر نے لاشاری قوم کی کچھ عورتوں کو مغلوں کے ہاتھ سے رہائی دلا کر رات کو انہیں ایک علیٰحدہ خیمہ میں رکھا اور اس پر حفاظت کی غرض سے دریشکوں کا پہرہ مقرر کیا۔ رات کو ہوا کا ایک سخت طوفان آیا اور خیمے کی چوبیں ٹوٹ گئیں۔ مگر ایک دریشک نے صبح تک خیمے کو اپنے کندھے کے سہارے سے اٹھائے رکھا۔ میر چاکر نے جب اس شجاعت کا حال سنا تو دریشکوں کو "سنہری دریشکوں" کا خطاب دیا اور یہ خطاب اب تک کبھی کبھی ان کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

دریشک میدانی علاقہ میں مزاریوں کے بعد آباد ہوئے ہیں۔ مزاریوں ہی کی طرح یہ بھی قوم نہر کے ایک حکمران اسلام خاں نامی کے جو سلاطین مغل کی طرف سے اس علاقہ کا ناظم تھا بلانے پر اس جگہ آئے تھے۔ اسلام خان نے رودھن خاں دریشک کو آسنی کے گردونواح کی اراضیات اور ان کے شمالی جانب پہاڑیوں کے نزدیک کا وہ علاقہ بھی عطا کیا جس پر مزاری قابض تھے۔ رودھن خاں دریشک سے چار پشت بعد داود خاں کے زمانے میں دریشکوں اور جسکانیوں کے درمیان لڑائی شروع ہوئی یہ جسکانی اس وقت پہاڑیوں کی تلیھی کے ایک نشیبی علاقہ میں آباد تھے۔وہ سوری کے اندر طرفین میں ایک سخت لڑائی واقع ہوئی۔ اس معرکہ میں خود جسکانی رئیس اور اس کے ایک سو سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ اس کے بعد پھر اس علاقہ میں جسکانیوں کا کوئی تمن نہیں رہا اور اس قوم کے آدمی متفرق گروہوں میں منتشر ہو کر گرچانیوں، دریشکوں اور دوسری ہمسایہ قوموں کے اندر جذب اور شامل ہو گئے اور باقی ماندہ صرف ضلع لیہ میں اپنا جدا فرقہ بنا کر رہنے لگے۔ ڈیرہ غازی خاں کے طاقتور حکمران نواب محمود خان گوجر نے سردار عظمت خاں کے زمانے میں دریشکوں پر فوج کشی کی۔ اس کی فوج نے قلعہ آسنی کا محاصرہ کر لیا مگر قلعہ

کی فوج میدان میں نکل کر اس پر حملہ آور ہوئی۔نواب کی فوج ہزیمت اٹھا کر بھاگ نکلی اور اس کے ۱۴۰ آدمی جنگ میں کام آئے۔

جب صلح ہو گئی تو سردار عظمت خان کو مواضعات راجن پور، محمد پور، جلال پور، رسول پور، شاہ پور اور دنیا پور کے محاصل میں سے بیسواں حصہ حق کسور ملا۔

عظمت خان کے بعد اس کا بیٹا حیات خان جانشین ہوا۔ اس نے بروہیوں سے اتحاد کیا اور ہرنداجل کے علاقے کے کچھ سرحدی حصہ پر نصیر خان قلات کے خان کی طرف سے قابض ہوا۔ خان قلات ۱۸۱۱ء میں فوت ہو گیا اور اس کے بیٹوں میں جانشینی کے لئے جنگیں ہوئیں محمود خان کو جو قلات میں تھا عوام نے خان تسلیم کر لیا مگر رحیم خان نے جو ہرندواجل کے علاقہ میں تھا اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اپنے بھائی مصطفیٰ خان کو قتل کر ڈالا۔ اس نے دریشکوں کی مدد سے داجل پر حملہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا اور اس حملہ میں حیدر خان کاردار سو آدمیوں کے ساتھ مارا گیا۔ آخر کار محمود خان کی فوج نے ہرنداجل کو پھر لے لیا اور رحیم خان قتل کیا گیا۔

یہ سخت ابتری کا زمانہ تھا۔ درانی بادشاہت کے حصے بکھرے ہوتے جاتے تھے اور قلات کے خانوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ مختلف اقوام کی رعایا سے اپنے حقوق حکومت تسلیم کرائیں۔ ہر ایک قوم اپنی اپنی اراضی کی حفاظت یا اس کی توسیع کے لئے دوسروں سے لڑ رہی تھی۔ اس جنگ و پیکار نے قصبات اور مواضعات تباہ کر دئے اور نہریں بند ہو گئیں۔ اس وقت دریشک بھی اپنی ہمسایہ اقوام گرچانیوں بگٹیوں اور جکھرانیوں سے مصروف پیکار تھے۔

جب ۱۸۴۸ء میں ایڈورڈس صاحب ڈیرہ غازی خان کی طرف سے روانہ ہوئے تو سردار بجار خان نے اپنے چچازاد بھائی بخش خان کو سو آدمی دے کر صاحب موصوف کے ساتھ شریک ہونے کے لئے بھیجا۔ جب تک ملتان کا محاصرہ رہا یہ وہاں موجود رہے اور لڑائی کے خاتمہ پر ان کے سردار کو ایک جوڑی کڑہ اور ہزار روپے کا خلعت عطا ہوا۔ الحاق کے بعد آسنی جو دریشکوں کا صدر مقام تھا ایک رسالہ کی چھاؤنی ڈالنے کے لئے منتخب کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی برپا ہوئی تو یہ رسالہ ہندوستان کو بھیجا گیا اور آسنی کی چھاؤنی بجار خان کے سپرد کی گئی جو ان دریشکوں کے فوجی دستوں کا جو اس مطلب کے لئے بھرتی کئے گئے تھے رسالدار بنایا گیا۔

اگست ۱۸۵۷ء میں مریوں نے سرحد کو غیر محفوظ پا کر میدانوں پر ایک بڑا حملہ کیا۔ انہوں نے بہت سے مویشی چھین لئے اور بہت سے گلہ بانوں کو قتل کر کے ان کو پہاڑ کی طرف لے گئے۔ سردار بجار خان نے جو چند دریشک سواروں کے ساتھ ان دنوں اس علاقہ میں گشت کر رہا تھا جب یہ سنا تو تعاقب کیا اور درہ بھگاری میں دو سو سے زیادہ مریوں سے اس کا سامنا ہو گیا۔ کٹو خان بگٹی پچاس سواروں کے ساتھ اس جگہ بجار خان سے آملا اور موسیٰ خان لغاری بھی دو گھڑی کی چوکی سے کچھ فوجی دستے لے کر آ پہنچا مگر موخر الذکر مریوں سے لڑنے کے واسطے تیار نہ

تھے۔۔ مری گھوڑوں پر سے اتر پڑے جس سے سمجھا گیا کہ وہ لڑنے پر آمادہ تھے۔ دریشک بھی گھوڑوں سے اترے اور انہیں لڑائی کا وبال برداشت کرنا پڑا۔ سردار بجار خان اور اس کا سب سے بڑا بیٹا در یہن خان مع ۳۸ اور دریشکوں کے مارے گئے اور مری جن کے آدمی دریشکوں کی نسبت کم قتل ہوئے تھے لوٹ کا مال لے کر پہاڑوں میں چلے گئے۔

سردار میران خان کو جو اس وقت نابالغ تھا اس کے باپ کی خدمات کے صلے میں ایک ہزار روپے سالانہ کی پنشن عطا ہوئی اور اس کے علاوہ مقتول آدمیوں کے ورثاء کو بھی پنشن دی گئی اور جو زندہ رہے ان کو انعام ملے۔

میران خاں کا اپنی عمر کے اخیر وقت میں تمام دیگر رشتہ داروں سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے علاقہ دریشک کے جنوب میں محض ایک بنجر اور نکمی زمین کے لئے مزاریوں کے ساتھ طویل مقدمہ بازی پر بہت سا روپیہ خرچ کیا بلکہ اپنا تمام زور و زر اسی پر لگا دیا۔ لیکن جب یہ مقدمہ چیف کورٹ کی عدالت اپیل میں پہنچا اس وقت فریقین میں باہم راضی نامہ ہو گیا۔ میراں خاں ۱۸۹۴ء میں راہئی عالم ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا در یھن خاں جانشین ہوا۔ در یھن خاں تمنداری پر جانشین ہونے سے دو سال قبل پندرھویں بنگال رسالہ میں نوکر رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے فضول تنازعے کو بالکل ختم کر دیا اور مزاریوں کے ساتھ امن و آشتی کا نیا باب شروع کیا۔

انگریزوں نے سردار در یہن خان کے اس اقدام کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اسے انعام کا مستحق قرار دیا۔ اس انعام کی رقم اس وقت تقریباً تین ہزار روپے تھی۔ دریشک انگریزوں کو جو سوار فراہم کرتے تھے انہیں اس کا بھی معاوضہ ادا کیا جاتا تھا جس کا نرخ ۴ آنے فی سوار فی یوم تھا اور اس کی زیادہ سے زیادہ ادائیگی ۸۰۰ روپے سالانہ کی جاتی تھی۔

انگریز سردار در یہن خان کی وفاداری کے صلے میں اسے صوبائی درباری کا درجہ عطا کیا۔ ۱۹۱۰ء میں اسے خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا گیا پہلی جنگ عظیم کے دوران سردار در یہن خاں نے انگریزوں کو چار ہزار روپے کا قرضہ اور ۲۰ سپاہی فراہم کئے۔ جب مریوں نے انگریزوں کے خلاف مہم جوئی کی تو اس موقع پر بھی دریشکوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور پورے علاقے میں امن و امان برقرار کر کے ہی دم لیا۔(۱)

سردار در یہن خان کے ایک بھائی آمن خان دریشک ۱۹۲۰ء میں پنجاب کی لیجسلیٹو کونسل کے رکن بنے۔(۲)

سردار در یہن خان دریشک کے ایک اور بھائی سردار بہادر خان دریشک تھے۔ وہ ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ایچی سن چیفس کالج لاہور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے نائب تحصیلدار کی حیثیت سے سرکاری ملازمت کا آغاز کیا اور ۱۹۳۲ء میں ریونیو

اسسٹنٹ کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں انہیں ایم بی ای کا اعزاز عطا ہوا۔ تقسیم سے پہلے وہ تین مرتبہ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۳) ۱۹۴۶ء میں انہوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی (۴) قیام پاکستان کے بعد وہ ۱۹۵۱ء میں بھی پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۵) جبکہ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے مغربی پاکستان اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی (۶)

سردار بہادر خان دریشک کے صاحبزادے سردار نصراللہ خان دریشک ہیں۔ انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے کیا اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور صوبائی وزارت کے درجے پر فائز ہوئے۔

۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک ان کے پاس خوراک اور امداد باہمی اور ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء تک آبپاشی اور بجلی کے قلم دان رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ دوسری مرتبہ رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہوئے (۸) مگر جب پی این اے کی تحریک کے دوران سردار شوکت حیات نے پیپلز پارٹی کے پنجابی اراکین اسمبلی کا فارورڈ گروپ تشکیل دیا تو میر بلخ شیر مزاری کے کہنے پر سردار نصراللہ دریشک اس میں شامل ہو گئے اور انہوں نے پیپلز پارٹی سے استعفیٰ دے دیا (۹)

۱۹۸۵ء میں سردار نصراللہ دریشک پی پی ۱۸۹ راجن پور سے ایک مرتبہ پھر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ ریونیو کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیئرمین بنائے گئے۔ (۱۰) ۱۹۸۶ء میں جب چودھری پرویز الٰہی نے وزیراعلیٰ نواز شریف کے خلاف محاذ آرائی کا آغاز کیا تو نصراللہ دریشک بھی ان کے گروپ میں شامل تھے۔ وہ واحد ایم پی اے تھے جنہیں سب سے زیادہ انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ مگر بعد میں ان کی وزیراعلیٰ سے صلح ہو گئی اور انہیں نگراں صوبائی حکومت میں بطور وزیر شامل کر لیا گیا (۱۱)

سردار نصراللہ دریشک نے ۱۹۸۸ء میں قومی اور صوبائی دونوں نشستوں میں انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی میں ان کے مدمقابل سردار عاشق محمد مزاری اور سردار شیر باز مزاری تھے۔ مگر سردار نصراللہ دریشک کی حکمت عملی کی وجہ سے میر بلخ شیر مزاری کی حمایت ان کے سگے بھائی سردار شیر باز مزاری کی بجائے انہیں حاصل ہو گئی۔ وہ یہ انتخاب ہار گئے۔ مگر ان کے اور سردار عاشق مزاری کے ووٹوں میں فقط ۳۹۲ ووٹوں کا فرق تھا۔ اگر سردار شیر باز مزاری اس انتخاب میں امیدوار نہ ہوتے تو سردار نصراللہ دریشک یہ انتخاب باسانی جیت سکتے تھے صوبائی اسمبلی میں سردار نصراللہ دریشک کے مدمقابل سردار امان اللہ دریشک تھے۔ سردار نصراللہ دریشک یہ انتخاب باسانی جیت گئے (۱۲) بعد ازاں وہ میاں نواز شریف کی کابینہ میں وزیر بھی بنے۔ انہیں آبپاشی اور بجلی کے قلم دان کے علاوہ قانون اور پارلیمانی امور کا اضافی چارج بھی سونپا گیا تھا (۱۳) ۱۹۹۰ء میں

سردار نصراللہ خان دریشک نے قومی اسمبلی کا انتخاب خود نہیں لڑا بلکہ انہوں نے میر بلخ شیر مزاری کی انتخابی مہم میں ان کی حمایت کی۔ وہ صوبائی اسمبلی کی دو نشستوں پر امیدوار بنے۔ پی پی ۲۰۴ راجن پور پر انہوں نے پی ڈی اے کے سردار محمد جعفر خان لغاری کو شکست دی اور پی پی ۲۰۵ راجن پور پر انہوں نے پی ڈی اے کے حفیظ الرحمٰن خان کو ہرایا (۱۴) بعد میں انہوں نے پی پی ۲۰۵ راجن پور ۲ کی نشست خالی کر دی۔ جس پر ضمنی انتخاب میں ان کے کزن اور برادر نسبتی سردار حاجی غلام مجتبیٰ خان دریشک کامیاب ہو گئے (۱۵) ۱۹۹۰ء میں سردار نصراللہ خان دریشک ایک مرتبہ پھر صوبائی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ انہیں قانون، پارلیمانی امور، پلاننگ اور ترقیات کے قلم دان سونپے گئے (۱۶)

جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ ۱۹۹۰ء تک سردار نصراللہ خان دریشک اور میر بلخ شیر مزاری ایک ہی کیمپ میں تھے مگر آگے چل کر ان دونوں میں شدید اختلافات پیدا ہوئے اختلاف کا سبب ایک بہت چھوٹا سا مسئلہ تھا اور وہ یہ کہ بلخ شیر مزاری راجن پور کے ڈپٹی کمشنر کا تبادلہ کروانا چاہتے تھے مگر نواز شریف اس تبادلے کے لئے تیار نہیں تھے۔ نصراللہ دریشک بھی اس تبادلے کے خلاف تھے۔ چنانچہ یہ چھوٹی سی بات بلخ شیر مزاری اور نواز شریف و نصراللہ دریشک کے درمیان بنائے مخاصمت بن گئی۔ بعد میں بلخ شیر مزاری اور فاروق لغاری بھی نصراللہ دریشک دشمنی میں ایک دوسرے کے قریب آنے لگے لیکن بلدیاتی اور مقامی سیاست میں ان کی مخالفت بھرپور طریقے سے جاری رہی۔(۱۷)

۱۹۹۳ء میں جب میر بلخ شیر مزاری نگراں وزیر اعظم بنے تو ان کی کابینہ میں فاروق لغاری کا نام سرفہرست تھا۔ جتنی دیر ان کی وزارت جاری رہی۔ نصر اللہ دریشک صوبائی کابینہ سے باہر رہے۔ البتہ میر بلخ شیر مزاری کے رخصت ہوتے ہی سردار نصر اللہ دریشک ۲۷ مئی ۱۹۹۳ء کو پنجاب کابینہ میں شامل کر لئے گئے۔ اس مرتبہ انہیں وزارت قانون کا قلم دان سونپا گیا۔ (۱۸)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں سردار نصر اللہ خان دریشک نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا مگر دونوں میں ناکام ہوگئے۔ این اے ۱۳۴ راجن پور پر انہیں میر بلخ شیر مزاری نے شکست دی (۱۹) جب کہ پی پی ۲۰۵ راجن پور ۲ پر انہیں امان اللہ خان دریشک نے ہرایا (۲۰)۔ یوں سردار امان اللہ دریشک نے ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں سردار نصر اللہ خاں دریشک سے اپنی شکست کا بدلہ لے لیا۔ سردار امان اللہ دریشک کے والد سردار محمد رمضان خان دریشک ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے ہیں جب کہ ان کے چچا سردار کرم الٰہی خان ۱۹۶۵ء میں کامیاب ہوئے تھے (۲۱)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں سردار نصر اللہ خان دریشک نے این اے ۱۳۴ راجن پور سے آزاد

امیدوار کی حیثیت میں حصہ لیا اور میر بلخ شیر مزاری کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۲۲) انہوں نے اپنی کامیابی کا یہ تسلسل ۲۰۰۲ء میں بھی جاری رکھا اور سردار خالد بشیر مزاری کو شکست دے کر نہ صرف قومی اسمبلی کے رکن بنے بلکہ اسمبلی میں پاکستان مسلم لیگ کے چیف وہپ کے عہدے پر بھی فائز ہوئے (۲۳)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں سردار نصر اللہ خان دریشک کے صاحبزادے سردار حسنین بہادر دریشک نے بھی آزاد امیدوار کے طور پر پی پی ۲۴۸ راجن پور ۲ سے پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیابی کے بعد چودھری پرویز الٰہی کی کابینہ میں وزیر خزانہ کے عہدے پر فائز ہوئے (۲۴) ادھر سردار نصر اللہ خان دریشک کے حریف سردار امان اللہ دریشک نے بھی اپنی کامیابیوں کا تسلسل جاری رکھا اور ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء دونوں عام انتخابات میں پنجاب اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے (۲۵) سردار نصر اللہ خان دریشک کے ایک صاحبزادے علی رضا خاں دریشک ۲۰۰۵ء میں راجن پور کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے ہیں (۲۶)

حوالہ جات

۱۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب۔ لاہور۔ جلد دوم ص ۲۳۳ تا ۲۳۶،
۲۔ کرپال سی یادیو۔ الیکشنز ان پنجاب ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء۔ نئی دہلی۔ ص ۴۹
۳۔ تہور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۵۶۔۱۹۵۵ء۔
۴۔ کرپال سی یادیو۔ الیکز ان پنجاب ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء۔ نئی دہلی۔ ص ۱۱۷
۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵۔ لاہور۔ ص ۲۳۹
۶۔ محکمہ تعلقات عامہ مغربی پاکستان۔ مغربی پاکستان کا جائزہ ۱۹۵۸ء لاہور۔ ص ۲۶۶
۷۔ طارق اسماعیل۔ الیکشن ۸۵۔ لاہور۔ ص ۲۳۹
۸۔ پنجاب اسمبلی ۱۹۸۷ء۔ گولڈن جوبلی سوونیئر۔ لاہور۔ ص ۶۱
۹۔ احمد سلیم۔ دریشک ورسز مزاری۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۰ تا ۱۶ جون ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳
۱۰۔ پنجاب اسمبلی ۱۹۸۷ء گولڈن جوبلی سونیئر۔ لاہور۔ ص ۶۱
۱۱۔ احمد سلیم۔ کیپنگ اٹ ان دی فیملی۔ ویک اینڈ پوسٹ (روزنامہ فرنٹیر پوسٹ) لاہور۔ مورخہ ۲۵ رجون ۱۹۹۳ء۔ ص ۸
۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۸، ۲۸۹
۱۳۔ طاہر محمود ڈوگر۔ ہواز ہو اینڈ وہاٹ از وہاٹ ۱۹۸۹ء۔ لاہور۔ ص ۶
۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء (جلد دوم)۔

ص ۲۴۰
۱۵۔ امجد وڑائچ۔ دی نونز اینڈ نائٹس آف پنجاب پولیٹکس۔ روزنامہ دی نیوز کراچی۔ الیکشن اسپیشل۔ ۲۰ ستمبر۱۹۹۳ء
۱۶۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔
۱۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹راپریل ۱۹۹۳ء
۱۸۔ احمد سلیم۔ دریشک ورسز مزاری۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۰رتا ۱۶رجون ۱۹۹۲ء ص ۱۳۔
۱۹۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴راکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۹۳۔
۲۰۔ ایضاً۔ ۱۷راکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۲۸۔
۲۱۔ ایم اے کے لودھی۔ انٹروڈیوسنگ اور ریپس (امان اللہ خان دریشک)۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور ۲۵رنومبر۔ یکم دسمبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۸
۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ (جلد دوم)۔ اسلام آباد۔ ص ۱۰۱
۲۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ (جلد دوم) اسلام آباد۔ ص ۶۲
۲۴۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۲۸۹
۲۵۔ (i) الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ (جلد دوم)۔ اسلام آباد۔ ص ۳۸۳
(ii) الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ (جلد دوم) اسلام آباد۔ ص ۲۰۳۔
۲۶۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸راکتوبر ۲۰۰۵ء

دستی

قیام پاکستان کے بعد پنجاب کی سیاست میں جن اکابرین نے بڑا نام کمایا۔ ان میں ایک نام سردار عبدالحمید دستی کا بھی ہے۔ وہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۸ء تک مسلسل پنجاب اسمبلی اور پھر مغربی پاکستان کے رکن رہے۔ متعدد کابیناؤں کے رکن رہے سدا بہار وزیر کا خطاب پایا اور پنجاب کی وزارت اعلیٰ تک پہنچے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے اپنے حالات زندگی مختصراً کچھ یوں بیان کئے ہیں:

"میری تاریخ پیدائش متنازعہ ہے۔ میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ پر ۱۸۹۱ء کا سن ہے والد صاحب کی ڈائری میں ۱۸۹۱ء کو کاٹ کر ۱۸۹۲ء لکھا ہے۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا والوں نے ۱۸۹۴ء لکھی ہے۔ میں بہرحال ۱۸۹۲ء ہی کہتا ہوں۔ تاریخ اور مہینہ کا کوئی مستند ریکارڈ میرے پاس نہیں۔

ہم جدی پشتی ضلع مظفر گڑھ کے موضع دستی والا کے رہنے والے ہیں۔ جن دنوں میں مغربی پاکستان میں منسٹر تھا۔ بلوچستان کی ریاست مکران کے والی بھائی خاں مجھے کہا کرتے تھے۔ ایک طرح سے میں آپ کی رعایا ہوں اور ایک طرح سے آپ میری رعایا ہیں۔ میں آپ کی رعایا یوں ہوں کہ آپ منسٹر ہیں اور میں عام آدمی ہوں اور میری رعایا آپ اس طرح ہیں کہ میری ریاست میں ایک علاقہ دشت ہے اس علاقے کے رہنے والے دشتی کہلاتے ہیں۔ آپ کے وڈیرے (آباؤاجداد) یقیناً وہیں سے آئے ہیں اور دشتی سے دستی ہو گئے۔

میرے والد مرحوم اللہ یار چونکہ سول سروس میں تھے۔ اس لئے میری پیدائش گورداسپور میں ہوئی۔ وہ ان دنوں وہاں تعینات تھے۔

بی۔ اے میں نے ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ ویسے اس دوران ایک سال میں اسلامیہ کالج میں بھی رہا۔ زیادہ عرصہ گورنمنٹ کالج میں رہا۔ چودھری ظفر اللہ صاحب مجھ سے سینئر تھے۔ ان کے ساتھ تب سے یاد اللہ ہے۔

ایل ایل بی ۱۹۱۹ء میں لاء کالج لاہور سے کیا اور گورداسپور میں پریکٹس شروع کر دی۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں میں مظفر گڑھ آیا۔ کیونکہ اباجی کی پنشن ہو چکی تھی۔ انہوں نے فرمایا میں تو گورداسپور

نوکری کے سلسلے میں تھا اور آپ نے وہاں ہٹی ہی کر لی ہے۔ اگر آپ نے ہٹی کرنی ہے تو گھر میں کیوں نہیں کرتے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۰ء کے بعد میں مظفر گڑھ آ گیا۔

مظفر گڑھ ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر اور وائس چیئرمین منتخب ہوتا رہا۔ اس دوران انجمن اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور اس کا صدر رہا۔ ڈسٹرکٹ نیشنل وار فرنٹ کا پریذیڈنٹ ہوا۔ مسلم لیگ کی تحریک شروع ہوئی تو مظفر گڑھ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۴۵ء کے الیکشن میں حصہ لیا۔ میرے مخالف احرار کی طرف سے نوابزادہ نصراللہ خاں اور پنجاب کی حکمران یونینسٹ پارٹی کی طرف سے فضل کریم قریشی امیدوار حلقے میں کامیاب رہا۔

پاکستان بنا۔ پنجاب کے وزیراعظم نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ تھے۔ میاں افتخار الدین ان کے وزیر مہاجرین تھے۔ مجھے انہوں نے اپنا پارلیمانی سیکرٹری مقرر کیا۔ بعد میں میں ممدوٹ کابینہ میں وزیر رہا۔ میرے پاس متعدد محکمے رہے۔ حتیٰ کہ وزیراعظم (پنجاب) نے لا اینڈ آرڈر کا محکمہ بھی مجھے دے دیا۔ زراعت اور صحت بھی میرے پاس تھے۔ شیخ کرامت علی مستعفی ہوئے تو تعلیم کا محکمہ بھی مجھے مل گیا۔ پھر میں دولتانہ وزارت میں تعلیم و صحت کا وزیر رہا۔ (۵ر اپریل ۱۹۵۱ء تا ۳ر اپریل ۱۹۵۳ء) ملک فیروز خاں نون پنجاب کے وزیراعلیٰ ہوئے تو میں ان کی کابینہ کا بھی رکن رہا۔ (۱۳ر اپریل ۱۹۵۳ء تا ۲۱ر مئی ۱۹۵۵ء) میرے پاس ایگریکلچر، پاپولیشن اور لوکل باڈیز کے محکمے تھے۔ بلکہ گزٹ آ گیا کہ وزیراعلیٰ کی غیر موجودگی میں میں وزیراعلیٰ ہوں گا۔ نون صاحب تن آسان تھے۔ امیر آدمی جو تھے۔ امیر آدمی اور نواب لوگ بالعموم تن آسان ہوتے ہیں۔ جس وقت مسلیں اکٹھی ہو جاتیں تھیں تو کراچی چلے جاتے تھے۔ راتیں جاگ جاگ کر مجھے مسلیں نکالنا پڑتی تھیں۔

فیروز خان نون کے بعد میں پنجاب کا وزیراعلیٰ بنایا گیا اور اس عہدے پر ۲۱ر مئی ۱۹۵۵ء سے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۵ء یعنی ون یونٹ کے قیام تک فائز رہا۔ ون یونٹ بنا تو مغربی پاکستان کے پہلے وزیراعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب ہوئے ان کے دور حکومت میں جو ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء سے ۱۶ر جولائی ۱۹۵۷ء تک جاری رہا، میں وزیر تعلیم رہا۔ ان کے بعد سردار عبدالرشید مغربی پاکستان کے وزیراعلیٰ ہوئے میں ان کی کابینہ میں بھی جو ۱۶ر جولائی ۱۹۵۷ء سے ۱۸ر مارچ ۱۹۵۸ء تک جاری رہی، وزیر تعلیم کے عہدے پر فائز رہا۔ ۱۸ر مارچ ۱۹۵۸ء سے مظفر علی قزلباش وزیراعلیٰ ہوئے۔ میں بدستور وزیر تعلیم تھا کہ ۷ر اور ۸ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کی درمیانی شب کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر ملک سے سیاست کی بساط ہی لپیٹ دی"۔ (۱)

سردار عبدالحمید دستی اتنے عرصہ مسلسل پنجاب کابینہ میں شامل رہے کہ ان کو سدا بہار وزیر تو کہا ہی گیا۔ ایک مرتبہ اسمبلی میں (غالباً) مولانا عبدالستار نیازی نے یہ شعر پڑھا دیا۔

کل   من   علیہا   خان

الادستی عبدالحمید خان

طرح فیروز خان نون کی وزارت کے زمانے میں ضمیر جعفری کے یہ تین اشعار نوائے وقت میں شائع ہوئے۔

آج تک جتنے بھی مسلم لیگ کے گزرے وزیر
جملہ رفت و بود میں دستی بلند اقبال ہیں
مجلس ممدوث میں، کابینہ ممتاز میں
اب ملک فیروز خاں کے بھی شریک حال ہیں
کوئی بھی بستی ہو، اس بستی میں دستی ہے ضرور
آپ مسلم لیگ کے لالہ منوہر لال ہیں۔ (۲)

۱۹۵۸ء میں مارشل لاء حکومت کے نفاذ کے بعد عبدالحمید دستی ایبڈو کی زد میں آ گئے اور پھر ہمیشہ کے لئے سیاست کے میدان سے دور چلے گئے۔

سردار عبدالحمید دستی کے صاحبزادے سردار امجد حمید دستی ہیں۔ جو اپنی سیاسی وا بستگیاں تبدیل کرنے کا اتنا اچھا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ کہ ان کا شمار باقاعدہ طور پر "لوٹوں" میں کیا جاتا ہے۔ (۳) وہ ۷ر جون ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ ان کے کلاس فیلوز میں نسیم حجازی اور مجید لاہوری شامل تھے۔ امجد حمید دستی سیاست کے افق پر ۱۹۷۰ء میں نمودار ہوئے انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز نواب زادہ نصراللہ خان کی پی ڈی پی سے کیا اور اس پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس اسمبلی میں سردار امجد حمید نے تابش الوری اور حاجی سیف اللہ کے ہمراہ ڈپٹی لیڈر آف اپوزیشن کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات سے پہلے امجد حمید دستی چھلانگ لگا کر پاکستان پیپلز پارٹی میں چلے گئے اس انتخاب میں وہ اپنے سابق رہنما نواب زادہ نصراللہ خان کے مقابلے میں صف آرا ہوئے مگران کے ووٹروں کو ان کا یہ انقلاب پسند نہ آیا اور وہ بری طرح شکست کھا گئے۔

۱۹۸۱ء میں سردار امجد حمید دستی ضیاء الحق کے کیمپ میں چلے گئے اور وفاقی مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے ۱۹۸۵ء میں انہوں نے پی پی اور مظفر گڑھ ا سے پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا اور نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ کچھ عرصہ صوبائی کابینہ میں وزیر خوراک بھی رہے (۴)

۱۹۸۸ء میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد میں شمولیت اختیار کی اور غلام مصطفیٰ کھر کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کھر کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں انہوں نے اسی نشست پر ایک مرتبہ پھر عبدالرحمٰن کھر کو شکست دی اور مسلسل تیسری مرتبہ پنجاب اسمبلی کا رکن منتخب ہوکر ہیٹ ٹرک مکمل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے اپنی یہ نشست چوتھی مرتبہ جیتی۔ یہ انتخاب انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر لڑا تھا۔ (۵) سردار

امجد حمید دستی ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء میں صوبہ پنجاب کے وزیرِ خزانہ بھی رہ چکے ہیں۔ (۶)

سردار امجد حمید دستی نے ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں بھی اپنی کامیابیوں کا تسلسل جاری رکھا۔

۱۹۹۷ء میں وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۷) جب کہ ۱۹۹۹ء میں نواز شریف کی معزولی کے بعد وہ پاکستان مسلم لیگ (ق) میں چلے گئے اور ۲۰۰۲ء میں اسی پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن بنے (۸) وہ اس وقت پنجاب اسمبلی کے معمر ترین رکن تھے (۹)

۲۰۰۲ء کے انتخابات کے بعد سردار امجد حمید دستی کی صاحبزادی تہمینہ دستی بھی خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن بنیں انہیں پاکستان مسلم لیگ (ق) نے نامزد کیا تھا (۱۰) تہمینہ دستی ۲۰۰۵ء میں منعقد ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں مظفر گڑھ کے ضلعی ناظم کے عہدے کی بھی امیدوار تھیں مگر اس انتخابات میں انہیں عبد القیوم جتوئی نے شکست دے دی (۱۱)

حوالہ جات

۱۔ سردار عبدالحمید خان دستی سے منیر احمد کا انٹرویو۔ ماہنامہ آتش فشاں لاہور۔ اگست ۱۹۸۲ء۔ ص ۹

۲۔ ایضاً۔ ص ۴۴

۳۔ عدنان عادل۔ ونس اے لوٹا آل ویز اے لوٹا۔ ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۱۹/تا ۲۵/اگست ۱۹۹۳ء۔ ص ۷

۴۔ ایم اے کے لودھی۔ مظفر گڑھس یونگ لیجنڈ۔ (سردار امجد حمید دستی) دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۲۵/۔ ۳۱/مارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۸

۵۔ امان اللہ خان (مرتب) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۳ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۹

۶۔ ایم اے کے لودھی۔ مظفر گڑھس لونگ لیجنڈ۔ (سردار امجد حمید دستی) دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۲۵/۔ ۳۱/مارچ ۱۹۹۳ء

۷۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰/فروری ۱۹۹۷۔ ص ۳۴۷

۸۔ ایضاً۔ ۲۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۳۶۶

۹۔ عابد تہامی۔ الیکشن ۲۔ لاہور۔ ص ۴۶۲

۱۰۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ ص ۴۳۷

۱۱۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۷/اکتوبر ۲۰۰۵ء

دولتانے

دولتانے جوئیہ راجپوتوں کی ایک شاخ ہیں جن کا شمار ہندوستان کے چھتیس شاہی راجپوت خاندانوں میں ہوتا ہے۔ یہ کورو پانڈوؤں کی اولاد میں سے ہیں۔ راجہ پورس جو کہ دریائے جہلم کے کنارے دور تک ایک وسیع و عریض حکومت کا مالک تھا اور جس کی جنگ یونانی شہنشاہ سکندر اعظم سے ہوئی تھی جوئیہ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ انہوں نے بھیرہ شہر آباد کیا جو ان کا مرکزی شہر تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جوئیہ خاندان کی حکومت دریائے ستلج سے لے کر مارواڑ تک پھیلی ہوئی تھی مگر بھٹی راجپوتوں اور راٹھوروں نے جوئیوں کو اس خطے سے نکال باہر کیا۔ تاہم ضلع فیروز پور اور شاہ پور میں ان کا اثر و رسوخ موجود رہا۔

جوئیہ خاندان نے بھٹیانہ اور ناگور ریاستوں پر بھی اپنا سکّہ چلایا۔ بعد ازاں وہ پاک پتن آئے اور حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ہاتھوں پر مشرف با اسلام ہوئے۔ انہوں نے اس علاقہ پر اپنی ریاست قائم کر لی جس میں فیروز پور تک کا علاقہ شامل تھا۔

فیروز پور ہی میں اس قبیلے کے ولی صفت انسان حضرت سلطان محمود جوئیہ کا مزار بھی واقع ہے۔ جنگ آزادی کا عظیم کماندار جنرل بخت خاں انہی حضرت سلطان جوئیہ کا بھتیجا تھا۔

جوئیہ راجپوت خاندان تقریباً ایک سو سے زائد ذیلی گوتوں پر مشتمل ہے ان میں سے جو مشہور ہوئیں ان میں سے ایک گوت دولتانہ بھی ہے جو کہ ضلع وہاڑی میں آباد ہے اور جس کا شمار راجپوتوں کے باوقار قبیلوں میں ہوتا ہے۔ (۱)

مشہور محقق اے آر شبلی کی تحقیق بھی اس بیان کی تائید کرتی ہے۔ وہ اپنی کتاب "پاکستان کے دیہہ خدا" میں لکھتے ہیں۔

"دولتانوں کا مورث اعلیٰ بڈھن تھا جس نے اپنے نام پر بڈھن نام کا ایک گاؤں بھی آباد کیا۔ دولتانہ ان قبائل میں سے ہے جو سکندر اعظم کے حملہ سے بہت پہلے دریائے ستلج کے کنارے آ

کر آباد ہوا۔ مارس نام ایک سیٹلمنٹ افسر نے ۱۸۵۸ء میں بندوبست کی کتاب میں لکھا ہے کہ ستلج کے ساحل پر میلسی کی تحصیل میں جویا نام ایک قبیلہ کے تریسٹھ گاؤں تھے۔ یہ قبیلہ بیکانیر کے راجپوتوں کا تھا۔ خیال ہے کہ پندرھویں صدی میں یہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے ستلج کے دونوں کناروں پر قبضہ کر لیا۔ کننگھم کا خیال ہے کہ جویا دراصل یاندہی قبیلہ کے خاندان سے تھے جو سکندر اعظم کے حملہ سے پہلے یہاں آیا۔ یہ لوگ آٹھ سو برس قبل یعنی بارھویں صدی میں مسلمان ہوئے۔ ان میں سے دو بھائی بہت مشہور ہوئے۔ رائے جلال الدین اور رائے کمال الدین ان کو سلطان دہلی نے ایک بھٹی سردار کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ انہوں نے بھٹی کو تہہ تیغ کر کے اس کا قلعہ مسمار کر دیا اور ان میں سے جلال الدین اسی جگہ آباد ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک قبیلہ سالدہیر یہاں آ نکلا۔ پھر دولتانے آئے جن کا سربراہ بڈہن خاں تھا۔ اس کا وارث غلام محمد لڑن ہوا۔ (۲)

غلام محمد لڑن نے اپنے نام پر لڑن کے نام کا ایک گاؤں آباد کیا تھا وہ ضلع ملتان کی تحصیل وہاڑی میں ایک ایسے جرائم پیشہ قبیلہ کا سردار تھا جو رسہ گیری اور دوسرے جرائم کی وجہ سے ستلج کے دونوں کناروں پر بہت خوف و ہراس پھیلاتا تھا۔ بالآخر انگریزوں نے اس قبیلے کو رام کر لیا اور ان کے سردار لڑن کو سولہ ہزار ایک اراضی اس شرط پر بطور انعام عطا کیا آئندہ اس کے قبیلے کی طرف سے کوئی جرم سرزد نہیں ہو گا۔ (۳)

قیام پاکستان سے پہلے اس خاندان کے جس فرد نے سیاست کے میدان میں شہرت حاصل کی وہ میاں احمد یار خان دولتانہ تھے۔ وہ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۰ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل اور ۱۹۳۷ء میں دو نشستوں سے پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد میں انہوں نے ایک نشست خالی کر دی جس پر ضمنی انتخاب میں ان کے چھوٹے بھائی میاں اللہ یار خاں دولتانہ کامیاب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں بھی اس نشست پر میاں اللہ یار خاں دولتانہ ہی کامیاب ہوئے تھے۔ (۴)

میاں احمد یار خان دولتانہ کے اکلوتے بیٹے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ ہیں وہ اپنے والد کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ ۴ر جون ۱۹۴۳ء کو پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جبکہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اور قومی دونوں اسمبلیوں کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۵)

قیام پاکستان کے بعد جب پنجاب میں نواب افتخار حسین ممدوٹ وزارت اعلیٰ پر فائز ہوئے تو میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ ان کی کابینہ میں وزیر خزانہ کے طور پر شامل ہوئے۔ وہ زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ پاکستان بھی ابھی وجود میں آیا تھا اور مہاجرین کے مسائل بڑے سنگین اور دلخراش تھے۔ ادھر بھارت پاکستان کے وجود ہی کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس نازک دور میں ضرورت کامل

اعتماد اور بے پناہ خلوص کی تھی، عوام اور حکومت نے ایثار اور حب الوطنی کا ثبوت دیا بھی، مگر پنجاب کی حکومت زیادہ دیر تک اپنے آپ کو متحد نہ رکھ سکی۔ دولتانہ حکومت میں دوسری پوزیشن پر قانع نہ تھے اور وہ جلد سے جلد صوبے کی وزارت عظمیٰ پر فائز ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ اقتدار کی جنگ چند مہینے اندر ہی اندر جاری رہی اور پھر یہ جنگ اخبارات کی سرخیوں آ پہنچی۔ دولتانہ مستعفی ہو گئے اور ان کے ساتھ سردار شوکت حیات بھی حکومت سے باہر آ گئے۔ اس واقعے سے پنجاب کی سیاست میں دو خرابیاں پیدا ہوئیں۔

ا۔ حکمران سیاسی جماعت میں گروہ بندی

ب۔ پنجاب میں گورنر راج کا تسلط

یہ دونوں خرابیاں آگے چل کر پاکستان کی سیاسی زندگی میں زہر بن کر سرایت کر گئیں۔ دولتانہ حکومت میں پہلی پوزیشن حاصل کرنا چاہتے تھے، مگر اس مقصد کے لئے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھے انہوں نے جناب سردار شوکت حیات کے ذریعے راستہ ہموار کیا اور انہیں اپنے سیاسی مقاصد کا اس خوبصورتی سے آلہ کار بنایا کہ سردار صاحب کو احساس تک نہ ہوا۔ اسی وقت سے سردار شوکت حیات بڑے خلوص سے فریب کھاتے چلے آ رہے ہیں۔

دولتانہ کی سیاسی آرزوؤں نے پنجاب کو گورنر راج کے شکنجوں میں کس دیا اور یہیں سے وہ کھیل شروع ہوتا ہے جو بالاخر مارشل لاء کی خبر لایا۔ عوام کے سیاسی رہنما حکومت سے ہٹ گئے اور سیاسی مشینری فی الحقیقت، سیکرٹریوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ حکومت میں جواب دہی کا احساس کم ہوتا رہا اور عوام سیاسی تربیت اور احتساب کے حق سے محروم ہو گئے۔ میاں عبدالباری مرحوم کی کوششوں سے گورنر کے مشیر مقرر کئے گئے۔ ورنہ اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ پاکستان آغاز ہی میں غیر جمہوری روایات کی لپیٹ میں آ جائے اور آزادی کے حصول کے باوجود انگریز گورنر مسلمانوں کی آئینی اور سیاسی آزادی کی علامت قرار پائے۔

۵۱ء کے آغاز میں پنجاب کے اندر پہلے عام انتخابات ہوئے۔ جناح مسلم لیگ (نواب ممدوٹ) جماعت اسلامی اور اتحاد پاکستان پارٹی (میاں افتخار الدین) نے حزب اختلاف کا کردار ادا کیا۔ جناب دولتانہ کے اپنے حلقے میں ان کے مقابل امیدوار کھڑا ہوا۔ نوائے وقت کے صفحات گواہ ہیں کہ وہ انتخابات دھونس، دھوکا، دھاندلی کی علامت بن گئے تھے۔ بڑے پیمانے پر بیلٹ بکس توڑے گئے، جعلی ووٹ بھگتائے گئے اور جمہوریت کی تمام قدریں پامال ہوئیں۔ دولتانہ صاحب ان تمام حربوں کے ذریعے نہایت معمولی اکثریت سے اپنے حلقے سے کامیاب ہوئے۔ اس وقت عام اندازہ یہ تھا کہ انتخابات منصفانہ ہوتے، تو دولتانہ کی کامیابی ناممکن تھی۔

دولتانہ صاحب نے انتخابات میں کامیابی اور پنجاب کی وزارت عظمیٰ حاصل کرنے کے لئے جمہوریت کی نشوونما روک دی بلکہ ایسے اقدامات کئے جن کی وجہ سے ملک بتدریج جمہوریت

سے محروم ہوتا چلا گیا۔ پہلے انہوں نے نواب ممدوٹ کی جمہوری حکومت کو تلپٹ کیا اور بعد میں جمہوری روایات کا سر قلم کر ڈالا۔ انتخابات میں غیر جمہوری طریقوں کو رواج سب سے پہلے پنجاب میں ملا اور ان طریقوں نے پھر کبھی جمہوریت کو پنپنے نہ دیا۔ جمہوریت کی عمارت تعمیر ہونے سے پہلے وہ بنیادیں ہلا دی گئی تھیں۔ جو تحریک پاکستان میں عوام کے بے پناہ جمہوری شعور سے اٹھائی گئی تھیں۔

جناب دولتانہ نے پنجاب کا وزیر اعلیٰ بن جانے کے بعد آزادی صحافت پر بھرپور وار کیا۔ ان کے زمانے میں نوائے وقت پر افتاد آ پڑی، مگر اول تو حمید نظامی مرحوم ذہانت اور تعلقات میں دولتانہ سے بہت آگے تھے اور دوسرے انتظامی اور عدالتی شعبے سیاسی دباؤ سے متاثر نہ ہوئے تھے۔ وزیر اعلیٰ اور ایڈیٹر کے درمیان جنگ جاری رہی اور بالاخر وزیر اعلیٰ کو ایڈیٹر کے قلم کے آگے جھکنا پڑا۔

پنجاب کی وزارت عظمٰی پر متمکن ہوئے دولتانہ صاحب کو مشکل سے دو سال ہوئے تھے کہ انہیں پاکستان کے وزیراعظم بننے کی آرزو نے پاگل کر دیا۔ لیاقت علی خاں راولپنڈی میں شہید کئے جا چکے تھے اور خواجہ ناظم الدین جو بڑے ہی سادہ مزاج اور سادہ دل تھے، وزیراعظم بنا دیئے گئے۔ دولتانہ صاحب نے بھانپ لیا کہ خواجہ صاحب کو چت کرنا بہت زیادہ مشکل نہیں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر چند برسوں میں پاکستان کے وزیراعظم بن جاتے، مگر جمہوری راستہ طویل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ وہ شارٹ کٹ چاہتے تھے اور شارٹ کٹ بھی ایسا جو انہیں آگے بڑھ کر خود بنانا نہ پڑے۔ انہوں نے اپنی سابقہ روایات کے عین مطابق خواجہ ناظم الدین صاحب کے خلاف سازش تیار کی۔ نواب ممدوٹ کے خلاف سازش میں وہ کامیاب ہو ہی چکے تھے، اس لئے انہیں کامل یقین تھا کہ خواجہ صاحب ان کے خفیہ حملوں کے سامنے ٹھہر نہ سکیں گے۔ دولتانہ صاحب کے منصوبے کے مطابق دیکھتے ہی دیکھتے احمدیوں کے خلاف تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ تحریک اپنی شدت اور قوت میں بلاخیز تھی اور پورے پنجاب میں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ مرکزی حکومت سخت پریشان ہو گئی۔ خواجہ ناظم الدین پنجاب بھر میں مطعون کئے جا رہے تھے۔ ان کے جنازے نکالے گئے اور اس طرح پنجاب کے عوام کا مرکزی حکومت، زیادہ صحیح یہ کہ، وزیراعظم سے تصادم کرا دیا۔ دولتانہ صاحب جانتے تھے خواجہ صاحب اپنی طبعی نرم دلی کی وجہ سے تحریک کے خلاف سخت اقدامات نہ کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ تحریک میں مذہب کا رنگ غالب تھا، اس لئے مرکزی حکومت کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پنجاب کے آگے جھک جائے۔ پنجاب کے سامنے جھک جانے کا مطلب دولتانہ کے آگے جھک جانا تھا۔ کشمکش جاری رہی اور عین اس وقت دولتانہ صاحب اپنی کامیابی کے خواب دیکھ رہے تھے، مرکزی حکومت حرکت میں آئی اور لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

منیر رپورٹ میں دولتانہ صاحب کی سیاسی سازشوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دولتانہ صاحب نے اپنی سیاسی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے ایک ایسا ڈراما تیار کیا جس کے نتائج بڑے بھیانک اور دور رس نکلے۔ مارشل لاء بظاہر لاہور میں نافذ ہوا' مگر اس نے پورے ملک کی سیاست اور آئینی زندگی کو متاثر کیا۔

لاہور کے مارشل لاء کے بعد ایوب خاں کے سیاسی عزائم کروٹیں لینے لگے۔ مارشل لاء کا پہلا تجربہ کامیاب رہا تھا۔ ملک میں کوئی ایسی سیاسی جماعت نہ تھی جس نے جمہوری روایات کو زندہ اور مستحکم کرنے کے لئے قربانی دی ہو' البتہ مارشل لاء کی فوجی عدالت نے مولانا عبدالستار خاں نیازی اور سید ابو الاعلیٰ مودودی کو سزائے موت کا حکم سنایا۔

یہ مارشل لاء مارچ ۱۹۵۳ء میں نافذ ہوا اور اس طرح وہ ناخوشگوار تجربہ جس نے اور بہت سے ناخوشگوار تجربوں کو جنم دیا' جناب دولتانہ کے ہاتھوں وجود میں آیا۔ دولتانہ صاحب پنجاب کی وزارت عظمیٰ سے محروم کر دیئے گئے۔ یہ سارا منصوبہ دولتانہ صاحب کے سراسر خلاف گیا۔ پاکستان کی وزارت عظمیٰ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا اور پنجاب کی وزارت عظمیٰ بھی ہاتھ سے نکل گئی اور رسوائیوں کے کانٹے ان کے اور اقتدار کے درمیان حائل ہو گئے۔

دولتانہ صاحب نے جو سازش خواجہ صاحب کے خلاف کی' وہ سازش اپنے نتائج کے اعتبار سے ملک کے سیاسی مستقبل کے لئے سخت تباہ کن ثابت ہوئی۔ ختم نبوت کی تحریک جسے عام مسلمان ایک مذہبی تحریک سمجھ رہے تھے اور جس کی پشت پر دولتانہ صاحب کی اغراض کام کر رہی تھیں' اس نے ملک میں غیر آئینی اقدامات کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔ پنجاب کی زندگی کئی مہینوں سے شورشوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی اور اس کے نتیجے میں ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات پر تھوڑا بہت اثر پڑنا لازمی تھا۔ گندم کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں اور قحط کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

گورنر جنرل غلام محمد جو ملک میں جمہوری نظام کے سخت خلاف تھے اور اپنی آمریت قائم کرنا چاہتے تھے' انہوں نے ملک کی غذائی صورت حال کا بہانہ بنا کر خواجہ ناظم الدین کو پاکستان کی وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا۔ یہ حادثہ اپریل ۱۹۵۳ء میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ حادثہ ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے زیادہ ہولناک اور شرمناک حادثہ تھا۔ ایک جمہوری وزیراعظم کی برطرفی دراصل ملک کی آئینی خودکشی تھی۔ مسلم لیگ جو دھڑوں میں بٹ چکی تھی۔ گورنر جنرل کے اس غیر آئینی اقدام کے خلاف اف تک بھی نہ کر سکی۔ دولتانہ صاحب اگر خواجہ صاحب کے خلاف خفیہ طریقوں سے عوامی تحریک نہ چلاتے' تو لاہور میں مارشل لاء نہ لگتا اور گورنر جنرل کو خواجہ صاحب کے برطرف کرنے کا کبھی حوصلہ نہ پڑتا۔ خواجہ صاحب اگر برطرف نہ کیے جاتے' تو پاکستان کی آئینی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی اور ہم جمہوریت کی شاہراہ پر بہت آگے نکل چکے

ہوتے۔

ادھر دولتانہ صاحب خواجہ ناظم الدین صاحب کے خلاف سرگرم عمل تھے اور ادھر جناب نور الامین کی اطلاعات کے مطابق سہروردی صاحب سے خط و کتابت کے ذریعے سیاسی معاہدوں میں مصروف تھے۔ وہ اپنے طور پر مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کے مقابلے میں، عوامی لیگ سے پینگیں بڑھا رہے تھے۔ عہد و پیمان کے یہ مرحلے دولتانہ صاحب کے لئے اقتدار کی راہ ہموار نہ کر سکے۔

پاکستان کی تاریخ کا سیاہ باب دولتانہ صاحب نے اپنی خاک شدہ آرزوؤں سے لکھا ہے۔

خواجہ ناظم الدین صاحب کی برطرفی پر کسی سیاسی جماعت کی طرف سے موثر احتجاج نہ ہوا۔ گورنر جنرل غلام محمد کے سیاسی عزائم میں اور دیوانگی پیدا ہو گئی۔ اکتوبر ۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی۔ ان تمام حادثات کا تعلق ۱۹۵۳ء کے غیر معمولی حالات سے تھا جن کی بڑی حد تک ذمے داری جناب دولتانہ پر آتی ہے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک کے واقعات بڑے پر اسرار ہیں اور ان پر اسرار واقعات میں بڑے اہم چہرے چھپے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان کا سراغ لگانے کی ضرورت نہیں، تاہم ان دو تین برسوں میں ایک واقعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

مسلم لیگ ون یونٹ کی تشکیل میں بڑی فعال تھی اور دوسری دستور ساز اسمبلی کے اہم ارکان اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ون یونٹ کی ضرورت اور اہمیت پر دولتانہ صاحب نے ایک مضبوط مضمون تیار کیا تھا۔ وہ مضبوط مضمون بعض نکات کی وجہ سے دستور ساز اسمبلی میں زبردست بحث و تمحیص کا موضوع بنا تھا اور اس بحث نے ملک کی اہم ترین شخصیتوں کو متاثر کر ڈالا تھا، مگر ایک دو اصحاب کی تدبیروں نے صورت حال کو خراب ہونے سے بچا لیا۔ ون یونٹ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں تشکیل پایا اور ابھی دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ مسلم لیگ نے سندھ کے جی ایم سید گروپ سے ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق وہ ون یونٹ کو توڑنے پر رضامند ہو گئی۔ اس وقت تک ری پبلکن بھی جنم لے چکی تھی۔ مسلم لیگ اور ری پبلکن میں اقتدار کے لئے سخت کشمکش تھی۔ مغربی پاکستان کی مسلم لیگ کے روح رواں دولتانہ تھے اور انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اس عمارت کو گرا دینے کا فیصلہ کر لیا جس کی تعمیر میں انہوں نے پوری قوت صرف کی تھی۔ یہ ملکی سیاست کا تیسرا بڑا سانحہ تھا۔ دولتانہ صاحب نے اس شخص کے ساتھ معاہدے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ جو قائداعظمؒ کا شدید مخالف تھا اور پاکستان میں علاقائی حد بندیوں کے لئے کام کر رہا تھا۔

۱۹۵۷ء کے آخری مہینوں میں صدر پاکستان، اسکندر مرزا اپنے آپ کو پاکستان کا بادشاہ بنانے کے لئے سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھے۔ وہ سہروردی کو اپنی راہ سے ہٹا دینا چاہتے تھے۔ باخبر حلقوں کی روایت ہے کہ سہروردی کی برطرفی میں اسکندر مرزا کو دولتانہ صاحب کی حمایت حاصل

تھی اور عین اس وقت جب باشعور سیاسی جماعتیں اسمبلی میں صدر پاکستان کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرنے کی تیاریوں میں سرگرم تھیں' دولتانہ صاحب اسکندر مرزا سے سرگوشیوں میں منہمک تھے اور پھر ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات آئی۔ سردار بہادر خاں اس رات کی داستان بڑی تفصیل سے سناتے ہیں:

"میں اس رات کو دولتانہ کے ہاں مقیم تھا۔ آدھی رات کے وقت دولتانہ صاحب نے آہستہ سے دستک دی۔ میں جاگ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے مبارک باد دی کہ تمہارے بھائی نے ملک کا اقتدار سنبھال لیا ہے۔ میرے لئے یہ خبر بڑی وحشت ناک اور دلخراش تھی۔ میں نے حسرت اور دکھ کے ساتھ پوچھا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا ملک میں مارشل لاء نافذ ہو چکا ہے اور جنرل ایوب خاں چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اور سپریم کمانڈر بن گئے ہیں۔ میں نے پھر حسرت سے پوچھا آپ کو یہ خبر کیسے معلوم ہوئی' ٹیلی فون کی گھنٹی تو بجی نہیں؟ کہنے لگے معلومات کے اور ذرائع بھی ہیں۔

پھر ۲۷ر اکتوبر کو سکندر مرزا نے وزیروں سے حلف لیا۔ مجھ سے الماس دولتانہ نے بڑے حسرت آمیز لہجہ میں کہا: منظور قادر نے میرے شوہر کی جگہ لے لی ہے۔ اسکندر مرزا نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔"

جناب سردار بہادر خاں نے تو اور بھی بہت سے رازوں سے پردہ ہٹایا' مگر ہم تو صرف ان معاملات کو اہمیت دیتے ہیں جو ملک کی قسمت پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ دولتانہ صاحب اور ان کی اہلیہ مارشل لاء کے نفاذ سے جو توقعات وابستہ کئے ہوئے تھیں۔ وہ پوری نہ ہو سکی مگر ان کا ہاتھ مارشل لاء کے لئے راستہ ہموار کر گیا۔ مارشل لاء نے ملک کی سیاسی اور بین الاقوامی حیثیت کو جو نقصان ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اب دولتانہ صاحب کی تین بڑی خواہشیں تھیں۔

- پاکستان کے بااختیار صدر ہوں۔
- ملک کے وزیراعظم بن جائیں۔
- یہ ممکن نہ ہو' تو وزارت خارجہ ان کے سپرد ہو۔

ایوب خاں کے صدارتی نظام میں وزارت عظمیٰ خارج از امکان تھی' اس لئے وہ اس طویل عرصے میں وزارت خارجہ کو اپنی منزل سمجھتے رہے۔ سکندر مرزا نے ان سے وعدہ خلافی کی' تو انہوں نے ایوب خاں سے پیمان وفا باندھ لیا۔ سیاسی مبصرین شہادت دیتے ہیں کہ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء کے وسط تک دولتانہ صاحب ایوب خاں کی پشت پناہی کرتے رہے۔ جب ایوب خاں اور دولتانہ مری میں ہوتے' تو ایوب خاں کے بیشتر سیاسی بیانات دولتانہ صاحب کے مشوروں سے تیار ہوتے تھے۔ ایوب خاں صاحب نے اپنی سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا تو دولتانہ صاحب اس

فیصلے کی حمایت کر رہے تھے۔ فدا محمد خاں (سابق ایم۔ این۔ اے پشاور) نے اپنا ایک واقعہ یوں بیان کیا:

"ان دنوں ایوب خاں مری میں ٹھہرے ہوئے تھے انہوں نے مجھے بلایا اور کراچی میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ میں نے کہا: مسلم لیگ پہلے سے موجود ہے اور میں اسی سے وابستہ ہوں۔ ایوب خاں زور دیتے رہے۔ آخر میں کہا دولتانہ سے مشورہ کر لو۔

قصر صدارت کے سامنے دولتانہ صاحب کی اقامت گاہ تھی۔ میں سیدھا وہاں پہنچا اور دولتانہ صاحب سے ایوب خاں کی باتیں بیان کیں۔ فرمانے لگے: "ٹھیک ہے تمہیں شرکت کرنی چاہیے"۔ میں ششدر رہ گیا۔"

سیاسی حالات کا بہاؤ اس بیان کی تصدیق کرتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے ایوب خاں بڑی حد تک دولتانہ صاحب کی گرفت میں تھے، لیکن نواب کالا باغ کے گورنر بن جانے سے صورت حال یکسر بدل گئی۔ وہ دولتانہ کو اپنے لئے اور ایوب خاں کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کی تمام تر حکمت عملی دولتانہ کی قوت کو توڑنا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عوام پر دولتانہ کی گرفت بہت ڈھیلی ہے۔

۱۹۶۲ء کے انتخابات جو اگرچہ بنیادی جمہوریتوں کی بنیاد پر منعقد ہوئے تھے، مگر ملک کی تاریخ میں سب سے زیادہ غیر جانب دارانہ اور منصفانہ انتخابات تھے۔ ان انتخابات میں وہ سیاسی قائد حصہ نہ لے سکے جو ایبڈو ہو چکے تھے، مگر ان کے رشتے دار منتخب ہو گئے۔ دولتانہ صاحب کے حلقے سے ان کا رشتے دار منتخب ہو سکا نہ ان کا سیاسی دست راست۔ اس سے عیاں تھا کہ دولتانہ صاحب عوام میں مقبول نہ تھے۔ نواب کالا باغ دولتانہ کی بے پناہ صلاحیتوں سے خائف تھے، وہ صلاحیتیں جن کے ذریعے اندر ہی اندر سیاست کی بساط الٹی جا سکتی تھی۔

نواب کالا باغ کے ہوتے ہوئے دولتانہ کے لئے ایوب خاں سے سیاسی تعلقات استوار کرنا ممکن نہ رہا، لیکن جلد ہی ایک نیا راستہ تلاش کر لیا گیا۔ انہوں نے اپنی بیگم کے ذریعے ایوب خاں کے لڑکوں سے صنعتی روابط قائم کر لئے۔ یہ دور وہ تھا جس میں سیاسی تعلقات، صنعتی تعلقات کے گرد گھومتے تھے، چنانچہ ایوب خاں سے سیاسی اختلافات ہونے کے باوجود، دولتانہ صاحب کے شاہی خاندان سے خوشگوار تعلقات قائم رہے۔

۱۹۶۵ء کے انتخابات میں عوامی خواہشات، بنیادی جمہوریت کی آمریت کے ہاتھوں شکست کھا گئیں، لیکن دولتانہ صاحب کی دور رس نگاہوں نے آنے والے حالات کا اسی وقت اندازہ لگا لیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ آنے والے حالات میں اپوزیشن جماعتیں اہم کردار ادا کریں گی اور جب حکومت عوامی جدوجہد کے ہاتھوں پسپا ہو گی، اور باقی جماعتوں کے سربراہوں کو حکومت

سے معاملہ کرنے کے مواقع میسر آ جائیں گے، چنانچہ اس احساس کے تحت انہوں نے کونسل مسلم لیگ کی قیادت کو ہاتھ میں لینے کا منصوبہ بنایا۔

دولتانہ صاحب ہر بڑے کام کا آغاز بڑی سادگی اور بڑے انکسار سے کرتے ہیں۔ ۱۹۶۶ء کے آخر میں وہ ایبڈو کی قید سے آزاد ہونے والے تھے۔ رہا ہونے سے پہلے انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو خط لکھا کہ وہ کونسل مسلم لیگ دو آنے کا ممبر بننا چاہتے ہیں اور انہیں کسی عہدے کی خواہش نہیں۔ ایبڈو اٹھنے سے ایک روز پہلے ۳۰ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو بیان دیا کہ وہ کسی عہدے کے آرزو مند نہیں۔ شوکت حیات سے ان کا معاہدہ بھی ہوا کہ وہ ان کے لئے کام کریں گے، مگر اندر ہی اندر شطرنج کے شہسوار بازی کھیلتے رہے اور دولتانہ صاحب کونسل مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ یہ انتخابات اپنے سینے میں جو افسوسناک واقعات چھپائے ہوئے ہیں، انہیں عام کرنے کی ضرورت نہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ دولتانہ صاحب کس انداز کے انتخابات کے ذریعے اوپر آئے ہوں گے۔

دولتانہ صاحب کونسل مسلم لیگ کے صدر کیوں کر بنے؟ اس میں ایک دو باتیں ملک کے نقطہ نظر سے خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ انتخابات سے پہلے دولتانہ اور قیوم خاں میں ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ انتخاب میں حصہ نہ لیں گے۔ اسی معاہدے کی روشنی میں دولتانہ صاحب نے سردار شوکت حیات کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ آخری وقت میں دولتانہ صاحب صدارت کے امیدوار بن گئے۔ یہ معاہدے کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ اس خلاف ورزی سے دل برداشتہ ہو کر قیوم خاں کونسل مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے اور ان کی علیحدگی نے پاکستان کی سیاسی زندگی میں ایک اور الجھن اور ایک اور سلسلہ انتشار پیدا کر دیا۔

دولتانہ صاحب نے اپنے طرز عمل سے مسلسل یہ ثابت کیا کہ سیاسی زندگی میں معاہدوں اور الفاظ کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ وہ ۱۹۵۱ء میں بھی اسی طرح ایک تحریری معاہدے کی خلاف ورزی کر چکے ہیں۔ انہوں نے ملتان کے گیلانیوں سے قرآن پر حلف اٹھا کر وعدہ کیا کہ وہ ان کے نمائندے کو وزارت میں شامل کریں گے۔ وزارت بنی، تو کسی گیلانی کو وزیر نہ بنایا۔ جب پوچھا گیا کہ قرآن کو درمیان میں لا کر یہ بد عہدی؟ تو فرمایا میں نے تو حاشیے پر دستخط کیے تھے۔

دولتانہ صاحب کے انتخاب کے سلسلے میں یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ ان کے لئے چند مرکزی وزراء کام کرتے رہے اور ضلع ہزارہ کا تمام اثر و رسوخ ان کے حق میں استعمال ہوا۔ بعض سیاسی مبصر یہ برملا کہتے ہیں کہ انتخاب سے پہلے ایوب اور دولتانہ کے درمیان خفیہ معاہدہ ہو چکا تھا، ورنہ مرکزی وزیروں کو کونسل مسلم لیگ کے انتخابات میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟

دولتانہ صاحب کا رویہ کسی مقام پر بھی اپنے مخصوص مزاج سے الگ نظر نہیں آتا۔ وہ ہمیشہ

پہلے سیدھے سادے واقعات کو بتدریج سنگین بناتے ہیں اور پھر ان سنگین حالات کو انتہا تک پہنچا کر اپنے لئے معاملہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اس بات سے بہت کم دلچسپی ہے کہ حالات کو انتہا تک پہنچانے میں ملک کو اپنی سالمیت اور وقار کی کتنی بڑی قیمت دینی پڑتی ہے۔

فروری ۱۹۶۹ء میں ملک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ہنگامے اپنے عروج پر تھے۔ ایوب خاں گول میز کانفرنس میں ڈیک کے نمائندوں سے بات چیت کرنے کو تیار تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن اگر تلہ سازش کیس کے سلسلے میں گرفتار تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں عوامی لیگ ڈیک میں شامل ہو گئی تھی۔

۱۷۔۱۸ر فروری ۱۹۶۹ء کے ایام ملک کی سیاسی زندگی میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر گئے۔ دولتانہ صاحب مصر تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے بغیر ہمیں صدر پاکستان سے گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ کونسل مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے دولتانہ کی رائے کے خلاف فیصلہ دیا۔ ادھر عوامی لیگ کے قائدین بار بار کہتے رہے کہ ہم آپ کو لکھ کر دیتے ہیں کہ ہماری طرف آپ دو نکات کی بنیاد پر صدر ایوب سے بات چیت کر لیں۔ اس تمام خارجہ دباؤ کے باوجود دولتانہ صاحب اس بات پر ڈٹے رہے کہ وہ شیخ مجیب کے بغیر گول میز کانفرنس میں شرکت نہیں کریں گے۔ ڈیک میں ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر دولتانہ صاحب نے جناب سردار شوکت حیات کو آگے کر دیا۔

ملک پر مارشل لاء کے خطرات منڈلا رہے تھے۔ ”پی ڈی ایم“ کے قائدین جن کے ساتھ دولتانہ صاحب برسوں سے کام کرتے چلے آ رہے تھے، سخت مضطرب اور پریشان تھے۔ کونسل مسلم لیگ کے سمجھ دار ارکان انگاروں پر لوٹ رہے تھے مگر دولتانہ صاحب حالات کو انتہا تک پہنچا دینا چاہتے تھے۔ انہیں اپنی دیرینہ آرزو پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اقتدار ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ آخری ضرب لگانے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔

آج دولتانہ صاحب اپنے اس وقت کے طرز عمل کی کچھ ہی وضاحت کریں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اقتدار کا کھیل کھیل رہے تھے۔ انہوں نے مجلس عاملہ میں تمام سیاسی جماعتوں کا تجزیہ پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ کونسل مسلم لیگ کے سوا اور کوئی سیاسی جماعت برسر اقتدار نہیں آ سکتی۔ جماعت اسلامی کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اس کے خلاف صرف یہ پروپیگنڈہ کافی ہے کہ اس نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ پھر انہوں نے بڑے موثر انداز میں یہ ثابت کیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کا واحد لیڈر ہے اور ہم اس کے تعاون سے ایوب خاں سے اقتدار لے سکتے ہیں۔

سیاسی سمجھوتے، سیاسی زندگی میں ناگزیر ہیں۔ سیاسی زندگی بھی لچک اور پھیلاؤ کا تقاضا کرتی ہے، مگر یہ لچک اصولوں کو ختم کرنے اور ملک کو سیاسی بحران سے دو چار کرنے والی نہیں ہونی

چاہیے- پاکستان جل رہا تھا اور دولتانہ صاحب اپنے لئے قصر صدارت تعمیر کرا رہے تھے- ہو سکتا ہے وہ اس حد تک جانا نہیں چاہتے ہوں 'مگر جو رویہ انہوں نے اختیار کیا تھا' اس کے قدرتی نتائج اس کے سوا اور کچھ نکل ہی نہیں سکتے تھے جو بالاخر پوری قوم کو بھگتنے پڑے

ایک بار پھر مارشل لاء آگیا اور اقتدار کے سہانے سپنے زندگی کی تلخ حقیقت بن گئے-

مارشل لاء کے بعد دولتانہ صاحب پھر اپنی خفیہ سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے-

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات سے پہلے سندھ میں انہیں سیاسی اعتبار سے جی ایم سید سب سے زیادہ طاقت ور نظر آئے تو دولتانہ صاحب نے قائداعظم کے اصول اور جی ایم سید کی کشمکش سب کو بھلا دیا اور اپنے حلقہ اثر کی توسیع کے لئے جی ایم سید سے بغل گیر ہو گئے- اس انتخابی معاہدے نے دولتانہ صاحب کے سیاسی مستقبل کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور دولتانہ صاحب سب کو اپنے جال میں پھنساتے پھنساتے خود ایک بہت بڑے سیاسی جال میں پھنس گئے وہ پاکستان کے ہر حلقے سے قائدین کو اپنے ساتھ ملانے کی مہم پر نکلے ہوئے تھے جن کی مدد سے اقتدار کی مسند تک پہنچ سکیں- سرحد میں ان کی نظر عبدالولی خاں پر گئی' مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن صاحب ان کے جگری دوست پہلے سے موجود تھے- سندھ میں کھوڑو صاحب کو رام کر چکے تھے- ہارون خاندان سے ان کے پہلے ہی سے سیاسی روابط تھے- بہاول پور میں حسن محمود سے سیاسی گفتگو جاری تھی- پنجاب میں وہ کسی کو مد مقابل سمجھتے ہی نہ تھے- اس سیاسی صورت حال سے عوام میں یہ تاثر پھیلتا جا رہا تھا کہ انتخابات میں دولتانہ سب سے زیادہ طاقت ور سیاسی شخصیت کی حیثیت سے ابھریں گے-(۶)

مگر جب انتخابات کے نتائج برامد ہوئے تو ان کی کونسل مسلم لیگ قومی اسمبلی کی فقط سات اور جملہ صوبائی اسمبلیوں کی فقط اکیس نشستیں حاصل کر پائی- مشرقی پاکستان اور بلوچستان میں اس کا کوئی امیدوار کامیاب نہ ہو سکا-(۷)

پیپلز پارٹی کی حکومت کے قیام کے بعد انہیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ وہ بھی خان عبدالقیوم خان کی طرح ذوالفقار علی بھٹو کے تابع مہمل بن جائیں چنانچہ انہوں نے قومی اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دیا اور انگلستان میں پاکستان کے سفیر بن گئے-(۸) یوں پاکستان کی بساط سیاست کا ایک انتہائی اہم مہرہ بساط سے ہمیشہ کے لیے باہر ہو گیا-

بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد میاں ممتاز دولتانہ عملی سیاست سے تقریباً دست کش ہو گئے-

۳۰ جون ۱۹۹۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا-(۹)

میاں ممتاز دولتانہ کے سفیر بننے کی وجہ سے قومی اسمبلی کی جو نشست خالی ہوئی تھی اس پر ضمنی انتخاب میں ان کے کزن اور میاں اللہ یار خان دولتانہ کے صاحبزادے میاں ریاض احمد خان دولتانہ

ایم این اے منتخب ہوئے۔ میاں ریاض احمد خاں دولتانہ نے اس انتخاب میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی تھی۔ ۱۹۷۷ء میں بھی انہوں نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور این اے ۱۲۲ وہاڑی ۲ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔

ضیاء الحق کے دور حکومت میں میاں ریاض احمد خاں دولتانہ مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہو گئے۔ انہوں نے ۱۹۸۵ء کے انتخاب میں بھی حصہ لیا اور این اے ۱۲۲ وہاڑی ۲ سے قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۰) انہوں نے ۷ مئی ۱۹۹۶ء کو وفات پائی (۱۱)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کے اکلوتے صاحبزادے میاں جاوید ممتاز دولتانہ نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور پی پی ۱۹۶ وہاڑی ۵ سے صوبائی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوئے۔ اس سے پہلے وہ اسی حلقے سے ۱۹۷۷ء میں بھی ایم پی اے منتخب ہوئے تھے اس وقت انہوں نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا تھا۔ (۱۲) ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور پی ڈی اے کے امیدوار محمد ضرغام خان خاکوانی سے ۵۶۲ ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ اسی انتخاب میں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کے بھتیجے اور میاں ریاض احمد خان دولتانہ کے صاحبزادے میاں محمد زاہد خاں دولتانہ نے بھی این اے ۱۳۰ وہاڑی ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ آئی جے آئی کے اکبر علی بھٹی اور پی ڈی اے کے محمد احسن خان، دونوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۳) میاں زاہد دولتانہ اس سے قبل ڈسٹرکٹ کونسل وہاڑی کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ (۱۴)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں دولتانہ خاندان ایک مرتبہ پھر خبروں کا موضوع بنا۔ ان انتخابات میں ایک جانب تو میاں ممتاز دولتانہ کے صاحبزادے میاں جاوید ممتاز دولتانہ نے صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں محمد ضرغام خان خاکوانی کو شکست دے کر اپنی کھوئی ہوئی نشست ایک مرتبہ پھر حاصل کر لی (۱۵) دوسری جانب میاں ریاض احمد دولتانہ کی صاحبزادی اور میاں زاہد خاں دولتانہ کی ہمشیرہ مسز تہمینہ عقیل دولتانہ عبدالمجید بھٹی اور دیگر امیدواروں کو شکست دے کر قومی اسمبلی کی رکن بن گئیں (۱۶) وہ واحد خاتون تھیں تو پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھیں (۱۷)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں میاں جاوید ممتاز دولتانہ کا نام نظر نہیں آیا۔ ان انتخابات میں ان کی نشست پی پی ۱۹۶ وہاڑی ۵ سے میاں سکندر علی خاں دولتانہ کامیاب ہوئے جو محمد اسلام خان دولتانہ کے صاحبزادے ہیں (۱۸) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں میاں جاوید ممتاز دولتانہ نے پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر پاکستان مسلم لیگ (ق) محمد ایوب خان سلڈیرا سے شکست کھا گئے۔ (۱۹)

۲۰۰۲ء میں میاں ممتاز دولتانہ کی صاحبزادی، جاوید ممتاز دولتانہ کی بہن اور ایوب کھوڑو کی بہو، شاہدہ دولتانہ نے بھی پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر وہ بھی

پاکستان مسلم لیگ (ق) کے اسحٰق خاکوانی سے شکست کھا گئیں (۲۰)

ادھر میاں ریاض احمد دولتانہ کی صاحبزادی تہمینہ دولتانہ نے ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں ایک مرتبہ پھر این اے ۱۳۰ وہاڑی ۲ سے کامیابی حاصل کی اور بعد ازاں وفاق میں ترقی نسواں، سماجی بہبود اور خصوصی تعلیم کی وزیر مقرر ہوئیں (۲۱)

۱۹۹۹ء میں میاں نواز شریف کی معزولی کے بعد جب ان کی پارٹی کے بیشتر رہنما، ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے اور پاکستان مسلم لیگ (ق) کی حکومتی چھتری کے نیچے جمع ہو گئے تھے، مسز تہمینہ دولتانہ نے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ میاں نواز شریف کا ساتھ دیا۔ اس جدوجہد میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ ۲۰۰۲ء کے انتخاب میں انہوں نے دو حلقوں سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اگرچہ وہ کامیاب نہیں ہوئیں لیکن پاکستان مسلم لیگ (ن) نے خواتین کی مخصوص نشستوں پر انہیں قومی اسمبلی پہنچا ہی دیا (۲۲)

۲۰۰۵ء میں بیگم تہمینہ دولتانہ کے موجودہ شوہر زاہد انور واہلہ نے وہاڑی سے ضلعی ناظم کا انتخاب لڑا لیکن سرکاری امیدوار میاں ثاقب خورشید سے شکست کھا گئے (۲۳)

دولتانہ خاندان کی سیاسی رشتہ داریوں کا سلسلہ پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ جن میں سرگودھا کا قریشی خاندان، لاڑکانہ کا کھوڑو خاندان، جھنگ کا بھروانہ خاندان اور کمالیہ کا کھرل خاندان سرفہرست ہے۔ (۲۴)

میاں ممتاز دولتانہ کی بھتیجی بیگم نادرہ خاکوانی پیپلز پارٹی پنجاب کی خواتین ونگ کی سربراہ ہیں۔ بیگم نادرہ خاکوانی کی صاحبزادی بیلم حسنین ہیں جن کے شوہر سعادت حسنین، خالد کھرل کے بھانجے سعید علی خان کے کزن ہیں۔ بیلم حسنین ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی ہیں۔ (۲۵) ممتاز دولتانہ کی اکلوتی صاحبزادی شاہدہ سندھ کے معروف سیاستدان ایوب کھوڑو کی بہو ہیں۔ میاں ممتاز دولتانہ کی ایک بہن رادھن سرگودھا کے سعید قریشی سے بیاہی ہیں اور عزیز الحق قریشی، جنہوں نے ۱۹۸۸ء میں دو حلقوں سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا، ان کے بھانجے ہیں۔ اسی طرح مہر اختر عباس بھروانہ بھی جو ۱۹۹۳ء میں پی پی اے جھنگ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب ہارے تھے، میاں ممتاز دولتانہ کے بھانجے ہیں (۲۶) ۲۰۰۲ء میں اختر بھروانہ کی صاحبزادی صائمہ اختر بھروانہ نے قومی اسمبلی کی نشست این اے ۹۰ جھنگ ۵ سے انتخاب لڑا اور قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ صائمہ اختر بھروانہ نے یہ انتخاب آزاد امیدوار کے طور پر لڑا تھا۔ (۲۷)

حوالہ جات

۱۔ ظفر جھنڈیر، ارشاد علی، ایم اکبر رانا، تاریخ راجپوت۔ کراچی۔ ص ۷۶۔۷۷

۲۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ۱۰۵/۱۰۶،

۳۔ زاہد چوہدری۔ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء۔ لاہور۔ ص ۱۱۰، ۱۱۱

۴۔ کری پال سی یادیو۔ الیکشنز ان پنجاب۔۱۹۲۰ء۔۱۹۴۷ء۔ نئی دہلی۔ ص ۴۸، ۶۴، ۷۱، ۹۱، ۹۳، ۱۰۴، ۱۱۶۔

۵۔ ایضاً۔ ص ۴۰، ۱۰۵، ۱۱۲

۶۔ الطاف حسن قریشی۔ معاہدوں اور خوابوں کے بادشاہ، جناب دولتانہ۔ ہفت روزہ زندگی۔ لاہور ۲۶ر جنوری ۱۹۷۰ء۔ ص ۶ تا ۱۰

۷۔ صفدر محمود۔ پاکستان تاریخ و سیاست۔ لاہور۔ ص ۱۲ تا ۱۴ (ضمیمہ ۴)

۸۔ جگنو محسن۔ ممتاز دولتانہ (پروفائل) دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۱۶ر۔۲۲ر اگست ۱۹۹۰ء ص ۱۴

۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ یکم جولائی ۱۹۹۵ء

۱۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۲۲۸

۱۱۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۸ر مئی ۱۹۹۶ء

۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۴

۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۵۸۔ ۲۴۶

۱۴۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۶ر جنوری ۱۹۸۲ء

۱۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۲۶

۱۶۔ ایضاً۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۹۲

۱۷۔ ادارہ۔ چار خواتین بھی جیت گئیں۔ پندرہ روزہ حقیقت بہاولپور۔ ۱۶ر تا ۳۱ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۹

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ اسلام آباد (جلد اول)۔ ص ۳۲۶۔ (جلد دوم)۔ ص ۳۷۴

۱۹۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۳۰۶۰

۲۰۔ ایضاً۔ ص ۲۹۴۳

۲۱۔ ارشاد امین۔ پارلیمینٹ بک ۱۹۹۷ء۔ (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۱۵۰

۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ (جلد دوم)۔ ص ۶۰، ۱۰۵

۲۳۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۲۴۔ سہیل وڑائچ۔ وے آل آرون۔ دی نیشن لاہور۔ الیکشن ۹۳ اسپیشل۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۹۳ء

۲۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۶

۲۶۔ سہیل وڑائچ۔ وے آل آرون۔ دی نیشن لاہور۔ الیکشن ۹۳ء اسپیشل۔ ۲۷ر ستمبر ۱۹۹۳ء

۲۷۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ ص ۲۴۰

ڈاہا

ڈاہے پنواڑ کی راجپوت گوت کی ایک نہایت اہم شاخ ہیں اور مہاراجہ سری کھنڈ کی نسل سے چندر بنسی الاصل ہونے کے دعویدار ہیں۔ مہاراجہ سری کھنڈ کی بیسویں پشت میں راجہ دوہج کا بیٹا ڈاہا نامی تھا جس کے نام سے اس قبیلہ کا نام ڈاہا مشہور ہے۔ پوری بتیس پشتوں تک ڈاہے ہندو رہے یہاں تک کہ اس خاندان کے ایک فرد تقی خان نے اسلام قبول کر لیا۔

اس خاندان کی ۳۵ ویں پشت میں ایک شخص سنگھار خان نامی ہوا۔ وہ بھارت کی ریاست سی پی (موجودہ نام : مدھیہ پردیش) کے مقام دھار سے ہجرت کر کے پنجاب آیا اور یہاں پہلے بہاولپور اور پھر پاک پتن ضلع ساہیوال میں آباد ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد سنگھار خاں خانیوال آیا اور اسے اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔ سنگھار خان کی چھٹی پشت میں نور خان اور تیرہویں پشت میں حسن خاں گزرا ہے۔ حسن خان کا پوتا زیادت خان اپنے وقت کا خاصا مشہور آدمی تھا۔ وہ عہد خالصہ میں دیوان ساون مل مولراج اور کرم نرائن (جو ملتان کے گورنر تھے) کے زمانے میں قبیلہ ڈاہا کا سربراہ تھا اور کوٹ کمالیہ' تنبہ' لڈن اور سی کے کاردار اس کے ماتحت اور زیر اثر تھے۔ اسی زمانہ میں زیادت خاں جنوبی علاقہ کے چوروں اور ڈاکوؤں کو گرفتار کراتا تھا اور اس خدمت کے عوض اسے موجود الوقت سرکار کی طرف سے بر آمد شدہ مال مسروقہ کی مالیت کی ایک چوتھائی ملا کرتی تھی اور نیز اسے شیخ ملکا۔ خانیوال اور خیرپور کے مالیہ اراضی میں سے کچھ رقم ملا کرتی تھی۔

خان زیادت خاں اس وقت کے بڑے مقتدر آدمیوں میں تھا اور اس کو علاقہ خیرپور واقع ریاست بہاولپور اور دیگر مقامات میں اراضیات عطا ہوئی تھیں جن کو اس نے آباد کیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران خان زیادت خان کے بیٹے خان شاہ محمد خاں نے فوجوں کے بھاگے ہوئے سپاہیوں کو گرفتار کروا کے انگریزوں کی بڑی مدد کی۔ جس کے صلے میں اسے نہ صرف سند عطا ہوئی بلکہ ذیلدار اور ڈویژنل درباری بنا دیا گیا۔ خان شاہ محمد خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا خان کرم خان ذیلدار' اعزازی مجسٹریٹ اور اعزازی منصف بنایا گیا۔ اسے ۱۹۰۳ء میں

دہلی دربار میں بھی مدعو کیا گیا جہاں اسے ایک سند عطا ہوئی- (۱)

خان کرم خان کے چار بیٹے ہوئے خان زیادت خاں دوم' خان فرید خاں' خاں ہیبت خاں اور خان گل محمد خان- سب سے بڑا یعنی زیادت خان' ذیلدار' اعزازی مجسٹریٹ اور ڈویژنل درباری تھا- اس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران نہ صرف بھرتی کے امور نہایت جانفشانی سے انجام دیئے- بلکہ لڑائی کے لئے اونٹ اور قرضہ بھی فراہم کیا- اس نے ۱۹۱۸ء میں ۳۲ سال کی عمر میں وفات پائی-

خان کرم خان کے دوسرے بیٹے خان فرید نے بھی انگریزوں کی خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا- اس نے فوج میں بہت سے رنگروٹ بھرتی کروائے جس کے صلے میں اسے اراضی' جنگی انعام اور مالیہ کی معافی عطا کی گئی- خاں فرید خاں کی اور بھی بہت سی خدمات تھیں جن کے اعتراف کے طور پر اسے پہلے خان صاحب اور پھر خان بہادر کے خطابات عطا ہوئے-

خان فرید خان کے چھوٹے بھائی کا نام ہیبت خان تھا- اس نے بھی انگریزوں کی خیر خواہی اور خدمات کی انجام دہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جن کے عوض میں اسے دو مرتبہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا رکن بنایا گیا- ۱۹۳۷ء میں وہ پنجاب اسمبلی کا رکن منتخب ہوا اور ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر اور میونسپل کمشنر کے عہدے پر بھی فائز رہا- (۲) ہیبت خاں نے ۱۹۴۵ء کے انتخاب میں بھی حصہ لیا تھا مگر وہ مسلم لیگی امیدوار پیر بڈھن شاہ کھگہ سے شکست کھا گیا تھا- ۱۹۵۱ء میں میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے پیر بڈھن شاہ کو نظر انداز کر کے ہیبت خان کو مسلم لیگ کا ٹکٹ عطا کیا- پیر بڈھن شاہ نے ہیبت خان کے مقابلے پر چودھری ظفر اللہ خاں جہانیاں کو بطور آزاد امیدوار کھڑا کر دیا جو یہ مقابلہ جیت گیا- (۳)

خاں کرم خاں کا سب سے چھوٹا بیٹا خان گل محمد خاں پولیس میں ملازم رہا جہاں وہ انگریزوں کی خدمات بجا لاتا رہا-

۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء دونوں انتخابات میں خان فرید خان ڈاہا کے بیٹے افضل احمد ڈاہا نے انتخاب لڑا مگر دونوں مرتبہ وہ پیر بڈھن شاہ کھگہ کے بیٹے پیر قمر الزمان شاہ کھگہ سے شکست کھا گیا ۱۹۷۰ء خان گل محمد کے بیٹے آفتاب احمد ڈاہا اور پیر قمر الزماں شاہ کھگہ نے دو الگ الگ نشستوں پر انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ دونوں ہی امیدوار شکست کھا گئے-

پیر قمر الزماں شاہ پیر صاحب پگارا کے سمدھی اور سابق صوبائی وزیر میاں محمد ذاکر قریشی کے داماد بھی ہیں- (۵)

۱۹۷۷ء میں آفتاب احمد ڈاہا کے چھوٹے بھائی رفعت حیات ڈاہا نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور یوں قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ ڈاہا خاندان کا کوئی فرد قومی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب ہوا-

۱۹۸۵ء میں آفتاب احمد ڈاہا نے ایک مرتبہ پھر کمر ہمت کسی اور این اے ۱۱۲ ملتان ۲ سے انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ بھی وہ اپنے خاندان کے دیرینہ حریف پیر قمر الزماں شاہ کھگہ کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔

۱۹۸۸ء میں آفتاب احمد خاں ڈاہا اور پیر قمر الزماں شاہ کھگہ دونوں ہی اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ کے لئے کوشاں تھے۔ مگر میاں غلام حیدر وائیں سے دوستی کے باعث آفتاب احمد خاں ڈاہا اسلامی جمہوری اتحاد کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پیر قمر نے انتخاب میں حصہ ہی نہیں لیا۔ آفتاب احمد خاں ڈاہا کے مدمقابل ان کے حقیقی بھائی رفعت حیات خاں ڈاہا تھے جنہیں پیپلز پارٹی نے ٹکٹ دیا تھا۔ رفعت حیات خاں ڈاہا ۱۹۷۷ء میں بھی پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایم این اے منتخب ہو چکے تھے۔ چنانچہ دونوں بھائیوں میں مقابلہ ہوا اور یہ مقابلہ آفتاب احمد خاں ڈاہا نے تقریباً ۲۱ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے جیت لیا۔ (٦)

۱۹۹۰ء میں آفتاب احمد خاں ڈاہا ایک مرتبہ پھر آئی جے آئی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار بنے۔ اس مرتبہ پیپلز پارٹی نے ان کے بھائی کی بجائے ان کے دیرینہ حریف پیر قمر الزماں شاہ کھگہ کو اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ مگر یہ معرکہ بھی آفتاب احمد خاں ڈاہا کے ہاتھ رہا اور انہوں نے پیر قمر الزماں شاہ کھگہ کو انیس ہزار ووٹوں سے شکست دے کر نہ صرف اپنی اور اپنے تایا زاد بھائی افضل خان ڈاہا کی شکستوں کا بدلہ لے لیا بلکہ پیر قمر الزماں شاہ کھگہ کے والد پیر بڈھن شاہ کے ہاتھوں اپنے تایا خان ہیبت خاں ڈاہا کی شکست کا حساب بھی چکا دیا۔ (٧) ۱۹۹۳ء میں آفتاب احمد ڈاہا نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ ان کا حلقہ انتخاب وہی تھا یعنی این اے ۱۲۲ خانیوال ۲۔ مگر اس مرتبہ ان کے مدمقابل سردار اللہ یار ہراج تھے۔ جنہیں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ سردار اللہ یار ہراج ۱۹۸۵ء‘ ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے تھے۔ اس مرتبہ انہوں نے صوبائی کے ساتھ ساتھ قومی اسمبلی کا انتخاب بھی لڑا۔ مگر وہ حسب سابق صوبائی نشست پر تو کامیاب ہو گئے (۹) مگر قومی اسمبلی پر کامیابی آفتاب احمد ڈاہا ہی کے حصے میں آئی (۱۰)

۱۹۹۷ء کے انتخابات میں بھی آفتاب حمد ڈاہا نے اپنی کامیابی کا تسلسل برقرار رکھا اور مسلسل پانچویں مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور قومی اسمبلی مجلس قائمہ برائے خوراک و زراعت و لائیو اسٹاک کے چیئرمین بنائے گئے۔ (۱۱) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ گریجویشن نہ ہونے کے باعث انتخابی عمل سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے اپنی نشست پر رضوان احمد ڈاہا کو انتخاب لڑوایا جو آزاد امیدوار حامد یار ہراج سے تقریباً بائیس ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۲)

ڈاہا خاندان کے ایک اور فرد حاجی عرفان احمد ڈاہا بھی ۱۹۸۸ء سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیت رہے ہیں۔ ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء دونوں انتخابات انہوں نے آئی جے آئی کے ٹکٹ پر لڑے تھے جبکہ

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں انہیں پی ایم ایل (این) کی حمایت حاصل تھی۔ (۱۳)

عرفان احمد ڈاہا نے ۱۹۹۷ء میں بھی اسی نشست پر انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ انتخابات کے بعد وہ وزیراعلیٰ شہباز شریف کے پولیٹیکل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ (۱۴) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے انتخاب نہیں لڑا۔ ان انتخابات میں خانیوال سے صوبائی اسمبلی کی نشست پی پی ۲۱۴ خانیوال ۳ سے ظہور احمد ڈاہا پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ خان ہزارے خان ڈاہا کے صاحبزادے ہیں۔ (۱۵) انتخابات کے بعد وہ پنجاب اسمبلی میں پارلیمانی سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ (۱۶)

حوالہ جات

۱۔ سر لیپل ایچ گریفن، کرنل میسی۔ تذکرۂ رؤسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۵۳۰ تا ۵۳۲

۲۔ تہور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ لاہور۔ ص ۱۴۷ تا ۱۵۳

۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۶۷

۴۔ عدنان عادل۔ پولیٹیکل رائیولز آف پنجاب۔ دی فرائیڈے ٹائمنر۔ لاہور ۱۲ر تا ۱۸ر اگست ۱۹۹۳ء۔ ص ۹

۵۔ سہیل وڑائچ۔ برٹش الائیز آف ۱۸۵۷ ان دی رن۔ روزنامہ دی نیشن لاہور۔ الیکشن ۹۳ اسپیشل۔ ۱۸ر ستمبر ۱۹۹۳ء

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۶۷

۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۵۵

۸۔ امجد وڑائچ۔ دی نونز اینڈ نائٹس آف پنجابس پولیٹکس۔ دی نیوز کراچی۔ الیکشن اسپیشل۔ ۲۰ر ستمبر ۱۹۹۳ء

۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۲۱

۱۰۔ ایضاً۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۲۸۹

۱۱۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء۔ جلد اول۔ لاہور۔ ص ۱۴۲

۱۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۹۴۰

۱۳۔ امان اللہ خان (مرتب)۔ ڈائریکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب۔ ۱۹۹۳ء۔ لاہور۔ ص ۲۵۵

۱۴۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۲۹۳

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد اول۔ ص ۳۲۵
۱۶۔ پنجاب اسمبلی کی ویب سائٹ www.pap.gov.pk/lagislators/present

روکڑی

میانوالی میں آباد روکڑی خاندان تقسیم سے پہلے سے سیاست میں سرگرم عمل ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ روکڑی ان کا خاندانی نام نہیں ہے بلکہ اس قصبے کا نام ہے جہاں یہ آباد ہیں۔ نسلاً" یہ نیازی پٹھان ہیں جو درحقیقت لودھی پٹھانوں کی ایک بہت بڑی شاخ ہیں۔ روکڑی خاندان کے سربراہ امیر محمد عبداللہ خان روکڑی کا تعلق نیازی پٹھانوں کی سمند خیل، خیل ہے ہے۔

امیر عبداللہ خاں روکڑی نے اپنی خود نوشت میں اور میرا پاکستان میں اپنے خاندانی پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"نیازیوں میں ہمارا قبیلہ سمند خیل ہے اور سمند خان ہمارے جد امجد تھے۔ یہ انہی کے نام سے منسوب ہے۔ سمند خاں نہایت کڑیل، بہادر، جفاکش مگر انتہائی آزادی پسند تھے۔ باوجود ہر قسم کی تحریص اور لالچ کے انہوں نے سکھوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ سکھ راجے نے انہیں بڑی جاگیریں دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس وقت کچھ لوگوں نے سکھ راج سے تعاون کر کے جاگیریں بھی حاصل کیں لیکن آزادی پسند سمند خان نے یہ بھی برداشت نہ کیا وہ سکھ دوست خوانین کے مقابلے میں بھی ڈٹ گئے ان کے ساتھی بہت کم رہ گئے تھے۔ سکھ دوست خوانین سے بھی ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے اور وہ اپنی محدود طاقت کی وجہ سے سکھ راج کا کھلا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لہٰذا وہ سکھوں کے ساتھ ہمیشہ گوریلا جنگ میں مصروف رہے۔ اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے چونکہ کوئی بڑا دفاعی قلعہ بنانے کی مالی سکت نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے ایک کنواں جو آج تک ان کے نام سے منسوب ہے۔ اپنے علاقے میں کھدوایا جس سے اس کے خیل والے پانی حاصل کرتے تھے اور اس کنوئیں کے ساتھ ایک ایسا چبوترہ بنایا، جہاں سے دور دور تک دیکھا جا سکتا تھا اور سمند خان کے ساتھی وہاں سے سکھ حملہ آوروں کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ یہ کنواں اور اس کے کچھ باقیات ابھی تک ہمارے ہاں موجود

ہیں۔

تاریخی حوالوں سے ثابت ہے کہ میانوالی میں گکھڑوں کی حکومت تھی۔ نیازیوں نے انہیں شکست دے کر یہاں قبضہ کیا۔ گکھڑ پنڈی اور اس کے ملحقہ علاقوں میں جا بسے۔ میرے پردادا سمند خان نے سکھوں کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ جب سکھوں کے لشکر آتے وہ اپنی برادری کے لوگوں کے ساتھ جنگل میں چلے جاتے۔ ہمارا گاؤں دریا کے کنارے واقع ہے۔ سکھ واپس جاتے تو وہ چند سکھوں کو قتل کر دیتے۔ ان کے پاس باضابطہ کوئی فوج نہ تھی۔ اس لئے وہ اپنے خاندان خیل کے لوگوں کو ساتھ لیتے اور یہ کارروائیاں کرتے۔ اگرچہ سکھوں نے انہیں مطیع کرنے، ڈرانے دھمکانے کے علاوہ بہت سے لالچ بھی دیئے۔ مگر آزادی پسند سمند خان کسی بھی طور پر سکھ غلامی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بہرحال آنے والے دور میں سمند خان کی جرات و جوانمردی کا اعتراف کرتے ہوئے ہمارے علاقے کے ریلوے اسٹیشن کو ان کے نام سے سمند خان والا ریلوے اسٹیشن بنا دیا۔

ہم نیازی پٹھان در حقیقت لودھی پٹھانوں کی ایک بہت بڑی شاخ ہیں جو میانوالی اور اس کی تحصیل عیسیٰ خیل میں آباد ہوئے۔ ہم بہت سے چھوٹے چھوٹے قبیلوں، گروہوں اور خانوادوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہمارے درمیان تقسیم در تقسیم کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ عیسیٰ خیل، سرہنگ، مشانی، تاج خیل، پائی خیل، بوری خیل اور داؤد خیل ہمارے بڑے بڑے قبیلے ہیں جو آگے مزید قبیلوں سے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ عیسیٰ خیل، موسیٰ خیل، باتو خیل، وطہ خیل وغیرہ وغیرہ تو نیازی پٹھانوں کے قبیلے ہیں جو درحقیقت یک جدی اور ایک ہیں۔ لیکن ہماری اس ثقافت اور معاشرے میں رسم و رواج کا اثر ہندو قوموں نے بھی قبول کیا اور یہاں پر ان کے قبیلے بھی خیل کے عنوان سے ہی شناخت ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً ٹھاکر خیل، چندن خیل، رام خیل، رچی خیل وغیرہ۔ اس رواج کے مطابق چونکہ میرے پردادا کا نام سمند خان تھا اس لئے میرے خاندان کو نیازیوں میں سمند خیل کے نام سے شناخت کیا جاتا ہے۔ مجھے اور میری اولاد بھانجوں، بھتیجوں وغیرہ کو ہمارے رہائشی قصبے کی نسبت سے ملک بھر میں روکڑی کے حوالے سے شناخت کیا جاتا ہے"۔ (۱)

امیر محمد عبداللہ خان روکڑی اسی روکڑی قصبے میں ۱۰ر جون ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ (۲) ان کے والد محمد حیات خان کو انگریزوں نے خان صاحب کا خطاب عطا کیا تھا۔ امیر عبداللہ روکڑی نے سیاست کا آغاز اپنے دور طالب علمی میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے کیا۔ اس کے بعد وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران انہیں ضلع کا اعزازی ریکروٹنگ آفیسر مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں ان کی عمدہ کارکردگی کے باعث انہیں خان صاحب کا خطاب بھی عطا ہوا۔ (۳)

امیر عبداللہ روکڑی کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اس انتخاب میں بھی حصہ لینے کا اعزاز حاصل ہوا جو ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوا تھا۔ وہ یہ انتخاب اپنے ہم نام خان صاحب میر محمد عبداللہ خان سے ۲۷۷ ووٹوں سے ہار گئے۔ (۴) مگر بعد ازاں جب امیر عبداللہ روکڑی نے اپنی شکست کے خلاف انتخابی عذر داری داخل کی تو ووٹوں کی دوبارہ گنتی کے بعد انہیں فاتح قرار دے دیا گیا۔ یوں امیر عبداللہ روکڑی کو قیام پاکستان کے وقت پنجاب اسمبلی کا رکن ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ (۵) امیر عبداللہ روکڑی اس کے بعد ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں بھی کامیاب ہوئے۔ پھر ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کے قیام کے بعد وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ (۶)

۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کی آمد کے بعد امیر عبداللہ روکڑی پر ایبڈو کے تحت پابندیاں عائد کر دی گئیں اور وہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء تک کسی سیاسی عمل میں حصہ لینے کے لئے نا اہل قرار دے دیئے گئے۔ (۷)

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ کنونشن مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا مگر انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل رہی۔ (۸) اس انتخاب میں انہوں نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کو ۵۲ ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دی۔ (۹)

ان انتخابات کے بعد جب پاکستان قومی اتحاد نے دھاندلیوں کے خلاف مہم چلائی تو ان سے یکجہتی کے اظہار کے لئے پیپلز پارٹی کے جن ارکان اسمبلی نے اسمبلی کی رکنیت سے استعفے دیئے تھے ان میں امیر عبداللہ روکڑی پیش پیش تھے۔ (۱۰)

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں امیر عبداللہ روکڑی نے خود تو حصہ نہیں لیا۔ لیکن اپنے صاحبزادے عامر حیات روکڑی کو قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں اور اپنے بھانجے گل حمید روکڑی کو صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑوایا۔ عامر حیات روکڑی دونوں انتخابات ہار گئے۔ مگر گل حمید روکڑی جو اس سے پہلے ۱۹۶۵ء میں بھی مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے تھے۔ انتخاب جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۱)

عامر حیات روکڑی نے بعد ازاں اپنے حلقے کے ووٹوں کی گنتی کے خلاف انتخابی عذر داری دائر کی اور جب الیکشن کمیشن آف پاکستان نے ووٹوں کی دوبارہ گنتی کی تو عامر حیات خان اسمبلی کے ممبر منتخب قرار دے دیئے گئے۔ (۱۲)

اس برس اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد جب سینٹ آف پاکستان کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو امیر عبداللہ خاں روکڑی اس کی رکنیت کے امیدوار بنے اور با آسانی کامیاب ہو کر سینٹ کے رکن بن گئے۔ ان کی رکنیت ۱۹۹۱ء میں ختم ہوئی مگر وہ ۱۹۹۱ء میں ایک مرتبہ پھر چھ سال کے لئے سینٹ کے رکن منتخب ہوئے گئے۔ (۱۳)

امیر عبداللہ خان روکڑی نے ۲؍دسمبر ۲۰۰۱ء کو وفات پائی۔ (۱۴)

امیر عبداللہ روکڑی کے بیٹے عامر حیات روکڑی جو سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان کے صاحبزادے اختر ایوب کے داماد ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار ہوئے۔ اس مرتبہ انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت بھی حاصل تھی۔ مگر اس مرتبہ بھی وہ اپنے دیرینہ حریف ڈاکٹر شیر افگن نیازی کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ جنہوں نے یہ انتخاب عوامی اتحاد کے پلیٹ فارم سے لڑا تھا۔ (۱۵)

عامر حیات روکڑی نے ہمت نہیں ہاری اور ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں صوبائی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار ہوئے اس مرتبہ حالات ان کے حق میں تھے۔ چنانچہ وہ اپنے حریف طارق عباس خان کو تقریباً دو گنے ووٹوں سے شکست دے کر یہ انتخاب بآسانی جیت گئے۔ (۱۶) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں عامر حیات روکڑی نے پی پی ۳۷ میانوالی ۲ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر وہ حاجی اکرام اللہ خان کے ہاتھوں تقریباً پانچ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۷)

۱۹۹۷ء میں عامر حیات روکڑی نے قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر انتخاب لڑا۔ مگر وہ دونوں ہی نشستوں پر شکست کھا گئے۔ (۱۸) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے عام انتخابات میں تو حصہ نہیں لیا لیکن ضمنی انتخاب میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔ (۱۹)

ادھر گل حمید خان روکڑی ۱۹۸۵ء میں صوبائی اسمبلی کا رکن بننے کے بعد وزیر اعلیٰ پنجاب کے مشیر کے منصب پر فائز ہوئے۔ (۲۰) ۱۹۸۸ء میں وہ دوبارہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور نواز شریف کابینہ میں وزیر خوراک بنائے گئے۔ (۲۱) ۱۹۹۰ میں انہوں نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب لڑا اور دونوں میں کامیاب رہے۔ قومی اسمبلی کی نشست پر انہوں نے ڈاکٹر شیر افگن نیازی کو شکست دی جبکہ صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں انہوں نے امیر عبداللہ خان نیازی وٹا خیل کو ہرایا۔ بعد ازاں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی۔ ان کی خالی کردہ صوبائی اسمبلی کی نشست پر بعدازاں میاں ریاض احمد شاہ کامیاب ہوئے۔ (۲۲)

۱۹۹۲ء میں جب نواز شریف حکومت پہلی مرتبہ برطرف کی گئی تو وہ میر بلخ شیر مزاری کی نگراں کابینہ میں وزیر اعظم کے معاون خصوصی کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان کا درجہ وزیر مملکت کے مساوی تھا۔ (۲۳) گل حمید روکڑی نے ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں این اے ۵۳ میانوالی سے انتخاب لڑا۔ مگر وہ عبید اللہ خان سے تقریباً سات ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۲۴)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں بھی گل حمید روکڑی قومی اسمبلی کے انتخابات میں شکست کھا گئے۔ (۲۵) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کی بجائے صوبائی اسمبلی کی دو نشستوں پر بیک وقت انتخاب لڑا اور دونوں نشستوں پر کامیاب ہوئے انتخابات کے بعد گل حمید روکڑی چودھری پرویز الٰہی کی کابینہ میں

وزیر مقرر ہوئے۔(۲۶)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات ہی میں گل حمید روکڑی کے صاحبزادے حمیر حیات خان نے بھی قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کا مقابلہ ڈاکٹر شیر افگن خان نیازی اور مولانا عبدالستار خان نیازی جیسے دیوقامت رہنماؤں سے تھا۔ چنانچہ وہ اس انتخاب میں تیسرے نمبر پر رہے۔(۲۷)

حمیر حیات خان ۲۰۰۱ء میں ضلع میانوالی کے ناظم منتخب ہوئے تھے (۲۸) تاہم ۲۰۰۵ء میں وہ اس عہدے پر کامیاب نہ ہو سکے انہیں ڈاکٹر شیر افگن کے حمایت یافتہ امیدوار عبیداللہ شادی خیل نے شکست دی۔(۲۹)

گل حمید روکڑی کی رشتہ داری چودھری ظہور الٰہی کے خاندان سے بھی قائم ہو چکی ہے اور چودھری شجاعت حسین کے بھائی گل حمید روکڑی کے داماد بن چکے ہیں۔(۳۰)

روکڑی خاندان کو ''ٹرانسپورٹ ٹائیکون'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی نیو خان ٹرانسپورٹ کمپنی اور نیوخان روڈ رنرز پنجاب ہی نہیں، پاکستان کی صف اول کی ٹرانسپورٹ کمپنی شمار کی جاتی ہے۔(۳۱)

حوالہ جات

۱۔ امیر محمد عبداللہ خاں روکڑی۔ میں اور میرا پاکستان۔ لاہور۔ ص ۳۱ تا ۳۴

۲۔ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان ڈائرکٹری آف ممبرز جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص ۵۴

۳۔ امیر محمد عبداللہ خان روکڑی۔ میں اور میرا پاکستان۔ لاہور۔ ص ۲۷، ۴۳، ۴۴، ۴۶

۴۔ کرپال سی یادیو۔ الیکشنز ان پنجاب ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء۔ نئی دہلی۔ ص ۱۱۵

۵۔ امیر محمد عبداللہ خان روکڑی۔ میں اور میرا پاکستان۔ لاہور۔ ص ۶۴

۶۔ محکمہ تعلقات عامہ، مغربی پاکستان سالانہ جائزہ۔ ۱۹۵۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۷۴

۷۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نا اہلیاں۔ لاہور۔ ص ۷۶

۸۔ امیر محمد عبداللہ خان روکڑی۔ میں اور میرا پاکستان۔ لاہور۔ ص ۱۵۷

۹۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۲۰۸

۱۰۔ امیر محمد عبداللہ خان روکڑی۔ میں اور میرا پاکستان۔ لاہور۔ ص ۱۵۸

۱۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۸۷ تا ۹۱

۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۳۱

۱۳۔ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائرکٹری آف ممبرز ۱۹۹۱ء۔ ۱۹۹۴ء۔ ص ۵۶

۱۴۔ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی۔ ۳ر دسمبر ۲۰۰۱ء

۱۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۳۱

۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۷۷

۱۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۶۷

۱۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰/ فروری ۱۹۹۷ء ص ۲۰۲

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۳۸۱

۲۰۔ پنجاب اسمبلی ۱۹۸۷ء۔ گولڈن جوبلی سووینئر۔ لاہور۔ ص ۵۴

۲۱۔ ٹی ایم ڈوگر۔ ہواز ہو اینڈ وہاٹ از وہاٹ۔ ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۷

۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز۔ جلد دوم ص ۳۳

۲۳۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۰/ تا ۱۲/ مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۸

۲۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۶۵

۲۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰/ فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۲۰۲

۲۶۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۱۱

۲۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۶۵

۲۸۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۱۱

۲۹۔ روزنامہ دی نیوز کراچی۔ ۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ (انٹرنیٹ ایڈیشن)

۳۰۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ روزنامہ جنگ۔ لاہور۔ ۲۷/ اگست ۱۹۹۱ء

۳۱۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائریکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب۔ ۱۹۹۰ء۔ ص ۵۲

رئیس

رحیم یار خان میں آباد رئیس، انڈرھ قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو راجپوتوں کی ایک شاخ اور جیسلمیر اور بیکانیر کے علاقے پر حکمران رہی ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ محمد جیا مرحوم بھونگ میں اقامت گزین ہو گئے تھے جنہیں مشہور سہروردی بزرگ حضرت شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کے خلیفہ مجاز حضرت پیر موسیٰ نوابؒ سے شرف بیعت حاصل تھا۔ ان کے خاندان کی دوسری شاخ سکھر میں قیام پذیر ہوئی جس کے سربراہ شیخ احمد تھے۔ یہ بھی حضرت پیر موسیٰ نواب کے مرید تھے۔ انہوں نے عملاً فقیری اختیار کر لی تھی چنانچہ شکار پور، پنوں عاقل اور گھوٹکی میں ان کی درویشی کا سلسلہ اب بھی قائم ہے۔

مولوی نذر محمد انڈرھ اور مولوی حماد اللہ انڈرھ بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے جو اپنی علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے دور دور تک شہرت رکھتے تھے اور ان کا حلقہ درس بھونگ سے سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔

قیام پاکستان کے وقت اس خاندان کے سربراہ رئیس غازی محمد تھے۔ ان پر دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کے باوجود فقیری کا رنگ غالب تھا۔ بے شمار زرعی اراضی ان کی ملکیت تھی۔ وہ فرسٹ کلاس آنریری مجسٹریٹ رہے۔ بہاولپور دربار میں کرسی نشین رہے اور بہاولپور کی پہلی اسمبلی کے قیام سے ہی سیاست کے میدان میں موجود رہے لیکن ان تمام اعزازات کے باوجود جو امتیازی وصف ان کی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے وہ ان کا مذہبی جذبہ تھا۔ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خوشنودی کو ہر حال میں مقدم سمجھتے تھے۔ دینی کاموں سے انہیں بے حد دلچسپی تھی۔ یتیموں بیواؤں اور غریبوں کی امداد سرپرستی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ مساجد کی تعمیر کا شوق تھا۔ خود بھی متعدد مساجد تعمیر کروائیں اور دوسروں کو بھی مساجد کی تعمیر کے لئے معقول چندہ دیا۔ خاص طور پر بھونگ کی مسجد جس پر ان کی زندگی میں تقریباً ایک کروڑ روپیہ خرچ ہو چکا تھا ان کی ایسی یادگار ہے جو رہتی دنیا تک ان کے نام کو زندہ رکھنے کے

لئے کافی ہے۔ اس مسجد کے ساتھ ایک دینی درس گاہ بھی ہے جس سے ہزاروں طلبا تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ اس درسگاہ کے جملہ اخراجات رئیس صاحب خود ہی برداشت کرتے تھے۔ ان کے قائم کردہ مدرسوں کا سلسلہ بھونگ سے شکارپور اور پنوں عاقل تک پھیلا ہوا ہے۔ رئیس غازی محمد خود بھی متعدد مرتبہ حج اور عمرے کی سعادت سے فیض یاب ہو چکے تھے اور ہر برس کئی افراد کو اپنے خرچ پر حج کے لئے بھجوایا کرتے تھے۔ (۱)

رئیس غازی محمد کو اللہ نے چھ بیٹوں سے نوازا۔ جن کے نام رئیس شبیر احمد، رئیس پیر احمد، رئیس وزیر احمد، رئیس حبیب احمد، رئیس محبوب احمد اور رئیس مہتاب احمد ہیں۔ (۲)

رئیس شبیر احمد نے سیاست کے میدان میں ۱۹۶۲ء میں قدم رکھا اور ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۰ء تینوں انتخابات میں صوبائی اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۷۰ء میں آزاد امیدوار کے طور پر ایم پی اے منتخب ہوئے تھے مگر ہوا کا رخ دیکھ کر پیپلزپارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ چوتھی مرتبہ ایم پی اے منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے عام انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ ان کے حلقے سے مخدوم زادہ حسن محمود بیک وقت قومی اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد ازاں مخدوم زادہ حسن محمود نے قومی اسمبلی کی نشست چھوڑ دی اور اس نشست پر ضمنی انتخابات میں رئیس شبیر احمد بلا مقابلہ ایم این اے منتخب ہو گئے۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں رئیس شبیر احمد نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر حصہ لیا اور این اے ۱۵۰ رحیم یار خان ۴ سے پیپلزپارٹی کے امیدوار محمد اسلم ڈاہر اور آزاد امیدوار سردار رفیق حیدر لغاری کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۳)

۱۹۸۹ء میں جب بے نظیر بھٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش ہوئی تو رئیس شبیر احمد نے آئی جے آئی سے وابستگی ختم کرکے پیپلزپارٹی کا دامن تھام لیا اور اس تحریک کے دوران انہوں نے بے نظیر بھٹو کے خلاف ووٹ استعمال نہیں کیا۔ وہ ان ۱۲ ارکان اسمبلی میں شامل تھے جو عدم اعتماد کی تحریک پر ووٹنگ کے وقت مبینہ طور پر اٹھا کر وزیراعظم کے چیمبر میں بٹھا دیئے گئے تھے۔ (۴)

رئیس شبیر احمد کی سیاسی وفاداری بدلنے کو ان کے ووٹرز نے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا چنانچہ ۱۹۹۰ء میں جب رئیس شبیر احمد کو پاکستان پیپلزپارٹی نے قومی اسمبلی کا ٹکٹ عطا کیا۔ تو وہ انتخاب ہار گئے۔ انہیں ان کے دیرینہ حلیف مخدوم زادہ حسن محمود کے صاحبزادے مخدوم زادہ سید احمد محمود نے شکست دی تھی۔ جنہیں آئی جے آئی کی حمایت حاصل تھی۔ یہ رئیس شبیر احمد کے سیاسی کیریئر کی پہلی شکست تھی۔ (۵)

۱۹۹۱ء میں بلدیاتی انتخابات کے موقع پر رئیس شبیر احمد اور مخدوم سید احمد محمود میں دوبارہ انتخابی مفاہمت قائم ہو گئی۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات کے موقع پر پاکستان پیپلزپارٹی نے رئیس شبیر احمد

کو قومی اسمبلی کا ٹکٹ دینے کی پیشکش کی تھی مگر رئیس شبیر احمد نے خود انتخاب لڑنے کی بجائے یہ ٹکٹ سردار رفیق حیدر خان لغاری کو دلوا دیا (۶) تاہم کامیاب وہ بھی نہ ہو سکے اور سید احمد محمود سے تقریباً ساڑھے تیس ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۷)

۱۹۹۷ء میں رئیس شبیر احمد کے صاحبزادے رئیس مشتاق احمد نے این اے ۱۴۷ رحیم یار خان اسے آزاد امیدوار کی حیثیت سے قومی اسمبلی کا اور پی پی ۲۳۳ رحیم یار خان ۲ سے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ دونوں نشستوں پر کامیاب نہ ہو سکے (۸) جبکہ رئیس شبیر احمد کی نشست این اے ۱۵۰ رحیم یار خان ۴ سے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سردار رفیق احمد خان لغاری نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سید احمد محمود سے شکست کھائی (۹) تاہم وہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں رئیس غازی محمد کے صاحبزادے اور رئیس شبیر احمد کے چھوٹے بھائی رئیس محبوب احمد کو شکست دے کر پنجاب اسمبلی کا رکن بننے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ (۱۰)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں رئیس شبیر احمد کے صاحبزادے رئیس منیر احمد اپنے چچا رئیس وزیر احمد کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ رئیس منیر احمد نے یہ انتخاب پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین کے ٹکٹ پر لڑا تھا جبکہ رئیس وزیر احمد پاکستان مسلم لیگ (ق) کے امیدوار تھے۔ (۱۱)

رئیس منیر احمد نے انتخابات کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی پیٹریاٹ میں شمولیت اختیار کر لی اور میر ظفر اللہ جمالی کی کابینہ میں کھیل، ثقافت، سیاحت اور امور نوجواں کے وزیر مملکت کے منصب پر فائز ہوئے (۱۲) تاہم شوکت عزیز کی کابینہ میں ان کا نام شامل نہیں تھا۔ (۱۳)

حوالہ جات

۱۔ مسعود حسن شہاب دہلوی۔ مشاہیر بہاولپور۔ بہاولپور۔ ص ۲۲۴، ۲۲۵

۲۔ تہور علی خاں۔ بائیو گرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۶۱-۱۹۶۰ء۔ لاہور۔ ص ۲۶۳، ۲۶۴

۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۱۹

۴۔ حافظ عبدالخالق۔ قرارداد عدم اعتماد۔ ہفت روزہ تکبیر کراچی۔ ۹/نومبر ۱۹۸۹ء۔ ص ۹

۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۶۵

۶۔ ادارہ۔ ٹرن کوٹس پیراڈائز۔ ضلع رحیم یار خاں کا انتخابی جائزہ۔ روزنامہ نیشن لاہور الیکشن ۹۳ء اسپیشل۔ مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۹۳ء

۷۔ سعید احمد۔ بہاولپور کی سیاسی حقیقتیں۔ پندرہ روزہ حقیقت بہاولپور۔ ۱۶/تا ۳۱/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۳۱

۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۱۰، ۴۱۱

۹۔ ایضاً۔ ص ۱۱۲

۱۰۔ ایضاً۔ ص ۴۱۸

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۶۸

۱۲۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی بارہویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائریکٹری۔ لاہور۔ ص ۳۴۷

۱۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۵ ستمبر ۲۰۰۴ء

سردار

تاتاریوں نے چنگیز خاں کی زیر قیادت جب خوارزم کی سلطنت کو روند ڈالا اور سمرقند اور بخارا وغیرہ شہروں میں قتل عام کیا اور ان کو کھنڈرات بنا کر رکھ دیا۔ اس وقت ہندوستان میں شہنشاہ شمس الدین التمش کا راج تھا۔ اس نے تاتاریوں کی بڑھتی ہوئی زبردست طاقت کو دیکھ کر ان کی یورش کی روک تھام کے لئے لاہور اور ملتان کی فوجوں میں اضافہ کے ساتھ ان دونوں شہروں کے درمیان دیپالپور میں چیدہ چیدہ بہادروں کو ملک کے دوسرے گوشوں سے ڈھونڈ کر ایک زبردست فوج رکھی اور وہاں ایک بڑی چھاؤنی قائم کی تاکہ درہ بولان کی طرف سے تاتاری آئیں تو ملتان کی فوج کو ساتھ ملا کر مقابلہ کرے۔ یہ چھاؤنی تاتاریوں کے حملوں کے سلسلہ تک تقریباً ایک صدی تک دیپالپور میں قائم رہی۔ تاتاریوں کو ایک دفعہ بھی کامیاب نہ ہونے دیا۔ سردار فیملی کا مورث اعلیٰ اس فوج میں بڑا عہدہ دار تھا۔ اس کے لڑکے پوتے بھی ان حملوں کو جو تاتاریوں کے ہوتے تھے، بڑی بہادری سے روکتے رہے۔

دیپالپور کے بالکل قریب ان کو آٹھ دیہات پر مشتمل ایک جاگیر ملی۔ اس جاگیر میں انہوں نے ایک مرکزی گاؤں بنایا جو ان کے خطاب دولہ کے نام سے مشہور ہوا۔

جب ایک صدی کے بعد اس چھاؤنی کی ضرورت نہ رہی تو یہ اپنی جاگیر میں زراعت کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ اس گاؤں کو دو دفعہ تاتاریوں نے مسمار کیا۔ یہ پھر تیسری دفعہ آباد کیا گیا۔ پہلے مسمار شدہ گاؤں کی پختہ اینٹوں کو لا کر سارا گاؤں اور فصیل پختہ اینٹوں سے بنائی گئی۔ جس کی وجہ سے یہ گاؤں ڈولہ پختہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہی نام اس گاؤں کا آج تک چلا آ رہا ہے۔ جب سکھوں کا زمانہ آیا انہوں نے لاہور کے بعد ملتان پر قبضہ کرنا ضروری سمجھ کر دیپالپور وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ ان کے پانچ گاؤں بھی لے لئے۔ ان کے تین گاؤں ڈولہ، پختہ، لوہاری والا اور دولہ واحد رہ گئے۔ جو آج تک ڈولہ پختہ کی میاں فیملی کے پاس موجود ہیں۔

اس خاندان کے ایک بڑے دلیر اور ہوشیار میاں حسن نے ایک زبردست جتھہ مرتب کیا

تاکہ سکھوں کی مار دھاڑ کا دفاع کیا جا سکے۔ قصور پر سب سے آخر میں سکھ قبضہ کر سکے وہاں سکھوں کو پٹھانوں کی لڑائی کا حال سن کر میاں حسن اپنے زبردست جتھہ کو لے کر قصور پٹھانوں کی مدد اور سکھوں سے لڑنے کے لئے آ گیا۔ ان کی قصور میں آمد اور لڑائی میں شمولیت کے بعد جلد ہی پٹھانوں اور سکھوں کی صلح ہو گئی۔ اس پر میاں حسن کو فکر لاحق ہوئی کہ رنجیت سنگھ کا عتاب ہم پر ضرور نازل ہو گا کہ ہم پٹھانوں کی مدد کے لئے کیوں آئے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے جتھہ کو لے کر واپس دیپال پور کو روانہ ہوا۔ قصور سے دیپالپور کی طرف ٹھیک ۱۲ میل پر ایک میدان میں انہوں نے قیام کیا تاکہ دوسرے دن صبح سفر کیا جائے۔ اس میدان کے قریب ایک سکھ نے خام قلعہ بنایا ہوا تھا۔ یہ رقبہ اس کو اس زمانہ کے دستور کے مطابق اس لئے ملا ہوا تھا کہ بوقت ضرورت وہ ایک سو آدمی لڑائی کے موقع پر لا سکے۔ یہ خام قلعہ چٹیل میدان میں بنایا ہوا تھا اس لئے اس کا نام قلعہ گنجہ مشہور ہو گیا تھا۔

سکھ قلعہ دار نے اپنے قلعہ کے برج سے میدان میں اس قافلہ کو دیکھ کر آدمی بھیج کر دریافت کیا کہ آپ کون ہیں۔ میاں حسن نے جواب دیا کہ ہم قصور سے واپس دیپال پور جا رہے ہیں۔ کل صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ سکھ قلعہ دار نے پھر یہ پیغام بھیجا کہ آپ سکھوں سے لڑنے کے لئے قصور گئے تھے یہاں سے ابھی نکل جائیں ورنہ میں لڑائی کروں گا۔ میاں حسن نے پیغام لانے والے کو جواب دیا کہ ہمیں رات گزارنی ہے، صبح سویرے ہم چلے جائیں گے لیکن سکھ قلعہ دار نے اپنے قلعہ میں نوبتیں بجا کر اپنی فوج کو اکٹھا کرنے کا حکم دیا اور قلعہ سے باہر فوج لا کر اس جتھہ پر حملہ کر دیا۔ قلعہ میں نوبت کی آواز سے میاں حسن اور ان کا جتھہ لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لڑائی ہوئی اور سکھ ہار گئے اور رات کو ہی میاں حسن نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ سکھ جتھہ دار لاہور کی طرف بھاگ گیا۔ اس زمانہ میں شنوائی یکایک نہیں ہوتی تھی۔ میاں حسن بارہ سال اس قلعہ اور قصبہ پر قابض رہے اس اثناء میں انہوں نے قریب کے تمام مسلمان دیہاتوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کر لئے راجپوتوں کے ساتھ بھی اس کے موضع جوہیہ سے آگے کوٹلی رائے ابوبکر اور رکھانوالہ تک تعلقات قائم ہو گئے۔ پھر لاہور سے دس بارہ میل کے قریب موضع چندرا تھا۔ راجپوت اس کے دوست بن گئے۔ انہوں نے سب کو تاکید کے ساتھ کہا ہوا تھا کہ قلعہ گنجہ کا قلعہ دار رنجیت سنگھ کی فوجی مدد لے کر آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دی جائے۔ اس علاقہ میں میاں حسن کی دلیری اور بہادری اور قلعہ کو فتح کرنے کا بڑا چرچا تھا۔ اس علاقہ میں میاں کے القاب سے لوگ واقف نہیں تھے۔ وہ بڑے آدمی کو سردار کہتے تھے اس لئے میاں حسن، سردار حسن کے نام سے پکارے جانے لگے۔ موضع چندرا نزد لاہور سے ایک گھوڑ سوار قاصد نے آ کر سردار حسن کو اطلاع دی کہ قلعہ دار رنجیت سنگھ کی فوج کا دستہ لے کر آ رہا ہے۔ رات اس نے چندرا گاؤں کے میدان میں قیام کیا تھا۔

میاں حسن نے اپنے آدمیوں کو جمع کر کے کہا کہ ہم یہاں راجہ رنجیت سنگھ کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اپنا سب اسباب بیل گاڑیوں پر لاد کر یہاں سے روانگی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ سردار حسین نے اپنے جتھہ کو لے کر قلعہ گنج سے روانہ ہو کر ٹھیک بارہ میل دور جا کر مقام کیا۔ قلعہ گنج میں انہوں نے کہا ہوا تھا کہ اگر سکھ فوج نے ہمارا تعاقب کیا تو ہمیں اطلاع دی جائے۔ جس جگہ سردار حسن نے قیام کیا تھا وہ دریائے ستلج کے قریب تھا کہ اگر لڑائی سے کوئی نقصان ہو تو وہ دریا کے پار انگریزی راج میں جا سکیں گے۔

چار پانچ دن کے بعد گنج کلاں سے آدمی آیا کہ سکھ فوج قلعہ دار کو قلعہ کا قبضہ دے کر اور فتح کا جشن منا کر فتح کے ڈنکے بجاتے ہوئے واپس لاہور کو چلے گئے ہیں۔

کچھ دن کے بعد جب یہ واضح ہوا کہ اب یہاں کوئی خطرہ نہیں تو سردار حسن نے اسی مقام کو مستقل رہنے کے لئے پسند کیا۔ یہ زمین ایک سکھ کی جاگیر تھی۔ سکھ مر گیا تو اس کی بیوہ ڈیڑھ میل دور موضع تارا میں ایک گڑھی (چھوٹا سا قلعہ) میں رہتی تھی۔ اس نے سردار حسن سے اس لئے کوئی مزاحمت نہ کی کہ جو دیپالپور سے قصور راجہ کے ساتھ لڑائی کرنے آ گیا تھا پھر ایک قلعہ خام بھی اس نے قلعہ گنجہ چھین لیا تھا' اس کے ساتھ لڑائی کی مجھ میں تاب ہی نہیں۔

سردار حسن نے اسی جگہ پر گاؤں بنانا شروع کیا۔ انہوں نے نانک شاہ چھوٹی اینٹوں کے کئی آوے پکوا کر بارہ کنوئیں تعمیر کرائے اور اپنے گھر کے لئے اس زمانہ کے ڈیزائن کا پختہ مکان بنایا۔ سردار حسن کی وفات کے بعد اس کے اکلوتے بیٹے سردار احمد نے پندرہ پختہ کنویں اور گھر کے مکانوں کو محل کی شکل میں تبدیل کرنے کے علاوہ وہاں ایک ایسی پختہ اور بڑی مسجد بنائی کہ قصور شہر یا چونیاں یا ضلع بھر کے کسی گاؤں میں ایسی بڑی مسجد نہیں تھی۔

سردار احمد کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام نور محمد اور چھوٹے کا برہان تھا۔ سردار احمد کی وفات کے بعد ان دونوں نے اٹھارہ پختہ کنویں اور بنائے۔ جب انگریزی راج آیا تو سردار نور محمد کی عمر ۳۴ سال اور سردار نور برہان کی عمر ۲۶ سال تھی۔ انہوں نے انگریزی حکومت سے تعاون نہ کیا۔ اپنی زراعت کے انتظام' گاؤں کی توسیع اور گاؤں سے باہر ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا باغ لگانے میں مصروف رہے۔ جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد ملک میں ہر ایک نے حکومت سے تعاون کیا تو ان دونوں بھائیوں نے بھی حکومت سے تعاون کرنا ضروری سمجھا۔ اس تعاون سے سردار نور محمد اس علاقہ کا ذیلدار بنایا گیا۔ پھر جلد ہی ان کو اس علاقہ کا آنریری مجسٹریٹ بنایا گیا اور دیوانی مقدمات کے بھی اختیارات دے دیئے گئے۔ انہوں نے گاؤں سے باہر باغ کے قریب دو کوٹھیاں بنائیں۔ ایک کوٹھی کو عدالت گھر بنایا گیا اور دوسری کوٹھی انگریز افسران کے لئے جو دورہ پر آتے یا شکار کے لئے آتے (کیونکہ دریا قریب تھا اور یہ بڑی اچھی شکار گاہ تھی) تو اس دوسری بڑی کوٹھی میں ٹھہرتے۔ جو اس زمانہ کے اعلیٰ ڈیزائن کی تھی

چھوٹے بھائی سردار نور برہان کو پہلے خاں صاحب کا خطاب ملا پھر جلد ہی ان کو خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ قصور جو ۲۶ میل دور تھا، گاؤں کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ یہ چار پانچ تھانے جو قصور اور چونیاں سے دور تھے وہ سب ان کی مجسٹریٹی میں تھے۔

ان دونوں بھائیوں کے گنجہ کلاں میں ۴۵ پختہ کنوئیں تھے، جہاں انہوں نے مزارعوں کے آم اور جامن کے پودے دے کر بارہ آم اور بارہ جامن ہر کنوئیں پر لگانا ضروری قرار دیا تاکہ ان کی آمدنی سے اس بڑے گاؤں کی صفائی، مسافروں کے طعام و قیام کے اخراجات اور سرکاری افسروں کی آمد پر خرچ ہو سکے۔ انہوں نے گنجہ کلاں کے قریب ایک اور گاؤں خرید کر اس کا نام گنجہ خرد رکھا اور بڑے گاؤں کا نام بجائے گنجہ کلاں کے گنج کلاں رکھا لیکن عوام میں یہ مقبول نہ ہو سکا۔ ضلع لاہور میں گنجہ کلاں کے اطراف میں ان کے چار گاؤں ماموں کے محمود اور رٹھوڑا تھے اور دریا کے پار ضلع فیروز پور میں ان دیہات کے متصل چار گاؤں خرید کر بنائے۔ موضع پھاروالا، موضع گٹی، موضع خاص مہر، موضع غزنی والا۔ ان دونوں بھائیوں کی زمین چھ ہزار ایکڑ اراضی تھی۔ حکومت سے انہوں نے کوئی زمین نہیں لی۔ بہت عرصہ کے بعد جب پتوکی کی بار آباد ہونے لگی تو حکومت کی طرف سے ان کو پیشکش کی گئی کہ آپ دو ہزار ایکڑ زمین لے کر فارم قائم کریں لیکن انہوں نے لکھا کہ ہمارے پاس آٹھ گاؤں بڑے زرخیز ہیں۔ ہم پتوکی میں خود زمین نہیں لیتے۔ آپ ضلع لاہور اور خصوصیت سے تحصیل قصور اور تحصیل چونیاں میں کم زمین رکھنے والوں کو ہمارے مشورہ سے زمین دیں۔ یہ بات حکومت نے منظور کر لی۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے گاؤں کی حدود سے باہر قصور اور چونیاں تک فہرست بنائی جو حکومت نے مان لی اور اسی فہرست کے مطابق زمین تقسیم ہوئی۔ اس میں بہت کم زمین رکھنے والے ارائیوں کے نام تھے اس لئے پتوکی میں ارائیں بڑی کثرت سے آباد ہوئے۔ پاکستان بننے تک وہ علاقہ برادران گنجہ کلاں کی بڑی عزت کرتا رہا اور اب تک وہ بڑے احترام کی نگاہ سے ان کو دیکھتے ہیں۔

۱۹۱۱ء میں امرتسر سے قصور اور قصور سے پاکپتن ریلوے لائن بنائی گئی تو گنجہ کلاں کے قریب چار میل پر عثمان والا اسٹیشن پر ان دونوں بھائیوں نے زمین خرید کر ایک منڈی کی بنیاد رکھی۔ اس میں بھی دو کوٹھیاں، ایک بازار، ایک چوک، ایک مسجد اور محلے بنائے، ابھی یہ کام جاری تھا کہ ۱۹۱۷ء میں حکومت یہ ریلوے لائن اکھاڑ کر بصرہ و بغداد لے گئی۔ جس سے تعمیر رک گئی۔ ۱۸۹۸ء میں سردار نور محمد آنریری مجسٹریٹ نے ضلع لاہور کے ایک ریلوے سٹیشن گنڈا سنگھ والا میں جو ضلع فیروز پور کے بھی قریب تھا ایک ارائیں خاندان میں جو خطبہ انہوں نے دیا، اس خاندان کے پاس چھپا ہوا موجود ہے۔ اس کانفرنس میں باغبان پورہ سے میاں جمال الدین (میاں افتخار الدین کے والد) اور مسٹر شاہ دین جو بعد ازاں چیف کورٹ لاہور کے جج رہے، شامل

ہوئے اور ان دونوں اضلاع کے جملہ سرکردہ ارائیں شامل ہوئے۔ سردار نور محمد نے اپنے خطبہ صدارت میں تنظیم برادری، بیاہ شادی پر بے جا رسومات کی بندش اور کفایت شعاری اختیار کرنے اور تعلیم پر زور دیا۔ ایک محاسبہ کمیٹی بنائی کہ جو دستور کی خلاف ورزی کرے گا اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔ یہ کمیٹی بڑی سختی سے نگرانی کرتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضلع لاہور (ماسوائے لاہور شہر) اور ضلع فیروزپور کے ارائیں ۲۰ سال میں اس سے دوگنی زمین خرید سکے جتنی پہلے ان کے ہاں تھی۔

سردار حاجی نور محمد بہت بڑے عالم فاضل اور تاریخ دان تھے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی خان بہادر سردار نور برہان کی دو لڑکیوں کو پندرہ سال مسلسل خود پڑھایا۔ وہ دونوں عربی فارسی کے علاوہ تاریخ کی بڑی ماہر تھیں، ان میں ایک تو سردار محمد شفیع کی والدہ تھیں۔ وہ محمد شفیع کی پیدائش کے آٹھ دن بعد فوت ہو گئیں تو ان کی بڑی ہمشیرہ نے سردار محمد شفیع کی تربیت کی کیونکہ وہ خود بڑی عالم اور تاریخ دان تھی۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سردار محمد شفیع بچپن ہی سے انگریزی حکومت کے مخالف ہوئے۔ یہ اس ابتدائی تربیت کا نتیجہ تھا۔

سردار نور محمد ۱۹۰۳ء کے قریب جالندھر میں ارائیں کانفرنس میں گئے اور تعلیم و تنظیم پر انہوں نے لیکچر دیا۔ سردار نور محمد ۱۹۱۲ء کے آخر میں انتقال فرما گئے۔ تو ان کے چھوٹے بھائی ان کی جگہ مجسٹریٹ بنے۔ وہ عثمان والہ میں عدالت گھر بنا کر عدالت کرتے اور منڈی کی تعمیر کی نگرانی بھی کرتے۔

۱۹۱۶ء میں خان بہادر حاجی سردار نور برہان کے مشورہ سے لاہور میں پہلی ارائیں کانفرنس ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں ملک میں اصلاحات ہوئیں اور ضلع لاہور میں (ماسوائے لاہور شہر) ایک ہی مسلم سیٹ تھی۔ میاں سر محمد شفیع نے خان بہادر سردار نور برہان سے مشورہ کر کے اپنے داماد میاں شاہ نواز کو لیجسلیٹو کونسل کے لئے کھڑا کیا۔ وہ کسی دیہات میں نہیں گیا لیکن سردار فیملی نے بڑی بھاری اکثریت سے ان کو کامیاب کرایا۔ تین سال بعد لیجسلیٹو کونسل کا پھر الیکشن آیا۔ اس وقت خان بہادر سردار نور برہان تو انتقال فرما گئے تھے لیکن اس خاندان کا اثر بدستور ضلع بھر میں قائم تھا۔ میاں شاہ نواز کو پھر کھڑا کیا گیا۔ سردار وزیر علی، سردار امراؤ علی اور سردار الہ بخش نے انہیں سارے ضلع کے ووٹ لے کر دیئے اور یوں میاں شاہنواز بڑی بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔ اس بار بھی وہ صرف ایک دن الیکشن کے وقت پتوکی گئے ورنہ کسی گاؤں میں نہیں گئے۔ اس کے بعد جب اسمبلی بنی اور ضلع کی تین مسلم سیٹیں بنیں تو سردار محمد حسین کو خاندان نے کھڑا کیا۔ وہ کامیاب ہوئے۔ اس سیٹ پر سردار محمد حسین چار دفعہ ممبر بنتے رہے۔ جب پاکستان بنا تو اس خاندان نے ضلع کی دوسری سیٹ سردار نور محمد کے پوتے سردار احمد علی کو کھڑا کیا۔

خاندان کی مدد سے یہ بھی ممبر بن گئے۔

۱۹۰۷ء میں جب اس خاندان کے دونوں بزرگ سردار نور محمد اور سردار برہان زندہ تھے دریائے ستلج گنجہ کلاں کے قریب آگیا تو انہوں نے جس جگہ دریا خم کھا کر آیا تھا اس جگہ سے ایک بڑی نہر ڈیڑھ میل لمبی اور بڑی چوڑی بنائی۔ جب طغیانی آئی تو بنائی ہوئی نہر کا بند توڑ کر دریا کا بہاؤ بدل کر رکھ دیا۔ یہ دونوں بھائی اور ان کی اولاد ۱۹۲۱ء تک ایک ہی محل میں رہتے تھے ایک ہی جگہ روٹی پکتی لیکن اس کے بعد انہوں نے زمین تقسیم کرلی اور الگ الگ ہو گئے۔ میاں فیملی ڈولہ پختہ نزد دیپال پور اور میاں فیملی برج جیوے خاں ضلع ساہیوال اور سردار فیملی گنجہ کلاں ان تینوں خاندانوں کا مورث اعلیٰ ایک ہی تھا۔ یہ کئی پشت اوپر جا کر مل جاتے ہیں۔ (۱)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے سردار احمد علی پاکستان بننے کے بعد ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۲ء میں دو مرتبہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۲) ۱۹۷۷ء میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی مدد سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ مگر جب انتخابات کے بعد انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی تحریک چلی تو انہوں نے بعض دیگر ارکان اسمبلی کے ہمراہ، جن میں سردار شوکت حیات، امیر عبداللہ روکڑی اور میر بلخ شیر مزاری وغیرہ شامل تھے، قومی اسمبلی کی رکنیت سے بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا۔ (۳) سردار احمد علی، انجمن ارائیاں پاکستان کے صدر بھی رہے تھے۔

سردار احمد علی کے صاحبزادے سردار آصف احمد علی ہیں۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ انہوں نے اپنے کیریر کا آغاز ایف سی کالج (لاہور) میں تدریس سے کیا۔ مگر جلد ہی ان کے آزادانہ خیالات کے باعث انہیں اسلامی جمعیت طلبہ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ تدریس کو چھوڑ کر حکومت پنجاب کے مشیر ہو گئے۔ ۱۹۸۱ء میں انہوں نے جنرل ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ سے عملی سیاست کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۵ء میں وہ این اے ۸۹ قصور ا سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۴) سردار صاحب قومی اسمبلی میں آزاد بنچوں پر بیٹھے اور انہوں نے سید فخر امام گروپ کا ساتھ دیا۔ مگر قومی اسمبلی ٹوٹنے کے اعلان کے بعد انہوں نے خواجہ طارق رحیم سے دوستی کے باعث پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ پیپلز پارٹی میں ان کی شمولیت پر ضلع قصور کے پارٹی کارکنوں نے ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا جس پر سردار آصف نے ان کے خلاف بھی سخت زبان استعمال کی۔ چنانچہ جب سردار صاحب نے اپنی کنویسنگ کا آغاز کیا تو انہیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور یہی ان کی شکست کی وجہ بن گئی۔ (۵)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں سردار آصف احمد علی نے ایک مرتبہ پھر این اے ۱۰۶ قصور ا سے انتخاب لڑا۔ سابقہ تجربہ کے پیش نظر اس مرتبہ انہوں نے آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم انہیں آئی جے آئی کی حمایت حاصل رہی۔ ان کا یہ فیصلہ درست ثابت

ہوا اور وہ یہ انتخاب جیت گئے۔ (۶) انتخاب میں کامیابی کے بعد انہوں نے نواز شریف کی کابینہ میں اقتصادی امور کے وزیر مملکت کے طور پر شمولیت اختیار کرلی۔ (۷)

۱۹۹۲ء میں سردار آصف احمد علی کے بعض بیانات پر ان کے خلاف بڑی لے دے ہوئی جن میں انہوں نے ملاؤں کو ہدف تنقید بنایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ لوگ ملاؤں کے اسلام کی بجائے صوفیا کے اسلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور پاکستان کے نوے فیصد عوام قائداعظم اور علامہ اقبال کے اسلام کے خواہشمند ہیں۔ مولانا مودودی کے اسلام کے نہیں۔ (۸)

۱۹۹۳ء میں نواز شریف کی کابینہ کے وزراء نے استعفے دینے کا سلسلہ شروع کیا تو سردار آصف احمد علی ان میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے ۶ر اپریل ۱۹۹۳ء کو ایک پریس کانفرنس میں مستعفی ہونے کا اعلان کیا اور نواز شریف کی پالیسیوں اور ان کی کچن کابینہ کے وزراء کو ہدف تنقید بنایا۔ (۹) انہوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ نواز شریف حکومت عالمی دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہے۔ جس پر اگلے روز نواز شریف کابینہ کے وزراء نے سردار آصف کو ہدف تنقید بنایا۔

۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو نواز شریف کی برطرفی کے بعد جب نگراں وزیر اعظم بلخ شیر مزاری نے اپنی کابینہ تشکیل دی تو سردار احمد آصف علی اس میں وفاقی وزیر کے طور پر شامل تھے انہیں اینٹی نارکوٹکس کا قلمدان سونپا گیا تھا۔ (۱۱) ۱۹۹۳ء کے عام انتخاب میں سردار آصف علی نے پاکستان مسلم لیگ (جونیجو لیگ) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کے مدمقابل خورشید محمود قصوری تھے جو پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) کے امیدوار تھے۔ یہ معرکہ سردار آصف علی نے سر کیا (۱۲) بعد ازاں سردار آصف علی بے نظیر کابینہ میں بھی شامل ہوئے۔ انہیں وزارت خارجہ جیسی اہم وزارت کا قلمدان سونپا گیا۔ (۱۳)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر پاکستان مسلم لیگ، چٹھہ گروپ کے پلیٹ فارم سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے خورشید محمود قصوری سے بری طرح شکست کھا گئے۔ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے احتجاجاً حصہ نہیں لیا، کیونکہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے نائب صدر خورشید محمود قصوری نے ان کے خلاف نشست چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ (۱۴)

حوالہ جات

۱۔ علی اصغر چودھری۔ تاریخ ارائیاں۔ لاہور۔ ص ۶۰۰ تا ۶۰۷

۲۔ امجد وڑائچ۔ دی نونز اینڈ نائنٹس آف پنجابس پولیٹکس۔ دی نیوز کراچی الیکشن اسپیشل۔ ۲۰ر ستمبر ۱۹۹۳ء

۳۔ امیر محمد عبداللہ خاں ردکڑی۔ میں اور میرا پاکستان۔ لاہور۔ ص ۱۵۸

۴۔ عامر میر۔ دی اینٹی مولوی لیگر (سردار آصف احمد علی) دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔۳/۔۹/مارچ ۱۹۹۴ء۔ص ۸

۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ص ۲۳۹

۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰۔ جلد دوم۔ص ۵۰

۷۔ ڈوگر برادرز۔ پاکستان اور دنیا میں کون کیا ہے؟۔ لاہور۔ص ۴۸۳

۸۔ طلعت حسین۔ ملا کی حکومت مصیبتوں کی حکومت ہوگی۔ (سردار آصف علی کا انٹرویو)۔ ماہنامہ مطالعہ پاکستان کراچی۔ جولائی ۱۹۹۲ء۔ص ۱۲ تا ۱۴

۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۷/اپریل ۱۹۹۳ء

۱۰۔ ایضاً۔ ۸/اپریل ۱۹۹۳ء

۱۱۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۰ تا ۱۶ مئی ۱۹۹۳ء۔ص ۸

۱۲۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۲۸۳

۱۳۔ عامر میر۔ دی اینٹی مولوی لیگر (سردار آصف احمد علی) دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۳/۔۹/مارچ ۱۹۹۴ء۔ص ۸

۱۴۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ص ۱۹۵

سید

جھنگ کی سیاست پر شاہ جیونہؒ کے گدی نشینوں کے اثرات بڑے گہرے ہیں۔ حضرت شاہ جیونہؒ کا اصل نام محبوب عالم تھا۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ وہ عرب سے بخارا سمرقند' عراق اور ایران سے ہوتے ہوئے اسلام کی تبلیغ کے لیے برصغیر آئے اور ضلع جھنگ میں دریائے چناب کے قریب قیام پذیر ہوئے۔ وہ بہت عالم فاضل اور فقیر منش انسان تھے۔ ان کا ایک واقعہ ہے کہ انہوں نے دریائے چناب میں کھڑے ہو کر ایک کروڑ مرتبہ سورۃ مزمل پڑھی تھی جس کی وجہ سے انہیں کروڑیہ بھی کہا جانے لگا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس زمانے میں ہندوستان پر غیاث الدین بلبن کی اور جھنگ اور اس کے نواح میں سمرو خاندان کی حکومت تھی۔ سمرو راجہ کے اکلوتے بیٹے کو ان کے دشمنوں نے خنجر سے اس طرح گھائل کیا تھا کہ اس کا سینہ چاک ہو گیا۔ حکیموں اور طبیبوں نے جواب دے دیا۔ والدہ نے کسی سے شاہ جیونہ کا نام سنا کہ اللہ کے ایک بزرگ ہیں کہ جو دعا کرتے ہیں قبول ہو جاتی ہے۔ انہیں عزت و احترام سے بلوایا گیا اور معجزہ یہ ہوا کہ انہوں نے وہ چاک سینہ' ہاتھ سے سی دیا اس حولے سے انہیں "شاہ جیونہ پاٹے سیوتا" بھی کہا جاتا ہے اسی طرح ایک مرتبہ ان کے بیٹے پیرلاھن امام کھیل رہے تھے کہ کفار نے حملہ کر دیا۔ پیر امام بچے تھے۔ انہیں قریب ہی ایک کچی مٹی کی دیوار نظر آئی۔ اسی پر چڑھ گئے اور کہا "چل مجھے لے کر بھاگ چل یہاں سے"۔ اور دیوار نے بھاگنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک زہریلا سانپ نظر آیا۔ آپ نے اسے پکڑ کر چابک کے طور پر استعمال کیا اور اس طرح جان بچائی۔ یہ دیوار آج بھی شاہ جیونہ کے علاقے میں موجود ہے شاہ جیونہ کی ولایت کی وجہ سے اب ان کی اولاد مرجع عقیدت ہے (۱)

قیام پاکستان کے بعد شاہ جیونہ خاندان کے جس فرد نے سیاست کے میدان میں سب سے زیادہ شہرت کمائی وہ کرنل (ریٹائرڈ) عابد حسین تھے۔ کرنل عابد حسین سید مراتب علی کے داماد تھے۔ جو خود لاہور کے ایک معروف خانوادے فقیر خاندان کے داماد تھے۔ (۲)

کرنل عابد حسین کی سیاست کا آغاز یوں تو ۱۹۴۳ء میں جھنگ ڈسٹرکٹ بورڈ کی رکنیت سے ہو گیا تھا مگر قومی سطح پر ان کا نام ۱۹۴۵ء میں نمایاں ہوا۔ جب انہوں نے فوج چھوڑ کر ہندوستان کی مرکزی مجلس قانون ساز کا انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں وہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی مرکزی کابینہ تک جا پہنچے۔ (۳) ۱۹۵۵ء میں جب صوبہ مغربی پاکستان کا وجود عمل میں آیا تو انہوں نے صوبائی کابینہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ چونکہ ان کی ممتاز دولتانہ کے ساتھ نہیں بنتی تھی اس لئے جب ری پبلکن پارٹی وجود میں آئی تو وہ اس پارٹی کے جنرل سیکرٹری بن گئے۔ ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کے بعد ۱۹۵۷ء میں انہوں نے اس پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ تاہم ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کی آمد تک وہ بدستور صوبائی وزیر رہے۔ البتہ ان کے قلم دان بدلتے رہے۔ (۴)

کرنل عابد حسین ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے تھے کیونکہ ایوب خان نے انہیں ایبڈو کے تحت ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء تک نااہل قرار دے دیا تھا کرنل عابد حسین نے ایبڈو کے خلاف مقدمہ بڑی تیاری کے ساتھ لڑا تھا مگر اس کے باوجود وہ مقدمہ جیت نہ سکے اور سیاست سے بے دخل ہی رہے۔ (۵) ایوب خان کے زمانے میں انہوں نے حزب اختلاف کے مشترکہ محاذ نیشنل ڈیمو کریٹک فرنٹ کے قیام میں مدد دی۔ ایوب خان کے مقابلے میں جب محترمہ فاطمہ جناح نے انتخابات میں حصہ لیا تو انہوں نے فاطمہ جناح کا ساتھ دیا اور انہیں ۹۲ میں سے ۸۷ بی ڈی ممبران کی تائید حاصل کر کے دی۔ جو ایک ریکارڈ ہے۔ (۶)

۱۹۷۰ء میں کرنل عابد حسین نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر جمعیت علمائے پاکستان کے امیدوار مہر غلام حیدر بھروانہ کے مقابلے میں ناکام ہو گئے۔ (۷) اس شکست کا ان کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ اور وہ چند ہی ماہ بعد ۳ر اپریل ۱۹۷۱ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ (۸)

کرنل عابد حسین کی وفات کے بعد ان کی وراثت ان کی اکلوتی بیٹی عابدہ حسین نے سنبھالی۔ انہوں نے لاہور سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سوئٹزر لینڈ اور اٹلی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

وطن واپسی کے بعد ۱۹۶۹ء میں وہ اپنے خالہ زاد بھائی فخر امام کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔

فروری ۱۹۷۲ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر خواتین کی مخصوص نشستوں پر پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں یوں ان کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ (۹)

جھنگ ایسا ضلع تھا جہاں ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کو صرف ایک سیٹ ملی تھی۔ قومی کی تینوں سیٹیں جے۔ یو۔ آئی کو اور چار آزاد امیدواروں کو ملی تھیں۔ عابدہ حسین کے انتخاب کے بعد چاروں آزاد ارکان بھی پیپلز پارٹی میں آ گئے۔ عابدہ حسین نے دسمبر ۱۹۷۶ء تک پورے

پانچ سال اس علاقے میں واقعی پیپلز پارٹی کی ورکر کی حیثیت سے لوگوں کے دلوں میں جگہ پیدا کی۔

عابدہ حسین صوبائی اسمبلی کی واحد منتخب رکن تھیں جو شروع شروع میں برقعہ پہن کر اسمبلی میں آیا کرتی تھیں۔ ان کی نشست بھی عقب میں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ سیٹ آگے بڑھتی گئی اور برقعہ آہستہ آہستہ شیفون کے باریک دوپٹے کی شکل اختیار کرتا گیا۔ بھٹو کے زمانے میں عابدہ کی آواز سیاست کے ایوانوں میں نمایاں طور پر سنی جانے لگی تھی۔ ایماڈ نکن لکھتی ہیں: ''اس (عابدہ حسین) نے بھٹو کو پرجوش' آئیڈیا لسٹک اور سفاک پایا۔ ایک ہی بار جب وہ بھٹو سے علیحدگی میں ملی تو اس نے عابدہ حسین کی کسی رائے پر' جو اس نے بھٹو کے بارے میں دی تھی' عابدہ حسین کو سخت ڈانٹا اور اس پر شدید اعتراضات کئے۔ اس کے بعد بھٹو نے اس سے پوچھا: کیا سیاست اس کی بیٹی بے نظیر کے لئے مشکل اور سخت ثابت ہو گی؟ بھٹو اپنی بیٹی کو سیاست میں لانے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اس کے راستے میں کسی دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے لئے عابدہ حسین کو پاکستان پیپلز پارٹی نے ٹکٹ نہ دیا۔ عابدہ حسین کا دعویٰ ہے کہ بھٹو نے اسے اس لئے ٹکٹ نہیں دیا کہ وہ بے نظیر کے سامنے کسی دوسری خاتون کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا''۔

لیکن عابدہ حسین نے ایک پاکستانی اخبار نویس کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: ''مارچ ۷۷ء کے الیکشن کے لئے میں نے براہ راست الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تو میری درخواست رد کر دی گئی' حالانکہ میں اپنے ضلع میں نہ صرف پیپلز پارٹی کی آرگنائزر تھی بلکہ سب سے سرکردہ ممبر تھی۔ جب ٹکٹوں کا فیصلہ ہوا تو ایسے لوگ سامنے آئے جو پہلے وابستہ نہیں تھے۔ مجھے بھٹو صاحب نے فون کر کے کہا کہ آپ خواتین کی نشست پر الیکشن لڑیں' براہ راست انتخاب میں حصہ نہ لیں' میں نے کہا کہ پیپلز پارٹی کے منشور میں تو عورت کی آزادی کی سب سے زیادہ بات کی گئی ہے پھر مجھے صرف عورت ہونے کے ناطے الیکشن میں حصہ لینے سے کیوں روکا جا رہا ہے؟ لیکن میری بات قبول نہ کی گئی' لہٰذا میں نے فروری ۱۹۷۷ء میں پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ میں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کاغذات داخل کروائے۔ مگر ڈائریکٹر جنرل ایف ایس ایف (فیڈرل سیکورٹی فورسز) کے خفیہ احکامات کے سبب میرے کاغذات مسترد کر دیئے گئے۔ میرے کاغذات مسترد ہونے کے بعد جھنگ میں فضا پیپلز پارٹی کے خلاف ہو گئی۔ یوں میرے شہر میں قومی اتحاد کو عروج ملا۔ جب پیپلز پارٹی کے لوگوں نے دیکھا کہ میں پیپلز پارٹی سے مکمل طور پر علیحدہ ہو چکی ہوں تو حکومت نے میرے اور میرے ساتھیوں کے خلاف مختلف مقدمات کی بھرمار کر دی'' سیاسی طاقت میں اضافے کے لئے سیدہ عابدہ حسین کو پی این اے میں جانا پڑا۔ مئی ۱۹۷۷ء میں این۔ ڈی۔ پی میں شمولیت اختیار کرنے کے فوراً بعد وہ پی این اے (پاکستان نیشنل الائنس) کے پلیٹ فارم پر

آ گئیں۔ انہیں جولائی ۱۹۷۷ء میں این ڈی پی کی ورکنگ کمیٹی کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ جب اگست ۱۹۷۷ء کے الیکشن کا اعلان ہوا تو انہیں پی این اے نے ٹکٹ دیا "عجیب اتفاق ہے کہ پیپلزپارٹی نے جو ایک ترقی پسند پارٹی کہلاتی ہے' عورت کو براہ راست الیکشن لڑانے سے انکار کر دیا تھا جبکہ پی این اے نے' جو رجعت پسند مشہور تھی' مجھے خوشی خوشی ٹکٹ دیا۔" ایک روایت یہ بھی ہے کہ ۷۷ء کے الیکشن میں وہ سروسز ہسپتال لاہور میں داخل تھیں۔ وہیں سے کاغذات داخل کروائے گئے تو بھٹو صاحب نے دھمکی آمیز پیغام عابدہ حسین کو بھجوایا: "آزاد حیثیت میں الیکشن میں حصہ لینے سے باز رہو' ورنہ یاد رکھو تم ہسپتال میں ہو اور ہسپتال میں کچھ بھی ہو سکتا ہے"۔

ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں ایک بار محترمہ عابدہ حسین نے کہا تھا: "میں نہ بھٹو صاحب کے نزدیکی دائرے میں تھی' نہ ہی بیرونی سرکل میں! صرف ایک بار جب میں نے ان سے انٹرویو لیا تھا تو براہ راست ملاقات ہوئی تھی۔ البتہ مختلف تقاریب میں وہ کئی بار ملے۔ مجھے ذاتی طور پر ان سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ ایک مہربان اور شفیق انسان تھے۔ مجھے ہمیشہ عزت سے پیش آتے۔ جب بلوچستان میں عطاء اللہ مینگل کی وزارت توڑی گئی تو مجھے صدمہ ہوا تھا۔ اسی دن میری والدہ نے کہہ دیا تھا کہ بھٹو جمہوریت پسند حکمران نہیں ہے۔ لیکن شروع میں میرا ذہن قبول نہیں کرتا تھا۔ میں ان کا دفاع کرتی تھی مگر بعد میں والدہ کی بات کو ذہن نے قبول کر لیا"۔

عابدہ حسین دو سال تک نیشنل ڈیمو کریٹک پارٹی سے وابستہ رہیں۔ مئی ۱۹۷۹ء تک جب اس جماعت کے دو دھڑے ہو گئے تھے۔ یہ دھڑے بلوچ اور پختون کے جھگڑے پر ہوئے تھے جو دراصل ولی خان اور بزنجو کی شخصیت کا باہمی تصادم تھا۔ این ڈی پی سے علیحدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے عابدہ کہتی ہیں: "پارٹی ٹوٹ گئی تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس جھگڑے میں حصہ دار نہ بنوں۔ میں نے این ڈی پی سے بہت کچھ سیکھا۔ اچھے لوگ تھے لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں بلوچ اور پختون جھگڑے میں فریق بننا نہیں چاہتی تھی"۔

ذوالفقار علی بھٹو کے منظر سیاست سے اوجھل ہو جانے کے بعد پاکستانی اقتدار پر جنرل ضیاء الحق قابض ہوئے تو اس میں سیدہ عابدہ حسین کے شوہر جناب فخر امام کو مرکزی وزارت سے نوازا گیا۔ وہ اس سے قبل چھ ماہ کے لئے تحریک استقلال میں بھی رہ چکے تھے۔ دونوں میاں بیوی عزت اور شہرت کے عروج پر تھے۔ دونوں برابری کی سطح پر آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ دونوں کا سیاسی ذہنی اشتراک پھل پھول رہا تھا۔ مارشل لاء حکومت کی وزارت قبول کرنے سے قبل فخر امام ڈسٹرکٹ کونسل کے چیئرمین منتخب ہو چکے تھے۔ سیدہ عابدہ سے جب پوچھا گیا کہ جمہوریت پسند ہونے کے باوجود آپ کے شوہر نے مارشل لائی وزارت کیوں قبول کی تو ان کا جواب تھا: "واقعی یہ ایک دھبہ ہے جو فخر امام کے سیاسی ریکارڈ پر لگا ہے۔ وہ جب وزارت میں گئے تھے' اس وقت بھی میں نے اختلاف کیا تھا لیکن ان کے اپنے دلائل تھے۔ وہ کہتے تھے' میں

پاکستان کی سب سے بڑی ڈسٹرکٹ کونسل کا چیئرمین ہوں' لہٰذا مجھے غیر منتخب نہیں کہا جا سکتا' دوسری بات یہ کہ حکومتی امور کا تجربہ ہمیں حکومت میں جانے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ میں نے اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا تھا' مگر وہ اس وقت مطمئن تھے"۔

۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات میں دونوں میاں بیوی نے حصہ لیا تھا۔ فخر امام منتخب ہو کر ضلع کونسل ملتان کے چیئرمین بنے تھے اور عابدہ حسین کامیاب ہو کر ضلع کونسل جھنگ کی چیئرمین بن گئی تھیں۔ یہ ملک بھر میں اپنی نوعیت کی واحد اور پہلی مثال تھی کہ میاں بیوی بلدیاتی ادارے کے ایک جیسے عہدوں پر متمکن ہوں اور یہ بھی پہلی مثال تھی کہ کوئی خاتون ضلع کونسل کی چیئرمین ہو۔ ۸۳ء کے بلدیاتی انتخابات میں وہ جیت گئیں مگر اس بار شوہر نامدار ہار گئے۔ فروری ۱۹۸۵ء کے الیکشن میں قومی اسمبلی کی نشستوں پر دونوں میاں بیوی ایک بار پھر کامیابی سے ہمکنار ہوئے (جناب فخر امام ملتان سے اور محترمہ عابدہ جھنگ سے) عابدہ حسین نے ان انتخابات میں اسی (۸۰) ہزار ووٹ لئے جو پورے پاکستان میں تیسرے نمبر پر سب سے زیادہ ووٹ تھے۔ (۱۰) ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں ۱۴ خواتین نے حصہ لیا تھا۔ جن میں عابدہ حسین واحد امیدوار تھیں جو کامیاب ہوئی تھیں۔ (۱۱)

جھنگ ڈسٹرکٹ کونسل کی دوبار چیئرمین منتخب ہونے کے دوران میں عابدہ نے علاقے میں واقعتاً" رفاہ عامہ کے کئی کام کروائے۔ ڈھائی سو میل لمبی سڑکیں تعمیر کروائیں' چالیس سکول بنوائے' لائبریریاں' ڈسپنسریاں اور مارکیٹیں اس کے علاوہ ہیں۔ انہوں نے جب ڈسٹرکٹ کونسل کا چارج نئے آنے والے چیئرمین کے سپرد کیا تو اس وقت جھنگ ڈسٹرکٹ کونسل کے پاس چھ کروڑ روپے بینک میں موجود تھے۔

۸۵ء کے الیکشن کے نتیجے میں وہ قومی اسمبلی میں پہنچیں تو انہوں نے "انڈی پنڈنٹ پارلیمنٹری گروپ" (آئی پی جی) تشکیل دیا جو وزیراعظم محمد خان جونیجو کی اپوزیشن تھا۔ انہی دنوں عابدہ حسین کے شاہ جیونہ میں سینکڑوں ایکڑ پر مشتمل سٹڈ فارم کے پٹے کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ پنجاب حکومت نے وزیراعظم جونیجو کے دباؤ پر سٹڈ فارم کی میعاد میں مزید توسیع نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس پر بس نہ کی گئی بلکہ فیصلہ ہوا کہ جونہی میعاد کا آخری دن ختم ہو' فارم کو بزور طاقت خالی کرا لیا جائے۔ طرفین روزانہ اس موضوع پر تند و تیز بیانات کا تبادلہ کرنے لگے۔ پنجاب سرکار نے پولیس کی مسلح گارڈ اور ڈپٹی کمشنر جھنگ نے اپنے بندوق بردار سٹڈ فارم پر بھجوا دیئے۔ لیکن اس مقام پر عابدہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ نہ گئیں۔ انہوں نے بھی اپنے مزارعین کو اسلحے سے لیس کر کے کھیتوں میں بٹھا دیا۔ طرفین کے کیمپوں میں سے قریب تھا کہ بندوقیں شعلے اگلنے لگتیں کہ عابدہ حسین کی والدہ نے ایوان صدارت پر دستک دی۔ وہ بیگم وقار النساء نون کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ صدر ضیاء الحق کو معلوم ہوا تو وہ خود ان سے ملنے وہاں پہنچ

گئے۔ یوں نواز شریف کو بھی اس معاملے پر خاموش ہونا پڑا۔ عابدہ حسین کی لڑائی جونیجو اور ان کے درمیان رہ گئی۔ عدالت عالیہ نے بھی مداخلت کی اور بقول عابدہ حسین: "مجھے اسٹے آرڈر دے کر سرخ رو کر دیا!"۔

نومبر ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں سیدہ عابدہ حسین نے جھنگ کی دونوں نشستوں پر بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی اگرچہ دوسری نشست (شہری) پر امید تھی کہ ان کے مضبوط حریف مولانا حق نواز جھنگوی (مرحوم) کامیاب ہوں گے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر بریلوی ووٹ بھی مولانا جھنگوی کی صندوقچی میں چلے جاتے تو نتیجہ مختلف ہوتا۔ جناب فخر امام کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

۸۸ء کے انتخابات میں ایک کمزور سی اکثریت کے بل پر بے نظیر بھٹو وزارت عظمیٰ کی کرسی پر بیٹھنے میں کامیاب ہو گئیں۔ سیدہ عابدہ حسین نے بے نظیر بھٹو کو اعتماد کا ووٹ دیا' دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتی بھی رہیں۔ پھر بے نظیر بھٹو کے انداز حکمرانی نے ان کا اور عابدہ کا راستہ الگ کر دیا۔ عابدہ حسین نے متحدہ حزب اختلاف بنانے میں بے حد نمایاں کردار ادا کیا۔ بے نظیر کو چاروں شانے چت کرنے میں ان کی انگریزی زبان میں مضبوط گرفت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس کا بین ثبوت بے نظیر کے تین وزراء کے ساتھ ان کی مکالمہ آرائیاں ہیں۔ ان وزراء میں ان کے ایک کزن فیصل صالح حیات اور دوسرے شیر افگن ہیں۔ موخر الذکر نے تو ایک بار اسمبلی کے فلور پر یہ تک کہہ دیا: "مجھے ذرا انگریزی زیادہ نہیں آتی' اس لئے سیدہ کا سامنا نہیں کر پاتا!"

بے نظیر بھٹو نے جو راستہ اختیار کیا تھا' اس نے بالاخر انہیں اقتدار سے محروم کر دیا۔ ۶ر اگست ۱۹۹۰ء کو صدر مملکت نے ان کی حکومت برطرف کر دی۔ عابدہ حسین کے لئے یہ اقدام نہ تو حیرت انگیز تھا نہ ہی غیر متوقع! انہوں نے ایک بیان میں صدر پاکستان کے اس اقدام کو بروقت اور مستحسن قرار دیتے ہوئے کہا: "بھٹو خاندان کا یہ وطیرہ بن چکا ہے کہ جب وہ فوج پر سوار ہو کر ایوان اقتدار میں داخل ہوتا ہے تو وہ فوج کا مداح بن جاتا ہے' اس کی تعریف و توصیف کے پل باندھنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اقتدار کے کوچے سے نکلتے ہی وہ فوج کے بارے میں شکایات کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ فوج ایک نازک اور حساس ادارہ ہے۔۔۔ دنیا کا کوئی بھی جمہوری ملک حکومت میں فوج کے عمل دخل کو مناسب خیال نہیں کرتا۔ موجودہ صورتحال کی ذمہ داری فوج کے سر تھوپی نہیں جا سکتی۔ فوج نے نہ تو اسمبلیوں کو توڑنے میں کوئی کردار ادا کیا ہے' نہ ہی اس نے آئین کو پامال کیا ہے"۔

بے نظیر حکومت کی معطلی کے بعد صدر صاحب نے جو نگران حکومت' جس کے سربراہ جناب غلام مصطفیٰ جتوئی کو بنایا گیا تھا' تشکیل دی' اس میں عابدہ حسین کو وزارت اطلاعات و

نشریات کا قلم دان سپرد کیا گیا۔ بے نظیر صاحبہ کی بیس ماہانہ حکومت کے دوران میں سیدہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے اخبار نویسوں کو بلیک میلر اور چائے کی پیالی پر بک جانے والے کہا تھا (یہ خبر ایک بڑے اخبار میں شائع بھی ہوئی)۔ اب جو انہیں وزارت اطلاعات کا قلمدان سونپا گیا تو چہ میگوئیاں کی گئیں کہ جس خاتون کی اخبار نویسوں کے بارے میں ایسی رائے ہو وہ اخبار نویسوں کی وزارت کیسے چلا سکیں گی؟ لیکن وزیر بنتے ہی سیدہ نے راولپنڈی پریس کلب میں اخبار نویسوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ سیاستدان، صحافیوں کے بارے میں اس انداز میں منفی تبصرہ کرے، کیا اسے ساری دنیا میں اخباروں کے ذریعے زندہ نہیں رہنا؟

پیپلز پارٹی کے حلقوں کی طرف سے ان پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ پی پی پی کے نمایاں ارکان اور اس کی چیئر پرسن کے خلاف ٹی وی، ریڈیو اور سرکاری اخبارات کو استعمال کر کے ان کی کردار کشی کر رہی ہیں۔ انہوں نے اخباری اور نشری بیانات میں اپنے حریفوں کی سنت پر عمل کرتے ہوئے، ان کے خوب لتے لئے۔ انہی بیانات کے سبب بے نظیر کے پہلے دور حکومت میں جناب فاروق لغاری نے کہا: "افسوس بہن عابدہ، فخر امام بن گئی ہیں حالانکہ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں فخر امام نہیں ہوں، اور نہ ہی فخر امام بنوں گی"۔

اکتوبر ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں سیدہ عابدہ حسین نے بھرپور حصہ لیا۔ وہ وزارت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ انتخابی مہم میں بھی مردانہ وار شریک ہوئیں۔ (۱۲)

اس مرتبہ ان کا حلقہ اور مد مقابل دونوں بدل چکے تھے۔ اب ان کا حلقہ تھا این اے ۶۹ جھنگ ۴ اور ان کے مد مقابل تھے ان کے حقیقی بھتیجے فیصل صالح حیات۔ جو شاہ جیونہ کے ممکنہ گدی نشین بھی ہیں چنانچہ یہ معرکہ بھتیجے نے اپنے سیاسی اثرات سے زیادہ اپنے روحانی اثرات کی وجہ سے جیت لیا۔

عابدہ حسین کے شوہر سید فخر امام اس مرتبہ بھی این اے ۱۲۱ خانیوال ا سے امیدوار تھے۔ ۱۹۸۸ء میں وہ اس نشست پر مہر محمد اقبال ہراج سے شکست کھا چکے تھے اس مرتبہ بھی ان کے مدمقابل وہی تھے۔ مگر اب حالات بدل چکے تھے اور سید فخر امام نے حالات کی اس تبدیلی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مہر محمد اقبال ہراج کو تقریباً تیرہ ہزار ووٹوں سے شکست دے کر اپنا حساب چکا دیا۔ (۱۳)

نواز شریف کے وزیر اعظم بننے کے بعد جناب فخر امام ان کی کابینہ میں بطور وزیر تعلیم شامل ہوئے جبکہ سیدہ عابدہ حسین کو ان کی شکست کے باوجود امریکہ میں سفیر بنا دیا گیا۔ ۱۸ر اپریل ۱۹۹۳ء کو جب غلام اسحٰق خان نے نواز شریف کابینہ کو برخواست کیا تو سیدہ عابدہ حسین نے اس اقدام سے پہلے ہی نواز شریف سے یکجہتی کے طور پر اپنی سفارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ (۱۴)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں سیدہ عابدہ حسین کو اس بنیاد پر انتخاب کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا کہ ان کی سفارت سے استعفیٰ کو دو سال سے کم عرصہ گزارا ہے چنانچہ اس مرتبہ سیدہ عابدہ حسین کی بجائے ان کی والدہ بیگم کشور عابد حسین نے انتخاب لڑا۔ بیگم صاحبہ کے مدمقابل مخدوم سید فیصل صالح حیات تھے۔ بیگم صاحبہ یہ معرکہ تقریباً ساڑھے نو ہزار ووٹوں سے ہار گئیں۔ سیدہ عابدہ حسین کے شوہر سید فخر امام بھی ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں کامیاب نہ ہو سکے اور محمد اقبال هراج سے تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۵)

۱۹۹۶ء میں جب بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد نگراں حکومت تشکیل دی گئی تو سیدہ عابدہ حسین کو تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کا وزیر بنا دیا گیا۔ تاہم جب یہ فیصلہ ہوا کہ نگراں کابینہ کے وزراء عام انتخابات میں حصہ نہیں لے سکیں گے تو وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئیں۔ (۱۶)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے این اے ۶۹ جھنگ ۴ سے انتخاب لڑا اور مخدوم سید فیصل صالح حیات کو تقریباً ۲۴ ہزار ووٹوں سے شکست دے کر قومی اسمبلی کی رکن بن گئیں۔ (۱۷) بعد ازاں وہ وفاقی کابینہ میں شامل ہوئیں، انہیں وفاقی وزیر برائے بہبود آبادی کا قلم دان سونپا گیا۔ (۱۸) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر حصہ لیا لیکن مخدوم سید فیصل صالح حیات سے دس ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئیں۔ (۱۹)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں سید فخر امام ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب جیتنے میں کامیاب ہوئے۔ (۲۰) تاہم ۲۰۰۲ء میں وہ دو نشستوں پر انتخاب لڑنے کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک نشست پر انہیں محمد رضا حیات ہراج نے ہرایا جبکہ دوسری نشست پر انہیں پیر محمد اسلم بودلہ نے شکست سے ہم کنار کیا۔ (۲۱)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں سیدہ عابدہ حسین اور سید فخر امام کی صاحبزادی سیدہ صغریٰ امام نے پی پی ۷۶ جھنگ ۴ سے پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اپنے والدین کے برعکس وہ یہ انتخاب بڑی آسانی سے جیت گئیں انہوں نے مدثر عباس مگھیانہ کو شکست سے دوچار کیا صغریٰ امام ۲۰۰۱ء میں ضلع جھنگ کی ناظمہ منتخب ہوئی تھیں مگر ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے انہوں نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ (۲۲)

سیدہ عابدہ حسین کے شوہر سید فخر امام کا تعلق خانیوال کے قتال پور سید گھرانے سے ہے۔ سید فخر امام کے چچا پیر نو بہار شاہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں ایم پی اے اور ایم ایل اے منتخب ہوئے تھے۔ سید فخر امام کے ایک کزن ڈاکٹر خاور علی شاہ ۱۹۷۷ء میں پہلی مرتبہ صوبائی اسمبلی کے رکن بنے ۱۹۸۱ء میں وہ مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے تھے اور ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء تینوں انتخابات میں صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہو کر کامیابی کی ہیٹ ٹرک مکمل کر چکے ہیں۔ (۲۳) انہوں نے ۱۹۹۳ء کے

عام انتخاب میں بھی حصہ لیا مگر اس مرتبہ بد قسمتی سے کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۴) ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں ڈاکٹر خاور علی شاہ نے ایک مرتبہ پھر کامیابی حاصل کی۔ (۲۵) تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ مخدوم سید محمد مختار حسین شاہ کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۲۶)

۲۰۰۵ء کے بلدیاتی انتخابات میں سید فخر امام کے بھائی سید فیصل امام نے خانیوال سے ضلعی ناظم کا انتخاب لڑا تھا مگر مسلم لیگ (ق) کے حمایت یافتہ امیدوار سردار احمد یار ہراج سے بری طرح شکست کھا گئے تھے۔ (۲۷)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے سیدہ عابدہ حسین اور سید فخر امام کا ننھیال سید مراتب علی کا مشہور صنعت کار گھرانہ ہے۔ اس رشتہ کے اعتبار سے سیدہ عابدہ حسین اور سید فخر امام کے ایک ماموں سید امجد علی شاہ ری پبلکن دور حکومت میں مرکزی وزیر خزانہ اور بعد میں اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب رہے ہیں۔ (۲۸) جبکہ دوسرے ماموں سید بابر علی، جناب معین قریشی کی نگران کابینہ میں وزیر خزانہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ (۲۹)

سیدہ عابدہ حسین کے رشتے کے بھتیجے سید فیصل صالح حیات، جو حضرت شاہ جیونہ کے موجودہ سجادہ نشین مخدوم محمد غوث کے صاحبزادے ہیں، ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایم این اے منتخب ہوئے تھے اور ان کے مقابلے میں اسلامی قومی اتحاد کے امیدوار ظفر جمال بلوچ شکست کھا گئے تھے، جو اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ بھی رہے تھے۔ سید فیصل صالح حیات ۱۹۸۸ء میں این اے ۲۹ جھنگ ۴ سے بھی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ انہیں یہ کامیابی سینئر سید افتخار علی بخاری کو شکست دے کر حاصل ہوئی تھی۔ (۳۰) ۱۹۹۰ء کے عام انتخات میں انہوں نے اپنی پھوپھی سیدہ عابدہ حسین کو اور ۱۹۹۳ء میں بیگم کشور عابدہ حسین کو شکست دی۔ تاہم ۱۹۹۷ء میں وہ سیدہ عابدہ حسین سے شکست کھا گئے ۲۰۰۲ء میں وہ سیدہ عابدہ حسین کو ہرا کر ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن بنے ان انتخابات میں وہ این اے ۹۱ جھنگ ۴ سے بھی قومی اسمبلی کی نشست کے امیدوار تھے مگر اس نشست پر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۳۱)

انتخابات کے بعد قومی اسمبلی میں انہوں نے راؤ سکندر اقبال کے ساتھ مل کر پاکستان پیپلز پارٹی پیٹریاٹس ے نام سے اپنا ایک علیحدہ گروپ بنا لیا اور ظفر اللہ جمالی کو وزیر اعظم بنوانے میں اہم کردار ادا کیا نئے سیٹ اپ میں وہ پہلے وزیر داخلہ اور پھر کشمیر اور شمالی علاقہ جات کے وزیر مقرر ہوئے۔ (۳۲)

سید فیصل صالح حیات کے چھوٹے بھائی مخدوم زادہ سید اسد حیات شاہ ۱۹۸۸ء سے پابندی سے انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے سیدہ عابدہ حسین سے اور ۱۹۹۰ء میں انہوں نے مولانا حاجی محمد رحمت اللہ سے شکست کھائی۔ ۱۹۹۳ء میں وہ این اے ۶۷ جھنگ ۲ سے مولانا حاجی محمد رحمت اللہ ہی کو تقریباً گیارہ سو ووٹوں سے شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن بننے میں

کامیاب ہوئے۔ (۳۳) لیکن ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے عام انتخات میں کامیاب نہ ہو سکے ۱۹۹۷ء میں انہیں حاجی محمد رحمت اللہ نے ہرایا جبکہ ۲۰۰۲ء میں انہیں محترمہ غلام بی بی بھروانہ نے شکست دی۔ (۳۴)

سیدہ عابدہ حسین کے تایا میجر مبارک علی شاہ مرحوم کا شمار پنجاب میں تحریک پاکستان کے صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا ہے وہ ۱۹۳۷ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انہوں نے نواب ملک خضر حیات ٹوانہ سے بغاوت کی اور پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے قیام کے لئے مؤثر کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ضلع جھنگ سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ۱۹۵۱ء میں بھی صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیتا اور کچھ عرصہ ملک فیروز خاں نون کی صوبائی وزارت میں شامل رہے ان کے بیٹے سید ذوالفقار علی بخاری نے ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے انتخاب میں کامیابی حاصل کی اور وہ قومی اسمبلی کے آزاد بنچوں پر بیٹھے اس وقت وہ ایک نوجوان پارلیمنٹرین تھے۔ جنہوں نے اپنی تقریروں میں ایوب خان کے آمرانہ اقدامات کو ہدف تنقید بنایا۔ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں انہوں نے بطور آزاد امیدوار حصہ لیا مگر قومی اسمبلی کے اس انتخاب میں کنونشن مسلم لیگ کے امیدوار نواب مہر نوازش علی سیال مرحوم کو کامیاب بنانے کے لیے زبردست دھاندلیوں کا ارتکاب کیا گیا اور ان دھاندلیوں کے صدائے بازگشت لاہور ہائی کورٹ میں بھی سنی گئی۔ ۱۹۷۰ء میں سید ذوالفقار علی بخاری نے قومی اسمبلی کی اسی نشست سے بطور آزاد امیدوار کاغذات نامزدگی جمع کرائے مگر اس نشست پر چونکہ کرنل سید عابد حسین مرحوم امیدوار تھے اس لئے وہ سرگرم نہ رہے تاہم انہوں نے اپنے کاغذات نامزدگی واپس نہ لئے ۱۹۷۷ء کے انتخابات سے قبل سید ذوالفقار علی بخاری اور ان کے چھوٹے بھائی سید افتخار علی بخاری پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔ وزیراعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے سید ذوالفقار علی کی شناسائی کے باعث پیپلز پارٹی نے دونوں بھائیوں کو قومی اور صوبائی اسمبلی کے لئے امیدوار نامزد کر دیا سید ذوالفقار علی بخاری نے ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد کے امیدوار نوابزادہ افتخار احمد انصاری کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔ سید ذوالفقار بخاری مارشل لاء کے دور میں پیپلز پارٹی سے ہی وابستہ رہے۔

۱۹۸۵ء کے عام انتخاب میں انہوں نے حصہ نہیں لیا تاہم وہ اپنی کزن عابدہ حسین کے مخالف امیدوار حاجی غلام محمد گادی کی حمایت میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے عابدہ حسین کا مقابلہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ (۳۵) اس کے بعد کسی انتخاب میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

سید ذوالفقار علی بخاری کے چھوٹے بھائی، سید افتخار علی بخاری سینیٹر رہ چکے ہیں اور مخدوم سجاد حسین قریشی کے داماد ہیں ان کے تفصیلی حالات قریشی خاندان کے باب میں رقم کیے گئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ خالدہ یوسف۔ سیاست نے کبھی میرے گھر کی دہلیز پار نہیں کی۔ فیصل صالح حیات سے خصوصی گفتگو۔ جمعہ میگزین (روزنامہ جنگ) لاہور۔۱۲ر نومبر ۱۹۹۳ء
۲۔ فقیر سید وحید الدین۔ انجمن۔ لاہور۔ ص ۹۴، ۹۵
۳۔ تہور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۵۵۔۱۹۵۴ء۔ لاہور۔ ص ۴، ۵
۴۔ ادارہ۔ کرنل عابد حسین۔ ہفت روزہ لیل ونہار (لاہور)۔۱۸ر مئی ۱۹۵۸ء
۵۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۷۳ تا ۷۶
۶۔ تنویر قیصر شاہد۔ سیدہ عابدہ حسین کئی عنوانوں کی ایک کہانی۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۹۰ء تا ۴ر جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۷
۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۵۲
۸۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات مشاہیر پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۱۲۷
۹۔ جگنو محسن۔ سیدہ عابدہ حسین پروفائل۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔۲ر۔۸ر نومبر ۱۹۸۹ء۔ ص ۱۳
۱۰۔ تنویر قیصر شاہد۔ سیدہ عابدہ حسین، کئی عنوانوں کی ایک کہانی۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۹۰ء تا ۴ر جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۵ تا ۱۸
۱۱۔ ادارہ۔ چودہ خواتین میں سے صرف ایک کامیاب (باکس)۔ ہفت روزہ حرمت، اسلام آباد ۱۴ر تا ۲۱ر مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۱۱
۱۲۔ تنویر قیصر شاہد۔ سیدہ عابدہ حسین، کئی عنوانوں کی ایک کہانی۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۹۰ء تا ۴ر جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۹
۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء جلد دوم ص ۵۵
۱۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹ر اپریل ۱۹۹۳ء
۱۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۷۰، ۱۲۸۹
۱۶۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۸۹
۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۵۸
۱۸۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۸۹
۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء جلد دوم۔ ص ۳۶۔

۲۰۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۱۴۱
۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۵۶، ۵۷
۲۲۔ وکیل انجم۔ پنجاب کی سیاست جاگیرداری اور دھڑے بندیوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ روزنامہ جنگ کراچی (سنڈے میگزین) ۴ر ستمبر ۲۰۰۵ء۔ ص ۲۲
۲۳۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب، لاہور۔ ص ۱۴۰
۲۴۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۲۰
۲۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم ص ۳۵۳
۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء جلد دوم ص ۱۹۱
۲۷۔ روزنامہ دی نیوز۔ کراچی۔ ۸ر اکتوبر ۲۰۰۵ء
۲۸۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ روز نامہ جنگ لاہور۔ خصوصی اشاعت ۲۷ر اگست ۱۹۹۱ء
۲۹۔ جگنو محسن۔ پروفائل، سید بابر علی۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۲۹ر جولائی۔ ۴ر اگست ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۴
۳۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور ص ۱۵۴
۳۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد دوم ص ۳۷۔
۳۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳ر ستمبر ۲۰۰۴ء
۳۳۔ گزٹ آف پاکستان اسلام آباد۔ ۳ر دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۵۴۵، ۱۱ر نومبر ۱۹۹۰ء ص۔ ۹۲۰۸۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ۱۲۶۹
۳۴۔ (i) دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰ر فروری ۱۹۹۷ء ص ۲۰۶
(ii) دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۹۱۶
۳۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۵۳

عباسی

ریاست بہاولپور پنجاب کے جنوب مغرب اور سندھ کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس کے شمال کی طرف دریائے ستلج۔ مغرب کی طرف دریائے سندھ اور جنوب کی طرف ریاست ہائے بیکانیر۔ جیسلمیر اور صوبہ سندھ ہیں۔ اس ریاست کا انتہائی طول تقریباً ۳۰۰ میل اور عرض تقریباً پچاس میل ہے۔

اس ریاست میں داؤد پوتروں کا خاندان بلحاظ طاقت و حکومت سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ حکمران بھی اسی قبیلے میں سے ہوتے رہے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو حضرت محمدؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد بتاتے ہیں۔ روایت ہے کہ بغداد کے آخری عباسی خلیفہ المسلمین کی وفات کے بعد حضرت عباسؓ کی اولاد نے سرزمین عراق سے ہجرت کی اور خراسان اور مکران کے راستے سے روڑی بھکر واقع سندھ میں آگئی۔ قدیم تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ روڑی بھکر میں آ کر آباد ہوئے اور نہایت مرفہ الحال زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے قطعات اراضی کو آبپاش اور زرخیز بنانے کے لئے دریائے سندھ سے نہریں نکال لی تھیں۔ امیر چنی خاں حضرت عباسؓ سے چھتیسویں پشت میں ہوا ہے۔ اس کے دو لڑکے داؤد خاں اور مہدی خاں نامی تھے۔ داؤد خاں کی اولاد عباسی داد پوترے کہلائی اور انہوں نے ریاست بہاولپور کی بنیاد ڈالی اور مہدی خاں کا بیٹا کلہوڑہ سندھ کے حکمران خاندان کلہوڑہ کا بانی ہوا۔ ۱۷۳۹ء میں شہنشاہ نادر شاہ نے صادق محمد خاں صاحب اول کو نواب کا خطاب عطا کیا اور خطاب کے علاوہ بہت سا علاقہ بھی دیا جو اب تک ریاست بہاولپور میں شامل ہے۔ لیکن یہ ریاست ابتداء کئی سال تک صرف چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ایک مجموعہ رہی جن کے ہر ایک حکمران کو انتظامی اختیارات اور مالکانہ حقوق حاصل تھے اور وہ محض برائے نام نواب کو اپنا بالادست حاکم تسلیم کرتے تھے۔ نواب صادق محمدؒ خاں صاحب اول کے پوتے نواب بہاول خاں صاحب ثانی پہلے حکمران تھے جنہوں نے سارے چھوٹے چھوٹے داد پوترے رئیسوں کو اپنے حلقہ اطاعت میں داخل کر کے متحدہ ریاست قائم

کی۔

اس کے باوجود کہ ۱۷۸۸ء میں کابل کا درانی بادشاہ تیمور شاہ بہاول خاں صاحب کی اولوالعزمانہ جدوجہد کے راستہ میں سخت رکاوٹ ثابت ہوا اور کچھ مدت تک تیمور شاہ کی فوج بہاولپور پر قابض بھی رہی پھر بھی بہاول خاں صاحب اپنی طاقت کو بتدریج مستحکم کرنے میں کامیاب ہوتے گئے اور ملتان اور دیگر قرب و جوار کے اضلاع کے حصص پر کئی سال تک ان کے شاہانہ حقوق تسلیم ہوتے رہے۔ ۱۸۰۲ء میں شاہ محمودؒ والئی کابل کی اجازت سے انہوں نے بہاولپور میں ایک ٹکسال کھولی اور ریاست کے نام کا سکہ مضروب کیا۔ لیکن ان کے جانشین کے زمانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے ریاست کی طاقت میں آہستہ آہستہ زوال آتا گیا اور اس کا بہت سا علاقہ نکل جانے کی وجہ سے ریاست کے مقبوضات کے حدود کم ہو گئے۔ جب ۱۸۲۵ء میں نواب بہاول خاں صاحب ثالث مسند نشین ریاست ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ اگر اپنے علاقے کو سکھوں کے ہاتھ سے بچانے کی کوئی تدبیر ہے تو وہ سرکار انگریزی کے ساتھ رابطہ اتحاد قائم کرنے کی صورت ہے چنانچہ انہوں نے ۱۸۳۳ء میں سرکار انگریزی سے ایک عہدنامہ کر لیا جس کی رو سے نواب صاحب کی خودمختاری تسلیم کی گئی اور ان کی ریاست محفوظ ہو کر اس حشر سے بچ گئی جو ملتان اور مغربی پنجاب کی دوسری مسلمان ریاستوں کا ہوا ۱۸۳۸ء میں نواب بہاول خاں صاحب ثالث نے بڑی وفاداری سے اس انگریزی سپاہ کو مدد دی جو کہ افغانستان پر قابض تھی اور یوں کسی قدر اس بار احسان سے بھی سبکدوش بنے جو سرکار انگریزی نے ان کی ریاست کو سکھوں سے محفوظ کر کے ان پر کیا تھا۔

اس خدمت کے صلے میں ان کو اضلاع سبزل کوٹ اور بھنگ باڑہ سرکار انگریزی نے عطا کئے۔ اسی سال میں ایک نیا عہدنامہ ان کے ساتھ ہوا جس کی رو سے سرکار انگریزی نے پھر ان کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور خود مختار حکمران قرار دیا۔ ۱۸۴۸ء میں انہوں نے پھر ملتان کی بغاوت میں جو سکھوں کی دوسری لڑائی کا باعث ہوئی بیش بہا مدد دی۔ نواب بہاول خان کی فوج نے ایڈورڈس صاحب کی غیر آئینی سپاہ کے ساتھ شامل ہو کر مولراج کی فوج کو شکست دی اور جب تک جنرل وش انگریزی فوج لے کر نہ پہنچ گئے باغیوں کو ملتان کی فصیل کے اندر گھیرے رکھا۔ ان خدمات کے عوض میں ان کو ایک لاکھ روپے کی تاحیات پنشن ملی۔ علاوہ ازیں ان کی افواج کو بھی ان کی خدمات کے صلے میں ۸۰۰۰۰ روپیہ نقد مرحمت کیا گیا۔

۱۸۵۰ء میں نواب بہاول خاں صاحب ثالث نے اپنے بڑے بیٹے فتح یار خاں صاحب کی بجائے دوسرے لڑکے سعادت یار خاں صاحب کو ولی عہد ریاست مقرر کرنا چاہا۔ حکومت نے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور فیصلہ کر دیا کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا اختیار خود نواب صاحب کے ہاتھ میں ہے اور اس میں کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں

سعادت خان ہی مسند نشین ہوئے۔ مگر تھوڑے ہی عرصے بعد ان کے بڑے بھائی نواب فتح خان نے جن کے مدد و معاون تمام چھوٹے داؤد پوترے رئیس تھے ان کو نکال دیا۔ نواب سعادت خان نے بحضور گورنر جنرل اس کی اپیل کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وہاں سے یہ جواب ملا کہ سرکار انگریزی والئی ریاست کو صرف اس کے بیرونی دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ فتح خان نواب بن گئے اور ان کے معزول شدہ بھائی کو انگریزی علاقے میں پناہ دے دی گئی۔ سعادت یار خاں صاحب کے گزارے کے لئے ریاست سے ۱۹۲۰۰ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر ہو گیا اور انہوں نے یہ اقرار کیا کہ اب انہیں اور ان کی اولاد کو ہمیشہ کیلئے بہاولپور کی مسند امارت پر کوئی حق نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن معزول نواب صاحب نے بہت جلد یعنی اسی سال میں سازشی داد پوترے سرداروں کی امداد سے اس اقرار کو بالکل توڑ دیا۔ (ا) کیونکہ ان سرداروں کو بخوبی یاد تھا کہ انہوں نے پچھلی مرتبہ کس سہولت کے ساتھ انقلاب پیدا کر دیا تھا اور انہیں امید تھی کہ لگاتار مداخلت سے نواب صاحب کے خاندان کی طاقت گھٹ جائے گی اور ہماری طاقت بڑھ جائے گی مگر اس موقع پر انہوں نے سرکار انگریزی کی اولوالعزمی اور طاقت کا اندازہ کرنے میں غلطی کھائی۔ نواب سعادت خان فوراً لاہور کے قلعے میں قید کر دیئے گئے اور ان کا نصف مشاہرہ اس وقت تک کے لئے بند کر دیا گیا جب تک وہ اپنے آپ کو پورا مشاہرہ حاصل کرنے کا مستحق ثابت نہ کریں مگر وہ اسی طرح ۱۸۶۴ء میں لاولد فوت ہو گئے۔

۱۸۶۳ء میں داؤد پوتروں نے نواب بہاول خان کے خلاف بغاوت اختیار کی جو فی الفور فرد کی گئی لیکن ۱۸۶۵ء کے موسم خزاں اور پھر آئندہ سال کے ماہ مارچ میں از سرنو بغاوتیں ہوئیں مگر باغی ان دونوں موقعوں پر ناکام رہے۔ آخری بغاوت کے فرو ہونے کے بعد نواب صاحب دفعتہ" مر گئے۔ اس مرگ ناگہانی میں بے ایمانی کا اشتباہ ہے۔ ریاست میں بدانتظامی اور پھیلتی گئی اور آخرکار یہ قرار پایا کہ ریاست کا انتظام تا سن بلوغ نواب صادق محمد خان جو اس وقت نابالغی کے باعث اپنی والدہ کے زیر حفاظت تھے۔ سرکار انگریزی کے سپرد کیا جائے۔ اس کے سوا ان نافرمان بردار سرداروں کو قابو میں رکھنے کے واسطے اس وقت کوئی اور عمدہ تدبیر نہ تھی کیونکہ ان کو یقین تھا کہ ان کا ذاتی مفاد نواب صاحب کے خاندان کی بربادی ہی میں ہے۔

جولائی ۱۸۶۶ء میں ریاست کا انتظام صاحب کمشنر بہادر ملتان کے سپرد ہوا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ایک خاص پولیٹیکل ایجنٹ زیر نگرانی گورنمنٹ پنجاب مقرر ہوئے اور ان کو نظم و نسق ریاست کے پورے پورے اختیارات دیئے گئے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو جو ہدایت ریاست کی حکومت کے باب میں کی گئی تھی اس میں یہ اصول مدنظر رکھا گیا تھا کہ حتی الوسع مقامی عہدہ داروں کی مدد سے ریاست کے کاروبار کو انجام دیں اور مختلف صیغوں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ جب نواب صاحب ۱۸ برس کی عمر کے ہوں تو وہ انتظام ریاست کو ایسی صورت میں

پائیں کہ اسے اپنے اہلکاروں کے ذریعے سے عمدہ طور پر چلا سکیں۔ جب ۱۸۶۷ء میں کرنل منچن صاحب پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے اس وقت ریاست نہایت ہی خراب حالت میں تھی۔ کہتے ہیں کہ ریاست بھر میں صرف دو آدمی ذی رتبہ اور رسوخ والے باقی رہ گئے تھے اور سب یا تو مروا ڈالے گئے تھے یا جلاوطنی کی حالت میں مرکھپ گئے تھے اور ان کے قبائل محالات ضبط ہو جانے کے باعث تنگ دستی کی مصیبت میں مبتلا تھے۔ غرض وہاں نہ ایسے ملازم تھے جن کو کارکن کہہ سکیں اور نہ ایسے افسر تھے جن کے سپرد ریاست کے بڑے بڑے کام کئے جا سکیں۔ خزانہ خالی تھا اور ہر ایک صیغے کے ملازموں کی تنخواہیں بہت ہی چڑھی ہوئی تھیں۔ فوج فاقہ کشی کی حالت میں سرکش ہو رہی تھی۔ نہروں کا کوئی خبر گیراں نہ تھا جس سے وہ ابتر حالت میں بڑی تھیں۔ بہت سے مالکان نے اپنی اراضیات چھوڑ دی تھیں اور اضلاع ملحقہ میں بحیثیت مزارعان سالانہ ٹھیکہ پر کاشت کاری کرتے تھے۔ مگر سرکاری حسن انتظام سے ریاست کے کاروبار میں بہت جلد ترقی ہو گئی۔ ہر ایک صیغہ از سرنو ترتیب دیا گیا اور چند ہی سال میں ریاست پھر مرفہ الحال ہو گئی۔ نواب صاحب نومبر ۱۸۷۹ء میں سن بلوغ کو پہنچے۔ اسی سال میں نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب نے ان کو پورے اختیارات ریاست عطا فرمائے اور اس موقع پر حضور ممدوح نے ان ترقیوں کا جو عمدہ انتظام کے باعث ظہور میں آئی تھیں ذکر فرمایا۔ ۱۸۶۵ء میں تو یہ حال تھا کہ آمدنی مالگزاری سے کچھ وصول نہیں ہوتا تھا لیکن انگریزی انتظام کے قائم ہونے کے پہلے ہی سال میں چودہ لاکھ روپیہ وصول ہوا اور جب نواب صاحب مسند نشین ہوئے تو یہ آمدنی بیس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ سڑکیں، پل اور عمارات رفاہ عام تعمیر کی گئیں۔ پرانی نہروں کی مرمت کی گئی اور ان کو وسعت دی گئی اور نئی نہریں بھی تجویز ہو کر کھودی گئیں جن سے آبپاش رقبہ میں ڈھائی لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہو گیا۔ انڈس ویلی ریلوے جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کی شاخ تھی اس ریاست کے علاقے میں ڈیڑھ سو میل تک گزرتی تھی۔ اس کا کل خرچ گورنمنٹ ہند نے دیا تھا۔ (۲)

باضابطہ مسند نشینی ہو چکنے کے بعد نواب صادق محمد خاں صاحب رابع اپنی ہی ریاست کے تجربہ کار اہلکاروں کی ایک کونسل کی مدد سے ریاست کا عمدہ انتظام کرتے رہے۔ افغانستان کی دوسری لڑائی کی تیاری میں ریاست بہاولپور نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور خصوصاً اس فوج کو بڑی مدد دی جو کہ لیفٹیننٹ جنرل سر ڈانلڈ سٹوارٹ بالقابہ کے ماتحت کوئٹہ میں تھی۔ بے شمار بیل اور یابو دینے کے علاوہ ریاست نے محکمہ باربرداری کو بیس ہزار اونٹ بھی دیئے۔ ریاست کی فوج کے پانچ سو پیدل اور ایک سو سوار ڈیرہ غازی خاں میں تعینات کئے گئے اور جبکہ باقاعدہ سرکاری رجمنٹیں سرحدی چوکیوں کو خالی کر گئی تھیں۔ ان سپاہیوں نے ان کے استحکام میں بڑی مفید مدد کی۔ مصر اور سوڈان کی مہموں میں بھی نواب صاحب نے بڑی وفاداری سے اپنی خدمات

پیش کیں اور پنجاب کے دوسرے حکمران رؤسا کی طرح انہوں نے بھی ایک خاص فوج اس غرض سے تیار کی کہ جب کبھی امپیریل سروس کے واسطے ضرورت ہو یہ فوج ریاست کی حدود سے باہر جا کر خدمت کرے۔ شروع میں یہ فوج صرف ۱۰۰ سوار اور ۴۰۰ پیادوں سے مرتب ہوئی تھی۔

جب ۱۸۸۰ء میں جناب لارڈ رپن صاحب بہادر بالقابہ ریاست میں تشریف لائے تو اس موقع پر نواب صاحب کو مذکورہ بالا حسن خدمات کے صلہ میں جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا معزز خطاب ملا۔ نواب صادق محمد خاں صاحب رابع بیس سال حکومت کر لینے کے بعد ۱۸۹۹ء میں دنیا سے عالم آخرت کی طرف رحلت فرما ہوئے۔ ان کی حکومت کے چند آخری سال قابل اطمینان نہ تھے جن میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی فضول خرچی نے ریاست کے انتظام اور اس کے خزانہ دونوں کو بڑا ضعف پہنچایا اور وہ اپنے بعد بہت سا ذاتی قرضہ چھوڑ گئے۔ کرنل ایل۔ جے۔ ایچ گرے صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی نے جو نواب محمد بہاول خاں صاحب خامس کے زمانہ نابالغی میں ریاست کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے تھے اپنے زمانہ انتظام میں یہ سارے قرضے اتار دیئے۔

بزرگ باپ کی رحلت کے وقت نواب محمد بہاول خاں صاحب خامس کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی۔ ۱۹۰۳ء میں حضور لارڈ کرزن نے ان کو پورے اختیارات دیئے اور اسی سال میں ریاست بہاولپور بھی ریاست ہائے پھلکیان کی ایجنسی کے ماتحت کی گئی۔ مرحوم نواب صاحب نے اپنے تھوڑے سے عہد حکومت میں ثابت کر دکھایا کہ وہ ایک ہونہار، مستعد اور لائق منتظم حکمران ہیں لیکن حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر وطن واپس آتے ہوئے فروری ۱۹۰۷ء میں بندرگاہ عدن پر ان کی قبل ازوقت موت سے ریاست کو بہت نقصان پہنچا۔ نواب صاحب مرحوم کے شیر خوار لڑکے صادق محمد خاں صاحب (ولادت ۱۹۰۴ء) ان کے جانشین ہوئے۔ (۳)

نواب صادق محمد خاں صاحب نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا اور آزادی کے بعد بہاولپور کا الحاق پاکستان کے ساتھ کر لیا، تاہم ریاست کی زرخیز ترین زمینوں پر امیر بہاولپور کا قبضہ رہا۔ ایوب حکومت نے زرعی اصلاحات کے ذریعے نہ صرف تمام زمینوں پر ان کو اور ان کے خاندان کو قابض رہنے کی اجازت دے دی بلکہ مویشی فارم کھولنے کے لئے مزید بیس ہزار ایکڑ دے دیئے۔ (۴)

۱۹۵۵ء تک بہاولپور ایک آزاد یونٹ کے طور پر پاکستان کا حصہ رہی اور امور خارجہ، دفاع اور کرنسی کے علاوہ دیگر تمام امور میں خود مختار رہی۔ ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کے قیام کے بعد بہاولپور کو صوبہ مغربی پاکستان میں شامل کر لیا گیا۔(۵) ۱۹۷۰ء میں جب ون یونٹ کا خاتمہ ہوا تو اہل بہاولپور نے مطالبہ کیا کہ ان کا سابقہ تشخص بحال کیا جائے مگر حکومت پاکستان نے اس ریاست کو صوبہ پنجاب میں شامل کر دیا۔ تب سے اب تک یہ ریاست صوبہ پنجاب ہی کا حصہ

ہے۔

اسی دوران ۲۴ر مئی ۱۹۶۶ء کو نواب الحاج سر صادق محمد خاں عباسی وفات پا گئے اور نواب الحاج محمد عباس خاں عباسی ان کے جانشین قرار پائے۔ نواب الحاج محمد عباس خاں عباسی ۵۲-۱۹۵۱ء میں بہاولپور کی مجلس قانون ساز کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں جب قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں وہ ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن بن گئے۔ جولائی ۱۹۷۵ء سے جولائی ۱۹۷۷ء تک وہ پنجاب کے گورنر رہے لیکن جنرل ضیاء الحق کے برسراقتدار آنے کے بعد وہ ان کے ہاتھ مضبوط کرنے لگے اور ان کی کابینہ میں حج، اوقاف اور مذہبی امور کے وفاقی وزیر بن گئے۔

نواب سر صادق محمد خاں عباسی کے کئی بیٹے ہوئے جن میں سے شہزادہ ہارون رشید عباسی، لیفٹیننٹ جنرل صادق الرشید محمد عباسی اور شہزادہ سعید الرشید محمود عباسی نے کسی حد تک سیاست کے میدان میں نام کمایا۔

شہزادہ ہارون رشید عباسی مختلف ممالک میں پاکستان کے سفیر رہے۔ لیفٹیننٹ جنرل صادق الرشید محمد عباسی ۱۹۷۸ء میں سندھ کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور ۱۹۸۰ء میں سندھ کے گورنر بنائے گئے اور اپریل ۱۹۸۴ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ جبکہ شہزادہ سعید الرشید محمود عباسی باقاعدہ طور پر سیاست میں فعال رہے۔ انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز مسلم لیگ سے کیا۔ تاہم ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہوں نے آزادانہ طور پر حصہ لیا۔ پیپلزپارٹی کی حکومت کے قیام کے بعد ان کے بڑے بھائی نواب الحاج محمد عباس عباسی صوبہ پنجاب کے گورنر بنے اور وہ خود ۱۷ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کو پاکستان پیپلزپارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۵ء میں انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کا اور ۱۹۷۶ء میں سیاحت کا وزیر مملکت بنایا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں وہ ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۲ء میں جب مجلس شوریٰ کا قیام عمل میں آیا تو ان کے ایک اور بڑے بھائی جنرل ضیاء کے معتمد ساتھیوں میں شامل ہو چکے تھے چنانچہ انہوں نے بھی مجلس شوریٰ میں شمولیت اختیار کی اور اس ادارے کے وائس چیئرمین منتخب ہوئے۔ (۶)

۱۹۸۵ء میں انہوں نے غیر جماعتی انتخاب میں حصہ لیا اور کامیابی کے بعد جونیجو حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے واپس پیپلزپارٹی کا رخ کیا اور اس پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ وہ اپنے بھتیجے شہزادہ صلاح الدین عباسی کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔(۷) ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء کے انتخاب میں انہوں نے حصہ ہی نہیں لیا۔ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا مگر کامیاب نہ ہو سکے (۸)

شہزادہ صلاح الدین عباسی نواب الحاج محمد عباس عباسی کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں پہلی مرتبہ حصہ لیا اور اپنے چچا سعید الرشید محمود عباسی کو شکست

دے کر قومی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۹) ۱۹۸۹ء میں جب بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوئی تو وہ پیپلز پارٹی کے کیمپ میں تھے مگر بعد میں وہ آئی جے آئی میں چلے گئے اور انہوں نے آئی جے آئی کے ٹکٹ پر ہی ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں حصہ لیا۔ اس مرتبہ ان کے مدمقابل ان کے چچا زاد بھائی صاحبزادہ محمد عثمان عباسی تھے۔ جنہیں انہوں نے تقریباً ساڑھے نو ہزار ووٹوں سے شکست دی اور ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیابی حاصل کی۔ (۱۰) ۱۹۹۳ء کے انتخاب میں شہزادہ صلاح الدین عباسی کو پی ایم ایل (این) اور صاحبزادہ محمد عثمان عباسی کو پی ایم ایل (جے) کی حمایت حاصل تھی۔ اس مرتبہ بھی یہ معرکہ صلاح الدین عباسی کے ہاتھ رہا (۱۱)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں صلاح الدین عباسی نے اپنی کامیابی کا تسلسل جاری رکھا تاہم ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں وہ گریجویشن کی شرط کی وجہ سے حصہ نہ لے سکے۔ انہوں نے ۲۰۰۱ء میں ضلعی ناظم کا انتخاب لڑا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکے تھے (۱۲)

صاحبزادہ محمد عثمان عباسی اس سے پہلے ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخاب میں رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۸۸ء کے انتخاب میں انہوں نے اسی نشست پر پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا مگر آئی جے آئی کے عبداللہ خان ڈاہر کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۱۳) ۱۹۹۰ء کے انتخاب میں انہوں نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی کے لئے تو ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے مگر وہ پی پی ۲۱۹ بہاولپور ۲ سے صوبائی اسمبلی کے رکن ضرور منتخب ہو گئے۔ (۱۴) انتخاب میں کامیابی کے بعد پہلے تو وہ نواز کیمپ میں رہے مگر ۱۸ اپریل ۱۹۹۲ء کے بعد وہ منظور وٹو کے کیمپ میں چلے گئے اور پنجاب اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر منتخب ہوئے۔ (۱۵) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں بھی انہوں نے قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ بدقسمتی سے دونوں ہی نشستوں پر ناکامی سے دوچار ہوئے۔ قومی اسمبلی کی نشست پر، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، انہیں شہزادہ صلاح الدین عباسی نے ہرایا۔ جب کہ صوبائی نشست پر انہیں سردار محمد عبداللہ ڈاہر نے شکست دے دی (۱۶) ۱۹۹۷ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا اور سردار محمد عبداللہ ڈاہر کو شکست دے کر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۷) صاحبزادہ محمد عثمان عباسی کے صاحبزادے صاحبزادہ عمر دراز عباسی نے ۲۰۰۱ء میں تحصیل ناظم اور ۲۰۰۵ء میں بہاولپور کے ضلعی ناظم کا انتخاب لڑا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکے تھے (۱۸)

شہزادہ صلاح الدین عباسی اور صاحبزادہ محمد عثمان عباسی کے پھوپھی زاد بھائی صاحبزادہ فاروق انور عباسی نے ۱۹۸۵ء میں سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ ۱۹۸۵ء میں وہ سید تابش الوری کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ بعد ازاں وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور صوبائی پارلیمانی سیکرٹری بنائے گئے۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑا مگر

کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۹) ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء دونوں عام انتخاب میں انہوں نے این اے ۱۴۲ بہاولپور ۲ سے انتخاب لڑا اور دونوں ہی میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۹۰ء میں ان سے شکست کھانے والوں میں شہزادہ مامون الرشید عباسی بھی شامل تھے (۲۰) جب کہ ۱۹۹۳ء میں ان سے ہارنے والوں میں سرفہرست نام طارق بشیر چیمہ کا تھا (۲۱) صاحبزادہ فاروق انور عباسی نے ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں بھی کامیابی حاصل کی (۲۲) انہیں وزارت محنت و افرادی قوت کا پارلیمانی سکریٹری مقرر کیا گیا تھا مگر بعض وجوہ کی بنا پر انہوں نے یہ عہدہ سنبھالنے سے معذرت کر لی (۲۳)

حوالہ جات

۱۔ سرپیل ایچ گرفین، کرنل میسی۔ تذکرہ رؤسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۶۵۷ تا ۶۶۱

۲۔ کرل چارلس میسی۔ روسائے بااختیار و خاندان نامی۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس) لاہور۔ حصہ اول۔ ص ۱۱ تا ۱۳

۳۔ سرپیل ایچ گرفین، کرنل میسی، تذکرہ روسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۶۶۴۔۶۶۵

۴۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۹۹، ۱۰۰

۵۔ بریگیڈیئر نذیر علی شاہ۔ صادق نامہ (دی ہسٹری آف بہاولپور اسٹیٹ) لاہور۔ ص ۱۳۹

۶۔ صاحبزادہ محمد قمرالزماں عباسی۔ بغداد سے بہاولپور۔ لاہور۔ ص ۱۱۷، ۱۶۱، ۱۶۷ تا ۱۷۹

۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۳۰۴، ۳۰۵

۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۶

۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۰۴

۱۰۔ لوکل ورسز سیٹلر، روزنامہ دی نیشن لاہور الیکشن ۹۳ اسپیشل۔ ۲۲/اگست ۱۹۹۳ء

۱۱۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۲۹۵

۱۲۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۰۵

۱۳۔ سید احمد تیمور ناصر۔ بہاولپور ڈویژن کی ۲۳ نشستوں پر انتخابی معرکہ۔ روزنامہ کائنات بہاولپور۔ مورخہ ۳۰/نومبر ۱۹۸۸ء۔ (اشاعت خصوصی)

۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۶۲، ۲۵۵

۱۵۔ لوکل ورسز سیٹلڈ۔ روزنامہ دی نیشن لاہور۔ الیکشن ۹۳ء اسپیشل۔ ۲۲/اگست ۱۹۹۳ء

۱۶۔ سعید احمد۔ بہاولپور ڈویژن۔ پندرہ روزہ حقیقت بہاولپور۔ ۱۶/ تا ۳۱/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۷،
۲۱۹

۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ، جلد دوم۔ ص ۳۹۶

۱۸۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۷/ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۱۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۰۷، ۳۰۸

۲۰۔ احمد سلیم۔ رولرز آف بہاولپور۔ ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۹/-۱۵/ ستمبر ۱۹۹۳ء۔
ص ۱۳۔

۲۱۔ گزٹ آف پاکستان۔ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۲۸

۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۶

۲۳۔ ارشاد امین۔ پارلیمینٹ بک ۹۷ء۔ (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۱۶۲

قریشی

انگریز نے اس سرزمین پر قدم رکھا تو ہمارے علماء دو طبقوں میں بٹ گئے۔ ایک طبقہ نے اسے "کافر" اور "دجال" قرار دے کر علم جہاد بلند کر دیا۔ دوسرے نے اس کی خدمت و خوشامد کو اپنا شعار بنایا۔ پہلے طبقے کو اپنے عقائد کی سزا بھگتنا پڑی۔ انگریز نے اس کے رہنماؤں کو توپوں کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا۔ دوسرا طبقہ فائدہ میں رہا۔ اس نے دین فروشی کے عوض بڑی بڑی زمینیں اور جاگیریں انعام میں پائیں۔ گورمانیوں اور گیلانیوں کی طرح ملتان کے مخدوم قریشیوں کا شمار اسی طبقہ میں ہوتا ہے۔

مخدوم قریشیوں کے بزرگ شیخ بہاؤ الدین تھے جن کے علم و عرفان کے مداح تمام مسلمان ہیں اور جن کے مریدوں کا سلسلہ بھی بہت وسیع ہے۔ وہ تحصیل لیہ میں کوٹ کھروڑ کے مقام پر ۱۱۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ شجرہ نسب کے لحاظ سے وہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے چچا اسد کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے مورث سلطان حسین ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آئے اور لیہ میں جا کر آباد ہو گئے۔ شیخ بہاؤ الدین بچپن ہی سے درویشانہ مزاج رکھتے تھے۔ وہ گھر بار چھوڑ کر خراسان چلے گئے۔ جہاں انہوں نے شہاب الدین سہروردی کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد وہ اسلامی ممالک کی سیاحت کرتے رہے۔ آخر ۱۲۲۲ء میں واپس ہندوستان پہنچے اور ملتان جا کر آباد ہو گئے۔

شیخ بہاؤ الدین کے علم و فضیلت کی شہرت دور دور تک پھیلی تو شمس تبریز بھی ادھر آ نکلے۔ جب شیخ کو پتہ چلا تو انہوں نے دودھ کا ایک لبالب پیالہ شمس تبریز کو بھیجا۔ جس میں اشارا یہ مقصود تھا کہ ملتان میں اب کسی اور فقیر یا درویش کی گنجائش نہیں ہے۔ شمس تبریز نے دودھ پر ایک پھول رکھ کر پیالہ واپس کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ نہ صرف گنجائش موجود ہے۔ بلکہ نووارد کی خوشبو شیخ سے بھی زیادہ پھیلے گی۔ اس پر شیخ برافروختہ ہو گئے۔ انہوں نے حکم دیا کہ ملتان کا کوئی شہری شمس تبریز سے تعاون نہ کرے۔ شمس تبریز خود تو بے نیاز تھے لیکن ان کے ہمراہی کو بھوک

لگی تو اس نے شور مچایا۔ اس پر شمس نے جنگل کی بکریوں کو آواز دی۔ وہ دوڑتی ہوئی آئیں اور دودھ کے لئے اپنے تھن پیش کر دیئے۔ شمس نے ان میں سے ایک بکری کو ذبح کیا اور اپنے نوجوان رفیق کو شہر بھیجا کہ کسی سے آگ لے آئے تاکہ گوشت پکایا جائے۔ لیکن شہر میں کوئی شخص بھی شمس تبریز یا اس کے ہمراہی سے بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ ایک دوکاندار نے اس کے منہ پر دودھ کا برتن دے مارا وہ روتا ہوا اپنے پیر کے پاس پہنچا۔ شمس تبریز نے بلند آواز سے کہا۔

"اے شمس (سورج) تو ہی قریب آ کہ میں تیری حرارت سے کھانا پکاؤں۔ یہاں کے لوگ تو مجھے کھانے سے بھی محروم رکھنا چاہتے ہیں"۔ کہتے ہیں اس پر سورج قریب آگیا۔ لیکن کھانا تیار ہونے کے بعد بھی ملتان کی فضا میں ٹھہرا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ملتان میں وہ باقی مقامات کی بہ نسبت ایک نیزہ نیچے ہے۔

روایات کے مطابق اس واقعہ کے بعد شیخ بہاؤ الدین تقریباً ایک سو برس تک ملتان میں مقیم رہے اور رشد و ہدایت کی روشنی پھیلاتے رہے۔ ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔(۱)

سکھوں کے عہد حکومت میں ملتان کی بہت سی درگاہوں کی بیش بہا جاگیریں جو ان درگاہوں کے اخراجات کے لئے ملی تھیں ضبط ہو گئیں۔ ۱۸۱۸ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملتان کو فتح کر کے وہاں کی تمام زیارتوں کے لئے مجموعی طور پر ۳۵۰۰ کے نقد وظائف مقرر کر دیئے اور دیوان ساون مل نے یہ وظائف اور گھٹا کر صرف ۱۶۰۰ روپیہ رہنے دیئے۔ سکھ دربار کے دور دورہ میں ان درگاہوں کے متعلق اراضی کا مالیہ نقد وظیفے اور نذرانہ کی منہائی کے بعد ۲۰۳۰ روپیہ ہوتے تھے۔ ۴۹-۱۸۴۸ء کے بلوہ کے تمام دوران میں مخدوم شاہ محمود نے گورنمنٹ کی خیر خواہی ظاہر کی اور اس میں کلام نہیں کہ مخدوم ممدوح کو سکھوں کے ساتھ محبت کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ مخدوم نے اپنے اثر و رسوخ سے اور ان خبروں سے جو اس نے دیں انگریز حکومت کو بہت فائدہ پہنچایا۔ چنانچہ الحاق پنجاب کے موقع پر ملتان کی زیارتوں کے وظائف بحال رکھے گئے۔ یعنی اچھا برتاؤ رکھنے کی شرط پر ۷۰۰ روپیہ مالیت کی اراضی بطور علی الدوام جاگیر کے دی گئی اور ۱۳۰۰ روپیہ کا نقد وظیفہ مخدوم شاہ محمود کی حین حیات کے لئے عطا کیا گیا۔ نیز ضلع ساہی ناتھ کا جہاں مخدوم نے ۱۸۳۴ء میں میوہ دار درخت نصب کئے تھے' ایک چوتھا حصہ بطور ذاتی عطیہ کے اس کے نام دوامًا" واگزار کیا گیا۔

حضرت شیخ بہاؤ الدین قدس سرہ اور حضرت شیخ رکن عالم قدس سرہ کی درگاہوں کو ملتان کے بہت سے محاصروں میں کوئی صدمہ نہیں پہنچا تھا۔ مگر ۱۸۴۸ء کا محاصرہ ان کے لیئے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ چونکہ یہ دونوں قلعے کے اندر واقع تھیں اس لئے محاصرین کی گولیاں اور گولے ان پر گرتے تھے اور یہ تقریباً ویران اور منہدم ہو گئی تھیں۔ ۱۸۵۰ء میں پنجاب گورنمنٹ نے تجویز کی کہ ان دونوں درگاہوں کی از سر نو تعمیر کے لئے دس ہزار روپیہ دیا جائے مگر

گورنمنٹ ہند نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ لیکن چونکہ مخدوم شاہ محمود خود مستعد اور بااثر بزرگ تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے مریدوں سے مدد اور نقد روپیہ لے کر بہت لاگت اور خرچ سے پھر دونوں درگاہوں کو پہلے کی طرح شاندار بنا دیا۔

۱۸۵۷ء میں مخدوم شاہ محمود نے گورنمنٹ کی بڑی اچھی خدمت انجام دی یعنی یہ صاحب کمشنر بہادر کو ان تمام ضروری واقعات کی خبر دیتا رہا جو اس کو معلوم ہوتے رہتے تھے اور غلام مصطفیٰ خاں کے رسالے کے لئے بیس آدمی اور گھوڑے اور کئی آدمی نئی پولیس کے واسطے مہیا کئے۔ اس نے پولیس اور فوج میں اور آدمی بھی دے کر مدد کی اور خود بھی کرنیل ہملٹن صاحب کے ہمراہ پچیس سواروں کے ساتھ باغیوں سے لڑنے گیا۔ کچھ کیمپ کی خدمت بھی اپنے ذمہ لی اور جو اسباب اگلے پڑاؤ پر بھیجا جا رہا تھا اس کی حفاظت کی۔ جنگ کے اس موقع پر مخدوم شاہ محمود کی موجودگی سے باغیوں پر بڑا اثر پڑا۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ خود ان کے مذہب کا ایک نہایت مقتدر آدمی اور پیشوا ان کی بغاوت کے خلاف ہے اپنے دل ہار دیئے۔ ملتان میں بغاوت کرنے والی رجمنٹوں سے ہتھیار چھیننے کے موقع پر مخدوم ممدوح نے مع اپنے مریدین کے صاحب کمشنر بہادر کا ساتھ دیا اور اس پل کی حفاظت کے لئے کمشنر صاحب سے جا ملا۔ جس پر گزر کر لوگ چھاؤنیوں کو جاتے تھے۔ مخدوم کے مریدوں میں سے کوئی بھی باغیوں کے ساتھ شامل نہیں ہوا اور یوں اس کی کارگزاری اور خیر سگالی مخدوم پاک پٹن کی کارروائی اور خیر خواہی سے بڑھ کر رہی کیونکہ پاک پٹن کے مخدوم کے پیرو بلوۂ گوگیرہ کے موقع پر تمام بلوائیوں میں آگے آگے تھے۔ ان خدمات کے صلہ میں مخدوم شاہ محمود کو ۳۰۰۰ روپیہ نقد انعام ملا۔ زیارت کے نقد وظیفہ کا تبادلہ ۱۷۸۰ روپیہ مالیہ کی ایک اراضی جاگیر کے ساتھ کر دیا گیا اور یہ جاگیر ان ۵۵۰ روپیہ مالیت کے آٹھ چاہات کے علاوہ تھی جو مخدوم کو بطور علے الدوام عطیہ کے ملے تھے۔ ۱۸۶۰ء میں وائسرائے ہند کی تشریف آوری لاہور کے موقع پر مخدوم کی ذات خاص کے لئے ایک باغ ۱۵۰ روپیہ سالانہ آمدنی کا عطا ہوا جو "دبھنگی والا باغ" مشہور ہے۔

مخدوم محمود شاہ شیخ حسن شاہ کا فرزند تھا اور بی بی رجی صاحب دختر شیخ محمد غوث نے (جو حضرت شیخ بہاؤ الدین قدس سرہ العزیز سے انیسویں پشت میں تھے) اسے گود میں لیا تھا۔ مخدوم شاہ محمود کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا اور اس کی جگہ اس کا خلف الصدق مخدوم شیخ بہاول بخش حضرات بہاؤ الدین اور رکن عالم قدس اللہ سرہما کی درگاہوں کا سجادہ نشین ہوا۔ محمود شاہ مرحوم مخدوم کو بڑے تزک و شان کے ساتھ حضرت شیخ بہاؤ الدین قدس سرہ کے روضہ کے اندر دفن کیا گیا۔ ہزارہا مسلمان مخدوم کے جنازے کے ساتھ شامل ہوئے اور مقامی عدالتیں اس حادثہ کی وجہ سے مرحوم کے اعزاز کے لئے بند کی گئیں صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے مخدوم شیخ بہاول بخش کی رسم دستار بندی ادا کی اور اس کو ایک شاہانہ خلعت عطا کر کے درگاہوں کا سجادہ نشین مقرر کیا۔

مخدوم بہاول بخش کی شادی احمد پور شرقی واقعہ ریاست بہاولپور کے بزرگ خاندان شیخ بہاول دین کی ایک لڑکی سے ہوئی۔

مخدوم بہاول بخش کے نام اس کے والد کی خاص نو مواضعات کی جاگیر اور باغ بدستور جاری رکھا گیا اور نہر واقع تحصیل میلسی کی چرائی کی آمدنی میں سے بھی کچھ فیصدی اس کا حق مقرر ہوا نیز موضع سیرتھ واقع تحصیل میلسی کے مالیہ کا چوتھا حصہ بھی اس کے خاندان کے لئے بطور علی الدوام عطیہ کے معین ہو گیا۔ دربار لاہور منعقدہ ۱۸۸۰ء کے موقع پر مخدوم بہاول بخش کو خدمات جنگ افغانستان کے صلہ میں ایک خلعت عطا ہوا۔ جنگ مذکور میں اس نے بار برداری کے لئے اونٹ جمع کرنے میں امداد دی تھی اور بذات خود لڑائی میں شامل ہونے کی بھی درخواست کی تھی مگر اس شمولیت کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ مخدوم بہاول بخش کو ۱۸۸۷ء میں آنریری مجسٹریٹ بنایا گیا اور یہ چند سال تک میونسپل کمیٹی کا ممبر رہا۔ یہ پراونشل درباری بھی تھا۔ مخدوم بہاول بخش نے ۱۸۹۶ء میں عالم بقا کا راستہ لیا۔ اس کا بیٹا مخدوم شیخ محمد شاہ اس کی وفات سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔

بہاول بخش کی جگہ اس کا بھائی مخدوم شیخ حسن بخش حضرات شیخ بہاؤ الدین و رکن عالم قدس سرہما کی درگاہوں کا سجادہ نشین اور خاندان کا بزرگ مقرر ہوا۔ مخدوم شیخ حسن بخش ۱۸۹۶ء میں آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوا اور ۱۹۰۵ء میں اسے خان بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ یہ پراونشل درباری تھا۔ چونکہ اس نے اپنے آپ کو بہت سا مقروض کر لیا اس لئے اس کی جائداد کچھ عرصہ کے لئے کورٹ آف وارڈز کے انتظام میں رہی۔ مجسٹریٹ اور میونسپل کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے اس نے بڑی ہی خدمات کیں۔ اس کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا اور اس کا بیٹا مرید حسین جو کئی سال ہوئے کیمل کیڈر میں رسالدار تھا اس کا جانشین ہوا۔ وہ پراونشل درباری، اول درجہ کے اختیارات کا اعزازی مجسٹریٹ، اعزازی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، دیوانی عدالتوں میں حاضری سے مستثنیٰ اور معافی دار تھا۔ اسے ذاتی اعزاز کے طور پر نواب کا خطاب عطا ہوا تھا۔ (۲) ۲۳ر مئی ۱۹۳۶ء کو وہ مخدوم سید راجن بخش شاہ گیلانی کی وفات کے باعث خالی ہونے والی نشست پر سید شیر شاہ گیلانی کو شکست دے کر پنجاب اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا۔ (۳)

مرید حسین قریشی کے اکلوتے بیٹے سجاد حسین قریشی ہیں وہ ۲۴ر ستمبر ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ وہ پکے یونینسٹ تھے مگر اگست ۱۹۴۷ء کے اوائل میں ہوا کا رخ دیکھ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں وہ ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ کامیاب نہ ہو سکے تاہم ۱۹۷۷ء کے انتخابات سے پہلے انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور اس پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۴) جنرل ضیاء کے دور میں انہوں نے پھر اپنی سیاسی وابستگی تبدیل کی اور

جنرل ضیاء کے ہاتھ مضبوط کرنے لگے، بدلے میں جنرل ضیاء نے انہیں مجلس شوریٰ کا رکن بنا دیا۔ جس کے وہ ۱۹۸۵ء تک ممبر رہے ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کے بعد مخدوم سجاد حسین قریشی سینٹ آف پاکستان کے رکن اور ڈپٹی چیئرمین بنے اور ملک سے مارشل لاء کے خاتمے کے بعد ۳۰/ دسمبر ۱۹۸۵ء کو صوبہ پنجاب کے گورنر بنا دیئے گئے۔ (۵) وہ اس عہدے پر دسمبر ۱۹۸۸ء تک فائز رہے۔ ان کے اس عہدے سے ہٹائے جانے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے بے نظیر بھٹو کی ہدایت کے علی الرغم نواز شریف سے پنجاب کی وزارت اعلیٰ کا حلف لینے میں بڑی عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ (۶) انہوں نے ۲۳/ جنوری ۱۹۹۸ء کو ملتان میں وفات پائی۔ انہیں ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریا کی درگاہ میں دفن کیا گیا (۷)

مخدوم سجاد حسین قریشی کے بڑے صاحبزادے مخدوم شاہ محمود قریشی نے سیاست کے میدان میں ۱۹۸۳ء میں قدم رکھا۔ اس برس انہوں نے لوکل باڈی کے انتخابات میں حصہ لیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں وہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۸۶ء میں پاکستان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۸۸ء میں وہ دوبارہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس مرتبہ چوہدری پرویز الٰہی اور منظور وٹو کے ساتھ ساتھ ان کی نظریں بھی پنجاب کی وزارت اعلیٰ پر تھی۔ مگر ان کو فقط منصوبہ بندی کا وزیر بننا ہی نصیب ہو سکا۔ ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں وہ تیسری مرتبہ پنجاب اسمبلی کے رکن بنے۔ اس مرتبہ بھی وہ چوہدری پرویز الٰہی، منظور وٹو اور غلام حیدر وائیں کے ساتھ ساتھ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بننے کے خواہشمند تھے مگر اس مرتبہ قرعہ فال غلام حیدر وائیں کے نام نکلا اور مخدوم شاہ محمود قریشی کو فقط وزارت خزانہ پر اکتفا کرنی پڑی۔ لیکن شاہ محمود قریشی نے اپنے ذہن سے وزارت اعلیٰ کا خواب کبھی نہ جھٹکا۔ ۱۹۹۳ء میں جب غلام حیدر وائیں کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور ہوئی تو شاہ محمود قریشی نے خفیہ طور پر بے نظیر بھٹو سے ملاقات کی۔ لیکن بے نظیر منظور وٹو کی موجودی میں بھلا کیا کر سکتی تھیں۔ یوں معاملہ دبایا گیا۔ تاہم شاہ محمود قریشی اور نواز شریف راہیں ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں (۸) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں شاہ محمود قریشی نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور مخدوم جاوید ہاشمی کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۹)

شاہ محمود قریشی نے ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں اسی نشست پر مخدوم جاوید ہاشمی سے شکست کھائی (۱۰) تاہم ۲۰۰۲ء میں وہ انہیں ہرا کر ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن بن گئے (۱۱) انتخابات کے بعد انہوں نے وزارت عظمیٰ کے عہدے کے لیے انتخاب لڑا لیکن وہ مسلم لیگ (ق) کے میر ظفر اللہ جمالی کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۱۲)

مخدوم سجاد حسین قریشی کے چھوٹے صاحبزادے مخدوم زادہ مرید حسین قریشی نے ۱۹۸۸ء میں

پہلی مرتبہ اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر پی ڈی پی کے امیدوار حاجی خلیل احمد شیخ کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۱۳) ۱۹۹۰ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا یہ فیصلہ درست ثابت ہوا اور وہ حاجی خلیل احمد شیخ کو پندرہ ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دے کر صوبائی اسمبلی کی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۴)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں اپنے بڑے بھائی کی طرح مخدوم زادہ مرید حسین قریشی نے بھی پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ ان کا حلقہ انتخاب تھا پی پی ۱۲۲ ملتان ۷۔ وہ اس انتخاب میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔ (۱۵)

۱۹۹۷ء کے انتخابات میں انہوں نے اس نشست پر ملک مظہر عباس ران سے شکست کھائی (۱۶) تاہم ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔ (۱۷)

مخدوم سجاد حسین قریشی کے چچا شیخ احمد کبیر بھی اپنے زمانے کے معروف گدی نشین تھے اور انہوں نے اپنے بڑے بھائی شیخ مخدوم مرید حسین کے ساتھ ایک سمجھوتے کے تحت اپنے مریدی کے حلقے آپس میں تقسیم کر لئے تھے۔ شیخ احمد کبیر ڈسٹرکٹ بورڈ کے نامزد رکن اور ملتان میونسپل کمیٹی کے منتخب شدہ رکن رہے۔ انہوں نے تحریک عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریکوں کو ناکام بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ (۱۸) ان کے صاحبزادے پیر خورشید احمد قریشی (تاریخ پیدائش۔ ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء) ایچی سن کالج لاہور کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی شادی اپنی تایا زاد بہن اور نواب سر مخدوم مرید حسین قریشی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ (۱۹) انہوں نے ایک مختصر عرصہ سیاست کے میدان میں گزارا اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی کے ممبر رہے۔ (۲۰)

ملتان کے قریشیوں کی ایک اور شاخ بھی عرصہ دراز سے عملی سیاست کے میدان میں ہے۔ اس شاخ کا مورث اعلیٰ شیخ پیر شاہ تھا جو مخدوم سجاد حسین قریشی کے پردادا مخدوم شاہ محمود کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ پراونشل درباری تھا اور چند سال میونسپل کمیٹی ملتان کا آنریری سیکرٹری بھی رہا۔ تحصیل میلسی کے ۳ مواضعات کی جاگیر اس کے نام تھی اس نے کابل کی لڑائی میں محکمہ بار برداری میں امداد دی اور اس کے خدمات کے صلہ میں وائسرائے ہند نے اسے ایک سند عطا کی۔ اس کا انتقال ۱۸۹۷ء میں ہوا اور اس کا بیٹا شیخ ریاض حسین اس کی جگہ پراونشل درباری بنایا گیا۔ شیخ ریاض حسین ۱۸۹۷ء میں ٹوچی فیلڈ فورس میں آنریری اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر مقرر کیا گیا اور علاوہ تمغہ کے اس کی خدمات کے صلہ میں اسے ایک تلوار بھی عنایت کی گئی۔ ۱۸۹۲ء میں اسے آنریری مجسٹریٹ بنایا گیا اور ۱۸۹۲ء میں آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنا کر پولٹیکل کا کام انجام دینے کے لئے ضلع بنوں میں تعینات کیا گیا۔ ۱۹۰۰ء میں اسے خان بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ جنگ عظیم کے دوران میں اس نے کئی چندے دیئے اور بہت سی تعداد رنگروٹوں کی بھرتی کرائی۔ ۱۹۱۵ء میں اسے سی آئی ای کا خطاب دیا گیا اور ۱۹۲۶ء میں اسے

نواب بنا دیا گیا۔ کئی سال تک یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا سینئر وائس چیئرمین رہا۔ مئی ۱۹۳۵ء کے کوئٹہ کے زلزلہ میں نواب ریاض حسین اور اس کا بیٹا کپتان مقبول حسین فوت ہوگئے۔ نواب ریاض حسین کے پانچ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے شیخ بھاون شاہ کو جو ۳۶ جیکب ہارس میں جمعدار تھا۔ جنگ عظیم کی خدمات کے صلہ میں ایک سند ایک تلوار اور ایک تمغہ عطا ہوئے اور اس کا نام گورنمنٹ کے گزٹ میں درج کیا گیا۔ پنجاب گورنمنٹ نے بھی اس کے بھرتی کے کام کی تعریف کی اور اس کے صلہ میں اسے دو مستطیل اراضی اور ایک سند عطا کی۔ نیز کمانڈر انچیف بہادر نے اسے ایک سرٹیفکیٹ عطا کیا۔ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک میں اس نے اپنا تمام زور بل گورنمنٹ کی طرف داری میں صرف کیا۔ اس کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا اور اس کا سب سے بڑا لڑکا شیخ منظور حسین تحصیلدار تھا۔ نواب ریاض حسین کا دوسرا بیٹا ولایت حسین اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور ۱۹۲۹ء میں فوت ہوا اور تیسرا تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ نواب موصوف کا چوتھا بیٹا میجر عاشق حسین ایچی سن کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہاڈسن صاحب کے رسالہ میں شامل ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں اس کو امرت سر میں شورش کے دور کرنے میں مدد دینے کے لئے بھیجا گیا اور یہ ضلع ہوشیار پور کی ببرا کالیوں کی شورش کو مٹانے میں بھی شریک رہا۔ ۱۹۲۶ء میں اسے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کر کے فیروز پور لگایا گیا۔ مگر ۱۹۳۰ء میں اپنے باپ کے عمر رسیدہ ہو جانے کی وجہ سے اس عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور اسے ملتان میں آنریری مجسٹریٹ درجہ اول بنا دیا گیا۔ یہ ملتان میونسپلٹی کا صدر اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر رہے۔ اس کی شادی نواب سر لیاقت حیات خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ نواب ریاض حسین کے سب سے چھوٹے بیٹے کپتان مقبول حسین نے بھی پہلے ایچی سن کالج میں اور بعد میں سینڈ ہرسٹ میں تعلیم پائی تھی۔ اس کو ۱۹۲۴ء میں کمیشن عطا کیا جا کر نمبر ۷ لائٹ کیولری میں لگایا گیا اور اس کی شادی نواب صاحب پٹوری کی بہن سے ہوئی مگر اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ اپنے باپ کے ساتھ کوئٹہ کے زلزلہ میں لاولد فوت ہو گیا۔ (۲۱)

ان بھائیوں میں نواب عاشق حسین قریشی نے عملی سیاست میں قدم رکھا۔ وہ یونینسٹ پارٹی کے پلیٹ فارم سے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخاب کے کچھ عرصہ بعد ایک انتخابی عذرداری کے باعث ان کی رکنیت کالعدم قرار دے دی گئی اور ان کے حریف، مسلم لیگی امیدوار محمد اکرم بوسن کامیاب قرار دے دیئے گئے۔ (۲۲) نواب عاشق حسین قریشی کچھ عرصہ صوبائی وزیر بھی رہے۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء میں لاہور کے فسادات میں وفات پائی (۲۳) نواب عاشق حسین قریشی کے صاحبزادے نواب صادق حسین قریشی ہیں۔ انہوں نے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کی رکنیت سے کیا۔ (۲۴) کہا جاتا ہے کہ ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کے دوران یہ صادق حسین قریشی ہی تھے جنہوں نے ملتان کے قریب ذوالفقار علی بھٹو پر ریلوے

پھاٹک بند کروا کے قاتلانہ حملہ کروایا تھا۔ مگر بھٹو اس حملے سے بال بال بچ نکلے تھے۔ (۲۵) کچھ ہی دنوں بعد صادق حسین قریشی پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور علمدار حسین گیلانی کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۶) پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں وہ نومبر ۱۹۷۳ء سے مارچ ۱۹۷۵ء تک پنجاب کے گورنر اور ۱۱ر جولائی ۱۹۷۵ء سے ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء تک پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ (۲۷) ۱۹۸۵ء میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی ہائی کمان کے اس فیصلے کے باوجود کہ پارٹی کا کوئی رکن انتخاب میں حصہ نہیں لے گا۔ حلقہ پی پی ۱۶۶ ملتان ۱۰ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر بری طرح سے ہار گئے۔ اس حلقے سے پانچ امیدواروں نے انتخاب لڑا تھا۔ جن میں پنجاب کے اس سابق گورنر اور وزیر اعلیٰ کی پوزیشن چوتھی تھی۔ (۲۸) ۲۶ر جون ۲۰۰۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۲۹)

صادق حسین قریشی کے تایا شیخ بہاون شاہ کے پوتے اور فدا حسین قریشی کے صاحبزادے ریاض حسین قریشی پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے این اے ۱۱۵ ملتان ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا اور عوامی اتحاد کے سید حامد سعید کاظمی اور اسلامی جمہوری اتحاد کے بابو فیروز دین انصاری کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب رہے تھے۔ (۳۰) ۱۹۹۰ء میں انہوں نے دوبارہ اسی نشست سے انتخاب لڑا۔ مگر اس مرتبہ انہیں علامہ حامد سعید کاظمی کے ہاتھوں تقریباً ۲۰ ہزار ووٹوں سے شکست اٹھانی پڑی۔ (۳۱) ۱۹۹۳ء میں انہوں نے اسی نشست پر تیسری مرتبہ انتخاب لڑا۔ مگر اس مرتبہ بھی ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ پی ایم ایل (این) کے امیدوار حاجی محمد بوٹا سے تقریباً سترہ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۳۲)

ان انتخابات کے بعد ریاض حسین قریشی خود تو عملی سیاست سے دست بردار ہو گئے لیکن ان کے صاحبزادے محمد معین الدین ریاض قریشی نے ۱۹۹۷ء میں قومی اسمبلی اور ۲۰۰۲ء میں پناجب اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ۱۹۹۷ء میں تو وہ کامیاب نہ ہو سکے (۳۳) البتہ ۲۰۰۲ء میں وہ پی پی ۱۹۴ ملتان ۱ سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۳۴)

مخدوم سجاد حسین قریشی کے بیٹوں کے علاوہ ان کے تین داماد بھی ایک طویل عرصہ سے سیاست کے میدان میں ہیں۔

ان کے ایک داماد پر شجاعت حسنین قریشی ہیں۔ جن کے والد پیر ظہور حسین قریشی پہلے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے پھر ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن رہے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ ایک مرتبہ پھر مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے۔ ان کی سیاسی وابستگی کونسل مسلم لیگ کے ساتھ تھی۔ اور ان کا شمار ممتاز دولتانہ کے کٹر حامیوں میں ہوتا تھا انہوں نے صدارتی انتخابات میں ایوب خان کے بجائے مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا۔ پیر ظہور حسین قریشی، ذوالفقار علی بھٹو

کے کافی قریب تھے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات سے پہلے ہی ان کی وفات ہوگئی۔ تاہم ان کے بیٹے پیر شجاعت کو صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا اور وہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں پیر شجاعت حسنین قریشی کامیاب نہ ہو سکے۔ بعد ازاں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور انہیں مخدوم سجاد حسین قریشی کی جگہ سینٹ کا ٹکٹ دیا گیا۔ (۳۵) پیر شجاعت حسنین قریشی سینٹ کے رکن بن تو گئے مگر جلد ہی انہیں ایک عدالتی فیصلے کے تحت اس نشست پر نا اہل قرار دے دیا گیا۔ (۳۶) بے نظیر بھٹو کے برسراقتدار آنے کے بعد پیر شجاعت حسنین قریشی دوبارہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور انہیں ان کے دوست سردار فاروق احمد لغاری نے سینٹ کا ٹکٹ بھی دلوا دیا مگر وہ شکست کھا گئے۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے انہیں میاں چنوں سے غلام حیدر وائیں کے مقابلے میں ایم پی اے کا ٹکٹ دیا لیکن انتخابات سے چند روز پہلے وہ غلام حیدر وائیں کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ بعد ازاں غلام حیدر وائیں نے جب قومی اسمبلی کی نشست (این اے ۱۲۳ خانیوال ۳) خالی کی تو پیر شجاعت حسنین قریشی نے اس نشست پر ضمنی انتخاب لڑا اور کامیاب ہو کر قومی اسمبلی کے رکن بن گئے۔ (۳۷) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پی پی ۱۷۹ خانیوال ۶ سے انتخاب لڑا اور پنجاب اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۳۸)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں بھی وہ اسی نشست پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۳۹) تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ گریجویشن کی شرط کے وجہ سے شریک نہیں ہو سکے چنانچہ ان کی نشست پر ان کے صاحبزادے پیر ظہور حسین قریشی پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔

۲۰۰۵ء میں انہوں نے اور اکے بیٹے نے اپنی سیاسی وفاداری تبدیل کر کے پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کر لی۔ جس کے صلے میں انہیں میاں چنوں کے تحصیل ناظم کے عہدے پر کامیاب کروا دیا گیا۔ (۴۰)

مخدوم سجاد حسین قریشی کے ایک اور داماد سید افتخار علی بخاری کا تعلق جھنگ کے شاہ جیونہ خاندان سے ہے وہ ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ مارشل لاء کے دور حکومت میں انہیں ڈسٹرکٹ کونسل کے انتخاب میں سیدہ عابدہ حسین کے مقابلے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۸۵ء کے بعد انہوں نے پیپلز پارٹی کو خیر باد کہا جس کا ایک سبب محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیدہ عابدہ حسین سے ملاقات بتائی جاتی ہے۔ جب ان کے ہم زلف پیر شجاعت حسین قریشی کو ایک عدالتی فیصلے کے تحت سینٹ کی رکنیت کا نا اہل قرار دیا گیا تو سید افتخار علی بخاری ان کی جگہ سینٹ کے رکن منتخب ہو گئے۔ سینٹ کا رکن منتخب ہونے کے بعد وہ خزانہ اور منصوبہ بندی کے وزیر مملکت بھی رہے۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر این اے ۲۹ جھنگ ۴ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اپنے مدمقابل سید فیصل صالح حیات کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔

(۴۱)

ادھر مخدوم سجاد حسین قریشی کے ایک اور داماد اور سید علمدار حسین شاہ کے فرزند مخدوم زادہ سید محمد احسن شاہ بھی ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۰ء تک مسلسل صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑتے رہے ہیں ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۰ء دونوں انتخابات میں انہوں نے کامیابی حاصل کی تھی۔ جبکہ ۱۹۸۸ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار سید ناظم حسین شاہ کے ہاتھوں شکست کھا گئے تھے۔(۴۲) ۲۰۰۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (۴۳)

حوالہ جات

۱۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۱۴۵ تا ۱۴۷
۲۔ سر لیپل ایچ گرفین، کرنل میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۴۹۶ تا ۵۰۰
۳۔ کرپال سی یادیو۔ الیکشنز ان پنجاب۔ نئی دہلی۔ ص ۳۴
۴۔ احمد سلیم۔ قریشیز آف ملتان۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ ۱۵ر۔ ۲۱ر جولائی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳
۵۔ پنجاب اسمبلی ۱۹۸۷ء (گولڈن جوبلی سووینیر)۔ لاہور۔ ص ۲۱
۶۔ وکیل انجم۔ سیاست کے فرعون۔ لاہور۔ ص ۱۹۸، ۱۹۹
۷۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۳۴۹
۸۔ احمد سلیم۔ قریشیز آف ملتان۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ ۱۵ر۔ ۲۱ر جولائی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳
۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۸۹
۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۹۲
۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۵۴
۱۲۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۸۱
۱۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور ص ۲۶۳
۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم ص۔ ۲۳۶
۱۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۴۱۸
۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۳۴۴
۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد اول و دوم
۱۸۔ سر لیپل ایچ گرفین، کرنل میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۵۰۰، ۵۰۱

۱۹۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ٦٦۔۱۹٦۵ء۔ لاہور۔ ص ۳۷۲،۳۷۱

۲۰۔ سر لیپل ایچ گرفین، کرنل میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب۔ لاہور جلد دوم۔ ص ۵۰۱

۲۱۔ سر لیپل ایچ گرفین، کرنل میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب۔ لاہور جلد دوم۔ ص ۵۰۱، ۵۰۲

۲۲۔ کرپال سی یادیو۔ الیکشنز ان پنجاب۔ نئی دہلی۔ ص ۹۳، ۱۱٦، ۱۲۴

۲۳۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ٦٦۔۱۹٦۵ء لاہور۔ ص ۴۳۹

۲۴۔ عبداللہ الاثری۔ عالمی معلومات لاہور۔ ص ۴٦

۲۵۔ منیر احمد منیر۔ جو میں نے دیکھا۔ لاہور۔ ص ۲۰۰، ۲۰۱

۲٦۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱٦/ دسمبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۵۰۸۰

۲۷۔ موسیٰ خان جلال زئی۔ کون کون ہے؟ اور کیا کیا ہے؟ لاہور۔ ص ۴۷۹

۲۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۲۸/ مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۵٦۳

۲۹۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی۔ ۲۷/ جون ۲۰۰۰ء

۳۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۵۷

۳۱۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۳۸۴

۳۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۸۷

۳۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۸۸

۳۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۸۵

۳۵۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۷/ اگست ۱۹۹۱ء

۳٦۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۵۴

۳۷۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۷/ اگست ۱۹۹۱ء

۳۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۲۲

۳۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۳۵۷

۴۰۔ اورنگ زیب۔ لاہور نامہ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۹/ تا ۲۵/ ستمبر ۲۰۰۵ء اور ویب سائٹ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ www.ecp.gov.pk

۴۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۵۴

۴۲۔ گزٹ آف پاکستان۔ ۲۸/ مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۵۳۔ ۳/ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳٦۴۲۔ ۱۱/

نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۲۹۵
۴۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۰۸

قصوری

قصور سے تعلق رکھنے والا ایک اور خاندان بھی پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بے حد معروف ہے اور ہر دور میں اس کا کوئی نہ کوئی فرد سیاست کے میدان میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ یہ سیاسی خاندان مولانا عبدالقادر قصوری کا خاندان ہے۔

مولانا عبدالقادر قصوری ۱۸۶۶ء میں ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں دلاور چیمہ میں پیدا ہوئے تھے۔ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے عصری تعلیم بھی حاصل کی اور لاہور میں وکالت کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد قصور میں اقامت اختیار کی اور اسی شہر میں اپنی پریکٹس کا آغاز کیا۔ ابتدا میں مولانا عبدالقادر قصوری، سرسید احمد خان کی آل انڈیا ایجوکیشن کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ (۱) مگر پھر تحریک خلافت اور انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ منسلک ہو گئے وہ پنجاب خلافت کمیٹی کے صدر اور انڈین نیشنل کانگریس کے ورکنگ کمیٹی کے رکن اور ۱۰ برس پنجاب کانگریس کے صدر رہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری نے مسلمانان برصغیر کے لیے ہر دور میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۶ء میں مسجد شہید گنج کے حصول کے لیے مولانا ظفر علی خان نے جب مجلس اتحاد ملت قائم کی تو مولانا عبدالقادر قصوری ہی اس کے صدر بنائے گئے تھے۔ (۲) مولانا عبدالقادر قصوری نے اپنا آخری وقت لاہور میں گزارا۔ جہاں ۱۶ر نومبر ۱۹۴۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اگلے روز انہیں قصور میں دفن کیا گیا۔ (۳)

مولانا عبدالقادر قصوری کے سب سے بڑے صاحبزادے مولانا محی الدین احمد قصوری تھے۔ وہ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ کچھ عرصہ متفرق مشاغل میں بسر کرنے کے بعد کلکتہ چلے گئے جہاں انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں اقدام کے نام سے ایک عالی شان اخبار جاری کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران یہ اخبار بند ہو گیا۔ تو وہ واپس قصور آ گئے جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد کچھ عرصہ انہوں نے قید و بند میں گزارا۔ (۴)

مولانا محی الدین احمد قصوری کے فرزند، معین قریشی ہیں جو عالمی بنک کے اعلیٰ ترین

عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ ۲۶/جون ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے تھے۔ (۵) معین قریشی گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل ہیں۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور فل برائٹ اسکالر شپ پر انڈیانا یونیورسٹی سے اکنامکس میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ وہ حکومت پاکستان میں خزانہ اور منصوبہ بندی کے متعدد ذمہ دارانہ مناصب پر فائز رہے اور پھر ۱۹۵۸ء انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ سے وابستہ ہو گئے۔(۶)

۱۸/ جولائی ۱۹۹۳ء کو جب یہ فیصلہ ہوا کہ غلام اسحٰق خان اور میاں نواز شریف دونوں اپنے عہدوں سے استعفیٰ دیں اور اکتوبر ۱۹۹۳ء میں عام انتخابات منعقد ہوں تو اس درمیانی عرصہ کے لیے جس شخصیت کو نگراں وزیر اعظم مقرر کیا گیا وہ یہی معین قریشی تھے۔(۷)

مولانا عبدالقادر قصوری کے دوسرے فرزند اور مولانا محی الدین احمد قصوری کے چھوٹے بھائی مولانا محمد علی قصوری تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن اور کیمبرج یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ۱۹۱۴ء میں وہ کچھ عرصہ کے لیے وطن واپس آئے مگر جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے واپس انگلستان نہ جاسکے یوں وہ بیرسٹری کی تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ (۸)

کچھ دنوں بعد وہ افغانستان چلے گئے جہاں امیر حبیب اللہ خان نے انہیں حبیبہ کالج میں پرنسپل مقرر کیا۔ ان کے افغانستان جانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ افغان حکومت کی مدد سے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کروائیں مگر وہاں جا کر انہیں اندازہ ہوا کہ افغانستان تو خود سازشی ماحول، تعلیمی پسماندگی اور تہذیبی پستی سے آزاد کروائے جانے کا حق دار ہے۔ چنانچہ ان حالات سے مایوس ہو کر وہ یاغستان چلے گئے اور وہاں قبائلی جاں سپاروں کو انگریزوں کے خلاف بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ مولانا محمد علی قصوری کی ان کوششوں نے انگریزوں کو پریشان ضرور کیا اور اسے سرحدوں پر فوجیں تعینات کرنے کے لیے کثیر مصارف برداشت کرنے پڑے تاہم ان کوششوں کا کوئی مثبت اور بڑا نتیجہ برامد نہیں ہوا اور مولانا محمد علی قصوری کو بے نیل مرام وطن واپس لوٹنا پڑا۔(۹)

وطن واپسی کے بعد مولانا محمد علی قصوری سیاست کے میدان سے دور ہو گئے اور تجارت اور قرآن پاک کی درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی شادی ۲۶/نومبر ۱۹۲۲ء کو ریاست لوہارو کے نواب علاء الدین علائی کی نواسی سے ہوئی تھی۔ نواب سید میر احمد شفیع نیر فرید آبادی ان کے سسر تھے جبکہ اردو کے مشہور مترجم سید ہاشمی فرید آبادی، معروف شاعر سید مطلبی فرید آبادی اور ممتاز مزاح نگار سید ابو تمیم فرید آبادی ان کے برادران نسبتی تھے۔ مولانا محمد علی قصوری کی اولاد نرینہ نہ تھی۔ انہوں نے ۱۲/جنوری ۱۹۵۶ء کو وفات پائی (۱۰) مولانا محمد علی قصوری

کے درس قرآن کے شاگردوں میں ایک مشہور نام جناب ارشاد احمد حقانی کا ہے جو روزنامہ جنگ کے نام ور تجزیہ نگار ہیں۔(۱۱)

مولانا عبدالقادر قصوری کے سب سے چھوٹے فرزند میاں محمود علی قصوری ہیں۔ وہ ۳۱/اکتوبر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے مگر ابھی ان کی عمر صرف چار برس تھی کہ وہ اپنی والدہ کے سائے سے محروم ہو گئے۔

میاں محمود علی قصوری نے پونا، بمبئی اور لاہور میں تعلیم حاصل کی اور پھر ۱۹۳۲ء میں بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لندن کے گریزان میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور وطن واپس آ گئے۔ لندن میں قیام کے دوران ان کی ملاقات چودھری رحمت علی سے بھی ہوئی۔ قائداعظم بھی ان دنوں لندن ہی میں مقیم تھے اور لندن ہی میں پریوی کونسل میں وکالت کر رہے تھے۔ چنانچہ میاں محمود علی قصوری، میاں ارشد حسین کے ساتھ ان سے ملے اور ان کو چودھری رحمت علی کے مجوزہ مطالبہ پاکستان کے بارے میں آگاہ کیا تو قائداعظم کہنے لگے پہلے بھی بہت سے لوگ ان سے چودھری رحمت علی کے ان مطالبات کا ذکر کر چکے ہیں مگر یہ سوائے پاگل پن کے کچھ نہیں ہے۔ میاں محمود علی قصوری بتاتے تھے کہ قائداعظم نے چودھری رحمت علی کے منصوبہ پاکستان کے بارے میں جو جملہ ادا کیا تھا وہ یہ تھا "Young man, Forget about it. It's Midsummer madness:"

میاں محمود علی قصوری ۱۹۳۵ء میں وطن واپس لوٹے اور لاء کالج میں درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ڈاکٹر شیخ محمد عالم کے ساتھ (جنہیں برصغیر کی سیاسی تاریخ کا پہلا لوٹا کہا جاتا ہے) منسلک ہو کر وکالت کے اسرار ورموز سیکھنے لگے۔ جلد ہی بطور وکیل ان کی شہرت پھیلنے لگی اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں اپنی وکالت کو وقت دینے کے لیے لاء کالج سے مستعفی ہونا پڑا۔ اسی دوران ۱۹۴۲ء میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے پر آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ابوالکلام آزاد ان کے والد کے پرانے دوستوں میں سے تھے اور ان دنوں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے۔ انہوں نے میاں محمود علی قصوری کا رجحان دیکھتے ہوئے انہیں مسلم لیگ میں شمولیت کا مشورہ دیا تھا۔

اسی دوران میاں محمود علی قصوری رشتہ ازواج میں منسلک ہو گئے۔ ان کی شادی نواب

آف لوہارو، سر امیر الدین احمد خان کی پوتی روشن آرا سے ہوئی۔ ان کے سسر کا نام نواب زادہ اعزاز الدین خان تھا یوں جمیل الدین عالی رشتے میں میاں محمود علی قصوری کی اہلیہ کے چچا ہوتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد میاں محمود علی قصوری نے میاں افتخار الدین کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا اور ایک نئی سیاسی جماعت ''آزاد پاکستان پارٹی'' کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۵۵ء میں اس سیاسی جماعت نے پاکستان کی دیگر ہم خیال جماعتوں کے ساتھ مل کر نیشنل عوامی پارٹی قائم کی۔ جو اپنے نام کے اختصار نیپ کے نام سے مشہور ہوئی۔ محمود علی قصوری اس سیاسی جماعت کے سکرٹری منتخب کیے گئے۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے ذوالفقار علی بھٹو کے پر زور اصرار پر میاں محمود علی قصوری، پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۱ء میں وہ لاہور سے بھٹو کی خالی کردہ نشست پر ضمنی انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور دسمبر ۱۹۷۱ء مین پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہونے پر وزیر قانون اور پارلیمانی امور کے منصب پر فائز ہوئے۔ اس عہدے پر کام کرتے ہوئے ان کا سب سے بڑا کارنامہ عبوری آئین کی تیاری اور نفاذ تھا (۱۳)۔ مگر جلد ہی ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ان کے اختلافات نمایاں ہونے لگے اور ۴/اکتوبر ۱۹۷۲ء کو وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ ۱۶/فروری ۱۹۷۳ء کو انہیں پارٹی سے خارج کردیا گیا۔ تقریباً چار ماہ بعد ۷/جون ۱۹۷۳ء کو میاں صاحب نے تحریک استقلال میں شمولیت کا اعلان کر دیا (۱۴)۔

تحریک استقلال کے ساتھ میاں محمود علی قصوری کی وابستگی ان کی وفات تک جاری رہی۔ وفات کے وقت وہ اس جماعت کے سینیئر نائب صدر تھے۔ اس دوران تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) کا پہلا اجلاس ان کی اقامت پر منعقد ہوا۔ ۱۳/اپریل ۱۹۸۷ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

میاں محمود علی قصوری زندگی بھر شہری آزادیوں اور انسانی حقوق کے لیے قانونی جنگ لڑتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں انہوں نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں میاں افتخار الدین کے اس مقدمے کی پیروی کی جس میں ان کی جائیداد اور کاریں ضبط کرلی گئی تھیں۔ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ہفت روزہ نیازمانہ کے خلاف مقدمے

میں کمیونسٹ پارٹی کی وکالت کی۔ ۱۹۵۳ء میں انہوں نے قادیانیوں کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کے دوران گرفتار ہوئے عبدالستار نیازی اور مولانا مودودی کے مقدمات لڑے۔ وہ معروف آئینی مقدمے مولوی تمیز الدین کیس میں بھی مولوی تمیز الدین کی جانب سے پیش ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں نواب زادہ نصراللہ خان کے مقدمے میں صفائی کے وکیل بنے اور حیدر آباد سازش کیس میں نیپ کے رہنماؤں خان عبدالولی خان اور غوث بخش بزنجو کی جانب سے پیش ہوئے (۱۵) وہ کئی قومی اور بین الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیموں کے عہدے دار تھے۔ وہ ویت نام میں امریکی جنگی جرائم کی تحقیقات کرنے والے مشہور عالم برٹرینڈ رسل ٹریبونل کے رکن بھی رہے تھے (۱۶)۔

میاں محمود علی قصوری کی زندگی ہی میں ان کے صاحبزادے خورشید محمود قصوری، سیاست کے میدان میں نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔

وہ گورنمنٹ کالج لاہور، کیمبرج یونیورسٹی، آکسفورڈ یونیورسٹی، یونیورسٹی آف پیرس، یونیورسٹی آف نائس (فرانس) اور گریز ان (لندن) کے فارغ التحصیل ہیں۔ انہوں نے اپنے والد کے دوش بہ دوش تحریک استقلال سے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا اور اس جماعت کے سیکریٹری جنرل رہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے این اے ۸۳ لاہور ۳ سے پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر پاکستان پیپلز پارٹی کے میاں احسان الحق کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۱۷)۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں وہ پارٹی ڈسپلن کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر این اے ۹۸ لاہور ۷ سے انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ بھی ان کے ستارے یاوری نہیں کر سکے (۱۸) ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات کے انعقاد کے وقت وہ پاکستان ڈیموکریٹک الائنس کے سیکریٹری تھے مگر انہوں نے انتخاب میں حصہ نہیں لیا (۱۹) ۱۹۹۳ء میں جب غلام اسحٰق خان نے نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر کے میر بلخ شیر مزاری کو نگراں وزیراعظم مقرر کیا تو خورشید محمود قصوری ان کی کابینہ میں تحریک استقلال کی جانب سے وزیر بنے (۲۰) ۱۹۹۳ء کے انتخابات سے کچھ عرصہ قبل وہ تحریک استقلال چھوڑ کر پاکستان مسلم لیگ (ن) میں شامل ہو گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے این اے ۱۰۶ قصور ا سے انتخاب لڑا۔ مگر اس مرتبہ بھی ناکامی ان کا مقدر بنی انہیں شکست دینے والے امیدوار تھے سردار آصف احمد علی جو پاکستان مسلم لیگ (ج) کے امیدوار تھے (۲۱)۔ ۱۹۹۷ء میں انہوں نے اسی حلقہ سے دوبارہ انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کا ستارہ عروج پر تھا اس لیے خورشید محمود قصوری، بڑی آسانی سے سردار آصف احمد علی کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے (۲۲) جلد ہی پاکستان مسلم لیگ (ن) کی قیادت سے ان کے اختلافات نمایاں ہونے شروع ہو گئے چنانچہ ۱۹۹۹ء میں جب جنرل پرویز مشرف نے

میاں نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹا تو اس کے بعد انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ق) کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۲۰۰۲ء کے عام انتخاب میں انہوں نے قصور سے قومی اسمبلی کی دونشستوں (این اے ۱۳۹ اور این اے ۱۴۰) سے انتخاب لڑا۔ پہلی نشست پر وہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے چودھری منظور احمد سے شکست کھا گئے تاہم دوسری نشست پر وہ آزاد امیدوار مولانا معین الدین لکھوی کو شکست دے کر دوبارہ قومی اسمبلی کے رکن بن گئے (۲۳)۔

انتخابات کے بعد جب مرکزی حکومت تشکیل دی گئی تو میاں خورشید محمود قصوری کے اعلیٰ خاندانی اور تعلیمی پس منظر کی بناپر انہیں وزارت خارجہ کا قلم دان سونپا گیا (۲۴)۔ میر ظفراللہ جمالی کی کابینہ میں بھی وہ اسی منصب پر فائز تھے۔ شوکت عزیز کی کابینہ میں بھی وہ اسی منصب پر فائز رہے۔

میاں خورشید محمود قصوری کی ایک وجہ شہرت ان کی بیوی مونی قصوری کا قائم کردہ بیکن ہاؤس اسکول سسٹم ہے۔ یہ پاکستان کا سب سے بڑا پرائیویٹ اسکول سسٹم ہے اور اس کا آغاز ۱۹۷۸ء میں ہوا تھا۔ مونی قصوری ۱۹۴۹ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا تعلق چنیوٹ کے ایک کاروباری گھرانے سے ہے (۲۵) وہ مشہور صنعت کار میاں سعید سہگل کی نواسی ہیں اور رفحان انڈسٹری کے بانی حاجی شفیع منوں کی پوتی ہیں (۲۶)۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ ملک۔ داستان خانوادہ میاں محمود علی قصوری۔ لاہور۔ ص ۴۷ تا ۶۳

۲۔ اسد سلیم شیخ۔ انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان۔ لاہور۔ ص ۸۴۵، ۸۴۶

۳۔ عبداللہ ملک۔ داستان خانوادہ میاں محمود علی قصوری۔ لاہور۔ ص ۶۹

۴۔ ایضاً

۵۔ ارشاد احمد حقانی، سیاسی خاندان کا غیر سیاسی وزیراعظم۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۲ر جولائی ۱۹۹۳ء

۶۔ رانا سعید خان۔ اے ٹروپیٹریاٹ، معین قریشی (پروفائیل)۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۶ تا ۱۲ر جون ۱۹۹۷ء ص ۲۴

۷۔ سجاد بخاری۔ پاکستان کے ۱۷ وزرائے اعظم۔ لاہور۔ ص ۲۱۵ تا ۲۲۵

۸۔ عبداللہ ملک۔ داستان خانوادہ میاں محمود علی قصوری۔ لاہور۔ ص ۲۷

۹۔ ڈاکٹر انور سدید۔ اردو ادب میں سفرنامہ۔ لاہور۔ ص ۲۱۱ تا ۲۱۷

۱۰۔ عبداللہ ملک۔ داستان خانوادہ میاں محمود علی قصوری۔ لاہور۔ ص ۷۸ تا ۸۲

۱۱۔ ارشاد احمد حقانی۔ سیاسی خاندان کا غیر سیاسی وزیراعظم۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۲ جولائی ۱۹۹۳ء

۱۲۔ عمر جمیل۔ میاں محمود علی قصوری (فوٹوفیچر)۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۲۔ ۱۸ر جولائی ۲۰۰۲ء ص ۲۱

۱۳۔ عبداللہ ملک۔ داستان خانوادہ میاں محمود علی قصوری۔ لاہور۔ ص ۷ ۸ تا ۴۳۱

۱۴۔ رضی الدین رضی۔ شاکر حسین شاکر۔ پاکستان ۵۳ سال۔ لاہور۔ ص ۵۱۹، ۵۲۶

۱۵۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۱۴راپریل ۱۹۸۷ء

۱۶۔ عالیہ انعام۔ ریمیمبرنگ اے ڈریمر۔ میاں محمود علی قصوری (پروفائل) ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۲۲رتا ۲۸راپریل ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۴

۱۷۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۹۹

۱۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۱۶

۱۹۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء۔ (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۱۲۶

۲۰۔ سجاد بخاری۔ پاکستان کے ۱۷ وزرائے اعظم۔ لاہور۔ ص ۲۱۲

۲۱۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۲۹۶

۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۸۲، ۸۳

۲۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۸۴

۲۴۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ ص ۲۹۰

۲۵۔ جگنو محسن۔ دی وومن دیٹ شی از۔ مونی قصوری (پروفائل)۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور ۳۱رمئی۔ ۶رجون ۱۹۹۰ء ص ۱۴۔

۲۶۔ مجاہد حسین۔ انتہا کے دور میں اعتدال پسند۔ خورشید محمود قصوری (شخصیت)۔ ہفت روزہ آج کل لاہور ۲۴۔ ۳۰رنومبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۲۴

کالا باغ کے نواب

کالا باغ کا نام لیتے ہی ذہن پر نواب کالا باغ ملک امیر محمد خان کی شبیہہ ابھرتی ہے جو ایوب خان کے زمانے میں چھ برس تک مغربی پاکستان کے گورنر رہے مگر ان کا رعب' ان کا دبدبہ اور انکا جاہ وجلال آج تک یادگار ہے۔

ملک امیر محمد خان' ایک اعوان قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اعوانوں کا شجرہ نسب ایک روایت کے مطابق حضرت علیؑ کے فرزند حضرت عباس علمدارؑ سے ملتا ہے جو معرکہ کربلا میں شہید ہوئے تھے جبکہ دوسری روایت کے مطابق وہ حضرت علیؑ کے ایک اور فرزند محمد بن حنفیہؓ کی اولاد ہیں۔ دونوں صورتوں میں یہ قبیلہ ایک علوی' قریشی اور ہاشمی قبیلہ ہے۔ (۱)

کہا جاتا ہے کہ اب سے کوئی چار صدی قبل اعوان ملک' کالا باغ کے مقام پر وارد ہوئے یہ پہلے پہل کوہ دانگ کی اس بنجر چٹان پر آباد ہوئے جو قدرتاً ایک مستحکم قلعہ کی شکل میں دریا سے اوپر کی طرف کالا باغ سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھی اور گردونواح کے باشندے کسی قوی دشمن کے آنے کا خوف ہونے کے وقت اس قدرتی حصار میں پناہ لیا کرتے تھے۔ یہاں آباد ہونے والا پہلا اعوان بندے علی تھا جو شیخ آدو کا پوتا تھا۔ اس نے اس علاقے کی نمک کی کانوں پر قبضہ کیا اور اس علاقے کا رئیس بن گیا۔ بندے علی نے پتن پر اپنا تسلط قائم کر کے نمک اور پھٹکری پر محصول لگا دیا اور کالا باغ کے شمالی پہاڑوں پر آباد بھنگی خیل خٹکوں سے خراج لینے لگا۔ بندے علی کی وفات کے بعد اعوانوں کو چند جنگی مہمات میں شکست بھی ہوئی لیکن وہ اپنے علاقے میں بدستور طاقت ور رہے اور آخر کار قرب و جوار کی تمام اراضی پر قابض ہو گئے۔

سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں تیمور شاہ نے ملک سرخرو خان کے بیٹے ملک محمد اعظم خان اعوان کو علاقہ کالا باغ کا رئیس تسلیم کر لیا اور اسے دہلی اور کابل کے درمیانی راستے کو پرامن اور محفوظ رکھنے کے لئے بارہ سو روپے سالانہ بطور حق الخدمت دینا منظور کر لیا۔

۱۸۲۲ء میں جب سکھوں نے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تو اس وقت ملک محمد اعظم خان کے بیٹے ملک اللہ یار خان کو اس علاقے کی جاگیر بخش دی اور بدلے میں طے کیا کہ وہ ہر سال مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دو گھوڑے، گیارہ اونٹ، پانچ کتے، محصول نمک کے دوتہائی اور مسان کی ارضیات کے مالیہ کا چالیس فیصد وہ بطور خراج دیا کرے گا۔ سکھوں کے عہد میں اعوان ملکوں کو بہت فائدہ پہنچا اور وہ بہت جلد علاقے کے بڑے جاگیردار بن گئے۔

ملک اللہ یار خان نے سکھوں کی ان عنایات کا بدلہ یہ دیا کہ جب انگریزوں نے اس علاقے میں قدم رکھا تو وہ ان کے ساتھ مل گیا۔ اس نے ایڈورڈز کو بنوں اور دلیپ گڑھ کی مہمات میں سامان رسد اور گھڑ سواروں کی مدد فراہم کی۔ گھڑ سواروں کے دستہ کا سردار خود اس کا بیٹا مظفر خان تھا جو ملک فتح خان ٹوانے کے ساتھ مل کر بنوں میں انگریز کے قلعہ کی حفاظت کرتا رہا۔ اس دوران فتح خان ٹوانہ سکھوں کے ہاتھوں مارا گیا اور مظفر خان نے سکھ سپاہیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ تاہم اس نے بہت جلد پانچ ہزار روپے بطور تاوان ادا کر کے رہائی حاصل کر لی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران اعوان ملکوں نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ مظفر خان اور اس کے بیٹے ملک یار محمد خان نے ایک سو سپاہی بھرتی کر کے ایڈورڈز کی کمان میں دے دیئے۔ جنگ کے بعد مظفر خان کو خان بہادر کا خطاب عطا ہوا۔

ملک اللہ یار خان نے ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد ملک مظفر خان علاقے کا رئیس بن گیا اس نے افغانستان کی جنگ میں بھی انگ یزوں کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا۔ ۱۸۸۵ء میں ملک مظفر خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ملک یار محمد خان علاقے کا حاکم ہوا۔ وہ انگریزوں کا دیرینہ وفادار تھا چنانچہ انگریزوں نے اس کی وفاداری کے بدلے میں اسے نہ صرف کالا باغ کی کانوں کے ٹھیکے عطا کئے بلکہ عیسیٰ خیل اور میانوالی کی جاگیریں بھی اس کے حصے میں آئیں۔ انگریزوں کی ان عنایات کی بدولت ملک یار محمد خان کی جائیداد کی سالانہ آمدنی گیارہ ہزار روپے تک پہنچ گئی۔ انگریزوں نے اسے ۱۹۰۷ء میں خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔

ملک یار محمد خان نے ۱۹۰۸ء میں وفات پائی اس کی وفات کے بعد اس کا منصب ملک عطا محمد خان نے سنبھالا۔ ملک عطا محمد خان بھی اپنے باپ، دادا اور پردادا کی طرح انگریزوں کا وفادار رہا۔ اس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کو نہ صرف خطیر مالی امداد فراہم کی بلکہ انہیں ہزاروں سپاہی بھی فراہم کیے۔ انگریزوں نے اسے دہلی کو رونیشن دربار میں مدعو کیا اور اسے نہ صرف خان بہادر کا خطاب عطا کیا بلکہ نواب کا منصب بھی پیش کیا۔ ۱۹۲۴ء میں

اس کا انتقال ہو گیا۔

نواب خان بہادر ملک عطا محمد خان کی وفات کے وقت ان کے بیٹے ملک امیر محمد خان کی عمر فقط ۱۴ برس تھی چنانچہ ان کی تمام جائیداد کورٹ آف وائڈ کی نگرانی میں چلی گئی۔ امیر محمد خان نے ۱۹۲۸ء میں ایچی سن کالج لاہور سے تعلیم مکمل کی اور پھر مزید تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ان کی جائیداد واپس ملی اور ۱۹۳۵ء انہیں سلور جوبلی میڈل کا مستحق قرار دیا گیا۔ (۲)

ملک امیر محمد خان ۲۰ جون ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں انہوں نے یونینسٹ امیدوار کے مقابلے میں مسلم لیگ کے امیدوار مولانا عبدالستار نیازی کو کامیاب کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۱ء میں وہ پنجاب اسمبلی کے، ۱۹۵۵ء میں قومی اسمبلی کے اور ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہیں کئی مرتبہ وزارت کی پیشکش ہوئی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ ۹۔ دسمبر ۱۹۵۸ء کو انہیں پی آئی ڈی سی اور ۱۱ جولائی ۱۹۵۹ء کو خوراک و زراعت کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ ان عہدوں پر انکی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر ۱۲ اپریل ۱۹۶۰ء کو انہیں مغربی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ (۳)

ملک امیر محمد خان کا عہد گورنری، پاکستان کی تاریخ کا ایک یادگار باب ہے انہوں نے حکومتی معاملات اپنے روایتی اور شاہانہ انداز میں چلائے۔ وہ ایک روایتی جاگیردار تھے اور اپنی جاگیردارانہ وراثت پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ وہ ریاستی اور حکومتی معاملات میں کسی سے رو رعایت کے قائل نہ تھے مگر دوسری طرف اگر ان کا دشمن، خود چل کر ان کے پاس آ جائے اور ان سے مدد کا طالب ہو تو وہ اس کی حمایت کے لئے کسی سے بھی ٹکرا سکتے تھے۔

پیر علی محمد راشدی نے اپنی کتاب روداد چمن میں نواب کالا باغ کی شخصیت کی خاکہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''نواب امیر محمد خان آف کالا باغ، اپنی جگہ پر ایک غیر معمولی انسان تھے ان کو دیکھ کر اٹھارہویں، انیسویں صدی کے نوابوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخصیت آج کل کے ماحول کی پیداوار نہیں ہو سکتی۔ بڑے خوددار، راست گو، دوستی اور دشمنی کے پختہ، وعدہ کے سچے، منتظم، منتقم، ہاتھ صاف، باہمت، ضدی، طبعاً تشدد پسند، جفاکش، ذاتی کیریکٹر کے لحاظ سے صاف، شکل وشباہت میں رعب دار، رہن سہن میں سادہ مگر صفائی پسند، ایک سوٹ کیس لے کر گورنر ہاؤس میں داخل ہوئے اور وہی سوٹ کیس اٹھا کر وہاں سے چل

رہے۔" (۴)

جب امیر محمد خان' مغربی پاکستان کے گورنر بنے تو ان کے اقدامات سے ان کے جابر اور ظالم ہونے کا تاثر ابھرا۔ گورنر بننے کے بعد ریاستی امور ان کے بیٹوں کے سپرد ہو گئے جنہوں نے اپنے باپ کے عہدے سے انتہائی ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس دور میں کالا باغ کی تمام زمینوں اور مکانات پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ کسی شخص کو اپنا ذاتی مکان بنانے کا حق نہ تھا اور نہ ہی کوئی زمین خرید سکتا تھا حد یہ کہ کوئی شخص اپنے گھر میں کسی کو مہمان بھی نہیں رکھ سکتا تھا' اس کے لئے بھی اسے نواب کالا باغ کے خاندان سے اجازت لینی پڑتی تھی اور اجازت نہ ملنے کی صورت میں مہمان کو واپس بھیجنا پڑتا تھا۔ علاقے کی تمام شادیاں بھی نوابزادگان کی پیشگی اجازت سے مشروط ہوتی تھیں۔ نوابزادگان کے نظام کو ریاست کے اندر ریاست کا نام دیا جا سکتا تھا۔ اس کے باہر جمہوری اور آئینی قوانین چلتے تھے لیکن اس ریاست کے اندر صرف اور صرف ریاستی قوانین کی عملداری تھی۔

نواب امیر محمد خان نے اپنی ریاست کے لوگوں کا ہر طرح سے استحصال کیا۔ جب فصلیں پک جائیں تو سب سے پہلے نواب کالا باغ کی فصلیں فروخت ہوتی تھیں۔ ان کی اجناس کی فروخت تک کسی کو اپنی فصل منڈی میں لانے کی اجازت نہ تھی۔ انہیں انتظار کرنا پڑتا تھا کہ جب نواب صاحب کی فصل' منڈی سے ختم ہو تب وہ اپنی فصلیں بیچیں۔ انہیں لوگوں کے روزگار پر بھی دسترس تھی۔ وہ جس کام کے کرنے کی اجازت دیتے وہ کاروبار جائز سمجھا جاتا تھا۔ وہ جس کو چاہتے عزت دیتے اور جس کو چاہتے ذلیل کروا دیتے۔ نواب صاحب کی حکم عدولی کرنے والوں کو سر عام سزا دی جاتی تھی تاکہ لوگ اس سزا سے خوف کھائیں اور سبق سیکھیں۔ ان کے علاقے کے لوگ' ان کی دہشت سے ڈرے ڈرے رہتے تھے اور نواب صاحب کو ناراض کرنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ عام آدمی کے لئے سیاست میں حصہ لینا اور سیاسی گفتگو کرنا' گناہ کا درجہ رکھتا تھا جس کی عبرتناک سزائیں تھیں۔ انہوں نے اپنے علاقے میں اپنے جیتے جی کسی کو سیاست میں قدم نہ رکھنے دیا۔ ان کے علاقے میں تعلیم کا حصول بھی ممنوع تھا۔ جب ان کے علاقے میں کوئی اسکول منظور کیا جاتا تھا تو وہ اسے فوراً منسوخ کروا دیتے تھے۔ اگر کوئی شخص اپنے بچوں کو چوری چھپے تعلیم دینے کی کوشش کرتا تو اسے بھی سزا دی جاتی تھی۔ علاقے میں نواب صاحب کے مخبروں کا انتہائی مضبوط اور مربوط جال تھا جس کے ذریعے نواب صاحب کو علاقے کی پل پل کی خبر ملتی رہتی تھی۔ (۵)

دوسری طرف وہ دوستوں کے دوست تھے۔ انہوں نے سب سے زیادہ وفاداری ایوب خان سے نبھائی اور انہیں نوکر شاہی کے چنگل سے آزاد کروانے کے لئے ہر ممکنہ قدم اٹھایا۔

۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات میں انہوں نے ایوب خان کا کھل کر ساتھ دیا اور انہیں بھاری اکثریت سے کامیاب کروایا۔

نواب کالا باغ' ذوالفقار علی بھٹو سے سخت عناد رکھتے تھے۔ دونوں میں مقابلہ یہ رہتا تھا کہ ان میں سے کون ایوب خان کا زیادہ وفادار ہے اور کسے ایوب خان کا زیادہ قرب حاصل ہے۔ ۱۹۶۶ء میں جب بھٹو' وزارت سے فارغ کئے گئے تو انہیں ایوب خان سے زیادہ نواب کالا باغ سے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا جب وہ وزارت سے سبکدوش ہو کر ٹرین کے ذریعہ لاہور پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر ان کا والہانہ استقبال ہوا اور اسی استقبال کے دوران ان کے کپڑے بھی پھٹ گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو' انہی کپڑوں میں نواب کالا باغ سے ملنے گورنر ہاؤس پہنچ گئے اور عام ملاقاتیوں کی طرح گورنر ہاؤس کے استقبالیہ پر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ نواب کالا باغ نے فوراً ان کو اندر بلا لیا۔ انتہائی شفقت کا مظاہرہ کیا۔ نہلوایا' کپڑے بدلوائے' کھانا کھلایا اور اس یقین دہانی کے ساتھ ان کو رخصت کیا کہ۔

''چونکہ تم خود چل کر میرے دروازے پر آ گئے ہو اس لئے میں نے ہر چیز فراموش کر دی ہے۔ اب میرے ہاتھ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

ادھر ایوب خان سمجھتے رہے کہ نواب کالا باغ' خود بخود بھٹو کی خبر لیتے رہیں گے اور ان کی زندگی دشوار کر دیں گے مگر یہ نہیں ہوا بھٹو اپنا کام کرتے پھرے اور نواب کالا باغ قطعاً خاموش رہے۔

پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب روداد چمن میں لکھتے ہیں:

''۱۹۷۳ء میں بھٹو مرحوم سے میری اس موضوع پر مختصر سی گفتگو ہوئی بھٹو نے کالا باغ کے بارے میں کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے ان سے کہا ''مگر انہوں نے تو آپ پر احسان کیا تھا آپ کے جانے کے بعد انہوں نے ایوب خان کی کدورت مول لے لی مگر آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دی'' بھٹو نے فرمایا ''ہاں۔ یہ ان کی فیوڈل کمزوری تھی۔'' (۶)

اس زمانے میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کے بعد نواب کالا باغ کے لئے گورنر ہاؤس میں مزید قیام' ممکن نہیں رہا۔

یہ واقعہ کراچی کے ایک ضمنی انتخاب کا معاملہ تھا۔ یہ انتخاب کراچی میں لیاری کی نشست پر منعقد ہوا تھا۔ اس انتخاب میں کنونشن مسلم لیگ کے امیدوار خان بہادر حبیب اللہ پراچہ تھے جبکہ ان کے مقابلے میں حزب اختلاف نے میر غوث بخش بزنجو کو میدان میں اتارا تھا۔ ایوب خان' حبیب اللہ پراچہ کو کامیاب کروانا چاہتے تھے جبکہ نواب کالا باغ حبیب اللہ پراچہ کو سخت ناپسند کرتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ غوث بخش بزنجو انتخابات میں کامیاب ہوں۔ ان کے دو

صوبائی وزرا محمود ہارون اور غفار پاشا بھی بزنجو کے لئے کام کر رہے تھے۔ یہ انتخاب حبیب اللہ پراچہ ہار گئے جس کا ایوب خان کو بہت رنج ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ نواب کالا باغ کی وجہ سے انہیں سبکی اٹھانی پڑی ہے (۷)

انہی دنوں ایوب خان نے نواب کالا باغ کو کوئٹہ بلایا ایوب خان نے ان کے منصب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی خفگی کا اظہار نہیں کیا۔ مگر ایک دن نواب کالا باغ نے خود یہ مسئلہ اٹھایا اور ایوب خان سے کہا کہ انہوں نے اس ضمنی انتخاب میں بزنجو کی کامیابی کے لئے کوئی کردار ادا نہیں کیا البتہ ان کے جو دو صوبائی وزرا اس معاملے میں ملوث ہیں وہ ان کے خلاف تحقیقات کا حکم دینے والے ہیں۔ ایوب خان نے کہا نواب صاحب' سربازار گندے کپڑے دھونے سے کیا حاصل۔ وہ دونوں وزیر میری رضا سے مقرر ہوئے تھے انہیں فوراً فارغ کر دیجئے میں نے اپنی رضا واپس لے لی۔

اس واقعے کو بعد ایوب خان اور نواب کالا باغ کے راستے الگ الگ ہو گئے اور ستمبر ۱۹۶۶ء میں نواب کالا باغ نے مغربی پاکستان کے گورنر کے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ ایوب خان نے آخر وقت تک کوشش کی کہ نواب صاحب اپنا استعفیٰ واپس لے لیں مگر انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ مردوں کے استعفے دکھانے ڈرانے یا واپس لینے کے لئے نہیں ہوتے۔

گورنری کے منصب سے مستعفی ہونے کے بعد نواب کالا باغ سوا سال بھی زندہ نہیں رہے اور ۲۶ نومبر ۱۹۶۷ء کو اپنے گھر میں اپنے ہی بیٹے ملک اسد اللہ خان کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

اس واقعے کی تفصیل یہ تھی ۲۶ نومبر ۱۹۶۷ء کی صبح نواب کالا باغ ملک امیر محمد خان اور ان کے تیسرے بیٹے ملک اسد اللہ خان کے درمیان جائیداد کے مسئلے پر جھگڑا ہو گیا جس پر نواب صاحب نے اپنے پستول سے اپنے بیٹے پر گولی چلا دی جو اس کے کاندھے میں لگی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ دوسری گولی چلاتے' ان کے بیٹے نے اپنے پستول سے ان پر فائر کھول دیا اور پے در پے چھ گولیاں چلا کر انہیں موقع پر ہی ہلاک کر دیا۔

پولیس نے تفتیش کی اور ملک صاحب کے بیٹوں' دیگر عزیزوں اور ملازمین سے بھی پوچھ گچھ کی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اسد اللہ نے اپنے والد پر گولی اپنے دفاع میں چلائی تھی۔ یہ مقدمہ عدالت میں بھی پیش ہوا مگر کچھ عرصہ بعد خاندان والوں کی طرف سے پیروی نہ ہونے کے باعث غیر موثر ہو کر رہ گیا۔ (۸)

دوسری طرف ایوب خان گورنری سے علیحدگی اور قتل کے بعد بھی نواب کالا باغ کی دوستی کو نہ بھلا سکے۔ الطاف گوہر نے اپنی کتاب ''ایوب خان۔ فوجی راج کے پہلے دس سال'' میں لکھا ہے :

''۱۷ اپریل ۱۹۶۸ء کو روسی وزیراعظم کوسیجن پاکستان کے سرکاری دورے پر آئے پاکستان میں کسی روسی وزیراعظم کا یہ پہلا دورہ تھا۔ پاکستان عوام کی طرف سے کوسیجن کا پرتپاک استقبال کیا گیا جس سے اسلام آباد میں موجود امریکی اہل کاروں کو خاصی کوفت ہوئی۔ ایوب خان کی

کوسیجن سے پہلی ملاقات کا اہتمام ایوان صدر کے ڈرائنگ روم میں کیا گیا تھا عین اس وقت جب ٹی وی کیمرے کمرے میں لائے جا رہے تھے میری نظر طاق پر سجائی ہوئی نواب کالا باغ کی تصویر پر پڑی۔ میں نے اس خیال سے اس تصویر کو وہاں سے ہٹا دیا کہ اگر عوام نے ٹیلی وژن پر یہ تصویر دیکھ لی تو وہ لازمی طور پر یہ سوچیں گے کہ گورنر سے ہٹائے جانے کے باوجود نواب کالا باغ کی تصویر ایوب خان کے ڈرائنگ روم میں اس طرح نمایاں طور پر کیوں آویزاں ہے۔ ایوب خان کو کمرے میں داخل ہوتے ہی پتا چل گیا کہ تصویر اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ انہوں نے حکم دیا کہ تصویر کو اسی جگہ پر رکھ دیا جائے ملاقات کے بعد جب میں نے ایوب خان کو بتایا کہ نواب کالا باغ کی تصویر کیوں ہٹائی گئی تھی تو وہ دیر تک نواب صاحب سے اپنی دوستی کا ذکر کرتے رہے۔ اس دوران ان کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ انہوں نے پنجابی میں کہا'' تنداں ٹٹیاں جڑیاں نئیں'' ان کے دل میں نواب صاحب کے لئے اب بھی بڑی قدر موجود تھی۔ (۹)

نواب کالا باغ کی زندگی میں ہی ان کے صاحبزادے ملک مظفر خان نے سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا تھا۔

۱۹۶۲ء کے بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت منعقد ہونے والے انتخابات میں انہوں نے این ڈبلیو ۳۶ میانوالی سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور عبدالستار نیازی جیسے قدآور امیدوار کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کے مقابلے میں کسی امیدوار نے کھڑے ہونے کی جرات نہیں کی چنانچہ وہ بلامقابلہ قومی اسمبلی کے رکن بن گئے۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت میں کامیابی حاصل کی بعد ازاں وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء کا انتخاب انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر لڑا۔ اور چوتھی مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ ۱۹۶۲ء کی طرح ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء میں بھی' نواب ملک مظفر خان نے عبدالستار نیازی کو شکست سے ہم کنار کیا تھا۔(۱۰)

مگر ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد ملک مظفر خان کسی انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکے ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک بالکل نا آموز امیدوار مقبول احمد خان نیازی سے شکست کھائی۔ جبکہ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہیں ان کے دیرینہ حریف عبدالستار خان نیازی نے شکست سے ہم کنار کیا۔ مولانا عبدالستار نیازی نے یہ انتخاب پاکستان عوامی اتحاد کے ٹکٹ پر لڑا تھا جبکہ ملک مظفر خان آزاد امیدوار تھے۔ (۱۱) ۱۹۸۸ء میں ملک مظفر خان نے صوبائی اسمبلی کی نشست پی پی ۳۸ میانوالی ۳ سے بھی انتخاب لڑا مگر اس نشست پر بھی ''کامیاب'' نہ ہو سکے۔ (۱۲) ۱۹ جون ۱۹۸۹ء کو سیاسی دشمنی کی بنیاد پر نواب ملک محمد مظفر خان کو قتل کر دیا گیا۔ (۱۳)

نواب کالا باغ کے ایک اور فرزند ملک اللہ یار خان تھے جو سابق صدر پاکستان فاروق لغاری

کے بہنوئی تھے۔ انہوں نے بھی کچھ عرصہ سیاست کے میدان میں گزارا۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اپنے بھائی ملک محمد مظفر خان سے شکست کھا گئے۔ ۱۹۸۲ء میں جنرل ضیاء الحق نے انہیں وفاقی مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر عین انتخاب کے دن وہ گل حمید روکڑی کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ اس کے بعد کسی انتخابی مہم میں ان کا نام نظر نہیں آیا (۱۴)۔ ۲۴ جون ۲۰۰۰ء کو نیب کی حراست میں ان کا انتقال ہو گیا جہاں وہ بعض مالی بدعنوانیوں کے سلسلے میں پابند سلاسل تھے (۱۵)۔

نواب کالا باغ کے تیسرے فرزند ملک محمد اسد خان، اس وقت قبیلے کے سردار ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۵ء میں سینٹ آف پاکستان کی رکنیت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکے (۱۶) اس کے بعد ان کا نام بھی کسی انتخابی مہم میں نظر نہیں آیا۔

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں ملک محمد مظفر خان کے فرزند ملک عبد الوحید نے پی پی ۵۰ میانوالی سے پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر روکڑی گروپ کے امیدوار غلام رسول شادی خیل کے ہاتھوں ضمانت ضبط کروا بیٹھے۔ (۱۷)

ادھر ملک اللہ یار خان کی دو صاحبزادیاں سمیرا ملک اور عائلہ ملک ۲۰۰۲ء میں قومی اسمبلی کی رکن بننے میں کامیاب ہوئیں۔ دونوں کا تعلق اپنے ماموں سردار فاروق لغاری کی سیاسی جماعت ملت پارٹی سے ہے۔ سمیرا ملک این اے ۶۹ خوشاب ا سے براہ راست انتخاب لڑ کر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں جب کہ ان کی چھوٹی بہن عائلہ ملک نیشنل الائنس کے ٹکٹ پر خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن نامزد ہوئیں (۱۸)

سمیرا ملک پہلے تو وزیر اعظم شوکت عزیز کی کابینہ میں سیاحت کی وزیر مملکت کے عہدے پر فائز ہوئیں (۱۹) پھر ۲۵ اپریل ۲۰۰۶ء کو انہیں خواتین اور نوجوانوں کے امور کا وفاقی وزیر بنا دیا گیا (۲۰) یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سمیرا ملک نے انتخابات میں اپنے شوہر ملک طاہر سرفراز کے خالہ زاد بھائی ملک عمر اسلم کو شکست سے ہم کنار کیا تھا جن کا تعلق پاکستان مسلم لیگ (ق) سے تھا (۲۱)

ادھر عائلہ ملک جو قومی اسمبلی کی رکن بنیں تو وہ ضیا پرویز حسین کی اہلیہ تھیں جن سے ان کی جلد ہی علیحدگی ہوگئی اور وہ بلوچستان کے ایک بہت بڑے سردار اور مرکزی وزیر یار محمد رند کی اہلیہ بن گئیں۔ سمیرا ملک اور عائلہ ملک کی تیسری بہن، اپنے ماموں زاد بھائی اور وفاقی وزیر اویس لغاری کی اہلیہ ہیں جو سابق صدر پاکستان، سردار فاروق لغاری کے صاحبزادے ہیں (۲۲)

نواب کالا باغ کی ہمشیرہ کی شادی سر محمد نواز خان گھیبہ سے ہوئی تھی جو سردار محمد علی خان، خان آف کوٹ فتح خان کے بیٹے تھے اور خود بھی اپنے قبیلے کے سردار رہے تھے (۲۳) سردار محمد نواز خان گھیبہ نومبر ۱۹۲۶ء میں مالکان اراضی کے نمائندے کے طور پر ہندوستان کی مرکزی مجلس قانون ساز

کے رکن منتخب ہوئے تھے اور ۱۹۳۷ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن بنے تھے (۲۴) وہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں بھی پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۲۵) قیام پاکستان کے بعد وہ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۹ء سے ۳۰ جون 1951ء تک دفاع، ریاستوں اور سرحدی علاقے کے نائب وزیر رہے (۲۶) ۳۰ اپریل ۱۹۶۸ء کو ان کا انتقال ہوگیا (۲۷) سردار محمد نواز خان گھیبہ کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی ان کے بعد ان کی سیاسی وراثت ان کے رشتے کے پوتے ملک عطا محمد نے سنبھالی جو نواب آف کالا باغ ملک امیر محمد خان کے داماد ہیں (۲۸) وہ ۱۹۹۰ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ان کا حلقہ انتخاب تھا پی پی ۱۵ اٹک ۴۔ ۱۹۸۸ء میں وہ اسی نشست پر سردار سکندر حیات خان کے ہاتھوں شکست کھا گئے تھے (۲۹) نواب کالا باغ کے ایک بھانجے ایئر مارشل (ر) نور خاں ہیں۔ وہ پاکستان کی فضائی افواج کے سربراہ اور مغربی پاکستان کے گورنر کے مناصب پر فائز رہے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۸ء میں انہیں پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنا نمائندہ نامزد کیا۔ مگر اس مرتبہ وہ انتخابات میں کامیاب نہیں ہو سکے (۳۰) نور خان کی والدہ نواب کالا باغ ملک امیر محمد خان کی کزن تھیں (۳۱)

نواب کالا باغ کے سب سے چھوٹے فرزند ملک محمد اعظم مرحوم تھے۔ ان کی اہلیہ عوامی نیشنل پارٹی کے رہنما خانزادہ عبدالوحید خان کی صاحبزادی ہیں۔ صاحبزادہ عبد الوحید خان رشتے میں سردار فاروق احمد لغاری کے ماموں تھے (۳۲)

حوالہ جات

۱۔ انجم سلطان شہباز۔ اقوام پنجاب۔ جہلم۔ ص ۶۰۶ تا ۶۱۱

۲۔ لیپل ایچ گریفن، چارلس فرانسس میسی، میجر کونران اور ایچ ڈی کریک۔ چیفس اینڈ فیملی آف نوٹ ان دی پنجاب۔ جلد دوم (مطبوعہ ۱۹۴۰ء)۔ لاہور۔ ص ۳۴۹ تا ۳۵۱

۳۔ عقیل عباس جعفری، ۳۶۶ دن، لاہور۔ ص ۵۰۰

۴۔ پیر علی محمد راشدی۔ روداد چمن۔ کراچی۔ ص ۲۰۶، ۲۰۷

۵۔ مجاہد حسین۔ پاکستان کے متنازع سیاستدان۔ لاہور۔ ص ۵۷ تا ۶۱

۶۔ پیر علی محمد راشدی۔ روداد چمن۔ کراچی۔ ص ۲۰۶، ۲۰۷

۷۔ الطاف گوہر۔ ایوب خان، فوجی راج کے پہلے دس سال۔ لاہور۔ ص ۴۳۵

۸۔ احمد سلیم۔ پاکستان کے سیاسی قتل۔ ص ۳۰ تا ۳۴

۹۔ الطاف گوہر۔ ایوب خان، فوجی راج کے پہلے دس سال۔ لاہور۔ ص ۴۳۷

۱۰۔ وکیل انجم۔ سیاستدانوں کی قلا بازیاں۔ جلد اول۔ ص ۳۶۳، ۴۴۹، ۵۳۸، ۵۵۱، ۶۷۶، ۸۸۰

۱۱۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۱۳۷، ۱۸۵

۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۷۴

۱۳۔ رضی الدین رضی، شاکر حسین شاکر۔ پاکستان ۵۳ سال۔ لاہور۔ ص ۸۶۹

۱۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۹۱

۱۵۔ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی۔ ۲۸ جون ۲۰۰۰ء

۱۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۳۰۸

۱۷۔ ایضاً۔ ص ۹۱

۱۸۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ ص ۲۱۹، ۴۵۷

۱۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳/ستمبر ۲۰۰۴ء

۲۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۶/ستمبر ۲۰۰۶ء

۲۱۔ عابد تہامی۔ الیکشن ۲۰۰۶ء۔ لاہور۔ ص ۵۱۱

۲۲۔ اٹس آل اے فیملی افیئر۔ پاکستان پنچ (انٹرنیٹ ایڈیشن)

۲۳۔ ویب سائٹ www.nq.net.au

۲۴۔ سر لیپل ایچ گرفین، کرنل میسی، تذکرہ روسائے پنجاب۔ جلد دوم۔ (ترجمہ سید نوازش علی)۔ لاہور۔ ص ۴۵۴

۲۵۔ پنجاب پراونشل اسمبلی سکریٹریٹ، لاہور۔ دی پنجاب لیجسلیٹرس۔ ص ۱۱، ۱۶

۲۶۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۶۸

۲۷۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۹۴۷

۲۸۔ سہیل وڑائچ۔ ۱۸۵۷ء کے غدّار خانوادے ۱۹۹۳ء کی انتخابی دوڑ میں۔ ترجمہ شریف کیانی۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۸/ستمبر ۱۹۹۳ء

۲۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔ جلد دوم۔ ص ۲۲۲

۳۰۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۷ اگست ۱۹۹۱ء

۳۱۔ جگنو محسن، ایئر مارشل (ر) نور خان (پروفائل)۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۸۔۱۴ اگست ۱۹۹۱ء۔ ص ۲۰

۳۲۔ ایم ریاض۔ پاکستان کا سدا بہار خاندان (خصوصی رپورٹ)۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۴ء

کھٹڑ

قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد کوئی بیس تیس برس تک پاکستانی سیاست پر بالعموم اور پنجاب کی سیاست پر بالخصوص کھٹڑ قبیلے کے سردار سکندر حیات اور ان کے بڑے بیٹے سردار شوکت حیات کے اثرات بڑے نمایاں رہے ہیں۔ ان دونوں باپ بیٹوں کا تعلق کھٹڑ قبیلے سے ہے جو اٹک اور فتح جنگ کی تحصیلوں میں کالا چٹا پہاڑ کے ساتھ آباد ہیں۔

مشہور محقق اے آر شبلی اپنی کتاب پاکستان کے دیہہ خدا میں رقم طراز ہیں۔

"اس قبیلے کا مورث اعلیٰ عبداللہ خان تھا۔ اہل قبیلہ کا دعویٰ ہے کہ وہ خراسان سے آئے ہیں اور ان کا شجرہ نسب قطب الدین ایبک سے جا ملتا ہے۔ وہ شہاب الدین غوری کا گورنر تھا اور اس کے بعد خاندان غلاماں کا بانی بن کر ہندوستان پر حکمران ہوا۔ مگر بعض دوسرے مورخین مثلاً سر لیپل ایچ گرفین اور کرنل میسی، اس دعویٰ سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ قطب الدین ایبک کا اپنا کوئی بیٹا نہیں تھا اور آرام شاہ جو اس کا جانشین ہوا صرف متبنیٰ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اعوانوں، کھوکھروں اور کھٹڑوں کا مورث اعلیٰ قطب الدین ایبک نہیں بلکہ قطب شاہ تھا جو غالباً گیارہویں صدی کے اوائل میں محمود غزنوی کی کسی فوج کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ اس قطب شاہ کے نو لڑکے تھے جن میں سب سے چھوٹے کا نام چوہان تھا۔

چوہان کے دو بیٹے تھے۔ ہمیر اور پسین۔ انہی کی اولاد اعوان بھی ہیں اور کھٹڑ بھی۔ جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو چوہانوں نے اس کی امداد کی۔ اسی قبیلہ کی ایک شاخ کا سردار کھٹڑ خاں تھا۔ وہ محمد غوری کے پاس ملازم ہو گیا۔ جب غوری نے پنجاب پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو کھٹڑ خاں بیوپاری کے لباس میں یہاں آیا اور اچانک نیلاب کے قلعہ کو فتح کرنے میں کامیاب رہا۔ نیلاب اس زمانہ میں دریائے سندھ پر اٹک کے نیچے ایک بارونق شہر تھا۔ اسی واقعہ کے بعد کھٹڑ خان کے نام تمام ساتھیوں نے اپنے قبیلہ کا نام کھٹڑ رکھ لیا۔ وہ اٹک کے گورنر جنگ خان کے ماتحت تھے۔ اس مرحلہ پر کھٹڑ مرتد بھی ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ کوئی جوگی

نیلاب آیا اور اس نے کھٹڑیوں کو بتوں کی پوجا کرنے کی ترغیب دی جوگی جادوگر بھی تھا۔ اس نے کھٹڑیوں پر کچھ ایسا جادو کیا کہ ان کے مویشی دودھ کی بجائے خون دینے لگے۔ جب عیسیٰ عبدالوہاب کو اوچ (بہاولپور) میں اس کی خبر ملی تو اس نے اپنے بیٹے شاہ نور عبدالرحمٰن کو بھی بھیجا تاکہ کھٹڑیوں کو شدھی سے بچائے۔ وہ نیلاب پہنچا تو شہر داخل ہونے سے پہلے اسے ایک بڑھیا ملی۔ اس نے پینے کے لئے دودھ مانگا تو بڑھیا نے بتایا کہ اس شہر پر کس طرح ایک آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ شاہ نور عبدالرحمٰن نے کہا کہ میں خود گائے کو دوہ کر دیکھوں گا۔ لوگوں نے بڑا منع کیا لیکن اس نے تھنوں کو ہاتھ لگایا تو خون کی بجائے سفید شیریں دودھ نکلا۔ اس پر شاہ نور کی دھاک بیٹھ گئی اور لوگ اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ جب جوگی کو پتہ چلا تو اس نے ایک پرندے کا دھارن لیا اور اڑتا ہوا شاہ نور کو دیکھنے آیا۔ شاہ نور تاڑ گیا۔ اس نے پرندے کو کس کر اپنا جوتا مارا جس سے وہ مرگیا اور لوگ جادو کے پھندے سے آزاد ہو گئے۔ یہ کہانی اعوانوں اور کھٹڑوں دونوں میں مشہور ہے۔ ممکن ہے وہ ارتداد کے بعد تبلیغ سے پھر مسلمان ہو گئے ہوں۔

کھٹڑ خاں کے چھ بیٹے تھے جو تین پشتوں تک راولپنڈی سے دریائے سندھ تک تمام اراضی پر قابض رہے۔ گھیبوں اور اعوانوں کی طرح انہوں نے بھی پہلے سکھوں کا مقابلہ کیا۔ اور پھر ان کے جاگیردار بن گئے۔ انگریزوں کے زمانہ میں ان کی جاگیریں اور زمینداریاں پختہ ہو گئیں۔ (ا)

کھٹڑ خان کے چوتھے بیٹے کا نام فیروز خان تھا۔ اس کی اولاد میں ایک شخص سید احمد خان اپنے بیٹے خزاں خان کے ساتھ دہلی گیا اور شاہی ملازمت میں داخل ہوا۔ سید احمد خان کی ایک بیٹی بھی اس کے ہمراہ تھی جس کا نام گل بیگم تھا۔ وہ نہایت حسین و جمیل تھی۔ جب اس کے حسن کا شہرہ ہوا تو دربار شاہی کا ایک بڑا افسر اس پر نادیدہ طور پر عاشق ہو گیا اس سے شادی کا خواہاں ہوا۔ سید احمد خان نے شادی سے انکار کر دیا تو افسر نے خزاں خان کو قید خانے میں ڈال دیا۔ خزاں خاں کا باپ سید احمد اپنی اس خوبصورت لڑکی کو رات ہی رات لے کر بھاگا اور اپنے ملک میں واپس آکر ایک موضع آباد کیا جس کا نام احمد آباد رکھا جو اب تباہ ہو گیا ہے۔ خزان خاں قید ہی میں مرگیا اور اس کے بیٹے جمال خاں نے اپنے رشتہ داروں سے لڑ کر احمد آباد چھوڑ دیا اور اپنے لئے جنگل میں ایک موضع آباد کیا جس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر جلال سر رکھا مگر جمال خان کے اس چھوٹے سے گاؤں کا نام اس سبب سے ماند پڑ گیا کہ شہنشاہ شاہجہان نے کابل کو جاتے ہوئے اس گاؤں کے قریب ایک سرائے اور محل ۱۶۴۵ء میں تعمیر کرایا جن کے نشان کچھ اب بھی نظر آتے ہیں اور جو آصف خانی محل کے نام سے مشہور ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس موضع کا نام واہ اس لئے پڑ گیا کہ شہنشاہ نے اس کے قریب کے خوشنما منظر بہتے ہوئے پانی ور دلفریب درختوں کے جھنڈوں کو دیکھ کر بے ساختہ "واہ" (یعنی واہ کیا اچھا

نظارہ ہے) کہہ دیا تھا(۲)

جب انگریزوں نے پنجاب فتح کیا تو خاندان کھٹڑ کا سب سے بااثر اور مقتدر شخص سردار کرم خان تھا۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ بڑے گہرے اور مستحکم تعلقات قائم کیے۔ یہاں تک مسٹر نکلسن جو بعد میں سرجان نکلسن ہوئے اور مسٹر ایبٹ جنہوں نے ایبٹ آباد بسایا' سردار صاحب کے یہاں پندرہ پندرہ بیس بیس دن تک مہمان رہا کرتے تھے اور اپنے دربار اور مقدمات کا کام بھی یہیں انجام دیتے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں سردار کرم خان نے سواروں اور پیادوں کی ایک بڑی رجمنٹ بھرتی کی جس سے نکلسن نے درہ مارگلہ پر ناکہ بندی کا کام کیا۔ سکھوں نے جو سردار کرم خان اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے مراسم دیکھ کر خائف ہو گئے تھے۔ پہلے تو اس کا مکان جلا دیا پھر اس کے چھوٹے بھائی سردار فتح خان کو اس سے بدظن کر دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب سردار کرم خان ایک درخت کے نیچے سو رہا تھا' سردار فتح خان نے اپنے نوکر کے ذریعہ اسے قتل کروا دیا۔

سردار کرم خان کے قتل کا انگریزوں کو بڑا صدمہ ہوا۔ انہوں نے اس کے بیٹے محمد حیات خان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ انہوں نے محمد حیات خان کو انگریزی تعلیم سے آراستہ کیا۔ اور جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوا یہ تربیت بعد ازاں خود انگریزوں کے بڑے کام آئی۔(۳)

نکلسن صاحب نے جو ۱۸۵۷ء میں پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے' کے برپا ہونے پر محمد حیات خان کو حکم دیا کہ خدمات کے لئے کچھ آفریدی بھرتی کرے اور جب صاحب موصوف پنجاب کی جنگ پر جانے والی فوج کے کمان افسر مقرر ہوئے تو انہوں نے محمد حیات خان کو اپنا دیسی مصاحب مقرر کیا۔ جس وقت جنرل نکلسن نے ہوتی مردان میں ۵۵ نمبر کالی پلٹن کو نہایت سخت سزا دی اور ۴۶ رجمنٹ ہندوستان پیدگاں اور نویں رسالہ کی ترموں گھاٹ پر سرکوبی کی تو محمد حیات خان ان کے ساتھ تھا وہ فوج کے ساتھ دہلی گیا اور جب تک محاصرہ رہا بہادری سے لڑتا رہا۔ جب جنرل نکلسن کو تسخیر دہلی کے موقع پر زخم کاری لگا اس وقت بھی محمد حیات خان ان کے ساتھ تھا۔ یہ زخم آنے کے بعد نکلسن صاحب چند روز جیئے اور حیات تادم واپسیں ان کے ساتھ رہا اور نہایت وفاداری سے ان کی خدمت کرتا رہا ان خدمات کے صلے میں ۲۵۰ روپے کی سالانہ پنشن جو اس کے باپ کو ملتی تھی اور اس کی وفات پر محمد حیات خان کے نام بحال رہی اور بڑھا کر ۳۶۰ روپیہ کی گئی۔ اسے ایک بیش بہا خلعت بھی مرحمت ہوا۔

دہلی فتح ہونے کے بعد محمد حیات خان پشاور کو واپس آیا اور وہاں تھانیدار مقرر ہوا۔ چند ماہ بعد اس کی تبدیلی ضلع جہلم ہوئی جہاں وہ تلہ گنگ کا تحصیلدار مقرر ہوا۔ مئی ۱۸۶۱ء میں محمد حیات خان عہدہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پر فائز ہو کر ضلع شاہ پور میں متعین ہوا اور بعد ازاں بنوں کو تبدیل کیا گیا ضلع بنوں میں اس کی غیر معمولی کوششوں' سرگرمی اور جدوجہد سے محمد خیل

وزیریوں کے مطیع اور سرحد پرامن قائم کرنے میں جو ۱۸۷۱ء میں ہوا بہت کچھ امداد ملی۔ ان بیش بہا خدمات کے صلے میں گورنمنٹ ہند نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ۱۸۷۶ء میں اسے اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیا گیا اور سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب مرحمت ہوا۔ ۷۹-۱۸۷۸ء کی جنگ کرم اور ۸۰-۱۸۷۹ء کی جنگ افغانستان میں وہ پولیٹیکل افسر رہا۔ ۱۸۹۹ء میں اسے نواب کا خطاب عطا ہوا۔ اس نے ۱۹۰۱ء میں وفات پائی اس کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا خان محمد اسلم حیات خاں جو اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھا اس کا جانشین ہوا۔ (۴)

خان بہادر سردار محمد اسلم حیات کے پانچ بھائی تھے جن میں سے دوسرے بھائی خان بہادر نواب سر لیاقت حیات خان نے سول سروس کے میدان میں اور چوتھے بھائی سر سکندر حیات خان نے سیاست کے میدان میں بڑا نام کمایا۔

نواب سر لیاقت حیات خان نے اپنی ملازمت کا آغاز ۱۹۰۹ء میں پنجاب پولیس سے بحیثیت ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کیا۔ بعد میں اس کی خدمات انڈین پولیس سروس کے سپرد کر دی گئیں ------ اس پوسٹنگ پر اس کا سب سے بڑا کارنامہ غدر پارٹی کی جدوجہد کو ناکام بنانا تھا۔ (۵) یہ پارٹی چند حریت پسند مسلمانوں نے ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے قائم کی تھی۔ اس پارٹی نے انقلاب کے لئے ۲۱ فروری ۱۹۱۵ء کا دن متعین کیا تھا۔ مگر یہ دن آنے سے پہلے ہی چند غداروں کے باعث پارٹی کی حکمت عملی فاش ہو گئی اور نواب سر لیاقت حیات خان جیسے قوم فروشوں نے اس پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کروا کر اسے ناکام بنا دیا۔ غدر پارٹی کے ۴۶ رہنماؤں کو پھانسی اور ۳۰۶ رہنماؤں کو عمر قید کی سزا ملی۔ ۱۹۴ کو طویل عرصہ کی سزا کاٹنی پڑی اور ۷۷ کو مختصر عرصہ کے لئے قید و بند بھگتنی پڑی جبکہ ۱۴۵ افراد کسی سزا سنائے جانے سے پہلے پولیس مقابلوں میں مارے گئے (۶) قوم فروشی کے اس کارنامہ کے پیچھے نواب سر لیاقت حیات خان تھا جسے اس خدمت کے معاوضہ میں کنگز پولیس میڈل سے نوازا گیا ------

قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند ------

کچھ عرصہ بعد سر لیاقت حیات کو خان بہادر اور آرڈر آف برٹش ایمپائر کے خطابات بھی عطا ہوئے ۱۹۲۳ء میں اس کی خدمات ریاست پٹیالہ کے سپرد کر دی گئیں۔ جہاں اس نے وزیر اعظم کے عہدے تک ترقی پائی اور اس دوران اس نے انگریزوں سے ''نواب'' اور مہاراجہ پٹیالہ سے اعتماد الدولہ اور وقار الملک تعظیم کے خطابات حاصل کئے۔ اس نے گول میز کانفرنس میں ریاست پٹیالہ کی نمائندگی کا فریضہ بھی انجام دیا اور پارلیمینٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی میں بھی بطور مندوب بھی شریک ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں اسے ''نائٹ ہڈ'' اور ۱۹۳۹ء میں کے بی ای کے خطابات مزید سے نوازا گیا۔ (۷) یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ غلام مصطفیٰ کھر کی سابقہ اور شہباز شریف کی موجودہ اہلیہ تہمینہ درانی اسی لیاقت حیات خان کی نواسی ہیں (۸)

سر لیاقت حیات خان کا چھوٹا بھائی سر سکندر حیات خان تھا ------ سر سکندر حیات خان ۱۸۹۲ء میں ملتان میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں ان دنوں سردار محمد حیات خان ایڈیشنل جج کے عہدے پر فائز تھا ------

۱۹۰۱ء میں اس کے والد کا انتقال ہوا تو اس کے کچھ عرصہ بعد اسے برائے تعلیم علی گڑھ بھیج دیا گیا جہاں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ انگلستان گیا مگر کوئی ڈگری حاصل کئے بغیر ۱۹۱۰ء میں واپس آگیا۔ پہلی جنگ عظیم میں اس نے اپنے آباو اجداد کی طرح اعلیٰ فوجی خدمات سرانجام دیں لہٰذا اسے کیپٹن بنا دیا گیا اور ایم۔بی۔ای کا خطاب دیا گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ پنجاب کونسل کا رکن منتخب ہوا تھا لیکن بعض انتخابی بدعنوانیوں کی وجہ سے اس کا انتخاب کالعدم قرار دے دیا گیا۔ اس انتخابی مقدمے میں ملک برکت علی مخالف فریق کا وکیل تھا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ پھر پنجاب کونسل کا رکن منتخب ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں وہ پنجاب کونسل کی اس ریفارمز کمیٹی کا سربراہ مقرر ہوا جو سائمن کمیشن کے ساتھ اشتراک عمل کے لئے بنائی گئی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں وہ حکومت پنجاب کا ریونیو ممبر نامزد ہوا اور ۱۹۳۲ء میں کچھ عرصہ کے لئے صوبہ کا گورنر بھی مقرر ہوا۔ ۱۹۳۴ء میں وہ ریزرو بنک آف انڈیا کے ڈپٹی گورنر کے عہدے پر فائز ہوا لیکن اس کی تمنا یہ تھی کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے پنجاب کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرلے سر سکندر حیات ضلع کیمبل پور کا جاگیردار تھا اور برطانوی سامراج کا خاندانی پٹھو تھا۔ پنجاب کے دوسرے مسلم جاگیرداروں کی طرح وہ بھی شہر کے درمیانہ طبقہ کے سر فضل حسین کی قیادت کو دل سے قبول نہیں کرتا تھا اور ہمہ وقت اپنے اس محسن کے خلاف جاگیردارانہ جوڑ توڑ اور سازش میں مصروف رہتا تھا۔ چنانچہ وہ ۲۰ جون ۱۹۳۶ء کو بمبئی سے لاہور پہنچا جبکہ سر فضل حسین ڈلہوزی میں بیمار پڑا تھا۔ وہ لاہور میں ایک طرف راجہ نریندر ناتھ سے ملا اور دوسری طرف اس نے علامہ اقبال سے بھی ملاقات کی۔

۲۲ جون کے سول اینڈ ملٹری گزٹ کی رپورٹ کے مطابق سر سکندر اور راجہ نریندر ناتھ کے درمیان اس امر کے متعلق تبادلہ خیالات ہوا کہ سر فضل حسین کی فرقہ وارانہ پالیسی کو ختم کر کے پنجاب کی سیاسی جماعتوں میں کیونکر اتحاد قائم ہونا چاہیے۔ سر فضل حسین نے جب یہ خبر پڑھی تو اسے سکندر کی احسان فراموشی پر بہت صدمہ ہوا جس کا اظہار اس نے ۲۴ جون کو چوہدری شہاب الدین کے نام اپنے خط میں کیا۔

۲۵ جون ۱۹۳۶ء کو ڈاکٹر اقبال نے قائداعظم کو ایک خط میں لکھا کہ "دو ایک روز ہوئے سر سکندر لاہور سے چلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بمبئی پہنچ کر آپ سے ملاقات کر کے بعض اہم امور کے متعلق گفتگو کرے گا۔ دولتانہ (احمد یار) نے کل شام مجھ سے ملاقات کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان یہ اعلان کرنے پر آمادہ ہیں کہ مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے آل انڈیا مسائل کے بارے میں مسلم لیگ جو فیصلہ کرے گی وہ اس کے پابند ہوں گے اور

ان مسائل کے متعلق وہ صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم گروپ سے کبھی کوئی معاہدہ نہیں کریں گے۔ بشرطیکہ مسلم لیگ یہ اعلان کرے کہ جو لوگ لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوں گے وہ اس گروپ سے تعاون کریں گے جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو گی۔ ازراہ کرم مجھے پہلی فرصت میں اطلاع دیجئے کہ اس تجویز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور سر سکندر حیات سے گفتگو کے نتیجے سے مجھے ضرور مطلع کیجئے۔ اگر آپ ان کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بہت ممکن ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ملیں۔"

۲۹ جون کو سر فضل حسین واپس لاہور پہنچا تو سر سکندر حیات بمبئی جا چکا تھا۔ احمد یار دولتانہ اور سر سکندر کا سازشی منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ وہ صرف فضل حسین کی موت کا انتظار کر رہے تھے جس کی صحت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو فضل حسین کا لاہور میں انتقال ہو گیا اور ۳۰ ستمبر ۱۹۳۶ء کو سر سکندر حیات خان ریزرو بنک سے مستعفی ہو کر واپس لاہور پہنچ گیا۔(۹)

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اپنی کتاب اقبال کے آخری دو سال میں لکھتے ہیں کہ سر سکندر حیات خان دراصل بڑی دیر سے اپنے محسن سر فضل حسین کے خلاف سازش میں مصروف تھا اور اس سلسلے میں نواب مظفر علی خان، میاں احمد یار خان دولتانہ اور سید مقبول کی درپردہ امداد حاصل تھی۔ وہ سر فضل حسین کے خلاف ایک نئی پارٹی کی طرح ڈالنے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا رہتا تھا۔ جب ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت انتخابات قریب آئے تو اس نے فضل حسین کو نیچا دکھانے کے لئے ایک طرف تو مسلم لیگ سے رابطہ قائم کیا اور دوسری طرف وہ ہندوؤں کے لیڈر راجہ نریندر ناتھ سے بھی درپردہ سازباز کرتا رہا۔ جب تک فضل حسین کی صحت ٹھیک رہی سر سکندر کو کھلم کھلا اس کی مخالفت کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ لیکن جب اس کی صحت مسلسل خراب رہنے لگی تو سر سکندر کی سازشی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ "میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل ہارپر نلسن فضل حسین کے معالج تھے اور نواب مظفر خان چپکے چپکے ہارپر نلسن کے پاس جا کر پوچھتے تھے کہ فضل حسین کی زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ ہارپر نلسن نے ایک ذمہ دار معالج کی حیثیت سے نواب مظفر خان کو تو کچھ بتانے سے انکار کر دیا لیکن انہوں نے میاں فضل حسین کو اس بات سے فوراً آگاہ کر دیا کہ ان کے حریف اب ان کی زندگی کی گھڑیاں شمار کر رہے ہیں۔ فضل حسین کو نواب مظفر خان کی اس حرکت سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ انہوں نے رنج والم کی اس شدت میں خودکشی کر لینے کا ارادہ کر لیا اور آخر ایک کرب انگیز ذہنی کشمکش کے بعد وہ اس مذموم ارادے سے باز آئے (۱۰) چونکہ عاشق بٹالوی نے اس واقعہ کا ذکر فضل حسین کے بیٹے عظیم حسین کی تحریر کردہ سوانح عمری کے حوالے سے لکھا ہے اس لئے اس کی صداقت کے بارے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

قبل ازیں فضل حسین نے سر سکندر حیات اور دوسرے جاگیرداروں کی سازشوں سے پریشان ہو کر چوہدری شہاب الدین کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "دوست عزیز اور رشتہ دار اس قدر خود غرض، حاسد اور ناشکرے ہو گئے ہیں کہ ان کی کمینہ حرکات دیکھ کر دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے صبر و شکر کرنے اور غداریوں کو برداشت کرنے کے سوا کیا چارہ ہے۔ اب تو زندگی کا صرف یہی مقصد رہ گیا ہے کہ جو کام شروع کیا تھا اسے بالخیر انجام تک پہنچایا جائے۔" اور پھر اس نے سر سکندر کے نام ایک خط میں لکھا کہ "اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تو میں صرف پارٹی کی قیادت ہی سے نہیں بلکہ پبلک زندگی اور سیاسی کاموں سے کلیتاً دستبردار ہونے کو تیار ہوں"۔ گویا پنجابی مسلمانوں کے شہری درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھنے والا عظیم لیڈر، جس نے اپنے طریقے سے فی الحقیقت مسلمانوں کی گرانقدر خدمات سر انجام دیں تھیں، اتنے اندوہناک حالات میں راہی ملک عدم ہوا۔

۳۰ ستمبر ۱۹۳۶ء کو سر سکندر حیات خان بمبئی میں ریزرو بنک سے مستعفی ہو کر لاہور پہنچا تو اس کے چند دنوں بعد ہی وہ نہ صرف یونینسٹ پارٹی کا لیڈر بن گیا بلکہ گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے اسے نواب مظفر خان کی جگہ اپنی کونسل کا ریونیو ممبر بھی نامزد کر دیا۔ چنانچہ اکتوبر میں جب اس نے اس دوگانہ حیثیت سے یونینسٹ پارٹی کی طرف سے انتخابی مہم شروع کی تو سارے صوبے کے مسلم جاگیردار جوق در جوق اس کی فوج میں شامل ہو گئے۔ چونکہ سر سکندر کا رہن سہن جاگیردارانہ تھا اس لئے اس کے طبقاتی بھائیوں کو دل و جان سے اس کی قیادت قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا بالخصوص ایسی حالت میں کہ وہ لاٹ صاحب کا بھی منظور نظر تھا۔

۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں سردار سکندر حیات کی یونینسٹ پارٹی پنجاب کی اکثریتی پارٹی کے طور پر ابھری۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو سردار شوکت حیات پنجاب کا وزیر اعلیٰ منتخب ہوا۔ اسے اسمبلی کے ۱۷۵ ارکان میں سے ۹۶ کی حمایت حاصل تھی۔ (۱۱)

چند ماہ بعد اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں سر سکندر حیات خاں نے اتحاد پارٹی کے لیڈر ہونے کے باوجود، شرکت کی اور اعلان کیا کہ میں مسلم لیگ میں شامل ہو گیا ہوں اور اتحاد پارٹی کے تمام مسلمان رکن بھی مسلم لیگ کے ممبر بن جائیں گے۔ چنانچہ اس موقع پر ایک تحریر بھی لکھی گئی، جس کو بعد میں سکندر، جناح پیکٹ کا نام دیا گیا۔

اقبال اس معاہدے سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس معاہدہ میں اتحاد پارٹی کو بالادستی حاصل ہو گئی ہے اور مسلم لیگ کو ثانوی حیثیت ملی ہے۔ بالاخر وہی ہوا، جس کا اقبال کو خدشہ تھا۔ سر سکندر حیات نے لکھنؤ سے واپس آتے ہی اخباروں کو اس قسم کے بیانات دینا شروع کر دیئے جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ لکھنؤ کی بات لکھنؤ میں ہی ختم ہو گئی ہے۔ سر سکندر حیات

خاں نے اپنے بیان میں صاف طور پر کہا کہ "جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے سابقہ صورت حال برقرار رہے گی"۔

اقبال نے سر سکندر کے اس بیان پر بڑے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اور مختلف بیانوں کے ذریعے سر سکندر کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ صورت حال سر سکندر کے لئے بڑی پریشان کن تھی۔ انہوں نے ۲۱ اکتوبر کو اس سلسلے میں اقبال سے پہلی ملاقات کی اور لیگ اور اتحاد پارٹی کے اختلافات پر تبادلہ خیال کیا۔ کچھ تجاویز پیش کیں۔ ۱۰ نومبر کو اقبال نے محمد علی جناح کو لکھا:

"سر سکندر کی تمام تجاویز کا مقصد یہ ہے کہ لیگ پر قابض ہو کر اس کو ختم کر دیا جائے۔ انہوں نے ابھی تک لیگ کے فارم رکنیت پر دستخط نہیں کئے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ وہ دستخط نہیں کریں گے"۔

مسلم لیگ نے ۵ فروری ۱۹۴۰ء کو دہلی میں اعلان کیا کہ وہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں ایک اجلاس منعقد کرے گی جس میں مسلمانوں کی الگ مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا جائے گا۔ سر سکندر کے لئے یہ صورت حال بڑی فیصلہ کن تھی۔ انہوں نے اس معاملے میں پیش قدمی کی اور اس اجلاس میں پیش کرنے کے لئے ایک قرارداد کا مسودہ مرتب کیا اور محمد علی جناح کی منظوری کے لئے بھیج دیا۔ محمد علی جناح نے اسے سب جیکٹس کمیٹی کے سپرد کر دیا' تاکہ اس پر غور و خوض کیا جائے۔ سب جیکٹس کمیٹی نے اس میں بہت کچھ تبدیلیاں کیں اور اسے قرارداد لاہور' کا نام دیا یہ مسودہ ۲۴ مارچ کے اجلاس میں منظور ہو گیا (۱۴)

پنجاب کے مسلم عوام الناس میں لفظ "پاکستان" مقبول ہو جانے کے باوجود پنجاب کے وزیر اعظم سکندر حیات خان نے صوبائی اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی تشکیل نہیں کی تھی اور اس نے کبھی اپنی کسی تحریر یا تقریر میں "پاکستان" کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ذہنی طور پر اس منطق (مسلم قوم کا حق خود ارادیت) کو تسلیم نہیں کیا تھا جسے اس کی اپنی منطق (صوبائی خود مختاری) کی جگہ تقسیم ملک کے مطالبے کی بنیاد بنایا گیا تھا۔ اس نے ۸ ستمبر ۱۹۴۰ء کو لاہور کے ایک ہندو اخبار ٹریبیون کے نامہ نگار سے انٹرویو میں کہا تھا کہ آج بھی فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم کے خلاف ہوں۔ پنجاب پر کسی خاص فرقے کی حکومت نہیں چل سکتی۔ پنجاب پر صرف پنجابیوں کی حکومت ہو گی۔ مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہندوستان کو تقسیم کیا جائے"۔

چند ماہ بعد ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو سر سکندر حیات نے اسمبلی کے فلور پر قرارداد پاکستان یا مطالبہ پاکستان کی واضح الفاظ میں مخالفت کی۔

سر سکندر کی یہ تاریخی تقریر تعبیر و تشریح کی محتاج نہیں۔ اس تقریر میں یہ حقیقت بالکل

واضح تھی کہ پنجاب کے جاگیرداروں کا یہ سرغنہ قرارداد پاکستان کی منظوری کے تقریباً ایک سال بعد بھی نہ صرف وہ خود برصغیر کی دوٹوک تقسیم کے خلاف تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ جناح بھی اس کے حق میں نہیں تھے۔ وہ پاکستان کو محض ایک نعرہ سمجھتا تھا جسے اس کے بیان کے مطابق جناح نے محض اس لئے اپنا لیا تھا کہ یہ نعرہ ہندو اخبارات کی سنگین غلطی کے باعث مسلم عوام میں بے حد مقبول ہو گیا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ صوبوں کو خود مختاری اور حاکمانہ حیثیت رکھنے والی مملکتوں کا درجہ دیا جائے اور چند محکمے یعنی دفاع، امور خارجہ، مواصلات اور کرنسی وغیرہ ایک مرکزی ادارے یا بورڈ کی تحویل میں رہیں جس کی حیثیت خود مختار صوبوں کے ایجنٹ کی ہو۔ وہ برصغیر کی تقسیم اس طرح نہیں چاہتا تھا کہ یہاں مسلم راج ہو اور وہاں ہندو راج ہو۔ وہ اپنے مجوزہ یونٹوں اور منطقوں میں غیر فرقہ وارانہ سیکولر حکومتیں قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے پیش رو سر فضل حسین کی طرح پنجابی شاونزم کا عظیم علمبردار تھا اور وہ پنجاب کو مادر وطن کہتا تھا اور پنجابیت کو مذہب و ملت سے بالاتر سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ پنجاب میں خالص مسلم راج ہو تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ وہ پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کے معاملات میں کسی غیر پنجابی، بشمول قائداعظم محمد علی جناح، کی مداخلت برداشت نہیں کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ پنجاب، پنجاب ہے اور یہ پنجاب ہی رہے گا خواہ کوئی کچھ ہی کہے۔ وہ پنجاب کے مفادات کو اولین حیثیت دیتا تھا باقی ساری چیزیں اس کی نظر میں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں یا ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔

لاہور کے روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ نے ۱۳ مارچ کو نیا پاکستان کے زیر عنوان ایک اداریہ میں سر سکندر کی اس تجویز پر تنقید بھی کی اور تعریف بھی کی۔ لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ سر سکندر حیات خان کو چاہئے کہ اپنے لئے ایک مستقل مقام معین کر لیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کی تائید کریں یا آئندہ کے بارے میں کوئی اور محکم سکیم مرتب کر کے اس کی پابندی کریں۔ یہ بار بار پہلو بدلنا اور روز نئی نئی اسکیمیں پیش کرنا مناسب نہیں۔ لاہور کے مسلمان اخباروں زمیندار، انقلاب، شہباز اور احسان وغیرہ نے اس تجویز پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ سر چھوٹو رام کا تبصرہ یہ تھا کہ میں گذشتہ ۲۰ سال سے سر سکندر حیات کے خیالات و عقائد سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ پکے نیشنلسٹ ہیں۔ گاہے گاہے مسلم لیگی بن ضرور جاتے ہیں لیکن ان سے ان کا نیشنلزم کمزور ہونے کی بجائے اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

جنوری ۱۹۴۲ء میں قاہرہ میں برطانوی وزیر اعظم چرچل نے ہی سر سکندر کو بتایا ہو گا کہ اس کی حکومت ہندوستان کے لئے متذکرہ آئینی تجاویز پر غور کر رہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ پنجاب کی "مارشل قوم" کو جنگ کی بھٹی میں دھکیلے جاؤ اور ساتھ ہی علاقائی شونزم کو بھی ہوا دو تاکہ کل ہند سطح پر کانگرس اور مسلم لیگ دونوں ہی قابو میں رہیں۔ سر سکندر برطانوی

سامراج کا پشتینی پٹھو تھا اور اپنے صوبائی جاگیرداروں کا سرغنہ تھا جو ہر کام اپنے ضلع کے انگریز ڈپٹی کمشنر سے پوچھ کر کرتے تھے لہٰذا اس کی جانب سے انگریزوں کی مرضی کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ہزماسٹرز وائس تھا۔

دو ماہ بعد ۱۱ مارچ ۱۹۴۲ء کو برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ اس کی کابینہ نے ہندوستان کے لئے ایک آئینی فارمولا مرتب کیا ہے جس کے تحت نہ تو کسی اقلیت کو اکثریت کے خواہش کے خلاف ویٹو کے استعمال کا اختیار ہو گا اور نہ ہی اکثریت کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ ایسے فیصلے کرے جن سے داخلی امن و امان کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔ چنانچہ چرچل کے اس اعلان کے مطابق اسٹیفورڈ کرپس جو فارمولا لایا اس میں کہا گیا تھا کہ جنگ عظیم ہونے کے بعد ایک دستور ساز اسمبلی منتخب کی جائے گی۔ ریاستوں کو اس اسمبلی میں شریک کیا جائے گا اور جو آئین یہ اسمبلی وضع کرے گی حکومت برطانیہ اسے فی الفور منظور کر لے گی۔ مجوزہ آئینی فارمولے میں ہندوستان کے لئے ہمیں شرائط کے ساتھ ڈو مینین اسٹیٹس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

سر اسیفرڈ کرپس کا یہ آئینی فارمولا پنجاب کے وزیراعظم سر سکندر حیات کی ان تجاویز سے ملتا جلتا تھا جو اس نے جولائی ۱۹۳۹ء میں ایک پمفلٹ کی صورت میں پیش کی تھیں۔ پھر جن کا اس نے ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب اسمبلی میں اعادہ کیا تھا اور پھر جنوری ۱۹۴۲ء میں قاہرہ میں اس کے اور وزیراعظم چرچل کے درمیان گفتگو میں زیر بحث آئی تھیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ برطانوی سامراج ہندوستان کے بارے میں اپنی پالیسی سر سکندر حیات خان کے مشورے کے مطابق وضع کرتا تھا بلکہ اس سے یہ ثابت ہوا تھا کہ حکومت برطانیہ نے ۱۹۳۹ء میں ہی یہ فیصلہ کر لیا ہوا تھا کہ جنگ کی صورت میں ہندوستان کے بارے میں اس کی پالیسی کیا ہو گی۔ چونکہ اسے کانگرس کے امداد و اعانت کی امید نہیں تھی اس لئے اس نے ان تمام عناصر کی حوصلہ افزائی کا پروگرام بنایا ہوا تھا جو کسی بھی نعرے کے تحت اس کی جنگی کارروائیوں میں ممدومعاون ہو سکتا تھا۔ چونکہ سر سکندر ہندوستان میں سب سے زیادہ بھرتی دینے والے صوبہ پنجاب کا وزیراعظم تھا اس لئے اس کی وساطت سے پنجابی شونزم کو الگ ڈو مینین کا لالچ دینے میں کوئی حرج نہیں تھا بلکہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں تھا کہ پنجابیوں کو مزید یہ لالچ دیا جائے کہ جنگ کے بعد سارے شمال مغربی ہندوستانی پر پنجابیوں کی حکمرانی ہو گی۔ سندھی، بلوچی، اور پٹھان ان کے زیر نگیں ہوں گے۔ لیکن جب ۱۲ اپریل کو مسلم لیگ نے اس حقیقت کے باوجود کہ کرپس نے برصغیر کی تقسیم کے اصول کو پہلی مرتبہ تسلیم کیا تھا، اس کے فارمولے کو مسترد کر دیا تو سر سکندر کو بہت صدمہ ہوا۔ سر سکندر برطانوی سامراج سے بھرپور اور غیر مشروط تعاون کرنا چاہتا تھا جبکہ جناح کا تعاون نیم دلانہ اور مشروط ہوتا تھا اور اس کے راستے میں کوئی نہ کوئی روڑہ اٹکاتے رہتے تھے۔

۱۹۴۲ء کے سارے سال کے دوران صدر مسلم لیگ محمد علی جناح اور سر سکندر حیات کے

درمیان جنگ سے متعلقہ مسائل کے بارے میں اختلافات کے مظاہرے ہوتے رہے تا آنکہ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء کو سر سکندر حیات خان کا ۵۰ سال کی عمر میں یکایک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اسی روز اس کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی کی تقریب پر بہت پر تکلف دعوت ہوئی تھی جس میں ایک ہزار کے قریب مہمانوں نے شرکت کی تھی۔ اس کے انتقال پر وہ دو ہزار کے قریب تعزیت نامے وصول ہوئے جن میں برطانیہ کے وزیراعظم سرونسٹن چرچل اور وزیر ہند ایمرسن کے پیغامات بھی شامل تھے۔

سر سکندر حیات کی وفات کے بعد گورنر برٹینڈز گلیسی کی نظر عنایت سے سرگودھا کا ایک جاگیردار ملک خضر حیات ٹوانہ پنجاب کا وزیراعظم بن گیا۔ اس کی کابینہ میں سرشاہ نواز ممدوٹ مرحوم کا بیٹا نواب افتخار ممدوٹ احمد یار دولتانہ مرحوم کا بیٹا ممتاز محمد خاں دولتانہ اور سر سکندر حیات مرحوم کا بیٹا سردار شوکت حیات خان شامل تھے۔ جب سر سکندر کا انتقال ہوا تو اس وقت شوکت حیات خاں فوج میں ملازم تھا لیکن اسے اپنے والد کی "گرانقدر" خدمات کے انعام کے طور پر فوج سے فارغ کر کے صوبائی وزارت کا رکن بنا دیا گیا تھا۔ (۱۳)

مگر یہ تینوں وزرا ہی زیادہ دیر ملک خضر حیات ٹوانہ کا ساتھ نہ دے سکے۔ وہ مسلمان ہند کی اکثریت کی طرح قائداعظم محمد علی جناح کو اپنا رہنما سمجھتے تھے اور ان کے حکم کی تعمیل واجب جانتے تھے ۱۹۴۶ء میں سردار شوکت حیات نے قائداعظم کی ہدایت پر خضر حیات ٹوانہ کی وزارت سے استعفیٰ دیا (۱۴) اور اسی برس مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے اسی انتخابی مہم کے دوران سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں قائداعظم کی موجودی میں انہیں شوکت پنجاب کا خطاب ملا۔ جو ان کے نام کا جزو بن گیا۔

قیام پاکستان کے بعد سردار شوکت حیات اور مسلم لیگ کی ہائی کمان کے درمیان اختلافات سامنے آنے لگے۔ چنانچہ سردار شوکت حیات نے میاں افتخار الدین اور بعض دیگر اراکین اسمبلی کے ہمراہ آزاد پاکستان پارٹی کے نام سے ایک اپوزیشن پارٹی تشکیل دے ڈالی جس کا کام مسلم لیگ حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا اور اس پر تنقید کرنا تھا۔

جب غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت توڑ دی تو سردار شوکت حیات سیاسی منظر سے غائب ہو گئے۔ وہ ۱۹۶۴ء میں اس وقت دوبارہ سیاسی افق پر نمودار ہوئے جب مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کے خلاف صدارتی انتخاب لڑنے کا اعلان کیا۔ سردار شوکت حیات اس انتخابی مہم میں اپنے عظیم قائد کی ہمشیرہ کے دوش بدوش رہے اس دوران گورنر مغربی پاکستان نواب آف کالا باغ نے ان کے بڑے بیٹے سکندر حیات پر شاہی قلعہ میں شدید تشدد کیا۔ مگر سردار شوکت حیات استقامت کا پہاڑ بنے رہے۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں سردار شوکت حیات کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے

رکن منتخب ہوئے۔ ابتداء میں وہ حزب اختلاف میں رہے مگر ذوالفقار علی بھٹو کے سحر کا اسیر ہو کر انہوں نے پیپلز پارٹی کا دامن تھام لیا۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے اور قومی اسمبلی کے رکن بن گئے۔ (۱۵)

ان انتخابات میں مبینہ دھاندلیوں کے خلاف جب پاکستان قومی اتحاد نے تحریک چلانے کا آغاز کیا تو سردار شوکت حیات اس تحریک سے لاتعلق نہ رہ سکے۔ ۱۵ اپریل ۱۹۷۷ء کو انہوں نے اپنے ہم خیال اراکین اسمبلی کا اجلاس طلب کیا جس پر اگلے دن انہیں ان کے ساتھیوں سمیت، پیپلز پارٹی سے خارج کر دیا گیا (۱۶) اس کے بعد سردار شوکت حیات نے کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیا۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۹۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا (۱۷)

سردار شوکت حیات کے صاحبزادے سردار سکندر حیات یوں تو ایوب خان کے دور میں ایک طالب علم رہنما کے طور پر نمایاں ہوئے تھے مگر سیاسی دنیا میں ان کی باقاعدہ آمد اس وقت ہوئی جب وہ ۱۹۸۵ء کے انتخابات کے بعد نواز شریف کے معتمد خصوصی بنے۔ بعد ازاں ان دونوں میں اختلافات پیدا ہوئے اور سکندر حیات نے پاکستان پیپلز پارٹی کا دامن تھام لیا۔ ۱۹۸۸ء کے انتخاب میں انہوں نے پی پی ۱۵ اٹک ۴ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور اسلامی جمہوری اتحاد کے ملک عطا محمد خان کو شکست دے کر پنجاب اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۱۸) ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا اور یوں پی پی ۱۵ اٹک ۴ سے ملک عطا محمد خان صوبائی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۱۹) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر افق سیاست پر نمایاں ہوئے اور اس مرتبہ بھی پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پی پی ۱۵ اٹک ۴ سے پنجاب اسمبلی کے رکن بننے میں بآسانی کامیاب ہو گئے۔ (۲۰)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ کامیاب نہ ہو سکے (۲۱) جب کہ ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام ہی نظر نہیں آیا۔

سردار سکندر حیات خان کے ایک صاحبزادے سردار عظمت حیات کی شادی پنجاب اسمبلی کے سابق رکن اور اردو کے نامور ڈرامہ نگار حکیم احمد شجاع کی صاحبزادی کے ساتھ اور ایک صاحبزادی طاہرہ کی شادی ان کے اپنے ایک عزیز نواب مظفر خاں صاحب بہادر کے صاحبزادے مظہر علی خان سے انجام پائی تھی (۲۲)

یہ وہی مظہر علی خان ہیں جو پاکستان کا ایک انتہائی باوقار جریدہ ''ویو پوائنٹ'' شائع کرتے تھے۔ انہوں نے ۲۸ رجنوری ۱۹۹۳ء کو وفات پائی (۲۳) انہی مظہر علی خان اور طاہرہ مظہر علی خان کے صاحبزادے طارق علی ہیں جو سن ساٹھ کی دہائی میں انگلستان میں ''پاکستان کے سوشلسٹ طالب علم رہنما'' کی حیثیت سے خاصے مشہور ہوئے تھے۔

سید طارق علی پہلے پاکستانی تھے جو آکسفورڈ یونیورسٹی یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ برٹرنڈرسل فاؤنڈیشن کے رکن رہے اور انہوں نے لندن میں ویت نام کی جنگ کے خلاف کئی بڑے بڑے مظاہروں کی قیادت کی۔

سید طارق علی ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ جن میں ان کی مشہور کتابیں ''پاکستان، فوج کا تسلط یا عوامی طاقت'' ''کیا پاکستان باقی رہ سکتا ہے؟'' نہرو اور گاندھیز'' اور گلیوں میں لڑائی والا سال'' قابل ذکر ہیں (۲۴)

سردار شوکت حیات کی ہمشیرہ محمودہ سلیم ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھیں اور صوبائی وزیر تعلیم کے منصب پر بھی فائز رہی تھیں۔ (۲۵)

حوالہ جات

۱۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۱۹۴ تا ۱۹۷

۲۔ کرنل چارلس میسی۔ رؤسائے با اختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس) لاہور۔ ص ۶۰۴، ۶۰۵

۳۔ مرزا محمد سعید بیگ۔ حیات سکندر۔ لاہور۔ ص ۵ تا ۹

۴۔ سر لیپل ایچ گریفن، چارلس میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب، لاہور۔ جلد دوم۔

۵۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص۔ ۳۳۴

۶۔ پرشوتم مہرا۔ اے ڈکشنری آف ماڈرن انڈین ہسٹری۔ نئی دہلی۔ ص ۲۶۲ تا ۲۶۵

۷۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۳۳۴، ۳۳۵

۸۔ تہمینہ درانی۔ مینڈا سائیں۔ لاہور۔ ص ۲۳۱

۹۔ زاہد چوہدری۔ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء۔ لاہور ص ۳۴۳، ۲۰۹، ۲۱۰

۱۰۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔ اقبال کے آخری دو سال۔ لاہور۔ ص ۲۹۰ تا ۲۹۲

۱۱۔ زاہد چوہدری۔ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء۔ لاہور۔ ص ۲۱۱، ۲۱۲

۱۲۔ سید مظفر حسین برنی۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ نئی دہلی۔ جلد دوم۔ ص ۸۸۹، ۹۰۰

۱۳۔ زاہد چودھری۔ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقا۔ لاہور۔ ص ۳۱۳، ۳۱۹ تا ۳۳۲، ۳۴۱ تا ۳۴۳

۱۴۔ ایضاً۔ ۳۶۲ تا ۳۶۵

۱۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۱۰۸، ۱۰۹

۱۶۔ ملک سلیم اکبر۔ الیکشن ۷۷۔ کراچی۔ ص ۱۸۶، ۱۸۷

۱۷۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء

۱۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۰۸

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۶۹
۲۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۶۰
۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۹۳
۲۲۔ مرزا محمد سعید بیگ۔ حیات سکندر۔ لاہور۔ ص ۱۰۵
۲۳۔ خالد حسین۔ فیکٹ فائیل۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۴/۔ ۱۰/فروری ۱۹۹۳ء۔ ص ۲
۲۴۔ طارق علی۔ انار کے سائے۔ لاہور۔ فلیپ
۲۵۔ وکیل انجم۔ پنجاب کی سیاست جاگیرداری اور دھڑے بندیوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ روزنامہ جنگ کراچی (سنڈے ایڈیشن) ۴ ستمبر ۲۰۰۵ء۔ ص ۶

کھر

قیام پاکستان کے بعد جنوبی پنجاب کے جو خاندان' میدان سیاست میں نمایاں ہوئے ان میں ایک نام کھر خاندان کا بھی ہے۔ کھر خاندان کے تاریخی پس منظر کے حوالے سے تہمینہ درانی اپنی کتاب ''مینڈا سائیں'' میں لکھتی ہیں:

''کھر خاندان کا تعلق پنجاب کے کھرل قبیلے سے ہے۔ کہا جاتا ہے ایک مرتبہ خطہ لاہور سے تعلق رکھنے والے کھرلوں کے ایک ٹولے نے ملتان میں گنے کے ایک کھیت کے پاس پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ انہوں نے گنے کاٹ کر کچھ اپنے مویشیوں کو کھلا دیئے اور کچھ کو جوڑ جاڑ کر جھونپڑیاں بنا لیں۔ جب کھیت کے مالک نے گلہ کیا تو انہوں نے بھولپن سے کہا کہ وہ سمجھتے تھے کہ گنا کسی قسم کا بیج ہے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا وہ کون ہیں تو انہوں نے فخر سے کہا کہ وہ کھرل ہیں۔ بزلہ سنج مالک نے رعایت لفظی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم کھرل نہیں' خر ہو جس کے معنی فارسی میں گدھا ہیں''۔ یہ شاخ ملتان سے ملحق مظفر گڑھ میں دریائے سندھ کے کنارے آباد ہو گئی۔

بہرکیف کھر اپنے نام کی ابتدا کی وجہ کچھ اور بیان کرتے ہیں۔ کھرلوں کے پیر قبیلے کے عام افراد سے برتر سمجھتے جاتے تھے۔ علماء اور ان کے مریدوں میں فرق کرنے کے لئے ثانی الذکر خود کو کھر کہنے لگے۔

کھر فخریہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوگ سیان کے رومانی ہیرو مرزا جٹ کی اولاد میں جو صاحباں کو لے اڑا تھا اور جس کا نام پنجاب کے قلب و نظر پر نقش ہو چکا ہے۔ کھر رومان مزاج کے مالک ہیں۔ ان کی رومان پسندی کی اصلاح ناممکن ہے۔

کھر خاندان کی تاریخ کچھ افسانہ ہے۔ کچھ تذکرہ اولیا ہے۔ یہ تاریخ نسل در نسل زبانی منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ مصطفیٰ کے اب وجد نے کوٹ ادو کا رخ اس لئے کیا کہ انگریز اپنی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرتے رہو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انہیں دوسرے قبائل سے جنگ کرنے پر

کسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ خاندان کے بزرگ افراد برطانوی راج کے خلاف تھے اور سفید آقاؤں کے خلاف احمد خاں کھرل کے کارہائے نمایاں کی یاد ابھی تازہ تھی۔ انہوں نے نقل مکانی شروع کر دی۔ قبیلہ شیر خوار بچیوں کو ہلاک کرنے کا عادی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس عظیم نقل مکانی کا آغاز ہوا تو تمام عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ کھرل چاہتے تھے کہ دوران سفر ان پر کسی قسم کا بوجھ نہ ہو۔ انہیں پتہ تھا ان کی عورتیں دوسرے غارت گر قبائل کا ہدف بن جائیں گی۔ اس لئے انہیں مار ڈالنا مسئلے کا زیادہ آبرو مندانہ حل تھا۔ وہ نقل مکانی کر کے دریائے سندھ کے کنارے کنارے آباد ہو گئے۔

غلام مصطفیٰ کے دادا نے چار شادیاں کیں۔ ہر بار اس کی بیوی پورے پورے گاؤں اپنے جہیز میں لائی۔ ان دیہات کے علاوہ بابا نے اپنی مقتول عورتوں کے سونے اور زیورات کی مدد سے جو وہ ساتھ لانا نہ بھولا تھا۔ زرخیز زمین کے بڑے بڑے رقبے خرید لئے۔ مربع بھر زمین صرف چار آنے میں مل جاتی تھی۔

اس کی ایک بیوی کا نام سناواں تھا۔ وہ جہیز میں ایک گاؤں لائی تھی جو آج بھی اس کے نام سے منسوب ہے۔ خریداری اور ازدواجی رشتوں سے دادا کی جاگیر میں کوٹ ادو اور ڈوگر کا بھی اضافہ ہوا۔ ان بزرگوار کے تین بیٹے ہوئے۔ ان میں سے ایک طفولیت میں فوت ہو گیا۔ یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ پرانے خانہ بدوش طور طریقے چھوڑ کر کسی جگہ ٹک کر رہا جائے۔ جو زمین پہلے پورے قبیلے کی شاملات تھی اسے اب صرف ایک خاندان کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ قبائلی معاشرے سے جاگیردارانہ معاشرے کی طرف سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔

دونوں بیٹوں' محمد یار کھر اور احمد یار کھر کے سماجی قدو قامت میں اضافہ ہو تا گیا۔ محمد یار کھر بہت بچہ خیز واقع ہوئے تھے۔ ان کے پچیس سے زیادہ اولادیں ہوئیں۔ انہوں نے بہت ہی کم عمر میں شادی کی تھی۔ جب ان کی بیوی فوت ہوئی تو انہوں نے دوبارہ شادی کر لی۔ نئی بیوی ملتان کی کوئی رقاصہ تھی۔ اس رقاصہ کی بہن کی شادی ڈیرہ غازی خاں کے سردار مزاری سے ہوئی۔ رقاصہ بیوی کی وفات کے بعد محمد یار کھر نے مصطفیٰ کی والدہ سے شادی کی۔ وہ ساٹھ برس کے اور مصطفیٰ کی والدہ سولہ برس کی تھیں۔ مصطفیٰ کی والدہ کے سولہ بچے ہوئے۔ ان میں سے سات بیٹے اور ایک بیٹی زندہ ہے۔

مصطفیٰ کی والدہ کا تعلق ملتان شہر سے تھا۔ انہوں نے جاگیردارانہ طرز زندگی اس طرح اپنا لی جیسے وہ ان کی فطرت ثانیہ ہو۔ وہ قبیلے کی تمام رسوم اور روایات کی نہایت احتیاط سے پابندی کرتیں۔ انہوں نے خود کو سرتاپا قبیلے کے رنگ میں رنگ لیا۔ انہیں بیٹیاں جننے سے نفرت ہو گئی اگرچہ قبیلے نے نوزائیدہ بیٹیوں کو ہلاک کرنے کا سلسلہ ترک کر دیا تھا' اس کے باوجود مصطفیٰ کی والدہ' جب بھی ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی' اپنی کوفت کا اظہار ضرور کرتیں۔۔ بیٹی جننا عورت کی

کمزوری کی دلیل تھی۔ یہ ایک بن لکھا فرمان تھا جسے قبیلے کی تائید حاصل تھی۔

جانے کیسے' ایک کے سوا ان کی تمام بیٹیاں فوت ہو گئیں۔ سرگوشیوں میں کہا جاتا تھا کہ بیٹیوں کی موت کی ذمے دار وہ آپ ہیں۔ ان کی اموات کے گرد زبردست اسرار کا حصار تھا۔ چھوٹی بچیوں کو پہلے عام زکام یا معمولی کھانسی ہو جاتی۔ ماں ان پر توجہ نہ دیتی تاکہ ان کی بیماری بڑھتی رہے۔ بچیوں کو پتہ چلتا کہ ان کی قوت مدافعت کمزور پڑتی جا رہی ہے اور بالآخر وہ مرض کی پیچیدگیوں کی تاب نہ لا کر چل بستیں۔ ان کی کبھی دوا دارو نہ کی جاتی۔

زندہ بچ جانے والی اکلوتی بیٹی' رشیدہ' کے ساتھ ماں بہیمانہ سلوک کرتی رہی۔ چھ برس کی عمر میں اسے آج کل کی کسی سنڈریلا کی طرح کھانا پکانے اور برتن مانجھنے پر لگا دیا گیا۔ بات بے بات کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر کے اسے بے دردی سے مارا پیٹا جاتا۔ ماں جھونٹے پکڑ کر اسے ادھر سے ادھر گھسیٹتی پھرتی۔ ماں کے سارے بغض کا نشانہ وہی بنتی۔ اس کی یہ غلطی کبھی معاف نہ ہو سکی کہ وہ زندہ بچ گئی تھی۔ رشیدہ کی زندگی موت سے بدتر تھی۔ ہر روز اسے چاروں طرف سے دھوئیں کے مرغولوں میں گھر کر کھلے چولہے کے سامنے بیٹھنا پڑتا۔ اس کے میلے کچیلے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں پڑی ہوتیں اور وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے چپاتیاں بنانے کی کوشش میں لگی رہتی۔ آخر ایک روز رشیدہ کو اتنی بری طرح پیٹا گیا کہ وہ مرتے مرتے بچی۔ مصطفیٰ نے اپنی بہن کی جان بچائی اور اسے اپنے ایک مزارع کی بیوی کے حوالے کر دیا جو دائی کا پیشہ کرتی تھی۔ رشیدہ کو اس عورت نے پالا پوسا۔

ساتوں بیٹے نظم و ضبط سے آشنا ہوئے بغیر بڑے ہوتے گئے۔ ان کے والد بہت معمر ہو چکے تھے اور والدہ کو خود کو ٹھیٹ جاگیردارنی ثابت کرنے اور بیٹی کی جان سولی پر لٹکائے رکھنے سے فرصت نہ تھی۔ مصطفیٰ اور اس کے بھائی ہوش نکلے اور چھوٹے چھوٹے وحشیوں میں تبدیل ہو گئے۔

کوٹ ادو سے ملحقہ قبائلی سرزمین غیر علاقہ کہلاتی ہے۔ وہاں قبائلی سرداروں کے فرمان کو قانون کا درجہ حاصل ہے۔ وہاں عورتوں کا ادلا بدلا ہوتا' انہیں بیچا جاتا۔ جب عورت فروخت ہو کر کسی کی بیوی بن جاتی تو اسے میاں کی من مانیوں کے سامنے سر جھکانا پڑتا۔ میاں اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرتا جو زر خرید لونڈی باندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی عورت فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑی جاتی تو اس کی کونچیں کاٹ دی جاتیں تاکہ اسے وسیع و عریض صحرا رینگ کر عبور کرنا پڑے۔ مرد شکاری تھے' عورتیں ان کا شکار۔

وٹے سٹے پر عملدرآمد عام تھا۔ اس کی ابتدا یرغمال بنانے کے قدیم دستور سے ہوئی ہو گی۔ جب ایک قبیلے کی عورت کسی دوسرے قبیلے میں بیاہی جاتی تو عورت کا بھائی اپنے بہنوئی کی بہن کو بیوی بنا کر لے آتا۔ اس کارروائی سے اپنی عورت کے حقوق کا تحفظ منظور تھا۔ اپنی بیوی سے

بد سلوکی کرنے والے شوہر کو بخوبی علم ہوتا کہ اس کی بہن کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ چنانچہ شادیاں ایک قسم کا دباؤ ہوتیں جن کی وجہ سے فریقین بد خلقی سے باز رہتے۔

جب بدلے میں بیوی لانے کے لئے دلہن کا کوئی بھائی نہ ہوتا تو چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو دلہن کے باپ سے بیاہ دیا جاتا۔

عورتوں کو بکاؤ مال سمجھا جاتا۔ ان کا فرض منصبی یہ تھا کہ کام کریں، گھر کو صاف ستھرا رکھیں، کھانا پکائیں، بچے جنیں، مرد کو لذت بہم پہنچائیں اور مار کھائیں۔ حقوق صفر، فرائض ہزاروں۔

مردوں میں شکار کے لئے جو میلان خاطر پایا جاتا تھا اس میں پرانے وقتوں سے اب تک کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس خمار کا تعلق ان کے ماضی سے تھا۔ انہیں خونریزی کا شوق تھا اور چھپ کر شکار کا پیچھا کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ جانور کو تکلیف سے تڑپتا دیکھ کر ان کو حال آنے لگتا۔

مصطفیٰ اور اس کے بھائیوں کے لئے زندگی شکار سے عبارت تھی۔ وہ زبردست کھوجی تھے اور اپنے صید کی تلاش میں کئی کئی دن گھر سے غائب رہتے۔ شکار زیادہ تر گھوڑے پر چڑھ کر لیکن کبھی کبھار پاپیادہ بھی کیا جاتا۔ وہ تیتر سے لے کر سانپ تک ہر چیز مارنے پر تلے رہتے۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ جس چیز کا شکار کیا جا رہا ہے وہ حرام ہے یا حلال۔ شکار کرنے کا عمل زیادہ اہم تھا۔ اوسکر وائلڈ کا قول کہ "جو ناگفتنی ہیں وہ خوردنی کو کھدیڑنے چلے ہیں" مکمل طور سے ان پر منطبق ہوتا۔

جب شکار کا موسم نہ ہوتا تو یہ لڑکے لاٹھیوں سے لیس ہو کر اس انتظار میں کھڑے رہتے کہ سانپ جھاڑیوں سے کب باہر آتا ہے۔ اگر سانپ ریڑواں چال چلتا پٹی پٹائی لیک پر آنے کی غلطی کرتا تو لڑکے حملہ کر کے اسے فوراً مار ڈالتے۔ سانپ کی تاک میں وہ گھنٹوں کڑی دھوپ میں کھڑے رہتے۔ شکار بجائے خود نشہ تھا۔ شکار کھیلنے سے مصطفیٰ کے ریفلیکس تیز ہوئے۔ ہمت اور قوت برداشت بڑھی۔ چالوں گھاتوں کی سمجھ حاصل ہوئی۔ اس نے سیکھا کہ بہلا پھسلا کر، دم دے کر، کسی کو جال میں کس طرح پھنسایا جاتا ہے۔ کسی سیاستدان کے لئے، خصوصاً اس ملک میں، اس سے بہتر مکتب کوئی نہیں۔

خون کی پیاس بجھنے میں نہ آتی۔ جب کرنے کے لئے کچھ اور نہ ہوتا تو لڑکے رینگ کر چوزوں کے دڑبے میں جا گھستے اور چوزوں کی گردنوں کو اتنا مروڑتے کہ وہ جھٹ سے الگ ہو جاتیں۔ بے سر کے چوزے کو اذیت کے مارے تڑپتا اور اپنے کپڑوں کو اس کے لہو کی پھوار سے رنگین ہوتا دیکھ کر انہیں بڑا مزہ آتا، یہاں تک کہ چوزہ پھڑپھڑا کر ان کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتا، آخری بار جھرجھری لیتا اور دم توڑ دیتا۔

شکار ان کے ہاتھ آ جاتا تو وہ ضیافت کا اہتمام کرتے۔ وہ سب کے سب کھانا پکانے میں ماہر

تھے اور اس مہارت پر انہیں خاص فخر تھا۔ وہ گوشت خور تھے۔ انہیں گوشت کھانے میں مزہ آتا تھا۔ سبزی سے انہیں مطلق ذوق نہ تھا اور وہ سبزی خوروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ گوشت کو دیر تک شاذ و نادر ہی پکایا جاتا۔ وہ ایسا گوشت کھانے کو ترجیح دیتے جسے تھوڑی دیر پکایا گیا ہو اور جس میں خون کی ذرا ذرا سی پھٹکیاں ابھی نظر آ رہی ہوں۔ تہذیب ان کی وحشیانہ جبلتوں کو رام نہیں کر سکی تھی۔

جس علاقے میں یہ قبیلہ آباد ہے وہ بہت بنجر اور خشک ہے۔ گرمیوں میں غضب کی گرمی پڑتی ہے۔ سیم اور تھور کے دہرے مسئلے کی وجہ سے بیشتر زمین کسی کام کی نہیں۔ ماحول درشت ہے، لوگ غریب ہیں۔ زندگی جہد مسلسل ہے۔ صعوبت کے حقیقی ہونے میں کلام نہیں۔ آب و ہوا بے رحم اور کٹھور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آب و ہوا کی انہی خصائص کو علاقے کے باشندوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔

مصطفیٰ کے خاندان کا سیاست کو طرف جھکاؤ نہ تھا۔ اس کے والد کا اختیار بہت بڑے علاقے پر تھا لیکن ان کی نظر میونسپل سطح سے آگے نہیں جاتی تھی۔ انہیں قومی سیاست کی منجدھار میں قدم رکھنے کا کوئی ارمان نہ تھا۔ وہ انتظامیہ سے دور رہنے اور سماجی کام پر توجہ مرکوز رکھنے کے قائل تھے۔ جب مشتاق احمد گورمانی پنجاب کا گورنر بنا تو گورمانی قبیلے کی طاقت بڑھ گئی۔ گورمانی ساتھ کے علاقے میں آباد تھا اور وہ مقامی سیاست میں ٹانگ اڑانے لگے۔ گورمانیوں کا اپنی حدود سے تجاوز مصطفیٰ کے خاندان پر گراں گزرا۔ نوکر شاہی، جو کھر خاندان کا احترام کرتی آئی تھی، اب جانبدار نظر آنے لگی۔ پولیس نے گورمانی قبیلے کی غیر قانونی حرکتوں کا نوٹس لینا چھوڑ دیا۔ کھروں کو پتہ چلا کہ اگر انہوں نے قومی سطح پر اپنا لوہا نہ منوایا تو وہ ماتحت بن کر رہ جائیں گے۔ انہیں بڑا کھلا کہ ان پر دھونس جمائی جا رہی ہے اور ان کی طاقت کی جو روایتی اساس تھی وہ رفتہ رفتہ کھوکھلی ہو چلی ہے۔ کھروں پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ ان کے اپنے لوگوں میں بے چینی پھیل گئی اور وہ ان کی بہ نسبت گورمانیوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کرنے لگے ہیں۔ کھروں کو پہلی بار انصاف میں تاخیر سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے دیکھا کہ گورمانیوں سے روایتی رقابت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے پانی کے وسائل کا رخ یا تو موڑ دیا گیا ہے یا ان کے بالکل بند ہو جانے کی نوبت آ گئی ہے۔

فیصلہ کیا گیا کہ اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر اور گورمانیوں کی یلغار کا توڑ کرنے کے لئے کھر خاندان قومی سیاست میں حصہ لے گا۔ مصطفیٰ کھر چوبیس سال کا تھا۔ یہ ۱۹۶۲ء کا ذکر ہے اور محدود حق رائے دہی کے تحت قومی اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے۔ مصطفیٰ نے قومی اسمبلی کی ایک نشست کے لئے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بالکل ہی مورکھ تھا۔ علاقے کے روایتی خاندان اور اقتدار کا سودا کرانے والے اسے جانتے تک نہ تھے۔ مصطفیٰ ان حقائق سے بد

ں نہ ہوا۔ کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کے سربراہ کی خدمت میں وہ حاضر نہ ہوا ہو۔ اس نے ہر ایک کے سامنے وضاحت سے اپنی سیاست اور معتقدات پر روشنی ڈالی۔ لغاریوں کے روپ میں اسے اتحادی مل گئے۔ لغاری گورمانیوں کے رقیب تھے۔ مصطفیٰ نے بڑی مستقل مزاجی سے بالکل نچلی سطح پر مہم چلائی تو اسے خاصی حمایت حاصل ہو گئی۔ جس آسانی سے وہ انتخاب جیتا اس پر سارے سیاسی پنڈت حیرت زدہ رہ گئے۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب اسے سوچ کر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی کہ سب لوگوں کی نظریں اسی پر جمی ہوئی ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب اسے پہلی بار بنیادی جمہوریت کے اراکین سے بھرے ہوئے کمرے میں تقریر کرنی پڑی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ یہ بات مصطفیٰ نے چوبیس سال بعد اس وقت بتائی جب میں جلسہ عام میں پہلی تقریر کی تیاری میں مشغول تھی۔

گورمانی جیسے گرم و سرد چشیدہ سیاستدان کے خلاف مصطفیٰ کی جیت پر مصطفیٰ کے والد خوش ہوئے۔ انعام کے طور پر انہوں نے اسے سات لاکھ روپے دیئے۔ تازہ تازہ ہاتھ آنے والی اس دولت سے مصطفیٰ نے بہت سی کاریں خرید لیں۔ وہ کیڈلک یا اولڈز موبیل میں بڑے دھوم دھڑکے سے پارلیمینٹ جایا کرتا۔ اسے بھڑکیلی امریکی کاروں سے عشق تھا۔ بعض اوقات وہ ایک کار کو تو خود چلاتا اور باقی کاروں کے ڈرائیوں کو حکم دیتا کہ کار جلوس کی صورت میں اس کے پیچھے پیچھے آئیں۔ اس کو یہ سجھائی نہ دیا کہ امارت کی اس نمائش کو معاشرے کا چیدہ ترین طبقہ نیا نیا پیسہ ہاتھ آجانے کا اظہار سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

پارلیمینٹ میں مصطفیٰ کو اپنی نشست پر بیٹھے رہنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ وہ ابھی تک پینڈو نوجوان تھا اور اسے اپنے پینڈو ہنے کا احساس بھی بہت تھا۔ وہ بعض مقطع ارکان کے بے تکان طمطراق کو تحسین بھری نظر سے دیکھتا۔ ان کی تقریریں سنتے سنتے اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ سرعام موثرانداز میں تقریر کرنے کی صلاحیت کتنی طاقت کی حامل ہے۔ اس نے منظور قادر، بھٹو صاحب، صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان اور نواب کالا باغ کی تقریریں سنیں اور ان کی مدد سے تقریر کرنے کے فن کو سمجھا۔ اس نے خود اسمبلی میں ایک بار بھی تقریر نہیں کی۔ اسے پارلیمینٹ کے سب سے غیراہم رکن ہونے کی شہرت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔

مصطفیٰ نے مجھے بتایا کہ پارلیمینٹ کا رکن بننے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے جان لیا تھا کہ اب سیاسی اثر و رسوخ کے بغیر جاگیردارانہ دنیا اپنا کام نہیں چلا سکتی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ کسی بااختیار مقام پر فائز ہوئے بغیر وہ اپنے متوسلین اور اپنی املاک کے لئے انصاف حاصل نہیں کر سکتا۔ پارلیمینٹ نے اسے قانونی جواز اقتدار اور تحفظ فراہم کر دیا۔

قومی اسمبلی میں مصطفیٰ نے دیکھا کہ اسے سندھ سے تعلق رکھنے والے ایک ساتھی جاگیردار غلام مصطفیٰ جتوئی، کے پہلو میں نشست ملی ہے۔ ان کے نام کے پہلے دو جز تو مشترک تھے ہی،

ان کے درمیان اور بھی بہت سے پہلو اشتراک کے نکل آئے۔ ان میں دوستی ہو گئی جس کے نتیجے میں ہنگامہ خیز برسوں کا فرق نہ آسکا۔ جتوئی صاحب سندھ کے سب سے بڑے جاگیردار خاندانوں میں سے ایک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ وڈیروں کی ایک بڑی منڈلی کے قائد تھے اور انہیں اسمبلی میں اچھا بھلا رسوخ حاصل تھا۔ جتوئی صاحب کو کیا خبر تھی کہ ایک دن خود اپنے انتخابی حلقے کی طرف سے مسترد ہو جانے کے بعد کوٹ ادو سے آنے والا یہ کچا نوجوان انہیں قومی اسمبلی کی نشست کی پیشکش کرے گا۔

بھٹو صاحب جتوئی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہی حال صدر مملکت کا تھا۔ ایوب خان شکار کھیلنے کی غرض سے اکثر جتوئی صاحب کے پاس نواب شاہ جاتے رہتے تھے۔

اس زمانے کے بیشتر نوجوانوں کی طرح مصطفیٰ بھی بھٹو صاحب کی مقناطیسی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو گیا جنہیں یکے بعد دیگرے ایندھن اور قدرتی وسائل، کامرس اور امور خارجہ جیسی اہم وزارتیں سنبھالنے کا موقع ملا تھا۔ مصطفیٰ نے جتوئی صاحب سے کہا کہ اسے اس آتش بجاں پارلیمنٹرین سے متعارف کرایا جائے۔ تعارف کرا دیا گیا۔ یہ ایک ایسے پیچ در پیچ تعلق کی ابتدا تھی جو سدا محبت اور نفرت کی انتہاؤں کے درمیان جھولتا رہا۔

۱۹۶۶ء میں بھارت کے ساتھ تاشقند معاہدے کے بعد بھٹو صاحب وزیر خارجہ کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ پاکستان کی مسلح افواج نے جو کچھ میدان جنگ میں جیتا تھا وہ سب ایوب خان نے گفت و شنید کے دوران گنوا دیا۔ تاشقند کو ایوب خان کا واٹرلو ثابت ہونا تھا۔ بھٹو صاحب نے اسے بچ کر جانے کا موقع نہ دیا۔

کابینہ سے مستعفی ہونے کے بعد بھٹو صاحب نے راولپنڈی سے کراچی جانے کی ٹھانی۔ وہ راولپنڈی سے ایک ٹرین پر سوار ہوئے۔ کوٹ ادو کے نوجوان ایم این اے کے سوا کوئی آدمی انہیں الوداع کہنے سٹیشن پر نہ پہنچا۔ بھٹو صاحب مصطفیٰ سے سٹیشن پر مل کر بہت خوش ہوئے۔ مصطفیٰ کی اس ادا نے ان کے دل پر اثر کیا۔ انہوں نے مصطفیٰ کی جرات مندی پر اظہار خیال کیا۔ بھٹو صاحب اب سیاسی اچھوت تھے اور لوگ اس ڈر سے ان کے پاس نہ پھٹکتے تھے کہ کہیں ان پر ایوب خان اور کالا باغ کا قہر نازل نہ ہو جائے۔ مصطفیٰ نے اپنا پسندیدہ قول دہرایا۔ "وقت بتائے گا"۔

بھٹو صاحب کراچی چلے آئے اور جلد ہی مصطفیٰ ان کے پاس آگیا۔ دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ برے وقتوں کے ساتھی۔ اس شراکت سے دونوں کا فائدہ پہنچا۔ بھٹو صاحب نے مصطفیٰ کی دلیری، خلقی مکاری اور نئی باتوں کو بہت جلد جزو ذہن بنا لینے کی اہلیت کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ وہ کھر پر بلا تامل اعتماد کر سکتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ مصطفیٰ کا مشاہدہ تیز ہے، وہ ذہین ہے۔ مزید براں یہ کہ اس کی نظر میں وہ کسی دیوتا سے کم نہیں۔ بھٹو صاحب نے مصطفیٰ کے فیصلوں پر

بھروسہ کرنا شروع کر دیا۔ مصطفیٰ نے بھی کان لگا کر عوام کے دلوں کی دھڑکن سنی اور بھٹو صاحب اس کے اندازوں پر تکیہ کرنے لگے۔

مصطفیٰ ستر کلفٹن میں بھٹو صاحب کے پاس مقیم تھا۔ بھٹو صاحب نے اس کی ذات میں گہری دلچسپی لینی شروع کی۔ انہوں نے نوجوان سے کہا کہ بعض مصنفوں کو پڑھو اور اسے سیاسی تھیوری کی اونچ نیچ خود سمجھانے لگے۔ وہ روزانہ بڑی تفصیل سے سوال پوچھتے تاکہ پتہ چلے کہ مصطفیٰ نے جو پڑھا ہے اسے کس حد تک سمجھ سکا ہے۔ انہوں نے مصطفیٰ کو لباس پہننے کی تمیز بھی سکھائی۔ نواجوان زمیندار جلد ہی اپنی کر مپلین پتلونوں' ٹیری لین قمیصوں اور سینڈلوں سے بے نیاز ہو گیا۔ بھٹو صاحب کسی چھیل چھبیلے جیسا لباس پہنا کرتے تھے اور مصطفیٰ پوشاک کی حد تک ان کے اسلوب کی تقلید کرنے لگا۔ بھٹو صاحب اپنی ٹرن بل اور ایسر کی قمیضیں مصطفیٰ کو دیتے رہتے جو اب خوش قطع سوٹ پہننے لگا تھا۔

مصطفیٰ کو ایک نئی دنیا سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ وہ اب ایسے لوگ کے درمیان تھا جن کا رہن سہن نفاست کا آئینہ دار تھا۔ وہ ستر کلفٹن میں گھوم پھر کر وہاں کی زیبائش اور ساز و سامان کو ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔ یہ اور ہی دنیا تھی جس کا اس کے اپنے گئے گزرے گھر سے دور کا بھی تعلق نہ تھا"۔ (ا)

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں غلام مصطفیٰ کھر پیپلزپارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ مسٹر بھٹو انہیں اپنا سیاسی جانشین قرار دیتے تھے۔ جب پیپلزپارٹی برسر اقتدار آئی تو مسٹر کھر کو پنجاب کا گورنر بنایا گیا اور اس کے ساتھ وہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون اے بنائے گئے۔ بطور گورنر انہوں نے اپنے اختیارات کا اندھا دھند استعمال کیا ان کے زمانہ اقتدار کے دوران پولیس کی ہڑتال بھی ہوئی۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے بعد وہ پنجاب کے وزیراعلیٰ بنائے گئے ان کے دور میں مخالف سیاستدانوں پر تشدد کیا گیا اور بعض سیاستدانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اس سے پیپلزپارٹی کی حکومت کی بڑی بدنامی ہوئی ان کے دور پر سیاسی اور سماجی حلقے فخر نہیں کر سکتے۔ وہ مخالف عناصر کو تشدد کے ذریعے مرعوب کرنا چاہتے تھے تاہم ان کی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دیہی علاقوں میں رسہ گیری نظام کا خاتمہ کر دیا اور لوگوں کو صدیوں پرانے اس جابرانہ اور ظالمانہ نظام سے نجات ملی۔ بیورو کریسی اور قومی اسمبلی میں ایک طبقے نے بڑے منظم انداز میں انہیں اقتدار سے جدا کرنے کے لئے مسٹر بھٹو کو یہ تاثر دیا کہ مسٹر کھر ان کی جگہ لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر بھٹو نے ان کے اردگرد ایسے آدمی مقرر کر دیئے جو ان کی سرگرمیوں کو چیک کرتے بعض خفیہ اداروں نے بھی مسٹر کھر کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے اپنا کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۴ء میں پنجاب میں سیلاب نے تباہ کاریاں پھیلائیں اس وقت مسٹر بھٹو پاکستان کے وزیراعظم تھے وہ پنجاب کے سیلاب زدہ دوروں پر آئے مسٹر کھر بطور وزیراعلیٰ ان کے

ساتھ تھے جھنگ میں ان کی آمد پر پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد کے نعروں کے ساتھ ساتھ جب شیر پنجاب ملک غلام مصطفیٰ کھر زندہ باد کے نعرے لگائے تو مسٹر بھٹو نے اپنے قریب کھڑے ایس پی جھنگ سے کہا کہ کارکنوں کو ڈنڈے مارو- ایس پی جھنگ نے وزیراعظم کے حکم پر جب کارکنوں پر ڈنڈے برسائے تو ملک غلام مصطفیٰ کھر نے نہایت غیظ و غضب کے عالم میں ایس پی سے ڈنڈا چھین کر اسے بری طرح جھٹک دیا- اسی روز سے سیاسی حلقوں میں یہ تاثر پھیلا کہ مسٹر کھر بہت جلد اقتدار سے رخصت ہونے والے ہیں-
اس دوران چار ارکان پنجاب اسمبلی نے مسٹر کھر کے خلاف کھلم کھلا محاذ آرائی کا آغاز کر دیا- ان میں قصور سے چودھری محمد یعقوب مان، گوجرہ سے مسٹر خالد ملک، جہلم سے راجہ منور احمد اور خانیوال ملتان سے نواب ایم- کے خاکوانی شامل تھے- پیپلز پارٹی میں شامل ارکان کی بھاری اکثریت مسٹر کھر کے ساتھ تھی اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ مسٹر بھٹو کبھی بھی مسٹر کھر سے جدا نہیں ہو سکتے اور مسٹر کھر کبھی بھی مسٹر بھٹو سے بے وفائی نہیں کریں گے اور جن لوگوں نے مسٹر کھر کے خلاف بغاوت کی تھی پیپلز پارٹی کے ارکان پنجاب اسمبلی ان کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے رہے کہ چونکہ ان ارکان کو وزارت میں شامل نہیں کیا گیا اس لئے وہ مسٹر کھر کے خلاف ہو گئے ہیں- مسٹر کھر بھی اپنے خلاف چلائی گئی مہم کا صحیح اندازہ لگانے میں ناکام رہے وہ سمجھتے تھے کہ مسٹر بھٹو ان سے جدا نہیں ہوں گے- چنانچہ انہوں نے ایک مخالف چودھری محمد یعقوب مان کا باغ اور کھڑی فصلیں اجاڑ دیں- اس صورت حال کے پیش نظر مسٹر بھٹو نے مسٹر کھر کو پنجاب کی وزارت اعلیٰ سے محروم کر دیا اور ان کی جگہ اس وقت کے صوبائی وزیر خزانہ مسٹر محمد حنیف رامے کو پنجاب کا وزیراعلیٰ بنایا گیا اور مسٹر کھر کو پنجاب کا گورنر بنایا گیا مگر وزیراعلیٰ اور گورنر میں محاذ آرائی جاری رہی- یہاں تک کہ مسٹر رامے نے بطور وزیراعلیٰ پنجاب کے سیکرٹریوں، کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کو ہدایت کی کہ وہ گورنر ہاؤس سے اپنا رابطہ منقطع رکھیں- جب دونوں اصحاب کی کشمکش اور محاذ آرائی اپنے عروج پر پہنچی تو ان دونوں کو سبکدوش کر دیا گیا- مسٹر رامے سینٹ کے رکن بنائے گئے جبکہ ان کی چھوڑی ہوئی صوبائی نشست جو کہ شاہدرہ اور شاد باغ کے علاقوں پر مشتمل تھی اس پر مسٹر کھر بطور آزاد امیدوار سامنے آئے- پیپلز پارٹی نے اپنا جماعتی ٹکٹ ایک پرولتاری کارکن اور پیپلز پارٹی لاہور کے صدر مسٹر شیر محمد بھٹی کو دیا- حکومت نے ایف ایس ایف کے ذریعے مسٹر کھر کے حامیوں کو راتوں رات گرفتار کیا اور انہیں دلائی کیمپ بھیج دیا- ان میں چودھری محمد ارشاد اور میاں افتخار احمد تاری بھی تھے جو کھر کابینہ میں وزیر رہے- مسٹر کھر نے شاد باغ کے قریب تاجپورہ گراؤنڈ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا جب اس جلسے میں اپنی تقریر کا آغاز کرنے لگے تو ایف ایس ایف کے ذریعے اس جلسہ پر فائرنگ کی گئی جس سے جلسہ گاہ میں وہ بھگدڑ مچی جس سے بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں اور سینکڑوں افراد زخمی

ہوئے۔ جاں بحق ہونے والوں میں زیادہ تعداد بچوں کی تھی۔

میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کے بعد ملک غلام مصطفیٰ کھر پنجاب کے دوسرے سیاستدان تھے جن کے ساتھ بہت سے ارکان قومی و صوبائی اسمبلی ثابت قدم رہے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر اور مسٹر رامے نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ مسٹر رامے کو مسلم لیگ کا چیف آرگنائزر بنایا گیا جبکہ مسٹر کھر مسلم لیگ کے مرکزی نائب صدر تھے۔ مسٹر رامے کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر شاہی قلعہ میں بھی تشدد کیا گیا۔ ان کے حامیوں کو ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں قومی اتحاد کے ٹکٹ بھی دیئے گئے۔ ۱۹۷۷ء میں جب مسٹر بھٹو کے خلاف قومی اتحاد نے اپنی منظم تحریک چلائی تو مسٹر کھر پھر مسٹر بھٹو کے ساتھ شامل ہو گئے اور انہوں نے ایک اجتماع میں قومی اتحاد کے لیڈروں کو کھل کر گالیاں دیں۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد مسٹر کھر نے فوجی حکام کو تاثر دیا کہ وہ مسٹر بھٹو کے خلاف ہیں۔ جنرل چشتی کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اس وقت پیپلز پارٹی کے حامی عناصر نے بیرون ملک بیٹھ کر جنرل ضیاء الحق کے خلاف محاذ آرائی کا آغاز کیا۔ مسٹر کھر کو اس محاذ آرائی کو ختم کرنے کے لئے لندن بھیجا گیا مگر وہ لندن پہنچتے ہی مارشل لاء حکومت کے خلاف ہو گئے۔ ان کے ایک دست راست اور شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ سے سابق ایم پی اے چودھری محمد حنیف اور سابق صوبائی وزیر چودھری محمد ارشاد بھی لندن چلے گئے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر نے صدر ضیاء الحق کے خلاف محاذ آرائی کے لئے مختلف ممالک کا دورہ بھی کیا اور ان کے خلاف پاکستان میں مسلح بغاوت کروانے کی منصوبہ بندی بھی کی۔ مگر یہ راز فاش ہو گیا۔ مارشل لاء کی ایک عدالت نے ایک مقدمہ میں مسٹر کھر کو ان کی غیر حاضری میں سزا بھی سنائی۔ وہ ۱۹۸۶ء میں واپس وطن پہنچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ وزیراعظم جونیجو انہیں رہا کرنے کے حق میں تھے مگر صدر ضیاء الحق کے لئے مسٹر کھر کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ بعض اہم شخصیات نے مسٹر کھر کی رہائی کے لئے وقتاً فوقتاً جب بھی صدر ضیاء الحق سے گفتگو کی انہوں نے یہی جواب دیا کہ کھر میرا دشمن ہے اور یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ انتخابی مہم سے قبل وہ رہا ہوئے ان کی رہائی سے قبل لاہور میں نگران وزیراعلیٰ مسٹر نواز شریف کے قومی اور صوبائی اسمبلی کے حلقوں سے ان کے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے گئے جبکہ ان کے آبائی ضلع مظفر گڑھ سے قومی اسمبلی کی دو اور لیہ ضلع میں صوبائی اسمبلی کی ایک نشست پر بھی ان کے کاغذات نامزدگی جمع کرائے جا چکے تھے۔ وہ اسلام آباد سے لاہور پہنچے اپنے حلقہ انتخاب کا جائزہ لیا پیپلز پارٹی کے کارکن چاہتے تھے کہ انہیں مسٹر نواز شریف کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کا امیدوار نامزد کر دیا جائے مگر پیپلز پارٹی کی قیادت کے لئے مسٹر کھر کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ جس وقت لاہور پہنچنے سے قبل مسٹر کھر دریائے راوی کے پل پر پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی تعریف کر رہے تھے۔ اس وقت بیگم نصرت بھٹو لاہور ائرپورٹ میں اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے خلاف اپنی شدید نفرت کا اظہار کر رہی

تھیں۔ دوسرے پنجاب میں پیپلز پارٹی کی قیادت کے لئے مسٹر کھر ناقابل برداشت تھے۔ پیپلز پارٹی کے سابق صدر مسٹر جہانگیر بدر نے ۱۹۸۶ء میں ان کے خلاف زبردست مہم چلائی۔ بیگم بے نظیر بھٹو بھی مسٹر کھر کو پیپلز پارٹی کی صفوں میں جگہ دینے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ پیپلز پارٹی پنجاب کے صدر رانا شوکت محمود بھی ان کے خلاف تھے یہی وجہ تھی کہ لاہور میں پنجاب کے نگران وزیر اعلیٰ مسٹر نواز شریف کے مقابلے میں جب پیپلز پارٹی نے انہیں اپنا امیدوار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے لاہور میں اپنے حلقے کے دو تین چکر لگائے۔ پیپلز پارٹی کے جھنڈے کو سلامی دی اور مظفر گڑھ چلے گئے مظفر گڑھ جانے سے قبل وہ لاہور سے انتخاب لڑنے سے ہی دستبردار ہو گئے۔ (۲)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں غلام مصطفیٰ کھر نے دو حلقوں سے کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں انہوں نے اپنی ایک خالی کردہ نشست اپنے دیرینہ دوست غلام مصطفیٰ جتوئی کو پیش کر دی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اس نشست پر کامیاب ہونے کے بعد نہ صرف کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز کے سربراہ بن گئے بلکہ بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد نگراں وزیر اعظم بھی بنائے گئے۔

ادھر غلام مصطفیٰ کھر واپس پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے انہوں نے بے نظیر حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد کو ناکام بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مگر جلد ہی پیپلز پارٹی کے جیالوں سے ان کے اختلافات کی خبریں عام ہونے لگیں اور بے نظیر حکومت کے خاتمے سے چند ہفتے پہلے وہ پیپلز پارٹی سے باہر آ گئے۔ ۶ر اگست ۱۹۹۰ء کو جب غلام مصطفیٰ جتوئی نگراں وزیر اعظم بنائے گئے تو غلام مصطفیٰ کھر ان کی نگراں کابینہ میں وزیر داخلہ کے طور پر شامل تھے۔ (۳)

۱۹۹۰ء کا انتخاب علام مصطفیٰ کھر نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑا۔ وہ قومی کی دو اور صوبائی کی ایک نشست پر امیدوار تھے۔ تینوں ہی نشستوں پر وہ کامیاب ہوئے۔ بعد ازاں انہوں نے قومی کی ایک اور صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی جس پر علی الترتیب غلام مصطفیٰ کھر کے بھائی غلام محمد نور ربانی کھر اور ملک محمد رفیق کھر کامیاب ہو گئے۔ ان دونوں امیدواروں کو آئی جے آئی نے ٹکٹ عطا کیا تھا۔ (۴)

نواز شریف حکومت کے دوران غلام مصطفیٰ کھر پیپلز پارٹی کا ساتھ دیتے رہے۔ ۱۹۹۲ء کے اواخر میں جب اپوزیشن پارٹیوں نے این ڈی اے تشکیل دیا تو غلام مصطفیٰ کھر اس نئے اتحاد میں شامل ہو گئے۔ (۵)

نواز شریف حکومت کے خاتمے کے بعد انہوں نے چوتھی مرتبہ پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور لاہور سے نواز شریف کے مقابلے میں قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا اعلان کیا۔ تاہم اس سے قبل کہ ان انتخابات کا انعقاد ہوتا وہ اس حلقہ سے دستبردار ہو گئے۔ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں ملک غلام مصطفیٰ کھر اپنے روایتی حلقہ ہائے انتخاب این اے ۱۳۷ مظفر گڑھ ۳، این اے ۱۳۸ مظفر گڑھ ۴ اور پی

پی ۲۱۳ مظفر گڑھ ۷ سے امیدوار تھے وہ ان تینوں حلقوں سے کامیاب ہوئے (۶) بعد ازاں انہوں نے این اے ۱۳۷ مظفر گڑھ ۳ اور پی پی ۲۱۳ مظفر گڑھ کی نشست خالی کر دی۔ جس پر بالترتیب ان کے بھائی غلام محمد فخر رسول عربی کھر اور ان کے بیٹے بلال مصطفیٰ کھر کامیاب ہوگئے (۷) غلام مصطفےٰ کھر بعد ازاں بے نظیر بھٹو کی کابینہ میں بجلی اور پانی کے وزیر کے طور پر شامل کیے گئے۔ (۸)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں غلام مصطفےٰ کھر نے این اے ۱۳۸ مظفر گڑھ ۴ سے انتخاب لڑا مگر وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے میاں غلام عباس قریشی سے بری طرح شکست کھا گئے (۹) ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ ہی نہیں لیا (۱۰)

غلام مصطفیٰ کھر کے کئی بھائی ہیں جن میں سے اکثر ایم این اے یا ایم پی اے رہ چکے ہیں۔ ان کے ایک بھائی غلام محمد مجتبیٰ غازی کھر مرحوم ۱۹۸۵ء میں این اے ۱۳۸ مظفر گڑھ ۲ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۱)

۱۹۸۵ء میں ان کے ایک اور بھائی غلام محمد مرتضیٰ کھر بھی این اے ۱۲۹ مظفر گڑھ ۳ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے اپنے بھائی غلام مصطفیٰ کھر کا مقابلہ کیا۔ مگر اس مرتبہ ہو کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۲)

انہوں نے ۱۹۹۷ء میں بھی آزاد امیدوار کی حیثیت سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب لڑا مگر دونوں میں کامیاب نہ ہو سکے (۱۳)

ان کے تیسرے بھائی ملک غلام محمد نور ربانی کھر ۱۹۸۵ء سے مسلم لیگ میں شامل ہیں۔ ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء تینوں عام انتخابات میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیتا۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۷ء تک انہوں نے نواز شریف کی کابینہ میں ماہی پروری اور جنگلی حیات کے وزیر کے طور پر خدمات انجام دیں تاہم بعد میں انہیں لوکل گورنمنٹ اور اوقات کی اسٹینڈنگ کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ (۱۴)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات کے بعد جب ملک غلام مصطفیٰ کھر نے قومی اسمبلی کی نشست این اے ۱۳۷ مظفر گڑھ ۳ خالی کی تو وہ اس نشست پر منعقد ہونے والے ضمنی انتخاب میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔ بعد ازاں ان کی اپنی خالی کردہ صوبائی اسمبلی کی نشست پر ان کی اہلیہ سمیرا کھر کامیاب ہوگئیں۔ اس نشست پر دوسرے امیدواروں کے علاوہ ملک غلام محمد نور ربانی کھر کے بھائی ملک غلام مرتضیٰ کھر اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کے صاحبزادے ملک عبدالرحمٰن کھر بھی امیدوار تھے۔ (۱۵)

۱۹۹۳ء کے بحران میں ملک نور ربانی کھر نے پاکستان مسلم لیگ (جونیجو گروپ) کا ساتھ دیا۔ جس کے انعام کے طور پر وہ میر بلخ شیر مزاری کی نگران کابینہ میں مشیر کے درجہ پر فائز کئے گئے تھے۔

(۱۶) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں ملک نور ربانی کھر نے پاکستان مسلم لیگ (ج) کے ٹکٹ پر این اے ۱۳۷ مظفر گڑھ ۳ سے کاغذات نامزدگی داخل کروائے۔ پیپلز پارٹی نے یہ حلقہ انتخابی ایڈجسٹمنٹ کے تحت جونیجو گروپ کے لئے اوپن چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے خیال تھا کہ ملک غلام مصطفیٰ کھر اس حلقے سے انتخاب نہیں لڑیں گے۔ مگر جب غلام مصطفیٰ کھر نے اس حلقہ سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کاغذات نامزدگی جمع کروائے تو ملک نور ربانی کھر نے اس کی شکایت اپنی پارٹی کے سربراہ حامد ناصر چٹھہ سے کی۔ حامد ناصر چٹھہ نے یہ شکایت بے نظیر تک پہنچائی۔ بے نظیر بھٹو نے جب غلام مصطفیٰ کھر سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ملک نور ربانی کھر اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ مسلم لیگ (ن) کے امیدوار میاں احسان کریم قریشی اور اسلامک فرنٹ کے لیاقت بلوچ کا مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ بے نظیر بھٹو بھی خاموش ہوگئیں۔ ۶ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو جب اس حلقہ کے نتائج سامنے آئے تو غلام مصطفیٰ کھر کامیاب ہو چکے تھے۔ (۱۷) یہی حال صوبائی اسمبلی کی نشست پی پی ۲۱۲ مظفر گڑھ ۶ کا ہوا۔ یہاں ملک نور ربانی کھر کو توقع تھی کہ پی ڈی ایف انہیں یا ان کی اہلیہ سمیرا کھر کو ٹکٹ عنایت کرے گا مگر یہاں بھی غلام مصطفیٰ کھر کی جوڑ توڑ کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کا ٹکٹ ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کھر کو مل گیا اور ملک نور ربانی کھر اور سمیرا کھر دونوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ (۱۸) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں ملک غلام محمد نور ربانی کھر نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور اپنے بھائی ملک غلام محمد فخر رسول عربی کھر سمیت تمام امیدواروں کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے البتہ صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں وہ کامیاب نہ ہو سکے (۱۹)

۲۰۰۲ء کے انتخابات میں ان کی صاحبزادی حنا ربانی کھر نے این اے ۱۷۷ مظفر گڑھ ۲ سے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور اپنے قریب ترین حریف خالد احمد گورمانی کو ۳۴۳ ووٹ سے شکست دے کر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ اس انتخابی معرکے میں ان کے کزنز ملک محمد شاہ نواز کھر اور ملک محمد باسط کھر بھی حصہ لے رہے تھے (۲۰)

پی پی ۲۱۲ مظفر گڑھ ۶ سے غلام مصطفیٰ کھر کے بھیجتے ملک محمد فاروق کھر پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدوار تھے مگر : کامیاب نہ ہو سکے (۲۱) ملک محمد فاروق کھر جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ۱۹۹۱ء کے ضمنی انتخابات میں اسی حلقہ سے ایم پی اے منتخب ہوئے تھے۔ غلام مصطفیٰ کھر کے ایک اور بھائی ملک غلام محمد فخر رسول عربی کھر نے ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں غلام مصطفیٰ کھر سے قومی اسمبلی کی نشست پر شکست کھائی تھی۔ (۲۲) ۱۹۹۳ء کے ضمنی انتخابات میں وہ این اے ۱۳۷ سے ایم این اے منتخب ہوئے ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں انہوں نے اپنے بھائی ملک محمد نور ربانی کھر سے شکست کھائی (۲۳) تاہم ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں غلام مصطفیٰ کھر کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کھر بھی سیاست کے

میدان میں قدم رکھ چکے ہیں۔ اس انتخاب میں انہوں نے پی پی ۲۱۱ مظفر گڑھ ۵ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر امجد حمید دستی سے شکست کھا گئے تھے۔ (۲۴) ۱۹۹۰ء میں بھی وہ اس نشست پر دوبارہ امجد حمید دستی سے ہار گئے۔ (۲۵) ۱۹۹۱ء میں وہ ملک نور ربانی کھر کی خالی کردہ نشست پر ضمنی انتخاب کے امیدوار بھی تھے مگر اس مرتبہ بھی وہ یہ انتخاب جیت نہیں سکے اور اپنی چچی سمیرا کھر سے شکست کھا گئے۔ (۲۶) تاہم ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں وہ اپنے چچاؤں ملک محمد فاروق کھر اور ملک غلام محمد نور ربانی کھر کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۲۷)۔

۱۹۹۷ء میں عبدالرحمٰن کھر نے صوبائی اسمبلی کی دو نشستوں پر انتخاب لڑا مگر دونوں پر کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک نشست پر انہیں امجد حمید دستی نے ہرایا اور دوسری پر انہیں ان کے چچا ملک محمد فاروق کھر نے شکست دی۔ کامیاب ہونے والے دونوں امیدواروں کا تعلق پاکستان مسلم لیگ (ن) سے تھا جب کہ عبد الرحمٰن کھر نے یہ انتخاب آزاد حیثیت میں لڑا تھا (۲۸) ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ملک غلام مصطفیٰ کھر کے ایک اور صاحبزادے بلال مصطفیٰ کھر بھی ۱۹۹۳ء کے ضمنی انتخابات میں ایم پی اے منتخب ہو چکے ہیں جب کہ ان کے کزن طاہر سلطان میلادی کھر ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں ایم پی اے منتخب ہوئے تھے (۲۹) ۱۹۹۳ء کے بعد بلال مصطفیٰ کھر نے کسی انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ البتہ طاہر سلطان میلادی کھر نے ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء دونوں عام انتخابات میں حصہ لیا اور دونوں میں شکست کھائی۔ ۱۹۹۷ء میں انہیں ملک محمد رفیق کھر نے ہرایا (۳۰) جب کہ ۲۰۰۲ء میں انہیں طارق احمد گورمانی کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی (۳۱) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں اسی خاندان کے ملک جاوید کامران کھر بھی مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے ہیں (۳۲)

حوالہ جات

۱۔ تہمینہ درانی۔ مینڈا سائیں۔ لاہور۔ ص ۳۴۱ تا ۳۵۱

۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۹۵ تا ۲۹۹

۳۔ عدنان عادل۔ ونس اے لوٹا، آل ویز اے لوٹا۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۱۹/تا ۲۵/اگست ۱۹۹۳ء

۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔ جلد دوم۔ ص ۶۰، ۶۱، ۵۳۷، ۵۴۴

۵۔ منیر احمد۔ پاکستان کے سیاسی اتحاد۔ لاہور۔ ص ۱۷۹ تا ۱۸۴

۶۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۹۴ء ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۴۳۰

۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳ر دسمبر ۱۹۹۳ء
۸۔ ایضاً۔ ۲۷ر جنوری ۱۹۹۴ء
۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۳
۱۰۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۹۲
۱۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۲۴۷
۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۹۹
۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۲، ۳۹۱
۱۴۔ پنجاب اسمبلی ۱۹۸۷ء۔ گولڈن جوبلی سوونیئر۔ لاہور۔ ص ۶۲
۱۵۔ شیخ ریاض پرویز۔ کھر برادران میں صلح ممکن نہیں۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۵ر مارچ ۱۹۹۱ء
۱۶۔ شیخ ریاض پرویز۔ کھر برادران میں صلح ہوگئی۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۳ر اگست ۱۹۹۳ء
۱۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۹۴
۱۸۔ ایضاً۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۳۰
۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۳، ۳۹۰
۲۰۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۹۴۶
۲۱۔ ایضاً۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۳۰
۲۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۹۵
۲۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰ فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۲۳۰
۲۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۰۱
۲۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۲۵۲
۲۶۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۲ مارچ ۱۹۹۱ء۔ ص ۳۴۷
۲۷۔ ایضاً۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۳۰
۲۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۸۹، ۳۹۰
۲۹۔ امان اللہ خان (مرتب)۔ ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۳ء۔ لاہور۔ ص ۲۹۰، ۲۹۱
۳۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد ۱۹۹۷ء۔ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۹۲
۳۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۲۰۴
۳۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم ص۔ ۲۰۵

کھرل

اوکاڑہ سے گوگیرہ کی طرف سفر کریں تو دریائے راوی کے دونوں کناروں پر کھرل قوم کے گاؤں اور دیہات نظر آتے ہیں جہاں یہ برادری صدیوں سے آباد ہے۔ اس برادری کی آبادی کا پھیلاؤ گوگیرہ سے جڑانوالہ اور تاندلیانوالہ تک اور پھر جڑانوالہ سے کھڑایانوالہ اور پھر ننکانہ اور وار برٹن سے سیدوالا تک کھرل برادری کی مختلف گوتیں آباد ہیں۔

کھرل اپنا شجرہ نسب راجہ کرن چندر بنسی سے ملاتے ہیں جو ہستنا پور کا مشہور راجہ تھا۔ انگریز کی نگاہ میں کھرل ایک جرائم پیشہ قبیلہ تھا۔ جس کا کام قتل و غارت اور مار دھاڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد کھرل مجاہدین کی صف میں شامل ہو گئے جن کو ہندو اقتدار ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ دیوان ساون مل اور سکھوں نے ان کے مجاہدانہ جوش و خروش کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ لیکن گورا فوج کی وحشت و بربریت کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ جا سکی۔

کھرل خاندان کا سربراہ کمال خاں تھا۔ جس نے سولھویں صدی میں جھنگ سے چالیس میل جانب جنوب کوٹ کمالیہ آباد کیا۔ یہاں سیال بھی رہتے تھے۔ کھرلوں کا دعویٰ تھا کہ سیال راجپوتوں کی طرف سے ان کے عزیز ہیں۔ اس کے باوجود دونوں قبائل کی آپس میں سر پھٹول ہوتی رہتی تھی ایک دفعہ دہلی کا کوئی شہزادہ راستہ بھول کر ادھر جا نکلا۔ اس وقت کمال خان کا چوتھا وارث سعادت یار خاں کمالیہ کا سردار تھا۔ شہزادہ اس کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے زور دے کر کھرلوں اور سیالوں کی آپس میں صلح کرا دی اور یہ تجویز پیش کی کہ جھنگ سیال کا آٹھواں سردار غازی خاں اپنی بیٹی کی شادی سعادت خاں سے کر دے۔ اس پر جھنگ کے سردار برافروختہ ہو گئے اور انہوں نے شہزادے کو قتل کر دیا۔ تاہم بعد میں شہزادے کے ساتھیوں نے بھی سردار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

پنجاب کی مشہور رومانی داستاں مرزا صاحباں کا مرکزی کردار مرزا بھی کھرل خاندان کا چشم و

چراغ تھا۔ مرزا اس قبیلہ کی شاہی شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے اپنی ایک خالہ زاد صاحباں سے محبت ہو گئی۔ وہ بھی مرزا پر جان چھڑکنے لگی۔ تاہم صاحباں ایک شخص خان زاد سے منسوب ہو چکی تھی۔ اس کے والدین نے دونوں کی شادی رچائی تو عین جس وقت بارات آئی مرزا نے صاحباں کو اغوا کر لیا اور اسے اپنی گھوڑی "بکی" پر بٹھا کر دھن آباد کی جانب فرار ہو گیا۔ کھرل خاندان کے افراد نے اس کا پیچھا کیا اور آخر اسے اپنے اڈے پر پہنچنے سے پہلے ہی جا لیا مرزا نے بڑی شجاعت سے مقابلہ کیا لیکن اتنے افراد کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ جا سکی اور وہ جان سے مارا گیا۔ خان زاد نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح صاحباں کی جان بچ جائے لیکن کھرلوں نے اسے اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ سمجھا اور اس کا بھی گلا گھونٹ ڈالا۔ اس کے بعد کھرلوں میں لڑکی کی پیدائش کو منحوس سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ جب بھی کسی کھرل کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی اس کا گلا گھونٹ دیا جاتا تھا۔ آخر ملتان کے ایک انگریز کمشنر کرنل ہملٹن کے سمجھانے بجھانے پر کھرلوں نے اس رسم کو ترک کر دیا۔

جھنگ کے غازی خاں کے لڑکے لال خاں کو سعادت یار خاں سے بھی اتنی چڑ تھی جتنی اس کے والد سے۔ کمالیہ کا سردار اسے "طوائف زادہ" کہا کرتا تھا۔ ایک دفعہ طیش میں آکر اس نے سیالوں کو اکٹھا کیا اور کمالیہ پر ہلہ بول دیا۔ "باہر نکل اوئے"۔ لال خاں نے گاؤں کے پاس پہنچ کر آواز دی۔ "آ تینوں رنڈی دے پتر دا ناچ دکھاواں" لیکن سعادت خاں دم سادھ کر بیٹھا رہا۔ لال خاں نے گاؤں میں لوٹ مار مچائی اور بڑھکیں مارتا ہوا واپس چلا آیا۔

۱۷۹۸ء میں جب شاہ زماں نے پنجاب پر حملہ کیا اور سکھوں میں بھاگڑ مچ گئی تو حاکم ملتان مظفر خان نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے کمالیہ پر حملہ کر دیا اور سکھوں کو مار بھگایا۔ تاہم ۱۸۰۳ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس جاگیر کو لاہور کے ساتھ ملا لیا اور اس وقت کے رئیس سعادت یار خان کو چالیس دیہات کے مالکانہ حقوق بخش دیئے۔ سکھ برابر اس جاگیر کی سرپرستی کرتے رہے۔ بلکہ کچھ نئے دیہاتوں کا بھی اس میں اضافہ کیا۔ (۱)

۱۸۵۷ء میں جہاں تمام لوگوں نے انگریز کے خلاف علم جہاد بلند کیا وہیں کھرل برادری کو فخر حاصل ہے کہ انہوں نے پنجاب میں انگریز کے خلاف مزاحمت کی۔ انگریز جو پنجاب میں قابض ہونے سے پہلے ہی اسے بازوئے شمشیر زن سمجھتے تھے ان کے خلاف کھرل برادری کے بعض اکابرین نے جذبہ حریت کے تحت جہاد کیا اور انگریزوں پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس علاقے پر قابض ہونا اتنا آسان نہیں۔ انگریز نے اپنی حکمت عملی کے تحت کھرلوں کو پسپا کرنے کے لئے گوگیرہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور ایک لفٹیننٹ گورنر لارڈ برکلے نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ بدمست انگریز روزانہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کھرل برادری کے نہتے افراد کو گولیوں کا نشانہ بناتا اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے کھرلوں کے لئے چیلنج بن جاتا۔ کھرلوں کی قیادت جھامرہ

کے ایک مجاہد آزادی احمد خاں کھرل کے ہاتھ میں تھی پوری برادری سمیت دیگر برادریوں مثلاً فسانوں اور وٹوؤں کے بعض جری نوجوانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا انہوں نے انگریزوں کے خلاف مزاحمت کے لئے گوریلا جنگ کے اصولوں کو اپنایا۔ انگریزوں کی ڈاک کے نظام کو معطل کر دیا اور پھر جس راستے پر آزادی کے حریت پسندوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بناتا ایک ہی رات میں احمد خاں کھرل کے ساتھیوں نے دریائے راوی کے ریت اور مٹی کی تہہ ایسے بچھادی کہ جب صبح کو برکلے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آیا تو اس کا گھوڑا اس دلدل میں پھنس گیا' برکلے نے گھوڑے سے اتر کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اس نے گولیاں چلا کر پستول خالی کر دیا تو چھپے ہوئے مجاہدین نے لاٹھیوں سے برکلے کو جہنم رسید کر دیا احمد خاں کھرل اور ان کے مجاہدوں کا ہیڈ کوارٹر سیدوالہ کے قریب راوی کنارے ایک گاؤں مہر آباد کے قریب تھا احمد خاں کھرل انگریز کے خلاف اپنی تحریک جہاد کو پورے پنجاب میں پھیلانے اور اسے کامیاب بنانے کے آرزو مند تھے ان کے ساتھی ان پر جانثاری کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے انہوں نے محسوس کیا کہ انگریزوں کے خلاف اس تحریک جہاد کو کامیاب بنانے کے لئے کشمیر کے مسلمان مہاراجہ سے جنگی امداد حاصل کی جائے' اس کے لئے وہ اپنی حکمت عملی کی تیاریوں میں بھی مصروف رہے انہوں نے پہلی بار انگریزوں کو شکست دی اس وقت انہیں ہزاروں جانباز ساتھی مل گئے۔ جنہوں نے پوری جرات اور مردانگی سے انگریزوں کے عزائم کو ناکام بنا دیا۔ گوگیرہ کے ایک زمیندار رائے ساون خان نے احمد خاں کھرل کا ساتھ دیا۔ ساون خاں اس جنگ میں شہید ہو گیا جس میں احمد خاں کو انگریزوں پر فتح نصیب ہوئی۔ ساون خاں کے بیٹے ساوو خان نے بھی مردانگی کے جوہر دکھائے مگر دوسری بار جب احمد خاں کھرل کے خلاف دہلی سے انگریزوں نے کمک پہنچائی تو اس وقت بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی احمد خاں کھرل شہید کے ساتھ کمالیہ کا رائے سرفراز اور سکھ سردار بیدی تھا انہوں نے غداری سے جنگ کے دوران احمد خاں کھرل کا سر اس وقت تن سے جدا کیا جب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود تھے اس سر کو لے کر دونوں غدار انگریز کی فوج سے جا ملے۔ سرفراز کو نواب آف کمالیہ اور سکھ سردار بیدی کو پاکپتن میں وسیع و عریض اراضی کا مالک بنا دیا گیا۔ رائے ساون خاں کے خاندان میں پانچ نوجوانوں اور دو عورتوں کو گوگیرہ جیل میں بند کر دیا گیا جن کی رہائی سات سال بعد ملکہ وکٹوریہ کے حکم سے عمل میں لائی گئی اور اس خاندان کو ضلع فیروزپور میں ان کی آبائی زمینوں پر تین دیہات دیوان کھیڑا۔ کوٹل کھیڑا اور بیکائن والہ کی اراضی کے مالکانہ حقوق تفویض کر دیئے۔ پاکپتن کے با اثر زمیندار میاں ولی داد بھنڈارا اور ساہیوال کے وکیل میاں محمد شفیق بھنڈارا کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے اسی خاندان کے ایک فرد حاجی جلال دین بھنڈارا پاکستان بننے کے بعد پنجاب اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے۔

اس جنگ میں ہزاروں حریت پسند مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا احمد خاں کھرل کے گاؤں جھامرہ کو انگریزوں نے نذر آتش کر دیا۔ احمد خاں کھرل شہید کی پسپائی کے بعد جھنگ کے سیال سرداروں نے انگریزوں سے ٹکر لینے کا ارادہ ترک کر دیا اور انہوں نے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی۔ کھرلوں کو پریشان کرنے کے لئے انگریزوں نے مکروہ حکمت عملی اپنائی اور نصف صدی تک ان کی رسوائی کے لئے ہر گھٹیا حربہ استعمال کیا ان کے خلاف کردار کشی کی مہم چلائی' تھانوں میں انہیں رسوا کرنے کے لئے انہیں چور اور رسہ گیر بنایا گیا اور ایک ایسی برادری جو اس علاقے میں پرانی تہذیب و ثقافت کی امین تھی انہیں "جانگلی" کے مکروہ نام سے پکارا گیا پنجاب کے دیگر علاقوں خصوصاً مشرقی پنجاب سے ایسے گھرانوں کو آباد کیا گیا جن کے چودھریوں کو ان "جانگلیوں" کی کردار کشی پر ابھارا گیا تحصیل جڑانوالہ میں ایک قدیم گاؤں دانا آباد واقع ہے چونکہ کھرلوں میں احمد خاں کھرل کی حریت پسندی کے طور پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ان کی گھوڑی ساوی کے گیت شادی بیاہوں میں گائے جاتے ہیں اس لئے کھرلوں کے مخالفین کی زبان پر دانا آباد کے مرزا کی گھوڑی بکی کے گیت سنائی دینے لگے مرزا صاحباں کی عشقیہ داستان کو اس طرح دہرایا گیا جیسے انہوں نے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ (۲)

انگریزوں نے پنجاب کے جاگیرداروں کی مشہور تاریخ "چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب" میں بڑے فخر سے لکھا ہے۔

کھرلوں نے ۱۸۵۷ء کے "فسادات" کے موقع پر جو بغاوت کی۔ اس کا انہیں ایسا سبق دیا گیا ہے جو ان کی کئی پشتوں کے لئے کافی ہو گا"۔ (۳)

انگریزوں نے اسی تاریخ میں غدار سرفراز خاں کی جا بجا تعریف کی ہے اور اسے "سرکار کا وفادار اور نمک حلال" کا خطاب دیا ہے۔ انہی خدمات کے عوض سرفراز خان کو خاں بہادر کا خطاب' ۵۰۰ روپے کی ایک خلعت اور ۵۲۵ روپے کی ایک جاگیر عطا ہوئی۔ سرفراز خان نے ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی تمام جاگیریں اور پنشن بحق سرکار ضبط ہو گئیں اور دیگر تمام جائیداد خورد برد کر لی گئی۔ (۴) مگر انگریزوں نے سرفراز خان کے اکلوتے بیٹے امیر علی خاں کو بھوکوں نہ مرنے دیا اور اسے نہ صرف ایک لاکھ روپیہ نقد دے کر تمام جائیداد واگزار کی' بلکہ اسے ملتان اور لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے دو دیہات اور منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کے ۳۸ دیہات کے تعلقداری حقوق عطا کئے۔ اس کے علاوہ لائل پور کے ۶۴ دیہات اور منٹگمری کے دس دیہات کے مالکانہ حقوق دیئے اور چناب کالونی میں ساڑھے سولہ مربعوں کے علاوہ کمالیہ کی اکثر عمارتوں اور زمینوں پر اس کی ملکیت تسلیم کر لی۔ کمالیہ کی جاگیر میں منٹگمری کے پانچ اور لائلپور کا ایک گاؤں بھی شامل ہے۔ منٹگمری کے اور لائلپور کے دو دیہات کی نمبرداری بھی سیالوں کے پاس رہی۔ ۱۸۷۲ء میں امیر علی خان اور جہان خان میں ذیل داری کے سوال پر جھگڑا

اٹھ کھڑا ہوا۔ تاہم اسے جلد ہی چکا دیا گیا۔ گو اس کے بعد بھی خاندان کے ان دونوں افراد کی آپس میں بول چال بند رہی۔ جہان خان کا لڑکا احمد خاں اپنی وفات ۱۸۹۷ء تک اپنے گاؤں کمالیہ میں رہتا رہا۔ وہ بے حد کنجوس تھا اور اس نے بے شمار دولت جمع کر رکھی تھی۔ اس کا لڑکا شہزاد خان لائلپور (موجودہ فیصل آباد) چلا آیا' جہاں وہ کئی مربعوں کا مالک اور نمبردار رہا۔(۵)

اسی دوران ۱۸۹۴ء میں امیر علی خان نے بھی وفات پائی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے سعادت علی خان نے اپنے باپ کی جاگیر اور پراونشل کرسی ورثے میں حاصل کی۔

اپنے باپ دادا کی طرح سعادت علی خاں بھی انگریزوں کا وفادار رہا۔ جس کے صلہ میں اسے وقتاً" فوقتاً" مختلف مناصب اور جاگیریں بطور انعام عطا ہوتی رہیں۔ ۱۹۲۵ء میں اسے خان صاحب اور بعد ازاں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ (۶) ۱۹۳۷ء میں اس نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب کی مجلس قانون ساز کا انتخاب لڑا اور خان سرفراز خان کو شکست دے کر یہ نشست حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ (۷)

سعادت علی خاں کے چھوٹے بھائی قلب علی خان کو بھی خاصی جاگیریں اور مناصب حاصل ہوئے ان کے چچا زاد بھائی محمد مراد خاں اور شہزاد خان بھی جاگیروں اور مناصب کے حصول میں پیچھے نہیں رہے۔

جب ۱۹۳۷ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات منعقد ہوئے تو اوکاڑہ کے علاقوں سے رائے جعفر علی خاں کھرل اور جڑانوالہ کے دیہی علاقے سے خان بہادر شہادت خاں آف کوٹ کمیر کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ انہی انتخابات میں نواب سعادت علی خاں آف کمالیہ کو بھی کامیابی نصیب ہوئی مگر کھرلوں نے احمد خاں کھرل شہید کے جذبہ حریت اور کمالیہ کے رائے سرفراز کی غدارانہ روش کے باعث کمالیہ کی نواب فیملی کو اپنے دل و دماغ میں زیادہ اہمیت نہیں دی اگرچہ جن خاندانوں نے انگریزوں سے ٹکر لی ان کے کئی افراد نے اپنی علاقائی بالادستی کے لئے انگریزوں سے وفاداریوں کے نئے ریکارڈ بھی قائم کئے مگر کھرل برادری کی عقیدت انہیں خاندانوں سے رہی۔ نواب سعادت علی خاں اگرچہ ۱۹۳۷ء میں کامیاب ہو گئے مگر یہ ان کا آخری الیکشن تھا۔

رائے جعفر علی خاں کھرل کو اس الیکشن کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس کے بعد ان کے ایک رشتے دار رائے جہانگیر کھرل کامیاب ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۷۰ء تک اوکاڑہ کے علاقے سے کوئی کھرل کامیاب نہ ہو سکا البتہ راوی پار کے علاقوں میں تقریباً ہر انتخاب میں کھرل برادری کے کئی افراد کامیاب ہوتے رہے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں خان بہادر رائے شہادت خاں کھرل یونینسٹ ٹکٹ پر کھڑے ہوئے مگر چک شاہمند کے رائے انور خاں کھرل نے انہیں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر شکست دی انہی انتخابات میں جھامرہ کے میر محمد خاں آف جھامرہ کامیاب ہوئے

اور ضلع شیخوپورہ کی تحصیل ننکانہ سے ایک دیہاتی نوجوان رائے شہادت خاں کھرل آف کوٹ فاضل کامیاب ہو گئے اس نشست پر مسلم لیگ کی ضلعی لیڈر شپ بابا اکبر کھرل کو ٹکٹ دینے پر اصرار کرتی رہی مگر انہوں نے اپنے رشتے دار رائے شہادت خاں کھرل کو ٹکٹ دے دیا۔ ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں کھرلوں کو اضلاع لائل پور۔ ساہیوال اور شیخوپورہ سے صرف دو نشستیں ملیں اور ان کے بہت سے امیدوار ناکام ہو گئے تحصیل جڑانوالہ سے رائے نوشیر خاں کھرل کامیاب ہوئے جبکہ ضلع ساہیوال کی ایک مہاجر نشست سے حاجی جلال دین بھنڈارا جناح عوامی لیگ کے ٹکٹ پر ایم ایل اے منتخب ہو گئے حاجی صاحب کے مقابلے میں مسلم لیگ کا امیدوار بڑے ڈرامائی انداز میں دستبردار ہو گیا۔ ضلع شیخوپورہ کی تحصیل ننکانہ کی جس نشست سے رائے شہادت خاں کھرل ۱۹۴۶ء میں ایم ایل اے منتخب ہوئے تھے اسی نشست سے بابا اکبر کھرل کے بیٹے رائے غلام محمد کھرل کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا گیا مگر اس نشست سے رائے بشیر بھٹی آف ننکانہ کامیاب ہو گئے۔ ۱۹۶۲ء میں کھرلوں کی سیاست نے نئی کروٹ لی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں ایک نوجوان وکیل رائے منصب علی خاں کھرل اپنی آبائی تحصیل ننکانہ سے کامیاب ہوئے۔ جس وقت رائے منصب علی نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اس وقت تحصیل ننکانہ کے کھرلوں میں قتل و غارت گری کی سنگین وارداتوں کے باعث شدید قسم کی دھڑے بندی موجود تھی جس کا فائدہ دوسرے بااثر افراد اٹھاتے تھے، مگر چونکہ وہ بڑے جاگیردار خاندان کے فرد نہیں تھے اس لئے انہوں نے تمام بااثر کھرلوں سے رابطہ قائم کر کے اپنے اعلیٰ اخلاق کی قوت سے انتخاب میں کامیابی حاصل کی، ان کے مقابلے میں ورک برادری کے ایک بااثر زمیندار غریب عالم تھے، مگر ان کا ذاتی کردار انتخابی مہم کے دوران موضوع بحث بن گیا۔ کھرل زمینداروں نے اپنی ذاتی دشمنیوں اور رنجشوں کو بالائے طاق رکھا اور وہ کامیاب ہو گئے۔ رائے منصب علی خاں کھرل اس وقت سب سے کم عمر رکن مغربی پاکستان اسمبلی تھے۔ ۱۹۶۵ء میں تحصیل ننکانہ سے قومی اسمبلی کا ٹکٹ رائے بشیر احمد بھٹی کو ملا مگر صوبائی اسمبلی کے لئے کنونشن مسلم لیگ کا ٹکٹ رائے منصب علی کھرل کو دیا گیا دراصل ان کے اس وقت کے صوبائی وزیر میاں محمد یاسین خاں وٹو سے گہرے مراسم تھے گورنر نواب ملک امیر محمد خاں آف کالا باغ نے میاں صاحب کی آبائی تحصیل دیپال پور سے ان کے یار غار راؤ محمد افضل جو میاں یاسین کے صوبائی وزیر بننے کے بعد ان کی ضمنی نشست سے ایم پی اے منتخب ہوئے انہیں نظر انداز کر دیا اور یہ ٹکٹ اس وقت کے ایڈیشنل چیف سیکرٹری سید غیاث الدین کے بھانجے سید عاشق حسین مصطفیٰ آبادی کو دیا گیا انتخاب کے دوران گورنر کالا باغ نے صوبائی وزیر میاں یاسین وٹو کے دیپال پور میں داخلے پر پابندی عائد کر دی اور اس کے ساتھ میاں صاحب کو اجازت دے دی کہ اگر وہ چاہئیں تو پنجاب کے کسی بھی صوبائی حلقے کے لئے اپنے کسی بھی دوست کو کنونشن مسلم لیگ کا ٹکٹ دلا سکتے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ رائے منصب علی کھرل کو ٹکٹ دیا جائے' چنانچہ تحصیل ننکانہ کے صوبائی حلقے سے رائے صاحب کو صوبائی ٹکٹ دیا گیا اور وہ دوبارہ ایم پی اے منتخب ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں تحصیل جڑانوالہ میں قومی اسمبلی کی نشست پر کرنل سلیم کھرل کو کنونشن مسلم لیگ کا ٹکٹ دے دیا گیا اور انہیں اپوزیشن کے امیدوار میاں عبدالباری مرحوم کے مقابلے میں کامیاب کرایا گیا اسی تحصیل کے ایک صوبائی حلقے سے رائے عارف حسین کھرل کو بھی صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دے دیا گیا موصوف رشتے کے اعتبار سے ۱۹۴۶ء میں منتخب ایم ایل اے رائے انور خاں کھرل کے بھتیجے ہیں رائے انور خاں جب پہلی بار ۱۹۴۶ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تو اس وقت پنجاب اسمبلی کے ارکان نے آل انڈیا لیجلسیٹو اسمبلی کے ارکان کا انتخاب کرنا تھا قائداعظم نے پنجاب کے مسلم لیگی رہنماؤں نواب افتخار حسین ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کو ہدایات جاری کر دیں کہ نواب مظفر علی قزلباش کو مرکزی قانون ساز اسمبلی کا رکن نہ بننے دیا جائے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے دو ارکان چودھری محمد حسین چٹھہ اور کیپٹن عاشق حسین قریشی کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ مسلم لیگ میں شامل کسی رکن کو نواب قزلباش کے کیمپ میں نہ جانے دیا جائے اور ساتھ ہی ایک دو یونینسٹ مسلم ارکان کو مجبور کیا جائے کہ وہ مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی پر ہی ترجیح دیں یہ امر قابل ذکر ہے کہ کیپٹن نواب عاشق حسین قریشی اگرچہ اپنے آبائی ضلع ملتان سے یونینسٹ ٹکٹ پر ایم ایل اے منتخب ہوئے تھے مگر وہ فوری طور پر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور پھر وہ مسلم لیگ کے مقاصد کے لئے بہت زیادہ سرگرم عمل ہو گئے انہی دنوں مسلم لیگ کے حامی طلبہ کی تنظیم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بے حد سرگرم تھی ایم ایس ایف کے عہدیدار یونینسٹوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں پر کڑی نظر رکھتے۔ انہی دنوں ایم ایل اے موصوف کے ایک بھتیجے اور وفاقی مجلس شوریٰ کے سابق رکن رائے سرفراز خان کھرل اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں زیر تعلیم تھے' ایم ایس ایف کے لیڈروں سید محمد قاسم رضوی' حکیم آفتاب اور ان کے دیگر ساتھیوں کو پتہ چلا کہ رائے انور خاں کھرل سے نواب قزلباش کو ووٹ دینے کا سودا ہو چکا ہے۔

اور ایم ایل موصوف اس وقت نواب پیلس میں موجود ہیں نواب قزلباش ان دنوں ریلوے ہیڈ کوارٹرز کے سامنے اپنی پرانی اقامت گاہ میں مقیم تھے ایم ایس ایف کے لیڈروں نے رائے سرفراز کھرل کو اپنے پاس بلایا اور ان سے کہا کہ اب تک تو آپ ہمارے درمیان گفتگو کے دوران بڑے فخریہ انداز میں کہتے رہے ہو کہ کھرلوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا ہے مگر آج تمہارا چچا جان کیا کچھ کرنے والا ہے رائے سرفراز خان کھرل غصے سے آگ بگولا ہو گیا اس نے اپنے کسی دوست طالب علم سے پستول لیا اور تانگے میں سوار نواب پیلس پہنچ گیا اس نے اس اقامت گاہ میں داخل ہوتے وقت اپنے چچا ایم ایل اے کے بارے میں دریافت کیا مگر جب بعض ملازمین

نے اسے گیٹ سے باہر نکالنے کی کوشش کی تو اس نے پستول تان لیا اور دھمکی دی کہ اس کے چچا کو اس کے سامنے لایا جائے ورنہ وہ انتہائی اقدام اٹھانے سے گریز نہیں کرے گا رائے انور خان کھرل اس شور کو سن کر باہر نکلا۔ رائے سرفراز نے اسے زبردستی تانگے میں سوار کیا اور اسے اسلامیہ کالج میں موجودہ ایم ایس ایف کے لیڈروں کے سامنے پیش کر دیا اور کہا کہ اگر میرا چچا مسلم لیگ کے خلاف ووٹ دے دے تو ہم چچا بھتیجا کو آپ لوگ گولیوں سے چھلنی کر دیں۔ جس روز مرکزی قانون ساز اسمبلی کا الیکشن ہو رہا تھا مسلم لیگ کے نوجوان رہنماؤں نے ضلع فیروزپور سے یونینیسٹ ٹکٹ پر منتخب ایم ایل اے میاں باغ علی سکھیرا کو قائل کر لیا کہ وہ نواب قزلباش کو ووٹ نہیں دے گا۔ پنجاب اسمبلی کے ایوان میں جب مختلف امیدواروں کے لئے ان کے حامی ووٹروں کے ہاتھ کھڑے کرائے گئے تو نواب قزلباش کی باری پر نواب عاشق حسین قریشی اور چودھری محمد حسین چٹھہ نے میاں باغ علی سکھیرا کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اس موقع پر نواب قزلباش اور نواب عاشق حسین قریشی میں شدید جھڑپ ہوئی' اس دوران مسلم لیگ کے ٹکٹ پر تحصیل شکر گڑھ سے منتخب ایم ایل اے نے پچھلی نشستوں پر کھڑے ہو کر نواب قزلباش کے حق میں ووٹ دے دیا اور مسلم لیگ کے ارکان حیران و پریشان رہ گئے حالانکہ میاں باغ علی سکھیرا نے اس وقت کے سپیکر مسٹر ایس پی سنگھا کے استفسار پر واضح کر دیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے حامی بن گئے ہیں نواب قزلباش مرکزی قانون ساز اسمبلی کے رکن تو منتخب ہو گئے مگر ان کے حق میں ووٹ ڈالنے والے ایک ایم ایل اے اپنے علاقے کے ووٹروں کے غیظ و غضب کا شکار ہو گئے انہوں نے ایک ایم ایل اے موصوف کے گھر کو نذر آتش کر دیا تو نواب عاشق حسین قریشی کو اس واقعہ کے چند روز بعد چوبرجی چوک میں ایک پولیس کانسٹیبل نے گولیوں سے چھلنی کر دیا رائے سرفراز کھرل اور رائے عارف حسین کھرل جو رائے نور خان کے بھتیجے ہیں انہوں نے ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے چچا کی حمایت نہیں کریں گے اگرچہ انہیں مسلم لیگ نے پنجاب اسمبلی کے انتخاب میں ٹکٹ بھی دے دیا مگر وہ آزاد امیدوار رائے نوشیر خان کھرل آف بڈھا چک کے مقابلے میں ناکام ہو گئے ۱۹۶۵ء کے انتخاب میں عارف حسین کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ایم پی اے منتخب ہو گئے۔ مگر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب نہ ہو سکے البتہ ۱۹۷۰ء میں اس برادری کو کافی نشستیں ملیں' رائے منصب علی خان کھرل جو ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک ایم پی اے رہے اس دوران وہ اپنے آبائی ضلع شیخوپورہ کی سیاست میں کونسل مسلم لیگ کے رہنما چودھری محمد حسین چٹھہ کے کٹر ترین مخالفین میں شمار ہوتے' سسرال کے رشتے سے وہ رائے بشیر احمد بھٹی آف ننکانہ کے رشتے دار بھی بن گئے مگر بعد میں علاقائی بالا دستی کے حصول کے سوال پر رائے منصب اور بشیر بھٹی کی راہیں جدا ہو گئیں رائے منصب علی کھرل کو کونسل مسلم لیگ کی طرف سے قومی اسمبلی کا ٹکٹ تفویض کیا گیا جب

کہ رائے بشیر بھٹی کے مقابلے میں بطور آزاد امیدوار کھڑے ہوئے ان کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کا ٹکٹ رائے شہادت خان کھرل آف کوٹ فاضل کو دیا گیا اور وہی اس حلقے سے ایم این اے منتخب ہو گئے اگرچہ رائے منصب علی کھرل ۱۹۷۰ء کا انتخاب ہار گئے مگر وہ دوسرے نمبر پر رہے۔ تحصیل جڑانوالہ میں جہاں رائے عارف حسین کھرل قومی اسمبلی کا انتخابات ہار گئے وہاں صوبائی نشست پر ان کے کزن رائے عمر حیات خان کھرل کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ایم پی اے منتخب ہوئے ایوب خان کے خلاف تحریک میں انہوں نے فیصل آباد اور جڑانوالہ کے طلبہ کی قیادت کی تھی ملحقہ صوبائی نشست سے رائے سخاوت خان کھرل بطور آزاد امیدوار ایم پی اے منتخب ہو گئے تحصیل فیصل آباد سے ایک اور امیدوار رائے احمد حیات خان کھرل پیپلزپارٹی کے ٹکٹ پر ایم پی اے منتخب ہو گئے' اوکاڑہ کے علاقے میں انتخابی سیاست نے ۳۳ سال بعد نئی کروٹ لی اور اس علاقے میں جہاں جیوے خان کی ارائیں فیملی سیاست و قیادت پر بالا دستی قائم رکھنے میں کامیاب رہی تھی وہاں کھرلوں میں سے دو افراد سیاست کے افق پر نمودار ہوئے ۱۹۷۰ء میں حاجی محمد صادق ربیرہ کھرل ایم این اے منتخب ہوئے اور ان کے مقابلے میں اس علاقے کے معروف رہنما میاں عبدالحق آف اوکاڑہ ہار گئے ناکام امیدوار مدوت العمر قومی اور صوبائی اسمبلی کے رکن رہے' ان کے بھائی میاں نذیر احمد جو ۱۹۶۵ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے ایک نوجوان رائے میاں خان کھرل ایڈووکیٹ کے مقابلے میں ناکام ہو گئے ان انتخابی ناکامیوں نے دونوں بھائیوں کو بے حد پریشان کر دیا میاں عبدالحق مرحوم جلد ہی فوت ہو گئے جب کہ میاں نذیر احمد ایک سازش کے تحت قتل کر دیئے گئے حاجی صادق کھرل غیر سنجیدہ سیاست دان تھے وہ جب تک ایم این اے رہے انہوں نے سنجیدگی کا شاذ ہی مظاہرہ کیا ہے انہوں نے انتخاب میں اپنی کامیابی کی خبر کو بھی غیر سنجیدہ انداز میں سنا اور کامیابی کی نوید سنانے والوں کو اپنی دشنام طرازیوں کا نشانہ بنایا مگر انہیں اس وقت یقین آیا جب سینکڑوں افراد جلوس کی شکل میں مبارک باد دینے ان کی کوٹھی وقع اوکاڑہ میں آئے البتہ رائے میاں خان کھرل نے ایم پی اے کی حیثیت سے اپنے علاقے کی ترقی کے لئے بڑا کردار ادا کیا وہ پنجاب اسمبلی کے ایوان میں بھی بعض معاملات پر کھل کر اظہار خیال کرتے۔ جن دنوں محمد حنیف رامے پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے پنجاب اسمبلی میں حکمران جماعت کے بعض ارکان نے شہری اور دیہی تفریق پیدا کی ان ارکان میں رائے میاں خان کھرل بھی شامل تھے انہوں نے اسمبلی ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جناب سپیکر! پنجاب کو دانشور وزیر اعلیٰ کی نہیں زمیندار وزیر اعلیٰ کی ضرورت ہے ۱۹۷۷ء میں حاجی صادق کھرل اور رائے میاں خان کھرل کو پیپلزپارٹی نے ٹکٹوں کی تقسیم میں نظرانداز کر دیا اس پر رائے میاں خان کھرل بطور آزاد امیدوار سامنے آئے ان انتخابات کے تھوڑے عرصے بعد ہی وہ جوانی میں ہی دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں احمد خان کھرل شہید

کے کارناموں کو اجاگر کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی اور گوگیرہ میں پنجاب کے اس حریت پسند کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے متعدد کانفرنسوں کا انعقاد کرایا۔ ۱۹۷۷ء میں تحصیل جڑانوالہ سے رائے عارف حسین کھرل اور رائے اسلم خان کھرل ایڈووکیٹ آف کوٹ ہدایت کو پیپلزپارٹی کے ٹکٹ دیئے گئے ان انتخابات میں تحصیل ننکانہ سے رائے منصب علی خان کھرل امیدوار نہ بنے اور انہوں نے قومی اتحاد کی طرف سے قومی اسمبلی کے امیدوار ملک شہادت خان وسیر کی مدد کی جب وفاقی مجلس شوریٰ کی تشکیل ہوئی تو تحصیل جڑانوالہ سے رائے سرفراز خان کھرل آف چک شہامند (رائے عارف حسین کھرل کے بھائی) اور تحصیل ننکانہ سے رائے منصب علی کھرل کو مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کر دیا گیا۔

۱۹۸۵ء کے انتخابات میں کھرلوں کو اضلاع اوکاڑہ، فیصل آباد، اور شیخوپورہ سے فقید المثال کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ تحصیل جڑانوالہ سے رائے عارف حسین کھرل اور رائے صلاح الدین کھرل ایم این اے منتخب ہوئے رائے عارف حسین نے جن سابق ارکان اسمبلی کو شکست دی ان میں ۱۹۷۰ء میں ان کے انتخابی حریف چودھری غلام نبی، ۱۹۷۷ء میں پیپلزپارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ایم این اے شہادت خان بلوچ اور ایک سابق ایم ایل اے محمد اشرف عالم لشاری ہیں (۸) رائے عارف حسین کھرل رائے امیر محمد خان کھرل کے پوتے اور رائے سکندر خان کھرل کے صاحبزادے ہیں۔ رائے امیر محمد خاں کھرل ۱۹۲۱ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے تھے جبکہ رائے سکندر خان کھرل ۳۹-۱۹۳۸ء میں معالتی بورڈ کے رکن نامزد ہوئے تھے (۹) رائے صلاح الدین کھرل رشتے کے اعتبار سے ۱۹۳۸ء میں اس علاقے کے منتخب ایم ایل اے خان بہادر شہادت خان کھرل کے بھتیجے ہیں انہوں نے ملک کے معروف سیاسی رہنما عبد الباری مرحوم کے صاحبزادے میاں غلام دستگیر باری کو ناکام بنایا۔ رائے منصب علی کھرل تحصیل ننکانہ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انہوں نے بشیر بھٹی کو ناکام بنایا۔ رائے جعفر خان کھرل تحصیل جڑانوالہ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے وہ ۱۹۷۷ء میں پیپلزپارٹی کے صوبائی اسمبلی کے امیدوار اسلم خان کھرل کے بڑے بھائی اور ڈسٹرکٹ کونسلر تھے۔ وہ سابق ایم این اے رائے شہادت خان مرحوم کے بھانجے ہیں۔ رائے رب نواز کھرل آف جھامرہ بھی ۱۹۸۵ء میں ایم پی اے منتخب ہوئے ان کے علاوہ ان انتخابات میں ضلع اوکاڑہ سے رائے شفقت عباس بیرہ اور رائے نور محمد کھرل ایم پی اے منتخب ہوئے۔ اول الذکر ایم پی اے رشتے کے اعتبار سے رائے رب نواز خان کھرل کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ (۱۰)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں بھی کھرل برادری نے بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ ان انتخابات میں رائے محمد اسلم کھرل نے پیپلزپارٹی کے ٹکٹ پر این اے ۵۸ فیصل آباد ۲ سے حصہ لیا اور رائے صلاح الدین کھرل کو شکست دی۔ جنہیں آئی جے آئی نے ٹکٹ دیا تھا۔ رائے

منصب علی کھرل این اے ۱۰۵ شیخوپورہ ۵ سے امیدوار تھے مگروہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۱)

رائے خالد احمد خاں کھرل سول سروس میں شامل رہے وہ بھٹو کے قابل اعتماد افسران میں شامل تھے پہلے وہ لاڑکانہ کے ڈپٹی کمشنر اور پھر کمشنر بنائے گئے' مارشل لاء کے نفاذ کے بعد وہ بیرون ملک چلے گئے اور ۱۹۸۸ء کے انتخابات سے کچھ عرصہ قبل وطن واپس آئے۔ انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر این اے ۷۱ ٹوبہ ٹیک سنگھ ا سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگروہ کامیاب نہ ہو سکے۔ تاہم وہ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۰ء تک اسیبلشمنٹ اور کابینہ امور کے معاملات میں وزیراعظم کے مشیر رہے (۱۲)

۱۹۹۰ء میں نتائج ماسوائے ایک نتیجے کے، وہی پرانے ہی رہے۔ اس انتخاب میں رائے محمد اسلم کھرل کے ساتھ ساتھ رائے منصب علی کھرل بھی قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے رائے محمد اسلم کھرل نے رائے عارف حسن کھرل کو ہرایا جنہیں آئی جے آئی نے ٹکٹ دیا تھا۔ تاہم اس کی شکست کا باعث رائے اسلم کی بجائے آزاد امیدوار صلاح الدین کھرل بنے، جنہوں نے پندرہ ہزار ووٹ حاصل کئے اور رائے عارف حسین کھرل فقط ڈھائی ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۳) ۱۹۹۷ء میں اس نشست پر رائے صلاح الدین کھرل کامیاب ہوئے جنہوں نے یہ انتخاب پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر لڑا تھا۔ (۱۴) ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں صلاح الدین کھرل پاکستان مسلم لیگ (ق) کے محمد وصی ظفر سے تقریباً ۱۵ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۵)

۱۹۹۰ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں رائے خالد خاں کھرل نے خود تو انتخاب میں حصہ نہیں لیا لیکن اپنے بھائی جاوید احمد کھرل کو پی ڈی اے کے ٹکٹ پر انتخاب لڑوا دیا۔ جاوید احمد کھرل کے مدمقابل رائے خالد خان کھرل کے سابقہ حریف چوہدری اسد الرحمٰن تھے جو یہ انتخاب تقریباً آٹھ ہزار ووٹوں سے جیت گئے۔ (۱۶)

جاوید احمد کھرل ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں پی پی ۸۷ فیصل آباد (لائل پور) ۱۱ سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ انہوں نے مئی ۱۹۹۲ء میں وفات پائی (۱۷)

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں خالد احمد کھرل نے این اے ۷۱ ٹوبہ ٹیک سنگھ ا سے خود انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری کر گئے اور وہ نہ صرف ایم این اے بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۸) بلکہ ایک اہم وزارت، وزارت اطلاعات ونشریات کے حصول میں بھی کامیاب رہے۔ (۱۹) خالد احمد کھرل نے ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں بھی حصہ لیا مگر دونوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۹۷ء میں انہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے چودھری اسد الرحمٰن نے ہرایا۔ (۲۰) جبکہ ۲۰۰۲ء میں انہیں آزاد امیدوار ریاض فتیانہ نے شکست دی۔ (۲۱)

خالد احمد کھرل کی رشتہ داریاں پورے پنجاب میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی ایک ہمشیرہ سعید علی

خان کی والدہ ہیں۔ سعید علی خان کے کزن سعادت حسنین کی شادی سابق ایم این اے اور وفاقی وزیر بیگم نادرہ خاکوانی کی صاحبزادی بیلم سے ہوئی ہے۔ (۲۲) بیلم حسنین ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے بعد خواتین کے مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن بنی ہیں۔ (۲۳)

ان کی والدہ بیگم نادرہ خاکوانی پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کی کزن ہیں۔ ادھر فیصل صالح حیات کی والدہ اور خالد احمد کھرل کی اہلیہ آپس میں حقیقی بہنیں ہیں اور یہ دونوں بہنیں پاکستان فضائیہ کے سابق سربراہ اور امریکہ میں پاکستان کے سابق سفیر ائیر چیف مارشل (ریٹائرڈ) ذوالفقار علی خان کی بھتیجیاں ہیں۔ (۲۴)

رائے محمد اسلم خان کھرل نے ۱۹۹۳ء میں رائے عارف حسین کھرل سے شکست کھائی۔ (۲۵) ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ ہی نہیں لیا جبکہ ۲۰۰۲ء میں انہوں نے اپنی سیاسی وابستگی تبدیل کر کے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور این اے ۱۴۳ اوکاڑہ ا سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۶) رائے عارف حسین کھرل کا نام ۱۹۹۳ء کے بعد کسی انتخابی عمل میں نظر نہیں آیا۔ ۲ ستمبر ۲۰۰۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا (۲۸)

کھرل برادری ہی کے ایک اور فرد جو عملی سیاست میں ہیں، رائے نور محمد کھرل ہیں۔ وہ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۳ء تک مسلسل چار مرتبہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۸) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۹) ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ البتہ ان انتخابات میں پی پی ۱۸۵ اوکاڑہ ا سے رائے فاروق عمر خان کھرل پہلی مرتبہ صوبائی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوئے ان کا تعلق پاکستان مسلم لیگ (ق) سے تھا۔ (۳۰)

حوالہ جات

۱۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۱۴۰ تا ۱۴۳

۲۔ طارق اسمٰعیل۔ کھرلوں نے انگریزوں سے ٹکر لی۔ نوائے وقت میگزین۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۱۳ تا ۱۹ ستمبر ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۲

۳۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیف اینڈ فیمیلز آف نوٹ ان دی پنجاب (انگریزی)۔ لاہور۔ حصہ دوم۔ ص ۳۶۰

۴۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیف اینڈ فیمیلز آف نوٹ ان دی پنجاب (انگریزی)۔ لاہور۔ حصہ دوم۔ ص ۳۶۱

۵۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۱۴۴

۶۔ سر لیپل ایچ گرفین۔ کرنل میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ حصہ

دوم۔ص ۴۸۹

۷۔ کرپال سی یادیو۔ الیکشنز ان پنجاب۔ ۱۹۲۰ء۔ ۱۹۴۷ء نئی دہلی۔ص ۹۲۔

۸۔ طارق اسمٰعیل۔ کھرلوں نے انگریزوں سے ٹکر لی۔ نوائے وقت میگزین (روزنامہ نوائے وقت) کراچی۔ ۱۳ر تا ۱۹ر ستمبر ۱۹۸۵۔ ص ۲۲، ۲۳، ۱۸

۹۔ رائے عارف حسین کھرل۔ ذاتی مکتوب بنام مصنف۔ شمولہ سووینئر، پاکستان کے سیاسی وڈیرے۔ کراچی۔

۱۰۔ طارق اسمٰعیل۔ کھرلوں نے انگریزوں سے ٹکر لی۔ نوائے وقت میگزین (روزنامہ نوائے وقت) کراچی۔ ۱۳ر تا ۱۹ر ستمبر ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۲، ۲۳، ۱۸

۱۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۱۳۷، ۱۳۸، ۲۳۱، ۲۳۲

۱۲۔ سہیل وڑائچ۔ برٹش الائیز آف ۱۸۶۵ ان دی رن۔ روزنامہ دی نیشنل لاہور۔ الیکشن ۹۳ اسپیشل۔ ۱۸ر ستمبر ۱۹۹۳ء۔

۱۳۔ رائے عارف حسین کھرل۔ ذاتی مکتوب بنام مصنف۔ مشمولہ سووینئر پاکستان کے سیاسی وڈیرے۔ کراچی۔

۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۵۱

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۳۲

۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم ص ۳۸

۱۷۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۲۳۱

۱۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳۔ ص ۱۲۷۱

۱۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۷ر جنوری ۱۹۹۴ء

۲۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰ر فروری ۱۹۹۷۔ ص ۲۰۸

۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء ص ۲۹۱۹

۲۲۔ سہیل وڑائچ۔ برٹش الائیز آف ۱۸۵۷ ان دی رن۔ روزنامہ دی نیشن لاہور۔ الیکشن ۹۳ء اسپیشل۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۹۳ء۔

۲۳۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ ص ۴۴۳

۲۴۔ سہیل وڑائچ۔ برٹش الائیز آف ۱۸۵۷ ان دی رن۔ روزنامہ دی نیشن لاہور۔ الیکشن ۹۳ اسپیشل ۱۸ر ستمبر ۱۹۹۳

۲۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۶۷

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۵۳
۲۷۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۴۵۷
۲۸۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۳ء لاہور۔ ص ۲۳۳
۲۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم ص ۳۳۳
۳۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۸۲

کھوسہ

کھوسے بلوچی قبیلہ کی شاخ ہوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پاس سندھ میں بے شمار زمینیں تھیں۔ اب وہ سکھر اور جیکب آباد میں آباد ہیں۔ ان کی ایک شاخ ابھی تک ڈیرہ غازی خان کی پہاڑیوں میں رہتی ہے۔ دراصل کھوسے، ہوتی اور منت کانی وغیرہ سب ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ سکھوں اور انگریزوں کی مہمات میں ان قبائیلوں نے ساتھ دیا جس کے صلہ میں ان کو جاگیریں اور اراضی ملی۔(۱)

کرنل چارلس میسی اپنی کتاب روسائے بااختیار اور نامی خاندان میں لکھتا ہے:

"کھوسے، ضلع ڈیرہ غازی خان میں بلوچوں کی اور بہت سی قوموں کی طرح چودھویں صدی کے آغاز میں آباد ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بلوچ قوم کے ہوت فرقہ کی شاخ ہیں۔ ان کے ایک حصہ نے سونمیانی ملک سندھ میں زمینیں حاصل کیں اور اب سکھر اور نہر سندھ کے درمیان اور روجھان کے مغرب کی طرف ضلع جیکب آباد میں آباد ہیں۔ اس کی ایک اور شاخ بلیل خان کے زیر حکم سرحد ڈیرہ غازی خان کے پرے کوہ بلیل میں آباد ہوئی۔ کوہ بلیل شاید وہی ہے جس کو وادی رکینی (موجودہ رکھنی) کہتے ہیں جو آج کل کھیترانوں کے قبضہ میں ہے۔ یہاں سے انہوں نے اپنے سردار باطل خان کے ماتحت میدانوں کی طرف رخ کیا اور عیسائی کھیترانوں کی ایک جماعت بھی جس کا سردار یا روخان تھا ان کے ہمراہ ہو گئی تھی۔ ان سرداروں نے قصبات باطل اور یار و آباد کئے جو ایک دوسرے سے تین تین میل کے فاصلے پر ہیں اور یہ دونوں قوم کھوسہ کا صدر مقام ہیں۔ عیسانی اسی وقت سے قوم کھوسہ میں شامل کر لئے گئے ہیں اور اب یہ بھی اس کی ایک بڑی شاخ ہے۔(۲)

سر لیپل ایچ گرفین نے تذکرہ روسائے پنجاب میں لکھا ہے:

یہ علاقہ غازی خاں میرانی اول نے باطل خاں کھوسہ کو بطور معافی کے عطا کیا تھا۔ باطل خاں کا پوتا یوسف خاں اپنے ہم عہد غازی خاں میرانی کا ماتحت اور جنگی معاون تھا یہ اپنے ولی نعمت آقا

کی طرف سے کئی معرکوں میں لڑا اور اس کے جنگی کارناموں اور بہادری کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ سودھ والئے کانچی نے یوسف خاں کی جرات و دلیری کا حال سن کر اسے اپنی سرکار میں نوکر رکھ لیا اور اسے اور اس کے بیٹے غلام حیدر خاں کو ان کی بہادری کے صلے میں بیشمار تحائف دیئے اور ان تحائف کے علاوہ غلام حیدر خاں سے اپنی لڑکی بھی بیاہ دی۔ گمان غالب یہ ہے کہ یوسف خاں کی عدم موجودگی میں قوم کھوسہ اس سے باغی ہو گئی ہو گی کیونکہ جس وقت یہ راجہ کی ملازمت ترک کر کے اپنے علاقہ میں واپس آیا تو عیسانیوں نے اس کے ساتھ بڑی دشمنی اور مخالفت ظاہر کی اور آخر کار اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ یوسف خاں کی جگہ اس کا بیٹا غلام حیدر خاں قومی سرداری کے منصب پر مامور ہوا۔ مگر یہ بھی دغا سے قتل کر دیا گیا اور غلام حیدر خاں کی وفات کے وقت اس کا بیٹا برخوردار خاں نابالغ بچہ تھا چنانچہ اس کی ماں یعنی غلام حیدر کی بی بی نے اپنے نور نظر کی حفاظت کے خیال سے اس کو ٹبی لنڈ کے کھوسوں کے پاس بھیج دیا۔ تاکہ وہ ان میں پرورش پائے اور خونخوار و غدار دشمنوں کے شر سے محفوظ رہ سکے۔ برخوردار خاں بالغ ہو کر اپنے علاقہ میں واپس آیا اور اپنے باپ اور دادا کے خون کا بدلہ لینے کے لئے عیسانیوں پر حملہ کرنے کا عازم ہوا۔ بہت سے کھوسے اس کے ساتھی ہو گئے۔ عیسانی لڑ کر مطیع کئے گئے اور ان کا سردار قید کر لیا گیا۔ مگر اس کے بعد طرفین میں اس طرح پر صلح ہو گئی کہ عیسانیوں کے تین سردار خاں محمد خاں رئیس یارو۔ جوانک خاں رئیس ولانہ اور ہوت خاں رئیس ہوت نے اپنی لڑکیوں کی شادی کھوسہ تمندار برخوردار خاں سے کر دی۔ بعد ازاں برخوردار خاں مسو خاں رئیس نتکانی کا طرفدار ہو گیا اور نتکانیوں نے برخوردار خاں کو نتکانی رئیس کی عمدہ خدمات بجا لانے کے معاوضہ میں مواضعات ماٹی اور مہوئی مع ان کی گرد و نواح کی اراضیات کے عطا کئے جن کی آبپاشی مہوئی نالہ سے ہوتی تھی۔ یہ مواضعات اور اراضیات اس وقت تک کھوسوں کے قبضے میں ہیں مگر سوری لنڈوں کی اراضیات بیچ میں آ جانے کی وجہ سے یہ مواضع قوم کھوسا کے باقی علاقہ سے الگ ہو گئے ہیں۔ برخوردار خاں نے میاں عبدالنبی خاں سرائی کو بھی اس لڑائی میں جنگی امداد دی تھی جو میاں عبدالنبی اور تالپوریوں کے مابین واقع ہوئی تھی۔

برخوردار خاں مسو خاں کے ایک رشتہ دار اسد خاں کو نتکانیوں کی سرداری دلانے کے لئے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا غلام حیدر خاں اس کا جانشین ہوا جس نے لال خاں نتکانی سے لڑ کر اس پر فتح حاصل کی۔ لال خاں کو اس کے ہاتھ سے پیہاڑ کے مقام پر شکست ہوئی اور لال خاں کی جگہ اسد خاں نتکانی قوم کا تمندار تسلیم کیا گیا۔ لال خاں بھاگ کر افغانستان میں پناہ گزین ہوا اور اس نے بارک زئی خاندان سے اتحاد پیدا کر لیا۔ بارک زئی خاندان افغانستان کے امیر دوست محمد خاں کے سوتیلے بھائی جبڑ خاں کے ساتھ اپنے کنبہ کی ایک

لڑکی بیاہ کر اس وقت ملک میں بہت زبردست ہو گیا تھا۔ بعد ازاں زمان شاہ کے عہد حکومت میں جبڑ خاں ڈیرہ غازی خاں کا ناظم مقرر ہوا اور اس نے لال خاں کو ایک سند عطا کی جس کی رو سے لال خاں پھر نتکانیوں کا سردار مقرر کیا گیا۔ لال خاں یہ سند لے کر سنگڑ کو واپس آیا اور آتے ہی مائی اور مہونی کھوسوں کے سرداران نور محمد اور یار محمد کو قتل کر دیا۔ اس قتل ناحق کی وجہ سے کھوسوں کی قوم لال خاں سے بگڑ بیٹھی اور اس کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے۔ لال خاں کو اب دوسری دفعہ پھر بھاگ جانا پڑا اور اس موقع پر وہ پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس اور بعد ازاں نواب بہاولپور کی خدمت میں امداد طلب کرنے کے لئے حاضر ہوا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۹ء میں ڈیرہ غازی خاں کو فتح کر کے صادق محمد خاں عباسی نواب بہاولپور کو اجارہ پر دے دیا۔ اب نتکانیوں کے جلاوطن رئیس لال خاں نے اپنے پرانے دشمن کھوسوں پر حملہ کرنے کے لئے نواب بہاولپور سے پھر امداد مانگی اور نواب نے اسے دو ہزار جوانوں کی فوج سے کمک دی۔ لال خاں درہ دیڈر کے پاس دلانہ کے مقام پر اپنے مخالفوں سے معرکہ آرا ہوا مگر اس لڑائی میں کامیابی کھوسوں کے ہاتھ رہی اور لال خاں خود ہی جنگ میں کام آ گیا۔ لال خاں کی وفات سے ان تمام نقصانات کی تلافی ہو گئی جو اس نے قوم کھوسا کو پہنچائے تھے لیکن ادھر اس شکست سے نواب بہاولپور کو جوش آ گیا اور وہ کھوسوں کو ذلیل کرنے پر تل بیٹھا۔ چنانچہ اس نے غلام حیدر خاں کو پیام بھیجا کہ وہ اس سے اپنی دختر کی شادی کر دے نواب کو بخوبی معلوم تھا کہ غلام حیدر خاں اس بات سے ضرور انکار کر دے گا اور ایسا ہی ہوا۔ غلام حیدر خاں نے لغاری، گرچانی اور نتکانی سرداروں کی حمایت و طرفداری کے غرے پر نواب کی درخواست نہایت حقارت کے ساتھ رد کر دی۔ مگر نواب کب ماننے والا تھا۔ اس نے غلام حیدر کو بزور مطیع کرنے کے ارادے سے قلعہ گجری کا محاصرہ کر لیا اور اس کے دو سال بعد ایک موقع سے نواب کی فوج نے غلام حیدر خاں اور اس کے چند ہمراہیوں پر اچانک حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔ غلام حیدر کا بھائی کوڑا خاں اس کا جانشین ہوا۔ اور اس نے مجبوراً نواب کی اطاعت مان کر اپنی دختر کی شادی نواب کے بیٹے بہاول خاں سے کر دی۔ کوڑا خاں نے نواب کو یہ پٹی بھی پڑھائی کہ وہ اس کے ہم چشم اور مددگار تمنداروں کی لڑکیاں بھی طلب کرے چنانچہ لغاری، گرچانی اور نتکانی سرداروں کو بھی مجبور ہو کر اپنی ایک ایک لڑکی نواب کو دینی پڑی۔

جب ۱۸۳۰ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازی خاں کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا تو کوڑا خاں نے لاہور میں آ کر مہاراجہ کی اطاعت قبول کی اور اس کے صلے میں اسے ایک ہزار روپیہ کی پنشن عطا ہوئی۔ ۱۸۳۲ء میں دیوان ساون مل ڈیرہ غازی خاں کا ناظم مقرر ہوا۔ یہ بوزداروں اور کھیتڑانوں کو مطیع کرنا چاہتا تھا۔ اور کوڑا خاں نے ان قوموں کے مقابلہ میں دیوان کو اچھی مدد دی۔ مگر کھیتڑانوں کے ساتھ لڑنا کھوسوں کے حق میں زبوں ثابت ہوا کیونکہ

میر حاجی خاں کھتران نے جو اپنے زمانے کا سب سے بڑا اور زبردست پہاڑی سردار تھا کھوسوں کے علاقہ پر فوج کشی کی اور انہیں بہت سا نقصان پہنچایا اور یورش کر کے قصبہ یارو کو ان سے چھین لیا۔ اخیر وقت میں کوڑا خاں اور دیوان ساون مل کی دوستی میں بھی فرق آگیا کیونکہ دیوان ساون مل کوڑا خاں کے پرانے دشمن لغاریوں کا طرفدار ہو گیا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں مسٹر اینڈرسن اور وانز ایگنیو صاحبان ملتان میں مارے گئے اور ان کے قتل کے بعد جب ایڈورڈ صاحب بہادر اپنی پٹھان فوج کو لئے ہوئے پائیں کی طرف سے سرحد کی جانب کوچ کر رہے تھے اس وقت سردار کوڑا خاں ان کے ساتھ شامل ہو گیا اور اپنے بیٹے غلام حیدر خاں کو بھیجا کہ وہ ان سے ڈیرہ فتح خاں کے مقام پر ملے۔ ایڈورڈز صاحب بہادر نے غلام حیدر کو جرنیل وان کورٹ لینڈٹ کے نام ایک چٹھی دی اور جرنیل موصوف نے غلام حیدر کو ناصی خاں پوپل زئی کے ساتھ ڈیرہ غازی خاں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اس وقت لونگا رام کاردار شہر ڈیرہ غازی خاں پر قابض تھا یہ دیوان ساون مل کا ماتحت تھا اور لغاری اس کی امداد پر تھے۔ کھوسوں نے غلام حیدر کی زیر ماتحتی امب والہ چاہ پر جو شہر کے مشرق میں ہے لغاریوں پر حملہ کر دیا اور دشمن کے ۸۰ آدمی مار کر ان پر کامل فتح حاصل کی۔ لونگا رام اسیر کر لیا گیا اور ایڈورڈز صاحب بہادر کے پہنچتے ہی شہر ان کے حوالے کر دیا گیا۔ کوڑا خاں تین سو کھوسوں کے ساتھ ایڈورڈز صاحب بہادر کے ہمراہ ملتان آکر شہر کے محاصرے میں بھی شامل ہوا۔ لڑائی کے بعد اس کی پنشن اضافہ کر کے ۲۲۰۰ روپیہ کر دی گئی اور رکھ والا باغ واقعہ ڈیرہ غازی خاں اسے بطور معافی کے عطا کیا گیا۔ غلام حیدر خاں پولیس میں رسالدار بنایا گیا۔ گو یہ ایک حد تک بہادر فیاض اور اپنی قوم کا شیر دل شخص تھا مگر اپنی تلون مزاجی کی وجہ سے پولیس افسری کا کام اچھی طرح سے نہ کر سکا وہ اپنے افسروں کی ایسی متابعت نہیں کرتا تھا جیسی کہ اسے کرنی لازم تھی اس لئے اخیر میں ضروری معلوم ہوا کہ اسے موقوف کیا جائے۔ غلام حیدر خاں عمر بھر سیر و سیاحت کرتے رہنے اور ناموری کے کام کرنے کا بہت مشتاق رہا۔ اس نے شمالی ہندوستان کے کئی سفر کئے۔ ۱۸۴۳ء میں جبکہ مہاراجہ شیر سنگھ کو سندھانوالیوں نے قتل کیا ہے تو غلام حیدر خاں لاہور میں موجود تھا اور اس لڑائی میں جو مہاراجہ کے قتل کے بعد ہوئی اس نے بھی حصہ لیا۔ ایک موقع پر کسی نے اس کے سامنے یہ مثل بیان کی کہ "جو جائیگا نادوں پھر آئے گا کون"۔ اس نے دعویٰ کے ساتھ کہا کہ "میں نادوں جاؤں گا اور فوراً واپس بھی آؤں گا"۔ چنانچہ یہ بغیر زاد راہ کا انتظام کئے روانہ ہو گیا اور راستے میں آب و دانا مہیا کرنے کے لئے اسے مجبوراً اپنے اور اپنے ہمراہیوں کے گھوڑے بیچ دینے پڑے۔ غلام حیدر خاں تلون طبع اور آتش مزاجی کی وجہ سے اپنی قوم کا انتظام بھی نہ کر سکا اور چونکہ اس کا باپ بڈھا اور کمزور ہو گیا تھا اس لئے قوم میں بدامنی پھیل گئی جو عرصے تک قائم رہی۔

سردار کوڑا خاں ۱۸۷۱ء تک زندہ رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے سو سال کی عمر پائی۔ مگر

اخیر وقت میں یہ ایک مدت سے اپنی قوم کا انتظام کرنے کے ناقابل ہو گیا تھا۔ اس کے سب سے بڑے بیٹے احمد خاں نے منشیات کا عادی بن کر اپنا دماغ بیکار کر لیا تھا اور برخوردار خاں بھی تمنداری کے قابل نہ تھا اس لئے یہ زیادہ تر بہاولپور میں رہا کرتا تھا۔ ان وجوہات سے احمد خاں کے بیٹے سکندر خاں نے جو قوم کی سب سے بڑی شاخ کا رکن تھا تمنداری کا دعویٰ کیا اور بنائے دعویٰ یہ قرار دی کہ غلام حیدر خاں اپنے باپ کی زندگی ہی میں فوت ہو چکا ہے اور اب تمنداری اس کا حق ہے مگر سکندر خاں کا یہ دعویٰ نہ چلا اور بالاخر غلام حیدر کے بیٹے سردار بہادر خاں کو تمنداری مل گئی جو اس وقت صرف دس سالہ بچہ تھا۔ سردار بہادر خاں کے دادا کوڑا خاں نے خود اپنے ہاتھ سے پوتے کے سر پر دستار بندی کی رسم ادا کی اور اس کے دوسرے سال فوت ہو گیا۔ اگرچہ سلسلہ جانشینی میں سکندر خاں کا پہلا نمبر تھا لیکن اس کا یہ حق اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ اس میں اس عہدے کا کام چلانے کی قابلیت نہ تھی اور مزید براں قوم کھوسہ کو بھی اس پر اعتبار نہ تھا۔ اس بے اعتباری کی وجہ یہ تھی کہ سکندر خاں نے غدر ۱۸۵۷ء کے ایک موقع پر جبکہ وہ اپنی قوم کی ایک جمعیت کا کمیدان تھا کوئی بہادری ظاہر نہیں کی تھی۔ سکندر خاں وہمی اور ضدی آدمی تھا۔ اس کی بے سلیقگی اور عام لیاقت میں کمی کی وجہ سے خاندان کا کوئی آدمی بھی اس کا دوست نہیں رہا تھا۔ تاہم وہ سردار بہادر خاں کی نابالغی کے زمانے میں تمن کا منیجر اور تمندار کا سرپرست مقرر کیا گیا۔ سردار بہادر خاں ۱۸۷۹ء میں بالغ ہو گیا اور سکندر خاں کو اس کی سرپرستی اور تمن کی منیجری کے عہدے سے علیحدہ ہونا پڑا۔ مگر اس سے اعلیٰ مرتبہ رکھنے کے بعد ادنیٰ درجہ میں اتر آنے پر قناعت نہ ہو سکی۔ اپنے آپ کو جانشینی کا جائز مستحق سمجھتے اور ۸ سال تک عملی طور سے سردار رہ چکنے کی وجہ سے اس نے نئے نوجوان سردار کی مخالفت شروع کر دی اور اس اختلاف سے قوم کو بہت نقصان پہنچا۔ سردار بہادر خاں کو کورٹ آف وارڈز کے انتظام میں رکھ کر انبالہ وارڈز اسکول میں تعلیم دی گئی تھی۔ سردار بہادر خاں کو کچھ تو جوانی اور ناتجربہ کاری اور بہت کچھ اس جماعت کی مخالفت کی وجہ سے جس کے سرغنہ سکندر خاں اور اس کا بھائی دوست محمد خاں تھے اپنے تمن کے انتظام میں ابتداء کسی قدر دقت پیش آئی۔ مگر کھوسوں نے تھوڑے عرصہ کے بعد عام طور پر بخوشی اس کی اطاعت قبول کر لی اور یہ ان میں خوب ہر دلعزیز ہو گیا۔ سردار بہادر خاں نے باطل سے دو میل کے فاصلہ پر ایک نیا قلعہ اور مکان بنایا جو بہادر گڑھ کہلاتا ہے۔

سردار بہادر خاں آنریری مجسٹریٹ اور پراونشل درباری تھا۔ یہ ۱۹۰۶ء میں لاولد فوت ہو گیا اور خاندان کی تمنداری پھر اس کی بڑی شاخ میں واپس آ کر بہادر خاں کے چچا زاد بھائی مبارک خاں ولد سکندر خاں کو ملی۔

سردار مبارک خان بھی آنریری مجسٹریٹ اور پراونشل درباری رہا۔ اس کی سالانہ آمدنی

تقریباً ۲۴۰۰۰ روپے تھی۔ (۳)

۱۹۱۶ء میں سردار مبارک خاں کھوسہ نے بھی وفات پائی۔ اس کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے قبیلے کی تمنداری اس کے کزن سردار غلام حیدر خاں کو منتقل ہو گئی۔ سردار غلام حیدر خان کو انگریزوں نے خان بہادر کا خطاب عطا کیا اور اسے اعزازی مجسٹریٹ اور سب جج کے اختیارات تفویض کئے۔ بعض سیاسی وجوہات اور گرتی ہوئی صحت کے باعث سردار غلام حیدر خاں ۱۹۳۶ء میں اپنے سب سے بڑے بیٹے سردار دوست محمد خاں کے حق میں دستبردار ہو گیا اس وقت سردار دوست محمد خاں کی عمر فقط ۲۶ سال تھی اور وہ بارڈر ملٹری پولیس میں دفعہ دار کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ (۴)

سردار دوست محمد خاں کھوسہ نے کم عمری ہی میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے وقت اس کا بیٹا ذوالفقار علی خان کھوسہ (تاریخ پیدائش : ۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۵ء) بھی خاصا کم عمر تھا۔ چنانچہ اس کی جاگیر کورٹ آف وارڈ میں لے لی گئی اور ۱۹۵۷ء میں اس کے حوالے کی گئی۔

سردار ذوالفقار علی کھوسہ نے یونین کونسل، باطل کی چیئرمین شپ سے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا۔ (۵) ۱۹۶۲ء میں وہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں وہ اپنے چچا اور جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر صوبہ بھر میں کامیاب ہونے والے واحد ایم پی اے سردار عطا محمد کھوسہ کے استعفیٰ کے بعد خالی ہونے والی نشست پر ضمنی انتخاب میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۶)

رکن اسمبلی منتخب ہونے کے بعد سردار ذوالفقار علی کھوسہ نے پیپلزپارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ مگر پیپلزپارٹی کے زوال کے بعد جب ڈیرہ غازی خاں کے نمایاں ترین خاندان مثلاً دریشک اور مزاری پیپلزپارٹی سے علیحدہ ہوئے تو سردار ذوالفقار علی کھوسہ نے بھی اس پارٹی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ (۷)

۱۹۸۵ء میں سردار ذوالفقار علی کھوسہ پی پی ۱۸۴ ڈیرہ غازی خان اسے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اور بعد ازاں پنجاب مسلم لیگ کے نائب صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ (۸)

۱۹۸۸ء میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں وہ نواز شریف کابینہ میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے خدمت سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور بعد ازاں صوبائی کابینہ میں وزیر پانی و بجلی کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ (۹) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں سردار ذوالفقار علی خان کھوسہ نے پی پی ۲۰۱ ڈیرہ غازی خان ۳ سے کامیابی حاصل کی۔ انہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حمایت حاصل تھی (۱۰)

۱۹۹۷ء میں بھی وہ اسی حلقے سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۱) اور صوبائی وزیر مسلم لیگ (ن) کے صوبائی صدر اور پنجاب کے گورنر کے منصب پر فائز رہے۔ تاہم ۲۰۰۲ء میں انہوں نے انتخابات میں حصہ نہیں لیا (۱۲)

۱۹۹۰ء کے انتخابات میں سردار ذوالفقار علی کھوسہ کے صاحبزادے سردار سیف الدین خان کھوسہ آزاد امیدوار سردار مقصود احمد خان لغاری سے فقط ۲۷ ۴۷ ووٹوں سے شکست کھا گئے تھے۔ (۱۳) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں بھی نتائج تو یہی رہے مگر اس مرتبہ ووٹوں کا فرق ۴۷ ۲۷ سے بڑھ کر ساڑھے سترہ ہزار کے لگ بھگ ہو چکا تھا سردار سیف الدین کھوسہ قومی اسمبلی کی نشست این اے ۱۳۳ کو ڈی جی خان، راجن پور سے بھی امیدوار تھے اگر اس نشست پر بھی کامیاب نہ ہو سکے تھے (۱۴) سردار محمد سیف الدین خان کھوسہ ۱۹۹۷ء میں بھی انہی دونوں حلقوں سے امیدوار تھے مگر وہ اس مرتبہ بھی دونوں نشستوں سے انتخاب ہار گئے (۱۵) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے دو صوبائی نشستوں پر انتخاب لڑا مگر وہ اس بار بھی کسی نشست پر کامیاب نہ ہو سکے (۱۶)

سردار ذوالفقار علی کھوسہ کے سوتیلے چچا سردار عطا محمد کھوسہ بھی سیاست میں رہے تھے۔ وہ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وہ ۱۹۷۰ء میں پنجاب بھر میں جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے واحد ایم پی اے تھے۔ ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء میں سردار عطا محمد کھوسہ کے صاحبزادے محسن عطا خان کھوسہ بالترتیب آئی جے آئی اور پی ایم ایل (این) کے ٹکٹ پر پی پی ۲۰۰ ڈیرہ غازی خاں ۲ سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۷) تاہم ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا (۱۸)

سردار ذوالفقار علی کھوسہ کے ایک اور سوتیلے چچا سردار ناصر محمد کھوسہ کے صاحبزادے محمد امجد فاروق خاں کھوسہ بھی ۱۹۸۵ء سے سیاست کے میدان میں ہیں۔ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۸ء میں وہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۱۹) جب ۱۹۹۰ء میں وہ آئی جے آئی کے ٹکٹ پر این اے ۱۳۲ ڈیرہ غازی خان سے قومی اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کھوسہ خاندان کا کوئی فرد قومی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ (۲۰) تاہم ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں وہ اپنی نشست برقرار نہ رکھ سکے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے خواجہ کمال الدین انور سے شکست کھا گئے (۲۱) ۱۹۹۷ء میں سردار امجد فاروق خان نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۲) ۲۰۰۲ء میں بھی وہ اسی حلقے سے امیدوار تھے مگر پاکستان مسلم لیگ (ق) کے خواجہ شیراز محمود سے شکست کھا گئے (۲۳)

کھوسہ خاندان کے ایک اور فرد صلاح الدین کھوسہ ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء دونوں انتخابات میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پی پی ۲۰۰ ڈی جی خان ۲ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا۔ مگر

دونوں مرتبہ کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں انہیں سردار محمد امجد فاروق کھوسہ نے ہرایا تھا۔ (۲۴) جب کہ ۱۹۹۰ میں انہیں محسن عطا خان کھوسہ نے شکست دی تھی (۲۵) انہوں نے ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔ ۲۰۰۲ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کی ہمت کی مگر وہ اس مرتبہ بھی کامیاب نہ ہو سکے (۲۶)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں گزشتہ ۳۲ برس میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ پورے ضلع میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں سے ایک نشست پر بھی کوئی کھوسہ سردار منتخب نہیں ہو سکا (۲۷) البتہ ایک کھوسہ سردار، سردار محمد لطیف خان کھوسہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین کے ٹکٹ پر سینٹ آف پاکستان کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے (۲۸)

حوالہ جات

۱۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۱۸۴

۲۔ کرنل چارلس میسی۔ روسائے با اختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس) لاہور۔ ص ۳۹۴،۳۹۳

۳۔ سر لیپل ایچ گرفین۔ کرنل میسی۔ تذکرۂ روٴسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۵۸۰ تا ۵۹۰

۴۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب۔ لاہور۔ ص ۴۳۱

۵۔ تہور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۷۰۔۱۹۶۹ء۔ لاہور۔ ص ۵۳۰

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵۔ لاہور۔ ص ۲۳۸

۷۔ وکیل انجم۔ سیاست کے فرعون۔ لاہور۔ ص ۱۴۲

۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۲۹۰

۹۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائریکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب۔ لاہور۔ ص ۱۵۷

۱۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/۱۷کتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۲۷

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۷۹

۱۲۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۹۵

۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۲۴۸

۱۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۴۲۸۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۲۹۳

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷۔ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۸۰،

۱۰۰

۱۶۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد دوم۔ ص ۲۰۱،۲۰۲

۱۷۔ ایضاً۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۷۸

۱۸۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔

۱۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۹۰

۲۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۵۹

۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴اکتوبر۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۹۲

۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۰

۲۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم ص ۶۱

۲۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۶۵۱

۲۵۔ ایضاً۔ ۱۱/نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۰۵

۲۶۔ ایضاً۔ ۲۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۳۰۶۳

۲۷۔ عابد تہامی۔ الیکشن ۲۰۰۲ء۔ لاہور ص ۴۷۲

۲۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد اول ص ۲۸۶

گردیزی

گردیزی سید ایک زمانہ میں ضلع ملتان کے تمام سادات خاندانوں میں سب سے زیادہ متمول اور بارسوخ تھے اور تحصیل کبیر والہ کا تقریباً وہ کل حصہ ان کے قبضہ میں تھا جس میں سے اب لاہور کو آنے والی جرنیلی سڑک گزرتی ہے۔ دریائے راوی کے بہاؤ کا موقع مل جانے سے ان کا علاقہ دریا برد ہو کر ویران ہو گیا۔ اگرچہ اس وجہ سے خاندان کی مالی حیثیت گھٹ گئی ہے تاہم ان کا رسوخ اور اقتدار بدستور اور خوب قائم ہے۔ سادات گردیزی حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد ہونے اور مذہباً" شیعہ ہونے کی وجہ سے حسینی کہلاتے ہیں۔ پہلے ان کی سکونت بغداد میں تھی۔ گردیزی سادات کا مورث اعلیٰ سید محمد دیبال حضرت امام حسینؓ کے پڑپوتے کا بیٹا تھا۔ سید محمد دیباج کا لڑکا سید محمد علی اپنے اصلی وطن مدینہ منورہ سے نقل مکان کر کے بغداد میں چلا آیا اور سید محمد علی کے پڑپوتے سید عبداللہ نے بغداد سے مقام گردیز متصل شہر غزنی میں نقل مکان کر دیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی بعد ازاں سید عبداللہ کے پڑپوتے شیخ المشائخ حضرت ابو الفضل جمال الدین محمد یوسف ۱۰۸۸ء میں گردیز سے ہجرت کر کے ملتان میں آ رہے اور اپنے زہد و اتقا اور کرامات کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گئے اور بہت سی اراضیات ان کو نذرانہ میں پیش کی گئیں۔ ۱۱۳۷ء میں ان کا وصال ہو گیا اور ان کی درگاہ ملتان میں بڑی عزت و حرمت رکھتی ہے۔ ان کی نسبت مشہور ہے کہ آپ چیتے پر سوار ہو کر سانپ کو بطور کوڑے کے استعمال کرتے تھے اور ان کا دست مبارک گاہے گاہے ان کے مزار کے باہر نکلا ہوا دکھائی دیا کرتا تھا۔

محمد یوسف ثانیؒ حضرت ابو الفضل جمال الدین محمد یوسفؒ سے آٹھویں پشت میں ہوئے یہ بغیر کسی اولاد نرینہ کو اپنی یادگار چھوڑنے کے فوت ہو گئے اور ان کی لڑکی سید ابو الفتح نامی ایک شخص سے بیاہی گئی جو حضرت امام حسینؓ کے ایک اور پوتے حضرت زید شہیدؒ کی اولاد سے تھے اور اسی وجہ سے اس خاندان کو بعض وقت زیدی بھی کہتے ہیں۔ سید ابو الفتح کا لڑکا محمد یوسف ثالث گردیزی بزرگ کی درگاہ کا وارث اور سجادہ نشین ہوا۔

٭٭٭

اس خاندان کے پاس مختلف مسلمان سلاطین دہلی کے کئی فرمان موجود ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغل بادشاہوں کے زمانہ میں اس خاندان کی کس قدر تعظیم و تکریم ہوتی تھی اور ان کا کتنا جاہ و جلال تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب شہنشاہ اورنگزیب سید محمد یوسف رابع کے زمانے میں ملتان آیا تو اس نے سید موصوف کو ایک بیش بہا خلعت اور ایک ہاتھی نذر دیا تھا۔

۱۹۰۹ء میں اس درگاہ کا سجادہ نشین خاندان کی سب سے بڑی شاخ کا رکن مخدوم شیخ محمد راجو تھا۔ اس کا قیام خاص شہر ملتان میں رہتا تھا اور اس کی راستبازی اور فیاضی کی وجہ سے لوگ اس کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ مخدوم شیخ محمد راجو ڈویژنل درباری اور آنریری مجسٹریٹ تھا اور ۳۰ سال تک متواتر ملتان میونسپل کمیٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر رہا۔ ۱۰۰ روپیہ سالانہ کی مالیت کی جاگیر اس کے نام تھی اور نہر چناب پر ۷ مربعہ بھی ملے ہوئے تھے۔ مخدوم راجو کا بھائی امیر حیدر شاہ زیادہ تر موضع امیر پور تحصیل کبیر والہ میں رہتا تھا جہاں اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا امیر حیدر شاہ بڑا ہوشیار اور محتاط زمیندار تھا۔

اس خاندان کی ایک اور شاخ موضع کورائی بلوچ تحصیل کبیر والہ میں ہے اس شاخ کا سب سے ممتاز رکن سید مراد شاہ تھا۔ اس نے ریاست بہاولپور میں چیف جج کے عہدے تک عروج پایا۔ ۱۸۴۸ء کے محاصرہ ملتان میں اس نے انگریزی فوج کی بڑی امداد کی تھی اس لئے یہ الحاق پنجاب کے بعد شور کوٹ اور جھنگ کا پیش کار مقرر کیا گیا۔ ۱۸۵۰ء میں اس کو تحصیلداری ملی اور اس عہدے پر ۱۴ سال کی خدمات کے بعد ترقی پا کر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو گیا۔ ایام غدر کی اچھی خدمات کے صلہ میں اسے ایک سند اور ۲۰۰ روپیہ کا خلعت عطا ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں اسے ریاست بہاولپور کا نیٹو ایجنٹ مقرر کیا گیا اور بعد ازاں پولیٹکل ایجنٹ اور سپرنٹنڈنٹ کا نائب مقرر ہوا۔ اس نے انہار منچن واہ اور فورڈ واہ کی تیاری میں بہت اچھی کار گزاری دکھائی جس کے صلہ میں صاحب پولیٹکل ایجنٹ بہادر کی سفارش پر اس کو ۷۰۰۰ روپیہ نقد انعام عطا ہوا اور تنخواہ میں بھی ترقی کی گئی۔ پھر جب کہ ۱۸۷۰ء میں ریاست میں چیف کورٹ قائم کیا گیا تو مراد شاہ یہاں کا چیف جج مقرر ہوا اور چیف ججی کے علاوہ ریاست کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی رہا۔ ۱۸۷۲ء میں لارڈ نارتھ بروک بالقابہ وائسرائے ہند نے ملتان میں ایک دربار کیا جس میں سید مراد شاہ کو ۸۰۰ روپیہ کا خلعت عطا ہوا۔ ۱۸۷۴ء میں مراد شاہ کے عہدہ چیف ججی پر نہایت اعلیٰ درجہ کا کام کرنے کے صلہ میں اس کی تنخواہ بڑھا کر ۱۰۰۰ روپیہ ماہوار کر دی گئی۔ جنوری ۱۸۷۶ء میں بحالت ملازمت اس کا انتقال ہو گیا اور ریاست نے عطیہ حسن خدمات کے طور پر اس کی بیوہ اور لڑکے کو ۶۰۰۰ روپیہ مرحمت کیا۔

سید مراد شاہ مرحوم کا اکلوتا بیٹا خان بہادر سید حسن بخش اپنے باپ کی وفات کے وقت صرف ۱۵ سال کا تھا۔ اس کی نابالغی کے زمانہ میں اس کی جائداد کا انتظام کورٹ آف وارڈز کے

سپرد رہا۔ یہ ملتان میں رہتا تھا اور عرصہ تک ملتان میونسپل کمیٹی کا وائس پریذیڈنٹ رہا۔ یہ آنریری مجسٹریٹ اور پراونشل درباری بھی تھا اور ۱۸۹۹ء میں اسے خان بہادر کا خطاب عطا ہوا تھا۔ خان بہادر حسن بخش نہایت تعلیم یافتہ اور مطالعہ کا بہت شوقین تھا۔ اس نے ایران اور دیگر ممالک میں بہت سے سفر کرکے خود ہی اپنا سفر نامہ دو جلدوں میں لکھا تھا۔ یہ ۱۹۱۱ء کے دہلی دربار میں مدعو کیا گیا تھا اور اسے تمغہ تاجپوشی عطا ہوا تھا۔ اس نے جنگ عظیم کے دوران میں جنگی خرچ کے لئے ۴۰۰۰ روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا اور ۸۰۰۰ روپیہ جنگ مذکور کے دوسرے فنڈوں میں بطور چندہ دیا اور ۲۵ رنگروٹ مہیا کئے اس نے ایک تعلیمی ادارہ بنام باب العلوم قائم کیا جو ملتان کی شیش محل روڈ پر واقع ہے اور اس کے لئے ایک مکان دیا اور ۵ مربعہ جات اراضی اس کے اخراجات کے لئے اس کے نام کر دیئے۔ اس باب العلوم میں مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ خان بہادر مرحوم نے اس لائلسٹ ایسوسی ایشن کا پریذیڈنٹ ہونا منظور کیا جو ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے رد کے طور پر قائم کی گئی تھی۔ خان بہادر مرحوم کی کوششوں سے اس ایسوسی ایشن کی ۲۵ شاخیں ضلع کے مختلف مقامات میں قائم ہوئیں اور اس کی اس محنت کی تعریف کمشنر نے بھی کی۔ خان بہادر حسن بخش نے سلور جوبلی فنڈ میں ۵۰۰ روپیہ دیا اور اسے سلور جوبلی میڈل اور ایک سند عطا ہوئے۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا سید زمرد حسین شاہ جوانی کی عمر میں ایک لڑکا محمد عبدالجلیل شاہ چھوڑ کر فوت ہو گیا۔ محمد عبدالجلیل شاہ اپنے دادا خان بہادر حسن بخش کی وفات پر جو ۱۹۳۸ء میں واقع ہوئی مرحوم کی جگہ پراونشل درباری بنایا گیا۔۔۔۔ خان بہادر موصوف کا دوسرا بیٹا محمد نواز شاہ پنشنر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور اس نے جنگ عظیم کے دوران بھرتی کا اچھا کام کیا۔ خان بہادر موصوف کا تیسرا بیٹا سید الطاف حسین شاہ تحصیلدار تھا جس کا بیٹا عباس حسین شاہ گریجویٹ اور پنجاب شیعہ کانفرنس کا پریذیڈنٹ تھا۔ (۱)

قیام پاکستان کے بعد ملتان کے گردیزیوں میں سے جو افراد سیاست کے افق پر نمایاں ہوئے ان میں سب سے زیادہ شہرت محمد نواز شاہ گردیزی کے بیٹے علی حسین شاہ گردیزی نے حاصل کی۔ وہ قیام پاکستان سے پہلے سے ہی مسلم لیگ کی تنظیم سے وابستہ تھے اور تحریک پاکستان کے دنوں میں قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کر چکے تھے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے کونسلر ضلعی آرگنائزر اور صوبائی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن بنے اور کچھ دنوں تک صوبائی وزیر بھی رہے۔ ان کے پاس ترقیات کا قلمدان تھا۔ (۲) ۱۹۵۶ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۳) ایوب خان کی حکومت نے انہیں ایبڈو کے تحت نااہل قرار دیا چنانچہ وہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء تک کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لے سکے۔ (۴)

علی حسین شاہ گردیزی کے بعد ملتان سے گردیزی خاندان کا جو فرد سیاست میں سب سے

نمایاں ہوا۔ وہ سید عباس حسین گردیزی تھے۔ سول سروس سے بطور ڈپٹی کمشنر ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء دونوں انتخابات میں حصہ لیا اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان دونوں انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لیا تھا۔ (۵)

۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء دونوں انتخابات میں گردیزی خاندان کے ایک اور فرد سید محمد رضی شاہ گردیزی بھی صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیتنے میں کامیاب رہے۔ دونوں انتخابات میں انہیں پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سید رضی شاہ گردیزی پہلے پیپلز پارٹی کے شدید مخالف ہوا کرتے تھے اور ۱۹۷۰ء میں انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے نواب صادق حسین قریشی کی ایما پر ذوالفقار علی بھٹو کے قافلے پر حملہ بھی کروایا تھا۔ مگر جب کچھ ہی عرصہ بعد نواب صادق حسین قریشی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تو سید رضی شاہ گردیزی نے بھی پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ سید رضی شاہ گردیزی نے ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ وہ این اے ۱۱۵ ملتان ۵ سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور انہیں سید حامد رضا گیلانی کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی۔ (۶)

ملتان ہی سے گردیزی خاندان کے ایک اور فرد جو مدت دراز سے عملی سیاست میں رہے۔ سید قسور گردیزی ہیں۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک پاکستان کے دنوں میں پاکستان مسلم لیگ سے کیا۔ تقسیم کے بعد وہ مسلم لیگی رہنماؤں کی سیاست سے دلبرداشتہ ہو گئے اور انہوں نے نومبر ۱۹۵۰ء میں میاں افتخار الدین کے ہمراہ آزاد پاکستان پارٹی تشکیل دی۔ اس پارٹی کے منشور کا ایک اہم مطالبہ ملک سے جاگیرداری کا خاتمہ تھا۔ سید قسور گردیزی نے ستمبر ۱۹۵۶ء میں پاکستان نیشنل پارٹی اور جولائی ۱۹۵۷ء میں نیشنل عوامی پارٹی کے قیام میں اہم کردار ادا کیا اور آخرالذکر پارٹی کے وائس چیئرمین بھی منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات میں انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کا کھل کر ساتھ دیا جس کی وجہ سے انہیں ایوب خان کے دور میں قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بھٹو کے زمانے میں بھی وہ اپنے نظریات کی وجہ سے پس دیوار زنداں ہی رہے (۷) ۱۹۷۸ء میں انہوں نے غوث بخش بزنجو کے ساتھ مل کر پاکستان نیشنل پارٹی (پی این پی) کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے ۱۱ر ستمبر ۱۹۹۳ء کو لاہور میں وفات پائی آخری وقت تک وہ پی این پی ہی سے وابستہ تھے (۸) قسور گردیزی مخدوم سجاد حسین قریشی کے برادر نسبتی تھے (۹)

گردیزیوں کی ایک شاخ بہاولپور میں بھی آباد ہے' اس شاخ کے مورث اعلیٰ سید واجد علی شاہ گردیزی نے رنجیت سنگھ کے عہد میں میلسی ضلع ملتان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اسی خاندان کے ایک اور بزرگ سید محمد نواز شاہ تھے۔ جن کا مزار میلسی میں ہے۔ ان کی اولاد میں سے سید امام شاہ گردیزی نواب بہاول خاں رابع کے عہد میں بہاولپور تشریف لائے اور مشیر فوج کے عہدے پر مامور ہوئے۔ سید امام شاہ کے فرزند سید محمد نواز شاہ نے بھی مشیر فوج' چیف جج

اور وزیر کی حیثیت سے ریاست اور ریاستی عوام کی خدمت کی۔ سید محمد نواز شاہ کے دو فرزند سید محمد علی شاہ اور سید غلام علی شاہ تھے۔ سید غلام علی شاہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی سے بیعت تھے۔ انہوں نے چار شادیاں کیں مگر اولاد سے محروم رہے۔ پھر انہوں نے اپنے مرشد سے دعا کے لئے رجوع کیا۔ مرشد کی دعا سے ان کے یہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ جن کے نام سید محمد نواز شاہ گردیزی اور سید احمد نواز شاہ گردیزی تھے۔ (۱۰)

سید محمد نواز شاہ گردیزی مسلم لیگ میں شامل تھے۔ وہ بہاولپور مسلم لیگ کے سیکرٹری مالیات بھی رہے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ ریاست بہاولپور کی کابینہ کے رکن بنے۔ (۱۱) وہ ایک مرتبہ صوبائی اسمبلی کے رکن بھی بنے۔ جس کا سبب یہ تھا کہ ان کے چھوٹے بھائی احمد نواز شاہ گردیزی جب صوبائی اسمبلی میں کامیابی کے بعد وزیر بنائے گئے تو اس وقت کے قانون کے مطابق ان کی رکنیت ختم ہو گئی۔ سیاسی ضرورت کا تقاضہ تھا کہ یہ رکنیت بہرصورت گھر میں ہی رہے۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے محمد نواز شاہ صاحب کو اس نشست پر منتخب کروا دیا گیا اس کے بعد جب احمد نواز شاہ صاحب کو رکنیت کی ضرورت پیش آئی تو وہ فوراً مستعفی ہو گئے اور صوبائی اسمبلی کی نشست دوبارہ احمد نواز شاہ کو مل گئی۔ (۱۲)

محمد نواز شاہ گردیزی کے صاحبزادے تسنیم نواز گردیزی ہیں۔ وہ ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء تینوں انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ان کا تعلق اسلامی جمہوری اتحاد سے تھا۔ وہ محمد خان جونیجو اور میاں محمد نواز شریف کی کابیناؤں میں وزارت پر بھی فائز رہے تھے۔ (۱۳) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں تسنیم نواز گردیزی نے ایک مرتبہ پھر این اے ۱۴۳ سے انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے میاں ریاض حسین پیرزادہ سے تقریباً سولہ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۴) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں تسنیم نواز گردیزی پاکستان مسلم لیگ (ن) کی نامزدگی حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے ور ان کی نشست سے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر محمد عقیل الرحمٰن بلا مقابلہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہو گئے۔ (۱۵) وہ ۲۰۰۲ء میں بھی پاکستان مسلم لیگ کے کسی بھی دھڑے کی نامزدگی حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے مگر ان کی خوش قسمتی کہ ان کے حلقے این اے ۱۸۷ بہاولپور ۵ سے پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین کے کامیاب امیدوار چودھری اعتزاز احسن نے یہ نشست خالی کردی۔ جس پر بعدازاں ضمنی انتخاب میں تسنیم نواز گردیزی آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہو گئے۔ (۱۶) تسنیم نواز گردیزی انتخابات میں کامیابی کے بعد پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شامل ہو گئے۔ (۱۷)

تسنیم نواز گردیزی احمد نواز گردیزی کے داماد ہیں جبکہ ان کے بڑے بھائی سلیم نواز گردیزی

مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ کے داماد اور پیر پگاڑا اور علمدار حسین گیلانی کے ہم زلف ہیں۔ (۱۸)

محمد نواز شاہ گردیزی کے چھوٹے بھائی احمد نواز شاہ گردیزی نے اپنے بڑے بھائی کی بہ نسبت سیاست میں زیادہ نام کمایا۔ وہ ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ (۱۹) قیام پاکستان کے بعد وہ صوبائی سیاست میں متحرک رہے اور صدر ایوب خان کے دور میں صوبائی وزارت تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ ان کے صاحبزادے سید سلیمان احمد گردیزی ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء دونوں انتخابات میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے ہیں۔ (۲۰) تاہم ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں وہ چوہدری صفدر حسین سے تقریباً ۲۲ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے تھے۔ (۲۱)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں سلیمان گردیزی کے چھوٹے بھائی سید عرفان احمد گردیزی، پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۲) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں تحسین نواز گردیزی نے پی پی ۲۷۳ بہاولپور ۷ سے پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۳) ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے بعد احمد نواز گردیزی کی صاحبزادی بشریٰ نواز گردیزی خواتین کی مخصوص نشستوں پر پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی ہیں۔ انہیں اس نشست پر پاکستان مسلم لیگ (ق) نے نامزد کیا تھا۔ (۲۴)

حوالہ جات

۱۔ سرلیپل ایچ گرفین۔ کرنل میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ حصہ دوم۔ ص ۵۰۹ تا ۵۱۲

۲۔ تہور علی خان بائیوگرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۶۲۔۱۹۶۱ء۔ لاہور ص ۵۱

۳۔ احمد سلیم۔ دی گردیزیز آف ملتان اینڈ بہاولپور۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔۲۳ر۔۲۹ر دسمبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۴۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۷۵

۵۔ منشی عبدالرحمان خان۔ آئینہ ملتان۔ ملتان۔ ص ۵۴۲

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۲۱۲، ۲۱۳

۷۔ احمد سلیم۔ دی گردیزیز آف ملتان اینڈ بہاولپور۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۳ر۔۲۹ر دسمبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۸۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۹۳ء

۹۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۷ر اگست ۱۹۹۱ء

۱۰۔ مسعود حسن شہاب دہلوی۔ مشاہیر بہاولپور۔ ص ۲۰۸

۱۱۔ تہور علی خان بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۶۲۔۱۹۲۱ء لاہور۔ ص ۴۰۲

۱۲۔ مسعود حسن شہاب دہلوی۔ مشاہیر بہاولپور۔ بہاولپور۔ ص ۲۰۸

۱۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۱۱۸، ۴۹۶، ۴۹۸، ۴۹۹

۱۴۔ احمد سلیم۔ دی گردیزیز آف ملتان اینڈ بہاولپور۔ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۳۔/۲۹ دسمبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم ص ۱۰۷

۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم ص ۶۵، ۳۷۸

۱۷۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۹۷

۱۸۔ مسعود حسن شہاب دہلوی۔ مشاہیر بہاولپور۔ بہاولپور۔ ص ۲۰۹

۱۹۔ تہور علی خان بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۵۶۔۱۹۵۵ء لاہور۔ ص ۷

۲۰۔ (۱) طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور ص ۳۰۸

(۲) طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۴۱۲، ۴۱۳

۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۳۳

۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۰۱

۲۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ رپورٹ جلد اول۔ ص ۲۱۰

۲۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ رپورٹ جلد اول۔ ص ۳۳۱

گیلانی

ملتان کے گیلانیوں کا خاندان نہایت قدیم ہے اور ان کا نام ایران کے ایک صوبے گیلان کی طرف منسوب ہے وہ حضرت پیران پیر شیخ سید عبدالقادر گیلانی کی اولاد میں ہیں۔

حضرت پیران پیر کی نویں پشت میں ایک بزرگ حضرت سید شیخ محمد غوث تھے جو پندرھویں صدی عیسوی میں ریاست بہاولپور میں اچ کے مقام پر آ کر آباد ہوئے۔ اسی مقام پر حضرت سید شیخ محمد غوث کے نگڑ پوتے کے گھر میں حضرت پیر موسیٰ پاک شہید پیدا ہوئے جو گیلانی خاندان کے جد امجد ہیں۔ (۱)

حضرت سید موسیٰ پاک شہید ولی کامل اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ آپ کے حلقہ مریدین میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسے بزرگ شامل تھے۔ ۱۵۹۲ء میں آپ موضع منگے ہٹی سے گزر رہے تھے کہ آپ پر قزاقوں نے حملہ کر دیا آپ اس حملہ میں شہید ہوئے اور آپ کو منگے ہٹی ہی میں دفن کر دیا گیا۔ پندرہ برس بعد آپ کے صاحبزادے سید حامد بخش المعروف بہ سید فیض اللہ کو خیال پیدا ہوا کہ آپ کی نعش مبارک کو ملتان منتقل کیا جائے۔ جب نعش کو ملتان لانے کے لئے قبر سے نکالا گیا تو وہ صحیح و سالم تھی اور اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا تھا۔ یہ دیکھ کر لوگ بے حد متعجب اور معتقد ہوئے۔ بعد ازاں آپ کی لاش ملتان لا کر پاک دروازے کے اندر دفن کی۔ یہ بڑی مشہور درگاہ ہے اور ہر مذہب و ملت کے بہت سے مسلمان اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ (۲)

حضرت سید موسیٰ پاک شہید کے چار فرزند تھے۔ جن میں سے دو فرزند نواب سید یحییٰ اور نواب سید موسیٰ جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں ملتان کے ناظم مامور ہوئے۔

شہنشاہاں مغلیہ کی طرف سے درگاہ کے سجادہ نشین کو ساڑھے بارہ ہزار روپیہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی اور جس وقت شہنشاہ محمد شاہ حضرت مخدوم شیخ محمد غوث ثانی سے ملنے آئے تو اس نے اس جاگیر میں مزید اضافہ کر دیا۔

۱۸۴۸ء میں جب میجر ایڈورڈ نے ملتان فتح کیا تو وہ اس درگاہ کے سجادہ نشینوں کی خیر خواہی سے متاثر ہوا اور اسے صرف اسی درگاہ کے لئے یہ سند دی کہ اسے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران مخدوم شیخ حامد گنج رابع المعروف پیر سید نور شاہ نے انگریزوں کی نمایاں خدمات انجام دیں چنانچہ ان کی قوم فروشانہ خدمات کے عوض ۱۸۵۹ء میں سر جان لارنس نے انہیں ۳۰۰ روپے کی ایک خلعت اور ایک سند عطا کی۔

حضرت پیر سید نور شاہ کے بعد ان کے جانشین پیر سید ولایت شاہ ہوئے۔ انگریزوں نے انہیں ۱۸۷۷ء میں ملتان کا اعزازی مجسٹریٹ مقرر کیا۔ ۱۸۷۸ء میں ان کی وفات کے بعد ان کی جانشینی مخدوم شیخ محمد غوث رابع نے سنبھالی جو مخدوم سید صدرالدین شاہ کے نام سے معروف ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر فقط دس برس تھی۔ (۳)

مخدوم سید صدر الدین شاہ گیلانی موجودہ گیلانی خاندان کے سربراہ اور خانقاہ حضرت موسیٰ پاک شہید کے سجادہ نشین تھے' دس برس کی عمر میں ۱۸۷۸ء میں آپ نے اپنے والد ماجد کی جگہ سجادگی سنبھالی۔ چونکہ ملتان کے گیلانی خاندان نے جنگ ملتان میں اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی قابل قدر خدمات انجام دی تھیں۔ اسی لئے انگریز حکام آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ زہد و تقویٰ کی وجہ سے مسلمانوں میں ہی بہت محبوب و مقبول تھے۔ ہندو مسلمان سب آپ کا احترام کرتے تھے' آپ سرکار انگریزی کے یار وفادار تھے۔ انجمن رؤسائے پنجاب کے رکن اور پراونشل درباری تھے۔ چار سال تک ڈسٹرکٹ جیل ملتان کے آنریری وزیٹر رہے۔ ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے موقعہ پر جارج پنجم نے آپ کو شرف ملاقات بخشا۔ پہلی جنگ عظیم میں آپ نے سرکاری انگریزی کی بڑی خدمت انجام دیں۔ جس پر آپ کو خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔ آپ کی خاندانی خدمات کی وجہ سے اعلیٰ انگریز حکام از قسم گورنر' کمشنر اور ڈپٹی کمشنر دربار پیر صاحب پر پہنچ کر اظہار عقیدت کرتے تھے' آپ کے ہزاروں مرید شمالی ہندوستانی اور افغانستان تک پھیلے ہوئے تھے' وہ بھی آپ کی طرح وفادار سرکار رہے۔ (۴)

خان بہادر مخدوم سید صدر الدین شاہ کے دو بھائیوں میں سے ایک سید شیر شاہ سرکاری ملازم ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ایکسٹرا اکمشنر بن گئے۔ انہوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزی فوج میں رنگروٹ بھرتی کروائے جن کے صلہ میں انہیں ایک تمغے' سنہری گھڑی' تلوار اور خانصاحب اور خان بہادر کے خطابات سے نوازا گیا۔ صدر الدین شاہ کے دوسرے بھائی سید راجن بخش شاہ ۱۹۲۱ء میں مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن بنے اور اپنی وفات یعنی ۱۹۳۶ء تک مسلسل اس کے رکن رہے۔ خان بہادر مخدوم سید صدر الدین شاہ کے چار بیٹے ہوئے جن کے نام سید غلام یٰسین شاہ' سید غلام مصطفیٰ شاہ' سید محمد مختار حسین شاہ اور سید محمد رضا شاہ تھے یہ تمام بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور وہ تمام کے تمام اعلیٰ سرکاری ملازمتوں پر فائز رہے' آخر الذکر

یعنی سید محمد رضا شاہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن بھی رہے۔ اور ان کے پاس اعزازی مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر کے عہدے بھی رہے۔ (۵)

۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخابات میں ملتان کے تقریباً تمام بڑے خاندانوں نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لیا مگر گیلانی خاندان نے اس انتخاب میں ہی نہیں، تحریک پاکستان کے ہر مرحلے پر مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ اس انتخاب کے موقع پر سید محمد رضا شاہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر شجاع آباد کے حلقے سے امیدوار تھے ان کے مد مقابل قریشی خاندان کے سربراہ سر مرید حسین قریشی تھے جنہیں یونینسٹ پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ قریشی خاندان ہی کے عاشق حسین قریشی اس انتخاب میں آزاد امیدوار کے طور پر حصہ لے رہے تھے۔ یہ انتخاب سید محمد رضا شاہ گیلانی نے جیت لیا۔ (۶) اس سے کچھ عرصہ قبل ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے چیئرمین کے انتخاب میں انہوں نے انگریز ڈپٹی کمشنر ای پی مون کو بھاری اکثریت سے شکست دی تھی۔ وہ غالباً متحدہ پنجاب کے تمام اضلاع میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے واحد غیر سرکاری چیئرمین تھے۔ (۷)

انہی سید محمد رضا شاہ کے صاحبزادے سید حامد رضا گیلانی نے پاکستان کی سیاست میں نام کمایا۔ مگر ان کا ذکر ذرا آگے آئے گا۔

سید غلام مصطفیٰ شاہ کے نو بیٹے تھے۔ جن میں تین بیٹے یعنی سید ولایت حسین شاہ، سید علمدار حسین شاہ اور سید رحمت حسین شاہ سیاست کے میدان میں نمایاں ہوئے۔ سید ولایت حسین شاہ اور سید علمدار حسین شاہ ۱۹۵۱ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جبکہ سید علمدار حسین ۱۹۵۳ء میں صوبائی وزیر صحت کے منصب پر فائز ہوئے۔ (۸)

اس کے بعد پنجاب میں وزارتیں بدلتی رہیں مگر سید علمدار حسین گیلانی ہر وزارت میں شامل ہوتے رہے، ون یونٹ کے قیام کے بعد جب ری پبلکن پارٹی وجود میں آئی تو سید علمدار حسین گیلانی اس نومولود پارٹی میں بھی شامل ہو گئے اور اکتوبر ۱۹۵۸ء تک اسی پارٹی سے وابستہ رہے۔ (۹) مارشل لاء کے دوران وہ ایبڈو کی زد میں آ گئے مگر انہوں نے اپنے خاندان کو سیاست سے خارج نہ ہونے دیا اور اپنے بھائی سید رحمت حسین شاہ گیلانی کو کنونشن مسلم لیگ میں شامل کروا کے ان کے سہارے سیاست میں حصہ لیتے رہے۔

اسی دوران سید محمد رضا شاہ کے صاحبزادے سید حامد رضا گیلانی بھی سیاست کے میدان میں نمایاں ہونا شروع ہوئے۔ وہ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء دونوں انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے وہ ذوالفقار علی بھٹو کے دوستوں میں شامل تھے اور انہی کے کہنے پر حامد رضا گیلانی ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء دونوں مرتبہ پارلیمانی سیکرٹری بنائے گئے تھے۔

بھٹو کی وزارت سے علیحدگی کے بعد سید حامد رضا گیلانی بھی ان کے ساتھ جانے پر رضامند تھے۔ مگر قومی اسمبلی کی رکنیت سے محرومی اور ملتان کے قریشی گروپ کی مخالفت کے خوف سے

کنونشن لیگ میں شامل رہے۔ (۱۰)

ایوب خان کے زوال کے بعد حامد رضا گیلانی پیپلز پارٹی میں شامل ہونا چاہتے تھے مگر ان کے کزن علمدار حسین گیلانی نے ایسا نہ ہونے دیا اور وہ دونوں مسلم لیگ قیوم گروپ میں شامل ہو گئے۔ اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک سیاسی تجزیہ نگار نے تحریر کیا تھا۔

"اسے محض اتفاق سمجھئے یا موقع پرستی کہ گیلانی خاندان نے ہمیشہ برسر اقتدار جماعت کا ساتھ دیا ہے لیکن ملتان کے سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ اس مرتبہ گیلانی خاندان دور اندیشی کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔ اس نے غلط گھوڑے پر ہاتھ رکھا ہے۔ بہرحال ان کا انتخاب کیا ہی ہو' صحیح صورتحال چند ماہ بعد سامنے آ جائے گی"۔ (۱۱) اور پھر ہوا بھی یہی۔ چند ماہ بعد جب انتخابات منعقد ہوئے تو حامد رضا گیلانی اور علمدار حسین گیلانی دونوں ہی شکست کھا چکے تھے اور ان کا حریف قریشی خاندان' پیپلز پارٹی کا سہارا لے کر ملتان کی سیاست پر قابض ہو چکا تھا۔

حامد رضا گیلانی کچھ عرصہ بعد پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ جس کے بعد بھٹو نے انہیں سفارتی عہدے پر فائز کر دیا اور ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک وہ مشرقی افریقہ کے ممالک میں سفارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور بعد ازاں چند ماہ تک وفاقی وزیر بھی رہے۔ ان کے پاس صنعت کا قلمدان تھا۔

۱۹۷۷ء میں بھٹو کے زوال کے بعد حامد رضا گیلانی نے جنرل ضیاء کے ہاتھ مضبوط کرنا شروع کر دیئے۔ وہ ۱۹۸۵ء کے انتخابی عمل میں شریک ہوئے اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۲) وہ کچھ عرصہ غلام مصطفیٰ جتوئی کی نیشنل پیپلز پارٹی میں شامل رہے تاہم ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہوں نے اپنے بھتیجے یوسف رضا گیلانی سے مقابلہ کیا۔ انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی اور یوسف رضا گیلانی کو پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ یہ مقابلہ یوسف رضا گیلانی کے ہاتھ رہا اور حامد رضا گیلانی یہ انتخاب تقریباً ۵ ہزار ووٹوں سے ہار گئے۔ (۱۳) ۱۹۹۱ء میں وہ سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۴)

۲۰۰۲ء میں ان کے صاحبزادے سید حیدر رضا گیلانی نے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۵)

یوسف رضا گیلانی، علمدار حسین گیلانی کے صاحبزادے ہیں۔ علمدار حسین گیلانی نے ۸/اگست ۱۹۷۸ء کو وفات پائی۔ (۱۶) یوسف رضا گیلانی ملکی سیاست کے افق پر اس وقت نمایاں ہوئے جب انہوں نے ۱۹۸۳ء میں ڈسٹرکٹ کونسل ملتان کی چیئرمین شپ کا انتخاب جیتا۔ ان کے مد مقابل امیدوار سید فخر امام تھے جو ان دنوں وفاقی وزیر بلدیات بھی تھے۔ سید فخر امام نے یہ انتخاب ہارنے کے بعد وفاقی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۸۵ء میں یوسف رضا گیلانی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ چونکہ پیر پگاڑا ان کے خالو اور مخدوم زادہ حسن محمود ان کے ماموں تھے اس لئے انہیں فوری طور پر وفاقی کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔ انہیں پہلے ہاؤسنگ اور فزیکل پلاننگ کا اور پھر ریلوے کا قلمدان سونپا گیا یہ بات ان کے اور ان کے چچا حامد رضا گیلانی میں وجہ تنازع بھی بنی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حامد رضا گیلانی اسی رنجش کی وجہ سے مسلم لیگ چھوڑ کر اپنے دیرینہ دوست غلام مصطفیٰ جتوئی کی این پی پی میں چلے گئے تاہم کچھ عرصہ بعد انہوں نے ایک مرتبہ پھر مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

ادھر جونیجو حکومت میں وزارت کے مزے لوٹنے والے یوسف رضا گیلانی نے جب پیپلز پارٹی کا ستارہ بلندیوں پر جاتے ہوئے دیکھا تو ۱۹۸۸ء کے انتخاب سے پیشتر پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ انہیں پیپلز پارٹی کا ٹکٹ بھی مل گیا۔ اگرچہ ان کے مد مقابل پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف تھے تاہم اھوا این اے ۱۱۴ ملتان ا سے بآسانی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۷) بے نظیر حکومت میں بھی وہ ریلوے کے وفاقی وزیر بنائے گئے۔ انہوں نے اپنی وزارت کے دوران اپنے حلقہ انتخاب کے سینکڑوں افراد کو ریلوے میں بھرتی کروایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے اپنے چچا حامد رضا گیلانی کو شکست دے کر اپنی نشست جیتنے کی ہیٹ ٹرک کر لی۔ (۱۸) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں یوسف رضا گیلانی نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے حاجی سکندر حیات بوسن کو تقریباً ۲۴ ہزار ووٹوں سے شکست دی (۱۹) بعد ازاں وہ قومی اسمبلی کے اسپیکر کے منصب پر فائز ہوئے۔ انہیں اس عہدے کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی نے نامزد کیا تھا اور انہوں نے یہ مقابلہ ۹۰ ووٹوں کے مقابلے ۱۰۶ ووٹوں سے جیتا تھا۔ (۲۰)

۱۹۷۷ء کے عام انتخاب میں سید یوسف رضا گیلانی کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۱) اور ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ نیب کے مقدمات کی وجہ سے حصہ نہ لے سکے تو انہوں نے اپنے بھانجے اسد مرتضیٰ گیلانی کو پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑوایا۔ اسد مرتضیٰ گیلانی یہ انتخاب جیت گئے لیکن انتخابات کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی پیٹریاٹس میں شامل ہو گئے۔ جس کے بعد نیب کے مقدمات میں یوسف رضا گیلانی کی ضمانت ہو گئی۔ (۲۲) اور مخدوم زادہ سید اسد مرتضیٰ گیلانی مذہبی امور کے پارلیمانی سیکرٹری بنا دیئے گئے۔ (۲۳)

سید یوسف رضا گیلانی کے ایک کزن اور سید شوکت حسین گیلانی کے صاحبزادے سید تنویر الحسن گیلانی بھی ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے انہیں آئی جے آئی کی حمایت حاصل تھی۔ ان کے مقابلے میں پی ڈی اے کے مختار احمد اعوان اور جمعیت علمائے پاکستان کے شاہ احمد نورانی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ تنویر الحسن گیلانی اس سے قبل ۱۹۸۵ء میں بھی انتخاب لڑ چکے ہیں مگر اس وقت وہ فقط ۱۳۲۵ ووٹوں سے شکست کھا گئے تھے۔ (۲۴)

۱۹۹۳ء کے بحران میں تنویر الحسن گیلانی نے مسلم لیگ چٹھہ گروپ کا ساتھ دیا چنانچہ جب ۱۸ر اپریل ۱۹۹۲ء کو میاں نواز شریف کابینہ برخواست کی گئی تو تنویر الحسن گیلانی کو میر بلخ شیر مزاری کی نگراں کابینہ میں بطور وزیر شامل کر لیا گیا انہیں نوجوانوں کے امور کا قلمدان سونپا گیا تھا۔(۲۵) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے شیخ طاہر رشید سے ساڑھے چھ ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست کھا گئے۔(۲۶)

تنویر الحسن گیلانی نے ۱۹۹۷ء کا انتخاب بھی پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر لڑا مگر اس مرتبہ بھی پاکستان مسلم لیگ (ن) شیخ طاہر رشید سے شکست کھا گئے۔(۲۷) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات سے پیشتر وہ ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شامل ہو گئے مگر ان کے ستارے اس مرتبہ بھی یاوری نہ کر سکے اور وہ پاکستان مسلم لیگ (نٌ) کے رانا محمود الحسن سے شکست کھا گئے۔(۲۸)

حوالہ جات

۱۔ سر لیپل ایچ گرفین، کرنل میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۵۲۷، ۵۲۸

۲۔ منشی عبدالرحمٰن خان۔ آئینہ ملتان۔ ملتان۔ ص ۱۳۴، ۱۳۵

۳۔ سر لیپل ایچ گرفین، کرنل میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۵۲۷، ۵۲۸

۴۔ منشی عبدالرحمٰن خان۔ آئینہ ملتان۔ ملتان۔ ص ۳۵۸

۵۔ احمد سلیم۔ گیلانیز آف ملتان۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۲۵ر نومبر۔ یکم دسمبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۶۔ کرپال سی یادیو۔ الیکشنز ان پنجاب۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء۔ نئی دہلی۔ ص ۱۱۶

۷۔ نمائندہ خصوصی۔ ملتان کے سیاسی گھرانے۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۹

۸۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ لاہور۔ ایڈیشن ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ ص ۹

۹۔ عدنان عادل۔ ونس اے لوٹا آل ویز اے لوٹا۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۹ر تا ۲۵ر اگست ۱۹۹۳ء ص ۶

۱۰۔ نمائندہ خصوصی۔ ملتان کے سیاسی گھرانے۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء۔ ص ۲۱

۱۱۔ ریاض احمد چودھری۔ گیلانی خاندان، قیوم کی آغوش میں۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۸ر جون ۱۹۷۰ء۔ ص ۲۲، ۲۳

۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور ص ۲۱۲، ۲۱۳

۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۵۳

۱۴۔ پارلیمینٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائرکٹری آف ممبرز ۱۹۹۱ء۔۱۹۹۴ء۔ ص ۶۱

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۸۷

۱۶۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات مشاہیر پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۱۶۶

۱۷۔ خالد حسین ۔ دی مین ایوری بڈی لوز ٹولو۔ (یوسف رضا گیلانی) دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۷ر۔۲۳ر دسمبر ۱۹۹۲ء۔ ص ۸

۱۸۔ ادارہ۔ نو ہارڈ فیلنگ۔ روز نامہ نیشن لاہور۔ الیکشن ۹۳ء خصوصی اشاعت۔ ۱۷ر اگست ۱۹۹۳ء

۱۹۔ دی گزٹ آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۸۷

۲۰۔ روز نامہ جنگ کراچی۔ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۹۳ء

۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۸۸

۲۲۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۴۰۲، ۱۲۲

۲۳۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ ص ۵۵۰

۲۴۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۲۴۸، ۲۵۰

۲۵۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۰ر تا ۱۲ر مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۸

۲۶۔ نوید ظفر اشتیاق حسین۔ الیکشن ۱۹۹۳ء۔ اسلام آباد۔ ص ۱۷۴

۲۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۸۹

۲۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۵۵

لغاری

قوم لغاری کے تمندار اس کی شاخ الیانی کے رکن ہیں۔ ان کی سرداری پندرہ یا سولہ پشتوں سے ایک ہی شاخ میں چلی آتی ہے۔ یہ اپنے موجودہ علاقہ میں سولہویں صدی کے پہلے پچاس سال کے اندر آباد ہوئے تھے۔ ڈیرہ جات کے بہت سے دیگر بلوچوں کی طرح لغاری بھی اسی وقت میر چاکر کے ہمراہ ہندوستان آئے ہیں جبکہ میر مذکور شاہنشاہ ہمایوں کے ہمرکاب شیر شاہ کے افغان جانشینوں سے ملک و سلطنت واپس لینے کے لئے ہندوستان کو آیا تھا۔ میر چاکر مقام ستگھرہ میں سکونت پذیر ہو گیا جو ضلع ساہیوال کے قریب ہے اور جہاں میر چاکر کی قبر اب تک موجود ہے (ا)

لغاری اپنے سردار میر رندو خان کے ساتھ دریائے اٹک کے اس ملک میں جہاں کا غازی خان دودائی اول حاکم تھا واپس چلے آئے اور احمدانی بلوچوں کو جو اب بھی تمام ضلع میں متفرق طور پر آباد پائے جاتے ہیں' نکال کر ان کے ملک پر قابض ہو گئے اور آج تک اس پر قابض ہیں چنانچہ رندو خان کی ٹوٹی پھوٹی قبر اب تک موضع چوٹی کے قریب موجود ہے اور جس طرز کی عمارتیں ابتدائے عہد مغلیہ میں بنا کرتی تھیں اس طرز کی بنی ہوئی ہے۔

اٹھارھویں صدی کے وسط سے پہلے جب بلوچ خان تمندار تھا' لغاری قوم کا تالپور فرقہ اپنی اصلی قوم سے علیحدہ ہو کر شمالی سندھ میں چلا گیا اور ان کے سردار شہداد خان نے وہاں کے رئیس غلام شاہ کلہوڑہ کے پاس جا کر پناہ لی۔ تالپوروں نے ۱۷۷۲ء میں جب کلہوڑوں کو نکال دیا تو ان کا آخری حاکم عبدالنبی بھاگ کر ڈیرہ جات کی طرف چلا گیا اور اس طرح تالپور خان شمالی سندھ میں آباد ہو گیا۔ (۲)

لغاریوں کی ایک شاخ برکھان کہلاتی ہے اور موجودہ بلوچستان میں آباد ہے۔ جب درانیوں کا خاتمہ ہوا اور ڈیرہ غازی خان پر سکھوں نے قبضہ کیا تو ایک لغاری سردار محمد خان بھاگ کر لغاری برکھان میں چلا گیا جہاں اس کے ہاں جمال خاں پیدا ہوا۔ لغاری جلد ہی سکھوں کے حلیف بن

گئے اور ساون مل کو ساتھ ملا کر اپنے پرانے حریفوں گورچانیوں اور کھوسوں سے انتقام لینے میں کامیاب رہے۔ چٹا خان گورچانی نے اپنے بھتیجے سے تمنداری چھین رکھی تھی لیکن بھتیجا ہوشیار نکلا۔ اس نے لغاریوں کی امداد سے اچانک چٹا خان پر حملہ کیا اور اسے دیوان ساون مل کے حوالے کر کے اپنا منصب واپس لے لیا۔ اس کے بعد دشمنی کی آگ کچھ دیر فرو رہی لیکن پھر بھڑک اٹھی۔ رحیم خاں لغاری کے ایک بیٹے کو گورچانیوں نے بہاولپور میں پہنچ کر قتل کر دیا۔ رحیم خاں پہلے سردار کا بھتیجا تھا۔ اس نے محمد خاں کی موت کے بعد تمنداری پر قبضہ کر رکھا تھا لیکن مزاریوں کی امداد سے اسے بہاولپور بھگا دیا گیا۔ جہاں نواب نے اسے صادق آباد کی تحصیل میں رحیم آباد کے مقام پر ایک جاگیر دے دی۔ (۳)

رحیم خاں کے دو بیٹے غلام حیدر خاں اور میر عالم خاں نامی تھے جو وہیں بہاولپور میں رہے اور باپ کی جاگیر انہیں ملتی رہی۔

جب ۱۸۴۸ء میں ایڈورڈز صاحب بہادر نے سرحد کی طرف سے ڈیرہ غازی خاں پر حملہ کیا تو لغاریوں نے سکھوں کا ساتھ دیا اور کھوسے اور گرچانی ایڈورڈس صاحب کی طرف ہو گئے۔ جلال خاں لغاری دوابہ سندھ ساگر میں مولراج کے ساتھ شامل تھا اور اس کی قوم کے ۵۰۰ جوان لونگا مل کاردار ڈیرہ غازی خاں کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے مگر انہوں نے غلام حیدر خاں اور کوڑا خاں کے ماتحت کھوسوں سے لڑ کر شکست کھائی اور بہت نقصان اٹھایا۔ (۴)

جب ایڈورڈس صاحب نے ڈیرہ غازی خان پر تسلط جما لیا تو جلال خان ۸۰ آدمیوں کے ساتھ ان کے پاس آیا مگر چونکہ لغاریوں اور کھوسوں میں عداوت تھی اس لئے اس کی رفاقت تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ اس وقت گو جمال خان تمندار تھا مگر قوم کے لوگوں میں جلال خان کا زیادہ رعب داب تھا اور بلوچوں میں بھی زیادہ مشہور آدمی تھا۔ اس نے آبپاشی کے متعلق جو تدابیر کیں ان سے ظاہر ہے کہ وہ مفید کاموں کے کرنے میں بڑا اولوالعزم تھا' چنانچہ اس نے دھنڈی' مانکا اور نور نہروں کو وسیع کرنے اور بمقام چوٹی بالا نہر کاریز بنانے کی تجویزیں کیں۔ نہر کاریز اس نے بہت سا روپیہ صرف کر کے پٹھان مزدوروں کی مدد سے ان زمین دوز نہروں کے نمونے پر بنائی جیسی کہ ضلع کوئٹہ میں موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حصول نفع کی حرص اس کو بارہا حد سے باہر لے گئی مثلاً انتظام نہر کے متعلق جو جعل ہوئے ان میں اس کی سازش تھی جس کے سبب کچھ عرصے کے لئے اس سے مجسٹریٹی اختیارات چھین لئے گئے تھے' اس کے بعد اس نے سرحد پار کی قوموں خاصکر کھیترانوں پر اپنا رعب داب جما کر سرکار انگریزی کے فائدے کے لئے سرحد پر مفید خدمات انجام دیں۔ ۷۶-۱۸۷۵ء میں یہ سر رابرٹ سنڈیمن کے ساتھ قلات گیا اور اس کے وفادارانہ رویئے کے صلے میں اس کو نوابی کا خطاب ملا اور مجسٹریٹی کے اختیارات پھر عطا کئے گئے۔ یہ ۱۸۸۱ء میں حج کے واسطے مکہ گیا اور واپسی کے وقت اپنے وطن موضع چوٹی پہنچنے سے

پہلے ڈیرہ غازی خان میں فوت ہو گیا۔ (۵)

نواب جلال خاں کا جانشین نواب محمد خاں ایک قابل اور ہردلعزیز آدمی تھا۔ اس نے اپنی قوم کا انتظام نہایت خوبی سے کیا۔ محمد خاں کو ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر نواب کا خطاب عطا ہوا۔ یہ اچھا تعلیم یافتہ آدمی تھا اور اپنے تمن کے حدود کے اندر اسے مجسٹریٹ کے اختیارات ملے تھے۔ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ بلوچستان کے ایک قطعہ اراضی کے مالکانہ حقوق حاصل کرنے کے لئے مقدمہ بازی اور دعاوی پر صرف کیا۔ یہ علاقہ لغاری برکھان کہلاتا ہے اور گو جس اراضی پر قوم کھڑاں آباد ہے اس کے بیچ میں حائل ہونے کی وجہ سے یہ قطعہ زمین علاقہ ہڈیانی سے الگ ہو گیا تھا۔ لیکن اس پر رئیس لغاری کے خاندان کا جدی قبضہ چلا آتا تھا۔ جس زمانہ میں ان پہاڑی قومی کی آئے دن آپس میں لڑائیاں ٹھنی رہتی تھیں، اگرچہ اس وقت علاقہ لغاری برکھان کا مالیہ کچھ زیادہ تھا مگر ان اقوام کے زیر سایہ سرکار انگریزی آ جانے کے بعد اس کی مالی آمدنی بہت معقول ہو گئی۔ گورنمنٹ اس علاقہ کی بابت نواب محمد خاں کے دعاوی کو ابتداءً اس بنا پر نامنظور کرتی رہی کہ وہ لغاری برکھان کا مالک نہیں کہا جا سکتا ہے مگر آخر سرکاری حکومت نے اس قطعہ پر خاندان کی ملکیت منظور کر لی۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ منظوری محمد خاں کی وفات کے بعد ملی۔ محمد خاں ۱۸۹۶ء میں فوت ہو گیا۔

نواب محمد خاں کی وفات کے بعد اس کا اکلوتا بیٹا جمال خاں اس کا جانشین ہوا مگر یہ لڑکا نابالغ تھا۔ اس وجہ سے محمد خاں کا چچازاد بھائی تگیا خاں قائم مقام تمندار مقرر کیا گیا۔ تگیا خاں ۱۹۰۵ء میں جائیداد پر تقریباً ۲۰۰۰۰۰ روپیہ قرضہ چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوا۔ جو اس نے اراضیات برکھان کو زیر کاشت کرنے کے واسطے لیا تھا۔ تگیا خاں کی وفات کے بعد قائم مقام تمندار کی جگہ کے لئے تگیا خاں کے بھائی دین محمد خاں اور اس کے بیٹے میر محمد خاں میں کش مکش شروع ہوئی اور متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ سرداروں کی ایک پنچایت کے سپرد کیا گیا۔ اس پنچائت میں نواب بہرام خاں سی۔ آئی۔ ای سردار حلب خاں سی۔ آئی۔ ای اور خان بہادر جندوڈا خان سابق وزیراعظم ریاست بہاولپور کے سے مقتدر سردار شامل تھے۔ ثالثوں نے یہ تجویز کی کہ دین محمد خاں صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے ماتحت رہ کر لغاری ریاست کا بلاشرکت غیرے منیجر بنایا جائے اور وہ تین ماہ کے اندر ہی کسی غیر منقولہ جائیداد کو بیچنے کے بغیر صرف خاندانی جائداد کی آمدنی میں سے ۶۰۰۰۰ روپیہ قرض میں ادا کرے اور یہ کہ وہ گورنمنٹ کا مالیہ اور دیگر مواجب ادا کرنے کا بھی ذمہ دار ہو گا۔ نیز یہ کہ ۲۰۰۰۰ روپیہ سالانہ اس وقت تک قرضہ میں دینا ہو گا جب تک کہ یہ بالکل ادا نہ ہو جائے۔ پھر قرضہ صاف ہو جانے کے بعد ۱۰۰۰۰ روپیہ سالانہ جائداد میں جمع کرتا رہے اور آمدنی کے باقی ماندہ روپیہ سے تمن اور خاندان کا خرچ خانہ داری چلاتا رہے اور یہ بھی قرار پایا کہ اگر کسی سال فصل کم ہو گی تو اسی اندازہ سے صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر ۲۰۰۰۰ روپیہ

سالانہ قرضہ کی قسط میں کمی کر دیں گے اور فصل بہت اچھی ہونے کی صورت میں سردار دین محمد خاں کو اسی اندازہ سے قرضہ کی قسط میں اضافہ کر دینا ہو گا۔

ثالثان کی یہ تجویز حکومت پنجاب نے منظور فرمالی اور سردار دین محمد خاں کو قائم مقام تمندار تسلیم کیا گیا۔ (۶)

اسی دوران سردار جمال خان لغاری لاہور میں ایچی سن کالج میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں مجسٹریٹ کے اختیار عطا کئے گئے اور تمن کے معاملات چلانے کے لئے خصوصی تربیت دی گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران انہوں نے حکومت ہند کو ۱۰ ہزار روپے نقد اور اپنے تمن کے ۸۰ افراد کا عطیہ پیش کیا۔ ۱۹۱۵ء میں بزداروں اور قیصرانیوں کی محاذ آرائی ختم کرانے کے سلسلہ میں ان کا کردار بڑا اہم رہا اور حکومت ہند نے ان کی اس خدمت کے صلے میں انہیں سند اور خلعت سے سرفراز کیا۔ ۱۹۱۶ء میں سردار جمال خان لغاری نے قبیلے کی سرداری سنبھالی۔ مری اور کھیترانوں کی قبائلی جنگ کے دوران انہوں نے ملتان بریگیڈ کے پولیٹکل آفیسر کے طور پر خدمت انجام دی جس کے عوض انہیں ۱۹۱۹ء میں فرنٹیروار میڈل عطا ہوا۔ اسی برس انہیں خان بہادر کا خطاب ملا اور چھ برس بعد انہیں نواب بنا دیا گیا۔

سردار بہرام خان مزاری کی وفات کے بعد سردار جمال خان لغاری ضلع ڈیرہ غازی خان کے چیف جرگہ کے ساتھ ساتھ بلوچستان اور پنجاب کے بین الصوبائی چیف جرگہ کے بھی صدر بنائے گئے۔

۱۹۳۶ء میں سردار جمال خان کو ان کے ضلع کا اعزازی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ صوبائی درباری' اعزازی مجسٹریٹ اور سول جج کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ وہ اپنے ضلع کے پہلے تمن دار تھے جنہوں نے علاقے میں پرائمری تعلیم متعارف کروائی اور غریب اور حقدار طلبا کے لئے تیں وظیفے منظور کئے۔ (۷)

سردار جمال خان ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ جہاں وہ قیام پاکستان تک بلوچ تمنداروں کے حلقے کی نمائندگی کرتے رہے۔ ۱۹۲۱ء کے بعد انہوں نے ۱۹۲۳' ۱۹۲۶' ۱۹۳۰' ۱۹۳۷ اور ۱۹۴۶ء۔ ہر انتخاب میں حصہ لیا اور کامیابی سے ہمکنار ہوتے رہے۔ (۸) انہوں نے ۱۲ر اگست ۱۹۶۵ء کو روم میں وفات پائی۔

سردار جمال خان کے بعد ان کا ورثہ ان کے بیٹے محمد خاں لغاری نے سنبھالا۔ وہ اپنے والد کی زندگی ہی میں ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ صوبائی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ دولتانہ کی کابینہ میں تعمیرات عامہ' بجلی اور سڑکوں کے' فیروز خاں نون کی کابینہ میں خزانے کے اور سردار عبدالحمید دستی کی کابینہ میں خزانہ' آبکاری' محصولات' نوآبادیوں اور آب پاشی کے وزیر رہے۔

ایوب خان کے دور میں ان پر ایبڈو کے تحت مقدمہ چلا اور ان پر ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء تک سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے۔ (۹) مگر اس سے قبل کہ اسمبلیاں اپنے کام کا آغاز کرتیں۔ وہ ۲۱ ستمبر ۱۹۷۱ء کو وفات پا گئے۔ (۱۰) ان کی خالی نشست پر بعد ازاں ان کے بھائی عطا محمد خان لغاری کامیاب ہو گئے۔ (۱۱) سردار عطا محمد لغاری جنرل ضیاء الحق کے دور میں مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ (۱۲) بعد ازاں انہوں نے کئی مرتبہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر ہر مرتبہ اپنے کسی نہ کسی بھتیجے سے شکست کھائی۔

سردار محمد خان لغاری کے تیسرے بھائی محمود خان لغاری پہلے سے ہی عملی سیاست میں تھے۔ وہ ۸ مارچ ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے یونینسٹ پارٹی کے خلاف انتخابی مہم میں مسلم لیگ کے لئے کام کیا اور اس سلسلے میں ایک ماہ تک قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کی (۱۳) ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں جب ان کے بھائی سردار محمد خان لغاری ایبڈو کی پابندی کی وجہ سے انتخاب نہیں لڑ سکتے تھے وہ نواب کالا باغ کی حمایت سے بلامقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۱۴)

سردار محمد خان لغاری کی ہمشیرہ عفیفہ ممدوٹ قیام پاکستان کے بعد پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ اور پنجاب اسمبلی کے پہلے قائد حزب اختلاف نواب افتخار حسین ممدوٹ مرحوم کی بھاوج اور مجلس کارکنان تحریک پاکستان کے صدر نواب ذوالفقار علی ممدوٹ کی اہلیہ ہیں۔ (۱۵) ۱۹۷۷ء میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے تو اس وقت محترمہ عفیفہ ممدوٹ پاکستان قومی اتحاد کے شعبہ خواتین کی سربراہ تھیں۔ بعد ازاں وہ جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں وزیر مملکت کے عہدے پر فائز رہیں۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے اپنے بھتیجے سردار فاروق خان لغاری کا مقابلہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔ بعد ازاں وہ خواتین کی مخصوص نشستوں پر پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہو گئیں۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے بعد انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد سے علیحدگی اختیار کر لی اور خلیج کے بحران پر نوابزادہ نصراللہ خان کی طرف سے بلائی گئی آل پارٹیز کانفرنس میں حکومت کے خلاف زوردار تقریر کی۔ (۱۶)

سردار محمد خان لغاری کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے صاحبزادے فاروق لغاری قبیلے کے سردار بنے۔ وہ ۲ر مئی ۱۹۴۰ء کو وزیرستان کے علاقے ٹانک میں پیدا ہوئے۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے سول سروس جوائن کی۔ مگر والد کی وفات کے بعد ۱۹۷۳ء میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے۔ (۱۷) اسی برس وہ پاکستان پیپلز پارٹی کی جانب سے سینٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی

کے رکن منتخب ہوئے اور کچھ عرصہ وفاقی وزیر بھی رہے۔ مارشل لا کے دور میں جب پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر غلام حسین بیرون ملک چلے گئے تو وہ ان کی جگہ پارٹی کے سیکرٹری جنرل بنے اور مارشل لا کے دوران کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ (۱۸)

فاروق لغاری نے ۱۹۸۸ء میں صوبائی اور قومی دونوں نشستوں پر انتخاب لڑا تھا اور دونوں ہی پر کامیاب ہوئے تھے۔ وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بننے کے خواہاں تھے اسی لئے انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست سے دستبردار ہو کر صوبائی اسمبلی کی نشست برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا تھا مگر جب وہ میاں نواز شریف کے مقابلے میں وزارت اعلیٰ کے عہدے کے لئے کامیاب نہ ہو سکے تو انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست سے مستعفی ہو کر ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے ضمنی انتخاب میں حصہ لیا اور اس مرتبہ بھی کامیاب رہے۔ (۱۹) بعد ازاں وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی کابینہ میں پانی اور قوت کے وزیر بنائے گئے۔ (۲۰)

۱۹۹۰ء کے انتخابات میں فاروق لغاری نے فقط قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا ان کا حلقہ انتخاب تھا۔ این اے ۱۳۳ ڈیرہ غازی خان و راجن پور۔ اس انتخاب میں وہ آئی جے آئی کے سردار طفیل احمد خان کو تقریباً ۲۰ ہزار ووٹوں سے شکست دے کر کامیاب رہے (۲۱) ۱۹۹۳ء میں جب غلام اسحٰق خان نے نواز شریف حکومت کو برطرف کیا تو سردار فاروق لغاری، بلخ شیر مزاری کی نگراں کابینہ میں وزیر خزانہ و اقتصادی امور کے عہدے پر فائز کیے گئے تھے۔ اس زمانے میں ان کی پالیسیوں کی عالمی بینک اور آئی ایم ایف نے بھی حمایت کی تھی اور یہ بیرونی اقتصادی منڈیوں میں پاکستان کی ساکھ بحال کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی (۲۲)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا۔ اور دونوں نشستوں پر کامیاب ہوئے (۲۳) قومی اسمبلی کی نشست پر انہوں نے ۹۴۳،۹۵ ووٹ حاصل کیے جو ان انتخابات میں پاکستان بھر میں کسی بھی امیدوار کے سب سے زیادہ حاصل کیے جانے والے ووٹ تھے (۲۴)

انتخابات کے بعد سردار فاروق لغاری نے قومی اسمبلی کی رکنیت برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی کابینہ میں وزارت خارجہ پر فائز ہوئے۔ نومبر ۱۹۹۳ء میں جب صدارتی انتخابات منعقد ہوئے تو سردار فاروق لغاری کا نام اچانک سامنے آیا۔ آہستہ آہستہ سردار فاروق لغاری کے تمام ممکنہ حریف ایک ایک کر کے سامنے سے ہٹ گئے اور سردار فاروق لغاری اپنے مدمقابل امیدوار جناب وسیم سجاد کو شکست دے کر پاکستان کے نویں صدر منتخب ہو گئے (۲۵) ان کے صدر منتخب ہونے کے بعد دائیں بازو کے ایک معروف جریدے کے مدیر نے سردار فاروق لغاری کی شخصیت اور کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مجھے جناب فاروق احمد لغاری کی پیپلز پارٹی میں موجودگی ہمیشہ انمل بے جوڑ محسوس ہوئی

اور یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی تھی کہ ایسا پابند صوم وصلوۃ، تہجد گزار، جدید وقدیم کے متوازن مطالعہ اور صاف ستھری زندگی کی شہرت رکھنے والا یہ شخص پیپلز پارٹی کے سیاسی اور معاشرتی کلچر میں کہاں پھنس گیا؟ مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کی مشیت نے اسے آج ہی کے لئے وہاں محفوظ رکھا اور پروان چڑھایا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ یہ وہاں موجود نہ ہوتا تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صدارت کے عہدۂ جلیلہ کے لئے پیپلز پارٹی اپنی صف سے کس شخص کو نکال کر قوم کے سامنے پیش کرتی؟ وہاں دیانت و امانت، ذاتی زندگی کی پاکیزگی، دینداری اور اس منصب کے لئے علم و اہلیت کی مطلوبہ صلاحیتیں رکھنے والا دوسرا فرد ہے کہاں؟ نہ ہوتے وہ تو کیا ہوتا؟ اگر پیپلز پارٹی سے وابستگی ہی واحد ''عیب'' تھا وہی آج ''صواب'' بن گیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ شر میں سے خیر برآمد کرنے پر پوری طرح قادر ہے''۔ (۲۶)

مگر فاروق لغاری صدر کے منصب پر فائز ہوئے تو اپوزیشن اور ذرائع ابلاغ نے ان کی شخصیت کے بعض ایسے گوشے بے نقاب کیے جن سے ان کی شخصیت کا متنازع پن نمایاں ہوتا گیا۔ کرپشن اور لوٹ مار کے مضبوط ڈھانچے نے فاروق لغاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ان کے بارے میں ایک کے بعد دوسری خبر اخبارات کی زینت بننے لگی۔

سب سے پہلے مہران بنک اسکینڈل منظر عام پر آیا پھر خبر آئی کہ صدر مملکت نے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ امریکا کا سرکاری دورہ اس لیے کیا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے کانووکیشن میں شرکت کرسکیں۔ پھر معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے ذاتی دوست رابرٹ میک فارلین کی کمپنی کو بلوچستان میں پاور پراجیکٹ لگانے کا لائسنس دینے میں کمیشن حاصل کیا ہے اور پھر اس اطلاع نے تو تمام محبّ وطن پاکستانیوں کو افسردہ کر دیا کہ انہوں نے ایمل کانسی کو امریکا کے حوالے کرنے میں کئی ملین ڈالر بطور انعام حاصل کیے ہیں (۲۷) یقیناً ان میں سے کئی خبریں غلط بھی ہوں گی یا ان میں مبالغے کا عنصر شامل ہوگا تاہم ذرائع ابلاغ پر ان اطلاعات کی اشاعت نے سردار فاروق لغاری کی ''مسٹر کلین'' والی امیج کو نقصان بہت پہنچایا۔

رفتہ رفتہ بے نظیر بھٹو اور فاروق لغاری میں اختلافات بڑھنے لگے۔

۱۹۹۶ء میں حالات ایک مرتبہ پھر اس نہج پر پہنچ گئے کہ محسوس ہونے لگا کہ دل کا جانا ٹھہر گیا ہے،
صبح گیا یا شام گیا۔

۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء میں کراچی میں ماورائے عدالت قتل اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئے۔ حالات اس حد تک بگڑ گئے ۲۰ر ستمبر ۱۹۹۶ء کو خود وزیر اعظم پاکستان کے حقیقی بھائی میر مرتضیٰ بھٹو پولیس کی ایک جارحانہ اور عاقبت نا اندیش کارروائی کے نتیجے میں لقمۂ اجل بن گئے۔ (۲۸)

ان حالات اور واقعات کا سہارا لیتے ہوئے فاروق لغاری نے ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو بے نظیر بھٹو کی حکومت کو ختم کر کے قومی اسمبلی توڑنے کا اعلان کر دیا۔ نواز شریف نے اس اقدام کا زبردست خیر مقدم کیا اور کہا کہ صدر لغاری کا یہ فیصلہ قومی امنگوں کا ترجمان ہے۔

اسی شام صدر فاروق لغاری نے ملک معراج خالد کو ملک کا نگراں وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ ۳ر فروری ۱۹۹۷ء کو ملک میں از سر نو انتخابات منعقد کروائے۔ انتخابات میں نواز شریف نے قومی اسمبلی کی ۲۰۷ میں سے دو تہائی یعنی ۱۳۷ نشستوں پر کامیابی حاصل کر لی۔ یہ کامیابی خود نواز شریف کے لیے بھی غیر متوقع تھی۔ ۱۷ فروری ۱۹۹۷ء کو پاکستان کی تاریخ کے سب سے بڑے مینڈیٹ کے ساتھ وہ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

لیکن بہت جلد نواز شریف نے اپنی ترجیحات بدل لیں۔ کرپشن، لوٹ مار، ظلم و ستم، گرانی، بے روز گاری اور بد امنی کے خاتمے پر اپنی توجہ مذکور کرنے کی بجائے انہیں اپنے اقتدار کے تحفظ اور اختیارات میں اضافے کی فکر لاحق ہو گئی۔ موجودہ حالات میں اس بات کا دور دور تک اِمکان نہیں تھا کہ صدر مملکت اپنا آئینی حق استعمال کرتے ہوئے نواز حکومت کو برطرف کر دیں لیکن اس کے باوجود انتہائی عجلت میں قواعد و ضوابط معطل کر کے بغیر کسی بحث کے آئین میں ترمیم کا تیرھواں بل ایک ہی دن یکم اپریل ۱۹۹۷ء کو قومی اسمبلی اور سینٹ سے منظور کروا لیا۔ جس کے مطابق صدر اور گورنروں کا حکومت برطرف کرنے اور اسمبلی توڑنے کا اختیار ختم کر دیا اور فوجی سربراہوں اور گورنروں کی تقرری کے اختیارات صدر سے لے کر وزیر اعظم کو سونپ دیئے گئے۔ بے نظیر بھٹو نے اس بل کی منظوری میں نواز شریف کے ساتھ تعاون کیا کیونکہ اس کی زد فاروق لغاری پر پڑتی تھی۔

نواز شریف کے ان اقدامات سے فاروق لغاری بے دست پا ہو کر رہ گئے۔ صدر سے نمٹ کر ۱۹۹۷ء ہی میں نواز شریف نے عدلیہ سے بھی نمٹنا چاہا اور اسے اعتماد میں لیے بغیر سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد ۱۷ سے کم کر کے ۱۲ کر دی۔ سپریم کورٹ نے اس پر شدید احتجاج کیا۔ طویل کشمکش کے بعد یہ مسئلہ حل ہوا اور نئے ججوں کی تقرری عمل میں آ گئی۔ خیال تھا کہ اب حکومت اور عدلیہ کے درمیان تعلقات معمول پر آ گئے ہیں اور تلخیاں ختم ہو گئی ہیں مگر اکتوبر ۱۹۹۷ء جب سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ سعودی عرب گئے ہوئے تھے۔ قائم مقام چیف جسٹس، جسٹس اجمل میاں نے اس مسئلے کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ سجاد علی شاہ اپنا دورہ مختصر کر کے وطن واپس آ گئے اور آئین کی تعبیر کے لیے سپریم کورٹ کا فل کورٹ اجلاس طلب کر لیا۔ فاروق لغاری، سجاد علی شاہ کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے۔ مگر نوبت اس حد تک پہنچی کہ سپریم کورٹ کے جج آپس میں تقسیم ہو گئے، جسٹس سجاد علی شاہ کو رخصت پر جانا

پڑا اور صدر فاروق لغاری کو اپنے عہدہ سے استعفیٰ دینا پڑا۔(۲۹)

۳۱ مئی ۱۹۹۸ء فاروق لغاری نے ایک نئی سیاسی جماعت ''ملت پارٹی'' کے قیام کا اعلان کیا۔(۳۰)

کوئی چار برس کی تیاری کے بعد ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں سردار فاروق لغاری کو اپنی سیاسی جماعت کی مقبولیت جانچنے کا موقع ملا۔

ان انتخابات میں انہوں نے خود نہ صرف ڈیرہ غازی خان اور ساہیوال سے قومی اسمبلی کی نشستیں جیتیں بلکہ ڈیرہ غازی خان ہی سے صوبائی اسمبلی کی ایک نشست پر بھی کامیاب ہو گئے (۳۱)

سردار فاروق لغاری کے صاحبزادے سردار اویس احمد لغاری ۱۹۹۷ء میں پی پی ۲۰۴ راجن پور سے کامیابی حاصل کر کے اپنے سیاسی سفر کا آغاز کر چکے تھے (۳۲) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے قومی اور صوبائی، دونوں اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لیا اور دونوں نشستوں پر کامیابی حاصل کی (۳۳) بعد ازاں وہ مرکزی کابینہ میں شامل کیے گئے۔ جہاں انہیں انفارمیشن اور ٹیلی کمیونیکیشن کا وزیر بنایا گیا (۳۴)۔

فاروق لغاری کے ایک اور صاحبزادے سردار محمد جمال خاں مزاری نے ۱۹۹۷ء میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکے تھے۔(۳۵) ۲۰۰۱ء میں وہ ڈیرہ غازی خان کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے۔(۳۶) ۲۰۰۵ء میں بھی وہ اسی عہدے کے امیدوار تھے مگر سردار مقصود لغاری کے ہاتھوں شکست کھا گئے ۲۰۰۶ء میں وہ سینٹ آف پاکستان کے رُکن منتخب ہوئے ہیں (۳۷)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے فاروق لغاری کے چچا سردار عطا محمد خاں لغاری پنجاب اسمبلی اور مجلس شوریٰ کے رکن رہ چکے ہیں مگر ۱۹۸۵ء میں وہ اپنے بھتیجے سردار مقصود احمد لغاری سے اور ۱۹۸۸ء میں صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں مقصود احمد لغاری سے اور قومی اسمبلی کے انتخاب میں فاروق لغاری سے شکست کھا گئے تھے (۳۸) انہوں نے ۲۰ ستمبر ۱۹۹۲ء کو وفات پائی۔ سردار عطا محمد خان لغاری کے صاحبزادے سردار جعفر خان لغاری ہیں جو ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۳ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب رہے (۳۹)۔ تاہم ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں وہ سردار نصر اللہ خان دریشک سے شکست کھا گئے (۴۰) ۱۹۸۵ء کا انتخاب انہوں نے آزاد حیثیت میں لڑا تھا جب کہ آخر الذکر تینوں انتخابات میں انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ سردار جعفر خاں لغاری راجن پور ڈسٹرکٹ کونسل کے چیئرمین بھی رہ چکے ہیں۔

سردار جعفر خان لغاری ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء دونوں انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۴۱) تاہم ۲۰۰۲ء کے صوبائی انتخابات میں وہ سردار محمد خان لغاری سے شکست کھا گئے (۴۲) اسی برس وہ اپنی اہلیہ مینا احسان لغاری کو خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کا رکن بنوانے میں کامیاب ہو گئے (۴۳)

سردار جعفر خاں لغاری کے بھائی سردار عمر خان لغاری ۱۹۸۵ء کے ضمنی انتخابات میں اپنے چچا زاد بھائی سردار مقصود خاں لغاری کی خالی کردہ نشست پر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۴۴)

سردار محمد خاں لغاری اور سردار عطا محمد لغاری کے تیسرے بھائی سردار محمود خاں لغاری تھے ان کے دو صاجزادگان اس وقت عملی سیاست میں ہیں۔ بڑے صاجزادے سردار مقصود احمد لغاری ۱۹۸۵ء میں بیک وقت قومی اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد ازاں انہوں نے صوبائی نشست خالی کر دی اور محمد خان جونیجو کی کابینہ میں وزیر رہے۔ ۱۹۸۸ء میں جب صدر ضیاء الحق نے قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دیں تو وہ پنجاب کی نگراں کابینہ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے پلیٹ فارم سے انتخاب لڑا اور پی پی ۱۸۵ ڈیرہ غازی خان ۲ سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد ازاں وہ نواز شریف کی صوبائی کابینہ میں وزیر خوراک کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنی سیاسی وابستگی تبدیل کر لی اور پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۴۵) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی دو نشستوں پر انتخاب لڑا۔ تاہم وہ صرف ایک نشست (پی پی ۲۱۳ ڈی جی خان۴) سے ہی کامیاب ہو سکے۔ بعد ازاں انہوں نے یہ نشست بھی خالی کر دی اور سردار فاروق احمد لغاری کے صدر بننے کے بعد ان کی خالی کردہ نشست پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۴۶) انتخابات میں کامیابی کے بعد وہ بجلی اور آب پاشی کے وزیر بنائے گئے (۴۷) ۱۹۹۷ء میں وہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۴۸) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے خود کسی انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ البتہ اپنے صاجزادے سردار محمد خان لغاری کو قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑوایا۔ سردار محمد خان لغاری قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی ایک ایک نشست پر تو فاروق احمد لغاری سے شکست کھا گئے (۴۹) تاہم صوبائی اسمبلی کی ایک نشست پر وہ سردار جعفر خان لغاری کو شکست دے کر پنجاب اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوگئے (۵۰)

سردار محمود خان لغاری کے چھوٹے صاحبزادے سردار منصور احمد لغاری نے ۱۹۹۰ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا اور اپنے بھائی کے دوش بدوش کامیابی سے ہمکنار ہوئے تھے۔ (۵۱) ۱۹۹۷ء میں انہوں نے قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا مگر شکست کھائی (۵۲) تاہم اسی برس سردار فاروق احمد خان لغاری کی آشیر باد کے باعث وہ سینٹ کے رکن منتخب ہونے میں کامیاب ہو گئے (۵۳)۔

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا تاہم ۲۰۰۵ء میں وہ سردار فاروق لغاری کے صاحبزادے جمال خاں لغاری کو شکست دے کر ڈیرہ غازی خان کے ضلعی ناظم منتخب ہو گئے (۵۴)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں سردار فاروق احمد لغاری کی خالی کردہ صوبائی نشست پر پی پی ۲۰۳ ڈیرہ غازی خان ۵ سے سردار رفیق احمد لغاری کامیاب ہوئے۔ ان کا تعلق بھی لغاری خاندان ہی سے ہے (۵۵) سردار رفیق احمد لغاری نے ۱۹۹۷ء میں بھی اپنی یہ نشست برقرار رکھی (۵۶) انہوں نے ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں خود تو حصہ نہیں لیا تاہم ان کے صاحبزادے محمد محسن خان لغاری ضمنی انتخابات میں سردار فاروق لغاری کی خالی کردہ نشست پر پنجاب اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۵۷) سردار رفیق احمد لغاری ۲۰۰۵ء میں رحیم یار خاں کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے ہیں (۵۸)

سردار فاروق احمد لغاری کا خاندان پاکستان کے مختلف سیاسی خاندانوں کے ساتھ رشتے داریوں کے ایک گنجلک جال میں بندھا ہوا ہے۔

سردار فاروق احمد لغاری کی والدہ صوابی کے علاقہ زیدہ کے کرنل عبدالرحیم خان کی صاحبزادی ہیں۔ کرنل عبدالرحیم خان کے والد خان بہادر عبدالغفور خاں تقسیم سے پہلے سرحد اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ سردار فاروق لغاری کی ایک ہمشیرہ طورو خاندان کے یوسف خان کو بیاہی ہوئی ہیں۔ یوسف خان کے چھوٹے بھائی عطاء اللہ خان سابق قائد ایوان سینٹ محمد علی خان ہوتی کے داماد ہیں۔ فاروق لغاری کی ایک ہمشیرہ نواب کالا باغ ملک امیر محمد خاں کی بہو اور ملک اللہ یار خان کی اہلیہ ہیں۔ اسی طرح نواب کالا باغ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ملک اعظم خان سے فاروق لغاری کے ماموں خانزادہ عبدالوحید خان کی صاحبزادی کا رشتہ ہوا ہے۔ خانزادہ عبدالوحید خاں کا تعلق نیشنل عوامی پارٹی سے ہے۔

سردار فاروق لغاری کی ایک اور ہمشیرہ ملتان کے مشہور خاکوانی خاندان کے محمد عمر خاکوانی کی اہلیہ ہیں۔ سردار فاروق لغاری کی ایک خالہ مردان کے فیض اللہ خاں کو بیاہی گئی ہیں جن

کی صاحبزادی نواب طورو میجر جنرل (ر) وصال محمد خان کے صاحبزادے فیاض طورو کی اہلیہ ہیں فاروق لغاری کی دوسری خالہ چارسدہ کے خان بہادر غلام حیدر خان شیر پاؤ کے صاحبزادے ولی محمد خان کی اہلیہ ہیں۔ ولی محمد خان آفتاب احمد شیر پاؤ اور حیات محمد خان شیر پاؤ کے حقیقی بھائی ہیں۔ ولی محمد خان کی صاحبزادی سردار فاروق لغاری کی اہلیہ ہیں۔ (۵۹) جن کا نام نسرین لغاری ہے (۶۰)

۲۰۰۲ء میں نیشنل الائنس کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والی سمیرا ملک اور عائلہ ملک، نواب کالا باغ کی نواسیاں اور سردار فاروق لغاری کی سگی بھانجیاں ہیں جبکہ سمیرا ملک اور عائلہ ملک کی ایک اور ہمشیرہ اویس لغاری کی اہلیہ ہیں (۶۱)۔

حوالہ جات

۱۔ سر لیپل ایچ گریفن، کرنل میسی، تذکرۂ روسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۵۶۱

۲۔ چارلس میسن۔ رؤسائے با اختیار و خاندان نامی۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس) لاہور۔ حصہ دوم۔ ص۔ ۳۷۸، ۳۷۹۔

۳۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۱۸۰

۴۔ احمد سلیم۔ دی تمندارز آف دی لغاری ٹرائب۔ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۱۱۔۱۷ نومبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۵۔ چارلس میسن۔ رؤسائے با اختیار و خاندان نامی۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس) لاہور حصہ دوم۔ ص ۳۸۱،۳۸۲۔

۶۔ سر لیپل ایچ گریفن، کرنل میسی، تذکرۂ روسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۵۶۵، ۵۶۶

۷۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب (انگریزی)۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۴۲۰، ۴۲۱۔

۸۔ کرپال سی یادیو۔ الیکشنز ان پنجاب ۱۹۲۰ء۔ ۱۹۴۷ء۔ نئی دہلی۔ ص ۵۰، ۵۷، ۶۵، ۷۱، ۹۷، ۱۲۱

۹۔ احمد سلیم۔ دی تمندارز آف دی لغاری ٹرائب۔ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۱۱۔۱۷ نومبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۱۰۔ ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ۔ دفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۷۳۵۔

۱۱۔ طارق اسماعیل۔ الیکشن۔ ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۸۔

۱۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۵۔ دسمبر ۱۹۸۱ء۔

۱۳۔ تہور علی خاں۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن۔ ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ لاہور۔ ص ۲۷۴۔

۱۴۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۹/جنوری ۱۹۷۷ء

۱۵۔ رفعت عباس۔ عفیفہ ممدوٹ۔ لاہور، ص ۵۱، ۵۲، ۱۰۱

۱۶۔ سہیل وڑائچ۔ سیاسی شطرنج اور ۴۰ گھرانے۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۷/اگست ۱۹۹۱ء

۱۷۔ ظہیر احمد۔ فاروق لغاری سے ایک مختلف انٹرویو۔ مشمولہ ساقی ترے پیمانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۳۲

۱۸۔ طارق اسماعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۷

۱۹۔ وکیل انجم۔ سیاست کے فرعون۔ لاہور۔ ص۔ ۱۳۰، ۱۳۱

۲۰۔ جگنو محسن۔ فاروق لغاری (پروفائل)۔ ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۰۔ ۲۶ اگست ۱۹۹۲ء۔ ص ۲۴

۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء، جلد دوم۔ صفحہ ۵۹

۲۲۔ خالدہ یوسف۔ سی ایس پی آفیسر، سینیٹر، ایم این اے، وفاقی وزیر اور اب......... جنگ میگزین۔ (روزنامہ جنگ) لاہور۔ ۱۹ نومبر ۱۹۹۳ء

۲۳۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۲۹۳۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۲۸

۲۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔

۲۵۔ خالدہ یوسف۔ سی ایس پی آفیسر، سینیٹر، ایم این اے، وفاقی وزیر اور اب......... جنگ میگزین (روزنامہ جنگ) لاہور۔ ۱۹ نومبر ۱۹۹۳ء۔

۲۶۔ محمد صلاح الدین۔ پاکستان جاگیرداروں کی جاگیر بن گیا۔ ہفت روزہ تکبیر کراچی۔ ۲۵/نومبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۹

۲۷۔ مجاہد حسین۔ پاکستان کے متنازع سیاستدان۔ لاہور۔ ص ۲۹۳۔

۲۸۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۱/ستمبر ۱۹۹۶ء

۲۹۔ پروفیسر غفور احمد۔ نواز شریف، اقتدار سے عتاب تک۔ لاہور۔ ص ۷ تا ۱۲

۳۰۔ ایضاً۔ص ۳۶۱۔

۳۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۵۹، ۶۱، اور ۲۰۲۔

۳۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد ۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۳۸۲

۳۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم ص ۶۱، اور ۲۰۲۔

۳۴۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ص ۳۲۳

۳۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۳۷۹

۳۶۔ روزنامہ دی نیوز کراچی ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۳۷۔ (i) رفیق ڈوگر۔ ووٹوں کی خرید وفروخت اور برادری پروری۔ مطبوعہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۷ تا ۲۳/اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ص ۱۸۔

(ii) روزنامہ ڈان کراچی ۔۲/مارچ ۲۰۰۶ء

۳۸۔ (i) دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۵۶۸، ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۳۲۵۱، ۳۵۶۳

(ii) ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ص ۵۵۵

۳۹۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۳ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۲۔

۴۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ سالام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۔ ۱۹۹۰ء جلد دوم۔ص ۲۴۸

۴۱۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ص ۳۲۴

۴۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم ص ۲۰۱۔

۴۳۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ص ۴۵۶

۴۴۔ طارق اسماعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ص ۲۸۸

۴۵۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائریکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۰ء۔لاہور۔ ص ۱۵۸

۴۶۔ (i) دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۴۲۷، ۱۴۲۸

(ii) روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۹/دسمبر ۱۹۹۳۔
۴۷۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۴۰۶
۴۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۸۰
۴۹۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۶۱، ۲۰۲
۵۰۔ ایضاً۔ ص ۲۰۱
۵۱۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائریکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب۔ ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۱۵۹
۵۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم ص ۱۰۰، ۳۸۱
۵۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاست دان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۴۰۶
۵۴۔ روزنامہ دی نیوز۔ کراچی۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء
۵۵۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائریکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب۔ ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۱
۵۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۸ء جنرل الیکشنز رپورٹ ۔جلد دوم۔ ص ۳۸۱
۵۷۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۸۴
۵۸۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء
۵۹۔ ایم ریاض۔ پاکستان کا سدا بہار خاندان (خصوصی رپورٹ)۔ مطبوعہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۴ء
۶۰۔ جگنو محسن۔ سردار فاروق احمد خان لغاری۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ ۱۸ تا ۲۴ نومبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۶
۶۱۔ الس آل اے فیملی افیئر۔ پاکستان پنچ (انٹرنیٹ ایڈیشن)

مخدوم زادے

رحیم یار خان کے مخدوم زادے ایک طویل عرصہ سے پاکستان کی سیاست میں نمایاں کردار ادا کرتے آئے ہیں۔ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں اس خانوادے کے نامور فرزند مخدوم زادہ حسن محمود اپنی خود نوشت سوانح عمری "میرا سیاسی سفر" میں لکھتے ہیں۔

"میرے بزرگ جو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے نویں صدی ہجری میں حلب و شام سے ترک سکونت کر کے ہندوستان آئے تھے اور انہوں نے برصغیر کے مشہور تاریخی و روحانی مرکز اوچ کو جو سابق ریاست بہاولپور کے وسطی شہر احمد پور شرقیہ سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع ہے اپنا مسکن بنایا۔ اوچ شریف کو اپنا مسکن بنانے والے میرے پہلے بزرگ سید محمد غوث حلبی تھے جن سے نہ صرف یہاں قادری سلسلے کی داغ بیل پڑی بلکہ پورے برصغیر میں تصوف کے اس سلسلے کو فروغ حاصل ہوا۔

حضرت سید محمد غوث کی اولاد میں سید عبدالقادر ثانیؒ بڑی با اثر روحانی شخصیت کے مالک تھے مخلوق خدا نے ہزاروں کی تعداد میں آپ سے روحانی فیض حاصل کیا تھا اکثر سلاطین وقت آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے چنانچہ حاکم سندھ سلطان حسین مرزا اور سلطان سکندر لودھی کو بھی آپ سے نسبت ارادت تھی۔

آپ کی ہی اولاد اوچ گیلانی کی سجادگی پر فائز ہوتی چلتی آ رہی ہے۔ سید عبدالقادر ثانیؒ کے فرزند سید بعد الرزاق گیلانیؒ اور ان کے فرزند سید حامد گنج بخش تھے سید حامد گنج بخش کے فرزند سید خلیل اور ان کے فرزند سید محمد زماںؒ تھے جن سے میرے خاندان کا سلسلہ چلا۔

سید محمد زمان نے اوچ کو خیرباد کہہ کر دوسرے مقامات کا رخ کیا۔ ان کے پوتے سید محمد زمان ثانیؒ نے صادق آباد ضلع رحیم یار خان کے قصبہ جمال دین والی میں سکونت اختیار کی۔ جمال دین والی کسی زمانے میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے میرے بزرگوں خاص طور پر میرے والد نے ایک بارونق اور معاشی لحاظ سے خوشحال قصبے کی صورت دے دی۔ پاکستان کی شاید ہی کوئی ایسی

بڑی سیاسی، مذہبی، علمی اور قومی شخصیت ہو گی جس کا شرف میزبانی جمال دین والی کی سر سبز و شاداب سر زمین کو حاصل نہ ہوا یا میرے بزرگوں اور اہل خاندان نے ان مقتدر رہنماؤں کی پذیرائی میں اپنی منفرد روایات کو ملحوظ نہ رکھا ہو۔

سید محمد زمان شاہ ثانیؒ کے پر پوتے سید اشرف الدین کے فرزند سید جیون شاہ ان کے فرزند سید شرف الدین اور ان کے فرزند میرے والد گرامی مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ ہیں۔ میرے بزرگوں کو والیان حکومت کی طرف سے بہت سی مراعات حاصل تھیں اور ان کی طرف سے بہت سے احکام اور نوشتے میرے پاس محفوظ ہیں۔ مثلاً ۱۱۹۳ء میں ایک حکم تیمور بادشاہ کی جانب سے ہے جس میں تمام سابقہ مراعات کو بحال رکھنے کا حکم ہے اور سابقہ انتظامات کو قائم رکھنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ تیمور شاہ والی کابل کا تسلط ملتان اور بہاولپور تک تھا۔ تیمور شاہ نواب مبارک کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا بعد میں اسے رہائی ملی اور اسے اختیارات حکمرانی عطا ہوئے۔ اس کے علاوہ ۱۲۲۶ھ اور ۱۲۵۹ھ میں نواب بہاولپور کی طرف مراعات بحال رکھنے کا حکم ہے جن میں میرے پردادا سید جیون شاہ صاحب کو حسب سابق انتظام و انصرام بحال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی ساخت پر داخت پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔ ۱۹۰۱ء کے ایک مراسلے میں نواب بہاول خان کی جانب سے شادی میں شرکت کا دعوت نامہ ہے ان تمام مراسلات میں میرے بزرگوں کو جن خطابات سے نوازا گیا ہے ان میں خادمان کرامت بیان سیادت و نقابت مرتبت صفوت و نجابت منزلت سلسلہ خاندان عظام نیز جناب فیض ماب مہر سپہر ولایت قطب فلک صفوت و ہدایت مطلع انوار بانی منبع اسرار یزدانی حضرت مخدوم الملک کے القاب ہیں۔" (۱)

مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ اپنے والد سید شرف الدین کی وفات کے بعد ۱۹۲۳ء میں گدی نشیں ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ چونکہ قیام پاکستان سے قبل ریاست بہاولپور میں ہر نوع کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی اس سید غلام میراں شاہ مسلم لیگ کو بہاولپور میں زیادہ فروغ نہ دے سکے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ پابندی ہٹی تو انہوں نے نہ صرف بہاولپور اسٹیٹ میں مسلم لیگ قائم کی بلکہ اس کے پہلے صدر بھی مقرر ہوئے (۲) قیام پاکستان کے بعد وہ کچھ عرصہ ریاست بہاولپور کے وزیر مہاجرین بھی رہے (۳)

مخدوم ملک سید غلام میراں شاہ ایک روشن خیال سیاستدان تھے۔ انہوں نے ایک جانب اپنے زمیندارے کو منظم طریقہ سے استوار کیا اور جمال دین والی کو جو محض ایک گاؤں تھا اپنے حسن انتظام سے ایک مثالی قصبہ بنا دیا اور دوسری جانب اپنے مزارعین کے لئے جدید طرح کے مکانات، ہسپتال، بازار، گرلز کالج اور پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف آفس قائم کئے۔ ان اقدامات سے سید غلام میراں شاہ اپنے علاقے کی ہر دل عزیز ہستی بن گئے۔

مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ کو اللہ نے دو فرزند اور کئی بیٹیاں عطا کیں۔ بڑے فرزند

مخدوم زادہ سید حسن محمود تھے، جنھوں نے بہاولپور کی سیاست میں اپنے والد کے ساتھ مل کر کام کیا اور ایک فعال و سرگرم سیاستدان کی حیثیت سے بہاولپور پر چھا گئے۔ دوسرے فرزند اقبال محمود تھے، جو کسی دشمن کی گولی کا نشانہ بن گئے۔

مخدوم الملک کی دو صاجزادیاں ملتان کے گیلانی خاندان میں سید علمدار حسین گیلانی اور سید رحمت حسین گیلانی کو بیاہی ہیں جبکہ تیسری صاجزادی کی شادی پیر پگارا سید مردان علی شاہ سے ہوئی ہے ---- یوں سید یوسف رضا گیلانی اور سید صبغت اللہ راشدی ان کے نواسے ہیں۔ (۴)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، مخدوم زادہ سید حسن محمود نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز بہاولپور سے کیا۔ پہلے وہ وزیر تعلیم اور وزیر صحت بنائے گئے پھر ۱۹۵۱ء میں ریاست کی وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے۔ ون یونٹ کے قیام تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔

صوبہ مغربی پاکستان کے قیام کے بعد مخدوم زادہ سید حسن محمود ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت میں شامل ہوئے۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا اور وہ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے۔ سید حسن محمود بعد ازاں سردار عبدالرشید اور نواب مظفر علی قزلباش کی کابینہ میں بھی شامل رہے۔

۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۶ء تک مخدوم زادہ حسن محمود ایبڈو کی پابندیوں کی زد میں رہے اور عملی سیاست سے باہر رہے۔ تاہم اس دوران انہوں نے کنونشن مسلم لیگ کی حمایت جاری رکھی انہوں نے ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخاب میں ایوب خان کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور محترمہ فاطمہ جناح کی شکست میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات سے پہلے مخدوم زادہ حسن محمود نے کنونشن مسلم لیگ کو بھی داغ مفارقت دے دیا اور مسلم لیگ قیوم گروپ میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے قومی اور صوبائی دنوں نشستوں پر انتخاب لڑا وہ قومی اسمبلی کے انتخاب میں تو کامیاب نہ ہو سکے لیکن صوبائی اسمبلی کی نشست پر پھر بھی کامیاب ہو گئے۔

۱۹۷۱ء میں پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ اس حکومت میں قیوم لیگ پیپلز پارٹی کی حلیف جماعت تھی۔ مگر مخدوم زادہ حسن محمود قیوم لیگ کے چیف آرگنائزر ہونے کے باوجود ملکی امور سے بے تعلق رہے اور اپنی توجہ جماعتی تنظیم پر صرف کرتے رہے۔ (۵)

اس دور حکومت میں چونکہ سید حسن محمود، بھٹو سے ذرا دور دور ہی رہے اس لئے بقول حسن محمود کے بھٹو نے انہیں قدموں میں جھکانے کے لئے بڑے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کئے وہ اپنی خود نوشت سوانح "میرا سیاسی سفر" میں لکھتے ہیں۔

"مسٹر بھٹو کی فطرت تو یہ تھی کہ اگر کوئی شخصیت ان کی خواہش کے مطابق ان کے کام نہ

آسکے تو وہ ایسے حالات پیدا کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے کہ وہ خود بخود ان کے پیروں پر گر پڑے۔ چنانچہ انہوں نے تحریص و ترغیب کے علاوہ ایسے اوچھے ہتھیار بھی استعمال کئے جس کی وجہ سے کوئی اور ہوتا تو شاید ان سے دامن نہ چھڑا سکتا لیکن خدا نے مجھے ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ میرا ذکر کرتے تو مجھے عیار سیاستدان کہہ کر اپنے دل کا بخار نکالتے تھے۔ انہوں نے میرے خلاف کئی جھوٹے مقدمات قائم کرائے، مثلاً بجلی کی چوری میں مجھے اور میری والدہ کو ملوث کر کے ہمارے ملازمین کو گرفتار کرایا اور ہمارے بجلی کے کنکشن کاٹ دئے گئے۔ پھر انکم ٹیکس کے سلسلے میں مجھ پر مقدمہ چلایا گیا اور مبینہ طور پر غلط حسابات پیش کرنے کے الزام میں میری گرفتاری کے احکام جاری ہوئے جس میں بمشکل میری ضمانت ہوئی۔

سپیشل جج کسٹمز اور ٹیکسیشن کراچی کی عدالت میں انکم ٹیکس افسر کے فیصلے کے خلاف میں نے اپیل دائر کی، جس کا فیصلہ ۱۵ اپریل ۱۹۷۸ء کو جا کر ہوا اور وہ تمام الزمات جو میرے خلاف لگائے گئے تھے جھوٹے ثابت ہوئے اور میں بری کر دیا گیا۔

اسی طرح سٹی کو آپریٹو بنک کے بعض قرضوں کے سلسلے میں مجھے خاصا پریشان کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ دنیا کا ہر کاروبار بنکوں کی مدد سے چلتا ہے۔ میں بھی محمود اینڈ کمپنی کے نام سے کچھ کاروبار کرتا تھا اور اس کے لئے سٹی کو آپریٹو بنک سے قرض لینا پڑا تھا۔ اس قرضے کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں میرے خلاف عدالتی کاروائی کرائی گئی۔ معاملہ پاکستان کی سپریم کورٹ تک گیا۔ لیکن چونکہ جس رقم کا مجھ پر دعویٰ کیا گیا تھا وہ بھی ادا کر چکا تھا اس لئے سپریم کورٹ نے میرے حق میں فیصلہ دیا اور میں بری الذمہ قرار دیا گیا۔

یہ تو مشتے نمونے از خروارے چند واقعات کا تذکرہ کیا ہے ورنہ ایسے کتنے حربے نہ جانے مسٹر بھٹو نے میرے خلاف استعمال کئے بہرحال :۔

عدو شرے بر انگیزد کہ خیر مادران باشد

اپنی ان تمام حرکتوں کے باوجود جب میرا وہ کچھ نہ بگاڑ سکے تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔"

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات سے ذرا پہلے قیوم لیگ نے پیپلز پارٹی سے اشتراک عمل ختم کر دیا۔ دوسری جانب مخدوم زادہ سید حسن محمود نے بھی قیوم لیگ سے ترک تعلق کیا اور اپنے برادر نسبتی پیر پگارا کی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ چونکہ یہ مسلم لیگ پی این اے میں شامل تھی اس لئے مخدوم زادہ حسن محمود بھی پی این اے کی جانب سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار ہوئے مگر وہ یہ انتخاب تقریباً ۱۱ ہزار ووٹوں سے ہار گئے۔ (۷)

۱۹۸۵ء میں مخدوم زادہ حسن محمود نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا۔ اور دونوں نشستوں پر کامیاب رہے۔ ان کے احباب کا اصرار تھا کہ وہ قومی اسمبلی کی نشست برقرار

رکھیں اور صوبائی اسمبلی کی نشست چھوڑ دیں۔ مگر مخدوم زادہ کی نظریں پنجاب کی وزارت اعلیٰ پر تھیں۔ اس لئے انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی اور قومی اسمبلی کی نشست چھوڑ دی۔ جس پر ضمنی انتخاب میں رئیس شبیر احمد قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۸)

ان انتخابات میں بعض خاندانوں کے افراد کے امیدوار بننے پر آپس میں شدید اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔ مخدوم زادہ حسن محمود اور صوبائی وزیر خوراک سردار رفیق حیدر لغاری کا آپس میں انتخابی سمجھوتہ ہو گیا۔ مگر مخدوم زادہ حسن محمود کے والد مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ نے اس پر شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ وہ موضع بھونگ کے رئیس زمینداروں کو چھوڑنے کے لئے ہر گز تیار نہ ہوئے۔ دراصل ماضی میں جمال الدین والی اور بھونگ کے سیاسی خاندان آپس میں اکٹھے رہے یہاں تک کہ جب رئیس شبیر احمد کو بھٹو دور حکومت میں صوبائی وزیر بھی بنایا گیا تو مخدوم زادہ حسن محمود مسلم لیگ کے سرگرم راہنما ہونے کے باوجود دونوں خاندانوں میں کسی قسم کی کوئی رنجش پیدا نہ ہوئی۔

۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات میں مخدوم الملک نے مخدوم زادہ حسن محمود کے داماد مسٹر زاہد اکبر کو ڈسٹرکٹ کونسل رحیم یار خاں کی ایک نشست پر کھڑا کیا۔ یا ان کے مقابلے میں سردار اسلم خان ڈاہر امیدوار تھے جن کی حسن محمود مدد کر رہے تھے اس صورتحال کے پیش نظر مخدوم الملک نے بھونگ کے زمینداروں کی مدد حاصل کی۔ رئیس شبیر احمد اور ان کے بھائی رئیس وزیر احمد نے دن رات ایک کر کے مسٹر زاہد اکبر کو کامیاب بنایا عام انتخابات کا جب مرحلہ آیا تو مخدوم زادہ حسن محمود نے بھونگ کے رئیسوں پر رحیم آباد کے لغاریوں کو ترجیح دی۔ اس سے مخدوم الملک بگڑ گئے مگر تقریباً دو ہفتوں کے بعد علاقے کے بڑے زمینداروں کی مداخلت پر مخدوم الملک نے جہاں اپنے بیٹے کی امداد کے لئے کمربستہ ہونے پر آمادگی ظاہر کی وہاں انہوں نے بھونگ کے زمینداروں کی امداد سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔ (۹)

پنجاب میں جب وزیر اعلیٰ کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو مخدوم زادہ حسن محمود کو جو اپنے برادر نسبتی پیر پگارا کی حمایت پر تکیہ کئے ہوئے تھے' نواز شریف کی شکل میں ایک طاقتور حریف کا سامنا کرنا پڑا۔ نواز شریف کو جنرل ضیاء الحق کی آشیرباد حاصل تھی اس لئے یہ معرکہ نواز شریف نے جیت لیا اور مخدوم زادہ حسن محمود پنجاب اسمبلی میں قائد حزب اختلاف بن گئے۔ (۱۰)

مخدوم زادہ حسن محمود نے تقریباً ڈیڑھ برس اپنا یہ فریضہ نبھایا۔ ۱۵ اگست ۱۹۸۶ء کو ان کے والد مخدوم الملک غلام میراں شاہ نے وفات پائی اس کے فقط ۲۱ دن بعد وہ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (۱۱)

مخدوم زادہ حسن محمود کی وفات کے بعد ان کا منصب ان کے بیٹے مخدوم احمد محمود نے

سنبھالا۔ وہ اپنے والد کی وفات پر ان کی نشست پر صوبائی اسمبلی کے رکن بنے۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں انہوں نے آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑا لیکن انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت حاصل رہی ان کے مد مقابل پیپلز پارٹی کے سردار رانجھے خان تھے جو تقریباً سولہ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۲)

۱۹۸۸ء ہی میں پی پی ۲۳۹ رحیم یار خاں ۸ سے مخدوم زادہ احمد محمود کے چھوٹے بھائی سید علی اکبر نے بھی صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ بڑے بھائی کی طرح وہ بھی آزاد امیدوار تھے اس حلقے میں ان کے مقابلے پر ان کی بہن سید سلمیٰ گیلانی بھی انتخاب لڑ رہی تھیں مگر اصل مقابلہ سید علی اکبر اسلامی جمہوری اتحاد کے محمد امین باجوہ اور آزاد امیدوار شوکت داؤد میں ہوا اور یہ مقابلہ سید علی اکبر جیت گئے۔ انتخاب میں کامیابی کے بعد انہوں نے اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ (۱۳)

انتخابات کے بعد پنجاب میں جب اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت قائم ہوئی تو مخدوم زادہ سید احمد محمود اس میں ایکسائز اور ٹیکسیشن کے وزیر بنے۔ (۱۴)

۱۹۹۰ء میں سید احمد محمود نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی میں ان کے مد مقابل ان کے خاندانی حلیف سردار رئیس شبیر احمد تھے۔ چونکہ رئیس شبیر احمد نے ۱۹۸۹ء میں تحریک عدم اعتماد کے موقع پر محترمہ بے نظیر بھٹو کا ساتھ دیا تھا اس لئے علاقے کے ووٹرز ان سے خفا تھے۔

چنانچہ یہ معرکہ سید احمد محمود کے ہاتھ رہا۔ صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں سید احمد محمود نے اپنا سابقہ حلقہ انتخاب تو اپنے چھوٹے بھائی سید اکبر علی کے سپرد کر دیا اور خود سید علی اکبر کے حلقے سے کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ سید علی اکبر تو تقریباً ۲۰ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو گئے مگر سید احمد محمود آزاد امیدوار شوکت داؤد سے تقریباً ڈھائی ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۵)

ان انتخابات کے بعد علی اکبر صوبائی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ انہیں وزیر اعلیٰ پنجاب کا مشیر بنا لیا گیا۔ (۱۶)

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں سید احمد محمود نے اپنی سابقہ نشست یعنی این اے ۱۵۰ رحیم یار خان ۴ پر پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (جونیجو گروپ) کے مشترکہ امیدوار رفیق خیدر لغاری کا مقابلہ کیا اور کامیابی حاصل کی (۱۷) جب کہ صوبائی اسمبلی کی نشست پی پی ۲۴۰ رحیم یار خاں ۹ پر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے چھوٹے بھائی علی اکبر محمود نے حسب سابق پی پی ۲۳۸ رحیم یار خاں ۷ سے انتخاب لڑا اور یہ انتخاب جیت کر اپنی کامیابیوں کی ہیٹ ٹرک قائم کی (۱۸)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں مخدوم زادہ سید احمد، محمود اور مخدوم زادہ سید علی اکبر محمود، دونوں

نے اپنی یہ نشستیں دوبارہ جیت لیں (۱۹) سید احمد محمود نے ضلعی ناظم ہونے کی وجہ سے ۲۰۰۲ء کا انتخاب نہیں لڑا اور اپنی نشست پر اپنے کاروباری حلیف جہانگیر خان ترین کو کامیاب کروا دیا (۲۰) جہانگیر خان ترین پہلے وزیر اعلیٰ پنجاب پرویز الٰہی کے مشیر کے منصب پر فائز ہوئے (۲۱) اور پھر شوکت عزیز کی کابینہ میں وفاقی وزیر بنے۔ انہیں صنعت و پیداوار کا قلم دان سونپا گیا۔ (۲۲) ۲۰۰۲ء میں صوبائی اسمبلی کی نشست پر بھی مخدوم زادہ علی اکبر محمود نے انتخاب نہیں لڑا اور اپنی نشست پر چوہدری پرویز الٰہی کو کامیاب کروایا، چوہدری پرویز الٰہی نے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد مخدوم زادہ علی اکبر محمود کو اپنا معاون خصوصی مقرر کر لیا (۲۳)

۲۰۰۵ء میں مخدوم زادہ سید احمد محمود، ایک مرتبہ پھر رحیم یار خان کے ضلعی ناظم بننے کے متمنی تھے مگر مسلم لیگ (ق) کی قیادت انہیں اس عہدے پر نامزد کرنے سے گریزاں تھی۔ سبب اس کا یہ تھا کہ ایک طرف تو مخدوم زادہ سید احمد محمود پر کرپشن کے الزامات تھے دوسری جانب وزراء اور ارکان اسمبلی کا ایک بڑا طاقت ور گروپ ان کے خلاف تھا۔ (۲۴) اسی دوران رحیم یار خان سے پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے رکن قومی اسمبلی چوہدری ظفر علی اقبال وڑائچ نے نہ صرف خود پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کی بلکہ پیپلز پارٹی کے سابق رکن صوبائی اسمبلی سردار رفیق حیدر لغاری کو بھی ضلعی ناظم بنانے کے وعدے پر مسلم لیگ (ق) میں شامل کر لیا۔ اس پر مخدوم احمد محمود نے پاکستان مسلم لیگ (ق) چھوڑنے کا اعلان کر دیا مگر ان کے اس فیصلے میں نہ ان کا ساتھ جہانگیر خان ترین نے دیا نہ ہی ان کے چھوٹے بھائی علی اکبر محمود نے (۲۵) چنانچہ مسلم لیگ (ق) نے بڑے اعتماد کے ساتھ احمد محمود کی جگہ سردار رفیق حیدر لغاری کو ضلعی ناظم کے عہدے کے لیے نامزد بھی کیا اور پھر کامیاب بھی کروا لیا (۲۶)

حوالہ جات

۱۔ مخدوم زادہ سید حسن محمود۔ میرا سیاسی سفر۔ لاہور۔ ص ۲۱ تا ۲۳

۲۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۶۱۔۱۹۶۰ء۔ لاہور۔ ص ۶۲

۳۔ مخدوم زادہ سید حسن محمود۔ میرا سیاسی سفر۔ لاہور۔ ص ۳۷

۴۔ مسعود حسن شہاب دہلوی۔ مشاہیر بہاولپور۔ بہاولپور۔ ص ۸۳ تا ۸۷

۵۔ مخدوم زادہ سید حسن محمود۔ میرا سیاسی سفر۔ لاہور۔ ص ۳۷ تا ۲۸۲

۶۔ ایضاً۔ ص ۲۸۲، ۲۸۳

۷۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۲۷۳

۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵۔ لاہور۔ ص ۲۸۸، ۲۹۲، ۵۵

۹۔ ایضاً۔ص ۲۸۶

۱۰۔ مخدوم زادہ سید حسن محمود۔ میرا سیاسی سفر۔ لاہور۔ص ۳۰۳ تا ۳۰۵

۱۱۔ ایضاً۔ص ۱۹،۱۷

۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔لاہور۔ص ۵۱۰،۳۲۱

۱۳۔ سعید احمد۔ بہاولپور کے انتخابی نتائج۔ روزنامہ جسارت کراچی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۸۸۔

۱۴۔ ٹی ایم ڈوگر۔ ہواز ہو اینڈ واٹ از وہاٹ۔۱۹۹۰۔ص ۶

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰۔ جلد دوم ص ۲۶۳،۵۶

۱۶۔ ڈوگر برادرز۔ پاکستان اور دنیا میں کون کیا ہے؟۔ لاہور۔ص ۴۸۵

۱۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۲۹۸

۱۸۔ ایضاً۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ص ۱۴۳۸، ۱۴۳۷

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ص ۱۱۲،۴۴

۲۰۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ص ۱۳۲

۲۱۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ص ۳۴۵

۲۲۔ روزنامہ جنگ کراچی ۳ ستمبر ۲۰۰۴ء

۲۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ص ۱۳۲

۲۴۔ اورنگ زیب۔ لاہور نامہ۔ہفت روزہ اخبار جہاں۔ کراچی ۲۶/ستمبر تا ۲/اکتوبر ۲۰۰۵ء ص ۱۶

۲۵۔ ایضاً ۲۲/تا ۲۸/اگست ۲۰۰۵ء ص ۱۴

۲۶۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء

مزاری

مزاری قوم ایک بہت بڑی قوم ہے اس قوم کے لئے نام لفظ "مزار" بمعنی "شیر" سے لیا گیا ہے۔ بالا چانی اس قوم کی ایسی شاخ ہے جسے اس قوم کی دوسری شاخوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اس قوم کی چار شاخیں ہیں بالا چانی، رستمانی، سیدانی اور سرگانی۔ کھیٹرو جو بروہیوں کی ایک قوم ہے۔ اب مزاریوں کا ایک بڑا جزو ہے مزاری لوگ بالا چانیوں کے علاوہ عام طور پر "سیاہ لاف" (کالے پیٹ والے) مشہور ہیں۔ اس وقت راجن پور کا جنوبی حصہ مرغائی سے کشمور تک مزاری قوم سے آباد ہے بہت سے پہاڑی قطعات اور دریائے سندھ کے دونوں کناروں کی اراضیات اس علاقہ کی حدود میں شامل ہیں۔ مزاری قوم کا ایک بہت بڑا حصہ سندھ میں اوباڑو کے مقام پر بھی آباد ہے۔ بلوچ قبائل کے محقق غلام رسول کورائی کا کہنا ہے کہ بالا چانی مزاریوں سے الگ ہیں اور ایک شخص مسمی ہوت کو اپنا مورث اعلیٰ بتاتے ہیں۔ جو بلوچوں کی پانچ شاخوں سے ایک کا بانی ہے۔ ہوت کے دو پوتے اسحاق اور پنوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اخیر اور سولھویں صدی کے شروع میں جب بلوچ پنجاب کے میدانی علاقوں میں آباد ہوئے تو اسحاق کشمور میں آکر آباد ہو گیا اس وقت مزاری قوم کی اکثریت آبادی کوہ بھمبر کے قریب پہاڑی علاقے میں آباد تھی اور ان میں سے کوئی بھی میدانوں میں سکونت پذیر نہیں ہوا تھا۔ صرف کشمور ان کی تجارتی منڈی تھی جہاں وہ اپنے مال مویشی، غلے اور کپڑے سے تبادلہ کرتے تھے۔ اسحاق کشمور میں آباد ہو گیا تھا اپنی نیک نامی کی وجہ سے پورے علاقے میں مشہور تھا۔ تجارت کی غرض سے جو مزاری کشمور میں آتے تو اسحاق ان کی بڑی خدمت کرتا۔ واپس اپنے وطن جا کر مزاری اسحاق کی تعریف اپنے سردار بزن خان مزاری سے کرتے تھے ایک مرتبہ جب کشمور کے باشندوں نے چار مزاریوں کو قید کر دیا تو بزن نے اسحاق کی طرف چار عورتیں اس عرض سے بھجوائیں کہ وہ قیدیوں کو رہا کرانے میں اس سے مدد مانگیں۔ اسحاق نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے ان مزاریوں کو رہا کرایا اور چاروں عورتوں سمیت ان کو واپس اپنے وطن بھجوا

دیا۔ اس پر بزن خان نے اسحاق کو ملاقات کے لئے مدعو کیا جب یہ وہاں پہنچا تو مزاریوں نے نہایت گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ بزن نے اپنی سرداری کی دستار اس کے سر باندھی اور اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔ اسحاق کے دو بیٹے ہوئے بڑے کا نام بالاچ تھا (جس سے بالا چانی فرقہ منسوب ہے) اور چھوٹے کا نام شادن۔ اسحاق کے بعد بالاچ سردار نامزد ہوا' لیکن مزاری قوم انتخاب کی قائل تھی پہلے تو اس قوم نے بالاچ کے بیٹے زارو کو سردار بنانا چاہا مگر اتفاق سے اس وقت ایک زبردست آندھی آگئی اور زارو کی جھونپڑی کی چھت گر پڑی جسے مزاریوں نے بدشگونی سمجھا اور زارو کو سردار بنانے سے منحرف ہو گئے بعد ازاں مزاری شادن کے بڑے بیٹے باطل کے پاس اکٹھے ہو گئے اور اسے اپنا سردار بنانا چاہا باطل نے اپنی ماں کے مشورے سے سردار بننے کے لئے اپنی قوم کے آگے تین شرطیں عائد کر دیں۔

ا۔ اگر کوئی مزاری دوسرے کو قتل کرے' بے عزت کرے' یا کسی لڑکی کو اغوا کرے تو اسے قبیلہ چھوڑ کر کم از کم ایک سال تک جنگلوں میں رہنا ہو گا۔

۲۔ اگر کوئی مہمان یا اجنبی آ جائے اور سردار کسی مزاری سے بھیڑ بکری لے کر اس کی تواضع کرنا چاہے تو اس سے قیمت وصول نہیں کی جائے گی۔

۳۔ سردار کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ تمام اہل قبیلہ سے ٹیکس وصول کرے گا۔

مزاریوں نے یہ شرائط قبول کر لیں اور باطل اس قبیلہ کا سردار بن گیا۔ باطل کے زمانے میں میر چاکر کے ماتحت بلوچ وسط پنجاب میں آنے شروع ہو گئے تھے ان دنوں راجن پور کے ان علاقوں پر ناہڑ کی حکومت تھی اور بھاگسر سے لے کر کشمور تک کا علاقہ قاسم خان ناہڑ کے قبضے میں تھا۔ اس حکومت کا صدر مقام کن تھا۔ کچھ عرصے بعد ناہڑ قوم کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تو کن کے ناہڑوں نے مزاریوں سے رابطہ اتحاد پیدا کیا جس کے نتیجے میں میر حمل خان مزاری اپنی قوم کے آدمیوں کے ہمراہ ان کی مدد کے واسطے پہاڑی سے اترا اور بھاگسر پر قبضہ کر لیا اور آہستہ آہستہ اس پورے علاقہ پر مزاری قوم قابض ہو گئی۔

بگٹی قبیلہ سے مزاریوں نے بے شمار لڑائیاں لڑیں ایک موقع پر مزاری مویشی چرا کر لے جا رہے تھے کہ پانچ ساتھی ایک جگہ بیٹھ کر جوا کھیلنے لگے۔ وہ اس کھیل میں اتنے مشغول ہوئے کہ بگٹیوں نے ان پر اچانک حملہ کر دیا اور انہیں قتل کر دیا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع حمل خان کو ہوئی تو اس نے قسم کھائی کہ آئندہ ایک بھی مزاری جوا کھیلتا دیکھا گیا تو اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ تھوڑے عرصے کے بعد اس نے اپنے بیٹے مٹھا خان کو جوا کھیلتے ہوئے دیکھا۔ مٹھا خان نے باپ کو دیکھتے ہی دیوار پھلانگ کر بھاگنا چاہا مگر حمل خان نے ایسا تاک کر تیر مارا کہ اس کے بیٹے کی ران میں پیوست ہو گیا۔ جب مزاریوں نے دیکھا کہ ان کا سردار جوئے کے معاملہ میں اتنا سخت ہے تو انہوں نے جوا کھیلنا بند کر دیا۔

میر حمل خان کے زمانے میں مزاریوں اور دریشکوں میں بہت ساری جنگیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ کچھ مزاری کھیازی قبیلہ کے ساتھ کوہ گیان داری کے ڈھلانوں پر اپنے مویشی چرانے میں مصروف تھے کہ دریشکوں کے ایک گروہ نے ان پر حملہ کر دیا دریشک مویشیوں کا ایک گلہ چھین کر لے گئے اور ایک مزاری اور کھیازی کو بھی قتل کر دیا۔ حمل خان مزاری کو پتہ چلا تو اس نے ان کا تعاقب کیا اور حامد پور کے قریب جنگ کر کے پندرہ دریشک قتل کر دیئے بعد ازاں حمل خان آسنی پر حملہ کرنے کے واسطے ایک فوج لے کر روانہ ہوا۔ ادھر دریشکوں کے سردار شہک خان نے روجھان پر حملہ کر دیا۔ یہ دونوں فوجیں بلا اطلاع ایک دوسرے کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہوئیں اور دونوں کو کامیابی ہوئی البتہ دریشکوں کو زیادہ فائدہ پہنچا انہوں نے روجھان کو خوب دل کھول کر لوٹا اس لڑائی میں حمل خان مزاری کی بیوی ماری گئی اور اس کی ماں بھی زخمی ہوئی مزاریوں کے مطابق دریشکوں نے عورتوں پر ہاتھ اٹھا کر اچھا نہیں کیا۔ مگر دریشکوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ عورتوں پر حملہ اتفاقیہ تھا۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ایک اور لڑائی ہوئی جس میں دریشکوں کو شکست ہوئی اور خود شہک خان بھی مزاریوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

میر حمل کے بعد اس کا بیٹا میر مٹھا خان اس کا جانشین ہوا۔ اس زمانے میں بھی مزاریوں کی کھیازئی، دریشکوں اور گورچانیوں کے ساتھ برابر لڑائی رہی۔ ۱۷۱۴ء میں میر مٹھا خان نے وفات پائی اور اس کا بیٹا میر گل شیر خان اس کا جانشین ہوا۔ ان دنوں برصغیر پر احمد شاہ ابدالی کے حملے زوروں پر تھے۔ جس کے نتیجے میں دہلی کی بادشاہت ٹکڑے ٹکڑے ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی نے ہڑند اور داجل کے علاقے نصیر خان بروہی کو دیئے۔ بروہی یہاں کے بلوچ قبائل کو اپنے زیر حکومت کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے مزاریوں سے بھی اطاعت کرنے کے لئے کہا مگر انہوں نے نصیر خان بروہی کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا اور تمام مزاری میدانی علاقہ چھوڑ کر پہاڑ پر چلے گئے۔ نصیر خان نے کشمور میں قلعہ تعمیر کرایا اور پورے میدانی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ بروہیوں نے پہاڑ پر بھی مزاریوں کا پیچھا کیا اور ان کے سردار میر گل شیر کو قتل کر دیا۔ میر گل شیر کے بعد اس کا بیٹا میر شاہ علی اس کا جانشین ہوا جس نے کچھ عرصہ کی محنت کے بعد اپنی فوج تیار کی اور کشمور پر حملہ آور ہوا اور کچھ مدت کے لئے بروہیوں کو وہاں سے نکال دیا۔

دریائے سندھ کے جنوبی کنارے پر چانڈیہ قوم آباد تھی۔ مزاریوں نے ان سے صلح کر لی اور دونوں بروہیوں کے مشترکہ دشمن بن گئے لیکن دریا کے زرخیز علاقوں پر قبضہ کرنے کی خواہش دونوں قوموں میں تھیں اس لئے ان کے درمیان صلح زیادہ دیر نہ رہ سکی۔ جس کے نتیجے میں مزاریوں نے راتوں رات دریا پار کر کے چانڈیوں پر اچانک حملہ کر دیا اس حملے میں بے شمار چانڈیے مارے گئے۔ مزاریوں نے ایک ایک گھر کو لوٹا اور پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا ادھر نصیر

خان بروہی نے مزاری علاقوں پر قبضہ کرنے کا مکمل پروگرام بنا لیا۔ اس کے ساتھ بگٹی قبیلہ کے لوگ بھی مزاریوں کے خلاف نصیر خان کے اتحادی بن گئے۔ انہوں نے مل کر روجھان پر حملہ کیا اور بیالیس مزاری قتل کرنے کے بعد ان کے مال مویشی اٹھا کر لے گئے۔ اس وقت میر شاہ علی کا پوتا میر حمل خان سوم مزاریوں کا سردار تھا اسی اثنا میں بروہیوں نے عمر کوٹ میں بھی ایک قلعہ تعمیر کرایا تاکہ مزاریوں پر مکمل تسلط قائم رکھا جا سکے' میر حمل خان سوئم نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے پانچ صد آدمیوں کا لشکر تیار کر کے عمر کوٹ کے قلعہ پر مقیم بروہیوں پر حملہ کر دیا اور وہاں پر موجود تمام بروہیوں کو بشمول ان کے مقامی سردار کے قتل کر دیا اس کے بعد بروہیوں کو مزاریوں کی آزادی میں دخل دینے کی جرات نہ ہوئی لیکن میر حمل خان نے مصلحت اس میں سمجھی کہ کسی طاقتور رئیس کی اطاعت قبول کر لے چنانچہ خیر پور جا کر سندھ کے ٹالپور امیر رستم خان کے تابع فرمان ہو گیا۔ مزاریوں کی تاریخ میں کسی کی اطاعت کرنے کا یہ پہلا واقعہ ۱۷۹۱ء میں پیش آیا۔

بروہی بھاگ گئے تو مزاریوں نے بگٹیوں کے علاقہ پر حملہ کر دیا اور بے شمار مال غنیمت لوٹا۔ لیکن ابھی وہ مال لوٹ کر واپس جا رہے تھے کہ بگٹیوں نے اچانک پیچھے سے شب خون مارا۔ جس کے نتیجے میں بے شمار مزاری مارے گئے۔

۱۸۰۱ء میں میر حمل خان سوئم فوت ہوا تو اس کی جگہ میر بہرام خان اس کا جانشین ہوا اور دریشکوں کے ساتھ پھر سے لڑائی کا آغاز ہو گیا جس میں زیادہ تر کامیابی مزاریوں کو ہوئی۔ ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازیخان کا علاقہ انتظامی لحاظ سے ریاست بہاول پور میں شامل کر دیا۔ دیوان ساون مل اس علاقے کا گورنر تھا اس نے جب دیکھا کہ روجھان کے مزاری ریاست بہاولپور میں شامل ہونے سے گریز کر رہے ہیں تو وہ سات ہزار کی فوج لے کر ان پر چڑھ دوڑا اور ان کے تمام مال مویشی چھین کر ان کو پہاڑوں میں مار بھگایا مگر بہت جلد مزاریوں نے سکھوں سے انتقام لینے کی غرض سے کوٹ مٹھن پر حملہ کر دیا۔ جہاں انہوں نے سکھوں کو شکست دے کر کوٹ مٹھن شہر کو لوٹ لیا۔ آخر کار رحیم خان لغاری کے توسط سے ۱۸۳۴ء میں سکھوں اور مزاریوں میں صلح ہوئی اور دیوان ساون مل نے مزاریوں کو ان کے علاقے واپس کر دیئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد مزاریوں نے سکھوں سے پھر بغاوت کر دی اس کے نتیجے میں ان کو سندھ بھگا دیا گیا۔ اسی اثنا میں عمر کوٹ اور دکن کے مقام پر بھی مزاریوں اور سکھوں کے درمیان فیصلہ کن جنگیں ہوئیں۔ لیکن ہر دفعہ توپ خانے کے آگے مزاریوں کو پسپا ہونا پڑا۔

اس دوران تحریک مجاہدین کے ایک رہنما نصیر الدین شاہ جو سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شاہ کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے' مزاری قبیلے میں آئے اور اس طرح سکھوں کے خلاف مزاریوں کی جدوجہد' تحریک مجاہدین سے منسلک ہو گئی اور سکھوں کے خلاف گوریلا جنگ جاری

رکھی گئی۔ اس میں مزاریوں کو بھاری جانی نقصان ہوا لیکن سکھ فوجیں جو شکار پور فتح کرنے نکلی تھیں مکمل طور پر برباد ہو گئیں اور رنجیت سنگھ کے سمندر تک پہنچنے کے خواب ادھورے رہ گئے۔ (۱)

۱۸۳۷ء میں بہرام خان کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا دوست علی قبیلے کا سردار بنا۔ اس نے سکھوں کے خلاف جنگ جاری رکھی مگر سکھوں نے اسے سندھ کی طرف بھگا دیا۔ اتنے میں دیوان ساون مل مارا گیا اس کے لڑکے مول راج کو چونکہ حامیوں کی ضرورت تھی اس لئے اس نے دوست علی خان کا قصور معاف کر دیا۔ (۲)

۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ وہ بھی دوست علی خاں سے امداد کے طالب ہوئے۔ مگر سردار دوست علی خان جو ایک بڑے مجاہد، قوم پرست، وطن پرست، کفار کے دشمن، غازی، نمازی اور مزاری قبیلے کے تمام سرداروں سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز تھے اور ایک ربع صدی تک سکھوں کے خلاف جہاد کی قیادت کرتے رہے تھے انگریزوں کے دام میں نہیں آئے چنانچہ انگریزوں نے اس مردحر کو معزول کرکے اس کے چھوٹے بھائی امام بخش خاں کو قبیلے کا سردار بنا دیا۔ اس مرد حر کی معزولی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ سکھوں کے ساتھ آخری جنگ میں شدید زخمی ہو کر معذور ہو گئے تھے اور قبیلے کے معاملات چلانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ (۳)

امام بخش خان ہر طرح سے انگریزوں کی امیدوں پر پورا اترا اس نے بہت سے موقعوں پر انگریزوں کو مستعدی اور نمک حلالی دکھائی۔

جنگ آزادی کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے اعزازی مجسٹریٹ کا اعزاز عطا کیا۔ اس نے علاقہ مزاری کے مقدمات کو بڑی عمدگی سے فیصل کیا۔ اور مجرموں کو عبرتناک سزائیں دے کر جرائم میں نمایاں کمی کر دی۔ لوگوں کو اس کے انصاف پر اس قدر اعتماد اور یقین تھا کہ جو لفظ اس کے منہ سے نکلتے تھے وہی قانون بن جاتے تھے۔ سردار امام بخش کے ان اقدامات کی وجہ سے اس کے علاقہ کے تمام افراد انگریزوں کے مطیع اور فرمانبردار بن گئے۔

سردار امام بخش کا ایک اور بڑا کارنامہ مری اور بگٹی اقوام کے معاملات کا تصفیہ کرانا تھا۔ اس نے رابرٹ سنڈیمن کو ان اقوام کو مطیع کرنے اور ان کو انگریزی علاقے میں لوٹ مار کرنے سے روکنے میں بڑی مدد دی اور خان آف قلات اور انگریزوں کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ انگریزوں نے سردار امام بخش کی اس وفاداری کے صلہ میں اسے سر اور نواب کے خطابات عطا کئے۔ ۱۸۸۴ء میں اسے سی آئی ای اور ۱۸۸۸ء میں کے سی آئی ای کے خطابات مرحمت کئے۔ وہ پراونشل درباری تھا اور پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا ممبر بھی رہا تھا۔ (۴) روسائے با اختیار اور نامی خاندان کے مصنف کرنل چارلس میسی نے اسے

ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔

"بلاشبہ یہ نواب ان بہت سے اعلیٰ درجہ کے سرداروں میں سے ایک لائق فائق سردار ہے جو مغربی سرحد کی حفاظت کرنے اور اس کو نیم وحشی قوموں کو لوٹ مار سے جو ہمارے علاقہ سے باہر آباد ہیں بچانے میں مدد دیتے ہیں۔ اس کی ہر ایک عادت قابل تعریف ہے۔ یہ بہادر، راست باز، منصف، فیاض، مہمان نواز، وجیہہ، خوش خو، ہمدرد اور حلیم الطبع شخص ہے مگر برتاؤ میں لوہے سے زیادہ سخت"۔ (۵)

سر نواب امام بخش خان نے ۱۹۰۳ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا میر بہرام خاں جاگیر کا وارث بنا۔

بہرام خان ایک اعلیٰ پائے کا منتظم تھا اس نے اپنی تمنداری کا مکمل کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور کسی معاملے سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے اپنی تمن داری میں اور تمنداری سے باہر ہونے والے جھگڑے اپنی فراست سے حل کئے۔ جیکب آباد کے قبائل اپنے جرگہ میں خصوصی طور پر شامل ہونے کے لئے سال میں دو بار اسے ضرور دعوت دیتے تھے۔

۱۹۰۴ء میں بہرام خان کو نواب کا خطاب ملا اور تین سال بعد اسے سی آئی ای بنا دیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ پنجاب کے جاگیرداروں اور تمن داروں کی تنظیم "پنجاب چیفس ایسوسی ایشن" کا صدر اور ۱۹۱۰ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا رکن منتخب ہوا۔ ایک سال بعد اسے کے بی ای کا خطاب عطا ہوا۔ اسے ضلعی جرگہ کا صدر، پراونشل درباری، فرسٹ کلاس مجسٹریٹ اور اسسٹنٹ کلکٹر کے اختیارات بھی حاصل تھے۔

نواب سر بہرام خان نے ۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔ اس کے اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے اس کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ بالاخر اس کے تایا میر دوست علی خاں، جسے انگریزوں نے معزول کر دیا تھا، کا پوتا میر دوست محمد خاں اس کا جانشین قرار پایا۔ انگریزوں نے اسے بھی خان بہادر اور نواب کے خطابات سے نوازا۔ مگر جب تک وہ قوم کا سردار رہا انگریز اس سے خائف ہی رہے۔ (۶) یہاں اس بات کا تذکرہ یقیناً دلچسپی کا حامل ہو گا کہ لفظ پاکستان کے خالق چوہدری رحمت علی نے کچھ دن میر دوست محمد خاں کے پرسنل سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے تھے۔ (۷)

خان بہادر نواب دوست محمد خاں بھی اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ چنانچہ جب اس نے ۱۹۳۲ء میں وفات پائی تو اس کا ورثہ اس کے چھوٹے بھائی مراد بخش خان کو منتقل ہوا۔ ایک برس بعد مراد بخش خان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے تین بیٹے ہوئے میر بلخ شیر مزاری، شیر جان مزاری اور شیر باز مزاری۔ مراد بخش خان کی وفات کے وقت میر بلخ شیر مزاری کی عمر فقط ۵ برس تھی۔ چنانچہ حکومت نے اس کی تمام جاگیر کورٹ آف وارڈ میں لے لی اور سردار رحیم یار خان اس علاقے کا

قائم مقام سربراہ بنا دیا گیا۔(۸)

میر بلخ شیر مزاری (تاریخ پیدائش : ۸رجولائی ۱۹۲۸ء) نے کوئین میری اسکول لاہور اور ایچی سن (چیفس) کالج لاہور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ اپنے قبیلے کے سربراہ مقرر ہوئے۔

میر بلخ شیر مزاری کو ابتدا ہی سے سیاست سے دلچسپی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے ڈیرہ غازی خان ڈسٹرکٹ بورڈ کی چیئرمین شپ سے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز کیا۔ اس منصب پر وہ ۱۹۵۵ء تک فائز رہے۔ اسی دوران وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور جون ۱۹۵۵ء میں پاکستان کی مجلس دستور ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ یہ وہی دستور ساز اسمبلی تھی جس نے پاکستان کا پہلا آئین منظور کیا تھا۔ سردار بلخ شیر مزاری اس اسمبلی کے سب سے کم عمر رکن تھے۔(۹)

۱۹۶۲ء میں وہ دوسری مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ ہی نہیں لیا۔ کیونکہ اس سے قبل وہ محترمہ فاطمہ جناح کی صدارتی مہم میں ان کا بھرپور ساتھ دے چکے تھے اور اس مسئلے پر ان کا نواب کالا باغ سے اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ نواب کالا باغ یوں بھی لغاریوں کا کھل کر ساتھ دے رہے تھے کیونکہ ان کے ایک صاحبزادے سردار محمد خان لغاری کے داماد بن چکے تھے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں میر بلخ شیر مزاری نے خود صوبائی اسمبلی کی نشست پر انتخاب لڑا اور اپنے چھوٹے بھائی سردار شیر باز خاں مزاری کو قومی اسمبلی کی نشست پر انتخاب لڑوایا۔ ان انتخابات میں یہ دونوں بھائی کامیاب ہوئے۔(۱۰)

۱۹۷۴ء میں میر بلخ شیر مزاری نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۷۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ پاکستان قومی اتحاد نے جب ان انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف مہم چلائی تو میر بلخ شیر مزاری، سردار شوکت حیات کے فارورڈ گروپ میں شامل ہوگئے اور انہوں نے پاکستان قومی اتحاد کی تحریک سے یکجہتی کے اظہار کے طور پر پاکستان پیپلز پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔(۱۱)

۱۹۸۱ء میں وہ مجلس شوریٰ کے رکن نامزد کئے گئے۔ ۱۹۸۵ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات میں انہوں نے پاکستان بھر میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔ انتخاب میں کامیابی کے بعد انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں سردار بلخ شیر مزاری انتخابی عمل سے خود تو دور رہے مگر انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی سردار شیر باز مزاری کو اپنے حلقے سے انتخاب لڑنے کے لئے تیار کر لیا۔ سردار شیر باز مزاری این ڈی پی کے سربراہ تھے مگر سردار بلخ شیر مزاری چاہتے تھے کہ وہ آئی جے آئی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑیں۔ جب سردار شیر باز مزاری اس پر آمادہ نہیں ہوئے تو سردار بلخ شیر مزاری ان سے ناراض ہوگئے اور انہوں نے ردعمل کے طور پر سردار نصر اللہ دریشک کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا

کہ اس حلقے سے پیپلز پارٹی کے امیدوار سردار عاشق محمد مزاری کامیاب ہوگئے۔ حالانکہ ان کے ووٹ سردار شیر باز مزاری اور نصر اللہ دریشک کے مجموعی ووٹوں سے تقریباً دس ہزار کم تھے۔(۱۲)

۱۹۹۰ء کے انتخابات میں سردار بلخ شیر مزاری نے آئی جے آئی کے ٹکٹ پر خود انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا یہ انتخاب بھی جیت لیا۔(۱۳)

۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو جب غلام اسحٰق خان نے نواز شریف حکومت برخواست کی اور قومی اسمبلی تحلیل کی تو سردار بلخ شیر مزاری نگراں وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ فقط ۳۸ دن اس عہدے پر فائز ہوئے اور ۲۵ مئی ۱۹۹۳ء کو قومی اسمبلی کی بحالی کے ساتھ ہی اپنے عہدے سے برخواست ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے پاکستان کے سب سے کم مدت وزیراعظم ہونے کا ریکارڈ بھی قائم کیا۔ (۱۴) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں میر بلخ شیر مزاری نے ایک مرتبہ پھر این اے ۱۳۴ راجن پور سے انتخاب لڑا اور اس مرتبہ بھی کامیابی حاصل کی (۱۵) یوں انہوں نے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۳ء تک کوئی انتخاب نہ ہارنے کا منفرد ریکارڈ قائم کیا جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۸۸ء میں انہوں نے انتخابی عمل میں حصہ نہیں لیا تھا۔ میر بلخ شیر مزاری نے ۱۹۹۳ء کے صدارتی انتخاب کے لیے بھی کاغذات نامزدگی داخل کروائے تھے لیکن بعد ازاں وہ جناب فاروق لغاری کے حق میں دستبردار ہوگئے تھے (۱۶)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں میر بلخ شیر مزاری کامیاب نہ ہوسکے اور سردار نصر اللہ خان دریشک سے شکست کھا گئے (۱۷) یہ وہی سردار نصر اللہ خان دریشک تھے جنہیں بلخ شیر مزاری نے ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں اپنے بھائی کے مقابلے میں لڑوایا تھا۔ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں سردار بلخ شیر مزاری نے حصہ نہیں لیا۔

سردار بلخ شیر مزاری کے تین صاحبزادے ہیں۔ جن میں سے بڑے صاحبزادے ریاض مزاری ۱۹۸۵ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ دوسرے صاحبزادے طارق مزاری، احمد نواز بگٹی کے داماد ہیں (۱۸) جب کہ تیسرے صاحبزادے زاہد محمود مزاری ۱۹۹۳ء میں پی پی ۲۰۲ راجن پور ۳ سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ہیں (۱۹) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں زاہد محمود مزاری، فرحت عزیز مزاری سے شکست کھا گئے (۲۰) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں دونوں نے حصہ نہیں لیا۔

سردار بلخ شیر مزاری کے چھوٹے بھائی سردار شیر جان مزاری تھے۔ انہوں نے ایک حادثہ میں ۱۹۶۴ء میں وفات پائی۔ (۲۱) سردار شیر جان مزاری کے صاحبزادے سلیم جان مزاری کچھ عرصہ سندھ کی سیاست میں متحرک رہے۔ وہ ۱۹۸۵ء میں پہلی مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۲) ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے مگر آزاد امیدوار میر شاہ علی خان سے شکست کھا گئے تھے۔ جب کہ ۱۹۹۰ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کے طور پر حصہ لیا اور پی ڈی اے کے امیدوار میر غالب حسین ڈومکی کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب رہے۔ بعد ازاں وہ جام صادق علی اور مظفر حسین شاہ، دونوں کی کابیناؤں میں شامل رہے اور صوبے کی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ (۲۳) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پی ایس ۱۰ جیکب آباد ا سے انتخاب

لڑا۔ مگر اس مرتبہ وہ میر غالب حسین ڈومکی سے تقریباً چھ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۲۴)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۵) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں بھی کامیابی نے ان کے قدم چومے اور وہ قومی اور صوبائی، دونوں اسمبلیوں کا انتخاب جیت گئے۔ بعد ازاں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی جس پر ضمنی انتخابات میں امتیاز شیخ کامیاب ہوگئے (۲۶) ۲۰۰۵ء میں انہوں نے کشمور کے ضلعی ناظم کا انتخاب جیتا (۲۷) اور قومی اسمبلی کی نشست سے مستعفی ہوگئے۔

سردار بلخ شیر مزاری اور سردار شیر جان مزاری کے تیسرے بھائی سردار شیر باز خان مزاری، گو عمر میں سب سے چھوٹے ہیں، مگر اپنے دونوں بھائیوں کی بہ نسبت زیادہ شہرت اور زیادہ عزت و وقار کے حامل ہیں۔

سردار شیر باز خاں مزاری نے سیاست کے میدان میں ۱۹۵۸ء میں قدم رکھا۔ تاہم قومی سیاست کے افق پر ان کا نام اس وقت جگمگایا جب ۱۹۶۴ء میں صدارتی انتخابات ہوئے اور محترمہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کے مقابلے میں صدارتی انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ سردار صاحب نے نہ صرف خود بلکہ اپنے بڑے بھائی سردار بلخ شیر مزاری کو بھی محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت پر آمادہ کیا۔ سردار صاحب ایوبی ڈکٹیٹر شپ اور نواب کالا باغ کے ظالمانہ اقدامات کے سخت مخالف تھے انہوں نے بھرپور کوشش کر کے قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ اور جمہوریت کے علمبردار محترمہ مادر ملت کو اپنے حلقہ اثر ڈیرہ غازی خان اور کشمور (سندھ) میں زیادہ ووٹ دلوائے اور اس کے نتیجہ میں ان کو نواب کالا باغ کی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بننا پڑا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سردار شیر باز خان مزاری ایک طاقتور سیاستدان کی حیثیت سے ابھرے اور انہوں نے اپنے مخالفین کے مجموعی ووٹوں سے بھی زیادہ ووٹ حاصل کئے اور قومی اسمبلی میں آزاد گروپ کے قائد منتخب ہو کر عملاً قومی لیڈر بن گئے۔ ۱۹۷۲ء میں قومی اسمبلی میں صدر کے انتخاب کے موقع پر حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والی تمام پارٹیوں نے متفقہ طور پر سردار شیر باز مزاری کو اپنا امیدوار نامزد کیا تھا اور ووٹنگ کے دوران حزب اختلاف کے تمام ارکان نے انہی کو ووٹ دیا تھا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر نذیر شہید بھی سردار شیر باز مزاری مادر ملت کی الیکشن مہم میں آپس میں دوست بن گئے تھے ڈاکٹر نذیر شہید بھی سردار صاحب کے بھرپور تعاون اور کوشش سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر نذیر شہید خود بھی ایک مقبول، ہر دلعزیز، بے لوث کارکن اور عوام دوست شخصیت تھے لیکن ان کا اثر شہر ڈیرہ غازی خان اور گرد نواح تک محدود تھا اور باہر کے عوام ابھی تک قبائلی سرداروں کے پنجہ میں گرفتار تھے۔ اس لئے عوامی سیلاب کے باوجود ضلع ڈیرہ غازی خان میں پیپلز پارٹی کا کوئی امیدوار کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

سردار شیر باز مزاری نے اپنے ذاتی تعلق کی بنیاد پر تمن کھوسہ اور تمن بزدار کے تمام ووٹ ڈاکٹر نذیر شہید کو دلوا کر کامیابی سے ہمکنار کرایا تھا کیونکہ ان دونوں قوموں کے سرداران کے دوست تھے اور

ان دونوں سرداروں، سردار ذوالفقار خان کھوسہ اور سردار دوست محمد خان بزادر نے زبردست تعاون کیا تھا اور یہ بھی ایک قابل ذکر بات ہے کہ ڈاکٹر نذیر کی شہادت کے بعد ضلع ڈیرہ غازی خان کے تمام قومی اور صوبائی اسمبلی کے ارکان پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے تھے اور سردار شیر باز مزاری اس ضلع کے واحد رکن تھے جو حزب اختلاف کے ساتھ رہ گئے تھے۔

۱۹۷۳ء میں بھٹو نے بلوچستان کی منتخب حکومت کو ختم کر کے وہاں عملاً گورنر راج نافذ کر دیا اور ۱۹۷۵ء میں حیات محمد خان شیر پاؤ کے قتل کے نتیجے میں نیپ پر پابندی لگا کر ولی خان اور ان کے ساتھیوں پر بغاوت کا مقدمہ چلانا شروع کیا اس کارروائی کے نتیجے میں پورے بلوچستان اور سرحد پر ایک دہشت طاری تھی۔

اس کسمپرسی کے عالم میں نیپ کے مقید لیڈروں اور پارٹی کے مختلف کارکنوں اور دیگر سنجیدہ سیاسی حلقوں نے سردار شیر باز خان مزاری سے اپیل کی کہ وہ جرات کر کے آگے آئیں (کیونکہ ان کے سوا اور کوئی ایسی شخصیت نہیں تھی جو حکومت کے دباؤ کا مقابلہ بھی کر سکے اور نیپ کے کارکنوں اور دیگر حکومت مخالف حلقوں کے لئے قابل قبول بھی ہو) اور نیپ کی جگہ ایک نئی جماعت تشکیل دیں تا کہ نیپ سے تعلق رکھنے والے سیاسی عناصر اور جمہوریت پسند حلقوں کے لئے سیاسی پلیٹ فارم مہیا ہو سکے۔ نیپ مکمل تباہی سے بچ جائے، ملک میں ایک سیاسی خلاء واقع نہ ہو۔

حالانکہ سردار شیر باز مزاری کی نیپ سے نظریاتی ہم آہنگی نہیں تھی۔ اس کے باوجود بلوچستان کے عوام اور نیپ کے لیڈروں مظلومیت اور ملک کی یکجہتی کی خاطر سردار صاحب نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اس طرح این ڈی پی کا قیام عمل میں آیا۔ سردار صاحب کی جرات مندانہ قیادت و پیہم جدوجہد کی بدولت ایک مختصر عرصے کے اندر این ڈی پی ایک بڑی سیاسی قوت بن گئی۔ قومی اسمبلی اور سینٹ میں پیپلز پارٹی ایک بڑی سیاسی قوت بن گئی۔ قومی اسمبلی اور سینٹ میں پیپلز پارٹی کے بعد این ڈی پی دوسری بڑی پارلیمانی پارٹی تھی اور پنجاب میں بھی سیاسی عناصر اور عوام کا ایک بڑا حلقہ این ڈی پی میں شامل ہوگیا۔ حالانکہ ولی خان پنجاب کی ناپسندیدہ شخصیت تھے۔ جب مارشل لاء دور میں اسیران حیدر آباد رہا ہوئے تو پہلے سب کے سب (سوائے نواب خیر بخش مری کے) این ڈی پی میں شامل ہوگئے۔ بعد میں آہستہ آہستہ مختلف حیلوں بہانوں سے پارٹی سے علیحدگی اختیار کرنے لگے کیونکہ لسانی اور صوبائی مسائل میں سردار شیر باز مزاری ان کے ہمنوا نہیں تھے۔ سردار شیر باز مزاری کی سیاست کی بنیاد پاکستانیت تھی۔

پہلے بلوچ لیڈر علیحدہ ہوئے اور پھر ولی خان نے بھی پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ چونکہ وہ اندرونی طور پر جنرل ضیاء الحق سے مل گئے تھے اس لئے انہوں نے پہلے احتساب اور بعد میں انتخاب کا نعرہ لگایا تھا۔

آخر کار اس سازش کا انکشاف اس وقت ہوا جب ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران کنوینر کی حیثیت سے سردار شیر باز مزاری جیل چلے گئے۔ (مزاری صاحب واحد سیاستدان ہیں جن کو ضیاء دور میں بیک وقت پاکستان کے چاروں صوبوں سے صوبہ بدری کے احکامات جاری ہوئے اس وقت وہ پاکستان بچاؤ کمیٹی کے صدر بھی تھے) اور غلام احمد بلور ان کے قائم مقام بن گئے۔ اس دوران ولی

خان اور بیگم نسیم ولی خان لندن کھسک گئے اور غلام احمد بلور نے ڈرامائی طور پر غفار خان کی ہدایت اور ایک متروک قرار داد (قرار داد بنوں) کا سہارا لے کر تحریک سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کر دیا کہ صوبوں کو خود مختاری دینے کے لئے کنفیڈریشن کی بنیاد پر نیا آئین بنانے کے لئے نئی آئین ساز اسمبلی کے لئے الیکشن کرائے جائیں اور ۱۹۷۳ء کے آئین کو منسوخ کیا جائے۔

سردار شیر باز مزاری جب جیل سے نکلے تو ان کی پارٹی کی یہ کیفیت تھی۔

بہار تھی نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا
چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

اس طرح ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شیر باز مزاری کو پارٹی میں غیر موثر کرنے کے لئے ولی خان اور ان کی ذریت نے پارٹی منشور کی دھجیاں بکھیرنی شروع کر دیں۔ ولی خان نے کنفیڈریشن کی حمایت اور صوبائی سیاست پر دوبارہ زور دینا شروع کیا اور ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین کے خلاف مسلسل ہرزہ سرائی جاری رکھی۔

نوبت بہ ایں جا رسید کہ سردار شیر باز مزاری نے جن مظلوموں کی مظلومیت سے متاثر ہو کر ان کی پارٹی کو زندہ اور فعال رکھا تھا ان کی رہائی کے لئے سرتوڑ کوششیں کی تھیں، اور بے انتہا قربانیاں دی تھیں ان کے بے وفائی، حریصانہ اور حریفانہ رویہ سے تنگ آ کر اپنی بنائی ہوئی پارٹی کی پہلے صدارت اور پھر بنیادی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور محسن کشی کا یہ واقعہ تاریخ کے صفحات میں ثبت ہوگیا اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ایک صحافی نے لکھا تھا کہ ولی خان نے سردار شیر باز مزاری سے وہ سلوک کیا ہے جو ''بندریا نے اپنے بچوں سے کیا تھا'' اور اس طرح سردار شیر باز مزاری اور ولی خان کی راہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ ہوگئیں۔ (۲۸)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں سردار شیر باز خان مزاری کو اپنے حقیقی بھائی میر بلخ شیر مزاری کے ہاتھوں خاصا تلخ تجربہ اٹھانا پڑا۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا:

''۱۹۸۸ء کے الیکشن میں، میرے بڑے بھائی میر بلخ شیر میرے پاس آئے اور کہا کہ آؤ، آبائی علاقے سے الیکشن لڑو...... میں نے کہا بھائی، میں کراچی کا رہنے والا ہوں۔ ۲۰ سال سے میرا اس علاقے میں آنا جانا بھی نہیں ہے۔ وہاں کے لوگوں کے اپنے مسائل اور مشکلات ہیں۔ نظریاتی آدمی تو آج کل بہت کم ہیں۔ لیکن وہ مجھے مجبور کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ جب وہاں لوگوں نے مجھ سے کہا کہ آپ تو کراچی میں رہتے ہیں، ہمارے مسائل کون حل کرے گا؟ ہم پر جھوٹے مقدمات بنوائے جاتے ہیں۔ ان سے رہائی کون دلائے گا؟

میں نے ان سے کہا: ''میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں کراچی میں رہتا ہوں۔ نظریاتی آدمی ہوں، اسمبلی میں عوام کے حقوق کی بات کروں گا۔ ووٹ دینا ہے تو دو، ورنہ نہیں دو۔ کیونکہ میں اسمبلی میں گیا تو جمہوریت کی بات کروں گا۔ یہاں کے معاشی حالات بہتر بنانے کی بات کروں گا لیکن یہاں رہ کر

تھانے دار ایس پی اور ڈی ایس پی کے پاس نہیں جا سکتا"۔
اس پر بھائی نے کہا "آپ آئی جے آئی میں شامل ہو جائیں، بقیہ مسائل ہم خود دیکھ لیں گے"۔
میں نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا"۔

دوسری طرف پیپلز پارٹی کا کردار دیکھیں۔ ایم آر ڈی میں ہم ساتھ رہے۔ میں نے ان کے لئے جدوجہد کی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ الیکشن ہوں گے تو ہم اقتدار میں نہیں آئیں گے۔ ایم آر ڈی میں پیپلز پارٹی ہی سب سے بڑی جماعت تھی۔ ہم چھوٹی جماعتوں کو تو باہر ہی رہنا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم جدوجہد میں مصروف تھے۔ سختیاں برداشت کر رہے تھے۔ سزا کاٹ رہے تھے، صرف ان کے لئے، جمہوریت کی بقا کے لئے لیکن جب الیکشن کا وقت آیا تو انہوں نے ایک ایسے شخص کو میرے مقابلے پر ٹکٹ دے دیا جو پیپلز پارٹی کا ممبر نہ تھا اور ان کی بیگم صاحبہ ضیاء کی اسمبلی میں ممبر رہی تھیں۔

دوسری طرف میرے بھائی صاحب تھے۔ جنہوں نے کراچی میں مجھ پر کوئی شرط عائد نہیں کی اور اب مطالبہ کر رہے تھے کہ میں آئی جے آئی میں شامل ہو جاؤں۔ یعنی میں نے گذشتہ ۱۰ سال جو محنت کی سب ضائع ہو جائے۔ اس دوران میں جیلوں میں گیا، مصیبتیں، تکلیفیں برداشت کیں، چاروں صوبوں سے نکالا گیا اور جس نے یہ سب مظالم ڈھائے میں اس کی باقیات کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ میں نے بھائی سے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
انہوں نے کہا "پھر آپ کامیاب نہیں ہوں گے"۔
میں نے کہا "کامیابی اور ناکامی مسئلہ نہیں ہے۔ اب مجھے موقع مل گیا ہے کہ میں عوام تک اپنی آواز پہنچا سکوں"۔

میرے بھائی نے آئی جے آئی کے امیدوار کے لئے کام کیا جو صوبائی وزیر بھی تھے۔ لیکن وہ ہار گیا اور پیپلز پارٹی کا امیدوار جیت گیا۔ میں کھڑا نہ ہوتا تو آئی جے آئی کا امیدوار کامیاب ہو جاتا کیونکہ نگراں حکومت ان کی تھی۔ انتظامیہ ان کے ساتھ تھی۔ سرکاری ٹرانسپورٹ بھی ان کے لئے استعمال ہو رہی تھی۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرے بڑے بھائی اور میری سوچ میں واضح فرق ہے۔ ان میں اور دوسرے سیاست دانوں میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ وہ بھی ہمیشہ اقتدار کے ساتھ رہے ہیں (۲۹)

سردار شیر باز مزاری نے اس کے بعد کسی انتخاب میں حصہ نہیں لیا تاہم اب ان کی اگلی نسل سیاسی میدان میں نمودار ہو چکی ہے۔ ۲۰۰۵ء کے بلدیاتی انتخاب میں ان کے صاحبزادے شیر کوہ مزاری روجھان کے تحصیل ناظم منتخب ہوئے ہیں۔ (۳۰)

سردار بلخ شیر مزاری اور سردار شیر باز خاں مزاری کے ایک خاندانی حریف سردار عاشق مزاری تھے۔ ان کا تعلق بیوروکریسی سے تھا وہ محکمہ صنعت کے صوبائی سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے اور اس عہدے پر فائز ہو کر بعض لوگوں کی اس قدر سرپرستی کی کہ وہ آج اہم صنعتی خاندانوں کی صف میں شامل ہیں۔ (۳۱) ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہوں نے شیر باز مزاری کے ووٹ تقسیم کرانے کے خیال

سے کسی مزاری سردار کو میدان میں لانے کی تدبیر سوچی۔ چنانچہ لغاری گروہ کے سربراہ نوابزادہ محمد خاں لغاری سے مشورہ کر کے انہوں نے اپنے داماد شوکت حسین مزاری کے لئے پاکستان پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کر لیا۔ لغاری گروہ سے کئے گئے سمجھوتے کی رو سے عاشق مزاری نے شوکت مزاری کی انتخابی مہم کو تمن مزاری ہی تک محدود رکھا۔ تمن مزاری سے باہر البتہ وہ محمد رمضان کی انتخابی مہم میں سرگرداں رہے۔ اس مقصد کے لئے ان کی جیپوں ان کی کاروں اور ان کے سرمائے کا کھلے عام استعمال ہوا۔ گویا خاندانی رقابت کی بنا پر ایک طرف پیپلز پارٹی کا ٹک حاصل کر کے شیر باز مزاری کا مقابلہ کیا گیا اور دوسری طرف پارٹی کے خلاف لغاری گروہ کا ساتھ دیا گیا پارٹی کے عام کارکنوں نے عاشق مزاری کی اس دوغلی پالیسی کے خلاف احتجاج تو کیا لیکن وہ حالات کے دباؤ کی وجہ سے کارگر نہ ہوا (۳۲)

شوکت مزاری یہ انتخاب تو ہار گئے مگر انہوں نے سیاست کے میدان سے منہ نہ موڑا اور ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں نہ صرف ایم پی اے بننے میں کامیاب ہوئے بلکہ مارشل لاء کے نفاذ تک صوبائی وزیر اطلاعات کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ (۳۳)

۱۹۸۵ء میں سردار عاشق مزاری نے این اے ۱۶۲ راجن پور سے قومی اسمبلی اور پی پی ۱۹۰ راجن پور۳ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر دونوں میں ہی ناکام رہے۔ قومی اسمبلی کے انتخابات میں انہیں میر بلخ شیر مزاری نے اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں انہیں میر بلخ شیر مزاری کے صاحبزادے ریاض محمود خاں مزاری نے شکست دی۔

تاہم ۱۹۸۵ء میں سردار عاشق مزاری اپنی اہلیہ درشہوار مزاری کو خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کا رکن بنوانے میں کامیاب ہوگئے۔ (۳۴)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں سردار عاشق مزاری نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کی خوش قسمتی سے ان کے مخالف ووٹ سردار شیر باز مزاری اور سردار نصر اللہ دریشک میں تقسیم ہوگئے اور یوں سردار عاشق مزاری اپنے دونوں مخالف امیدواروں کے مشترکہ ووٹوں سے تقریباً دس ہزار ووٹ کم حاصل کرنے کے باوجود قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوگئے۔

اسی انتخاب میں سردار عاشق مزاری کے داماد سردار شوکت مزاری پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پی پی ۲۰۶ راجن پور۳ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے اپنے عزیز فرحت عزیز خان مزاری کو جو آئی جے آئی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہے تھے شکست دی تھی۔ (۳۵)

۱۹۹۰ء کے انتخابات سردار عاشق مزاری نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ میر بلخ شیر مزاری کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ ان کے داماد سردار شوکت مزاری صوبائی اسمبلی کی نشست پر امیدوار تھے مگر وہ بھی فرحت عزیز مزاری سے ہار گئے (۳۶)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں سردار شوکت مزاری نے پی پی ۲۰۶ راجن پور۳ سے انتخاب لڑا۔ مگر وہ اس مرتبہ میر بلخ شیر مزاری کے صاحبزادے زاہد محمود مزاری سے شکست کھا گئے (۳۷)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔ تاہم ۲۰۰۲ء میں وہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کا ٹکٹ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ان انتخابات میں انہوں نے ایک سخت مقابلے میں مسرت عزیز مزاری کو شکست دی اور نہ صرف پنجاب اسمبلی کے رکن بلکہ بعد ازاں اس کے ڈپٹی اسپیکر بھی منتخب ہوئے (۳۸)

مسرت عزیز مزاری کے بھائی فرحت عزیز مزاری ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۷ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۳۹) مسرت عزیز مزاری اور فرحت عزیز مزاری، میر بلخ شیر مزاری اور میر شیر باز مزاری کے بھانجے ہیں (۴۰)

حوالہ جات

۱۔ شکیل پتانی۔ مزاری قوم کی مختصر تاریخ۔ ماہنامہ عصائے کلیم کوٹ مٹھن۔ مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۴۵ تا ۴۷

۲۔ اے آر شبلی۔ پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۱۷۷، ۱۷۸

۳۔ اجمل مزاری۔ سیاست کے فرعون کا تنقیدی مطالعہ۔ ہفت روزہ قومی اخبار نیوز میگزین۔ کراچی ۱۹/ تا ۲۵/ مارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۸

۴۔ سر لیپل ایچ گرفین، کرنل میسی۔ تذکرہ روسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۵۵۵ تا ۵۵۷

۵۔ کرنل چارلس میسی۔ روسائے با اختیار و نامی خاندان۔ (ترجمہ لالہ بھگوان داس) لاہور۔ ص ۳۷۵، ۳۷۶

۶۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۴۱۶

۷۔ نذیر لغاری۔ سیاست دوران۔ کراچی۔ ص ۵۰

۸۔ جی ایل چوپڑہ۔ چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۴۱۶

۹۔ ڈاکٹر خورشید ملک۔ میر بلخ شیر مزاری۔ ماہنامہ عصائے کلیم کوٹ مٹھن۔ مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۳۹، ۴۰

۱۰۔ محمود غزنوی۔ قبضہ گروپ کی کابینہ۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۲۰/ مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴

۱۱۔ احمد سلیم۔ اے سردار فار آل سیزنز۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۶ (اے)

۱۲۔ آفاق احمد۔ سردار سیاست (سردار شیر باز مزاری کی سرگزشت)۔ ماہنامہ سرگزشت کراچی اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۳۲

۱۳۔ خالد حسین۔ لو پروفائل مسٹر کلین۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۲/ تا ۲۸ اپریل ۱۹۹۳ء۔ ص ۴

۱۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۶/ مئی ۱۹۹۳ء

۱۵۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۹۳

۱۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۵/ نومبر ۱۹۹۳ء

۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۱

۱۸۔ محمود غزنوی۔ قبضہ گروپ کی کابینہ۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۲۰ مئی ۱۹۹۳ء ص ۱۴

۱۹۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۲۹

۲۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۸۴

۲۱۔ اجمل مزاری۔ سیاست کے فرعون کا تنقیدی مطالعہ۔ ہفت روزہ قومی اخبار نیوز میگزین۔ کراچی۔ ۱۹ تا ۲۵ مارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۸

۲۲۔ ثمینہ امان۔ ڈائرکٹری، ممبرز آف پروانشل اسمبلی، سندھ اینڈ بلوچستان ۱۹۸۵ء لاہور۔ ص ۵۰

۲۳۔ شفیع علی خان۔ جیکب آباد میں اکثر پرانے حریف ہی مقابل ہیں۔ روزنامہ جنگ کراچی ۵/ستمبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۷

۲۴۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ۱۴۵۲

۲۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۳۸

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء جلد دوم ص ۷۵، ۳۸۵، ۲۳۸

۲۷۔ روزنامہ جنگ کراچی ۔ ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۲۸۔ اجمل مزاری۔ سیاست کے فرعون کا تنقیدی مطالعہ۔ ہفت روزہ قومی اخبار نیوز میگزین۔ کراچی ۱۹/تا ۲۵/مارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۸، ۳۲

۲۹۔ آفاق احمد۔ سردار سیاست (سردار شیر باز مزاری کی سرگزشت)۔ ماہنامہ سرگزشت کراچی اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۳۲، ۳۳

۳۰۔ روزنامہ جنگ کراچی ۔ ۱۷/اکتوبر ۲۰۰۵ء

۳۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۹

۳۲۔ ڈاکٹر مبشر حسن۔ پاکستان کے جعلی حکمران طبقے۔ لاہور۔ ص ۱۰۳

۳۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۹۱

۳۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۲۳۶، ۲۴۰، ۲۹۵

۳۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۸ تا ۲۹۱

۳۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۵۹، ۲۵۰

۳۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۲۹

۳۸۔ پراونشل اسمبلی آف دی پنجاب ۲۰۰۲ء۔ لاہور۔ بائیوگرافی آف ممبرز۔ ص ۲۵۰

۳۹۔ پراونشل اسمبلی آف دی پنجاب ۱۹۹۷ء۔ لاہور۔ بائیوگرافی آف ممبرز۔ ص ۱۳۱

۴۰۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر)۔ ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب۔ ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۱۶۲

موکل

لاہور کے علاقہ میں بڑے زمینداروں کا ایک ایسا خاندان بھی آباد ہے جس کے کچھ افراد مسلمان ہیں اور کچھ سکھ۔ لیکن دونوں 'موکل' کہلاتے ہیں۔ انگریزوں نے نہ صرف ان کو خطابات سے نوازا بلکہ ان کی سکھوں کے زمانہ کی جاگیر کو بحال کیا اور فوج میں بھرتی کر کے ان کو اپنے مخصوص مفاد کی تقویت کے لئے استعمال کیا۔

موکل دراصل سندھو جاٹ ہیں۔ جن کو رنجیت سنگھ کے زمانہ میں خاصہ اقتدار حاصل ہوا۔ تاہم اس خاندان نے جو کچھ حاصل کیا وہ اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے نہیں بلکہ میدان جنگ میں اپنی شجاعت اور طاقت دکھا کر حاصل کیا ہے۔

اس خاندان کا بانی سردار سوندا سنگھ تھا۔ اس کے سات بیٹے تھے مگر ان میں سے فقط دو کی اولادوں نے اپنا نام پیدا کیا سوندا سنگھ کی ایک بیٹی تھی جس کا نام کوراں تھا۔ اس کی شادی اس نے سردار لال سنگھ سے کر دی جو پاک پتن کے نواح کا ایک جاگیردار تھا۔ سردار لال سنگھ نے اپنے برادران نسبتی ٹھاکر سنگھ اور کیسر سنگھ کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا اور انہیں اپنی قزاقی کی مہمات میں اپنے ساتھ لے جانے لگا۔

ٹھاکر سنگھ کے بیٹے کا نام جوند سنگھ تھا۔ وہ اپنے چچا زاد بھائیوں کے ہمراہ لاہور چلا آیا اور یہاں رنجیت سنگھ کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔

کچھ عرصہ تک کسی کی توجہ ان کی طرف نہیں ہوئی مگر بیسہ کی خونریز لڑائی میں جو جولائی ۱۸۱۳ء میں دیوان محکم چند اور افغان وزیر کے درمیان اٹک کے قریب ہوئی ان چچیرے بھائیوں نے جن میں سے چھ اس لڑائی میں شامل تھے بہادری اور شجاعت کے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ مہاراجہ نے انہیں بنگیل پور کی ۲۵۰۰ روپیہ مالیت کی جاگیر عطا کی اور جوند سنگھ کو جس نے اپنے آپ کو خاص طور پر ممتاز کیا تھا ضلع گجرات کے پانچ مواضعات ۳۰۰۰۰ کی مالیت کے اس شرط پر عطا کئے کہ یہ ۱۵۰ سوار خدمات کے لئے دیا کرے اور اس کے بھائی اس کے ماتحت رکھے

گئے۔ ۱۸۱۸ء میں اس نے ملتان میں اور دوسرے سال کشمیر میں خدمات انجام دیں۔ اور آخر الذکر مقام پر اس کے پہلو میں برچھی سے سخت زخم آگیا جس کی وجہ سے اسے کشمیر کے مالیہ میں سے ۲۵۰۰ روپیہ سالانہ ملنا مقرر ہوا۔ ایک زمانے میں اس خاندان کی جاگیر کی مالیت ۴۳۵٬۰۰۰ روپیہ تک پہنچ گئی تھی جس میں وہ ۲۰۰۰ روپیہ بھی شامل ہے جو ان کو ان کے ننھیالی رشتہ دار لال سنگھ کی جاگیر میں سے ملتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات واقع ۱۸۳۹ء اور جوند سنگھ کی وفات واقع ۱۸۴۰ء کے بعد خاندان موکل کی جاگیریں ویسی کی ویسی ہی رہیں اور چونکہ ۱۸۳۶ء میں علاقہ آپس میں تقسیم ہو گیا تھا اس لئے وہ جاگیریں جو جوند سنگھ کو خاص طور پر ملی ہوئی تھیں اس کے دو بیٹوں بیلا سنگھ اور گورکھ سنگھ کے نام واگزار ہو گئیں مگر اڑھائی سو سوار جو وہ خدمات کے لئے دیا کرتے تھے بڑھا کر تین سو کر دیئے گئے اور ان بھائیوں کو شہزادہ نونہال سنگھ کے ماتحت کر دیا گیا۔ ان بھائیوں کا آپس میں اتفاق نہیں رہا۔ بڑے بھائی کو چھوٹے پر شک ہو گیا کہ اس کی خواہش نہ صرف یہ تھی کہ خاندانی جاگیر کا حصہ اس سے زیادہ حاصل کر لے بلکہ یہ کہ اس کی جگہ سردار بھی وہی بن جائے۔ اس موقع پر راجہ ہیرا سنگھ وزیر تھا جس نے سردار بیلا سنگھ سے ۲۰۰۰۰ روپیہ بطور نذرانہ لے کر اسے مستقل طور پر سردار بنا دیا اور جاگیر دے دی۔ سردار گورکھ سنگھ کے دل پر اس بات کا ایسا اثر ہوا کہ وہ تھوڑا عرصہ بعد ۱۸۴۴ء میں اسی رنج میں مر گیا۔ جب پنجاب کی پہلی لڑائی شروع ہوئی تو سرداران بیلا سنگھ اور سورجن سنگھ دو سو سوار ساتھ لے کر سکھ فوج سے مل گئے اور اس حصہ فوج میں شامل تھے جو مدکی اور فیروز شاہ کی طرف بڑھا۔ یہ دونوں سراؤں کی لڑائی میں بھی موجود تھے جس میں بیلا سنگھ سخت زخمی ہو گیا اور کشتیوں کا پل توڑ دیا جانے کے بعد اس بات کی لاحاصل کوشش کرتا ہوا کہ پایاب گزر جائے دریائے ستلج میں ڈوب گیا۔ اس کے نوکر کئی روز تک اس کی لاش تلاش کرتے رہے مگر نہ پا سکے۔ جب راجہ لال سنگھ لاہور میں عہدۂ وزارت پر مستقل ہوا تو سردار بیلا سنگھ کی قریباً نصف جاگیریں ضبط ہو گئیں مگر اس پر بھی سورجن سنگھ کے واسطے ۶۳۸۰۰ روپیہ مالیت کی جاگیریں رہیں جن میں ۴۹۸۰۰ کی ۱۶۰ سوار خدمات کے لئے دینے کی شرط پر تھیں۔ سورجن سنگھ یہ جاگیریں ۱۸۴۹ء تک لیتا رہا۔ مگر پھر وہ اپنے چچیرے بھائی خزان سنگھ کے ساتھ مفسدوں میں شامل ہو گیا اور جاگیر مذکور ضبط ہو گئی البتہ رنگیل پور کی جاگیر جو ایک ہزار کی مالیت کی تھی اور جو سردار گورکھ سنگھ کی وفات پر اس کی بیوہ اور لڑکی کے گزارے کے لئے ملی ہوئی تھی ضبطی سے بچ گئی اور بیوہ کے نام قائم رہی۔ خزان سنگھ کو ۴۵۰ روپیہ اور مقدم سنگھ کو ۲۷ روپیہ پنشن ملی۔ سورجن سنگھ کی پنشن جو ۱۲۰۰ روپیہ تھی مارچ ۱۹۶۴ء میں اس کی وفات پر ضبط ہو گئی۔ اس کا بیٹا چتر سنگھ اس کی جگہ اعلیٰ نمبردار بنا جس نے ۱۸۷۹ء میں مسلمان ہو کر اپنا نام بدل کر فتح دین رکھ لیا۔ اس کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا اس نے تین بیٹے کرم

الٰہی برکت علی اور اکبر علی چھوڑے۔

موکل خاندان کا ایک اور فرد مانا سنگھ تھا۔ وہ پولیس کے محکمے میں ملازم تھا جہاں اس نے بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کے عوض ریٹائر ہونے کے بعد اسے موضع موکل کے گرد و نواح کے ۲۸ مواضعات کا ذیلدار یا آنریری پولیس مجسٹریٹ بنا دیا گیا اور ۱۸۶۲ء میں اسے چونیاں کے قریب رکھ مدکی میں ۲۰۷ ایکڑ افتادہ زمین عطا کی گئی۔ مانا سنگھ ۱۸۸۴ء میں فوت ہوا اور اس کا بیٹا نرائن سنگھ اس کی جگہ ذیلدار اور نمبردار بنا اور ۱۹۰۰ء میں فوت ہو گیا۔ اس کے دوسرے دو بیٹے پرتاب سنگھ اور لابھ سنگھ مسلمان ہو گئے۔ پرتاب سنگھ نے اپنا نام بشیر احمد خاں اور لابھ سنگھ نے اپنا نام محمد عمر رکھ لیا۔ بشیر احمد خاں محکمہ انہار پنجاب میں ملازم رہا اور ڈپٹی کلکٹر ہو کر تیس سال کی ملازمت کے بعد اپنی ملازمت سے علیحدہ ہوا۔ وہ زراعت کے متعلق بہت سی کتابوں کا مصنف تھا اور اس نے خاندان موکل کی تاریخ بھی لکھی۔ جبکہ اس کا بھائی محمد عمر ذیلدار رہا اور اس نے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

موکل خاندان کا ایک سرکردہ شخص سردار گوڈر سنگھ تھا۔ اس نے بھی مانا سنگھ کے دوش بدوش وسیع اراضی حاصل کی اور مانا سنگھ کی وفات کے بعد خاندان کا بزرگ اور اسی کی درباری کرسی کا وارث بنا۔ گوڈر سنگھ کا انتقال ۱۸۹۳ء میں ہوا۔

گوڈر سنگھ کے بیٹے تیجا سنگھ نے بھی اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور تمام عمر عبدالرحمٰن خاں کہلایا وہ پنجاب کے محکمہ انہار میں ڈپٹی کلکٹر تھا جس میں اس نے ۳۰ سال سے زیادہ ملازمت کی۔ اس کی لمبی ملازمت جس میں اس کا کام ہمیشہ افسروں کے پسندیدہ رہا اور عام لیاقت کی وجہ سے اسے ۱۹۰۷ء میں "خان بہادر" کا خطاب عطا کیا گیا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک وہ لاہور میں آنریری مجسٹریٹ درجہ اول رہا۔ یہ پراونشل درباری تھا اور خاندان کی سب سے بڑی شاخ کا رکن ہونے کی وجہ سے تمام خاندان کا سرکردہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ملکیت میں موضع موکل کی ۲۶۸ ایکڑ اراضی تھی اور یہ موضع مذکور کا نمبردار تھا۔ ۱۹۱۶ء میں اسے ضلع منٹگمری کی لوئر باری دو آب آبادی پر ۱۳ مربعہ جات اراضی عطا ہوئے۔ (۱)

سردار محمد عمر کا' جس کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے' بیٹا سردار حبیب اللہ موکل تھا وہ سیاست کے میدان میں خاص فعال رہا اور اس نے بڑے بڑے عہدے اور مناصب حاصل کئے۔

۱۹۳۷ء میں سردار حبیب اللہ موکل نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر خود یونینسٹ پارٹی کے سرکردہ ارکان سر شہاب الدین اور میاں احمد دولتانہ نے اسے ناکام بنانے کی حکمت عملی تیار کی۔ حبیب اللہ موکل کا مقابلہ میاں افتخار الدین سے تھا۔ میاں افتخار الدین نے اس انتخاب میں کامیابی کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کیا اور یوں حبیب اللہ موکل کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں حبیب اللہ موکل نے چونیاں سے انتخاب لڑا اس مرتبہ بھی وہ یونینسٹ پارٹی کا امیدوار تھا۔ مگر اس مرتبہ بھی وہ مسلم لیگ کے سردار محمد حسین گنجیانوالہ کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔

۱۹۴۶ء ہی کے انتخابات میں موکل خاندان کا سردار رشید احمد موکل بھی امیدوار تھا سردار حبیب اللہ موکل کے برعکس وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہا تھا مگر وہ بھی اپنے مد مقابل نواب مظفر علی خاں قزلباش سے شکست کھا گیا یہ امر قابل ذکر ہے کہ پولنگ کے روز یہ افواہ سننے میں آئی کہ نواب مظفر علی قزلباش کو دھاندلی کے ذریعہ کامیاب کروایا جا رہا ہے اس پر مسلم لیگی امیدوار کے والد سردار حفیظ اللہ موکل نے اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا لیکن اسے زندگی نے مہلت نہ دی اور پولنگ سے ایک دن پہلے ایک حادثہ میں جاں بحق ہو گیا۔

۱۹۶۲ء میں سردار رشید احمد موکل کا سامنا میاں افتخار الدین کے صاحبزادے میاں عارف افتخار سے ہوا۔ یہ انتخاب سردار رشید احمد نے جیتا۔ (۲) ۱۹۶۵ء میں سردار رشید احمد نے ملک معراج خالد سے شکست کھائی۔ (۳) ۱۹۷۰ء میں انہوں نے اپنا انتخابی حلقہ تبدیل کیا اور لاہور کی بجائے فیصل آباد سے انتخاب لڑا۔ مگر اس مرتبہ بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۴) اور اس ناکامی کے بعد بالاخر سیاست کا میدان ہی چھوڑ گئے۔

سردار رشید احمد کے بیٹے سردار عارف رشید نے ۱۹۸۵ء میں پی پی ۱۰۹ لاہور ۱۶ سے انتخاب میں حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔ وہ نواز شریف کابینہ میں وزیر بھی رہے۔ انہیں زراعت اور بجلی کا قلمدان سونپا گیا۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں سردار عارف رشید نے سابقہ حلقہ انتخاب تو اپنے کزن سردار عادل عمر کے لئے خالی کر دیا۔ اور خود پی پی ۱۳۳ لاہور ۱۸ سے کاغذات نامزدگی داخل کروائے۔ گو انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت حاصل تھی مگر وہ پیپلز پارٹی کے امیدوار چوہدری شبیر احمد ایڈووکیٹ سے تقریباً ڈیڑھ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۶) ۱۹۹۳ء میں سردار عارف رشید نے ایک مرتبہ پھر پی پی ۱۳ لاہور ۱۵ کو اپنی معرکہ آرائی کے لیے منتخب کیا۔ مگر اس مرتبہ بھی ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ عبدالرشید بھٹی اور محمد شفیع بھٹی کے بعد تیسری پوزیشن ہی حاصل کر سکے (۷)

۱۹۹۷ء کے انتخابی عمل میں سردار عارف رشید کا نام نظر نہیں آیا۔ ۲۰۰۲ء میں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر این اے ۱۲۹ لاہور ۱۲ سے انتخاب لڑا۔ مگر پاکستان مسلم لیگ (ق) کے میجر (ر) حبیب اللہ وڑائچ کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۸)

موکل خاندان ہی کے ایک فرد سردار خالد عمر تھے انہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں ملک معراج خالد سے شکست کھائی۔ بعد ازاں وہ ڈسٹرکٹ کونسل کے چیئرمین رہے۔ ان کا انتقال ۲۷ اپریل ۱۹۹۴ء کو ہوا۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں ان کے بیٹے سردار عادل عمر نے سردار عارف رشید کے حلقے

سے انتخاب لڑا مگر وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار چوہدری محمد حیات سے شکست کھا گئے۔ (۹) سردار عادل عمر ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں بھی اسی حلقے سے امیدوار تھے مگر اس مرتبہ بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس مرتبہ انہوں نے پی ڈی اے کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا تھا۔ (۱۰)

سردار عادل عمر کے بھائی سردار کامل عمر نے ۲۰۰۲ء میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر این اے ۱۲۸ لاہور ۱۱ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین کے امیدوار ظہیر عباس کھوکھر سے شکست کھا گئے۔ (۱۱) تاہم ۲۰۰۵ء میں وہ لاہور میں علامہ اقبال ٹاؤن کے ٹاؤن ناظم منتخب ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۲) لاہور کے موکل خاندان کی بہ نسبت قصور کے سردار حسن اختر موکل کا انتخابی ریکارڈ زیادہ بہتر ہے۔ انہوں نے ۱۹۸۵ سے ۲۰۰۲ء تک تمام صوبائی انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۷ء دو مرتبہ پنجاب اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کے منصب پر بھی منتخب ہوئے ۲۰۰۲ء کا انتخاب انہوں نے پنجاب مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر جیتا تھا۔ (۱۳)

حوالہ جات

۱۔ سر لیپل ایچ گرفین، کرنل میسی، تذکرہ روسائے پنجاب۔ ترجمہ نوازش علی۔ لاہور۔ جلد اول۔ ص ۵۹۹ تا ۶۰۴

۲۔ امتیاز اعوان۔ لاہور کے انتخابی معرکے۔ روز نامہ جنگ لاہور۔ ۲ر نومبر ۱۹۸۸ء

۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۱۸

۴۔ پنجاب کے انتخابی نتائج کی غیر سرکاری تفصیلات۔ ہفتہ روزہ زندگی لاہور۔ ۱۴ تا ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۲ تا ۱۵

۵۔ پنجاب اسمبلی ۱۹۸۷ء۔ گولڈن جوبلی سوونیئر۔ لاہور۔ ص ۸۹

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۲۶، ۲۲۷

۷۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۰۶

۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء جلد دوم۔ ص ۴۸

۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ ص ۲۱۸، ۲۲۶

۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء جلد دوم۔ ص ۲۱۹

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۸

۱۲۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۷ر اکتوبر ۲۰۰۵ء

۱۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۳۷

نوابزادے

گجرات کا نوابزادہ خاندان ایک طویل عرصہ تک گجرات کی سیاست پر نمایاں رہا ہے۔ یہ ذات کے گوجر ہیں اور راجہ جے پال کی اولاد میں سے ہیں۔ راجہ جے پال ان کھتانوں کا مورث اعلیٰ تھا' جنہوں نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جبکہ سلطان مسعود نے اس علاقے کے جنوبی حصہ پر حملہ کیا تھا۔

سر لیپل ایچ گرفین اور کرنل میسی' تذکرہ رؤسائے پنجاب میں لکھتے ہیں :

پنجاب کے الحاق کے موقع پر اجنالہ کا سب سے بڑا زمیندار چودھری سلطان علی ذیلدار اس قبیلہ کا سرکردہ یا میر گروہ تھا۔ جولائی ۱۸۵۴ء میں جب معافیات کی تحقیقات ہوئی تو چودھری سلطان علی نے اجنالہ کی نصف معافی کا دعویٰ کیا جس کی مالیت ۳۲۵ روپیہ تھی اور جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت سے حاصل کر رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جب دیوا کے چبوں نے موضع دوکوہا پر حملہ کیا تو سلطان علی خاں اپنے قبیلہ کے ایک ہزار جوان لے کر سرکار کی امداد پر آمادہ ہو گیا اور ان آدمیوں کی خدمات کا کوئی معاوضہ نہ لیتے ہوئے اس نے ضلع گجرات کے اس حصہ کی حفاظت کی جو کشمیر کی سرحد سے ملتا ہے۔ سلطان علی کے یہ جوان دہلی بھی گئے جہاں یہ محاصرہ میں بہت مفید ثابت ہوئے ان خدمات کے صلہ میں اس کی معافی یا انعام کے دعویٰ پر پھر غور کیا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو گورنر جنرل بالقابہ کی طرف سے موضع دھندا کلاں بطور جاگیر عطا ہوا۔ چودھری سلطان علی ایک مستعد اور بڑا ہوشیار ذیلدار تھا۔ اور اس نے ۱۸۷۲ء کی وبائے ہیضہ کے دوران میں بڑی قابل قدر امداد دی۔ اس نے تعلیم حاصل کرنے اور ٹیکہ لگوانے کے لئے اپنے علاقہ کے لوگوں کو آمادہ کیا یہ کرسی نشین تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی کو ۱۸۷۷ء میں اچھی سرکاری خدمات کے صلہ میں ایک سند عطا ہوئی۔

چودھری سلطان علی نے تین بیٹے محمد خاں' احمد خاں اور فضل علی چھوڑے۔ سب سے بڑا محمد خاں پیرو شاہ کا ذیلدار تھا۔ اس نے جنگ عظیم کے دوران میں ایک ہزار روپیہ قرضہ جنگ میں

دیا۔ ۸ ہزار روپیہ اسی مد میں جمع کیا اور قریباً ایک ہزار رنگروٹ دیئے اس کو ایک اعزازی تلوار۔ ایک تمغہ جنگ اور ایک خلعت عطا ہوئے اور ۱۹۱۹ء کی شورشوں کے بعد اسے ۲۵۰ روپیہ کی ایک جاگیر اور خان صاحب کا خطاب عطا ہوئے۔ یہ آنریری مجسٹریٹ ریڈ کراس سوسائٹی کا نائب سرپرست اور سینٹ جان ایمبولنس ایسوسی ایشن کا کونسلر تھا اور اسے ۱۹۲۷ء میں "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا۔ اسی سال یعنی ۱۹۲۷ء میں اس کا انتقال ایک نابالغ لڑکا عطا الٰہی چھوڑ کر ہوا جو ابھی دو سال ہی کا تھا کہ اسے اس کی جگہ ذیلدار بنا دیا گیا۔ چودھری سلطان علی کا دوسرا بیٹا چودھری احمد خاں اپنے چھوٹے بھائی فضل علی کی جگہ بطور سربراہ ذیلدار اور علاقہ وار باربرداری کام کرتا رہا اور ۵۵ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔

خان بہادر نواب فضل علی ابھی چار سال کا تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور یہ اپنے باپ کی ایک وصیت کے مطابق ذیلداری اور جاگیر کا جانشین ہوا۔ اس نے سکاچ مشن سکول گجرات (جہاں یہ کرکٹ کا کپتان تھا) میں تعلیم حاصل کی جس کے بعد اسے ۱۸۹۶ء میں پراونشل درباری اور اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں سب رجسٹرار گجرات بنا دیا گیا اور اس کے بعد گجرات کا آنریری مجسٹریٹ مقرر ہونے پر اس نے سب رجسٹراری کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس نے چترال کی لڑائی میں محکمہ نقل و حمل میں بڑی امداد کی۔ اسے ۱۹۰۲ء میں گھوڑی پال شرائط پر ساڑھے دس مربعہ عطا ہوئے اور ۱۹۰۹ء میں خان بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں اسے جنتری گرانٹ کے طور پر دس مستطیل مزید عطا ہوئے۔

جنگ عظیم کے دوران میں نواب فضل علی نے ۱۵۰۰ سے زیادہ رنگروٹ اور قرضہ جنگ میں ۲ ہزار روپیہ دیا اور اس کے علاوہ ۱۰ ہزار روپیہ کی مزید رقم اسی امد میں جمع کی۔ اس کے خاندان نے رسالہ کے لیے ایک پورا ترب بھی مہیا کیا۔ ان خدمات کے صلہ میں اسے ایم پی ای کا خطاب ایک اعزازی تلوار، ایک خلعت اور تمغہ جنگ عطا ہوئے۔ یہ پہلے گجرات میونسپلٹی کا وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوا اور اس کے بعد سب سے پہلا غیر سرکاری پریذیڈنٹ ہو گیا اور اس عہدہ سے اس نے ۱۹۴۷ء میں استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۰۶ء میں نواب فضل علی نے ضلع گجرات میں امداد باہمی کی تحریک شروع کی اور ۱۹۱۹ء میں اجنالہ سنٹرل کوآپریٹو بنک کا پریذیڈنٹ مقرر ہوا اور یہ پنجاب کوآپریٹو یونین کا وائس پریذیڈنٹ بھی رہا۔ یہ ۱۹۲۶ء میں گجرات ڈسٹرکٹ بورڈ کا پریذیڈنٹ ہوا اور اس طرح یہ پنجاب میں سب سے پہلا غیر سرکاری پریذیڈنٹ تھا۔ ۱۹۲۸ء میں اسے ۵۰۰ روپیہ کی جاگیر عطا ہوئی جس پر ۱۹۳۷ء میں ۲۵۰ روپیہ کی ایک اور جاگیر کا اضافہ کیا گیا اسے ۱۹۳۲ء میں نواب کا معزز خطاب عطا ہوا اور اس کے ایک سال بعد او بی ای کا خطاب عطا ہوا۔

نواب فضل علی نے ضلع میں رفاہ عامہ کی متعدد تحریکیں شروع کیں اور ایک ہائی اسکول

قائم کیا جس کا نام زمیندارہ ہائی اسکول تھا۔ بعد ازاں اس اسکول کو کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ (۱)
۱۹۳۷ء میں وہ یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۲)

نواب فضل علی کے دو بیٹے نوابزادہ مہدی علی خاں اور نوابزادہ اصغر علی خاں تھے۔ نوابزادہ مہدی علی خان نے ۱۹۵۱ء میں پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ مگر پھر اس کے بعد سیاست کے میدان میں ان کا نام کہیں نظر نہیں آیا۔ ان کے بیٹے چوہدری ظفر مہدی نے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں حصہ لیا۔ ان کا مقابلہ اپنے کزن چوہدری محمد نواز سے ہوا۔ جنہیں ان انتخابات میں چوہدری ظہور الٰہی کی حمایت حاصل تھی۔ یہ معرکہ چوہدری نواز کے ہاتھ رہا۔

چوہدری ظفر مہدی بعد ازاں اپنے چچا نوابزادہ اصغر علی کے ہمراہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور ۱۹۷۷ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست پر چوہدری ظہور الٰہی کو زبردست شکست سے دوچار کیا۔

نواب فضل علی کی سیاسی وراثت صحیح معنوں میں ان کے چھوٹے صاحبزادے نوابزادہ اصغر علی خان نے سنبھالی۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اپنے والد کی وفات پر ۱۹۴۲ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۶ء میں پنجاب اسمبلی کی رکنیت حاصل کی۔ دونوں مرتبہ انہیں یونینسٹ پارٹی کی حمایت حاصل تھی مگر جب انہوں نے مسلم لیگ کا ستارہ عروج پر دیکھا تو وہ یونینسٹ پارٹی چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۵۱ء میں بھی وہ مسلم لیگ ہی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۳)

۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کے قیام کے بعد جو انتخابات منعقد ہوئے ان میں نواب زادہ اصغر علی خاں کامیاب نہ ہو سکے۔ (۴) اس وقت تک ان کے حریف چوہدری فضل الٰہی اور چوہدری ظہور الٰہی گجرات کی سیاست میں اپنے قدم جمانا شروع کر چکے تھے۔

کچھ عرصے بعد جب مغربی پاکستان اسمبلی میں ری پبلکن پارٹی وجود میں آئی تو چوہدری فضل الٰہی اور چوہدری ظہور الٰہی اس نوزائیدہ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ جس کے صلے میں مخدوم زادہ سید حسن محمود نے نوابزادہ اصغر علی کی جگہ چوہدری ظہور الٰہی کو گجرات ڈسٹرکٹ بورڈ کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ نواب زادہ اصغر علی نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے مسلم لیگ کے صدر خان عبدالقیوم خاں کو گجرات مدعو کیا اور ان کا ۳۲ میل لمبا جلوس نکالا۔۔۔ مگر چند ہی روز بعد مارشل لاء نافذ ہو گیا اور تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عاید کر دی گئی۔ (۵)

۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں نوابزادہ اصغر علی کو زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی اور ان کا مخالف گروپ، چوہدری ظہور الٰہی کی قیادت میں گجرات کی سیاست پر پوری طرح قابض ہو گیا۔ (۶) کچھ ہی عرصہ بعد نوابزادہ اصغر علی کی قسمت کا ستارہ پھر چمکا اور ان کی خوش قسمتی سے مغربی

پاکستان کے مطلق العنان گورنر نواب کالاباغ اور چوہدری ظہور الٰہی میں ان بن ہو گئی۔ نواب کالا باغ نے چوہدری ظہور الٰہی کو نیچا دکھانے کے لئے نوابزادہ اصغر علی کی سرپرستی شروع کر دی اور انہیں کنونشن مسلم لیگ میں شامل کر لیا۔ یوں نواب زادہ صاحب ۱۹۶۵ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۷)

ایوب خاں کے زوال کے بعد نواب زادہ اصغر علی خاں نے دوبارہ قیوم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں خم ٹھونک کر چوہدری ظہور الٰہی کا مقابلہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر ہفت روزہ زندگی نے اپنے ایک انتخابی تجزیئے میں تحریر کیا:

"نوابزادہ اصغر علی بھی عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے والد نے گجرات میں زمیندارہ کالج قائم کیا' اس اعتبار سے ان کا شہر میں خاصا اثر ہے مگر ایوب خان کے سیاسی انتقال کے بعد ان کی وفاداریوں میں مسلسل تغیر آتا رہا۔ اب یہ عالم ہے کہ ایک طرف قیوم لیگ سے آشنائی ہے تو دوسری طرف پیپلز پارٹی سے خفیہ یارانہ ہے۔ پیپلز پارٹی نے ان کی سفارش پر گجرات میں ٹکٹ دیئے ہیں۔ اصغر گورال جو پیپلز پارٹی میں اور صوبائی نشست سے انتخاب لڑ رہے ہیں وہ نوابزادہ اصغر علی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ احمدیہ جماعت بھی نوابزادہ صاحب کی پشت پناہ بنی ہوئی ہے۔" (۸)

اس انتخاب میں نوابزادہ اصغر علی ناکام ہو گئے۔ جلد ہی انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

۱۹۷۹ء میں نوابزادہ اصغر علی کے صاحبزادے نواب زادہ مظفر علی نے ضلع کونسل گجرات کی چیئرمین شپ کے انتخاب میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۸۱ء میں ان کے بڑے بھائی نوابزادہ مظہر علی خان وفاقی مجلس شوریٰ کے رکن بنا دیئے گئے۔ نوابزادہ مظہر علی ۱۹۷۷ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہو چکے تھے۔ (۹)

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات سے پہلے حکام بالا نے نوابزادہ خاندان اور چوہدری خاندان کے درمیان ایک معاہدہ کروایا۔ جس کی رو سے گجرات کی ایک قومی اور ایک صوبائی نشست نوابزادہ خاندان کو ایک قومی اور ایک صوبائی نشست چوہدری خاندان کو مل گئی یوں نوابزادہ خاندان کے نوابزادہ مظہر علی قومی اسمبلی کے اور نوابزادہ مظفر علی صوبائی اسمبلی کے بلامقابلہ رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۰) نوابزادہ مظہر علی اس سے قبل ۱۹۷۷ء میں بھی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۱۱)

۱۹۸۸ء میں نوابزادہ خاندان نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور نواب زادہ مظہر علی نے این اے ۸۰ گجرات ا سے قومی اسمبلی کا اور ان کے بھائی نوابزادہ غضنفر علی گل نے پی پی ۹۲ گجرات ۲ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس انتخاب میں نوابزادہ مظہر علی خاں تو چودھری

تجمل حسین سے شکست کھا گئے مگر نواب زادہ غضنفر علی گل اسلامی جمہوری اتحاد کے چودھری غلام سرور کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۲)

۱۹۹۰ء میں نوابزادہ غضنفر علی گل کو پی ڈی اے نے قومی اسمبلی کی اسی نشست پر اپنا امیدوار نامزد کیا جس پر ۱۹۸۸ء میں ان کے بڑے بھائی نواب زادہ مظہر علی خاں نے شکست کھائی تھی۔ مگر اس مرتبہ پھر چوہدری تجمل حسین کا پلہ بھاری رہا اور نوابزادہ غضنفر علی گل تقریباً اکتیس ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۳) نوابزادہ غضنفر علی گل کے بھائی نوابزادہ مظفر علی نے ۱۹۸۸ء میں نوابزادہ غضنفر علی گل سے شکست کھانے والے امیدوار چودھری غلام سرور کا مقابلہ کیا۔ مگر اس مرتبہ غلام سرور کا پلہ بھاری رہا اور نوابزادہ خاندان اس صوبائی نشست سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ (۱۴)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں نوابزادہ غضنفر علی گل نے این اے ۸۰ گجرات ا سے چوہدری شجاعت حسین کا مقابلہ کیا اور انہیں تقریباً پانچ ہزار ووٹوں سے شکست دی (۱۵) جب کہ ان کے بھائی نوابزادہ مظہر علی نے پی پی ۹۳ گجرات ۲ سے چوہدری غلام سرور کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی تک رسائی حاصل کر لی (۱۶)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں نوابزادہ غضنفر علی گل نے قومی اسمبلی کی نشست پر چودھری تجمل حسین کے صاحبزادے چودھری مبشر حسن سے (۱۷) اور ان کے بھائی نوابزادہ مظہر علی نے صوبائی اسمبلی کی نشست پر چودھری غلام سرور سے شکست کھائی۔ (۱۸)

۲۰۰۲ء میں قومی اسمبلی کی نشست پر نوابزادہ غضنفر علی گل کو چودھری وجاہت حسین کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ (۱۹) جبکہ نوابزادہ مظہر علی نے انتخابات میں حصہ ہی نہیں لیا۔ ان کے بجائے ان کے حلقے سے ایک اور نام نوابزادہ مظفر علی کا نظر آیا جو پاکستان پیپلز پارٹی (پارلیمنٹرین) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے لیکن پاکستان مسلم لیگ (ق) کے خالد اصغر گھرال سے شکست کھا گئے۔ (۲۰)

حوالہ جات

۱۔ سر لیپل ایچ گرفین۔ کرنل میسی تذکرہ رؤسائے پنجاب۔ ترجمہ سید نوازش علی۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۲۴۹ تا ۲۵۱

۲۔ کرپال سی یادیو۔ الیکشنز ان پنجاب۔ ۱۹۲۰ء۔ ۱۹۴۷ء۔ نئی دہلی۔ ص ۹۰

۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۸۰

۴۔ پرویز حمید۔ چودھری ظہور الٰہی۔ جنگ میگزین (روزنامہ جنگ) لاہور۔ ۴ر تا ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۱۔ ص ۵

۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۸۰

۶۔ پرویز حمید۔ چودھری ظہور الٰہی۔ جنگ میگزین (روزنامہ جنگ) لاہور۔۴ر تا ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۱۔ ص ۵۔

۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۸۰

۸۔ الطاف حسن قریشی۔ پنجاب کا انتخابی جائزہ۔ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۷ر تا ۱۳ر دسمبر ۱۹۸۰ء۔ ص ۸

۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۸۰، ۱۸۱

۱۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۱۸۱

۱۱۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔۲۴ر مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۳۵۴

۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۱۷۹، ۱۸۹

۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۴۱

۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۲۰۰

۱۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۷۴

۱۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۹۰

۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۶۶

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ۲۷۰

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ ص ۴۱

۲۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ ص ۱۵۴

نکئی

لاہور سے بذریعہ سڑک ملتان جاتے ہوئے بھائی پھیرو سے تقریباً ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک سٹاپ بھوئینکے آتا ہے۔ یہاں سے شمال مغرب کی طرف تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں بہڑوال واقع ہے اس چھوٹے سے گاؤں کی زیادہ تر آبادی تقسیم ہند کے بعد پاکستان آنے والے مہاجر خاندانوں پر مشتمل ہے اس گاؤں کی تاریخ ہی دراصل نکئی خاندان کی تاریخ ہے۔

پنجاب کی تاریخ میں نکئی خاندان کا ذکر دیگر بہت سے حوالوں کے علاوہ سیاسی خاندان کے طور پر بھی موجود ہے جبکہ اس خاندان کے سکھ ارکان نے بھارت کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا جو تقسیم ہند کے وقت بھارت چلے گئے تھے۔

''بہڑ وال'' گاؤں کو پندرھویں صدی کے آخر میں آروڑا قوم کے ایک شخص ''بہڑ'' نے آباد کیا اور اس کے نام پر گاؤں کا نام بہڑوال مشہور ہوا۔

روایت کے مطابق سکھ مذہب کے پانچویں گروشری گرو ارجن دیو جی اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ننکانہ صاحب شیخوپورہ سے قصور جاتے ہوئے اس گاؤں بہڑوال میں آرام کیلئے ٹھہرے۔ یہاں کے لوگوں نے گاؤں کے لوگوں کی کوئی خاطر مدارت نہ کی تو گرو جی بہڑوال میں قیام کا ارادہ ملتوی کر کے قریبی گاؤں جمبر چلے گئے۔ جہاں کے لوگوں نے بہڑوال کے برعکس گرو جی کو پر جوش انداز میں خوش آمدید کہا۔ سفر کی تھکن سے نڈھال گروشری ارجن دیو جی آرام کی غرض سے چارپائی پر لیٹ گئے۔

روایت کے مطابق بہڑوال کا چوہدری ہیمراج جو گرو جی کی آمد کے وقت گاؤں میں موجود نہ تھا جب آیا تو اور گرو جی کو سوتا ہوا سمجھ کر ان کی چارپائی کو اٹھا کر جمبر سے بہڑوال لے آیا۔ چوہدری ہیمراج کے اس عمل سے گرو جی بہت خوش ہوئے اور پینے کے لئے پانی مانگا تو انہیں بتایا گیا کہ گاؤں کے اکلوتے کنویں کا پانی کھارا (کڑوا) ہے جس پر گروشری ارجن دیو جی نے گڑ کی ایک ڈلی منگوائی اور کنویں میں ڈال دی جس سے کنویں کا پانی فوراً میٹھا ہو گیا جو آج تک میٹھا ہے۔ اس موقع پر گرو جی نے ہیمراج کو دعا دی تھی اور پیشین گوئی کی تھی کہ تیرے گھر میں ایک ایسا بیٹا پیدا ہو گا جو بڑا طاقتور

رئیس بنے گا۔

بعض تاریخی کتب کے مطابق اس واقعہ کے فوراً بعد ۱۵۹۵ء میں اس خاندان نے گرو ارجن کے ہاتھ پر سکھ مذہب اختیار کر لیا۔

بہڑوال میں یہ روایت آج بھی مشہور ہے اور لوگوں کا آج بھی اس پر اعتقاد ہے کہ کنویں کا پانی گرو شری ارجن دیو جی کے کرشمہ سے میٹھا ہوا۔ یہ کنواں ''کھو بڈے والا'' کے نام سے مشہور ہے اور آج بھی بہڑوال کے گردوارہ پنجم پادشاہی'' کے احاطہ میں موجود ہے۔

گرو ارجن جی کی وفات ۱۶۰۶ میں ہوئی جس کے تقریباً ایک سو سال بعد چوہدری ہیمراج کے خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ہیرا سنگھ رکھا گیا جسے روایت کے مطابق گرو ارجن کے دعا اور پیش گوئی کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔

اسی ہیرا سنگھ نے اٹھارویں صدی کے وسط میں لاہور سے گوگیرہ کے درمیانی علاقے پر قبضہ کر لیا اور وسیع وعریض جاگیر پر اکیلا حکمران بن گیا۔

ہیرا سنگھ کی جاگیر کا علاقہ ''نکا'' پنجابی زبان میں کنارے یا دہانے کو کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ چونکہ راوی کے کنارے کا علاقہ تھا اس لئے اس کو نکا اور اس پر حاکم خاندان کو ''نکے والے سردار'' کہا جانے لگا۔

ہیرا سنگھ نے اپنی جاگیر کو مزید وسعت دینے کے لیے ایک جنگجو گروہ بنایا جس کے ذریعے اس نے آس پاس کے علاقوں پر حملہ آور ہو کر چھوٹے زمینداروں اور سرداروں کی جاگیروں میں اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ یہ جنگجو گروہ ''نکئی مسل'' یعنی نکے والے سرداروں کا گروہ کے نام سے مشہور ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس گروہ نے چونیاں پر قابض افغانوں کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا اور اس طرح یہ مسل ایک طاقتور گروہ کی صورت میں سامنے آئی۔

ہیرا سنگھ کی بڑھتی ہوئی طاقت کے بل پر کھیوں اور بھنگیوں سے مل کر مغل سلطنت کے خالف بغاوت کر دی اور بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

روایت کے مطابق گرو شری ارجن دیو جی نے پیش گوئی کی تھی کہ ''ہیرا سنگھ نام سکھ بچہ بڑا ہو کر مسلمان فقیر سے الجھ پڑے گا لیکن یہ اس کے اختیار میں ہو گا اگر وہ اس موقع کو ٹال دے گا تو ہندوستان کا حکمران بنے گا ورنہ دوسری صورت میں مارا جائے گا۔'' اور پھر گرو ارجن کی پیشین گوئی سچ ہوئی اور جب ہیرا سنگھ نے پاک پتن کے حکمران اور سجادہ نشین شیخ شجاع چشتی کے علاقہ پر حملہ کیا تو اس لڑائی میں ہیرا سنگھ مارا گیا۔

ہیرا سنگھ کی موت کے وقت اس کا بیٹا دل سنگھ ابھی کم سن تھا اس لئے ہیرا سنگھ کا بھتیجا نار سنگھ مسل کا حکمران بنا۔ اس خاندان کو اب بھی علاقوں میں فتوحات اور لوٹ مار کا چسکا پڑ چکا تھا اور اس

مسل کا ہر حکمران اپنی جاگیر میں اضافہ کرنے کے درپے رہتا۔

مسل کا نیا حاکم نار سنگھ بھی کوٹ کمالیہ کے ایک معرکہ میں مارا گیا۔ نار سنگھ کا کی موت کے بعد اس کا بھائی رن سنگھ حکمران بنا جس نے اپنی جاگیر کو مزید وسعت دی اور مسل کی طاقت میں بھرپور اضافہ کیا۔ رن سنگھ کے دور میں مسل کے قبضے میں 9 لاکھ روپے مالیت کی جاگیر تھی اور ان کے قبضے میں۔ چونیاں، قصور، شرقپور اور گوگیرہ کا علاقہ تھا۔ کھرل قوم کا صدر مقام کوٹ کمالیہ بھی کچھ عرصہ نکئی مسل کی عملداری میں رہا اس وقت نکئی خاندان کے پاس چار ہزار ایکڑ سے زائد اراضی تھی۔

نکئی مسل اور قریبی علاقوں پر قابض خاندان سید والوں جو سکھ کی پرانی دشمنی تھی۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان کئی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ لیکن دونوں گروہ چونکہ طاقتور کے اعتبار سے برابری پر تھے اس لئے دونوں میں سے کوئی کسی کو فتح نہ کر سکا۔

آخر کار جب سید والوں کا سردار قمر سنگھ بوڑھا ہو گیا۔ تو رن سنگھ نکئی نے سید والوں کو فتح کر لیا۔ رن سنگھ ۱۷۸۱ء میں انتقال کر گیا۔ رن سنگھ کے بعد اس کا بڑا بیٹا بھگوان سنگھ نکئی مسل کا سردار بنا جو کہ بزدل اور کمزور ثابت ہوا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سید والا کے سردار قمر سنگھ (جو کہ انتقال کر چکا تھا) کے بھائی نے نکئی مسل پر حملہ کر کے نہ صرف سید والا کو نکئی مسل سے واگذار کر لیا بلکہ نکئی مسل کے کوئی مواضعات پر قبضہ کر لیا بھگوان سنگھ جتنا کمزور اور بزدل تھا اتنا ہی بڑا سیاستدان اور منصوبہ بندی کر کے چلنے والا تھا۔

انسائیکلو پیڈیا آف سکھ لٹریچر کے مطابق یہ سوچ کر بھگوان سنگھ نکئی نے اپنی چھوٹی بیٹی راج کور کی منگنی گوجرانوالہ کی طاقتور مسل سوکر چاکیہ کے کمیدان سردار مہان سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ سے کر دی۔ یہ مسل اس وقت پنجاب کی سب سے طاقتور مسل تھی سید والا کے وزیر سنگھ نے اس نسبت کو ختم کرانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے باپ مہان سنگھ نے سید والا کے وزیر سنگھ اور نکئی مسل کے بھگوان سنگھ کے ۱۷۸۵ء میں امرتسر بلایا اور جے سنگھ کھیا کے خلاف ان کی مدد طلب کی جس پر دونوں آمادہ ہو گئے اور مہان سنگھ کو ان کی مدد سے فتح حاصل ہوئی مگر مال غنیمت کی تقسیم پر بھگوان سنگھ اور وزیر سنگھ میں تکرار ہوئی مگر مہان سنگھ نے دونوں میں صلح کرادی مگر یہ تکرار اس حد تک بڑھ گئی کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار بند ہو گئے اور دونوں کی فوجیں ٹکرا گئیں۔ اس لڑائی میں بھگوان سنگھ نکئی مارا گیا۔ بھگوان سنگھ کی موت کے بعد اس کا بھائی گیان سنگھ نکئی مسل کا حاکم بنا۔ اسی دوران ہیرا سنگھ کا بیٹا دل سنگھ بھی جوان ہو چکا تھا سکھ ہسٹری کے مصنف کے مطابق ایک روز وزیر سنگھ بہڑوال میں آدھمکا جس کو دیکھ کر ہیرا سنگھ کے بیٹے دل سنگھ اس پر حملہ آور ہوا اور اسے مدت کی گھاٹ اتار دیا۔ جس سے نکئی مسل کا پرانا دشمن ختم ہو گیا۔ وزیر سنگھ کو قتل ہوتا دیکھ کر اس کے ایک ملازم نے قتل کے بعد فرار

ہوتے ہوئے دل سنگھ کا پیچھا کر کے اسے قتل کر دیا۔ اس خون خرابے سے نکئی مسل اور کمزور ہو گئی۔

اس دوران رنجیت سنگھ نے ''تخت لاہور'' پر قبضہ کر لیا جس سے نکئی سرداروں کو حوصلہ ہوا کہ چونکہ رنجیت سنگھ چونکہ نکئی مسل کا داماد ہے۔ اس لئے انہیں اپنی کھوئی ہوئی جاگیریں واپس مل جائیں گی۔ مگر نکئی سرداروں کا یہ خیال ''دیوانے کا خواب'' ثابت ہوا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے غیر متوقع طور پر خود پیش قدمی کرتے ہوئے نکئی مسل کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور پھر آہستہ آہستہ نکئی مسل کا پورا علاقہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں آ گیا۔

۱۸۰۲ء میں مہارانی راج کور کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام کھڑک سنگھ رکھا گیا جو بعد میں پنجاب تخت پر براجمان ہوا اور مہاراجہ کھڑک سنگھ کہلایا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نکئی مسل کے سردار بھگوان سنگھ کی وفات کے بعد خاندان نکئی کے نئے سردار کاہن سنگھ کو حکم دیا کہ وہ اس کے دربار میں حاضر رہا کرے جس سے کاہن سنگھ نے انکار کر دیا۔ جس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نکئی مسل کی باقی ماندہ جاگیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور کاہن سنگھ کو بہڑوال کے گرد و نواح میں ۱۵ ہزار مالیت کی جاگیر بطور پنشن دے دی۔

اس کے بعد نکئی خاندان جو کہ علاقہ میں سب سے امیر اور طاقتور خیال کیا جاتا تھا اپنے ہی داماد کے ہاتھوں زیادتیوں کا شکار ہو کر اپنے گرد و نواح کی اس جاگیر تک ہی محدود ہو کر رہ گیا جو انہیں زندگی گزارنے کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بطور پنشن عطا کیں تھیں۔

۱۸۹۱ء میں سردار رنجودھ سنگھ فوت ہوا تو اس کا بڑا لڑکا اودھم سنگھ سردار بنا اور دو ہزار روپے جاگیر اور پراونشل درباری مقرر ہوا۔ ۱۹۰۹ء میں اودھم سنگھ کی وفات کے بعد بلونت سنگھ جاگیردار ہوا جو ۱۹۱۰ء مین انتقال کر گیا۔ اس کے بعد ہرموہن سنگھ نکئی کا جانشین مقرر ہوا۔ اور ۱۹۱۱ء میں انتقال کر گیا۔ اس سے پہلے ہرموہن سنگھ کا بھائی اودھم سنگھ کا بھائی جو تحصیلدار تھا فوت ہوا۔ اس کے بعد عطر سنگھ اور ایشر سنگھ نکئی کا دور آتا ہے جو کہ پر امن تھا اور اس دور میں نکئی خاندان کو کئی جاگیریں واپس ملیں۔

گوجرانوالہ کے ایک گاؤں اروپ کی ایک روحانی شخصیت خواجہ برکت علی کی کرامات دیکھ کر سردار ایشر سنگھ نکئی اور سردار عطر سنگھ نکئی مسلمان ہو گئے۔ ایشر سنگھ کا اسلام نام عبدالعزیز نکئی جبکہ سردار عطر سنگھ نکئی کا نام خدا بخش نکئی رکھا گیا۔

ایشر سنگھ کا انتقال جو عبدالعزیز نکئی ہو چکے تھے ۱۹۲۳ء میں ہوا، ان کے بڑے بیٹے کا نام سردار دین محمد نکئی تھا جو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر چونیاں اور ضلع منٹگمری (ساہیوال) رہے۔ دوسرے بیٹے محمد اکبر نکئی تھے جو ذیلدار اور آنریری مجسٹریٹ ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کے وقت نکئی خاندان کے سکھ افراد بھارت چلے گئے اور بھارت میں اعلیٰ حکومتی عہدوں پر فائز رہے جبکہ پاکستان میں موجود مسلمان نکئی خاندان نے باقاعدہ سیاست

میں حصہ لینا شروع کیا اور اپنی جاگیر پر زراعت کے جدید طریقوں کے مطابق کاشتکاری شروع کر دی۔

سیاست کے میدان میں قدم رکھنے والے نکئی خاندان کے پہلے فرد سردار عبدالحمید نکئی تھے جو ۱۹۵۱ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اس کے بعد انہوں نے ۱۹۵۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۹۶۲ء میں بی ڈی سسٹم کے تحت قومی اسمبلی کے انتخابات میں نکئی خاندان کے سردار عبدالحمید نکئی قومی اسمبلی کے حلقہ این ڈبلیو ۳۸ لاہور سے رکن منتخب ہوئے۔ ان انتخابات میں سردار عبدالحمید نکئی نے معین الدین لکھوی کو شکست دی۔ سردار عبدالحمید بعد ازاں کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

۱۹۶۵ء کے انتخابات میں سردار عبدالحمید نکئی نے کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے حلقہ این ڈبلیو ۴۱۔ لاہور سے چوہدری محمد سعید کو شکست دی اور ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔(۱) ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سردار عبدالحمید نکئی نے حصہ ہی نہیں لیا۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں وہ این اے ۱۹ قصور۔۳ سے رانا پھول محمد خان کو شکست دے کر ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔(۲)

۱۹۸۵ء کے انتخابات میں سردار عبدالحمید نکئی کے صاحبزادے سردار طالب حسین نکئی نے پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ رانا پھول محمد خان سے شکست کھا گئے۔(۳)

۱۹۸۸ء میں سردار طالب حسین نکئی نے اپنے والد کے حلقہ انتخاب سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار تھے۔ اس انتخاب میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار ملک عاشق حسین اعوان کو شکست دے کر کامیاب ہو گئے۔(۴) ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے آزاد امیدوار رانا محمد حیات خان کے ہاتھوں شکست کھائی۔(۵) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں کامیابی نے ان کے قدم چومے لیکن ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں وہ رانا محمد حیات خان کے ہاتھوں دوبارہ شکست کھا گئے۔ رانا محمد حیات خان کو اس مرتبہ پاکستان مسلم لیگ (ن) نے ٹکٹ دیا تھا۔ جبکہ طالب حسین نکئی پاکستان مسلم لیگ (ج) کے امیدوار تھے۔(۶)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں سردار طالب حسین نکئی نے حصہ نہیں لیا اور قصور سے قومی اسمبلی کی دو نشستیں عارف حسین نکئی کے بیٹے آصف نکئی نے جیت لیں۔ بعدازاں آصف نکئی کی خالی کردہ نشست این اے ۱۴۲ قصور ۵ پر منعقد ہونے والے ضمنی انتخاب میں اس نشست پر سردار طالب حسین نکئی قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔(۷)

سردار طالب حسین نکئی ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۷ء میں قصور ضلع کونسل کے رکن بھی منتخب ہو چکے ہیں۔(۸)

سردار عبدالحمید نکئی کے کزن اور برادر نسبتی سردار عارف حسین نکئی تھے جو سردار دین محمد نکئی کے صاحبزادے اور سردار عبدالعزیز نکئی (ایشر سنگھ) کے پوتے تھے۔

سردار عارف حسین نکئی نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ۱۹۷۰ء میں جمیعت علمائے پاکستان کے پلیٹ فارم سے کیا تاہم اس انتخاب میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور قومی اسمبلی کی نشست پر پاکستان پیپلز پارٹی کے شفاعت چوہان سے بری طرح شکست کھا گئے۔(۹) ۱۹۷۷ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر چونکہ قومی اتحاد نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا اس لیے سردار عارف حسین نکئی بھی اس لہر کی زد میں آگئے اور کامیاب نہ ہو سکے۔(۱۰)

۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخاب میں وہ قصور ضلع کونسل کے واس چیئرمین منتخب ہوئے تاہم ۱۹۸۳ء میں وہ اسی کونسل کی چیئرمینی کا انتخاب ہار گئے۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں وہ پی پی ۱۱۵ قصور ۶ سے پہلی مرتبہ پنجاب اسمبلی کا انتخاب جیتنے میں کامیاب ہوئے۔(۱۱) ۱۹۸۸ء میں سردار عارف نکئی اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ہوگئے۔ وہ نہ صرف اس انتخاب میں کامیاب ہوئے بلکہ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں بھی کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ ۱۹۸۵ء سے ۱۲ر ستمبر ۱۹۹۵ء تک انہوں نے نہ صرف ہر صوبائی حکومت میں وزیر مال کے حیثیت سے خدمات انجام دیں بلکہ پنجاب کی دھڑے بندی کی سیاست میں بھی اہم کردار ادا کیا۔(۱۲)

۱۳ر ستمبر ۱۹۹۵ء کو وٹو حکومت کے خاتمے کے انہیں اچانک پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا اور یوں ایک نسبتاً غیر معروف نام، قومی سطح پر اہمیت اختیار کر گیا۔(۱۳)

سردار عارف حسین نکئی اپنے اس منصب پر ۳ر نومبر ۱۹۹۶ء تک فائز رہے انہوں نے ۱۹۹۷ء میں بھی پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر اس مرتبہ ان کی قسمت یاوری نہ کر سکی اور وہ اپنی اس نشست پر، جس پر ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۳ء تک چار مرتبہ کامیاب ہو چکے تھے۔ رانا محمد حیات خان کے ہاتھوں تقریباً ۱۲ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ ان انتخابات میں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست پر بھی انتخاب لڑا مگر اس نشست پر بھی ناکامی ہی ان کا مقدر بنی۔(۱۴)

۲۹ر فروری ۲۰۰۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔(۱۵)

سردار عارف حسین نکئی کی وفات کے بعد ان کے دو صاحبزادگان سیاست کے میدان میں نمایاں ہوئے۔ ان میں سے بڑے بھائی سردار پرویز حسن نکئی ہیں جو اگرچہ ۱۹۹۰ء ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء کے انتخابی عمل میں بھی شریک ہوئے تھے مگر کامیابی نے ان کے قدم پہلی مرتبہ ۲۰۰۲ء میں چومے جب وہ پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہوئے۔(۱۶)

پرویز حسن نکئی کے چھوٹے بھائی سردار محمد آصف نکئی ہیں جنہوں نے ۲۰۰۲ء میں این اے ۱۴۱

قصور۴ اور این اے ۱۴۲ قصور ۵ سے بیک وقت انتخاب لڑا ور دونوں ہی نشستوں پر کامیاب ہوئے۔ (۱۷) بعد ازاں انہوں نے این اے ۱۴۲ قصور ۵ خالی کر دی جس پر ضمنی انتخاب میں سردار طالب حسین نکئی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔(۱۸)

حوالہ جات

۱۔ احمد سلیم، معظم رضا تبسم۔ ممدوٹ سے وٹو تک۔ لاہور۔ ص ۲۹۳ تا ۲۹۹
۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۱۵۴، ۱۵۵
۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۱۵۵، ۱۵۸
۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۴۱
۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء جلد دوم۔ ص ۵۱
۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۸۴
۷۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۴۳۹
۸۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ ص ۲۹۲
۹۔ احمد سلیم، معظم رضا تبسم۔ ممدوٹ سے وٹو تک۔ لاہور۔ ص ۲۹۹
۱۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۴۵، ۲۴۶
۱۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۱۵۹
۱۲۔ احمد سلیم، معظم رضا تبسم۔ ممدوٹ سے وٹو تک۔ لاہور۔ ص ۳۰۱
۱۳۔ مجاہد حسین۔ پاکستان کے متنازعہ سیاستدان۔ لاہور۔ ص ۲۰۴
۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۲۸،۸۴
۱۵۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ یکم مارچ ۲۰۰۰ء
۱۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۳۰۴۶
۱۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۹۳۵
۱۸۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۴۳۹

نون

نون، بھٹی قوم کی مشہور و معروف ذیلی شاخ ہے۔ یہ قوم پنجاب کے مختلف اضلاع میں آباد ہے۔ تاہم اس کے زیادہ تر افراد ملتان، شاہ پور اور سرگودھا میں آباد ہیں۔ شاہ پور اور سرگودھا میں یہ قوم زیادہ تر ٹوانوں کے ساتھ آباد ہے۔ چونکہ ٹوانوں کے ساتھ اس قوم کی رشتے داریاں بھی ہیں۔ اس لیے لوگ انہیں ٹوانوں کی شاخ سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت اس سے مختلف ہے۔ (۱)

مشہور محقق اے آر شبلی اپنی کتاب پاکستان کے دیہہ خدا میں لکھتے ہیں:

''سرگودھا ڈویژن میں ٹوانہ، نون اور اعوان قبائل کے جو بڑے بڑے زمیندار آباد ہیں وہ سب کے سب ملک کہلاتے ہیں۔ ان کے شجرۂ نسب سے ظاہر ہے کہ وہ ہندوراجپوتوں کی اولاد ہیں جو پندرہویں صدی میں دریائے سندھ کے کنارے آباد ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے قرب و جوار کے علاقے میں مار دھاڑ کی اور بے شمار اراضی پر قبضہ کرلیا۔ انگریز کی آمد پر ان لوگوں کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء میں آزادی پسندوں کا خون بہایا جس کی سرخی نے ان کے چہرے گلنار کر دیے۔ ان کے سینوں پر سونے اور چاندی کے تمغے جگمگانے لگے اور ان کی جاگیریں حدنظر تک وسیع ہوگئیں۔ سر سکندر حیات خان، سر فیروز خان نون اور سر خضر خان سب اسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں'' (۲)

خود سر فیروز خان نون نے بھی اپنی خودنوشت سوانح عمری، چشم دید، میں لکھا ہے:

''ہم لوگ نسلاً بھٹی راجپوت ہیں۔ ہمارے اجداد راجپوتانہ کے ہندو تھے اور پانچ سو برس قبل ترک وطن کر کے سمال میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کا قبیلہ دوران سفر جب پاک پتن پہنچا جو ستلج کے کنارے پر ایک قصبہ ہے تو اس نے مشہور صوفی بزرگ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ہمارے اجداد یہاں سے شمال مغرب کی طرف روانہ ہوئے اور دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے درمیان عین ریگستان میں مٹھاٹوانہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔ (۳)

سر فیروز خان نون کے پردادا ملک بخش خان تھے جو اپنے بیٹے ملک جہان خان کے ساتھ رنجیت سنگھ کی فوج میں ملازم رہا۔ چند مواضعات جاگیر میں پائے۔ الحاق پنجاب کے موقع پر یا اس سے کچھ

عرصہ پہلے یہ مواضعات ضبط ہو گئے اب ان لوگوں نے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرنے شروع کیے اور ملتان کی بغاوت کے زمانے میں ملک جہاں خان کا بھائی ملک فتح خان کچھ سوار لے کر انگریزوں کی فوج میں شامل ہو گیا اور اس نے ملتان کے علاوہ جہلم اور نہوں کی فتوحات میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان خدمات کے عوض ملک فتح خان کو ۱۲۰۰ روپے کی پنشن عطا ہوئی اور اس کے بیٹے محمد حیات خان کو بھیرہ کے قریب ساڑھے تین ہزار ایکڑ زمین اجارے پر عطا ہوئی۔ محمد حیات خان کا تایا زاد بھائی ملک محمد حاکم خان تھا، جسے انگریزوں کی خدمات کے عوض خان بہادر کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ملک محمد حاکم خان، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوتے ہی ملک فتح خان شیر خان ٹوانہ کے رسالے میں شامل ہوا اور حصار، بنگال، نارنول اور دوسرے کئی معرکوں میں موجود رہا۔ انہیں میں سے ایک معرکے میں وہ شدید زخمی بھی ہوا۔

جنگ کے اختتام پر انگریزوں نے اسے ۲۷۵ روپے کی تا حیات پنشن عطا کی اور پہلے پولیس انسپکٹر اور پھر تحصیل دار کا منصب پیش کیا جس پر اس نے کئی برس تک خدمات انجام دیں۔ خان بہادر ملک محمد حاکم خان پروانشل ذر بازی بھی تھا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے ملک شیر محمد خان کو بھی آنریری مجسٹریٹ کا عہدہ عطا کیا گیا تھا۔ (۴)

ملک محمد حاکم خان کا چچا اور فیروز خان نون کا دادا ملک فتح خان نون تھا فیروز خان نون نے اپنی سوانح عمری میں تصدیق کی ہے کہ اس کا دادا فتحِ پنجاب کے وقت میانوالی کی تحصیل عیسیٰ خیل کا گورنر تھا اور اس نے سکھوں کے گورنر ملک راج کے خلاف صف آرائی کے لیے عیسیٰ خیل سے پانچ ہزار پٹھانوں کی بھرتی کر کے ملتان میں میجر ایڈورڈز کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ (۵)

فیروز خان نون نے مزید لکھا ہے کہ ۱۸۲۰ء کے قریب جب پنجاب میں انگریزوں کے قدم جم چکے تھے، میرے دادا (ملک فتح خان نون) نے چار ہزار ایکڑ زمین پٹے پر حاصل کی۔ انہوں نے دریائے جہلم سے نور پور نون تک ایک دس میل طویل سیلابی نہر تعمیر کروائی اور بعد میں حکومت سے اس ساری زمین کے ملکیتی حقوق خرید لیے۔ (۶)

ملک فتح خان نون کا بیٹا، محمد حیات خان نون تھا جسے انگریزوں نے سر کا خطاب عطا کیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں وہ زمینداروں کی نشست پر پنجاب اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا۔ (۷)

اسی محمد حیات کا بیٹا فیروز خان نون تھا جو آگے چل کر پاکستان کا وزیر اعظم بنا۔

فیروز خان نون ۷ مئی ۱۸۹۳ء کو ضلع سرگودھا کی تحصیل بھلوال کے ایک گاؤں ہموکہ میں پیدا ہوئے تھے انہوں نے ابتدائی تعلیم پبلک سکول بھیرہ ضلع سرگودھا سے حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں وہ مزید تعلیم کے لیے لاہور منتقل ہو گئے اور ایچی سن کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۲ء میں ایچی سن کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ انگلستان چلے گئے۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں انہوں نے وڈھم کالج آکسفورڈ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اسی سال ستمبر میں ملک فیروز خان نون واپس ہندوستان آگئے اور جنوری ۱۹۱۸ء میں ضلع کچہری سرگودھا میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۲۰ء کے عام انتخابات میں وہ تحصیل بھلوال سے لاہور کی لیجلسیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۵ء کے انتخابات

میں وہ ایک بار پھر ووٹوں کی بھاری اکثریت کے ساتھ کامیاب قرار دیئے گئے۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کے انتخابات میں ان کے مقابلے میں کسی امیدوار نے الیکشن نہ لڑا اور وہ بلا مقابلہ منتخب ہوگئے یکم جولائی ۱۹۲۷ء کو وزراء کی کونسل میں شامل کر لیا گیا۔ اس وقت وہ ہندوستان کے سب سے کم عمر وزیر تھے۔ بحیثیت مجموعی ملک فیروز خان نون سولہ برس صوبائی اسمبلی کے ممبر اور دس برس سے زائد مختلف محکموں کے وزیر رہے۔ جون ۱۹۳۶ء سے ستمبر ۱۹۴۱ء تک وہ لندن میں ہندوستان کے ہائی کمشنر رہے۔ اس دوران وہ جینواء میں لیگ آف نیشنز کے اجلاسوں میں ہندوستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے شریک ہوتے رہے۔ ستمبر ۱۹۴۱ء سے ستمبر ۱۹۴۲ء تک وائسرائے ہند کی کابینہ کے رکن رہے ستمبر ۱۹۴۵ء میں وزیر دفاع کے عہدہ سے مستعفی ہو کر لاہور آئے تو اہل لاہور نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ نومبر ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں ملک فیروز خان نون راولپنڈی شہر کے انتخابی حلقہ سے کامیاب ہوئے نومبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت پر انہوں نے مشرقی وسطی کا دورہ کیا۔ ۱۹۴۹ء میں ایکیفے کے اجلاس منعقدہ سنگاپور میں پاکستانی وفد کی قیادت کی۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں انہیں مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اپریل ۱۹۵۳ء میں وزیر اعلیٰ پنجاب بنے۔ ۱۹۵۵ء میں سیاسی اختلافات کی بنا پر مسلم لیگ سے نکال دیئے گئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کو وہ وزیراعظم حسین شہید سروردی کی کابینہ میں امور خارجہ اور دولت مشترکہ کے وزیر کی حیثیت سے شامل کئے گئے۔ انہوں نے ۱۱۸ کتوبر ۱۹۵۷ء تک اس عہدہ پر کام کیا۔ جب آئی آئی چندریگر پاکستان کے وزیراعظم بنے تو انہوں نے بھی ملک فیروز خان نون کو اپنی کابینہ میں شامل کر کے وزارت امور خارجہ و دولت مشترکہ تعلقات کا قلمدان سونپا۔ آئی آئی چندریگر کے استعفی کے بعد ۱۶ دسمبر ۱۹۵۷ء کو انہوں نے وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ ان کی کابینہ میں سترہ وفاقی وزراء اور دس وزرائے مملکت شامل کئے گئے۔ اس سے قبل پاکستان وزیراعظم کی کابینہ میں اتنے زیادہ ارکان کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

ملک فیروز خان نون کی وزارت پاکستان کے پہلے پارلیمانی دور کی آخری اور سب سے کمزور وزارت تھی۔ ملک فیروز خان نون پنجاب کے ایک مشہور زمیندار اور جاگیر دار نون خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انہیں انتظامی امور کا وسیع تجربہ حاصل تھا۔ وزارت عظمیٰ کی مسند پر متمکن ہونے سے قبل وہ مشرقی پاکستان کے گورنر اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہ چکے تھے۔ ملک فیروز خان نون کی وزارت کو ری پبلکن پارٹی، عوامی لیگ اور کرشک سرامک پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ جب یہ وزارت بنی تو ملک کے سیاسی حالات میں ابتری انتہاء کو قریب پہنچ چکی تھی۔ عوام کی نمائندگی کے نام پر جو سیاستدان مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں پر قابض تھے۔ ان کی نگاہوں سے ملک کی تعمیر و ترقی اور مستقبل اور عوام کی فلاح و بہبود کا ہر مسئلہ قطعاً اوجھل ہو چکا تھا۔ ان کے نزدیک اہمیت صرف ایک سوال کو حاصل تھی کہ کون سے گٹھ جوڑ کے ذریعے اکثریت قائم کی جا سکتی ہے یا قائم شدہ اکثریت کو توڑا جا سکتا ہے۔ برسر اقتدار پارٹیوں کا تمام وقت اپنی اکثریت کو بچانے اور مخالف پارٹیوں کا تمام وقت ان کی اکثریت کو توڑ کر متبادل اکثریت قائم کرنے کی کوشش میں صرف ہوتا ہے۔ اس شطرنج کے کھیل میں کسی پارٹی کو کسی

قسم کی بے اصولی اور بدعنوانی سے عاری نہ تھا۔ اس صورتحال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ملک کی اقتصادی حالت تباہی کی طرف گامزن تھی۔ ملک اقتصادی دیوالیہ پن کی دہلیز تک پہنچ چکا تھا۔ پیداوار اور برآمدات کی مقدار روز بروز کم ہوتی جارہی تھی۔ پہلا پانچ سالہ تعمیراتی منصوبہ کس مپرسی کی حالت میں چل رہا تھا۔ سونے وغیرہ کے محفوظ ذخائر کم ہوتے ہوتے خطرے کے نشان سے بھی نیچے چلے گئے تھے۔

ملک فیروز خان نون کی وزارت عظمیٰ کے دور میں جو اہم واقعات رونما ہوئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مغربی پاکستان میں جب ری پبلکن پارٹی انتخابات منعقد کرانے کے وعدے سے پھر گئی اور نومبر ۱۹۵۸ء میں ہونے والے انتخابات کو مارچ ۱۹۵۹ء تک التواء میں ڈال دیا گیا تو اس کے اقتدار کو ختم کرنے کی غرض سے مسلم لیگ نے نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ گٹھ جوڑ کرلیا۔ اس سے ری پبلکن پارٹی کے متعدد مفاد پرست ارکان اپنی پارٹی کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے چنانچہ ری پبلکن پارٹی بحران کا شکار ہو کر رہ گئی۔ قریب تھا کہ اس کی وزارت کو اسمبلی میں شکست ہو جائے صدر اسکندر مرزا نے مغربی پاکستان میں دفعہ ۱۹۳ کے تحت گورنر راج نافذ کر دیا۔ بعدازاں جب دو ماہ بعد گورنر راج ختم ہوا تو ری پبلکن پارٹی بار دیگر برسر اقتدار آگئی لیکن ڈاکٹر خان صاحب مستعفی ہوگئے اور ان کی جگہ صوبہ سرحد کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس سردار عبدالرشید خان کو وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ جب ری پبلکن پارٹی نے بھی نیشنل عوامی پارٹی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے "ون یونٹ" کو توڑنے کا وعدہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکز میں عوامی لیگ اور ری پبلکن کا گٹھ جوڑ ٹوٹ گیا۔ بعدازاں جب یہ افواہ پھیلی کہ نیشنل عوامی پارٹی ری پبلکن کی حمایت سے دست کش ہو کر مسلم لیگ سے اتحاد کرنے والی ہے تو ری پبلکن پارٹی کے اندر پھر انتشار کے آثار پیدا ہوئے اور وزارت کا جہاز ڈگمگانے لگا۔ اس مرحلے پر ری پبلکن پارٹی نے وزارت کے جہاز کو آنے والے تلاطم سے بچانے کے لیے سردار عبدالرشید کی جگہ نواب مظفر علی قزلباش کو نیا کپتان (قائد) منتخب کرلیا۔ انہوں نے ۲۰ مارچ ۱۹۵۸ء کو بجٹ سیشن میں ۳۰۰ کے ہاؤس مین سے ۱۶۳ ووٹوں کی حمایت حاصل کر کے ۲۶ ووٹوں کی اکثریت سے مسلم لیگ پارٹی کو شکست دے کر ری پبلکن پارٹی کے اقتدار کو بچالیا۔ آئندہ بجٹ سیشن تک مغربی پاکستان اسمبلی کا کوئی اجلاس بلانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ کیونکہ اس دوران اکتوبر ۱۹۵۸ء میں فوجی انقلاب آگیا۔

۲۔ مشرقی پاکستان کے گورنر اے کے فضل الحق نے عطاء الرحمن خاں کی قیادت میں قائم ہونے والی عوامی لیگ وزارت کو برطرف کر دیا۔ کیونکہ وہ فنانس بل کو منظور نہ کرا سکی اور ساتھ ہی کرشک سرامک پارٹی کے لیڈر ابو حسین سرکار کو وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ مرکز میں نون وزارت عوامی لیگ کی تائید و تعاون کی محتاج تھی۔ اس لئے عوامی لیگ کے سربراہ حسین شہید سہروردی کے دباؤ پر ملک فیروز خان نون نے فضل الحق کے اقدام کو غیر آئینی قرار دے کر انہیں گورنری سے الگ کر دیا اور ان کی جگہ فوری طور پر صوبے کے چیف سیکرٹری کو عارضی وقفے کے لیے

گورنر مقرر کر دیا۔ نئے گورنر نے ابو حسین سرکار کی وزارت کو اس کی حلف اٹھانے کی رسم کے بارہ گھنٹے کے بعد برطرف کر دیا اور عطاء الرحمٰن کو وزیر اعلیٰ مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔ ابو حسین سرکار کی برطرفی کا حکم ایسا تھا جس کے لیے کوئی قانونی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک گورنر نے انہیں وزیر اعلیٰ مقرر کیا تھا اور اس کے بعد اگلے گورنر نے انہیں بغیر کسی قصور کے برطرف کر دیا تھا۔

عطا الرحمٰن کی کابینہ کے پھر برسر اقتدار آجانے کے بعد نیشنل عوامی پارٹی نے جس طرح مغربی پاکستان میں پہلے ایک وزارت کی حمایت کی اور پھر اسی کی مخالفت کر کے تفرقہ انگیزی کا کردار ادا کیا تھا وہی کردار اس نے مشرقی پاکستان میں بھی ادا کیا۔ ۱۹ جون ۱۹۵۸ء کو جب اس نے عوامی لیگ کی حمایت سے منہ موڑ لیا تو عوامی لیگ کی وزارت شکست کھا گئی اور متحدہ محاذ کی وزارت نے اقتدار سنبھال لیا۔ مگر اسی روز نیشنل عوامی پارٹی نے اپنی حمایت کا رخ عوامی لیگ کی طرف پھیر کر متحدہ محاذ کی وزارت کو نیچا دکھا دیا۔ الغرض صورتحال ایسی ابتر ہو گئی کہ صدر اسکندر مرزا کو ۲۴ جون ۱۹۵۸ء کو مشرقی پاکستان میں دفعہ ۱۹۳ کے تحت صدر راج نافذ کرنا پڑا۔ دو مہینے کے بعد ۲۵ راگست ۱۹۵۸ء کو عوامی لیگ کے عطاء الرحمٰن خاں پھر وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ صوبائی اسمبلی نے سپیکر عبدالحکیم کو غیر صحت مند دماغ والا شخص (پاگل) قرار دے دیا۔ اس پر ۲۱ رستمبر ۱۹۵۸ء کو اسمبلی کے اجلاس میں دنگا فساد شروع ہو گیا جس کے سبب ڈپٹی سپیکر شاہد علی شدید زخمی ہوئے اور دو دن بعد ۲۳ رستمبر ۱۹۵۸ء کو بیہوشی کی حالت میں ہی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۳۔ فیروز خان نون وزارت کے دوران میں ۹ رمئی ۱۹۵۸ء کو علی الصبح ایک شخص عطا محمد نے ری پبلکن پارٹی کے بانی مغربی پاکستان کے پہلے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کو ان کی لاہور کی رہائش گاہ میں گھس کر قتل کر دیا۔ مفاد پرست سیاست دانوں نے اس قتل کو سیاسی مسئلہ بنا کر اپنے سیاسی حریفوں کو اس میں ملوث کرنے کی پوری کوشش کی۔ پولیس نے اصل قاتل کے علاوہ خاکسار لیڈر علامہ عنایت اللہ مشرقی اور ان کے چند دوسرے ساتھیوں کو گرفتار کر کے سازش قتل کے الزام میں ان کا چالان عدالت میں پیش کیا۔ لیکن عدم ثبوت کی بناء پر سیشن کورٹ نے انہیں بری کر دیا۔

۴۔ ملک فیروز خان نون کے دور اقتدار میں کشمیری مہاجرین نے اپنے وطن کو بھارت کے غاصبانہ قبضہ سے آزاد کرانے کی غرض سے کشمیری لیڈر غلام عباس کی قیادت میں عملی جدوجہد اور جنگ بندی لائن کو عبور کر کے مسلح جدوجہد کا عزم صمیم کیا۔ چنانچہ کشمیر لبریشن فرنٹ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی جس نے مقبوضہ کشمیر میں جنگ آزادی کی شمع روشن کرنے کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ لیکن ملک فیروز خان نون کی وزارت نے کشمیری حریت پسندوں کو عملی اقدام کرنے سے روک دیا۔

۵۔ قیام پاکستان کے وقت سے صوبہ مشرقی پاکستان سے ملحقہ بیروباڑی یونین نامی ایک علاقے

ے بارے میں پاکستان اور بھارت کے مابین تنازع چلا آرہا تھا۔ گو بعد میں ''بگا ایوارڈ'' کی روسے اس علاقے پر پاکستان کا حق تسلیم کرلیا گیا۔ مگر ابھی تک اس علاقے کو پاکستان کے حوالے نہ کیا گیا تھا۔ ملک فیروز خان نون اس علاقے کے حصول کے لئے بھارتی حکومت سے بات چیت کی غرض سے دہلی گئے۔ بات چیت کے بعد بھارت نے نہ صرف اس علاقے کو پاکستان کو دینے کی یقین دہانی کرائی بلکہ اس ضمن میں ایک معاہدے پر دستخط بھی کئے۔ لیکن بھارتی حکومت نے ہمیشہ ٹال مٹول کی پالیسی اپنا کر اس پر قبضہ جمائے رکھا۔ حتیٰ کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش کی حکومت نے خود ہی اس خطہ زمین سے دست برداری اختیار کرلی۔

۸ر ستمبر ۱۹۵۸ء کو پاکستان کے رقبے میں تقریباً تین سو مربع میل کا اضافہ اس طرح ہوا کہ بندرگاہ گوادر اور اس کے آس پاس کا علاقہ جو قبل ازیں سلطان مسقط کے قبضے میں تھا پاکستان میں شامل ہو گیا۔ گوادر کی بندرگاہ اور اس کا نواحی علاقہ جو جغرافیائی اور آبادی کی زبان اور نسل کے اعتبار سے فی الحقیقت مغربی پاکستان کے علاقہ مکران کا ایک حصہ تھا۔ عرصہ دو سو سال سے سلطان مسقط کے قبضہ واختیار میں تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں لیاقت علی خان نے برطانوی حکومت کے ساتھ یہ مسئلہ چھیڑا کہ گوادر پاکستان کا حصہ ہے اور اس پر سلطان مسقط کا قبضہ ان تاریخی بے انصافیوں کی یادگار ہے جن کا اب ازالہ ہونا چاہئے۔ لیاقت علی خان کی زندگی میں اس مسئلہ کے متعلق گفت وشنید مکمل نہ ہوسکی۔ حکومت برطانیہ نے سلطان مسقط کو راضی کرنے کی ذمہ داری قبول کی لیکن اختلاف اس بات پر رہا کہ برطانوی حکومت سلطان کو کچھ معاوضہ دلوا کر گوادر سے دست بردار کرانا چاہتی تھی جب کہ پاکستان کی حکومت گوادر اور اس کی آبادی کو تجارتی مال تسلیم نہ کرتی تھی بلکہ پاکستان کے ایک قدرتی حصے کے طور پر بیرونی تسلط سے اسے آزاد کرانا چاہتی تھی۔ لیاقت علی خان کے بعد یہ مسئلہ بے توجہی کا شکار رہا۔ بالآخر ۱۹۵۸ء میں برطانوی حکومت نے حکومت پاکستان کو اس بات پر راضی کرلیا کہ سلطان کو مناسب معاوضہ دے کر اس مسئلہ کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ چالیس لاکھ پونڈ پر سودا طے ہو گیا اور ۸ر ستمبر ۱۹۵۸ء کو اس علاقے کی رسمی منتقلی کا اعلان کردیا گیا۔

۱۴ فروری ۱۹۵۸ء کو سردار عبدالرب نشتر کی المناک وفات کے بعد ۲۹ مارچ ۱۹۵۸ء کو خان عبدالقیوم خان، پاکستان مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے ۱۴ اپریل ۱۹۵۸ء کو کراچی میں اپنے اعزاز میں دیئے گئے ایک استقبالیہ میں خیر مقدمی سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے دوسری باتوں کا ذکر چھوڑ کر اپنا زور کلام اسکندر مرزا کے خلاف تنقید پر صرف کیا۔ خان عبدالقیوم خان نے کہا کہ اسکندر مرزا ایک آئینی عہدے پر فائز ہیں لیکن وہ دن رات سیاست میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں۔ ری پبلکن پارٹی کے کرتا دھرتا وہی ہیں۔ وزارتوں کو بنانے اور توڑنے میں ہمیشہ ان کا سب سے زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے آئینی عہدے کے آداب سے تجاوز کر کے آئین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ لہٰذا ملک کے بنیادی مفاد کا تقاضا ہے کہ انہیں اس عہدے سے برطرف کیا جائے۔ جو لوگ پاکستان کی ترقی اور استحکام کے خواہش مند ہیں ان کے لئے سب سے پہلا مسئلہ اسکندر مرزا سے ملک

کونجات دلوانا ہے۔ جن کے ہاتھوں آئین تباہ و برباد ہو رہا ہے۔

اس کے بعد خان عبدالقیوم خان نے صدر اسکندر مرزا کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کی مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم سے کوئی اور نتیجہ برآمد ہوا یا نہ ہوا۔ لیکن خان عبدالقیوم کے جلسے عوام کے لئے بے حد پرکشش بن گئے اور مسلم لیگ کے گرتے ہوئے سیاسی وقار کو وقتی طور پر عجیب سہارا ملا۔ چند مہینوں کے اندر خان عبدالقیوم خان کی سرگرمیوں نے مغربی پاکستان میں مسلم لیگ کے حق میں خاصا جوش و خروش پیدا کر دیا۔ اس سے نہ صرف ری پبلکن پارٹی کی مقبولیت میں کمی واقع ہوئی بلکہ صدر اسکندر مرزا عوام میں غیر مقبول ہو کر رہ گئے۔ آئین ۱۹۵۶ء کے تحت ہونے والے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے خان عبدالقیوم خان ملک کے طوفانی دورے کر کے اپنی شعلہ بیانی سے لوگوں کو خانہ جنگی کی تلقین کر رہے تھے۔ وہ لوگوں سے کھلم کھلا کہتے کہ اگر میری پارٹی کو انتخابات میں کامیابی نہ ہوئی تو خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ ان کو دو بڑے فصیح البیان رفیق مل گئے تھے۔ ان میں ایک تو سردار بہادر خان تھے اور دوسرے راجہ غضنفر علی خان۔

خان عبدالقیوم خان نے مسلم لیگ نیشنل گارڈ تیار کرنے شروع کئے اور کوئی ساٹھ ہزار جوان بھرتی کر لئے۔ یہ لوگ وردیاں اور فولادی خُود پہنے، رائفلیں اٹھائے سر بازار پریڈ کرتے۔ ۲۰ر ستمبر ۱۹۵۸ء کو حکومت نے فوجی وردیوں کا پہننا اور فوجی یا فوجی سے ملتے جلتے ادارے قائم کرنا، خواہ وہ افراد کی طرف سے ہوں یا جماعتوں کی طرف سے، ممنوع قرار دے دیئے۔ ساتھ ہی ۲۲ر ستمبر کو وزیراعظم فیروز خان نون نے اعلان کیا کہ اگر ہر سیاسی جماعت کے پاس اتنی پرائیویٹ فوج ہوئی تو ملک میں آزادانہ منصفانہ انتخابات مطلق نہ ہو سکیں گے۔ اس پر خان عبدالقیوم خان اسی روز کراچی پہنچے اور ان کے ہزاروں حمائتیوں نے حکومت کے امتناعی احکام کی کھلے بندوں خلاف ورزی کی۔ ۲۸ر ستمبر کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ایک قرار داد منظور کی کہ اگر ضرورت پڑی تو غیر آئینی طریقوں سے حکومت کو برطرف کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں ملک گیر یوم احتجاج منانے کی تاریخ بھی مقرر کی گئی۔ لیکن اس تاریخ سے پہلے ہی فوجی انقلاب آ گیا اور مارشل لاء کے تحت تمام سیاسی سرگرمیاں معطل ہو گئیں۔

ملک کی خراب اور پیچیدہ سیاسی صورتحال نے اس وقت مزید پیچیدگی اختیار کر لی جب خان آف قلات نے عام ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قلات کو پاکستان سے الگ کرنے کے لئے سازشیں کرنی شروع کر دیں۔ اس زمانے میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ خان آف قلات کو اس امر میں خود سکندر مرزا کی طرف سے شہ مل رہی ہے جو اپنا آخری حربہ استعمال کرنے کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ ۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو خان آف قلات کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے تمام اعزازات، مراعات اور اختیارات چھین لیے گئے۔

ملک فیروز خان نون کا دور وزارت سیاسی سازشوں، بدعنوانیوں اور بے یقینی کا دور تھا۔ سیاستدان ہمہ وقت عہدوں کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ روٹ پرمٹوں اور امپورٹ لائسنسوں کی صورت میں رشوتیں گزشتہ تمام ریکارڈ مات کر گئی تھیں۔ خویش پروری اور اقربا نوازی نے نظم و نسق میں اپنے پنجے گاڑ لئے تھے۔ سمگلنگ اور چور بازاری نقطہ انتہاء کو پہنچ گئی تھی۔ سمگلروں اور بردہ فروشوں کی پشت

پناہی برسر اقتدار طبقہ کا شعار بن چکا تھا۔ انتظامیہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ ملک اقتصادی بدحالی سے دوچار تھا۔ اندھا دھند خرچ اس زمانے کا عام دستور نظر آتا تھا۔ ہم جتنا غیر ملکی زرمبادلہ کما رہے تھے اس سے زیادہ گنوا رہے تھے۔ زرمبادلہ کی محفوظ رقوم گھٹتے گھٹتے بیالیس کروڑ روپے رہ گئی تھیں۔ ادھر تو ملک میں یہ ابتری پھیلی ہوئی تھی اور ادھر ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت عام انتخابات کے چرچے ہو رہے تھے۔ یہ انتخابات نومبر ۱۹۵۷ء میں ہونے والے تھے۔ مگر بعد میں انہیں مارچ ۱۹۵۸ء تک ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جب سے مسلم لیگ کی قیادت خان عبدالقیوم خان کے ہاتھ میں آئی تھی ملک کی سیاسی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئی تھیں۔ آئے دن عام جلسے منعقد ہونے لگے تھے اور اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے لمبے لمبے جلوس نکالے جا رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ دوسری تمام جماعتوں کو مات دے جائے گی۔ صدر اسکندر مرزا کے لئے یہ صورتحال بڑی تشویش ناک تھی۔ انہیں خطرہ تھا کہ آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کامیابی سے ہمکنار ہو گئی اور اسمبلی میں اسے واضح اکثریت حاصل ہو گئی تو ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا اور وہ جوڑ توڑ کے ذریعے سیاستدانوں کو انگلیوں پر نچا کر اپنا الو سیدھا نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا وہ مسلم لیگ کی رابطہ عوام مہم کو طرح طرح کے حربوں سے سبوتاژ کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔

بالآخر صدر اسکندر مرزا نے اس صورتحال سے نجات کے لئے حتمی اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو نہ صرف ملک فیروز خان نون کی وزارت عظمیٰ ختم کر دی بلکہ پاکستان سے پارلیمانی نظام کا خاتمہ کرتے ہوئے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور ۱۹۵۶ء کا آئین منسوخ کر دیا۔ (۸)

ملک فیروز خان نون نے اس کے بعد تمام عرصہ سیاست سے دور بسر کیا۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں نون خاندان کی شکست کا صدمہ ان سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ انتخاب کے دو ہی دن بعد ۹ دسمبر ۱۹۷۰ء کو وفات پا گئے۔ (۹)

ملک فیروز خان نون کی سیاست کے میدان سے گوشہ نشینی کے بعد ان کے صاحبزادے نور حیات خان نون نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تاہم ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ملک انور علی نون کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ اب انہوں نے ہوا کا رخ پہچانا اور پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے اسی پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لیا اور ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۰) وہ ایک مختصر عرصہ کے لئے بھٹو کی کابینہ کے رکن بھی رہے۔ تاہم جب بھٹو کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو نور حیات خان نون کو پاکستان پیپلز پارٹی سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ (۱۱)

۱۹۸۵ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے غیر جماعتی انتخابات منعقد کروائے تو نور حیات خان نون نے این اے ۹۵ سرگودھا ۵ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۲) بعد ازاں وہ محمد خان جونیجو کی کابینہ میں وزیر صحت کے منصب پر فائز ہوئے (۱۳) ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ ہی نہیں لیا۔ (۱۴) ۶ ستمبر ۱۹۹۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا (۱۵)

نور حیات خان نون کے چھوٹے بھائی منظور حیات خان نون ہیں۔ وہ ایک مختصر دورانیے کے لیے سیاست کے میدان میں رہے اور جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں قائم ہونے والی مجلس شوریٰ کے رکن بنے۔ منظور حیات خان نون کے صاحبزادے ملک عدنان حیات خان نون ہیں جو ۱۹۹۷ء میں این اے ۴۷ سرگودھا ا سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۶) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ گریجویشن کی شرط کی وجہ سے حصہ نہ لے سکے (۱۷) یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل ہوگا کہ منظور حیات خان نون کی ایک صاحبزادی کی شادی سابق وزیر اعلیٰ پنجاب میاں افتخار ممدوٹ کے خاندان میں ہوئی ہے۔ (۱۸)

ملک فیروز خان نون کی دوسری اہلیہ اور نور حیات خان نون اور منظور حیات خان نون کی سوتیلی والدہ بیگم وقار النساء نون جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں وزیر مملکت اور صدارتی مشیر کے عہدوں پر فائز رہیں اور پرتگال میں پاکستان کی سفیر بھی رہیں۔ وہ ۲۳؍جولائی ۱۹۲۰ء کو برطانیہ کے ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئی تھیں تاہم ملک فیروز خان نون سے شادی سے قبل انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بیگم وقار النساء نون مختلف ادوار میں متعدد سماجی تنظیموں کی روح رواں اور ایک طویل عرصہ تک پاکستان ریڈ کراس سوسائٹی کی صدر رہیں۔ ان کی خدمات کی یادگار راولپنڈی کا وقار النساء گرلز کالج ہے۔ بیگم وقار النساء نون نے ایک بے حد فعال زندگی گزارنے کے بعد ۱۶ جنوری ۲۰۰۰ء کو وفات پائی۔ (۱۹)

۱۹۷۶ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ملک انور علی نون نے نور حیات خان نون کو شکست دی تھی۔ ان دونوں کا شجرہ نسب چوتھی پشت پر جا کر ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے۔ ملک انور علی خان نون، خان بہادر ملک محمد حاکم خان نون کے پوتے اور سلطان علی خان کے فرزند تھے وہ ۱۹۷۷ء میں بھی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۲۰) تاہم وفاقی وزارت ان کی بجائے نور حیات خان نون کے ہاتھ آئی۔ جو، جیسا کہ اوپر رقم کیا جا چکا ہے، ملک فیروز خان نون کے فرزند تھے۔

ملک انور علی خان نون کے فرزند امجد علی نون ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء میں این اے ۴۷ سرگودھا ا سے کاغذات نامزدگی داخل کروائے تھے مگر پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل نہ ہونے کے باعث انتخابی عمل سے ریٹائر ہو گئے تھے (۲۱) ۱۹۹۳ء کے انتخاب میں پاکستان پیپلز پارٹی نے انہیں پی پی ۳۱ سرگودھا ۹ سے صوبائی اسمبلی کا امیدوار نامزد کیا مگر وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے احمد خان ہرال سے ۶۴۵ ووٹوں سے شکست کھا گئے (۲۲) ۱۹۹۷ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔ ۲۰۰۱ء میں وہ ضلع سرگودھا کے ناظم منتخب ہوئے (۲۳) وہ ۲۰۰۵ء میں بھی اس عہدے کے امیدوار تھے مگر کامیاب نہ ہو سکے (۲۴)

ملک انور علی خان نون کی ایک صاحبزادی کی شادی سرگودھا کے ملک کرم بخش اعوان کے صاحبزادے سے ہوئی ہے (۲۵) ملک کرم بخش اعوان ۱۹۷۰ء میں سرگودھا سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ان کا تعلق کونسل مسلم لیگ سے تھا (۲۶) ملک کرم بخش اعوان کے صاحبزادے ملک

محمد بشیر اعوان ۱۹۸۸ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے جب کہ ایک اور صاحبزادے ملک محمد جاوید اقبال اعوان ۲۰۰۲ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن بنے ہیں (۲۷)

حوالہ جات

۱ـ غلام اکبر ملک، بھٹی اور بٹ۔ لاہور۔ ص ۱۳۳

۲ـ اے آر شبلی، پاکستان کے دیہہ خدا۔ لاہور۔ ص ۴۸

۳ـ فیروز خان نون، چشم دید۔ لاہور۔ ص ۸،۹

۴ـ سر لیپل ایچ گریفن، چارلس میسی، تذکرہ روسائے پنجاب۔ جلد دوم۔ ص ۳۱۷ تا ۳۱۹

۵ـ فیروز خان نون، چشم دید۔ لاہور۔ ص ۱۴،۱۵

۶ـ ایضاً۔ ص ۱۶

۷ـ پنجاب پروانشل اسمبلی سکریٹریٹ، دی پنجاب لیجسلیٹرز۔ لاہور۔ ص ۴

۸ـ سجاد بخاری، پاکستان کے ۱۷ وزرائے اعظم۔ لاہور۔ ص ۹۱ تا ۱۰۳

۹ـ سید قاسم محمود، انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا۔ کراچی۔ ص ۲۱۷

۱۰ـ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۴۰

۱۱ـ وکیل انجم۔ سیاست کے فرعون۔ لاہور۔ ص ۳۴۸

۱۲ـ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۸۰

۱۳ـ سجاد بخاری۔ پاکستان کے ۱۷ وزرائے اعظم۔ لاہور۔ ص ۱۴۴

۱۴ـ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔ جلد دوم۔ ص ۵۳ تا ۵۶

۱۵ـ ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۹۰۵

۱۶ـ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء۔ لاہور۔ ص ۶۷

۱۷ـ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۱۲ر جولائی ۲۰۰۲ء

۱۸ـ وکیل انجم۔ پنجاب کی سیاست جاگیرداری اور دھڑے بندیوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ روزنامہ جنگ کراچی، سنڈے میگزین ۴ ستمبر ۲۰۰۵ ص ۷

۱۹ـ روزنامہ ڈان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ جنوری ۲۰۰۰ء

۲۰ـ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۱ مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۲۹۱

۲۱ـ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۳۱

۲۲ـ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔ جلد دوم۔ ص ۲۳۴

۲۳ـ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۴۱

۲۴ـ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۲۵۔ سہیل وڑائچ۔ سب کی نانی ایک ہے۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ یکم فروری ۱۹۹۷ء
۲۶۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۵۸
۲۷۔ پراونشل اسمبلی آف دی پنجاب۔ بائیوگرافی آف ممبرز ۲۰۰۲ء۔ لاہور۔ ص ۳۹

وٹو

وٹو اصلاً" ہندو راجپوت ہیں۔ جنہوں نے حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔ پاکستان بننے کے بعد ضلع فیروز پور اور ریاست بیکانیر کے مسلمان ہجرت کر کے ساہیوال' اوکاڑہ اور بہاولنگر کے اضلاع میں آباد ہوئے۔ جہاں وٹوؤں کی کئی گوتیں آباد ہیں۔ ان گوتوں کے نام کے آخر میں "کا" کا اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً میاں غلام محمد احمد خاں کی گوت مانیکا' میاں منظور احمد وٹو کی گوت تیجے کا' میاں یاسین وٹو کی گوت ٹھاکر کا اور غلام حسین وٹو کی گوت کالوکا ہے۔ اس طرح اس برادری کی بیسیوں گوتیں ہیں مگر دوسری برادریوں کی طرح ان کے اہم افراد کی اپنی اپنی سیاست اور اپنی اپنی راہیں ہیں۔ پاکستان بننے سے قبل میاں غلام محمد احمد مانیکا کے والد خان بہادر میاں نور احمد مانیکا کو مرکزی شخصیت کی حیثیت حاصل رہی پاک پتن کے نواح میں ان کی وسیع اراضیات تھیں۔ پنجاب اسمبلی کے رکن ہونے کی حیثیت سے انہیں سرکاری طور پر بھی بااثر شخصیت کا مرتبہ حاصل رہا ان کی ایک صاحب زادی کی شادی درگاہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے سجادہ نشین دیوان غلام قطب الدین سے ہوئی جنہیں اس علاقے میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پاکستان بننے سے قبل خان بہادر میاں نور احمد مانیکا مسلم لیگی امیدوار میاں محمد مسعود چشتی کے مقابلے میں ناکام ہو گئے جو دیوان غلام قطب الدین کے بہنوئی اور سابق ایم پی اے میاں غلام فرید چشتی کے والد تھے۔ پاکستان بننے کے بعد مانیکا فیملی کے ایک زمیندار میاں خدا یار مانیکا ۱۹۵۱ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ میاں خدا یار مانیکا موضع بنگلہ حیات کے زمیندار تھے۔ وہ خان بہادر میاں نور احمد مانیکا مرحوم کے داماد اور سابق وفاقی وزیر میاں غلام محمد مانیکا کی سوتیلی بہن کے خاوند تھے۔ میاں خدا یار مانیکا جب پنجاب اسمبلی کے رکن تھے اس وقت پنجاب اسمبلی میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کے ایما پر پنجاب اسمبلی نے ایک قانون منظور کیا کہ جو ارکان اسمبلی اپنے اپنے دیہات کے نمبردار ہیں وہ دہری رکنیت برقرار نہیں رکھ سکتے انہیں نمبرداری اور اسمبلی رکنیت میں سے ایک عہدے سے

دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس پر رکن موصوف واحد ایم ایل اے تھے جنہوں نے نمبرداری کو اسمبلی کی رکنیت پر ترجیح دی اور اسمبلی کی رکنیت کو خیرباد کہہ دیا۔ خان بہادر میاں نور احمد مانیکا ان دنوں پیرانہ سالی کے باعث سیاست اور چودھراہٹ سے عملی طور پر ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور ان کی زمینیں میاں غلام محمد مانیکا اور ان کے چھوٹے بھائی میاں نذر فرید مانیکا کی کمسنی کے باعث کورٹ آف وارڈز میں چلی گئیں ۱۹۵۸ء میں ری پبلکن دور حکومت کے وزیر بلدیات مخدوم حسن محمود نے میاں غلام محمد مانیکا کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں ساہیوال کا میونسپل کمشنر بنا دیا جس کے بعد انہوں نے اپنی زمینیں کورٹ آف وارڈ سے نکالیں اور خود ان زمینوں کی نگہداشت کرنے لگے۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں میاں غلام محمد احمد مانیکا مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے جب کہ ملحقہ صوبائی حلقے سے جو تحصیل دیپال پور کے علاقوں پر مشتمل تھا اس حلقے سے میاں عطا محمد مانیکا آف بنگلہ حیات کے صاحب زادے میاں ممتاز مانیکا امیدوار بنے مگر ان کے مقابلے میں میاں یاسین وٹو کامیاب ہو گئے۔ گورنر نواب امیر محمد خان آف کالاباغ نے اپنے خاندانی تعلقات کی بنیاد پر میاں غلام محمد مانیکا کو صوبائی پارلیمانی سیکرٹری بنا دیا اور میاں یاسین وٹو صوبائی وزیر بنا دیئے گئے ان کے وزارت میں شامل ہونے کے باعث ان کی چھوڑی ہوئی نشست پر راؤ محمد افضل ایم پی اے منتخب ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے رہنما رائے خداداد خان قومی اسمبلی کے لئے کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ کے حصول کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ مگر نواب امیر محمد خان آف کالاباغ عارف والا کی رانا فیملی کے سربراہ کو ٹکٹ دینے کے مخالف تھے میاں غلام محمد احمد مانیکا کی کوشش تھی کہ اس نشست سے ان کے بہنوئی دیوان غلام قطب الدین کامیاب ہوں اور نواب امیر محمد آف کالاباغ بھی چاہتے تھے کہ دیوان صاحب ہی اس نشست سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو جائیں چنانچہ گورنر نے دونوں امیدواروں میں تصفیہ کرانے کے لئے ضلع ساہیوال کے دو سرکردہ ارکان میاں محمد یاسین وٹو اور میاں عبدالحق آف اوکاڑہ پر مشتمل دو رکنی کمیٹی قائم کی۔ کمیٹی نے رانا خداداد کو نظر انداز کر دیا اور فیصلہ دیوان صاحب کے حق میں صادر کر دیا اور یوں دیوان صاحب بلامقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ میاں غلام محمد احمد مانیکا اور میاں یاسین وٹو کنونشن مسلم لیگ میں شامل رہنے کے باوجود علاقائی طور پر ایک دوسرے کے مخالف رہے اور جب کنونشن لیگ کے اقتدار کا سورج غروب ہونے لگا تو ایک روز صوبائی اسمبلی کے ایوان میں دونوں اصحاب میں جھڑپ ہوئی اور ان علاقائی مخالفتوں کا بھانڈہ اس طرح پھوٹا کہ اس جھڑپ کو سننے والوں نے محسوس کر لیا کہ دونوں افراد صدیوں تک ایک پلیٹ فارم پر خلوص نیت سے مجتمع نہیں ہو سکتے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں میاں محمد یاسین خان وٹو نے کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر تحصیل دیپال پور سے قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا مگر وہ پیپلز پارٹی کے امیدوار میاں محمد حسن وٹو کے مقابلے میں ناکام ہو گئے

البتہ ان کے حلیف راؤ محمد افضل خان کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پیپلز پارٹی کے مقابلے میں ایم پی اے منتخب ہو گئے۔ انہی انتخابات میں دیوان غلام قطب الدین اور میاں غلام محمد احمد خاں مانیکا قیوم لیگ کے ٹکٹ پر بالترتیب قومی اور صوبائی امیدوار بنے مگر پیپلز پارٹی کے مقابلے میں ناکام رہے۔ دیوان صاحب کے مقابلے میں راؤ محمد ہاشم خان اور میاں غلام محمد مانیکا کے مقابلے میں دیوان صاحب کے بھانجے میاں غلام فرید چشتی کامیاب ہوئے۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات سے قبل میاں محمد یاسین خان وٹو اور راؤ محمد افضل خان اور ان کا پورا گروپ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا جب کہ میاں غلام محمد احمد مانیکا نے بھی پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا ان دنوں ان کے بہنوئی میاں اسلم حیات وٹو آئی جی سندھ کے عہدے پر فائز تھے افسر موصوف نے اس وقت بطور اے ایس پی پولیس ملازمت کا آغاز کیا جب ان کے ماموں میاں خدا یار مانیکا پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ جب پیپلز پارٹی نے ٹکٹ تقسیم کیے تو میاں یاسین وٹو کو قومی اور راؤ محمد افضل کو صوبائی اسمبلی کے ٹکٹ دیئے گئے مگر میاں غلام محمد مانیکا کو نظر انداز کر دیا گیا جبکہ دیپال پور کے ایک حلقہ سے میاں منظور احمد وٹو کو صوبائی ٹکٹ بھی دیا گیا۔ پاک پتن تحصیل سے پیپلز پارٹی کی ہائی کمان نے راؤ محمد ہاشم اور میاں غلام فرید چشتی کو بالترتیب قومی اور صوبائی اسمبلی کے ٹکٹ دے دیئے اس صورتحال سے مانیکا گروپ کو بڑی تشویش ہوئی مگر مسٹر منظور احمد وٹو کا ٹکٹ واپس لے کر میاں غلام محمد مانیکا کو صوبائی اسمبلی کے لئے پیپلز پارٹی نے اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ ان انتخابات کے بعد میاں یٰسین خاں وٹو وفاقی وزیر بنائے گئے جبکہ نواب صادق قریشی کی پنجاب کابینہ میں میاں غلام محمد مانیکا کو لیا گیا۔ راؤ محمد ہاشم اور میاں یاسین وٹو کی ہم آہنگی کے باعث مانیکا گروپ احساس محرومی کا شکار ہوا جب جولائی ۱۹۷۷ء میں مارشل لا نافذ ہوا تو میاں غلام محمد احمد مانیکا نے سابق حکمران جماعت کو خیرباد کہ دیا مگر ان کے مخالفین پیپلز پارٹی میں رہے۔ ۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات میں میاں غلام محمد احمد مانیکا اپنے علاقہ پیر غنی پاک پتن سے ڈسٹرکٹ کونسلر منتخب ہوئے اور انہوں نے ڈسٹرکٹ کونسل ساہیوال کے چیئرمین کے عہدہ کے حصول کے لئے انتخاب میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ ان کے مقابلے میں راؤ محمد افضل نے ساہیوال سے ایک سابق صوبائی وزیر ملک فتح شیر لنگڑیال کے صاحب زادے ملک اقبال لنگڑیال کو ابھارا مگر میاں غلام محمد مانیکا کی انتخابی حکمت عملی موثر رہی اور وہ نہ صرف خود ڈسٹرکٹ کونسل ساہیوال کے چیئرمین منتخب ہوئے بلکہ دیپال پور میں راؤ محمد افضل کے مخالف دھڑے کے ایک سرگرم ڈسٹرکٹ کونسلر سردار سلطان کو وائس چیئرمین بھی منتخب کرا لیا۔ اس کے بعد میاں غلام محمد مانیکا گورنر پنجاب جنرل سوار خان کی کابینہ میں بطور وزیر بلدیات لیئے گئے ان کی جگہ جب لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان کو پنجاب کا گورنر بنایا گیا تو میاں غلام محمد مانیکا کو ان کی کابینہ میں وزیر لیا گیا۔ وفاقی مجلس شوریٰ کی تشکیل پر راؤ محمد افضل اس وقت کے وفاقی وزیر راؤ فرمان علی

خان کی معاونت سے اس ادارہ کے رکن نامزد ہو گئے جب کہ پاک پتن سے میاں عطا محمد مانیکا کو وفاقی مجلس شوریٰ میں شامل کیا گیا موخر الذکر رکن رشتے کے اعتبار سے میاں خدا یار مانیکا کے صاحب زادے ہیں۔ ضلع ساہیوال کی کوکھ سے اوکاڑہ کو جب نیا ضلع بنایا گیا تو دیپال پور تحصیل کو ضلع اوکاڑہ میں شامل کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ کونسل ساہیوال کے چیئرمین اور وائس چیئرمین کے عہدوں کے لئے جب دوبارہ انتخاب کرانے کا مرحلہ پیش آیا تو میاں غلام محمد مانیکا نے چیئرمین کے لئے دوبارہ انتخاب لڑنے کا فیصلہ کر لیا مگر راؤ افضل خان کی گورنر پنجاب سے قربت کے باعث انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور یوں وہ صوبائی وزیر کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۸۳ء کے بلدیاتی انتخابات میں میاں غلام محمد مانیکا نے ڈسٹرکٹ کونسل کے انتخاب میں حصہ لینے کا پھر فیصلہ کر لیا مگر انہیں ہرانے کے لئے تمام مخالف گروپ ایک بار پھر متحد ہو گئے ان کے مقابلے میں پاک پتن کے ایک قریبی گاؤں کے ایک نوجوان چن پیر کو کھڑا کیا گیا جو رشتے کے اعتبار سے پاکستان بار کونسل کے رکن سید افضل حیدر کے بھائی کے داماد ہیں دونوں امیدواروں نے زبردست کنویسنگ کی مگر میاں غلام محمد احمد مانیکا پھر کامیاب ہو گئے۔ مگر وہ ڈسٹرکٹ کونسل ساہیوال کے چیئرمین منتخب نہ ہو سکے اور ان کے مقابلے میں ان کے سابقہ انتخابی حریف ملک محمد اقبال لنگڑیال کامیاب ہو گئے۔ میاں غلام محمد مانیکا وزارت سے مستعفی اور ڈسٹرکٹ کونسل ساہیوال کے چیئرمین کے انتخاب میں ناکامی کے بعد کافی حد تک پس منظر میں چلے گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی میاں نذر فرید مانیکا کو بلدیہ پاک پتن کی چیئرمینی سے الگ کرنے کے لئے بھی ان کے مخالفین سرگرم رہے مگر انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۸۵ء کے انتخابات سے ایک ماہ قبل انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست سے خود کو امیدوار بنانے کا فیصلہ کر لیا ان کے مقابلے میں مخالفین نے ایک ڈسٹرکٹ کونسلر اور سابق ایم پی اے مسٹر احمد علی بیٹو کو مشترکہ امیدوار کھڑا کیا' بعض مخالفین ان کے مقابلے میں وفاقی مجلس شوریٰ کے رکن میاں عطا محمد مانیکا کو آگے لانے کے لئے صلاح مشورے کرتے رہے مگر انہوں نے حلقہ دیپالپور سے الیکشن لڑنے کو ترجیح دی۔ میاں غلام محمد احمد مانیکا اپنے مخالفین کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود میاں ولی دار بھنڈارا کی تیار کردہ انتخابی حکمت عملی کے باعث کامیاب ہو گئے مگر پاک پتن شہر اور نواحی علاقوں سے ان کے مخالف امیدوار اور سابق ایم پی اے میاں غلام فرید چشتی کو کامیابی نصیب ہوئی اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ انہوں نے صوبائی انتخابات کی پولنگ سے قبل اپنے ماموں دیوان غلام قطب الدین سے صلح کر لی۔

ضلع اوکاڑہ کی انتخابی سیاست میں مسٹر منظور وٹو نمایاں شخصیت کے طور پر سامنے آئے۔ ۱۹۸۳ء کے بلدیاتی انتخابات میں میاں یاسین خان وٹو اور راؤ محمد افضل خان ایک دوسرے سے ایسے علیحدہ ہوئے کہ شاید وہ اب کبھی خوابوں میں بھی نہ مل سکیں۔ میاں یاسین وٹو کو ماضی کے انتخابات میں کامیاب کروانے میں ایک زمیندار حافظ محمد حسن (یہ صاحب اور ہیں)۔ ۱۹۷۰ء میں

یاسین وٹو کے مقابلے میں کامیاب ہونے والے ایم این اے محمد حسن وٹو نہیں) نے نمایاں کردار ادا کیا۔

زمیندار موصوف چاہتے تھے کہ میاں منظور وٹو اس علاقے کے مطلع سیاست پر روشن ستارے کے طور پر اجاگر ہوں۔ مسٹر منظور وٹو سے جب ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے اپنا صوبائی ٹکٹ واپس لے لیا تو انہوں نے تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ تحریک استقلال کی ہائی کمان میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۸۳ء کے بلدیاتی انتخابات میں انہوں نے ڈسٹرکٹ کونسل اوکاڑہ کی نشست پر انتخاب میں حصہ لیا اور وہ کامیاب ہوئے بعد میں انہوں نے میاں یاسین وٹو گروپ سے مل کر ڈسٹرکٹ کونسل اوکاڑہ کی چیئرمینی کا انتخاب بھی جیت لیا۔ بطور چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل اوکاڑہ اپنے ضلع کی ترقیاتی سکیموں پر عمل درآمد کرانے کے لئے دن رات کام کیا اس اعتبار سے انہوں نے نئے ضلع میں اپنا طاقتور گروپ قائم کر لیا۔ جب ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات کا مرحلہ آیا تو انہوں نے میاں یاسین وٹو کو مجبور کر دیا کہ وہ سیاسی جماعتوں کی سیاست سے الگ تھلگ ہو جائیں اور عام انتخابات میں حصہ لیں چنانچہ اس گروپ نے قومی اسمبلی کی تین نشستوں پر میاں یاسین وٹو' سید سجاد حیدر شاہ اور میاں محمد زمان آف اوکاڑہ کو ٹکٹ دیئے۔ اس گروپ کے مقابلے میں راؤ محمد افضل' راؤ فرمان علی خان اور میاں عطا محمد مانیکا نے اپنا گروپ بنا لیا گویا راؤ محمد افضل خان جو میاں یاسین وٹو سے علیحدہ ہو چکے تھے انہوں نے پرانے سیاسی حریفوں سے صلح کر لی اور مانیکا گروپ کو اپنا سیاسی ہم سفر بنا لیا۔ دیپال پور کی نشست سے میاں یاسین وٹو کے مقابلے میں میاں عطا محمد مانیکا' اوکاڑہ سے میاں محمد زمان کے مقابلے میں راؤ فرمان علی خان اور حلقہ رینالہ خورد سے سید سجاد حیدر شاہ کے مقابلے میں راؤ محمد افضل امیدوار بنے۔ جب انتخابی نتائج سامنے آئے تو تینوں نشستوں پر میاں منظور وٹو گروپ کامیاب ہو گیا۔ اس ضلع کی صرف دو صوبائی نشستوں پر راؤ افضل گروپ کامیاب رہا اس گروپ کے دو امیدوار ملک محمد عباس کھوکھر دیپال پور سے اور رائے شفقت عباس ربیرہ اوکاڑہ تحصیل سے کامیاب ہوئے جب کہ باقی نشستوں پر بھی میاں منظور وٹو گروپ کو کامیابی نصیب ہوئی خود میاں منظور وٹو حلقہ حویلی سے ایم پی اے منتخب ہوئے اور انہوں نے ۱۹۷۰ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ایم پی اے مسٹر خالد نواز وٹو آف ٹبک کو شکست دی۔ حجرہ شاہ مقیم کا سجادہ نشین خاندان جو ہر دور میں راؤ محمد افضل خان کا حلیف رہا اس خاندان کے ایک نوجوان سید افضال شاہ کو راؤ محمد افضل گروپ سے علیحدہ کیا گیا اور انہیں ایم پی اے منتخب کرانے کی ترغیب دی۔ تحصیل اوکاڑہ سے رائے نور محمد کھرل' چودھری ارشاد علی ایڈووکیٹ اور چودھری اکرام الحق ایم پی اے منتخب ہو گئے۔ ان کا تعلق میاں منظور وٹو گروپ سے تھا۔

۱۹۸۵ء کی قومی اسمبلی معرض وجود میں آنے کے بعد میاں غلام محمد احمد مانیکا مسلم لیگ کے

حامی ارکان قومی اسمبلی کی صف میں شامل ہو گئے۔ مگر میاں یاسین وٹو نے مخدوم حامد رضا گیلانی اور چودھری انور عزیز کے ساتھ گروپ بنایا۔ خواجہ محمد صفدر سابق چیئرمین وفاقی مجلس شوریٰ نے قومی اسمبلی کے اسپیکر کے انتخاب میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو مخالف گروپ نے میاں یاسین وٹو کو اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ اس گروپ نے پیر صاحب آف پگاڑا کی امداد حاصل کرنے کے لئے ان سے ملاقات کی مگر میاں صاحب جب واپس آئے تو وہ ڈرامائی انداز میں اسپیکر کے انتخاب سے دستبردار ہو گئے۔ اس پر مخالف گروپ نے جھنگ سے منتخب خاتون ایم این اے بیگم عابدہ حسین کو مخالف امیدوار کے طور پر سامنے لانے کا فیصلہ کیا مگر بلوچستان اور سرحد سے دینی فکر رکھنے والے ارکان قومی اسمبلی نے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ وہ خاتون امیدوار کو ووٹ نہیں دیں گے۔ اس پر ان کے خاوند مسٹر فخر امام کو کھڑا کیا گیا انتخاب میں خواجہ محمد صفدر ہار گئے اور سید فخر امام قومی اسمبلی کے اسپیکر منتخب ہو گئے۔ اگلے روز صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے مسٹر محمد خان جونیجو کو پاکستان کا وزیر اعظم نامزد کر دیا۔ جنہوں نے قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ بھی حاصل کر لیا۔ وزیر اعظم نے اپنی کابینہ میں میاں غلام محمد احمد مانیکا کو وفاقی وزیر لے لیا مگر میاں یاسین خان وٹو کو نظر انداز کر دیا گیا۔

مسٹر منظور وٹو کو پنجاب اسمبلی کا اسپیکر نامزد کرنے کے لئے پنجاب اسمبلی کے بااثر لوگوں کو اعتماد میں لیا گیا اور اس کے لئے میاں یاسین خان وٹو بھی سرگرم عمل رہے۔ مسٹر منظور وٹو بلامقابلہ اسپیکر منتخب ہو گئے۔ صوبائی کابینہ میں اسی گروپ کے سید افضل شاہ کو بطور صوبائی وزیر صحت لیا گیا اور تھوڑے دنوں کے بعد میاں محمد یاسین خان وٹو بھی وفاقی کابینہ میں لئے گئے۔ انہیں وزارت خزانہ کا قلم دان سونپا گیا۔ (۱)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں یٰسین وٹو نے حصہ نہیں لیا۔ شاید انہیں پہلے سے ہی اپنی شکست کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کے حلقے این اے ۱۱۳ اوکاڑہ ۴ سے میاں منظور احمد وٹو نے انتخاب لڑا۔ ان کے مدمقابل امیدوار پیپلز پارٹی کے میاں عطا محمد مانیکا تھے۔ یہ معرکہ میاں منظور احمد وٹو کے ہاتھ رہا۔

۱۹۸۸ء ہی میں میاں منظور احمد وٹو نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب بھی لڑا۔ یہ انتخاب بھی میاں منظور احمد وٹو ہی نے جیتا۔ بعد ازاں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی اور قومی اسمبلی کی نشست خالی کر دی۔ (۲)

جنوری ۱۹۸۹ء میں جب اس نشست پر ضمنی انتخاب منعقد ہوا تو اسلامی جمہوری اتحاد نے یٰسین وٹو کو ٹکٹ دینے کا اعلان کر دیا۔ اس نشست پر ان کے مدمقابل میاں عطا محمد مانیکا ہی رہے۔ یٰسین وٹو ۱۹۸۵ء میں اور منظور وٹو ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں میاں عطا محمد مانیکا کو شکست دے چکے تھے۔ مگر میاں عطا محمد مانیکا کے حوصلے پست نہ ہوئے اور اس ضمنی انتخاب میں

انہوں نے بڑی زور دار انتخابی مہم چلائی۔

انتخابی مہم کے دوران ہی آثار نظر آ رہے تھے کہ میاں یٰسین وٹو کے مقابلے میں میاں عطا محمد مانیکا کی پوزیشن بہتر ہے۔ یٰسین وٹو نے صوبائی وزیر سید افضال شاہ کے بھائی اور حجرہ شاہ مقیم کے سجادہ نشین سید اعجاز علی شاہ کی علاقائی اور روحانی طاقت پر انحصار کیا۔ جن کے تعاون سے وہ ۱۹۸۵ء میں کامیاب ہو چکے تھے۔ مگر اس مرتبہ سید اعجاز علی شاہ جس گاؤں میں جاتے وہاں ان کے مریدین دست بستہ کھڑے ہو کر کہتے حضرت صاحب! اس بار آپ ہمیں میاں یٰسین کو ووٹ دینے کا حکم نہ دیں۔ دوسرے پیپلزپارٹی نے اپنی کامیابی کی راہ ہموار کرنے کے لئے ووٹروں کے ہزاروں شناختی کارڈ تیار کئے اور اوکاڑہ میں رجسٹریشن آفس کے باہر رینجرز کا پہرہ بٹھا دیا۔ اس طرح میاں یٰسین وٹو کی کامیابی کے امکانات معدوم ہو گئے اور میاں عطا محمد مانیکا انہیں ساڑھے چھتیس ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۳)

ادھر این اے ۱۲۷ ساہیوال ۴ سے میاں غلام احمد مانیکا نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کے مدمقابل پیپلزپارٹی کے امیدوار راؤ محمد ہاشم تھے' یہ معرکہ میاں غلام احمد مانیکا نے تقریباً ساڑھے چار ہزار ووٹوں سے جیت لیا۔ (۴)

بہاولنگر میں وٹو برادری کے سابق صوبائی وزیر محمد افضل وٹو نے جو ۱۹۸۵ء میں میاں عبدالستار لالیکا سے انتخاب ہارے تھے' این اے ۱۴۴ بہاولنگرا سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر وہ اس مرتبہ بھی بہت بری طرح سے شکست کھا گئے۔ (۵)

بہاولنگر ہی سے میاں خادم حسین وٹو نے جو ۱۹۸۵ء میں بھی اس نشست پر کامیاب ہوئے تھے' پیپلزپارٹی کے امیدوار محمد اکرم کو شکست دے کر اپنی نشست برقرار رکھی۔ میاں خادم حسین وٹو کے والد میاں نذر محمد کالوکا ۱۹۶۵ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۶)

۱۹۹۰ء میں میاں یٰسین وٹو نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے انتخاب کے لئے کمر ہمت کسی۔ اس مرتبہ بھی انہیں آئی جے آئی کی حمایت حاصل تھی اور ان کے مدمقابل وہی میاں عطا محمد خاں مانیکا تھے جو ۱۹۸۵ء میں ان سے شکست کھا چکے تھے اور ۱۹۸۸ء کے ضمنی انتخاب میں انہیں شکست سے دوچار کر چکے تھے۔ اس مرتبہ یہ معرکہ میاں یٰسین وٹو کے ہاتھ رہا جنہوں نے اپنے حریف کو تقریباً ساڑھے چوبیس ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ (۷)

۱۹۹۰ء میں میاں عطا محمد مانیکا' صوبائی اسمبلی کی نشست پر بھی امیدوار تھے اور ان کے مدمقابل حسب سابق میاں منظور احمد وٹو تھے جنہوں نے انہیں تقریباً ۸۷ ہزار ووٹوں سے شکست دے دی۔ (۸)

میاں عطا محمد مانیکا کی شکست کا سب سے بڑا سبب تو یہ تھا کہ ان کے حلقے کے ووٹرز اور حامی

ان سے بہت زیادہ ناراض تھے' ان کا کہنا تھا کہ ایم این اے بننے کے بعد میاں صاحب نے دوبارہ لوٹ کر اپنے حلقے کے عوام کی خبر تک نہیں لی۔ دوسرا سبب یہ ہوا کہ مانیکا گروپ کے بعض سرکردہ ارکان مثلاً میاں فیض احمد مانیکا' میاں یوسف خاں' میاں اشتیاق احمد دیوان' میاں نصیر احمد خان' میاں محمد زمان خان وٹو اور میاں امداد حسین داریکا پیپلزپارٹی چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ان تمام معززین کو پورے انتخابی حلقے میں بے پناہ اثر و رسوخ حاصل تھا اور ان کی مسلم لیگ میں شمولیت سے میاں محمد یٰسین خاں وٹو کی پوزیشن بے حد مستحکم ہو گئی۔ (۹)

ادھر این اے ۱۲۸ پاک پتن سے (جو ۱۹۸۸ء میں این اے ۱۲۷ ساہیوال ۴ کہلاتا تھا) میاں غلام محمد احمد خان مانیکا اس مرتبہ آئی جے آئی کے ٹکٹ کے حصول میں ناکام رہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف تو خود آزادانہ طور پر کاغذات نامزدگی داخل کروائے اور دوسری جانب پی ڈی اے کے امیدوار راؤ ہاشم خاں کی انتخابی مہم چلانے کا فیصلہ کیا۔ مگر عین آخری وقت پر وہ اپنے دست راست میاں ولی داد خان بھنڈارہ کے ساتھ آئی جے آئی کے نامزد امیدوار میاں محمود احمد خاں کی رہائش گاہ پر آئے اور ان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ راؤ ہاشم' جن کی پوزیشن خاصی مستحکم بتائی جا رہی تھی' تقریباً ۱۵ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ انہی انتخابات میں پی پی ۱۹۰ پاک پتن ا سے آزاد امیدوار میاں گوہر فرید احمد خانؒ مانیکا نے سخت مقابلے کے بعد ۵۳۹ ووٹوں سے آئی جے آئی کے غلام فرید چشتی کو شکست دے کر ان کے بیس سالہ دور اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ میاں گوہر فرید احمد مانیکا میاں نذر فرید احمد خاں مانیکا کے صاحبزادے اور میاں غلام محمد احمد مانیکا کے بھتیجے ہیں۔ (۱۰)

۱۹۹۳ء میں میاں غلام احمد مانیکا کے صاحبزادے احمد رضا مانیکا نے بھی اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تاہم وہ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء دونوں انتخابات میں کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۱) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے پلیٹ فارم سے انتخاب لڑا اور اس حلقے کے مضبوط حریف محمود احمد خان اور راؤ نسیم ہاشم خان کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ (۱۲)

بہاولنگر سے صوبائی نشست پی پی ۲۲۵ بہاولنگر ا سے آئی جے آئی کا ٹکٹ حسب سابق میاں خادم حسین وٹو ہی کو ملا۔ اور وہ اس مرتبہ بھی اس نشست پر کامیابی حاصل کر کے اپنی ہیٹ ٹرک مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۳)

۱۹۹۰ء کے انتخابات کے بعد وٹو برادری کے افراد کامیابی کے باوجود اقتدار سے ذرا دور دور ہی رہے مگر ان کی تمام کسر میاں منظور احمد وٹو نے نکال لی۔

وہ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۸ء کی طرح ۱۹۹۰ء میں بھی پنجاب اسمبلی کے اسپیکر منتخب ہوئے۔ مگر گاہے بگاہے وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں سے ان کے اختلافات سامنے آتے رہے۔ ۱۸/اپریل ۱۹۹۳ء کو جب غلام اسحاق خاں نے نواز شریف حکومت کو برطرف کیا تو میاں منظور احمد وٹو کو مبینہ طور پر صدر

کے اشارے پر اپنے دیرینہ خواب، کہ وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنیں، تعبیر دینے کا موقع میسر آ گیا۔

انہوں نے فور طور پر اپنے حامی اراکین کے ذریعہ غلام حیدر وائیں کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی۔ جسے ۲۰ کے مقابلے میں ۱۵۷ ووٹوں سے منظور کر لیا گیا اور یوں غلام حیدر وائیں کی جگہ جناب منظور وٹو پنجاب کے نئے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ (۱۴)

سپریم کورٹ کی جانب سے قومی اسمبلی کی بحالی کے فیصلے کے بعد میاں منظور وٹو کی سیاست میں ایک نیا موڑ آیا اور انہوں نے پنجاب اسمبلی توڑ دی۔ اس فیصلے کے خلاف قائد حزب اختلاف چوہدری پرویز الٰہی نے ہائی کورٹ میں رٹ کی اور یہ بھی دعویٰ کیا کہ وہ اسمبلی توڑنے کے اقدام سے پہلے ہی منظور وٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد کا نوٹس سیکرٹری اسمبلی کو وصول کروا چکے تھے۔ ہائی کورٹ نے پرویز الٰہی کی رٹ پر اسمبلی بحال کرنے کا فیصلہ دیا مگر منظور وٹو نے فوراً ہی دوبارہ اسمبلی توڑنے کی سفارش کر دی۔ جس پر گورنر پنجاب چوہدری الطاف حسین نے اسمبلی ایک مرتبہ پھر تحلیل کر دی اور منظور وٹو کو نگراں وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ (۱۵)

منظور وٹو کے اس قدام کو ملک بھر میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا قومی اسمبلی میں بھی اس کے خلاف ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں صدر سے استدعا کی گئی کہ وہ پنجاب کا نظم و نسق خود سنبھالیں۔ یا میاں اظہر یا سرکاری انتظامیہ میں نامزد کردہ کسی اور شخص کو صوبہ کا گورنر مقرر کریں۔ مگر ایک جانب تو صدر نے گورنر کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا دوسری جانب سے منظور وٹو نے وفاق کی جانب سے صوبے کا انتظام سنبھالنے کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ (۱۶)

ابھی یہ سرکشی جاری تھی کہ نواز شریف حکومت اور غلام اسحٰق خان کی رخصتی کا وقت آن پہنچا اور ۱۸/ جولائی ۱۹۹۳ء کو قومی اسمبلی کے ساتھ ساتھ تمام صوبائی اسمبلیاں بھی توڑ دی گئیں۔ پنجاب اسمبلی تو خیر پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ مگر اب تمام وزرائے اعلیٰ بھی رخصت ہو گئے اور یوں منظور وٹو کا کھیل اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ (۱۷)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں میاں یٰسین وٹو اور میاں منظور وٹو ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ میاں یٰسین وٹو پاکستان مسلم لیگ (ن) اور میاں منظور وٹو پاکستان مسلم لیگ (ج) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے۔ یہ معرکہ میاں یٰسین وٹو کے ہاتھ رہا اور انہوں نے اپنے حریف کو تقریباً تین ہزار ووٹوں سے ہرا دیا۔ (۱۸) میاں یٰسین وٹو نے ۱۹۹۷ء میں قومی اور صوبائی اسمبلی دونوں کے انتخابات میں حصہ لیا۔ قومی اسمبلی کے انتخاب میں انہوں نے میاں منظور وٹو کو شکست دی مگر صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں وہ میاں منظور وٹو کے صاحبزادے معظم جہاں زیب احمد خان وٹو سے شکست کھا گئے۔ (۱۹) انتخابات کے بعد میاں یٰسین وٹو وفاقی وزیر برائے پارلیمانی امور کے منصب پر فائز ہوئے۔ (۲۰) میاں یٰسین وٹو نے ۲۹/ اپریل ۲۰۰۲ء کو کار کے ایک حادثے میں وفات پائی۔ (۲۱)

۲۰۰۲ء میں میاں یٰسین خان وٹو کے بھائی میاں محمد معین خان وٹو اور بیٹے جاوید یٰسین وٹو نے این اے ۱۴۷ اوکاڑہ ۵ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر دونوں ہی میاں منظور وٹو کی صاحبزادی روبینہ شاہین وٹو سے شکست کھا گئے۔ جاوید یٰسین وٹو پی پی ۱۹۳ اوکاڑہ ۹ سے صوبائی اسمبلی کی رکنیت کے بھی امیدوار تھے مگر وہ اس نشست پر بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۲)

ادھر ۱۹۹۳ء میں میاں منظور احمد وٹو اپنے آبائی علاقے اوکاڑہ سے قومی اور صوبائی دونوں نشستوں سے تو انتخاب لڑ ہی رہے تھے مگر حفظ ماتقدم کے طور پر انہوں نے پی پی ۴۷ فیصل آباد ۵ سے بھی انتخاب لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی دور اندیشی ان کے کام آگئی کیونکہ اپنے آبائی علاقے میں تو وہ دونوں نشستوں پر شکست کھا گئے مگر فیصل آباد کی نشست پر وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے اور بعد ازاں ایک مرتبہ پھر پنجاب کی وزارت اعلیٰ پر فائز ہو گئے۔ (۲۳) ۱۹۹۷ء میں میاں منظور خان وٹو نے قومی اسمبلی کے انتخاب میں میاں یٰسین وٹو کے ہاتھوں شکست کھائی۔ وہ صوبائی اسمبلی کی نشست کے بھی امیدوار تھے مگر اس نشست پر انہوں نے اپنی بجائے اپنے بیٹے معظم جہاں زیب احمد خان وٹو کے حق میں مہم چلائی اور یوں ان کے بیٹے اس نشست پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۲۴) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں نہ انہوں نے خود حصہ لیا نہ ان کے بیٹوں نے البتہ ان کی بیٹی روبینہ شاہین قومی اسمبلی کی رکن بننے میں کامیاب ہو گئیں۔ (۲۵) میاں منظور وٹو کے صاحبزادے خرم جہانگیر وٹو ۲۰۰۵ء میں دیپال پور کے تحصیل ناظم منتخب ہوئے۔ (۲۶)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں میاں عطا محمد مانیکا نے پی پی ۱۵۹ اوکاڑہ ۷ سے حصہ لیا اور میاں امداد حسین داریکا وٹو کو ہرا کر پنجاب اسمبلی کے رکن بن گئے۔ (۲۷) ۱۹۹۷ء میں میاں عطا محمد مانیکا نے اپنا حلقہ تو معظم جہاں زیب احمد خان وٹو کے لیے خالی چھوڑ دیا اور خود ایک نئے حلقے پی پی ۱۹۰ پاک پتن ۲ سے انتخاب لڑا۔ مگر وہ اپنی اس حکمت عملی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۸) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر پاک پتن سے انتخاب لڑا اور نسیم ہاشم خان کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۲۹) میاں عطا محمد مانیکا، میاں خدا یار مانیکا کے صاحبزادے ہیں۔ (۳۰) جو ۱۹۵۱ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ان کا ذکر اوپر کے صفحات میں بالتفصیل گزر چکا ہے۔

۱۹۹۳ء میں میاں خادم حسین وٹو عرف محمد اختر خادم، اسی نشست پر جس پر ۱۹۸۵، ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ء میں اپنی کامیابی کی ہیٹ ٹرک مکمل کی تھی، محمد سردار خان گدھوکا سے ۲۳ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۳۱) ۱۹۹۷ء میں بھی ناکامی ان کا مقدر بنی (۳۲) تاہم ۲۰۰۲ء میں وہ نہ صرف اپنی کھوئی ہوئی نشست دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے بلکہ زکوٰۃ اور عشر کے صوبائی وزیر کے منصب پر بھی فائز ہو گئے۔ (۳۳)

حوالہ جات

۱۔ حالیہ انتخابات میں کامیاب ہونے والے ۴ وٹو، چاروں بر سر اقتدار۔ میگزین روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۱۳؍تا ۱۹؍جولائی ۱۹۸۵ء ص ۳،۲

۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۵۰، ۲۵۴

۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۷۲

۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴، ۲۷، ۴۵۳

۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۰۹

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۱۲

۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء جلد دوم۔ ص ۵۴

۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء جلد دوم۔ ص ۲۳۳

۹۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۳۶۲

۱۰۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۴۱۷ تا ۴۱۹

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم ص ۹۷

۱۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۵۹

۱۳۔ امان اللہ خان (ایڈیٹر) ڈائرکٹری ارکان صوبائی اسمبلی پنجاب۔ ۱۹۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۱۷۹

۱۴۔ شیخ حق نواز۔ لاہور سے لاہور تک۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۳؍تا ۹؍مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

۱۵۔ شیخ حق نواز۔ لاہور سے لاہور تک۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ مورخہ ۵؍تا ۱۱؍جولائی ۱۹۹۳ء ص ۱۳

۱۶۔ شیخ حق نواز۔ لاہور سے لاہور تک۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ مورخہ ۱۲؍تا ۱۸؍جولائی ۱۹۹۳ء ص ۱۳

۱۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹؍جولائی ۱۹۹۳ء

۱۸۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴؍اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۲۸۶

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۸۷، ۳۳۷

۲۰۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء۔ (جلد اول) لاہور۔ ص ۱۳۳

۲۱۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳۰؍اپریل ۲۰۰۲ء

۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۵۴، ۱۸۵

۲۳۔ امان اللہ خان (مرتب) ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۳ء۔ لاہور۔ ص ۱۳۰

وریو

سیالکوٹ میں ایک موضع کا نام وریو ہے جہاں قیام پاکستان کے بعد ضلع گورداسپور کے کئی گوجر گھرانے آ کر آباد ہوئے۔ انہی میں سے ایک خاندان چودھری اختر علی کا خاندان ہے جو گزشتہ دو دہائیوں سے سیالکوٹ کے سیاسی افق پر چھایا ہوا ہے اور اپنے موضع کی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ وریو کا لاحقہ بھی لگاتا ہے(۱)۔

اس خاندان کے جس فرد نے سب سے پہلے سیاست کے میدان میں قدم رکھا وہ چودھری عبدالستار وریو تھے تاہم ان سے پہلے کچھ ذکر ان کے بڑے بھائی چودھری اختر علی وریو کا جو ۱۹۷۹ء سے سیاست کے میدان میں ہیں اور ان کی کامیابی کا ریکارڈ بھی ان کے بھائی کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے۔

چودھری اختر علی وریو نے اپنی سیاست کا آغاز ۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات سے کیا اور ڈسٹرکٹ کونسل کے رکن اور پھر چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۳ء کے بلدیاتی انتخاب میں بھی وہ ضلع سیالکوٹ کی کونسل کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے پنجاب اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا اور پی پی ۱۴۳ سیالکوٹ ۲ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ ۱۹۸۸ء میں وہ پنجاب کے نگراں وزیراعلیٰ کے مشیر خصوصی کے منصب پر فائز ہوئے (۲)۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر اسی حلقے سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور پنجاب کی صوبائی کابینہ میں وزیر تعمیرات و مواصلات بنائے گئے ۱۹۹۳ء میں وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) سے علیحدہ ہوکر پاکستان مسلم لیگ (جونیجو گروپ) میں شامل ہو گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا اور دونوں ہی میں کامیاب رہے۔ بعدازاں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی (۳)۔ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں ان کے ستارے یاوری نہیں کر سکے اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں دونوں انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدواروں سے شکست کھا گئے۔ قومی اسمبلی کے انتخابات میں انہیں احسن اقبال نے ہرایا جبکہ صوبائی اسمبلی میں انہیں ادریس احمد باجوہ نے شکست دی (۴) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ نیب میں مقدمے کے باعث حصہ نہیں لے سکے اور یوں کسی بھی عوامی ادارے کی

رکنیت حاصل نہ کر سکے(۵)

چودھری اختر علی وریو کے چھوٹے بھائی چودھری عبدالستار وریو ہیں۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ (کنونشن) اور ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں پاکستان قومی اتحاد کے ٹکٹ پر حصہ لیا۔ لیکن دونوں انتخابات میں کامیاب نہ ہوسکے(۶) ۱۹۸۵ء میں انہیں پروفیسر محمد احمد نے شکست دی(۷) ۱۹۸۷ء میں وہ ڈسٹرکٹ کونسل سیالکوٹ کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۸ء میں جب میاں محمد نواز شریف نے اپنی سیالکوٹ والی نشست خالی کی تو اس نشست پر اسلامی جمہوری اتحاد نے چودھری عبدالستار وریو کو اپنا امیدوار نامزد کردیا۔ ان ضمنی انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی نے چودھری سکندر حیات ملہی کو اپنا امیدوار نامزد کیا۔ دونوں امیدواروں میں زوردار مقابلہ ہوا اور چودھری عبدالستار وریو قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے(۸)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں چودھری عبدالستار وریو ایک مرتبہ پھر اسی حلقے سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور وفاقی وزیر بھی رہے۔ مگر ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ اپنے دیرینہ حریف چودھری سکندر حیات ملہی سے شکست کھا گئے جنہیں ۱۹۹۳ء کی طرح اس مرتبہ بھی پاکستان مسلم لیگ (ن) نے اپنا امیدوار نامزد کیا تھا۔ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے فعال حصہ نہیں لیا تاہم ان کے حلقے سے علی اسجد ملہی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے(۱۱) جنہیں ان انتخابات میں وریو خاندان کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

چودھری اختر علی وریو کے صاحبزادے چودھری خوش اختر سبحانی ہیں:

چودھری خوش اختر سبحانی پہلی مرتبہ ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۹۳ء میں وہ نہ صرف دوسری مرتبہ پنجاب اسمبلی کے رکن بنے بلکہ صوبائی کابینہ کے رکن بننے میں بھی کامیاب ہوئے۔ ان کے پاس ہاؤسنگ اور فزیکل پلاننگ کا قلمدان تھا(۱۲) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں ان کے حلقے سے ان کے والد چودھری اختر علی وریو نے انتخاب لڑا مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ خود چودھری خوش اختر سبحانی نے قومی اور صوبائی، دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا مگر دونوں ہی میں کامیاب نہ ہوسکے(۱۳) ۲۰۰۲ء میں وہ تیسری مرتبہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۴) چودھری عبدالستار وریو کے صاحبزادے ارمغان سبحانی ہیں۔ وہ ۱۹۹۳ء میں پہلی مرتبہ اپنے چچا چودھری اختر علی وریو کی خالی کردہ نشست پر ضمنی انتخاب میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے(۱۵)۔ ۲۰۰۲ء میں وہ قومی اسمبلی کے انتخابات میں کھڑے ضرور ہوئے تھے لیکن انہوں نے اپنی تمام تر توجہ صوبائی نشست پر مرکوز رکھی۔ اس کے باعث وہ قومی اسمبلی کے انتخابات میں صرف ۵۳۲ ووٹ حاصل کر سکے جبکہ صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں وہ بھاری اکثریت سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے(۱۶) انتخابات میں کامیابی کے بعد وہ پنجاب کابینہ کے رکن رہے۔ ان کے پاس پاور کا قلم دان تھا(۱۷)

حوالہ جات

۱۔ اشفاق نیاز۔ تاریخ سیالکوٹ۔ سیالکوٹ۔ ص۱۵۵
۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص۲۰۳
۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص۲۰۰
۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ ۱۹۹۷ء۔ جلد دوم۔ ص۷۲، ۲۸۲
۵۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص۲۰۰
۶۔ ڈاکٹر جاوید بٹ۔ سیالکوٹ کا چوہدری خاندان۔ ہفت روزہ تصویر پاکستان لاہور۔ ۳رفروری ۱۹۹۵ء۔ ص۸
۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص۱۹۰
۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص۵۶۰، ۵۶۱
۹۔ اشفاق نیاز۔ تاریخ سیالکوٹ۔ سیالکوٹ۔ ص۱۵۵
۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۷۱
۱۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص۲۹۲۴
۱۲۔ امان اللہ خان۔ ڈائرکٹری اراکین صوبائی اسمبلی پنجاب ۱۹۹۳ء لاہور۔ ص۱۸۳، ۳۲۸
۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۷۰، ۷۱، ۲۸۳
۱۴۔ پراونشل اسمبلی آف دی پنجاب ۲۰۰۲ء بائیوگرافی آف ممبرز۔ لاہور۔ ص۱۲۵
۱۵۔ ایضاً۔ ص۱۲۷
۱۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء ص۲۹۲۴، ۳۰۲۵
۱۷۔ پراونشل اسمبلی آف دی پنجاب ۲۰۰۲ء۔ بائیوگرافی آف ممبرز۔ لاہور۔ ص۳۸۴

تیسرا حصّہ

صوبہ سندھ

ارباب

ارباب خاندان صحرائے تھر کا مالک اور ارباب امیر حسن اس علاقے کے بے تاج بادشاہ سمجھے جاتے ہیں۔

ارباب خاندان سمہ قبیلے کی ایک شاخ ہے جس نے سندھ پر تقریباً تین سو برس حکومت کی ہے۔ سندھ کے دوسرے قبیلوں کی طرح یہ قبیلہ بھی مختلف شاخوں اور خاندانوں میں بٹا ہوا ہے۔ ارباب خاندان اس علاقے میں بارہویں صدی عیسوی کے اوائل سے آباد ہے اور علاقے کی سیاست پر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ (۱)

بیسویں صدی میں اس خاندان کی جس شخصیت نے سب سے پہلے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ ارباب توگاچی تھے۔ ارباب توگاچی نہ صرف قیام پاکستان سے پہلے قائم ہونے والی دونوں سندھ اسمبلیوں کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۲) بلکہ ۱۹۵۳ء میں بھی ضلع تھر پارکر سے صوبائی اسمبلی کے رکن بنے۔ (۳)

ارباب توگاچی کے صاحبزادے ارباب فیض محمد تھے جو ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء چاروں عام انتخابات میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۴) ارباب توگاچی اور ارباب فیض محمد دونوں کا تعلق ارباب قبیلے کی نوہڑی شاخ سے تھا۔

ارباب فیض محمد نے ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں حصہ نہیں لیا تاہم ۱۹۹۷ء میں وہ اسی حلقے سے بلامقابلہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۵) ۲۷ نومبر ۲۰۰۰ء کو ان کا انتقال ہوگیا (۶)

نوہڑی شاخ کے سردار ارباب امیر حسن ہیں۔ وہ تھر کے بے تاج بادشاہ سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ سیاست پر ان کی گرفت کمزور پڑتی جارہی ہے۔

ارباب امیر حسن نے ۱۹۷۰ء میں کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پہلی مرتبہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور تھرپارکر ۵ سے اسمبلی کے رکن بننے میں کامیابی حاصل کی۔ (۷) اس وقت صوبائی اسمبلی کا حلقہ قومی اسمبلی کے موجودہ حلقے کے برابر تھا۔ کامیابی کے بعد ارباب امیر حسن پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل

ہو گئے۔

۱۹۸۱ء میں ارباب امیر حسن جنرل ضیاء الحق کی نامزد کردہ مجلس شوریٰ میں شامل ہوئے (۸) ۱۹۸۵ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کے مدمقابل غلام محمد میمن عرف لاٹ صاحب تھے۔ ارباب امیر حسن نے انہیں ۱۵ ہزار سے زائد ووٹوں سے شکست دی۔ تاہم غلام محمد میمن اس شکست سے دل گرفتہ نہیں ہوئے اور انہوں نے انتخاب ہارنے کے بعد بھی ووٹرز سے مسلسل رابطہ رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۸۸ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کا ٹکٹ ان کے صاحبزادے گل محمد میمن کو مل گیا۔ پیر صاحب پگارا کے مریدوں اور ارباب امیر حسن سے ناراضی رکھنے والوں گروپوں نے بھی لاٹ گروپ کا ساتھ دیا۔ (۹) گل محمد میمن زبردست مقابلے کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکے تاہم انتخابی نتائج نے ارباب امیر حسن کو ہلا کر رکھ دیا۔ ارباب امیر حسن نے اس انتخاب میں ۴۱۲۷۹ ووٹ حاصل کئے جب کہ گل محمد میمن نے ۳۸۴۶۹ ووٹ حاصل کئے۔ سندھ کے مشہور کمیونسٹ رہنما جام ساقی بھی اسی نشست سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ان کے حاصل کردہ ووٹوں کی تعداد ۱۷۵۲ تھی، پھر گل محمد میمن نے اس نشست پر دو ''کورنگ'' امیدوار بھی کھڑے کئے تھے۔ جن میں ایک ان کے والد غلام محمد میمن اور دوسرے امیدوار مراد علی ایڈووکیٹ تھے۔ مگر ان دونوں کورنگ امیدواروں نے مجموعی طور پر ۱۲۶۰ ووٹ حاصل کئے۔ باالفاظ دیگر ارباب امیر حسن کے حق میں پڑنے والے ووٹوں کی بہ نسبت ان کی مخالفت میں پڑنے والے ووٹوں کی تعداد زیادہ تھی۔ (۱۰)

انتخاب جیتنے کے بعد جب پاکستان پیپلز پارٹی برسراقتدار آئی تو ارباب امیر حسن نے اپنی روایت کے مطابق پارٹی کی حمایت کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم جونہی محترمہ بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوئی۔ ارباب امیر حسن کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز سے جا ملے۔ عدم اعتماد کی تحریک کی ناکامی کے بعد ارباب امیر حسن کو اپنی ''غلطی'' کا احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ جناب قائم علی شاہ کو اپنے گاؤں ڈوڈو مارو بلا کر باقاعدہ پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اگست ۱۹۹۰ء میں بے نظیر بھٹو کی معزولی کے بعد ارباب امیر حسن ایک مرتبہ پھر۔ بے نظیر کے مخالفین سے جا ملے اور غلام مصطفیٰ جتوئی اور جام صادق علی سے ربط ضبط بڑھانے لگے۔ (۱۱)

مگر جب انتخاب کا مرحلہ آیا تو انہوں نے ووٹرز کے عتاب سے بچنے کے لئے اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کو آگے کر دیا۔ ارباب غلام رحیم ڈسٹرکٹ کونسل تھرپارکر کے چیئرمین اور سابق وزیر اعلیٰ اختر علی جی قاضی کے مشیر رہ چکے تھے (۱۲) انہوں نے ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں پی ایس ۵۷ تھرپارکر ۳ سے انتخاب لڑا تھا مگر غلام محمد میمن عرف لاٹ صاحب سے شکست کھا گئے تھے۔ (۱۳) جنہیں ۱۹۸۵ء میں ان کے بھائی ارباب امیر حسن نے قومی اسمبلی کی نشست پر ۱۵ ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دی تھی۔

۱۹۹۰ء میں ارباب غلام رحیم نے پی ڈی اے کے فقیر محمد حفیظ سے مقابلہ کیا اور انہیں تقریباً ۱۲ ہزار ووٹوں سے شکست دی ۱۴۔ انتخاب جیتنے کے بعد ارباب غلام رحیم نواز شریف کا ساتھ دینے لگے۔ مگر جب ۱۹۹۳ء میں غلام اسحٰق خان اور نواز شریف میں محاذ آرائی کا آغاز ہوا تو ارباب غلام رحیم غلام اسحٰق خان کے کیمپ سے جا ملے۔ جس کا صلہ انہیں بلخ شیر مزاری کی نگراں کابینہ میں شمولیت کی صورت میں ملا۔ اس نگراں کابینہ میں انہیں سیاسی امور کا قلم دان سونپا گیا تھا۔ (۱۵) ۱۹۹۳ء کے انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کیا اور اسی پارٹی کے ٹکٹ پر این اے ۲۷۱ تھر سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے میں کامیاب ہوگئے (۱۷)۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں ارباب غلام رحیم نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصّہ لیا اور ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۸) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے قومی اور صوبائی اسمبلی، دونوں کے انتخاب میں حصہ لیا اور دونوں میں کامیابی حاصل کی (۱۹) تاہم بعد میں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست خالی کر دی۔ اس نشست پر تین مرتبہ ضمنی انتخابات منعقد ہوئے۔ پہلی مرتبہ اس نشست پر ارباب زکاء اللہ بلا مقابلہ کامیاب ہوئے (۲۰) دوسری مرتبہ اس نشست پر ضمنی انتخاب اس وقت منعقد ہوئے جب وزیر اعظم شوکت عزیز کو وزیر اعظم بننے کے لیے قومی اسمبلی کی نشست کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ ارباب ذکاء اللہ نے یہ نشست خالی کر دی اور ضمنی انتخاب میں جناب شوکت عزیز اسی نشست پر بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئے (۲۱) جناب شوکت عزیز نے اٹک اور تھر پارکر، دو حلقوں سے انتخاب لڑا تھا۔ وہ دونوں نشستوں پر کامیاب ہوئے۔ انہوں نے اٹک کی نشست برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا اور تھر پارکر کی مذکورہ بالا نشست خالی کر دی۔ چنانچہ اس نشست پر ایک مرتبہ پھر ضمنی انتخاب منعقد ہوا جس میں ارباب زکاء اللہ دوبارہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئے۔ (۲۲)

ارباب غلام رحیم نے ۹ جون ۲۰۰۴ء کو صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف اٹھایا (۲۳)

ارباب امیر حسن اور ارباب غلام رحیم کے ایک بھائی ارباب حاجی عبد اللہ ہیں جو ۲۰۰۲ء میں پہلی مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ہیں (۲۴)

۲۰۰۵ء میں ارباب انور، بلا مقابلہ تھر پارکر کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے۔ انہیں خوشحال پاکستان گروپ کی حمایت حاصل تھی (۲۵)

ارباب خاندان کی ایک اور شاخ راحموں کہلاتی ہے اس کے سربراہ ارباب مقبول احمد ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء تینوں انتخاب میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر ایک مرتبہ بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۶) یہ تینوں انتخابات انہوں نے آزادانہ حیثیت میں لڑے تھے۔ یہاں یہ

بات قابل ذکر ہے کہ راحموں شاخ کے سابق سردار ارباب نور محمد ۱۹۵۳ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۲۷) جب کہ ۱۹۷۷ء میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی تھی۔ (۲۸)

حوالہ جات

۱۔ ادارہ۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۸۸ء۔ ص ۱۲۲

۲۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۲۲۱، ۳۹۱

۳۔ گورنمنٹ آف سندھ۔ سندھ لیجسلیٹو اسمبلی ڈیبیٹس۔ اشاریہ اور ضمیمے۔ ۱۹۵۴ء۔ کراچی۔ ص ۸

۴۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴ مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۳۲۴، ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۶۰۴، ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۶۸۴، ۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۴۱

۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۴۸۴

۶۔ ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی، دسمبر ۲۰۰۱ء

۷۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ (سندھی) کراچی۔ ص ۱۰۰، ۱۰۱

۸۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۱ء

۹۔ زبیر احمد مجاہد۔ این اے ۱۷۲ (تھر) کی انتخابی صورتحال۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء

۱۰۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۵۷۷

۱۱۔ زبیر احمد مجاہد۔ این اے ۱۷۶ (تھر) کی انتخابی صورتحال۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۷۱

۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۷۹

۱۵۔ محمود غزنوی۔ قبضہ گروپ کی کابینہ۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۲۰ مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۶

۱۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳ اگست ۱۹۹۳ء

۱۷۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۱۰

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۱۳۴

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔

ص ۸۱، ۲۵۶

۲۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۳۷۹

۲۱۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹/اگست ۲۰۰۴ء

۲۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۴ء

۲۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۰/جون ۲۰۰۴ء

۲۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۲۵۶

۲۵۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء

۲۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد ۲۸/مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۳۶۰۴ ۳/دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۶۸۵، ۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۴۱

۲۷۔ تہور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ۵۵، ۱۹۵۴ء ایڈیشن۔ لاہور۔ ص ۱۹۳۔

۲۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴/مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۳۶۴

انڑ

نواب شاہ کے قریب سکرنڈ کے مقام پر آباد سماٹ قوم اپنے نام کے ساتھ انڑ کا لاحقہ لگاتی ہے۔ یہ قوم ٹھٹھہ کے مشہور رؤسا جام سمہ اور جام تماچی کی اولاد میں سے ہے (ا)

بیسویں صدی کے اوائل میں اس قبیلے کی سرداری میاں محمد انڑ کے پاس تھی جو انگریزوں کے بڑے خیر خواہ تھے اور انگریزوں نے انہیں خان صاحب کے خطاب سے نوازا تھا۔

میاں محمد خاں انڑ کے تین بیٹے تھے۔ رئیس رسول بخش انڑ، رئیس امام بخش انڑ، اور رئیس دھنی بخش انڑ۔

ان میں سے رئیس رسول بخش انڑ اپنے والد کی وفات کے بعد قبیلے کا سردار بنا اور سیاست کے میدان میں بھی نمایاں ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں وہ ضلع کونسل نوابشاہ کا رکن، ۱۹۲۸ء میں نائب صدر اور ۱۹۳۳ء میں صدر منتخب ہوا۔ مگر کچھ ہی عرصہ اور اس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے بعد جب ۱۹۳۷ء میں عام انتخابات منعقد ہوئے تو رئیس رسول بخش انڑ نے جی ایم سید اور حاجی حسن بخش کی حمایت سے انتخاب لڑا اور خان بہادر حاجی امام بخش جتوئی کو شکست دی۔

رسول بخش انڑ اتحاد پارٹی کے پلیٹ فارم سے رکن اسمبلی منتخب ہوا تھا مگر ہمیشہ پارٹی کے مقابلے میں جی ایم سید وغیرہ کا ساتھ دیتا رہا۔ اسی دوران سندھ کے سماٹ قوم کے لوگوں نے ایک کانفرنس بلائی جس میں رئیس رسول بخش انڑ کو سماٹ قوم کا صدر منتخب کیا گیا۔

۱۹۴۰ء کے لگ بھگ رئیس رسول بخش انڑ پر ایک یورپین کلکٹر مسٹر ڈیوس اور کچھ بدنیت پولیس اہل کاروں کی ایماء پر دفعہ ۱۱۰ کے تحت ایک مقدمہ چلایا گیا۔ رسول بخش انڑ اس وقت صوبائی اسمبلی کا رکن تھا۔ اس کا دفاع بھی مضبوط تھا مگر کلکٹر نے اسے سزا کا حکم دیا۔ بعد میں چیف کورٹ نے بھی اس کی اپیل مسترد کر دی۔ جی ایم سید کا کہنا ہے کہ یہ کارروائی دراصل

رسول بخش انڑ کی طاقت کم کرنے کے لئے کی گئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد رسول بخش انڑ کا رجحان درویشی کی طرف ہوا اور اس نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں حصہ نہیں لیا' تاہم ۱۹۵۳ء کے انتخابات میں اس نے حصہ لیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس انتخاب میں اس کی مخالفت جی ایم سید نے بھی کی (۲)

انگریزوں نے رئیس رسول بخش انڑ کو خان بہادر کا خطاب دینے کا اعلان کیا تھا۔ مگر اس نے یہ خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ صوبہ سندھ کا واحد شخص تھا جس نے اس خطاب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا (۳)

رئیس رسول بخش کے بعد سماٹ قبیلے کی سرداری ان کے صاحبزادے جام تماچی کے پاس آئی۔ سردار جام تماچی ۱۲ر جون ۱۹۵۴ء کو نواب شاہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۸۱ء میں مجلس شوریٰ سے کیا۔ وہ اس ادارے کے سب سے کم عمر رکن تھے۔ ۱۹۸۵ء میں وہ سینٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ اس ایوان میں بھی منتخب ہونے والے سب سے کم عمر شخص تھے (۴)

۱۹۸۸ء میں سردار جام تماچی نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا انہوں نے اپنے حریف رئیس شیر محمد انڑ کو تقریباً انیس ہزار ووٹوں سے شکست دی (۵) رئیس شیر محمد انڑ ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۶) ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں سردار جام تماچی پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ انہوں نے دو حلقوں سے کاغذات نامزدگی داخل کروائے تھے مگر پھر انتخاب میں حصہ نہیں لیا (۷)

سردار جام تماچی نے ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں بھی قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر کاغذات جمع کروائے مگر انتخابات میں زیادہ دلچسپی نہیں لی (۸) ۲۰۰۲ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹرین کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور پی ایس ۲۸ نواب شاہ ۵ سے بڑی بھاری اکثریت سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے (۹)

نواب شاہ سے ہی انڑ قبیلے ہی کے ایک اور فرد غلام رسول انڑ بھی عرصہ دراز سے میدان سیاست میں فعال ہیں۔ وہ ۱۹۷۷ء میں پی ایس ۲۲ نواب شاہ ۳ سے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۱۰) ۱۹۸۸ء میں انہوں نے پی ایس ۱۷ نواب شاہ ۳ سے انتخاب لڑا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے (۱۱) ۱۹۹۰ء میں انہوں نے آئی جے آئی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی نشست پر سید شبیر احمد شاہ سے مقابلہ کیا مگر اس مرتبہ بھی کامیاب نہ ہو سکے (۱۲) البتہ ۱۹۹۳ء میں جب وہ ایک مرتبہ پھر پیپلز پارٹی کا ٹکٹ لینے میں کامیاب ہوگئے تو پی ایس ۲۳ نواب شاہ ۴ سے بآسانی سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے (۱۳)

۱۹۹۷ء کے انتخابات میں بھی غلام رسول انڑ، اسی حلقے سے کامیاب ہوئے تاہم اس مرتبہ انہوں نے یہ انتخاب پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر لڑا تھا (۱۴)

۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا البتہ ان کے حلقے سے عبد الحفیظ انڑ نے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا جو پاکستان پیپلز پارٹی کے غلام قادر چانڈیو سے تقریباً گیارہ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۱۵)۔

انڑ قبیلے کی ایک شاخ خیر پور میں آباد ہے۔ اس شاخ سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون بیگم گلزار انڑ نے ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں بڑی شہرت کمائی تھی۔ ان کے میدان سیاست میں آنے کا پس منظر مختصراً یہ ہے کہ ان کا تعلق سندھ کی عام قوم سہنہ سے ہے۔ جس کی سندھ میں نہ کوئی سیاسی اہمیت ہے اور نہ مذہبی۔ ان کی شادی رسول بخش انڑ سے ہوئی جو پیر صاحب پگارا کے خاص عقیدت مند تھے اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ بھی رہے۔ بھٹو کے دور میں وہ پیر صاحب پگارا سے عقیدت مندی کی وجہ سے نوکری سے علیحدہ کئے گئے اور انہوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کرلیا۔۔۔ بیگم گلزار انڑ کی سیاست میں آمد بھی پیر پگارا کے سبب ہوئی اور وہ ۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر ضلع کونسل خیر پور کی رکن بن گئیں۔

اسی دوران رسول بخش انڑ کو زمین کے ایک تنازعے میں پیر پگارا سے شکایت ہوگئی اور یہ تنازعہ انہیں لاشعوری طور پر پیر پگارا سے دور لے گیا۔ ادھر ان کی اہلیہ سندھو دیش تحریک کے نرغے میں آگئیں اور ان کی برین وشنگ کا کام شروع ہوگیا۔

۱۹۸۳ء کے بلدیاتی اور ۱۹۸۵ء کے صوبائی انتخابات میں بیگم گلزار انڑ نے پیر پگارا کے صاحبزادے پیر صبغت اللہ شاہ راشدی عرف راجہ سائیں کا مقابلہ کیا، علاقائی اور قومی پریس نے اس مقابلہ کو بڑی اہمیت دی مگر بیگم گلزار انڑ دونوں انتخابات میں شکست سے دوچار ہوئیں۔ انتخابات کے بعد وہ دوبارہ پیر صاحب پگارا کے کیمپ میں آگئیں اور خواتین کی مخصوص نشستوں پر سندھ اسمبلی کی رکن منتخب ہوگئیں (۱۶)

بیگم گلزار انڑ، ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے بعد بھی خواتین کی مخصوص نشستوں پر سندھ اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھیں (۱۷)

انڑ قبیلے کی ایک اور شاخ لاڑکانہ میں آباد ہے۔ اس شاخ کے غلام عمر خاں انڑ اپنے علاقے کے معروف زمیندار تھے اور اپنے سماجی کاموں کی وجہ سے اب بھی اچھے الفاظ میں یاد کئے جاتے ہیں (۱۸) انہی غلام عمر خاں انڑ کے صاحبزادے غلام حسین انڑ تھے۔ جو ۱۹۸۵ء میں پہلی مرتبہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۸۸ء کے انتخاب سے قبل انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ایک مرتبہ

پھر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے میں کامیاب ہوئے۔ (۱۹) اس رکنیت کے دوران انہوں نے مبینہ طور پر ایک ایسا کارنامہ انجام دیا، جس کی بازگشت اس چارج شیٹ میں بھی سنائی دی، جو صدر غلام اسحٰق خان نے ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کو برطرف کرتے ہوئے سنائی تھی۔ (۲۰)

اس واقعہ کی تفصیل ہفت روزہ حرمت نے اپنے ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں یوں بیان کی تھی:

''اس سال اخبارات میں شائع ہونے والی سب سے بڑی اور دہشتناک خبر پاکستان کی تاریخ میں ہونے والی اس اہم ترین ڈکیتی کی ہے۔ جس میں پیپلز پارٹی کے ایک سابق رکن صوبائی اسمبلی غلام حسین انڑ نے برطانیہ میں مقیم ایک پاکستانی سے کراچی میں پونے دو کروڑ روپے ہتھیا لئے۔ اس مقصد کے لئے غلام حسین انڑ اور اس کے ساتھیوں نے مرتضٰی حسین بخاری کو ایک ہوٹل سے زبردستی اغوا کیا اور کئی روز تک ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بنگلے میں مسلح افراد کی نگرانی میں حبس بے جا میں رکھ کر اس پر تشدد کیا اور پھر اس کی ٹانگ سے ایک ٹائم بم باندھ کر ایک کروڑ ستر لاکھ روپے کی بھاری رقوم چھین لیں۔ غلام حسین انڑ کا تعلق ملک کی سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے آبائی ضلع لاڑکانہ سے ہے اور اسے گزشتہ سال ضلع کونسل لاڑکانہ کا چیئرمین بھی بنایا گیا۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق اس کی سرپرستی میں اس قسم کی وارداتیں منظم منصوبہ بندی کے ساتھ کی جاتی رہی ہیں اور وہ جونیجو کے مسلم لیگی دور حکومت میں پیپلز پارٹی ڈوگری کے صدر الٰہی بخش سیال کے قتل میں ملوث رہا ہے، جب کہ پچھلے چند برسوں میں اس کا نام اپنی بیوی کبریٰ شاہ کے قتل میں ملوث بتایا جاتا ہے۔ اس کے دو ساتھیوں علی بخش پالاری اور عاطف منظور نے مرتضٰی بخاری کی ٹانگ سے بم باندھا تھا اور اسے زبردستی چیک پر دستخط کرنے پر مجبور کیا تھا۔

اس ڈکیتی کی تفصیلات کے مطابق صدر تھانے میں ڈی آئی جی کراچی کی ہدایت پر پولیس نے غلام حسین انڑ اور اس کے بعض ساتھیوں کے خلاف مقدمہ درج کیا اس مقدمہ میں مدعی سید مرتضٰی حسین بخاری ساکن ۱۵۷ مارٹن روڈ لندن ہے۔ صدر تھانہ کے ذرائع کے مطابق مقدمہ کے اندراج کے بعد یہ معاملہ سی آئی اے کے حوالے کر دیا گیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق دوران تفتیش گرفتار ہونے والے ملزمان نے اہم انکشافات کیے۔ جن کے مطابق تمام ملزمان کا اصل سرپرست اس وقت کی ملک کی طاقتور ترین شخصیت کا رفیق ہے، جس کی رہائش کراچی کے ایک بہت ہی معروف ''ہاؤس'' میں ہے جو باخبر ذرائع کے مطابق دراصل ''بلاول ہاؤس'' ہے جہاں ایک بااثر شخصیت سابق وزیر اعظم کے شوہر آصف علی زرداری مقیم ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ گرفتار شدہ ملزم علی بخش پالاری دراصل پالاری نہیں بلکہ عباسی ہے اور دھوکہ دہی کے لئے اپنے نام کے ساتھ پالاری استعمال کرتا تھا۔ ایک مقامی انگریزی روزنامے کے مطابق اس واقعے کا علم بے نظیر بھٹو کو بھی تھا۔

اس سلسلے کی دیگر تفصیلات اور ایف آئی آر میں درج مدعی کے بیان کی روشنی میں ملزمان کا

نشانہ بننے والے مرتضیٰ حسین بخاری ایک معذور بچے کے والد ہوتے ہوئے اس قسم کے امراض کا شکار ہونے والے دیگر ہم وطن شہریوں کے علاج کے نیک جذبے کے تحت اسلام آباد میں ایک ہسپتال تعمیر کرنا چاہتے تھے۔اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے پاس سے کثیر رقم شامل کرنے کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں مقیم دیگر پاکستانی بھائیوں سے بھی بڑی مقدار میں عطیات وصول کئے اور اس طرح ایک کروڑ ۷۵ لاکھ روپے کا فنڈ جمع کر لیا۔ وہ بذات خود پیشے کے لحاظ سے ایک کنسٹرکشن انجینئر ہیں۔

یہ اگست ۱۹۸۹ء کے آخری ہفتے کی بات ہے، جب مرتضیٰ بخاری لندن سے کراچی پہنچ کر ہوٹل ہالی ڈے ان میں قیام پزیر ہوئے۔ اس دوران مجوزہ ہسپتال کے لئے پلاٹ کے حصول کی غرض سے ان کا رابطہ غلام حسین انٹر سے قائم ہوا جس نے اگلے روز انہیں وہاں سے تاج محل ہوٹل میں منتقل ہونے کو کہا کیونکہ انٹر اور اس کے ساتھیوں کو انہیں بلاول ہاؤس لے کر جانا تھا۔ لیکن حسب وعدہ بلاول ہاؤس لے جانے کی بجائے وہ ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بنگلے میں لے جائے گئے، جہاں انہیں پہلے سے موجود آٹھ مسلح افراد کے حوالے کر دیا گیا۔ وہاں انہیں حبس بے جا میں رکھ کر تشدد کے ذریعے ان ملزمان نے ان کی پونے دو کروڑ روپے کی رقم کے حصول کی کوشش شروع کی۔ جو دراصل بی سی سی آئی (بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل) میں جمع تھی۔ لہٰذا ملزمان نے ان سے جبراً مختلف چیک لکھوا کر انہیں بینک سے کیش کروانے کی کوشش کی، لیکن بعض پیچیدگیوں کی وجہ سے وہ چیک بینک نے واپس کر دیئے۔ اس کا علاج ملزمان نے یہ کیا کہ اگلے روز اپنی قید میں موجود مرتضیٰ حسین بخاری کی ایک ٹانگ پر بم باندھ کر انہیں بینک لے گئے جہاں اس دھمکی کے تحت کہ اگر انہوں نے شور مچانے یا کسی کو کچھ بتانے کی کوشش کی تو ریموٹ کنٹرول آلے کے ذریعے اس بم کے ساتھ انہیں بھی اڑا دیا جائے گا۔ ملزمان نے ان کے ساتھ رہ کر مطلوبہ رقم کے پے آرڈر تیار کروائے۔ ان میں سے ایک پچاس لاکھ روپے کا غلام حسین انٹر کے نام اور دوسرا ۴۵ لاکھ روپے کا علی بخش پالاری کے نام تھا۔ جب کہ مزید پانچ لاکھ روپے پالاری نے نقد وصول کئے۔ بقیہ ۷۵ لاکھ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ملزمان کی سرپرست بااثر شخصیت کے کھاتے میں چلے گئے۔ اس واردات کے دو روز بعد غلام حسین انٹر نے بینک سے اس بات کی یقین دہانی حاصل کی کہ تمام رقم ملزمان کے نام منتقل کر دی گئی ہے اور پھر اس رات دس بجے کے ایل ایم کی ایک پرواز کا ٹکٹ دے کر مرتضیٰ بخاری کو جبراً سخت نگرانی میں کراچی کے ہوائی اڈے لے گئے اور اپنی موجودگی میں انہیں لندن جانے والی پرواز پر روانہ کر کے واپس پلٹے۔

لندن واپس پہنچ کر مرتضیٰ بخاری نے سندھ کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس کو ایک تفصیل خط میں اس واردات کے بارے میں لکھا مگر اس پر فوری طور پر کوئی کارروائی نہ ہوسکی۔ حتیٰ کہ نئے آئی جی آغا سعادت علی شاہ نے چارج سنبھال لیا۔ ان کی نظر سے یہ درخواست گزری تو انہوں نے اس پر فوری

کارروائی کے احکامات صادر کرتے ہوئے باقاعدہ تفتیش کا آغاز کروایا۔ تاہم پولیس کے بعض قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ ستمبر ۱۹۸۹ء میں لندن پہنچنے کے بعد اپریل ۱۹۹۰ء میں اس سنگین شکار پر مرتضیٰ بخاری نے توجہ اس لئے دلائی کہ ان کے بیٹے کی بیوی اور ملزم غلام حسین انڑ کی بیوی دونوں سگی بہنیں ہیں۔ لہٰذا ان سات آٹھ ماہ کے دوران عین ممکن ہے دونوں خاندان اندرونی طور پر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہے جس میں مکمل ناکامی کے بعد انہوں نے مجبوراً پولیس کے اعلیٰ حکام سے رجوع کیا۔

پولیس کو دیئے گئے اپنے بیان میں مرتضیٰ بخاری نے بتایا کہ غلام حسین انڑ نے ہسپتال کے قیام کے لئے میرے ساتھ تعاون کی پیشکش کرتے ہوئے مختلف سرکاری محکموں سے کلیرنس دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ دریں اثناء پولیس نے بینک کے ریکارڈ کی چھان بین، مشتبہ افراد سے پوچھ گچھ اور ڈیفنس سوسائٹی کے اس بنگلے سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں، جہاں مرتضیٰ بخاری کو اغوا کر کے چھپایا گیا تھا۔ یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس پوری واردات میں مذکورہ رکن صوبائی اسمبلی غلام حسین انڑ مکمل طور پر ملوث تھا۔

باخبر ذرائع کے مطابق مرتضیٰ بخاری نے پولیس کو دیئے گئے اپنے بیان میں بتایا کہ اس کی کلفٹن کے بلاول ہاؤس میں آصف زردای سے کم ازکم تین مرتبہ ملاقات بھی کروائی گئی تھی جس کا مقصد ہسپتال کے لئے پلاٹ کے حصول میں اس کی اجازت اور تعاون حاصل کرنا تھا۔ اس کی تصدیق پولیس کی تحویل میں موجود ملزمان علی بخش پالاری اور عاطف منظور کے بیانات سے بھی ہوئی۔ ان ذرائع کے مطابق مسٹر بخاری کا اصرار تھا کہ آصف زرداری سے ملزمان کے ذریعے ہونے والی ملاقاتیں بھی یقیناً اس ڈکیتی کے منصوبے کا ایک حصہ تھیں۔" (۲۱)

بے نظیر حکومت کی معزولی کے بعد آصف زرداری اور غلام حسین انڑ پر اس الزام پر مقدمہ چلایا گیا۔ تاہم اسی دوران ملک میں عام انتخاب ہوئے اور آصف زرداری اور غلام حسین انڑ دونوں ہی بالترتیب قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے رکن منتخب ہوگئے۔ (۲۲)

نواز شریف کے دور حکومت میں آصف زرداری اور غلام حسین انڑ دونوں ہی عرصہ دراز تک قید میں رہے۔ مگر عدالت کی کارروائی طویل تر ہوتی گئی اور یوں دونوں ہی ملزمان ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں غلام حسین انڑ پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لیا۔ لیکن پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار نذیر احمد بگھیو سے شکست کھا گئے (۲۳)

۲۵ جنوری ۱۹۹۶ء کو غلام حسین انڑ کا انتقال ہوگیا (۲۴) غلام حسین انڑ کی وفات کے بعد ان کے بھائی الطاف حسین انڑ نے سیاست میں قدم رکھا اور ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء میں سندھ اسمبلی کے رکن

منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۷ء کا انتخاب انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑا تھا (۲۵) جب کہ ۲۰۰۲ء میں انہیں پاکستان مسلم لیگ (ق) کی حمایت حاصل تھی۔ الطاف حسین انڑ علی محمد مہر کی کابینہ میں وزیر بھی رہے تھے (۲۶)

حوالہ جات

۱۔ تہورعلی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان ۵۶۔۱۹۵۶ء۔ لاہور۔ ص۔ ۲۸۶

۲۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ حیدرآباد۔ جلد دوم۔ ص۔ ۲۸۲ تا ۲۸۸

۳۔ تہورعلی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان ۹۳۔۱۹۹۲ء۔ لاہور۔ ص۔ ۳۴

۴۔ تہورعلی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان ۹۳۔۱۹۹۲ء۔ لاہور۔ ص۔ ۳۴

۵۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۳/دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص۔ ۳۶۷۳

۶۔ ایضاً۔ ۲۸/مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۵۹۳

۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰۔ جلد دوم۔ ص ۳۱۸،۳۱۹

۸۔ ایضاً۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۴۵۱

۹۔ ایضاً جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد دوم۔ ص ۲۴۲

۱۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴ مارچ ۱۹۷۷۔ ص ۳۳۶۵

۱۱۔ ایضاً۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۶۷۳

۱۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۷۴

۱۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۶۱

۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ، جلد دوم۔ ص ۴۵۲

۱۵۔ ایضاً جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ، جلد دوم۔ ص ۲۴۱

۱۶۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۵۹

۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد اول۔ ص ۳۴۶

۱۸۔ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی۔ کجھ شخصیتوں۔ مشمولہ لاڑکانہ ساہ سیبانو۔ لاڑکانہ۔ ص۔ ۱۹۱،۱۹۲

۱۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۶۸

۲۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۷/اگست ۱۹۹۳ء

۲۱۔ ناصر محمود۔ چور بنے ہیں چوکیدار۔ ہفت روزہ حرمت ستمبر ۱۹۹۰۔ (خصوصی اشاعت)۔ ص۔ ۳۶

تا ۳۷

۲۲۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۔۶۰۵، ۶۱۹
۲۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۶۵
۲۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۶/جنوری ۱۹۹۶ء
۲۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۶۳
۲۶۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۵۹

بجارانی

بجارانی یا بجرانی میر بجر کی اولاد ہیں جو میر چاکر خاں ثانی کا چھوٹا بھائی تھا۔ ان دونوں بھائیوں میں آپس میں نہیں بنتی تھی چنانچہ جب میر چاکر خاں ثانی نے مغل شہنشاہ ہمایوں کی امداد کے لئے دہلی کا رخ کیا تو اس کی عدم موجودگی میں میر بجر نے علم بغاوت بلند کر دیا اور میر چاکر کے دارالحکومت سیبی (یا سبی) پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ میر چاکر خاں ثانی کو جب اپنے بھائی کی بغاوت کا علم ہوا تو اس نے باطل خاں کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا۔ جس نے نہ صرف میر بجر کو شکست دی بلکہ اس کے سب سے بڑے مددگار اور حمایتی ہیبتان کی بھی سرکوبی کی۔ میر بجر نے بعد ازاں کوہ دامن میں ایک بہت وسیع رقبہ پر اپنی حکومت قائم کی اور باقی زندگی امن و امان میں گزاری۔ جیکب آباد کے اولین آباد کار بجارانی' اسی میر بجر کی اولاد ہیں تاہم اب یہ قبیلہ مری قبیلے کی شاخ کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ (۱)

بیسویں صدی کے اوائل میں بجارانی قبیلے کے سردار' سردار شیر محمد خاں بجارانی تھے۔ وہ اٹھارہ سال لوکل بورڈ کے اور چودہ برس بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ انہیں انگریزوں کی خدمات کے عوض خان بہادر کا خطاب عطا ہوا تھا اور انہیں دہلی دربار بھی بطور خاص مدعو کیا گیا تھا جہاں انہیں دو تلواروں کے علاوہ تمغے' اسناد اور سفارشی خطوط سے نوازا گیا تھا۔ (۲) ۱۹۳۷ء میں وہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۳) انہوں نے ۲۵ جنوری ۱۹۳۹ء کو وفات پائی۔۔۔۔

سردار شیر محمد خاں بجارانی کے بعد ان کی وراثت ان کے بیٹے سردار نور محمد خاں بجارانی نے سنبھالی۔ وہ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے انہیں انگریزوں نے خان صاحب کا خطاب عطا کیا تھا۔ (۴) قیام پاکستان کے بعد وہ ۱۹۵۳ء کے عام انتخابات میں بھی سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ سندھ اسمبلی کے ان ارکان میں بھی

شامل تھے جنھوں نے ون یونٹ کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ (۵) ۱۹۵۶ء میں وہ صوبہ سندھ کی جانب سے مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے۔ (۶)

۱۹۷۰ء میں سردار نور محمد خاں بجارانی پاکستان پیپلزپارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۷۳-۱۹۷۲ء کے وسط میں انہوں نے اپنی نشست اپنے بیٹے میر ہزار خاں بجارانی کے لئے خالی کر دی۔ (۷) میر ہزار خاں بجارانی نے صرف اس نشست پر سندھ اسمبلی کے رکن بنے بلکہ وہ فوراً ہی غلام مصطفیٰ جتوئی کی کابینہ میں مواصلات، ٹرانسپورٹ اور زرعی ترقی کے وزیر بھی بن گئے۔ (۸) انہوں نے ۱۹۷۷ء میں بھی صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیتا اور کچھ دن آب پاشی اور بجلی کے صوبائی وزیر بھی رہے۔ (۹)

اسی کی دہائی میں میر ہزار خاں بجارانی سندھ پیپلزپارٹی کی سربراہی تک پہنچے۔ انہیں اس عہدے پر محترمہ بے نظیر بھٹو نے مخدوم خلیق الزماں کے استعفیٰ کے بعد نامزد کیا تھا۔ ۱۹۸۷ء کے بلدیاتی انتخابات کے بعد انہوں نے شکست کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور پھر اچانک مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر کے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرتے ہی انہیں سینٹ کا ٹکٹ بھی مل گیا اور وہ یہ نشست حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔

مئی ۱۹۸۸ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے جونیجو حکومت کو برطرف کیا تو میر ہزار خاں بجارانی نگراں کابینہ میں وفاقی وزیر صحت بنے۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ البتہ وہ ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں ضرور شریک ہوئے اور حلقہ این اے ۱۵۷ جیکب آباد ۲ سے پی ڈی اے کے میر مہران خاں بجارانی کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن بن گئے۔ (۱۰) بعد ازاں وہ جناب نواز شریف کی کابینہ کے رکن بنے۔ انہیں دفاعی پیداوار کا قلمدان سونپا گیا۔ (۱۱)

۱۹۹۳ء کے اوائل میں جب صدر غلام اسحٰق خاں اور وزیراعظم نواز شریف کے درمیان اختلافات اپنی انتہا کو پہنچے تو میر ہزار خاں بجارانی نے ہوا کی رخ کا اندازہ کرتے ہوئے غلام اسحٰق کیمپ میں شمولیت اختیار کی اور وفاقی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ چنانچہ اس کا صلہ انہیں یہ ملا کہ جب نواز شریف حکومت برطرف ہوئی تو وہ نگراں وفاقی کابینہ میں وزیر دفاع بنا دیئے گئے میر ہزار خاں بجارانی غلام مصطفیٰ جتوئی کی نگراں کابینہ میں بھی شامل تھے۔ (۱۲) یوں انہوں نے نگراں کابیناؤں میں شامل ہونے کی ”ہیٹ ٹرک“ مکمل کر لی۔

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں ایک مرتبہ پھر میر ہزار خان بجارانی اور میر مہران خان بجارانی ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ گو ایک ابتدائی انتخابی جائزے کے مطابق اس نشست پر میر ہزار خان بجارانی کا پلہ باری تھا (۱۳) مگر جب انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو میر مہران خان بجارانی ۱۲۸۹ ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو چکے تھے (۱۴)

۱۹۹۷ء میں میر ہزار خان بجارانی نے پاکستان پیپلز پارٹی، شہید بھٹو گروپ کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی (۱۵) ۲۰۰۲ء کا انتخاب انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر لڑا اور ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۶)

میر ہزار خاں بجارانی کے حقیقی بھائی سردار شیر محمد خان بجارانی ۱۹۸۵ء سے سندھ اسمبلی کا انتخاب پابندی سے لڑ رہے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں ان کا حلقہ پی ایس ۲ جیکب آباد ۲ تھا۔ اس انتخاب میں وہ کامیاب رہے۔ (۱۷) ۱۹۸۸ء میں ان کا حلقہ پی ایس ۱۱ جیکب آباد ۲ تھا۔ اس انتخاب میں وہ میر حاکم علی خاں سندرانی سے شکست کھا گئے۔ (۱۸) ۱۹۹۰ء میں بھی وہ پھر اسی حلقہ سے امیدوار تھے۔ اس انتخاب میں وہ میر حاکم علی خاں سندرانی سے اپنی شکست کا بدلہ لینے میں کامیاب ہو گئے اور ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۹) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر حاکم علی سندرانی کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی (۲۰) یہ تمام انتخابات انہوں نے آزادانہ حیثیت میں لڑے تھے۔

۱۹۹۷ء کے انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی، شہید بھٹو گروپ کے ٹکٹ پر حصہ لیا اور ایک مرتبہ پھر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۱) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے خود انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ ان کی جگہ ان کے صاحبزادے میر محبوب علی خان بجارانی نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور پی ایس ۱۶ جیکب آباد ۴ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے یہ انتخاب پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر لڑا تھا۔ (۲۲)

میر ہزار خاں بجارانی کے حریف میر مہران خان بجارانی ان کے ماموں ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پاکستان کی پہلی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۲۳) ۱۹۷۷ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ (۲۴) ۱۹۸۵ء ے غیر جماعتی انتخاب میں انہوں نے آزادانہ طور پر حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ وہ کچھ عرصہ جونیجو حکومت میں وزیر مملکت بھی رہے۔ ۱۹۸۸ء میں وہ دوبارہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور اپنے عزیز میر اللہ جوایو بجارانی عرف بکن خان کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ میر اللہ جوایو بجارانی نے پیپلز پارٹی کے لئے بڑی قربانیاں دی تھیں اور ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران ڈسٹرکٹ کونسل جیکب آباد کے چیئرمین کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا مگر جب انتخاب کا وقت آیا تو پیپلز پارٹی نے انہیں نظر انداز کر کے ۱۹۸۵ء کے انتخاب میں حصہ لینے والے اور جونیجو کابینہ میں وزیر بننے والے فرد کو ان پر ترجیح دے دی۔ (۲۵) میر مہران خاں بجارانی نے انتخابات کے بعد اپنے ووٹروں سے زیادہ رابطہ نہیں رکھا اور اپنا زیادہ تر وقت اسلام آباد میں گزارا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے ووٹروں سے کٹ کر رہ گئے اور جب ۱۹۹۰ء کے انتخابات ہوئے تو وہ میر ہزار خان بجارانی سے تقریباً ۴۶ ہزار ووٹوں سے شکست کھا

گئے۔ (۲٦) تاہم جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں وہ اپنا بدلہ چکانے میں کامیاب ہوئے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام کہیں نظر نہیں آیا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حیات خاں بیدار بلوچ۔ احسن البیان یعنی تواریخ بلوچاں۔ لاہور۔ ص ۵۰
۲۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ لاہور۔ ایڈیشن ۵٦۔۱۹۵۵ء۔ ص ۱۷۱
۳۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۲۱۲
۴۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ لاہور۔ ایڈیشن ۵٦۔۱۹۵۵ء۔ ص ۱۷۱
۵۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۱ / جنوری ۱۹۵٦ء
٦۔ پیر علی محمد راشدی۔ ون یونٹ کی تاریخ۔ لاہور۔ ص ٦٦، ۱۲۹
۷۔ ادریس بختیار اور حسن علی۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن ۹۰ء اسپیشل ایشو۔ ص ۸۴
۸۔ دی سندھ گورنمنٹ گزٹ۔ کراچی۔ مورخہ ۱۴ / جنوری ۱۹۷۴ء۔ ص ۵۱
۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۷ / اپریل ۱۹۷۷ء
۱۰۔ الیکن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم ص ۲۷
۱۱۔ موسیٰ خاں جلال زئی۔ کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟ لاہور۔ ص ۴۸٦
۱۲۔ محمود غزنوی۔ قبضہ گروپ کی کابینہ۔ ہفت روزہ حرمت۔ اسلام آباد۔ ۲۰ / مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵
۱۳۔ علی حسن، ادریس بختیار۔ اسٹوری ویدر۔ ماہنامہ ہیرالڈ۔ کراچی۔ الیکشن ۹۳ء۔ اسپیشل ایشو۔ ص ۱۱۳
۱۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ / اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۲۴۱
۱۵۔ ایضاً۔ ۲۰ / فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۲۳۸
۱٦۔ ایضاً۔ ۲۵ / اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۹۵۷
۱۷۔ ایضاً۔ ۲۸ / مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۵۹
۱۸۔ ایضاً۔ ۳ / دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳٦۷۱
۱۹۔ ایضاً۔ ۱۱ / نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۲۴
۲۰۔ ایضاً۔ ۱۸ / اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۵۳
۲۱۔ ایضاً۔ ۲۰ / فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۴۳۱

۲۲۔ ایضاً۔۲۵/اکتوبر۲۰۰۲ء۔ص ۳۰۸۶
۲۳۔ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان' ڈائرکٹری آف ممبرز۔ جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص۱۴۲
۲۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۱/ مارچ ۱۹۹۷ء۔ ص ۳۲۸۷
۲۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۳۶
۲۶۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۵۰۹

بھٹو

پاکستان کی سیاسی تاریخ پر شاید ہی کسی خاندان کے اتنے گہرے اثرات ہوں گے جتنے بھٹو خاندان کے ہیں۔ یہ خاندان اقتدار میں ہو یا اقتدار سے باہر' پاکستان کی سیاست اس خاندان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

بھٹو خاندان کی تاریخ کے حوالے سے جناب جی ایم سید اپنی کتاب "جنب گزاریم جن سین" میں رقم طراز ہیں:

"بھٹو اصل میں پنجاب کے رہنے والے ہیں' لاڑکانہ میں بھٹو قبیلے کا مورث اعلیٰ سرور محمد خاں آیا تھا' بعض کہتے ہیں کہ بھٹے ارائیں ہیں اور بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ جیسلمیر کے راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔ جن میں سے کسی نے پنجاب میں جا کر ارائیوں سے رشتے ناطے کر لئے۔ (۱)

جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے کہ بھٹو ارائیں ہیں. تاریخ ارائیاں کا مصنف لکھتا ہے:

"اضلاع سکھر' لاڑکانہ' جیکب آباد اور دادو میں ایک معقول تعداد بھٹو قوم کی پائی جاتی ہے ان کی قوم ارائیں اور گوت بھٹو ہے۔ سرسہ اور بھٹہ ضلع حصار میں ارائیوں کے دو بڑے گاؤں تھے۔ ۱۷۹۱ء کے قحط میں جب زلزلہ کے سبب دریائے سرسوتی خشک ہو گیا' تو ان لوگوں کو نقل مکانی کرنی پڑی۔ ایک بڑی تعداد مشرق کی طرف نکل گئی اور اضلاع پیلی بھیت' بریلی اور نینی تال میں جا کر آباد ہو گئی۔ کچھ لوگ پنجاب کی طرف چلے گئے اور کچھ لوگوں نے مغرب کی طرف رخت سفر باندھا اور اضلاع لاڑکانہ' سکھر اور دادو میں جا کر آباد ہو گئے۔ مغرب کی طرف جانے والوں کی زیادہ تعداد بھٹہ گاؤں سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے پیلی بھیت کے ارائیں سرسہ وال اور لاڑکانہ کے ارائیں بھٹو مشہور ہو گئے۔" (۲)

جبکہ دوسری جانب بھٹو کے ایک سوانح نگار اور مشہور مورخ رشید اختر ندوی بھٹو خاندان کی تاریخ رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ خیال صحیح ہے کہ بھٹو خاندان نسلاً" راجپوت ہے اور اس بڑے راجپوت قبیلہ "بھٹ" کی شاخ ہے جو محمود غزنوی کے ہم عصر مورخ البیرونی کی رو سے الور سے پندرہ فرسخ کے فاصلے پر ایک بڑا مقام "بھاٹیہ" میں آباد تھا اور جس کی غالب تعداد ملتان کے نواح میں سکونت رکھتی تھی اور اس کے ایک راجہ نے محمود غزنوی سے بڑی جنگ لڑی تھی۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:

"اس خاندان کے وہ پہلے بزرگ جو ضلع حصار کے ایک گاؤں "بھٹو" یا "بھٹ" سے انتقال وطن کر کے سندھ میں آباد ہوئے' وہ ساتھ خان مٹھا خان تھے۔ انہوں نے ضلع لاڑکانہ کو جائے رہائش کے طور پر کیوں پسند فرمایا اس کے بارے میں ہم زیادہ وثوق سے تو کوئی بات کہہ نہیں سکتے۔ مگر سندھ کے تاریخی حالات و واقعات کی رفتار اگر پیش نظر رکھی جائے تو یہ امر قرین قیاس ہے کہ کلہوڑہ خاندان کے میاں شاہ علی شاہل محمد سے ان کا روحانی رشتہ ترک وطن کا پہلا موجب بنا تھا کیونکہ یہاں آن کر وہ ان کے بڑے معتمد ساتھی اور رفیق کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔"(۳)

رشید اختر ندوی کی تائید مشہور مورخ اسٹنیلے والپرٹ (Stanley Wolpert) بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "زلفی بھٹو آف پاکستان' ہز لائف اینڈ ٹائمز" میں رقم طراز ہیں:

"سندھ کا مطلب "دریا" ہے کیونکہ دریائے سندھ یہیں پر آکر ختم ہوتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کی ابتداء سے ذرا قبل بھٹو خاندان بھارت کے مشرق میں واقع راجستھان کے صحرا راجپوتانہ سے نقل مکانی کر کے پانی کی تلاش میں سندھ میں آ بسا تھا۔ زلفی کے آباؤاجداد ہندو راجپوت تھے ان کا قبیلہ ایک دشوار گزار سفر کے بعد یہاں آیا تھا تاہم سترہویں صدی کے دوران وسط ایشیا سے آنے والے عظیم مغلوں نے پورے برصغیر کو فتح کر لیا اور کئی راجپوت جنگجوؤں سمیت زلفی کے مورث اعلیٰ شیتو (Sheto) نے بھی اسلام قبول کر لیا اس طرح راسخ العقیدہ مغل بادشاہ اورنگ زیب (۱۷۰۷ء۔ ۱۶۸۵ء) اور اس کے مسلم حاکموں سے ٹیکس میں چھوٹ اور دیگر مراعات حاصل کیں اور اپنے لئے قبیلہ کی سرداری اور شاہی خطاب "خان" بھی حاصل کیا۔" (۴)

تاہم محترمہ نصرت بھٹو اسٹینلے وولپرٹ کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بھٹو قبیلے کے وہ پہلے شخص جو دولت اسلام سے مالامال ہوئے' محمد خان تھے۔ شیتو خان ان محمد خان کی ساتویں پشت میں گزرے ہیں (۵)

بہرحال رشید اختر ندوی اور اسٹینلے وولپرٹ سمیت بھٹو خاندان کے سبھی مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ بھٹو خاندان کے وہ پہلے شخص جو راجستھان سے نقل مکانی کر کے سندھ میں آباد ہوئے۔ وہ شیتو خان تھے۔ اسٹینلے وولپرٹ لکھتے ہیں۔

"شیتو خان نے لاڑکانہ سے چند میل شمال میں رتوڈیرو سندھ میں اپنے لئے زرخیز اراضی کا انتخاب کیا اسی کے دیہی قصبہ میں دو صدی بعد زلفی پیدا ہوا۔ رتوڈیرو اور لاڑکانہ میں نہروں کے ذریعہ آنے والے دریائے سندھ کے میٹھے زرخیز پانی سے چاول اور گنے کی بھرپور فصلیں ہوئیں جو بھٹو خاندان کی ضرورت کے لئے کافی تھا۔ مزید یہ ہے کہ کپاس کی پیداوار سے کپڑا بھی خوب حاصل ہوا جس کے نتیجے میں بھٹو خاندان تیزی سے خوشحالی کی طرف گامزن ہو گیا۔ اس وقت تک شیتو خان کو کیا کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ لاڑکانہ سے دس میل سے بھی کم فاصلے پر دنیا کی قدیم ترین تہذیب موہن جو ڈرو کے آثار زمین میں دفن ہیں۔"

مغلوں کے زوال کے بعد ٹھٹھہ کے علاقے پر کلھوڑوں کے جنگجو قبیلے نے قبضہ کر لیا لیکن شیتو خان کے پوتے پیر بخش خان بھٹو نے انہیں لاڑکانہ سے مار بھگایا اور یہاں بھٹو خاندان کی عملداری قائم کر دی۔ بعد میں جب سندھ پر تالپور خاندان غالب آ گیا اور وڈیرہ پیر بخش نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو' اپنے بیٹے اللہ بخش خان بھٹو کو خیرپور کے دربار میں یرغمالی کے طور پر بھیجا۔ تالپوروں نے انہیں عزت و احترام کا مقام دیا۔

۱۷۵۸ میں ٹھٹھہ کے مقام پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا پہلا کارخانہ قائم کیا لیکن یہ کارخانہ چل نہ سکا۔ ۱۸۳۰ء میں انگریز ملاح دریائے سندھ کے راستے اپنی کشتیاں لے کر حیدر آباد تک آ گئے۔ اس وقت شمال میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی' امیران سندھ نے پنجاب کے سکھوں سے بچنے کے لئے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ۱۸۳۸ء میں کرنل ہنری پوتنگر کے ساتھ معاہدہ طے پا گیا تو ان کا ایک نمائندہ اور محافظ دستہ حیدر آباد میں قیام پذیر ہو گیا۔ تالپوروں میں ناچاقی پیدا ہو گئی تو اس کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا اور جنرل نیپئر کی قیادت میں ۱۸۴۳ء میں سندھ فتح کر لیا تو اس نے پیر بخش بھٹو کے فرزند دودو خان بھٹو کو اس علاقے کا سردار مقرر کیا۔

دودو خان کا پوتا میر غلام مرتضیٰ بھٹو خوبصورت' گبھرو' شیر جوان نکلا' اس زمانے میں لاڑکانہ میں ایک ۶۰ سالہ معمر انگریز مجسٹریٹ کلکٹر کرنل مے ہیو متعین تھا۔ اس نے ایک سندھی لڑکی شیر کو اپنی قید میں داشتہ بنا رکھا تھا۔ مرتضیٰ بھٹو کو اس لڑکی سے محبت ہو گئی' کرنل مے ہیو کو اس کی بھنک پڑی تو اس نے مرتضیٰ بھٹو کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا ارادہ کیا۔ ایک دن وہ کسی دور دراز کے علاقے میں دورے پر چلا گیا' مرتضیٰ کو پتہ چلا تو وہ لاڑکانے میں اس حسینہ کے پاس پہنچ گیا۔ کرنل مے ہیو موقع کی تاک میں تھا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا واپس آیا اور چابک لے کر مرتضیٰ پر برس پڑا۔ مرتضیٰ نے بھی جوابی حملہ کیا اور کرنل کو فرش پر اوندھا گرایا۔ اس پر چابک زنی کی اور اپنی محبوبہ شیر کو اس کے ماں باپ کے گھر پہنچا کر واپس رتوڈیرو چلا گیا۔

یہ ۱۸۹۲ء کا واقعہ ہے۔ بھٹو کے والد شاہنواز اس وقت صرف چار برس کے تھے۔ (بے نظیر نے اپنی خود نوشت سوانح "دختر مشرق" میں یہ واقعہ اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو سے سن کر لکھا

ہے' لیکن بھٹو نے اس کی صورت یکسر بدل دی ہے۔ سندھی حسینہ شیر کو برطانوی افسر کی بیٹی قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ انگریز لڑکی بھی مرتضیٰ بھٹو کو چاہتی تھی۔ مرتضیٰ اسے اس کے باپ کے سامنے بھگا کر لے گیا' پھر اسے اپنے آدمیوں سے قتل کروایا اور خود افغانستان بھاگ گیا ------ اس من گھڑت کہانی کی ساعت بے نظیر کو اچھی لگی ہے ----- اس سے جو اخلاقیات اس کے والد نے مرتب کی وہ تھی ----- عزت' اصول اور وفاداری کے جذبے کا تحفظ -----")۔

سر شاہنواز بھٹو اپنی خود نوشت سوانح میں (جو ابھی تک زیر طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی) لکھا ہے کہ "کرنل ہیو اس "ناخوشگوار واقعہ" کو پوشیدہ رکھنے کے لئے بہت بے چین تھا اسے معلوم تھا کہ اگر اسکینڈل سے پردہ اٹھ گیا تو اس کی ایڈمنسٹریٹو آفیسر کی ملازمت ختم ہو سکتی ہے۔ تاہم وہ اپنی یہ بے عزتی کبھی فراموش نہیں کر سکا۔ شاہنواز کے مطابق بعد میں لاڑکانہ کے قریب سندھ پولیس کے ایک انسپکٹر شیر محمد شاہ کو اس کے دشمنوں نے شدید زخمی کر دیا۔ مے ہیو نے (اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے) انسپکٹر شاہ سے کہا کہ اگر وہ یہ گواہی دے دے کہ میر مرتضیٰ بھٹو نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا ہے تو وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ اسے (شاہ کو) ترقی اور اراضی سے نوازے گا اور شاہ نے ایسا ہی کیا۔ سیشن جج نے میر مرتضیٰ کو سزا سنائی تاہم اس سزا سے بچنے کے لئے انہیں اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ ایک سال بعد کرنل نے ایک اور کھیل کھیلا اس مرتبہ نوجوان بھٹو کو ایک ہندو کے قتل میں پھانسنے کی کوشش کی اور عینی شہادت کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ یہ مقدمہ لڑنے کے لئے انہیں دو انگریز بیرسٹروں کو بھاری فیس ادا کرنا پڑی۔ بمبئی کے مسٹر امزٹی کو ایک ہزار روپے اور لاہور کے مسٹر روتیجن کو پندرہ سو روپے فی یوم خدمات پر حاصل کیا گیا۔ مقدمہ نے طول کھینچا اور سزا ختم ہو گئی۔ تاہم دونوں بیرسٹروں نے اس مقدمہ سے بہت پیسہ بنایا' اس کے باوجود پرانی دشمنی ختم نہیں ہوئی کرنل نے دوبارہ مقدمہ چلانے کے لئے بمبئی سے درخواست منظور کرا لی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے والد کے پاس اب اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ اسے عدالتوں میں لٹاتے (اس لئے) انہوں نے اپنے سرکش بیٹے کو فرار ہونے کا مشورہ دیا۔ نوجوان پہلے تو بہاولپور ریاست میں روپوش ہو گیا لیکن وہاں انگریزوں نے اس کا پتہ لگا لیا بعد میں وہ کابل چلا گیا جہاں کوئی انگریز افسر اس کی تلاش میں نہیں آ سکتا تھا۔"

بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو لکھتے ہیں کہ یہ ملک بدری مرتضیٰ بھٹو کے لیے بڑی سود مند ثابت ہوئی' اس سے انہیں افغانستان کے سرداروں سے سیاست کی ابجد سیکھنے کا موقع ملا۔

میر مرتضیٰ بھٹو کے فرار کی سزا ان کے والد خدا بخش خان بھٹو کو بھگتنا پڑی۔ کرنل مے ہیو ان کے خون کا پیاسا ہو گیا' آخر ایک روز ان پر ڈاکوؤں سے حملہ کرا دیا' خدا بخش خان زخمی ہو گئے اور اپنے گاؤں امیر آباد میں انتقال کر گئے۔ ان کا بیٹا مرتضیٰ چونکہ مفرور تھا' اس لئے کرنل

مے ہیو نے ان کے خاندان کے زر و جواہر اور اسلحہ پر قبضہ کر لیا اور فرنیچر' قالین اور غالیچوں پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ بھٹو خاندان کے افراد کو گڑھی خدا بخش سے تین کپڑوں میں نکال دیا۔ یہ ۱۸۹۶ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت بھٹو کے والد شاہ نواز کی عمر ۸ برس تھی۔ مرتضیٰ بھٹو نے اپنے والد کی وفات کی خبر سنی تو واپس آکر اپنا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے کابل کے امیر عبدالرحمان سے مالی امداد حاصل کی لیکن پنج ند کے قریب ان کی کشتی الٹ گئی اور سارا افغانی سونا دریا برد ہو گیا۔ مرتضیٰ بھٹو بمشکل بہاولپور پہنچے' جان پہچان کے آدمیوں سے کچھ قرض لیا اور سکھ مزدور کا لباس پہن کر کراچی میں رئیس غلام محمد شیدی کے پاس پہنچ گئے' ان کے تعاون سے مرتضیٰ بھٹو کی رسائی کراچی کے کمشنر سے ایون جیمز تک کروائی گئی۔ سر ایون نے ان کا مقدمہ سکھر سے کراچی کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ کراچی میں ان کا مقدمہ موتی لعل ایڈوانی نے لڑا اور مرتضیٰ بھٹو کو بری کرا دیا۔ اس زمانے میں کراچی میں "کالی پلیگ" پھیلی ہوئی تھی۔ مرتضیٰ بھٹو نے کراچی سے نکل کر سب سے پہلے لعل شہباز قلندر کے مزار پر حاضری دی اور پھر دادو میں اپنے ایک دوست علی محمد کے پاس آ گئے جو خان بہادر حسن علی آفندی کے فرزند تھے اور سول جج کے عہدے پر فائز تھے۔ یہاں انہیں معلوم ہوا کہ کرنل مے ہیو ریٹائر ہو رہا ہے۔ دونوں کی ملاقات علی محمد سول جج کے مکان پر ہوئی' مے ہیو نے پرانی دشمنی ختم کر دی اور بھٹو خاندان کی جائیداد کی واپسی کا حکم دے دیا۔ مرتضیٰ بھٹو لاڑکانہ آئے تو ایک فاتح کی طرح ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے ان سب لوگوں کو بھی معاف کر دیا جنہوں نے اس کے خلاف گواہی دی تھی اور انگریز کرنل مے ہیو کا ساتھ دیا تھا ------ تاہم یہ لوگ میر مرتضیٰ سے خوفزدہ تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ان سے اپنا انتقام ضرور لے گا' چنانچہ ایک ماہ بعد میر مرتضیٰ کو زہر دے کر مروا دیا گیا۔

شاہ نواز کی عمر اس وقت دس برس تھی' وہ اپنے سوتیلے بھائی علی گوہر خان سے پورے چوبیس گھنٹے یعنی ایک دن بڑے تھے' اس لیے شاہ نواز اچانک اپنے تمن کے سردار بن گئے' اب سازشوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ انگریز کلکٹر مسٹر میول نے دونوں بچوں کی نگہداشت کی۔ اراضی "کورٹ آف وارڈ" کے سپرد کر دی گئی۔ ممتاز علی بھٹو کے والد وڈیرہ والٰہی بخش خان کو شاہ نواز کا متولی مقرر کیا گیا۔ شاہ نواز نے ابتدائی تعلیم لاڑکانہ مدرسہ میں اور ثانوی تعلیم سندھ مدرسہ کراچی میں حاصل کی' اس زمانے میں بمبئی کی انگریزی حکومت نے اپنے وفادار جاگیرداروں کے بچوں کو سرکاری ملازمتیں دینے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا' چنانچہ شاہ نواز کو میٹرک پاس کرنے سے قبل ہی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی ملازمت دے دی گئی' نوجوان شاہ نواز ملازمت پر جانے سے قبل گڑھی پیر بخش آئے تو انہیں ایک بہت بڑے سانحے کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے سرپرست الٰہی بخش بھٹو (ممتاز بھٹو کے والد) غسل خانے میں گئے تو دیر تک باہر نہ نکلے' دروازہ

توڑ کر دیکھا گیا تو اندر الٰہی بخش بھٹو مردہ پڑے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۸ برس تھی۔ ڈاکٹروں نے موت کو حرکت قلب بند ہو جانے کا نتیجہ قرار دیا' بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انہوں نے خودکشی کرلی تھی۔ تاہم اس خودکشی کی وجہ لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

اب شاہ نواز ۲۰ برس کی عمر میں نہ صرف اپنے خاندان کے سربراہ بن گئے بلکہ وہ میر الٰہی بخش بھٹو کے خاندان کے متولی بھی بن گئے۔ ان کی کل اراضی ایک لاکھ ایکڑ سے زیادہ تھی' اپنی زمینوں پر اس نوجوان نے قدم رکھا تو ان کا دل بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنا اضطراب کم کرنے کے لئے سگریٹ طلب کیا' ملازم نے اپنی جیب سے بیڑی نکال کر پیش کی' یہ شاہ نواز کی زندگی میں کڑوی بیڑی کا پہلا کش تھا لیکن بعد میں سگریٹ نوشی ترک نہ کی جا سکی اور وہ "چین اسموکر" بن گئے تاہم ابھی وہ بالغ نہیں ہوئے تھے' ان کی زمینیں کورٹ آف وارڈ میں تھیں۔ نیا کلکٹر مسٹر سی ایم بیکر آیا تو اس نے ایک بنگالی ہندو کیمت راؤ کو اسٹیٹ مینجر مقرر کر دیا۔ ان دونوں نے شاہ نواز کو خوب تنگ کیا۔ اس کے پس منظر میں مے ہیو کی مرتضیٰ بھٹو سے دشمنی کا واقعہ بھی موجود تھا' چنانچہ آنے والا ہر نیا انگریز افسر اس دشمنی کو تازہ رکھتا۔ دوسری طرف الٰہی بخش بھٹو کی بیوہ چاہتی تھیں کہ جائیداد کی تقسیم عمل میں آ جائے۔ اس وجہ سے بھی شاہ نواز کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مارچ ۱۹۰۹ء میں جب ان کی عمر ۲۱ برس ہو گئی تو ان کی جائیداد کورٹ آف وارڈ سے واگزار ہو گئی۔ دونوں بھائیوں نے اپنا اپنا حصہ الگ کر لیا' تاہم میر الٰہی بخش کے بچے ابھی چھوٹے تھے' اس لئے ان کی جائیداد کی نگرانی شاہ نواز کے ذمے ہی رہی۔ اس وقت برطانوی ہندوستان میں دوررس نتائج کی حامل آئینی اصلاحات کی جا رہی تھیں' اس لیے شاہ نواز بھٹو بھی عوام کے مسائل و معاملات میں دلچسپی لینے لگے۔

انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء کے تحت لیجسلیٹو کونسل میں سندھ کو صرف ایک نشست حاصل تھی' جسے گورنر نامزدگی سے پر کرتے تھے' ۱۹۰۴ء تک اس نشست پر شیخ صادق علی وزیر آف خیر پور کو نامزد کیا جاتا رہا۔ جب وہ خیرپور کے وزیراعظم بنے تو ان کی جگہ سندھی بیرسٹر جی' ایم بھرگڑی کو نامزد کیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں سندھ کو تین مزید نشستیں مل گئیں۔ شاہ نواز بھٹو نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل دہلی میں مسٹر بھرگڑی کو شکست دے کر سندھ کی ایک نشست جیت لی۔ انگریز حکومت نے انہیں نہ صرف لاڑکانہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا پریذیڈنٹ مقرر کیا بلکہ انہیں انتظامی عدالتی اختیارات بھی تفویض کیے۔" (۶)

اس حوالے سے جناب رشید اختر ندوی اپنی کتاب "ذوالفقار علی بھٹو۔ سیاسی سوانح حیات" میں لکھتے ہیں:

"یہ بات دلچسپی کا موجب ہے اور جناب سر شاہنواز کی غیر معمولی مقبولیت اور ان پر عوام کے بے پناہ اعتماد کا مظہر بھی ہے کہ جناب سر شاہنواز ۱۹۲۰ء میں جب لاڑکانہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے

پہلی بار پریذیڈنٹ منتخب ہوئے تو ان کے پاس یہ منصب ۱۹۲۰ء سے لے کر مسلسل و متواتر ۱۹۳۴ء تک رہا۔ وہ برابر چودہ سال تک لاڑکانہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے پریذیڈنٹ رہے اس دوران انہوں نے لاڑکانہ کے عوام کو بہت فائدے پہنچائے۔ اسکول و ہسپتال قائم کئے' سڑکیں بنوائیں اور رفاہ عامہ کے دوسرے کام کئے۔

یہ ۱۹۲۱ء کا سال تھا یعنی ڈسٹرکٹ بورڈ لاڑکانہ کا پریذیڈنٹ منتخب ہوئے انہیں ایک سال ہو چکا تھا جب سر شاہنواز بمبئ لیجسلیٹو کونسل کے رکن بنائے گئے۔ یہ اعزاز بھی ان کے پاس چودہ سال تک رہا۔

وہ تنہا سندھ کے ایسے نمائندے تھے جنہیں یہ بلند منصب اتنی لمبی مدت تک میسر رہا۔ وہ پورے سندھ کے زمینداروں کے نمائندے تھے اور سندھ کا کوئی زمیندار بڑا یا چھوٹا ایسا نہ تھا جسے ان کی نمائندگی پر اس پوری مدت میں کوئی اعتراض پیدا ہوا ہو۔

اس پوری مدت میں سندھ میں کوئی اور شخصیت ایسی نہ ابھری جو ان کی حریف بن سکتی یا جو سیاسی زندگی میں ان سے دوبدو ہونے کا حوصلہ کرتی۔ اسی سال یعنی ۱۹۲۱ء میں انگریزی حکومت نے انہیں خان بہادر کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔

اس سے دو سال پہلے ۱۹۱۹ء میں انہیں او بی ای کا خطاب دیا گیا تھا۔ جو انگریز اور ان کے مابین تعلق کی پہلی سند تھی۔

۱۹۲۵ء میں انگریزوں نے انہیں سی آئی ای اور ۱۹۳۰ء میں سر کا خطاب دیا اگلے سال یعنی ۱۹۳۱ء میں لندن میں ہندوستان کے مستقبل سے متعلق آئینی تبدیلیوں کے بارے میں جو گول میز کانفرنس منعقد ہوئی' اس میں سندھ کے مسلمانوں کا جو چار افراد پر مشتمل وفد شریک کیا گیا اس کی سربراہی کی عزت انہی کو ملی۔

گول میز کانفرنس کے دوران سر شاہنواز بھٹو نے سندھ کو بمبئ سے جدا کرنے کا مطالبہ بڑی خوش اسلوبی سے اٹھایا۔ ان کے طرز استدلال سے اپنے اور پرائے سبھی بے حد متاثر ہوئے۔

۱۹۳۲ء میں وہ حیدر آباد والی "سندھ آزاد کانفرنس" میں جو علامہ یوسف علی کی صدارت میں ہوئی تھی' استقبالیہ کمیٹی کے ممبر تھے۔ اس کے بعد سندھ آزاد کانفرنس کے صدر مقرر کئے گئے اس کے سیکرٹری میاں محمد شاہ تھے۔

۱۹۲۴ء میں وہ بمبئ گورنمنٹ میں محکمہ لوکل سیلف کے وزیر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۲ء تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے اس کے بعد ایک سال کے لئے سندھ کے گورنر کے مددگار بھی رہے۔

۱۹۳۴ء میں انہوں نے سندھ پیپلز پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی۔ یہ سندھ میں مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت تھی۔ ۱۹۳۶ء میں سندھ بمبئ سے علیحدہ ہو گیا تو سندھ کے

مسلمانوں کی ایک اور سیاسی تنظیم سندھ اتحاد پارٹی وجود میں آئی اور شاہنواز بھٹو اس پارٹی کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں سندھ اتحاد پارٹی اکثریتی پارٹی کے طور پر ابھری۔ مگر بدقسمتی سے شاہنواز بھٹو خود کامیاب نہ ہو سکے۔ اتحاد پارٹی کے ارکان نے شاہنواز بھٹو کی وزارت بنانے کے لئے گورنر کے سامنے درخواست پیش کی مگر گورنر نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا کہ ایک شکست خوردہ شخص کو وزارت بنانے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ سید غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے وزیراعلیٰ بن گئے اور شاہنواز بھٹو کو بمبئی سندھ پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین بنا دیا گیا۔

۱۹۴۵ء تک شاہنواز بھٹو اسی منصب پر فائز رہے۔ یہ ۱۹۴۷ء کا آغاز تھا جب سر شاہنواز کو بمبئی کی ایک ساحلی مسلمان ریاست جوناگڑھ کے والی نے اپنی وزارت میں شمولیت کی دعوت دی۔ انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی اور جوناگڑھ تشریف لے گئے۔ بعد ازاں انہوں نے ریاست جوناگڑھ کے وزیراعظم کی خدمات سرانجام دیں اور اپنی اس حیثیت میں انہوں نے اگست ۱۹۴۷ء میں نواب جوناگڑھ کو اپنی ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرنے کے لئے آمادہ کرنے کی سعی کی، لیکن سردار پٹیل نے ان کی ایک نہ چلنے دی، چنانچہ ۱۹۴۷ء میں شاہ نواز بھٹو سمندر کے راستے کراچی آ گئے۔

پاکستان آنے کے بعد سر شاہنواز بھٹو نے عملی سیاست کو بالکل خیرباد کہہ دیا۔ یہاں تک کہ ۱۹ر نومبر ۱۹۵۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۷)

سرشاہنواز بھٹو نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کا پہلا لڑکا سکندر سات برس کی عمر میں نمونئے سے مر گیا تھا۔ اس کی وفات سے دو ماہ قبل ان کا دوسرا بیٹا امداد علی پیدا ہوا۔ وہ ۳۱ برس کی عمر میں ۱۹۵۳ء میں وفات پا گیا، سرشاہ نواز نے اپنی غیر مطبوعہ سوانح عمری میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیدائش کا ذکر تک نہیں کیا۔ زلفی ان کی دوسری بیوی لکھی بائی کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو ایک نوجوان خوبصورت ہندو خاتون تھیں۔ ۱۹۲۴ء میں اُس کی بڑی بہن اور اپنے برادر نسبتی میر مقبول سپرنٹنڈنٹ پولیس سکھر کے دولت کدہ پر انہوں نے اس دلکش دوشیزہ کو دیکھا تو پہلی نظر میں ہی گھائل ہو گئے۔ لکھی بائی پونہ کی رہنے والی تھیں، انہوں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کا نیا نام خورشید رکھا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں ان کی شادی کوئٹہ میں خان آف قلات کے محل میں ہوئی، اس وقت کی یادگار وہ تصویر ہے جس میں جناب شاہ نواز اپنی بیگم کے ساتھ خان آف قلات کے باڈی گارڈ دستے کی تلواروں کے سائے میں گزرتے نظر آتے ہیں، اس وقت خورشید کی عمر قریباً ۱۸ برس تھی۔ مستقبل میں یہ خاتون ان کے تین بچوں ------ منا، بے نظیر اور سب سے چھوٹے بیٹے ذوالفقار علی کی ماں بننے والی تھیں۔ (۸)

ذوالفقار علی بھٹو ۵؍ جنوری ۱۹۲۸ء کو المرتضیٰ لاڑکانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ان کے والد بمبئی میں مقیم تھے تو کیتھڈرل ہائی اسکول کے فرسٹ اسٹینڈرڈ سے ان کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ وہ ایک عرصہ تک بمبئی ہی میں مقیم رہے اور وہیں سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ کے بعد وہ ۱۹۴۸ء کے اوائل میں اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ روانہ ہو گئے۔

امریکہ سے نوجوان ذوالفقار علی بھٹو نے کیلیفورنیا اور برکلے سے پولیٹیکل سائنس اور قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ نومبر ۱۹۵۳ء میں وہ وطن واپس لوٹ آئے۔ یہاں واپس آکر انہوں نے کراچی کو اپنا مسکن بنایا اور وکالت سے اپنے کیریر کا آغاز کیا ابتدا میں وہ رام چندانی نامی ایک سینئر وکیل کے اسسٹنٹ بنے مگر بعد ازاں کراچی میں قانون کے طلباء کو کانسٹی ٹیوشنل لاء پڑھانے لگے۔ انہی دنوں ون یونٹ کا مسئلہ اٹھا تو انہوں نے ون یونٹ کے خلاف سندھ یونٹ فرنٹ کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی اور اس کی صدارت سنبھال لی۔ (۹)

ان دنوں پاکستان پر اسکندر مرزا کی حکومت تھی جو سر شاہنواز بھٹو کا دیرینہ دوست تھا۔ اسکندر مرزا اکثر شکار کے لئے بھٹو خاندان کی شکار گاہ پر جایا کرتا تھا۔ وہیں اس کی ملاقات نوجوان ذوالفقار علی بھٹو سے ہوئی۔ وہ اس کی ذہانت اور قابلیت سے بے حد متاثر ہوا اور کچھ ہی عرصہ بعد جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستان کی نمائندگی کے لئے وفد تشکیل دیا گیا تو حسین شہید سہروردی کی سفارش پر جو خود بھی بھٹو خاندان کے دوست تھے' اسکندر مرزا نے ذوالفقار علی بھٹو کا نام اس وفد میں شامل کر لیا

بھٹو کی عمر اس وقت ۲۹ برس کے لگ بھگ تھی مگر جب اس نے جنرل اسمبلی میں پاکستان کا موقف بیان کیا تو وہ دنیا بھر سے آئے ہو وفود کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ اقوام متحدہ ہی میں ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے والد کی وفات کی اطلاع ملی اور وہ وطن واپس لوٹ آئے۔ (۱۰)

۷؍ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو پاکستان بھر میں مارشل لاء نافذ ہو گیا اور ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ ساتھ وزارت عظمیٰ پر بھی فائز ہو گئے۔ ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ایوب خان نے اپنی کابینہ تشکیل دی۔ اس کابینہ میں بہت سے سینئر افراد کے ساتھ نوجوان ذوالفقار علی بھٹو بھی شامل تھے۔ انہیں وزارت تجارت کا قلمدان سونپا گیا تھا۔ چند دن بعد جب ایوب خان نے ملک کی صدارت سنبھال کر نئی کابینہ تشکیل دی تو نوجوان بھٹو اس کابینہ میں بھی شامل تھے۔

رفتہ رفتہ ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے ذہن اور زبان کی حیثیت حاصل کر لی اور ایوب خان کا نفس ناطقہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کابینہ کی روح رواں بن گئے۔ ملک کا کوئی اندرونی اور بیرونی مسئلہ ایسا نہ تھا جو ان کی طبع رسا کی دسترس سے باہر ہوتا۔

جنوری ۱۹۶۳ء میں محمد علی بوگرہ کی وفات کے بعد ذوالفقار علی بھٹو' پاکستان کے وزیر خارجہ

بنا دیئے گئے۔ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد انہوں نے اقوام عالم کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بہتر بنانے کی طرف توجہ دی اور یوں پاکستان آزاد خارجہ پالیسی کے ایک نئے دور میں شامل ہو گیا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا۔ اس موقع پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جو تقریر کی وہ سلامتی کونسل کی تاریخ کی چند بہترین تقاریر میں شمار ہوتی ہے۔ مگر پاکستان نے جو جنگ، جنگ کے میدان میں جیتی تھی وہ میز پر ہار دی گئی اور تاشقند میں صدر ایوب خان، بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری سے ایک معاہدے کے ذریعہ پاکستان کا عزت اور وقار سب کچھ کھو کر آ گئے۔

اعلان تاشقند کے بعد بھٹو صاحب نے حکومت سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن ملکی مفاد کی خاطر ایوب خاں کے کہنے پر کچھ عرصہ کے لئے راولپنڈی آ گئے۔ اعلان تاشقند کے بعد ایوب حکومت کے خلاف عوام میں نفرت پھیل گئی۔ بھٹو صاحب کی علیحدگی کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ ۱۸ر جون ۱۹۶۶ء کو ایوب خاں نے اعلان کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو پچھلے کئی برسوں سے کام کرتے تھک گئے ہیں اور بیمار ہیں اس لئے علاج کرانے کے لئے رخصت پر جا رہے ہیں۔

۲۷ر فروری ۱۹۶۷ء کو لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک عشائیہ میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کنونشن لیگ سے علیحدگی کا اعلان کیا۔ اگست ۱۹۶۷ء میں انہوں نے وسیع پیمانے پر عوامی رابطہ مہم کے سلسلے میں ملک کا دورہ کیا۔

۳۰ر نومبر ۱۹۶۷ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور میں ایک کنونشن منعقد کیا اور اپنی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کی تشکیل کا اعلان کر دیا۔ (۱۱)

جلد ہی انہوں نے ملک گیر دورے کا آغاز کیا ہر مقام پر لاکھوں افراد نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ ۱۳ر نومبر ۱۹۶۸ء کی رات انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ آمریت کے خلاف تحریک جاری رہی۔ حکومت سیاسی راہنماؤں سے بحالی جمہوریت کے مذاکرات پر مجبور ہو گئی۔ ۱۴ر فروری ۱۹۶۹ء کو بھٹو صاحب رہا کر دیئے گئے۔ سیاسی رہنما صدر ایوب سے مذاکرات کے لئے گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے بھٹو نے اس کا بائیکاٹ کیا۔

حالات بگڑے ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ء کو ملک میں ایک بار پھر مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ یحییٰ خاں نے مارشل لاء نافذ کرتے وقت انتخابات کرا کے اقتدار عوامی نمائندوں کے سپرد کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ انتخابات کے سلسلے میں محدود جلسوں کی اجازت دے دی۔ بھٹو صاحب نے ملک بھر میں جگہ جگہ جلسے کر کے عوام میں ایک زبردست جوش و خروش پیدا کر دیا۔

جس کے نتیجے میں ۷ر دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی مغربی پاکستان میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئی۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن نے بھاری اکثریت سے

کامیابی حاصل کرلی۔ شیخ مجیب نے چھ نکات کی بنیاد پر انتخاب جیتا تھا جو سب کے سب مغربی پاکستان اور نظریہ پاکستان کے حامیوں کے لئے قابل قبول نہیں تھے۔ مجیب الرحمٰن انتخابات جیتنے کے بعد فی الفور قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے پر زور دے رہے تھے لیکن آئینی اور سیاسی امور پر کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بھٹو ان سے مذاکرات کے لئے ڈھاکہ گئے لیکن شیخ مجیب نے ہٹ دھرمی نہ چھوڑی۔ عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک شروع کر رکھی تھی۔ عوامی لیگیوں نے کچھ عرصہ بعد پاک افواج پر حملے شروع کر دیئے۔ حالات بگڑے بالآخر فوج کو کارروائی کرنا پڑی۔ مجیب الرحمٰن گرفتار ہوئے۔ بھارت نے مکتی باہنی کے نام سے فوج تیار کرکے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ مغربی پاکستان پر بھی حملہ کیا گیا۔ ۸ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو بھٹو پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے اقوام متحدہ پہنچے۔ لیکن اس وقت تک صورت حال انتہائی مایوس کن ہو چکی تھی۔ پاکستانی حکومت کی طرف سے انہیں ہر شرط پر صلح کی ہدایت کر دی گئی۔ پاکستان کے خلاف سازش مکمل ہو چکی تھی۔

وسط دسمبر میں مشرقی پاکستان پر بھارتی فوجوں کی مدد سے مکتی باہنی کا قبضہ مکمل ہو گیا پاکستانی افواج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ نوے ہزار سے زائد پاکستانیوں کو جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو ذوالفقار علی بھٹو امریکہ سے وطن واپس پہنچے۔ تو یحییٰ خاں نے انہیں اقتدار سونپ دیا۔ انہوں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے عنان حکومت سنبھالی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی تمام مسائل کے حل کے لئے انتھک محنت شروع کر دی۔ معاہدہ شملہ ہوا۔ پاکستان کو اپنے چھنے ہوئے علاقے واپس ملے۔ جنگی قیدی واپس آئے۔ اسلامی دنیا اور بڑی طاقتوں سے روابط بڑھانے کی انتھک کوشش کی گئی۔ لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی۔ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔ حج و اوقاف اور مذہبی امور کی الگ وزارت قائم کی گئی، ہر کسی کو حج کی اجازت دے دی گئی۔ عالمی سیرت کانفرنس بلائی گئی۔ اغلاط سے پاک قرآن پاک چھاپنے کا پبلشروں کو سختی سے پابند کیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۷۲ء کو بنیادی اہمیت کی حامل دس بڑی صنعتوں کے ۳۱ اداروں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ ستمبر ۱۹۷۳ء میں بناسپتی گھی کی ۲۶ ملیں قومی ملکیت میں لی گئیں۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں جہاز رانی کی صنعت کو قومیا لیا گیا اور بنک اور انشورنس کمپنیاں قومی ملکیت میں لی گئیں۔ سرکاری ملازمین کی اور صنعتی اداروں کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا۔

فروری ۱۹۷۲ء کو صدیوں پرانا فرسودہ زرعی نظام ختم کیا گیا اور زمینداروں سے ۱۵۰ ایکڑ نہری اور ۳۰۰ ایکڑ غیر نہری زمین سے زائد زمین حاصل کرلی گئی۔ کاشتکاروں اور مزارعین کو بہت سی مراعات دی گئیں۔

۱۲ر مارچ ۱۹۷۳ء کو نئی صحت پالیسی کا اعلان کیا گیا۔ پرانے میڈیکل کالجوں کی نشستوں میں

اضافہ کیا گیا نئے میڈیکل کالج اور سکول قائم کئے گئے۔

۱۵ر مارچ ۱۹۷۲ء کو تعلیمی پالیسی کا اعلان ہوا جس کے تحت تمام پرائیویٹ کالجوں اور سکولوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور ان کے اسٹاف کی ملازمت مستقل کر دی گئی۔ نئے کالج اور سکول کھولے گئے۔ مڈل تک تعلیم مفت اور لازمی قرار دی گئی۔ نئے ثانوی تعلیمی بورڈ قائم ہوئے۔ نئی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ یونیورسٹیوں میں سمسٹر سسٹم اور شعبوں کی سربراہی کے لئے روٹیشن سسٹم رائج ہوا۔ طلبہ کو کرایوں میں رعایت دی گئی۔ نئے ہوسٹل تعمیر ہوئے۔ وظائف کی تعداد بڑھائی گئی۔ غریب طلبہ کے لئے بک بنک قائم کئے گئے۔

۱۲ر اپریل ۱۹۷۲ء کو پولیس اصلاحات نافذ ہوئیں۔ پولیس ملازمین کی تنخواہ بڑھائی گئی۔ ۱۳ر اپریل ۱۹۷۲ء کو عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی اور نئی قانونی اصلاحات نافذ ہوئیں۔ ملک میں معدنی پیداوار بڑھانے، تیل کی تلاش اور زر مبادلہ زیادہ کمانے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ایٹمی توانائی کے پروگراموں کو بہت اہمیت ملی۔ فولاد کے کارخانہ کا کام تکمیل کے مرحلے طے کرنے لگا۔ ذرائع ابلاغ کو ترقی دی گئی۔ نئے ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم کئے گئے۔

بلوچستان کا سرداری نظام ختم کر دیا گیا اور اس صوبہ کے غریب اور مظلوم عوام کو سرداروں کے ظلم سے نجات دلائی گئی۔

۱۰ر اپریل ۱۹۷۳ء کو قومی اسمبلی میں پہلی بار مشترکہ طور پر ایک قومی آئین منظور کیا گیا۔ ۱۲ر اپریل کو بھٹو نے صدر کی حیثیت سے اس کی توثیق کی اور ۱۴ر اگست ۱۹۷۳ء کو اس مستقل آئین کے نفاذ کا اعلان کیا گیا۔

جنوری ۱۹۷۷ء میں مزید زرعی اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ پچیس ایکڑ نہری زمین تک مالیہ معاف کر دیا گیا۔ زمین کی حد ملکیت کم کر کے سو ایکڑ نہری اور دو سو ایکڑ بارانی کر دی گئی۔ زمینداروں کے لئے انکم ٹیکس کا نظام رائج کیا گیا۔

جناب بھٹو کی حکومت نے ۷ر اور ۱۰ر مارچ ۱۹۷۷ء کو ملک میں عام انتخابات کرائے۔ پیپلز پارٹی کے امیدوار بھاری اکثریت میں جیت گئے۔ حزب مخالف نے پاکستان قومی اتحاد کے پلیٹ فارم سے یہ اعلان کیا کہ انتخابات میں بڑے پیمانہ پر دھاندلیاں ہوئی ہیں اور دھاندلیاں حکومت کی طرف سے کرائی گئی ہیں۔ ۱۰ر مارچ کو ہونے والے صوبائی انتخابات کا حزب مخالف نے بائیکاٹ کیا اور اسمبلیوں میں جانے سے انکار کر دیا۔

حزب مخالف کی طرف سے احتجاج اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ دھاندلیوں کے نتیجے میں تشکیل پانے والی اسمبلی توڑ دی جائے۔ وزیر اعظم بھٹو مستعفی ہو جائیں اور انتخابات فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں دوبارہ کرائے جائیں۔ لیکن فوج کی طرف سے ذوالفقار علی بھٹو کی مکمل تائید و حمایت کا اعلان کر دیا گیا۔ حیدر آباد، کراچی اور لاہور میں مارشل

لاء لگا دیا گیا۔

حزب مخالف کے ایک لاکھ کے قریب کارکن گرفتار کر لئے گئے۔ سینکڑوں افراد گولی کا نشانہ بنائے گئے۔ ملکی معیشت کو اربوں کا نقصان پہنچا۔ بالاخر عرب ممالک خصوصاً شاہ خالد والئی سعودی عرب کی کوششوں سے سمجھوتے کی بات چیت ہوئی لیکن ناکام ہوئی۔

بالاخر ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کو بھٹو کی حکومت ختم کر کے فوج نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ آرمی کے چیف آف اسٹاف جنرل محمد ضیاء الحق صاحب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ الیکشن کے بعد انہوں نے ملک کی باگ ڈور منتخب اراکین کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا۔ (۱۲)

جنرل ضیاء الحق آئے تو بظاہر نوے دن کے لئے تھے۔ مگر انہوں نے آتے ہی جو اقدامات شروع کئے ان سے ظاہر ہو گیا کہ ان کے ذہن میں نوے دن کے اندر اندر انتخابات منعقد کروانے کی بات دور دور تک موجود نہیں تھی۔ وہ ایک طویل کھیل کی تیاری کر کے آئے تھے اور ان کے ذمے ایک طاقتور قومی شخصیت اور اس کی سیاسی جماعت کو نیست و نابود کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔

انہوں نے جلد ہی سیاستدانوں اور صحافیوں میں اپنے اشاروں پر کام کرنے والے تلاش کئے جو انہیں مشورہ دینے لگے کہ انتخابات سے پہلے احتساب کا عمل ضروری ہے۔ (۱۳)

ستمبر ۱۹۷۷ء میں بھٹو کو ان کی رہائش گاہ سے گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے اپنے اقتدار میں اپنے ایک باغی رکن اسمبلی پر قاتلانہ حملہ کروایا تھا۔ جس میں اس کے والد ہلاک ہو گئے تھے۔

یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں چلا اور ہائیکورٹ نے اس جرم میں بھٹو کو موت کی سزا سنا دی۔ عدالتی کارروائی کے دوران فاضل چیف جسٹس کا رویہ مبینہ طور پر معاندانہ رہا۔ جس کی بھٹو نے کئی مرتبہ شکایت بھی کی۔

ہائیکورٹ کا فیصلہ نظر ثانی کے لئے سپریم کورٹ کے سامنے پیش ہوا۔ سپریم کورٹ کی بنچ نو ججوں پر مشتمل تھی۔ ان نو ججوں میں سے دو جج' عدالتی کارروائی کے دوران ریٹائر کر دیئے گئے۔ سات میں تین ججوں نے بھٹو کی پھانسی اور تین ججوں نے بریت کا فیصلہ دیا۔ مگر چیف جسٹس نے اپنا وزن پھانسی کی توثیق کرنے والے ججوں کے پلڑے میں ڈال دیا اور یوں ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔

بھٹو کی پھانسی کے بعد بھٹو خاندان پر مصائب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ان کے صاحبزادگان مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو پہلے ہی ملک سے باہر جا چکے تھے' بعد میں ایک طیارے کے اغوا کا ڈرامہ رچایا گیا اور پیپلز پارٹی سے وابستہ تمام افراد فوجی حکومت کے عتاب میں آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد بھٹو کی بیوہ نصرت بھٹو اور بڑی صاحبزادی بے نظیر بھی جلا وطن کر دی گئیں' مگر

فوجی حکومت عوام کے دلوں سے ان کی محبت سرمو کم نہ کر سکی۔

۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی انتخابات کا ڈرامہ رچایا گیا۔ جس کے بعد پارلیمنٹ میں ایک جماعت مسلم لیگ کے نام سے قائم کر دی گئی۔ ستمبر ۱۹۸۵ء میں فوجی آمر نے اپنے اقدامات کو آئینی تحفظ دینے کے لئے پارلیمنٹ کو آئین میں آٹھویں ترمیم منظور کرنے پر مجبور کیا اور یوں ۳۰؍ دسمبر ۱۹۸۵ء کو ملک کے طویل ترین مارشل لاء کا خاتمہ ہو گیا۔

جنرل ضیاء الحق جو دسمبر ۱۹۸۴ء میں ایک ریفرنڈم کے ذریعے ملک کے صدر "منتخب" ہو چکے تھے۔ ملک کی صدارت بدستور اپنے پاس رکھی۔ انہوں نے جب "جمہوری" حکومت کو اپنے اشاروں سے تجاوز کرتے ہوئے دیکھا تو آٹھویں ترمیم کا سہارا لے کر اسے گھر واپس بھیج دیا اور خود خلیفتہ المسلمین بننے کی تیاریاں کرنے لگے۔

ادھر مارشل لاء کے خاتمے کے بعد بے نظیر بھٹو وطن واپس آ چکی تھیں عوام نے ان کا والہانہ استقبال کیا تھا۔ جس کا مظاہرہ ان کی شادی کی تقریب میں بھی دیکھنے میں آیا جو شادی کی تقریب سے زیادہ ایک عوامی تقریب کا روپ دھار گئی تھی۔

۱۷؍ اگست ۱۹۸۸ء کو ایک ہوائی حادثہ میں جنرل ضیاء اپنے فوجی رفقاء کے ہمراہ ہلاک ہو گئے۔ ان کے جانشینوں نے موعودہ انتخابات اپنی تاریخ پر منعقد کروانے کا اعلان کیا۔ اسی دوران سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ آئندہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر منعقد ہوں گے۔

انتخابات سے کچھ عرصہ قبل آئی ایس آئی کی ایما پر غلام مصطفیٰ جتوئی کی صدارت میں انہیں بازو کی جماعتوں کا ایک انتخاب وجود میں آیا۔ جس کا نام اسلامی جمہوری اتحاد رکھا گیا۔ عام انتخابات میں بے نظیر بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی نے ۹۲ اور اسلامی جمہوری اتحاد نے ۵۴ نشستیں حاصل کیں تاہم وہ صوبہ سندھ کے علاوہ کسی اور صوبہ میں واضح اکثریت حاصل نہ کر سکی۔

بے نظیر بھٹو کی جماعت اس انتخاب میں اگرچہ واضح اکثریت حاصل نہ کر سکی، مگر مہاجر قومی موومنٹ، عوامی نیشنل پارٹی، فاٹا اور بعض آزاد ارکان اسمبلی کی مدد سے وہ صدر مملکت کو اپنی اکثریت کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گئیں اور یوں مرکز میں ایک مرتبہ پھر پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی۔ (۱۴)

پیپلز پارٹی کی یہ حکومت کوئی بیس ماہ جاری رہی۔ اس دوران ایک ایک کر کے پیپلز پارٹی کی تمام حلیف جماعتیں اسے تنہا چھوڑ گئیں۔ پنجاب جہاں نواز شریف وزیر اعلیٰ بن چکے تھے۔ مرکز کے خلاف سازشوں کا گڑھ بن گیا۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء کے اواخر میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی۔ جو اگرچہ ناکام ہو گئی مگر اس نے بے نظیر حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔

اپوزیشن جماعتوں نے صدر پاکستان پر زور ڈالنا شروع کیا کہ مرکزی حکومت نا اہل ہے کرپشن کر رہی ہے اس کو ہٹایا جائے اور نئے انتخابات کروائے جائیں۔ آخر کار ۶ راگست ۱۹۹۰ء کو صدر غلام اسحٰق خان نے قومی اسمبلی توڑ کر ۱ اکتوبر ۱۹۹۰ء میں عام انتخابات منعقد کروانے کا اعلان کیا ور اس ذمہ داری کو سنبھالنے کیلئے غلام مصطفیٰ جتوئی کی سربراہی میں ایک نگراں حکومت تشکیل دے دی۔

پیپلز پارٹی نے ان انتخابات میں ایک اتحاد کی شکل میں حصہ لیا۔ جس میں اس کے علاوہ تحریک استقلال، تحریک نفاذ فقہ جعفریہ اور مسلم لیگ (ملک قاسم گروپ) شامل تھیں اس اتحاد کو پیپلز ڈیموکریٹک الائنس کا نام دیا گیا۔ (۱۵)

مگر غلام مصطفیٰ جتوئی شفاف انتخابات منعقد کروانے میں ناکام رہے۔ تاہم ان کا منصوبہ اتنا جامع اور مکمل تھا کہ کسی جانب سے اس پر انگشت زنی نہ کی جا سکی۔ اس انتخاب کے نتیجے میں مرکز میں نواز شریف کی حکومت قائم ہو گئی اور محترمہ بے نظیر بھٹو ملک کی پہلی خاتون قائد حزب اختلاف بن گئیں۔

رفتہ رفتہ انتخابات کی دھاندلیاں عوام کے سامنے آنے لگیں۔ کچھ عرصہ کے بعد برسر اقتدار ''ٹرائیکا'' میں سے دو افراد جنرل اسلم بیگ اور غلام مصطفیٰ جتوئی نے انتخابات میں دھاندلی کا ڈھکا چھپا اعتراف کیا خود صدر غلام اسحٰق خان بھی جو سارے کھیل سے با خبر تھے نواز شریف حکومت کو پہلے تو برداشت کرتے رہے پھر انہوں نے آٹھویں ترمیم کا سہارا لیتے ہوئے انہیں وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا۔

قومی اسمبلی کے اسپیکر جناب گوہر ایوب نے صدر غلام اسحٰق خان کے اس اقدام کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ سپریم کورٹ نے ۳۷ دن کے بعد نواز شریف حکومت کو بحال کر دیا مگر صدر اور وزیر اعظم کے درمیان جو کشیدگی پیدا ہو چکی تھی وہ ختم نہ کی جا سکی۔ ۱۸ ر جولائی ۱۹۹۳ء کو چیف آف آرمی اسٹاف کی مداخلت پر صدر اور وزیر اعظم دونوں ہی کو رخصت ہونا پڑا اور ۶ ر اکتوبر کو قومی اسمبلی اور ۹ ر اکتوبر ۱۹۹۳ء کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔ (۱۶)

ان انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی نے واضح کامیابی حاصل کی۔ تاہم اسے مرکز اور پنجاب میں حکومت کی تشکیل کے لیے پاکستان مسلم لیگ (جونیجو گروپ) کی امداد حاصل کرنی پڑی۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو قومی اسمبلی میں وزارت عظمیٰ کے لیے ووٹنگ ہوئی جس میں محترمہ بے نظیر بھٹو ۱۲۱ ووٹ حاصل کر کے مرتبہ پھر ملک کی وزیر اعظم منتخب ہو گئیں۔ وہ پاکستان کی پہلی شخصیت تھیں جو اس منصب سے معزول ہونے کے بعد کو اس کے حصول میں کامیاب ہوئی تھیں (۱۷) محترمہ بے نظیر بھٹو نے وزیر اعظم بنتے ہی سردار فاروق خان لغاری کو جنہیں وہ ''فاروق بھائی'' کہتی تھیں، صدر کے منصب پر منتخب کروا دیا۔ یوں وہ انتہائی پر اعتماد او بے فکر ہو گئیں کہ اب انہیں آئین کی دفعہ ۵۸ (۲) بی کے ذریعہ

کوئی اقتدار سے معزول نہیں کرے گا۔

بے نظیر بھٹو نے اپنی اس دوسری میقات کے دوران' اپنا رویہ انتہائی محتاط رکھا اور سول' ملٹری بیوروکریسی سے الجھنے سے گریز کیا۔ آئی ایس آئی نے بھی شروع شروع میں انتظامی امور میں مداخلت سے گریز کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی کی یہ حکومت بھی عوام میں نا مقبول ہونے لگی۔ جس کا ایک بڑا سبب اپوزیشن لیڈر نواز شریف کی عدم تعاون کی پالیسی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً ایسے اقدامات کرتے رہے اور ایسے بیانات دیتے رہے جس سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے لیے مشکلات میں اضافہ ہوا۔

۱۹۹۴-۹۵ء میں کراچی کے حالات بھی بے نظیر بھٹو کی حکومت کے لئے مسئلہ بنے رہے۔ اس دوران کراچی میں ہزاروں افراد ہلاک ہوئے۔ جن میں سے کچھ ایم کیو ایم کے دو دھڑوں کی باہمی منافشت کا نتیجہ کہے گئے اور بقیہ اس آپریشن کلین اپ کا نتیجہ تھے جو محترمہ بے نظیر بھٹو کے وزیر داخلہ' نصیراللہ بابر کی نگرانی میں انجام دیا گیا۔

۱۹۹۵ء میں میجر جنرل اور بریگیڈیر رینک کے کچھ فوجی افسران نے حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ سازش بروقت پکڑی گئی اور یوں ملک ایک ناگہانی آفت سے محفوظ رہا۔ ۱۹۹۶ء میں چیف آف آرمی اسٹاف جنرل وحید کاکڑ اپنے عہدے سے ریٹائر ہو گئے اور جنرل جہانگیر کرامت اس منصب پر فائز ہو گئے۔ اسی برس مارچ میں پنجاب ہائی کورٹ میں ججز کی تقرری کی مسئلے پر بے نظیر حکومت اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جسٹس سجاد علی شاہ کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ چیف جسٹس نے وارننگ دی کہ اعلیٰ عدالتوں میں ججز کی تقرری' سینیارٹی کے حساب سے کی جائے۔ بے نظیر بھٹو ان تقرریوں کو وزیر اعظم کا آئینی اختیار سمجھتی تھیں۔ صدر مملکت نے چیف جسٹس کا ساتھ دیا یوں عدلیہ اور انتظامیہ کے درمیان بھی خلیج حائل ہو گئی۔

اس دوران بے نظیر بھٹو کے بھائی مرتضیٰ بھٹو نے بھی اپنی الگ سیاسی جماعت قائم کر لی اور وزیر اعظم کے لیے مشکلات کا باعث بننے لگے۔ ۲۰ رستمبر ۱۹۹۶ء کو مرتضیٰ بھٹو کو کراچی میں پر اسرار انداز میں قتل کر دیا گیا۔ اس واقعہ نے بھی حکومت کی بدنامی میں اضافہ کیا اور یہ تاثر محکم کیا کہ پاکستان ایک پولیس اسٹیٹ بن چکا ہے۔

صدر فاروق لغاری پر دباؤ بڑھنے لگا کہ وہ حالات کی بہتری کے لئے اپنا آئینی حق استعمال کریں۔ اس فضا میں بے نظیر بھٹو نے آصف زرداری کے ہمراہ ایوان صدر میں فاروق لغاری سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں لغاری نے کرپشن کا مسئلہ اٹھایا جس پر آصف زرداری نے کہا اس ضمن میں صدر لغاری کا اپنا دامن بھی صاف نہیں ہے۔ لغاری نے زرداری کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ یہ آخری ملاقات فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو فاروق لغاری نے کرپشن اور آئین کی خلاف ورزی کے الزامات لگا کر بے نظیر حکومت کو برطرف کر دیا اور قومی اسمبلی تحلیل کر دی۔ بے نظیر بھٹو نے الزام لگایا کہ انکے بھائی کے قتل میں فاروق لغاری کی مرضی و منشاء بھی شامل تھی۔ تاکہ ان کی حکومت ختم کرنے کا جواز پیدا کیا جا سکے (۱۸)

قومی اسمبلی کے اسپیکر یوسف رضا گیلانی نے سپریم کورٹ میں قومی اسمبلیوں کے توڑنے کے حکم کو چیلنج کیا مگر اب حالات ۱۹۹۳ء جیسے نہ تھے۔ چنانچہ ۲۹ جنوری ۱۹۹۷ء کو سپریم کورٹ نے ۵ رنومبر ۱۹۹۶ء کے صدارتی فرمان کو برقرار رکھتے ہوئے قومی اسمبلی کی تحلیل اور بے نظیر حکومت کی برطرفی کو درست قرار دے دیا۔

۳ رفروری ۱۹۹۷ء کو ملک بھر میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ جس میں محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی نشست بچانے میں تو کامیاب ہوئیں مگر اپنی پارٹی کو شکست فاش سے نہ بچا سکیں۔ بے نظیر بھٹو نے انتخابات کے بعد الزام لگایا کہ انتخابات میں بڑے بھاری پیمانے پر دھاندلی ہوئی ہے۔ تاہم وہ نواز شریف سے تعاون کے لیے تیار ہیں۔

انتخابات کے بعد نواز شریف نے اپنے قریبی ساتھی سیف الرحمن کی سربراہی میں ایک احتساب سیل قائم کرنے کے بعد بے نظیر بھٹو' آصف زرداری اور ان کے قریبی بیورو کریٹس کو بدعنوانیوں کے مختلف مقدمات میں ملوث کر لیا۔ پنجاب ہائی کورٹ کی احتساب بنچ نے بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کو سات سال کی سزا سنائی تاہم بے نظیر بھٹو ہائی کورٹ کا فیصلہ آنے سے پہلے ہی پاکستان سے باہر چلی گئیں۔ (۱۹) جب سے اب تک وہ وطن واپس نہیں لوٹی ہیں۔

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں بے نظیر بھٹو نے بیرون ملک سے انتخاب لڑنا چاہا مگر ان کے کاغذات مسترد کر دیے گئے (۲۰) ۲۰۰۶ء میں انہوں نے اپنے حریف سیاستدان' نواز شریف کے ساتھ دست تعاون دراز کیا جس کے نتیجے میں میثاق جمہوریت وجود میں آیا۔ اس میثاق میں دونوں سیاستدانوں نے عہد کیا کہ برسراقتدار آنے یا نہ آنے' دونوں صورتوں میں دونوں فریق ایک دوسرے کی حکومت اور مینڈیٹ کا احترام کریں گے اور آئندہ ایسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہوں گے جس سے فوج کو مداخلت کا جواز مل سکے۔ (۲۱)

بے نظیر بھٹو کے چھوٹے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو نے بھی کچھ وقت سیاست کے میدان میں گزارا۔ وہ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں سندھ اسمبلی کی ایک نشست پر کامیاب ہوئے تھے (۲۲)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مارشل لاء حکومت کے قیام کے کچھ ہی عرصہ بعد میر مرتضیٰ بھٹو اپنے بھائی شاہنواز بھٹو کے ہمراہ ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ ملک سے باہر جا کر انہوں نے پاکستان کی فوجی حکومت کے خلاف مزاحمتی تحریک کا آغاز کیا اور ایک تنظیم الذوالفقار بنائی۔ فوجی حکومت نے

اس تنظیم کو خود مرتضیٰ بھٹو کے خلاف استعمال کر ڈالا اور ایک طیارے کے اغوا کا ڈراما رچا کر نہ صرف تحریک بحالی جمہوریت کو سختی سے کچل دیا بلکہ بعض ایسے افراد سے بھی نجات پا لی، جن کی پیپلز پارٹی سے وابستگی کسی شک و شبہ سے بالاتر تھی اور جو آگے چل کر فوجی حکومت کے لئے کسی مشکل کا باعث بن سکتے تھے۔

میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو نے طیارے کے اغوا کی ذمہ داری قبول کر کے اپنی تباہی کا سامان خود پیدا کر لیا۔ بعد ازاں میر شاہنواز بھٹو بھی پیرس میں اپنے فلیٹ میں ہلاک کر دیئے گئے۔

نواز شریف کے آخری ایام میں نواز شریف کابینہ کے بعض سرکردہ ارکان نے مبینہ طور پر مرتضیٰ بھٹو سے رابطہ کیا۔ اور کہا کہ اگر وہ وطن واپس آجائیں تو ان پر قائم مقدمات ختم کر دیئے جائیں گے اور انہیں عام معافی دے دی جائے گی۔ مگر مرتضیٰ بھٹو نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ (۲۳)

بہر حال انتخابات میں کامیابی اور اپنی بہن کے وزیر اعظم بننے کے بعد مرتضیٰ بھٹو ۳ نومبر ۱۹۹۳ء کو وطن واپس آ گئے۔ مرتضیٰ وطن واپس پہنچے تو انہیں فوراً ہی گرفتار کر لیا گیا۔ مرتضیٰ نے دعویٰ کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے واحد بیٹے کی حیثیت سے وہی پیپلز پارٹی کی قیادت کے حق دار ہیں مگر بے نظیر نے ان کا یہ حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ نصرت بھٹو نے اپنے بیٹے کی حمایت کرنی چاہی تو بے نظیر نے انہیں پارٹی کی چیئر پرسن شپ سے معزول کر دیا اور خود تمام اختیارات سنبھال لیے۔

میر مرتضیٰ بھٹو کچھ عرصہ بعد ضمانت پر رہا کر دیے گئے۔ انہوں نے ملک گیر دوروں کا آغاز کیا مگر دوسری جانب ان کی وہ بہن تھیں جو جنرل ضیاء الحق اور نواز شریف جیسے حکمرانوں کا مقابلہ کرتی رہی تھیں اس لیے انہیں کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی۔ (۲۴)

اسی دور حکومت میں میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کا المناک واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے کی تفصیل یہ تھی کہ ستمبر ۱۹۹۶ء کی شام کو میر مرتضیٰ بھٹو اپنی پارٹی کے سیاسی جلسہ میں شرکت کرنے کے بعد گھر واپس لوٹ رہے تھے جب دو گاڑیوں پر مشتمل یہ قافلہ مرتضیٰ بھٹو کے گھر ۷۰ کلفٹن سے چند قدم پیچھے دو تلوار چورنگی چوک پر پہنچا تو چوک میں گھات لگائے بیٹھی پولیس نے ان گاڑیوں کو روکا، اور فائرنگ کر کے میر مرتضیٰ بھٹو، مسٹر عاشق جتوئی اور چھ دوسرے افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے باقی ساتھی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو شدید زخمی حالت میں کوئی پچاس منٹ بعد ہسپتال لے جایا گیا۔ جہاں وہ جاں بحق ہو گئے۔ اس وقت مرتضیٰ بھٹو کی عمر ۴۲ سال تھی۔

موت کا خونی کھیل اس وقت شروع ہوا جب مرتضیٰ بھٹو کے ساتھی علی سنارا کو پولیس نے اٹھا لیا اور غائب کر دیا، مرتضیٰ بھٹو کو اس بات پر غصہ تھا کہ علی سنارا کی گرفتاری ظاہر نہ کر کے معاملہ پر اسرار بنایا جا رہا ہے۔ مرتضیٰ بھٹو کو اس بات کی صحیح اطلاع نہیں مل رہی تھی کہ علی سنارا کو کس سی آئی اے سنٹر

یا کس تھانے کی پولیس نے گرفتار کیا ہے؟ مرتضیٰ بھٹو کا ردعمل شدید تھا انہوں نے کئی تھانوں اور سی آئی اے کے سینٹر جا کر علی سنارا کو تلاش کیا۔ پولیس کا دعویٰ ہے کہ سی آئی اے سینٹر میں انہوں نے پورے سینٹر کے عملے کو یرغمال بنا کر تمام کمروں کی تلاشی لی اور علی سنارا کے موجود نہ ہونے پر واپس چلے گئے۔ اس واقعے کے اگلے روز شہر میں بموں کے دھماکے ہوئے تو انتظامیہ نے براہ راست اور بالواسطہ ان دھماکوں کو مرتضیٰ بھٹو سے منسوب کیا۔ اس کے اگلے روز پی پی پی شہید بھٹو گروپ کے خلاف باقاعدہ آپریشن شروع کر دیا گیا۔ اسی روز لیاری میں لگ بھگ ۵۰۰ کارکنوں کی تلاشی میں گھروں پر چھاپے مارے گئے اور ایک سو کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ کراچی کے علاوہ اندرون سندھ بھی تنظیم کے خلاف آپریشن شروع کر دیا گیا۔

مرتضیٰ بھٹو اپنی گرفتاری کی توقع کر رہے تھے مگر ادھر معاملہ الٹ تھا۔ ڈی آئی جی کراچی شعیب سڈل اور ایس ایس پی ساؤتھ واجد درانی مبینہ طور پر مرتضیٰ بھٹو قتل آپریشن کے انچارج تھے۔

مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد ہونے والے عجیب و غریب واقعات نے اس کے قتل کو بہت پر اسرار بنا دیا مثلاً ابھی مرتضیٰ بھٹو کو قتل ہوئے دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ صدر فاروق احمد خان لغاری نے رات کے بارہ بجے ۲۰-۲۱ ستمبر کی درمیانی رات کو پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں پہلی بار ایوان صدر کے ذاتی غیر سرکاری خصوصی وکلاء کے ذریعے سپریم کورٹ کو حکومتی کارکردگی کے بارے میں اپنی عدم اطمینان سے متعلق نوٹس بھجوایا۔ دوسرے دن انہوں نے پارلیمنٹ میں احتسابی مسودے کے حوالے سے اپنی عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ تیسرے دن انہوں نے اپوزیشن لیڈر میاں نواز شریف سے ملاقات کی۔ اور انہیں یقین دلایا کہ حکومتی کارکردگی غیر معیاری ہونے کی صورت میں وہ آٹھویں ترمیم کے تحت اپنے اختیارات استعمال کریں گے۔

دوسری طرف وزیراعظم کے شوہر نے آصف علی زرداری نے اسی روز اپنی مونچھیں صاف کروا دیں جن کے بارے میں اخبارات میں یہاں تک چھپا کہ مرتضیٰ بھٹو نے آصف زرداری کو اغوا کیا۔ مارا پیٹا اور ان کی مونچھیں صاف کرا دیں۔ جس کے فوری ردعمل میں میر مرتضیٰ کو موت سے دوچار ہونا پڑا۔ آصف علی زرداری اور مرتضیٰ بھٹو کی ایک دوسرے کے بارے میں ناپسندیدگی کی بنا پر عام طور پر ملک بھر میں پہلا تاثر یہ تھا کہ مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے ذمہ دار آصف علی زرداری ہیں' خاص طور پر جب کہ انہوں نے ڈی آئی جی کراچی شعیب سڈل کو کچھ عرصہ قبل خصوصی طور پر راولپنڈی سے کراچی بھجوایا تھا۔ شعیب سڈل آصف علی زرداری کے بہت قریب سمجھے جاتے تھے۔

ڈی آئی جی شعیب سڈل نے یہاں تک کہا کہ اگر مرتضیٰ بھٹو کے قتل پر پولیس کے خلاف کاروائی ہوئی تو ہم سب استعفیٰ سے دیں گے اس کا مطلب یہ تھا کہ وزیراعظم اپنے بھائی کے قتل پر تحقیقات سے پہلے ہی قتل کے ذمہ دار پولیس والوں کو بے گناہ قرار دے دیں۔

وزیر اعلیٰ سندھ سید عبداللہ شاہ کا تبصرہ تھا کہ اس واقعہ کا کوئی گواہ موجود نہیں ہے۔ حالانکہ اس واقعہ میں ان گنت پولیس والوں نے حصہ لیا اور بہت سے افراد مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ زخمی بھی ہوئے۔ وزیر اعلیٰ کے اس بیان نے بھی شکوک کو جنم دیا۔ وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے کہا کہ مرتضیٰ کے قتل کو سازش قرار دے کر معاملہ الجھایا جا رہا ہے اور یہ کہ الذولفقار ایک دہشت گرد تنظیم ہے اور اس کے بھارت کی خفیہ ایجنسی ''را'' سے تعلقات ہیں۔ لہٰذا پولیس نے مرتضیٰ کے خلاف درست کاروائی کی ہے۔

لیکن جو سب سے اہم واقعہ ہوا وہ یہ تھا کہ پولیس آپریشن کے ایک اہم کردار ایس ایچ او حق نواز سیال کو پراسرار طور پر اس کے گھر میں اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ زخمی تھا اور پولیس کے باڈی گارڈ اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ حق نواز سیال اصل ذمہ داروں کے بارے میں کچھ بولنا چاہتا تھا۔

وزیر اعظم بےنظیر نے کہا کہ ظلم بھی ہمارے ساتھ ہوا ہے اور ذمہ داری بھی ہمارے اوپر ڈالی جا رہی ہے۔ بے نظیر حکومت نے قتل کے معاملہ کی تحقیقات کیلئے سکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رساں بلوائے۔ مگر بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد نامکمل تحقیقات کے دوران ہی ان سراغ رسالوں کو واپس بھیج دیا گیا۔ (۲۵)

حکومت نے اس قتل کی تفتیش ے لیے جسٹس ناصر اسلم زاہد کی سربراہی میں ایک تین رکنی ٹربیونل قائم کیا۔ ٹربیونل کے بغیر دو ارکان جسٹس امان اللہ عباسی اور جسٹس ڈاکٹر غوث محمد تھے۔ اس ٹربیونل نے مسلسل کئی ماہ تک گواہان کے بیانات قلم بند کیے اور ۳۰ مئی ۱۹۹۷ء کو اپنی رپورٹ مکمل کر لی۔

رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ مرتضیٰ بھٹو کو ماورائے عدالت قتل کیا گیا ہے۔ پولیس مرتضیٰ بھٹو کو قتل کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ انکا اصل مقصد مرتضیٰ بھٹو کے گارڈز اور مسلح ساتھیوں کو غیر مسلح کرنا تھا مگر جب ان گارڈز اور مسلح ساتھیوں نے پولیس پر فائرنگ شروع کی تو جواب میں پولیس کو بھی اپنے دفاع میں فائرنگ کرنی پڑی جس کے نتیجے میں مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھی ہلاک ہو گئے (۳۶) میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد انکی بیوہ غنویٰ بھٹو سیاست میں متحرک ہوئیں اور انہوں نے پیپلز پارٹی شہید بھٹو گروپ کی قیادت سنبھالی نگران کی پارٹی ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء دونوں عام انتخابات میں کسی قابل ذکر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکی غنویٰ بھٹو نے ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں خود بھی اپنی خوش دامن، محترمہ نصرت بھٹو کے خلاف قومی اسمبلی کا اور نثار کھوڑو کے مقابلے میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکی تھیں (۲۷)

ذوالفقار علی بھٹو کی دو بیویاں تھیں۔ ان کی پہلی بیوی کا نام شیریں امیر بیگم تھا۔ جو ذوالفقار علی بھٹو کے ایک رشتے کے چچا خان بہادر احمد خان بھٹی کی صاحبزادی تھیں۔ ان سے ایک بیٹی بھی پیدا ہوئی تھی

جس کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا۔ شیریں امیر بیگم کا انتقال ۱۹ جنوری ۲۰۰۳ء کو ہوا (۲۹)

ذوالفقار علی بھٹو کی دوسری بیوی نصرت بھٹو ہیں۔ جن سے ان کی شادی ۸ر ستمبر ۱۹۵۱ء کو ہوئی۔

نصرت بھٹو نے سیاست کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب ان کے شوہر کی معزولی کے بعد انہیں پہلی مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ نصرت بھٹو نے ایک جانب تو اپنے شوہر کی گرفتاری کے بعد پارٹی کی قیادت سنبھالی' دوسری جانب اعلیٰ عدالتوں میں اپنے شوہر کی معزولی اور ان کی نظر بندی کے خلاف آئینی جنگ لڑی۔ یہ جنگ بیگم نصرت بھٹو بنام چیف آف دی آرمی اسٹاف کے نام سے معروف ہے' بیگم نصرت بھٹو اگرچہ یہ جنگ ہار گئیں' مگر آج بھی اس کیس کی بازگشت گاہے گاہے سنائی دیتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت کے بعد بیگم نصرت بھٹو پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بن گئیں۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ تک نظر بندی اور جلا وطنی کی اذیت اٹھائی۔ اس دوران انہیں اپنے نوجوان بیٹے کی ناگہانی موت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا' لیکن انہوں نے سب کچھ مردانہ وار برداشت کیا۔ بیگم نصرت بھٹو کئی مرتبہ قومی اسمبلی کی رکن بھی منتخب ہو چکی ہیں۔ پہلی مرتبہ وہ ۱۹۷۷ء میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ (۲۹) پھر ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے چترال اور لاڑکانہ دو مقامات سے قومی اسمبلی کا انتخاب جیتا۔ کامیابی کے بعد وہ اپنی صاحبزادی کی کابینہ میں سینئر وزیر کے طور پر شریک ہوئیں۔ (۳۰) ۱۹۹۰ء میں بھی نصرت بھٹو' قومی اسمبلی کا انتخاب جیتنے میں کامیاب رہیں اور اپنی صاحبزادی کے ہمراہ حزب اختلاف کا کردار ادا کرتی رہیں۔ (۳۱) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے پرانے حلقہ انتخاب این اے ۱۶۴ لاڑکانہ ا سے انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کا مقابلہ بیگم حمیدہ کھوڑو سے تھا۔ مگر دونوں کے ووٹوں میں تقریباً ساٹھ ہزار ووٹوں کا فرق رہا----اور یوں بیگم نصرت بھٹو یہ معرکہ بڑی آسانی سے جیت گئیں (۳۲) ۱۹۹۷ء میں بھی وہ اسی حلقے سے قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ اس مرتبہ ان کی حریف ان کی بہو اور مرتضیٰ بھٹو کی بیوہ غنویٰ بھٹو تھیں۔ مگر دونوں کے ووٹوں میں تقریباً ساڑھے اٹھارہ ہزار ووٹوں کا فرق رہا (۳۳)

قیام پاکستان سے اور قیام پاکستان کے بعد بھٹو خاندان کے کئی اور افراد بھی اسمبلیوں کے رکن منتخب ہو چکے ہیں۔ ان میں پہلا نام واحد بخش بھٹو کا ہے جو سر شاہنواز بھٹو کے دادا خدا بخش بھٹو کے بھتیجے تھے۔

واحد بخش بھٹو ۱۹۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے کہ ان کے والد الٰہی بخش بھٹو کا انتقال ہو گیا اور قبیلے کی سرداری انہیں منتقل ہو گئی۔ ۱۹۲۴ء میں وہ باقاعدہ طور پر قبیلے کے سردار تسلیم کئے گئے اور ۱۹۳۶ء میں وہ زمینداروں کے حلقے سے مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں جب بمبئی کونسل کے انتخابات منعقد ہوئے تو واحد بخش بھٹو نے یہ

انتخاب بھی لڑا اور اپنے حریف غلام محمد اسران کے دستبردار ہونے کے بعد یہ انتخاب جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ واحد بخش بھٹو نے ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو ۳۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔ (۳۴)

واحد بخش بھٹو کے صاحبزادے پیر بخش بھٹو بھی ایک مختصر عرصہ کے لئے سیاست کے میدان کے میدان میں رہے۔ ۱۹۶۲ء میں ذوالفقار علی بھٹو لاڑکانہ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ جو ارکان اسمبلی کابینہ میں وزیر کی حیثیت سے شامل ہوں گے انہیں اپنی اسمبلی کی نشست سے محروم ہونا پڑے گا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں بھٹو بھی اپنی نشست سے دستبردار ہو گئے۔ اس نشست پر ضمنی انتخابات میں انہوں نے اپنے چچا سردار پیر بخش بھٹو کو کھڑا کیا ان کے مقابلے میں عبدالحمید جتوئی کھڑے ہوئے جن کو ایوب کھوڑو اور قاضی فضل اللہ کی حمایت حاصل تھی۔ بھٹو نے ذاتی طور پر انتخابی مہم میں حصہ لیا اور سردار پیر بخش بھٹو کامیاب ہو گئے۔ وہ ۱۹۶۵ء تک قومی اسمبلی کے رکن رہے (۳۵)

واحد بخش بھٹو کی وفات کے بعد ان کے بھائی نبی بخش بھٹو قبیلے کے سردار بنے۔ وہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک بمبئی لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن رہے اور ۱۹۳۵ء میں مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں وہ سندھ اسمبلی کے رکن بنے (۳۶) اس انتخاب میں انہوں نے قاضی فضل اللہ کو شکست دی تھی۔ (۳۷) انکی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے ممتاز علی بھٹو' بھٹو قبیلے کے سردار بن گئے (۳۹)

ممتاز علی بھٹو ملک کے ان سیاسی رہنماؤں میں شامل ہیں جن کی سیاسی تربیت ذوالفقار علی بھٹو کی رہین منت ہے۔ ویسے بھی وہ بھٹو کے عزیز ہیں اور ایک عرصہ تک یہی رشتہ داری ممتاز علی بھٹو کی شناخت بنی رہی ہے۔

۱۹۶۵ء میں سردار پیر بخش بھٹو کی مدت رکنیت ختم ہوئی تو ذوالفقار علی بھٹو نے اس نشست پر ممتاز علی بھٹو کو کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ممتاز بھٹو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑے اور کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچے اور یہیں سے ملکی سیاست کے دروازے ان کے لئے کھل گئے۔

۱۹۶۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو ممتاز بھٹو ابتدا ہی میں اس میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء میں انتخابات کے انعقاد تک وہ بھٹو کے ساتھ ملک گیر دوروں میں شریک رہے۔ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھٹو نے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اگلے ہی روز صوبائی گورنروں کے تقرر کا اعلان ہوا۔ ممتاز بھٹو کے حصے میں صوبہ سندھ جیسے اہم صوبے کی گورنری آئی۔ ۱۸ر اپریل ۱۹۷۲ء کو عبوری آئین کی قومی اسمبلی میں منظوری کے بعد صوبوں میں پارلیمانی حکومتیں قائم ہوئی۔ ۲۹ر اپریل ۱۹۷۲ء کو میر رسول بخش تالپور سندھ کے گورنر مقرر ہوئے۔ دو دن بعد یعنی یکم مئی ۱۹۷۲ء کو ممتاز بھٹو نے وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف اٹھایا۔

سندھ کی گورنری اور وزارت اعلیٰ کے زمانے میں ممتاز بھٹو ایک متنازعہ شخصیت بن کر ابھرے۔ ملک کے ذرائع ابلاغ خاص طور سے کراچی کے اردو اخبارات میں ان کی جو تصویر ابھر کر سامنے آئی وہ ایک سخت گیر اور کسی حد تک انتہا پسند اور منتقم مزاج سندھی کی تصویر تھی۔ ان کے دور اقتدار میں صوبے میں کئی مرتبہ امن و امان کی صورت حال خراب ہوئی۔ ۷/جون ۱۹۷۲ء کا دن غالباً انکی صوبائی حکومت کا سب سے افسوسناک دن تھا۔ اس روز سائٹ کے علاقے میں مزدوروں اور پولیس کے درمیان خونریز تصادم ہوا۔ دوسرا اہم مسئلہ جس نے اس دور میں خونریز فسادات کی شکل اختیار کی وہ سندھی کو صوبائی زبان بنانے کیلئے صوبائی اسمبلی میں بل کا پیش کیا جانا تھا۔ ۶/جولائی ۱۹۷۲ء کو لسانی بل سندھ اسمبلی میں پیش کیا گیا اور اگلے ہی روز حزب اختلاف اور خود پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے بعض اردو داں اراکین اسمبلی کی مخالفت کے باوجود یہ بل کثرت رائے سے منظور کر لیا گیا۔ بل کی منظوری کے فوراً بعد کراچی میں ہنگامے شروع ہو گئے اور کئی جگہوں پر کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ ایک روز بعد یعنی ۸/جولائی کو شہر میں ہولناک خونریزی ہوئی اور حالات پر قابو پانے کیلئے فوج کو طلب کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی صدر بھٹو نے لسانی بل کو نظر ثانی کے لئے طلب کر لیا۔ انہوں نے اس بل کے مخالفین سے مذاکرات بھی کئے اور یوں ۱۶۔جولائی ۱۹۷۲ء کو ایک آرڈیننس جاری کیا گیا۔ جس کی رو سے اردو اور سندھی دونوں کو ساتھ ساتھ چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ لسانی تنازعہ ۱۷ نومبر ۱۹۷۲ء کو اس وقت ختم ہوا جب سندھ اسمبلی نے ترمیمی لسانی بل اتفاق رائے سے منظور کر لیا۔

جن دنوں لسانی بل سندھ اسمبلی میں زیر بحث تھا' حزب اختلاف کے ایک رکن عثمان کینیڈی نے (جو بعد میں پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے) ایک بیان میں جب ممتاز بھٹو کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی' تو انہوں نے صوبائی اسمبلی میں اس کا جواب دیتے ہوئے اعلان کیا کہ سندھ کے لئے ایک سر تو کیا دس سر حاضر ہیں۔ اس پر انہیں ڈھیسر سندھ (سندھ کا دس سروں والا) کا خطاب ملا جس پر وہ آج بھی فخر کرتے ہیں اور اسے سندھ سے اپنی بے پایاں محبت کا ثبوت قرار دیتے ہیں۔ لسانی بل اور اس پر ان کا اصرار اگر ایک افسوسناک تنازع کا سبب بنا تو صرف اس لئے کہ ان کی حکومت نے غالباً نا تجربہ کاری کی بنا پر اس اہم اور بنیادی نوعیت کے مسئلے پر فریقین کو اعتماد میں لینے کی ضرورت کو مناسب طور پر محسوس نہیں کیا۔ نیز ایک پیچیدہ اور نازک مسئلے کو انتظامی مشینری کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی۔ پھر جوں جوں یہ مسئلہ بگڑتا گیا ویسے ویسے حکومت کا اس مشینری پر انحصار بھی بڑھتا چلا گیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خود حزب اختلاف نے بھی اس موقع پر مناسب سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس مسئلے کو ایک بڑا سیاسی طوفان اٹھانے اور اس کے ذریعے حکومت کو ملکی سطح پر پسپا کرنے کیلئے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اسی زمانے میں بھٹو نے انکشاف کیا تھا کہ عین ہنگاموں کے عروج پر حزب اختلاف کے بعض مقتدر رہنماؤں نے فوج کے سربراہ جنرل ٹکا خان کو خفیہ مراسلے کے ذریعے

پیش قدمی کا مشورہ دیا تھا۔

سندھ میں ممتاز بھٹو کے دور اقتدار کے ان واقعات سے قطع نظر بعض شعبوں میں ان کی کارکردگی قابل تعریف تھی۔ انہوں نے بدعنوانیوں کے سدباب کے لئے قانون بنایا۔ پولیس اور افسر شاہی کے بعض بدعنوان افراد کو ان کے عہدوں سے الگ کیا گیا اور ان پر مقدمات قائم کیے گئے۔ ان کے دور حکومت میں ایک عام آدمی کو وزرا اور ارکان اسمبلی تک رسائی حاصل تھی اور وہ اپنی دادفریاد ان تک پہنچ سکتے تھے۔ ویسے تو یہ ایک جمہوری نظام میں معمول کی بات ہوتی ہے' مگر کیونکہ پاکستان میں جمہوری عمل کی روایت کوئی زیادہ متاثر کن نہیں تھی لہٰذا ان کے دور میں اس کا اجرا نمایاں طور پر محسوس کیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے بعض مفاد پرستوں نے بھی حتی المقدور استفادہ کیا۔

ممتاز بھٹو کی صوبائی حکومت کی مذکورہ خوبیوں کے اثرات اس مجموعی کشیدگی اور کھینچاؤ کی فضا کی نذر ہو گئے جو آغاز کار ہی میں صوبے میں پیدا ہو گیا تھا اور جس پر ان کی انتظامیہ بخوبی کنٹرول حاصل نہیں کر سکی تھی۔ ۱۹۷۲ء کے اواخر میں وہ سندھ کی وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہو گئے ان کی جگہ اس وقت تک وفاقی وزیر مواصلات رہنے والے غلام مصطفیٰ جتوئی نے لی۔ جنہوں نے ۲۳/دسمبر ۱۹۷۳ء کو وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھایا۔ ممتاز بھٹو ان تبدیلیوں کو دیگر وجوہ کے علاوہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کی رپورٹو ں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ سندھ کے لئے ان کے پرجوش خیالات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھیں اور انہیں پاکستان کے کے اتحاد و یکجہتی کے لئے مضر تصور کرتی تھیں۔

سندھ کی وزارت اعلیٰ سے علیحدگی کے بعد ممتاز بھٹو نو ماہ حکومتی ذمہ داریوں سے آزاد رہے۔ اس دوران انہیں وزیراعظم بھٹو نے وزرت خارجہ کی پیشکش بھی کی جسے انہوں نے قبول نہیں کیا۔ بعد ازاں سابق وزیراعظم نے بقول ممتاز بھٹو ان سے پوچھے بغیر انہیں وزیر مواصلات بنا دیا۔ اس عہدے پر وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے تک فائز رہے۔

پیپلز پارٹی کے اقتدار کے خاتمے پر دیگر لیڈروں کی طرح ممتاز بھٹو کو بھی فوجی حفاظت میں لے لیا گیا۔ اس حفاظت سے چھوٹے تو پھر مقدمات اور گرفتاریوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اس دوران وہ عارضہ قلب بھی شکار ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں انہوں نے جیل میں دوسرے سیاسی قیدیوں کے سامنے ایک طویل اور جذباتی تقریر میں کنفیڈریشن کی تجویز پیش کی یہ کیسٹ جیل سے باہر آیا اور تقریر اخبارات میں چھپی تو اس موضوع پر مباحثے کا آغاز ہو گیا جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہا۔ جیل سے رہائی کے بعد ممتاز بھٹو لندن چلے گئے جہاں انہوں نے عبدالحفیظ پیرزادہ' عطاء اللہ مینگل' افضل بنگش اور بہت سے ہم خیال سیاسی کارکنوں کے ساتھ مل کر سندھی بلوچ پشتون فرنٹ کی داغ بیل ڈالی۔ انہیں اس فرنٹ کا کنوینر برائے پاکستان منتخب کیا گیا۔ لندن میں طویل قیام کے بعد وہ ۱۹۸۶ء کے اوائل میں پاکستان

واپس آگئے اور فرنٹ کے پروگرام کی تشہیر کے لئے ملک گیر دوروں کا آغاز کیا۔ (۴۰)

ممتاز بھٹو کی سیاسی سرگرمیوں کو عوام تو کوئی خواص میں بھی کوئی پزیرائی نہ مل سکی۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء کے دونوں انتخابات میں حصہ لیا۔ مگر دونوں مرتبہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک معمولی زمیندار دیدار حسین شاہ سے شکست کھا گئے۔ (۴۱) تاہم ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے انہی دیدار حسین شاہ کو تقریباً دو ہزار ووٹوں سے شکست دیکر سولہ سال بعد صوبائی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ (۴۲)

۷ نومبر ۱۹۹۶ء کو وہ سندھ اسمبلی کی تحلیل کے بعد سندھ کے نگران وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے (۴۳) اس عہدے پر فائز ہونے کے باعث وہ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے۔ تاہم انہوں نے اس مرتبہ اپنے صاحبزادے امیر بخش بھٹو کو پی ایس ۳۰ لاڑکانہ ۲ سے سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑوایا جو ایک سخت مقابلے کے بعد یہ انتخاب جیت گئے (۴۴) امیر بخش بھٹو نے ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ مگر اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے امیدوار محمد ایاز سومرو سے تقریباً پانچ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۴۵)

حوالہ جات

۱۔ جی ایم سید۔ جب گزار یم جن سین۔ جلد اول۔ ص ۱۲۲، ۱۲۳

۲۔ طفیل احمد۔ سندھ کا بھٹو قبیلہ۔ مشمولہ تاریخ ارائیاں۔ علی اصغر چودھری۔ لاہور۔ ص ۲۵۶، ۲۵۷

۳۔ رشید اختر ندوی۔ ذوالفقار علی بھٹو، سیاسی سوانح حیات۔ اسلام آباد۔ جلد اول۔ ص ۲۴ تا ۶۵

۴۔ اسٹینلے وولپرٹ۔ زلفی بھٹو آف پاکستان۔ ہز لائف اینڈ ٹائمز۔ نیویارک۔ ص ۴

۵۔ بیگم نصرت بھٹو۔ لیٹر ٹو دی ایڈیٹر۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۳۱/ مارچ۔ ۲/ اپریل ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۰

۶۔ اسٹینلے وولپرٹ۔ زلفی بھٹو آف پاکستان۔ ہز لائف اینڈ ٹائمز۔ نیویارک۔ ص ۴ تا ۱۴

۷۔ رشید اختر ندوی۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ سیاسی سوانح حیات۔ اسلام آباد۔ جلد اول ص ۳۷ تا ۱۰۳

۸۔ اسٹینلے وولرٹ زلفی بھٹو آف پاکستان ہزلائف انڈ ٹائمز نیویارک۔ ص ۱۵

۹۔ رشید امزندری، ذوالفقار علی بھٹو سیاسی سوانح حیات۔ اسلام آباد جلد اول۔ ص ۱۲۶ تا ۱۴۵

۱۰۔ رشید اختر ندوی۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ سیاسی سوانح حیات۔ اسلام آباد۔ جلد اول ص ۱۵۰ تا ۱۵۴

۱۱۔ سار۔ عوام کی سیاست، جدوجہد کے پچیس سال۔ لاہور س ۱۳ تا ۶۳

۱۲۔ علی اصغر چوہدری۔ تاریخ ارائیاں۔ لاہور۔ ص ۶۹۴ تا ۶۹۸

۱۳۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نا اہلیاں۔ لاہور ۱۰۴ تا ۱۰۶

۱۴۔ سار۔عوام کی سیاست، جدوجہد کے پچیس سال۔ص ۳۴۵ تا ۳۴۸
۱۵۔ عابد تہامی۔ انتخابات ۹۰ء کا وائٹ پیپر۔ لاہور ص ۴۱، ۴۲
۱۶۔ صہیب مرغوب۔ صدر اور وزیراعظم کی بیک وقت رخصتی۔ روز نامہ جنگ لاہور۔ ۲۰/جولائی ۱۹۹۳ء
۱۷۔ روز نامہ جنگ کراچی۔ ۲۰/اکتوبر ۱۹۹۳ء
۱۸۔ قیوم نظامی، جرنیل اور سیاستدان، تاریخ کی عدالت میں۔ لاہور۔ص ۱۶۴ تا ۱۶۸
۱۹۔ پروفیسر غفور احمد، نواز شریف، اقتدار سے عتاب تک۔ لاہور۔ص ۲۰، ۵۴، ۵۵، ۷۳، ۲۸۶، ۵۲۱
۲۰۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔س ۲۳۶
۲۱۔ روزنامہ جنگ کراچی، ۱۵/مئی ۲۰۰۶ء
۲۲۔ نور محمد بھٹو، بھٹو خاندان۔ حیدرآباد۔ص ۲۲
۲۳۔ اویس توحید۔ دی جینے سس آف دی الذوالفقار۔ دی نیوز کراچی۔ ۹ ستمبر ۱۹۹۳ء
۲۴۔ ولیم ڈالریمپل۔ بھٹو خاندان۔ فاصلوں اور قربتوں کی کہانی (ترجمہ: جی آر اعوان) ہفت روزہ زندگی۔ لاہور۔ ۱۵/تا ۲۱/جولائی ۱۹۹۴ء۔ص ۲۴ تا ۲۹
۲۵۔ احمد سلیم۔ پاکستان کے سیاسی قتل۔ لاہور۔ص ۱۳۹ تا ۱۴۲
۲۶۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کے پچاس سال، آخری قسط ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۱/ تا ۱۷/اگست ۱۹۹۷ء ص ۵۴
۲۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ، جلد دوم۔ص ۱۲۴، ۱۲۵، ۴۶۰
۲۸۔ روزنامہ ڈان، کراچی۔ ۲۰/جنوری ۲۰۰۳ء
۲۹۔ روز نامہ جنگ کراچی۔ ۲۶ مارچ ۱۹۷۷ء
۳۰۔ نجمہ بابر۔ امنگ دی سیلیکٹ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۱۹۹۰ء۔ص ۶۷
۳۱۔ ادارہ۔ لیس منسٹر نو منسٹر۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن ۹۰ء اسپیشل ایشو۔ص ۳۱، ۲۳
۳۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۳۰۵
۳۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ص ۱۲۴، ۱۲۵
۳۴۔ جی ایم سید۔ جب گزاریم جن سین۔ جلد اول۔ص ۱۲۲ تا ۱۲۵
۳۵۔ سید جعفر احمد۔ کنفیڈریشن راہ نجات یا راہ فرار۔ کراچی۔ص ۸۴، ۸۵
۳۶۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن۔ ۵۶۔ ۱۹۵۵۔ لاہور۔ص ۶۷۵

۳۷۔ قربان علی بگتی۔ لاڑکانہ ضلع جی بلوچن جی مختصر تاریخ۔ مشمولہ لاڑکانو ساہ سیبانو۔ لاڑکانہ۔ ص ۵۴

۳۸۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان، لاہور۔ ص ۸۷۳

۳۹۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۲۳راپریل ۲۰۰۳ء۔

۴۰۔ سید جعفر احمد۔ کنفیڈریشن راہ نجات یا راہ فرار۔ کراچی۔ ص ۸۴ تا ۸۹

۴۱۔ (i) دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۳ردسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۶۷۶

(ii) دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۱۹۳۳۶۔

۴۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷راکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۶۳۔

۴۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۸رنومبر ۱۹۹۶ء

۴۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ، جلد دوم۔ ص ۴۵۹

۴۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ، جلد دوم ص ۲۴۶

پٹھان

شکار پور میں آباد پٹھان خاندان گزشتہ نصف صدی سے پاکستان کی قومی سیاست میں سرگرم عمل ہے۔

یہ خاندان، اصل میں بابر پٹھان قبیلہ کہلاتا ہے۔ اس قبیلے کے جدامجد سلطان خان میروں کے عہد حکومت میں افغانستان سے نقل مکانی کر کے سندھ آئے اور یہاں شکار پور میں "سلطان کوٹ" کے نام سے ایک گاؤں آباد کر کے اس گاؤں میں قیام پذیر ہوئے۔ آہستہ آہستہ ان کے ورثا ایک بڑی زمیں داری اور علاقے میں خاصے اثر و رسوخ کے مالک بن گئے۔

انگریزوں کے عہد حکومت میں اس خاندان کے کئی افراد کو خان صاحب اور خان بہادر کے خطابات عطا ہوئے۔ جن میں خان صاحب سیف الدین خان، خان صاحب حسام الدین خان، خان بہادر نظام الدین خان، خان بہادر جان محمد خان، خان بہادر شاہ پسند خان اور خان بہادر میر احمد خان شامل تھے۔ ان میں سے کئی افراد بمبئی کونسل اور سندھ اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ جن میں خان بہادر جان محمد خان (چھ برس تک بمبئی کونسل کے رکن رہے) اور خان بہادر میر احمد خان (قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے) کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ خان بہادر میر احمد خان کے چچا کا نام آغا در محمد خان تھا۔ وہ سلطان خان کے پوتے اور خان بہادر شاہ پسند خان کے حقیقی بھائی تھے۔ آغا در محمد خان نے دو شادیاں کیں۔ ان کی کئی اولادیں ہوئیں مگر سیاسی میدان میں ان میں سب سے زیادہ شہرت ان کی دوسری بیوی سے سب سے چھوٹے بیٹے آغا غلام نبی پٹھان نے حاصل کی۔ (۱)

آغا غلام نبی پٹھان ۱۸ر جولائی ۱۹۱۱ء کو سلطان کوٹ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم شکار پور، کراچی اور لاڑکانہ سے حاصل کرنے کے بعد انہوں نے علی گڑھ کا رخ کیا اور پھر نویں جماعت سے بی ایس سی تک کی تمام تعلیم گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی سے حاصل کی۔ علی گڑھ میں آغا غلام نبی پٹھان کی ملاقات قائداعظم سے ہوئی اور پھر قائداعظم کے حکم پر وہ سندھ چلے آئے

اور یہاں مسلم لیگ کو منظم کرنے لگے۔
یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ اسمبلی کے انتخابات کے بعد سر غلام حسین ہدایت اللہ کی اتحاد پارٹی کی وزارت کو شکست ہو چکی تھی اور خان بہادر اللہ بخش کی وزارت قائم ہو چکی تھی۔
آغا غلام نبی پٹھان ۱۹۳۸ء میں سندھ پراونشل مسلم لیگ کے جونیئر جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے اور پھر ۱۹۵۱ء تک آٹھ برس تک سندھ پراونشل مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر خدمات انجام دیتے رہے۔ (۲)
اسی دوران ۱۹۴۲ء میں اللہ بخش سومرو کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ جب اللہ بخش سومرو کی خالی ہونے والی نشست پر ضمنی انتخابات منعقد ہوئے تو ایک جانب اللہ بخش سومرو کے بھائی مولا بخش سومرو امیدوار تھے جب کہ دوسری جانب خان بہادر احمد خاں سدھائیو تھے، جنہیں مسلم لیگ کی حمایت حاصل تھی۔ آغا غلام نبی پٹھان نے جی ایم سید کی ایما پر احمد خان سدھائیو کی انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یوں احمد خاں سدھائیو مولا بخش سومرو کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔
بد قسمتی سے ایک برس بعد احمد خان سدھائیو وفات پا گئے۔ اب اس نشست پر مسلم لیگ نے آغا غلام نبی پٹھان کو امیدوار نامزد کیا جبکہ ان کے مد مقابل مولا بخش سومرو ہی رہے اب مولا بخش سومرو کی حمایت میں غلام حسین ہدایت اللہ نے کام کرنا شروع کیا اور اس کی مدد کے لئے سرکاری مشینری بھی استعمال کرنا شروع کر دی۔ آغا غلام نبی پٹھان نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے انتخاب سے دستبرداری اختیار کی اور مسلم لیگ نے پیر پگارا کے بھائی راحم شاہ کو اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ یہ معرکہ مولا بخش سومرو کے ہاتھ رہا۔ راحم شاہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ (۳)
قیام پاکستان کے بعد آغا غلام نبی پٹھان بلا مقابلہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور جنوری ۱۹۵۰ء میں صوبائی کابینہ میں شامل کر لئے گئے۔ (۴) ۱۹۵۱ء میں یوسف ہارون سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے انہوں نے بعض اختلافات کی بنا پر آغا غلام نبی پٹھان کو اپنی کابینہ سے خارج کر دیا۔ مگر بعد میں جب ایوب کھوڑو دوبارہ سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے تو وہ پھر کابینہ میں شامل کر لئے گئے۔
آغا غلام نبی پٹھان ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اس وقت مسلم لیگ اپوزیشن میں آ چکی تھی۔ ڈاکٹر خان صاحب کے بعد جب عبدالرشید نے صوبائی کابینہ تشکیل دی تو آغا غلام نبی پٹھان اس کابینہ میں شامل کر لئے گئے۔
کچھ عرصہ بعد آغا غلام نبی پٹھان اینٹی ون یونٹ فرنٹ میں شامل ہو گئے جس کے چیئرمین ایوب کھوڑو تھے اور جس کے دیگر ارکان میں پیر پگارا، جی ایم سید، مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ، میر اسلام علی تالپور، قاضی فضل اللہ، پیرزادہ عبدالستار، مولا بخش سومرو، غلام محمد وسان اور شیخ

عبدالمجید سندھی جیسے اکابر شامل تھے۔

ایوب خان کے مارشل لاء کے زمانے میں آغا غلام نبی پٹھان پر ایبڈو کے تحت سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی گئی اور یوں ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تک وہ سیاست سے باہر رہے۔ اس دوران محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم چلی تو آغا صاحب نے اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ (۵)

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لیا۔ انتخابات سے قبل ان کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے دائیں بازو کے ایک ہفت روزہ نے تحریر کیا۔ ''بہت بڑے سرمایہ دار اور زمین دار سیاسی پارٹیاں تبدیل کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں' پہلے کنونشن لیگ میں آمریت کا سہارا بنے' پھر جی ایم سید کی پرستش کرتے رہے اور یک لخت بھٹو صاحب کے پجاری بن گئے''۔ (۶) اس انتخاب میں ان کے مدمقابل مولا بخش سومرو کامیاب ہوئے۔ تاہم بھٹو نے انہیں بھلایا نہیں اور سومروں کو نیچا دکھانے کیلئے انہیں ۱۹۷۳ء میں قائم ہونے والی پاکستان کی سینٹ کا رکن بنوا دیا۔ (۷) آغا غلام نبی پٹھان نے ۱۹۷۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر این اے ۱۵۲ سکھر ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور پاکستان قومی اتحاد کے مولانا محمد شاہ امروٹی کو شکست دینے میں کامیاب رہے۔ (۸) ۲ رجولائی ۱۹۹۷ء کو آغا غلام نبی پٹھان کا انتقال ہوگیا۔ (۹)

انہی آغا غلام نبی پٹھان کے اکلوتے بیٹے آغا طارق خان ہیں۔ وہ ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۸ء سے وہ پاکستان پیپلز پارٹی سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء میں این اے ۱۵۴ شکار پور ا سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور مولا بخش سومرو کے فرزند الٰہی بخش سومرو کو شکست دے کر ۱۹۷۰ء میں اپنے والد کی شکست کا بدلہ لے لیا آغا طارق خان بعد ازاں وفاقی کابینہ میں بھی شامل ہوئے۔ ان کے پاس ثقافت' کھیل اور سیاحت کے قلمدان رہے۔ (۱۰)

۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں آغا طارق خان کو قومی اسمبلی کی بجائے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ ملا۔ وہ پی ایس ۸ شکار پور ۲ سے امیدوار تھے۔ یہ دونوں انتخابات بھی انہوں نے بآسانی جیت لیے (۱۱) ۱۹۹۷ء میں وہ اسی نشست پر حسب سابق پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے لیکن پاکستان مسلم لیگ (ن) کے مقبول احمد شیخ کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۱۲) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر اسی نشست پر انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ انہیں مقبول احمد شیخ کے بھائی امتیاز شیخ کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی۔ امتیاز شیخ نیشنل الائنس کے امیدوار تھے۔ (۱۳)

پٹھانوں کی ایک اور شاخ' جو گڑھی لیسین میں آباد ہے' اپنے نام کے ساتھ ''درّانی'' کا لاحقہ لگاتی ہے۔ اس خاندان کے آغا شمس الدین درانی ۱۹۳۷ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۴) آغا شمس الدین درانی کے دو بیٹے عملی سیاست میں آئے۔ ایک آغا بدرالدین درانی اور دوسرے آغا صدر الدین درانی۔

آغا بدر الدین درانی' ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔

(۱۵) قیام پاکستان کے بعد وہ سندھ اسمبلی کے اسپیکر بھی رہے۔ ۲۶/جنوری ۱۹۶۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا(۱۶) ان کے چھوٹے بھائی آغا صدر الدین درانی نے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کی رکنیت سے کیا۔ (۱۷) وہ ۱۹۶۵ء میں بھی اس اسمبلی کے رکن بنے اور ۱۹۶۸ء میں وہ کچھ عرصہ تک پارلیمانی سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۷۰ء کے صوبائی انتخاب میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا اور ۱۹۷۴ء میں سندھ اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بنے۔ ۱۹۷۷ء میں انہیں اسپیکر بنا دیا گیا۔ (۱۸)

جنرل ضیاء الحق کے دور میں آغا صدر الدین درانی بیرون ملک سفیر بھی رہے۔ (۱۹) اور اس مجلس شوریٰ کے رکن بھی بنے جو جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۸۱ء میں تشکیل دی تھی۔ (۲۰) ۱۹۸۵ء میں انہوں نے این اے ۱۵۵ شکار پور ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اس انتخاب میں انہیں آغا عطا محمد خان کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی۔ (۲۱)

۱۹۹۸ء کے انتخابات میں آغا صدر الدین درانی کے صاحبزادے آغا سراج درانی کو' جو آصف زرداری کے قریبی دوست ہیں اور ان دنوں امریکہ میں مقیم تھے' بطور خاص پاکستان بلوا کر صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا۔ آغا خان سراج درانی اس انتخاب میں کامیاب رہے اور انتخاب جیتنے کے بعد سندھ کی کابینہ میں بھی شامل رہے۔ انہیں ہاؤسنگ اور ٹاؤن پلاننگ کا قلمدان دیا گیا تھا۔ (۲۲) ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء میں بھی آغا سراج درانی کو صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ ملا اور وہ ان انتخابات کو جیتنے میں بھی کامیاب رہے۔ (۲۳)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس نشست پر آغا سراج درانی کے مقابل میر مرتضیٰ بھٹو بھی امیدوار تھے تاہم وہ ۱۱۵۶۹ ووٹ حاصل کرنے کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۴) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں آغا سراج درانی پاکستان پیپلز پارٹی شہید بھٹو گروپ کے نادر حسین خان کمیریو سے شکست کھا گئے (۲۵) وہ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ اس مرتبہ انہیں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ذوالفقار علی کمیریو نے شکست دی (۲۶)

آغا عطا محمد خان جنہوں نے ۱۹۸۵ء میں آغا صدر الدین درانی کو شکست دی تھی۔ خود بھی سیاسی پس منظر کے حامل ہیں۔ ان کے والد آغا جان محمد خان ۱۹۲۰ء میں تعلقہ لوکل بورڈ کے صدر اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۷ء تک بمبئی کونسل کے رکن رہے۔ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے بعد وہ سندھ ایڈوائزری کمیٹی میں بھی شامل رہے۔ انہیں انگریزوں نے خان بہادر کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ عطا محمد خان خود بھی ریڈ کراس اور کوئی دوسری رفاہی تنظیموں کے رکن رہ چکے ہیں۔ سکھر کا سب سے شاندار سینما شالامار بھی انہی کی ملکیت ہے۔ (۲۷) ۱۹۹۸ء میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے ان کا حلقہ انتخاب تھا این اے ۱۵۵ شکار پور ۲۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان کا مقابلہ کرنے والوں میں آغا مسیح الدین درانی بھی شامل تھے جو

آغا سراج درانی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ (۲۸) آغا عطا محمد خان نے ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں حصہ نہیں لیا تاہم ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے موجود تھے۔ وہ اس انتخاب میں پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار الطاف علی بھائیو سے تقریباً ۱۵ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۲۹) ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کی نشست این اے ۲۰۳ شکار پور ۲ سے انکے عزیز آغا ارسلان خان پاکستان پیپلز پارٹی' پارلیمنٹیرین کے امیدوار تھے' مگر وہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے غوث بخش مہر سے شکست کھا گئے (۳۰)

حوالہ جات

۱۔ جی ایم سید۔ جب گزاریم جب سین (سندھی)۔ حیدر آباد۔ جلد دوم۔ ص ۴۵۴ تا ۴۵۶

۲۔ منیر احمد منیر۔ سیاسی جوار بھاٹا۔ لاہور۔ ص ۱۲

۳۔ جی ایم سید جب گزاریم جن سین (سندھی)۔ حیدر آباد۔ جلد دوم۔ ص ۴۶۵ تا ۴۶۶

۴۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلوپیڈیا۔ ایڈیشن ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ لاہور۔ ص ۲۰

۵۔ جی ایم سید۔ جب گزاریم جن سین (سندھی)۔ حیدر آباد۔ جلد دوم۔ ص ۴۶۹ تا ۴۷۲

۶۔ الطاف حسن قریشی۔ بلوچستان اور سندھ کا انتخابی جائزہ۔ ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور۔ ۲۳/ تا ۲۹/ نومبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۲

۷۔ ادریس بختیار' علی حسن۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن ۹۰ء اسپیشل ایشو۔ ص ۸۵

۸۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان (حصہ اول) کراچی۔ ص ۲۷۶

۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳/ جولائی ۱۹۹۷ء

۱۰۔ الیس محمد رضا (مدیر)۔ پرسنز ہوشیپ اور ڈیسٹنی (جلد اول)۔ کراچی۔ ص ۲۱۶

۱۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۹/ نومبر ۱۹۹۰۔ ص ۹۳۲۳' ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۵۱

۱۲۔ ایضاً۔ ۲۳/ فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۴۲۹

۱۳۔ ایضاً۔ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۹۷ء۔ ص ۳۰۸۵

۱۴۔ ڈاکٹر عبدالجبار لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۲۱۲

۱۵۔ ولی مظہر ایڈووکیٹ۔ عظیم قائد عظیم تحریک جلد اول۔ ملتان۔ ص ۴۱۸

۱۶۔ خادم حسین چانڈیو۔ ماروجی ملیر جا (سندھی)۔ حیدر آباد۔ ص ۱۲۰

۱۷۔ عبداللہ الاثری۔ عالمی معلومات۔ لاہور۔ ص ۴۶

۱۸۔ ایس محمد رضا (مدیر)۔ پرسنز ہوشیپ آورڈیسٹنی (جلد اول)۔ کراچی۔ ص ۲۱٦

۱۹۔ ادریس بختیار و علی حسن۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن ۹۰ء اسپشل ایشو۔ ص ۸۵

۲۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۱ء

۲۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۴٦۱، ۴٦۲

۲۲۔ طاہر محمود ڈوگر۔ ہواز ہو اینڈ وہاٹ از وہاٹ (۹۸۹ء ایڈیشن)۔ لاہور۔ ص ۸

۲۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱/ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۲۳، ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۵۱

۲۴۔ ایضاً۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۵۱

۲۵۔ ایضاً۔ ۲۳/ فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۴۲۹

۲٦۔ ایضاً۔ ۲۵/ اکتوبر ۲۰۲ء۔ ص ۳۰۸۵

۲۷۔ رحیم داد خان مولائی شیدائی۔ تاریخ سکھر (سندھی) حیدرآباد۔ ص ۴۰٦

۲۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ۴۵۷

۲۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۰۱

۳۰۔ ایضاً۔ ۲۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۹۵۵

پیران پاگارہ

سندھ میں پیری مریدی کے کئی معروف خاندان ایسے ہیں جن کے مرید لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ان میں "پیر پاگارو" خاندان نمایاں ہے۔ اس کے مریدوں کو "حر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حر تحریک کا تعلق بھی اس خاندان سے ہے۔ ان تحاریک کا سلسلہ ایک صدی سے بھی زیادہ کا ہے' جن میں سید احمد شہید بریلوی کی سکھوں کے خلاف تحریک میں معاونت (۱۸۲۶ تا ۱۸۳۱ء) اس وقت سے ہے جب سندھ پر تالپوروں کی حکومت تھی اور تین تحریکیں (i) ۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۶ء (ii) ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء اور (iii) ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۳ء خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

سید احمد شہید نے حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے لئے سکھوں کے خلاف ۱۸۲۴ء میں اعلان جہاد کیا۔ جس زمانے میں سید صاحب ہندوستان میں تحریک مجاہدین کی تنظیم کر رہے تھے' ٹھیک اسی دور میں سندھ کے جلیل القدر روحانی پیشوا سید صبغۃ اللہ شاہ (اول) نے انہی خطوط پر اپنی فکری اور نظری تحریک کا آغاز کیا۔ سید صبغۃ اللہ نے بھی اپنے جان نثاروں اور مریدوں کی روحانی و اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ عسکری تربیت کا بھی بندوبست کیا' تاکہ بوقت ضرورت ملت اسلامیہ کی سربلندی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا سکیں۔ (۱)

حضرت سید صبغۃ اللہ بن حضرت پیر محمد راشد سندھ کے مشہور صوفیائے کرام کے خاندان کے چشم و چراغ تھے' جو حضرت پیر محمد راشد روضہ دھنی کے بعد مسند آرائے رشد و ہدایت ہوئے' اور دستار سجادگی ان کے سر پر باندھی گئی۔ اس خاندان میں یہ پہلے پیر تھے جو "پیر پگارہ" (صاحب دستار) کے لقب سے مشہور ہوئے (آپ کا سلسلہ نسب حضرت سید علی مکی رحمتہ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں حجاز سے نکل کر بغداد پھر سندھ پہنچے تھے۔ ان کے دوسرے بھائی محمد یاسین علم یا جھنڈا لے کر دوسری جگہ چلے گئے اور پیر جھنڈا کے لقب سے مشہور ہوئے۔)

سید صبغۃ اللہ اول نے جب مسند رشد و ہدایت کو زینت بخشی تو اس وقت ہندوستان میں

مغلیہ حکومت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ پنجاب پر سکھوں کا تسلط تھا اور سندھ پر انگریز اور سکھ نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان مایوس کن حالات نے مسلمانوں کو سراسیمہ' حیران اور پریشان بنا رکھا تھا۔ سارے معاشرے پر تنزل و انحطاط کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ مذہب کی روح ختم ہو چکی تھی۔ لوگ صدہا اخلاقی عیوب اور گمراہیوں میں مبتلا تھے۔ رسمی تصوف اس لئے بے روح ہو کر رہ گیا تھا کہ وہ جمال شریعت سے آراستہ نہ تھا۔ ان بگڑے ہوئے حالات میں حضرت سید پیر صبغتہ اللہ اول نے رشد و ہدایت کی شمع روشن کی۔

سکھ سندھ کی طرف پھیلنے لگے اور انگریز اپنے معاہدوں کی زنجیروں کے ذریعے اہل سندھ کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے لگے تو' حضرت پیر صبغتہ اللہ اول نے جہاد کا عزم مصمم کر لیا۔ آپ کا کوئی وعظ جہاد کی ترغیب اور فضائل سے خالی نہ ہوتا تھا۔ "کچھ" اور "لار" کے مرید ان کے مواعظ میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ لہٰذا آپ ان پر خطوط کے ذریعے سے جہاد کی فضیلت اور اہمیت کو واضح کرتے تھے۔

ان ہی مریدوں میں سے حضرت سید شاہ صبغتہ اللہ اول نے ایسے سرفروش اور جاں باز مجاہدوں کی جماعت تیار کی' جو وقت پڑنے پر ملت اسلامیہ کے لئے اپنی جان کی بازی لگا سکے۔ ان ہی مجاہدین کو "حر" کا لقب دیا گیا اور یہی حر تحریک کا نقطہ آغاز تھا۔

ادھر ۱۸۲۷ء میں حضرت سید احمد شہید عزم جہاد و ہجرت سے سرشار مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ سندھ وارد ہوئے۔ حیدر آباد میں میران تالپور نے حضرت سید احمد کی جماعت کا بھرپور استقبال کیا۔ مگر ان کا قلب ذوق جہاد سے خالی تھا اس لئے حضرت سید احمد ان سے رخصت ہو کر آگے بڑھے اور رانی پور پہنچے۔

جب حضرت سید احمد شہید رانی پور تشریف لائے تو اتفاق سے حضرت سید صبغتہ اللہ اول بھی اپنے ایک سو مریدوں کے ساتھ رانی پور آئے ہوئے تھے۔ یہیں آپ کی ملاقات حضرت سید احمد شہید سے ہوئی۔ دونوں کے خیالات و افکار میں ہم آہنگی تھی' دونوں جذبہ جہاد سے سرشار تھے' روحانی ہم آہنگی نے دلی ربط کو اور بھی قوی کر دیا تھا۔ (۲)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے خداداد خان کی کتاب لب تاریخ سنہ ھ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے۔

"اس ملاقات میں حضرت سید احمد شہید اور حضرت سید صبغتہ اللہ اول دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ جہاد کر کے شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو سکھوں کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔ چنانچہ سندھ میں بھی ایک عظیم مہم کا آغاز کیا گیا اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی جانے لگی۔ درزیوں کی ایک جماعت کو بلا کر حکم دیا گیا کہ مجاہدین کے لئے جنگی لباس تیار کریں اور اپنے مریدوں اور جان نثاروں کی ایک جماعت کو حضرت سید شہید کے ہمرکاب کر دیا۔ یہ پہلی جماعت تھی جو حروں یعنی احرار کے نام سے موسوم ہوئی۔ (۳)

سید صبغتہ اللہ شاہ نے اس جماعت کو سامان حرب و ضرب سے لیس کر کے سید احمد شہید کے ہمراہ کر دیا اور خود ان کی مزید معاونت کے لئے سندھ میں رہے۔ بعض علمائے حق حضرت صبغتہ اللہ شاہ کی اپیل پر پروانہ وار مجاہدین (حروں) کی جماعت میں بغرض جہاد شامل ہو گئے تاکہ سید احمد شہید کو مزید کمک بہم پہنچائی جائے۔ چنانچہ قاضی عثمان السندھی جو شوکانیؒ کے شاگردوں میں سے تھے اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تعلیمات سے متاثر تھے واپس اپنے وطن آ گئے اور حروں کے ایک طائفہ میں مجاہدانہ طور پر شرکت کی۔

سید احمد شہید کو پہلے پہل اس جہاد میں نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں لیکن آخر کار حالات نے پلٹا کھایا اور ذیلقعدہ ۱۲۴۶ھ میں آپ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے۔

حضرت سید شہید کی ناکامی کے اسباب میں سے غالباً ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت صبغتہ اللہ شاہ پانچ رمضان ۱۲۴۶ھ کو وفات پا گئے اور وہ فوجی اور افرادی امداد جو ان کی طرف سے حضرت شہید کو ملتی تھی اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

حضرت سید احمد شہید، سید صبغتہ اللہ کو سندھ میں اپنا رفیق و معاون تصور کرتے تھے اور اپنے اہل و عیال کو بھی ان کے سپرد کر گئے تھے۔

حضرت پیر صاحب نے اپنے مریدوں کو جو پہلی جماعت حضرت سید احمد کے ساتھ روانہ کی تھی اس کی تعداد پانچ سو تھی اور سید صاحب کے اہل و عیال پیر صاحب کی حویلی میں بصد عزت و احترام اور تکریم مقیم تھے۔

دوسری طرف مجاہدین نے ۲۳ر جون ۱۸۳۰ء کو سکھوں سے پشاور بھی فتح کر لیا مگر بعد میں حالات نے جو پلٹا کھایا وہ یہ تھا کہ انگریزوں نے اپنی چالبازیوں سے صوبہ سرحد میں فساد شروع کرایا، جس کے نتیجے میں حضرت سید احمد و حضرت سید اسماعیل بالاکوٹ میں سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ (۴)

سید صبغتہ اللہ شاہ (اول) پیر پگارہ کے دو بیٹے تھے۔ سید علی محمد شاہ اور سید پیر علی گوہر شاہ جو آپ کی وفات یکم رمضان ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ آپ دوسرے پاگارو تھے اور لقب تھا "بنگلہ دھنی"۔ وہ شاعر تھے اور تخلص "اصغر" تھا۔

آپ کے دور میں تحریک مجاہدین کا ایک گروپ آزاد علاقہ کی طرف جاتا ہوا پیر گوٹھ میں آیا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی اور قیام حکومت الہیہ کے سلسلے میں پیر گوٹھ کو سندھ کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے سندھ کے حکمرانوں کو پنجاب کے سکھوں کا خوف دلا کر سندھ پر قبضہ کر لیا۔ "میانی" اور "دبہ" کی جنگوں میں تالپوروں کی شکست کے بعد ایک طرف سے میر شیر محمد خان اور نواب احمد خان اور دوسری طرف سے میر شہداد خان نے سندھ کی آزادی کے

لئے تحریک چلائی۔ کئی معرکے بھی ہوئے مگر قسمت نے یاوری نہیں کی اور چند برسوں کے اندر انگریزوں کی گرفت مستحکم ہو گئی۔ مگر سندھ اور ہندوستان کے عوام کے دلوں میں آزادی کی چنگاری سلگتی رہی۔

۱۸۵۷ء میں ایک بار بلکہ پہلی بار پورے برصغیر میں انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی میرٹھ سے شروع ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر کو محب وطن مجاہدوں نے اپنا بادشاہ تسلیم کیا مگر پنجاب کے سکھ اور کئی غدار انگریز کے بازوئے شمشیر بن گئے۔ انہوں نے دہلی کی بربادی اور مجاہدوں کی ناکامی میں انگریزوں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس پوری تحریک آزادی میں سندھ بھی آگے آگے تھا اور شکار پور اور جیکب آباد کے جتنے بلوچ اس تحریک میں شریک تھے ان میں اکثریت حر مجاہدین کی تھی۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ سید علی گوہر شاہ پیر پاگارہ بنگلہ دھنی' جمادی الاول ۱۲۶۳ء بمطابق ۲۸ اپریل ۱۸۴۷ء کو وفات پا گئے تھے۔ ان کی مسند پر ان کے بیٹے پیر سید حزب اللہ شاہ بطور پیر پاگارہ سجادہ نشین بنے۔ ان کا لقب تھا تخت دھنی۔ آپ بھی شاعر تھے اور تخلص مسکین تھا۔

جناب حزب اللہ شاہ اس وقت کمسن تھے لیکن وہ اپنے آباء و اجداد کی مجاہدانہ روایت سے با خبر تھے۔ جیسے وقت گزرا تو انہوں نے جماعت کی باقاعدہ تنظیم شروع کی۔ انگریزوں کی سامراجی حکومت کے خلاف جذبہ بڑھتا رہا۔ ۱۸۸۶ء میں جب روہڑی سکھر پل کی تکمیل پر جلسہ ہوا اور اس میں شراب تقسیم کی گئی تو پیر صاحب نے زور دار احتجاج کیا کہ آپ کو کیا حق ہے کہ ہمارے اسلامی شعار کے منافی حرکتیں کریں۔

اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پیر گوٹھ کے پیر صاحبان اور ان کی حر جماعت نے کبھی بھی انگریزوں کو دل سے برداشت نہیں کیا۔ وہ مسلسل ان کو پریشان رکھتے آئے۔ وہ کبھی بھی ان کے وفادار نہ بنے اور نہ بن سکتے تھے۔ جس طرح پیشہ وار فوجی خاندان ہوتے ہیں اسی طرح انہیں پیشہ ور مجاہدین کہا جا سکتا ہے۔ ان کے خاندانوں میں بیٹا' باپ' دادا' پردادا' مسلسل مجاہدین کی صفوں میں نظر آتے ہیں۔ ۱۸۴۳ء میں بھی حر جماعت کے لوگ اور عورتیں ایسی تھیں' جنہوں نے میر شیر محمد خان کو' جو اس وقت انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی چلا رہے تھے' انگریز گھڑ سوار دستہ سے محفوظ رکھنے کے لئے کشتیوں کے ذریعے مکھی جھیل سے ملحق گھنے جنگل میں لے گئے تھے اور انگریز سوار مجبوراً ان کا مزید پیچھا نہ کر سکے تھے۔

پیر حزب اللہ شاہ (تخت دھنی) کے دور میں حر مجاہدین کی ظاہری خاموشی سے انگریزوں نے یہ تاثر لیا کہ پیر پاگارہ ان کے خیر خواہ ہو گئے ہیں' اس لئے سندھ کے کمشنر نے خان بہادر خدا داد خان (مولف لب تاریخ سندھ) کو کچھ تحائف دے کر پیر صاحب کے پاس بھیجا کہ وہ ایک بھرے

اجلاس میں پیر صاحب کو پیش کریں۔ ان تحائف میں ایک تلوار اور آفریں نامہ بھی تھا۔
پیر صاحب نے مصلحتاً" ان تحائف کو اس لئے قبول کرنے سے انکار نہیں کیا کہ مبادا انگریز اصل حقیقت سمجھ لیں کہ حروں کو خاموش رہنے کی تلقین محض وقتی طور پر کی گئی ہے۔

اس کے باوجود لب تاریخ سندھ کے مولف نے سرکاری پرچہ نویس کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حر مجاہدین وقتاً" فوقتاً" انگریزوں پر چھاپہ مار کر انہیں نقصان پہنچاتے اور پریشان کرتے رہے، جس سے انگریز حکومت بد حواس ہو گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ پیر پاگارہ پر کبھی دباؤ ڈال کر اور کبھی خوشامد کرکے مجاہدین سے نمٹنے کی کوشش کرتی رہی۔

پیر سید حزب اللہ شاہ تخت دھنی کی وفات ۲ محرم ۱۳۰۸ھ مطابق ۲۱ر اگست ۱۸۹۰ء تک کچھ ایسے ہی حالات رہے۔

آپ کی وفات کے بعد پیر سید علی گوہر شاہ (ثانی) سجادہ نشین ہوئے۔ آپ کا لقب محض دھنی تھا۔ ان کے دور میں ۱۸۹۶ء میں تحریک شروع ہوئی۔

پیر علی گوہر شاہ محرم شاہ محرم الحرام ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں انتقال کر گئے تھے۔ چونکہ وہ لاولد تھے اس لئے ان کے چھوٹے بھائی سید شاہ مردان شاہ سجادہ نشین ہوئے۔ اس دور میں انہوں نے کھپرو سانگھڑ اور شہداد پور تحصیلوں میں انگریزوں کے خلاف زبردست گوریلا جنگ چھیڑ دی۔ انہوں نے تھانوں اور سرکاری دفتروں کو اپنا نشانہ بنایا۔ حر مجاہدین کے پے در پے اور اچانک حملوں کی وجہ سے پولیس میں سخت خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔

حکومت بھی غافل نہ تھی۔ اس نے اپنی روایتی چال چلی۔ جاسوسی، مکرو فریب لڑاؤ اور حکومت کرو کی ڈپلومیسی کے تحت حروں کی ان کمین گاہوں کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ انہوں نے پورے سندھ میں سے پولیس فورس کو جمع کرکے اور فوج کی مدد سے ان کا گھیراؤ کر لیا۔

بے شمار، حر مجاہدین گرفتار ہو گئے اور ان کے ساتھ بہت ہی ظالمانہ سلوک کیا گیا۔ بہت سے حر مقابلوں میں مارے گئے اور کئی ایک کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

جاسوسی کرنے والوں کو یا حکومت کی مدد کرنے والوں کو بہت سے انعامات سے نوازا گیا۔

حروں کو اپنے ہم وطنوں سے ایک شکایت تھی، وہ یہ کہ یا تو ہمارے ساتھ مل کر انگریزوں سے لڑو یا ہمیں لڑنے دو۔ تم غیر جانبدار ہی رہو۔ مگر حریص اور خوشامدی لوگ حروں کے خیر خواہ بن کر ان میں گھس جاتے اور ان کے راز لے کر غیر ملکی آقاؤں کو پہنچا دیتے جس کے عوض انہیں خطیر انعام سے نوازا جاتا۔ وہ اس پر بڑے نازاں اور خوش ہوتے۔

حروں کی گوریلا جنگیں انگریزوں کے لئے سخت خوف و ہراس کا سبب ہوتی تھیں مگر وہ بھی اپنی چالبازیوں سے ان کو کچلنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ حروں کی کوئی رہنمائی نہ ہوتی تھی اور نہ

جدید اسلحہ ان کے پاس ہوتا نہ ہی ان کی شیرازہ بندی ہوئی اور نہ کوئی معاون ومددگار تھا' اس طرح یہ سلسلے ۱۸۹۸ء تک جاری رہے۔

دیکھا جائے تو سید علی گوہر شاہ کا دور کچھ اور زیادہ پر آشوب رہا ہے۔ پورے برصغیر میں اس وقت کوئی تحریک نہ تھی اور حکومت کی گرفت بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ ایک طرف تو محکمہ سراغ رسانی بہت فعال تھا اور دوسری طرف محکمہ مال گزاری کی بدولت ملک کا کونہ کونہ اور ہر ضلع ان کی گرفت میں تھا' تیسری طرف جاگیرداری اور خطابات نے بااثر اور امراء لوگوں کو بے حس بنا رکھا تھا۔ ان کا اگر کوئی مقصد تھا تو صرف یہ کہ وہ کس طرح حکومت کے منظور نظر ہو سکتے ہیں۔ فوج اور پولیس میں مقامی اور غیر ملکی اس طرح بھرتی کئے ہوئے تھے کہ اگر ذرا سی بھی کوئی شورش کہیں سے اٹھتی تھی تو آغاز ہی میں اپنے انجام کو پہنچ جاتی تھی۔ ایسے حالات میں ایک وسیع و عریض اور مضبوط حکومت کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہونا بھی کوئی آسان بات نہ تھی۔

سچ تو یہ ہے ایسے حالات میں حروں کا صرف زندہ رہنا ہی ان کی جوانمردی اور حوصلے کی بلندی کا ثبوت ہے۔

مگر عین اس دور میں جب کہ ۱۸۹۶ء میں مسٹر جیمس دوبارہ سندھ کے کمشنر بن کر آ گئے' حروں نے سانگھڑ اور تھرپارکر کے اضلاع میں گوریلا جنگ کر کے دہشت پھیلا دی اور حکومت کو حیران و پریشان کر دیا۔ حروں کی اس تحریک کو دوسری حر تحریک سے موسوم کر سکتے ہیں۔ جو آزادی کے لئے تھی اور وہ سکھوں کی بجائے انگریزوں کے خلاف تھی جو ۹۶-۱۸۹۵ء میں باقاعدہ علم بغاوت بلند کر کے شروع ہوئی۔

انگریز تو ویسے ہی حروں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے' اس لئے انہوں نے کبھی بھی پیران پاگارہ یا ان کے مریدوں سے کوئی رعایت نہیں برتی اور نہ کبھی ان سے راہ و رسم پیدا کئے۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ پیران پاگارہ اور ان کے مریدین کبھی بھی انگریزوں سے نفرت کو ختم نہیں کریں گے۔ یہ دوری اور خلیج بڑھتے بڑھتے آخر وہ دن بھی آ گیا کہ پاگارہ کے مرید بچو خاص خیلی اور اس کے ساتھی پیرو وسان نے آزادی کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔

ضلع سانگھڑ کے جنگلات "مکھی بیلہ" کو اپنا مرکز بنا کر بچو خاص خیلی اور اس کے ساتھی پیرو وسان نے اپنی بادشاہت کا اس طرح اعلان کیا کہ لوگ اس کو بچو بادشاہ کہتے اور پیرو کو وزیر کہہ کے پکارتے۔ یہ آپس میں ۱۲ سالار تھے۔

ان ساتھیوں (مجاہدوں) کو "بھروٹیا" یا "مکھی کے مور" کہا جاتا تھا۔ انہوں نے ۲ ہزار مربع میل کے علاقہ پر قبضہ کر رکھا تھا یا آزاد کر رکھا تھا۔

چونکہ یہ ٹولہ ہر اس آدمی کے بھی خلاف تھا جو حکومت کا مخبر تھا اس لئے ان لوگوں نے حکومت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا بھی صفایا کرنا شروع کر دیا' جو جاسوسی کر کے حکومت سے

انعام و اکرام حاصل کرتے تھے۔ ایسے ہی واقعات کو تھرپارکر کے مشہور عوامی شاعر مل محمود پلی نے اپنے اشعار میں رقم کیا ہے۔ ایک واقعہ یہ تھا کہ سانگھڑ ضلع کے ایک گاؤں "بھرم بری" میں ہر سال اس نام سے ایک میلہ بھی لگتا ہے۔ ۱۸۹۶ء کے میلے میں ان حروں نے حملہ کر کے ایک سکھ "جولہ سنگھ" دفعدار کو للکارتے ہوئے قتل کر دیا۔

آزادی کی یہ تحریک بلاشبہ ایک محدود علاقے میں تھی۔ سندھ کے ایک ضلع سانگھڑ میں' بلکہ اس وقت سانگھڑ ایک تحصیل کی حیثیت رکھتا تھا' مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تحریک کم و بیش ۱۲ سال سے زائد عرصے تک جاری رہی۔ یہ ۱۲ سالاروں کا ٹولہ انگریزوں سے مسلح لڑائیاں لڑتا رہا۔ نتیجے کے طور پر پیر صاحبان کے مریدوں اور خاص طور پر حروں پر بہت مظالم ڈھائے گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں گرفتار ہوئے اور برسوں تک ان کو جیلوں میں رکھا گیا۔ جب جیلیں بھر گئیں تو کانٹوں کی باڑھیں لگا کر ان Concentration Camps کو جیل بنایا گیا اور حروں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ان میں رکھا گیا۔ ان کی زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ "کالے پانی" تک کی سزا دی گئی۔ حروں کے علاوہ دوسرے عوام کی بھی زندگی اجیرن ہو گئی۔ حروں پر چوکسی (نگرانی) رکھنے کے لئے سانگھڑ' جملعوں' میرپور' کنگ پنی' جمراؤ اور دیگر جگہوں پر خاص پولیس چوکیاں قائم کی گئیں۔ (۵)

جناب شاہ مردان شاہ (اول) کا انتقال ۷ ربیع اول ۱۳۴۰ھ/۹ نومبر ۱۹۲۱ئہ کو ہوا تو ان کے فرزند سید صبغتہ اللہ شاہ (ثانی) کو سجادہ نشین بنایا گیا۔ ان کا لقب پگ دھنی یعنی دستار والا تھا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی اور حالات کیا تھے' ان کی ایک جھلک اوپر دی جا چکی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت یہ خلافت کانٹوں کا تاج رکھنے کے مترادف تھی۔ اس کے باوجود وہ کمسنی میں بھی جرات مند اور مستحکم ارادے کے مالک تھے۔ انہوں نے چچا مرحوم پیر علی گوہر شاہ کے نام پر انگریزوں کے دیئے ہوئے "آفرین نامہ" کا فریم' جو بنگلہ کی دیوار پر آویزاں تھا' یہ کہہ کر توڑ دیا اور اسے پرزہ پرزہ کر دیا کہ:

"ہمارے بزرگ بھی کس قدر سادہ لوح تھے۔ خداوند تعالیٰ نے ان کو بڑی عزت بخشی تھی لیکن پھر بھی یہ آفرین نامہ موجود ہے"۔

اس سے خودداری' عزت نفس' حریت پسندی اور خاندانی وجاہت کا زبردست تاثر ملتا ہے۔ چونکہ وہ صغیرسن تھے اور ان کے کئی رشتہ داروں کو حکومت نے نگرانی کرنے اور حکومت کے حق میں آمادہ کرنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا' انہوں نے ایسے واقعات حکومت تک پہنچا دیئے۔ حکومت پہلے سے زیادہ سخت اور محتاط ہو گئی اور مخبروں کا جال بچھا دیا جو ہر وقت پیر صاحب کے اقدامات پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ چونکہ حکومت پیر صاحب کو گرفتار کرنا چاہتی تھی اور کسی موقعے کی تلاش میں تھی۔ لہٰذا وہ موقع ان کو مل گیا۔

۱۹۲۹ء میں پیر گوٹھ کی ایک عورت نے سکھر پولیس کو ایک درخواست دی کہ اس کے لڑکے ابراہیم کوری کو پیر صاحب نے قید کر رکھا ہے۔ اس پر ایس پی سکھر غلام اکبر نے پولیس کی بھاری جمعیت سے پیر گوٹھ پر چھاپہ مار کر نہ صرف ابراہیم کو برآمد کر لیا، بلکہ کافی مقدار میں گولہ بارود بھی قبضہ میں کر لیا۔ پیر صاحب گرفتار کر لئے گئے۔ ان کے خلاف بغاوت، غیر قانونی اسلحہ کا جمع کرنا، ابراہیم کو حبس بیجا میں رکھنا اور مریم بی بی (ابراہیم کی ماں) کو قتل کرنے کے الزامات میں مقدمہ چلایا گیا۔

اس مقدمے کے الزامات میں ابراہیم کو صندوقچی میں ناحق بند رکھنا۔ غیر قانونی طور پر ۱۲ رائفلیں، ۳ بندوقیں، ۲ ریوالور اور پندرہ ہزار کارتوس اور گولیاں اور دوسرا بارود بنانے کا سامان بھی ملا تھا۔

چونکہ یہ بہت بڑا مقدمہ بنایا گیا تھا اس لئے اس وقت ہندوستان کے معروف وکیل محمد علی جناح (قائداعظم) کو مقدمہ کی پیروی کے لئے مقرر کیا گیا۔ وہ بمبئی سے مقدمہ کی پیروی کرنے کے لئے سکھر آیا کرتے تھے۔

مقدمہ کی ابھی دو پیشیاں ہوئیں تھیں کہ تیسری پیشی پر محمد علی جناح (قائداعظم) نے واضح الفاظ میں بتایا کہ (انگریزوں کی طرف سے) پیر صاحب کو کسی صورت میں بھی آزاد نہیں کیا جائے گا۔ محمد لائق زرداری نے اپنی کتاب "تحریک پاکستان میں سندھ کا حصہ" میں، تحریر کیا ہے کہ اس وجہ سے قائداعظم نے فیس واپس کرتے ہوئے آئندہ کے لئے معذرت کر لی۔

مقدمہ چلنے کے بعد مریم کا قتل تو ثابت نہیں ہوا البتہ پیر صاحب کو دوسرے الزامات میں ۸ سال کی سزا سنا کر رتناگری جیل (پونا) بھیج دیا گیا۔

اسی جیل خانے میں انہوں نے اپنے جد امجد حضرت پیر محمد راشد (روضہ دھنی) کے ملفوظات کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ فارسی، سندھی اور اردو کی بہت سی کتابیں پڑھیں اور ان کتابوں سے اخذ کر کے ایک انتخاب مرتب کیا۔

یہیں انہیں ہندوستان کی سیاست کو سمجھنے کا موقع ملا اور یہیں انہوں نے انگریزوں کی غیر منصفانہ پالیسی اور "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" پر غور کر کے ایک سیاسی منشور مرتب کیا۔ (۶)

جیل سے رہا ہو کر جب وہ اپنے وطن سندھ واپس آئے تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف توجہ دی۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان کے مرید ہر قسم کے نشے سے احتراز کریں اور سادگی اور کفایت شعاری کو اپنا شعار بنائیں۔ انہوں نے خواتین کو بھی اشیائے صرف میں بچت کا حکم دیا۔

سانگھڑ کے قریب گڑنگ میں اپنی تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک بنگلہ تعمیر کرایا۔ اس بنگلے کی حیثیت ایک مرکز کی تھی۔ جہاں مریدین آکر قیام کرتے تھے۔ اس مرکز کی حفاظت

کے لئے مریدوں کا پہرہ لگوایا۔

رات کو پیر صاحب لباس تبدیل کر کے فقرا کر لباس میں گھومتے اور جو شخص نشے میں مبتلا نظر آتا' اسے بلا کر سخت تنبیہہ کرتے۔ پھر حضرت پیر صبغتہ اللہ ثانی نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ جماعت کا کوئی شخص ولایتی کپڑا نہ پہنے بلکہ ملک کا بنا ہوا کپڑا استعمال کرے۔

وہ انگریزوں کے خلاف بلا امتیاز مسلم و غیر مسلم ایک متحدہ محاذ قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ ہندو اور مسلمان آپس میں اتفاق سے رہیں اور کسی جھگڑے اور اختلاف میں نہ پڑیں۔

ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا۔ لہذا انگریزوں نے حروں کی نگرانی کے متعلق سخت احکام جاری کیئے۔

حضرت پیر صبغتہ اللہ ثانی نے اس تحریک کو منظم بنانے کے لئے غازیوں کی ایک فہرست مرتب کی اور خود بھی مختلف اوقات میں غازیوں کا معائنہ کیا۔ مریدوں کو حکم دیا کہ وہ گاؤں گاؤں جا کر غازیوں کے ناموں کی ایک فہرست مرتب کریں۔

پیر صاحب گڑنگ کے بنگلے میں مختلف اوقات میں غازیوں کا معائنہ کرتے۔ معائنے کی صورت یہ ہوتی کہ مرید آ کر پندرہ پندرہ کی ٹولیوں میں بیٹھ جاتے' جو کوئی اس قطار میں بیٹھتا' پیر صاحب اس سے پوچھتے اب تم غازی ہو گئے ہو۔ وہ جواب دیتے ہاں قبلہ! پھر فرماتے تمہیں مبارک ہو کہ تم غازیوں کی فہرست میں آ گئے ہو تم پر سیکڑوں رحمتیں نازل ہوں۔ اس موقع پر ایک کافی عام ہو گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ :

وہ شخص مرد میدان نہیں جو اپنا سر بچالے
بلکہ مرشد کو سر نذر کرنے ہی میں ہماری عید ہے

اسی زمانے میں مسجد منزل گاہ کا جھگڑا شروع ہوا جس کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ پیر صاحب نے اپنے غازیوں کو تاکید کی کہ وہ ہر جگہ امن و امان کو بحال رکھیں۔ پیر صاحب نے پوری طاقت سے انگریز حکومت کی اس سازش کو ناکام بنا دیا۔ جس کے ذریعے سے وہ ہندو مسلم شر پسندوں کو اکسا کر حضرت پیر پاگارہ اور ان کی جماعت حروں کے خلاف سخت اقدامات کا بہانہ تراشنا چاہتی تھی۔ انگریز کا مقصد یہ تھا کہ اگر پیر صاحب کے زیر اثر دیہات میں کچھ ہندو مارے جائیں تو اس سے ایک تو بڑا فائدہ یہ پہنچے گا کہ ہندو مسلم اتحاد خطرے میں پڑ جائے گا' دوسرے یہ کہ اس بہانے سے غازیوں پر پابندی لگانے کا موقع ہاتھ آ جائے گا' لیکن انگریز کی یہ منافقانہ پالیسی ناکام رہی اور پیر صاحب کو اس سازش کا علم ایک رات پہلے سانگھڑ کے بنگلے میں ہو گیا اور فوراً ہی آپ نے امن و امان کے بحال رکھنے کی تدبیریں اختیار کیں اور غازیوں نے ایسے اقدامات کیئے کہ حملہ آور پیر صاحب کے گاؤں میں ہندوؤں پر حملے کی جرات نہ کر سکے۔ اس اسکیم کی ناکامی کے بعد دوسرے دن ہندوؤں کا ایک وفد سکھر کے کلکٹر سے ملا۔ اس

وفد نے کلکٹر سے کہا کہ رات پیر صاحب کے غازیوں نے ہماری جانیں بچائیں اور پورے گاؤں میں امن و امان برقرار رکھا' ہم پیر صاحب کے شکر گزار ہیں۔

انگریزوں نے اپنی اس تجویز کی ناکامی کو دیکھ کر ایک نئی ترکیب سوچی۔ کچھ دن کے بعد سکھر کے کلکٹر نے پیر صاحب کو بلوا بھیجا۔ پیر صاحب نے اپنے خلیفہ احمد کو کلکٹر سکھر سے ملاقات کے لئے بھیجا۔ کلکٹر ان سے بظاہر بہت اچھے طریقے سے پیش آیا اور کہا کہ پیر صاحب کو ہمارا پیغام پہنچائیے کہ انہوں نے امن عامہ بحال کرنے کا جو کام پیر گوٹھ میں انجام دیا ہے اس کو گورنمنٹ بنظر استحسان دیکھتی ہے اور اس نے ان خدمات کے صلہ میں ایک تلوار اور ایک بندوق انعام کے طور پر مقرر کی ہے۔ نیز میری سفارش پر انہیں خطاب دینا بھی منظور کیا ہے۔ امید ہے کہ پیر صاحب اس انعام کو منظور فرمائیں گے۔

پیر صاحب نے انگریزی حکومت کے انعامات اور خطاب کو ٹھکرا دیا اور خلیفہ احمد سے کہا جاؤ اور کلکٹر سے کہو کہ ہتھیار میرے پاس موجود ہیں اور پیر پاگارہ کا خاندانی خطاب میرے لئے کافی ہے' مجھے آپ کے انعام اور خطاب کی ضرورت نہیں۔

خلیفہ احمد نے پیر صاحب کا یہ جواب کلکٹر سکھر کو پہنچا دیا' کلکٹر نے خلیفہ احمد سے کہا کہ پیر صاحب نے انعام اور خطاب مسترد کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔

جب فرنگی حکومت کو یقین کامل ہو گیا کہ پیر صاحب کسی لالچ اور دباؤ میں آنے والے نہیں اور وہ انگریز حکومت کے کسی طرح بھی وفادار نہیں ہو سکتے تو انہوں نے تشدد کا آخری حربہ استعمال کرنے کے لئے تمام کاغذی کارروائیاں مکمل کر لیں۔

ادھر پیر صاحب نے بھی فرنگی سامراجیت کے ظلم و تشدد سے بچنے کے لئے' سانگھڑ گڑنگ والے بنگلے کو اپنا مرکز بنایا اور چھ ماہ وہاں مستقل قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ اس بنگلے میں غازیوں کو سپاہیانہ تربیت دی جاتی تھی۔ عوام میں مشہور ہو گیا تھا کہ پیر صاحب اس بنگلے میں اپنے مریدوں کو بندوق اور ریوالور چلانے کی تربیت دے کر انگریزوں کے خلاف لڑائی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ پیر صاحب کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مریدوں کی جماعت کو منظم اور طاقتور بنایا جائے تاکہ فرنگی استعمار پسند طاقت کو مفلوج کر کے حریت کے چراغ کو سندھ کی شب تاریک میں روشن کیا جائے۔

انگریز بھی پیر صاحب کے ارادوں سے ناواقف نہیں تھا۔ وہ اپنے ذہن میں ان کو باغی تسلیم کر چکا تھا اور اس فکر میں تھا کہ کسی بہانے سے ان کی قوت کو کچل دے۔

سب سے پہلے انگریز حکومت نے حروں کے خلاف جو قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ جہاں کہیں بھی فتنہ و فساد ہوتا وہ حروں کی طرف منسوب کرتے اور ناکردہ گناہ حر گرفتار کر لئے جاتے۔ پھر انگریزی حکومت نے مزید زیادتی یہ کی کہ ہر چھوٹے بڑے حر کے لئے پولیس چوکیوں میں ہفتے

میں اور بعض کی دو تین دن کے بعد اور بعض کی روزانہ حاضری لازمی قرار دی۔ گڑنگ کے بنگلے پر بھی پولیس کا ایک دستہ متعین کیا گیا۔ تا کہ جب بھی ضرورت ہو' پیر صاحب کے خلاف کارروائی کی جا سکے۔ پیر صاحب نے ان غلط اقدامات کے خلاف احتجاج کیا۔ خصوصیت سے حکومت کو اس طرف توجہ دلائی کہ حروں کا پولیس چوکیوں پر حاضری کا طریقہ غلط ہے۔ روزانہ حاضری دینے کے لئے انہیں میلوں پیدل چلنا پڑتا ہے اور یہ بات انصاف کے خلاف ہے۔ لیکن حکومت اس احتجاج کے باوجود تشدد پر قائم رہی۔ جس پر پیر صاحب نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ وہ آئندہ پولیس چوکیوں پر حاضری نہ دیں۔ بلکہ اپنے گھروں میں اپنے کاموں میں مشغول رہیں۔ یہ گویا سندھ میں سول نافرمانی کی طرف پہلا قدم تھا۔

اس پر فرنگی حکومت نے دھڑا دھڑ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پیر صاحب نے اپنے خاص خاص مریدوں کو روپوشی کا حکم دیا۔ حکومت کا دباؤ روز بروز شدید ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ سرعام گولیاں چلنے لگیں اور سرکاری افسر پیر صاحب کے اور ان کے مریدوں کے خلاف رپورٹیں بھیجنے لگے۔

اس زمانے میں بعض لوگوں نے پیر صاحب کو مشورہ دیا کہ اگر آپ سرکار کی خیر خواہی کریں' تو حکومت اس کے عوض میں بہت کچھ دینے کو تیار ہے۔ لیکن پیر صاحب نے انہیں جواب دیا کہ رشوت میرے مذہب میں حرام ہے۔

آخر بہت سی رپورٹوں کے بعد پیر صاحب کو کراچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن پیر صاحب نے مطالبہ کیا کہ اگر ان کا کوئی قصور ہے تو ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ اس کے علاوہ کراچی کی نظربندی کے بارے میں مجھے کوئی تحریری حکم نامہ دکھایا جائے۔ کہ آخر کس کے حکم سے مجھ کو نظربند کیا گیا ہے۔ ورنہ میں اس پابندی کے خلاف قدم اٹھاؤں گا۔ مگر انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ اس وقت سندھ کے وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے۔ پیر صاحب نے وزیر اعلیٰ سے کہا کہ حکومت کی یہ نظر بندی بے جا ہے اور وہ اس کے لئے آمادہ نہیں۔ وزیر اعلیٰ نے جواب دیا کہ وہ احکام کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ وہ پیر صاحب کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

پیر صاحب نظربندی کی پروا نہ کرتے ہوئے موٹر میں راتوں رات گڑنگ کے بنگلے میں پہنچے اور مریدوں کو بتایا کہ ان کے خلاف حکومت کارروائیاں کر رہی ہے۔ اگر بات بڑھ جائے تو حروں کو بددل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی منظم جدوجہد جاری رکھیں۔ اس کے بعد پیر گوٹھ پہنچے اور وہاں بھی یہی احکام دیئے۔

کراچی سے فرار کے بعد فرنگی حکومت کو موقع مل گیا کہ وہ پیر صاحب پر بغاوت کا مقدمہ چلائے۔ اس کے علاوہ حکومت نے حروں کے خلاف کارروائیاں تیز تر کر دیں۔

انگریزی حکومت نے تشدد اور استبداد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پیر صاحب کے بنگلے کا

محاصرہ کر لیا گیا۔ بنگلے پر بم باری کی گئی۔ درگاہ شریف میں پیر صاحب کی حویلیوں اور گاؤں کو بارود کے ذریعے کھنڈرات بنایا گیا۔ پیر صاحب کو بمشکل تمام گرفتار کیا گیا۔ لیکن یہ پہاڑ جیسی مصیبتیں بھی حروں کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کر سکیں۔

سندھ میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ پھر بھی سرزمین سندھ کے حریت پسند فرزند پولیس اور فوج کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ ان کی بہادری اور شجاعت کی تفصیل ایک مستقل کتاب چاہتی ہے۔

عورتوں نے بھی اس جہاد حریت میں حصہ لیا۔ بہت سی خواتین کے کارنامے اس ضمن حیرت انگیز ہیں۔

پیر صاحب کی تربیت بے حد موثر ثابت ہوئی اور پیر صاحب کی غیر حاضری کے باوجود حر غازیوں نے انگریزوں سے جنگ جاری رکھی۔ سندھ کے عوام نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔ فوج اہل سندھ پر مارشل لاء کی صورت میں ایک عذاب نازل کرتی رہی۔ پیر گوٹھ اور گڑنگ میں حروں کے مکان نذر آتش کیے گئے۔ حر بلکہ عام مرید بھی گرفتار کیئے گئے۔ بہت سوں کو جیلوں اور کیمپوں میں بند کر دیا گیا۔ ہزاروں بے گناہ شہید، سینکڑوں عورتوں بیوہ اور ہزاروں بچے یتیم ہوئے۔

اس ظالمانہ ماحول میں سندھ کے بڑے بڑے زمیندار اور وڈیرے خاموش تماشائی بنے تماشہ دیکھتے رہے اور اس ظلم پر کسی کو مجال دم زدن نہ تھی۔ (۷)

پیر صاحب پاگارہ سید صبغتہ اللہ شاہ (ثانی) پر برطانیہ کے خلاف بغاوت کرنے اور دوسرے کئی جرائم میں مقدمے سینٹرل جیل حیدر آباد میں ایک ٹربیونل میں چلائے گئے۔ ٹربیونل کا سربراہ میجر جنرل رچرڈسن تھا اور ایک ممبر سول مجسٹریٹ کامریڈ حیدر بخش جتوئی تھے۔

حکومت نے سندھ کے چند وڈیروں اور زمینداروں سے گواہیاں دلوا کر پیر صاحب کے خلاف مقدمہ کو مضبوط بنایا مگر اس کے ساتھ ساتھ حکومت نے اپنے ایجنٹوں کو کئی بار پیر صاحب کے پاس بھیجا کہ وہ حکومت سے معافی مانگ لیں تو انہیں معاف کیا جا سکتا ہے اور اس طرح وہ پھانسی تک کی سزا سے بچ سکتے ہیں لیکن پیر صاحب نے ان سب کو ایک ہی جواب دیا:

"شہادت ہمارا تاج ہے۔ اسے آگے بڑھ کر پہن لینا ہمارے لئے عبادت ہے۔ ہم نے صرف آزادی کو چاہا ہے اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ انسان سے معافی مانگنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تو صرف اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں"۔

پیر صاحب کو پھانسی دینے کا فیصلہ ہو چکا تھا مگر اس کی تاریخ اور وقت اس لئے راز میں رکھے گئے کہ اگر یہ اعلان کیا گیا تو حر مجاہدین جان پر کھیل کر بھی پیر صاحب کو جیل سے نکال کر لے جائیں گے۔

ایک انگریز اعلیٰ افسر مسٹر لیمبرک یا مسٹر کوپر روزانہ رات کو پیر صاحب سے شطرنج کھیلنے آیا کرتا تھا اور ہمیشہ ہار جاتا تھا۔ پھانسی لگنے سے ایک رات پہلے وہ انگریز اس خیال سے آیا تھا کہ اپنے انجام کو سامنے دیکھتے ہوئے اور ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتے ہوئے پیر صاحب آج ضرور ہار جائیں گے اور وہ با آسانی پہلی مرتبہ جیت لے گا۔ لیکن اس کی یہ ساری امیدیں آج بھی پوری نہیں ہوئیں۔ پیر صاحب بڑے صبر سے سکون اور اطمینان سے کھیلتے ہوئے تین بار بازی جیت گئے۔

انگریز افسر پیر صاحب کے سکون قلب کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ پیر صاحب نے بڑے اطمینان سے کہا:

"حق کی راہ میں شہادت حاصل کرنا تو میرے آباؤ اجداد کی سنت ہے۔ ہم جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس کی خاطر ہنستے کھیلتے پھانسی کے تختے پر چڑھ جانا ہمارے لئے عین عبادت ہے۔ ہم غلام بننے کے لئے پیدا نہیں ہوئے بلکہ غلامی کی زنجیریں توڑنا ہمارا مقصد حیات ہے"۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دور میں کسی بھی سیاسی جماعت نے پیر صاحب یا ان کی جماعت کے حق میں کوئی آواز کیوں نہ اٹھائی اور ایک مجاہد اور اس کی تنظیم کو ایسے ہی بے یار و مددگار کیوں چھوڑ دیا گیا؟

اس بارے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے نوجوانوں نے ایک وفد دہلی میں لیاقت علی خان سے ملنے کے لئے روانہ کیا۔ نوجوانوں کے وفد نے پیر صاحب کی حمایت میں بہت کچھ کہا۔ لیاقت علی خان نے کہا کہ:

"ہم تو پیر صاحب کی خاطر بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن سندھ کے مسلم لیگیوں میں کوئی جرأت نہیں ہے کہ وہ پیر صاحب کی حمایت میں آگے بڑھیں اور ہمیں مداخلت کا موقع دیں"۔ (۸)

یہ حقیقت ہے کہ کسی نے کچھ نہیں کیا اور پیر صاحب کو ۲۰ر مارچ ۱۹۴۳ء کو فجر کے وقت پھانسی دے دی گئی۔ (۹)

پیر صاحب کی شہادت کے بعد انگریز نے آپ کی گدی مستقل طور پر ختم کر دی۔ تاکہ آئندہ اس خاندان سے کوئی باقی نہ رہے۔ آپ کے دونوں صغیر سن صاحبزادے پیر سکندر شاہ اور پیر نادر شاہ کو تعلیم کے بہانے لندن روانہ کر دیا گیا۔

پیر سید صبغۃ اللہ شاہ (ثانی) کی شہادت ہو چکی تھی اور انگریز اپنی دانست میں اس گدی کو مستقل طور پر ختم کر چکے تھے۔ ان کے دو صغیر سن بیٹے تعلیم کے بہانے لندن روانہ کر دیئے گئے تھے، مگر پھر بھی حروں کی سرگرمیاں ماند نہ پڑیں تو انگریزوں نے بڑی فنکاری سے اس گدی پر اپنے مطلب کا آلہ کار بننے والے کسی فرد کو مسند نشین کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ کام

حیدر آباد کے کلکٹر محمد بخش کے سپرد کیا گیا۔ اس نے جماعت کے خلفاء اور با اثر افراد کی کانفرنس بلا کر ایسی کوشش کی، مگر اسے ناکامی ہوئی۔ مشہور ہے کہ انہوں نے پیر علی محمد راشدی کے لئے کوشش کی۔ مگر اس شیر دل جماعت کے ہر رکن نے احمد فقیر لغاری کی سربراہی میں بیک زبان اس تجویز کو مسترد کر دیا اور کہہ دیا کہ پیر پاگارہ کا جانشین ان کا جائز وارث ہی ہو گا جو پیر سکندر شاہ ہیں۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آگیا تو ۱۹۴۹ء میں اس کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان انگلستان کے دورے پر گئے۔ سید سکندر علی شاہ خود بتاتے ہیں کہ:

"نوابزادہ لیاقت علی خان لندن کے دورے پر آئے۔ انہوں نے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی نادر شاہ کو اپنی قیام گاہ کلیر جیمز ہوٹل میں بلایا اور تحریک آزادی میں ہماری خاندانی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بتایا کہ حکومت پاکستان ہماری گدی کو بحال رکھنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ انہوں نے اپنی زبان سے یہ فیصلہ سنایا تھا اور یہ بات ہمارے لئے قابل حیرت ہے کہ گدی کے احیاء کا فیصلہ تو ۱۹۴۹ء میں کر لیا گیا لیکن اس پر عمل در آمد ۱۹۵۲ء میں ہوا"۔

"گدی کی بحالی اور پیران پاگارہ کی لندن سے واپسی کے سلسلے میں درگاہ چنھان شریف ضلع گجرات والے بزرگ سید حاجی محمد افضل شاہ گیلانی اور لاڑکانہ والے نقشبندی بزرگ حضرت خواجہ محمد عبدالغفار نے بہت سرگرمی سے کام کیا۔ کئی وفود اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان اور وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین سے ملے۔ نیز صوبہ سندھ کے گورنر شیخ دین محمد نے درگاہ پر عائد کئی پابندیاں ختم کیں اور مجموعی کوششوں کے بعد ۴ر فروری ۱۹۵۲ء کو پیر سکندر علی شاہ کو پیر پاگارہ ہفتم ہونے کا اعلان کیا گیا اور ان کی ضبط شدہ جائداد بھی واپس کی گئی۔ اس سجادہ نشینی کی تقریب کو بڑے پر شکوہ انداز میں. پورے سندھ کے مسلمانوں اور بالخصوص حروں نے منایا اور دستار بندی کی رسم ادا کی گئی۔ انہوں نے روپوش حروں کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ رحیم ہنگورو نے پہلو تہی کی تو پکڑا گیا اور پھانسی کی سزا پائی"۔ (۱۰)

پیر نادر شاہ ۱۹۶۲ء سے لے کر ایوب خان کے زوال تک قومی اسمبلی کے رکن رہے۔

پیر صاحب پگارا رحیم یار خان کے معروف سیاست دان سید غلام میران شاہ کے داماد بنے۔ یوں وہ مخدوم زادہ سید حسن محمود کے بہنوئی اور سید علمدار حسین گیلانی کے ہم زلف بن گئے۔ مخدوم زادہ سید حسن محمود کا تعلق قیوم مسلم لیگ سے تھا اس لئے ان سے تعلق خاطر کی بنا پر پیر صاحب پگارا نے بھی اپنی سیاسی زندگی کا آغاز قیوم مسلم لیگ سے کیا۔

۱۹۷۰ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات میں پیر صاحب کے ایک مرید خاص آغا عطا محمد مری قیوم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے جب پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کو کامیاب ہوئی تو پیر صاحب پگارا نے اپنا سیاسی جھکاؤ شیخ مجیب الرحمان کی طرف کیا مگر مشرقی پاکستان میں فوجی

کارروائی کے باعث وہ جلد ہی علیحدہ ہو گئے۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں خان عبدالولی خاں کی جب مسٹر بھٹو سے ٹکر ہوئی تو انہوں نے اپوزیشن جماعتوں کا ایک نیا سیاسی پلیٹ فارم تشکیل دیا اور یو ڈی ایف کے نام سے اس نئے اتحاد کی سربراہی پیر صاحب پگارا کو سونپ دی گئی۔ اس کے ساتھ کنونشن مسلم لیگ اور کونسل مسلم لیگ کو متحد کر کے اس کا سربراہ بھی پیر صاحب آف پگارا کو بنایا گیا۔ اس دوران سندھ کے وزیر اعلیٰ مسٹر ممتاز علی بھٹو کے اقتدار کے دوران پیر صاحب کے مریدین حروں کے خلاف انتقامی کارروائیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور سات حروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پیر صاحب آف پگارا نے پیپلز پارٹی کے خلاف اپوزیشن جماعتوں کو منظم کیا ایک بار ان کی گرفتاری پر سانگھڑ میں امن و امان کا مسئلہ اس قدر سنگین نوعیت اختیار کر گیا کہ ان کی گرفتاری کے چند ہی گھنٹوں بعد انہیں باعزت رہائی ملی۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد بنانے میں بھی انہوں نے مرکزی کردار ادا کیا جب مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلیوں کے نتیجے میں ملک بھر میں تحریک چلائی گئی اور پی این اے کے قائدین اور کارکنوں کی بھاری اکثریت جیلوں میں ٹھونس دی گئی تو پیر صاحب پگارا نے اس تحریک کی قیادت کی۔ پیپلز پارٹی کی اقتدار سے محرومی کے بعد پیر صاحب آف پگارا سے نئے فوجی حکمرانوں کی نیاز مندی کا سلسلہ جاری رہا جب قومی اتحاد کو جنرل محمد ضیاء الحق نے وفاقی کابینہ میں نمائندگی دی تو پیر صاحب کا اس کابینہ کی تشکیل میں کافی عمل دخل رہا مگر بعد میں جنرل ضیاء الحق نے انہیں سیاسی طور پر پسپا کرنے کے لئے مسلم لیگ میں وفاقی وزیر چودھری ظہور الٰہی مرحوم کی زیر سرکردگی ایک ایسا گروپ تیار کیا' جس سے مسلم لیگ پھر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ انہیں مسلم لیگ کی صدارت سے علیحدہ کرنے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا گیا وفاقی مجلس شوریٰ کی تشکیل میں جن مسلم لیگیوں نے تعاون کیا۔ پیر صاحب پگارا نے ان سے قطع تعلق رکھا مگر ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے مسلم لیگیوں کو انتخابی عمل میں شریک ہونے کی ہدایت کی۔ سندھ سے ان کے ایک صاحب زادے پیر علی گوہر شاہ قومی اسمبلی اور دوسرے صاحب زادے پیر صبغت اللہ راشدی سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے مسٹر محمد خاں جونیجو سانگھڑ سے بلا مقابلہ ایم این اے منتخب ہوئے آغا عطا محمد مری بھی ایم این اے منتخب ہو گئے۔ پیر صاحب پگاڑا نے ان مسلم لیگی حضرات کے بارے میں سرد مہری دکھائی جنہوں نے وفاقی مجلس شوریٰ میں شمولیت اختیار کی تھی' چنانچہ انہوں نے قومی اسمبلی کے اسپیکر کے عہدے کے لئے وفاقی مجلس شوریٰ کے چیئرمین خواجہ محمد صفدر کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ پیر صاحب مسلم لیگی حضرات کے اس گروپ کو "ٹھگوں کا ٹولہ" قرار دیتے رہے ان کی آشیرباد سے ان کے مرید خاص مسٹر محمد خاں جونیجو پاکستان کے وزیر اعظم نامزد کئے گئے۔ پیر صاحب پگارو ۱۹۸۵ء کے عام

انتخابات کے نتیجے میں اپنے آبائی صوبے سندھ سے سینٹ کے رکن منتخب ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب قومی اسمبلی کے غیر جماعتی ایوان کو چلانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے اس بات کی حمایت کی کہ قومی اسمبلی اور ملک کے چاروں صوبائی اسمبلیوں میں مسلم لیگ کا احیا کیا جائے۔ صدر ضیاء الحق تو سیاسی جماعتوں کے نظام کے ہی خلاف تھے مگر انہیں بھی مسلم لیگ کی احیا کی تجویز کے سامنے جھکنا پڑا۔ پیر صاحب پگارا نے مسلم لیگ کی صدارت چھوڑ دی اور وزیر اعظم جونیجو مسلم لیگ کے صدر بھی بن گئے۔ پیر صاحب نے اپنا سیاسی وجود قائم رکھنے کے لئے صدر ضیاء الحق اور وزیر اعظم جونیجو پر اپنا سیاسی چیک جاری رکھا اور ان کے اختلافات کو وہ بلی چوہے کا کھیل قرار دیتے رہے۔

مسلم لیگ کے دور حکومت میں انہوں نے وزیر اعلیٰ پنجاب مسٹر نواز شریف سے شدید محاذ آرائی کی ان کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار بھی کرتے رہے انہوں نے چودھری پرویز الٰہی کا کھل کر ساتھ دیا' مگر وزیر اعظم جونیجو نے مسٹر نواز شریف کی حمایت جاری رکھی۔ اگرچہ بعض دوستوں نے پیر صاحب پگارا اور وزیر اعلیٰ پنجاب میں صلح کر دی مگر ان کا دل صاف نہ ہوا۔ ۲۹ر مئی ۱۹۸۸ء کے ایکشن کے بعد پیر صاحب پگارا نے اچانک اعلان کر دیا کہ انہوں نے مسلم لیگ کا احیا کر لیا ہے۔ اور اس جماعت کو انہوں نے فنکشنل مسلم لیگ کا نام دیا اور کو داس کے صدر بن گئے۔ انہوں نے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور ایک بار پھر انہوں نے صدر ضیاء الحق کے خلاف اخباری بیانات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انہوں نے وزیر اعلیٰ پنجاب کے خلاف بھی محاذ آرائی کا آغاز کیا جس سے پنجاب سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگی حلقوں میں شدید ردعمل کا اظہار بھی کیا جاتا رہا۔ پیر صاحب کہتے رہے کہ میں تو جھاڑو پھیر کر ہی جاؤں گا ۱۷ر اگست ۱۹۸۸ء کو سانحہ بہاولپور پیش آیا جس پر انہوں نے اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے اظہار تعزیت تو کر دیا مگر انہوں نے مرحوم صدر ضیاء الحق کے پسماندگان سے اظہار تعزیت کی زحمت نہ کی' بعد میں پیر صاحب سندھ چلے گئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے اتحاد پر خوشی کا اظہار نہ کیا سندھ میں وہ پیپلز پارٹی سے کم مگر اپنوں کے خلاف محاذ آرائی کرتے رہے' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود بھی انہیں بڑی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ملک کے سیاسی قائدین کی سیاسی صف میں شامل ہونے کے باوجود پیر صاحب سیاست میں نان سیریس رہتے ہیں اور بڑے سے بڑے سیاسی مسئلہ کو بھی طعن و تشنیع کی نذر کر دیتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ انکے اخباری بیانات کا حظ اٹھاتے ہیں مگر بہت سے لوگ ان بیانات کو بھی سیریس لیتے ہیں۔ بہرحال اتنی بڑی شکست و ریخت کے باوجود پیر صاحب کے علاقے میں ان کی قومی اسمبلی کی نشست محفوظ رہی اور ان کے صاحب زادے پیر علی گوہر شاہ ایم این اے منتخب ہو گئے۔ (۱۱)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں پیر صاحب پاگارا اور ان کے بیٹے پیر سید صدر الدین شاہ راشدی نے خیر پور سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر دونوں باپ بیٹے علی الترتیب سید پرویز علی شاہ اور سید

عبدالقادر شاہ جیلانی پیر آف رانی پور سے شکست کھا گئے' البتہ پیر صاحب پاگارہ کے دیگر دو صاحبزادگان پیر سید علی گوہر شاہ سانگھڑ سے قومی اسمبلی کا اور پیر سید صبغت اللہ شاہ خیر پور اور سانگھڑ دو مقامات سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ پیر سید صبغت اللہ شاہ نے بعد ازاں سانگھڑ کی نشست خالی کر دی جس پر ضمنی انتخاب میں حاجی خدا بخش نظامانی بلا مقابلہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۲) پیر سید صبغت اللہ راشدی عرف راجہ سائیں بعد ازاں جام صادق علی کی کابینہ میں شامل ہوئے۔ ان کے پاس مواصلات کا قلمدان تھا۔ (۱۳)

جام صادق علی کی وفات کے بعد جب مظفر حسین شاہ سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے تو صبغت اللہ راشدی ان کی کابینہ میں شامل رہے۔ اس مرتبہ انہیں مواصلات کے علاوہ تعمیرات' مال اور لینڈ یوٹیلائزیشن کے محکمے سونپے گئے تھے۔ اسی کابینہ میں ان کے چھوٹے بھائی پیر صدر الدین شاہ راشدی بھی وزیر اعلیٰ کے مشیر کے طور پر شامل ہوئے۔ انہیں زراعت اور بجلی کا قلمدان سونپا گیا۔ (۱۴)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں سید صبغت اللہ راشدی پی ایس ۶۵ سانگھڑ ۲ سے اور پیر سید صدر الدین راشدی پی ایس ۲۵ خیر پور ۲ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۵) پیر صدر الدین شاہ نے این اے ۱۶۳ خیر پور و سکھر سے بھی انتخاب لڑا تھا مگر اس انتخاب میں وہ کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ (۱۶)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں پیر سید صبغت اللہ شاہ راشدی نے این اے ۱۶۳ خیر پور ا سے اور پیر سید صدر الدین شاہ نے این اے ۱۶۳ خیر پور سکھر سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر بالترتیب غوث علی شاہ اور سید فضل علی شاہ جیلانی کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۱۷) البتہ صوبائی اسمبلی کے نتائج مختلف رہے۔ ان انتخابات میں سید صبغت اللہ شاہ پی ایس ۶۵ سانگھڑا سے اور پیر سید صدر الدین شاہ پی ایس ۲۵ خیر پور ۲ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۸)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں پیر سید صدر الدین شاہ این اے ۲۱۶ خیر پور ۲ سے قومی اسمبلی اور پی ایس ۳۰ خیر پور ۲ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۹) بعد ازاں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست خالی کر دی جس پر ضمنی انتخاب میں قائم علی شاہ کے بھتیجے سید جاوید علی شاہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۰)

پیر سید صدرالدین راشدی نے سندھ میں مسلم لیگ (ق) اور متحدہ قومی موومنٹ کی مخلوط حکومت بننے میں مدد کی۔ جس کے صلے میں انہیں پہلے علی محمد مہر نے اور پھر ارباب غلام رحیم نے وزارت سے نوازا۔

حوالہ جات

ا۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۷۱

۲۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تذکرہ صوفیائے سندھ۔ کراچی۔ ص۲۷۳ تا ۲۷۹

۳۔ خداداد خان۔ لب تاریخ سندھ۔ مرتب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ حیدر آباد۔ ص ۲۵۵ (فٹ نوٹ)

۴۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۷۶' ۷۷

۵۔ ایضاً۔ ص ۷۹ تا ۸۷

۶۔ تبسم چودھری۔ تذکرہ پیران پارگاہ۔ حیدر آباد۔ ۱۲۵ تا ۱۲۸

۷۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ۔ لاہور۔ جلد سوم۔ ص۱۶۴ تا ۱۶۹

۸۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۱۰۷ تا ۱۱۱

۹۔ سارہ ایف ڈی انصاری۔ صوفی سینس اینڈ اسٹیٹ پاور۔ لاہور۔ ص۱۵۲

۱۰۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۱۱۱ تا ۱۱۲

۱۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۲۰ تا ۳۴۲

۱۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۔ ۱۹۹۰ء جلد دوم۔ ص۴۷، ۸۰، ۳۲۰، ۳۳۹، ۵۴۵

۱۳۔ موسیٰ خان جلال زئی۔ کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟ لاہور۔ ص ۴۸۷

۱۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹/ مارچ ۱۹۹۲ء

۱۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۷۷' ۱۴۶۲

۱۶۔ ایضاً۔ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۲۹

۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص۱۲۳' ۱۲۴

۱۸۔ ایضاً۔ ص۴۹۳' ۴۵۴

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲۔ جلد دوم۔ ص ۷۷' ۲۴۳

۲۰۔ ایضاً۔ ص ۳۷۹

پیرزادہ

پرانے سکھر میں آباد پیرزادے نسلاً" قریشی النسب ہیں اور ان کے آباؤ اجداد عرب سے سندھ آ کر آباد ہوئے تھے۔ وہ سکھر کے مشہور بزرگ شاہ خیر الدین" کی درگاہ کے خلیفہ میاں جمال الدین کی اولاد میں سے ہیں اور تقریباً چار صدیوں سے سکھر میں آباد ہیں۔ یہ خاندان پرانے سکھر میں ایک خاص خاندانی حیثیت' طاقت اور حکومت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

اس خاندان کا پہلا فرد جو سماجی اور سیاسی میدان میں نمایاں ہوا۔ میاں عبدالرحمٰن تھا۔ وہ ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوا۔ وہ پیر غوث علی شاہ کی قائم کردہ انجمن اسلام کا رکن تھا۔ اس نے ضلع سکھر مدرسہ بورڈ کے قیام میں فعال کردار ادا کیا اور بعد ازاں اس بورڈ کا سیکرٹری بھی رہا۔ وہ سکھر میونسپلٹی کا رکن اور نائب صدر بھی منتخب ہوا۔ وہ پرانے سکھر کے ان رہنماؤں میں شامل تھا جن کی ہندو مسلمان یکساں عزت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ۱۹۳۹ء میں سکھر میں مسجد منزل گاہ کا قضیہ پیش آیا تو اس کی مداخلت کی وجہ سے پرانے سکھر میں مکمل امن و امان رہا۔ اس سے قبل ۱۸۹۲ء اور ۱۹۳۰ء میں بھی میاں میاں عبدالرحمٰن ہی کی وجہ سے پرانا سکھر ہندو مسلم فساد سے مکمل طور پر محفوظ رہا تھا۔ میاں عبدالرحمٰن نے ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

میاں عبدالرحمٰن کا بھائی پیرزادہ عبدالغفار قانون کے پیشے سے وابستہ تھا۔ جبکہ اس کے بیٹے پیرزادہ عبدالستار نے سیاست کے میدان میں ایک بڑی فعال زندگی گزاری۔ (۱) پیرزادہ عبدالستار ۴ر جولائی ۱۹۰۷ء کو پرانے سکھر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے لنکنزان سے بار ایٹ لا کیا اور سکھر میں وکالت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۷ء میں وہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے بعد' پہلے وہ اللہ بخش وزارت میں چیف پارلیمانی سیکرٹری بنے مگر ۱۹۳۹ء میں مسجد منزل گاہ کے قضیے پر اپوزیشن میں چلے گئے۔ ۱۹۴۱ء میں وہ وزارت پر فائز ہوئے اور انہیں پبلک ورکس' زراعت اور صحت کے قلمدان سونپے گئے۔ ۱۹۴۳ء میں اللہ بخش سومرو کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ جس کے بعد عبدالستار پیرزادہ نے کچھ دنوں تک سیاسی سرگرمیوں پر

توجہ دینا ترک کر دیا اور دوبارہ وکالت کی طرف راغب ہو گئے۔

۱۹۴۵ء کے اواخر میں عبدالستار پیرزادہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور جنوری ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔

ان انتخابات کے بعد ۸ر فروری ۱۹۴۶ء کو سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ نے وزارت تشکیل دی۔ ان کی کابینہ میں شروع شروع میں تو صرف ایوب کھوڑو' غلام علی تالپور اور پیر الٰہی بخش شامل تھے' مگر ۳۰ر مارچ ۱۹۴۶ء کو اس وزارت میں پیرزادہ عبدالستار اور میر بندہ علی تالپور کا بھی اضافہ ہو گیا۔ پیرزادہ عبدالستار کو صحت' تعلیم اور سیلف گورنمنٹ کے محکمے سونپے گئے تھے۔ پیرزادہ عبدالستار دسمبر ۱۹۴۶ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے انتخابات کے بعد قائم ہونے والی وزارت میں ایک مرتبہ پھر بطور وزیر شامل ہوئے اس مرتبہ بھی انہیں وہی پرانے قلمدان سونپے گئے تھے۔ پیرزادہ عبدالستار قیام پاکستان تک اس عہدے پر فائز رہے۔

قیام پاکستان کے بعد پیرزادہ عبدالستار کو مسلم لیگ کی جانب سے مرکزی دستور ساز اسمبلی کا رکن نامزد کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں وہ اقوام متحدہ میں بھیجے جانے والے وفد کے رکن بنے اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں مرکزی کابینہ میں شامل ہوئے۔ لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد وہ خواجہ ناظم الدین کی کابینہ میں بھی وزیر رہے۔ ان دونوں وزارتوں کے دوران وہ زراعت' غذا' صحت' قانون اور محنت کے محکموں کی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔

۱۹۵۳ء میں سندھ صوبائی اسمبلی کے عام انتخابات منعقد ہوئے تو ان دنوں پیرزادہ عبدالستار مرکز میں وزیر تھے اس لئے انہوں نے اس انتخاب میں حصہ نہ لیا۔ مگر انتخاب کے بعد جب صوبہ میں وزارت تشکیل دینے کا مرحلہ آیا تو پیرزادہ عبدالستار مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی کے لیڈر بھی بن گئے اور وزارت اعلیٰ تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ یہ عہدہ انہوں نے ۲۳ر مئی ۱۹۵۳ء کو سنبھالا۔

پیرزادہ کی وزارت کے دوران جی ایم سید اور اس کے ساتھی اپوزیشن میں بیٹھے۔ اسی دور میں کراچی کو سندھ کو واپس دیئے جانے اور سندھی زبان کو صوبہ سندھ کی سرکاری زبان بنانے کی قراردادیں منظور ہوئیں۔

عبدالستار پیرزادہ ون یونٹ کے قیام کے شدید مخالف تھے' نومبر ۱۹۵۴ء میں ان پر مرکزی حکومت نے دباؤ ڈالا کہ یا تو ون یونٹ کی حمایت کریں یا وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دیں۔ عبدالستار پیرزادہ نے اس مسئلے پر بحث کے لئے اسمبلی کا اجلاس بلانا چاہا مگر انہیں استعفیٰ پر مجبور کر دیا گیا۔ اور ۹ر نومبر ۱۹۵۴ء کو ان کی حکومت ختم کر دی گئی اور غلام محمد نے ایوب کھوڑو سے ون یونٹ کے حق میں قرارداد منظور کروانے کا وعدہ لے کر انہیں وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ ایوب کھوڑو نے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد حسب وعدہ اسمبلی سے یہ قرارداد منظور کروالی۔ مگر جس اجلاس میں یہ قرارداد منظور

ہوئی اس میں پیرزادہ شریک نہیں ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کا قیام عمل میں آیا اور جنوری ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے ارکان کا چناؤ عمل میں آیا۔ عبدالستار پیرزادہ اس چناؤ میں اسمبلی کا رکن بن گئے اور صوبائی کابینہ میں قانون اور زراعت کی وزارت پر فائز ہوئے۔ (۲)

جلد ہی مغربی پاکستان اسمبلی میں مسلم لیگ کے ناراض اراکین کی ایک جماعت وجود میں آئی۔ جس کا نام ری پبلیکن پارٹی تھا۔ یہ پارٹی راتوں رات وجود میں آئی تھی اور اسے مغربی پاکستان کے گورنر مشتاق احمد گورمانی اور وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کی آشیرواد اور صدر پاکستان اسکندر مرزا کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس پارٹی کے قیام سے ملکی سیاست میں انقلاب برپا ہو گیا اور مسلم لیگی ارکان نے دھڑا دھڑ وفاداریاں تبدیل کرنا شروع کر دیں۔ (اس اجمال کی تفصیل اسی کتاب میں "محمد زئی" خاندان کے احوال میں میں ملاحظہ فرمائیں)

اسمبلی میں دونوں جماعتوں کے درمیان زور آزمائی اور قوت کے مظاہرہ کا مرحلہ اسپیکر کا انتخاب تھا۔ جب زبردست جوڑ توڑ ہنگامہ آرائی اور صدر اسمبلی کے کاسٹنگ ووٹ کی اکثریت سے چوہدری فضل الٰہی اسمبلی کے اسپیکر منتخب ہو گئے تو مسلم لیگ نے انتخابات کے خلاف ہائی کورٹ میں عذرداری دائر کر دی۔

اب پیرزادہ عبدالستار کا کردار ملاحظہ فرمایئے۔

وہ وزیر قانون ہونے کے ناطے سے مسلم لیگ کے وکیل تھے۔ انہوں نے ہائی کورٹ میں عذرداری داخل کی اور اس کے بعد سیدھے گورنر ہاؤس پہنچے۔ ری پبلکن پارٹی میں شمولیت کا اعلان کیا۔ حلف وفاداری اٹھایا اور ری پبلکن پارٹی کی جانب سے وزیر قانون وپارلیمانی امور بن کر تالیوں کی گونج میں ایوان میں داخل ہوئے اور سرکاری بنچوں پر آبراجمان ہوئے۔ اسپیکر کے انتخاب کے خلاف ان کی دائر کردہ درخواست کی مزاحمت بھی اب ان کی وزارت قانون کی ذمہ داری تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ہائی کورٹ نے مسلم لیگ کی عذرداری خارج کر دی۔ (۳)

پیرزادہ عبدالستار ایوب خان کے مارشل لاء تک مغربی پاکستان کے وزیر قانون اور وزیر داخلہ رہے۔ (۴) ایوب خان کے دور میں ان پر ایبڈو کے تحت ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء تک سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ (۵) پابندی ہٹنے کے بعد انہوں نے ۱۹۷۰ء میں سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کے مد مقابل امیدواروں میں اے کے بروہی اور علی حسن منگی شامل تھے۔ عبدالستار پیرزادہ نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی انتخاب میں شکست کھائی۔ (۶) وہ یہ صدمہ جھیل نہ سکے اور چار ہی برس کے اندر ۲۵ر اگست ۱۹۷۴ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (۷)

جن دنوں عبدالستار پیرزادہ پر ایبڈو کے تحت سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر پابندی

تھی، انہی دنوں عبدالستار پیرزادہ کے صاحبزادے عبدالحفیظ پیرزادہ سیاست کے افق پر نمودار ہوئے۔

عبدالحفیظ پیرزادہ ۲۴ر فروری ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ملک ہی میں حاصل کی کراچی کے ڈی جے کالج سے طبیعات اور ریاضی کے مضامین کے ساتھ گریجویشن کیا پھر انگلستان چلے گئے جہاں انہوں نے بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پاکستان آنے کے بعد وہ قانون کے پیشے سے منسلک ہوئے اور ۱۹۶۲ء تک سپریم کورٹ کے وکیل کے درجے تک پہنچ گئے۔

حفیظ پیرزادہ نے سیاست میں داخل ہونے کی پہلی کوشش ۱۹۶۲ء میں اس وقت کی جب انہوں نے بنیادی جمہوریت کا انتخاب لڑا۔ اس انتخاب میں انہیں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ۱۹۶۴ء میں ایوب خان اور محترمہ فاطمہ جناح کے انتخابی معرکے میں انہوں نے موخر الذکر کے لئے کام کیا اور بالخصوص کراچی میں بہت سرگرم رہے، اسی انتخاب کے حوالے سے وہ کونسل مسلم لیگ کے رہنما یحییٰ بختیار کے بھی قریب رہے، لیکن اس پورے عرصے میں انہوں نے کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ ان کی جماعتی سیاست کا آغاز پاکستان پیپلزپارٹی ہی سے ہوا۔

پیپلزپارٹی میں شمولیت سے پہلے سے ان کے بھٹو سے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ ایوب خان کے زمانے میں بھٹو پر کئی مقدمات قائم کئے گئے۔ ان میں سے بیشتر میں پیرزادہ نے ان کی وکالت کی۔ ۱۹۶۷ء میں پیپلزپارٹی قائم ہوئی مگر پیرزادہ بھٹو سے دوستانہ مراسم کے باوجود بالکل ابتدا میں اس میں شامل نہیں ہوئے۔ شاید اس دوران وہ عملی سیاست میں آنے کے بارے میں ابھی حتمی فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ اس پس و پیش کا ایک سبب اور بھی تھا اور وہ یہ کہ کیونکہ وہ پیپلزپارٹی کے رہنماؤں پر قائم مقدمات کی پیروی کر رہے تھے لہٰذا خود بھٹو ان کو اس مرحلے پر سیاسی منظر پر نہیں لانا چاہتے تھے۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے کراچی سے قومی اسمبلی کی نشست پر انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں جب پیپلزپارٹی اور عوامی لیگ کے درمیان ڈھاکہ میں مذاکرات ہوئے تو حفیظ پیرزادہ اپنی پارٹی کے وفد میں شامل تھے۔ اسی سال کے اواخر میں جب پیپلزپارٹی برسراقتدار آئی تو ابتدا ہی سے انہیں اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ وہ مختلف اوقات میں وزیر تعلیم، وزیر برائے صوبائی رابطہ اور وزیر قانون رہے۔ وزارت تعلیم کے زمانے میں تعلیمی اصلاحات نافذ ہوئیں، جن کے تحت بیشتر تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ گو کہ قومیائے گئے تعلیمی اداروں کی کارکردگی پر سب ہی عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں، تاہم تعلیم کو نجی مالکان کی چیرہ دستیوں کے لئے کھلا چھوڑ دینے کے بھی حق میں کوئی نہ ہو گا۔ قومیائے گئے ادارے اگر مناسب کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تو اس کے اسباب پر علیحدہ سے غور کیا جانا

چاہیے اور اس کو زیادہ سائنٹفک بنیادوں پر استوار کیا جانا چاہیے تاکہ اس اقدام کی تنسیخ کر کے ماضی کی ریشہ دوانیوں کو ایک بار پھر موقع فراہم کر دیا جائے۔

وزیر قانون کی حیثیت سے حفیظ پیرزادہ کا سب سے نمایاں کارنامہ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری کے مراحل طے کرنا اور پھر اس کو متفقہ طور پر منظور کرانے کی منزل سر کرنا تھا۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی منظوری میں پیپلز پارٹی کی طرف سے بھٹو کے بعد سب سے زیادہ محنت حفیظ پیرزادہ ہی نے کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب دستور منظور ہوا تو پیپلز پارٹی کے سینئر لیڈر اور اس وقت کے وزیر صحت شیخ رشید نے ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ جوان سال ہیں مگر ذہن انہوں نے تجربہ کار بزرگوں کا پایا ہے۔ قومی تاریخ کے اس پہلو پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس دستور کے خالقوں میں نمایاں تر، حفیظ پیرزادہ اب اس کے حامی نہیں رہے ہیں اور اس کو دوراز کار تصور کرتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں یہ دستور بنا تھا، ۱۹۸۵ء میں انہوں نے دیگر ہم خیال سیاسی ساتھیوں کے ساتھ مل کر باضابطہ طور پر کنفیڈریشن کے قیام کی تجویز پیش کی اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے پاکستان کے لئے غیر موثر اور ناقابل عمل ہونے کا اعلان کر دیا۔ گویا صرف بارہ برس میں وہ دستور کے حوالے سے تراشیدم، پرستیدم اور شکستم کے مراحل سے گزر گئے۔

وزارت تعلیم اور وزارت قانون کے علاوہ ایک اور اہم وزارت جس پر پیپلز پارٹی کی حکومت میں وہ فائز رہے صوبائی رابطے کی وزارت تھی۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ یہ ایک وفاقی دستور تھا۔ ایک وفاقی نظام میں وحدتوں کے درمیان مختلف سطحوں پر رابطے کے لئے ادارہ سازی کی جاتی ہے۔ سیاسی سطح پر سب سے اہم ادارہ ایوان بالا ہوتا ہے۔ سیاسی جماعتیں بھی ان رابطوں کے لئے ایک موثر پلیٹ فارم ثابت ہوتی ہیں۔ مگر انتظامی سطح پر بھی کسی ایسے ادارے کی ضرورت ہوتی ہے، جو وقتاً" فوقتاً" وحدتوں کے باہمی تعلقات اور ان کے درمیان پیدا ہونے والی ٹیکنیکل پیچیدگیوں پر غوروخوض کرے اور وحدتوں کی حکومتوں کے نمائندے کو افہام و تفہیم میں مدد دے۔ بعض ترقی یافتہ فیڈریشنوں میں یہ کام بھی ایوان بالا ہی کی کسی کمیٹی کے دائرہ کار میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں اس ضرورت کی تکمیل کے لئے صوبائی رابطے کی ایک علیحدہ وزارت تشکیل دی گئی تھی۔ حفیظ پیرزادہ کو اپنی مختلف حکومتی ذمہ داریوں میں سب سے زیادہ کام کرنے کا لطف اسی وزارت میں آیا۔ انہوں نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا کہ

"صوبائی رابطے کی ذمہ داریاں پوری کر کے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ اس دور میں بھی صوبوں کے درمیان بہت سے تنازعات تھے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کیا ہمارے دور میں پانی کی تقسیم کا مسئلہ نہیں تھا۔ ۱۹۷۲ء میں پانی کی قلت کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں سیلابوں کی آمد ہوئی۔ پھر ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں بھی بحران آئے۔ ۱۹۷۶ء میں پھر سیلاب کا مسئلہ پیدا ہوا۔ توانائی کا

بحران بھی اس زمانے میں جاری رہا۔ ریلوے کا بحران بھی تھا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ صوبوں کے درمیان جھگڑے نہیں تھے۔ بہت جھگڑے تھے مگر یہ صوبائی رابطے کی وزارت تھی جو ان چیزوں کو منظر عام پر نہیں آنے دیتی تھی اور انہیں اندر ہی اندر حل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں میرا زیادہ تر وقت اسی وزارت کے فرائض کی تکمیل میں گزرتا تھا"۔

وزارتی ذمہ داریوں کے علاوہ حفیظ پیرزادہ نے بھٹو کے خصوصی ایلچی کی حیثیت سے بیرون ملک بھی کئی اہم ذمہ داریاں پوری کیں۔ ۱۹۷۲ء میں جبکہ ابھی حکومتی ڈھانچہ باقاعدہ طور پر منظم نہیں ہوا تھا اور زیادہ تر ایڈہاک بنیادوں پر کام چل رہے تھے حفیظ پیرزادہ' بھٹو کے نمائندے کی حیثیت سے چین' شمالی کوریا اور کئی دوسرے ملکوں میں گئے اور سربراہان مملکت تک بھٹو کے خصوصی پیغامات پہنچائے۔ اس وقت ایک اہم مسئلہ ان ملکوں کو بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے باز رکھنا تھا۔ اس میں ان کی کاوشوں کو کافی کامیابی بھی حاصل ہوئی کیونکہ کئی ملکوں نے اس ضمن میں فوری قدم اٹھانے سے احتراز کیا۔ پھر ۱۹۷۳ء میں عین اس وقت جبکہ دستور پر غور و خوض جاری تھا' حفیظ پیرزادہ کو ماسکو جانا پڑا کیونکہ جنگی قیدیوں پر بنگلہ دیش میں مقدمہ چلائے جانے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ پیرزادہ بھٹو کے نمائندے کی حیثیت سے ماسکو گئے اور الیکسی کوسیگن سے ملاقات کر کے انہیں پاکستان کے موقف سے آگاہ کیا۔ ۱۹۷۴ء میں اسلامی سربراہ کانفرنس سے قبل انہوں نے وزیراعظم بھٹو کے نمائندے کی حیثیت سے کئی مسلم ملکوں کا بھی دورہ کیا۔

۱۹۷۷ء میں انتخابات کے بعد جو سیاسی طوفان اٹھا اس میں بھی پیرزادہ نے بھٹو کے دست راست کی حیثیت سے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ مذاکرات میں وہ حکومت کے سہ رکنی وفد میں شامل تھے۔ یہ مذاکرات کامیاب ہو کر بھی ناکام رہے اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا' جس کے بعد پیپلزپارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں کے لئے آزمائش کے ایک پرخطر دور کا آغاز ہوا۔ اس دور میں حفیظ پیرزادہ مقدمات اور جیلوں کی زد میں رہے۔ جب رہائی ملی تو علاج کے لئے بیرون ملک روانہ ہو گئے۔ وہیں انہوں نے ممتاز علی بھٹو' عطاء اللہ مینگل' افضل بنگش اور دیگر افراد کے ساتھ مل کر سندھی بلوچ پشتون فرنٹ قائم کیا اور اس کے سیکرٹری جنرل بنائے گئے۔ (۸)

سندھی بلوچ پشتون فرنٹ کی اٹھان بہت اچھی تھی مگر یہ محاذ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور عبدالحفیظ پیرزادہ نے اس فرنٹ سے علیحدگی اختیار کر کے پاکستان نیشنل پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ (۹)

عبدالحفیظ پیرزادہ ۱۹۸۸ء کے انتخابی عمل میں شریک نہیں ہوئے۔ البتہ ۱۹۹۰ء میں انہوں نے این اے ۱۷۷ دادو سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ انہیں پی این پی کی حمایت حاصل تھی ان کے مدمقابل ملک اسد سکندر تھے جن کے والد ملک سکندر ۱۹۷۰ء میں اسی نشست پر جی ایم سید کو شکست

دے چکے تھے۔ چنانچہ یہ معرکہ بھی اسد سکندر کے ہاتھ رہا اور عبدالحفیظ پیرزادہ یہ انتخاب تقریباً ۳۲ ہزار ووٹوں سے ہار گئے۔ (۱۰)

۱۹۹۲ء میں جب نوابزادہ نصراللہ خان نے نیشنل ڈیموکریٹک الائنس کے نام سے سیاسی جماعتوں کا ایک اتحاد تشکیل دیا تو عبدالحفیظ پیرادہ اس اتحاد میں نہ صرف شامل ہوئے بلکہ اس اتحاد کے سیکرٹری جنرل بھی منتخب ہو گئے (۱۱)

۱۹۹۳ء میں وہ نواز شریف حکومت کو ہٹانے کی کاروائیوں میں بھی پیش پیش رہے۔ وہ بلخ شیر مزاری کی کابینہ میں شرکت کے خواہاں تھے مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ۱۹۹۳ء ہی میں جب میں منظور وٹو نے پنجاب اسمبلی توڑی اور ان کے اس اقدام کو لاہور ہائیکورٹ میں چیلنج کیا گیا تو عبدالحفیظ پیرزادہ ہی نے ان کی پیروی کی تھی۔

• عبدالحفیظ پیرزادہ کے چھوٹے بھائی مجیب پیرزادہ بھی عملی سیاست میں ہیں۔ وہ ۱۹۹۷ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۱۲) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں وہ کاغذات نامزدگی جمع کروانے کے بعد ریٹائر ہو گئے تھے (۱۳) ۲۰۰۲ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر این اے ۱۹۹ سکھر ۲ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۴)

حوالہ جات

۱۔ رحیم داد خاں مولائی شیدائی۔ تاریخ سکھر (سندھی)۔ حیدرآباد۔ ص ۳۸۹، ۳۹۰
۲۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین (سندھی)۔ جلد ۲۔ ص ۲۳۶ تا ۲۴۱
۳۔ محمد فاروق قریشی۔ پاکستان جمہوریت کا زوال۔ لاہور۔ ص ۱۶۲، ۱۶۳
۴۔ محکمہ تعلقات عامہ۔ مغربی پاکستان کا سالانہ جائزہ ۱۹۵۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۵۵
۵۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۷۵
۶۔ ادارہ۔ انتخابی عہد۔ چند جھلکیاں، چند گوشے۔ ہفت روزہ زندگی۔ لاہور۔ ۴ ر تا ۲۰ ر دسمبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۳۳
۷۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات مشاہیر پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۱۴۴
۸۔ سید جعفر احمد۔ کنفیڈریشن۔ راہ نجات یا راہ فرار۔ ص ۱۱۵ تا ۱۱۹
۹۔ مظہر عباس۔ مین فار آل سیزنز۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ ستمبر ۱۹۹۳ء
۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۷۹
۱۱۔ منیر احمد۔ پاکستان کے انتخابی اتحاد۔ لاہور۔ ص ۱۸۰
۱۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴ ر مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۳۶۳

۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۴۳۲
۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۷

تالپور

تالپور ٹالپر بلوچوں کی ایک شاخ ہیں۔ بلوچوں کا دعویٰ ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کی اولاد سے ہیں۔ بلوچوں کے نسب نامہ کی متفقہ طور پر یہ روایت ہے کہ وہ امیر حمزہ کی اولاد ہیں۔ وہ ان کا پہلا سردار تھا اس سے بعد میں یہ گمان پیدا ہوا کہ امیر حمزہ سے مراد رسول اکرمؐ کے چچا ہیں۔ حالانکہ نسب نامہ میں اس طرح کی وضاحت نہیں ہے تاریخوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں کرمان اور مکران (موجودہ ایرانی بلوچستان) سے بلوچستان میں آئے اور یہاں سکونت اختیار کی' جس کے بعد ملک کا نام بلوچستان پڑا۔ اس وقت بھی بلوچ سب سے زیادہ بلوچستان ہی میں آباد ہیں۔ اس کے بعد یہ پھیلنا شروع ہوئے ان میں بعض سندھ میں اور بعض دوسری جگہوں پر آکر آباد ہوئے اور زراعت' سپاہ گری اور دوسرے پیشوں میں مشغول ہو گئے۔

تالپوروں کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ "تالہ" ان بلوچوں کے ایک خاندانی بزرگ کا نام تھا اور "پور" فارسی میں اولاد کو کہتے ہیں۔ ان ہی دو لفظوں سے مرکب ہو کر تالپور بنا۔ پھر عوام کے کثرت استعمال سے ٹالپر ہو گیا۔ خود تالپوروں کی بھی بہت سی شاخیں ہیں۔ لیکن ہمارا مقصود صرف وہ تالپور ہیں جو کہ حیدر آباد' خیرپور اور میرپور میں حکمران ہوئے ان سب کا جد اعلیٰ گہ یا گکو خاں عرف سلیمان خاں کے آٹھ بیٹے تھے لیکن ہم صرف ان دو بیٹوں کا ذکر کریں گے جن کی اولاد سے حیدر آباد' خیرپور اور میرپور کے میر تھے۔ ان میں سے بڑے بیٹے کا نام ہوتک خان اور تیسرے بیٹے کا نام مالک خاں تھا۔

ہوتک خاں کی اولاد سے میراں حیدر آباد و خیرپور تھے۔ ہوتک خاں کے ایک بیٹے کا نام شہداد خان تھا۔ سندھ کا مشہور شہر شہداد پور اسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ شہداد خاں نے ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ء) میں وفات پائی۔ اس کا مقبرہ شہر شاہ پور سے متصل شاہی قبرستان میں قبہ شہداد کے نام سے موجود ہے۔

شہداد خاں کے بیٹوں میں صرف دو چاکر خاں اور میر بہرام خاں کا ذکر یہاں مقصود ہے۔ میراں خیرپور کا خاندان اسی چاکر خاں کی اولاد سے ہے۔ یہ خاندان پہلے شہدادانی اور پھر چاکرانی کے نام سے مشہور ہوا۔ اب تک تعلقہ شہداد پور میں میر چاکر خان کا بنا کردہ شہر "شاہ پور چاکر" کے نام سے مشہور ہے۔

دوسرا بیٹا میر بہرام خاں تھا۔ کہا گیا ہے وہ ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) میں میاں محمد سرفراز کے ہاتھوں شہید ہوا۔

میر بہرام خاں کا بڑا بیٹا میر صوبیدار تھا جو اپنے والد کے ساتھ ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) میں شہید ہوا یہ دونوں باپ بیٹے خدا آباد میں مدفون ہیں۔ حیدر آباد کے میر دل کا خاندان اسی میر بہرام کی اولاد سے ہے۔

میر صوبدار کے چار بیٹے میر فتح علی خاں' میر کرم علی خاں' میر غلام علی خاں اور میر مراد علی خاں تھے۔ میر فتح علی خاں وہی ہے جس کو فاتح سندھ کہتے ہیں۔

میر چاکر خاں کے بھی کئی بیٹے تھے لیکن میر سہراب خاں اس کا نامور بیٹا تھا' جو میر فتح علی خاں فاتحہ سندھ کا رفیق دوم تھا۔ میراں خیرپور اسی کی اولاد سے ہیں۔

مانک خاں بن گکہ خاں کے کئی بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام میر اللہ یار خاں تھا میر اللہ یار خاں کے بھی کئی بیٹے تھے۔ ان میں ایک میر مسو خاں تھا۔ مسو خاں کے بھی کئی بیٹے ان میں بڑا میر فتح خاں تھا۔ میر فتح خان کے بھی کئی فرزند تھے۔ اس کا دوسرا بیٹا میر ٹھارہ خاں تھا جس نے فتح ملک سندھ میں شرکت کی تھی اور اسی کی اولاد سے میراں میرپور تھے۔

کلہوڑوں کے بعد میر فتح علی خاں نے سندھ پر تسلط حاصل کیا اور وہ تالپور خاندان میں سندھ کا سب سے پہلا حکمران تھا۔

چونکہ تالپوروں میں پھوٹ کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ لہٰذا ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) میں میر فتح علی خاں نے ملک کی فلاح و بہبودی کے خیال سے سندھ کو سات حصوں میں تقسیم کر کے چار حصے اپنے اور اپنے بھائیوں کے لئے اس کا دارالسلطنت حیدر آباد قرار پایا۔ دو حصے میر سہراب خاں کو اور ایک حصہ میر ٹھارہ خاں کو دیا۔ اول الذکر کا دارالسلطنت خیرپور اور آخر الذکر کا مرکز میرپور قرار پایا۔ تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا جلد دوم) میں ہے کہ یہ تینوں علیحدہ علیحدہ خراج کی رقمیں دربار کابل کو پیش کرتے تھے لیکن "لب تاریخ سندھ" میں ہے کہ حیدر آباد اور میرپور کے حکمران مل خراج کی رقم ادا کرتے تھے اور خیرپور کے حکمران علیحدہ براہ راست اپنی خراج کی رقم پیش کرتے تھے۔ آخر ایک زمانے کے بعد شاہ خراسان اور امیراں خراسان کی نااتفاقی کی وجہ سے یہ خراج موقوف ہوا اور سندھ کے یہ تینوں تالپور خاندان آزاد اور خود مختار فرماں روا بن گئے۔ ان تینوں حکومتوں نے مل کر مرکزی حیثیت میر فتح علی خاں کو دی تھی۔ جس کا پایہ تخت

حیدر آباد تھا۔ میر سراب خاں اور میر ٹھارہ خاں نے اپنی حکومتوں کی حیثیت ایک ریاست کی سی رکھی جو بالکل مرکز کے اشارے پر چلتی تھی۔ حیدر آباد کی حکومت چار بھائی میر فتح علی خاں' میر غلام علی خاں میر کرم علی خاں اور میر مراد علی خاں چلاتے تھے جس کو چویاری حکومت کہتے تھے۔ ان چاروں بھائیوں میں سے جب کسی کی وفات ہوئی تو اس کی جگہ اس کے بیٹے کو ملی۔

ان تینوں حکومتوں کا نظام کار یہ تھا کہ اگر کوئی دشمن ان کی طرف رخ کرتا تو متفقہ طور پر متحدہ ہو کر اس کی مدافعت کرتے اگر یہ کسی حصہ ملک پر قابض ہو جاتے تو اس کو انصاف کے تقاضوں کے مطابق تقسیم کر لیتے۔

تالپوروں نے اپنی متفقہ جدوجہد سے ان تمام کھوئے ہوئے علاقوں کو حاصل کر لیا تھا کہ جو میاں غلام شاہ کے عہد حکومت میں سندھ میں داخل تھے اور بعد میں دوسروں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ مثلاً سبزل کوٹ کو انہوں نے دوبارہ نواب بہاولپور سے' اسی طرح کراچی اور اس کے مضافات کو خان قلات سے اور شکار پور اور اس کے نواح کو افغانوں سے اور لکھپت اور بست کو راجہ بھوج کے اور عمر کوٹ اور ریگستان کو راجہ جودھپور سے واپس لیا۔ ان کے علاوہ بھی سندھ کے اکثر قصبات جو کلہوڑہ فرمانرواؤں کے زمانے میں ان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے انہوں نے دوبارہ حاصل کر کے سندھ میں داخل کیے۔

جب میاں عبدالنبی نے سندھ پر یورش کرنے کے لئے والی قلات سے امداد طلب کی اور والی قلات سے بروسیوں کی فوج لے کر سندھ پر چڑھائی کی اور تالپوروں نے اسے شکست فاش دی تو اس لشکر میں محمد نصیر خاں والی قلات کا داماد بھی تھا جو اس لڑائی میں مارا گیا۔ محمد نصیر خان نے اپنے عزیزوں کا خون بہا طلب کیا اور میاں عبدالنبی نے ضلع کورہ (کراچی) کو اس خون بہا کے عوض دے دیا۔ میر فتح علی خاں نے اس ضمن میں دربار افغانستان کو معروضہ روانہ کیا اس معروضے سے تیمور شاہ نے محمد نصیر خان والی قلات کو لکھا کہ یہ علاقہ فوراً میر فتح علی خاں کے سپرد کر دیا جائے اور یوں یہ علاقہ محمد نصیر خان کو میر فتح علی خان کے حوالے کرنا پڑا۔

سندھ پر تالپوروں کی حکومت کوئی ۵۹ برس قائم رہی۔ یہ حکومت انتظامی حیثیت سے تین حصوں میں تقسیم تھی' حیدر آباد میں شہدادنیوں کی حکومت تھی' میرپور کی حکومت مانکانیوں کے ذمہ تھی اور خیرپور پر سہرابانی حکمران تھے۔

تالپوروں کا عہد حکومت اگرچہ بہت مختصر تھا اور باوجود اس امر کے کہ ان کا یہ دور آپس کے اختلاف اور سیاسی جوڑ توڑ میں گزرا اور وہ اپنی حکومت کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے' مجموعی طور پر ان کا دور ایک کامیاب دور کہا جا سکتا ہے۔

تمام تالپور فرمانروا پڑھے لکھے اور نکتہ سنج تھے ان میں سے بعض صاحب تالیف و تصنیف اور شاعر تھے اور اپنے دور کے علماء اور شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ انہیں عمدہ اور نادر کتابیں

جمع کرنے کا شوق بھی تھا اور ان کے اس شوق کی بدولت حیدر آباد کے قلعے میں کئی کتب خانے قائم ہو گئے تھے۔

سندھ کی سیاست میں تالپوروں کا حصہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کے تذکرے کے لئے ایک پوری کتاب بھی ناکافی ہو گی۔ "تالپور" سندھ کے کم و بیش ہر ضلع میں بااثر عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' تالپوروں کے سیاسی خاندانوں کو اگر چند مقامات تک محدود کر لیا جائے تو شاید ان کے تذکرے کے ساتھ کچھ انصاف ہو سکے۔ یہ مقامات حیدر آباد' میرپور خاص' ٹنڈو محمد خاں اور خیرپور ہیں۔

حیدر آباد کی سیاست میں تالپوروں کا جو خاندان سب سے زیادہ نمایاں ہوا وہ میر علی احمد تالپور اور ان کے بھائی میر رسول بخش تالپور کا خاندان تھا۔

میر علی احمد تالپور کے جد امجد کا نام میر شہداد خان تھا۔ انہی کے حوالے سے میر علی احمد تالپور کا خاندان شہدادانی کہلاتا ہے۔ میر شہداد خان کے پوتے میر محمود خان تھے' میر محمود خان کے بھتیجے میر فتح علی خان تھے جو فاتح سندھ کہلاتے تھے۔ انہی میر محمود خاں کی چوتھی پشت میں میر نبی بخش خان تھے' جو میر علی احمد اور میر رسول بخش کے والد تھے۔

میر علی احمد تالپور ۳۱ر اگست ۱۹۱۵ء کو ٹنڈو میر محمود میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے کانگریس سے اپنی سیاسی سفر کا آغاز کیا اور اسی برس منعقد ہونے والے سندھ اسمبلی کے انتخابات کے لئے تشکیل دیئے جانے والے سندھ کانگریس پارلیمانی بورڈ کے رکن بنے۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے خاکسار تحریک میں شمولیت اختیار کی اور صوبہ بہار کے "حاکم اعلیٰ" منتخب ہوئے جہاں انہوں نے چھ ماہ بسر کئے۔ بعد ازاں انہیں سندھ کا "حاکم اعلیٰ" بنا دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد میر علی احمد تالپور نے پہلے خان عبدالغفار خان کی پیپلز پارٹی اور پھر میاں افتخار الدین کی آزاد پاکستان پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۵۱ء میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور ۱۹۵۳ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کے قیام کے بعد وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے اور صوبائی کابینہ میں مارشل لاء کی آمد تک کئی وزارتوں پر فائز رہے۔ (۲)

۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات میں میر علی احمد تالپور نے محترمہ فاطمہ جناح کی کھل کر حمایت کی۔ ۱۹۶۸ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے۔ (۳) ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں حیدر آباد سے ذوالفقار علی بھٹو قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد ازاں جب انہوں نے نشست خالی کی تو ضمنی انتخاب میں اس نشست پر میر علی احمد تالپور کامیاب ہو گئے۔ میر علی احمد تالپور اس اسمبلی کے واحد رکن تھے جنہوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین پر اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں انہوں نے پیپلز پارٹی کو خیرباد کہا۔ ۱۹۷۷ء میں انہوں نے پیپلز پارٹی کے امیدوار سید امید علی شاہ سے شکست کھائی۔ (۴) ۱۹۷۸ء میں اپنے دیرینہ دوست ایوب کھوڑو کے اصرار پر انہوں نے

جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۸۵ء تک اس کے رکن رہے۔ ان کے پاس وزارت دفاع جیسا اہم قلمدان تھا۔ (۵)

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں میر علی احمد تالپور کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے مخالفین نے ان پر بھٹو کے قاتلوں کا ساتھ دینے کا الزام لگایا اور ان کو "تارا مسیح" کا خطاب دیا گیا۔ (۶) ۱۹۸۵ء کے بعد میر علی احمد تالپور نے عمر کا باقی حصہ خاموشی میں بسر کیا اور ۵ر اپریل ۱۹۸۷ء کو لندن میں وفات پائی۔ انہیں ان کے آبائی مقام ٹنڈو میر محمود میں سپرد خاک کیا گیا۔ (۷)

میر علی احمد تالپور ایک کھرے سیاست دان تھے۔ انہوں نے کبھی اصولوں پر مفاہمت نہیں کی، جب ذوالفقار علی بھٹو سے ان کے اختلافات بڑھے تو انہوں نے پارٹی چھوڑنے میں لمحہ بھر بھی تامل نہیں کیا۔ اسی طرح ان پر کبھی یہ الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا کہ انہوں نے کسی ذاتی مفاد کی خاطر کوئی پارٹی جوائن کی یا کسی وزارت میں شمولیت اختیار کی۔ وہ ایک صاحب مطالعہ شخص تھے اور گفتگو اور تقریر میں ان کے جوہر نمایاں ہوتے تھے۔

میر علی احمد تالپور کی زندگی ہی میں ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں ان کے صاحبزادے میر حیدر علی تالپور صوبائی اسمبلی کے رکن بن گئے تھے۔ (۸) ۱۹۹۳ء میں وہ این اے ۱۷۰ حیدر آباد ۴ سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے مگر یہ انتخاب بری طرح ہار گئے (۹)

۱۹۹۷ء میں وہ اسی نشست پر پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدوار تھے مگر وہ اس مرتبہ بھی کامیاب نہ ہو سکے (۱۰) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے تحریک انصاف کے ٹکٹ پر قومی اور صوبائی، دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا۔ مگر دونوں نشستوں پر ناکام رہے۔ (۱۱)

میر علی احمد تالپور کے چھوٹے بھائی میر رسول تالپور بھی سیاست کے میدان کے پرانے کھلاڑی تھے۔ وہ ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان سے پہلے وہ خاکسار اور احرار تحریک سے متاثر رہے قیام پاکستان کے بعد نیپ اور عوامی لیگ سے قریب رہے۔ پھر پیپلز پارٹی کے قیام میں فعال کردار ادا کیا۔ ۲۹ر اپریل ۱۹۷۲ء کو وہ صوبہ سندھ کے گورنر بنے۔ (۱۲) اور تقریباً دو برس اس عہدے پر فائز رہے۔ فروری ۱۹۷۳ء میں جب ان کے بھائی کی عزت کا سوال آیا تو وہ شان قلندری سے گورنر ہاؤس کو چھوڑ کر چلے آئے۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لائی دور میں وہ سندھ کے سینئر منسٹر بنائے گئے اور یکم مئی ۱۹۸۲ء کو اپنی وفات تک اسی عہدے پر فائز رہے۔

میر رسول بخش تالپور، یوں تو جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ تھے مگر انہوں نے اپنی زندگی مزدوروں کے سے انداز میں بسر کی۔ وہ سراپا عوامی آدمی تھے۔ ان کے شخصیت میں محبت اور اخوت، بہادری اور عاجزی، فقیری اور درویشی اور شاہی اور یاری کی صفات اس طرح یکجا ہو گئی تھیں کہ بلاشبہ سندھ کی سرزمین ان جیسے فرزند کو صدیوں تک ترسے گی۔ (۱۳)

میر رسول بخش تالپور کے ایک ہی فرزند میر رفیق تالپور ہیں۔ وہ ۸/ فروری ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے سندھ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا اور ۷۱-۱۹۷۰ء میں سندھ یونیورسٹی طلبہ یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ اس انتخاب میں انہوں نے جئے سندھ کے امیدوار ایوب دھامرہ کو شکست دی تھی۔ ان کی شادی ان کے تایا میر علی احمد تالپور کی صاجزادی سے ہوئی ہے۔ (۱۴)

میر رفیق تالپور نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کونسلر کی حیثیت سے کیا۔ ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۵) ۱۹۸۸ء میں بھی وہ پی ایس ۴۱ حیدر آباد ۷ سے امیدوار تھے مگر ایم کیو ایم کے شفیق احمد قریشی سے شکست کھا گئے۔ (۱۶) انہوں نے ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ ان کے حلقہ ہائے انتخاب تھے پی ایس ۳۷ حیدر آباد ۳ اور پی ایس ۳۹ حیدر آباد ۵ مگر اس مرتبہ بھی ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ دونوں حلقوں میں شکست کھا گئے۔ (۱۷)

۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کی انتخابی مہم میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

تالپوروں کی دوسری شاخ جو سیاست کے میدان میں نمایاں ہے۔ میر پور خاص میں آباد ہے۔ یہ سندھ کے آخری حکمران میر شیر محمد خاں تالپور کے اخلاف میں سے ہیں۔

میر شیر محمد خان تالپور نے سندھ کی مشہور جنگ، جنگ دبہ میں سر چارلس نیپئر سے مقابلہ کیا تھا۔ مگر اپنے بعض ساتھیوں کی غداری کے باعث شکست سے دو چار ہوئے تھے۔ میر شیر محمد خاں نے شکست کے بعد پنجاب کا رخ کیا مگر کچھ عرصہ بعد وہ واپس اپنے وطن آئے اور ۱۸۷۷ء میں اپنے وطن ہی میں وفات پائی۔ میر شیر محمد خان کو ان کی بہادری اور دلیری کے باعث شیر سندھ کہا جاتا ہے۔ (۱۸)

میر شیر محمد خان تالپور کے فرزند میر حاجی اللہ داد خان تھے۔ انہیں سردار بہادر کا خطاب ملا تھا اور وہ بارہ برس تک مجلس قانون ساز کے رکن اور آٹھ برس تک ضلعی لوکل بورڈ کے صدر رہے تھے۔

میر حاجی اللہ داد کے بیٹے میر امام بخش خاں تالپور تھے۔ وہ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اگلے برس صوبائی کابینہ میں شامل کئے گئے۔ (۱۹) وہ ۱۹۷۰ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن بنے (۲۰) ۱۹۷۷ء میں بھی وہ اپنی رکنیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ (۲۱)

میر امام بخش تالپور کے تین بیٹے ہیں جن میں سے ایک بیٹے پیر لطف اللہ تالپور نے ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں حصہ لیا تھا اور سندھ اسمبلی کا رکن بننے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ (۲۲) میر لطف اللہ تالپور، میر رسول بخش کے داماد ہیں۔ وہ اور ان کے بھائی میر فضل اللہ تالپور نے ۱۹۹۳ء کے انتخابات سے کچھ عرصہ قبل پیپلز پارٹی میں شمولیت اور اپنے حلقہ پی پی کے امیدوار سید علی قطب شاہ

کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کیا تھا۔(۲۳)

اسی خاندان کے ایک اور فرد میر علی بخش تالپور ہیں۔ وہ ۱۹۷۰ء میں خان بہادر غلام محمد وسان کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن بنے تھے۔(۲۴)

میر علی بخش تالپور کے فرزند میر منور علی تالپور ہیں۔ انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ۱۹۸۱ء میں مجلس شوریٰ کی رکنیت سے کیا۔ وہ پہلی مرتبہ ۱۹۸۵ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن بنے اور کچھ دن مسلم لیگ میں شامل رہے (۲۵) ۱۹۸۸ء کے انتخابات سے پہلے انہوں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوگئے۔(۲۶) اس مرتبہ انہوں نے صوبائی کابینہ کا رکن بننے میں کامیابی حاصل کی۔ (۲۷) ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب تیسری مرتبہ جیتا۔ (۲۸) انہوں نے ۱۹۹۳ء میں بھی صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اگرچہ اس مرتبہ انہیں پیر صاحب پگاڑا کے صاحبزادے پیر صبغت اللہ شاہ راشدی جیسے مضبوط امیدوار کا سامنا تھا۔ لیکن وہ یہ انتخاب جیتنے میں بھی کامیاب ہو گئے (۲۹) انہوں نے ۱۹۹۷ء میں بھی اسی نشست پر کامیابی حاصل کی اور میر علی نواز تالپور کو شکست سے ہم کنار کیا (۳۰) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ ہی نہیں لیا۔ آصف علی زرداری کی ہمشیرہ فریال، میر منور علی تالپور کی اہلیہ ہیں۔ فریال تالپور نے ۱۹۹۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر این اے ۱۲۰ نواب شاہ ا سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سید شوکت حسین شاہ سے شکست کھا گئیں۔(۳۱) اگست ۲۰۰۱ء میں وہ نواب شاہ کی ضلعی ناظمہ منتخب ہوئیں۔ (۳۲) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا اور ۲۰۰۵ء میں دوسری مرتبہ نواب شاہ کی ناظمہ منتخب ہوئیں۔ اس مرتبہ ان کے اور خوشحال پاکستان پارٹی کے امیدوار خان محمد ڈاہری کے ووٹ برابر تھے۔ اس لیے فیصلہ ٹاس پر ہوا تھا۔ (۳۳)

میر پور خاص میں آباد تالپوروں میں ایک اہم نام نواب محمد یوسف تالپور کا ہے۔ جو سیاست کے افق پر ۱۹۷۰ء کی دہائی میں نمودار ہوئے۔ وہ سندھ یونیورسٹی کی طلبہ یونین کے صدر رہے۔ ابتداء میں وہ جی ایم سید سے بہت متاثر تھے۔ تاہم انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ۱۹۷۲ء میں پاکستان پیپلز پارٹی سے کیا۔ وہ ۱۹۷۷ء میں پی ایس ۵۵ تھر پارکر ۳ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ۱۹۸۵ء میں وہ ممتاز بھٹو کے سندھ بلوچ پختون فرنٹ میں شامل ہوئے اور جلد ہی اس جماعت کے سر کردہ رہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔(۳۴) ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہوں نے بالترتیب آزاد امیدوار اور سندھ نیشنل فرنٹ کے امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا مگر دونوں مرتبہ میر منور علی تالپور کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔(۳۵) ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے بعد انہوں نے ایک مرتبہ پھر پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ انہوں نے جلد ہی بے نظیر بھٹو کا اعتماد حاصل کر لیا ۱۹۹۳ء کے انتخابات

میں پیپلز پارٹی نے انہیں این اے ۱۷۵ میر پور خاص وعمر کوٹ سے قومی اسمبلی کا ٹکٹ عطا کر دیا اور یوں نواب یوسف تالپور نہ صرف قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔(۳۶) بلکہ وزیر خوراک و زراعت کے طور پر وفاقی کابینہ میں بھی شامل کر لیے گئے۔ (۳۷) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں نواب محمد یوسف تالپور کامیاب نہ ہو سکے۔(۳۸) لیکن ۲۰۰۲ء میں وہ اسی نشست پر ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن بن گئے ان کے چھوٹے بھائی عبدالغنی تالپور بھی، جو ملک اسد سکندر کے برادر نسبتی ہیں ان انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے(۳۹)

تالپور کی تیسری شاخ ٹنڈو محمد خان میں آباد ہے۔ اس شاخ کے جس فرد نے تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد پاکستان کی سیاست میں سب سے زیادہ نام کمایا۔ وہ میر غلام علی تالپور تھے۔

میر غلام علی تالپور کا تعلق تالپوروں کی شاہوانی شاخ سے تھا۔ ان کے جد امجد میر شاہو خاں سندھ کے شاہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ میر غلام علی تالپور ۲۲ر ستمبر ۱۹۰۹ء کو ٹنڈو محمد خان میں پیدا ہوئے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ انہوں نے عملی سیاست کا آغاز ۱۹۳۷ء میں سندھ اسمبلی کی رکنیت سے کیا۔ ۱۹۴۳ء میں وہ پہلی مرتبہ وزارت پر فائز ہوئے اور پھر ان کا نام اور وزارت لازم وملزوم بن گئی۔ ۱۹۴۴ء میں انہوں نے مسلم لیگ کی اپیل پر خان بہادر کا خطاب واپس کر دیا۔

قیام پاکستان نے بعد وہ سندھ اسمبلی کے رکن رہے اور ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۴ء تک اسپیکر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ مرکز میں وزیر بنے اور پھر ایوب خان کے مارشل لاء کی آمد تک وزارت میں شامل رہے۔ اسی دوران انہوں نے اپنی سیاسی وابستگی بھی تبدیل کی اور مسلم لیگ کو چھوڑ کر ری پبلکن پارٹی سے جا ملے۔

۱۹۶۲ء میں میر غلام تالپور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ابھی ان کا دور رکنیت جاری تھا کہ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۴۰)

سندھ کی سیاست میں میر غلام علی تالپور کی ایک شہرت یہ ہے کہ وہ ون یونٹ کے شدید مخالف تھے اور ان کے اس جرم کی پاداش میں حکومت سندھ نے انہیں گرفتار کر کے ان کو اونٹ کی پیٹھ پر باندھ کر یالادکرمٹھی پہنچا دیا۔ وہاں جیل میں انہیں اتنی ازیتیں دی گئی کہ وہ جانبر نہ ہو سکے اور جلد ہی انتقال کر گئے۔ اسی بنیاد پر انہیں ون یونٹ کا شہید اول قرار دیا جاتا ہے مگر پیر علی محمد راشدی نے اپنی کتاب ''ون یونٹ کی تاریخ'' میں اس پورے واقعہ پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اسے من گھڑت اور جھوٹا واقعہ قرار دیا ہے۔(۴۱)

میر غلام علی تالپور کے ۵ صاحبزادے تھے۔ جن میں سے دو صاحبزادگان میر اعجاز علی تالپور اور میر ممتاز علی تالپور نے آگے چل کر سیاست کے میدان میں نام کمایا۔

میر اعجاز علی تالپور اپنے والد کی وفات کے بعد ان کی خالی ہونے والی نشست پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں وہ دوبارہ رکن اسمبلی بنے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے پہلے انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور پیپلز پارٹی کی ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد ازاں اعجاز علی تالپور ممتاز بھٹو کی کابینہ میں کچھ عرصہ کے لئے وزیر بھی رہے انہیں آب پاشی اور بجلی کے محکمے سونپے گئے تھے۔ (۴۳) ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں میر اعجاز علی تالپور نے پی ایس ۴۷ حیدر آباد ۱۱ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ ان کی نظریں سندھ کی وزارت اعلیٰ پر تھیں مگر قاضی عبدالمجید عابد در پردہ ان کوششوں کی مخالفت کرتے رہے اور انہوں نے صدر ضیاالحق اور وزیر اعظم جونیجو کو یہی تاثر دیا کہ میر اعجاز علی تالپور سندھ کی قیادت پر فائز ہونے کے بعد مسلم لیگ کے لئے مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میر اعجاز علی تالپور کو سندھ کی قیادت تو نصیب نہ ہوئی مگر وہ مسلم لیگ کی حکومت میں صوبائی وزارت پر فائز رہے۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات کے وقت میر اعجاز علی تالپور سندھ کی نگران کابینہ میں وزیر تھے۔ مگر اب یہ وزارت بھی ان کے کام نہ آسکی اور جب جماعتی بنیادوں پر انتخابات کا انعقاد ہوا تو میر اعجاز علی تالپور صوبائی اسمبلی کی نشست پر پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار سید محسن شاہ سے تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ یہ ان کی زندگی کی پہلی شکست تھی۔ (۴۳)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں بھی میر اعجاز علی تالپور نے سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ بھی ناکامی ہی ان کا مقدر بنی۔ (۴۴) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۴۵) ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام کہیں نظر نہیں آیا۔

میر اعجاز علی تالپور کے صاحبزادے میر عنایت علی تالپور نے اپنی سیاسی سفر کا آغاز ۱۹۸۵ء میں قومی اسمبلی کی رکنیت سے کیا۔ مگر اس کے بعد وہ پھر کسی اسمبلی کے رکن نہ بن سکے۔ ۱۹۸۸ء میں انہیں قاضی عبدالمجید عابد نے شکست دی۔ (۴۶) ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ ہی نہیں لیا۔ ۱۹۹۳ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کاغذات نامزدگی جمع کروائے مگر پھر اپنے والد کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی (شہید بھٹو گروپ) کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کا حلقہ تھا پی ایس ۴۴ حیدر آباد ۱۰۔ مگر وہ اس مرتبہ بھی کامیاب نہ ہو سکے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سید محسن شاہ بخاری سے شکست کھا گئے۔ (۴۷) ۲۰۰۵ء میں وہ ٹنڈو محمد خان کے ضلعی ناظم منتخب ہو گئے۔ انہوں نے ذوالفقار شاہ جاموٹ کو شکست دی۔ اس مرتبہ انہیں خوشحال پاکستان پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ (۴۸)

میر اعجاز علی تالپور کے بھائی میر ممتاز علی تالپور بھی ایک عرصہ سے سیاست کے میدان میں ہیں۔ وہ پہلی مرتبہ ۱۹۷۰ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۴۹)

۱۹۷۷ء میں وہ پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے دوبارہ صوبائی اسمبلی کے رکن بنے اور جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کی آمد تک پرائمری تعلیم اور اوقاف کی صوبائی وزارت پر فائز رہے۔ (۵۰) انہوں نے ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۷ء تک ہر انتخاب میں صوبائی اسمبلی کے حلقہ پی ایس ۴۴ حیدرآباد ۱۰ سے انتخاب میں حصہ لیا۔ مگر ایک مرتبہ بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ (۵۱)

ٹنڈو محمد خان ہی میں میر غلام علی تالپور کے کزن میر بندے علی تالپور کا خاندان بھی سیاست کے میدان میں عمل دخل رکھتا ہے۔

میر بندے علی تالپور تقسیم سے پہلے کوئی دس برس تک اسپیشل مجسٹریٹ اور پھر خاصے عرصہ تک حیدرآباد ضلعی لوکل بورڈ کے صدر رہے تھے۔ ۱۹۳۰ء وہ بمبئی لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن بنے اور سندھ سپریشن کمیٹی میں شامل کیے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ ایک مرتبہ پھر سندھ اسمبلی کے رکن بنے۔ اور سر غلام حسین ہدایت اللہ کے پہلی وزارت میں بطور وزیر شامل ہوئے۔۔۔۔ کچھ عرصہ بعد اللہ بخش سومرو سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے تو میر بندے علی تالپور نے ۱۸/ مارچ ۱۹۴۰ء کو اپنی وزارت تشکیل دی۔ ان کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ مسجد منزل گاہ سکھر کے قصبے کا منصفانہ تصفیہ تھا۔ (۵۲) ۱۹۴۶ء میں وہ ایک مرتبہ پھر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۵۳) تقسیم کے بعد ۱۹۵۳ء میں بھی سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۵۴) مگر اس کے بعد ان کا نام سیاسی افق سے بالکل غائب ہو گیا۔ جناب خالد شمس الحسن نے اپنی کتاب Sindh's Fight for Pakistan میں تحریر کیا ہے کہ جب ۱۹/ مارچ ۱۹۴۶ء کو سندھ اسمبلی میں مسلم لیگ کی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوئی تو کانگریس نے میر بندے علی تالپور کو اس تحریک کا ساتھ دینے کے لیے ایک خطیر رقم ادا کی۔ سردار پٹیل کے بقول میر بندے علی تالپور نے وہ رقم قبول کر لی مگر عین وقت پر تحریک کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور یوں مسلم لیگ کے خلاف تحریک عدم اعتماد فقط ایک ووٹ کی اکثریت سے مسترد ہو گئی۔ (۵۵)

میر بندے علی تالپور کے صاحبزادے میر غلام علی تالپور ہیں۔ وہ ۱۹۸۱ء میں مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے تھے۔ (۵۶) مگر اس کے بعد پھر ان کا نام کسی بھی سیاسی پلیٹ فارم سے نظر نہیں آیا۔

میر غلام علی تالپور کے چھوٹے بھائی میر محمد حسن خان تالپور (عرف میر بابو) ہیں جو ۲۰۰۲ء میں پی ایس ۵۵ بدین ا سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ہیں۔ (۵۷)

تالپوروں کی چوتھی شاخ خیر پور کے تالپور ہیں۔ یہ وہی خاندان ہے جس کی حکمرانی ریاست خیر پور پر قیام پاکستان کے بعد تک جاری رہی ہے۔ اس خاندان کے صاحبزادہ میر علی مردان خان تالپور اور صاحبزادہ میر عطا حسین خاں تالپور، قیام پاکستان کے بعد ریاست کی اسمبلی کے رکن رہے

تھے۔(۵۸) ون یونٹ کے قیام کے بعد جب ریاست کا وجود بالکل ختم ہو گیا تو ۱۹۵۶ء میں میر علی مردان خاں تالپور مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔(۵۹) ون یونٹ کے خاتمے کے بعد ۱۹۷۰ء میں جب صوبہ سندھ کی اسمبلی دوبارہ وجود میں آئی تو میر عطا حسین تالپور پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر اس اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔(۶۰) وہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں بھی کامیاب ہوئے اور مارشل لاء کی آمد تک صوبائی وزارت پر بھی فائز رہے۔ انہیں مواصلات کا قلمدان سونپا گیا تھا۔(۶۱)

۱۹۷۷ء کے بعد اس خانوادے کے افراد عملی سیاست میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کر سکے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر صفیہ بانو۔ امیران تالپور۔ اسلام آباد۔ ص ۳۹ تا ۴۲

۲۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ حیدر آباد۔ جلد ۲۔ ص ۲۹۹

۳۔ ظہیر احمد۔ میر علی احمد تالپور سے کھری کھری باتیں۔ مشمولہ ساقی ترے پیمانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۵۷

۴۔ فاضل جمیلی/ خورشید انجم۔ حیدر آباد میں قومی اسمبلی کے انتخابات، تاریخ کے آئینے میں۔ روزنامہ پبلک کراچی۔ ۱۶/اگست ۱۹۹۳ء

۵۔ ظہیر احمد۔ میر علی احمد تالپور سے کھری کھری باتیں۔ مشمولہ ساقی ترے پیمانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۵۰

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۴۸

۷۔ پروفیسر محمد اسلم۔ دفیات مشاہیر پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۱۶۶

۸۔ ثمینہ امان۔ ڈائرکٹری، ممبر آف پراونشل اسمبلی سندھ اینڈ بلوچستان۔ ۱۹۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۱۹

۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۰۷

۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۲۹

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۷۹، ۲۵۱

۱۲۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ (سندھی) کراچی۔ ص ۱، ۲

۱۳۔ ظہیر احمد۔ اب بھی زندہ ہیں۔ حیدر آباد۔ ص ۲۳ تا ۳۲

۱۴۔ ظہیر احمد۔ میر رفیق احمد تالپور سے بات چیت۔ مشمولہ ساقی تیرے پیمانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۱۶۹، ۱۷۰

۱۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور ص ۴۸۸

۱۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۵۱۸

۱۷۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۶۵، ۱۴۶۶

۱۸۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ۔ جلد دوم۔ ص ۶۷ تا ۷۷۴

۱۹۔ تہور علی خاں۔ بائیوگرافیکل انسائیکلو پیڈیا پاکستان۔ ایڈیشن ۶۱۔ ۱۹۶۰ء۔ لاہور۔ ص ۶۱

۲۰۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ (سندھی) کراچی۔ ص ۹۹

۲۱۔ لسٹ آف ایم پی ایز (سندھ) ۱۹۷۷ء (غیر مطبوعہ) فراہم کردہ سندھ اسمبلی سیکرٹریٹ کراچی۔ ص ۲

۲۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۴۹۰

۲۳۔ زہیر احمد مجاہد۔ بے نظیر کے دورہ میر پور خاص و عمر کوٹ کے سیاسی۔ اثرات۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۲/ ستمبر ۱۹۹۳ء۔

۲۴۔ ادارہ۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۱۹۸۸ء۔ ص ۱۱۸

۲۵۔ ادارہ۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۱۹۸۸ء۔ ص ۱۱۸

۲۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۷۰

۲۷۔ ٹی ایم ڈوگر۔ ہواز ہو اینڈ وہاٹ از وہاٹ۔ لاہور۔ ص ۸

۲۸۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور ص ۶۱۹

۲۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص۔ ۱۴۷۲

۳۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۳ فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۵۶۱

۳۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۳/ فروری ۱۹۹۷ء۔ ص۔ ۲۳۹

۳۲۔ مومن بلو۔ چارلس نیپئر کان محمد میاں سومری تائین۔ حیدر آباد۔ ص ۴۷۸

۳۳۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء؛ ۹/ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۳۴۔ عبدالحفیظ شیخ۔ نواب محمد یوسف تالپور۔ ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۲/۔۸/ دسمبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۶

۳۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۳/ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۶۸۳، ۱۱/ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۴۰

۳۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۰۹

۳۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۷/ جنوری ۱۹۹۴ء

۳۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۳۳

۳۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء جلد دوم۔ ص ۸۱

۴۰۔ جی ایم سید جنب گزاریم جن سین۔ حیدرآباد۔ جلد ۲۔ ص ۲۲۸ تا ۲۳۶
۴۱۔ پیر علی محمد راشدی۔ ون یونٹ کی تاریخ۔ لاہور۔ ص ۶ تا ۱۵
۴۲۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ (سندھی)۔ کراچی۔ ص ۱۵، ۱۶
۴۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۶۹
۴۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز۔ جلد دوم۔ ص ۳۲۹
۴۵۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۶۹
۴۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور ص ۳۴۸
۴۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۷۳
۴۸۔ روز نامہ ڈان کراچی۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء
۴۹۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ (سندھی) کراچی۔ ص ۹۵
۵۰۔ لسٹ آف ایم پی ایز (سندھ)۔ (غیر مطبوعہ)۔ فراہم کردہ سندھ اسمبلی سیکرٹریٹ کراچی۔ ص ۲
۵۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم ۴۷۳
۵۲۔ ایم یو عباسی (مدیر)۔ دی کلرفل پرسنالیٹیز آف سندھ ۱۹۴۴ء۔ کراچی۔ ص ۲۷
۵۳۔ عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور ۳۹۱
۵۴۔ حکومت سندھ۔ سندھ لیجسلیٹو اسمبلی ڈبیٹس۔ اشاریہ اور فہرستیں۔ ۱۹۵۴ء۔ ص ۶
۵۵۔ خالد شمس الحسن۔ سندھس فائٹ فار پاکستان۔ کراچی۔ ص ۲۲۹
۵۶۔ ادارہ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۸۸ء۔ ص ۱۱۸
۵۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ (جلد دوم)۔ ص ۲۵۳
۵۸۔ نسیم امروہوی۔ تاریخ خیر پور۔ خیر پور۔ ص ۱۶۳، ۱۶۴
۵۹۔ محکمہ تعلقات عامہ مغربی پاکستان۔ مغربی پاکستان۔ سالانہ جائزہ ۱۹۵۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۷۰
۶۰۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ (سندھی)۔ کراچی۔ ص ۹۱
۶۱۔ لسٹ آف ایم پی ایز (سندھ) ۱۹۷۷ء۔ (غیر مطبوعہ)۔ فراہم کردہ سندھ اسمبلی سیکرٹریٹ۔
کراچی۔ ص ۲

تھرپارکر کے شاہ

صوبہ سندھ کی سیاست میں سادات کا ہمیشہ سے بڑا مقام رہا ہے۔ یہ سادات سندھ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور انہی کے بزرگوں کے فیضان سے آج سندھ کا گوشہ گوشہ اسلام کے نور سے منور ہے۔ ایک دور تھا کہ الور برہمن آباد کے علاقے پر راجہ دلورائے حکمران تھا۔ اس کی حاکمیت کی بنیاد ظلم و تشدد پر تھی۔ سید علی مکی ۸۱۱ ھ میں مدینہ پاک سے اپنے صاحب زادے اور سو سواروں کے ساتھ سندھ میں ہندو مہاراجہ کی سرکوبی کے لئے آئے تھے۔ سید علی مکیؒ نے سندھ کے باشندوں کو اس راج کے ظلم و ستم سے نجات دلائی ان کے صاحب زادے سید محمد راشدؒ روضی دھنی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ وہ بڑے عالم تھے اور انہیں دین پر مکمل دسترس تھی۔ سید محمد راشدؒ نے سندھ میں اسلام پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ پیر صاحب پاگارہ خاندان کے ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے خود کو اسلام کے لئے مکمل طور وقف کیا تھا۔ سید علی مکیؒ کی اولاد دادو ضلع کے تعلقہ سیہون میں کیرتھر پہاڑی سلسلے کے قریب لکی کے علاقے میں آباد ہوئے تھے۔ اس لئے اس خاندان کو آج بھی لکیاری سادات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لکیاری سادات کے متعلق میر ابوالقاسم کے صاحب زادے یوسف میرک نے ۱۰۴۴ ھ میں شاہجہان کے سندھ کے دورے کے حالات کے متعلق کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں یوسف میرک نے لکھا ہے کہ ٹھٹھہ اور ولی محمد گوٹ لکیاری سادات کے اہم مراکز ہیں۔ ان سادات خاندانوں کی مالی پوزیشن مستحکم ہے ان کے پاس وافر مال اور املاک ہیں۔ جب شیر شاہ سوری سے شکست کے بعد ہمایوں سندھ میں آیا تھا تو شاہ حسین ارغون نے پورے سندھ کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ سندھ کو اجاڑا تھا۔ آبادیاں تہس نہس کر دی تھیں۔ شاہ حسن ارغون کی کوشش تھی کہ ہمایوں کو سندھ میں سکونت نہ مل سکے اور سندھ کا کوئی خاندان ہمایوں کی حمایت نہ کر سکے لیکن اس دور میں لکیاری سادات کے بزرگ طاقتور تھے۔ وہ شاہ حسن ارغون کے اقدامات سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے ہمایوں اور اس کے لشکر کی حوصلہ افزائی کی۔ میر تمکین اپنی یاد

داشتوں میں لکھتے ہیں کہ سیہون میں ڈاکوؤں کے کا قبضہ ہے۔ وہ لوٹ مار کرتے ہیں جس سے سادات خاندانوں کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔ جب میر تمکین کو سیہون کے صوبے دار مقرر کیا گیا تو سادات خاندانوں کے ساتھ بہتر طرز عمل اختیار کیا گیا ان کا مالیانہ معاف کیا گیا ان کے خدمات کا اعتراف کیا گیا انہیں عزت و توقیر اور انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ سوا تین سو سال پہلے سندھ کے لکیاری سادات کے دو خاندان کاٹھیاوار چلے گئے تھے۔ ان میں سے ایک خاندان جونا گڑھ ریاست میں بانٹوا کے قریب بھلگامڑ کے قصبے میں آباد ہوا۔ سندھ کے موجودہ گجراتی بولنے والے صنعت کاروں کی بڑی تعداد خود کو بانٹوا میمن کہلاتی ہے۔ دوسرا لکیاری سادات خاندان گجرات اور کاٹھیاوار کی سرحد پر احمد آباد ضلع کے نزدیک ڈھندوکا میں آباد ہوا۔ ڈھندوکا میں آباد سادات کے بزرگ کا نام سید کامل شاہ تھا۔ سید کامل شاہ نے ۱۰۴۹ھ میں اپنی اولاد کے ساتھ لکی شاہ ہجرت کی تھی۔ بعض لکیاری سادات خاندانوں کے افراد کو کاٹھیاوار اور گجرات میں اہم علاقوں میں فوجی گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ اور انہیں اہم عہدے تفویض کئے گئے تھے۔ اورنگ زیب بادشاہ نے ۱۰۹۸ھ میں اسی سادات خاندان کو ایک ہزار جریب زمین دی تھی۔ سادات خاندان کے مظفر علی شاہ' محمد شاہ' فرخ شیر شاہ کو مغل بادشاہوں نے اعزاز اور گورنری دی تھی۔ احمد آباد میں اور ڈھندوکا میں آج بھی لکیاری سادات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ سندھ میں الحاد و کفر کی فضا کو ختم کرنے کے لئے لکیاری سادات نے شب و روز کوششیں کیں۔ لکی کے مشہور و معروف شاہ صدر الدینؒ کا مزار آج بھی رشد و ہدایت کا مرکز ہے۔ اس مزار سے متصل پہاڑی سلسلے میں ایک ایسا چشمہ ہے جو "قدرتی شفاخانہ" ہے۔ یہ چشمہ لکی چشمہ کہلاتا ہے۔ سندھ اور دوسرے مریض اس چشمے کے پانی سے نہاتے ہیں اور صحت یاب ہوتے ہیں' سندھ میں لکیاری سادات کی قیادت پیر صاحب پاگارہ کے پاس ہے۔ وہ عملی سیاست میں ہیں اور سندھ کی سیاست میں انہیں کلیدی مقام حاصل ہے۔(۱)

مٹیاری سادات کی طرح لکیاری سادات بھی سندھ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی ایک شاخ تھرپار کر میں بھی آباد ہے۔

تھرپار کر میں لکیاری سادات خاندان کی اہم شخصیت خانؒ بہادر حاجی غلام نبی شاہ کی تھی۔ ان کے والد میر موج علی شاہ ایک معمولی زمیں دار تھے مگر میاں غلام نبی شاہ نے بڑی ہشیاری اور لیاقت سے اپنی زمینوں اور اپنے سیاسی اقتدار میں اضافہ کیا۔

۱۹۲۴ء میں وہ ضلعی لوکل بورڈ تھرپار کر کے صدر بنے اور ۱۹۳۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۲۴ء ہی میں ایک اہم انتخابی معرکہ آرائی کے بعد وہ بمبئی کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ اور جب تک سندھ بمبئی سے علاحدہ نہیں ہوا۔ مسلسل اس رکنیت پر فائز رہے۔ ۱۹۳۷ء میں سندھ اسمبلی کے پہلے عام انتخابات میں وہ سندھ اسمبلی کے رکن بنے۔ جی ایم سید

نے ان کی کامیابی کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ سرکار کی مخالفت سے پرہیز کرتے تھے اور ان کا اصول تھا کہ تقریریں عوام کے حق میں اور ووٹ سرکار کے حق میں ہونا چاہئے۔

وہ انگریزوں کے بڑے خیر خواہ تھے اسی باعث انگریزوں نے انہیں خان صاحب اور خان بہادر کے خطابات سے سرفراز کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اقتدار کے ساتھ رہے۔ ایک مرتبہ اسمبلی میں کچھ عرصہ کے لئے انہوں نے خان بہادر اللہ بخش کے مخالفین کے گروپ میں شمولیت اختیار کی مگر بہت جلد انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور وہ واپس اللہ بخش کے ساتھ آ گئے۔ حاجی غلام نبی شاہ نے ۲۹ر جون ۱۹۴۷ء کو وفات پائی۔ (۲)

حاجی غلام نبی شاہ کے صاحبزادے قربان علی شاہ بھی عرصہ دراز سے سیاست کے میدان میں ہیں۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز پاکستان پیپلز پارٹی سے کیا اور ۱۹۷۳ء میں قائم ہونے والی پہلی سینٹ آف پاکستان کے رکن بنے (۳)۔

۱۹۸۸ء میں انہوں نے میر پور خاص سے ایم این اے کا انتخاب جیتا۔ وہ ۱۹۹۰ء میں بھی اس حلقے سے امیدوار تھے اور نتائج کے ابتدائی اعلان کے مطابق ایم کیو ایم کے انیس احمد خان ایڈووکیٹ سے صرف ۵۱۴ ووٹوں سے شکست کھا گئے تھے۔ تاہم بعد میں ان کی غدرداری پر سندھ ہائی کورٹ نے انیس احمد خان کا انتخاب کالعدم قرار دے دیا۔

۱۹۹۳ء کے انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے وہ پیپلز پارٹی کو چھوڑ کر فنکشنل مسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر انتخابی عمل میں شریک ہوئے ان کے مدمقابل امیدواروں میں پیر آفتاب حسین شاہ جیلانی (پیپلز پارٹی) مرزا ادریس بیگ (حق پرست) اور شفیق احمد صدیقی (ایم کیو ایم حقیقی) شامل تھے (۴) یہ معرکہ پیر آفتاب حسین شاہ جیلانی نے تقریباً پانچ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے جیت لیا۔ (۵)

۱۹۹۷ء میں بھی قربان علی شاہ نے اسی نشست سے انتخاب لڑا اس مرتبہ وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدوار تھے۔ مگر وہ اس مرتبہ بھی پیر آفتاب حسین شاہ جیلانی کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۶) ۲۰۰۲ء کے انتخابات سے پہلے قربان علی شاہ نے ایک مرتبہ پھر پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور یوں ایک طویل عرصہ بعد این اے ۲۲۷ میر پور خاص ۲ سے قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوگئے (۷)

خان بہادر حاجی غلام نبی شاہ کے ایک بھتیجے سید غلام حیدر شاہ بھی سیاست کے میدان میں فعال رہے۔ انہوں نے قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد سیاست کے میدان میں قدم جمایا۔

سید غلام حیدر شاہ، جی ایم سید کے معتبر رفقا میں شامل تھے اور جن دنوں جی ایم سید، سندھ مسلم لیگ کی صدارت پر فائز تھے، یہ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں انہی غلام

حیدر شاہ کو ٹکٹ نہ دیے جانے کے مسئلہ پر جی ایم سید کا مسلم لیگ کی ہائی کمان سے اختلاف ہوا تھا اور انہوں نے اپنا الگ سید گروپ بنا کر انتخابات میں حصہ لیا تھا۔

جی ایم سید تو غلام حیدر شاہ کی وجہ سے مسلم لیگ سے دور ہو گئے۔ لیکن غلام حیدر شاہ، اقتدار کی چاہ کے باعث مسلم لیگ سے دور نہ ہو سکے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ دوبارہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور نہ صرف صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے بلکہ صوبائی وزارت کے مزے بھی لوٹتے رہے۔

غلام حیدر شاہ نے اس کے بعد کئی مرتبہ صوبائی انتخابات میں حصہ لیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ (۸)

انہی غلام حیدر شاہ کے صاحبزادے مظفر حسین شاہ ہیں۔ دور طالب علمی میں ان کا شمار کراچی کے نامور مقررین میں ہوتا تھا۔ جاوید جبار، معراج محمد خان، فتحیاب علی خان، علی مختار رضوی، جوہر حسین، شائستہ بیزار اور محسن علی ان کے ہم عصر مقررین میں شامل تھے۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے آزاد لیڈر کے طور پر جامعہ کراچی کے صدارتی انتخاب میں بھی حصہ لیا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے (۹) پھر وہ وکالت کی طرف چلے گئے اور قانون کے پیشہ سے وابستہ ہو کر اپنے جوہر منوانے لگے۔

۱۹۸۱ء میں ان کا نام سیاسی افق پر پہلی مرتبہ اس وقت نمایاں ہوا جب جنرل ضیاء الحق نے مجلس شوریٰ کے ارکان کی نامزدگی کا اعلان کیا۔ سید مظفر حسین شاہ کے نام بھی ان ارکان میں شامل تھا۔ ۱۹۸۴ء میں سندھ کے گورنر جہانداد خان نے انہیں وزیر صنعت کے طور پر اپنی کابینہ میں شامل کر لیا۔

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں سید مظفر حسین شاہ میر غلام مصطفیٰ خان تالپور کو شکست دے کر پی ایس ۵۸ تھر پار کر ۶ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ۱۹۸۶ء میں سندھ اسمبلی کے اسپیکر حسین عبد اللہ ہارون، عدم اعتماد کی ایک تحریک کے ذریعہ اپنے عہدے سے ہٹا دیئے گئے اور ان کی جگہ مظفر حسین شاہ، اسپیکر منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۸ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کا ریلا جہاں سندھ کے بڑے بڑے سیاستدانوں کو بہا کر لے گیا وہاں مظفر حسین شاہ کو بھی اپنی نشست پر شکست سے دوچار ہونا پڑا تاہم اس عرصہ میں انہوں نے اپنے ووٹرز سے مسلسل رابطہ رکھا اور ۱۹۹۰ء میں جب وہ دوبارہ ان کے سامنے گئے تو ان ووٹرز نے انہیں مایوس نہیں کیا۔ (۱۰)

مظفر حسین شاہ ایک مرتبہ پھر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ جام صادق علی نے انہیں اپنی کابینہ میں شامل کر لیا۔ آہستہ آہستہ مظفر حسین شاہ ان کے سب سے بااعتماد وزیر بن گئے۔ (۱۱)

۱۹۹۲ء میں جب جام صادق علی اپنی علالت کے باعث اپنے امور انجام نہیں دے پا رہے تھے تو مظفر حسین شاہ کو محکمہ صوبائی رابطہ کا انچارج بنا دیا گیا۔ یوں مظفر حسین شاہ سندھ کے تمام محکموں کے

ساتھ رابطہ کا کام انجام دینے کے علاوہ کابینہ کی اجلاس کی صدارت بھی کرنے لگے اور انہیں پالیسی فیصلے کرنے کا اختیار بھی دے دیا گیا۔ (۱۲)

یہی وجہ تھی کہ مارچ ۱۹۹۲ء میں جام صادق علی کی وفات کے بعد جب سندھ میں وزیر اعلیٰ کے طور پر مظفر حسین شاہ کا نام سامنے آیا تو کسی کو حیرت نہیں ہوئی۔ مظفر حسین شاہ کو اس عہدے پر بلا مقابلہ منتخب کیا گیا۔ یہ الگ بات کہ اس انتخاب سے پہلے ہی انہوں نے جوڑ توڑ کے ذریعہ اپنے تمام مخالفین کو راستے ہٹا دیا تھا۔ (۱۳) اس واقعے کی تفصیل جتوئی خاندان کے اجمال میں رقم کی گئی ہے۔

۱۹۹۳ء میں جب صدر مملکت غلام اسحٰق خان اور وزیر اعظم نواز شریف کے درمیان اختلافات کا غلغلہ بلند ہوا تو اس بحران میں مظفر حسین شاہ، جن کی وفاداریاں نواز شریف کے ساتھ ہونی چاہئے تھیں، خم ٹھونک کر غلام اسحٰق خان کے ساتھ جا ملے۔ نتیجہ غلام اسحٰق خان نے نہ سندھ اسمبلی کو تڑوایا اور نہ ہی مظفر حسین شاہ کو اپنے عہدے سے ہٹنا پڑا۔

مگر جب نواز شریف کے ساتھ ساتھ غلام اسحٰق خان بھی اپنے عہدے سے رخصت ہوئے تو مظفر حسین شاہ ایک مرتبہ پھر میاں نواز شریف کی حمایت کے محتاج ہوگئے اور انہوں نے پیر صاحب پاگارہ کے اشارے پر میاں صاحب سے اپنے تعلقات از سر نو بحال کر لیے پیر صاحب پاگارہ کی گڈ بکس میں مظفر حسین شاہ کا نام ذوالفقار علی شاہ جاموٹ کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ ان کے پلڑے میں ان کے سابقہ عہدوں کے ساتھ ساتھ عمر کوٹ کے نئے ضلعے اور میر پور خاص کے لئے وڈیروں کے قیام کی خدمت بھی ہے۔ جو بلاشبہ ایک تاریخی کام تھا۔ (۱۴)

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں مظفر حسین شاہ دو حلقوں سے صوبائی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ ایک پی ایس ۵۳ عمر کوٹ اور دوسرا پی ایس ۶۴ سانگھڑ۔ (۱۵)

عمر کوٹ میں انؒ کے مدمقابل پیپلز پارٹی کے ڈویژنل صدر سید علی مردان شاہ تھے جب کہ سانگھڑ میں انہیں پیپلز پارٹی کے نیاز محمد وسان کا سامنا تھا (۱۶) مظفر حسین شاہ عمر کوٹ والی نشست پر تو کامیاب نہ ہو سکے تاہم سانگھڑ والی نشست پر انہوں نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کر لی (۱۷)

۱۹۹۷ء میں سید مظفر حسین شاہ نے پی ایس ۵۳ عمر کوٹ ا سے آزاد امیدوار کی طور پر انتخاب لڑا اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سید علی مردان شاہ اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے اعجاز علی پالی دونوں کو شکست دے کر نہ صرف سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۸) بلکہ صوبائی کابینہ کے رکن بننے میں بھی کامیاب ہوئے۔ (۱۹)

۲۰۰۲ء کے انتخابات میں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ فنکشنل کے ٹکٹ پر دو نشستوں پر انتخاب

لڑا اور پی ایس ۶۹ میر پور خاص ۶ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔ پی ایس ۷۰ میر پور خاص ۷ سے ان کے دیرینہ حریف سید علی مردان شاہ کامیاب ہوئے (۲۰) انتخابات کے بعد وہ سندھ اسمبلی میں اسپیکر کے منصب پر فائز ہوئے (۲۱)

حوالہ جات

۱۔ محمد علی خالد۔ سندھ کے سید خاندانوں کی سیاست۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۹/اپریل ۱۹۸۷ء

۲۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ جلد اول۔ ص ۲۷۱، ۲۷۲

۳۔ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان، ڈائریکٹری آف ممبرز۔ جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۴۲

۴۔ زبیر احمد مجاہد۔ میر طور خاص، پی پی اور مسلم لیگ کے امیدواروں میں کانٹے کا مقابلہ ہوگا۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۸ ستمبر ۱۹۹۳ء

۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۰۹

۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۹۷، ۱۳۲

۷۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۸۱

۸۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ جلد اول۔ ص ۲۷۲، ۲۷۳

۹۔ اویس توحید۔ اے شاہ مائنس کورٹیرز۔ روزنامہ دی نیوز کراچی۔ ۱۳/مئی ۱۹۹۴ء

۱۰۔ محمود شام۔ سید مظفر حسین شاہ سے خصوصی انٹرویو۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۶/مارچ ۱۹۹۲ء

۱۱۔ عبدالحفیظ شیخ۔ نیومین ان ٹاؤن۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۵۔ ۱۱ مارچ ۱۹۹۲ء۔ ص ۵

۱۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹ فروری ۱۹۹۳ء

۱۳۔ نذیر لغاری۔ نئے وزیر اعلیٰ، توقعات اور خدشات۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء

۱۴۔ گل حسن آریسر۔ سید مظفر حسین شاہ کا سیاسی مستقبل۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۴/ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۵۔ سرفراز قائم خانی۔ ضلع سانگھڑ کا انتخابی جائزہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۱۶/ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۶۔ گل حسن آریسر۔ سید مظفر حسین شاہ کا سیاسی مستقبل۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۴/ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۷۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۷۳، ۱۴۷۷

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۸۲

۱۹۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۸۳

۲۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۲۶۰

۲۱۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۸۳

جام

سندھ میں بعض شخصیات کو لوک کرداروں کا درجہ حاصل ہے۔ ان شخصیات نے اپنے دور میں جاگیردارانہ کردار کے باوصف عام لوگوں کے ساتھ اس طرح کا میل میلاپ رکھا کہ وہ لوگوں کی ناگزیر ضرورت بن گئے۔ لاڑکانہ میں وڈیرہ محمد عمرانڑ اور سانگھڑ میں جام کانبھو خان کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ آج بھی جب کسی کی سخاوت، بہادری، جرات مندی، حسن سلوک رواداری، رکھ رکھاؤ اور اچھے طرز عمل کا ذکر ہوتا ہے تو اس کا تقابل جام کانبھو خان سے کیا جاتا ہے۔ آج بھی لوگ جب کسی کی اچھی خوبیوں میں کمی پاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ کونسا کانبھو خان ہے۔ (۱) نواب جام کانبھوخان کے آباؤاجداد جی ایم سید، غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام نبی پٹھان کے بزرگوں کی طرح صدیوں پہلے سندھ میں خانہ بدوشوں کی طرح پہنچے تھے اور پھر یہاں کی تہذیب اور تاریخ کا حصہ بن گئے۔ جام کانبھو خان کے بزرگ متحدہ ہندوستان کی معروف ریاست گجرات سے آئے تھے اور پھر سندھ کی مٹی نے ان کے پاؤں کچھ ایسی مضبوطی سے پکڑے کہ واپس جانا دشوار ہو گیا۔ یہ واقعہ برصغیر پاک و ہند پر انگریزی قبضہ سے ایک صدی پہلے کا ہے۔ کانبھو خان کے بزرگوں نے سلطنت مغلیہ کے عروج و زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور انگریزی استعمار کا نظارہ بھی کیا۔ انہی نواب کانبھو خان کے گھر میں سردیوں کی ایک رات اس سانولے لڑکے نے جنم لیا جس کا نام جام صادق علی رکھا گیا۔

جام صادق علی کو ابتدا ہی سے سیاست بازی اور جوڑتوڑ سے گہرا شغف تھا۔ سن پچاس کی دہائی میں انہوں نے بلدیاتی سیاست سے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز کیا اور پھر کئی دہائیوں تک سندھ کی سیاست پر چھائے رہے (۲)

جام صادق علی نے پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کا حلقہ انتخاب این ڈبلیو ۴۷ سانگھڑ و تھرپارکر تھا۔ اس انتخاب میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اپنے مد مقابل غلام محمد وسان سے شکست کھا گئے۔ (۳)

۱۹۶۵ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر کرہمت کسی اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کا حلقہ نمبر ۷۵ تھا اور ان کے مد مقابل ایس غلام شاہ تھے۔ یہ معرکہ جام صادق علی نے بآسانی جیت لیا اور یوں ان کی پارلیمانی زندگی کا آغاز ہوا۔ (۴)

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کی مہم کے دوران ذوالفقار علی بھٹو پر سانگھڑ میں ایک قاتلانہ حملہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قاتلانہ حملے کے پیچھے جام صادق علی کا ذہن رسا کام کر رہا تھا۔ ان انتخابات میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا اور پیر صاحب پگارا اور ذوالفقار علی بھٹو دونوں کے امیدواروں کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی (۵) تاہم بعد ازاں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور ۱۹۷۱ء میں جب سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو انہیں ممتاز بھٹو کی کابینہ میں آب کاری' محصول اور لوکل گورنمنٹ کا وزیر بنا دیا گیا۔ (۶) دو برس بعد ممتاز بھٹو کی جگہ غلام مصطفیٰ جتوئی سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے۔ جام صادق علی ان کی کابینہ میں بھی موجود تھے۔ اس مرتبہ انہیں لوکل گورنمنٹ' ہاؤسنگ اور ٹاؤن پلاننگ کے قلم دان سونپے گئے۔ (۷)

اس عہدے پر جام صادق علی کے جوہر ایسے کھلے کہ ان کی بازگشت کسی نہ کسی حوالے سے اگلے پندرہ بیس برس تک سنی جاتی رہی۔ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد ضیاء حکومت نے جو قرطاس ابیض جاری کیا تھا' اس میں جام صادق علی پر الزام لگایا گیا تھا۔

"سندھ میں ہاؤسنگ ٹاؤن پلاننگ اور لوکل گورنمنٹ کے وزیر کی حیثیت سے جام صادق علی رہائشی اور تجارتی پلاٹ غیر قانونی طریقوں سے فروخت کرانے اور مفاد عامہ کے لئے مخصوص کئے ہوئے پلاٹ کچھ افراد کو ریزرو قیمت پر الاٹ کرنے میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ یہ بہت بڑی نوازش تھی۔ اس لئے کہ کراچی اور دوسرے بڑے شہروں میں زمین کی مارکیٹ کی قیمت اور ریزرو قیمت میں بڑا فرق تھا۔

ٹربیونل میں اس طرح کی کئی بے قاعدگیاں ثابت ہو گئیں۔ مثال کے طور پر کراچی ڈیویلپمنٹ اتھارٹی کے ایک ملازم نے اپنے بیان میں کہا کہ جام صادق علی نے کراچی کے مختلف علاقوں میں افراد کے نام ایسے بہت سے پلاٹ الاٹ کر دیئے تھے جو قواعد کے مطابق نیلام عام یا قرعہ اندازی کے ذریعے فروخت ہونے چاہئیں تھے۔ اس ملازم نے الاٹمنٹ کی ۱۲۳ درخواستیں ٹربیونل میں پیش کیں جن کی وزیر نے اپنے ہاتھ سے توثیق کی تھی۔

جام صادق علی دوسری نوازشات کے معاملے میں بھی بڑے فراخ دل تھے۔ مقررہ قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہوں نے سندھ ایگریکلچر سپلائز آرگنائزیشن میں ۱۴۵ افراد کا تقرر کیا جبکہ اس ادارے میں ایک بھی اسامی نہیں تھی۔" (۸)

عبدالستار چودھری نے اپنی کتاب "بھٹو کے رنگیلے وزیر" میں لکھا ہے:

"جام صادق ضیاء حکومت کو حروں کے قتل سمیت کئی الزامات میں مطلوب تھے۔ ان کی بدعنوانیوں کو ضیاء اور ان کے پیروکاروں نے خوب خوب اچھالا تھا اور ان عناصر سے سمجھوتہ کئے بغیر وہ "نیک نام" اور نگران وزیر اعلیٰ نہیں بن سکتے تھے۔ جام صادق کی بدعنوانیوں کی تفصیلات ابھی تک لوگوں کو نہ بھولی ہوں گی۔ اپنی بدعنوانیوں کی بناء پر وہ اس قدر مشہور ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ مسٹر بھٹو نے کراچی ایئرپورٹ پر کہا تھا کہ جام صادق! تم کہیں مزار قائداعظم کو الاٹ نہ کر دینا ورنہ قوم میرے پیچھے پڑ جائے گی۔ جام صادق علی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کم از کم ایک تہائی کراچی کو بیچ کر کھا گیا ہے۔ جام صادق نے کے ڈی اے اور کراچی میونسپل کارپوریشن کا بجٹ پانی کی طرح خوبصورت عورتوں پر بہا دیا۔ انہیں اپنے ان کرتوتوں کی سنگینی کا اس قدر احساس تھا کہ مارشل لاء لگتے ہی کسی نہ کسی طرح اسمگلروں کی مدد سے جنہیں اپنے وقت میں انہوں نے خوب نوازا تھا ملک چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ جام صادق بھٹو کا کس قدر بڑا خوشامدی ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک بار کسی ہسپتال کا معائنہ کرتے ہوئے بھٹو نے ایک آلہ جراحی کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ کیا اس سے جام صاحب کی گردن کٹ سکتی ہے؟ جام نے فوراً اپنی گردن آگے کر دی۔

ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وزیر بلدیات کی حیثیت سے اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے پورے کراچی کو بیچ کھایا۔ گندے نالے تک نہ چھوڑے لاکھوں پلاٹ ہزاروں میں اپنے دوستوں یا ملنے والی خواتین کو عطا کر دیئے.... جام صادق نے کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کو دیوالیہ کر دیا تھا۔ کراچی میونسپل کارپوریشن کا سرمایہ اس نے ڈکار لیا تھا اس کی زمینوں کو اس نے اونے پونے بیچ ڈالا۔ کراچی میں کے ڈی اے کے پلاٹوں کا سکینڈل جس میں جام صادق نے کروڑوں روپے کمائے مشہور واقعہ ہے۔" (۹)

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جام صادق علی ملک سے فرار ہو گئے اور انہوں نے برطانیہ میں سیاسی پناہ حاصل کر لی۔ انہوں نے جلاوطنی کے عالم میں تقریباً ۱۱ برس گزارے۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات سے پہلے جام صادق علی کے بھائی جام کرم علی اور بیٹے جام معشوق علی نے پیر پگارا کو پیشکش کی کہ پیپلزپارٹی کے دور حکومت میں جن حروں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ان کے بارے میں میر جام صادق علی کی طرف سے وہ پیر صاحب پگارا کی سربراہی میں قائم ہونے والے جرگہ میں اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے تیار ہیں۔ خود وزیراعظم جونیجو نے برطانیہ کے دورہ کے دوران لندن میں میر جام صادق علی سے ملاقات کی اور اس ملاقات میں طے پایا کہ جرگے کا انعقاد کر کے اس معاملے کو نپٹایا جائے۔ یہ معاملہ اپنی جگہ پر بڑی سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ میر جام صادق علی کا کہنا تھا کہ پیپلزپارٹی کے زمانہ اقتدار میں جن حروں کو موت کے

گھاٹ اتار آگیا ان میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا بلکہ حروں کے قتل کی سازش ان لوگوں نے تیار کی جو سندھ میں اپنے جبر و استبداد کے ذریعے طوائف الملوکی پھیلانا چاہتے تھے تاکہ مسٹر بھٹو اور پیر صاحب پگارا میں براہ راست تصادم کرایا جائے۔ جب مارشل لاء نافذ ہوا تو میر جام صادق علی کو پتہ چلا کہ فوجی حکمران اس بات پر تل گئے ہیں کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو راستے سے ہٹا دیا جائے اور اس کے لئے وہ سابق وزیر اعظم کے خلاف حروں کے قتل کا مقدمہ قائم کر کے انہیں سزا دلوانا چاہتے ہیں۔ میر جام صادق علی کے بقول انہوں نے محسوس کیا کہ حروں کے مقدمہ قتل میں انہیں وعدہ معاف گواہ بنایا جائے گا اور اگر انہوں نے نئے حکمرانوں کی خواہشات کی تکمیل کی تو پھر سندھ میں مجموعی طور پر ان کے خلاف نفرت کا ایسا طوفان اٹھے گا جس میں ان کی آئندہ نسلیں بھی محفوظ نہیں رہ سکیں گی اس خوف کے پیش نظر وہ ملک سے ہی فرار ہو گئے اور انہوں نے لندن میں سیاسی پناہ حاصل کر لی۔ محمد خاں جونیجو نے لندن میں میر جام صادق علی سے ملاقات کی اور انہیں اس امر کا یقین دلایا کہ اگر وہ وطن واپس لوٹ آئیں تو اس معاملے میں ان کی ہمنوائی کی جائے گی۔ میر معشوق علی تو پیپلز پارٹی سے سیاسی وابستگی کی بنا پر پیر صاحب پگاڑو سے دور رہے مگر ان کے بھائی اور چچا اکثر و بیشتر پیر صاحب سے ملاقاتیں کرتے رہے' یہاں تک کہ ۱۹۸۷ء کے بلدیاتی انتخابات میں انہوں نے پیر صاحب کو اپنے جن امیدواروں کو کامیاب بنانے کے بارے میں گفتگو کی پیر صاحب نے بھی انہیں ناکام بنانے کے لئے کوئی مداخلت نہ کی۔ مگر جب مسٹر محمد خاں جونیجو نے میر جام صادق علی خاں کی وطن واپسی کے بارے میں پیر صاحب کو ان کے موقف سے آگاہ کیا تو پیر پگارا نے کہا کہ میر جام صادق علی سے کسی قسم کی صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خود جام صادق علی خاں نے پیر صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا۔ ان دنوں پیر صاحب لاہور میں مقیم تھے۔ اس ٹیلی فون پر بھی پیر صاحب نے کہا کہ آپ وطن آ جائیں مگر آپ کو وہ لوگ معاف نہیں کریں گے جن کا جانی نقصان ہوا ہے۔ پیر صاحب کے اس جواب کے بعد میر جام صادق علی نے اپنے اہل خانہ پر واضح کر دیا کہ انتخابات میں پوری قوت کا مظاہرہ کیا جائے اور اگر ہم انتخابات میں جیت گئے تو پیر صاحب پگارا بھی نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس گروپ نے پوری طاقت کا مظاہرہ کیا اور پیپلز پارٹی کی مدد سے سانگھڑ اور خیر پور میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ (۱۰)

۱۹۸۸ء میں جب پیپلز پارٹی دوبارہ برسر اقتدار آئی تو ۱۹۸۹ء میں جام صادق علی وطن واپس لوٹ آئے۔ وطن واپسی کے بعد وہ کسی "شایان شان" عہدے کے متمنی تھے مگر ان کی یہ مرادیں بر نہ آسکیں۔ اور انہیں محترمہ بے نظیر بھٹو کے مشیر برائے صوبائی رابطہ پر اکتفا کرنی پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ جام صادق علی کو کوئی بہتر عہدہ اس لئے نہ مل سکا کہ آئی ایس آئی نے بے نظیر بھٹو سے کہا تھا کہ جام صادق علی کو کوئی عہدہ نہ دیا جائے کیونکہ وہ بھارتی ایجنٹ ہیں۔ (۱۱)

۶ر اگست ۱۹۹۰ء کو جب بے نظیر حکومت کا خاتمہ ہوا تو انہی جام صادق علی کو صوبہ سندھ کا نگراں وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ یہاں سے جام صادق علی کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا جو ان کی وفات تک جاری رہا۔

وزیر اعلیٰ بنتے ہی جام صادق علی نے پیپلز پارٹی کو اپنے انتقام کا ہدف بنا لیا۔ انہوں نے پارٹی کے متعدد رہنماؤں کو گرفتار کیا۔ پھر اکتوبر ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں بھی انہوں نے دھاندلیوں کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے وہ نہ صرف خود ایم پی اے منتخب ہوئے بلکہ ان کے صاحبزادے جام معشوق علی، نگراں وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی اور سابق وزیر اعظم محمد خاں جونیجو سندھ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دھاندلی کا اعتراف بعد ازاں انہوں نے خود بھی کیا۔ جناب احمد سلیم نے اپنی کتاب "سیاستدانوں کی جبری نا اہلیاں" میں تحریر کیا۔ "سندھ کے وزیر اعلیٰ جام صادق علی کے اس بیان نے بھی بہت سے قیاسات کو جنم دیا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو صدر مملکت کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے انہیں لاڑکانہ سے ہرانے کی ہدایت نہیں کہ ورنہ ایسی ہدایت مل جاتی تو سابق وزیر اعظم اپنے آبائی حلقے سے بھی نہ جیت سکتی تھیں"۔ (۱۲)

اکتوبر ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی، اکثریتی پارٹی کے طور پر ابھری تھی۔ مگر یہ جام صادق علی ہی کا کمال تھا کہ وہ نہ صرف وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے بلکہ کبھی کسی کو ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کی بھی جرات نہیں ہوئی۔ غالباً وہ واحد وزیر اعلیٰ تھے جن کی کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی، کوئی سیاسی گروپ نہیں تھا وہ سندھ اسمبلی میں آزاد رکن کے طور پر منتخب ہوئے تھے۔ آزاد ارکان میں بھی کوئی ان کا ہم خیال نہیں تھا بہت سے آزاد ارکان اسمبلی کے بارے میں آخر وقت تک یہی سمجھا جا رہا تھا کہ وہ جام صادق علی کا ساتھ دیں گے بالخصوص اسمٰعیل راہو اور امیر حیدر شاہ کے خاندانی پس منظر کی وجہ سے یہ اندازے لگائے جا رہے تھے کہ وہ نہ صرف سرکاری کشتی میں سوار نہیں ہوں گے بلکہ کسی بھی جماعت کی حکومت میں شامل ہونے کی بجائے حزب اختلاف کی بنچوں پر بیٹھنا پسند کریں گے۔ مگر وہ دونوں ارکان نہ صرف سرکاری بنچوں پر بیٹھے بلکہ اسمٰعیل راہو نے تو جام ایم کیو ایم مخلوط کابینہ میں وزارت کا حلف بھی اٹھایا اور پوری استقامت کے ساتھ جام صادق علی کا ساتھ دیا۔

کہا جاتا ہے جام صادق علی دوستوں کے دوست تھے اور دشمنوں کے دشمن۔ ان کا یہی وصف تھا، جس نے انہیں عمر کے آخری لمحے تک بر سر اقتدار رکھا۔ جتنے دن وہ وزارت اعلیٰ پر فائز رہے انہیں پیر پگارا، ہالا کے مخدوم خاندان، شکارپور کے سومرو خاندان، سابق وزرائے اعظم محمد خان جونیجو اور غلام مصطفیٰ جتوئی، سندھ کے سابق وزرائے اعلیٰ سید غوث شاہ اور اختر علی جی قاضی، سندھ کے شہری علاقوں کی سب سے بڑی پارلیمانی اور سیاسی قوت ایم کیو ایم اور سندھ

اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے لگ بھگ اٹھارہ "لوٹوں" کی بھرپور حمایت حاصل رہی- وہ آزاد رکن منتخب ہوئے مگر سیاسی سفر میں تنہا نہیں رہے- انہوں نے ایسے لوگوں کا تعاون حاصل کیا جن کے تعاون سے وہ سندھ اسمبلی کے سب سے بڑے پارلیمانی گروپ کے لیڈر منتخب ہو گئے- اسی لئے انہیں سندھ اسمبلی میں کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا- انہیں موت سے خطرہ درپیش تھا اور بھلا موت سے کس کو رستگاری ہے- جام صاحب اس دار فانی سے رخصت تو ہو گئے مگر وہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کے پہلے وزیراعلیٰ تھے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو وہ برسراقتدار تھے- (۱۳)

نواز شریف دور حکومت کے حوالے سے شائع ہونے والی کتاب "ایجنسیوں کی حکومت" میں اظہر سہیل نے جام صادق علی کی شخصیت کے حوالے سے لکھا

"اس دور میں ملک کی سیاسی لحاظ سے دو انتہائی اہم شخصیات نے اپنی جان آفریں کے سپرد کی- ایک جام صادق علی اور دوسرے محمد خان جونیجو- میاں نواز شریف کے ساتھ ان دونوں کا معاملہ بہت دلچسپ تھا- وہ ان دونوں سے شدید نفرت کرنے کے باوجود ان کے احترام پر مجبور تھے اور ان دونوں کا احوال بھی تقریباً یہی تھا- مگر اتنے فرق کے ساتھ کہ جام صاحب میاں صاحب کے سامنے بھی چٹکی لے جاتے' جبکہ محمد خان جونیجو منہ پکا کر کے بیٹھے رہتے اور زیادہ سے زیادہ یہی کہتے کہ "اچھا سائیں دیکھتے ہیں"-

جام صادق علی مرحوم کے بارے میں اگر صرف ایک جملہ لکھنا مقصود ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ "وہ ۱۹۹۲ء کے صحیح سیاستدان تھے"- ہمارے ہاں سیاست کا مطلب چونکہ سچائی سے گریز اور چال بازی سمجھا جاتا ہے جس میں ہر آنے والے دن کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے اس لئے جام صاحب کو موجودہ عہد کا مثالی سیاستدان قرار دیا جا سکتا ہے- شخصیات اور اداروں کے بارے میں ان کی اپنی ایک قطعی رائے ہوا کرتی تھی اور یہ رائے وہ کسی حادثہ کی بناء پر نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر استوار کرتے اور پھر موقع پڑنے پر اس کا اعلان و اظہار اس خوبصورتی سے کرتے کہ سننے والے اش اش کر اٹھتے- مجھے ان کے ہمراہ سفر و حضر میں بہت سا وقت گزارنے کا موقع ملا- ان کے مشہور زمانہ سفر عمرہ میں بھی ان کے ہمراہ تھا اور اس سفر کے دوران ان کی شخصیت کے ایسے ایسے پہلو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا کہ عام حالات میں شاید وباید ہی اس کی نوبت آتی-

انہیں اپنی بات کہنے اور منوانے کا ڈھنگ آتا تھا اور اس بات سے بھی کامل طور پر آگاہ تھے کہ کون سی بات کس کے سامنے کس پیرائے میں کہی جا سکتی ہے- مثال کے طور پر ان کے چار مکالمے پیش کئے جا سکتے ہیں' ایک صدر مملکت غلام اسحاق خان کے ساتھ' دوسرا پیر صاحب پگارا کے ساتھ' تیسرا دبئی کے ایک بہت بڑے کاروباری اور غریر سنٹر کے مالک شیخ غریر کے ساتھ اور چوتھا میاں نواز شریف کے ساتھ-

صدر غلام اسحاق خان کے بارے میں یہ بات کوئی راز نہیں کہ وہ ایک "میٹر آف فیکٹ" آدمی ہیں، جن کے سامنے کوئی بھی شخص فالتو بات نہیں کرپاتا۔ وہ صرف کام کی بات کہتے اور کام ہی کی بات سنتے ہیں، مرحوم جام صادق علی سے ان کا تعلق کم و بیش ایک ربع صدی کی وابستگی پر مشتمل تھا اور اس تعلق کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جام صاحب بے نظیر بھٹو کی حکومت میں مشیر ہونے کے باوجود صدر غلام اسحاق خاں کے بھی خصوصی معتمد رہے۔ اور ٦ر اگست ١٩٩٠ء کی شام جب غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیراعظم کا حلف اٹھانے جا رہے تھے اس موقع پر صرف ایک سیاستدان ان کے ہمراہ تھا اور وہ تھے جام صادق علی۔ سیاست میں کم و بیش چالیس برس گزارنے کے بعد انہیں انسانوں کی شناخت اور ان کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنے کا ایک بے پناہ ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔ میاں نواز شریف وزیراعظم بنے تو جام صادق علی نے ابتدائی دو ماہ ہی کے عرصہ میں ان کے متعلق قطعی رائے قائم کرلی اور ایک موقع پر کراچی کے گورنر ہاؤس میں صدر مملکت سے کھل کر کہا کہ "جناب میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے منافق اور دوغلے لوگ دیکھے ہیں، مگر میاں نواز شریف سے زیادہ خطرناک آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے اس وزیراعظم سے ہوشیار رہئے گا۔ یہ شخص کسی بھی موقع پر آپ سے ایسی آنکھیں پھیرے گا کہ آپ دیکھتے رہ جائیں گے"۔

اس پر صدر غلام اسحاق خان نے برافروختہ ہو کر جواب دیا۔ "جام صاحب آپ ایک طویل عرصہ تک ملک سے باہر رہے ہیں، آپ میاں صاحب کو اچھی طرح نہیں جانتے مجھے یقین ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی رائے تبدیل ہو جائے گی"۔ اس پر جام صاحب نے صرف اتنا جواب دیا "جناب اللہ کرے، میری رائے غلط ہو مگر آپ پھر بھی احتیاط ضرور کیجئے گا"۔ اس کے بعد بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر جام صاحب اپنے نجی دوستوں کے سامنے اس رائے کا تکرار کر کے اس کی اصابت اور صلابت پر اصرار کرتے رہے، جہاں تک صدر غلام اسحاق خان کا تعلق ہے، وہ چونکہ صرف کام کی بات کہنے اور کام ہی کی بات سننے کے عادی ہیں، اس لئے جام صاحبؒ نے ان کے سامنے یہ بات کبھی نہیں دہرائی تاہم ایک مرتبہ صدر کے سامنے انہوں نے انتہائی لطیف انداز میں خود ان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ضرور کر دیا، ہوا یوں کہ ایوان صدر میں کسی موضوع پر جام صاحب کی رائے سنتے سنتے صدر مملکت مسکرا دیئے۔ جام صاحب نے انہیں مسکراتے دیکھا تو اچانک خاموش ہو کر تشویشناک انداز میں صدر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا، چندے توقف کے بعد صدر نے استفسار کیا کہ "جام صاحب آپ خاموش کیوں ہو گئے ہیں؟" جام صاحب نے ڈرے ہوئے لہجہ میں کہا "جناب کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"۔ صدر نے حیرت سے استفسار کیا۔ "آپ کو میری کس بات سے ناراضی کا شک گزرا۔"

"دراصل آپ آج میری بات سنتے ہوئے مسکرا دیئے تو مجھے شک گزرا کہ ہو نہ ہو آپ

ناراض ہو گئے ہیں، ورنہ عام حالات میں تو کسی نے بھی آپ کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا"۔ جام صاحب نے ہکلاتے ہوئے تمسخر کے انداز میں جواب دیا۔ جس پر صدر پہلے تو کھلکھلا کر ہنسے پھر گھورتے ہوئے کہا "جام صاحب آپ میرے ساتھ مذاق مت کیا کریں"۔

۱۹۹۰ء کے انتخابات کے بعد جام صادق علی عملاً" ایک تنہا آدمی تھے۔ سندھ اسمبلی میں ان کا کوئی گروپ بھی نہیں تھا مگر انہوں نے اپنے روایتی جوڑ توڑ کے ذریعہ صوبہ میں حکومت قائم کر لی۔ اس جوڑ توڑ کے دوران ایک موقع پر انہوں نے کراچی میں پیر صاحب پگارا کی اقامت گاہ کنگری ہاؤس میں پیر صاحب کو بتایا کہ انہوں نے سندھ کے ایک معروف روحانی پیشوا سے تعاون کی درخواست کی ہے۔ اس موقع پر انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "سائیں آج میں...... کی اقامت گاہ پر گیا اور ان سے ہاتھ باندھ کر درخواست کی کہ میرا ساتھ دیں، میں نے ان کے گھٹنوں کو بھی ہاتھ لگایا اور منت میں بھی کوئی کمی روا نہیں رکھی۔ امید ہے کہ وہ اپنے دونوں ووٹ میرے حق میں استعمال کریں گے"۔

"مگر صادق علی! اگر اس کے باوجود انہوں نے تمہارا ساتھ نہ دیا تو کیا ہو گا؟" پیر صاحب پگارا نے استفسار کیا۔

"تو جناب پھر میں ان کی ..... گا اور ووٹ لے لوں گا کیونکہ ووٹ تو مجھے بہر حال لینا ہی ہیں"۔ جام صاحب نے رسانیت سے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو پیر صاحب نے اس موقع پر موجود اپنے ایک دوست سے کہا "تم نے دیکھا، جام صادق علی، کس صفائی سے مجھے بھی دھمکی دے گیا ہے"۔

دبئی کا غریر سنٹر دنیا کے چند بڑے تجارتی مراکز میں سے ایک ہے۔ لندن کے معروف شاپنگ سنٹر "ہیرڈرز" کی طرح غریر سنٹر والوں کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ وہ سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک ہر چیز فراہم کر سکتے ہیں۔ اس سنٹر کے مالک شیخ غریر سے جام صادق علی کی دانت کاٹے کی دوستی تھی۔ اپنے مشہور سفر عمرہ کے دوران انہوں نے چندرے دبئی میں قیام کیا تو وہاں شیخ غریر سے بھی ملنے گئے۔ اس موقع پر انہوں نے خاص طور سے غریر سنٹر کے کاروں والے شو روم پر توجہ صرف کی اور وہاں ایک لنکن گاڑی پسند کر کے اس کی بہت تعریف کی۔ شیخ غریر نے جام صاحب کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے ازراہ محبت کہا "برادر، یہ گاڑی تمہاری ہوئی"۔ جام صاحب نے عاجزی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "دیکھو شیخ، میرا باپ تمہارے مقابلے میں بہت غریب اور درویش صفت آدمی تھا وہ تمہاری طرح دوستوں کو گاڑیوں کے تحفے تو نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس زمانہ میں ہمارے صحرائی علاقہ میں گاڑی کی بجائے اونٹ کی حکمرانی تھی۔ تب میرے والد کی روش یہ تھی کہ وہ اپنے مہمانوں کو اونٹ دیا کرتے۔ مگر یہ تحفہ تمہاری طرح نہیں دیا جاتا تھا کہ مہمان آیا تو اونٹ اس کے حوالے کر کے چلتا کر دیا۔ ہماری رسم یہ تھی کہ اونٹ نہ صرف

مہمان کے گھر پہنچاتے بلکہ ساتھ ایک ماہ کا راتب بھی بھجواتے تاکہ نئے مالک کو اونٹ کی عادات اور خوراک کا اندازہ ہو سکے۔ ادھر تم ہو کہ یہاں پردیس میں گاڑی میرے حوالے کر رہے ہو۔ تحفہ دینا ہے تو اسے میرے گھر پہنچاؤ۔ یہاں میں اسے کہاں لئے لئے پھروں گا"۔ شیخ غریر نے جام صاحب کی بات سنی تو قہقہہ لگاتے ہوئے' ان کے گالوں پر تین بوسے دیئے اور کہا' "برادر کراچی پہنچنے سے پہلے گاڑی تمہارے گھر پہنچ چکی ہو گی"۔ اور واقعی انہوں نے یہ گاڑی جام صاحب سے پہلے کراچی بھجوا دی۔ غریر سنٹر سے باہر نکلے تو جام صاحب نے واپس آتے ہوئے اپنے رفیق سفر الٰہی بخش سومرو سے کہا' "جب شیخ میرے بوسے لے رہا تھا تو میں نے دل میں سوچا' بھائی میاں تو چاہے میرے تین بوسے لینے کی بجائے میرے منہ پر تین مرتبہ تھوک لے مگر گاڑی کی ڈیوٹی بہرحال مجھی کو ادا کرنا پڑے گی' بیس لاکھ روپے کی گاڑی پر پاکستان میں دو سو فیصد ڈیوٹی میں بھلا کہاں سے ادا کروں گا"۔

دبئی ہی کے ہوٹل حیات ریجنسی میں قیام کے دوران ایک صبح جام صادق علی کو وزیراعظم میاں نواز شریف کا فون موصول ہوا۔ ان دنوں پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی کے نمائندوں پر مشتمل ایک مشترکہ تحقیقاتی کمیٹی کے قیام کی بات چل رہی تھی وزیراعظم اس کمیٹی اپنے خصوصی معاون چودھری نثار علی' سید غوث علی شاہ اور چودھری شجاعت حسین کو شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس موقع پر جام صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ان تینوں وزراء کی قدر مشترک پر "پلے بیک سنگر" کے حوالے سے جو تبصرہ کیا وہ تو خیر اپنی جگہ' مگر امر واقعہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس کمیٹی میں وزیراعظم کے نامزدگان کی بجائے اپنی پسند کے دو اراکین' عبدالستار لالیکا اور الٰہی بخش سومرو کو شامل کرنے پر نہ صرف اصرار کیا بلکہ اپنی بات تسلیم بھی کروالی۔ (۱۴)

جام صادق علی کے صاحبزادے جام معشوق علی تو ان کی زندگی ہی میں ایم این اے اور وفاقی وزیر بن چکے تھے۔ جام عاشق علی' ان کی وفات کے بعد سیاست میں آئے۔

جام معشوق علی پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء میں پیپلز پارٹی کے امیدوار کے طور پر سامنے آئے تھے اور ۲۷۰۶۱ ووٹ لے کر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے بعد ازاں وہ سندھ کی کابینہ میں بھی شامل ہوئے۔ انہیں صنعت اور معدنی ترقی کا قلمدان دیا گیا تھا۔

جام معشوق علی دوسری مرتبہ ۱۹۹۰ء میں این اے ۱۸۱ سانگھڑ ا سے پی ڈی اے کے شاہ نواز جونیجو کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۱۵) ان دنوں ان کے والد سندھ کے نگراں وزیراعلیٰ تھے اس لئے ان کی یہ کامیابی شکوک و شبہات سے بھرپور سمجھی جاتی ہے۔ یہی حال ان کے بھائی جام عاشق علی کی کامیابی کا ہے۔ وہ اپنے والد جام صادق علی کی وفات سے خالی ہونے والی نشست پر منعقد ہونے والے ضمنی انتخابات میں شاہ نواز جونیجو ہی کو شکست دے کر پی ایس ۶۷ سانگھڑ ۴ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۱۶) اس وقت

صوبہ میں ان کے والد کا حامی گروپ برسر اقتدار تھا۔

جام معشوق علی نواز شریف کی کابینہ میں پیداوار کے وزیر مملکت کے منصب پر فائز رہے۔ (۱۷)
جب ۱۸/اپریل ۱۹۹۳ء کو نواز شریف حکومت برخواست کی گئی تو جام معشوق میر شیخ شیر مزاری کی نگراں کابینہ میں بھی موجود تھے۔ اس مرتبہ انہیں مواصلات کا وزیر مملکت بنایا گیا تھا۔ (۱۸)

جام معشوق علی نے بعد ازاں پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت کے لئے بھی سلسلہ جنبانی کی۔ مگر محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان کی کوششوں کو بڑی حقارت سے مسترد کر دیا۔ وہ ان کے مرحوم والد کے ان مظالم کو بھلا کیسے بھلا سکتی تھیں۔ جو انہوں نے سندھ میں اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے پیپلز پارٹی کے کارکنوں پر روا رکھے تھے۔

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں جام معشوق علی نے ایک مرتبہ پھر این اے ۱۸۱ سانگھڑ ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا انہیں فنکشنل مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل تھا۔ انہوں نے یہ معرکہ ۵۰۵۳۱ ووٹ حاصل کر کے بآسانی سر کر لیا جب کہ ان کے قریبی حریف شاہنواز جونیجو ۴۵۱۲۱ ووٹ حاصل کر سکے (۱۹) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا اور بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ ان انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ (ن) اور پاکستان مسلم لیگ (ف) نے ان کے مقابلے میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا (۲۰)

جن دنوں جام صادق علی لندن میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے انہیں دنوں جام صاحب کے چچا زاد بھائی جام کرم علی (بعضوں کے نزدیک) جنرل ضیاء الحق کی آشیرباد سے سینیٹر بن گئے جبکہ بعض وقائع نگاروں کا کہنا تھا کہ جام کرم علی کا سینیٹر بننا میر صاحب پگارا کا مرہون منت تھا (۲۱) جام کرم علی اپنے اس عہدے پر مارچ ۱۹۹۱ء تک فائز رہے (۲۲)

حوالہ جات

۱۔ نذیر لغاری۔ ''وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب ہم نے چکا دیا''۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۸/مارچ ۱۹۹۲ء

۲۔ تنویر قیصر شاہد۔ جام صادق علی' سندھ کا غلام محمد۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور۔ مارچ ۱۹۹۲ء۔ ص ۲۴

۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳۰/اپریل ۱۹۶۲ء

۴۔ ایضاً۔ ۲۳/مارچ ۱۹۶۵ء

۵۔ محمد حنیف۔ پروفائل' جام صادق علی۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۰۔ ۲۱ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۵

۶۔ عبدالکریم خالد۔ عوامی دور۔ کراچی۔ ص ۱۳' ۱۴' ۱۰۱

۷۔ دی سندھ گورنمنٹ گزٹ۔ کراچی۔ ۱۴/جنوری ۱۹۷۴ء۔ ص ۵۱

۸۔ حکومت پاکستان۔ قرطاس ابیض۔ بھٹو کا دور حکومت۔ جلد اول۔ بھٹو۔ اہل خاندان۔ شرکاء کار۔ اسلام آباد۔ جنوری ۱۹۷۹ء۔ ص ۱۰۰

۹۔ عبدالستار چودھری۔ بھٹو کے رنگیلے وزیر۔ لاہور۔ ص ۴۵ تا ۴۷

۱۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۲۹ '۳۳۰

۱۱۔ قیوم نظامی۔ بے نظیر حکومت کے ۲۰ ماہ۔ لاہور۔ ص ۸۸

۱۲۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نا اہلیاں۔ لاہور۔ ص ۱۷۶

۱۳۔ نذیر لغاری۔ ''وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب ہم نے چکا دیا''۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۸/ مارچ ۱۹۹۲ء

۱۴۔ اظہر سہیل۔ ایجنسیوں کی حکومت۔ لاہور۔ ص ۹۳ تا ۹۷

۱۵۔ محمد ادریس بادانی۔ شاہنواز جونیجو بمقابلہ جام معشوق۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۵/ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۶۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۸/مئی ۱۹۹۲ء۔ ص ۵۳۹ '۵۴۰

۱۷۔ موسیٰ خان جلال زئی۔ کون کون ہے اور کیا کیا ہے۔ لاہور۔ ص ۴۹۲

۱۸۔ محمود غزنوی۔ قبضہ گروپ کی کابینہ۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۲۰/مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵

۱۹۔ گزٹ آف پاکستان۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۱۲

۲۰۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء۔ (حصہ اول)۔ ص ۲۰۱

۲۱۔ تنویر قیصر شاہد۔ جام صادق علی' سندھ کا غلام محمد۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور۔ مارچ ۱۹۹۲ء۔ ص ۳۰

۲۲۔ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائرکٹری آف ممبرز ۱۹۹۱ء۔ ص ۸۱

جاموٹ

سندھ میں آباد سمہ قبائل کے سرداروں میں سے کچھ سردار اپنے نام کے ساتھ جام کا سابقہ اور کچھ سادات خاندان اپنے نام کے ساتھ جاموٹ کا لاحقہ لگاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک خاندان ٹنڈو میں آباد سیدوں کا ہے جو اپنے نام کے ساتھ جاموٹ کا لاحقہ کچھ یوں لگاتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے خاندان یا قبیلے کا نام ہے۔

ٹیاری حیدر آباد سے ۲۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں سیدوں کا موسیٰ پوتا قبیلہ آباد ہے۔ جس کے مورث اعلیٰ سخی ہاشم شاہ ٹیاری تھے۔ (۱)

اس قبیلے کے ایک بزرگ میاں جیندل شاہ تھے۔ وہ میر نصیر علی خان تالپور کے زمانے میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ میاں جیندل شاہ کے فرزند محمد علی شاہ تھے جن کے دو بیٹے تھے۔ سید میاں جیندل شاہ اور سید میاں حسن علی شاہ۔

سید میاں جیندل شاہ چونکہ اپنے والد کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے اس لئے والد کی وفات کے بعد موسیٰ پوتا قبیلے کی سرداری انہی کو منتقل ہوئی۔ وہ کئی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی مہمان نوازی پورے سندھ میں مشہور تھی اور اسی باعث ان کے حاسدوں کی بھی کمی نہ تھی۔

سید میاں جیندل شاہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے ان کی وراثت ان کے چھوٹے بھائی سید میاں حسن علی شاہ کو منتقل ہوگئی۔ انہوں نے سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد انگریزوں کی بڑی مدد کی اور انگریزوں نے بھی انہیں انعام و اکرام سے نوازنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا، انہیں متعدد پروانے' آفرین نامے، لنگیاں اور تلواریں تو عطا ہوئی ہی تھیں۔ اس کے علاوہ انہیں اعزازی مجسٹریٹ اور خان بہادر کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

سید میاں حسن علی کے پانچ فرزند ہوئے۔ سید حاجی امام علی شاہ' سید محمد علی شاہ عرف سید اللہ بچائیو شاہ' سید حاجی جیندل شاہ' سید محمد انور شاہ اور سید حاجی فضل علی شاہ۔ سید میاں حسن نے ۱۳ مارچ ۱۹۲۵ء کو وفات پائی۔ ان کے سب سے بڑے صاحبزادے سید حاجی امام علی شاہ چونکہ اپنے والد کی

زندگی ہی میں ۵ اپریل ۱۹۲۴ء کو وفات پا چکے تھے۔ اس لئے ان کا ورثہ ان کے دوسرے صاحبزادے سید محمد علی شاہ عرف سید اللہ بچائیو شاہ کو منتقل ہوا۔

سید محمد علی شاہ ۱۹ ستمبر ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ والد کی وفات کے وقت ان کی عمر فقط ۱۸ برس تھی۔ (۲)

سید محمد علی شاہ اس خاندان کے پہلے فرد تھے جنہوں نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ ضلعی لوکل بورڈ حیدر آباد کے ممبر اور صدر رہے۔ وہ پیر بقادار شاہ، قاضی اکبر، غلام محمد وسان اور جی ایم سید کے ہم عصر سیاستدان تھے۔ ان کے پیر پگارا سے بھی گہرے مراسم تھے اور انہی مراسم کی وجہ سے وہ ۱۹۵۳ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ (۳) اور ون یونٹ سے قبل سندھ کی آخری صوبائی اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ (۴)

محمد علی شاہ جاموٹ نے ۱۲ نومبر ۱۹۶۱ء کو وفات پائی۔ ان کے بعد ان کی وراثت ان کے بڑے بیٹے سید ذوالفقار علی شاہ جاموٹ نے سنبھالی۔ (۵)

سید ذوالفقار علی شاہ جاموٹ ۱۵ اپریل ۱۹۴۱ء کو ٹمیاری میں پیدا ہوئے۔ وہ ٹنڈو جام کے زرعی کالج (اب زرعی یونیورسٹی) کے فارغ التحصیل ہیں (۶) ۱۹۷۳ء میں وہ یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ کے ٹکٹ پر پاکستان کی پہلی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے (۷) ۱۹۸۵ء میں دوسری مرتبہ اور ۱۹۹۱ء میں تیسری مرتبہ سینٹ کے رکن منتخب ہوئے (۸) وہ غالباً پہلی شخصیت تھے جو مسلسل تین میقات، سینٹ کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ذوالفقار علی جاموٹ، سینٹ میں غلام اسحٰق خان کے حامی گروپ میں شامل تھے یہی وجہ تھی کہ جب اپریل ۱۹۹۳ء میں غلام اسحاق خان نے قومی اسمبلی اور کابینہ کو توڑ کر نگراں کابینہ تشکیل دی تو اس میں ذوالفقار علی جاموٹ بطور وزیر بہبود آبادی شامل تھے۔ (۹)

۱۹۹۷ء میں تشکیل پانے والی سینٹ میں ذوالفقار علی جاموٹ جگہ نہ پا سکے۔ یہی کچھ ۲۰۰۲ء میں ہوا۔ ۲۰۰۵ء میں انہوں نے ٹنڈو محمد خان سے ضلعی ناظم کا انتخاب لڑا۔ لیکن وہ خوشحال پاکستان پینل کے میر عنایت علی تالپور سے شکست کھا گئے (۱۰) تاہم اسی انتخاب میں ان کے صاحبزادے محمد علی شاہ جاموٹ ٹمیاری کے بلامقابلہ ناظم منتخب ہو گئے۔ انہوں نے یہ انتخاب جاموٹ اتحاد پینل سے لڑا تھا (۱۱)

ذوالفقار علی شاہ جاموٹ کے چھوٹے بھائی شفقت علی جاموٹ ۱۹۸۵ء میں پی ایس ۳۸ حیدر آباد ۲ سے بلا مقابلہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۱۲) بعد ازاں وہ غوث علی شاہ کابینہ میں وزیر بھی رہے۔ ان کے پاس تعلیم، ثقافت اور کھیل کے قلمدان تھے۔ (۱۳) ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پی ایس ۳۵ سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا مگر پاکستان پیپلز پارٹی کے مخدوم امین فہیم سے بُری طرح شکست کھا گئے۔ (۱۴)

ذوالفقار علی شاہ جاموٹ اور شفقت علی شاہ جاموٹ کے چچا زاد بھائی اور انور شاہ جاموٹ کے

صاحبزادے امداد علی شاہ جاموٹ بھی ایک مختصر مدت کے لئے سندھ اسمبلی کے رکن رہے۔ وہ ۱۹۷۰ء میں حیدر آباد سے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر بلا مقابلہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے مگر اس سے قبل کہ وہ اپنی رکنیت کا حلف اٹھاتے، وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی نشست پر منعقدہ ضمنی انتخاب میں ان کے امیر علی شاہ جاموٹ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۶) وہ ۱۹۸۸ء میں بھی صوبائی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ مگر چونکہ اس مرتبہ پیپلز پارٹی کی حمایت ان کی بجائے مخدوم رفیق الزماں کو حاصل تھی اس لیے امیر علی شاہ جاموٹ ۱۰۲۱۷ ووٹ حاصل کرنے کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے (۱۷) ۱۹۹۰ء میں بھی انہیں پیپلز پارٹی کا ٹکٹ نہ مل سکا اور اس مرتبہ وہ ۱۱٬۶۱۴ ووٹ حاصل کرنے کے باوجود شکست کھا گئے (۱۸) ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ ہی نہیں لیا۔ ۲۰۰۲ء میں انہیں پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین نے قومی اسمبلی کے حلقے این اے ۲۲۱ حیدر آباد ۴ سے ٹکٹ دیا تھا۔ جس پر وہ آسانی سے کامیاب ہو گئے (۱۹)

سندھ کے سیاستدانوں کی ایک اور شاخ بھی اپنے نام کے ساتھ جاموٹ کا لاحقہ لگاتی ہے۔ یہ کراچی کی ساحلی بستی ابراہیم حیدری میں آباد ہیں۔ اس خاندان کے ولی محمد جاموٹ ۱۹۷۰ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۲۰) جبکہ حاجی شفیع محمد جاموٹ ۱۹۷۷ء میں پی ایس ۹۹ کراچی ۲۴ سے سندھ اسمبلی کے رکن بنے (۲۱) وہ ممتاز علی بھٹو کے معتمد ساتھیوں میں شامل تھے۔ جب پاکستان پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت اور ممتاز علی بھٹو کے مابین سیاسی اختلافات پیدا ہوئے تو حاجی شفیع محمد جاموٹ نے پاکستان پیپلز پارٹی سے استعفیٰ دے کر سندھی، بلوچ، پختون فرنٹ میں شمولیت اختیار کی۔ بعد میں ممتاز علی بھٹو نے اس فرنٹ کو توڑ کر سندھ نیشنل فرنٹ کے قیام کا اعلان کیا تو حاجی شفیع محمد جاموٹ بھی ان کے شریک سفر رہے۔ (۲۲) ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں حاجی شفیع محمد جاموٹ نے دو نشستوں پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر ایک نشست پر ایم کیو ایم کے محمد یونس سے اور دوسری نشست پر پیپلز پارٹی کے خواجہ محمد سے شکست کھا گئے۔ (۲۳) ۱۹۹۰ء میں بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد حاجی شفیع محمد جاموٹ نے نگراں صوبائی کابینہ میں شمولیت اختیار کی۔ سندھ نیشنل فرنٹ کے سربراہ ممتاز علی بھٹو نے پارٹی ضوابط کی خلاف ورزی کے نتیجے میں حاجی شفیع محمد جاموٹ کی پارٹی کی بنیادی رکنیت منسوخ کر دی۔ (۲۴) ۱۹۹۰ء کے انتخاب میں انہوں نے آزاد امیدوار کے طور پر حصہ لیا۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۵)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں اسی خاندان کے محمود تاج عالم جاموٹ نے پی ایس ۱۲۹ کراچی ۴۱ سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا اور سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۶)

حوالہ جات

۱۔ ادارہ۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۸۸ء۔ ص ۱۲۳

۲۔ جی ایم سید۔ جنب گزار یم جن سین۔ حیدر آباد۔ جلد اوّل۔ ص ۸۱ تا ۸۳

۳۔ ادارہ۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۸۸ء۔ ص ۱۲۳

۴۔ سندھ لیجسلیٹو اسمبلی ڈیبیٹس۔ جلد ۳ کتاب ا۔ ص ۳ (ضمیمہ)

۵۔ محمد علی خالد۔ سندھ کے سید خاندانوں کی سیاست۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۹/اپریل ۱۹۸۷ء

۶۔ سینٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ڈائریکٹری آف ممبرز۔ مارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۹۸

۷۔ وی ایف آگیف۔ سندھ تاریخ کے آئینہ میں۔ ترجمہ ڈاکٹر محمود صادق۔ کراچی۔ ص ۳۲۵

۸۔ سینٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ڈائریکٹری آف ممبرز۔ مارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۹۸

۹۔ محمود غزنوی۔ قبضہ گروپ کی کابینہ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۲۰/مئی ۱۹۹۳ء

۱۰۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کی ویب سائٹ www.ecp.gov.pk

۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۴۸۷

۱۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۹/اپریل ۱۹۸۵ء

۱۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور ص ۳۶۸

۱۵۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور (سندھی)۔ کراچی۔ ص ۹۲، ۹۳

۱۶۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴/مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۳۶۳

۱۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور ص ۵۱۶، ۵۱۷

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰۔ جلد دوم۔ ص ۳۲۵

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲۔ جلد دوم۔ ص ۷۹

۲۰۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور (سندھی)۔ کراچی۔ ص ۱۰۳، ۱۰۴

۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴/مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۳۶۷

۲۲۔ زبیر رانا۔ حاجی شفیع محمد جاموٹ سے ایک انٹرویو ہفت روزہ مہارت۔ لاہور۔ ص ۲۴، ۲۵

۲۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۵۲۹، ۵۳۰

۲۴۔ زبیر رانا۔ حاجی شفیع محمد جاموٹ سے ایک انٹرویو ہفت روزہ مہارت۔ لاہور۔ ص ۲۴، ۲۵

۲۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۳۴۴

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۲۸۶

جتوئی

جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری اپنی کتاب بلوچستان تاریخ کے آئینہ میں رقم طراز ہیں:

"جتوئی ایک قدیم قبیلہ ہے' جس کا ذکر قدیم لوک گیتوں میں آتا ہے۔ موجودہ دور میں یہ قبیلہ منتشر حالت میں ہے۔ بہرحال جتوئیوں کی خاصی بڑی تعداد پنجاب کے اضلاع مظفر گڑھ' ساہیوال' ملتان' جھنگ' شاہ پور' لاہور اور ڈیرہ غازی خاں' صوبہ سرحد' سندھ کے اضلاع شکارپور' سکھر' نواب شاہ اور دادو اور بلوچستان کے ضلع کچھی میں ملتی ہے۔ ایک بلوچ لوک گیت کی رو سے لفظ جتوئی' مائی جتو سے مشتق ہے۔ یہ ایک جاٹ عورت تھی' جس کی شادی ایک رند سے ہو گئی تھی۔ اس قبیلہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کا خون خالص نہیں ہے۔ لیکن قبائلی سماج میں اس قسم کے اعتراضات کچھ غیر معمولی نہیں ہیں۔ قدیم عرب قبیلوں کی طرح ایک بلوچ قبیلہ بھی اپنے شاعر یا گویے کی نظموں اور گیتوں کی بنا پر خون یا بہادری کی بنیاد پر اپنے کو دوسروں سے برتر اور اعلیٰ قرار دیتا ہے۔ ان قبائل میں یہ چیز ابھی تک موجود ہے۔ معلوم نہیں یہ کہانی درست ہے یا نہیں' لیکن لفظ جتوئی' دلچسپی کا موجب ضرور ہے۔" (۱)

سردار شیرباز مزاری نے اپنے ایک انٹرویو میں اپنے قبیلے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتایا تھا کہ مائی جتو بلوچوں کے مورث اعلیٰ میر جلال خان کی بیٹی اور رند' لاشار' کوارئی اور ہوت کی بہن تھی (۲) شیخ صادق علی شیر علی انصاری نے بھی اپنی کتاب دی مسلمان ریسز فاؤنڈ ان سندھ' بلوچستان اینڈ افغانستان میں اس بیان کی تائید کی ہے (۳) مگر محمد حیات خان بیدار بلوچ رند نے اپنی کتاب تواریخ بلوچستان میں اس خیال کی تردید کی اور لکھا ہے کہ جتوئی' جلال خان کی بیٹی نہیں بلکہ سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ انہوں نے اپنے بیان کی صداقت کے لیے یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ بلوچوں میں قبیلوں کے نام عورتوں کے نام پر نہیں ہوتے (۴) ادھر جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری جتوئیوں کا سلسلہ عرب قبیلے الزت سے جوڑتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے سندھ کی فتح کے موقع پر ایک قبیلہ' جسے بلاذری اور طبری نے الزت کہا

ہے اور جس کے افراد کی تعداد چار ہزار بتائی ہے' مسلم فوج کے ساتھ سندھ سے ترک وطن کر کے چلا گیا تھا۔ گورنر عراق سے ملحق زمینیں دے دی گئیں۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور قبیلہ بنو تمیم میں شامل ہو گئے۔ ان میں سے کچھ لوگ بیت المال کے محافظ مقرر کئے گئے۔ بلوچ سامی النسل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ ترک وطن کرنے سے پہلے شام میں رہا کرتے تھے۔ ان میں کچھ لوگوں کو گورنر عراق نے الزت قبیلہ کے لوگوں کے قریب ہی زمینیں دے دی تھیں۔ اس طرح عین ممکن ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ہمسائے ہو گئے ہوں اور بعد میں یہ جتوئی (جو حقیقتاً الزت تھے) بلوچوں کے ساتھ گھل مل گئے ہوں اور رفتہ رفتہ بلوچوں کا ایک حصہ بن گئے ہوں اور بعد میں ان علاقوں میں آ بسے ہوں۔ (۵)

سیاست کے میدان میں جتوئی قبیلے کے عمل دخل کا آغاز حاجی امام بخش جتوئی سے ہوتا ہے۔ جو غلام مصطفیٰ جتوئی کے دادا تھے۔

حاجی امام بخش جتوئی ۲۵ جولائی ۱۸۸۱ء کو گوٹھ ملک تعلقہ مورو میں پیدا ہوئے۔ وہ عربی اور فارسی پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ اور ان دونوں زبانوں میں شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کا تخلص صابر تھا۔ اور ان کا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے۔

حاجی امام بخش جتوئی بڑے مہمان نواز تھے اور انگریزوں سے ان کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔ انگریزوں نے انہیں خان صاحب اور خان بہادر کے خطابات سے نوازا تھا۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۸ء تک وہ اسپیشل مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۲ء تک وہ بمبئی لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن اور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک نواب شاہ ضلعی لوکل بورڈ اور اسکول بورڈ کے چیرمین رہے۔ انہوں نے ۷ نومبر ۱۹۳۸ء کو وفات پائی۔ (۶) وفات سے کچھ عرصہ قبل حاجی امام بخش جتوئی نے ۱۹۳۷ء میں سندھ مسلم پولیٹیکل پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر رسول بخش انڑ کے ہاتھوں شکست کھا گئے تھے۔

حاجی امام بخش جتوئی کی وفات کے بعد ان کا سیاسی ورثہ ان کے اکلوتے بیٹے غلام رسول جتوئی (تاریخ وفات: ۱۹ مئی ۱۹۶۵ء) نے سنبھالا۔ غلام رسول جتوئی ایک فعال سیاستدان تھے۔ وہ قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۶ء میں دو مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۷) اور ۱۹۵۳ء میں بھی صوبائی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوئے تھے۔ (۸)

۱۹۵۵ء میں جب ون یونٹ کا قیام عمل میں آیا تو غلام رسول جتوئی کا ورثہ ان کے بڑے صاحبزادے غلام مصطفیٰ جتوئی نے سنبھال لیا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس سے قبل وہ ڈسٹرکٹ کونسل نواب شاہ کے چیئرمین کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔

۱۹۶۲ء میں غلام مصطفیٰ جتوئی قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ اس انتخاب میں

انہوں نے محمد علی بوگرہ کے بعد پورے پاکستان میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کئے تھے۔ اس انتخاب کے بعد سیاسی جماعتیں بحال ہوئیں تو بھٹو صاحب سے دوستی کی وجہ سے وہ کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں ایوب خان نے پھر انتخابات کروائے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اس انتخاب میں بھی کامیاب ہوئے اور پھر اس وقت تک کنونشن مسلم لیگ میں شامل رہے جب تک ذوالفقار علی بھٹو اس میں شامل رہے۔

۱۹۶۷ء میں بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی قائم کی تو غلام مصطفیٰ جتوئی، غلام مصطفیٰ کھر اور ممتاز علی بھٹو، اس کے اساسی کنونشن میں تو شریک نہیں ہوئے مگر وہ پارٹی کے قیام کے سلسلہ میں تمام مشوروں میں شریک رہے۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں غلام مصطفیٰ جتوئی پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بھٹو نے اپنی حکومت کے قیام کے بعد غلام مصطفیٰ جتوئی کو اپنی مرکزی کابینہ میں شامل کر لیا۔ اور انہیں مواصلات ریلوے، بندرگاہیں، جہاز رانی، آب پاشی اور بجلی اینڈ گیس اور سیاسی امور کے محکمے سپرد کئے۔ (۹)

۱۹۷۳ء میں سندھ میں لسانی فسادات پھوٹ پڑے۔ جسے ممتاز بھٹو نے بزور طاقت دبانا چاہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ کے حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے اور یوں بھٹو نے سندھ کی وزارت اعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۳ء کو غلام مصطفیٰ جتوئی سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے۔ بعد ازاں وہ اپنے بھائی غلام مجتبیٰ خان جتوئی کی خالی کردہ نشست پر سندھ اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہو گئے۔ (۱۰)

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں غلام مصطفیٰ جتوئی بلا مقابلہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اور بعد ازاں متفقہ طور پر وزیر اعلیٰ بن گئے۔

غلام مصطفیٰ جتوئی تقریباً ساڑھے تین برس سندھ کے وزیر اعلیٰ رہے۔ ان کا دور سندھ میں بسنے والے تمام طبقوں کے لئے بڑا مصالحانہ دور تھا۔ (۱۱)

۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد فوجی حکمرانوں نے غلام مصطفیٰ جتوئی کے خلاف کسی قسم کی انتقامی کاروائی سے گریز کیا۔ مارشل لاء حکام نے پیپلز پارٹی کی بدعنوانیوں کے خلاف جو وہائٹ پیپر شائع کئے ان میں بھی غلام مصطفیٰ جتوئی کا نام شامل نہیں تھا۔ اس کی "وجہ" اظہر سہیل نے اپنی کتاب جنرل ضیاء کے گیارہ سال؟ میں رقم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق جو نوے روز کے اندر انتخابات کرانے کے وعدے پر ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کی شب بر سر اقتدار آئے تھے، انہوں نے ۸ ر اگست ۱۹۷۷ء کی صبح ایک الیکشن سیل قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنرل چشتی اس سیل کے سربراہ بنے۔ جب کہ اس کے اراکین میں جنرل راؤ فرمان علی، جنرل جمال سید میاں اور جنرل احسان الحق ملک شامل تھے۔ ۱۲ر

اگست کی صبح دس بج کر پچاس منٹ پر اس سیل نے پہلے سیاسی رہنما سے ملاقات کی' یہ ملاقات چکلالہ میں واقع جنرل چشتی کے دفتر میں ہوئی۔ ملاقات کرنے والے رہنما کا نام محمد یوسف خان خٹک تھا اور وہ خان عبدالقیوم خان کے نمبر دو کی حیثیت میں مسلم لیگ قیوم گروپ کی نمائندگی کرنے تشریف لائے تھے۔

یوسف خٹک کے فوراً بعد الیکشن سیل سے ملاقات کے لئے آنے والے سیاسی رہنما کا نام غلام مصطفیٰ کھر تھا' انہوں نے ملفوف انداز میں یہ تاثر دیا کہ اگر کسی طرح پیپلز پارٹی کو الیکشن کے بائیکاٹ پر مجبور کر دیا جائے تو' پارٹی میں موجود دائیں بازو کے عناصر ان کی غلام مصطفیٰ جتوئی کی قیادت میں ایک نسبتاً قابل قبول گروپ بنا کر بہتر کردار ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ انہوں نے الیکشن سیل کے اراکین کے سامنے تجویز پیش کی کہ اگر وہ چاہیں تو ان کی ملاقات غلام مصطفیٰ جتوئی سے بھی کروائی جا سکتی ہے۔ سیل کے اراکین نے حامی بھر لی اور ۲۵ر اگست کو کھر صاحب غلام مصطفیٰ جتوئی سمیت دوبارہ ان سے ملنے آئے۔ یہ ملاقات بھی جنرل چشتی کے دفتر میں ہوئی اور اس ملاقات کے دوران ان دونوں اہم قومی رہنماؤں نے یہ تجویز پیش کی کہ الیکشن سیل پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد کی تمام جماعتوں پر مشتمل ایک "ایک گرینڈ" اجلاس طلب کر کے' یہ بات ابھی سے طے کروالے کہ آئندہ سے پاکستان میں بھی ترکی کی طرح فوج کا ایک مستقل آئینی کردار ہو گا۔ اور وہ یہ کہ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں فوج آئینی طور پر اقتدار پر قبضہ کر سکے گی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نے سیل کے اراکین کو مشورہ دیا کہ وہ پیپلز پارٹی کے صرف انہی لیڈران کرام کو طلب کریں جن پر انہیں پورا اعتماد ہو۔ کیونکہ اکیلے بھٹو صاحب پر کسی بھی صورت میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اگر اکیلے آئے بھی تو ناقابل اعتبار ہوں گے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نے بے بسی کے انداز میں کہا' "جناب! جب تک بھٹو موجود ہے' ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے' اس سے ہمارے بارے میں عوامی تاثر مجروح ہو گا۔ تاہم اگر اسے منظر سے ہٹا دیا جائے تو کھر صاحب اور میں دونوں مل کر پیپلز پارٹی میں موجود دائیں بازو کے عناصر سمیت' پوری قوت سے آپ کا ساتھ دیں گے۔" اپنا یہ موقف بیان کرنے کے بعد جتوئی صاحب کھر کو اپنے اندر چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ کھر صاحب نے کہا۔ "جناب! ہمیں بھٹو کو "آؤٹ" کرنے کی کوشش کرنی چاہئے' اس کے بعد ہماری پیپلز پارٹی' این ڈی پی' جمعیت العلماء اسلام اور مسلم لیگ کا اتحاد ہو سکتا ہے جس میں تحریک استقلال بھی شامل ہو سکتی ہے۔ اس اتحاد کی مدد سے جتوئی کو وزیراعظم بنا کر آپ معاملات کو بہتر طریقہ سے چلا سکتے ہیں۔" (۱۲)

پھر یوں ہوا کہ غلام مصطفیٰ جتوئی پیپلز پارٹی میں شامل بھی رہے اور بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی جلا وطنی کے بہانے میں پارٹی کی قیادت بھی کرتے رہے۔ اگرچہ ان کے روابط مبینہ طور پر مارشل لاء حکام سے بھی بدستور برقرار رہے۔

غلام مصطفیٰ جتوئی نے ۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کی قیادت بھی کی۔ ان کے صاحبزادے غلام مرتضیٰ جتوئی پر اس تحریک میں کئی افراد کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ درج ہوا۔ ۱۹۸۵ء کے اوائل میں ایم آر ڈی کے رہنماؤں کو بائیکاٹ پر آمادہ کرنے والی شخصیت بھی غلام مصطفیٰ جتوئی کی ہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس فیصلے کے پیچھے بھی اصل ڈوری جنرل ضیاء الحق ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اور غلام مصطفیٰ جتوئی ہی نہیں ایم آر ڈی کے کئی اکابرین نے انہی کے ایماء پر غیر جماعتی انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا تھا۔

مارچ ۱۹۸۶ء کے اوائل میں جب غلام مصطفیٰ جتوئی لندن میں تھے محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان سے مشورہ کیے بغیر سندھ پیپلزپارٹی کی قیادت میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ یہ تبدیلیاں غلام مصطفیٰ جتوئی کے لئے ناقابل قبول تھیں چنانچہ وہ ناراض ہوگئے۔ ۲۱ مارچ کو وہ وطن واپس آئے تو ان کے حامیوں نے ان کا خیر مقدمی جلوس نکالنا چاہا۔ مگر پیپلزپارٹی کے کارکنوں نے وہ جلوس ہائی جیک کرلیا۔ اور نہ صرف "جتوئی کی جو شان ہے وہ بھٹو کا احسان ہے" اور "بھٹو فیملی ہیرو ہیرو باقی سارے زیرو زیرو" کے نعرے لگائے بلکہ جتوئی صاحب کو بے نظیر بھٹو کی تصویر اور پیپلزپارٹی کے پرچم کو سلامی دینے پر بھی مجبور کیا۔ (۱۳)

یہ صورتحال جتوئی کے لئے قطعاً ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے کچھ عرصہ سیاسی حالات کا جائزہ لیا اور پھر اپنی سیاسی جماعت نیشنل پیپلزپارٹی کیلئے ڈول ڈال دیا۔ اس جماعت کا تاسیسی کنونشن لاہور میں منعقد ہوا۔ اس جماعت کو ابتدا میں تو عوامی سطح پر پزیرائی حاصل ہوئی مگر بعد میں یہ جماعت کافی پس منظر میں چلی گئی۔

مئی ۱۹۸۸ء میں جب ضیاء الحق نے محمد خان جونیجو کی حکومت کو برطرف کیا تو غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیراعظم بننے کے خواہشمند تھے۔ مگر ضیاء الحق ایسا کوئی رسک لینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ ضیاء الحق کی وفات کے بعد جب آئی ایس آئی کی ایما پر ۹ جماعتوں پر مشتمل اسلامی جمہوری اتحاد تشکیل پایا تو غلام مصطفیٰ جتوئی کو اس اتحاد کا سربراہ بنا دیا گیا۔ جبکہ ان کے دیرینہ ساتھی غلام مصطفیٰ کھر ان سے صدر ضیاء الحق کے حامی عناصر سے صلح کرنے کی بنا پر علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے اپنا الگ گروپ تشکیل دے دیا۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں غلام مصطفیٰ جتوئی نے نواب شاہ سے دو حلقوں پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا ایک نشست پر انہوں نے سید ظفر علی شاہ سے تقریباً ۳۱ ہزار ووٹوں سے شکست کھائی جبکہ دوسری نشست پر انہیں حاجی رحمت اللہ ببہن نے ۱۵ ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ کامیاب ہونے والے دونوں امیدواروں کا تعلق پاکستان پیپلزپارٹی سے تھا۔

غلام مصطفیٰ جتوئی جیسے قد آور سیاست دان کا اپنے دو آبائی حلقوں سے شکست کھانا اس انتخاب کی سب سے بڑی خبر تھی۔ ان کی یہ شکست ان کی ہی نہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی بھی

خفت کا باعث بنی' ادھر انتخاب کے بعد غلام مصطفیٰ کھر نے جو دو نشستوں پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے' پیپلز پارٹی سے راہ و رسم بڑھانی چاہی۔ مگر ان کی ان کوششوں کو پیپلز پارٹی کی قیادت نے بری طرح جھڑک دیا۔ وہ غلام مصطفیٰ جتوئی کے دیرینہ دوست تھے۔ اور ان کے بغیر اسمبلی میں خود کو تنہا سمجھ رہے تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظر انہوں نے مسٹر جتوئی سے دوبارہ دوستی کر لی۔ اور انہیں اپنے حلقہ سے ضمنی انتخاب میں حصہ لینے کی دعوت دے ڈالی۔ مسٹر کھر کے اس فیصلے سے سیاسی حلقے انگشت بدنداں رہ گئے' جب کہ پیپلز پارٹی کے حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

اس انتخابی معرکہ کو سر کرنے کے لئے پیپلز پارٹی اور اسلامی اتحاد دونوں نے اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کیا۔ نواب زادہ نصراللہ خان نے بھی اس معرکے میں جتوئی کا ساتھ دیا۔ کھر نے اپنی تقریروں میں کہا کہ پنجاب سے جتوئی کا منتخب ہونا' پنجاب اور سندھ میں تعصبات کے خاتمے کا سبب بنے گا۔ یوں اس نشست پر مسٹر جتوئی بھاری اکثریت سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۴)

قومی اسمبلی میں پہنچنے کے بعد یکم جون ۱۹۸۹ کو غلام مصطفیٰ جتوئی متحدہ اپوزیشن (سی او پی) کے سربراہ بن گئے۔ اور ۳ جون کو قومی اسمبلی میں متحدہ اپوزیشن کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔

سی او پی کا قیام گویا بے نظیر حکومت کے زوال کا حرف آغاز تھا۔ چند ہی دنوں بعد متحدہ اپوزیشن نے اس حوالے سے بعض اہم فیصلے کئے۔ طے یہ کرنا تھا کہ بے نظیر حکومت کو بجٹ میں شکست دینے کی کوشش کی جائے یا مناسب وقت اور کوشش کے بعد باضابطہ عدم اعتماد کی تحریک لائی جائے۔ جتوئی صاحب نے دوسری بات کی تائید کی اور یوں معاملہ اکتوبر تک ٹل گیا۔ (۱۵)

اکتوبر ۱۹۸۹ء میں اپوزیشن پارٹیوں نے بے نظیر حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی۔ یوں تو اس تحریک کے روح رواں میاں نواز شریف اور میاں زاہد سرفراز تھے۔ مگر اس کی قیادت بہرحال جتوئی صاحب ہی نے کی' کیونکہ وہی متحدہ اپوزیشن کے سربراہ تھے۔

عدم اعتماد کی یہ تحریک تو ناکامی سے دوچار ہو گئی مگر چند ہی ماہ بعد اسلام آباد سازشوں کی عظیم آماجگاہ بن گیا۔ اور ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو بے نظیر حکومت رخصت کر دی گئی۔ ۔غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیراعظم بنا دیئے گئے۔ اور یوں ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی۔ (۱۶)

غلام مصطفیٰ جتوئی تقریباً نوے دن اپنے عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران ان کی حکومت نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کروائے۔ ان انتخابات کے حوالے سے احمد سلیم "سیاست دانوں کی جبری نااہلیاں" میں رقم طراز ہیں:

"۲۴ اکتوبر کو ہونے والی انتخابی دھاندلی جس کے بارے میں خود دھاندلی کا لفظ چھوٹا پڑ جاتا ہے، نگران حکومت کا آخری کارنامہ تھا۔ ۱۹۷۷ء میں بھٹو کی حکومت کو مبینہ انتخابی الزامات کے نتیجے میں ہٹایا گیا تھا۔ ۱۹۹۰ء میں بے نظیر کی حکومت ہارس ٹریڈنگ اور دیگر سنگین الزامات کے تحت ختم کی گئی، لیکن ۲۴ اکتوبر کو خود نگران حکومت نے کچھ ایسے معجزنما اقدامات کئے کہ ووٹوں میں ۲.۶. کا فرق ۹۰ نشستوں کے فرق میں تبدیل ہو گیا۔ ان دھاندلیوں کے بارے میں طول طویل بحثیں شائع ہو چکی ہیں جنہیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے البتہ انتخابات کے ڈیڑھ ماہ بعد سابق وزیر اعظم نے بعض سیاستدانوں کو اسمبلی سے باہر رکھنے کی سازش کا انکشاف کیا۔ انہوں نے کہا کہ گزشتہ انتخابات میں بعض قد آور سیاسی شخصیتوں کو اسمبلی سے باہر رکھنے کی سازش کی گئی، منصوبہ بندی کس نے کی اس کے محرکات کیا تھے؟ اس بارے میں وہ چھان بین کر رہے ہیں۔ تاہم ان کے نتیجے چھ ماہ بعد گزر جانے کے بعد بھی سامنے نہ آئے۔ ولی خان، مولانا فضل الرحمان اور نواب زادہ نصراللہ جیسی قد آور سیاسی شخصیات اسمبلی سے باہر رکھنے والے یقیناً پی ڈی اے کے لوگ نہیں ہو سکتے تھے یہ کام نگران وزیر اعظم کے دور میں اور یقیناً اسی حکومت کے بعض لوگوں کے ہاتھوں انجام پایا گیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ جتوئی جس پلیٹ فارم (آئی جے آئی) سے وزیر اعظم بنے وہ اسی کو سازش قرار دیتے رہے تھے جبکہ وزیر اعظم کے طور پر خود ان کی نامزدگی ایک بڑی سازش کا نتیجہ تھی۔

غلام مصطفیٰ جتوئی کے الزامات یا انکشافات نے قدرتی طور پر پاکستانی عوام کے اذہان میں پوری انتخابی مشق کے بارے میں کچھ سوالات اور شکوک ابھار دیئے اور لوگوں نے سوچا کہ جب اتنے بڑے بڑے غیر پی پی اکابر کو ہرانے کے لئے مبینہ سازش ہو سکتی ہے تو اصل اور بڑی اپوزیشن پارٹی پی ڈی اے کے ارکان اور امیدواروں کے خلاف کیا کچھ نہیں ہو سکتا اور کیا کچھ نہیں ہوا ہو گا۔ جناب جتوئی کے الزامات جب اپنے عروج پر تھے تو وزیر اعظم میاں نواز شریف نے یہ کہہ کر بحث کو ایک نیا رخ دے دیا کہ "بعض لوگوں کو تو اپنی نشستوں پر کامیابی کا بھی شک تھا۔"

یہ ایک لطیف اشارہ تھا اس حقیقت کی طرف کہ جناب جتوئی خود نوشہرو فیروز میں اپنی نشست پر کامیابی کے بارے میں متذبذب تھے لیکن وہ غیر معمولی اکثریت سے کامیاب ہو گئے جس سے بعض شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ فی الواقع جناب جتوئی اور جناب نواز شریف نے مذکورہ سوال پر جو کچھ کہا اس سے لوگوں نے یہ سمجھا کہ انتخابات کے نتائج کی اصل حقیقت وہ نہیں ہے جو ظاہر کی گئی ہے یا کی جا رہی ہے۔ (۱۷)

انہی انتخابات میں غلام مصطفیٰ جتوئی نواب شاہ کے علاوہ این اے ۹۰ سیالکوٹ ۴ سے بھی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے یہ نشست انہوں نے بعد ازاں خالی کر دی۔ جس پر سید غوث

علی شاہ بلا مقابلہ رکن اسمبلی منتخب ہو گئے۔ (۱۸)

جتوئی کا خیال تھا کہ انتخابات کے بعد وہی وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز رہیں گے لیکن انٹیلی جینس بیورو اور آئی ایس آئی کے ذریعے جتوئی کو اطلاع ملی کہ میاں نواز شریف نے ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے نتیجہ میں حکومت بنانے کے لئے منصوبہ بندی کر لی ہے۔ آئی بی اور آئی ایس آئی نے جتوئی کو یہاں تک رپورٹ دے دی تھی کہ میاں نواز شریف نے اپنی آئندہ کابینہ کا خاکہ بھی تیار کر لیا ہے' لیکن' جتوئی نے جب بطور نگران وزیر اعظم میاں نواز شریف سے ملاقاتیں کی تو میاں صاحب مکر گئے کہ انہوں نے وزیر اعظم کا عہدہ حاصل کرنے کے لئے سوچا تک نہیں ہے۔ جتوئی نے میاں نواز شریف کی باتوں پر یقین تو نہ کیا لیکن کا خیال تھا کہ وہ ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے بعد میاں نواز شریف کو پنجاب تک محدود رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ ان دنوں ان کا ستارہ عروج پر تھا۔ لیکن انتخابات کے بعد جب نتائج قوم کے سامنے آئے تو جتوئی کو شک ہوا کہ میاں نواز شریف پنجاب کارڈ استعمال کریں گے کیونکہ میاں صاحب نے نو منتخب ارکان اسمبلی کے ساتھ ساتھ دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ رابطے شروع کر دیئے تھے' تاکہ وہ انہیں بطور وزیر اعظم اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ ڈلوانے کی کوشش کریں۔ اسی دوران غلام مصطفیٰ جتوئی نے بھی اپنے کارڈ استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ لیکن آخر کار جتوئی کو نہ چاہتے ہوئے بھی میاں صاحب کے لئے جگہ خالی کرنا پڑی۔ چونکہ غلام مصطفیٰ جتوئی کو میاں صاحب کی "بے وفائی" کا بہت رنج تھا اس لئے انہوں نے میاں نواز شریف کے وزیر اعظم بننے کے بعد پیپلز پارٹی کی قیادت سے پینگیں بڑھانا شروع کر دیں اور انہوں نے بے نظیر بھٹو کو پیغام بھجوایا کہ آپ (بے نظیر بھٹو) میاں صاحب کے خلاف میرا ساتھ دیں کیونکہ مستقبل قریب میں ہم دونوں (پی پی پی اور این پی پی) وزیر اعظم سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن جتوئی کے پی پی پی کے ساتھ خفیہ روابط زیادہ دن تک خفیہ نہ رہ سکے اور انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر بریگیڈیر امتیاز نے مبینہ طور پر ان کی نگرانی شروع کروا دی۔ آئی بی کو اپنے مشن میں کافی حد تک کامیابی حاصل ہو گئی تھی اور جتوئی کے پی پی پی کی قیادت کے ساتھ رابطوں کی تصدیق ہو گئی تھی۔ لیکن جب جتوئی کو علم ہوا کہ ان کے کمرے میں خفیہ آلات لگائے گئے ہیں تو انہوں نے اپنے بیٹے مرتضیٰ جتوئی سے مشورہ کیا اور ایسے آلات کا بندوبست کیا جن سے آئی بی کے خفیہ آلات کا پتہ چلایا جا سکے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی ان دنوں ہالیڈے ان (موجودہ ہوٹل میریٹ) کے کمرہ نمبر ۳۵۶ اور ۳۵۷ میں مقیم تھے جبکہ خفیہ ایجنسی کے حکام کمرہ نمبر ۳۵۴ اور ۳۵۵ میں بیٹھ کر ان کی گفتگو کو ٹیپ کر رہے تھے۔ ہوٹل ہالیڈے ان کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ کمرہ نمبر ۳۵۴ اور ۳۵۵ میں جو لوگ موجود تھے وہ جتوئی کے کمرے سے خفیہ آلات بر آمد ہونے کے فوراً بعد کمرہ چھوڑ کر نکل گئے۔

غلام مصطفیٰ جتوئی نے ۶ر جون ۱۹۹۱ء کو ایک ہنگامی پریس کانفرنس طلب کر کے صحافیوں کو وہ

آلات دکھائے جن سے کوئی خفیہ ایجنسی ان کی نگرانی کروا رہی تھی۔ جتوئی اپنی پریس کانفرنس کے دوران انتہائی جذباتی ہو گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں میں آنسو لا کر کہا کہ ایک سیاستدان جو ۴۰ سال سے ملک کی فلاح و بہبود کے لئے سیاست کر رہا ہے اور جو نگران وزیراعظم کے عہدہ پر فائز رہ چکا ہے، موجودہ حکومت اس کی نگرانی کروا رہی ہے۔ جتوئی نے شکوہ کیا کہ انہوں نے جس شخص کو اپنے ہاتھوں سے اقتدار سونپا تھا، وہی ان کی حب الوطنی پر شک کر رہا ہے۔ میری اس طرح جاسوسی کروا کر حکومت کیا ثابت کرنا چاہتی ہے۔ کیا میں غدار ہوں؟ کیا میں محب وطن نہیں ہوں؟ کیا حکومت کو میری وفاداری پر شک ہے؟

جتوئی کے کمرے سے خفیہ آلات برآمد ہونے کے بعد بعض حلقوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ چونکہ آئی بی اور آئی ایس آئی کے درمیان چپقلش جاری ہے اس لئے آئی ایس آئی نے آئی بی کے لئے مشکلات کھڑی کرنے کے لئے جتوئی کو آگاہ کیا تھا کہ ان کے کمرے میں جاسوسی کے آلات نصب کئے گئے ہیں، جبکہ یہی الزام آئی ایس آئی نے لگایا کہ آئی بی نے جتوئی کو آگاہ کیا تھا کہ ان کے کمرے میں جاسوسی کے آلات نصب کرنے میں آئی ایس آئی کا ہاتھ ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں بظاہر بے وزن نظر آتی ہیں۔ (۱۹)

کچھ عرصہ بعد ۱۹۹۲ء کے اوائل میں ایک اور ایسا واقعہ پیش آیا جس سے نواز شریف اور غلام مصطفیٰ جتوئی کے راستے حتمی طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ واقعہ جام صادق علی کی وفات کے بعد ان کے جانشین کے انتخاب کا تھا۔

جتوئی اس عہدے پر جتوئی قبیلے کے سربراہ ڈاکٹر ابراہیم جتوئی کو کامیاب کروانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک جانب تو پیپلز پارٹی سے روابط بڑھائے اور اسے ابراہیم جتوئی کی حمایت کے لئے تیار کر لیا دوسری جانب انہیں جام صادق علی کی کابینہ میں شامل اپنے صاحبزادے مسرور جتوئی سمیت کم از کم پانچ وزیروں، پی پی کے بعض منحرف اراکین اور سندھ اسمبلی میں جام گروپ کے بعض اہم ارکان کی حمایت حاصل ہو گئی۔ بعض ذرائع کے مطابق جب جتوئی ابراہیم جتوئی کو قائد ایوان بنانے کی تیاری مکمل کر چکے تھے تو صوبائی دارالحکومت میں موجود وفاقی وزراء عبدالستار لالیکا، چوہدری شجاعت حسین، چوہدری نثار علی، ملک نعیم اور الٰہی بخش سومرو نے صورتحال کو پلٹ کر رکھ دیا۔ انہوں نے جام گروپ چھوڑنے والے ارکان کو سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکی دی اور ان ارکان اور خود غلام مصطفیٰ جتوئی پر یہ واضح کر دیا کہ اگر سید مظفر حسین شاہ قائد ایوان منتخب نہ ہو سکے تو اسمبلی تحلیل ہو جائے گی اور صوبہ میں گورنر راج نافذ ہو جائے گا۔

غلام مصطفیٰ جتوئی کے لئے یہ صورتحال خاصی ذلت آمیز تھی۔ مگر انہوں نے پھر بھی مفاہمت کا راستہ نہ چھوڑا اور خیرسگالی کے طور پر مظفر حسین شاہ کو بلا مقابلہ قائد ایوان منتخب کروا

دیا۔ مگر جب اس کے جواب میں مظفر حسین شاہ کی جانب سے جتوئی گروپ کے ارکان کو انتقام کا نشانہ بنائے جانے کا سلسلہ شروع ہوا تو غلام مصطفیٰ جتوئی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ (۲۰)

ایک جانب انہوں نے اپنے بیٹے غلام مرتضیٰ جتوئی کو مرکزی کابینہ سے واپس بلا لیا دوسری جانب نواز شریف کے خلاف خم ٹھوک کر سامنے آ گئے۔ اور چند ماہ بعد وہ اپنی ہم خیال جماعتوں کے ساتھ نیشنل ڈیمو کریٹک الائنس بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس اتحاد میں غلام مصطفیٰ جتوئی کی این پی پی کے علاوہ جمہوری وطن پارٹی' عوامی جمہوری پارٹی' این پی پی (کھر گروپ) پی این پی' مزدور کسان پارٹی اور مولانا کوثر نیازی اور راؤرشید شامل تھے۔ این ڈی اے کا تاسیسی کنونشن لاہور میں منعقد ہوا جس میں غلام مصطفیٰ جتوئی نے نواز شریف حکومت پر کڑی تنقید کی۔ (۲۱)

۱۹۹۳ء کے اوائل میں جب صدر اور وزیر اعظم میں کشیدگی اپنے نقطہ عروج کو پہنچی تو غلام مصطفیٰ جتوئی صدر کے کیمپ میں تھے۔ اس مرتبہ بھی وہ اسمبلیوں کی تحلیل کے بعد نگراں وزیر اعظم بننا چاہتے تھے مگر صدر نے فیصلہ کیا کہ نگران وزیر اعظم پنجاب سے ہو گا۔ ان کی نظر میں حامد ناصر چٹھہ اور بلخ شیر مزاری دونوں اس عہدے کے لئے موزوں ترین امیدوار تھے مگر جب پیر صاحب پگارا نے بلخ شیر مزاری کے حق میں فیصلہ دیا تو غلام اسحاق نے بھی انہی کے نام پر صاد کر دیا۔ (۲۲)

میر بلخ شیر مزاری کے نگران وزیر اعظم بننے کے بعد غلام مصطفیٰ جتوئی کے صاحبزادے ان کی نگراں کابینہ میں شامل ہوئے جو گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ جتوئی کو مزاری کے نگراں وزیر اعظم بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

جولائی ۱۹۹۳ء میں جب نواز شریف اور غلام اسحٰق خان ساتھ ساتھ رخصت ہوئے تو غلام مصطفیٰ جتوئی نے پیپلز پارٹی سے رابطے بحال کرنے چاہے۔ وہ چاہتے تھے کہ پیپلز پارٹی ان کی پارٹی کو کم از کم وہ نشستیں تو ضرور دے دے جس پر ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں ان کے نمائندے کامیاب ہوئے تھے' مگر اس موضوع پر پیپلز پارٹی نے گفتگو کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جتوئی اور ان کے یہ نمائندے اس انتخاب میں محض اس لئے کامیاب ہو سکے تھے کہ اس وقت مرکز اور صوبے میں ان کی حکومت تھی۔ ورنہ وہ اتنی نشستیں حاصل کرنے کے ہرگز اہل نہیں تھے۔ (۲۳)

غلام مصطفیٰ جتوئی نے پیپلز پارٹی سے مایوس ہو کر پیر پگارا سے اپنے رابطوں کو از سر نو بحال کیا اور ان کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے (۲۴) مگر اب ان کے ساتھ بدقسمتی یہ ہو گئی کہ ایکشن کمیشن نے غلام مصطفیٰ جتوئی اور ان کے بیٹوں کے کاغذات نامزدگی اس الزام کے تحت مسترد کر دیئے کہ وہ قرض نادہندہ ہیں۔ (۲۵) بہر حال سپریم کورٹ نے غلام مصطفیٰ جتوئی اور ان کے

صابزادگان کومشروط طور پر انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت دے دی۔ جتوئی نے اس انتخاب میں حصہ لیا۔ اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری کو تقریباً بیس ہزار ووٹوں سے شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۲۶) ۱۹۹۷ء میں بھی وہ اسی نشست سے کامیاب ہوئے (۲۷) تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے گریجویشن کی شرط کی وجہ سے حصہ نہیں لیا اور ان کی نشست پر ان کے بھائی ڈاکٹر غفار جتوئی کامیاب ہو گئے۔ (۲۸)

غلام مصطفیٰ جتوئی کے صاحبزادے غلام مرتضیٰ جتوئی نے ۱۹۹۰ء میں قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا اور دونوں ہی کامیاب ہوئے۔ (۲۹) بعد ازاں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی اور قومی اسمبلی کی رکنیت کے ذریعہ مرکزی کابینہ تک جا پہنچے۔ انہیں مواصلات کا قلمدان دیا گیا تھا۔ (۳۰) جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے اور پھر بلخ شیر مزاری کی نگراں کابینہ میں وزیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کے لئے کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے۔ جو ریٹرننگ آفیسر نے ان کے قرض نادہندہ ہونے کی پاداش میں مسترد کر دیئے تاہم بعد ازاں انہوں نے بھی انتخاب میں حصہ لیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے (۳۱)

غلام مرتضیٰ جتوئی نے ۱۹۹۷ء میں فقط صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے (۳۲) ۲۰۰۲ء کے انتخابی عملی میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

غلام مرتضیٰ جتوئی کے ایک صاحبزادے مسرور جتوئی بھی ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ بعد ازاں وہ جام صادق علی کی وزارت میں بھی شامل رہے تھے۔ (۳۳) مسرور جتوئی نے ۱۹۹۷ء میں قومی اسمبلی کے حلقہ این اے ۱۵۸ سے کاغذات جمع کروائے تھے مگر بعد ازاں اپنے والد کے حق میں مقابلے سے دست بردار ہو گئے۔ ان انتخابات میں وہ صوبائی اسمبلی کی نشست پی ایس ۱۹ نوشہرو فیروز ۵ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۳۴) ۲۰۰۱ء میں انہوں نے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا اور نوشہرو فیروز کے ضلعی ناظم بنے (۳۵)

اکتوبر ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں غلام مصطفیٰ جتوئی کے ایک اور صاحبزادے طارق جتوئی نے بھی حصہ لیا اور خان محمد جمالی کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۳۶) انہوں نے ۱۹۹۷ء میں پی ایس ۱۸ سے کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے مگر بعد میں فعال حصہ نہ لیا۔ ۲۴ جون ۲۰۰۱ء کو کشتی اُلٹنے کے ایک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا (۳۷)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں غلام مصطفیٰ جتوئی کے ایک اور صاحبزادے عارف مصطفیٰ جتوئی بھی صوبائی اسمبلی کی نشست پر منتخب ہوئے اور بعد ازاں صوبائی وزیر بننے میں بھی کامیاب ہوئے (۳۸)

غلام مصطفیٰ جتوئی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے آصف جتوئی ۲۰۰۳ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے ہیں (۳۹)

غلام مصطفیٰ جتوئی کے دو بھائی بھی عرصہ دراز سے عملی سیاست میں ہیں۔ ان کے منجھلے بھائی غلام مجتبیٰ جتوئی ۱۹۷۱ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے مگر جب جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے جب غلام مصطفیٰ جتوئی کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے تو غلام مجتبیٰ جتوئی ان کی جگہ قومی اسمبلی کے اور وہ ان کی جگہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۴۰) ۱۹۸۸ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کی ایک نشست پر کاغذات نامزدگی داخل کروائے تھے مگر بعد ازاں غلام مصطفیٰ جتوئی کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے۔ ۱۹۹۰ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ یہ انتخاب جیتنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ (۴۱) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں ان کے صاحبزادے غلام رسول عرف عاقب خان جتوئی نے سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا اور دھنی بخش جتوئی کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن بن گئے (۴۲) غلام رسول عرف عاقب خان جتوئی نے ۱۹۹۷ء میں این اے ۱۵۸ نوشہرو فیروز سے کاغذات نامزدگی جمع کروائے مگر بعد میں اپنے تایا غلام مصطفیٰ جتوئی کے حق میں دستبردار ہو گئے (۴۳) ۲۰۰۵ء میں وہ بلا مقابلہ نوشہرو فیروز کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے (۴۴)

غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام مجتبیٰ جتوئی کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر غفار جتوئی' کراچی کے مڈ ایسٹ ہسپتال کے مالک ہیں۔ وہ ملک کے مایہ ناز سرجنوں میں شمار ہوتے ہیں اور پاکستان میں اوپن ہارٹ سرجری کے بانی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وہ ۱۹۹۱ء میں چھ سال کے لئے سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے تھے (۴۵) ۲۰۰۲ء میں این اے ۲۱۱ نوشہرو فیروز سے قومی اسمبلی کے رکن بنے (۴۶) انہی انتخابات میں ان کے صاحبزادے فرحاد زمان جتوئی بھی کھڑے ہوئے اور پی ایس ۲۳ نوشہرو فیروز ۵ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۴۷)

جتوئی قبیلے کے سردار ڈاکٹر ابراہیم جتوئی بھی سیاست کے میدان میں عمل دخل رکھتے ہیں۔ وہ ۱۹۹۰ء میں پی ایس ۹ شکار پور ۳ پی ڈی اے کے امیدوار غوث بخش خان مہر کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۴۸) وہ جام صادق علی کی وفات کے بعد سندھ کی وزارت اعلیٰ کے ممکنہ امیدواروں میں شامل تھے مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر پی ایس ۹ شکار پور ۳ سے حصہ لیا۔ مگر اس مرتبہ وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۴۹) ۱۹۹۷ء میں وہ ایک مرتبہ پھر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۵۰) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے قومی اور صوبائی دونوں انتخابات میں حصہ لیا اور دونوں ہی میں کامیاب ہوئے (۵۱) بعد ازاں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی جس پر ضمنی انتخابات میں ان کے چھوٹے بھائی عابد حسین جتوئی سندھ اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۵۲)

جتوئیوں کی ایک شاخ جو دادو میں آباد ہے ایک طویل عرصہ سے عملی سیاست کے میدان میں ہے۔ اس شاخ کے جو افراد سیاست میں سب سے زیادہ نمایاں ہوئے وہ عبدالحمید جتوئی اور ان کے کزن عبدالمجید جتوئی ہیں۔ عبدالحمید جتوئی کو سیاست وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد قادر بخش جتوئی بمبئی اسمبلی کے رکن رہے تھے اور ان کے دو چچا بھی بمبئی اسمبلی کے رکن رہ چکے تھے۔ عبدالحمید جتوئی نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں آل انڈیا مسلم لیگ کے کارکن کی حیثیت سے حصہ لیا اور انڈین نیشنل کانگریس کے امیدوار پیر علی محمد شاہ راشدی کے مقابلے میں مسلم لیگ کے امیدوار یوسف ہارون کو کامیاب کروانے میں فعال کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۶ء میں وہ پہلی مرتبہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۵۳) وہ ون یونٹ کے خلاف ووٹ دینے والے چار ارکان اسمبلی میں شامل تھے جس کی بنا پر انہیں مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے جی ایم سید کے ساتھ مل کر ون یونٹ کے خلاف ایک محاذ بنایا جس میں نو ارکان اسمبلی شامل تھے۔ بعد ازاں انہوں نے پاکستان کے ترقی پسند رہنماؤں کے ساتھ مل کر پاکستان نیشنل پارٹی قائم کی۔ اس وقت ۳۱۰ ارکان پر مشتمل مغربی پاکستان اسمبلی میں ری پبلکن اور مسلم لیگی ارکان کی تعداد آدھی آدھی تھی اس لیے پاکستان نیشنل پارٹی کے دس ارکان کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوگئی۔ کچھ عرصہ بعد جب اسمبلی میں ون یونٹ کے خاتمے کی قرارداد پیش ہوئی تو مسلم لیگ نے ایوان کا بائیکاٹ کیا اور یہ قرار داد بھاری اکثریت سے منظور ہوگئی۔ قرار داد کے خلاف میں صرف ایک ووٹ آیا جو میاں محمد شفیع (م ش) کا تھا (۵۴) اسی دوران مولانا بھاشانی بھی پاکستان نیشنل پارٹی میں شامل ہو گئے جس کے بعد اس پارٹی کا نام بدل کر نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) رکھ دیا گیا۔ (۵۵) ۱۹۶۳ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو کے مرکزی وزیر بننے کے باعث ان کی قومی اسمبلی کی نشست خالی ہوئی تو عبدالحمید جتوئی نے اس نشست پر بھٹو کے چچا پیر بخش بھٹو سے انتخاب لڑا مگر وہ ایوب کھوڑو اور قاضی فضل اللہ کی حمایت حاصل ہونے کے باوجود شکست کھا گئے (۵۶) ۱۹۶۵ء میں وہ کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۵۷)

۱۹۷۰ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایم این اے بنے مگر پیپلز پارٹی کے پورے دور حکومت میں وہ بھٹو کی پالیسیوں کو ہدف تنقید بناتے رہے بھٹو کے دور میں مارشل لاء کے مسئلے پر ان کا پارٹی سے اختلاف ہوا تو انہوں نے علی احمد تالپور، راؤ خورشید اور میاں محمود علی قصوری کے ساتھ مل کر پارٹی میں باغی گروپ بنایا (۵۸) ۱۹۷۵ء میں انہوں نے پیپلز پارٹی کا ٹکٹ لینے سے انکار کر دیا اور اپنی جگہ اپنے بیٹے لیاقت علی جتوئی کو قومی اسمبلی کا انتخاب لڑوایا۔ ضیاالحق کے دور میں انہوں نے میر غوث بخش بزنجو کی پاکستان نیشنل پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور بحالی جمہوریت کے لیے جدوجہد کی (۵۹)

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں جب غلام مصطفیٰ جتوئی، ممتاز علی بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ، مخدوم

طالب المولیٰ اور پیر آف رانی پور جیسے با اثر وڈیروں نے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا تو گورنر سندھ لیفٹیننٹ جنرل جہانداد خان کی ایما پر سندھ کے جو بعض با اثر وڈیرے امیدواروں کی صف میں شامل ہوئے ان میں عبدالحمید جتوئی بھی شامل تھے۔ وہ اس انتخاب میں این اے ۷۹ دادو ۳ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۶۰) ۱۹۸۸ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ریلے کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور بُری طرح سے شکست کھا گئے۔ (۶۱) ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں بھی وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ (۶۲)

۱۹۹۳ء کے انتخابات سے پہلے عبدالحمید جتوئی نے مسلم لیگ (نواز شریف گروپ) میں شمولیت کا اعلان کیا اور اس انتخاب میں انہوں نے اسی جماعت کے پلیٹ فارم سے قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا وہ پیپلز پارٹی کے امیدوار رفیق احمد مہیسر سے بُری طرح شکست کھا گئے (۶۳)

۱۹۹۷ء کا انتخاب بھی انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر لڑا اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۶۴) ۱۹۹۷ء ہی میں ان کے صاحبزادے اعجاز جتوئی کی ناگہانی موت نے انہیں بجھا کر رکھ دیا۔ ۱۰ جنوری ۲۰۰۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۶۵)

عبدالحمید جتوئی کے دو صاحبزادگان بھی عملی سیاست میں ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے لیاقت جتوئی ۱۹۷۷ء میں پہلی مرتبہ اسمبلی کے رکن بنے تھے۔ (۶۶) ۱۹۸۱ء میں وہ مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۸۵ء میں وہ بلا مقابلہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۶۷) ۱۹۹۰ء میں انہوں نے سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا اور اس مرتبہ نہ صرف ایم پی اے بننے میں کامیاب ہوئے۔ (۶۸) بلکہ جام صادق علی اور مظفر حسین شاہ' دونوں وزرائے اعلیٰ کی کابینہ میں وزیر خزانہ کے طور پر بھی شامل رہے۔ (۶۹) ۱۹۹۳ء میں جب مرکز میں نواز شریف حکومت معزول ہوئی تو لیاقت جتوئی نے بھی استعفیٰ دے کر سندھ کی حکومت کو متزلزل کرنا چاہا۔ مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ (۷۰) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں لیاقت جتوئی سندھ اسمبلی کے رکن اور بعدازاں وزیراعلیٰ منتخب ہوئے (۷۱) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا اور دونوں میں کامیابی حاصل کی (۷۲) تاہم بعد میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی۔ اس نشست پر ضمنی انتخاب میں ان کے چھوٹے بھائی احسان علی جتوئی کامیاب ہوئے (۷۳) لیاقت علی جتوئی' میر ظفر اللہ جتوئی کی کابینہ میں صنعت و پیداوار (۷۴) اور شوکت عزیز کی کابینہ میں پانی اور بجلی کے وزیر بنائے گئے (۷۵)

لیاقت جتوئی کے ایک اور بھائی اعجاز جتوئی ۱۹۸۸ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۷۶) ان کا شمار قوم پرست رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ ۱۹۸۸ء ہی میں انہوں نے صوبائی

اسمبلی کا انتخاب بھی لڑا تھا مگر وہ اس انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ (۷۷) انہوں نے ۱۶ ستمبر ۱۹۹۷ء کو امریکا میں وفات پائی۔ وہ اس وقت بھی سینٹ کے رکن تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی نشست پر ان کے بھائی صداقت علی جتوئی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے (۷۸) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں صداقت علی جتوئی سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۷۹)

عبدالحمید جتوئی کے کزن عبدالمجید جتوئی نے بھی کچھ عرصہ عملی سیاست میں گزارا تھا وہ ۱۹۵۳ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۸۰) اور بعد ازاں مغربی پاکستان کی پہلی اسمبلی کے رکن بھی رہے تھے۔ (۸۱)

داود کے جتوئی خاندان میں سیاست کا سلسلہ اب اگلی نسل تک پہنچ چکا ہے اور اکتوبر ۲۰۰۵ء میں لیاقت علی جتوئی کے صاحبزادے کریم علی جتوئی' داود کے ضلعی ناظم منتخب ہونے میں کامیاب ہو چکے ہیں (۸۲)

حوالہ جات

۱۔ جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری۔ بلوچستان تاریخ کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ مترجم پروفیسر سعید احمد رفیق۔ ص ۵۲۹

۲۔ آفاق احمد۔ سردار سیاست۔ ماہنامہ سرگزشت کراچی۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۹

۳۔ شیخ صادق علی شیر علی انصاری۔ دی مسلمان ریسنر فاؤنڈان سندھ' بلوچستان اینڈ افغانستان کراچی۔ ص ۲۲

۴۔ محمد حیات خان بیدار بلوچ۔ تواریخ بلوچان۔ لاہور۔ حصہ دوم۔ ص ۲۷

۵۔ جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری۔ بلوچستان تاریخ کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ مترجم پروفیسر سعید احمد رفیق۔ ص ۵۲۹' ۵۳۰

۶۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ حیدر آباد۔ جلد اوّل۔ ص ۶۱ تا ۶۳

۷۔ خالد شمس الحسن۔ سندھس فائٹ فار پاکستان۔ کراچی۔ ص ۲۴۵' ۲۴۶

۸۔ حکومت سندھ۔ سندھ لیجسلیٹو اسمبلی ڈبیٹس ۱۹۵۴ء۔ کراچی۔ اشاریہ اور فہرستیں۔ ص ۸

۹۔ نذیر لغاری۔ سیاست دوراں۔ کراچی۔ ص ۲۲ تا ۲۵

۱۰۔ دی ایف آگئیف۔ سندھ تاریخ کے آئینہ میں۔ ترجمہ ڈاکٹر محمود صادق۔ کراچی۔ ص ۳۲۷

۱۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۳۷

۱۲۔ اظہر سہیل۔ جنرل ضیاء کے ۱۱ سال۔ لاہور ص ۳۳' ۳۴

۱۳۔ پروفیسر غفور احمد۔ جنرل ضیاء کے آخری ۱۰ سال۔ لاہور۔ ص ۲۳۶

۱۴۔ طارق اسمٰعیل۔الیکشن ۸۸ء۔لاہور۔ص ۵۶۷'۵۶۸

۱۵۔ اظہر سہیل۔سازشوں کا دور۔لاہور۔ص۱۰۵'۱۰۶

۱۶۔ عابد تہامی۔انتخابات ۹۰ء کا وائٹ پیپر۔لاہور۔ص ۴۲

۱۷۔ احمد سلیم۔سیاستدانوں کی جبری نا اہلیاں۔لاہور۔ص ۱۷۵'۱۷۶

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔جلد دوم۔ص ۴۵'۵۳۶

۱۹۔ منیر احمد۔پاکستان میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کا سیاسی کردار۔لاہور۔ص ۳۵۵ تا ۳۵۸

۲۰۔ نذیر لغاری نئے وزیر اعلیٰ' توقعات اور خدشات روزنامہ جنگ کراچی۔۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء

۲۱۔ منیر احمد۔پاکستان کے سیاسی اتحاد۔لاہور۔۱۷۹ تا ۱۹۰

۲۲۔ اظہر سہیل۔ایجنسیوں کی حکومت۔لاہور۔ص ۱۱۳' ۱۱۴

۲۳۔ محمود غزنوی۔قبضہ گروپ کی کابینہ۔ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔۲۰ر مئی ۱۹۹۰ء۔ص ۱۶

۲۴۔ مظہر عباس۔مین فار آل سیزنز۔ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ستمبر ۱۹۹۳ء۔ص ۵۲' ۵۳

۲۵۔ روزنامہ جنگ کراچی۔۱۵ر ستمبر ۱۹۹۳

۲۶۔ طارق اسمٰعیل۔الیکشن ۸۸ء۔لاہور۔ص ۳۶۳

۲۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔جلد دوم ص ۱۱۹

۲۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء جلد دوم۔ص ۷۵

۲۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔لاہور۔رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔جلد دوم۔ص ۳۱۶'۴۳

۳۰۔ موسیٰ خان جلال زئی۔کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟ لاہور۔ص ۴۸۶

۳۱۔ دی گزٹ آف پاکستان اسلام آباد ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۴۵۵

۳۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔جلد دوم۔ص ۴۴۷

۳۳۔ موسیٰ خان جلال زئی۔کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟ لاہور۔ص ۴۸۷

۳۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ص ۴۴۸

۳۵۔ مومن بلو۔چارلس نیپئر کان محمد میاں سومری تائیں۔حیدر آباد۔ص ۷۵۸

۳۶۔ گزٹ آف پاکستان۔اسلام آباد۔۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۴۵۸

۳۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔۲۵ر جون ۲۰۰۱ء

۳۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔جلد دوم ص ۲۳۸

۳۹۔ ایضاً۔جلد اوّل۔ص ۲۸۷

۴۰۔ کے ایچ اعوان۔الیکشن ان پاکستان۔کراچی۔ص ۲۸۲

۴۱۔ گزٹ آف پاکستان۔اسلام آباد۔ ۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء۔ص ۹۲۳۴

۴۲۔ ایضاً۔۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۴۵۸

۴۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔جلد دوم۔ص ۱۱۹

۴۴۔ روزنامہ ڈان کراچی۔۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۴۵۔ پارلیمنٹ ہاؤس۔اسلام آباد۔سینٹ آف پاکستان ڈائرکٹری آف ممبرز۔مارچ ۱۹۹۴۔ص ۷۸

۴۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔جلد دوم۔ص ۷۵

۴۷۔ ایضاً۔ص ۲۴۰

۴۸۔ گزٹ آف پاکستان۔اسلام آباد۔ ۱۱/نومبر ۱۹۹۰ء۔ص ۹۳۲۳

۴۹۔ ایضاً۔۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۴۰۲

۵۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔جلد دوم۔ص ۴۳۸

۵۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء جلد دوم۔ص ۲، ۲۳۶

۵۲۔ ایضاً۔ص ۳۸۵

۵۳۔ ارشاد امین۔پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء۔(جلد اوّل)۔لاہور۔ص ۱۹۹

۵۴۔ ایضاً۔ص ۱۹۹

۵۵۔ ایضاً۔ص ۱۹۹

۵۶۔ سید جعفر احمد۔کنفیڈریشن راہ نجات یا راہ فرار۔کراچی۔ص ۸۴، ۸۵

۵۷۔ ارشاد امین۔پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء۔(جلد اوّل)۔لاہور۔ص ۱۹۹

۵۸۔ ایضاً۔ص ۱۹۹

۵۹۔ ایضاً۔ص ۱۹۹

۶۰۔ طارق اسمٰعیل۔الیکشن ۸۵ء۔لاہور۔ص ۴۶۰

۶۱۔ طارق اسمٰعیل۔الیکشن ۷۷ء۔لاہور۔ص ۳۵۱، ۳۵۳

۶۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔اسلام آباد۔ ۱۱/نومبر ۱۹۹۰ء ص ۹۲۳۸

۶۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔اسلام آباد۔۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۳۱۱

۶۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔جلد دوم۔ص ۱۳۶

۶۵۔ روزنامہ ڈان کراچی۔یکم جنوری ۲۰۰۵ء

۶۶۔ ایس محمد رضا۔پرسنز ہوشیپ اور ڈیسٹنی۔کراچی۔ص ۲۴۳

۶۷۔ طارق اسمٰعیل۔الیکشن ۸۸ء۔لاہور۔ص ۳۵۱

۶۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱/اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ص ۹۳۴۳

۶۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد، رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۳۳۸

۷۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹/مارچ ۱۹۹۳ء

۷۱۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ص ۲۶۱

۷۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم ص ۸۲، ۲۶۶

۷۳۔ ایضاً۔ص ۳۸۶

۷۴۔ پلڈاٹ۔پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے ارکان کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ص ۵۴۲

۷۵۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳/ستمبر ۲۰۰۴ء

۷۶۔ پارلیمینٹ ہاؤس اسلام آباد، سینٹ آف پاکستان۔ ڈائرکٹری آف ممبرز۔ مارچ ۱۹۹۴ء۔ ص ۸۱

۷۷۔ طارق اسمٰعیل۔الیکشن ۸۸ء۔لاہور۔ص ۳۷۱

۷۸۔ پارلیمنٹ ہاؤس۔ سینٹ آف پاکستان، ڈائرکٹری آف ممبرز۔ (چوتھا ایڈیشن)۔اسلام آباد ص ۱۶۰

۷۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء حصہ دوم۔ ص ۲۶۳

۸۰۔ حکومت سندھ۔سندھ لیجسلیٹو اسمبلی ڈبیٹس۔۱۹۵۴ء۔ کراچی۔ اشاریہ اور فہرستیں۔ص ۹

۸۱۔ محکمہ تعلقات عامہ۔مغربی پاکستان۔مغربی پاکستان سالانہ جائزہ ۱۹۵۸ء۔لاہور۔ص ۲۶۶

۸۲۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء

جونیجو

پاکستان کے سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو کی شخصیت بھی عجب مرنجاں مرنج تھی۔ وہ پاکستان میں سب سے بڑے سیاسی عہدے تک پہنچے مگر ہمیشہ دوسری شخصیات کے حوالے سے پہچانے گئے۔ شروع شروع میں سیاست میں ان کی وجہ شناخت یہ تھی کہ وہ لاڑکانہ کے مشہور سیاست دان نواب امیر علی لاہوری کے داماد ہیں اور جب نواب صاحب کا انتقال ہو گیا تو ان کی وجہ شناخت یہ بنی کہ وہ پیر پگاڑا کے ایک نہایت وفادار اور قابل اعتماد مرید ہیں۔

معروف صحافی اظہر سہیل مرحوم نے اپنی کتاب سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک میں ان کا تعارف جن الفاظ میں کروایا تھا غالباً وہی ان کا سب سے جامع تعارف تھا۔ اظہر سہیل نے لکھا تھا:

''محمد خان جونیجو بلا شبہ اپنی وضع کے ایک ہی آدمی تھے۔ ان کا سا وزیراعظم اس ملک کو نہ پہلے ملا اور نہ شاید آئندہ ملے گا۔ وہ قائد ملت تھے نہ قائد عوام، ان کے پیچھے نہ کسی تحریک کی طاقت تھی نہ کسی جماعت کی قوت۔ وہ ایک طویل غیر سیاسی دور کے بعد ہونے والے غیر جماعتی انتخابات کی پیداوار تھے جنہیں جماعت بن جانے کے بعد بھی ان کے ساتھیوں نے دل سے اپنا قائد کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ہمارے ہاں سیاست میں ہیرو وہی بنتا ہے جو خود کو اچھا ''قائد'' منوالے۔ محمد خان جونیجو سے یہ نہ ہو سکا کیونکہ ان کی طاقت کا سرچشمہ محض دو افراد تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق اور پیر صاحب پگاڑا۔ مگر ان دونوں کا معاملہ بھی یہ رہا کہ ایک نے انہیں قابل اعتبار نہیں سمجھا اور دوسرے کا اعتبار انہوں نے خود کھو دیا۔

تین سالہ جمہوری دور کا قیام جنرل محمد ضیاء الحق کی طویل منصوبہ بندی کا محض ایک حصہ تھا، جسے بدقسمتی سے جونیجو صاحب مستقل اور مکمل جمہوری دور سمجھ بیٹھے۔ ان کا مسئلہ ذوالفقار علی بھٹو کا بت بھی تھا، جسے وہ اپنی ذہانت یا مقناطیسی شخصیت کے بل پر نہ توڑ سکے تو علاج معکوس کے طور پر خود کو شرافت کا نمونہ بنا کر پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ بھٹو کو جس انداز میں کیسانووا بنایا جا چکا ہے اس کے بعد ان کے طرز شرافت کو عوامی سطح پر زبردست پزیرائی حاصل ہو گی۔ عوام میں

بالعموم انہیں آج بھی ایک شریف اور مظلوم آدمی سمجھا جاتا ہے، جس نے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی، مگر اس کے اپنے ساتھ زیادتی ہوگئی''(۱)

محمد خان جونیجو ۱۸/اگست ۱۹۳۲ء کو ضلع سانگھڑ کی تحصیل کھپرو کے موضع سندھڑی کے ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام دین محمد جونیجو تھا۔ محمد خان جونیجو نے اپنی ابتدائی تعلیم میر پور خاص طور کراچی کے سینٹ پیٹرکس اسکول میں حاصل کی۔ بعد ازاں وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان اور امریکا بھی گئے جہاں سے انہوں نے زراعت میں ڈگریاں حاصل کیں۔(۲)

محمد خان جونیجو کے سیاسی کیریئر کا آغاز ۱۹۵۴ء میں ہوا جب وہ صرف ۲۲ سال کی عمر میں ضلع کونسل سانگھڑ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے اور ۱۹۶۳ء میں صوبائی وزیر بھی بن گئے۔ ان کے پاس صحت، بنیادی جمہوریت، محنت اور مواصلات کے قلم دان تھے۔ ۱۹۶۵ء میں وہ دوسری مرتبہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن اور صوبائی وزیر بنے اس مرتبہ انہیں مواصلات اور ورکس کا قلم دان سونپا گیا۔ ان کے عہدوزارت کے اہم کارناموں میں کراچی سرکلر ریلوے اور حیدر آباد اور کراچی کے درمیان سپر ہائی وے کی تعمیر شامل ہیں۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے انتخابی عمل میں محمد خان جونیجو کا نام نظر نہیں آیا۔ تاہم ۵/ جولائی ۱۹۷۸ء کو مارشل لاء کی پہلی سالگرہ پر جنرل محمد ضیاء الحق نے جب اپنی کابینہ کے ناموں کا اعلان کیا تو اس میں پاکستان قومی اتحاد سے تعلق رکھنے والے کچھ سیاستدان بھی شامل تھے۔ انہی سیاستدانوں میں سے ایک محمد خان جونیجو تھے، جنہیں اس منصب کے لیے پیر پگاڑا نے نامزد کیا تھا۔ انہیں ریلویز کا قلمدان دیا گیا تھا۔ وہ اس منصب پر ۲۱/اپریل ۱۹۷۹ء تک فائز رہے۔(۴)

اسی دوران ایک واقعہ پیش آیا کہ بعض سیاسی امور پر اختلاف کے باعث اس کابینہ میں پیر پگاڑا کے نامزد کردہ مسلم لیگی وزراء نے بغاوت کر دی۔ ان وزراء میں چودھری ظہور الٰہی اور میاں زاہد سرفراز پیش پیش تھے۔ ان وزراء نے جب محمد خان جونیجو کی حمایت حاصل کرنا چاہی تو وہ آمادہ نہ ہوئے بلکہ انہوں نے صاف صاف اعلان کر ڈالا ''میں وزارت سے استعفیٰ دے دوں گا مگر پیر صاحب سے غداری نہیں کروں گا''۔ کہا جاتا ہے کہ محمد خان جونیجو کا یہی طرز عمل تھا جس نے پیر پگاڑا اور ان کے درمیان ہم آہنگی اور مضبوط اعتماد کا جنم دیا اور انہوں نے اپنے روحانی پیشوا کے دل میں اتنی جگہ بنالی کہ وہ ملک کے سب سے بڑے عہدے کے لیے انہیں ادھار دینے پر تیار ہو گئے۔(۵)

۲۵/فروری ۱۹۸۵ء کو ملک بھر میں قومی اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے۔ مگر محمد خان جونیجو ان سات افراد میں سے ایک تھے جو ان انتخابات میں بلا مقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔(۶) یہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر منعقد ہوئے تھے۔ چنانچہ انتخابات کے بعد کم سے کم پانچ امیدوار ایسے تھے جو وزیر اعظم بننے کی دوڑ میں سب سے آگے تھے۔ ان امیدواروں میں محمد خان جونیجو کے علاوہ

الٰہی بخش سومرو، ظفر اللہ جمالی، محمد اسلم خٹک اور مخدوم حامد رضا گیلانی شامل تھے۔ جمالی صاحب کو کم عمر اور جذباتی نوجوان سمجھ کر مسترد کر دیا گیا۔ حامد رضا گیلانی پنجابی ہونے کے باعث رہ گئے اور محمد اسلم خٹک چیئرمین سینٹ جناب غلام اسحٰق خان کی وجہ سے چھوڑ دیئے گئے سو قرعہ فال الٰہی بخش سومرو یا محمد خان جونیجو میں سے کسی ایک کے نام پڑنے والا تھا۔ دونوں سندھی اور تقریباً ایک ہی حیثیت کے زمین دار تھے ایک کو اگر پیر پگاڑا کی مکمل سرپرستی حاصل تھی تو دوسرے کو بھی ان کی دوستی کا دعوا تھا مگر ۲۲ر مارچ ۱۹۸۵ء کو جب صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ ملک کے اگلے وزیر اعظم محمد خان جونیجو ہوں گے تو باقی تمام امیدواروں کے وزیر اعظم بننے کی افواہیں دم توڑ گئیں۔(۷)

محمد خان جونیجو کے بارے میں جنرل ضیاء الحق کا قیاس تھا کہ وہ ایک تابع مہمل قسم کے وزیر اعظم ثابت ہوں گے اور وہ ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں گے جیسا ذوالفقار علی بھٹو، فضل الٰہی چودھری کے ساتھ کرتے تھے مگر محمد خان جونیجو نے وزیر اعظم کے عہدے کا حلف اٹھانے کے بعد پہلی ہی تقریر میں اعلان کر دیا کہ مارشل لاء اور جمہوریت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ پھر چند ماہ بعد ۱۴ر اگست ۱۹۸۵ء کو انہوں نے مینار پاکستان پر تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مارشل لاء ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۵ء تک اٹھالیا جائے گا۔

جنرل ضیاء الحق نے محمد خان جونیجو کے اس اعلان کا پاس کیا اور ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو ملک سے مارشل لاء کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ تاہم اس دوران وہ قومی اسمبلی سے آٹھویں ترمیم کا بل منظور کروانا نہیں بھولے جس کی بدولت نہ صرف ان کے گزشتہ آٹھ سالہ غیر آئینی اقدامات کو آئینی تحفظ مل گیا بلکہ اسمبلیاں توڑنے اور وزیر اعظم کو برطرف کرنے کا اختیار بھی ان کے ہاتھ میں آ گیا۔

اگلے دو ڈھائی برس میں محمد خان جونیجو کے کئی اقدامات، جنرل ضیاء الحق نے کڑوا گھونٹ سمجھ کر قبول کیے۔ جنرل ضیاء الحق کے سب سے معتمد اور طاقت ور سیکرٹری اطلاعات جنرل مجیب الرحمٰن کو وہ ۱۹۸۵ء میں ان کے عہدے سے ہٹا چکے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں انہوں نے پہلے تو کابینہ میں جنرل ضیاالحق سے خصوصی تعلق رکھنے والے تین وزراء ڈاکٹر محبوب الحق، ڈاکٹر محمد اسد اور بیگم عطیہ عنایت اللہ کو فارغ کیا وہیں انٹلی جنس بیورو کے ڈائرکٹر، میجر جنرل آغا نیک محمد کو بھی ان کے عہدے سے سبک دوش کر دیا۔ اسی برس اپریل میں بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی پر ان کے پرجوش استقبال میں بھی محمد خان جونیجو نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ یہ بات بھی جنرل ضیاء الحق کو شدید ناگوار گزری۔

۱۹۸۷ء میں انہوں نے جنرل ضیاء الحق کے دو قابل اعتماد اور دیرینہ ساتھیوں جنرل رحیم الدین اور جنرل کے ایم عارف کی ملازمتوں میں توسیع کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی برس انہوں نے وہ بجٹ پیش کروایا جس میں ڈیفنس ٹیکس نافذ کیا گیا اور یوں عوام چیخ اٹھے کہ فوج کرتی ہی کیا ہے جس کے لیے مزید اربوں روپے درکار ہیں۔ اسی بجٹ میں انہوں نے جرنیلوں کو چھوٹی کاروں میں بٹھانے کا

اعلان کیا جس پر حاضر سروس فوجی ہی نہیں، ریٹائرڈ فوجی بھی بلبلا اٹھے۔

اسی برس دفتر خارجہ پر بھی محمد خان جونیجو کی گرفت مضبوط ہوگئی اور انہوں نے صاحبزادہ یعقوب علی خان کو وزیر خارجہ کے منصب سے ہٹا کر زین نورانی کو امور خارجہ کا وزیر مملکت مقرر کر دیا۔ ہی وہ زمانہ تھا جب مسئلہ افغانستان کے حل کی طرف تیزی سے پیش رفت ہو رہی تھی۔ صاحبزادہ یعقوب علی کے منظر پر سے ہٹ جانے کی وجہ سے روس نے بڑی سرعت سے پینترے بدلنے شروع کر دے۔ جنرل ضیاالحق نے اس جنگ میں روس کی شکست میں ایک کردار ادا کیا تھا۔ مگر اب جب اس جنگ کا فیصلہ ہونے والا تھا تو کھیل کی باگ ڈور ان کے ہاتھ سے چھین لی گئی تھی۔

محمد خان جونیجو نے افغانستان حل کرنے کا کریڈٹ لینے میں بڑی عجلت دکھائی اور وہ جنگ جو میدان میں جیتی جا چکی تھی بڑی حد تک مذاکرات کے میز پر ہار دی گئی۔

اس دوران ملک میں بدامنی کا دور دورہ رہا۔ خصوصاً کراچی میں لسانی فسادات اپنے عروج پر پہنچ گئے۔ سندھ کی حکومت ان فسادات کی روک تھام میں بالکل ناکام ہوگئی۔ مگر اس کے باوجود محمد خان جونیجو سندھ کے وزیراعلیٰ غوث علی شاہ کو ان کے عہدے سے ہر طرف کرنے میں لیت و لعل سے کام لیتے رہے۔ جب حالات قابو سے بالکل باہر ہو گئے تو ۶/اپریل ۱۹۸۸ء کو ان سے استعفیٰ لے لیا گیا مگر اس وقت تک خاصی دیر ہو چکی تھی۔ (۸)

۱۰/اپریل ۱۹۸۸ء کو راولپنڈی میں مسلح افواج کے فوجی ڈپو میں جو اوجڑی کیمپ کہلاتا تھا اچانک آگ لگ گئی۔ یہ ڈپو آئی ایس آئی کے اس شعبہ کی نگرانی میں چل رہا تھا جو جہاد افغانستان اور افغان مہاجرین کے حوالے سے پاکستان کی ایما پر معاملات کی باگ ڈور سنبھالے ہوا تھا۔

یہ ڈپو افغانستان کے مجاہدین کے لیے ''سپلائی ڈپو'' کا کام دیتا تھا۔ اس ڈپو میں آگ لگنے سے اس میں رکھے ہوئے میزائل چلنے شروع ہو گئے او، راولپنڈی اور اسلام آباد کا رہائشی علاقہ ان کی زد میں آ گیا اس واقعے میں سینکڑوں لوگ ہلاک ہوئے اور کروڑوں کی املاک کو نقصان پہنچا۔

افواہ یہ بھی تھی کہ یہ ڈپو آئی ایس آئی نے خود تباہ کروایا ہے کیونکہ امریکا کو شبہ تھا کہ افغان مجاہدین کے لیے فراہم کیا ہوا اسلحہ فوجی جرنیل ایران کو چوری چھپے فروخت کر رہے ہیں۔ امریکا نے پاکستان سے اسلحہ کا حساب مانگ لیا تھا اور امریکا کا ایک نمائندہ یہ ریکارڈ چیک کرنے کے لیے پاکستان آنے ہی والا تھا (۹)

محمد خان جونیجو نے اس واقعے کی تحقیقات کے لیے جنرل عمران اللہ کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی جس نے چند روز میں اپنی تحقیقاتی رپورٹ جونیجو صاحب کو پیش کر دی۔ جونیجو صاحب نے یہ رپورٹ وفاقی کابینہ کی ایک پانچ رکنی کمیٹی کے سپرد کی جس کا سربراہ وزیر مواصلات جناب محمد اسلم خٹک کو بنایا گیا۔

اسلم خٹک نے اپنی اس رپورٹ میں اس حادثے کو افغان جہاد کا ردعمل قرار دیا اور لکھا کہ قوموں کی تاریخ میں ایسے واقعات آتے ہی رہتے ہیں۔ اسلم خٹک نے اس واقعے کو بھول جانے پر زور دیا مگر کمیٹی کے ایک رکن رانا نعیم محمود نے جنہیں قاضی عبدالمجید عابد اور ابراہیم بلوچ کی حمایت حاصل تھی۔ اس سے اختلاف کیا اور واقعے کے ذمہ دار افسران کے خلاف کارروائی کرنے کی تجویز پیش کی۔ ان افسران میں جنرل اختر عبدالرحمٰن اور جنرل حمید گل شامل تھے۔

اس رپورٹ پر محمد خان جونیجو نے دونوں افسران کو برطرف کرنے کا فیصلہ کیا مگر ظاہر ہے یہ صورت حال جنرل ضیاء الحق کے لیے قابل قبول نہیں تھی اس لیے اس سے پیشتر کہ محمد خان جونیجو اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہناتے۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء الحق نے محمد خان جونیجو ہی کو برطرف کر کے جمہوریت کی بساط ہی الٹ دی (۱۰) بقول ایک مبصر کے ''یہ گویا جنرل صاحب کی تین سالہ کلفت کا خمیازہ تھا۔ گزشتہ تین برسوں کے دوران محمد خان جونیجو انہیں جو چھوٹے موٹے چرکے لگاتے رہے تھے' آج ایک ہی وار میں ایک ہی بھیانک گھاؤ ڈال کر انہوں نے اس کا بدلہ لے لیا تھا''۔ (۱۱)

جونیجو حکومت کے خاتمے کے بعد ضیاء نے اپنی نئی کابینہ تشکیل دی۔ انہوں نے شریعت آرڈی نینس جاری کیا اور شریعت کو ملک کا اعلیٰ ترین سرچشمہ قانون قرار دیا۔

ادھر محمد خان جونیجو' بدستور پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ جنرل ضیاء کی آشیرواد پر ۱۳ اگست ۱۹۸۸ء کو اسلام آباد ہوٹل میں پاکستان مسلم لیگ کے اجلاس میں زبردست ہنگامہ آرائی ہوئی جس کے نتیجے میں مسلم لیگ کے دو دھڑے بن گئے۔ ایک دھڑے کے سربراہ بدستور محمد خان جونیجو رہے جبکہ دوسرے دھڑے کے صدر فدا محمد خان بنے اور نواز شریف نے سیکرٹری جنرل کا منصب سنبھال لیا۔ (۱۲)

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء الحق اور ان کے رفقاء ایک فضائی حادثے میں لقمۂ اجل بن گئے ان کی وفات کے بعد فوج کے سروس چیفس نے ایک ہنگامی اجلاس میں سینٹ کے چیئرمین غلام اسحٰق خان کو صدر کے منصب پر فائز کرنے کا فیصلہ کیا۔ ضیاء الحق کے طویل مارشل لاء کی بنا پر عوام فوج کی سیاست میں مداخلت سے بیزار ہو چکے تھے لہٰذا حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ عام انتخابات منعقد کروا دیے جائیں۔ ادھر جنرل ضیاء الحق کی وفات کے بعد کالعدم قومی اسمبلی کے ارکان نے' جن کی قیادت حاجی سیف اللہ خان کر رہے تھے' لاہور ہائی کورٹ میں جنرل ضیاء الحق کے اسمبلی توڑے جانے کے اقدام کے خلاف رٹ دائر کر دی۔

۲۷ ستمبر ۱۹۸۸ء کو لاہور ہائی کورٹ نے جنرل ضیاء الحق کے اسمبلیاں توڑے جانے کے حکم کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ حامد ناصر چٹھہ نے فوری طور پر قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کا حکم جاری کر دیا مگر اس سے پہلے کہ یہ اجلاس منعقد ہوتا' ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء کو سپریم کورٹ نے لاہور ہائی کورٹ

کے اس حکم کو معطل کر دیا۔

۵/اکتوبر کو سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ سنایا جس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ اس وقت پوری قوم انتخابات کی تیاری میں لگی ہوئی ہے اس لیے سابقہ اسمبلی کی بحالی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یوں سپریم کورٹ نے گومگو کی کیفیت ختم کر کے واضح طور پر حکم جاری کیا کہ آئندہ انتخابات ہر صورت میں ۱۶/نومبر ۱۹۸۸ء کو منعقد کیے جائیں۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے پیچھے اصل کہانی کا انکشاف کئی برس بعد ہوا جب اس وقت کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ انہوں نے عدالت عظمیٰ کو اسمبلیاں بحال نہ کرنے کا پیغام بھیجا تھا۔ جب عدالت نے جنرل اسلم بیگ کو توہین عدالت کے جرم میں عدالت میں بلایا تو انہوں نے مزید انکشاف کیا یہ پیغام اس وقت کے وزیر قانون جناب وسیم سجاد کی وساطت سے بھیجا گیا تھا (۱۳)

صدر غلام اسحٰق خان اور جنرل مرزا اسلم بیگ نے عدالت عالیہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس بات کو یقینی بنایا کہ انتخابات اپنے موجودہ وقت پر ہی منعقد ہوں چنانچہ ۱۶/نومبر ۱۹۸۸ء کو قومی اسمبلی اور ۱۹/نومبر ۱۹۸۸ء کو چاروں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد ہوئے۔ ان انتخابات میں محمد خان جونیجو اور فدا محمد خان کی مسلم لیگوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا۔

ان انتخابات میں محمد خان جونیجو نے اپنے سابق حلقے کی بجائے ایک دوسرے حلقے این اے ۱۸۱ سانگھڑ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے شاہنواز جونیجو سے تقریباً ۱۹ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔

۱۹۹۰ء میں انہوں نے ایک کی بجائے تین حلقوں سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ یہ حلقے تھے این اے ۶۲ فیصل آباد، این اے ۱۷۵ تھرپارکر۲ اور این اے ۱۸۱ سانگھڑ ا۔ ان میں سے آخری نشست پر انہوں نے زیادہ فعالیت سے حصہ نہیں لیا اس لیے اس نشست پر وہ شکست کھا گئے اور جبکہ اول الذکر دونشستوں پر وہ کامیاب ہوگئے۔ بعد میں انہوں نے این اے ۶۲ فیصل آباد ۶ کی نشست خالی کردی جس پر ضمنی انتخاب میں راجہ نادر پرویز کامیاب ہوگئے (۱۴)۔

ان انتخابات کے بعد وزارت عظمیٰ کے ایک ممکنہ امیدوار محمد خان جونیجو بھی تھے مگر یہ بازی نواز شریف نے جیت لی اور یوں وہ ملک کے ۱۴ویں وزیراعظم بن گئے۔ ابھی نواز شریف کی وزارت عظمیٰ کا سلسلہ جاری تھا کہ محمد خان جونیجو شدید علیل ہوگئے۔ انہیں علاج کے لیے امریکا لے جایا گیا۔ مگر وہ ۱۸/مارچ ۱۹۹۳ء کو انتقال کر گئے۔ ۲۰/مارچ ۱۹۹۳ء کو انہیں ان کے آبائی گاؤں سندھڑی میں سپرد خاک کردیا گیا (۱۵)

سندھڑی میں محمد خان جونیجو کی تدفین کے موقع پر مسلم لیگی رہنماؤں کی باہمی کشیدگی کھل کر

سامنے آ گئی۔ ۲۴ مارچ ۱۹۹۳ء کو اسلام آباد میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں ملک کے وزیراعظم محمد نواز شریف کو پاکستان مسلم لیگ کا اگلا صدر نامزد کر دیا گیا حامد ناصر چٹھہ اور انور سیف اللہ نے ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں اس فیصلے کی مزاحمت کا اعلان کیا۔ اسی دن حامد ناصر چٹھہ، انور سیف اللہ اور محمد خان جونیجو کے صاحبزادے اسد جونیجو جو نواز شریف کے مشیر کے فرائض انجام دے رہے تھے، اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

محمد نواز شریف کے مسلم لیگ کے صدر بننے سے مسلم لیگ تین دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک دھڑے کی صدارت تو نواز شریف نے سنبھالی جبکہ دوسرے افراد، جن کا موقف تھا کہ سیاسی عہدہ اور حکومت عہدہ ایک شخصیت میں مرتکز نہ ہوں انہوں نے ایک نئے دھڑے کی بنیاد ڈال دی۔ اس دھڑے کو مسلم لیگ (جونیجو گروپ) کا نام دیا گیا۔ اس دھڑے کے صدر حامد ناصر چٹھہ، منتخب ہوئے جبکہ محمد خان جونیجو کے صاحبزادے اسد جونیجو کو اس کا چیف آرگنائزر بنا دیا گیا۔ دیگر عہدے داروں میں ظفر اللہ جمالی، منظور وٹو، میر افضل، تاج محمد جمالی اور خیر محمد بھرگڑی شامل ہوئے جبکہ تیسرا دھڑا پیر پگارا کی صدارت میں بدستور کام کرتا رہا۔ اس گروپ کو مسلم لیگ (پگارا گروپ) کا نام دیا گیا (۱۶)

محمد خان جونیجو کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے اسد جونیجو نے سیاست کے میدان میں نمایاں ہونے کی کوشش کی۔

اپریل ۱۹۹۳ء میں میر بلخ شیر مزاری کی نگراں کابینہ میں وہ پہلی مرتبہ وفاقی وزیر بنے (۱۷)۔

اکتوبر ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں اسد جونیجو نے مسلم لیگ (جونیجو گروپ) کے چیف آرگنائزر ہونے کی وجہ سے حصہ نہیں لیا۔ فروری ۱۹۹۷ء میں انہوں نے دو حلقوں سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ یہ حلقے تھے این اے ۱۷۵ میر پور خاص کم عمر کوٹ اور این اے ۱۸۰ سانگھڑ۔ اول الذکر حلقے میں انہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے پیر نور محمد شاہ جیلانی نے شکست دی جبکہ دوسرے حلقے میں آزاد امیدوار حاجی میر بخش کامیاب ہوئے (۱۸) ۲۰۰۲ء میں بھی انہوں نے قومی اسمبلی کے دو حلقوں سے کاغذات نامزدگی جمع کروائے۔ یہ حلقے تھے این اے ۲۲۷ میر پور خاص ۲ اور این اے ۲۳۵ سانگھڑ ۲۔ پہلے حلقے سے تو انہوں نے انتخاب لڑنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی البتہ دوسرے حلقے میں انہوں نے بھرپور انتخابی مہم چلائی۔ تاہم اس حلقے سے بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے اور پاکستان مسلم لیگ (پگارا گروپ) کے قاضی عبدالقدوس راجپر سے تقریباً ۲۵ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۱۹)

اسد جونیجو کے مقابلے میں ان کی ہمشیرہ کنیز فضہ جونیجو ایک مرتبہ سینیٹ اور ایک مرتبہ قومی اسمبلی کی رکن بننے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔

کنیز فضہ جونیجو مارچ ۱۹۹۴ء میں پاکستان مسلم لیگ (جونیجو گروپ) کی جانب سے سینٹ آف پاکستان کی رکن منتخب ہوئی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی یہ رکنیت سندھ کی بجائے پنجاب

کی مخصوص نشستوں پر عمل میں آئی تھی (۲۰) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ سندھ سے پاکستان مسلم لیگ (ق) کی جانب سے خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن بنائی گئیں (۲۱)

اسد جونیجو اور کنیز فضہ جونیجو کی چھوٹی بہن کنیز صغریٰ جونیجو ہیں' وہ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں میرپور خاص کی ضلعی ناظمہ منتخب ہوئی ہیں (۲۲)

محمد خان جونیجو کے خسر نواب امیر علی لاہوری بھی بیسویں صدی کے اوائل میں سندھ کے ممتاز سیاستدانوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا تعلق لاڑکانہ کے لاہوری خاندان سے تھا۔

لاہوری خاندان اصل میں ذات کے کھرل ہیں جو پنجاب کے راجہ کرن سنگھ کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کی ذات کرن سے تبدیل ہوکر کھرل بنی ہے۔ (۲۳) یہ کرشن بھگوان کی اولاد میں سورج بنسی راجپوتوں کی شاخ ہے۔ ان کے بزرگ اُچ شریف میں آنے کے بعد مسلمان ہوئے اور شیعہ مسلک سے وابستہ ہوئے۔ مغل فوج میں بھرتی ہوکر انہوں نے بہت سی فتوحات کیں جس پر مغل بادشاہوں نے انہیں کمالیہ کے نزدیک بہت بڑی جاگیر عطا کی۔ یہ جاگیر رنجیت سنگھ کے زمانے میں ضبط ہوگئی' بتایا جاتا ہے کہ پنجاب میں ضلع کمالیہ کا نام بھی نواب امیر علی لاہوری کے پردادا کے نام پر رکھا گیا ہے۔

لاڑکانہ میں لاہوری خاندان کی بنیاد سرائی ابراہیم کھرل نے رکھی۔ جس کی اولاد میں سرائی بھوروخان' اس کا بیٹا حاجی فتح محمد خان اور سرائی تارو خاں لاہوری مشہور ہوئے ۱۹۰۵ء میں سرائی تاروخاں کی وفات کے بعد شاہ محمد لاہوری اس کا جانشین ہوا سرائی شاہ محمد لاہوری' نواب امیر علی لاہوری کے بھائی سرائی دُر محمد لاہوری کا بیٹا اور نواب امیر علی لاہوری کا داماد تھا۔ وہ اپریل ۱۹۱۷ء سے اکتوبر ۱۹۱۸ء تک میونسپل کمیٹی لاڑکانہ اور ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ کا پہلا منتخب نائب صدر رہا۔ اس وقت اس ادارے کے صدر کا عہدہ انگریزوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس نے اکتوبر ۱۹۱۸ء میں صرف ۲۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔

سرائی شاہ محمد لاہوری کی وفات کے بعد ان کے چچا اور سسر سرائی امیر علی لاہوری' قبیلے کے سربراہ بنے۔ اس وقت تک قانون منظور ہوگیا تھا کہ لاڑکانہ میونسپلٹی کا سربراہ مقامی شخص بھی بن سکتا ہے چنانچہ وہ اس ادارے کے پہلے عوامی صدر منتخب ہوئے اور اس عہدے پر ۱۹۴۰ء تک مستقل ۲۲ سال منتخب ہوتے رہے۔

انگریزوں نے سرائی امیر علی لاہوری کو او بی ای (آفیسر آف موسٹ ایکسیلنٹ آرڈر آف برٹش امپائر) اور خان بہادر کے خطابات عطا کیے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انہوں نے انگریزوں کی مدد کے لیے قائم کیے گئے فنڈ میں ایک لاکھ روپے بطور قرض دیے جس پر انگریزوں نے اسے نواب کا خطاب عطا کیا۔ اب وہ نواب امیر علی لاہوری کہلانے لگے تھے۔

نواب امیر علی لاہوری ۱۹۲۰ء میں بمبئی کی مجلس قانون ساز کے رکن اور سندھ کی بمبئی سے علیحدگی

کے بعد ۱۹۳۷ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے' انہیں لاڑکانہ کی سیاست کا بادشاہ کہا جاتا تھا(۲۴) مشہور سول سرونٹ سید ہاشم رضائے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''ہماری منزل'' میں نواب امیر علی لاہوری کا تعارف ان الفاظ کروایا ہے۔ (ہاشم رضا ان دنوں لاڑکانہ کے کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے)

''نواب لاہوری (ایک طویل عرصہ تک) سال بہ سال لاڑکانہ میونسپلٹی کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ مگر ۱۹۴۴ء میں وہ ایک ہندو سیاستدان تولانی سے شکست کھا گئے۔ نواب لاہوری کا مشغلہ خطابات جمع کرنا تھا۔ انہوں نے خان بہادر' نواب اور ادبی ای کے خطابات حاصل کیے۔ انہوں نے مجھ سے بھی کئی بار فرمائش کی کہ میں نائٹ ہڈ (سر) کے خطاب کے لیے ان کی سفارش کروں۔ تاہم انہیں یہ خطاب نہیں مل سکا''۔(۲۵)

نواب حاجی امیر علی لاہوری' آل انڈیا مسلم لیگ میں بھی شامل رہے۔ تاہم جب ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ نے اپنے ارکان سے کہا کہ وہ انگریزوں کے عطا کردہ خطابات واپس کردیں تو نواب لاہوری نے خطابات واپس کرنے کی بجائے مسلم لیگ چھوڑنے کو ترجیح دی(۲۶)

قیام پاکستان کے بعد نواب امیر علی لاہوری نے سیاست کو خیرباد کہہ دیا۔ ۱۰راگست ۱۹۶۶ء کو ان کا انتقال ہوگیا(۲۷)

نواب امیر علی لاہوری کے صاحبزادے نواب علی گوہر لاہوری بھی ایک مختصر دورانیے کے لیے سیاست کے میدان میں رہے۔ وہ ۱۲راکتوبر ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں جب قائداعظم نے لاڑکانہ کا دورہ کیا تو اس نے ان کے جلوس کے چیف گارڈ اور نواب نبی بخش بھٹو کے بنگلے کی نگہبانی کے فرائض انجام دیئے ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء تک وہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن رہے تھے انہوں نے اینگلو عربک کالج اجمیری گیٹ دہلی میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں بھی سندھ کی نمائندگی کی تھی۔ وہ اردو میں شاعری کرتے تھے اور یکتا تخلص کرتے تھے۔ ۱۹۹۸ء میں ۸۶ سال کی عمر میں بھی وہ سیاسی سرگرمیوں میں دلچسپی لے رہے تھے اور ایک اسلامی انقلابی سیاسی پارٹی جنداللہ کو منظم کررہے تھے۔(۲۸)

نواب امیر علی لاہوری کے دو داماد سیاست کے میدان میں نمایاں رہے۔ ان میں سے ایک تو محمد خان جونیجو تھے جن کا احوال اوپر گزر چکا۔ دوسرے داماد رئیس جان محمد جونیجو تھے۔ جو سندھ کی تاریخ میں ''رئیس المہاجرین'' کے لقب سے معروف ہیں(۲۹)

رئیس جان محمد جونیجو' حاجی کریم بخش جونیجو کے صاحبزادے تھے۔ وہ ۲رجنوری ۱۸۸۸ء کو لاڑکانہ کے ایک گاؤں دھامڑا پیدا ہوئے۔ رئیس جان محمد جونیجو نے سندھ مدرستہ الاسلام کراچی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۱۰ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لندن چلے گئے جہاں انہوں نے

۱۹۱۳ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں وطن واپس آ کر لاڑکانہ میں بیرسٹری کا پریکٹس کرنے لگے۔ اسی دوران وہ ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ لاڑکانہ کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔(۳۰)

۱۹۱۷ء میں جب رئیس غلام محمد بھرگڑی کی کوششوں سے کراچی میں سندھ مسلم لیگ کی شاخ قائم ہوئی تو اس کے اساسی ارکان میں جان محمد جونیجو بھی شامل تھے۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں منعقد ہونے والی آل انڈیا خلافت کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ برطانوی حکومت ۱۳/سے ۱۶/نومبر ۱۹۱۹ء کے دوران، ترکی کے حصے بخرے کرنے پر جو جشن منانے والی ہے اس کا بائیکاٹ کیا جائے اور ہندوستان بھر کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں خلافت عثمانیہ کی بقا و استحکام کے لیے دعائیں مانگی جائیں۔ اس کانفرنس میں سندھ کے متعدد اکابر کے دوش بدوش جان محمد جونیجو بھی شامل تھے چنانچہ سندھ میں جان محمد جونیجو اور پیر تراب علی شاہ نے اس احتجاج کے منائے جانے کا بڑی دھوم دھام سے اہتمام کیا۔ انہوں نے لاڑکانہ میں ایک جلسہ عام منعقد کیا اور ۴ کی بجائے ۵ دن مکمل ہڑتال کی۔

۴/جنوری ۱۹۲۰ء کو حیدر آباد (سندھ) میں پہلی خلافت کانفرنس کے انعقاد میں بھی جان محمد جونیجو پیش پیش تھے۔ انہی کی دعوت پر ۶/تا ۸/فروری ۱۹۲۰ء کو لاڑکانہ میں ایک سہ روزہ خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی جیسے اکابر نے بھی شرکت کی۔ اس کے بعد ۲/اور ۳/مئی ۱۹۲۰ء کو جیکب آباد میں مولانا تاج محمد امروٹی کی صدارت میں ایک صوبائی خلافت کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں تقریر کرتے ہوئے جان محمد جونیجو صاحب نے کہا کہ میں اپنی سرداری، اپنی کرسی کے دوسرے نمبر کا اعزاز، اپنی میونسپل کمشنری، لوکل بورڈ کی رکنیت اور بیرسٹری کی ڈگری غرض اپنی ہر چیز کو انگریزوں کو واپس کرتا ہوں، بلکہ اس کے ساتھ ہی اپنی زرعی زمین کا لگان اور آبیانہ بھی دینے سے انکار کرتا ہوں (۳۲)

یہ سندھ میں ترک موالات کا نقطۂ آغاز تھا۔ حکومت نے لگان اور آبیانہ ادا نہ کرنے پر ان کی زمینوں کا پانی بند کر دیا مگر جان محمد جونیجو نے اس کی پروا نہیں کی۔

جان محمد جونیجو نے ترک موالات پر اکتفا نہیں کہ بلکہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے ہندوستان سے افغانستان ہجرت کی تحریک بھی منظم کی۔ یہ ایک جذباتی فیصلہ تھا جس کے نتائج و عواقب کا پہلے سے اندازہ نہیں کیا گیا تھا چناچہ سندھ کے ہزاروں افراد ہجرت کر کے افغانستان پہنچ گئے مگر وہاں انہیں لاتعداد مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مسائل کے حل کے لیے جان محمد جونیجو ہندوستان واپس آئے جہاں انہوں مولانا محمد علی جوہر سے ملاقات کی اور ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا، اس سفر میں انہوں نے پچاس لاکھ روپے جمع کیے جو فوری طور پر افغانستان روانہ کر دیے گئے۔

جان محمد جونیجو اسی سفر کے دوران اپریل ۱۹۲۱ء میں اجمیر پہنچے جہاں وہ شدید بیمار پڑ گئے اور اسی بیماری میں ۱۶/اپریل ۱۹۲۱ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ اجمیر ہی میں ساگر تالاب کے کنارے آسودہ

خاک ہیں (۳۳)

محمد خان جونیجو کے ایک عزیز شاہنواز جونیجو بھی کچھ عرصے سیاست کے میدان میں رہے تھے۔ وہ ۱۹۳۲ء میں ایک متوسط زمیں دار حاجی سنجر خان جونیجو کے گھر پیدا ہوئے۔ شاہنواز جونیجو نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۶۲ء میں یونین کونسل کے انتخابات سے کیا۔ سیاست میں ان کی آمد کا سبب ایک سیاسی حریف فدا حسین ڈیرو کے والد کا قتل تھا۔ اس قتل میں نواب کالا باغ اور جام صادق علی ملوث تھے مگر وہ اپنی سیاسی پوزیشن کی وجہ سے بچ نکلے۔ شاہنواز جونیجو کو اس قتل کے الزام میں مختصر سے وقت کے لیے جیل جانا پڑا جس کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی سیاست کے میدان میں قدم رکھیں گے۔

۱۹۷۶ء میں شاہنواز جونیجو کو سانگھڑ میں چھ حروں کے قتل کے الزام میں دوبارہ جیل جانا پڑا (۳۴) یہ چھ حر، پیپلز پارٹی کے ایک رہنما علی بخش جونیجو کے الزام میں گرفتار کیے گئے تھے کہ انہیں پولیس کی تحویل ہی میں قتل کر دیا گیا (۳۵) اس قتل کی ایف آئی آر میں جام صادق علی کے ساتھ ساتھ شاہنواز جونیجو کو بھی نامزد کیا گیا تھا۔ مگر الزام ثابت نہ ہونے کے باعث وہ جلد ہی رہا ہو گئے۔

شاہنواز جونیجو ۱۹۷۷ء میں سانگھڑ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنا چاہتے تھے۔ مگر پاکستان پیپلز پارٹی نے انہیں ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔ شاہنواز جونیجو نے اس کے باوجود آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑنا چاہا مگر بھٹو نے انہیں جیل میں ڈال دیا۔ جس کی وجہ سے وہ اس انتخابی عمل میں شریک نہیں ہو سکے۔ ۱۹۸۸ء میں پاکستان پیپلز پارٹی نے انہیں اس شرط پر قومی اسمبلی کے ٹکٹ کی پیش کش کی کہ وہ حلف اٹھائیں کہ وہ عین وقت پر محمد خان جونیجو کے حق میں دستبردار نہیں ہوں گے۔ شاہنواز جونیجو نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر ایسا حلف تمام امیدواروں سے لیا گیا ہے وہ حلف اٹھائیں گے ورنہ انہیں پیپلز پارٹی کا ٹکٹ قبول نہیں۔ ان کے اس موقف پر بیگم نصرت بھٹو نے ان کی تائید کی اور انہیں حلف اٹھائے بغیر پیپلز پارٹی کا ٹکٹ مل گیا۔ (۳۶)

شاہنواز جونیجو نے اس انتخابی معرکے میں محمد خان جونیجو کو اٹھارہ ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ محمد خان جونیجو کی شکست کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ حلقہ وہ نہیں تھا جس پر وہ ۱۹۸۵ء میں بلا مقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ اُس حلقے میں پیر پگارا نے اس مرتبہ اپنے صاحبزادے پیر سید علی گوہر شاہ کو کھڑا کیا تھا۔ (۳۷)

۱۹۹۰ء میں شاہنواز جونیجو نے اسی حلقے سے دوبارہ انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ جام صادق علی، صوبے کے نگراں وزیر اعلیٰ تھے اس لیے شاہنواز جونیجو کو ان کے صاحبزادے جام معشوق علی کے ہاتھ تقریباً ۲۵ ہزار ووٹوں سے شکست کھانی پڑی۔ (۳۸)

انتخابات کے بعد جام صادق علی نے شاہنواز جونیجو کو پیغام بھجوایا کہ اگر وہ پیپلز پارٹی چھوڑ دیں

تو نہیں صوبائی وزیر بنایا جاسکتا ہے۔ شاہنواز جونیجو کے انکار پر جام صادق علی نے انہیں جیل میں ڈال دیا۔ جام صادق علی کا پورا دور انہوں نے جیل میں گزارا اور ان کی رہائی سندھ ہائی کورٹ کے ایک حکم پر اس وقت عمل میں آئی جب جام صادق علی بستر مرگ پر تھے۔ بے نظیر بھٹو نے شاہنواز جونیجو کو یہ دیکھنے کے لیے کہ اب جام صادق علی کتنے دن کے مہمان ہیں' جام صادق علی کی عیادت کے لیے بھیجا۔ شاہنواز جونیجو جب جام صادق علی کے پاس پہنچے تو وہاں پیر پگارا اور الٰہی بخش سومرو موجود تھے۔ جام صادق علی کی قوت گویائی ختم ہوچکی تھی تاہم انہوں نے آنسوؤں کے ذریعہ شاہنواز جونیجو سے اپنے ظلم کی معافی چاہی۔ انہوں نے آنکھوں کے اشارے سے پیر پگارا کے اس بیان کی بھی تائید کی کہ پیر پگارا نے انہیں کئی مرتبہ شاہنواز جونیجو کے خلاف ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی (۳۹)

۴ر مارچ ۱۹۹۲ء کو جام صادق علی انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی خالی ہونے والی نشست پر ۲۸ر اپریل ۱۹۹۲ء کو ضمنی انتخابات منعقد ہوئے۔ ان انتخابات جام صادق علی کے صاحبزادے جام عاشق علی اور شاہنواز جونیجو نے حصہ لیا۔ انتخابی نتائج کے مطابق جام عاشق علی نے شاہنواز جونیجو کو تقریباً ۵۵ ہزار ووٹوں سے شکست دے دی (۴۰)

شاہنواز جونیجو نے اکتوبر ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ اس بار بھی وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے جبکہ ان کے مقابلے میں جام معشوق علی کو پاکستان مسلم لیگ (ن) نے اپنا امیدوار نامزد کیا تھا۔ یہ معرکہ جام معشوق علی نے تقریباً ۵ ہزار ووٹوں سے سر کر لیا (۴۱) ۱۹۹۵ء میں انہیں پاکستان پیپلز پارٹی نے سینٹ آف پاکستان کا رکن منتخب کرلیا۔ یہ نشست فدا حسین ڈیرو کے رکن قومی اسمبلی بننے کی وجہ سے خالی ہوئی تھی (۴۲)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں شاہنواز جونیجو نے حصہ نہیں لیا۔ ۱۴ر جولائی ۲۰۰۵ء کو وہ سنگاپور میں انتقال کر گئے۔ (۴۳)

شاہنواز جونیجو کی زندگی ہی میں ان کے دو صاحبزادگان سیاست میں نمایاں ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک روشن دین جونیجو ۲۰۰۱ء میں سانگھڑ کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے تھے (۴۴) جبکہ دوسرے صاحبزادے محمد خان جونیجو ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ محمد خان جونیجو نے یہ انتخاب پاکستان مسلم لیگ (فنکشنل) کے ٹکٹ پر لڑا تھا جب ان کے قریب ترین حریف فدا حسین ڈیرو کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی (پارلیمنٹیرین) سے تھا۔ محمد خان جونیجو نے فدا حسین ڈیرو کو تقریباً دس ہزار ووٹوں سے شکست دی تھی۔ محمد خان جونیجو نے ان انتخابات میں صوبائی اسمبلی کی نشست پی ایس ۸۲ سانگھڑ ۵ سے بھی کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے مگر بعدازاں پاکستان مسلم لیگ (ف) کے امام الدین شوقین کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے (۴۵)

حوالہ جات

۱۔ اظہر سہیل۔ سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک۔ لاہور۔ ص ۱۱

۲۔ ڈاکٹر نصر اللہ پنہور۔ محمد خان جونیجو ایک شریف انسان' ایک بااصول سیاستدان۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۸/مارچ ۱۹۹۵۔

۳۔ شاہد جاوید برکی۔ ہسٹاریکل ڈکشنری آف پاکستان۔ نئی دہلی۔ ص ۱۸۹

۴۔ خادم حسین چانڈیو۔ ماروجی ملیرجا (سندھ)۔ حیدر آباد۔ ص ۶۱۶

۵۔ جاوید احمد صدیقی۔ سقوط جونیجو۔ کراچی۔ ص ۸

۶۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۱۶۹' ۱۷۰

۷۔ اظہر سہیل۔ سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک۔ لاہور۔ ص ۷۵' ۷۶

۸۔ محمد صلاح الدین۔ جونیجو نامزد وزیراعظم تھے' منتخب ہونے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ ہفت روزہ تکبیر۔ کراچی۔ ۱۶/جون ۱۹۸۸

۹۔ قیوم نظامی' جرنیل اور سیاست دان' تاریخ کی عدالت میں۔ لاہور۔ ص ۱۴۶

۱۰۔ اظہر سہیل۔ سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک۔ لاہور۔ ص ۹۹ تا ۱۱۶

۱۱۔ اظہر سہیل۔ سازشوں کا دور۔ لاہور۔ ص ۲۳

۱۲۔ ایضاً۔ ص ۳۸' ۳۹

۱۳۔ احمد سلیم۔ عدلیہ کا سیاسی کردار۔ لاہور۔ ص ۲۴۳ تا ۲۴۵

۱۴۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۱۷۸، ۱۹۵، ۲۳۲، ۲۴۱، ۲۴۵

۱۵۔ خالد حسین۔ فیکٹ فائل ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۵ تا ۳۱/مارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۲

۱۶۔ پروفیسر غفور احمد۔ نواز شریف کا پہلا دور حکومت۔ لاہور۔ ص ۴۸۲' ۴۸۳' ۵۱۹' ۵۲۰

۱۷۔ سجاد بخاری۔ پاکستان کے ۱۷ وزرائے اعظم۔ لاہور۔ ص ۲۱۰

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ ص ۱۳۳' ۱۳۶

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲' رپورٹ' جلد دوم' ص ۸۱' ۸۳

۲۰۔ پارلیمنٹ ہاؤس' اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان' ڈائریکٹری آف ممبرز (تیسرا ایڈیشن)۔ ص ۸۲

۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان' اسلام آباد' جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ رپورٹ' جلد اول' ص ۳۰۹

۲۲۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء

۲۳۔ گل محمد گاد۔ اچوتو لاڑکانو گھمون مشمولہ لاڑکانہ ساہ سیپانو (سندھی)۔ لاڑکانہ۔ ص ۵۹۸

۲۴۔ عبدالستار بھٹی۔ لاڑکانو امر شخصیتوں (سندھی)۔ کراچی۔ ص ۳۱ تا ۳۵

۲۵۔ سید ہاشم رضا۔ ہماری منزل۔ کراچی۔ ص ۵۵، ۵۶

۲۶۔ عبدالستار بھٹی۔ لاڑکانہ امر شخصیتوں (سندھی)۔ کراچی۔ ص ۳۳

۲۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۲راگست ۱۹۶۶ء

۲۸۔ عبدالستار بھٹی۔ لاڑکانو امر شخصیتوں (سندھی)۔ کراچی۔ ص ۷۷ تا ۷۹

۲۹۔ عبدالستار بھٹی۔ لاڑکانو امر شخصیتوں (سندھی)۔ کراچی۔ ص ۳۵

۳۰۔ خادم حسین چانڈیو۔ ماروجی ملیرجا۔ حیدرآباد۔ ص ۱۷۴

۳۱۔ اسد سلیم شیخ۔ انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان۔ لاہور۔ ص ۳۵۵

۳۲۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ تحریک آزادی میں سندھ کا کردار (حصہ دوم)۔ حیدرآباد۔ ص ۶۳ تا ۶۶

۳۳۔ نبی بخش خان بلوچ۔ رئیس المہاجرین مرحوم جان محمد جونیجو۔ مشمولہ مہران' سوانح نمبر۔ حیدرآباد ص ۲۸۳ تا ۲۸۷

۳۴۔ مومن بلّو۔ جرگہ' جیل اینڈ جام صادق علی۔ سینیٹر شاہنواز جونیجو (پروفائیل)۔ ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمنر لاہور۔ ۱۱ر۔ ۱۷رستمبر ۱۹۹۸ء ص ۲۴

۳۵۔ احمد سلیم۔ پاکستان کے سیاسی قتل۔ اسلام آباد۔ ص ۴۱

۳۶۔ مومن بلّو۔ جرگہ' جیل اینڈ جام صادق علی۔ سینیٹر شاہنواز جونیجو (پروفائیل)۔ ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمنر لاہور ۱۱ر۔ ۱۷رستمبر ۱۹۹۸ء۔ ص ۲۴

۳۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۵۲ تا ۳۵۸۔ ۴۶۱، ۴۶۲

۳۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۸۰

۳۹۔ مومن بلّو۔ جرگہ' جیل اینڈ جام صادق علی۔ سینیٹر شاہنواز جونیجو (پروفائل)۔ ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمنر لاہور۔ ۱۱ر۔ ۱۷ر۔ ستمبر ۱۹۹۸ء۔ ص ۲۴

۴۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۹رمئی ۱۹۹۲ء۔ ص ۵۳۹، ۵۴۰

۴۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۶۴

۴۲۔ پارلیمنٹ ہاؤس' اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان' ڈائریکٹری آف ممبرز۔ (چوتھا ایڈیشن)۔ ص ۱۶۳

۴۳۔ حافظ نسیم الدین' پاکستان کے ماہ وسال۔ کراچی۔ ص ۹۱۸

۴۴۔ مومن بلو۔ چارلس نیپئیر کان محمد میاں سومرو تائین۔ حیدرآباد۔ ص ۶۹۸

۴۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۸۳، ۴
۲۶

چانڈیا

چانڈیا ایک بلوچ قبیلہ ہے جس کا تعلق میر جلال خان کے بیٹے ہوت خان سے ہے۔ بہت پہلے جب چانڈیا مکران سے چل کر سر زمین سندھ کی حدود میں داخل ہوئے تو انہوں نے ضلع جیکب آباد میں ایک شہر آباد کیا اور اس کا نام کوٹ چانڈ کا رکھا۔

بعد ازاں چانڈیوں نے ایک جنگ میں تالپوروں سے شکست کھائی اور یہ علاقہ خالی کر کے سندھ کے شمال مغرب کی جانب منتقل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر سھون تک کا علاقہ ماچھیوں سے چھین لیا اور اپنی ریاست قائم کرلی۔ اپنی روایت کے مطابق انہوں نے اس ریاست کا نام بھی چانڈکو رکھا جو بعد میں چانڈکا بولا جانے لگا۔

کچھ عرصہ بعد اس علاقہ پر آدم شاہ کلہوڑا وارد ہوئے۔ انہوں نے چانڈیا قبیلے سے بہت سی زمینیں چھین لیں اور یہاں اپنے مریدوں کے ساتھ رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کے مریدوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ جب عبدالرحیم خان خاناں سندھ میں آیا تو اس نے میاں آدم شاہ کلہوڑا کو چانڈ کا علاقے کے تین علقے (لاڑکانہ' ڈوکری اور نصیر آباد) فقیروں کے لنگر کے خرچ کے لئے دے دیئے۔ یوں کلہوڑوں کے قدم چانڈکا میں مضبوطی سے جم گئے۔ کچھ عرصہ بعد اس علاقے میں تالپور آ گئے اور وہ بھی یہیں رہنے لگے۔ مگر ایک میان میں دو تلواریں کس طرح رہ سکتی ہیں اس لئے جلد ہی کلہوڑوں اور تالپوروں میں جنگ ہوئی اور کلہوڑوں کے لشکر نے راہ فرار اختیار کی۔

کلہوڑوں اور تالپوروں کے دور میں چانڈیا خاموش رہے کیونکہ انہیں نہ تو کلہوڑوں سے دلچسپی تھی اور نہ تالپوروں سے۔ بلکہ کلہوڑوں نے تو انہیں آپس میں لڑوا کر ان کی رہی سہی قوت بھی ختم کر دی تھی۔ اس طرح چانڈیا دو گروہوں حاجی جا اور حسنانی میں تقسیم ہو گئے۔

حاجی جا گروہ کا کہنا تھا کہ وہ چانڈیوں کی سرداری کے حقدار ہیں جن کا جدامجد ملک غیبی اول تھا اور حسنانی گروہ کا جدامجد علی مراد خان چانڈیو تھا۔ کلہوڑوں نے ایک تیر سے دو شکار کئے اور

بیچ میں پڑ کر فیصلہ کیا کہ سال کے چھ مہینے ملک غیبی سردار رہے اور باقی چھ مہینے علی مراد سردار رہے۔ یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا اور اس دوران چانڈیوں کے متعدد افراد ہلاک ہوئے۔ آخر کار ملک غیبی اول نے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کی چنانچہ دونوں گروہوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں ملک غیبی کو فتح اور علی مراد کو شکست ہوئی۔

ملک غیبی خان کے بعد جب وڈیرہ ولی محمد چانڈیو قبیلے کا سردار بنا۔ تو اس نے سب حسنانیوں کو جمع کر کے منالیا اور اگلے پچھلے خونوں کا خون بہا بھی ادا کیا۔ (۱)

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز سندھ میں آہستہ آہستہ اپنے قدم جما رہے تھے۔ ریاست خیرپور میں میر علی مراد خان اول بر سر اقتدار آ چکے تھے جو انگریزوں کے زبردست وفادار تھے اور بقول ایک مورخ (منشی عطا محمد شکارپوری) کے "میر علی مراد خاں کی انگریزوں سے وفاداری اور خیر خواہی کے اس قدر کثیر واقعات ہیں کہ اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے"۔

چنانچہ جب جنگ دبہ میں انگریزوں کے ہاتھوں شیر سندھ میر شیر محمد خاں کو شکست کے بعد انگریزی حکومت کو ولی محمد خاں چانڈیو کے بارہ ہزار بلوچوں کے لشکر سے جو انگریزوں سے بغاوت کئے ہوئے تھا' خوف پیدا ہوا تو انگریزوں کے ایما پر میر علی مراد خان نے پہلے تو ولی محمد خاں چانڈیو کو زبانی تنبیہہ کی کہ وہ انگریزوں کا مطیع و فرماں بردار بنے' مگر جب چانڈیو اپنے ارادے پر جما رہا تو میر علی مراد خاں نے اسے گرفتار کر کے سر چارلس نیپئر کے پاس حیدر آباد بھیج دیا۔ (۲) توقع کے برخلاف سر چارلس نیپئر نے ولی محمد چانڈیو کا شایان شان استقبال کیا اور اس کی جاں بخشی کے ساتھ ساتھ اس کی زمین اور اس کی تلوار بھی اسے واپس کر دی۔ ولی محمد چانڈیو پر چارلس نیپئر کے اس اقدام کا بڑا مثبت اثر ہوا اور وہ ساری زندگی کے لئے انگریزوں کا بے دام غلام بن گیا۔

ولی محمد چانڈیو نے بعد ازاں کئی مہمات میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس نے ایک مشہور ڈاکو نوبت خاں کی گرفتاری میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ چارلس نیپئر نے اس گرفتاری کے عوض ایک عوامی دربار میں ولی محمد چانڈیو کو ایک ہزار روپیہ اور نوبت خاں کی تلوار بطور انعام پیش کی۔ ۱۸۴۵ء میں سر چارلس نیپئر نے پہاڑی قبائل کی سرکوبی کے لئے بھی ولی محمد چانڈیو کی خدمات حاصل کیں۔ ولی محمد چانڈیو کے لشکر میں ۸۰۰ سپاہی تھے جنہیں ان کی خدمت کے عوض ہر روز دو آنہ فی کس معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر انگریز ولی محمد چانڈیو کے لشکر کو ہر روز سو روپیہ معاوضہ ادا کرتے تھے۔ یہ مہم بیس دن جاری رہی اور بعد ازاں جب انگریزوں کو یہ رقم بھی زیادہ لگنے لگی تو انہوں نے چانڈیو قبیلے کے افراد کو رخصت کر کے مری قبیلے کے افراد کی خدمات حاصل کر لیں۔

انگریزوں نے ولی محمد چانڈیو کی خدمات کا اصل معاوضہ زمینوں اور جاگیروں کی صورت میں ادا کیا۔ ولی محمد چانڈیو نے ۲۷ر جون ۱۸۵۰ء کو وفات پائی۔ وفات کے وقت وہ چالیس ہزار بیگھہ زمین کا مالک تھا۔ اس کے علاوہ ڈیرہ غیبی اور مرزا پور کی جاگیریں بھی اسی کے نام تھیں۔ جن کا مجموعی رقبہ تین لاکھ بیگھہ کے لگ بھگ تھا۔ (۳)

ولی محمد چانڈیو کی وفات کے بعد اس کا بیٹا غیبی خان چانڈیو اس کا جانشین ہوا۔ غیبی خان چانڈیو نے ۱۸۸۶ء میں وفات پائی' چونکہ غیبی خان چانڈیو کا بڑا بیٹا داتو خان اس کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے انتقال کر چکا تھا' اس لئے اس کا وارث اس کا پوتا محمد خان ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں محمد خان کے سب سے چھوٹے بھائی عالم خان نے محمد خان اور اس کے بڑے بیٹے کو قتل کر دیا۔ عالم خان کو اس جرم میں پھانسی کی سزا ہوئی اور محمد خان کی جانشینی اس کے دوسرے بیٹے علی نواز کو ملی جس نے غیبی خان کا عرف اختیار کیا۔ (۴)

۱۹۱۰ء میں شائع ہونے والے صوبہ سندھ کے گزیٹر کے مطابق علی نواز عرف غیبی خان چانڈیو کی کل زمینوں کا رقبہ ۲'۱۶'۱۱۶ ایکٹر تھا اور وہ اس وقت سندھ کا سب سے بڑا جاگیردار اور زمیندار سمجھا جاتا تھا۔ (۵)

علی نواز عرف غیبی خان چانڈیو بھی ہمیشہ انگریزوں کی خدمت میں مستعد رہے۔ انگریزوں کی ان کی خدمات کے صلے میں انہیں سر کا خطاب عطا کیا تھا۔ (۶)

علی نواز عرف غیبی خاں چانڈیو نے خود تو کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن ان کے بڑے صاحبزادے مہر محمد خان چانڈیو دو مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں (۷) اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۶ء میں۔ آخرالذکر انتخاب میں انہوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔ (۸)

محمد خاں چانڈیو کی عمر نے زیادہ وفا نہیں کی اور وہ ۱۹۵۰ء میں اپنے والد کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد مارچ ۱۹۵۱ء میں ان کی خالی کردہ نشست پر ان کے بیٹے احمد سلطان چانڈیو اور حیدر بخش جتوئی کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اس انتخاب کے دوران احمد سلطان چانڈیو کی عمر کی کمی کا مسئلہ عدالت کے سامنے پیش ہوا۔ سیشن کورٹ کے جج عزیز اللہ میمن تھے جبکہ احمد سلطان چانڈیو کے وکیل حسین شہید سہروردی تھے۔ یہ مقدمہ حیدر بخش جتوئی نے جیتا تھا۔ (۹)

علی نواز عرف غیبی خاں چانڈیو نے ۱۹۵۴ء میں وفات پائی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ان کے بڑے صاحبزادے میر محمد خاں چانڈیو ان کی زندگی ہی میں وفات پا چکے تھے۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کے پوتے احمد سلطان چانڈیو ان کے جانشین بنے۔

سردار احمد سلطان چانڈیو ۱۹۵۳ء میں سندھ اسمبلی کے رکن بنے۔ اس انتخاب میں انہوں

نے اپنے چچا مظہر علی خاں کی ضمانت ضبط کروا دی تھی اور احمد سلطان چانڈیو سے انتخاب لڑنے کے "جرم" میں غیبی خاں چانڈیو نے ان کو عاق کر دیا تھا (۱۰)

۱۹۶۲ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے۔ (۱۱) ۱۹۶۶ء میں وہ دوبارہ اسی حلقے سے کامیاب ہوئے۔ (۱۲) ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں انہیں ذوالفقار علی بھٹو نے پیپلزپارٹی کی جانب سے انتخاب لڑنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ مگر احمد سلطان چانڈیو نے یہ انتخاب اپنے طور پر لڑا۔ وہ صوبائی اسمبلی کی نشست پی ایس ۱۱ لاڑکانہ ۲ سے امیدوار تھے۔ جس پر وہ بقول ان کے چار سو ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ سردار احمد سلطان چانڈیو نے حال ہی میں ایک انٹرویو میں ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے حوالے سے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ان انتخابات میں بھٹو اور کھوڑو کا اتحاد بن گیا تھا اور وہ دونوں قومی اسمبلی کی ایک ایک نشست پر راضی ہو گئے تھے جبکہ قاضی فضل اللہ کو صوبائی اسمبلی کی نشست ملنی تھی۔ مگر بعد ازاں احمد سلطان چانڈیو کی "سیاست" کی وجہ سے یہ اتحاد ممکن نہ ہو سکا تھا۔

انتخابات کے بعد جب بھٹو کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے سردار صاحب کو پتھاریداری اور ڈاکوؤں سے تعلق رکھنے کے الزام میں ایم پی او کے تحت ایک ماہ چار دن کے لیے گھر پر نظربند بھی رکھا۔ لیکن ۱۹۷۶ء میں ایک پولیس افسر کا کام سردار صاحب کی بھٹو صاحب سے ملاقات کا ذریعہ بن گیا۔ اور وہ بھٹو کی دسترس میں آ گئے۔ ۱۵ر ستمبر ۱۹۷۶ء کو سردار صاحب پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں انہیں قومی اسمبلی کے لیے پارٹی کا ٹکٹ بھی عطا ہوا اور وہ بلامقابلہ قومی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہو گئے (۱۳)

۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد جب قومی اسمبلی نے ذوالفقار علی بھٹو کو اگلی معیاد کے لیے وزیراعظم منتخب کیا تو بھٹو نے حلف اٹھانے کے موقع پر جو تقریر کی اس میں سردار احمد سلطان چانڈیو' کو پاکستان پیپلزپارٹی کے "عوامی انقلاب کی مثال" کے طور پر پیش کیا۔ بھٹو نے کہا

"اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ پاکستان پیپلزپارٹی کا سب سے اہم کارنامہ کیا ہے تو میں کہوں گا کہ میری ناچیز رائے میں یہ ہے کہ عوام کی سوچ میں زبردست انقلاب اور ان کے نقطہ نظر میں معیار کے اعتبار سے تبدیلی واقع ہوئی ہے اور یہی پاکستان پیپلزپارٹی کی جدوجہد کا مفید ترین پہلو ہے۔

آج اس ایوان میں بہت سے حضرات تشریف فرما ہیں جو اپنے اپنے ضلع کی نمائندگی کر رہے ہیں ان میں ایک صاحب میرے ضلع کے ہیں۔ جو نہ صرف پاکستان بلکہ برصغیر پاک و ہند کے سب سے بڑے جاگیردار تھے۔

یہ جاگیرداروں کے بڑے سردار تھے۔ چونکہ وہ میرے پڑوسی تھے اس لیے میں نے ان کی سابقہ جاگیر دیکھی ہے جب میں جوان تھا تو میں نے انہیں اپنے مزارعین سے ملتے دیکھا اور میں یہ

بھی جانتا ہوں کہ ان کے نامور آباؤاجداد اپنے مزارعین سے کس طرح ملتے تھے۔ گزشتہ سال میں سیلاب کے دوران وہاں گیا تھا اور میں نے انہی لوگوں میں اتنا زبردست انقلاب دیکھا کہ ایک لمحے کے لیے میں سیلاب کو بھول گیا۔ یہ واقعہ غیبی ڈیرو کا ہے۔ میں نے بچپن میں وہاں دیکھا کہ وہاں کے لوگ اس وقت تک گھٹنوں کے بل سر جھکائے کھڑے رہے جب تک جاگیردار آقا انہیں انگلی سے اٹھنے کا اشارہ نہ کرتا۔ اور آج وہ اپنے ملک کے وزیراعظم کے ساتھ بیٹھتے اور اپنے سابقہ جاگیردار کے ساتھ جسے وہ اب بھی اپنا روحانی پیشوا سمجھتے ہیں بیٹھتے ہیں اور برابر کی حیثیت سے ان سے باتیں کرتے ہیں۔"

بھٹو نے آگے چل کر مزید کہا "اب ایسا لگتا ہے کہ وہ بالکل مختلف لوگ ہیں۔ ان کی ذہنیت تبدیل ہو چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زنجیریں توڑ دی ہیں۔ اور غلامی کا وہ جوا اتار پھینکا ہے جو صدیوں سے ان کے گلے میں پڑا ہوا تھا حقیقت یہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی جدوجہد کا اصل مقصد بھی یہی تھا اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالیہ انتخاب میں اس پارٹی کو اتنی زبردست کامیابی کیوں حاصل ہوئی۔ (۱۴)

بھٹو کے زوال کے بعد سردار احمد سلطان چانڈیو کو گرفتار کرلیا گیا۔ ‌ ‌ارشل لاء ہیڈ کوارٹرز کراچی نے ۳۱ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کو ایک اخباری بیان جاری کیا۔ جس میں کہا گیا تھا۔

"سردار احمد سلطان چانڈیو اور اقبال فضل پر حال ہی میں کراچی میں ایک خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ دونوں جعل سازی اور دھوکہ دہی کے مجرم قرار دیئے گئے۔ عدالت نے احمد سلطان چانڈیو کو دو سال کی قید بامشقت اور ۵ لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید چھ ماہ کی قید بامشقت کی سزا ہو گی۔ اقبال فضل کو چار سال کی قید بامشقت اور ۵ لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں انہیں مزید ایک سال کی قید بامشقت کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

یہ دونوں اشخاص ایک ٹریول ایجنسی چلا رہے تھے جو جعلی پاسپورٹ اور جعلی ویزے بھی جاری کر رہی تھی۔ ان کا کاروبار انتہائی کامیابی سے چل رہا تھا حتیٰ کہ اس کا سراغ مل گیا (۱۵) سردار احمد سلطان چانڈیو نے ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں آزادانہ طور پر حصہ لیا اور بلا مقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۴)

اسی انتخاب میں انہوں نے صوبائی اسمبلی میں اختر علی قاضی کو منتخب کرانے میں اہم کردار ادا کیا جس کا صلہ انہیں اختر علی قاضی کی وزارت اعلیٰ کے زمانے میں وزیر بننے کی شکل میں ملا۔ مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ پیپلز پارٹی کی قیادت اور ووٹروں دونوں سے دور ہو گئے۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے این اے ۱۶۶ لاڑکانہ ۳ اور این اے ۱۶۵ لاڑکانہ ۲ دونوں حلقوں سے کاغذات نامزدگی

داخل کروائے۔ حلقہ این اے ۱۶۶ لاڑکانہ ۳ سے بے نظیر بھٹو خود امیدوار تھیں اور سردار احمد سلطان چانڈیو چاہتے تھے کہ اگر بے نظیر بھٹو این اے ۱۶۵ لاڑکانہ ۲ سے ڈاکٹر اشرف عباسی کو دستبردار کروا دیں تو وہ خود بے نظیر بھٹو کے مقابلے سے دستبردار ہو جائیں۔ مگر ان کی یہ تدبیر کارگر نہ ہو سکی اور محترمہ بے نظیر بھٹو سردار احمد سلطان چانڈیو کے مقابلے سے نہ خود دستبردار ہوئیں اور نہ ہی انہوں نے ڈاکٹر اشرف عباسی کو دستبردار کروایا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں حلقوں سے سردار احمد سلطان چانڈیو کی' ضمانت ضبط ہو گئی۔ (۱۷) اس شکست فاش کے بعد انہیں ۱۹۹۰ء میں انتخاب لڑنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ تاہم اس دوران وہ اپنے بعض پرانے رابطے بحال کرنے میں اور اپنے بیٹے کو پیپلزپارٹی کا ٹکٹ دلوانے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ (۱۸)

۱۹۹۰ء کے انتخابات کے بعد سردار احمد سلطان چانڈیو اس وقت پریس کا موضوع گفتگو بنے' جب مئی ۱۹۹۱ء میں ان کے ہم قبیلہ ڈاکو لائق چانڈیو نے تین چینی انجینئروں کو اغوا کر لیا اور ان کی رہائی کے عوض بھاری رقم اور اپنے کئی ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس موقع پر حکومت نے سردار سلطان چانڈیو کی خدمات حاصل کیں جن کی مداخلت کے باعث ڈاکوؤں نے تاوان کی رقم میں کمی کر کے مغویوں کو رہا کر دیا۔ (۱۹)

سردار احمد سلطان چانڈیو کے صاحبزادے نوابزادہ شبیر احمد خان چانڈیو نے ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں پی ڈی اے کے ٹکٹ پر این اے ۱۶۵ لاڑکانہ ۲ سے انتخاب لڑا اور سندھ کے دو سابق وزرائے اعلیٰ ممتاز علی بھٹو اور اختر علی جی قاضی کو شکست دے کر قومی اسمبلی کی رکنیت بآسانی حاصل کر لی۔ (۲۰)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں پی ڈی اے نے شبیر احمد چانڈیو کو ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے لئے ٹکٹ عنایت کر دیا۔ مگر دوسری جانب ان کی مخالف قوتوں نے سردار سلطان احمد چانڈیو کو ان کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ شبیر احمد چانڈیو نے بعد ازاں ایک اخباری بیان میں الیکشن کمیشن سے اپیل کی کہ ان کے والد بنکوں کے قرض نادہندہ ہیں اس لئے ان پر انتخاب میں حصہ لینے پر پابندی عائد کی جائے۔ (۲۱) بہر حال یہ مقابلہ ہوا اور پھر چشم فلک نے یہ بھی دیکھا کہ شبیر احمد چانڈیو نے محض اس وجہ سے کہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے' اپنے والد کو تقریباً دوگنے ووٹوں سے شکست دے دی۔ (۲۲)

۱۹۹۷ء میں شبیر احمد چانڈیو' تیسری مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اس مرتبہ ان کے مدمقابل تھیں محترمہ غنویٰ بھٹو۔ شبیر احمد چانڈیو نے یہ مقابلہ تقریباً گیارہ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے جیت لیا۔ (۲۳) ۲۴ جنوری ۲۰۰۰ء کو نواب سلطان چانڈیو، کراچی میں انتقال کر گئے (۲۴) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں شبیر احمد چانڈیو، گریجویشن کی شرط کی وجہ سے حصہ نہیں لے سکے۔ ان انتخابات میں صوبائی اسمبلی کی نشست پی ایس ۳۹ لاڑکانہ ۵ سے آفاق کریم چانڈیو اور دامن علی چانڈیو نے بالترتیب آزاد اور متحدہ مجلس عمل کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا مگر دونوں ہی پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین

کے غلام مجدد اسران سے شکست کھا گئے (۲۵) ستمبر ۲۰۰۵ء میں شبیر احمد چانڈیو نے اپنے بھتیجے نوابزادہ شاہنواز چانڈیو کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کی اور خوشحال پاکستان پینل کی جانب سے ضلع قنبر شہداد کوٹ کے ضلعی ناظم بننے میں کامیاب ہو گئے (۲۶)

چانڈیو قبیلے کی ایک شاخ ضلع ٹھٹھہ میں آباد ہے۔ اس شاخ کے مورث اعلیٰ رئیس باگو خان، چانڈیو گوٹھ ضلع دادو کے رہنے والے تھے۔ اپنے عزیزوں سے ناچاقی کے باعث کچھ عرصہ بعد انہوں نے نقل مکانی کر کے ٹنڈو محمد خان کے قریب اپنا گاؤں آباد کیا۔ رئیس باگو خان کا پوتا غلام محمد خان تھا۔ جو کچھ عرصہ بعد سجاول میں آباد ہوا۔ غلام محمد خان کے تین بیٹے تھے۔ رئیس صوبھو خان، رئیس گل محمد خان اور رئیس خیر محمد خاں۔ رئیسی گل محمد نے تو اپنی رہائش سجاول ہی میں رکھی لیکن رئیس صوبھو خاں او رئیس خیر محمد خاں نے وہاں سے نقل مکانی کر کے تعلقہ شاہ بندر میں لادیوں کے قریب اپنا گاؤں آباد کیا اور اسکا نام صوبھو خان چانڈیو رکھا۔ ان کی اولاد اب تک اسی گاؤں میں آباد ہے۔

صوبھو خان کے بیٹے دتل خان کی شادی خیر محمد خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ دتل خان کے بیٹے خیر محمد چانڈیو نے انگریزوں سے بڑے اچھے تعلقات رکھے جس کے باعث اس کی زمینداری میں بھی اضافہ ہوا۔ اسے سیکنڈ کلاس اعزازی مجسٹریٹ بھی بنایا گیا اور اسے پہلے خان صاحب اور پھر خان بہادر کے خطابات بھی عطا ہوئے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۷ء تک وہ کراچی ضلعی لوکل بورڈ کا رکن رہا۔ وہ نواب غیبی خان چانڈیوں کا ہم عصر تھا اور بعض مقامات پر نواب غیبی خان چانڈیو کی نمائندگی کا فریضہ بھی انجام دیتا تھا۔ خیر محمد چانڈیو نے جی ایم سید کو ۱۹۲۵ء میں کراچی ضلعی لوکل بورڈ کا نائب صدر اور ۱۹۲۸ء میں صدر منتخب کروانے میں مدد کی۔ اس انتخاب کے موقع پر اسے ہندوؤں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا، مگر اس نے انگریزوں کے نمائندے اور عارضی چئیر مین مسٹر سمنگٹن کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ خیر محمد چانڈیو نے ۹ جولائی ۱۹۵۴ء کو وفات پائی۔ (۲۷)

رئیس خیر محمد چانڈیو کے ۵ بیٹے تھے۔ جن میں سب سے زیادہ شہرت ان کے سب سے بڑے بیٹے یوسف خان چانڈیو نے پائی۔ یوسف خان چانڈیو کئی برس ضلعی لوکل بورڈ کراچی کے صدر رہے۔ ۱۹۳۷ء میں بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے بعد وہ سندھ اسمبلی کے رکن بنے۔ شروع شروع میں وہ عبدالمجید سندھی کی آزاد پارٹی میں شامل تھے مگر بعد میں انہوں نے کئی مرتبہ اپنی سیاسی وابستگی تبدیل کیں۔ جنوری ۱۹۴۶ء اور دسمبر ۱۹۴۶ء کے سندھ اسمبلی کے انتخابات میں انہوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر حصہ لیا اور دونوں مرتبہ کامیاب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء میں بھی وہ سندھ اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے اور پیر زادہ عبدالستار کی کابینہ میں وزارت پر بھی فائز ہوئے۔ (۲۸) ۱۹۵۶ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کا رکن بنے۔ (۲۹)

۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں یوسف چانڈیو قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوئے۔ (۳۰)

مگر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۰ء دونوں انتخابات میں ناکامی ان کا مقدر بنی۔ ۱۹۶۵ء میں انہیں صادق علی میمن نے شکست دی۔ (۳۱) جبکہ ۱۹۷۰ء میں انہیں ذوالفقار بھٹو نے ہرایا۔ (۳۲) ۱۹۷۷ء کے انتخابات سے قبل یوسف چانڈیو پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے این اے ۱۸۲ ٹھٹھہ ۲ سے انتخاب لڑا اور ۱۵ سال کے وقفہ کے بعد قومی اسمبلی تک پہنچنے مین کامیاب ہو گئے۔ (۳۳) یہ الگ بات ہے کہ یہ اسمبلی فقط تین ساڑھے تین ماہ ہی کام کرسکی۔

یوسف خان چانڈیو کے اکلوتے بیٹے موسیٰ خان چانڈیو نے ۱۹۸۰ء میں فوجی حکومت کی نامزد کردہ سندھ پراونشل کونسل کی رکنیت سے اپنے سیاسی کیرئیر کا آغاز کیا۔ (۳۴) ۱۹۸۵ء میں وہ پی ایس ۳۷ ٹھٹھہ ۳ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۳۵) اس کے بعد انہوں نے انتخابات میں حصہ ہی نہیں لیا۔ البتہ ۱۹۹۰ء میں ان کے کزن خیر محمد چانڈیو نے پی ڈی اے کے ٹکٹ پر پی ایس ۲۷ ٹھٹھہ ۴ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر وہ آزاد امیدوار غلام قادر ملکانی سے فقط ۵۰ ووٹوں سے شکست کھا گئے تھے۔ (۳۶)

چانڈیو قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک اور سیاستدان غلام قادر چانڈیو ہیں۔ وہ ۱۹۹۴ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے تھے (۳۷) ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں انہوں نے سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے (۳۸) تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ پی ایس ۲۷ نواب شاہ ۴ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۳۹)

حوالہ جات

۱۔ مترجم پروفیسر سعید الدین خان۔ لاڑکانہ تاریخ کے آئینے میں۔ مشمولہ لاڑکانو ساہ سیبانو مرتبہ گل محمد گاد، محمد افضل عباسی۔ لاڑکانہ۔ ص ۷۷ تا ۸۰ (حصہ اردو)

۲۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۷۵۲، ۷۵۳

۳۔ ریونیو ڈیپارٹمنٹ، حکومت بمبئی، ہسٹری آف ایلی نیشن ان دی پراونس آف سندھ۔ (انگریزی) جلد دوم۔ ص ۴۰ تا ۴۹

۴۔ شیخ صادق علی انصاری۔ دی مسلمان ریسز فاؤنڈ ان سندھ، بلوچستان اینڈ افغانستان۔ کراچی۔ ص ۲۱

۵۔ جے ڈبلیو اسمتھ (مرتب)۔ گزیٹیئر آف دی پراونس آف سندھ۔ جلد چہارم۔ لاڑکانہ ڈسٹرکٹ ص ۱۱

۶۔ سید ہاشم رضا۔ میری یادداشتیں۔ مشمولہ لاڑکانو ساہ سیبانو مرتبہ گل محمد گاد، محمد افضل عباسی۔ لاڑکانہ۔ ص ۵۳ (حصہ اردو)

۷۔ نور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ ص ۱۳۷

۸۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۳۸۷

۹۔ قربان علی بگٹی۔ ضلع لاڑکانہ کے بلوچوں کی مختصر تاریخ (سندھی۔ مشمولہ لاڑکانو ساہ سیبانو۔ مرتبہ گل محمد گاد، افضل عباسی۔ لاڑکانہ۔ ص ۶۰' ۶۱

۱۰۔ ظہیر احمد۔ سردار سلطان احمد چانڈیو کے انکشافات ہفت روزہ '' زندگی'' لاہور ۷ تا ۱۳ مئی ۱۹۹۴ء۔ ص ۲۰

۱۱۔ عبداللہ الاثری۔ عالمی معلومات۔ لاہور۔ ص ۴۱

۱۲۔ ایم آئی صدیقی رزم۔ ہمارے نمائندے۔ لاہور۔ ص ۱۸۴

۱۳۔ ظہیر احمد۔ سردار سلطان احمد چانڈیو کے انکشافات، ہفت روزہ '' زندگی'' لاہور۔ ۷ تا ۱۳ مئی ۱۹۹۴ء۔ ص ۲۱

۱۴۔ حکومت پاکستان۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے طریقہ کار پر قرطاس ابیض۔ راولپنڈی ص ۲۳' ۲۴

۱۵۔ ایضاً۔ ص ۲۴' ۲۵

۱۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۷۷

۱۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۳۴۵'۳۴۶

۱۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۵۱۸

۱۹۔ ادارہ۔ سندھ میں ڈاکوؤں کی سرگرمیاں۔ ماہنامہ تحریر و تصویر حیدر آباد۔ جون' جولائی ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۹' ۳۰

۲۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز۔ جلد دوم۔ ص ۷۵

۲۱۔ روزنامہ پبلک کراچی۔ ۹ ستمبر ۱۹۹۳ء

۲۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۰۵

۲۳۔ ایضاً۔ ۲۰ فروری ۱۹۹۷۔ ص ۲۴۲

۲۴۔ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۲۵ فروری ۲۰۰۰ء

۲۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۳۰۹۵

۲۶۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۲۷۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین (سندھی)۔ حیدآباد جلد ا۔ ص ۶۹ تا ۷۱

۲۸۔ ایضاً۔ ص ۷۱' ۷۲

۲۹۔ محکمہ تعلقات عامہ مغربی پاکستان۔ مغربی پاکستان سالانہ جائزہ ۱۹۵۸ء۔ لاہور۔ ص ۲۸۰

۳۰۔ افتخار احمد۔ پاکستان جنرل الیکشنز ۱۹۷۰ء۔ لاہور۔ ص ۱۲۳

۳۱۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۷۰ء

۳۲۔ ایضاً۔ ۹ دسمبر ۱۹۷۰ء

۳۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۳۰۱

۳۴۔ حکومت سندھ۔ لسٹ آف آفیسرز اینڈ ممبرز آف دی پراونشل کاؤنسل آف سندھ۔ کراچی۔ ص ۵

۳۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸/مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۶۰۷

۳۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ حصہ دوم۔ ص ۳۴۲

۳۷۔ پارلیمنٹ ہاؤس، اسلام آباد، سینٹ آف پاکستان، ڈائرکٹر آف ممبرز (چوتھا ایڈیشن) ۱۹۹۸ء۔ ص ۲۲۴

۳۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد ۲۳/فروری ۱۹۹۷ء۔ ص ۴۴۰

۳۹۔ ایضاً ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۳۰۹۰، ۳۰۹۱

خیرپور کے شاہ

سندھ کے اضلاع میں خیر پور ایک بڑا متمدن ضلع ہے۔ تقریباً دو صدیوں تک اسے تالپوروں کی ریاست کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اس کا یہ درجہ قیام پاکستان کے بعد ختم ہوا ہے۔

خیر پور کی سیاست پر ہمیشہ سے پیروں اور سیدوں کے اثرات نمایاں رہے ہیں۔ سندھ کے سب سے بڑے پیر' پیر صاحب پاگارہ کی گدی پیرجو گوٹھ اسی ضلع میں واقع ہے ان کے علاوہ جو پیر اس علاقے کی سیاست میں نمایاں رہے ہیں ان میں پیر آف رانی پور اور پیر آف گمبٹ خصوصاً قابل ذکر ہیں (۱)

تحریک آزادی میں پیر آف رانی پور کے خانوادے کے جس فرد نے سب سے پہلے سیاست کے میدان میں قدم رکھا وہ پیر صالح شاہ جیلانی تھے۔ انہوں نے مئی ۱۹۲۲ء میں سکھر کے مقام پر بالائی سندھ کے پیروں کی ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس نے تحریک خلافت کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا تھا۔

پیر صالح شاہ جیلانی نے بعد ازاں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور جنوری ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سندھ کا انتخاب لڑا۔ مگر اس انتخاب میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور جی ایم سید گروپ کے بقادار شاہ سے شکست کھا گئے۔ (۲)

قیام پاکستان کے بعد رانی پور کے اس خانوادے کے کئی حصے ہو گئے۔ ایک حصہ کی قیادت سید غلام محی الدین شاہ کے پاس آئی انہوں نے کئی مرتبہ انتخاب لڑا لیکن ایک مرتبہ بھی کسی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے مقابلے میں ایک اور حصے کے قائد پیر عبدالقادر شاہ جیلانی کی پوزیشن زیادہ بہتر رہی کہ وہ کئی مرتبہ اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے۔ (۳)

پیر عبدالقادر شاہ جیلانی کے والد پیر سید احمد شاہ جیلانی نے ۱۹۴۳ء میں پیر آف بھرچونڈی شریف کے ہمراہ کراچی میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی تھی۔

اور آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدواروں کی حمایت کرنے کا اعلان کیا تھا۔(۴)

پیر عبدالقادر شاہ جیلانی نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ۱۹۶۵ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات سے کیا تھا۔ مگر اس انتخاب میں وہ پیر صاحب پاگارہ کے چھوٹے بھائی پیر نادر علی شاہ سے شکست کھا گئے تھے۔ جنہیں کنونشن مسلم لیگ کی حمایت حاصل تھی۔(۵)

بعد ازاں پیر عبدالقادر شاہ جیلانی نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء دونوں انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔(۶) ۱۹۸۵ء میں انہوں نے خود تو انتخاب میں حصہ نہیں لیا مگر ان کے خاندان کے ایک رکن سید عبدالرزاق شاہ نے قومی اسمبلی کے انتخاب میں کامیابی حاصل کرلی۔ بعد ازاں پیر عبدالرزاق شاہ سندھی بلوچ پشتون فرنٹ میں شامل ہو گئے اور پیر عبدالقادر شاہ جیلانی غلام مصطفیٰ جتوئی سے دوستی کے باعث ان کی قائم کردہ سیاسی جماعت این پی پی میں شامل ہو گئے۔ جبکہ ان کے صاحبزادے علی تقی جیلانی پیپلز پارٹی میں ہی رہے۔

۱۹۸۸ء کے انتخابی عمل سے پہلے پیر عبدالقادر شاہ جیلانی نے ایک مرتبہ پھر پیپلز پارٹی میں واپس آنے کا اعلان کر دیا۔ پارٹی میں ان کی واپسی کا بھرپور خیرمقدم کیا گیا اور انہیں این اے ۱۶۳ خیرپور ۴ سے قومی اسمبلی کا ٹکٹ دے دیا گیا۔ پیر عبدالقادر شاہ جیلانی نے اس انتخاب میں پیر صاحب پگارا کے صاحبزادے پیر سید صدرالدین شاہ کو تقریباً ۵۷ ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ (۷)

۱۹۹۰ء میں بھی پیر عبدالقادر شاہ جیلانی نے اسی حلقے سے انتخاب لڑا۔ ان کے مدمقابل اس مرتبہ بھی سید صدر الدین شاہ تھے۔ یہ معرکہ بھی پیر عبدالقادر شاہ کے ہاتھ رہا اور انہوں نے اپنے مدمقابل کو تقریباً ۴۰ ہزار ووٹوں سے شکست دے دی (۸) ۱۹۹۳ء میں بھی اس نشست سے یہی دونوں امیدوار ایک دوسرے کے مدمقابل تھے اور اس مرتبہ بھی پیر عبدالقادر شاہ ہی کامیاب ہوئے تاہم اس مرتبہ دونوں امیدواروں کے ووٹوں کا فرق چالیس ہزار سے گھٹ کر فقط تیرہ ہزار رہ گیا تھا(۹)

پیر عبدالقادر شاہ جیلانی کے صاحبزادے' سید علی تقی شاہ نے ۱۹۸۸ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے انتخاب لڑا تھا اور پیر صاحب پگارا کے صاحبزادے پیر صبغت اللہ شاہ راشدی کو تقریباً ۱۸ ہزار ووٹوں سے ہرایا تھا۔(۱۰) ۱۹۹۰ء میں پیپلز پارٹی نے ان کی بجائے سید نیاز حسین شاہ کو ٹکٹ دیا۔ جو پیر صبغت اللہ شاہ راشدی سے تقریباً سولہ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۱)

پیر سید علی تقی شاہ قائم علی شاہ کی وزارت میں کچھ عرصہ صوبائی وزیر بھی رہے تھے۔ ۱۲-۱۱ ستمبر ۱۹۹۳ء کو انہوں نے بعض خاندانی رنجشوں کے باعث خود کو گولی مار کر خودکشی کرلی۔(۱۲)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں پیر عبدالقادر شاہ جیلانی کے صاحبزادے اور میر علی تقی شاہ جیلانی کے بھائی پیر سید فضل علی شاہ جیلانی نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر این اے ۱۶۳ خیر پور، سکھر سے انتخاب لڑا اور پیر سید صدر الدین شاہ کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۳) ۲۰۰۲ء میں بھی انہوں نے اپنی کامیابی کا تسلسل جاری رکھا (۱۴)

خیر پور ہی سے ایک پیر جو عرصہ دراز سے سیاست کے میدان میں ہیں پیر آف گمبٹ پیر سید حاجی گل شاہ جیلانی ہیں۔ وہ ۲۸ فروری ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے اور انہوں نے کراچی کے این جے وی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے عملی سیاست کے میدان میں ۱۹۷۰ء میں قدم رکھا اور پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۵)

پیر حاجی گل شاہ جیلانی بدستور پیپلز پارٹی ہی شامل رہے اور ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں انہوں نے مخدوم محمد کو شکست دی تھی۔ (۱۶) جبکہ ۱۹۹۰ء میں انہوں نے سید سرکار حسین شاہ عرف راجہ علی شاہ کو ہرایا تھا۔ (۱۷) ۱۹۹۳ء میں بھی ان کے مدمقابل سید سرکار حسین شاہ ہی تھے۔ سرکار حسین شاہ ۱۹۸۵ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے تھے۔ (۱۸) سید سرکار حسین شاہ کا تعلق تحریک نفاذ فقہ جعفریہ سے ہے تاہم اس انتخابات میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا مگر کامیابی اس مرتبہ بھی پیر حاجی گل شاہ ہی کے مقدر میں آئی۔ (۱۹) ۱۹۹۷ء میں اس نشست پر پاکستان پیپلز پارٹی نے محرم علی شیخ کو ٹکٹ عطا کیا جو یہ انتخاب جیت کر صوبائی اسمبلی کے رکن بنے پیر حاجی گل شاہ نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا جو اس مرتبہ صرف ۹۱۳ ووٹ حاصل کر سکے (۲۰) ۲۰۰۲ء کی انتخابی مہم میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

خیر پور سے سید خاندانوں کے جو دیگر افراد سیاست کے میدان میں ہیں ان میں سید قائم علی شاہ، سید پرویز علی شاہ اور غوث علی شاہ کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تمام افراد متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے سیاست میں اپنا مقام بڑی محنت سے بنایا ہے۔

سید قائم علی شاہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ابتدائی دنوں سے پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں۔ وہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور وفاقی کابینہ میں شامل رہے تھے۔ (۲۱)

۱۹۸۷ء میں انہیں سندھ پیپلز پارٹی کا چیئرمین بنایا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ پیپلز پارٹی غلام مصطفیٰ جتوئی، مخدوم خلیق الزماں اور میر ہزار خاں بجارانی کے پے در پے استعفوں کی وجہ سے بحران میں مبتلا تھی۔ قائم علی شاہ نے ایسے موقع پر پارٹی کی صوبائی قیادت سنبھالی اور اسے اس حد تک سنبھالا دیا کہ ۱۹۸۸ء کے انتخاب میں اس پارٹی نے دیہی سندھ کی تقریباً تمام نشستوں پر کامیابی حاصل کر لی۔ (۲۲)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں خود قائم علی شاہ نے قومی کی بجائے صوبائی اسمبلی کی نشست پر انتخاب لڑا اور سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ کو شکست فاش دی۔ انتخاب میں کامیابی کے

بعد قائم علی شاہ سندھ کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے۔ مگر ان کا پورا دور عدم استحکام کا دور تھا۔ ایک جانب انہیں اپنی حریف جماعت ایم کیو ایم کا سامنا تھا دوسری جانب چونکہ وہ جاگیرداروں کی نمائندگی نہیں کرتے تھے اس لئے ان کی اسمبلی میں جاگیرداروں کے نمائندے انہیں نیچا دکھانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ نتیجہ ان کے استعفیٰ کی صورت میں نکلا اور ان کی جگہ آفتاب شعبان میرانی سندھ کے وزیر اعلیٰ بنا دیئے گئے۔ (۲۳)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں قائم علی شاہ نے ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کے مدمقابل سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ غوث علی شاہ تھے۔ اس مرتبہ بھی یہ معرکہ قائم علی شاہ کے ہاتھ رہا۔ (۲۴)

۱۹۹۳ء میں بھی اسی حلقہ سے ایک مرتبہ یہی دونوں امیدوار ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ تاہم اس مرتبہ مقابلہ خاصا سخت رہا اور قائم علی شاہ اپنے حریف پر فقط ساڑھے چھ ہزار ووٹوں کی سبقت حاصل کر سکے (۲۵) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں قائم علی شاہ نے غوث علی شاہ سے شکست کھائی (۲۶) تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ اپنی نشست واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے (۲۷) اسی دوران مارچ ۱۹۹۷ء سے اکتوبر ۱۹۹۹ء کے دوران وہ سینٹ آف پاکستان کے رکن کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ (۲۸)

قائم علی شاہ کی صاحبزادی محترمہ نفیسہ شاہ بھی گزشتہ چند برس سے سیاسی میدان میں ہیں۔ وہ ۲۰۰۱ء میں ضلع خیر پور کی ناظمہ منتخب ہوئی تھیں (۲۹) لیکن ۲۰۰۵ء میں وہ فقیر دوست پینل کے حمایت یافتہ امیدوار پیر سید نیاز حسین شاہ جیلانی سے شکست کھا گئیں (۳۰)

قائم علی شاہ کے بھتیجے سید جاوید علی شاہ، ۲۰۰۲ء کے ضمنی انتخاب میں این اے ۲۱۶ خیر پور سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ہیں۔ انہوں نے ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹیرین کے ٹکٹ پر حصہ لیا تھا۔ مگر پاکستان مسلم لیگ (ف) کے امیدوار اور پیر پگارا کے صاحبزادے سید صدرالدین شاہ سے شکست کھا گئے تھے۔ سید صدر الدین شاہ نے خیر پور ہی سے صوبائی اسمبلی کی ایک نشست پر بھی کامیابی حاصل کی تھی اور انتخابات کے بعد بھی وہی نشست برقرار رکھی۔ چنانچہ جب این اے ۲۱۶ خیر پور پر ضمنی انتخاب منعقد ہوا تو سید جاوید علی شاہ نے پاکستان مسلم لیگ (ف) میں شمولیت اختیار کر لی اور اسی پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ یوں وہ قومی اسمبلی کے رکن بننے میں بڑی آسانی کے ساتھ کامیاب ہو گئے (۳۱)

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں خیر پور سے پیر پگارا کی شکست اس انتخاب کی چند بڑی خبروں میں سے ایک خبر تھی۔ انہیں پیپلز پارٹی کے نوجوان رہنما سید پرویز علی شاہ نے شکست دی تھی۔ سید پرویز علی شاہ پیپلز پارٹی کے ایک پرانے کارکن تھے اور انہوں نے پیپلز پارٹی کے لئے مارشل لاء کے دور حکومت

میں بڑی سختیاں برداشت کی تھیں۔ ان کی خدمات اور قربانیوں کے پیش نظر پیپلز پارٹی نے انہیں قومی اسمبلی کا ٹکٹ عطا کیا۔ ان کے مدمقابل پیر صاحب پگارا تھے۔ مگر پیر صاحب پگارا کی پوری حر فوج بھی جیئے بھٹو کے نعروں کا مقابلہ نہ کر سکی اور پیر صاحب پگارا کے ۳۶۳۶۳ ووٹوں کے مقابلے میں سید پرویز علی شاہ جیلانی ۸۸۱۵۱ ووٹوں سے کامیاب ہو گئے۔ دونوں فریقوں کے ووٹ میں ۵۴ ہزار ووٹوں کا فرق تھا۔ جو پیر صاحب پگارا کے حاصل کردہ ووٹوں سے بھی ڈیڑھ گنا زیادہ تھا(۳۲)

سید پرویز علی شاہ جیلانی بعد ازاں بے نظیر کی کابینہ میں بھی شامل رہے۔ انہیں نوجوانوں کے امور کا وزیر بنایا گیا تھا۔ (۳۳)

۱۹۹۰ء کے انتخابات میں پرویز علی شاہ نے ایک مرتبہ پھر پیر صاحب پگارا کو شکست فاش دی تاہم اس مرتبہ دونوں امیدواروں کے ووٹوں میں تقریباً ۲۸ ہزار ووٹوں کا فرق تھا(۳۴)

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں سید پرویز علی شاہ نے قومی اسمبلی کی بجائے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کا اصل ہدف صوبے کی وزارت اعلیٰ تھی۔ تاہم وہ اسمبلی کا انتخاب جیتنے کے باوجود اس ہدف کو حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ انہیں وزارتِ اعلیٰ تو نہ مل سکی لیکن بہ حال وہ ایک اہم وزارت، مواصلات اور ورکس کا قلمدان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۳۵)

پرویز علی شاہ نے ۱۹۹۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی، شہید بھٹو گروپ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا مگر بُری طرح شکست کھائی (۳۶) ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

خیر پور ہی سے سید غوث علی شاہ بھی گزشتہ ایک دہائی سے سیاست کے میدان میں نمایاں ہیں۔ سید قائم علی شاہ کی طرح وہ بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور سیلف میڈ انسان ہیں۔

سید غوث علی شاہ پرانے مسلم لیگی ہیں۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں وہ پاکستان بار کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے سید قائم علی شاہ سے شکست کھائی۔ مارشل لاء کے دور میں انہیں سندھ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔ مگر جج ہونے کے باوجود انہیں سندھ کا وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا، وہ ۶ اپریل ۱۹۸۵ء سے ۶ اپریل ۱۹۸۸ تک پورے تین سال سندھ کے وزیر اعلیٰ رہے گزشتہ نصف صدی کے دوران سر غلام حسین ہدایت اللہ اور غلام مصطفیٰ جتوئی کو چھوڑ کر سندھ کے باقی چودہ سابق وزرائے اعلیٰ میں ان کے زمانہ اقتدار کی مدت سب سے زیادہ رہی۔ سید غوث علی شاہ کو سندھ کے وڈیروں کا کوئی طاقتور گروپ اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگرچہ ان کی کابینہ میں سندھ کے بعض وڈیروں کو بھی نمائندگی ملی مگر سندھ کے وڈیرے، مخدوم پیر اور میران سے دور رہے۔ شاہ صاحب نے بعض وڈیروں کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش بھی کی۔ بعض وڈیروں کے شخصی اقتدار کو کم کرنے کے لئے بھی انہوں نے کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی وزارت اعلیٰ میں اندرون سندھ بڑی یورش ہوئی خصوصاً ۱۹۸۳ء کی ایم آر ڈی کے اثرات کو

مٹانے میں انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ سندھ میں ڈاکوؤں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ تعلیمی اداروں میں گڑ بڑ رہی، جئے سندھ کے حامیوں نے نئے سندھیوں کے لئے بے شمار مشکلات پیدا کر دیں چونکہ انہیں سندھ کی سیاسی دھڑے بندی میں پیر صاحب پگارو گروپ میں شامل کیا جاتا رہا مگر پیر صاحب ان کی پے درپے ناکامیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے کہ سید غوث علی شاہ کو صدر ضیاء الحق خود لائے ہیں ان کی تقرری میں میرا کوئی دخل نہیں۔ ۱۹۸۷ء میں پیر صاحب اور شاہ صاحب میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ کراچی میں شاہ صاحب نے جماعت اسلامی کو نیچا دکھانے کے لئے بلدیہ کراچی توڑ ڈالی، اس سے جماعت اسلامی کے حلقوں میں شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ میئر افغانی سراپا احتجاج بن گئے۔ جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے پاکستان کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا اور ان کی سیاسی قوت کا گراف نیچے آ گیا اس خلا کو پُر کرنے کے لئے ایم کیو ایم سامنے آئی۔ دوسری طرف کراچی اور حیدر آباد میں بسنے والے پنجابیوں اور پٹھانوں نے بھی پنجابی پختون اتحاد کے نام سے ایک نئی تنظیم کو جنم دیا کراچی اور حیدر آباد لسانی اور نسلی فسادات کی زد میں رہے۔ شاہ صاحب کے بارے میں پروپیگنڈہ ہوتا رہا کہ انہوں نے جئے سندھ کو اندرون سندھ اور ایم کیو ایم کو کراچی اور حیدر آباد میں ابھارا ہے۔ جب حالات قابو میں نہ رہے تو ۶ اپریل ۱۹۸۸ء کو ان سے استعفیٰ لے لیا گیا۔ شاہ صاحب نے پیپلز پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لئے اسلامی اتحاد کا ٹکٹ بھی نہ لیا اور انہوں نے سندھیوں کو تاثر دیا کہ وہ کالا باغ ڈیم کی مخالفت کے باعث اقتدار سے محروم ہوئے ہیں۔ جب انہیں سندھ کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا اس وقت وہ ایم پی اے نہیں تھے بعد میں ضلع سکھر سے ایک صوبائی نشست خالی کرا کر انہیں کامیاب بنایا گیا تھا۔ (۳۷)

۱۹۸۸ء میں سید غوث علی شاہ نے سید قائم علی شاہ سے شکست کھائی تھی۔ انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ ۱۹۹۰ء میں وہ عام انتخابات میں تو صوبائی اسمبلی کی نشست پر سید قائم علی شاہ سے ہار گئے تاہم ضمنی انتخابات میں وہ محمد خان جونیجو کی خالی کردہ نشست پر بلا مقابلہ کامیاب ہو کر قومی اسمبلی تک ضرور پہنچ گئے (۳۸) ۱۹۹۱ء میں وہ سینٹ کی رکنیت کے بھی امیدوار تھے اور اس رکنیت کے ذریعہ سینٹ کی چیئرمین شپ تک رسائی حاصل کرنا چاہتے تھے مگر وہ سینٹ کے رکن ہی نہ بن سکے ورنہ شاید غلام اسحاق خان کے استعفیٰ کے بعد وسیم سجاد کی بجائے وہ نگراں صدر مملکت ہوتے۔ (۳۹)

غوث علی شاہ نواز شریف کابینہ میں بھی شامل رہے تھے انہیں دفاع جیسی اہم وزارت کا قلم دان سونپا گیا تھا (۴۰)

۱۹۹۳ء میں غوث علی شاہ نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی کی نشست پر وہ منظور احمد وسان کے مدمقابل تھے جبکہ صوبائی اسمبلی کی نشست پر وہ حسب سابق سید قائم علی شاہ کا مقابلہ کر رہے تھے۔ (۴۱) تاہم غوث علی شاہ ان دونوں نشستوں پر کامیاب نہ ہو سکے (۴۲)

۱۹۹۸ء میں غوث علی شاہ نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا اور دونوں نشستوں پر کامیاب ہوئے (۴۳) بعدازاں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی اور مرکز میں وزیر تعلیم کے منصب پر فائز ہوئے (۴۴) ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

حوالہ جات

۱۔ رابیل شر۔ خیر پور جی سیاسی کہانی۔ پندرہ روزہ عبرت میگزین۔ حیدر آباد۔ یکم ستمبر ۱۹۹۳۔ ص ۱۴۔

۲۔ سارہ ایف ڈی انصاری۔ صوفی سینٹس اینڈ اسٹیٹ پاور۔ لاہور۔ ص۔ ۹۹، ۱۲۵

۳۔ ادریس بختیار، علی حسن۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۱۹۹۰۔ ص۔ ۸۲

۴۔ سارہ ایف ڈی انصاری۔ صوفی سینٹس اینڈ اسٹیٹ پاور۔ لاہور۔ ص۔ ۱۲۱، ۱۲۲

۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص۔ ۳۴۳

۶۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۲۸۴

۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص۔ ۳۴۲، ۴۵۸، ۴۵۹

۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۷۴

۹۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۲۹

۱۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص۔ ۳۶۵

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص۔ ۳۲۰

۱۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۹۳ء

۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۔ ۱۲۴

۱۴۔ ایضاً۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص۔ ۷۶

۱۵۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ کراچی۔ ص۔ ۹۰، ۹۱

۱۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص۔ ۳۶۵

۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص۔ ۳۲۱

۱۸۔ رابیل شر۔ خیر پور جی سیاسی کہانی۔ پندرہ روزہ عبرت میگزین۔ حیدر آباد۔ یکم ستمبر ۱۹۹۳ء۔ ص۔

۱۴

۱۹۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۶۲

۲۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۵۵

۲۱۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۲۸۴

۲۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۶۴

۲۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۷ فروری ۱۹۹۰ء

۲۴۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰۔ لاہور۔ ص۔ ۶۱۸

۲۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۶۱

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۵۳

۲۷۔ ایضاً۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۳۴۲

۲۸۔ پارلیمنٹ ہاؤس، اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان، ڈائرکٹری آف ممبرز۔ چوتھا ایڈیشن۔ ص ۱۵۵

۲۹۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۸۰

۳۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۳۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد، رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز جلد دوم۔ ص ۷۷، ۳۷۰

۳۲۔ ادریس بختیار۔ پیر پریشر۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۱۹۹۰ء۔ ص ۱۲۷، ۱۲۸

۳۳۔ ٹی ایم ڈوگر۔ ہوز ہو اینڈ وہاٹ از وہاٹ ۱۹۸۹ء۔ لاہور۔ ص۔ ۵

۳۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۷۴

۳۵۔ جاوید منصور۔ فرام پرائزنز ٹو پارٹیز۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۳/۔ ۱۹/جنوری ۱۹۹۴ء ص ۶

۳۶۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۲۴۶

۳۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص۔ ۳۶۴، ۳۶۵

۳۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص۔ ۳۱۹، ۵۳۶

۳۹۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۱۴ مارچ ۱۹۹۱ء، ۱۵ مارچ ۱۹۹۱ء

۴۰۔ ڈوگر برادرز۔ پاکستان اور دنیا میں کون کیا ہے؟ لاہور۔ ص۔ ۴۸۳

۴۱۔ عبدالرزاق خلجی۔ خیر پور میں امیدوار ووٹروں کی آؤ بھگت میں مصروف ہیں۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۹۳ء

۴۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۳۰۴، ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۶۱
۴۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۲۳، ۴۵۳
۴۴۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء (جلد اوّل)۔ لاہور۔ ص۔ ۱۸۲

زرداری

جناب صادق علی شیر علی انصاری کی معروف کتاب ''دی مسلم ریسز فاؤنڈ ان سندھ، بلوچستان اینڈ افغانستان'' کے مطابق زرداری ایک بلوچ سمہ قبیلہ ہے (۱) اختر علی خان بلوچ نے اپنی کتاب بلوچستان کی نامور شخصیات میں تحریر کیا ہے کہ زرداری قبیلہ چھ لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور اس کی سات شاخیں ہیں۔ اس قبیلے کے سردار، حاکم علی زرداری ہیں جن کا تعلق ضلع نواب شاہ کے تعلقہ سکرنڈ کے گوٹھ فتوبل زرداری سے ہے۔ وہ ۱۹۲۹ء میں سردار حاجی محمد حسین زرداری کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ (۲)

حاکم علی زرداری کا آبائی شغل تو جاگیرداری تھا مگر ان کا ذاتی رجحان کاروبار کی جانب سے تھا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں وہ کراچی کی فلمی صنعت میں انگریزی فلموں کے تقسیم کار کے طور پر نمایاں ہوئے اور بہت جلد شہر کے سب سے بڑے سینما کے مالک بن گئے۔

اسی دوران انہیں سیاست کا شوق بھی ہوا اور وہ نواب شاہ کونسل کے رکن اور یونین کونسل جمال شاہ کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو حاکم علی زرداری اس نئی پارٹی میں شامل ہوگئے۔ (۳)

پیپلز پارٹی میں شمولیت کے بعد جناب حاکم علی زرداری نے اخبارات میں لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی تحریروں میں سندھ کے روائتی وڈیروں کو ہدف تنقید بنانے لگے۔ انہوں نے اپنے ایسے ہی ایک کالم میں، جو روزنامہ جنگ کراچی میں ۳ نومبر ۱۹۶۹ء کو شائع ہوا تھا، تحریر کیا:

''جو شخص بھی دیدۂ بینا کی نعمت سے نواز گیا ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ آج سندھ کے عوام اور سندھ کی نمائندگی کے دعویداروں کے درمیان جو فصل ہے جو فرق ہے اور جو بعد مراتب ہے وہ پاکستان کے کسی علاقے میں نہیں پایا جاتا اور خدا نہ کرے کہ پایا جائے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ گزشتہ صدی میں جتنا سیاسی سماجی معاشی اور ثقافتی نقصان سندھ اور سندھ کے عوام کو پہنچا ہے اس کی نظیر برصغیر میں کہیں نہیں مل سکتی۔

ہر حال کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔

ہر دکھ کا ایک سبب ہوتا ہے۔

ہر بیماری بے سبب نہیں آتی۔

میں جب ایک آزاد خیال آدمی کی حیثیت میں سندھ کے حالات کا تجزیہ کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ ہر بیماری کی جڑ سندھ کے سیاسی وڈیرے ہیں۔

سندھ اور سندھ کے عوام جن تکلیفوں میں آج مبتلا ہیں ان تمام تکلیفوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔

بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔

سندھیوں نے غیر ملکی قیادت کا جوا اتار کر پھینکا اور آزادی کی نعمتوں کے بڑے حصہ دار وہ کوے بن گئے جو باہر سے اڑ کر آتے تھے۔

لیکن یہ ایک فریب ہے سراسر فریب۔

جو لوگ باہر سے آئے اور جنہیں سندھ کا سیاسی وڈیرا ہر بیماری کی جڑ محض اس لئے قرار دیتا ہے کہ اس کے اپنے گناہوں پر نقاب ڈلا رہے، ان میں سے چند مزدور وڈیرے بن گئے لیکن اکثریت ان کی بھی گندی جاہلانہ قیادت کا شکار ہے اور رہے گی۔

سندھ کے دکھ بیس سال پرانے نہیں پچاس نہیں بلکہ سو سال پرانے ہیں ان دکھوں کی تمام تر ذمہ داری ہمارے سیاسی وڈیروں پر ہے جن کی خود غرضانہ اور جاہلانہ قیادت نے یہ ماحول پیدا کیا۔

وہ موت جو خود ان کی لائی ہوئی ہے جب آ پہنچی اور انہیں اندیشہ لاحق ہوا کہ سندھ کے معاشی ،ثقافتی ،لسانی، سیاسی قتل کا ذمہ دار انہیں قرار نہ دیا جائے تو انہوں نے بالکل اس بے کسی کے عالم میں جیسے کسی بے علاج مریض کے لواحقین کہتے ہیں کہ خدا اسے شفا دے یہ نعرہ لگایا ہے کہ

جیئے سندھ

سندھ جیئے اور جم جم جیئے

عوام جب یہ نعرہ لگاتے ہیں تو ان کے ذہن میں حقیقی سندھ ہوتا ہے مگر جب سندھ کے سیاسی وڈیرے یہ نعرہ لگاتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بس وڈیرا زندہ رہے وہ نیا سندھی ہو یا پرانا سندھی اور سندھی عوام......؟

ان کی زندگی سے کسی کو کیا سروکار

الیکشن نزدیک آ رہا ہے

سیاسی حقوق بحال ہونے کے امکانات نظر آ رہے ہیں اور جمہوریت جس کی خود ان ہی سیاسی وڈیروں نے مٹی پلید کی تھی۔ اب پھر اس کے بحال ہونے کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔

سیاست کے اشجار جب پھلنے لگتے ہیں تو سیاسی وڈیرے پھر میدان میں کود پڑتے ہیں۔
چنانچہ پرانے شکاری ...... سندھ کے سیاسی وڈیرے پھر جال لے کر چلے آئے ہیں ...... جال بھی نیا نہیں ...... صدیوں پرانا کہ ہم سندھی عوام کے خادم ہیں ان کو ان کے کھوئے ہوئے حقوق دلائیں گے۔
سرزمین سندھ کو پھر سے جنت بنائیں گے۔
افسوس کہ سندھ کے ان سیاسی وڈیروں کی قیادت نے سندھ کے غریب عوام کو کچھ بھی نہیں دیا۔
ایک بار نہیں پچاس بار اپنی قیادت کے جوہر دکھا چکے ہیں تو ایسے میں عوام ان پر کیوں اعتماد کریں۔
آزمائے ہوئے کو پھر سے کیوں آزمائیں۔
سندھ کے سیاسی وڈیرے کی یہ دیرینہ فطرت ہے کہ جب الیکشن قریب آتا ہے وہ آپس میں گروہ بنا کر نئے چوغے پہن کر میدان میں آجاتے ہیں کیونکہ وہ سیاست کو اپنا موروثی حق سمجھتے ہیں اسمبلی کی ممبری وزارت و سفارت سب کے اہل کار وہ ہیں اور کوئی نہیں اور سندھ کی ہر چیز کو اپنی ذاتی ملکیت اور جاگیر تصور کرتے ہیں حالانکہ نہ تو وہ سندھی ہیں اور نہ ہی ان کو سندھ کے عوام سندھ کی سرزمین سے محبت اور پیار ہے۔ ان کو تو ہمیشہ اپنے اقتدار سے پیار اور محبت رہی ہے۔ جب سندھ کا صوبہ بمبئی کے ساتھ تھا تو یہی لوگ یہاں سے جا کر بمبئی کے سیٹھوں کے مہمان ہوتے تھے اور وہاں سندھ کے عوام کی قیادت کرنے کے بجائے اپنی ہی گروہ بندی اور اپنی ہی رنگ رلیوں میں مصروف رہتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اگر انہوں نے کوئی تیر مارا تو کسی نے خان بہادر کا خطاب پایا کوئی سر کہلایا اور کوئی خان صاحب بھی نہ بن سکا تو کمشنر اور کلکٹر کے دربار کا کرسی بردار بنا۔ مطلب یہ کہ نمائندے سندھی عوام کے نمائندے بن کر گئے اور وہاں جا کر اپنی ذات کا فائدہ پہنچایا۔
اس کے بعد جب سندھ ۱۹۳۶ء میں بمبئی سے الگ ہوا تو سندھ کے عوام کو بڑی امیدیں بندھیں کہ اب کچھ ہمارے آنسو پونچھے جائیں گے۔ ہماری کچھ تکلیفیں اور دکھ دور ہوں گے مگر حالات پہلے سے بھی بدتر ہوئے۔

ہمارے یہی رہنما یا ان کے خاندان کے افراد اسمبلیوں کے ممبر بنے، وزیر بنے، وزیر اعظم بنے، انہوں نے تمام سندھ کے عوام کے پاؤں اور ہاتھوں میں غلامی کی زنجیریں پہنائیں اور ہر وڈیرا اپنی زمینداری اور جاگیرداری میں بنی آدم کو زمین پر بٹھاتا، پاؤں پڑواتا اور تمام سندھی قوم کو احساس کمتری میں مبتلا کرتا رہا۔ ان کو یہی سمجھایا گیا کہ تم دوسرے درجے کے شہری ہو تم کم تر انسان ہو۔ یہ ظلم اور ستم ۱۹۴۱ء میں انتہا کو پہنچا ۱۹۴۱ء میں سندھ کی سرزمین پر دس مہینے مارشل لاء ان ہی رہبروں اور رہنماؤں نے انگریز بہادر کو کہہ کر لگوایا۔ ان دس مہینوں میں سندھ کے عوام پر جو مظالم ہوئے ان کی داستان خونچکاں اب تک سندھ کے عوام کو یاد ہیں۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا، انگریز دو عالمگیر جنگوں میں کمزور ہونے کی وجہ سے بوریا بستر چھوڑ کر چلا گیا۔ سندھ کے عوام کو یقین ہوگیا کہ اب ہم آزاد ہو رہے ہیں۔ اسلامی ریاست بن رہی ہے۔ ہمیں جتنے بھی دکھ اور تکلیفیں غلامی کی وجہ سے ہوئی تھیں وہ ختم ہو جائیں گی۔ لیکن افسوس کہ پاکستان بننے کے بعد ان سیاسی وڈیروں کے ظلم وتشدد زیادتیوں میں مزید اضافہ ہوا۔ اب تو اپنے ہی رہبر اپنے ہی رہنما اپنے ہی ہاتھوں سے سندھ کے عوام کو اپنا سمجھ کر لوٹتے رہے۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر آٹھ سال تک سندھ میں سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی اور انسانی حقوق سب چھین لئے گئے۔ ان آٹھ سالوں میں وڈیرے وزارتوں اور اسمبلیوں میں آپس میں دنیا جہاں سے بے خبر دست وگریباں ہوتے رہے۔ آٹھ سال میں پانچ چھ وزارتیں بدلیں اور دو سال گورنر راج رہا آخر میں آخری وزارت جس کے ایک سو سے زیادہ ممبر تھے جس میں بارہ وڈیرے پندرہ پارلیمانی سیکریٹری تین مشیر ہوئے۔ کراچی اور خیر پور کے خطے کو نکال کر باقی سندھ کے ہر خطے کے وزیر تھے۔ اسی عالم میں ون یونٹ بنایا گیا اور ان ہی وڈیروں نے ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو حیدر آباد کے شہر میں ون یونٹ کا بل پاس کیا۔ اب وحدت کا یہ وسیع خطہ کراچی سے لے کر پشاور تک بیورو کریسی کے ہاتھ آیا۔ اس بیورو کریسی کے سامنے انسان کی عزت، آبرو، جان و مال اور عزت نفس کی کوئی حقیقت نہ رہی۔ یہی وڈیرے ون یونٹ میں پھر وزیر، اسمبلیوں کے ممبر اور عہدیدار بن کر لاہور اور راولپنڈی میں وارد ہوئے۔ یہ تیرہ سال کے عرصہ تک وہاں اپنی رنگ رلیوں میں اور گروہ بندیوں میں مصروف رہے اور ہر چڑھتے سورج کے پجاری بن کر بیورو کریسی کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور ان کے ساتھی اور رفیق بنے رہے۔ سندھ میں شکار کی بیماری ان وڈیروں میں پرانی تھی۔ اس تیرہ سال کی مدت میں اس میں چار چاند لگ گئے اب ہر وزیر، ہر سفیر، ہر سربراہ مملکت اور ہر آفیسر سندھ کی سرزمین میں شکار کرتا نظر آیا۔ یہی وڈیرے ان کی مہمان نوازی اور خوشامد میں لگے رہے۔ ان وڈیروں نے سندھی عوام کی طرف سے پرمٹیں لیں اور ان کو بیچ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائی۔

اب یہ سیاسی سوداگر پھر سندھ کے عوام کا سودا کرنے نکلے ہیں۔ اب پھر جنرل الیکشن ہونے والے ہیں اور یہ پھر مونچھوں پر تاؤ دے کر سیاست میں کود پڑے ہیں۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر سندھ کے عوام کے لئے چیخ رہے ہیں اور مگر مچھ جیسے آنسو بہا رہے ہیں۔ اب ان کو کیا چاہیے ......؟ چند مہینوں میں انہوں نے وہی پرانی حرکتیں، آپس میں دست وگریبان ہونا، ایک دوسرے پر شخصی حملے کرنا، اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا ہے۔

حیدر آباد سندھ میں دو سندھی اخبار نکل رہے ہیں۔ ان کے پڑھنے کے بعد ہر محبّ وطن سندھی کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔ میں دونوں اخباروں کے منتظمین اپنے بزرگوں اور دوستوں سے عرض کرتا ہوں کہ کیا یہی صحافت ہے؟ کیا یہی سیاست ہے؟ آپ کی ان حرکتوں کی وجہ سے سندھ کی

ثقافت اور سندھی زبان کی کوئی خدمت نہیں ہو رہی بلکہ اخبار پڑھنے والوں کی نظروں میں آپ کا وقار گر گیا ہے اور آپ بہت حقیر ہو رہے ہیں کیا سندھی عوام امید کریں کہ آپ اپنی اس روش کو بدلیں گے اگر نہیں تو پھر آپ یہ خدمت نہیں بلکہ ایک بہت بڑا جرم کر رہے ہیں جسے آنے والی نسلیں بھی معاف نہیں کریں گی۔

سیاسی وڈیروں کو چھوڑ کر اب میں چند گزارشات سندھ کے سیاسی ورکروں اور اپنے نوجوان ساتھیوں کی خدمت میں پیش کروں گا۔ آپ کے جذبات اور آپ کے خیالات کا سندھی عوام احترام کرتے ہیں اور سندھی عوام آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔لیکن آپ جذبات کے ساتھ کچھ سوچنے کی زحمت بھی گوارا کریں۔ ہمیشہ یہ سیاسی اصول رہا ہے کہ ایک قیادت کو ہٹانے کے بعد نئی قیادت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اب تک ہماری پہلی قیادت نے سندھ کا پیچھا نہیں چھوڑا اور وہ اپنی پرانی باتوں اور گناہوں کو بھلا دینے کی تلقین کر رہی ہے۔ دوستو کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جن کو وقت بھر دیتا ہے اور کچھ زخم ایسے ہوتے جو زندگی کا ناسور بن جاتے ہیں۔ ہم نے پہلے ہی بڑے زخم کھائے ہیں۔ بڑے دُکھ اٹھائے ہیں۔ بڑی ذلتیں اور رسوائیاں گلے میں ڈالی ہیں۔ اب سندھ کے عوام میں زیادہ زخم کھانے کی گنجائش نہیں ہے اگر واقعی آپ سندھ کا کوئی قرضہ جو ہماری سات پشتوں پر ہے ادا کرنا چاہتے ہیں تو پہلا کام آپ لوگوں کو یہ کرنا چاہئے کہ ان بردہ فروشوں سے دور بھاگیں۔ ان کی محفلوں، ان کی ملاقاتوں اور ان کی محلاتی سازشوں میں شریک نہ ہوں کیونکہ ان لوگوں کی محلاتی سازشوں میں پتہ نہیں کتنے لاکھوں انسانوں کی تمناؤں کا خون کرنے کے سامان تیار ہو رہے ہیں۔ یہ احمقوں کی جنت میں رہنے والے لوگ ابھی سے گھر میں بیٹھ کر آپس میں وزارتیں اور اسمبلی کی کرسیاں بانٹتے پھر رہے ہیں ان کی ہر چال ہر کوشش یہی ہو رہی ہے کہ سندھ کے سیاسی ورکر اور نوجوانوں کو ساتھ ملا کر سیاسی اقتدار حاصل کریں۔ ووٹروں کی لسٹ بننا شروع ہوگئی ہے۔ آپ شہروں میں ان کے بنائے ہوئے گروپوں میں گھوم پھر رہے ہیں۔ لیکن سیاسی وڈیرا خاموشی سے لسٹیں بنانے کا کام کر رہا ہے لہٰذا آپ لوگوں کا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ آپ شہر ہو یا دیہات گھر گھر جا کر الیکشن اتھارٹی سے تعاون کریں اور الیکشن کی صحیح لسٹ ایمانداری سے بنائیں۔ اس کے بعد ہر سیاسی وڈیرے کے مقابلے میں ہر اسمبلی میں اپنا آزاد نمائندہ کھڑا کریں۔ کوئی بات نہیں ہار جیت ہوتی رہتی ہے لیکن ایک تو زندگی میں ان بڑے آدمیوں کا مقابلہ پہلی دفعہ ہوگا اور ظالم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔ ہر جگہ پر ان کا مقابلہ ان لوگوں کے لئے ایک نئی بات ہوگی۔ سندھ کے عوام کو اپنے صحیح ووٹ دینے کا ایک موقع ملے گا اور نئی قیادت کے نوجوان اسمبلیوں میں ممبر بن کر آئیں گے ان کو سوائے سندھ کے عوام کی خدمت اور ان کے دکھوں کے علاج کا اور کوئی سودا نہ ہوگا۔

سندھ کے سیاسی وڈیروں کی میراث پر عوام کی طرف سے یہ پہلا حملہ ہوگا اور یہ حملہ بجائے خود

ایک مقصد ہے۔

میں پرانا آزاد سیاسی کارکن ہوں اور کارکن ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میری آنکھیں بڑے بڑے تماشے دیکھ چکی ہیں۔ اب ان آنکھوں اور دل میں ایک ہی حسرت باقی ہے وہ یہ کہ سندھ میں سیاسی وڈیرے کی سیاسی موت ہوتا کہ آنے والی نسلیں سکھ، سکون اور عزت نفس کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔" (۴)

قارئین، آپ مجھے جناب حاکم علی زرداری کے کالم کے اس طویل اقتباس کے لیے معاف فرمائیں مگر کتاب میں اس اقتباس کو محض اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ آپ جان سکیں کہ ایک سیاسی کارکن جب تک صرف ایک سیاسی کارکن ہوتا ہے تو اس کی سوچ کیا ہوتی ہے اور جب وہ سیاسی کارکن، ایک سیاسی خانوادے سے منسلک ہو کر خود ایک سیاسی وڈیرا بنتا ہے تو اس کا طرز عمل کیا ہوتا ہے۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں حاکم علی زرداری، نواب شاہ سے قومی اسمبلی کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس وقت نواب شاہ میں قومی اسمبلی کی دو نشستیں تھیں، پاکستان پیپلز پارٹی نے نواب شاہ سے قومی اسمبلی کی دوسری نشست کے لیے جناب غلام مصطفٰے جتوئی کو اپنا نمائندہ نامزد کیا تھا۔

ان انتخابات کے وقت پورا مغربی پاکستان، خصوصاً صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ، ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کے سحر میں گرفتار تھا چنانچہ اسی فضا کے باعث جناب حاکم علی زرداری، قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوگئے۔ ان سے شکست کھانے والے امیدواروں میں آزاد امیدوار شبیر احمد شاہ، جمعیت علمائے اسلام کے حاجی علی احمد شاہ اور جماعت اسلامی کے محمد سلیم شامل تھے (۵)

۱۹۷۱ء میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو حاکم علی زرداری کی شہرت قومی اسمبلی میں پچھلی نشستوں پر بیٹھنے والے ایک خاموش رکن اسمبلی کی تھی جس کا کام صرف حکومتی پارٹی کی پالیسیوں کی تائید کرنا تھی (۶) اس عہد میں وہ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی رکنیت کے منصب پر فائز رہے۔

قومی اسمبلی میں حاکم علی زرداری کی غیر فعالیت کی وجہ سے ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے لیے پیپلز پارٹی کا ٹکٹ نہیں دیا بلکہ یہ ٹکٹ ۱۹۷۰ء میں ان سے شکست کھانے والے امیدوار سید شبیر احمد شاہ کو دے دیا۔ جس پر حاکم علی زرداری نے ناراض ہوکر پیپلز پارٹی سے ترک تعلق کر لیا اور نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں نہ صرف شمولیت اختیار کر لی بلکہ اس کے صوبہ سندھ کے آرگنائزر بھی بن گئے۔ نومبر ۱۹۷۷ء میں انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی ایک ''داغ دار'' پارٹی بن چکی ہے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو مشورہ دیا کہ وہ این ڈی پی میں شامل ہو جائیں (۷)

۱۹۸۱ء میں ۹ سیاسی جماعتوں کا اتحاد ایم آر ڈی قائم ہوا۔ اس اتحاد کی اساسی جماعتوں میں این ڈی پی بھی شامل تھی۔ ۱۹۸۵ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات منعقد کروانے کا اعلان کیا تو ایم آر ڈی نے ان انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا(۸) حاکم علی زرداری نے اس فیصلے کی پروانہ کرتے ہوئے ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لیا۔ ان کا حلقہ انتخاب تھا این اے ۱۶۰ نواب شاہ ۳ مگر وہ اس انتخاب میں بری طرح شکست کھا گئے۔ انہوں نے سید اصغر علی شاہ کے ۳۴ ہزار سے زائد اور محمد عمر ڈاہری کے ۲۶ ہزار سے زائد ووٹوں کے مقابلے میں محض ۱۵ ہزار کے لگ بھگ ووٹ حاصل کیے۔(۹)

ان انتخابات میں شکست کھانے کے بعد حاکم علی زرداری کا نام اس وقت خبروں کا مرکز بنا جب ۲۹/جولائی ۱۹۸۷ء کو ان کے صاحبزادے آصف علی زرداری کی منگنی سابق وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ انجام پائی۔ چند ماہ بعد ۱۸/دسمبر ۱۹۸۷ء کو بے نظیر بھٹو بہو بن کر ان کے گھر آ گئیں۔ (۱۰)

۱۹۸۷ء ہی میں این ڈی پی بھی اے این پی میں تبدیل ہو چکی تھی اور اس کا تاسیسی کنونشن بھی کراچی میں حاکم علی زرداری کی قیام گاہ پر منعقد ہوا تھا (۱۱) آصف زرداری اور بے نظیر بھٹو کی دعوت ولیمہ میں خان عبدالولی خان نے بطور خاص شرکت فرمائی کیونکہ آصف زردای ان کی پارٹی کے مرکزی نائب صدر حاکم علی زرداری کے فرزند تھے (۱۲)

مگر اس شادی کے چند ہی ماہ جناب حاکم علی زرداری نے اپنی سیاسی وابستگی تبدیل کر لی اور اپنی بہو کی قیادت میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں حاکم علی زرداری نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایک مرتبہ پھر این اے ۱۶۰ نواب شاہ ا سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے تھے چنانچہ وہ ساڑھے پچیس ہزار سے زائد ووٹ لے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے (۱۳) قومی اسمبلی میں پہنچتے ہی ان کی بہو نے، جواب ملک کی وزیر اعظم بن چکی تھیں، انہیں قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا چیئرمین مقرر کر دیا۔ حاکم علی زرداری نے اس حیثیت میں جنرل ضیاء الحق اور محمد خان جونیجو کی حکومت کی بدعنوانیوں کے معاملات کی چھان بین کی لیکن حزب اختلاف کی جانب سے خود ان پر بدعنوانیوں کے ایسے سنگین الزامات عائد کیے گئے کہ وہ بے نظیر حکومت کے آخری ایام میں پاکستان سے باہر چلے گئے۔ (۱۴)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں جناب حاکم علی زرداری نے صرف کاغذات نامزدگی جمع کروانے کی حد تک حصہ لیا (۱۵) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات سے کچھ عرصہ قبل وہ وطن واپس آئے اور این اے ۱۶۱ نواب شاہ ۲ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے (۱۶) انتخابات کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو ایک مرتبہ پھر ملک کی وزیر اعظم بن گئیں اور انہوں نے ماضی کی غلطیوں سے کوئی سبق نہ لیتے ہوئے اپنے

سسر کو ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا چیئرمین مقرر کر دیا اس دور حکومت میں بھی حاکم علی زرداری کی قومی اسمبلی میں بے سرو پا تقریریں حکومت کی سبکی کا باعث بنتی رہیں اور حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے اخبارات اور جرائد مستقل ان کی بدعنوانیوں کی مبینہ داستانیں شائع کرتے رہے (۱۷)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں حاکم علی زرداری نے نواب شاہ کے دونوں حلقوں سے قومی اسمبلی کے لیے کاغذات نامزدگی جمع کروائے مگر ایک میں بھی فعال حصہ نہیں لیا۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا (۱۸)

حاکم علی زرداری کے اکلوتے فرزند اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے شوہر جناب آصف زرداری کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

آصف زرداری نے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات سے کیا تھا۔ ان انتخابات میں انہوں نے پی ایس ۲۲ نواب شاہ ۷ سے کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے مگر صرف ۵۳ ووٹ حاصل کر سکے تھے اور یوں اس حلقے میں انتخاب لڑنے والے تمام امیدواروں میں آخری پوزیشن حاصل کی تھی (۱۹)

۱۹۸۷ء میں ان کی قسمت نے پلٹا کھایا اور محترمہ بے نظیر بھٹو سے ان کی شادی ہوگئی ۔ وہ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں تو شریک نہیں ہوئے مگر حکومتی معاملات میں ان کا عمل دخل اتنا بڑھا کہ انہیں مسٹر ٹین پرسنٹ کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔ اس خطاب کا پس منظر یہ تھا کہ اس زمانے میں مشہور تھا کہ حکومت کے ہر سودے میں آصف زرداری کا حصہ مبینہ طور پر دس فیصد ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب غلام اسحٰق خان نے ۱۹۹۰ء میں بے نظیر بھٹو کو برطرف کیا تو اپنی فرد جرم میں اشارۃً آصف زرداری کا ذکر بھی کیا (۲۰)

بے نظیر حکومت کی معزولی کے بعد آصف زرداری گرفتار کر لئے گئے۔ ان کے خلاف بدعنوانیوں کے مختلف ریفرنسز دائر کئے گئے۔ مگر تادم تحریر ان میں سے ایک ریفرنس بھی ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔

اسی دوران ملک کے عام انتخابات منعقد ہوئے۔ جن میں آصف زرداری نے دو نشستوں پر انتخاب لڑا۔ نواب شاہ کی نشست این اے ۱۶۰ نواب شاہ ا پر تو وہ نگران وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی کے صاحبزادے غلام مرتضیٰ جتوئی سے شکست کھا گئے، مگر کراچی کی نشست این اے ۱۸۹ کراچی جنوبی ا پر وہ ۵۴ ہزار سے زیادہ ووٹ لے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔ (۲۱) آصف زرداری کم و بیش ڈھائی برس پس دیوار زنداں رہے مگر اپنے تمام مقدمات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ اپریل ۱۹۹۳ء میں ان کی ضمانت پر رہائی عمل میں آئی اور نواز شریف حکومت کے خاتمے کے بعد، جن غلام

اسحاق خان نے اگست ۱۹۹۰ء میں ان پر بدعنوانیوں کے الزامات عائد کیے تھے، انہی غلام اسحٰق خان نے ان سے نگران کابینہ میں پانی اور بجلی کے وزیر کا حلف اٹھوالیا۔ (۲۲)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں آصف زرداری نے ایک مرتبہ پھر این اے ۱۶۰ نواب شاہ ۱۵ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کے سب سے مضبوط حریف سید کاظم حسین شاہ تھے۔ جن کا تعلق پاکستان مسلم لیگ (ن) سے تھا۔ آصف زرداری نے یہ معرکہ تقریباً گیارہ ہزار ووٹوں سے سر کر لیا (۲۳)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں آصف زرداری نے حصہ نہیں لیا تاہم مارچ ۱۹۹۷ء میں انہیں سینٹ آف پاکستان کا رکن منتخب کرلیا گیا (۲۴)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات کے وقت آصف زرداری جیل میں تھے ان کی قید کا سلسلہ نومبر ۱۹۹۶ء میں بے نظیر حکومت کے خاتمے کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ نواز شریف کے پورے دور حکومت میں پابند سلاسل رہے بلکہ پرویز مشرف کے دور حکومت میں بھی انہوں نے تقریباً پانچ برس قید میں گزارے۔ یوں انہیں ۲۲ نومبر ۲۰۰۴ء کو تقریباً ۸ برس کی قید کے بعد رہائی نصیب ہوئی (۲۵)

آصف زرداری کے خلاف آج بھی کرپشن کے لا تعداد مقدمے جاری ہیں۔ ان پر ان کے برادر نسبتی مرتضیٰ بھٹو کو قتل کروانے کا مقدمہ بھی دائر کیا گیا ہے۔ کئی مقدمات میں عدالتوں نے انہیں جرمانے، جائیداد کی ضبطی اور عوامی نمائندگی سے نااہلی کے فیصلے بھی سنائے ہیں مگر پھر اعلیٰ عدالتوں میں ان فیصلوں کے خلاف اپیلیں بھی دائر کر دی گئی ہیں جن کے باعث عوام اب تک یہ نہیں جان سکے ہیں کہ بے نظیر بھٹو کے شوہر پر دائر ہونے والے مقدمات محض سیاسی دشمنیوں کے شاخسانے ہیں یا واقعی درست ہیں (۲۶) چونکہ یہ مقدمات مختلف عدالتوں میں زیر سماعت ہیں اس لیے ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جا رہا۔

آصف زرداری کی تین بہنیں ہیں جو آصف زرداری کے جیل جانے کے بعد سیاست کے میدان میں متحرک ہوئیں۔

ان میں فریال تالپور نے ۱۹۹۷ء میں این اے ۱۶۰ نواب شاہ ا سے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدوار سید شوکت حسین شاہ سے شکست کھا گئی تھیں۔ (۲۷) اگست ۲۰۰۱ء میں وہ نواب شاہ کی ضلعی ناظمہ منتخب ہوئیں (۲۸) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا اور ۲۰۰۵ء میں دوسری مرتبہ نواب شاہ کی ناظمہ منتخب ہوئیں۔ اس مرتبہ ان کے اور خوشحال پاکستان پارٹی کے خان محمد ڈاہری نے برابر ووٹ حاصل کیے تھے اس لیے فیصلہ ٹاس پر ہوا تھا (۲۹)

فریال تالپور کے شوہر میر منور علی تالپور ہیں جن کا تفصیلی احوال اسی کتاب میں تالپور خاندان کے ذیل میں رقم کیا گیا ہے۔

آصف زرداری اور فریال تالپور کی دو چھوٹی بہنیں عذرا افضل پیچوہو اور فوزیہ اقبال زرداری نے بھی ۲۰۰۲ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا۔ ان میں عذرا افضل پیچوہو این اے ۲۱۳ نواب شاہ ا سے قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں جب کہ فوزیہ اقبال زرداری نے ان انتخابات میں فعال حصہ نہیں لیا اور دونوں حلقوں میں مجموعی طور پر صرف ۴۰۱ ووٹ حاصل کر سکیں (۳۰) فوزیہ اقبال زرداری نے ۲۰۰۵ء میں نواب شاہ کی ضلعی ناظمہ کے انتخاب کے لیے بھی کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے مگر پھر اپنی بہن فریال تالپور کے حق میں دستبردار ہوگئی تھیں (۳۱)

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ آصف زرداری کی والدہ بلقیس جہاں جنہوں نے ۱۲ر نومبر ۲۰۰۲ء کو وفات پائی۔ سندھ کے مشہور ماہر تعلیم اور سندھ مدرستہ الاسلام کے بانی حسن علی آفندی کی پڑپوتی تھیں (۳۲)

حوالہ جات

۱۔ صادق علی شیر علی انصاری، دی مسلم ریسز فاؤنڈ ان سندھ، بلوچستان اینڈ افغانستان۔ کراچی۔ ص ۵۳

۲۔ اختر علی بلوچ، بلوچستان کی نام ور شخصیات، جلد سوم۔ کراچی۔ ص ۱۸۸

۳۔ ایضاً۔ ص ۱۸۸، ۱۸۹

۴۔ روزنامہ جنگ کراچی، ۳ر نومبر ۱۹۶۹ء

۵۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد لائق زرداری، تاریخ ضلع نواب شاہ (سندھی)۔ مورو۔ ص ۳۴۴

۶۔ پروفیسر غفور احمد۔ بے نظیر حکومت کا عروج و زوال۔ لاہور۔ ص ۴۶۸

۷۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد لائق زرداری، تاریخ ضلع نواب شاہ (سندھی)۔ مورو۔ ص ۴۰۳

۸۔ سلیم یونس۔ سیاسی اتحاد اور پاکستانی سیاست پر اثرات۔ لاہور۔ ص ۱۵۳ تا ۱۷۲

۹۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد لائق زرداری۔ تاریخ ضلع نواب شاہ (سندھی)۔ مورو۔ ص ۴۰۵

۱۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳۰ر جولائی ۱۹۸۷ء ۱۹ر دسمبر ۱۹۸۷ء

۱۱۔ حافظ تقی الدین الدین۔ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں۔ لاہور۔ ص ۵۴۸

۱۲۔ ثقلین رضا۔ مرد حر۔ لاہور۔ ص ۶۵

۱۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۳۸، ۳۳۹

۱۴۔ سید قاسم محمود۔ انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا۔ کراچی۔ ص ۴۵۰
۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء ۔ جلد دوم۔ ص ۷۳
۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء ۔ جلد دوم۔ ص ۱۴۶
۱۷۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۱۵
۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ، جلد دوم۔ ص ۱۲۱، ۱۲۲
۱۹۔ ایضاً۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۸۵۔ جلد سوم۔ ص ۱۷۷
۲۰۔ آفتاب محمود۔ آصف ان ۔ بلنڈر لینڈ؟۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ سپلیمنٹ اگست ۱۹۹۰ء۔ ص ۳۷، ۳۸
۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۷۳، ۸۴
۲۲۔ محمود غزنوی۔ قبضہ گروپ کی کابینہ۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۲۰رمئی ۱۹۹۳ء ۔ ص ۱۲
۲۳۔ نوید ظفر، اشتیاق حسین۔ الیکشن ۱۹۹۳ء۔ اسلام آباد۔ ص ۲۲۲
۲۴۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۱۴
۲۵۔ ثقلین رضا۔ مردِ حُر۔ لاہور۔ ص ۱۱۱
۲۶۔ مرتضٰی انجم۔ سزا یافتہ سیاستدان ۔ لاہور۔ ص ۱۵۷ تا ۱۶۱
۲۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ ۔ جلد دوم ۔ ص ۱۲۱
۲۸۔ مومن بلو۔ چارلس نیپئر کان محمد میاں سومری تائین (سندھی) ۔ حیدر آباد۔ ص ۳۸۷
۲۹۔ روزنامہ ڈان کراچی ۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء ، ۹/اکتوبر ۲۰۰۵ء۔
۳۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ ۔ جلد دوم۔ ص ۷۶
۳۱۔ روزنامہ نیشن لاہور۔ ۵/اکتوبر ۲۰۰۵ء
۳۲۔ روزنامہ ڈان کراچی ۔ ۱۳/نومبر ۲۰۰۲ء

سن کے سید

سندھ کی سیاست پر سن کے سید گھرانے کے سربراہ جی ایم سید کے اثرات بڑے نمایاں ہیں۔

اپنے خاندان کے پس منظر کے بارے میں وہ اپنی کتاب "میری کہانی میری زبانی" میں رقم طراز ہیں:

"میرا تعلق سندھ کے ٹیاری سادات گھرانے سے ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق ان کا سلسلہ امام موسیٰ کاظم علیہ رحمتہ کے فرزند جعفر ثانی الجواری سے ملتا ہے۔

سندھ میں ان کے جد امجد سید حیدر کی آمد ۸۰۱ھ میں امیر تیمور کے ہندوستان میں آتے کے وقت ہوئی۔ وہ اپنے والد سید امیر علی کے ساتھ ہرات سے ملتان تک آئے۔ یہاں سے وہ سیر و سیاحت کی غرض سے الگ ہو گئے اور سندھ کے ہالہ گاؤں میں آکر آباد ہو گئے اور میاں ارباب شاہ محمد ہالو کے ہاں شادی کر کے یہیں کے ہو رہے۔

ان کی اولاد پہلے تو ہالہ میں رہتی تھی۔ کچھ مدت بعد یہاں سے ترک سکونت کر کے ٹیاری میں بس گئے۔ یہاں ان کی اولاد چار بڑے گھرانوں میں تقسیم ہو گئی۔ (۱) جرار پوتا (جرار کی اولاد) (۲) موسیٰ پوتا (۳) باقیل پوتا اور (۴) میاں پوتا۔

ان دنوں سندھ پر جام نظام الدین سموں کی حکومت تھی۔ اس وقت لکی سے لے کر کوٹڑی تک کے حصے میں ایک سرکش چانگ قبیلہ آباد تھا۔ جو حکومت اور عوام کو تنگ کرتا تھا۔ ان کی سرکوبی کے لئے سید سخی ابراہیم شاہ کے فرزند سید بدر الدین نے جام نظام الدین کی مدد کی۔ سرکوبی کرنے کے عوض ملی ہوئی جاگیر کو سنبھالنے کے لئے سید بدر الدین شاہ سن گاؤں میں ۹ صدی ہجری کے آخر میں آکر آباد ہوئے۔

ان کے سات بیٹے تھے جن کے نام اس طرح تھے: (۱) سید معروف شاہ (۲) سید موج شاہ (۳) سید دھنی ڈنو شاہ (۴) سید حاجی شاہ (۵) سید داؤ شاہ (۶) سید جھنڈو شاہ اور (۷) سید جیو شاہ

(ضیاء الدین)

سید جیو شاہ کے ہاں دو بیٹے سید جزار اور سید حیدر شاہ پیدا ہوئے۔ سید حیدر شاہ علیہ رحمتہ ایک خدا رسیدہ' عالم و فاضل بزرگ تھے جن کا تذکرہ تحفتہ الکرام اور تاریخ معصومی میں مختصراً ملتا ہے۔ انہوں نے ۹۳۷ھ میں رحلت فرمائی۔

میرے والد بزرگوار سید میاں محمد شاہ سید حیدر شاہ علیہ رحمتہ کے تیرہویں سجادہ نشین تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک میرے بڑے بھائی' جو والد صاحب کی شہادت کے فوراً بعد چھوٹی عمر میں راہی ملک عدم ہوئے اور دوسرا میں۔ میری پیدائش ۱۷ر جنوری ۱۹۰۴ء کو ہفتے کے روز ہوئی۔ میں ابھی بہت چھوٹا تھا کہ یکم نومبر ۱۹۰۵ء رمضان شریف کی تین تاریخ کو آدھی رات کے وقت میرے والد جامع مسجد سن کی طرف جا رہے تھے کہ خاندان کے کچھ لوگوں نے رقابت کی بنا پر انہیں قتل کر دیا۔

والد اور بھائی کی رحلت کے بعد پورے خاندان میں نرینہ اولاد صرف میں' چھوٹا سا بچہ باقی رہ گیا تھا۔ گھر میں میری پرورش تین پھوپھیوں' دو ماؤں اور ایک دادی نے کی۔ ہماری زمین سرکار نے کورٹ آف وارڈ میں دے دی اور گزر اوقات کے لئے تنخواہ مقرر کر دی۔ سارے خاندان میں کوئی نزدیکی مرد رشتہ دار باقی نہ تھا۔"(۱)

جی ایم سید نے پہلے سماجی زندگی کی ابتدا کی اور پھر سیاسی زندگی میں قدم رکھا۔ انہوں نے ۱۹۱۹ء میں سماجی اصلاح کی ایک انجمن اپنے شہر میں قائم کر کے اپنی سماجی زندگی کا آغاز کیا۔

مارچ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے سندھ کے پیروں اور سادات کی ایک انجمن قائم کی۔ اس انجمن کا مقصد رسوم بد سے اجتناب' بدعتوں کا انسداد' کفایت شعاری اور تعلیم کو عام کرنا تھا۔

۱۹۲۶ء میں شاہ حیدر کے سالانہ عرس میں فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم و تنظیم اور سماجی سدھار کے لئے سندھ میں کانفرنسوں کو رواج دیا جائے۔ ۱۹۳۰ء میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس کے موقع پر اس کا نام بدل کر سندھ کلچر مرکز رکھا گیا۔

۱۹۲۹ء میں جی ایم سید نے کراچی میں عورتوں کی اصلاح و تعلیم کے لئے ایک انجمن قائم کی۔

جی ایم سید کی سیاست کا دور ۱۹۲۰ء سے شروع ہوتا ہے جب وہ پہلی مرتبہ لاڑکانہ کی خلافت کانفرنس میں شریک ہوئے۔ انہوں نے باوجود نو عمری کے اس کانفرنس سے بہت کچھ سیکھا۔ اس کے بعد وہ سندھ کے مختلف شہروں میں تحریک خلافت کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔

۱۹۲۴ء میں جب برصغیر کے کارکنوں نے لوکل باڈیز میں کام کرنا شروع کیا' وہ تعلقہ لوکل بورڈ کے صدر اور کراچی ضلع لوکل بورڈ کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے کانگریس کا پرچار شروع کر دیا اور خالق دینا ہال میں نوجوان بھارت سبھا کے پلیٹ فارم سے

سرکار برطانیہ کے خلاف سخت تقریریں کیں۔

اسی زمانے میں ۱۹۲۸ء میں بمبئی سے سندھ کے علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک شروع ہوئی' اس تحریک میں جی ایم سید نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس تحریک کے سلسلے میں کئی کانفرنسیں ہوئیں وہ سب میں شریک رہے۔ (۲)

۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۶ء تک جی ایم سید کراچی سندھ پراونشل کواپریٹو سوسائٹی کے ڈائرکٹر رہے۔ اسی دوران انہوں نے لوئر سندھ زمیندارہ بنک قائم کیا۔

بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے بعد ۱۹۳۷ء میں سندھ اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے۔ ان انتخابات میں جی ایم سید سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور یہیں سے ان کی سیاسی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ (۳)

۱۹۳۹ء میں سندھ مسلم لیگ کو زیادہ فعال بنانے کے لئے ۱۹۳۹ء میں سر حاجی عبداللہ ہارون نے جی ایم سید کو گاڑی' لاؤڈ سپیکر اور وسیع لٹریچر فراہم کر دیا اور جی ایم سید نے سندھ کے ہر ایک شہر' گاؤں اور بستی میں لیگ کا پیغام اس انداز سے پہنچایا کہ پورا سندھ صوبہ اللہ اکبر کے نعروں سے گونجتا رہا۔

جی ایم سید کا یہی وہ کردار تھا جس کی وجہ سے آگے چل کر ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا مسلم لیگ میں انہیں ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنایا گیا۔

اس دوران جنوری ۱۹۴۰ء میں سندھ مسلم لیگ کی سالانہ تنظیم نو کے نتیجے میں جی ایم سید اس کے نائب صدر اور دسمبر ۱۹۴۰ء میں صوبہ سندھ مسلم لیگ کی انتظامی کمیٹی کے چیئرمین مقرر ہوئے۔

اس کمیٹی نے جی ایم سید کی رہنمائی میں بڑا کام کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں سندھ کے اندر مسلم لیگ کی ساڑھے چار سو شاخیں قائم ہو گئیں اس کے علاوہ کئی کانفرنسیں بھی بلائی گئیں جن میں سہون 'کوٹڑی' مورو اور سلطان کوٹ کی کانفرنسیں شامل تھیں۔

جی ایم سید نے مسلم لیگ کے پروپیگنڈے کے لئے ایک کتابچہ بھی شائع کیا۔ جس میں انہوں نے قائداعظم کے بارے میں تحریر کیا۔

"قائداعظم محمد علی جناح نے اسلام کی سچی خدمت کی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے صحیح مقصد کو پیش کیا ہے۔ جناح صاحب دو آزاد مغربی اور مشرقی ریاستیں قائم کریں گے"۔

بعد ازاں انہوں نے مقامی روزناموں میں تحریک پاکستان کی حمایت میں کئی مضامین بھی رقم کیے۔

مسلم لیگ رفتہ رفتہ سندھ میں اپنا مقام حاصل کرنے لگی۔ شہر شہر' گاؤں گاؤں میں اس کی شاخوں کے قیام' مختلف شہروں اور گاؤں میں ہر سال کانفرنسوں کے انعقاد اور ہر سال ۲۳ مارچ

کو یوم پاکستان کا منایا جانا اس کے حق میں فائدہ مند ہو رہا تھا۔
اسی دوران ۲۷ اپریل ۱۹۴۲ء کو سندھ مسلم لیگ کے صدر، سر حاجی عبداللہ ہارون کی وفات کا اندوہ ناک سانحہ پیش آیا۔ ان کی وفات کے بعد سندھ مسلم لیگ کی صدارت کی ذمہ داریاں جی ایم سید کے سپرد ہوئیں۔
یہی وہ دور تھا جس میں سندھ اسمبلی نے پاکستان کے حق میں ایک تاریخی قرارداد پاس کر کے اس نئے ملک کے وجود اور قیام میں آنے کی راہ ہموار کر دی۔ (۴)
محمد صادق قصوری اپنی کتاب اکابرین تحریک پاکستان میں رقم طراز ہیں:
"تحریک پاکستان میں ایک ایسا بھی موقع آیا کہ انگریز نے قائداعظم سے کہا کہ وہ مسلم اکثریت والے کسی بھی صوبے سے اپنی اکثریت کا ثبوت دے۔
یہ ایسا نازک مرحلہ تھا کہ قائداعظم کو بہت پریشانی سے دو چار ہونا پڑا۔ قائداعظم نے بنگال کے وزیر اعلیٰ سر فضل الحق سے رابطہ قائم کیا۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات سے رابطہ قائم کیا۔ اسی طرح صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان صاحب (خان عبدالغفار خان کے بھائی) سے رابطہ قائم کیا مگر کہیں سے بھی پاکستان کے حق میں قراداد کے پاس ہونے کی کوئی امید نظر نہ آئی۔ اب قائداعظم نے صوبہ سندھ پر اپنی امید کی نظر رکھی اور سندھ کے مسلم لیگی رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا۔
"اس موقع پر بھرچونڈی کے پیر عبدالرحمٰن نے، جو ایک روحانی پیشوا بھی تھے اور اسمبلی میں ان کے کئی معتقد بھی تھے، مگر ان کی اکثریت کانگریس کے ساتھ تھی، ایک ایک ممبر سے خود جا کر کہا کہ وہ اسمبلی کے اجلاس میں تحریک پاکستان کی تائید میں ووٹ دیں اور تحریک کی حمایت کریں"۔ (۵)
یہ ۳ مارچ ۱۹۴۳ء کا دن تھا جب جی ایم سید نے سندھ اسمبلی میں قرارداد پاکستان پیش کی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ:
"ہندوستان کے مسلمان علیٰحدہ قوم ہیں اور علیٰحدہ قومیت کے تحت علیٰحدہ وطن کا مطالبہ کرتے ہیں"۔ (۶)
یہ قرارداد جی ایم سید نے خود پیش کی تھی۔ ان کے الفاظ تھے:
"یہ اجلاس حکومت سے سفارش کرتا ہے کہ وہ عزت مآب وائسرائے کے ذریعے شہنشاہ انگلستان کو اس صوبے کے مسلمانوں کے جذبات اور خواہشات سے آگاہ کریں کہ:
ہندوستان کے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں، جن کا علیحدہ مذہب، فلسفہ، سماجی رسومات، ادب و روایات، سیاسی اور اقتصادی نظریات ہیں۔ وہ ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں۔ مسلمانوں کی وہاں اپنی علیحدہ آزاد قومی ریاست ہو، جہاں وہ ہندوستان کے علاقوں میں اکثریت رکھتے ہیں۔ اسی لئے

وہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں ایسا کوئی آئین قابل قبول نہیں ہو گا' جس میں مسلمانوں کو ایک مرکزی حکومت کے تحت دوسری قوم کے زیر اثر رکھا جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کی اپنی علیحدہ ریاست ہو۔ اگر مسلمانوں کو ایک مرکزی حکومت کے تحت رہنے کے لئے مجبور کیا گیا تو' حکومت اس کے لئے ذمہ دار ہو گی' جس کا نتیجہ خانہ جنگی ہو گا"۔

دسمبر ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس (جو بعد ازاں اس کا آخری اجلاس بھی ثابت ہوا) کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی۔ جبکہ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین جی ایم سید تھے۔ انہوں نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں قیام پاکستان کا واشگاف الفاظ میں مطالبہ کیا۔ انہوں نے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کو دعوت بھی دی کہ وہ سندھ آئیں اور یہاں تجارتی اور فنی سرگرمیاں پیدا کریں۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ یہاں پیسہ لگائیں۔ دکانیں کھولیں اور ہنروں سے متعلق کارخانے قائم کریں جو یہاں کے غیر مسلم لوگوں کے قبضے میں ہیں۔

جی ایم سید نے دوسرے صوبوں کے مسلمان رہنماؤں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جو مسلمان اقلیتی صوبوں میں رہتے ہیں وہ وہاں سے ہجرت کر کے یہاں آئیں کیونکہ انہیں وہاں ترقی کے مواقع کم ملیں گے۔ یہاں آ کر ہماری مدد کریں اور مسلمان آپس میں مل کر اپنی ترقی کے لئے کام کریں"۔

۱۹۴۵ء میں سندھ مسلم لیگ کے سالانہ انتخابات منعقد ہوئے۔ جن کے نتیجے میں جی ایم سید' صدر اور سید غلام حیدر شاہ جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ مسلم لیگ واضح طور پر دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ (۷)

عبدالجبار عابد لغاری اپنی کتاب "جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار" میں لکھتے ہیں۔

"سندھ مسلم لیگ میں پارٹی بازی اس وقت سے شروع ہوئی جب جی ایم سید اس کے صدر ہوئے۔ انہوں نے سندھ مسلم لیگ میں اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنے لوگوں کو عہدے اور ٹکٹ دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے صدر مسلم لیگ ہونے کے بعد سیکرٹری کے لئے غلام حیدر شاہ کا نام دیا۔ جو بالکل نئے اور غیر معروف تھے۔ انہوں نے کئی نامزدگیاں اپنی مرضی کی کیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سید لیگ بنا رہے ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ حکومت سندھ پارٹی کے تحت رہے بلکہ سندھ مسلم لیگ مرکزی لیگ کے تابع نہ رہے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ قائداعظم نے سر غلام حسین اور جی ایم سید کو لاہور اور دہلی بلوا کر ان کے اختلافات دور کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ مگر واپس ہوتے ہی ان کے اختلافات پھر شروع ہو گئے۔ سر غلام حسین وزیر اعلیٰ تھے اور جی ایم سید مسلم لیگ کے صدر تھے۔ جب محاذ آرائی دوبارہ بڑھ گئی تو قائداعظم نے دونوں رہنماؤں کو بمبئی بلوایا اور بیس گھنٹے تک ان سے تفصیلی

گفتگو کی اور اختلافات دور کرنے کی کوشش کی۔

قائداعظم نے مجلس عمل کے تین ارکان نواب اسماعیل خان' چودھری خلیق الزمان اور قاضی محمد عیسیٰ کو سندھ روانہ کیا۔ انہوں نے جی ایم سید سے کئی ملاقاتیں کیں۔ سر غلام حسین کو بھی آمادہ کیا کہ وہ وزارتوں میں سید گروپ کو پچاس فیصد نمائندگی دیں گے' پھر بھی جی ایم سید سمجھوتے پر تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے سر غلام حسین کی وزارت کو شکست سے بھی دو چار کیا' جس کی وجہ سے مخالف گروپ وزارت میں شامل ہو گیا۔ جی ایم سید نے قائداعظم کو تار روانہ کئے جس کے جواب میں قائداعظم نے یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو کہا کہ آپ کو مزید مشورہ دینا بے سود ہے۔

جی ایم سید اپنے مخالف سر غلام حسین کو گرا نہ سکے بلکہ مسلم لیگ میں خود ان کی اپنی پوزیشن کمزور ہونے لگی تو انہوں نے مرکزی قیادت سے معافی طلب کی اور اپنے گذشتہ رویے پر افسوس کا اظہار کیا۔ مگر آگے چل کر سید صاحب نے سندھ پارلیمانی بورڈ کے فیصلے کی پھر سے خلاف ورزی کی۔

۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اسمبلی کی نشستوں کے سلسلے میں مرکزی پارلیمانی بورڈ نے' جس میں قائداعظم بھی شامل تھے' کراچی میں ان کے سامنے ان کا فیصلہ منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ قائداعظم نے بار بار انہیں اپنے رویہ میں تبدیلی لانے کا احساس دلایا مگر وہ نہ مانے' اس طرح ۴ر جنوری ۱۹۴۶ء کو جی ایم سید مسلم لیگ سے خارج ہو گئے۔ (۸)

۱۹۴۶ء میں دو مرتبہ سندھ اسمبلی کا انتخاب منعقد ہوا۔ پہلی مرتبہ جنوری میں اور دوسری مرتبہ دسمبر میں۔

جنوری ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں جی ایم سید کی سید پارٹی کے ۴ ارکان کامیاب ہوئے۔ جن میں خود جی ایم سید کے علاوہ سید محمد علی شاہ' سید بقادار شاہ اور غلام مصطفیٰ بھرگڑی شامل تھے۔

مگر دسمبر ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں جی ایم سید گروپ کو مکمل طور پر شکست ہوئی اور جی ایم سید خود بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ (۹)

قیام پاکستان کے بعد جی ایم سید نے حزب اختلاف کی سیاست اختیار کی۔ ۸ر مئی ۱۹۴۸ء کو انہوں نے صوبہ سرحد کے سیاسی رہنما خان عبدالغفار خان کے ساتھ مل کر ایک سیاسی جماعت بنائی جس کا نام پیپلز پارٹی آف پاکستان رکھا گیا۔ خان عبدالغفار خان اس سیاسی جماعت کے صدر اور جی ایم سید اس کے جنرل سیکرٹری بنے۔ یہ پاکستان کی پہلی سیاسی پارٹی تھی۔ اس کے قیام کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ سرخپوش جماعت پیپلز پارٹی آف پاکستان کی فوج کی حیثیت سے کام کرے گی۔ (۱۱)

۱۹۴۸ء ہی میں جی ایم سید نے کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف تحریک چلائی جس پر

میں ان کے آبائی گاؤں سن میں نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں وہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اسمبلی میں انہوں نے ون یونٹ کے قیام کی مخالفت کی۔ جس پر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کے قیام کے بعد وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کے قیام میں فعال کردار ادا کیا۔ (۱۱) ایوب خان کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ان کا زیادہ تر وقت قید و بند میں بسر ہوا اور وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہی رہے۔ جی ایم سید سندھ کے عوام میں بزرگوں' صوفیائے کرام کی عقیدت سے واقف تھے کیونکہ وہ خود سید حیدر شاہ سنائیؒ کے سجادہ نشین ہیں جن کا ہر سال عرس ہوتا ہے۔ جس میں جی ایم سید خود شریک ہوتے ہیں۔ جی ایم سید نے بزم صوفیائے سندھ قائم کی۔ رسول بخش پلیجو اس تنظیم کے جنرل سیکرٹری تھے اس تنظیم کے ذریعے جی ایم سید بزرگوں اور صوفیوں کے سالانہ عرس کے موقعہ پر اجتماعات سے خطاب کر کے اپنے نظریات پھیلاتے تھے لیکن اس محاذ پر بھی انہیں ناکامی ہوئی۔ وہ دوبارہ سیاست میں آئے اور اب وہ سندھ کا اسلام سے ہی رشتہ منقطع کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان سے شائع ہونے والی اپنی کتاب "سندھو جی سیاچاہ" میں ایسے "انکشافات" انہوں نے کئے ہیں جس کا مقصد تاریخی حقائق کو مسخ کرنا ہے وہ صفحہ ۵۷ اور صفحہ ۶۰ پر لکھتے ہیں۔ "عربوں نے سندھ میں اسلام کے نام پر جو مذہب مسلط کیا وہ نفاق' نفرت' تشدد سے بھرپور اور اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف تھا لیکن عرب اور ان کے پیروکار اس کو اپنے مستقل مفاد کی حفاظت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ جب سندھ کے حاکم راجہ داہر کو معلوم ہوا کہ عربوں نے رسولؐ کے نواسے امام حسینؓ کو تنگ کیا ہے اور انہیں مارنا چاہتے ہیں تو انہوں نے امام کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ سندھ آئیں گے تو انہیں پناہ دی جائے گی۔ اس پیغام کے بعد امام عالی مقام بمع اہل و عیال عراق کے راستے سندھ کی طرف روانہ ہوئے لیکن بنو امیہ خاندان کے بادشاہ یزید نے اپنے سپہ سالار کے ذریعے امام عالی مقام کو شہید کیا ان کے اہل و عیال اور حامیوں کو تنگ کیا"۔ (۱۲)

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں جی ایم سید نے دادو سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس انتخاب میں انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار ملک سکندر نے شکست سے دو چار کیا۔ جس کے بعد انہوں نے کبھی کسی انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن وہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اہل سندھ کو پاکستان سے برگشتہ کرتے رہے۔ اس حوالے سے عطا اللہ عالی اپنی کتاب سندھ نیشنلزم میں لکھتے ہیں۔

"ناقدین کے مطابق جی ایم سید کو عوام کی طاقت پر کبھی یقین نہیں رہا۔ اس کے برعکس جی ایم سید کی سیاست کا محور ہمیشہ وڈیرے' با اثر لوگ اور یونیورسٹی کے سر پھرے نوجوان رہے ہیں۔ جی ایم سید کو اپنے پورے سیاسی کیریئر میں شاید سب سے بڑا دھچکہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں لگا جب ان کی آبائی نشست پی پی کے نسبتاً غیر معروف امیدوار ملک سکندر کے ہاتھوں جاتی

رہی۔

جی ایم سید ایک بڑے ادیب اور مورخ بھی ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے' ان کی بہت سی کتابیں سندھ میں مقبول ہیں۔ اس کے علاوہ جی ایم سید وسیع لائبریری کے مالک بھی ہیں' جس میں تصوف اور تاریخ کی بہت سی نادر کتابیں شامل ہیں۔ جی ایم سید کی کتاب "مسلم لیگ کی مخالفت کیوں؟" اور "اب پاکستان کو ٹوٹ جانا چاہیے!" ملک کے سیاسی حلقوں میں بہت زیر بحث رہی ہیں۔ آخر الذکر کتاب پر حال ہی میں پابندی لگائی گئی ہے۔

"اب پاکستان ٹوٹ جانا چاہیے" نامی کتاب میں انہوں نے مسلم نیشنلزم اور مسلم قومیت کے بارے میں اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ مسلم قومیت کے بارے میں جی ایم سید لکھتے ہیں۔ اگر مسلمان ایک قوم ہیں تو ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم سمجھنا چاہیے۔ مگر تاریخ کے کسی بھی دور میں وہ ایک قوم نہیں رہے۔ انہوں نے آپس میں جنگیں لڑیں' ایک دوسرے کا خون بہایا اور اس وقت بھی پنجابی' سندھیوں' بلوچوں اور پٹھانوں کو غلام بنائے بیٹھے ہیں۔ ایران اور عراق جنگ میں مصروف ہیں۔ پاکستان اور افغانستان ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو ایک قوم کہنا تاریخی حقیقتوں کے خلاف ہے"۔

اسلام کو سید صاحب جدا دین کی حیثیت سے نہیں مانتے۔ "اسے جدا دین کی حیثیت دینا' دین فطرت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کو تمام مذاہب کو برحق تسلیم کرنا چاہیے۔ اس کی شریعت کو ہمیشہ کے لئے مکمل سمجھنا غلط ہے۔ شریعت اسلامی کے اہم قوانین معاشرے کی تبدیلی کے سبب رد ہو چکے ہیں۔ اسلام نے تمام مذاہب سے استفادہ کیا ہے۔ چند بڑے اصولوں کے سوا تمام مذاہب کے بیشتر اصول یکساں ہوتے ہیں۔ شرعی اور فروعی باتیں زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلنے والی ہیں۔ اسلام نہ جدا دین تھا نہ اسے جدا دین کہلانا مقصود تھا۔ عرب سامراج کی طرف سے اس کے بنیادی اصولوں کو رد کر کے ایک جدا اور مکمل دین بنا دیا گیا۔ اسلام کی صحیح تشریح گورونانک اور خواجہ غلام فرید وغیرہ نے کی۔ اقبال جو کہ نطشے کی تعلیمات کا پیروکار تھا۔ اس نے اسلام کی تشریح فسطائی انداز میں کی۔"

پاکستان کے بارے میں جی ایم سید لکھتے ہیں۔ "پاکستان انگریز سامراج کی پالیسی کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور پاکستان کو اس دنیا کی بڑی اسلامی مملکت قرار دینا وغیرہ' یہ سب انگریز سامراج کے ایجاد کردہ تصورات تھے۔ انگریز سامراج کی جگہ امریکہ نے لے لی اور اب وہ مسلم ملکوں کے اتحاد کے نام پر پاکستان کو سرمایہ دار ملکوں کی مدد کے لئے اپنا آلہ کار بنا رہا ہے"۔

جی ایم سید تمام برائیوں کی جڑ "پنجاب سامراج" کو قرار دیتے ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا "ہر بات جو اہل پنجاب کو ناپسند ہو وہ ہمیں پسند ہے۔ جب تک پاکستان قائم ہے تب تک پاکستان کے اندر ہم کسی کی اچھائی کی توقع نہیں کر سکتے۔ یہ بول سے بیر حاصل کرنے

کے مترادف ہو گا"۔

پیر صاحب پگارا نے کہا۔" چاچا آپ کہتے ہیں کہ ہندوستان سے الحاق کیا جائے تو کیا پھر آپ ہمیں ہندوؤں کے ماتحت لانا چاہتے ہیں؟"

جی ایم سید فرماتے ہیں میں نے کہلا بھیجا" گدھے کی لات سے ہاتھی کی لات بہتر ہے، مار تو دے گی۔ ہندوستان سے الحاق کے لئے چار بڑی طاقتوں نے تاریخی کوشش کی۔ اشوک شہنشاہ، وکرما جیت، اکبر اعظم اور انگریز۔ ان سب نے تاریخ میں ہندوستان کے سیاسی اتحاد کے فیصلے صادر کئے۔ بدھ، مہاراج مہابیر دیو، جین، خواجہ معین الدین اجمیری، گورو نانک، شاہ عنایت، شاہ لطیف، سچل سرمست، بلھے شاہ، شاہ باہو، سامی کبیر بھگت اور راجہ موہن رائے نے ہندوستان کو نظریاتی طور پر ایک کرنے کی کوششیں کیں۔" ہندوستان ہمارا سہارا بن سکتا ہے، جس میں بیدار اور ہمدرد ہندوؤں کی کثیر تعداد رہتی ہے۔ جو سندھ چھوڑ کر چلے گئے تھے لیکن اس ملک کی یاد انہیں اب تک ستاتی ہے۔"

ہندوستان میں سندھ نام کا کوئی صوبہ نہیں، لیکن انہوں نے سندھ کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا ہے اور نوٹ پر بھی سندھی الفاظ درج ہیں۔

جی ایم سید کی تحریک کا اثر و نفوذ مارشل لاء حکومت میں بڑی سرعت سے سندھ میں پھیلا ہے۔ سندھ کا" پڑھا لکھا طبقہ" ان سے بہت متاثر ہے۔ سندھ کے نوجوانوں کی بڑی تعداد اب سندھ نیشنلزم کے لئے عملی جدوجہد کرنے پر سرگرداں ہے۔ (۱۳)

۲رمئی ۱۹۸۸ء کو جی ایم سید کی صدارت میں سندھ کی مختلف سیاسی اور سماجی جماعتوں اور شخصیات نے جن میں ادیب، دانشور اور ارکان پارلیمنٹ بھی شامل تھے، سن میں" سندھ نیشنل الائنس" کے نام سے ایک وسیع اتحاد تشکیل دیا جس کا مقصد سندھ کے مسائل کا حل تلاش کرنا تھا۔ (۱۴) اس اتحاد نے بعد ازاں عام انتخابات میں بھی حصہ لیا مگر یہ کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکا اور اس کے سبھی رہنما بُری طرح شکست کھا گئے۔

جی ایم سید ایک طویل عرصہ تک انتخابی سیاست سے دور رہے ۲۴راپریل ۱۹۹۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا (۱۵)

جی ایم سید کے دو صاحبزادگان ان کی زندگی ہی میں انتخابات میں حصہ لیتے رہے ہیں۔

جی ایم سید کے صاحبزادے امداد محمد شاہ ۱۹۸۵ء میں پی ایس ۲۴ نواب شاہ ۹ سے اور ۱۹۸۸ء میں پی ایس ۱۷ نواب شاہ ۳ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ تاہم ۱۹۸۸ء کے بعد انہوں نے انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔ ۳۰رستمبر ۲۰۰۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا (۱۶)

امداد محمد شاہ کے صاحبزادے سید جلال محمود ۱۹۹۷ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہونے کے بعد اس کے ڈپٹی اسپیکر کے منصب پر فائز ہوئے (۱۷)

۲۰۰۲ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹیرین کے نواب عبدالغنی تالپور سے بُری طرح شکست کھا گئے (۱۸) ۲۰۰۵ء میں وہ جام شورو کے ضلعی ناظم کے انتخاب میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔(۱۹)

امداد محمد شاہ کے بڑے بھائی امیر حیدر شاہ نے ۱۹۹۰ء میں پی ایس ۵۹ دادو ۲ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور وہ یہ انتخاب بآسانی جیت گئے۔ (۲۰)

جی ایم سید کے برادر نسبتی سید محمد شاہ بھی عرصہ دراز سے سیاست میں ہیں۔ وہ ۱۹۸۵ء میں پی ایس ۶۲ دادو ۳ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۲۱) لیکن اس کے بعد انہیں کوئی قابل ذکر کامیابی میسر نہ آسکی۔

حوالہ جات

۱۔ جی ایم سید۔ میری کہانی میری زبانی۔ لاہور۔ ص ۹،۱۰

۲۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ۔ جلد سوم۔ لاہور ص ۲۴۰، ۲۴۱

۳۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۷۰۔۱۹۶۹ء لاہور۔ ص ۳۹

۴۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدو جہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۳۴۳، ۳۴۷ تا ۳۶۲

۵۔ محمد صادق قصوری۔ اکابرین تحریک پاکستان۔ گجرات۔ ص ۱۱۶

۶۔ اشتیاق حسین قریشی۔ دی اسٹرگل فار پاکستان۔ کراچی۔ ص ۲۰۶

۷۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۳۶۵ تا ۳۷۶

۸۔ ایضاً۔ ص ۳۷۸ تا ۳۸۰ (حاشیہ)

۹۔ ڈاکٹر محمد لائق زرداری۔ تحریک پاکستان سند جو حصو۔ مورو۔ سندھ۔ ص ۳۴۸ تا ۳۵۸

۱۰۔ زاہد حسین انجم۔ انسائیکلو پیڈیا پاکستان میں اوّل اوّل۔ لاہور۔ ص ۲۱۹

۱۱۔ نریش کمار جین۔ مسلمان انڈیا۔ نئی دہلی۔ جلد دوم۔ ص ۱۷۱

۱۲۔ محمد علی خالد۔ سندھ کے سید خاندانوں کی سیاست۔ روزنامہ نوائے وقت۔ کراچی۔ ۲۹ اپریل ۱۹۸۷ء

۱۳۔ عطاء اللہ عالی۔ سندھ نیشنلزم۔ کراچی۔ ص ۱۱۲ تا ۱۱۵

۱۴۔ ساگر مشتاق۔ سندھ جو سید۔ ہفت روزہ سندھو۔ حیدر آباد۔ ۱۳ تا ۱۹ جنوری ۱۹۹۳۔ ص ۶

۱۵۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۵ اپریل ۱۹۹۵ء

۱۶۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۱۶۹

۱۷۔ حافظ نسیم الدین۔ پاکستان کے ماہ سال کراچی۔ ص ۷۰۸

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء جلد دوم۔ ص۔ ۸۲
۱۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۷/اکتوبر ۱۹۹۷ء
۲۰۔ ناصر علی پنہور۔ فیملی میٹرز (مراسلہ)۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء
۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۹/مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۶۰۵

سومرو

شکار پور میں آباد سومرہ خاندان بھی سندھ کا ایک اہم سیاسی خاندان شمار ہوتا ہے۔ یہ وہی خاندان ہے جس نے سندھ پر سالہا سال حکومت کی ہے۔

سندھ کی مشہور تاریخ تحفتہ الکرام سومروں کے آغاز کے بارے میں خاموش ہے مگر اس کے اندازے کے مطابق سومرہ فرزند زمین ہیں اور وہ صوبے کے پہلے باشندے "سندھ" کی اولاد ہیں۔ تحفتہ الکرام میں سندھ کو ہند کا بھائی بتایا گیا ہے جو حضرت نوحؑ کے تیسرے بیٹے ہام کے بیٹے تھے۔ مگر شیخ صادق علی شیر علی انصاری اپنی معرکہ آراء کتاب "دی مسلمان ریسز فاؤنڈ ان سندھ' بلوچستان اینڈ افغانستان" میں لکھتے ہیں کہ سندھ' ہند کا سگا بھائی نہیں تھا بلکہ چچا زاد بھائی تھا اور ان کا شجرہ حسب ذیل تھا۔

نوح
ہام
کوش
تاما
دارن — شابا
ہند — سندھ

سومرہ اسی سندھ کی اولاد میں سے ہیں۔ (ا)

ظفر جھنڈیر' ارشاد علی اور ایم اکبر رانا اپنی کتاب تاریخ راجپوت میں لکھتے ہیں۔

"تاریخ سندھ اور بالخصوص راجپوتوں کے ۳۶ شاہی خاندانوں میں سمرا (سومرو) راجپوت قبیلے کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سومرو/سمرا راجپوتوں کا گڑھ ریاست الور (راجپوتانہ جو کسی وقت سندھ کی راجدھانی تھی) یہاں راجا سومرا اور اس کا خاندان برسہا برس حکمران رہا۔ بعد ازاں جب یہ خاندان زوال پذیر ہوا تو مختلف حوالوں سے اس خاندان نے سندھ اور ملتان کے

خطوں میں اپنی حکمرانیاں قائم کیں اور اس طرح اس خاندان کے افراد برصغیر ہند میں پھیل گئے۔ جو پنجاب میں آباد ہوئے وہ خود کو سمرا راجپوت یا چودھری لکھتے ہیں۔ ان کی مادری زبان اردو یا پنجابی ہے جو ڈیرہ غازی خان' ملتان' مظفر گڑھ اور بہاولپور ریاست میں آباد ہوئے تو انہوں نے سرائیکی زبان کو اپنایا اور جو احباب سندھ میں آباد رہے انہوں نے سندھی زبان اپنائی' وہ خود کو راجپوت نہیں کہلاتے اس کی وجہ شائد ان کی تاریخ سے ناواقفیت ہے یا سندھی ہونے کے ناطے سے خود کو راجپوت کہلانا پسند نہیں کرتے۔ تاہم یہ مسلمہ امر ہے کہ یہ قبیلہ راجپوت ہے۔

سندھ کی تاریخ میں سومرا خاندان کے دور حکومت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ سومرا دور پر جو تاریخ کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں اس نے تحقیق میں دقت پیدا کر دی ہے۔ سومرا بنیادی طور پر سندھی تھے لیکن انہوں نے خود کو عربوں سے منسلک کر دیا۔ مورخین نے سومرا اور سمہ خاندان کو راجپوت نسل سے قرار دیا ہے جب کہ دولت علویہ کے مطابق یہ دونوں قومیں (سمہ اور سومرا) ایشیا کی مشہور "سمیرین" قوم سے تعلق رکھتی ہیں جو بڑی طاقتور قوم ہے۔ وسطی ایشیا میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔

سندھ میں جب عرب سلطنت کا عروج زوال پیدا ہونے لگا تب سومرا خاندان نے اپنی حاکمیت کا اعلان کیا۔ شروع میں سومرا خاندان سمہ قوم کی مدد سے سندھ کے حاکم بنے۔ اس طرح سومرا خاندان کی حکمرانی کا سورج طلوع ہوا جب کہ سندھ میں عربوں کے دور میں ہی سومرا صاحب حیثیت تھے اس کی تصدیق میر محمد معصوم بکھری کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔ سلطان محمود نے ملتان اور سندھ کو فتح کیا تھا۔ سلطان عبدالرشید بن محمود (۴۴۱ھ-۴۴۴ھ) کے زمانے میں جب سلطنت اس کی عیاشی اور آرام طلبی کی بنا پر کمزور بنی تب سومرا لوگوں نے اپنے قبیلے کے ایک شخص سومرہ کو تھری شہر میں تخت پر بٹھا کر اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔

کچھ ایسا ہی ذکر میر علی شیر قانع نے بھی کیا ہے جب سلطان عبدالرشید بن محمود کی سندھ پر حکومت تھی تب سندھیوں نے اس کی کمزوری کا فائدہ حاصل کر کے ۴۴۵ھ (۱۰۵۳ء) میں سومرا قبیلے کے لوگوں نے تھری میں جمع ہو کر سومرہ نامی ایک بادشاہ کو رہنما مقرر کیا۔ عربوں کے آخری دور میں جب کہ مرکزی حکومت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور سندھ کے اندر جدا جدا گورنروں کی حاکمیت قائم تھی اسی طرح جب مرکز ہی منتشر ہو اور مضبوط نہ رہے تو اس کی شاخیں کیسے مضبوط رہتیں؟ اور یہی وجہ تھی کہ اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر سومروں نے اپنی حکومت بنائی۔

سندھ کے اندر سومرا خاندان نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں تھری یا ٹھری شہر میں جمع ہو کر اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ اسی طرح پانچویں صدی ہجری کے آخر میں سومروں نے ملتان میں سیاسی اہمیت حاصل کر لی اور چھٹی صدی ہجری میں ان کی یہ اہمیت اختتام پذیر ہوئی۔ ویسے بھی کچھ' گجرات اور شمالی سندھ میں سومروں کے اہم مرکز تھے۔

سومرا کون تھے؟ اس کے بارے میں تاریخ دان مختلف آراء رکھتے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ سومرا حضرت علیؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ عرب تھے اور کچھ انہیں ہندو قرار دیتے ہیں۔ تاریخ طاہری کے مطابق سومرا ہندو قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور ہندو مذہب کے پابند تھے اور یہ بات مولائی شیدائی نے بھی اپنی کتاب "جنت سندھ" میں مولوی نجم الدین کی تاریخ "وقائع راجستھان" کے حوالے سے لکھی ہے اسی طرح مولائی شیدائی صاحب نے اسی کتاب میں ایبٹ کے حوالے سے سومروں کو راجپوت لکھا ہے اور دوسری جگہ مولوی عبدالحلیم شرر کی کتاب تاریخ سندھ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سومرا نو مسلم یہودی ہیں۔ میر علی شیر قانع لکھتا ہے سومرا قوم سامراہ کے عربوں سے ہے وہ ہجری دو صدی میں عرب کے تمیم قبیلے کے ساتھ سندھ میں آئے۔ تمیم عباسی دور میں سندھ کے والی مقرر ہوئے۔ (۲)

اعجاز الحق قدوسی بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب تاریخ سندھ میں سومرہ خاندان کی اصل اور وجہ تسمیہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق سومرہ قوم سامرہ کے عربوں سے نکلی تھی اور دوسری صدی ہجری میں قبیلہ بنو تمیم کے ساتھ سندھ میں آکر آباد ہوئی تھی۔

وہ لکھتے ہیں کہ پانچویں صدی ہجری میں جب سندھ پر حکمران غزنوی سلطنت کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تو ۴۴۴ھ میں سندھ میں سومرہ قبیلے کے لوگوں نے سومرہ نامی ایک شخص کو سندھ کا حاکم بنایا۔ جس کے اخلاف نے تین سو آٹھ سال یعنی ۷۵۲ھ تک سندھ پر حکمرانی کی۔ یہ سلاطین دہلی کے ماتحت حکمرانی کرتے تھے اور سلاطین دہلی کا ایک امیریا ریذیڈنٹ ان کے ساتھ رہتا تھا۔

سومروں کا پایہ تخت "تھری" تھا۔ ان کے عہد کے بعض رومانی قصے آج بھی سندھ کی ثقافت کا درخشاں باب ہیں اور اس دور کے تہذیب و تمدن کو بھرپور طور پر ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ان رومانی قصوں میں سیف الملوک اور بدیع الجمال' لیلا چنیسر' عمر ماروی اور مومل رانو بے حد مشہور ہیں۔ (۳)

بیسویں صدی کے اوائل میں سومرو خاندان کے دو افراد نے سندھ کی سیاست میں بڑا نام کمایا۔ ان میں سے ایک جناب اللہ بخش سومرو تھے اور دوسرے ان کے چھوٹے بھائی حاجی مولا بخش سومرو۔ یہ دونوں بھائی حاجی محمد عمر سومرو کے صاحبزادے تھے جو شکارپور میں زمینداری کے پیشے سے وابستہ تھے۔ (۴)

اللہ بخش سومرو ۱۹۰۰ء میں شکارپور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۲۳ء میں جیکب آباد میونسپلٹی کی صدارت سے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز کیا کچھ عرصہ بعد وہ لوکل بورڈ سکھر کے صدر بھی منتخب ہو گئے۔ (۵)

☆☆☆

۱۹۲۶ء میں وہ پٹھان کوٹ ضلع سکھر کے خان بہادر جان محمد خان پٹھان کو شکست دے کر بمبئی کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ جہاں انہوں نے سرشاہنواز بھٹو کے دست راست کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۳۶ء تک یعنی جب تک سندھ صوبہ بمبئی کا حصہ رہا وہ بمبئی کونسل کے رکن رہے۔ (۶)

جنوری ۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخابات میں جناب اللہ بخش سومرو سندھ اتحاد پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان انتخابات کے بعد سر غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے۔ مگر جب ان کی پارٹی نے کانگریس سے کئے گئے معاہدے کے برخلاف اتحاد پارٹی کے جناب سید میراں شاہ کو اسپیکر شپ دی تو ان کی حکومت ٹوٹ گئی اور اتحاد پارٹی نے جناب اللہ بخش سومرو کی قیادت میں کانگریس اور آزاد ہندو اراکین کی مدد سے وزارت تشکیل دی۔ یہ واقعہ ۲۳؍ مارچ ۱۹۳۸ء کا ہے۔

نئی حکومت کے وزراء نے اعلان کیا کہ وہ برطانوی استعمار کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد کے حق میں ہیں اور استعمار دشمن کے خلاف ان کے خیالات کانگریس کے پروگرام کے خلاف ہیں۔ ان بیانات اور اقدامات نے ہندو مہاسبھا، مسلم لیگ اور برطانوی حکام میں ناراضگی پیدا کر دی۔ آگے چل کر ان کے کانگریس سے بھی اختلافات پیدا ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے تمام کیمپوں کے سندھی قوم پرستوں پر تکیہ کرنے کا فیصلہ کیا اور "سندھ، سندھیوں کے لئے" کا نعرہ بلند کیا۔ اس اقدام نے ان کی ساکھ کو مضبوط کر دیا۔ کیونکہ سندھی قوم پرست اس نعرے کو صوبے کی تیز معاشی ترقی سے منسلک کرتے تھے۔ (۷)

اس کے باوجود اللہ بخش وزارت زیادہ دیر نہ چل سکی۔ ۱۹۳۹ء میں مسجد منزل گاہ کے واقعہ کی وجہ سے سندھ میں منافرت کی آگ اتنی پھیل گئی کہ ۱۸؍ مارچ ۱۹۴۰ء کو اللہ بخش سومرو کی وزارت ٹوٹ گئی اور میر بندے علی کی قیادت میں ایک نئی وزارت تشکیل دی گئی جس کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ سندھ میں مسلم لیگ کی یہ وزارت کم و بیش ایک سال تک چلی مگر ۷؍ مارچ ۱۹۴۱ء کو یہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی اور خان بہادر اللہ بخش سومرو دوبارہ سندھ کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔

۱۹۴۲ء میں کانگریس نے انگریزوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ہندوستان کو فوراً آزادی دیں اور اقتدار کانگریس کو منتقل کر کے ہندوستان سے رخصت ہو جائیں۔ یہ تحریک ہندوستان چھوڑ دو (Quit India) تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کے دوران کانگریس کے رہنماؤں نے اپنے خطابات، جو انہیں انگریزی حکومت نے دیئے تھے، انگریزوں کو واپس کر دیئے چونکہ سندھ کے وزیر اعلیٰ خان بہادر اللہ بخش سومرو نے اپنی حکومت کانگریس کے تعاون سے تشکیل دی تھی اس لئے انہوں نے بھی خان بہادر اور سی بی ای کے خطابات واپس کرنے کا اعلان کر دیا۔

حکومت نے اللہ بخش سومرو کے اس اقدام کا سختی سے نوٹس لیا اور ان کو ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو وزارت اعلیٰ سے برطرف کر دیا۔ یوں سر غلام حسین ہدایت اللہ دوبارہ سندھ کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ (۸)

اللہ بخش سومرو کی وزارت اعلیٰ کا یہ دوسرا دور کوئی ڈیڑھ برس جاری رہا۔ اس دوران سندھ میں پیر پگارا پیر صبغت اللہ ثانی کی تحریک اپنے نقطہ عروج کو پہنچی اور حکومت کو ان کی گرفتاری کے لئے سندھ میں مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔ ۲۰ر مارچ ۱۹۴۳ء کو انگریزوں نے اس عظیم مجاہد کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔ چونکہ پیر پگارا کی گرفتاری کا واقعہ اللہ بخش سومرو کی وزارت کے دوران پیش آیا تھا اس لئے پیر پگارا کے معتقدین نے انہیں مجرم گردانتے ہوئے ۱۴ر مئی ۱۹۴۳ء کو شہید کر دیا۔ (۹)

بعض حلقوں نے ان کے قتل کا الزام خان بہادر ایوب کھوڑو پر بھی عائد کیا مگر یہ الزام ثابت نہ کیا جا سکا اور ایوب کھوڑو اس مقدمے سے باعزت بری ہو گئے۔ (۱۰)

اللہ بخش سومرو کی شہادت کے بعد ان کے چھوٹے بھائی حاجی مولا بخش سومرو نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ اللہ بخش سومرو کی خالی ہونے والی نشست پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور کچھ عرصہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت میں غیر مسلم لیگی وزیر رہے۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں وہ سکھر سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ حکومت سندھ کے وزیر تعلیم اور ۱۹۵۴ء میں لوکل سیلف گورنمنٹ کے وزیر بنائے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور سہروردی، چندریگر اور فیروز خاں نون، تینوں وزرائے اعظم کی کابیناؤں میں شامل رہے۔ (۱۱) ایوب خان کے دور میں وہ ایبڈو کی پابندیوں کا شکار ہوئے۔ (۱۲) ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہوں نے آزادانہ طور پر حصہ لیا اور قومی اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ تاہم ذوالفقار علی بھٹو سے ان کی کبھی نہ نبھ سکی۔ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں ۱۴ر جنوری ۱۹۷۸ء سے ۵ر جولائی ۱۹۷۸ء تک سیاسی امور اور تجارت کے وزیر رہے۔ (۱۳)

حاجی مولا بخش سومرو نے عمر کا آخری حصہ گوشۂ گمنامی میں گزارا اور ۳ فروری ۱۹۸۹ء کو وفات پائی۔ (۱۴)

اللہ بخش سومرو اور مولا بخش سومرو، دونوں ہی کے بیٹوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا۔ اللہ بخش سومرو کے صاحبزادے رحیم بخش سومرو (۱۹۲۱ء۔ ۲۰۰۵ء) شکار پور میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ صوبہ سندھ کی اہم وزارتوں پر فائز رہے۔ ۱۹۶۵ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے۔ وہ اس اسمبلی کے پہلے رکن تھے جنہوں نے ایوب خان کی پالیسیوں کے خلاف اپنا استعفیٰ پیش کیا۔ ۱۹۷۰ء

میں انہوں نے تحریک استقلال کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ (۱۵) مگر بہت جلد انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور ۱۹۷۷ء میں اسی پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۶) بھٹو کے زوال کے بعد انہوں نے پھر قلا بازی کھائی اور جنرل ضیاء الحق کی نامزد کردہ مجلس شوریٰ کے رکن بن کر اس کے ہاتھ مضبوط کرنے لگے۔ (۱۷)

۱۹۸۵ء میں انہوں نے این اے ۱۵۷ جیکب آباد ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جب جنرل ضیاء الحق نے قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دیں تو رحیم بخش سومرو صوبہ سندھ کی نگراں کابینہ میں شامل ہو گئے۔ (۱۸) ۱۹۸۸ء میں انہوں نے این اے ۱۵۵ شکار پور ۲ کو اپنی معرکہ آرائی کے لئے منتخب کیا تاہم اس مرتبہ وہ کامیاب نہ ہو سکے اور پیپلز پارٹی کے امیدوار آغا عطا محمد خان سے شکست کھا گئے۔ دونوں امیدواروں کے ووٹوں میں تقریباً ۳۵ ہزار ووٹوں کا فرق تھا۔ (۱۹) ۱۹۹۰ء کے انتخاب میں انہوں نے خود تو حصہ نہیں لیا۔ تاہم ان کے بھتیجے جنید احمد سومرو نے این اے ۱۵۴ شکار پورا سے انتخاب لڑا۔ انہیں سندھ نیشنل فرنٹ کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن وہ پی ڈی اے کے آفتاب شعبان میرانی سے تقریباً ۱۸ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ جنید احمد سومرو اس سے قبل ۱۹۸۵ء میں پی ایس ۷ شکار پورا سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے تھے۔ (۲۱)

مولا بخش سومرو کے صاحبزادے احمد میاں سومرو بھی ایک طویل عرصہ سے عملی سیاست میں ہیں۔ وہ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ جیکب آباد میونسپل کمیٹی کے رکن اور پھر صدر بھی رہے۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں جب ان کے والد مولا بخش سومرو ایبڈو کی پابندیوں کی وجہ سے انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتے تھے تو انہوں نے مغربی پاکستان اسمبلی کا انتخاب لڑا وہ دونوں مرتبہ کامیاب ہوئے اور دونوں مرتبہ اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بنے۔ (۲۲) بعد ازاں وہ تحریک استقلال سندھ کے صدر رہے اور ۱۹۸۵ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے۔ (۲۳) اس سے قبل وہ ۱۹۷۳ء میں بھی سینٹ کی رکنیت کے امیدوار رہ چکے تھے۔ مگر کسی سیاسی پارٹی کی حمایت حاصل نہ ہونے کے باعث کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ (۲۴) ۱۹۹۲ء میں بھی وہ سینٹ کی رکنیت کے امیدوار تھے مگر ۱۹۷۳ء کی طرح اس مرتبہ بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۵) ۲۲ مارچ ۱۹۹۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا (۲۶)

احمد میاں سومرو کے صاحبزادے محمد میاں سومرو ہیں جو پیشے کے اعتبار سے بینکار ہیں۔ وہ ۲۵ مئی ۲۰۰۰ء کو صوبہ سندھ کے گورنر مقرر ہوئے اور ۲۴ دسمبر ۲۰۰۲ء تک اس منصب پر فائز رہے (۲۷) ۲۰۰۳ء میں وہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر سینٹ آف پاکستان کے رکن اور پھر ۱۲ مارچ ۲۰۰۳ء کو اس کے چئیر مین منتخب ہوئے (۲۸) محمد میاں سومرو کی والدہ سعیدہ سومرو بھی سیاست کے میدان میں ہیں اور ۲۰۰۵ء میں جیکب آباد کی ضلعی ناظمہ منتخب ہوئی ہیں (۲۹)

احمد میاں سومرو کے بھائی الٰہی بخش سومرو پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہیں اور این ای ڈی انجینئرنگ کالج کے پرنسپل کے ڈی اے کے ڈائریکٹر جنرل بھی رہ چکے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں وہ پہلی مرتبہ وفاقی وزیر بنے۔ ۱۹۸۵ء میں وہ بلا مقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ وزارت عظمیٰ کے امیدوار تھے مگر ان کی جگہ جنرل ضیاء الحق نے محمد خان جونیجو کو وزیراعظم نامزد کر دیا۔

اس واقعہ کے باوجود ان کے اور صدر ضیاء کے تعلقات بدستور خوشگوار رہے۔ جنرل ضیاء الحق نے ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جب محمد خان جونیجو کو برطرف کیا اور نگراں کابینہ تشکیل دی۔ تو الٰہی بخش سومرو اس نگراں کابینہ میں وزیر اطلاعات ونشریات کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر این اے ۱۵۴ شکار پور ا سے انتخاب لڑا مگر وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار آغا طارق خان سے بُری طرح شکست کھا گئے۔ (۳۰) ۱۹۹۰ء میں الٰہی بخش سومرو نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ ان کا حلقہ تھا این اے ۱۵۶ جیکب آباد 1۔ یہ تبدیلی انہیں راس آئی اور وہ پی ڈی اے کے سردار مقیم خان کھوسو کو تقریباً ایک ہزار ووٹوں سے شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۳۱)

۱۹۹۳ء میں وہ ایک مرتبہ پھر اسی حلقہ سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ مگر اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار میر احمد نواز خاں جاکھرانی سے شکست کھا گئے۔ (۳۲) ۱۹۹۷ء میں وہ ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور پھر بلا مقابلہ قومی اسمبلی کے اسپیکر بنے (۳۳) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ این اے ۲۸ جیکب آباد ا سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے مگر پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹیرین کے میر اعجاز حسین جاکھرانی سے شکست کھا گئے ان کی شکست کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ان انتخابات میں ان کے بھتیجے محمد میاں سومرو نے، جو اس وقت سندھ کے گورنر تھے، ان کی درپردہ مخالفت کی تھی (۳۴)

احمد میاں سومرو اور الٰہی بخش سومرو کے تیسرے بھائی افتخار احمد سومرو ۱۹۸۵ء میں بلا مقابلہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۳۵) اور بعد ازاں غوث علی شاہ کی کابینہ میں کچھ عرصہ وزیر بھی رہے تھے۔ (۳۶)

اسی سومرو قبیلے کے ایک فرد جناب ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ بھی ہیں۔ وہ اللہ بخش سومرو کے نواسے ہیں۔ وہ ۲۰۰۲ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے اور بعد ازاں وفاقی کابینہ میں نجکاری کے وزیر کے منصب پر فائز ہوئے تھے (۳۷)

سومرو قبیلے کی ایک شاخ ٹھٹھہ میں بھی آباد ہے۔ اس شاخ کے سردار محمد عثمان خان سومرو بھی سیاست کے میدان کے ایک پرانے کھلاڑی تھے۔ وہ ۷ر فروری ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں ان

کے والد میاں محمد خاں سومرو کی وفات کے بعد ان کی دستار بندی ہوئی۔ انہوں نے اپنی سیاست کا آغاز تعلقہ اور ضلع کی سطح سے کیا۔ ۱۹۳۷ء میں وہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۳۸) ۱۹۳۸ء میں انہوں نے کراچی میں منعقد ہونے والی مسلم لیگ کانفرنس میں شرکت کی۔ بعد ازاں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس، منعقدہ پٹنہ میں بھی شریک ہوئے۔ جہاں ان کی بڑی پزیرائی ہوئی۔ (۳۹)

سردار محمد عثمان خان سومرو سردار واحد بخش بھٹو اور سردار اللہ بخش سومرو کے قریبی ساتھیوں میں شامل تھے اور انہوں نے کئی مواقع پر اپنے ان دوستوں کا بڑا ساتھ نبھایا۔ وہ ۱۹۴۵ء تک سندھ اسمبلی کے رکن رہے۔ اس کے بعد انہوں نے جی ایم سید کے گروپ میں شمولیت اختیار کی۔ اسی باعث وہ پھر کبھی اسمبلی کے رکن منتخب نہ ہو سکے۔

۱۹۴۲ء میں انہیں گوٹھ سلیمان سومرو میں سندھ کی سومرو قوم نے انہیں اپنا سردار منتخب کیا تھا۔ حاجی مولا بخش سومرو کے فرزند احمد میاں سومرو کی دستار بندی تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔ (۴۰)

سردار عثمان سومرو کے فرزند محمد خاں سومرو ۹ر نومبر ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے جامعہ کراچی سے ایم اے اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ وہ طلبا کی سیاسی تحریکوں سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد وہ اس پارٹی میں شامل ہو گئے اور پارٹی کے ضلعی کنوینز اور ضلعی چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں وہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ممتاز علی بھٹو کی کابینہ میں منصوبہ بندی اور ترقیات کے وزیر کے طور پر شامل ہوئے۔ (۴۱)

۱۹۷۵ء میں جب میر رسول بخش تالپور نے سندھ کی گورنری اور پیپلز پارٹی کی رفاقت کو خیر باد کہا تو ان کے ساتھ پارٹی اور وزارت چھوڑنے والے واحد رکن اسمبلی محمد خان سومرو تھے۔ لیکن جب ۱۹۷۷ء میں انتخابات کا وقت آیا تو انہوں نے سیاسی سجدہ سہو کیا۔ جس پر انہیں قومی اسمبلی کا ٹکٹ مل گیا۔ ان کے مدمقابل محمد اسمٰعیل گاندھرو تھے۔ محمد خان سومرو نے یہ انتخاب بھاری اکثریت سے جیتا۔ ان انتخابات کے بعد محمد خاں سومرو سیاسی افق سے تقریباً غائب ہو گئے۔ ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء میں انہوں نے این ۱۸۲ ٹھٹھہ ا سے انتخاب لڑا تھا مگر چونکہ وہ آزاد امیدوار تھے اس لئے بہت کم ووٹ ہی حاصل کر سکے تھے۔ (۴۲)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں این اے ۲۳۷ ٹھٹھہ ا سے ڈاکٹر عبدالواحد سومرو نے پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹیرین کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا لیکن وہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سید ایاز علی شاہ شیرازی سے شکست کھا گئے (۴۳)

حوالہ جات

۱۔ شیخ صادق علی شیر علی انصاری۔ ''دی مسلمان ریسز فاؤنڈ ان سندھ، بلوچستان اینڈ افغانستان''۔ کراچی۔ص ۵۳،۵۴

۲۔ ظفر جھنڈیرا ارشاد علی، ایم اکبر رانا۔ تاریخ راجپوت۔ کراچی۔ص ۱۳۴، ۱۳۵

۳۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ (حصہ اوّل)۔ لاہور۔ ۴۱۲ تا ۴۳۹

۴۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ (حصہ سوم)۔ لاہور۔ص ۲۵۳

۵۔ جی ایم سید۔ کجھ خط۔ سیاستدان قومی کارکن جا۔ (سندھی)۔ حیدرآباد۔ص ۴۰۶

۶۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ (حصہ سوم)۔ لاہور۔ص ۲۵۳، ۲۵۴

۷۔ دی ایف آگیف۔ سندھ تاریخ کے آئینے میں۔ ترجمہ ڈاکٹر محمود صادق۔ کراچی۔ص۔ ۸۵، ۸۶

۸۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ص ۳۵۶، ۳۶۱

۹۔ پیر علی محمد راشدی۔ اھی ڈینھن اھی شیھن (جلد اوّل)۔ حیدرآباد۔ص ۲۴۶

۱۰۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ (حصہ سوم)۔ لاہور۔ص ۲۳۴

۱۱۔ نریش کمار جین۔ مسلمز ان انڈیا۔ جلد دوم۔ نئی دہلی۔ص ۱۶۳

۱۲۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ص ۴۷

۱۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ص ۴۸۹

۱۴۔ محمد اسلم۔ وفیات اعیان پاکستان۔ لاہور۔ص ۹۶

۱۵۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ (سندھی) کراچی۔ض ۸۳

۱۶۔ دی ایف آگیف۔ سندھ تاریخ کے آئینے میں۔ ترجمہ ڈاکٹر محمود صادق۔ کراچی۔ص ۸۵، ۸۶

۱۷۔ الیاس شاکر، یوسف خان۔ سندھ سے وفاقی مجلس شوریٰ میں لئے جانے والے ارکان۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۶؍جنوری ۱۹۸۲ء

۱۸۔ جگنو محسن۔ رحیم بخش سومرو (پروفائل) دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۴؍۔ ۳۰؍اگست ۱۹۸۹ء

۱۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ص ۳۵۷۱

۲۰۔ ایضاً۔ ۱۱؍نومبر ۱۹۹۰ء ص ۹۲۳۳۔ ۲۸؍مارچ ۱۹۸۵ء۔ص ۲۵۹۰

۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸؍مارچ ۱۹۸۵ء۔ص ۲۵۹۰

۲۲۔ پارلیمینٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائرکٹری آف ممبرز۔ جنوری۔ ۱۹۹۱ء۔ص ۴۳

۲۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ص ۳۱۶

۲۴۔ دی ایف آگیف۔ سندھ تاریخ کے آئینے میں۔ ترجمہ ڈاکٹر محمود صادق۔ کراچی۔ ص ۳۲۵
۲۵۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۱۴/مارچ ۱۹۹۲ء، ۱۵/مارچ ۱۹۹۰ء
۲۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۳/مارچ ۱۹۹۹ء
۲۷۔ حافظ نسیم الدین۔ پاکستان کے ماہ وسال۔ کراچی۔ ص۔ ۷۷۳، ۸۳۷، ۸۴۴
۲۸۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۷۹
۲۹۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۷/اکتوبر ۲۰۰۵
۳۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۳۵
۳۱۔ مسعود انصاری۔ دی سومروز (فیملی پروفائل) روزنامہ دی نیوز کراچی۔ ۲ اکتوبر ۹۳ء
۳۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۰۱
۳۳۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء۔ جلد اوّل۔ لاہور۔ ص ۱۷۶
۳۴۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۲۶
۳۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۳۱۶
۳۶۔ ثمینہ امان۔ ڈائریکٹری ممبر آف پراونشل اسمبلی، سندھ اینڈ بلوچستان۔ ۱۹۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۶
۳۷۔ وکیل انجم۔ سندھ کی سیاست۔ روزنامہ جنگ سنڈے میگزین ۹/اکتوبر ۲۰۰۵ء
۳۸۔ جی ایم سید۔ کجھ خطوط (سندھی)۔ حیدرآباد۔ ص ۵۳۲
۳۹۔ پیر علی محمد راشدی۔ اھی ڈینھن، اھی شینھن، (سندھی) حیدرآباد۔ جلد سوم۔ ص ۱۲۶، ۱۲۷
۴۰۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین (سندھی) حیدرآباد۔ جلد اوّل۔ ص ۷۷
۴۱۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ (سندھی) کراچی۔ ص ۱۸
۴۲۔ فاضل جمیلی، خورشید انجم۔ بدین، ٹھٹھہ اور دادو کے انتخابات تاریخ کے آئینے میں روزنامہ پبلک کراچی۔ ۱۷/اگست ۱۹۹۲ء
۴۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۸۴

سہون کے پیر

سندھ کی سیاست پر جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ پیروں اور روحانی بزرگوں کے خاندانوں کا تسلط بھی ایک طویل عرصہ سے قائم ہے۔

ایسا ہی ایک خاندان بھان سعید آباد تعلقہ سہون کے پیر الٰہی بخش کا خاندان ہے۔ اس خاندان کے ہالہ کے مخدوم صاحبان سے قریبی تعلقات رہے ہیں اور ان کے مریدوں کا سلسلہ کاٹھیاواڑ تک پھیلا ہوا ہے۔

پیرالٰہی بخش، پیرغلام حسین کے پوتے اور پیر نواز علی شاہ کے بیٹے تھے۔ وہ ۱۸۹۷ء میں پیرجو گوٹھ ضلع دادو میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کے والد نے انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیج دیا۔ وہاں انہیں پڑھتے ہوئے ایک ہی سال ہوا تھا کہ وہ مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر جامعہ ملیہ علی گڑھ میں داخل ہوگئے۔ بعد میں یہ جامعہ دہلی منتقل ہوگئی۔

پیرالٰہی بخش تحریک خلافت کے فعال کارکن تھے اور اس کے جلسے جلوسوں میں حصہ لیتے تھے۔ وہ ۷/تا ۱۰/جولائی ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں کراچی میں منعقد ہونے والی اس تاریخی کانفرنس میں بھی شریک ہوئے تھے جس میں تقریر کرنے کے الزام میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقاء پر خالق دینا ہال کراچی میں مقدمہ چلا گیا تھا اور انہیں بغاوت کے الزام میں مختلف المیعاد سزائیں سنائی گئی تھیں۔

تحریک خلافت کے خاتمے کے بعد پیرالٰہی بخش نے ۱۹۲۷ء میں دوبارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم اے اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے لاڑکانہ میں وکالت کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۷ء میں جب بمبئی سے علیحدگی کے بعد سندھ اسمبلی کے پہلے عام انتخابات منعقد ہوئے تو انہوں نے اس میں بھرپور حصہ لیا اور خان بہادر یار محمد خان جونیجو کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اس وقت ان کا تعلق سندھ یونائیٹڈ فرنٹ سے تھا۔(۱)

۱۹۳۸ء میں جب غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت ختم ہونے پر اللہ بخش سومرو نے نئی وزارت

تشکیل دی تو پیر الٰہی بخش اس میں ریونیو کے وزیر مقرر ہوئے۔ اس وزارت میں وہ ۱۹۴۰ء تک شامل رہے۔ ۱۹۴۰ء میں اللہ بخش سومرو کی حکومت ختم ہونے پر میر بندے علی تالپور وزیراعلیٰ بنے۔ ان کی کابینہ میں پیر الٰہی بخش شامل نہیں تھے مگر ۱۹۴۱ء میں جب اللہ بخش سومرو دوبارہ وزیراعلیٰ بنے تو پیر الٰہی بخش ایک مرتبہ پھر ان کی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ اس مرتبہ انہیں تعلیم، صنعت اور محنت، آبکاری اور دیہی ترقیات کے محکمے ملے۔ ۱۹۴۲ء میں انگریزوں کی مخالفت پر اللہ بخش سومرو کی وزارت کے خاتمے پر جب سر غلام حسین ہدایت اللہ دوبارہ صوبے کے وزیراعلیٰ بنے تو پیر الٰہی بخش ان کی کابینہ میں بھی شامل ہوئے اور سابق محکموں ہی کے وزیر بنائے گئے۔(۲)

اس دوران پیر الٰہی بخش سندھ یونائیٹڈ فرنٹ کو چھوڑ کر آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۵ء کے عام انتخابات میں وہ مسلم لیگ ہی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں سندھ اسمبلی کے انتخابات دوبارہ منعقد ہوئے جن میں قاضی محمد اکبر نے جی ایم سید کو شکست دی۔ جی ایم سید نے اپنی شکست کے خلاف انتخابی عذرداری داخل کی جس میں کہا گیا کہ وہ پیر الٰہی بخش کی جانب سے کروائی گئی دھاندلی کے باعث ہارے ہیں۔(۳۰)

قیام پاکستان کے بعد ایوب کھوڑو سندھ کے پہلے وزیراعلیٰ مقرر ہوئے مگر جب کراچی کی سندھ سے علیحدگی اور وفاق کا حصہ بنانے کا فیصلہ ہوا تو ایوب کھوڑو نے اس کے خلاف موقف اختیار کیا۔ مرکزی حکومت نے ایوب کھوڑو کی حکومت کو بدعنوانیوں کے الزام میں برطرف کر کے پیر الٰہی بخش کو سندھ کا وزیراعلیٰ مقرر کر دیا(۴) وہ اس عہدے پر ۳رمئی ۱۹۴۸ء سے ۴رفروری ۱۹۴۹ء تک فائز رہے۔(۵)

پیر الٰہی بخش کے سندھ کی وزارت اعلیٰ سے ہٹنے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ۱۹۴۵ء میں جی ایم سید نے ان کے خلاف جو انتخابی عذرداری داخل کی تھی، الیکشن ٹربیونل نے اس کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس فیصلے کے مطابق پیر الٰہی بخش کو سندھ اسمبلی کی رکنیت کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا اور یوں ان کی وزارت اعلیٰ بھی خود بخود ختم ہوگئی(۶)۔

۱۹۵۴ء میں سندھ اسمبلی کے ازسرنو انتخابات منعقد ہوئے اس انتخاب میں پیر الٰہی بخش ایک مرتبہ پھر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اس دوران وہ مسلم لیگ چھوڑ کر متحدہ محاذ میں شامل ہو چکے تھے(۷) ۱۱دسمبر۱۹۵۴ء کو جب سندھ اسمبلی نے سندھ کو ون یونٹ میں شامل کرنے کے لیے زبردستی قرارداد منظور کروائی تو اس قرارداد کی مخالفت میں ووٹ دینے والے اسے چار ارکان میں پیر الٰہی بخش بھی شامل تھے، (بقیہ تین ارکان شیخ خورشید احمد، غلام مصطفےٰ بھرگڑی اور عبدالمجید جتوئی تھے) (۸)

۱۹۵۶ء میں جب مغربی پاکستان اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے تو پیر الٰہی بخش اس اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور متحدہ محاذ پارٹی کے سیکرٹری بنے۔ اسی دوران نیشنل عوامی پارٹی کا قیام عمل میں آیا

تو پیرالٰہی بخش اس پارٹی میں شامل ہوگئے (۹)

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد جب ایوب خان سے پاکستان کے ممتاز سیاستدانوں کو ایبڈو کے قانون کے تحت سیاست سے جبری طور پر ریٹائر کیا تو اس کی زد میں آنے والوں میں پیرالٰہی بخش بھی شامل تھے۔ پیرالٰہی بخش پر سیاست سے جبری پابندی کا یہ سلسلہ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تک جاری رہا (۱۰) ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ان کا انتقال ہوگیا (۱۱) وہ کراچی میں اپنے نام سے موسوم بستی پیرالٰہی بخش کالونی کی جامع مسجد کی دیوار کے سائے میں آسودہ خاک ہیں (۱۲)

پیرالٰہی بخش کے پانچ فرزند تھے۔ میاں محمد نواز' میاں محمد شاہنواز' میاں عبدالحمید' میاں عبدالمجید اور میاں عبدالرشید۔ ان میں میاں محمد شاہنواز نے' جو سندھ کے ایک اور ممتاز سیاستدان قاضی محمد اکبر کے داماد بھی تھے (۱۳) ایک مختصر سا وقت سیاستدان کے میدان میں گزارا۔

وہ ۱۹۴۹ء میں پیرالٰہی بخش کو الیکشن ٹریبونل کی جانب سے نااہل قرار دیے جانے کے بعد ان کی نشست پر انتخابی امیدوار تھے مگر اس وقت قاضی فضل اللہ سندھ کے وزیراعلیٰ اور ایوب کھوڑو سندھ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ انہوں نے اس وقت کے کلکٹر سے میاں محمد شاہنواز کو نابالغ قرار دلوا کر اس کے کاغذات نامزدگی مسترد کروا دیے۔ ۱۹۵۴ء میں جب ایوب کھوڑو تیسری مرتبہ سندھ کے وزیراعلیٰ بنے تو انہوں نے میاں محمد شاہنواز کو جیل میں ڈلوا دیا۔ (۱۴)

انہی میاں محمد شاہنواز کے فرزند پیر مظہرالحق اور پیر مکرم الحق شاہ ہیں۔

پیر مظہرالحق قیام پاکستان کے ٹھیک ایک ماہ بعد' ۱۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے سندھ یونیورسٹی' سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ بعدازاں انہوں نے کراچی سے ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۹۶۹ء میں وہ ہالا میں منعقد ہونے والے پاکستان پیپلز پارٹی کے پہلے ملک گیر کنونشن میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔

۱۹۸۳ء میں انہوں نے سندھ میں جنرل ضیاء الحق کے خلاف چلنے والی ایم آر ڈی کی تحریک میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔ انہوں نے جی ایم سید کے علاقے سے ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔ جس پر انہیں مینٹینس آف پبلک آرڈر (ایم پی او) کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جہاں انہوں نے دو سال گزارے۔

۱۹۸۸ء میں وہ پہلی مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعدازاں وہ آفتاب شعبان میرانی کی وزارت میں وزیر قانون کے منصب پر فائز ہوئے۔ اگست ۱۹۹۰ء میں بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد جام صادق علی نے انہیں اغوا برائے تاوان کے الزام میں جیل میں ڈال دیا چنانچہ ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے جیل ہی سے حصہ لیا اور دوسری مرتبہ صوبائی اسمبلی کے رکن

منتخب ہوئے (۱۵) ۱۹۹۳ء میں پیر مظہر الحق نے اپنے سیاسی رہنما' ذوالفقار علی بھٹو کے صاحبزادے مرتضٰی بھٹو کو شکست دی اور تیسری مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن بنے۔ ۱۹۹۷ء میں وہ چوتھی مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے۔ (۱۶)

مرکز اور سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کے بعد پیر مظہر الحق کے ستارے پھر گردش میں آ گئے۔

پہلے تو انہیں ۱۲/جون ۱۹۹۷ء کو کچھ ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا۔ وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ کراچی سے حیدر آباد جا رہے تھے یہ واقعہ نوری آباد کے پاس اس وقت پیش آیا جب بعد میں ڈاکوؤں نے ان کی اہلیہ' ذاتی محافظ اور ڈرائیور کو رہا کر دیا مگر ان کی رہائی ۵۴ دن کے بعد عمل میں آئی اور وہ ۶/اگست ۱۹۹۷ء کی شب اپنے گھر واپس پہنچ گئے۔ رہائی کے بعد پیر مظہر الحق نے ایک پریس کانفرنس میں الزام لگایا کہ انہیں وزیر اعلیٰ سندھ' لیاقت جتوئی کی ہدایت پر اغوا کیا گیا تھا اور ان سے رہائی کے لیے تین کروڑ روپے دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا مگر انہوں نے کوئی تاوان ادا نہیں کیا۔ ۱۷/اگست ۱۹۹۷ء کو پولیس نے ٹھٹھہ میں پیر مظہر کو اغوا کرنے والے گروہ کے دو ارکان کو گرفتار کر لیا۔ ملزمان نے اعتراف کیا کہ انہوں نے پیر مظہر الحق کو سانگھڑ اور نواب شاہ کے سرحدی علاقے میں رکھا تھا۔

پیر مظہر الحق ڈاکوؤں کو قید سے چھوٹے تو حکومت نے انہیں بدعنوانیوں کے مختلف الزامات کے تحت جیل میں ڈال دیا۔ ہائی کورٹ کی احتساب بنچ نے انہیں پانچ سال قید کی سزا سنائی تاہم ۱۵/دسمبر ۱۹۹۷ء کو سپریم کورٹ نے انہیں ۲۰ لاکھ روپے کی ضمانت پر رہا کر دیا (۱۷) اسی مقدمے کے باعث پیر مظہر الحق ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے۔ اسی دوران وہ ایک اور کیس میں دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔

۲۰۰۲ء کے عام انتخاب میں پیر مظہر الحق نے اپنی نشست پر اپنی صاحبزادی ماروی مظہر کو پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر انتخاب لڑوایا جو نیشنل الائنس کے امیدوار سید محمد شاہ کو تقریباً چار ہزار ووٹوں سے شکست دے کر سندھ اسمبلی کی رکن منتخب ہو گئیں (۱۸)

ماروی مظہر نے سندھ اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے بعد پیر مظہر الحق کی رہائی کے لیے مہم چلائی اور ایوان کے اندر او باہر اس کے لیے آواز اٹھاتی رہیں۔ جس کے نتیجے میں ۲/جولائی ۲۰۰۵ء کو سندھ ہائی کورٹ نے ان کی ضمانت پر رہائی کی درخواست منظور کر لی۔ (۱۹)

پیر مظہر الحق کے ایک بھائی پیر مکرم الحق شاہ ہیں جو پاکستان پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔ ان پر بدعنوانیوں کے متعدد الزامات تھے جس کے نتیجے میں انہوں نے بھی ایک طویل عرصہ جیل میں گزارا (۲۰)

پیر مکرم الحق شاہ کی اہلیہ فرزانہ راجا ہیں جو ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی

پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر خواتین کی مخصوص نشستوں پر پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ وہ ۲/جنوری ۱۹۷۰ء کو پیدا ہوئی تھیں اور پنجاب یونیورسٹی کی فارغ التحصیل ہیں (۲۱) انہوں نے بھی پنجاب اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے بعد اپنے شوہر کی رہائی کے لیے بھرپور مہم چلائی جس کے نتیجے میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے ۱۳/مارچ ۲۰۰۵ء کو طبی بنیاد پر پیر مکرم الحق شاہ کی ضمانت کی درخواست منظور کر لی۔ (۲۲)

پیر مظہر الحق اور پیر مکرم الحق شاہ کے نانا قاضی اکبر تھے۔ یوں قاضی اکبر کے بھتیجے قاضی اسد عابد رشتے میں ان کے ماموں اور رکن قومی اسمبلی ڈاکٹر فہمیدہ مرزا رشتے میں ان کی خالہ ہوتی ہیں (۲۳)

حوالہ جات

۱۔ جی ایم سید۔ میرے دوست میرے ساتھی۔ (ترجمہ نسرین انجم بھٹی)۔ لاہور۔ ص ۴۹۰، ۴۹۱

۲۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ کراچی۔ ص ۳۱ تا ۳۳

۳۔ جی ایم سید۔ میرے دوست میرے ساتھی (ترجمہ نسرین انجم بھٹی)۔ لاہور۔ ص ۴۹۳

۴۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۲۹

۵۔ خادم حسین چانڈیو۔ مارو جی ملیر جا۔ (سندھی) حیدر آباد۔ ص ۱۷

۶۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ کراچی۔ ص ۳۶

۷۔ جی ایم سید۔ ون یونٹ کی تاریخ۔ لاہور۔ ص ۹۴

۸۔ پیر علی محمد راشدی۔ ون یونٹ کی تاریخ۔ لاہور۔ ص ۱۱۶ تا ۱۲۰

۹۔ جی ایم سید۔ میرے دوست میرے ساتھی۔ (ترجمہ نسرین انجم بھٹی)۔ لاہور۔ ص ۴۹۴

۱۰۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۱۶۲، ۱۶۳

۱۱۔ ڈاکٹر محمد منیر سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۱۶۲، ۱۶۳

۱۲۔ پروفیسر محمد اسلم۔ خفتگان کراچی۔ لاہور۔ ص ۳۳۲

۱۳۔ محمد مرزا۔ پی پی پی زپلر آف اسٹرینتھ (PP'S PILLAR OF STRENGTH) دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ یکم تا ۷/اپریل ۱۹۹۳ء۔ ص ۸

۱۴۔ جی ایم سید۔ میرے دوست میرے ساتھی (ترجمہ نسرین انجم بھٹی)۔ لاہور۔ ص ۴۹۳، ۴۹۴

۱۵۔ محمد مرزا۔ پی پی پیُ زپلر آف اسٹرینتھ۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ یکم تا ۷/اپریل ۱۹۹۳ء ص ۸

۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۸۸

۱۷۔ پروفیسر غفور احمد۔ نواز شریف اقتدار سے عتاب تک۔ لاہور۔ ص ۱۲۹، ۲۷۸
۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲، رپورٹ، جلد دوم۔ ص ۲۶۲
۱۹۔ روزنامہ ڈیلی ٹائمز۔ کراچی۔ ۳/جولائی ۲۰۰۵ء
۲۰۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۱۴/مارچ ۲۰۰۶ء
۲۱۔ پراونشل اسمبلی آف دی پنجاب ۲۰۰۲ء۔ بائیوگرافی آف ممبرز۔ لاہور۔ ص ۳۴۱
۲۲۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۱۴/مارچ ۲۰۰۶ء
۲۳۔ پراونشل اسمبلی آف دی پنجاب ۲۰۰۲ء۔ بائیوگرافی آف ممبرز۔ لاہور۔ ص ۳۴۱

شیرازی

صوبہ سندھ کے ضلع ٹھٹھہ میں آباد شیرازی خاندان ایک معروف سادات خاندان ہے۔ یہ خاندان صدیوں پہلے اس سرزمین پر آ کر آباد ہوا۔ ٹھٹھہ کے تاریخی قبرستان مکلی میں ان کے بزرگوں حضرت شاہ مراد شیرازی اور سید علی شیرازی کی درگاہیں آج بھی مرجع خلائق ہیں۔ حضرت شاہ عقیق جیسی روحانی شخصیات کا تعلق بھی اسی خانوادے سے تھا۔ اس خاندان کے آج بھی لاکھوں عقیدت مند ہیں لیکن روائتی پیری مریدی کا سلسلہ ترک ہو چکا ہے۔ (۱)

قیام پاکستان کے بعد اس خاندان کے جو افراد سیاست میں نمایاں ہوئے ان میں ایک نام علی اصغر شیرازی کا تھا وہ ۱۹۵۳ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور انہوں نے ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے انتخاب میں بھی کامیابی حاصل کی تھی۔ (۲)

علی اصغر شیرازی کے بعد سید قادر ڈینو شاہ شیرازی سیاست کے میدان میں نمایاں ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء میں سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے البتہ وہ ضلع کونسل ٹھٹھہ کے وائس چیئرمین اور چیئرمین کے عہدوں پر منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست کا انتخاب لڑا مگر اپنے حریف امیدوار حاجی محمد عثمان خان جلبانی سے صرف ۱۷۵ ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۳)

اس انتخاب میں قادر ڈینو شاہ شیرازی تو کامیاب نہ ہو سکے مگر ان کے صاحبزادے سید اعجاز علی شاہ شیرازی سندھ اسمبلی کی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے (۴) سید اعجاز علی شاہ بعد ازاں اسی نشست پر ۱۹۸۸ء ۱۹۹۰ء ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء تک مسلسل پانچ مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ ان میں سے تین انتخابات میں انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ بعد میں وہ پی پی کے مخالف کیمپ میں چلے گئے۔ ۱۹۹۷ء میں سینٹ کے انتخابات میں انہوں نے پیپلز پارٹی کے مخالف امیدوار کو ووٹ ڈالا۔ جس پر بھی کافی شور بھی مچا۔

سید اعجاز علی شاہ شیرازی کے چھوٹے بھائی سید شفقت حسین شاہ عرف شفا شاہ شیرازی ہیں

انہوں نے اپنی سیاست کا آغاز ضلعی کونسل کی رکنیت سے کیا پھر اپنے والد کی وفات ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۵ کے بعد ۹ر جنوری ۱۹۸۶ء کو ضلع کونسل ٹھٹھہ کے چیئرمین منتخب ہوگئے (۶) ۱۹۸۸ء میں وہ چھ برس کے لیے سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے (۷) ۱۹۹۰ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست این اے ۱۸۳ ٹھٹھہ ۲ سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا مگر پی ڈی اے کے امیدوار ارباب وزیر احمد میمن سے تقریباً ۸ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء میں وہ یہ نشست حاصل کرنے میں کامیاب رہے اور یوں دو مسلسل میقات کے لیے قومی اسمبلی کے رکن رہے ۱۹۹۳ء میں شفقت حسین شاہ شیرازی کے بھائی سید اعجاز علی شاہ شیرازی نے بھی قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے تھے (۸)

۲۰۰۱ء میں سید شفقت حسین شاہ شیرازی نے ٹھٹھہ کے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا اور ضلعی ناظم کے منصب پر فائز ہوئے۔ ٹھٹھہ کی ضلع کونسل ۵۵ ارکان پر مشتمل تھی جن میں سے ۴۲ ارکان نے سید شفقت حسین شاہ شیرازی کے حق میں ووٹ ڈالا تھا۔ (۹) ۲۰۰۵ء کے بلدیاتی انتخابات میں بھی وہ ٹھٹھہ کے ضلعی ناظم منتخب ہوگئے (۱۰)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں اعجاز علی شاہ شیرازی کے بیٹے ایاز علی شاہ شیرازی نے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر انتخاب لڑا اور دونوں ہی نشستوں پر کامیاب رہے (۱۱) بعد میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی جس پر ضمنی انتخابات میں انجینئر سید سرفراز علی شاہ شیرازی، سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے (۱۲) سید سرفراز علی شیرازی کے بھائی کے ایم ڈبلیو شاہ شیرازی ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں پی ایس ۸۸ ٹھٹھہ ۵ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے جب کہ اسی خاندان کے ایک اور امیدوار سید منظور حسین شاہ شیرازی انہی انتخابات میں پی ایس ۸۴ ٹھٹھہ ۱ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۱۳)

سید منظور حسین شاہ شیرازی، اعجاز علی شاہ شیرازی اور شفقت حسین شاہ شیرازی کے بھائی مظفر حسین شاہ شیرازی کے صاحبزادے ہیں۔ مظفر حسین شاہ شیرازی خود بھی میونسپل کمیٹی ٹھٹھہ کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ (۱۴)

حوالہ جات

۱۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۱۹۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۲۰۳

۲۔ وکیل انجم۔ سیاستدانوں کی قلابازیاں (جلد سوم)۔ لاہور۔ ص ۸۷۰

۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۴۸۰

۴۔ ایضاً۔ ص ۲۶۰۶

۵۔ رسول بخش تمیمی۔ ٹھٹھو صدین کان۔ کنڈیارو۔ ص ۳۹۴

۶۔ مومن بلو۔ چارلیس نیپئر کان محمد میاں سومرو تائین۔ حیدر آباد۔ ص ۵۶۱

۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۴/مارچ ۱۹۸۸ء

۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز رپورٹ ۱۹۹۷ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۳۸

۹۔ مومن بلو۔ چارلیس نیپئر کان محمد میاں سومرو تائین۔ حیدر آباد۔ ص ۵۳۱

۱۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۷/اکتوبر ۲۰۰۵ء

۱۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۹۶۸، ۳۱۱۳

۱۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء، رپورٹ۔ جلد اول۔ ص ۳۴۱

۱۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۳۱۱۳، ۳۱۱۴

۱۴۔ رسول بخش تمیمی۔ ٹھٹھہ صدین کان۔ کنڈویارو۔ ص ۳۹۴

عباسی

لاڑکانہ کا عباسی خاندان، اگرچہ کوئی جاگیردارانہ پس منظر نہیں رکھتا مگر گزشتہ چار، پانچ دہائیوں سے مسلسل سیاست میں متحرک ہے اور اس کے کئی افراد قومی اور صوبائی اسمبلی اور سینٹ میں نمائندگی کا فریضہ انجام دے چکے ہیں۔

اس خاندان کی سیاست کا آغاز بیگم ڈاکٹر اشرف عباسی سے ہوتا ہے جو ۲ جنوری ۱۹۲۵ء کو لاڑکانہ ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں ولید میں پیدا ہوئی تھیں (۱) ان کے والد حکیم سعید خان زمینداری کے ساتھ ساتھ حکمت کے پیشے سے بھی وابستہ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شہر بھر میں خان بہادر ایوب کھوڑو کی موٹر کار، نواب امیر علی لاہوری کے اعلیٰ نسل کے گھوڑوں اور حکیم سعید عباسی کی بگھی (جسے وکٹوریہ کہا جاتا تھا) کی دھوم تھی (۲)

اشرف عباسی، پانچ برس کی عمر میں والدین کے سائے سے محروم ہوگئیں تاہم ان کے بھائی نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان کی عمر فقط تیرہ برس تھی جب ۱۹۳۸ء میں انہوں نے بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد وہ کراچی منتقل ہوگئیں جہاں انہوں نے ۱۹۴۰ء میں ڈی جے کالج سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۳ء میں وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئیں جس کی وجہ سے ان کا تعلیمی سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہوگیا۔ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے ڈاؤ میڈیکل کالج، کراچی میں داخلہ لے لیا جہاں ۱۹۵۳ء میں انہوں نے ایم بی بی ایس کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اسی دوران وہ بائیں بازو کی طلبا تحریکوں (خصوصاً این ایس ایف) سے وابستہ ہوئیں جس نے آگے چل کر ان کے سیاسی کیریر میں اہم کردار ادا کیا (۳)

ڈاکٹر بننے کے بعد بیگم اشرف عباسی نے سول ہسپتال، لاڑکانہ سے اپنے میڈیکل کیریئر کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور خیر پور ڈویژن کونسل میں ضلع لاڑکانہ کی جانب سے پہلی خاتون رکن منتخب ہوئیں۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی ملاقات، ذوالفقار علی بھٹو سے

ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خان کے بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت ملک بھر میں قومی اسمبلی کے انتخابات منعقد ہو رہے تھے۔ ان انتخابات میں بیگم اشرف عباسی کے بھائی کامریڈ علی محمد خان عباسی، قمبر، لاڑکانہ سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جو ایوب خان کی مرکزی کابینہ کے رکن تھے، علی محمد خان عباسی کو ان کی نشست سے دستبردار کروانے کی کوشش کی اور پیشکش کی کہ اگر وہ اس نشست پر انتخاب نہ لڑیں تو بیگم اشرف عباسی کو خواتین کے لیے مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کا رکن منتخب کروایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور علی محمد خان عباسی کی دستبرداری کے بعد بیگم اشرف عباسی، قومی اسمبلی تک پہنچ گئیں بدقسمتی سے جس دن وہ قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں اسی دن ان کے شوہر ٹریفک کے ایک حادثے میں لقمہ اجل بن گئے۔

بیگم اشرف عباسی، بعد ازاں کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہوگئیں اور ۱۹۶۵ء میں ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔

۱۹۶۷ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تو بیگم اشرف عباسی نے اس نئی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہوں نے خود تو حصہ نہیں لیا تا ہم لاڑکانہ سے پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی انتخابی مہم میں بڑی فعال رہیں۔ ۱۹۷۲ء میں جب قومی اسمبلی کا باقاعدہ آغاز ہوا تو بیگم اشرف عباسی تیسری مرتبہ، خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب کر لی گئیں۔ ۱۹۷۳ء میں انہوں نے اسمبلی کی آئینی کمیٹی کی واحد خاتون رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور ۱۹۷۳ء کے آئین کے نفاذ کے بعد قومی اسمبلی کی ڈپٹی اسپیکر کے منصب پر فائز ہوئیں۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں بیگم اشرف عباسی، خواتین کی مخصوص نشستوں پر سندھ اسمبلی کی رکن منتخب کی گئیں۔ جہاں انہوں نے کچھ عرصہ کے لیے ٹاؤن پلاننگ اور بلدیات کے صوبائی وزیر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ (۴)

۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق کے مارشل لا کے نفاذ کے بعد انہوں نے طویل عرصہ تک قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کیں تاہم پاکستان پیپلز پارٹی سے ان کی وابستگی، مستقل برقرار رہی (۵)۔

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں بیگم اشرف عباسی نے حصہ نہیں لیا۔ تاہم ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پہلی مرتبہ لاڑکانہ سے عام انتخاب لڑا ان کے مقابل امیدوار سردار احمد سلطان چانڈیو تھے۔ بیگم اشرف عباسی نے اس انتخاب میں ۶۳ ہزار سے زیادہ ووٹ حاصل کیے جب کہ سردار احمد سلطان چانڈیو ان کے ایک چوتھائی ووٹ بھی حاصل نہ کر سکے۔ (۶) انتخابات کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی میں ڈپٹی اسپیکر کے منصب پر فائز ہوگئیں ۱۹۹۰ء اوراس کے بعد انہوں نے کسی انتخابی عمل میں حصہ نہیں لیا (۷)

بیگم اشرف عباسی کے سب سے بڑے صاحبزادے حاجی منور علی عباسی ہیں۔ منور علی عباسی ۳ ستمبر ۱۹۴۴ء کو ولید (لاڑکانہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کی سیاسی تربیت میں ان کے ماموں کامریڈ علی محمد خان عباسی نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے ساتھ ہی اس پارٹی سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں انہوں نے بلدیاتی انتخاب میں حصہ لیا۔ ۱۹۸۳ء میں انہوں نے صوبہ سندھ میں ایم آر ڈی کی تحریک منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ۱۹۸۷ء میں وہ لاڑکانہ میونسپلٹی کے چیئرمین منتخب ہوئے اور ۱۹۹۰ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں حاجی منور علی عباسی پی ایس ۳۱ لاڑکانہ ۳ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اگست ۱۹۹۰ء تک صوبہ سندھ میں ٹرانسپورٹ، بہبود آبادی اور بلدیات کے وزیر رہے۔ ۱۹۹۰ء میں وہ ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں وہ میر مرتضیٰ بھٹو سے تقریباً ۱۹۰۰ ووٹوں سے شکست کھا گئے تاہم ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء میں صوبائی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب رہے (۸)

بیگم اشرف عباسی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر صفدر عباسی ہیں۔ وہ بھی اپنی والدہ اور بڑے بھائی کی طرح پاکستان پیپلز پارٹی کے بے لوث کارکن ہیں۔

ڈاکٹر صفدر عباسی ۲۶ ردسمبر ۱۹۵۷ء کو پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ایچ سن کالج لاہور اور ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ (۹) ۱۹۸۵ء میں وہ مزید تعلیم کے حصول کے لیے برطانیہ چلے گئے جہاں ان کی ملاقات محترمہ بے نظیر بھٹو سے ہوئی۔ ۱۹۸۶ء میں وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہمراہ وطن واپس لوٹے اس کے بعد انہوں نے سیاست کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور میڈیکل کے پیشے کو خیر باد کہہ دیا (۱۰)۔

ڈاکٹر صفدر عباسی، ان چند افراد میں سے ایک ہیں، جن پر محترمہ بے نظیر بھٹو مکمل اعتماد کرتی ہیں۔ وہ پارٹی کے پالیسی میکر سمجھے جاتے ہیں۔

مارچ ۱۹۹۴ء میں وہ پہلی مرتبہ سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے (۱۱) ۲۰۰۲ء میں وہ دوسری مرتبہ سینٹر منتخب ہوئے (۱۲) ان کی رکنیت ۲۰۰۶ء میں ختم ہوگئی تھی تاہم مارچ ۲۰۰۶ء میں وہ ایک مرتبہ پھر سینٹ کے رکن بننے میں کامیاب ہوگئے (۱۳)

ڈاکٹر صفدر عباسی کی اہلیہ ناہید خان ہیں جو پاکستان پیپلز پارٹی کے دونوں ادوار حکومت میں سیاستدانوں سے زیادہ بااثر شخصیت کے طور پر سامنے آئی تھیں۔ (۱۴)

ناہید خان کا تعلق راولپنڈی کے ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ وہ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئیں۔ زمانہ طالب علمی ہی سے انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ، پی ایس ایف سے ناتا جوڑ لیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں ان کے بھائی کو پی آئی اے کا طیارہ اغوا کرنے کے الزام میں گرفتار کر

لیا گیا۔ جس کے بعد وہ کراچی اور پھر لندن منتقل ہو گئیں۔

لندن میں ناہید خان نے محترمہ بے نظیر بھٹو کا قرب حاصل کر لیا اور ان کی پولیٹیکل سکریٹری کے طور پر فرائض انجام دینے لگیں۔ ۱۹۸۶ء میں وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ وطن واپس لوٹیں۔ ۱۹۸۸ء میں جب بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بنیں تو ناہید خان، حکومتی طور پر ان کی پولیٹیکل سکریٹری مقرر کر دی گئیں۔ ۱۹۹۳ء میں جب محترمہ بے نظیر بھٹو دوبارہ وزیر اعظم بنیں تو ناہید خان کو ایک مرتبہ پھر حکومتی حلقوں میں اہم پوزیشن حاصل ہوگئی۔ ۱۹۹۶ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی برطرفی کے بعد ناہید خان پر کرپشن اور اپنی پوزیشن کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے متعدد الزامات عاید کیے گئے جن کی ایک جھلک ممتاز صحافی مجاہد حسین کی کتاب، پاکستان کے متنازعہ سیاستدان میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ (۱۵)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں ناہید خان نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر راولپنڈی سے قومی اسمبلی کے انتخاب لڑا مگر وہ یہ انتخاب شیخ رشید احمد کے ہاتھوں بری طرح سے ہار گئیں (۱۶) ۲۰۰۱ء میں انہوں نے ڈاکٹر صفدر عباسی سے شادی کر لی اور ۲۰۰۲ء میں پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین کے ٹکٹ پر خواتین کی مخصوص نشستوں پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب کر لی گئیں (۱۷)

حوالہ جات

۱۔ قربان علی بگٹی۔ لاڑکانہ ضلع بلوچن جی مختصر تاریخ۔ مشمولہ لاڑکانہ ساہ سیانو۔ لاڑکانہ۔ ص ۷۷

۲۔ عبدالستار بھٹی۔ لاڑکانہ امر شخصیتون (سندھی)۔ کراچی۔ ص ۱۱۳

۳۔ عمرانہ خواجہ۔ اشرف عباسی (پروفائل)۔ ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۱ر۔ ۱۷رجون ۱۹۹۲ء۔ ص ۴۴

۴۔ عبدالستار بھٹی، لاڑکانو امر شخصیتوں (سندھی)۔ کراچی۔ ص ۱۱۳، ۱۱۵

۵۔ خالد قیوم، پیپلز پارٹی کی رہ نما، بیگم اشرف عباسی سے انٹرویو ہفت روزہ تصویر پاکستان۔ لاہور، ۳۰ جولائی ۱۹۹۳ء

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء لاہور۔ ص ۳۴۵، ۳۴۶، ۴۵۹

۷۔ عبدالستار بھٹی۔ لاڑکانو امر شخصیتوں (سندھی) کراچی۔ ص ۱۱۶

۸۔ ایضاً۔ ص ۱۴۵ تا ۱۴۸

۹۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائرکٹری آف ممبرز (چوتھا ایڈیشن)۔ پارلیمنٹ ہاؤس، اسلام آباد۔ ص ۱۲۶

۱۰۔ ادارہ۔ ایجوکیڈ جیالا فرام دی گینگ آف فور ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ یکم تا ۷ دسمبر ۱۹۹۴ء ص ۸

۱۱۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائرکٹری آف ممبرز (چوتھا ایڈیشن)۔ پارلیمنٹ ہاؤس، اسلام آباد۔ ص ۱۶۲

۱۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد اول۔ ص ۲۸۷

۱۳۔ ایضاً۔ نوٹیفکیشن۔ ۹ مارچ ۲۰۰۶ء

۱۴۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۴۳۴، ۴۳۵

۱۵۔ مجاہد حسین۔ پاکستان کے متنازعہ سیاستدان۔ لاہور۔ ص ۳۸۳ تا ۳۹۳

۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۹

۱۷۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائریکٹری۔ لاہور۔ ص ۴۴۲۔

قاضی

تحریک ریشمی رومال برصغیر کی آزادی کی ایک عظیم تحریک تھی۔ جو بد قسمتی سے کامیاب نہ ہو سکی۔ اس تحریک میں سندھ کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ خود مولانا عبیداللہ سندھی کے علاوہ جو تحریک کے روح رواں تھے' اس میں سندھ کے بڑے بڑے اکابرین شامل تھے۔ انہی میں ایک نام قاضی عبدالقیوم کا تھا۔ (۱)

قاضی عبدالقیوم اپنے تین بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے سب سے بڑے بھائی مولانا حافظ حکیم محمد زماں کی زندگی زیادہ تر سھون میں گزری' جبکہ مولانا حکیم فتح محمد سھوانی اور قاضی عبدالقیوم نے سیاست اور ادب میں بڑا نام پیدا کیا۔ جبکہ فتح محمد سھوانی کراچی میں مقیم رہے اور انہوں نے قومی سیاست میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کا نہ صرف سندھی شاعری اور ادب میں مقام ہے بلکہ آپ انجمن ترقی اردو کے بانی رکن بھی تھے۔ قاضی عبدالقیوم نے بھی قومی سیاست میں بڑا نام کمایا۔ تحریک ریشمی رومال کے سلسلے میں وہ اور ان کے بھائی حکیم فتح محمد دونوں ہی گرفتار ہوئے ایک سال تک جیل کاٹی۔ قاضی عبدالقیوم نے بہت کم عمر پائی اور ۱۹۳۰ء میں ۴۳ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ انتقال کے وقت وہ حیدر آباد میونسپلٹی کے صدر تھے۔

قاضی عبدالقیوم نے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں چھوڑیں۔ جن میں قاضی محمد اکبر اور قاضی عبدالمجید عابد نے سیاست میں بڑا نام کمایا۔ قاضی محمد اکبر کو تو ایک زمانے میں "سندھ کا دولتانہ" کہا جاتا تھا۔

قاضی محمد اکبر جو اکتوبر ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے تھے' اپنے والد کی خالی ہونے والی نشست پر پہلے میونسپلٹی کے کونسلر اور پھر نائب صدر بنے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۱ برس تھی۔ ۲۳ برس کی عمر میں وہ خاکسار تحریک میں شامل ہوئے اور ۱۹۳۵ء تک علامہ مشرقی کے پیروکار رہے۔ اس عرصہ میں وہ صوبہ سندھ کے سالار بنے۔ وہ اس تحریک میں سندھ کو بذریعہ جہاد آزاد کرانے کے جذبے سے شامل ہوئے تھے۔

۱۹۳۵ء میں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور اسی سال حیدر آباد میونسپلٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ سندھ گیر سطح پر ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء میں ہوا جب انہیں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا سالار بنایا گیا۔ یہی وہ دور تھا جب سندھ میں مسلم لیگ کے سرگرم حامی جی ایم سید نے قائداعظم سے اختلاف کیا۔ اس وقت سندھ کے وزیراعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے۔ جبکہ کابینہ میں ایوب کھوڑو' پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور شامل تھے۔ یہ حکومت اگرچہ مسلم لیگ کی تھی لیکن حکومتی عہدوں پر فائز مسلم لیگیوں کی مسلم لیگ کے عہدیداروں سے نہ نبھ سکی۔ جی ایم سید اس وقت سندھ مسلم لیگ کے صدر تھے چنانچہ جب انتخابات کا موقع آیا تو ان کے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ جی ایم سید کا قائداعظم سے اختلاف کسی اصول پر نہیں محض تین نشستوں پر تھا' جی ایم سید چاہتے تھے کہ ہالہ' میرپور خاص اور نواب شاہ کی نشستیں ان کے نامزد کردہ افراد کو ملیں جبکہ حکومتی عہدیدار دوسرے امیدواروں کے حامی تھے۔ جب جی ایم سید قائداعظم کی تنبیہہ کے باوجود اپنے موقف سے نہیں ہٹے تو قائداعظم نے جی ایم سید کو ان کے ساتھیوں سمیت مسلم لیگ سے خارج کر دیا اور مسلم لیگ کی موجودہ باڈی کو توڑ کر ایڈہاک کمیٹی تشکیل دی۔ جس کا چیئرمین یوسف ہارون اور سیکرٹری قاضی اکبر کو بنایا گیا۔

جنوری ۱۹۴۶ء میں جب انتخابات کا مرحلہ آیا تو مسلم لیگ کے پاس تمام حلقوں کے لئے درخواستیں آئیں مگر جی ایم سید کے خلاف لڑنے پر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ یہ حلقہ سندھ میں رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا اور سب سے مشکل حلقہ تھا۔ قاضی اکبر نے اس مقابلے کے لئے خود کو پیش کیا۔ قائداعظم نے قاضی اکبر کی نامزدگی کی خود منظوری دی اور کہا "جاؤ اور جا کر سید کو عبرتناک شکست دو"۔

قاضی اکبر یہ انتخاب کیا لڑے کہ پورے برصغیر میں متعارف ہو گئے۔ اس انتخاب میں مسلم لیگ نے میاں افتخار الدین' ممتاز محمد خاں دولتانہ' مولانا عبدالقیوم کانپوری' راجہ غضنفر علی خاں' پیر صاحب زکوڑی شریف' پیر صاحب مانکی شریف اور مولانا داؤد غزنوی جیسی شخصیات کو بھیجا تھا۔ حقیقت ہے کہ پورے سندھ میں اگر کسی نشست پر لوگوں کی توجہ تھی وہ جی ایم سید اور قاضی محمد اکبر کی نشست تھی۔

قاضی محمد اکبر نے اس انتخاب میں جی ایم سید کو شکست دی اور قائداعظم کی نظر میں سرخرو رہے۔ قاضی محمد اکبر کو اس کارنامے پر سندھ اسمبلی کا چیف پارلیمانی سیکرٹری بنا دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد قاضی محمد اکبر نے حیدر آباد میونسپلٹی کی صدارت میں میر رسول بخش تالپور کو شکست دی۔ ۱۹۵۳ء میں جب انہیں اہل حیدر آباد نے بلا مقابلہ سندھ اسمبلی کا رکن منتخب کیا تو انہوں نے میونسپلٹی کی صدارت چھوڑ دی۔ (۲)

۱۹۵۳ء میں جب پیرزادہ عبدالستار سندھ کے وزیراعلیٰ بنے تو قاضی محمد اکبر ان کی کابینہ میں

بطور وزیر شامل ہو گئے۔ ان کے پاس مالیات، تعلیم اور امداد باہمی کے قلمدان تھے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ کچھ دن وزارت سے باہر رہے مگر دسمبر ۱۹۵۴ء میں وہ ایک مرتبہ پھر کابینہ کے رکن بنا دیئے گئے۔ (۳)

۱۹۵۵ء میں قاضی محمد اکبر کو تعلیم، خزانہ اور اطلاعات اور بعد میں داخلہ کے قلمدان سپرد کئے گئے۔ وزیر اطلاعات کی حیثیت سے انہوں نے حیدر آباد میں اے پی پی کی سروس شروع کروائی اور تین اخبارات کو حکومت کی طرف سے اے پی پی کی مفت سہولت دلوائی۔ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکرٹری اور چیئرمین کی حیثیت سے انہوں نے تعلیم کے فروغ کے لئے کام کیا اور چیمبر آف کامرس کا آغاز کیا۔ بعد ازاں انہیں مسلم لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ کا رکن منتخب کیا گیا۔ سردار نشتر کے دور میں انہوں نے آل پاکستان مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے صدر کی حیثیت سے سارے پاکستان کا دورہ کیا۔

۱۹۶۹ء میں قاضی محمد اکبر نے ایوب خاں کی طرف سے منعقدہ گول کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہیں پیپلز پارٹی کے امیدوار میر اعجاز علی تالپور کے مقابلے میں شکست ہوئی۔ چند سال بعد انہوں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور انہیں پرتگال میں پاکستان کا سفیر بنا دیا گیا۔ (۴)

قاضی محمد اکبر کی ایک شناخت صحافت بھی تھی۔ انہوں نے سندھ نیوز کے نام سے ایک بڑا اچھا اخبار جاری کیا۔ علاوہ ازیں وہ سندھ آبزرور کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ (۵) ۱۹۷۶ء میں ان کے صاحبزادے سلیم اکبر ٹریفک کے ایک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ اس غم کے بعد وہ بجھ کر رہ گئے اور بالآخر یہی صدمہ ان کی زندگی کے ابواب کو سمیٹ کر لے گیا۔ ۱۳ر فروری ۱۹۷۹ء کو سندھ کے اس نامور اور تاریخ ساز سیاست دان کی کتاب زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ (۶)

قاضی محمد اکبر کی وفات کے بعد ان کے کسی صاحبزادے نے تو سیاست میں قدم نہیں رکھا البتہ ان کی صاحبزادی ڈاکٹر امینہ اشرف ضرور کچھ عرصہ کے لئے سیاست میں فعال رہیں۔ وہ ۱۹۸۱ء میں وفاقی مجلس شوریٰ کی رکن نامزد ہوئیں (۷) اور ۱۹۸۵ء میں خواتین کے لئے مخصوص کی جانے والی نشستوں پر صوبائی اسمبلی کی رکن رہیں۔ (۸)

قاضی عبدالقیوم کے صاحبزادے اور قاضی محمد اکبر کے چھوٹے بھائی قاضی عبدالمجید عابد بھی ایک طویل عرصے سے سیاست اور صحافت کے کوچوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ وہ ۲ر مارچ ۱۹۱۵ء کو ضلع دادو کے شہر سہون میں پیدا ہوئے۔ وہ حکیم فتح محمد سہوانی کے داماد ہیں جو ان کے تایا بھی تھے اور ان کے والد قاضی عبدالقیوم کے ہمراہ تحریک ریشمی رومال میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔ (۹)

قاضی عبدالمجید عابد کے سیاسی کیریر کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۵۳ء میں قاضی اکبر نے حیدر آباد میونسپلٹی کی صدارت چھوڑی اور قاضی اکبر کے حریف میر رسول بخش تالپور نے خود قاضی عابد کا نام اس عہدے کے لئے تجویز کیا۔ (۱۰)

قاضی عبدالمجید عابد نے کچھ عرصہ اپنے تایا حکیم فتح محمد سہوانی کے اخبار "اصلاح" میں کام کیا تھا۔ انہوں نے اس تجربے کو سہارا بناتے ہوئے اگست ۱۹۵۸ء میں عبرت کا اجرا کیا جو اس وقت سندھی کا صف اول کا اخبار سمجھا جاتا ہے۔ اس اخبار کے ناطے سے قاضی عابد کئی مرتبہ اے پی این ایس اور سی پی این ای کے عہدیدار رہ چکے ہیں۔ (۱۱)

۱۹۷۹ء میں وہ حیدر آباد کے کونسلر اور ڈویژنل کوارڈینیشن کمیٹی کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ اسی حوالے سے انہیں ۱۹۸۰ء میں سندھ کی صوبائی کونسل کا رکن بنایا گیا۔ بعد ازاں وہ کچھ عرصہ تعمیرات اور مواصلات کے صوبائی وزیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ (۱۲)

۱۹۸۵ء میں قاضی عبدالمجید عابد نے میر علی احمد تالپور کو جو اس وقت وفاقی وزیر دفاع تھے شکست دے کر ملک گیر شہرت حاصل کی اور جی ایم سید کے مقابلے میں قاضی اکبر کی کامیابی کی طرح ان کی یہ کامیابی بھی ان کی شناخت بن گئی۔

قاضی عبدالمجید عابد پہلے حیدر آباد شہر سے صوبائی نشست پر انتخاب لڑنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کا انتخابی حلقہ پی ایس ۴۶ حیدر آباد ۱۰ تھا۔ مگر جب اس حلقے سے میر علی احمد تالپور کے بھتیجے اور میر رسول بخش تالپور کے بیٹے میر رفیق تالپور نے انتخاب لڑنے کا اعلان کیا تو قاضی عبدالمجید عابد خم ٹھونک کر میر علی احمد تالپور کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ (۱۳) اس انتخاب کے دوران میر علی احمد تالپور کو بھٹو کے قاتل کے طور پر پیش کیا گیا اور انہیں "سندھ کا تارا مسیح" کا خطاب دیا گیا۔ (۱۴) اس حلقہ کے ووٹرز اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یوں قاضی عبدالمجید عابد تقریباً ۱۲ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے یہ انتخاب جیت گئے۔ (۱۵)

انتخاب جیتنے کے بعد قاضی عبدالمجید عابد وفاقی وزارت پر فائز ہوئے۔ ان کے پاس مختلف اوقات میں خوراک اور اطلاعات و نشریات کے قلم دان رہے۔ (۱۶) ۲۹ر مئی ۱۹۸۸ء کو محمد خان جونیجو کی برطرفی کے بعد قاضی عبدالمجید عابد کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ ابھی ان کے بارے میں یہ قیاس آرائیاں جاری تھیں کہ انہیں محمد خان جونیجو کی جگہ پاکستان مسلم لیگ کا صدر بنایا جا رہا ہے مگر وہ اچانک مسلم لیگ کو چھوڑ کر پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ان کے اس اقدام پر تمام سیاسی حلقے حیران رہ گئے۔۔ دراصل قاضی عبدالمجید عابد اس راز سے واقف تھے کہ انہیں ۱۹۸۵ء میں پیپلز پارٹی کے ووٹرز نے ہی کامیابی سے ہم کنار کروایا تھا اور ان کی اس کامیابی میں "حب علی" سے زیادہ "بغض معاویہ" کا ہاتھ تھا۔ قاضی عبدالمجید عابد نے مسلم لیگ کے جماعتی

انتشار کا جائزہ لیا تو انہیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کا دامن تھام لیں۔ پیپلز پارٹی کو انہیں خوش آمدید کہنے میں اس لئے کوئی عار نہیں تھا کہ قاضی عبدالمجید عابد عبرت کے مالک اور چیف ایڈیٹر بھی تھے اور یہ اخبار اندرون سندھ خاصا پڑھا جاتا ہے۔

قاضی عبدالمجید عابد نے اس انتخاب میں حسب سابق این اے ۱۷۰ حیدر آباد ۴ سے حصہ لیا اور میر اعجاز علی تالپور کے صاحبزادے میر عنائت علی خان تالپور کو شکست دے کر کامیابی حاصل کی۔ (۱۷) ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ ۲۷ راگست ۱۹۹۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا (۱۸)

قاضی محمد اکبر اور قاضی عبدالمجید عابد کے ایک اور بھائی قاضی محمد اعظم بھی مختصر عرصہ کے لئے سیاسی میدان میں قدم رکھ چکے ہیں۔

۱۹۶۵ء میں وہ حیدر آباد سے مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۱۹) انہوں نے ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں بھی پی ایس ۴۵ حیدر آباد ۹ سے انتخاب لڑا تھا اور میر رسول بخش تالپور کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کے رکن بنے تھے۔ (۲۰)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات قاضی عبدالمجید عابد کے صاحبزادے قاضی اسد عابد نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ این اے ۱۶۹ حیدر آباد ۳ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اگرچہ ان کی کامیابی کے امکانات معدوم تھے تاہم وہ ان انتخابات میں ایم کیو ایم کے بائیکاٹ کے باعث قومی اسمبلی کا رکن بننے میں بآسانی کامیاب ہو گئے۔ (۲۱)

۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں قاضی اسد عابد نے حصہ نہیں لیا تاہم ان دونوں انتخابات میں ان کی ہمشیرہ، ڈاکٹر فہمیدہ مرزا، بدین سے قومی اسمبلی کی رکن بننے میں کامیاب رہیں۔ (۲۲)

ڈاکٹر فہمیدہ مرزا، ڈاکٹر ذوالفقار علی مرزا کی بیوی ہیں جو جسٹس (ر) ظفر علی مرزا کے صاحبزادے ہیں اور آصف زرداری کے بہت قریبی دوست سمجھے جاتے ہیں۔ ذوالفقار علی مرزا، ۱۹۹۳ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر میر مرتضٰی بھٹو کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ انہوں نے حکومت کی جانب سے انتقامی کارروائیوں کے خدشے کے پیش نظر ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا اور اپنی نشست (این اے ۱۷۳، بدین ۲) پر اپنی بیوی ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کو کھڑا کر دیا۔

ڈاکٹر فہمیدہ مرزا نہ صرف یہ انتخاب بآسانی جیت گئیں (۲۳) بلکہ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ۲۰۰۲ء میں بھی اپنی یہ نشست دوبارہ جیتنے میں کامیاب رہیں۔

قاضی خاندان سندھ کے ایک اور سیاسی خانوادے، پیر الٰہی بخش کے خاندان سے بھی رشتہ داریوں کے ذریعے جڑا ہوا ہے جس کی تفصیل اسی کتاب میں سہون کے پیر کے تذکرے میں تفصیل

سے رقم کی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۱۴۴، ۱۴۵
۲۔ ظہیر احمد۔ قاضی محمد اکبر مشمولہ اب بھی زندہ ہیں۔ حیدر آباد۔ ص ۴۵ تا ۵۶
۳۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور (سندھی) کراچی۔ ص ۳۵ تا ۳۷
۴۔ ظہیر احمد۔ قاضی محمد اکبر۔ مشمولہ اب بھی زندہ ہیں۔ حیدر آباد۔ ص ۴۶
۵۔ اردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۱۴۴۲، ۱۴۴۳
۶۔ ظہیر احمد۔ قاضی محمد اکبر۔ مشمولہ اب بھی زندہ ہیں۔ حیدر آباد۔ ص ۵۶
۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۵رجنوری ۱۹۸۲ء
۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ گزٹ نوٹیفکیشن مورخہ ۶ مارچ ۱۹۸۵ء
۹۔ ظہیر احمد۔ قاضی عبدالمجید عابد سے گفتگو۔ مشمولہ ساقی ترے پیمانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۱۲۸
۱۰۔ ظہیر احمد۔ قاضی محمد اکبر۔ مشمولہ اب بھی زندہ ہیں۔ حیدر آباد۔ ص ۵۵
۱۱۔ ظہیر احمد۔ قاضی عبدالمجید عابد سے گفتگو۔ مشمولہ ساقی ترے پیمانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۱۲۸
۱۲۔ سندھ پراونشل کونسل کے ارکان کی فہرست۔ فراہم کردہ سندھ اسمبلی سیکرٹریٹ۔ کراچی ص ۲
۱۳۔ ظہیر احمد۔ قاضی عبدالمجید عابد سے گفتگو۔ مشمولہ ساقی ترے پیمانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۱۳۱
۱۴۔ ادارہ۔ دی رولنگ کلاس۔ ماہنامہ ہیرالڈ الیکشن اسپیشل ۸۸ء۔ ص ۱۱۹
۱۵۔ گزٹ آف پاکستان۔ مورخہ ۲۸ر مارچ ۱۹۸۵ء ص ۲۴۷۸
۱۶۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص۔ ۴۹۶، ۴۹۷
۱۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ۳۴۸، ۳۴۹
۱۸۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۸ راگست ۱۹۹۶ء
۱۹۔ ایم آئی صدیقی رزم۔ ہمارے نمائندے۔ لاہور۔ ص ۷۲، ۷۳
۲۰۔ ظہیر احمد۔ قاضی عبدالمجید عابد سے گفتگو۔ مشمولہ ساقی ترے پیمانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۱۳۲
۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۰۶
۲۲۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۷۴
۲۳۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء۔ جلد اوّل۔ لاہور۔ ص ۱۹۳

کھوڑو

کھوڑو بنیادی طور پر پہاڑی لوگ ہیں۔ اب سے ڈھائی تین سو برس پہلے یہ خیرپور کے میدانی علاقے میں آکر آباد ہوئے۔ برطانوی دور سے کچھ پہلے اس خاندان نے دریائے سندھ عبور کرکے لاڑکانہ کے نزدیک دریا کے کنارے "عاقل" نامی گاؤں آباد کیا۔ یہ گاؤں دریا کے بہت نزدیک اور کچے کے علاقے میں تھا اس لئے یہ گاؤں کئی مرتبہ اجڑا اور کئی مرتبہ آباد ہوا۔

۱۸۴۳ء میں جب انگریزوں نے سندھ فتح کیا تو اس وقت کھوڑو خاندان کے محمد ایوب زندہ تھے۔ وہ انگریزوں کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ انہیں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانا پڑیں اور اسی قید کے دوران شکارپور جیل میں انہوں نے جان دے دی۔

محمد ایوب کے پڑپوتے میاں شاہ محمد خان کھوڑو ایک خوش حال زمیندار تھے ان کے چار صاحبزادے ہوئے۔

(۱) خاں بہادر محمد ایوب خاں

(۲) محمد نواز خاں

(۳) حاجی محمد مراد خاں اور

(۴) میاں علی گوہر خاں

خاں بہادر محمد ایوب کھوڑو ۱۴ر اگست ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے سندھ مدرسہ سے میٹرک کیا اور دو سال تک ڈی جے کالج کراچی میں پڑھا مگر ۱۹۲۱ء میں والد کے انتقال کے باعث انہیں تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاڑکانہ میں بیرسٹر جان محمد خان جونیجو نے خلافت کانفرنس منعقد کروائی تھی اور اس میں برصغیر کے چوٹی کے مسلم زعماء شریک ہوئے تھے۔ نوجوان ایوب کھوڑو نے اس کانفرنس میں شرکت تو کی مگر خلافت تحریک میں شامل نہیں ہوئے۔

تاہم بہت جلد ایوب کھوڑو کی سیاسی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء میں ان کے چچا جان محمد

کھوڑو نے اپنی نشست خالی کر کے انہیں لوکل بورڈ کا ممبر منتخب کرایا۔ دو برس بعد ۱۹۲۳ء میں بمبئی کی مجلس قانون ساز کا انتخاب ہوا تو ایوب کھوڑو اس مجلس کے رکن منتخب ہوئے۔ انہیں مبارک باد دینے آنے والوں میں شاہنواز بھٹو بھی شامل تھے۔ ایوب کھوڑو ۱۹۳۵ء تک اس نشست پر مسلمانان سندھ کی نمائندگی کرتے رہے۔

رفتہ رفتہ ایوب کھوڑو کی حیثیت ایک مسلمان لیڈر کے طور پر مستحکم ہوتی چلی گئی۔ بعد میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی تحریک نے انہیں مسلمانوں کا متفقہ لیڈر بنا دیا۔ بمبئی سندھ کی علیحدگی کی تحریک ۱۹۱۳ء سے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ شیخ عبدالمجید سندھی، عبداللہ ہارون اور جی ایم سید اس میں نمایاں تھے مگر ۱۹۲۹ء میں جب اس تحریک کی قیادت ایوب کھوڑو کے ہاتھ آئی تو اسے بہت تقویت ملی۔

اسی برس سائمن کمیشن نے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے مسئلہ کا جائزہ لیتے ہوئے یہ رپورٹ دی کہ سندھ معاشی طور پر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ایوب کھوڑو نے اس رپورٹ کو چیلنج کیا اور اعداد و شمار و دلائل کے ساتھ اس کا بھرپور جواب دیا۔ ایوب کھوڑو کا یہ جواب "Suffering of Sind" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ بعد ازاں ایوب کھوڑو کو لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس میں بھی اپنے موقف کے اعادے کا موقع ملا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں سندھ کو بمبئی سے علیٰحدگی کا فرمان جاری ہو گیا اور یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو سندھ علیحدہ صوبہ قرار پایا۔ (۱) محمد ایوب کھوڑو اس صوبائی کونسل میں شامل تھے جو گورنر سندھ سر لیلٹ گراہم نے قائم کی تھی۔ اس کونسل کی معیاد ۳۱ر مارچ ۱۹۳۷ء تک مقرر تھی، جب تک نئی صوبائی اسمبلی اور وزارت قائم ہو۔ (۲)

۱۹۳۷ء کے انتخابات سے قبل سندھ میں کئی سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں اور انہوں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ ان سیاسی جماعتوں میں سندھ اتحاد پارٹی اور ڈیمو کریٹک پارٹی کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ سندھ اتحاد پارٹی میں جی ایم سید، اللہ بخش سومرو اور سر عبداللہ ہارون وغیرہ شامل تھے۔ جبکہ ڈیمو کریٹک پارٹی کے کرتا دھرتا سر غلام حسین ہدایت اللہ اور محمد ایوب کھوڑو وغیرہ تھے۔ (۳)

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کوئی بھی سیاسی جماعت واضح اکثریت حاصل نہیں کر سکی۔ ۶۰ ارکان کے ایوان میں سب سے اکثریتی پارٹی سندھ اتحاد پارٹی تھی جس کے ۱۸ ارکان انتخاب جیتنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر گورنر نے سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزیر اعلیٰ مقرر کیا۔ جو زبردست جوڑ توڑ کے بعد ۳۶ ارکان کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ (۴)

جلد ہی جوڑ توڑ کی سیاست رنگ لانے لگی اور سندھ کی وزارتیں جلد جلد ٹوٹنے لگیں۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ کے بعد خان بہادر اللہ بخش سومرو وزیر اعلیٰ بنے۔ اللہ بخش سومرو کے

استعفیٰ کے نتیجے میں مختصر عرصہ کے لئے میر بندے علی تالپور نے وزارت تشکیل دی۔ اس وزارت میں محمد ایوب کھوڑو بھی شامل تھے۔ جنہیں پی ڈبلیو ڈی کا قلمدان سونپا گیا۔ اس کے بعد پھر اللہ بخش سومرو وزیراعلیٰ بنے۔ اللہ بخش سومرو کی برطرفی کے بعد قرعہ فال سر غلام حسین ہدایت اللہ کے نام نکلا۔ جن کی کابینہ میں ایوب کھوڑو بھی شام ہوئے۔ ان کے پاس ریونیو اور امداد باہمی کا قلمدان تھا۔ وہ اس وزارت پر ۲۵ر ستمبر ۱۹۴۴ء تک فائز رہے۔ (۵) اسی دوران (۱۴ر مئی ۱۹۴۳ء کو) خان بہادر اللہ بخش سومرو کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۴۴ء کو کھوڑو صاحب کو اس قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ یہ مقدمہ ۱۱ ماہ جاری رہا اور بالآخر ۳ر اگست ۱۹۴۵ء کو انہیں اس الزام سے بری قرار دے دیا گیا۔ (۶) اگلے برس جب غلام حسین ہدایت اللہ نے کابینہ کی از سر نو تشکیل کی تو ایوب کھوڑو اس میں بطور ڈپٹی چیف منسٹر دوبارہ شامل کر لئے گئے۔ انہیں پی ڈبلیو ڈی کا قلم دان بھی سونپا گیا۔ قیام پاکستان تک جناب ایوب کھوڑو اسی عہدے پر فائز رہے۔ (۷)

محمد ایوب کھوڑو کو انگریزوں نے ان کی خدمات کے صلے میں خان بہادر کے خطاب سے نوازا تھا۔ تحریک پاکستان کے دنوں میں ۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو قائداعظم نے تمام مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ انگریزوں کے دیئے ہوئے خطابات واپس کر دیں۔ بعض مسلمان رہنماؤں نے یہ خطابات لوٹانے میں بڑی ہچکچاہٹ سے کام لیا کیونکہ انہوں نے یہ خطابات بڑی جوڑتوڑ اور بڑا پیسہ خرچ کر کے حاصل کیے تھے۔ مگر ایوب کھوڑو نے قائداعظم کے اس فرمان پر عمل کرنے میں ذرا بھی پس و پیش سے کام نہ لیا اور فوراً ہی یہ خطاب واپس کر دیا (۸)

قیام پاکستان کے بعد غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے گورنر اور محمد ایوب کھوڑو پہلے وزیراعلیٰ مقرر ہوئے۔ تقسیم سے قبل سندھ' سیاسی ردو بدل کے لئے بہت بدنام تھا' جو مختلف گروہوں میں بدلتے ہوئے گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھا۔ تقسیم کے وقت عنان اقتدار پوری مضبوطی سے محمد ایوب کھوڑو کے تحت ایک مسلم لیگی وزارت کے ہاتھ میں تھی لیکن گورنر غلام حسین ہدایت اللہ کے ساتھ وزیراعلیٰ کھوڑو کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اپریل ۴۸ء کے اوائل میں کھوڑو اور ان کے دو وزیروں پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور کے درمیان کھلے بندوں نزاع کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اخبارات میں الزامات اور جوابی الزامات شائع ہوئے بقول چوہدری محمد علی' گورنر نے اس خیال سے وزیروں کے محکمے تبدیل کر دیئے کہ شاید اس طرح کابینہ زیادہ خوش اسلوبی سے کام کر سکے گی لیکن کھوڑو نے اسے گورنر کی بے جا مداخلت سمجھا۔ معاملہ قائداعظم تک پہنچا اور گورنر نے ان کے سامنے کھوڑو کی بدانتظامی اور رشوت ستانی کی شہادت پیش کر دی۔ چنانچہ ان کی ہدایت پر ۲۶ر اپریل ۱۹۴۸ء کو گورنر نے وزیراعلیٰ کو برطرف کر دیا حالانکہ انہیں سندھ اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ یہ اقدام ترمیم شدہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۵۱ کے

تحت کیا گیا۔ اس دفعہ میں لکھا تھا کہ وزراء "گورنر کی خوشنودی تک ہی اپنے عہدے پر فائز رہ سکیں گے اور گورنر اس دفعہ کے تحت، گورنر جنرل کے عام کنٹرول کے تابع ہو گا اور ان خاص ہدایات کی تعمیل کرے گا جو اسے وقتاً" فوقتاً" دی جائیں گی"۔

گورنر کی طرف سے جاری شدہ اعلامیہ میں کہا گیا کہ کھوڑو کے خلاف بد انتظامی، اپنے فرائض کی ادائیگی میں شدید بد عنوانی اور رشوت ستانی کے الزامات پر مبنی ایسا مقدمہ تیار کر لیا گیا ہے جس میں وہ ماخوذ ہو سکتے ہیں۔ (۹)

جناب احمد سلیم اپنی کتاب سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں میں رقم طراز ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ یہ مقدمہ اس لئے تیار نہیں کیا گیا تھا کہ کھوڑو نے رشوتیں وصول کی تھیں یا اقربا پروری کے مرتکب ہوئے تھے، ان کی یہ سرگرمیاں قیام پاکستان سے قبل بھی کسی سے پوشیدہ نہ رہی تھیں اور جب انہیں وزیر اعلیٰ بنایا گیا تو حکومت کو یہ خوش فہمی نہ رہی ہو گی کہ ان کا ذاتی کردار بے داغ ہے۔ یہ مقدمہ اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ وہ مرکزی حکومت کی مداخلت کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے اور سندھ ایک صوبے کے طور پر داخلی خود مختاری کا سب سے زیادہ حامی تھا۔ ایک قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ "پاکستان کے آئین میں ہر صوبے کو اندرونی معاملات میں مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے اور وحدت پاکستان کی تشکیل اس طرح عمل میں لائی جائے کہ پاکستان میں شامل تمام اکائیوں کو چھوٹی بڑی کے امتیاز کے بغیر انتظامیہ اور مقننہ میں مساوی نمائندگی مل سکے"۔

صوبائی حکومت کے اس موقف کو مرکز کی حامی قوتوں نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا تھا اور اسے انتشار کے بیج بونے کے مترادف قرار دیا گیا۔

اپنی برطرفی سے قبل گورنر سندھ سے وزیر اعلیٰ کے سنگین اختلافات پیدا ہو چکے تھے جن کا اظہار گورنر کی جانب سے وزیروں کے شعبے تبدیل کرنے سے ہوا تھا۔

تاہم کھوڑو کو ہٹانے کی اہم اور فوری وجہ کراچی کو وفاق کا حصہ بنانے کے خلاف ان کی جدوجہد تھی۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ لکھنے والے مختلف حضرات اس مسئلے کو غلط انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایوب کھوڑو کو بدعنوانیوں کے الزامات کے تحت اپریل ۱۹۴۸ء میں ہٹایا گیا اور مئی ۱۹۴۸ء میں کراچی کو وفاق کا حصہ بنانے کا فیصلہ ہوا جس کے خلاف جدوجہد میں کھوڑو بھی شریک تھے لیکن یہ پورا سچ نہیں ہے۔ سید نور احمد اور ڈاکٹر صفدر محمود سمیت کئی مورخوں نے یہ غلط تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس واقعہ سے معزول وزیر اعلیٰ کو "حکومت کے خلاف تحریک چلانے اور اپنی قیادت کا سکہ از سرنو رواں کرنے کا موقع مل گیا"۔ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور حکومت کے اس فیصلہ کی اس بنیاد پر مخالفت شروع کر دی کہ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کی کارروائی صوبے کے مفاد کے منافی ہے.... قیام پاکستان

کے بعد ایوب کھوڑو پہلے سیاسی لیڈر تھے جنہوں نے محض ذاتی مقبولیت کے لئے صوبائیت کے جذبات کو ابھارا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔

سید نور احمد تاریخی حقائق کو مسخ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسٹر کھوڑو نے ایک عجیب سوال پر صوبائی مفاد کا شور مچانا شروع کیا اور اس کے ساتھ ہی سندھیوں کے "مفاد" کے ایک اور "مسئلہ" کو بھی وابستہ کر دیا۔ یہ مسئلہ سندھ میں مہاجرین کی آباد کاری کا تھا۔ شکایت یہ پیدا کی گئی کہ "پاکستان' سندھ مشترکہ ریفیوجی کونسل" سندھ میں مہاجرین کو بھاری تعداد میں آباد کر کے مقامی لوگوں کے مفاد کے لئے خطرہ پیدا کر رہی ہے اور سندھ کی معاشی زندگی پر غیر سندھی عناصر کے غلبے کا امکان پیدا ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کراچی کی سندھ سے علیحدگی کا معاملہ کئی ماہ پہلے شروع ہو چکا تھا جس کی صوبائی حکومت کی جانب سے مخالفت کی جا رہی تھی۔ ۲ر فروری ۱۹۴۸ء کو صوبائی اسمبلی نے اتفاق رائے سے قرار داد منظور کی جو کراچی کو وفاق کا حصہ بنانے کی مذمت کرتی تھی۔ مسلم لیگ کی صوبائی مجلس عاملہ نے اعلان کیا کہ کراچی کی سندھ سے علیحدگی کی صورت میں وہ شہر کو پہلے کی طرح سندھ کے حصے کی حیثیت میں دیکھے گی اور اس میں اپنا کام جاری رکھے گی۔

اس چپقلش میں کھوڑو کو وزیر اعلیٰ کا عہدہ چھوڑنا پڑا لیکن مسلم لیگ میں ان کی طاقتور پوزیشن کے باعث انہیں سیاست سے بے دخل نہ کیا جا سکا۔ (۱۰)

برطرفی کے بعد کھوڑو کے خلاف ۶۲ الزامات کی بنیاد پر مقدمہ کی سماعت کے لئے لاہور چیف کورٹ کے چیف جسٹس عبدالرشید اور ڈھاکہ چیف کورٹ کے جسٹس شہاب الدین پر مشتمل ایک عدالتی ٹربیونل تشکیل دیا گیا۔ کھوڑو صاحب پر بد انتظامی اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بجا لانے میں سنگین بے ضابطگیوں کے الزامات عائد کئے گئے۔ جی ایم سید کے بقول کئی ہفتے وہ زیر حراست رہے' اسمبلی کی رکنیت کالعدم قرار دے کر انہیں تین سال کے لئے کسی بھی سرکاری عہدے پر تعینات کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ (۱۱)

قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مرکز نے پیر الٰہی بخش کو صوبے کا وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ سندھ عوامی محاذ سے تعاون کرنے والے قانون ساز اسمبلی کے ممبران کو گرفتار کر لیا گیا۔ برطرفی کے باوجود محمد ایوب کھوڑو کی سیاسی قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور دسمبر ۱۹۴۸ء میں مرکز کی خواہش کے خلاف انہیں سندھ مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ تاہم محمد ایوب کھوڑو یہ کہہ کر مسلم لیگ کی سربراہی سے مستعفی ہو گئے کہ جب تک ان کے خلاف الزامات کی تحقیقات کرنے والی عدالت کی رپورٹ سامنے نہیں آئے گی وہ اس وقت تک مسلم لیگ کا صدر بننا منظور نہیں کریں گے۔ (۱۲)

ایسی بے ڈھب صورتحال سے نمٹنے کے لئے قانون ساز اسمبلی نے ۷ر جنوری ۱۹۴۹ء کو

پبلک اور نمائندہ عہدوں پر نااہلیت کا قانون پروڈا منظور کیا۔ اس قانون کے تحت ایسے افراد کو گورنر جنرل کے حکم کے تحت دس سال تک کسی پبلک عہدہ کے لئے نااہل قرار دیا جا سکتا تھا جو بحیثیت مرکزی یا صوبائی وزیر، نائب وزیر، پارلیمانی سیکرٹری یا مرکزی اور صوبائی مجلس قانون ساز کے رکن بداعمالی کے مجرم قرار دیئے جائیں۔ "بد اعمالی" میں رشوت ستانی، بد عنوانی، اقربا پروری، دانستہ بد انتظامی اور اسی قسم کے دوسرے جرائم شامل تھے۔ اس قانون کے تحت کھوڑو کو دو سال کے لئے نااہل قرار دے دیا گیا۔ (۱۳)

پروڈا کے تحت پابندی کی مدت مکمل ہوتے ہی ایوب کھوڑو دوبارہ سندھ کے وزیراعلیٰ بن گئے اب انہوں نے اسی پروڈا کو جس کا وہ خود شکار ہو چکے تھے دوسرے سیاستدانوں کے خلاف استعمال کیا اور ہر وہ شخص، جس نے ان پر تنقید کی اس قانون کی زد میں آگیا۔

جلد ہی ایوب کھوڑو ایک مرتبہ پھر اسی قانون کے شکنجے میں آ گئے۔ ان پر بدعنوانی، رشوت ستانی، اقربا پروری اور انتظامیہ میں بے جا مداخلت کے الزامات تھے چنانچہ انہیں چار سال کے لئے کسی عوامی عہدہ پر فائز ہونے کے لئے نااہل قرار دے دیا گیا لیکن وہ نااہلی کی مدت پوری کرتے ہی تیسری بار وزیراعلیٰ بن گئے۔ (۱۴)

یہ واقعات اس آمریت کا شاخسانہ تھے جس کی بنیادیں ابتداء میں ہی رکھ دی گئی تھیں اور سیاسی مخالفین کو آواز بلند کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ بقول جی ایم سید جب لیگ کے اعلیٰ عہدیداروں کے سامنے خان بہادر کھوڑو نے قدرے خودداری کا مظاہرہ کیا تو انہیں برطرف کر کے ان کے خلاف ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایک خصوصی ٹربیونل قائم کر دیا گیا۔ اس ٹربیونل پر خرچ سندھ کا اٹھ رہا تھا لیکن اس کی نہ سندھ حکومت سے اجازت لی گئی نہ سندھ اسمبلی سے..... انہیں پہلے آزمائش کے طور پر اقتدار سے باہر کر دیا گیا اور جب ارباب حل و عقد کو یقین ہو گیا کہ اب وہ ان کی اطاعت قبول کر چکے ہیں تو انہیں اقتدار سونپ دیا گیا۔ آخر اس تمام ڈرامے کا مقصد کیا تھا؟ اگر وہ قصور وار تھے تو انہیں اقتدار سے صریحاً باہر رکھنے کی ضرورت تھی اور اگر وہ بے قصور تھے تو یہ سارا تماشہ انہیں محض اپنا مطیع بنانے کے لئے برپا کیا گیا تھا.... (۱۵)

ایوب کھوڑو تیسری مرتبہ وزیراعلیٰ بنے تو اس وقت ون یونٹ کا قیام سب سے بڑا مسئلہ تھا ایوب کھوڑو کے پیش رو عبدالستار پیرزادہ اس مسئلے پر سخت موقف اختیار کر چکے تھے ان کا یہی موقف ان کی برطرفی اور ایوب کھوڑو کی وزارت اعلیٰ کا باعث بنا۔ چنانچہ ایوب کھوڑو نے ۱۱ دسمبر ۱۹۵۴ء کو صوبہ سندھ کو ون یونٹ میں شامل کروانے کا بل پاس کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور ون یونٹ کے قیام تک صوبے کے وزیراعلیٰ رہے۔

ون یونٹ کے قیام کے بعد ایوب کھوڑو مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے۔ اور صوبائی وزارت میں بھی شامل ہوئے۔ (۱۶) کچھ عرصہ بعد وہ مرکزی کابینہ میں بھی شامل کئے گئے اور

انہیں وزارت دفاع کا قلمدان سونپا گیا۔ اسی وزارت کے دوران انہوں نے ایوب خان کی مدت ملازمت میں توسیع کی جس نے آگے چل کر بڑے دور رس نتائج پیدا کئے۔ (۱۷)

خود ایوب کھوڑو کو اس کا صلہ یہ ملا کہ ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کرتے ہی' چند دن بعد ایوب کھوڑو کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا اور ان پر ایبڈو کے تحت مقدمہ چلا کر انہیں سیاست سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایوب کھوڑو نے اس اقدام کے تحت سپریم کورٹ میں اپیل کی جس نے انہیں اس پابندی سے باعزت بری کر دیا۔

۱۹۶۴ء میں جناب ایوب کھوڑو نے صدارتی انتخاب کے موقع پر محترمہ فاطمہ جناح کے لئے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے لاڑکانہ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس انتخاب میں ان کے مد مقابل ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں شکست فاش دی۔ اس شکست کے بعد ایوب کھوڑو عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور ۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ (۱۸)

ایوب کھوڑو کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ محمد پاشا کھوڑو نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ انہوں نے ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں این اے ۱۶۴ لاڑکانہ اسے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس انتخاب میں بھٹو قبیلے کے سربراہ نواب نبی بخش بھٹو نے بھی ان کی حمایت کرنے کا اعلان کیا تھا۔ شاہ محمد پاشا کھوڑو نے بعد میں محمد خاں جونیجو کی کابینہ میں بھی شمولیت اختیار کی۔ (۱۹)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں شاہ محمد پاشا کھوڑو نے حصہ نہیں لیا۔ تاہم ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں وہ دوبارہ اسی حلقے سے امیدوار بنے۔ ان کی مد مقابل محترمہ نصرت بھٹو تھیں جنہوں نے انہیں ۷۰ ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دی۔ (۲۰)

۱۹۸۵ء کی قومی اسمبلی میں جناب ایوب کھوڑو کی ایک صاحبزادی مسز رشیدہ پاشا کھوڑو بھی خواتین کے لیے مخصوص نشستوں پر منتخب ہوئی تھیں ۔ اس نشست پر دراصل ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو کو حصہ لینا تھا مگر ان کے کاغذات نامزدگی مسترد ہو گئے۔ جن کے باعث مسز رشیدہ پاشا کھوڑو منتخب ہو گئیں۔ (۲۱)

شاہ محمد پاشا کھوڑو اور مسز رشیدہ پاشا کھوڑو کی بہن حمیدہ کھوڑو نے ۱۹۸۸ء میں این اے ۱۶۴ لاڑکانہ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا۔ اپنے والد کی عمر بھر کی سیاسی وابستگی کے برعکس انہوں نے سندھی قومیت کے فلسفہ کی ترجمان پی این پی میں شمولیت اختیار کی اور بیگم نصرت بھٹو کا مقابلہ کیا۔ اس انتخاب میں بیگم نصرت بھٹو نے انہیں تقریباً ۷۹ ہزار ووٹوں سے شکست دی تھی۔ (۲۲) ۱۹۹۳ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر بیگم نصرت بھٹو کے مقابلے میں قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ انہیں مسلم لیگ (نواز گروپ) کا ٹکٹ بھی حاصل تھا مگر اس مرتبہ بھی انہیں شکست

فاش سے دوچار ہونا پڑا (۲۳)

بیگم حمیدہ کھوڑو نے برطانوی جامعات سے آنرز اور پی ایچ ڈی کیا ہے۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں انہوں نے سندھ بلوچ پشتون فرنٹ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ سندھی قوم پرستوں میں ان کا بڑا اہم مقام ہے۔ (۲۴)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں حمیدہ کھوڑو کی بجائے ان کی بہن رشیدہ کھوڑو نے قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا وہ بھی محترمہ نصرت بھٹو سے بُری طرح شکست کھا گئیں (۲۵)

۲۰۰۲ء میں حمیدہ کھوڑو خواتین کی مخصوص نشستوں پر سندھ اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں اور بعد ازاں صوبائی وزیر تعلیم کے منصب پر فائز ہوئیں (۲۶)

شاہ محمد پاشا کھوڑو کے ایک اور بھائی مسعود کھوڑو بھی عملی سیاست میں ہیں۔ وہ ضلع کونسل لاڑکانہ کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پی ایس ۳۳ لاڑکانہ ۳ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا اور کامیاب ہوئے تھے (۲۷) ۱۹۸۸ء کے انتخاب میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ لیکن ۱۹۹۰ء میں وہ ایک مرتبہ پھر آزاد امیدوار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ان کے مدمقابل حاجی منور خان عباسی تھے جنہوں نے انہیں تقریباً ۲۸ ہزار ووٹوں سے شکست دی (۲۸) مسعود کھوڑو نے ۱۹۹۷ء کے صوبائی انتخابات میں بھی حصہ لیا مگر وہ اس مرتبہ بھی کامیاب نہ ہو سکے (۲۹)

ایوکھوڑو کے سب سے چھوٹے صاجزادے خالد محمود کھوڑو پاشا تو عملی سیاست سے دور ہیں مگر رشتہ داری کے حوالے سے وہ ایک مشہور سیاستدان گھرانے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی شادی پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ ممتاز محمد خان دولتانہ کی صاجزادی شاہدہ سے ہوئی ہے۔ (۳۰) شاہدہ دولتانہ نے ۲۰۰۲ء میں پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر این اے ۱۶۸ وہاڑی ۲ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر وہ اسحٰق خاکوانی سے شکست کھا گئی تھیں (۳۱)

محمد ایوب کھوڑو کے سب سے چھوٹے بھائی میاں علی گوہر کھوڑو بھی عملی سیاست سے وابستہ رہے ہیں۔ وہ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز مسلم لیگ سے کیا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں انہوں نے ضلع لاڑکانہ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیتا اور سندھ اسمبلی کے رکن بنے۔ (۳۲) ۱۹۶۲ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے (۳۳)

محمد ایوب کھوڑو اور میاں علی گوہر کھوڑو کے بھتیجے اور محمد نواز خاں کھوڑو کے اکلوتے صاجزادے نثار احمد کھوڑو اس وقت سیاست کے میدان میں خاصے فعال ہیں۔ وہ ڈی جے کالج کراچی اور جامعہ کراچی کے فارغ التحصیل ہیں۔ انہوں نے ۱۹۷۸ء میں تحریک استقلال سے اپنے سیاسی سفر کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۶ء تک وہ اسی جماعت سے وابستہ رہے اور اس دوران گرفتاری کی صعوبت بھی اٹھائی۔ ۶

فروری ۱۹۸۷ء کو انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے پی ایس ۳۳ لاڑکانہ ۵ سے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور سندھ کے سابق وزیراعلیٰ اختر علی قاضی کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کے رکن بننے میں کامیابی حاصل کی ۱۹۹۰ء میں بھی انہوں نے اسی نشست سے انتخاب لڑا اور ایک مرتبہ پھر اختر علی قاضی کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ (۳۴) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں کامیابی حاصل کر کے اپنی کامیابیوں کی ہیٹ ٹرک مکمل کی (۳۰) اور صوبائی وزارت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ (۳۵) ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں نثار احمد کھوڑو چوتھی مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن بنے (۳۶) اور ۲۰۰۲ء میں بھی اپنی یہ نشست برقرار رکھنے میں کامیاب رہے (۳۷)

حوالہ جات

۱۔ ظہیر احمد۔ حمیدہ کھوڑو سے تاریخی باتیں۔ مشمولہ ساقی ترے پیمانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۸۲ تا ۸۹

۲۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۲۰۸، ۲۰۹

۳۔ ظہیر احمد۔ حمیدہ کھوڑو سے تاریخی باتیں۔ مشمولہ ساقی ترے پیمانے سے۔ حیدر آباد۔ ص۸۹

۴۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۲۱۳

۵۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ (سندھی) کراچی۔ ص ۲۸ تا ۳۰

۶۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ (جلد سوم)۔ لاہور۔ ص ۲۳۴

۷۔ اعجاز احمد انصاری۔ جناب الحاج محمد ایوب صاحب کھوڑو۔ مشمولہ مہران، سوانح نمبر (سندھی) حیدر آباد۔ ص ۶۴۶

۸۔ مسعود انصاری۔ دی کھوڑوز آف سندھ۔ روزنامہ دی نیوز کراچی۔ الیکشن اسپیشل۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۳ء

۹۔ چوہدری محمد علی۔ ظہور پاکستان۔ (ترجمہ بشیر احمد ارشد)۔ لاہور۔ ص ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴

۱۰۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۲۸، ۲۹

۱۱۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین (سندھی)۔ حیدر آباد۔ جلد ۲۔ ص ۱۹۸

۱۲۔ ڈاکٹر صفدر محمود پاکستان۔ مسلم لیگ کا دور حکومت۔ لاہور۔ ص ۱۹۱

۱۳۔ چوہدری محمد علی۔ ظہور پاکستان (ترجمہ بشیر احمد ارشد) لاہور۔ ص ۴۳۳

۱۴۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۳۲، ۳۳

۱۵۔ جی ایم سید۔ نیئن سندھ لاء جدوجہد۔ (سندھی) حیدر آباد ص ۴۴۹ تا ۴۵۱

۱۶۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ (سندھی) کراچی۔ ص ۳۶، ۳۷

۱۷۔ پیر علی محمد راشدی۔ روداد چمن۔ کراچی۔ص ۷۹

۱۸۔ ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو۔ محمد ایوب کھوڑو۔ مشمولہ لاڑکانو ساہ سیبانو (سندھی)۔ مرتبہ گل محمد گاد۔ محمد افضل عباسی۔ لاڑکانہ۔ص ۲۱۹

۱۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ص ۳۴۴

۲۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ص ۷۵

۲۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ص ۲۹۷

۲۲۔طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ص ۳۴۴ ۴۵۹

۲۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۳۰۵

۲۴۔ ظہیر احمد۔ حمیدہ کھوڑو سے تاریخی باتیں (انٹرویو) مشمولہ ساقی ترے پیانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۸۴، ۱۰۴

۲۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ص ۱۲۱

۲۶۔ ایضاً۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ص ۳۴۵

۲۷۔ دی گزٹ آف دی پاکستان۔ ۲۸/مارچ ۱۹۸۵ء۔ص ۲۵۹۶

۲۸۔ ایضاً۔۱۱رنومبر ۱۹۹۰ء۔ص ۹۳۳۳

۲۹۔ ایضاً۔۲۳رفروری ۱۹۹۷ء۔ص ۴۴۸

۳۰۔ ظہیر احمد۔ حمیدہ کھوڑو سے تاریخی باتیں (انٹرویو) مشمولہ ساقی ترے پیانے سے۔ حیدر آباد۔ ص ۸۴

۳۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم ص ۶۰

۳۲۔ تہور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ لاہور۔ص ۲۶

۳۳۔ وکیل انجم۔ جاگیرداروں کے گرد گھومتی سندھ کی سیاست۔ روزنامہ جنگ سنڈے میگزین ۲ر اکتوبر ۲۰۰۵ء

۳۴۔ محمد مرزا۔ این آؤٹ اسپوکن مین۔ نثار کھوڑو۔ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۱رتا ۱۷رفروری ۱۹۹۳ء۔ص ۸۔

۳۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۴۶۶

۳۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ص ۴۶۰

۳۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء جلد دوم۔ص ۲۴۶

گبول

کراچی کے علاقے لیاری میں آباد گبول خاندان بھی تین نسلوں سے سیاست کے میدان میں فعال ہے۔ یہ خاندان بلوچ قبیلے ڈومبکی کی ایک شاخ ہے (۱)

گبول خاندان کی جس شخصیت نے پہلی بار سیاست کے میدان میں قدم رکھا ان کا نام سردار اللہ بخش خداداد خان گبول نے اپنی محنت اور قابلیت سے اپنی ساکھ بنائی اور مالی خوشحالی حاصل کی انہوں نے کراچی میں متعدد مکانات اور جائیدادیں اور مضافات میں زرعی اراضی خریدی۔ (۲)

اللہ بخش گبول ۱۵/اگست ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے انہوں نے سندھ مدرسۃ الاسلام میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۲۲ء میں کراچی تعلقہ لوکل بورڈ سے سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ ۱۹۲۵ء میں اس بورڈ کے صدر منتخب کیے گئے (۳)

جی ایم سید نے لکھا ہے کہ انہیں بچپن ہی سے افسروں اور حکومتی کارندوں کے ساتھ راہ و رسم رکھنے اور جوڑ توڑ کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ وہ جلد ہی کلکٹر کراچی مسٹر گبن کے منظور نظر بن گئے۔ جس کی وجہ سے ۱۹۲۷ء میں وہ سیکنڈ کلاس آنریری مجسٹریٹ اور اسی برس کراچی کے میونسپل کونسلر بن گئے۔ ۱۹۳۸ء میں وہ ضلع لوکل بورڈ کراچی کے نائب صدر اور ۱۹۳۳ء میں صدر منتخب کیے گئے اور اسی دوران انہوں نے خان صاحب اور خان بہادر کے خطابات حاصل کیے۔ جی ایم سید نے مزید لکھا ہے کہ اس کے باوجود کہ وہ انگریزی سے نابلد تھے' کلکٹر کراچی' مسٹر گبن نے انہیں بمبئی کونسل میں جمشید نصروانجی کے ساتھ کراچی میونسپل کارپوریشن بل پاس کرنے کیلئے قانونی ماہر کے طور پر نامزد کیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں جب کراچی میں شاتم رسول نتھورام کو قتل کرنے کے الزام میں غازی عبدالقیوم کو پھانسی کی سزا ملی تو حکومت نے اسے خاموشی سے میوہ شاہ کے قبرستان میں دفن کرنا چاہا جبکہ عوام اس کے جنازے کو جلوس کی شکل میں لے جانا چاہتے تھے۔ حکومت نے اس جلوس کو روکنے کیلئے لاٹھی چارج اور گولی چلانے کا حکم دیا۔ یہ حکم جن مجسٹریٹوں نے دیا ان میں سے ایک مجسٹریٹ اللہ بخش گبول تھے۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں سو سے زیادہ افراد شہید ہوئے اس واقعے کے بعد عوام اللہ بخش گبول سے

اتنے متنفر ہو گئے کہ انہیں شہر سے نقل مکانی کرنی پڑی۔ جی ایم سید نے لکھا ہے کہ اللہ بخش گبول کی قسمت اتنی اچھی تھی یا پھر عوام کا سیاسی شعور اور ان کی یادداشت اتنی کم زور تھی کہ دو ہی برس اور وہ اپنے سابقہ علاقے سے نہ صرف سندھ اسمبلی کے رکن منتخب کر لیے گئے بلکہ اس کے ڈپٹی اسپیکر اور چیف پارلیمانی سکریٹری کے عہدے پر بھی فائز رہے (۴)

خان بہادر اللہ بخش خداداد خان گبول کراچی کے ڈپٹی میئر بھی رہے اور پندرہ برس تک اعزازی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ کراچی پورٹ حج کمیٹی، گوروھن داس موتی لال موہٹہ آئی ہسپتال، سول ہسپتال کراچی، لیڈی ڈفرن ہسپتال، کراچی ریس کورس، کراچی کلب، فری میسن لاج اور اسی نوع کے لاتعداد دوسرے اداروں کے اہم منصب پر سالہا سال فائز رہے ۱۹۵۹ء میں ایوب خان کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد وہ حکومت مغربی پاکستان کے مشیر بھی بنائے گئے (۵)

جی ایم سید نے لکھا ہے وہ ایک خوش مزاج، کھلے ہاتھ اور کھلے دل کے مالک تھے۔ ان کی نظر ہمیشہ اس ہدف پر رہی کہ زندگی میں کیا فائدہ کہاں سے اور کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ نظریات اور اصولوں کے جھنجٹ میں نہیں پڑتے تھے اور زندگی کو اپنی شرائط پر بسر کرتے تھے (۶)

انہی اللہ بخش خداداد خان گبول کے صاجبزادے عبدالستار گبول تھے۔ وہ ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں این ڈبلیو ۱۳۰ کراچی ۳ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۷) ۱۹۷۲ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے قیام کے بعد وہ پہلے گورنر سندھ کے مشیر اور پھر سندھ کی صوبائی کابینہ میں صحت، محنت اور سماجی بہبود کے وزیر بنائے گئے (۸) ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ تاہم اس مرتبہ انہیں صوبے کی بجائے مرکز میں وزیر بنایا گیا ان کے پاس افرادی وسائل اور محنت کا قلم دان تھا (۹) ۲۳ رجولائی ۲۰۰۶ء کو ان کا انتقال ہوگیا (۱۰)

اللہ بخش خداداد خان گبول کے ایک اور قریبی عزیز محمد علی گبول تھے جو ۱۹۷۰ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۱)

اللہ بخش خداداد خان گبول کے پوتے اور عبدالستار گبول کے بھتیجے نبیل احمد گبول (پ: ۱۹۵۶ء) ہیں۔ انکے والد کا نام احمد اللہ بخش گبول ہے جو ایوب خان کے دور حکومت میں بی ڈی ممبر منتخب ہوئے تھے۔ نبیل احمد گبول نے ۱۹۸۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۸۸ء میں پہلی مرتبہ پی ایس ۸۵ کراچی نارتھ ا سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں وہ دوسری مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس مرتبہ پاکستان پیپلز پارٹی نے انہیں سندھ اسمبلی کا ڈپٹی اسپیکر بھی منتخب کیا (۱۲)

۱۹۹۷ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر اسی نشست پر انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ اس نشست پر

پاکستان پیپلز پارٹی (شہید زیدا اے بھٹو گروپ) نے حنیف پٹیل کا اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔

یوں پاکستان پیپلز پارٹی کے حامیوں کے ووٹ آپس میں تقسیم ہو جانے کے باعث اس حلقے سے ایم کیو ایم کے امیدوار لیاقت علی قریشی، سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۱۳)

۲۰۰۲ء میں نبیل احمد گبول نے صوبائی اسمبلی کی بجائے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کا حلقہ انتخاب تھا این اے ۲۴۸ کراچی ۱۰۔ نبیل احمد گبول، یہ انتخاب بھاری اکثریت سے جیت گئے اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۱۴)

خان بہادر اللہ بخش خداداد خان گبول کے نواسے اور نبیل احمد گبول کے پھوپھی زاد بھائی فیصل گبول ہیں۔ جن کی صاحبزادی فائزہ گبول متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین کی اہلیہ ہیں (۱۵) فیصل گبول، ۲۰۰۳ء میں سندھ کے وزیر اعلیٰ ارباب غلام رحیم کے مشیر صحت کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ وہ ان تین مشیران میں شامل تھے جنہیں وزیر کا درجہ حاصل تھا۔ فیصل گبول اپنے اس عہدے پر ۳۰/ستمبر ۲۰۰۵ء تک فائز رہے تھے (۱۶)

حوالہ جات

۱۔ شیخ صادق علی شیر علی انصاری۔ اے شارٹ اسکیچ، ہسٹاریکل اینڈ ٹریڈیشنل آف دی مسلمان۔ ریسز فاؤنڈ ان سندھ، بلوچستان اینڈ افغانستان۔ کراچی۔ ص ۱۸، ۱۹

۲۔ جی ایم سید۔ میرے دوست میرے ساتھی (ترجمہ جب گزار یم جن سین از نسرین انجم بھٹی)۔ لاہور ص ۴۰۶

۳۔ سر مونٹیگو ڈی بی ویب۔ دی کراچی ہواز ہو اینڈ وہائی (۳۲-۱۹۳۱ء)۔ کراچی۔ ص ۳۴

۴۔ جی ایم سید۔ میرے دوست میرے ساتھی، لاہور۔ ص ۴۰۶، ۴۰۷

۵۔ ادارہ۔ کچھ غیر معمولی سابق طلباء۔ مضمون مشمولہ دی پلاٹینیم جوبلی بک، سندھ مدرسۃ الاسلام۔ کراچی۔ ص ۶

۶۔ جی ایم سید۔ میرے دوست مرے ساتھی۔ لاہور۔ ص ۴۰۷، ۴۰۸

۷۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۶۵

۸۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ کراچی۔ ص ۱۱، ۱۲

۹۔ الیکشن ان پاکستان (حصہ اول)۔ کراچی۔ ص ۴۸۷

۱۰۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۲۴/جولائی ۲۰۰۶ء

۱۱۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ کراچی ص ۱۱۶

۱۲۔ محمد مرزا۔ انٹروڈیوسنگ اُوور سپیس۔ نبیل گبول۔ ہفت روزہ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۲۰ تا ۲۶ جنوری ۱۹۹۴ء۔ ص ۸

۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۵۱۸
۱۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء۔ ص ۲۹۷۳
۱۵۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳۱/جنوری ۲۰۰۱ء
۱۶۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ یکم اکتوبر ۲۰۰۵ء

لوند

لوند بلوچوں کے مشہور قبیلے ٹومبکی کی ایک شاخ ہے۔ (۱) یہ دو تمنوں میں منقسم ہے سوری لوند اور ٹبی لوند۔ یہ دونوں ڈیرہ غازی خان کے علاقے میں آباد ہیں اور ان دونوں کا دعوٰی ہے کہ یہ علی ابن ریحان کی اولاد ہیں جو میر چاکر کا بھتیجا تھا۔ سوری ایک بڑا قبیلہ ہے جو میدانی علاقوں میں آباد ہے اور ان کا مرکزی مقام کوٹ کنڈی والا ہے۔ اس قبیلے میں ایک گرچانی پاڑہ بھی شامل ہے۔ ٹبی لوند چھوٹا قبیلہ ہے اور اس میں لونڈوں اور کھوسوں کا ایک پاڑہ شامل ہے۔(۲)

سیاست کے میدان میں لوند قبیلہ نے صوبہ سندھ سے نام کمایا۔ سردار احمد خان لوند اول اس قبیلے کے پہلے سردار تھے جنہوں نے انگریزوں سے روابط بڑھائے اور انگریزوں نے انہیں ایک اعزازی سند سے نوازا۔ سردار احمد خان لوند اول کے صاحبزادے سردار داون خان لوند نے "خان صاحب" کا خطاب حاصل کیا (۳)۔ وہ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے قوم پرست گروپ کی جانب سے، جس کی قیادت خان بہادر مولا بخش سومرو کے ہاتھ میں تھی، سکھر شمال مشرقی سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۴) وہ اعزازی مجسٹریٹ بھی رہ چکے تھے اور انہیں بمبئی پریذیڈنسی نے سند اور محکمہ پولیس نے تلوار اور لنگی کا اعزاز عطا کیا تھا۔ انہوں نے پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۹ء میں وفات پائی (۵)

ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے سردار احمد خان قبیلے کے سردار بنے۔ وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے رکن اور صدر، جسٹس آف پیس، ضلعی جرگہ کے رکن اور یونین کونسل کے رکن رہے۔ (۶) تاہم ان سے زیادہ شہرت ان کے چھوٹے بھائی سردار نور محمد خاں لوند نے کمائی۔ وہ پاکستان کے واحد سیاستدان ہیں جو ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۳ء تک قومی اسمبلی کے ہر انتخاب میں کامیاب ہوئے ہیں۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء میں انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ بعد میں وہ مسلم لیگ

میں چلے گئے۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے غیر جماعتی انتخاب میں حصہ لیا اور این اے ۱۵۳ سکھر ۳ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۸ء میں وہ دوبارہ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور اس کے ٹکٹ پر آئی جے آئی کے احمد یار خان کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۷)۔ ۱۹۹۰ء میں بھی انہوں نے پی ڈی اے کے ٹکٹ پر اسی نشست سے انتخاب میں حصہ لیا اور قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب حاصل کی (۸)۔ ۱۹۹۳ء میں بھی وہ اسی حلقہ سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے اس مرتبہ بھی انہیں کوئی شکست نہ دے سکا (۹) اور یوں وہ مسلسل چھٹی مرتبہ قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۵ء کو سردار نور محمد خاں لوند کا انتقال ہو گیا (۱۰)

عمر کے آخری کئی برس سردار نور محمد خاں لوند اور درگاہ بھرچونڈوی کے میاں عبدالحق المعروف میاں مٹھو کے مابین شدید نوعیت کا تنازع چلتا رہا جس میں کئی افراد لقمہ اجل بنے۔ ان افراد میں سردار نور محمد خاں لوند کا ایک صاحبزادہ بھی شامل تھا۔ سردار لوند اور میاں مٹھو ماضی میں ایک ہی کیمپ میں شامل ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے (۱۱)

سردار نور محمد خاں لوند کی وفات کے بعد جب اس نشست پر ضمنی انتخابات منعقد ہوئے تو ان کے صاحبزادے میر خالد خاں لوند بلا مقابلہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہو گئے۔ میر خالد خاں لوند ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن بنے (۱۲) ۲۰۰۲ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹیرینز کے ٹکٹ پر تیسری مرتبہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے انتخابات کے بعد وہ پاکستان پیپلز پارٹی پیٹریاٹس میں شامل ہو گئے جس کے صلہ میں انہیں میر ظفر اللہ جمالی کی کابینہ میں پانی اور بجلی کا وزیر مملکت بنا دیا گیا (۱۳) تاہم جب شوکت عزیز نے اپنی کابینہ تشکیل دی تو اس میں میر خالد خان لوند کا نام شامل نہیں تھا (۱۴)۔

لوند قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک اور فرد جو عملی سیاست میں نمایاں رہے۔ رئیس عطا محمد لوند تھے۔ ان کا تعلق خیر پور سے تھا۔ وہ ۱۹۶۳ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ اسمبلی میں ون یونٹ کے خلاف اور سندھ کے حقوق کے لئے آواز بلند کرتے رہے اور اسی لئے قوم پرستوں کے خاصے قریب آ گئے (۱۵)

۱۹۶۸ء کی جمہوری تحریک میں انہوں نے حزب اختلاف کا ساتھ دیا اور ایوب خان کی آمریت کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل انہوں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی پیپلز پارٹی نے انہیں ٹکٹ بھی عطا کر دیا تھا مگر انہوں نے اس بنا پر ٹکٹ لینے سے انکار کر دیا کہ جن جن افراد کو ٹکٹ دیئے گئے ہیں وہ سب کے سب ایوبی آمریت کی یادگاریں ہیں۔ (۱۶)

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات حاجی عطا محمد لوند نے پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار پیر سید عبدالقادر شاہ پیر آف رانی پور کے مقابلے میں قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر تقریباً ایک لاکھ سے زیادہ

ووٹوں کی اکثریت سے شکست کھا گئے (۱۷)۔ اس کے بعد ان کا نام کسی انتخابی سرگرمی میں نظر نہیں آیا۔

حوالہ جات

۱۔ شیخ صادق علی شیر علی انصاری، دی مسلمان ریسز فاؤنڈ ان سندھ، بلوچستان اینڈ افغانستان۔ کراچی۔ص۔ ۱۹،۱۸

۲۔ ایم لونگ ورتھ ڈیمز۔ بلوچ قبائل۔ ترجمہ کامل القادری۔ کوئٹہ۔ ص ۸۸

۳۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ۷۰۔۱۹۶۹ء ایڈیشن۔ لاہور۔ ص ۴۹۶

۴۔ ولی مظہر ایڈووکیٹ۔ عظیم قائد عظیم تحریک۔ جلد اوّل۔ ملتان۔ ص ۴۲۰

۵۔ تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان ۷۰۔۱۹۶۹ء ایڈیشن۔ لاہور۔ ص۔ ۴۹۷،۴۹۶

۶۔ ایضاً۔ ص۔ ۴۹۷

۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۳۵

۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء رپورٹ جلد دوم۔ ص ۷۰

۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۰۰

۱۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۶/اگست ۱۹۹۵ء

۱۱۔ سعید خاور۔ ضلع سکھر کا انتخابی معرکہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۱ء ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۲۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء (جلد اوّل)۔ لاہور۔ ص۔ ۱۷۳

۱۳۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ ص ۳۵

۱۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۵/ستمبر ۲۰۰۴ء

۱۵۔ جی ایم سید۔ کچھ خطوط۔ حیدر آباد۔ ص۔ ۶۱۵،۶۱۴

۱۶۔ الطاف حسن قریشی۔ بلوچستان اور سندھ کا انتخابی جائزہ۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۲۳/تا ۲۹/نومبر ۱۹۹۳ء ص ۱۲

۱۷۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۲۸۴

ٹیاری کے شاہ

جنوری ۱۹۴۶ء میں جب ہندوستان کی دوسری اسمبلیوں کی طرح سندھ اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے تو اگرچہ اس انتخاب میں مسلم لیگ اکثریتی پارٹی کے طور پر ابھری۔ مگر اس کے ارکان کی تعداد اسمبلی کے کل ارکان کی تعداد کا نصف تھے' اس لئے سر غلام حسین ہدایت اللہ نے جو وزارت تشکیل دی وہ بڑی کمزور وزارت تھی۔

اس وزارت کو بچانے کے لئے ایک مرتبہ تو گورنر نے رمضان شریف کا سہارا لے کر اس کا اجلاس ہی نہیں بلایا اور دوسری مرتبہ اسمبلی کے اسپیکر نے اپنا استعفیٰ پیش کر کے مسلم لیگ کی وزارت کو بچالیا۔ سندھ اسمبلی کے یہ اسپیکر' جنہوں نے اپنا استعفیٰ دے کر مسلم لیگ کی وزارت کو بچایا تھا' سید میران محمد شاہ تھے۔ (۱)

میران محمد شاہ کا تعلق سادات ٹیاری کی منعمائی شاخ سے تھا جو ضلع حیدر آباد کے تعلقہ ٹنڈو محمد خان کے قصبے ٹکڑ کے رہنے والے تھے۔

ٹکڑ کا قصبہ میران محمد شاہ کے جدامجد سید عبدالحکیم شاہ شہید کے بھائی سید شمیر شاہ نے آباد کیا تھا۔ سید عبدالحکیم شاہ کے دو بیٹے تھے جن کے نام سید بادو شاہ اور سید قاسم شاہ تھے۔ سید قاسم شاہ' سید میران محمد شاہ کے دادا' سید حافظ میران محمد شاہ کے دادا تھے۔

سید میران محمد شاہ ٹکڑ میں ۱۹ر مارچ ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے کراچی کے سندھ مدرسہ سے میٹرک اور ڈی جے سائنس کالج سے گریجویشن کیا اور پھر بمبئی کے گورنمنٹ لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کر کے ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد میں وکالت کا آغاز کیا۔

اسی برس انہوں نے جی ایم سید کی منعقد کردہ ٹیاری سادات کانفرنس میں شرکت کی اور اس کے بعد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ حیدر آباد کے جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔

۱۹۲۵ء میں انہیں حیدر آباد میونسپلٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں وہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں وہ حیدر آباد ضلعی لوکل بورڈ کے

صدر بنے۔

کچھ عرصہ بعد بمبئی صوبے کی طرف سے سائمن کمیشن کی امداد کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ شاہ صاحب اس کمیٹی کے رکن بھی بنے۔ جب اس کمیٹی کے سامنے سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کا مسئلہ پیش ہوا تو سر شاہنواز بھٹو نے سندھ کو بمبئی سے جدا کرنے کے خلاف ووٹ دیا، لیکن میران محمد شاہ نے اختلافی نوٹ لکھا اور سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے پر زور دیا۔ میران محمد شاہ اور ان کے ساتھیوں کی کوششیں کامیاب رہیں اور ۱۹۳۶ء میں سندھ بمبئی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس وقت تک میران محمد شاہ بمبئی کونسل کے رکن رہے لیکن جب ۱۹۳۷ء میں سندھ اسمبلی کا انتخاب منعقد ہوا تو میران محمد شاہ حیدر آباد شہر اور تعلقہ سے نور محمد وکیل اور میرزا سکندر بیگ کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔

میران محمد شاہ نے کچھ عرصہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت میں پارلیمانی سیکرٹری کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۳۸ء میں جب اسمبلی کے اسپیکر دیوان بھوج سنگھ نے وفات پائی تو میران محمد شاہ ان کی جگہ پر اسمبلی کے اسپیکر منتخب ہوئے تو میران محمد شاہ ایک مرتبہ پھر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔

قیام پاکستان کے بعد میران محمد شاہ متعدد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک وہ سندھ کے صوبائی وزیر بنے۔ ۱۹۵۲ء میں انہیں اسپین میں پاکستان کا سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ لیکن اسی برس جب سفارتوں پر سیاسی رہنماؤں کی تقرری ختم کر دی گئی تو انہیں واپس بلا کر کراچی امپروومنٹ ٹرسٹ کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا۔ وہ ۱۹۵۷ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔

میران محمد شاہ کا ایک بڑا کارنامہ سندھی زبان و ادب کے فروغ کے لئے سندھی بورڈ کا قیام تھا۔ یہ ادارہ ۱۹۴۰ء میں قائم ہوا اور ۱۹۵۲ء تک شاہ صاحب ہی اس ادارے کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۵۲ء میں اس ادارے کا نام بدل کر سندھی ادبی بورڈ رکھ دیا گیا۔ میران محمد شاہ کو شاعری سے بھی شغف تھا اور وہ میر اور مجبور تخلص کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے ۱۹ر نومبر ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔

میران محمد شاہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ مگر بد قسمتی سے ان کا بیٹا سید قبول شاہ جوانی ہی میں فوت ہو گیا۔ میران محمد شاہ کی صاحبزادیوں کی شادیاں ان کے بھائی سید محمد قاسم شاہ کے صاحبزادوں حاجی غلام احمد شاہ اور سید قمر زماں شاہ سے ہوئیں۔ (۲) قمر الزماں شاہ نے آگے چل کر سیاست کے میدان میں نام پایا۔

سید قمر الزماں شاہ نے اپنی سیاست کا آغاز ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کی رکنیت سے کیا۔ بعد ازاں وہ ۱۹۶۵ء کی اسمبلی کے بھی رکن منتخب ہوئے۔ (۳) ۱۹۷۳ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پاکستان کی پہلی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ اس عہدے پر وہ ۴ر جولائی ۱۹۷۷ء تک

فائز رہے۔ (۴)

پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کے بعد سید قمر الزماں شاہ کا نام بالکل پس منظر میں چلا گیا۔ تاہم ان کا نام اس وقت اخبارات کی سرخیوں کی زینت بنا۔ جب ۱۲ فروری ۱۹۸۸ء کو ان کے بیٹے نوید قمر الزماں کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا۔ اغوا کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو اور سندھ کے وزیر اعلیٰ غوث علی شاہ نے قمر الزماں شاہ سے فون پر بات کی اور ان کے صاحبزادے کی جلد بازیابی کی یقین دہانی کروائی۔ پیپلز پارٹی سندھ کے صدر قائم علی شاہ نے نوید قمر کے اغوا پر مذمتی بیان جاری کیا۔

نوید قمر تقریباً ۲۱ روز بعد ۳ اور ۴ مارچ کی درمیانی شب ڈرامائی طور پر اپنے گھر واپس پہنچ گئے۔ اغوا کرنے والوں نے انہیں اور ان کے ڈرائیور کو جی او آر کالونی کے نزدیک لا کر چھوڑ دیا۔ ''عبرت'' نے لکھا کہ نوید قمر اس بات سے بے خبر ہیں کہ انہیں کس نے اغوا کیا اور اغوا کرنے والوں کا مقصد کیا تھا۔ وہ ملزمان کے گروہ یا نام سے بھی واقف نہیں اور نہ ہی یہ جانتے ہیں کہ ان کی بازیابی میں فیصلہ کن کردار کس نے ادا کیا ہے۔ تاوان نے، حکومت نے یا بااثر افراد کی کوششوں نے یا خود ان کی سیادت نے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ڈاکوؤں نے ان کی قیمتی اور سندھ میں اپنی نوعیت کی پہلی مرسیڈیز جیپ واپس نہیں کی ہے (۵)۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں سید نوید قمر کو پاکستان پیپلز پارٹی نے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ عطا کیا۔ انہوں نے پی ایس ۴۷ حیدر آباد ۳ سے انتخاب لڑا اور سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور صوبائی کابینہ میں وزیر اطلاعات کے منصب پر فائز ہوئے (۶)۔

۱۹۹۰ء میں پیپلز پارٹی نے سید نوید قمر کو قومی اسمبلی کا ٹکٹ عطا کیا۔ ان کا حلقہ تھا این اے ۷۰ حیدر آباد ۴۔ سید نوید قمر یہ انتخاب بھی بآسانی جیت گئے۔ انہوں نے کاسٹ کئے جانے والے ووٹوں کے ۸۶ء۷۶ فیصد ووٹ حاصل کئے تھے (۷)۔

۱۹۹۳ء میں بھی پیپلز پارٹی نے انہیں اسی حلقے سے امیدوار نامزد کیا اور اس مرتبہ بھی وہ یہ انتخاب بآسانی جیت گئے انہوں نے ۴۶۸۰۸ ووٹ حاصل کیے جبکہ ان کے مدمقابل میر حیدر علی خان تالپور جو میر علی احمد تالپور کے صاحبزادے ہیں اور پی ایم ایل (این) کے امیدوار تھے فقط ۱۶٬۷۲۰ ووٹ بھی حاصل کر سکے (۸) انتخابات کے بعد سید نوید قمر کو نج کاری کمیشن کا چیئرمین اور پھر نج کاری کا وزیر بنایا گیا۔ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے (۹) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ چوتھی مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ہیں (۱۰)

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۳۸۷

۲۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ جلد اوّل حیدر آباد۔ ص ۲۵۰ تا ۲۵۵

۳۔ افتخار احمد۔ پاکستان جنرل الیکشنز ۱۹۷۰ء۔ لاہور۔ ص۔۱۲۳'۱۲۶

۴۔ پارلیمینٹ ہاؤس، اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان، ڈائرکٹری آف ممبرز۔ جنوری ۱۹۹۱ء ص۔ ۱۳۱'۱۳۷

۵۔ ظہیر احمد (مدیر اعلیٰ)۔نوید قمر الزماں اور فیصل کا چھیلو کس طرح اغوا ہوئے۔ ماہنامہ تحریر و تصویر۔ حیدر آباد جون، جولائی ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۰

۶۔ ارشاد امین۔ پارلیمینٹ بک ۱۹۹۷ء۔ (جلد اوّل)۔ لاہور۔ص۔۱۹۰

۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰۔جلد دوم۔ ص ۷۷

۸۔ گزٹ آف پاکستان۔۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۳۰۷

۹۔ ارشاد امین۔ پارلیمینٹ بک ۹۷ء۔ لاہور۔ص ۱۹۰

۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ص ۷۹

مخدوم

سندھ کے روحانی خاندانوں میں ایک بڑا محترم خاندان حضرت لطف اللہ مخدوم نوح صدیقی سہروردی رحمتہ اللہ علیہ کا خاندان ہے۔ اس خاندان کے موجودہ سربراہ مخدوم محمد امین فہیم ہیں جو حضرت مخدوم نوحؒ کے سترہویں سجادہ نشین اور سروری جماعت کے سربراہ ہیں۔ مخدوم محمد امین فہیم کی گدی پیرپاگارہ کے بعد سندھ کی سب سے بڑی گدی سمجھی جاتی ہے۔(ا)

اعجازالحق قدوسی اپنی کتاب تذکرہ صوفیائے سندھ میں لکھتے ہیں:

آپ کا اسم گرامی لطف اللہ اور لقب مخدوم نوح تھا۔ آپ کے والد کا اسم گرامی نعمت اللہ اور والدہ کا نام بی بی راجی تھا۔ جو قبیلہ لاکھا سے تھیں۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ مخدوم نوح بن مخدوم نعمت اللہ ابن مخدوم اسحاق ابن مخدوم شہاب الدین ابن مخدوم سرور ابن مخدوم فخر الدین صغیر۔ آخر میں آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔

آپ کے جد اعلیٰ شیخ ابوبکر کتابی، شیخ احمد، شیخ محمد، شیخ علی معروف قاضی اور شیخ جلال الدین یہ پانچ حضرات سب سے پہلے آکر کوٹ کرور (حدود ملتان) میں آباد ہوئے۔

شیخ ابوبکر کتابی اپنے وقت کے عظیم المرتبت صوفی اور درویش تھے۔ آپ عوام و خواص میں شیخ شمس الدین کوٹ کروری سے مشہور ہوئے اور کوٹ کرور ہی میں وفات پائی۔

شیخ ابوبکر کتابی کے صاحبزادے مخدوم فخر الدین کبیر اتفاق سے سیرو سیاحت کی غرض سے سیوستان کے قرب و جوار میں تشریف لائے اور آب و دوانے کی کشش نے سندھ کو آپ کا وطن بنا دیا۔ مشہور یہ ہے کہ ابتدا" آپ نے اور آپ کے متعلقین نے اپنا وطن قصبہ بوبک کو بنایا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے بوبک ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ آپ سیوستان میں حضرت شہباز قلندر کے قرب و جوار میں مدفون ہوئے۔

اسی طرح حضرت مخدوم نوح کے جد مخدوم فخر الدین صغیر ایک دفعہ بطور سیرو سیاحت ہالہ کندی تشریف لائے۔ اہل ہالہ کندی نے انتہائی عزت و احترام کے ساتھ آپ کی خدمت اور

میزبانی کا شرف حاصل کیا اور لجاجت کے ساتھ تمنا ظاہر کی کہ اگر آپ ہالہ کندی کو اپنا وطن بنا لیں تو ہم سب کی خوش نصیبی ہو گی۔ آپ خاموش رہے یہاں تک کہ آپ کی روانگی کی تاریخ آ گئی۔ آپ کے ساتھیوں نے رخت سفر باندھا تو پھر اہل ہالہ نے دوبارہ اپنی تمنا ظاہر کی' آپ نے فرمایا کہ وہاں میرے رفقا اور وابستگان بے شمار ہیں۔ اہل ہالہ نے عرض کیا کہ اہل ہالہ بھی جو یہاں آپ کے توطن کی تمنا رکھتے ہیں' بے شمار ہیں۔ آپ نے اہل ہالہ کے اصرار پر ہالہ میں سکونت اختیار فرمائی اور اہل ہالہ بھی شب و روز جان و مال سے آپ کی خدمت میں مصروف ہو گئے پھر آپ تمام عمر ہالہ ہی میں مقیم رہے اور وہیں وفات پائی۔ (۲)

انہی فخر الدین صغیر کی پانچویں پشت میں حضرت مخدوم لطف اللہ عرف سرور شاہ پیدا ہوئے۔ جو اپنے لقب اور توطن مخدوم نوح ہالائیؒ سے معروف ہوئے۔ آپ ۹۱۱ھ مطابق ۱۵۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ اور آپ نے ۹۹۸ھ مطابق ۱۵۹۰ء میں وفات پائی۔ (۳)

یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ پر ارغون خاندان کی حکومت تھی۔ اسی زمانے میں ہمایوں بھی سندھ سے گزرا اور اسی زمانے میں عمر کوٹ کے مقام پر اکبر کی پیدائش ہوئی۔ یہ زمانہ مسلمانان سندھ کے انحطاط کا زمانہ تھا۔ حضرت مخدوم نوح ہالائیؒ نے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھا۔ ان کے کارنامے سندھی کی قدیم تصانیف حدیقیہ الاولیا' ارشاد الطالبین' دلیل الذاکرین اور رسالہ فتوحات سندھی عرف رسالہ فتحی میں تفصیل سے رقم ہوئے ہیں۔ حضرت مخدوم نوح ہالائی کا فیض سروری سہروردی جماعت کی شکل میں مسلسل جاری رہا اور ایک روایت کے مطابق اس جماعت کے وابستگان کی تعداد ہر زمانے میں نو لاکھ رہی جس کے بعد اس گدی کو "نو لکھی گدی" کہا جانے لگا۔ سروری جماعت سے وابستہ افراد سندھ ہی میں نہیں بلکہ شمال میں بہاولپور' ملتان اور بلوچستان تک اور جنوب میں کچھ' کاٹھیاواڑ اور گجرات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ (۴)

مخدوم نوح ہالائی کے بارہویں سجادہ نشین حضرت مخدوم امین محمد ثالث تھے۔ وہ ۲۷ر اکتوبر ۱۸۳۸ء کو پیدا ہوئے اور انہوں نے ۲۹ر جون ۱۸۸۶ء کو وفات پائی ابتدا میں انہیں شعر و شاعری' موسیقی اور شکار وغیرہ سے بڑا شغف تھا مگر انہوں نے عمر کا آخری حصہ چلہ کشی میں بسر کیا۔

حضرت مخدوم امین محمد ثالث کے دو بیٹے تھے جو یکے بعد دیگرے سجادہ نشین ہوئے۔ بڑے بیٹے کا نام مخدوم میاں محمد زماں تھا۔ ان کا انتقال ۲ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو ہوا۔ چونکہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ان کے بعد ان کے بھائی مخدوم میاں ظہیر الدین سجادہ نشین ہوئے۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۲۸ کو مخدوم میاں ظہیر الدین کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مخدوم میاں غلام محمد سجادہ نشین ہوئے۔ مخدوم میاں غلام محمد کے چھوٹے بھائی مخدوم میاں غلام حیدر اس خاندان کے پہلے فرد تھے جو عملی سیاست میں داخل ہوئے وہ ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ اور ۱۹۴۶ء میں دوسری مرتبہ

سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ مخدوم میاں غلام حیدر نہ صرف عربی اور فارسی کے عالم تھے بلکہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل بھی تھے۔

اسی دوران ۲۸ر اپریل ۱۹۴۳ء کو مخدوم میاں غلام محمد وفات پا گئے اور ان کی وفات کے بعد مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ مخدوم نوح ہالائی کی درگاہ کے سجادہ نشین ہوئے۔ مخدوم محمد زماں ۲۶ر ستمبر ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ والد کی وفات کے وقت ان کی عمر فقط ۲۴ برس تھی اس لئے ان کی گدی کے امور زیادہ تر ان کے چچا مخدوم میاں غلام حیدر ہی سنبھالتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں مخدوم میاں غلام حیدر بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اب مخدوم محمد زمان نے نہ صرف تن تنہا اپنی گدی کا انتظام سنبھالا بلکہ اپنے چچا کے بعد ان کی سیاسی وراثت بھی سنبھال لی۔ (۵)

۱۹۵۳ء میں وہ پہلی مرتبہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں وہ قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ (۶) ۱۹۶۶ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کی کابینہ سے استعفیٰ دے کر اپنے سیاسی سفر کا آغاز کیا تو مخدوم محمد زماں اس سفر میں ان کے ہم رکاب تھے۔ ۱۹۶۷ء میں بھٹو نے جب پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تو سندھ میں ان کا اولین مرکز' مخدوم صاحب کا بنگلہ بنا' جو ہالہ میں ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو پارٹی کے چیئرمین اور مخدوم محمد زماں سینئر وائس چیئرمین بنے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابی معرکے میں پاکستان پیپلز پارٹی کو سندھ میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس کا تمام تر سہرا مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ کے سر تھا۔ ان انتخاب میں نہ صرف وہ خود قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے بلکہ ان کے بڑے صاحبزادے مخدوم امین فہیم بھی بدین سے بھٹو کی خالی کردہ نشست پر ضمنی انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ مخدوم محمد زماں بعد ازاں ۱۹۷۷ء میں بھی قومی اسمبلی کا انتخاب جیتنے میں کامیاب رہے۔

مخدوم طالب المولیٰ ایک وضع دار اور با اصول انسان تھے۔ بھٹو کے دور حکومت میں انہوں نے بھٹو کی پالیسیوں سے کئی مرتبہ اختلاف بھی کیا اور کئی مرتبہ ان سے ناراض بھی ہوئے مگر انہوں نے کبھی پیپلز پارٹی سے علیحدگی اختیار نہ کی۔ پیپلز پارٹی سے ان کا یہ تعلق ان کی وفات (۱۱ر جنوری ۱۹۹۳ء) تک جاری رہا۔ (۷)

مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ کی وفات کے بعد ان کا ورثہ ان کے صاحبزادے مخدوم امین فہیم کو منتقل ہوا۔ محمد امین فہیم نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز ۱۹۷۰ء میں قومی اسمبلی کی رکنیت سے کیا۔ بعد ازاں وہ کچھ عرصہ گورنر سندھ کے مشیر رہے اور پھر مرکز میں وزیر مملکت کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں مخدوم محمد امین فہیم نے سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب

رہے۔ بعد ازاں وہ غلام مصطفیٰ جتوئی کی کابینہ میں ریونیو اور آباد کاری کے وزیر بن گئے۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دور میں ان کا پورا خاندان پیپلزپارٹی میں شامل رہا اور وہ نامساعد حالات کے باوجود پارٹی چلاتے رہے۔ ۱۹۸۳ء میں جب ایم آر ڈی کی تحریک چلی تو ان دنوں مخدوم امین فہیم سندھ پیپلزپارٹی کے صدر تھے۔ ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں مخدوم صاحب نے حصہ نہیں لیا اور انہوں نے پارٹی کی ہدایت پر ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔

۱۹۸۸ء میں مخدوم امین فہیم نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا اور دونوں ہی مین کامیاب ہوئے۔ بعد ازاں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی اور صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کردی۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات کے بعد جب محترمہ بے نظیر بھٹو نے مرکز میں اپنی کابینہ تشکیل دی تو مخدوم امین فہیم اس کابینہ میں شامل تھے۔ انہیں مواصلات کا قلمدان سونپا گیا تھا۔ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۰ء تک مخدوم امین فہیم اسی عہدے پر فائز رہے۔ ان کے بارے میں کئی مرتبہ افواہیں اڑیں کی وہ آئی جے آئی کی ایما پر پیپلزپارٹی میں اپنا گروپ تشکیل دے رہے ہیں۔ وزیراعظم بننے کے متمنی ہیں۔ مگر یہ افواہیں' افواہیں ہی رہیں۔ (۸)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں مخدوم محمد امین فہیم نے فقط قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۹)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے مخدوم امین فہیم کو ان کے روایتی حلقوں این اے ۱۶۷ حیدر آباد اور پی ایس ۳۵ حیدر آباد سے علی الترتیب قومی اور صوبائی اسمبلی کا رکن نامزد کیا تھا۔ مخدوم امین فہیم ان دونوں حلقوں سے بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ (۱۰) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں مخدوم امین فہیم واحد امیدوار تھے جو پورے پاکستان میں بلا مقابلہ قومی وصوبائی نشست سے کامیاب ہوئے ان کی اس کامیابی میں پیر پگارا کا بڑا حصہ تھا کہ جن کی ہدایت پر مسلم لیگ کے امیدوار نے مخدوم امین فہیم کی نشست سے دستبردار ہو کر ان کو بلا مقابلہ کامیابی سے ہمکنار کیا۔ پیپلز پارٹی کے لئے عام انتخابات کے پہلے مرحلہ پر مخدوم امین فہیم کی کامیابی تقویت کا باعث تھی لیکن محترمہ بینظیر بھٹو کے نزدیک یہ ایک خطرہ کا الارم تھی اس دوران مخدوم امین فہیم کے وزارت عظمیٰ کے لئے افواہیں سرگرم ہوئیں لیکن مخدوم امین فہیم نے سختی سے ان افواہوں کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ وزارت عظمیٰ کے لئے پارٹی کی واحد امیدوار محترمہ بینظیر بھٹو ہیں جبکہ وہ صوبہ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مخدوم امین فہیم اس وفاقی بیان کے ذریعے خود کو وفاقی سیاست سے الگ کر کے صوبائی وزارت اعلیٰ کے امیدوار کے طور پر سامنے لائے۔

۱۹۹۳ء کی نئی منتخب قومی اسمبلی حلف برداری کی تقریب میں محترمہ بینظیر بھٹو نے مخدوم امین فہیم کو حلف اٹھانے سے روک لیا جس سے اس بات کو تقویت ملی کہ محترمہ سندھ کی قیادت کے لئے مخدوم

امین فہیم کا انتخاب کر چکی ہیں لیکن سندھ سے صوبائی اسمبلی کے منتخب ارکان کے ساتھ بلاول ہاؤس میں منعقدہ اجلاس میں محترمہ بینظیر بھٹو نے اچانک عبداللہ شاہ کا نام پیش کر کے تمام حلقوں کو حیرت زدہ کر دیا اور مخدوم امین فہیم کو ایک مرتبہ پھر بڑے ایوان میں حلف اٹھانے اسلام آباد لے گئیں جہاں بعض اقلیتی ارکان کے ساتھ مخدوم امین فہیم نے حلف اٹھایا۔ (۱۱) بعد ازاں انہیں ہاؤسنگ اور تعمیرات کا وفاقی وزیر مقرر کیا گیا۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب جیتنے میں کامیاب ہوئے اور اسمبلی کی مجلس قائمہ برائے مواصلات کے رکن بنے (۱۲) اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں، جب محترمہ بے نظیر بھٹو ملک سے باہر تھیں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹیرینز کی قیادت کی اور چھٹی مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۳) اس مرتبہ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وزارت عظمیٰ کا تاج ان کے سر پر سجے مگر اسمبلی میں ان کی اپنی پارٹی کے ارکان نے پاکستان پیپلز پارٹی پیٹر پاٹس کے نام سے ایک فارورڈ گروپ بنا لیا جس نے پہلے ظفر اللہ جمالی کو اور پھر شوکت عزیز کو وزیر اعظم بننے میں مدد دی (۱۴)

مخدوم امین فہیم کے صاحبزادے مخدوم جمیل الزماں بھی عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں۔

وہ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں پی ایس ۳۵ حیدر آباد ا سے پاکستان پیپلز پارٹی، شہید بھٹو گروپ کے مخدوم فضل حسین کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے(۱۵) وہ ۲۰۰۲ء میں بھی اسی نشست پر دوبارہ سندھ اسمبلی کے رکن بنے (۱۶) اس مرتبہ ان کے سندھ کے وزیر اعلیٰ بننے کا امکان بھی تھا مگر سندھ کی جوڑ توڑ کی سیاست کی وجہ سے وہ وزیر اعلیٰ بننے کی بجائے صرف ڈپٹی اپوزیشن لیڈر ہی بن سکے۔

مخدوم محمد امین فہیم کے چھوٹے بھائی مخدوم خلیق الزماں نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز ۱۹۷۷ء میں صوبائی اسمبلی کی رکنیت سے کیا۔ انہوں نے بھی تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور کچھ عرصہ سندھ پیپلز پارٹی کے صدر بھی رہے۔ ۱۹۸۶ء میں جب محترمہ بے نظیر وطن واپس آئیں تو کچھ عرصہ بعد مخدوم خلیق الزماں کو صدارت سے ہٹا کر میر ہزار خان بجارانی کو سندھ پیپلز پارٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ مخدوم خلیق الزماں اس صورتحال سے دلبرداشتہ تو ہوئے لیکن انہوں نے پارٹی کا دامن نہ چھوڑا۔ ۱۹۸۸ء میں پیپلز پارٹی نے انہیں قومی اسمبلی کے لئے این اے ۱۷۱ حیدر آباد ۵ سے اپنا امیدوار نامزد کیا۔ مخدوم خلیق یہ انتخاب جیتنے میں کامیاب رہے۔ تاہم بعد ازاں وہ قومی اسمبلی اور قومی اسمبلی کے باہر پیپلز پارٹی کی پالیسیوں کو ہدف تنقید بناتے رہے۔ (۱۷) ۱۹۹۰ء میں پیپلز پارٹی نے مخدوم خلیق الزماں کو ٹکٹ نہیں دیا یوں وہ انتخابی عمل سے باہر رہے مگر جب سندھ میں جام صادق

علی نے وزارت اعلیٰ سنبھالی تو انہوں نے مخدوم خلیق الزماں کو پیپلز پارٹی کے خلاف لا کھڑا کیا اور انہیں سندھ سے سینیٹر بنوا دیا۔ مخدوم خلیق الزماں نے اس دور میں کھل کر پیپلز پارٹی کی مخالفت کی اور ان کی تند و تیز بیانات اخبارات کی زینت بنتے رہے۔ (۱۸) ۱۹۹۳ء میں جب محترمہ بے نظیر بھٹو نے مخدوم امین فہیم کو سندھ کا وزیر اعلیٰ مقرر نہ کیا تو اس فیصلے نے مخدوم خلیق الزماں کو اور بھی مشتعل کر دیا اور محترمہ کی والدہ بیگم نصرت بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کے کیمپ میں براہ راست شامل ہو گئے اور یوں ان کو ایک نیا پلیٹ فارم میسر آ گیا (۱۹)

مخدوم امین فہیم اور مخدوم خلیق الزماں کے اور بھی کئی بھائی سیاست میں نمایاں رہے۔ تاہم ان کی سیاست صوبہ سندھ کی سطح سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ان بھائیوں میں مخدوم اللہ بچائیو عرف رفیق الزماں، مخدوم شفیق الزماں اور مخدوم سعید الزماں کے نام قابل ذکر ہیں۔ مخدوم رفیق الزماں ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں وہ کچھ عرصہ صوبائی وزارت پر بھی فائز رہے۔ (۲۰) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں ان کی نشست پر مخدوم امین فہیم بلا مقابلہ رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہوئے۔ مگر بعد ازاں جب انہوں نے یہ نشست خالی کردی تو ضمنی انتخاب میں مخدوم رفیق الزماں بلا مقابلہ رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہو گئے (۲۱) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر سندھ اسمبلی کے رکن بنے (۲۲) ۲۰۰۱ء میں وہ حیدر آباد کے ضلعی ناظم بنے اور یوں انہوں نے ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں حصہ نہیں لیا (۲۳)

مخدوم شفیق الزماں ۱۹۸۸ء میں مخدوم امین فہیم کی خالی ہونے والی نشست پر ضمنی انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے رکن رہے۔ ۱۹۹۰ء میں وہ کچھ عرصہ جام صادق علی کی نگراں کابینہ میں بھی شامل رہے۔ (۲۴) انہوں نے ۱۶ر نومبر ۱۹۹۶ء کو وفات پائی (۲۵) مخدوم سعید الزماں عاطف عرف مخدوم غلام حیدر ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں پی ایس ۵۷ تھر ۳ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۲۶)

حوالہ جات

۱۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ حیدر آباد۔ جلد ۱۔ ص۔ ۹۳

۲۔ اعجاز الحق قدوسی۔ تذکرہ صوفیائے سندھ۔ کراچی۔ ص ۲۸۶، ۲۸۷

۳۔ اردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۱۷۵

۴۔ فقیر سرشار سروری۔ جناب مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ۔ مہران سوانح نمبر۔ حیدر آباد۔ ص ۶۵۲

۵۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ (سندھی) حیدر آباد۔ جلد ۱۔ ص۔ ۹۴ تا ۹۷

۶۔ اردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ لاہور۔ جلد دوم۔ ص ۱۴۷۹

۷۔ نسیم تقوی۔ مخدوم خاندان کے سیاسی اثرات۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۴ر ستمبر ۱۹۹۳

۸۔ ایس محمد رضا (مدیر)۔ پرسنز ہوشیپ اور ڈیسٹنی۔ کراچی۔ ص ۲۴۴، ۲۴۵

۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز۔ جلد ۲۔ ص ۷۶

۱۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۵ر ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۱۔ غازی صلاح الدین (حیدر آباد)۔ پیپلز پارٹی اور مخدوم خاندان میں اختلافات۔ روزنامہ جنگ کراچی ۱۴ر فروری ۱۹۹۴ء

۱۲۔ ارشاد امین۔ پالیمنٹ بک ۹۷ء۔ (جلد اوّل)۔ لاہور۔ ص۔ ۱۸۷

۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز۔ ۲۰۰۲ء جلد دوم۔ ص ۷۷

۱۴۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۵۰

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۶۴

۱۶۔ ایضاً۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۲۴۸

۱۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۴۹

۱۸۔ نسیم تقوی۔ مخدوم خاندان کے سیاسی اثرات۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۴ر ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۹۔ غازی صلاح الدین (حیدر آباد)۔ پیپلز پارٹی اور مخدوم خاندان میں اختلافات۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۴ فروری ۱۹۹۴ء

۲۰۔ ادریس بختیار، علی حسن۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ۔ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۱۹۹۰ء۔ ص ۸۰

۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔ جلد دوم صفحہ آخر (اغلاط نامہ)

۲۲۔ ایضاً۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۶۵

۲۳۔ مومن بلو۔ چارلس پینٹر کان محمد میاں سومرو تائین۔ حیدر آباد۔ ص ۴۷۶

۲۴۔ ادریس بختیار، علی حسن۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی الیکشن اسپیشل ۱۹۹۰ء۔ ص ۸۰

۲۵۔ حافظ نسیم الدین پاکستان کے ماہ وسال۔ کراچی۔ ص ۴۰۱

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۸۵

مری

سندھ میں آبائی قبیلہ، جو اپنے جد امجد سردار حاجی خان کی نسبت سے حاجی زئی مری قبیلہ کہلاتا ہے، بلوچوں کا ایک بڑا اور جری قبیلہ ہے۔ یہ قبیلہ کلہوڑوں کے عہد حکومت میں سردار حاجی خان کے ہمراہ سندھ آیا جہاں اس نے اپنی بے پناہ خصوصیات کے سبب کلہوڑہ اور تالپور حکومتوں میں فوجی اعزازات، مناصب اور جاگیریں حاصل کیں۔ رفتہ رفتہ مریوں اور تالپوروں میں آپس میں رشتے اور ناتے بھی ہو گئے اور یوں مریوں نے سندھ میں اپنا ایک الگ مستقل مقام حاصل کر لیا۔ اس وقت سے یہ قبیلہ نواب شاہ، سانگھڑ اور دوسرے علاقوں میں نہایت خوشحالی سے رہ بس رہا ہے۔

سردار حاجی خان، بلوچوں کے جد امجد میر جلال خان رند کی پندرہویں نسل میں تھا۔ حاجی خان کے بیٹے مستی خان نے کلہوڑوں اور تالپوروں کے مابین جنگ ہالانی میں بہادری اور جواں مردی کے جوہر دکھائے جس کے صلے میں انہیں جاگیریں عطا ہوئیں۔ مستی خان کی یادگار، ٹنڈو مستی خان ہے جبکہ حاجی خان کی دوسری بیوی سے پیدا ہونے والے بیٹے سہیدی کے بیٹے بلاول خان نے ٹنڈو آدم کے قریب کوٹ بلاول تعمیر کروایا (۱)

سردار مستی کان کا پڑپوتا وڈیرا محبت خان تھا۔ وہ والی خیر پور میر سہراب خان کا سپہ سالار اور با اعتماد مشیر تھا۔ میر سہراب خان کی وفات کے بعد وہ اس کے جانشین میر رستم خان کے دربار میں بھی یہی خدمت انجام دیتا رہا۔ میر رستم خان کے تیسرے بیٹے علی مردان کی شادی وڈیرہ محبت خان کی بیٹی سے ہوئی یوں یہ تعلقات رشتہ داری میں بدل گئے۔

علی مردان نے شادی کے بعد اپنے سسر کو نوشہرہ اور کنڈیارو میں جاگیروں سے نوازا۔ وڈیرہ محبت خان نے ۱۸۵۶ء میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا جانشین اس کا بیٹا میر محمد ہوا۔ اسی دوران سندھ پر انگریزوں کا قبضہ مستحکم ہو چکا تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے وڈیرہ میر محمد کی تمام جاگیروں کے بدلے میں اسے ایک ہزار بیگھہ زمین سے نوازا۔

وڈیرہ میر محمد کے کئی اور عزیز بھی، جو سردار حاجی خان کی اولاد میں سے تھے، انگریزوں کی

خدمات کے عوض سندھ میں بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بنے۔ ان میں علی خان، داؤ خان، رشید خان، احمد خان، ننڈو خاں اور غلام مرتضیٰ کے نام اور احوال، آج بھی انگریزوں کے ریکارڈ میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ (۲)

بیسویں صدی میں سندھ میں آباد مری قبیلے کے بعض افراد سیاست کے میدان میں بھی نمایاں ہونا شروع ہوئے جن میں ایک نام رئیس علی محمد مری کا تھا۔

رئیس علی محمد مری اپنی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک خلافت سے کیا اور وہ صوبہ سندھ خلافت کمیٹی کے رکن بھی رہے (۳) ۱۹۴۶ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۴) قیام پاکستان کے بعد جب کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کی بات چلی تو سندھ اسمبلی کے ارکان کا ایک پانچ رکنی وفد زیارت گیا جس نے قائداعظم سے ملاقات کی اور انہیں کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کے مضمرات سے آگاہ کیا۔ اس پانچ رکنی وفد میں ہاشم گزدر، قاضی محمد اکبر، آغا غلام نبی پٹھان اور سید علی اکبر شاہ کے ساتھ رئیس علی محمد مری بھی شامل تھے (۵) ۱۹۴۸ء کے اوافر یا ۱۹۴۹ء کے اوائل میں رئیس عل محمد مری کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی نشست پر ضمنی انتخاب منعقد ہوئے جن میں رئیس غلام حسین عرف حاجی جان محمد خان مری سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۶) رئیس علی محمد مری کے صاحبزادے رئیس عطا محمد مری تھے۔

رئیس عطا محمد مری نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۶۵ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کی رکنیت سے کیا۔ اس وقت ان کا تعلق برسراقتدار کنونشن مسلم لیگ سے تھا (۷)

۱۹۷۰ء میں رئیس عطا محمد مری، پاکستان مسلم لیگ (قبضہ گروپ) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے مگر ۱۹۷۷ء کے انتخابات سے پہلے، ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور بلا مقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۸) ۱۹۸۵ء میں منعقد ہونے والے انتخابات سے قبل انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کو خیر باد کہا اور غیر جماعتی انتخاب میں ایک مرتبہ پھر نہ صرف قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے بلکہ پاکستان مسلم لیگ میں بھی دوبارہ شامل ہو گئے (۹) مگر ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں ان کی نشست محمد خان جونیجو کو تفویض کر دی گئی اور انہیں مشورہ دیا گیا کہ وہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑیں۔ عطا محمد مری نے ان انتخابات میں حصہ ہی نہیں لیا اور ان کی نشست پر محمد خان جونیجو بھی کامیاب نہ ہو سکے (۱۰) ۱۹۹۰ء میں رئیس عطا محمد مری نے آزادانہ طور پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا جس میں وہ پی ڈی اے کے الطاف حسین رند کو بھاری اکثریت سے شکست دیکر نہ صرف سندھ اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے بلکہ انتخابات کے بعد سیاسی جوڑ توڑ کے نتیجے میں ڈپٹی اسپیکر کے منصب پر بھی فائز ہو گئے۔ ۱۹/ جون ۱۹۹۳ء کو جب ایم کیو ایم کے خلاف ریاستی آپریشن شروع ہوا تو سندھ اسمبلی کے اسپیکر عبدالرزاق خان روپوش ہو گئے۔ چنانچہ اس دوران عطا محمد

مری نے قائم مقام اسپیکر کے فرائض انجام دیے۔ انہوں نے بطور اسپیکر ایم کیو ایم کے روپوش ارکان کے استعفے قبول نہیں کیے بلکہ شرط رکھی کہ جو ارکان مستعفی ہونا چاہتے ہیں وہ اسپیکر کے سامنے ذاتی طور پر پیش ہو کر اپنے استعفے پیش کریں (۱۱) ۱۹۹۰ء کے بعد کسی انتخاب میں عطا محمد مری کا نام نظر نہیں آیا۔ ۲؍ مارچ ۱۹۹۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا (۱۲)

رئیس عطا محمد مری کی اہلیہ پروین مری نے بھی کچھ عرصہ سیاست کے میدان میں گزارا۔ وہ ۱۹۸۵ء میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر سندھ اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھیں (۱۳)

رئیس عطا محمد مری اور پروین مری کی صاحبزادی شازیہ مری ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر خواتین کی مخصوص نشستوں پر سندھ اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھیں (۱۴)

شازیہ مری نے سندھ اسمبلی میں بڑا افعال کردار ادا کیا۔ وہ ان ارکان اسمبلی میں شامل ہیں جو اسمبلی میں پیش ہونے والے ہر بل پر بھرپور مطالعہ اور تحقیق کے بعد گفتگو کرتی ہیں۔ انہوں نے اسمبلی میں اس قانون کے خلاف بھی ایک بل پیش کیا جو معذور افراد کو سپریر سروسز کے امتحانات میں شامل ہونے کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ یہ قانون متفقہ طور پر منظور ہوا جسے شازیہ مری اپنا ایک اہم کارنامہ گردانتی ہیں۔ انہوں نے سندھ بلڈنگ کنٹرول آرڈیننس میں ترمیم کا ایک بل بھی پیش کیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہر ملٹی سٹوری بلڈنگ میں معذور افراد کی وہیل چیئر کے لیے ریمپ بنانا لازمی قرار دیا جائے (۱۵)۔

حوالہ جات

۱۔ مولائی شیدائی۔ سندھ کے تاریخی بلوچ قبائل' حاجی زئی مری۔ شمولہ ماہنامہ بلوچی دنیا' ملتان۔ فروری ۱۹۶۶ء۔ ص ۱۰ تا ۱۲

۲۔ ریوینو ڈیپارٹمنٹ حکومت بمبئی۔ ہسٹری آف ایلی نیشن اف دی پراونس آف سندھ (جلد دوم)۔ کراچی۔ ص ۲۲۲ تا ۲۳۵

۳۔ جی ایم سید۔ کجھ خطوط (سندھی)۔ حیدر آباد۔ ص ۳۲۷

۴۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۳۸۶، ۳۹۱

۵۔ ظہیر احمد' اب بھی زندہ ہیں۔ حیدر آباد۔ ص ۵۳

۶۔ زاہد چوہدری' سندھ' مسئلہ خودمختاری کا آغاز۔ لاہور۔ ص ۳۳۱' ۳۱۲

۷۔ وکیل انجم۔ سیاستدانوں کی قلابازیاں (حصہ اول)۔ لاہور۔ ص ۸۳۳

۸۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۶۵' ۱۰۶

۹۔ وکیل انجم۔ سیاستدانوں کی قلابازیاں۔ (حصہ اول)۔ لاہور۔ ص ۸۳۳

۱۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور میں ۳۵۲ ' ۳۵۳
۱۱۔ نذیر لغاری۔ ایشور لال نے شازیہ مری کا نام پرچی کیوں لکھی؟ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۳ر تا ۹ر جولائی ۲۰۰۶ء۔ ص ۱۲
۱۲۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ دفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۵۵۵
۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان' اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۸۵ء۔ جلد ۳۔ ص ۲۲۴
۱۴۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد اول۔ ص ۳۴۵
۱۵۔ شازیہ حسن۔ رائزنگ فرام دی ایشز۔ (پروفائل۔ شازیہ مری)۔ دی ریویو میگزین۔ روزنامہ ڈان کراچی ۲۴ر فروری۔ ۲ر مارچ ۲۰۰۵۔ ص ۲۱ ' ۲۲

ملک

سندھ کے سیاسی خاندانوں میں ایک اہم نام ملک خاندان کا ہے جو کوہستان کے بے تاج بادشاہ کہلاتے ہیں۔

یہ خاندان سندھ کے مشہور سمہ قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ جو سندھ کے قدیم قبائل میں سے ایک ہے۔ یہ خاندان ملک سے پہلے جام کہلاتا تھا۔ انکے جد امجد کا نام یوں تو جام یادو تھا مگر ان کے شجرہ نسب کا جو پہلا شخص سندھ کے علاقے میں آکر آباد ہوا اس کا نام جام عیب خاں تھا۔ جام عیب خاں اپنے والد ہوتی خان دوم سے ’جو کچھ کے کسی علاقے کا سردار تھا‘ اپنے آٹھ دوستوں کے ہمراہ قلات کے علاقے میں آیا۔ ان نوجوان مردوں کی نسبت سے یہ افراد نومڑی اور پھر نومڑیا کہلائے تھے۔ یہ آٹھویں صدی ہجری کا زمانہ تھا۔ اس وقت اس علاقے کا حاکم مرک تھا جسے جام عیب خان نے بھرے دربار میں قتل کر کے اس کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔ جام عیب خان نے لسبیلہ کے جام دینار کی بیٹی سے شادی کی جس سے ایک بیٹا برکت خاں پیدا ہوا۔

پھر جام عیب خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر کے کوہستان کے علاقے میں آباد ہوا اور بہت جلد یہاں کا بھی حاکم بن بیٹھا۔ جام عیب خان کے بعد اس کا بیٹا برکت خاں علاقے کا حکمران بنا۔

جام برکت کی نویں پشت میں جام کانبھو خان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اس وقت کے مغل بادشاہ نے اپنے قید میں ڈال دیا تھا مگر اس زمانے دہلی کے نواح میں ایک شیر آگیا جو جانی نقصان پہنچانے لگا۔ بادشاہ نے جام کانبھو خان سے کہا کہ اگر وہ اس شیر کو مار دے تو اسے آزاد کر دیا جائے گا۔ جام کانبھو خاں نے یہ چیلنج منظور کر لیا اور شیر کو مارنے میں کامیاب ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنا عہدہ پورا کر کے نہ صرف اس آزاد کر دیا بلکہ اس کی جاگیر لوٹا کر اسے ملک کا خطاب کا بھی عطا کیا۔ تب سے یہ لوگ ملک کہلانے لگے۔ (۱)

جام کانبھو خاں کی پانچویں پشت میں اس خاندان کا سردار ملک احمد خان تھا۔

۱۸۴۳ء میں جب سندھ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو ملک احمد خاں انگریزوں کو سلام کے لیے دربار میں حاضر ہوا اس کے پاس اپنی جاگیر کی کوئی سند یا دستاویز موجود نہیں تھی لیکن انگریز کلکٹر نے دیگر شواہد کی بنیاد پر ملک احمد خان کے دعوے کو قبول کیا اور اسے اس کی جاگیر واپس لوٹا دی۔

یہ وہی ملک احمد خان ہے جس کے نام پر یہ علاقہ اب بھی تھانہ احمد خان کہلاتا ہے۔ (۲) ملک احمد خان کا بیٹا ملک صوبدار خان (دوم) تھا جس کی شادی لسبیلہ کے جام مہر خان دوم کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ملک صوبدار خاں (دوم) کے پڑپوتے کا نام ملک سردار خان (سوم) تھا۔ (۳) وہ اپنے زمانے میں لوکل بورڈ کا ممبر بنا اور ریٹائرمنٹ کے بعد ڈھائی روپے سالانہ بطور پنشن حاصل کرتا رہا (۴) اس کا انتقال ۲۸ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ہوا (۵)

ملک سردار خان کے تین بیٹے ہوئے جن میں سے ایک ملک سکندر خان نے قیام پاکستان کے بعد پہلے صوبائی اور پھر قومی سیاست میں نام کمایا۔

ملک سکندر خاں یکم مارچ ۱۹۲۷ء کو ضلع دادو میں تھانہ۔ احمد خان میں پیدا ہوئے (۶) وہ ۱۹۵۳ء میں بلا مقابلہ سندھ اسمبلی کے رکن بنے (۷) اور مسلم لیگ میں پیر زادہ عبدالستار کے دھڑے میں شامل ہو گئے ۱۹۵۶ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور رہی پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ البتہ ۱۹۶۵ء میں وہ کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر دوبارہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے ۱۹۶۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد ملک سکندر خان نے اس نئی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی (۸) ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہوں نے دادو سے جی ایم سید کے مقابلے میں قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور انہیں بڑی بھاری اکثریت سے شکست سے ہم کنار کیا۔ جی ایم سید نے ان انتخابات میں شکست کے بعد پھر کبھی کسی انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ (۹)

۱۹۷۷ء میں ملک سکندر خان نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور بلا مقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۰) مگر دسمبر ۱۹۸۱ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے وفاقی مجلس شوریٰ تشکیل دی تو وہ اس مجلس شوریٰ میں شامل ہو گئے (۱۱)

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں ملک سکندر نے خود حصہ نہیں لیا البتہ ان کے صاحبزادے ملک اسد سکندر نے پی ایس ۶۰ دادو ا سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے بعد ازاں وہ حکمران مسلم لیگ میں شامل ہو گئے (۱۲) ۱۹۸۸ء کے انتخابات سے قبل ملک اسد سکندر، پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور اپنی آبائی نشست این اے ۷۷ دادو ا سے قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۱۳) ۱۹۹۰ء میں ملک اسد سکندر نے ایک مرتبہ پھر اسی حلقے سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کے مد مقابل عبدالحفیظ پیرزادہ تھے۔ مگر وہ اپنی تمام تر شہرت کے باوجود ملک اسد

سکندر سے تقریباً ۳۲ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۱۴)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں ملک اسد سکندر ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس مرتبہ بھی انہیں پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنا امیدوار نامزد کیا تھا (۱۵)۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں ملک اسد سکندر نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا اور دونوں نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ واضح رہے کہ انہوں نے یہ دونوں انتخابات آزادانہ حیثیت میں لڑے تھے۔ انتخابات کے بعد ملک اور سکندر نے صوبائی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی اور لیاقت حسین جتوئی کی کابینہ کے رکن بنے (۱۶)

۲۰۰۱ء میں ملک اسد سکندر نے لیاقت جتوئی کے ساتھ دادو الائنس بنایا اور دادو کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے (۱۷) ۲۰۰۲ء میں گریجویشن کی شرط کی وجہ سے وہ عام انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے (۱۸) تاہم انتخابات سے کچھ پہلے وہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین میں واپس آ گئے اور اپنی موروثی نشست پر پارٹی کا ٹکٹ اپنی برادر نسبتی (بہنوئی) عبدالغنی تالپور کو دلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ عبدالغنی تالپور جو ایک اور رکن قومی اسمبلی یوسف تالپور کے چھوٹے بھائی بھی ہیں اس نشست پر بہت آسانی سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۱۹) ۲۰۰۵ء کے صوبائی انتخابات سے پہلے جام شورو کا نیا ضلع وجود میں آیا۔ چنانچہ ملک اسد سکندر نے اس مرتبہ عوام دوست پینل سے اس نئے ضلع کے ضلعی ناظم کا انتخاب لڑا اور جی ایم سید کے پوتے سید جلال محمود کو شکست دے کر اس انتخاب میں کامیاب ہوئے (۲۰)

ملک اسد سکندر، سردار محمد صالح بھوتانی کے بھانجے اور داماد ہیں (۲۱) سردار محمد صالح بھوتانی ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۷ء تک مسلسل چھ مرتبہ بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ہیں (۲۲) ۲۰۰۳ء میں انہوں نے انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ اس انتخاب میں ان کے بھائی محمد اسلم بھوتانی بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۳) سردار محمد صالح بھوتانی، سردار عطاء اللہ مینگل کے سالے بھی ہیں اور بہنوئی بھی۔ یوں بالواسطہ طور پر ملک اسد سکندر کی سردار عطاء اللہ مینگل سے بھی رشتے داری ہوتی ہے۔ سردار محمد صالح بھوتانی اور اسلم بھوتانی، اختر مینگل کے ماموں ہیں (۲۴)

ملک اسد سکندر کے ایک کزن ملک علاء الدین ہیں جو پولیس کے ریٹائرڈ آفیسر ہیں۔ وہ جام آف ملیر، جام مراد کے داماد ہیں جام مراد کے ایک بیٹے سردار عطاء اللہ مینگل کے داماد ہیں اور دوسرے نواب اکبر بگٹی کے (۲۵)

حوالہ جات

۱۔ جی ایم سید۔ میرے دوست میرے ساتھی۔ (اردو ترجمہ: نسرین انجم بھٹی)۔ لاہور۔ ص ۱۷ تا ۱۹

۷۲۸

۲۔ حسین بادشاہ۔ سندھ جاگیرن جی تاریخ (سندھی)۔ کنڈیارو۔ ص ۲۷۸ تا ۲۸۰

۳۔ جی ایم سید۔ میرے دوست میرے ساتھی (اردو ترجمہ: نسرین انجم بھٹی)۔ لاہور۔ ص ۷۲۹

۴۔ خان تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان ایڈیشن ۷۰۔۱۹۶۹ء۔ لاہور۔ ص ۵۲۸

۵۔ جی ایم سید۔ میرے دوست میرے ساتھی۔ (اردو ترجمہ: نسرین انجم بھٹی)۔ لاہور۔ ص ۷۳۲

۶۔ خادم حسین چانڈیو۔ مارو جی ملیر جا (سندھی)۔ حیدر آباد۔ ص ۳۰۵

۷۔ خان تہور علی خان۔ بائیو گرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۷۰۔۱۹۶۹ء ص ۵۲۸

۸۔ وکیل انجم۔ جاگیر داروں کے گرد گھومتی سندھ کی سیاست۔ روزنامہ جنگ کراچی' سنڈے میگزین ۲/اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ ص ۲۴

۹۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۷۹

۱۰۔ ایضاً۔ ۱۰۶

۱۱۔ الیاس شاکر' یوسف خان۔ سندھ سے وفاقی مجلس شوریٰ میں دیے جانے والے ارکان' وہ کون لوگ ہیں روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ مورخہ ۶/جنوری ۱۹۸۲ء۔

۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۴۹۰' ۴۹۱

۱۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۵۱

۱۴۔ عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کی انتخابی سیاست۔ اسلام آباد۔ ص ۲۶۰

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۶۰' ۱۶۱

۱۶۔ مومن بلو۔ چارلس پینٹر کان محمد میاں سومری تائین (سندھی)۔ حیدر آباد۔ ص ۶۰۵

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ویب سائٹ www.louwho.com

۱۹۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۲۶/ستمبر ۲۰۰۲ء' ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۲ء

۲۰۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۷/اکتوبر ۲۰۰۵

۲۱۔ عدنان عادل۔ بلوچ سردار کون کس کا رشتہ دار؟ بی بی سی اردو ڈاٹ کام۔ لاہور۔ ۲۶/فروری ۲۰۰۵ء

۲۲۔ وحید زہیر۔ بلوچستان' جمہوریت کا سفر' کوئٹہ۔ ص ۶۹' ۷۲' ۸۵' ۹۰ اور ۹۵

۲۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان' اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ رپورٹ' جلد دوم۔ ص ۳۶۰

۲۴۔ عدنان عادل۔ بلوچ سردار کون کس کا رشتہ دار؟ بی بی سی اردو ڈاٹ کام۔ لاہور۔ ۲۶ر فروری ۲۰۰۵ء

۲۵۔ ایضاً

مہر

مہر یا میہڑ قبیلہ سکھر ڈویژن میں ایک طویل عرصہ سے آباد ہے اور ملک کے اس حصے پر تقریباً انہی کا قبضہ ہے۔

ان کی نسل کے متعلق دو روائتیں ہیں ایک یہ کہ یہ عربی النسل ہیں اور محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ آئے۔ دوسری یہ کہ یہ راجپوتوں کے سورج بنسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سندھ میں میرپور ماتھیلو، سکھر اور پنو عاقل کے تعلقوں میں اور بھارت میں جیسلمیر ریاست میں آباد ہیں۔ تاریخ کلہوڑا کے مصنف غلام رسول مہر کے مطابق مہروں کے آباؤ اجداد اباڑو کی طرف رہتے تھے۔ ان میں سے ایک سردار کے سات فرزند تھے۔ جن میں سے ایک کا نام جیسر تھا۔ جو بھائیوں سے ناراض ہو کر دریا پار کر کے جتوئیوں کے ایک گاؤں میں رہنے لگا وہ بعد ازاں لکھی گوٹھ میں آ کر آباد ہوا۔ ان کے ایک فرزند کا نام عاقل تھا۔ پنو عاقل گوٹھ اسی کے نام سے منسوب ہے۔

جیسر اور جیسل ایک جیسے نام ہیں۔ یہی نام جیسلمیر کے بانی راجا کا تھا۔ میر گوٹھ، ماتھری یا وادی کو کہتے ہیں۔ اس لئے جیسلمیر کے لغوی معنے ہوئے جیسل کا گاؤں۔ چونکہ مہر قبیلہ اسی ریاست کے قرب و جوار میں آباد تھا۔ اس لئے گماں قوی ہے کہ یہ اسی ریاست کے بھٹی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے۔ (۱)

جی ایم سید نے اپنی کتاب جنب گزاریم جن سین میں ان روائتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔ (ترجمہ)

"پہلی روایت اس لئے صحیح نظر نہیں آتی تھی کہ عربوں کی آمد کے بعد سندھ کے کئی قبیلوں نے خود کو عربی النسل ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ سومرو، سمہ اور کئی دوسرے قبیلے اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر اس بات کو قبول کیا جائے تو پھر سندھ میں قدیم نسل کے لوگ چند ایک ہی رہ جائیں گے۔" (۲)

سندھ میں آباد قدیم نسلوں پر لکھی جانے والی ایک اہم کتاب "دی مسلمان ریسز فلونڈان سندھ بلوچستان اینڈ افغانستان" کے مصنف شیخ صادق علی شیر علی انصاری کا خیال ہے کہ مہر حضرت نوح علیہ السلام کے پڑپوتے ہند کی اولاد میں سے ہیں۔ ہند کے ایک پڑپوتے کا نام چاند تھا۔ جو الور کے بادشاہ سہاسی کے زمانے میں ماتھیلو کا گورنر مقرر ہوا۔ اب ماتھیلو کا شہر تو کھنڈر بن چکا ہے مگر میرپور ماتھیلو کا شہر انہی کھنڈرات کے قرب و جوار میں آباد ہے۔ چاند کے پوتے سنامک نے مرزا شاہ حسن ولد شاہ بیگ مغل کے عہد میں اسلام قبول کیا اور یوں یہ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ (۳)

مہروں کے موجودہ سردار، سردار غلام محمد مہر کے جد امجد نواب شیر محمد خان کی میرپور ماتھیلو میں ریاست ہوتی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سردار غلام محمد مہر کے بڑے دادا سردار مہراللہ ورایو خان کو اس علاقے میں مغلوں کی طرف سے جاگیر عطا ہوئی تھی اور یہ مغل حکومت کو ۱۲ ہزار روپے سالانہ خراج دیتا تھا۔

کلہوڑوں اور میروں کے عہد حکومت میں بھی ان کی اچھی خاصی جاگیر تھی۔ ان کے بہاولپور کے داود پوتروں سے کئی مقابلے ہوئے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد اس خاندان کے سردار محمد بخش خاں کو وائسرائے ہند کی جانب سے بندوق بطور انعام عطا ہوئی تھی۔

انہی سردار محمد بخش خان کا پوتا سردار علی گوہر خان مہر تھا۔ وہ ۱۹۱۰ء میں خان گڑھ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ ابھی چھوٹا ہی تھا کہ یتیمی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ ۱۹۳۱ء میں وہ اپنے قبیلے کا سردار بنا اور ۱۹۳۳ء میں اس نے تعلقہ لوکل بورڈ کی صدارت سے اپنی عملی سیاست کا آغاز کیا۔

سردار علی گوہر خاں کی سیاسی نشوونما قیصر خان بوزدار نے کی۔ قیصر خان بوزدار قبیلے کا سردار تھا۔ ۱۹۳۷ء میں وہ سندھ اتحاد پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کا رکن منتخب ہوا لیکن جب میروں نے بلوچ گروپ بنایا تو یہ اس میں شامل ہو کر سرکاری پارٹی میں چلا گیا۔ جی ایم سید نے لکھا ہے کہ سندھ کے عام زمینداروں کی طرح قیصر خاں بوزدار بھی ہمیشہ برسر اقتدار پارٹی کے ساتھ وابستہ رہتا تھا۔ یہ سیاسی اثر سردار علی گوہر مہر میں بھی تھا۔

سردار علی گوہر مہر ۱۹۴۲ء میں ایک ضمنی انتخاب کے ذریعہ سندھ اسمبلی کا رکن منتخب ہوا اور پھر ۱۹۵۳ء تک ہر انتخاب میں کامیاب ہوتا رہا۔ ۱۹۵۶ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کا رکن منتخب ہوا اور مارشل لاء کی آمد تک اس اسمبلی کا رکن رہا۔ مارشل لاء کے بعد اس نے فوجی حکام سے بھی اچھے مراسم قائم رکھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایوب خاں اس کی بیماری میں اس کی عیادت کے لئے اور اس کی وفات پر اس کی تعزیت کے لئے خود چل کر اس کے گاؤں آئے۔

سردار علی گوہر مہر اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے کوئی اولاد نرینہ نہ

تھی چنانچہ اس کی وفات کے بعد اس کے رشتے کے بھائی غلام محمد مہر کو اس کا جانشین تسلیم کر لیا گیا۔ (۴) سردار غلام محمد مہر نے بھی سردار علی گوہر خاں مہر کی طرح ہمیشہ چڑھتے سورج کی پوجا کی۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں وہ کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۵) ۱۹۷۰ء میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار نور محمد خان لوند سے شکست کھائی۔ (۶) اس شکست کے بعد انہوں نے ہوا کا رخ دیکھ کر سیاسی وابستگی تبدیل کر لی اور ۱۹۷۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ اس مرتبہ وہ این اے ۱۵۳ سکھر ۳ سے بآسانی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۷) اب ان کے ساتھ بد قسمتی یہ ہوئی کہ اس اسمبلی کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اور پورے ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں سردار غلام محمد خاں مہر نے ایک مرتبہ پھر اپنی سیاسی وابستگی تبدیل کی اور سندھ کے صوبائی وزیر بن گئے۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا اور این اے ۱۵۲ سکھر ۲ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے بعد ازاں وہ جناب محمد خاں جونیجو کی مرکزی کابینہ میں بھی شامل رہے۔ (۸)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں سردار غلام محمد خاں مہر ہوا کا رخ پہچاننے میں دھوکہ کھا گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ مگر سندھ بری طرح سے "بے نظیر لہر" کا شکار تھا۔ چنانچہ سردار غلام محمد مہر بھی پیپلز پارٹی کے امیدوار فقیر عبدالحق عرف میاں مٹھو سے شکست کھا گئے۔ ان کی شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ جنگ کے مبصر جناب نظام صدیقی نے لکھا۔

"سردار غلام محمد مہر سندھ کی سیاست کا ایک ایسا نام ہے جو ہر دور میں حکومت کے ساتھ رہا ہے یا حکومت میں رہا ہے۔ سردار غلام محمد مہر کو اگر تھوڑا سا بھی اندازہ ہو جاتا کہ اسلامی جمہوری اتحاد مات کھا جائے گا' تو وہ پی پی سے ٹکٹ مانگنے اور حاصل کرنے والوں کی قطار میں سب سے آگے ہوتے۔ ۱۸ سال پہلے جب وہ پی پی پی میں آئے تھے تو راقم نے بھٹو مرحوم سے پوچھا تھا کہ یہ تو کل تک ایوب خان کے ساتھ تھے ان کا پی پی کے پروگرام سے کیا علاقہ؟ تو بھٹو مرحوم نے کہا تھا کہ یہ پی پی پی کے وفادار نہیں' سرکار کے وفادار ہوں گے۔ جب بھی انہیں یہ شبہ ہو گا کہ پی پی اقتدار میں نہیں رہے گی یہ دوسری طرف چلے جائیں گے۔ وہی ہوا بھی' جوں ہی بھٹو مرحوم معزول ہوئے' یہ کود کر اقتدار کے ساتھ چلے گئے اور اس مرتبہ سونگھنے سے قاصر رہے کہ سیاسی ہوا کیا کہہ رہی ہے"۔ (۹)

مگر سردار غلام محمد مہر ۱۹۸۸ء ہی میں نہیں ۱۹۹۰ء میں بھی غالباً یہ سوچ کر کہ اب تو حالات اسلامی جمہوری اتحاد کے حق میں ہیں پھر اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے۔ مگر اس مرتبہ بھی وہ پی ڈی اے کے امیدوار جام سیف اللہ خان دھاریجو سے شکست کھا گئے۔ (۱۰) تاہم ۱۹۹۳ء

میں ان کے ستارے یاوری کر ہی گئے۔ اس مرتبہ وہ مسلم لیگ (نواز گروپ) کے امیدوار تھے اور ان کے مدمقابل ان کے پرانے حریف جام سیف اللہ دھاریجو تھے جنہیں پیپلز پارٹی نے ٹکٹ عطا کیا تھا۔ اس مرتبہ نتائج ۱۹۹۰ء کے برعکس رہے اور سردار غلام محمد مہر نے جام یوسف اللہ دھاریجو کو ۱۲ ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دے دی (۱۱)۔ ۱۹ اپریل ۱۹۹۵ء کو سرادر غلام محمد مہر کا انتقال ہو گیا۔ (۱۲)

سردار غلام محمد مہر کے بھائی حاجی علی انور خاں مہر بھی ایک طویل عرصہ سے صوبائی سیاست کے میدان میں فعال ہیں۔ وہ ۱۵/اگست ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے اور انہوں نے ۱۹۵۹ء میں یونین کونسل کی چیئرمین شپ سے اپنی سیاست کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے پہلی مرتبہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے (۱۳) ۱۹۷۷ء میں وہ صوبہ سندھ کے ان ارکان میں شامل تھے جو بلا مقابلہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۱۴) ۱۹۸۵ء میں پی ایس ۳ گھوٹکی سے سندھ اسمبلی کے رکن بنے۔ تاہم جب غوث علی شاہ صوبہ کے وزیر اعلیٰ نامزد ہوئے تو انہوں نے اپنی نشست غوث علی شاہ کے لئے خالی کردی اور یوں غوث علی شاہ ان کے حلقے سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۱۵) ۱۹۸۸ء میں انور علی خاں مہر کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے جام سیف اللہ خاں دھاریجو سے تقریباً ۸ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۱۶) ۱۹۹۰ء میں انہوں نے پھر اسی حلقہ یعنی پی ایس ۳ سکھر ۲ سے انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ بھی وہ آزاد امیدوار تھے تاہم اس مرتبہ وہ پی ڈی اے کے امیدوار سید نادر علی شاہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے (۱۷) ۱۹۹۳ء میں انہوں نے انتخابی عمل میں حصہ نہیں لیا۔ اس مرتبہ ان کے صاحبزادے سردار علی گوہر خان نے انتخاب لڑا جو سید محبوب علی شاہ کو شکست دے کر بآسانی سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۱۸)

میر علی گوہر خان مہر ۱۹۹۷ء میں بھی اسی حلقے سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۹) ۲۰۰۱ء میں وہ گھوٹکی کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے اور یوں انہوں نے ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں حصہ نہیں لیا (۲۰)

میر علی گوہر خان مہر کے چھوٹے بھائی میر علی محمد خان مہر ہیں۔ جو ۱۹۹۵ء میں اپنے چچا سردار غلام محمد خاں مہر کی وفات کے بعد ان کی خالی ہونے والی نشست پر منعقد ہونے والے ضمنی انتخاب میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ یہ دونوں انتخابات انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر جیتے تھے۔ (۲۱) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا اور قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ انتخابات کے بعد انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کر لی۔ انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست خالی کر دی اور صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ منتخب ہو گئے (۲۲) وہ اپنے اس عہدے پر ۷ جون ۲۰۰۴ء تک فائز رہے۔ وہ ایک کمزور وزیر اعلیٰ ثابت ہوئے اور ان کے دور حکومت میں سندھ بڑی بدامنی کا شکار رہا (۲۳)

میر علی محمد مہر نے قومی اسمبلی میں جو نشست خالی کی تھی اس پر ضمنی انتخابات میں ان کے چھوٹے بھائی علی نواز خاں مہر، قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ انہوں نے یہ انتخاب پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر لڑا تھا (۲۴)

سردار غلام محمد مہر اور سردار علی انور مہر کے ایک ہم قبیلہ غوث بخش مہر ۱۹۷۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پی ایس سکھرے سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۲۵) ۱۹۸۵ء میں انہوں نے پی ایس ۹ شکار پور ۳ سے سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں وہ کچھ عرصہ تک خوراک، زراعت اور لائیو اسٹاک کے صوبائی وزیر رہے (۲۶)

۱۹۸۸ء میں غوث بخش مہر نے اپنی سیاسی وابستگی تبدیل کر لی اور پاکستان پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یوں بآسانی ایک مرتبہ پھر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۲۷)

غوث بخش مہر نے ۱۹۹۰ء میں بھی پی ڈی اے کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی مگر اس کے باوجود اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ آزاد امیدوار محمد ابراہیم جتوئی سے شکست کھا گئے۔ (۲۸) ۱۹۹۳ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ بھی ان کا حلقہ پی ایس ۹ شکار پور ۳ تھا۔ اس مرتبہ وہ نہ صرف صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے بلکہ انتخاب کے بعد سندھ اسمبلی کے اسپیکر بننے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ (۲۹)

۱۹۹۷ء میں غوث بخش مہر نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور پاکستان پیپلز پارٹی کے واحد بخش بھائیو کو تقریباً سات ہزار ووٹوں سے شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انتخابات کے بعد وہ ہوا کا رُخ دیکھتے ہوئے پاکستان مسلم لیگ (ن) میں شامل ہو گئے (۳۰) ۲۰۰۱ء میں غوث بخش مہر نے اپنی سیاسی وابستگی ایک مرتبہ پھر تبدیل کر لی اور پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کی۔ ۲۰۰۲ کے عام انتخابات میں انہوں نے اسی پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لیا اور نہ صرف یہ کہ ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے بلکہ ریلوے کے وفاقی وزیر کے منصب پر بھی فائز ہوئے (۳۱) جناب شوکت عزیز کی کابینہ میں وہ انسداد منشیات کے وزیر بنائے گئے (۳۲)

جناب غوث بخش مہر کے صاحبزادے محمد عارف مہر ۲۰۰۱ء میں شکار پور کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے تھے (۳۳) ۲۰۰۵ء کے انتخابات میں بھی انہوں نے اپنا یہ منصب برقرار رکھا (۳۴)

حوالہ جات

۱۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ جلد دوم۔ حیدر آباد۔ ص ۲۸۱

۲۔ ایضاً۔ص ۲۸۱،۲۸۲
۳۔ شیخ صادق علی شیر علی انصاری۔ دی مسلمان ریسز فاونڈان سندھ بلوچستان اینڈ افغانستان کراچی۔ص ۵۸
۴۔ جی ایم سید۔ جنب گزار یم جن سین۔ حیدر آباد۔ جلد دوم۔ص ۲۸۲،۲۸۳
۵۔ تہور علی خاں۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ۷۰۔ ۱۹۶۹ء ایڈیشن۔ لاہور۔ص ۳۷،۳۸
۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۹ردسمبر ۱۹۷۱ء
۷۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ص ۲۷۶
۸۔ نظام صدیقی۔ ''سندھ کے عوام نے علیحدگی پسند عناصر کو مسترد کر دیا''۔ روزنامہ جنگ کراچی ۱۹رنومبر ۱۹۸۸ء
۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ص۔۳۳۴
۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپوررٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ص ۷۰
۱۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴راکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۳۹۹
۱۲۔ حافظ نسیم الدین۔ پاکستان کے ماہ وسال۔ کراچی۔ص ۶۷۵
۱۳۔ کریم بخش خالد (مرتب)۔ عوامی دور۔ (سندھی)۔ کراچی۔ص ۸۱،۸۲
۱۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴رمارچ ۱۹۷۷ء۔ص ۳۳۶۳
۱۵۔ پروفیسر غفور احمد۔ جنرل ضیاء کے آخری ۱۰ سال۔ لاہور۔ص ۱۹۲،۱۹۳
۱۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ص۔ ۳۶۶۹
۱۷۔ ایضاً۔ ۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء۔ص ۹۳۱۹
۱۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷راکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۴۴۸
۱۹۔ ایضاً۔ ۲۳ فروری ۱۹۹۷ء۔ص ۴۲۵
۲۰۔ مومن بلّو۔ چارلس نیپئر کان محمد سومری تائین۔ حیدر آباد۔ص ۸۶۴،۸۶۵
۲۱۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء۔ (جلد اوّل)۔ لاہور۔ص ۱۷۲
۲۲۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ص ۱۸۸
۲۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۸رجون ۲۰۰۴ء
۲۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشن ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ص ۳۷۹
۲۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴رمارچ ۱۹۷۷ء۔ص ۳۳۶۵
۲۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ص ۳۳۴

۲۷۔طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۶۱
۲۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۲۳
۲۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۰راکتوبر ۱۹۹۳ء
۳۰۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء۔ (جلد اوّل)۔ لاہور۔ ص ۱۷۵
۳۱۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۸۸
۳۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳ ستمبر ۲۰۰۴ء
۳۳۔ مومن بلو۔ چارلس نیپئر کان محمد میاں سومری تائین۔ حیدر آباد۔ ص ۸۸،۸۰
۳۴۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۷راکتوبر ۲۰۰۵ء

نواب شاہ کے شاہ

سندھ کے دوسرے سیاسی خاندانوں کے برعکس نواب شاہ کے "شاہ" کسی ایک خاندان یا قبیلے سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ سادات کی سات مختلف شاخوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ جن کے سربراہوں اور علاقوں کے نام یہ ہیں:

	(i)	سید مراد علی شاہ	(بھیریا)
	(ii)	سید ظفر علی شاہ	(دبھرو اور دربیلو)
	(iii)	سید عبدالحق	(بھورتی شریف)
	(iv)	سید علی اصغر شاہ	(کنڈیارو)
	(v)	سید منظور علی شاہ	(کنڈیارو)
	(vi)	سید امداد محمد شاہ	(سن)
اور	(vii)	سید نور احمد شاہ	(سکرنڈ)

سادات کے یہ خاندان نواب شاہ اور نوشہروفیروز میں وسیع زرعی اور شہری اراضی کے مالک ہیں اور یوں ان کے ووٹرز کی تعداد بھی بے شمار ہے۔ ان تمام زمینداروں اور سیاستدانوں میں سید ظفر علی شاہ کا نام سرفہرست ہے (ا)

سید ظفر علی شاہ کے دادا خان بہادر اللہ ڈنو شاہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ بڑے قابل، باہمت اور بارسوخ شخص تھے۔ وہ بمبئی کونسل کے رکن رہے حکومت نے ان کی خدمات سے خوش ہو کر انہیں اسپیشل مجسٹریٹ اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا تھا۔

خان بہادر اللہ ڈنو شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ نوشہرو میں مسلمانوں کے مدرسہ کا قیام تھا۔ یہ مدرسہ اس زمانے میں قائم ہوا جب تعلیم کے تمام شعبوں پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ نوشہرو کا یہ مدرسہ

مسلمانوں کے لئے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ خان بہادر صاحب نے ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو وفات پائی (۲)

خان بہادر صاحب کے دو فرزند تھے۔ سید کرارو شاہ اور سید محمد علی شاہ۔ سید کرارو شاہ ۱۹۵۳ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ نواب شاہ اور ڈسٹرکٹ مسلم لیگ نواب شاہ کے صدر رہے۔

سید محمد کرارو شاہ کے چار بیٹے تھے۔ سید اصغر علی شاہ' سید اکبر علی شاہ' سید نور محمد شاہ اور سید ابراہیم شاہ۔ ان میں سے سید اصغر علی شاہ اور سید نور محمد شاہ سیاست کے میدان میں نمایاں ہوئے۔(۳)

سید اصغر علی شاہ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخاب میں عمر ڈاہری اور حاکم علی زرداری کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۴) ۱۹۸۸ء میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر اور حاکم علی زرداری نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ یہ معرکہ حاکم علی زرداری کے سر رہا۔ (۵) ۱۹۹۰ء میں نوشہرو فیروز کے علیحدہ ضلع بن جانے کے بعد سید اصغر علی شاہ نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے پی ایس ۱۶ نوشہرو فیروز ۲ سے سندھ اسمبلی کا انتخاب لڑا اور اپنے بھتیجے مراد علی شاہ کو جو پی ڈی اے کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۶) بعد ازاں وہ سید مظفر حسین شاہ کی کابینہ میں وزیر بھی بنائے گئے۔ ان کے پاس زراعت کا قلم دان تھا (۷) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے بھتیجے سید مراد علی شاہ کا مقابلہ کیا۔ تاہم اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور کامیابی کا ہما ان کے بھتیجے کے سر پر بیٹھ گیا۔ (۸)

۱۹۹۷ء میں اصغر علی شاہ نے صوبائی اسمبلی کی بجائے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور خالد میاں راجپر، غلام رسول جتوئی اور ظفر علی شاہ جیسے مضبوط امیدواروں کو شکست دے کر نہ صرف قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے بلکہ ہاؤسنگ اور تعمیرات کے وزیر مملکت کے منصب پر بھی فائز ہوئے (۹)

سید اصغر علی شاہ کے چھوٹے بھائی سید نور محمد شاہ ۱۹۷۰ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اس سے پہلے کہ اس اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوتا، وہ وفات پا گئے۔ بعد ازاں اس نشست پر ضمنی انتخاب منعقد ہوئے جس میں ان کے صاحبزادے سید مراد علی شاہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۰)

سید مراد علی شاہ سیاسی وابستگیاں بدلنے کے ماہر ہیں۔

بھٹو حکومت کے زوال کے بعد وہ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخاب میں پی ایس ۱۷ نواب شاہ۲ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۱) اور غوث علی شاہ کی صوبائی کابینہ میں بطور وزیر شامل ہوئے۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات سے پہلے وہ پیپلز پارٹی میں واپس آ گئے اور ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی

کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۲) ۱۹۹۰ء کے انتخاب میں انہوں نے اپنے تایا سید اصغر علی شاہ کے مقابلے میں انتخاب لڑا۔ مگر اس مرتبہ پی ڈی اے کی حمایت حاصل ہونے کے باوجود وہ انتخاب جیتنے میں کامیاب نہ ہو سکے تاہم جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۹۷ء کے انتخابات سے قبل سید مراد علی شاہ نے ایک مرتبہ پھر قلا بازی کھائی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) میں شامل ہو گئے۔ وہ ایک مرتبہ پھر نہ صرف صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے بلکہ صوبہ سندھ کی کابینہ میں بھی شامل کیے گئے۔ (۱۳)

۲۰۰۲ء کے انتخابات سے پہلے انہوں نے ہوا کا رُخ دیکھتے ہوئے پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کی۔ تاہم اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ ایک سخت مقابلے کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹیرین کے عبدالحق عرف دوست محمد بھرت سے صرف ۲۰۳ ووٹوں سے شکست کھا گئے (۱۴) جب کہ ان کے صاحبزادے سید نور محمد شاہ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر پی ایس ۲۲ نوشہرو فروز ۴ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

مراد علی شاہ نے انتخابات میں اپنی شکست کو ووٹوں کی گنتی کی شاخسانہ قرار دیا ان کا مؤقف تھا کہ غیر سرکاری نتیجے میں انہیں ۲۹۷ ووٹوں سے کامیاب قرار دیا گیا تھا مگر جب سرکاری نتیجہ سامنے آیا تو وہ ۲۰۳ ووٹوں سے شکست کھا چکے تھے۔ مراد علی شاہ نے ۵۰۰ ووٹوں کے اس فرق کو الیکشن ٹریبونل میں چیلنج کر دیا۔ جس نے تین سال کی طویل ساعتوں اور ووٹوں کی از سر نو گنتی کے بعد مراد علی شاہ کو کامیاب قرار دیا اور یوں ۱۵/اکتوبر ۲۰۰۴ء کو انہوں نے سندھ اسمبلی میں رکنیت کا حلف اٹھا لیا۔ (۱۵)

خان بہادر الٰہند و شاہ کے دوسرے صاحبزادے محمد علی شاہ نے بھی سیاست کے میدان میں بڑا نام کمایا۔ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں ضلعی لوکل بورڈ کی صدارت سے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا۔ بعد ازاں وہ سر شاہنواز بھٹو کی قائم کردہ سیاسی جماعت سندھ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس پارٹی کا پہلا اجلاس ۱۳ جون ۱۹۳۴ء کو انہی کی کراچی کی اقامت پر منعقد ہوا تھا (۱۶) ۱۹۳۷ء میں وہ سندھ اتحاد پارٹی کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اسمبلی میں وہ جی ایم سید کے معتمد ساتھیوں میں شامل تھے اور ہر سیاسی جوڑ توڑ میں ان کے ساتھ رہتے تھے، ۱۹۴۵ء میں جب حاجی مولا بخش سومرو نے وزارت سے استعفیٰ دیا تو محمد علی شاہ ان کی جگہ وزیر بن گئے۔ انہیں پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کا قلمدان ملا تھا۔

۱۹۴۵ء کے اواخر میں جب مسلم لیگ نے نئے انتخابات کے لئے ٹکٹوں کی تقسیم کا عمل شروع کیا تو سندھ مسلم لیگ میں دو گروپ بن گئے۔ سید محمد علی شاہ نے اس موقع پر جی ایم سید کا ساتھ دیا اور ان کی جانب سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد ازاں یہ اسمبلی زیادہ عرصہ کام نہ کر سکی۔ دسمبر

۱۹۴۶ء میں جب اس اسمبلی کے از سر نو انتخابات منعقد ہوئے تو سید محمد علی شاہ اس کے رکن منتخب نہ ہو سکے۔

۱۹۴۸ء کے اوائل میں سید محمد علی شاہ ٹریفک کے ایک حادثہ میں شدید زخمی ہو گئے۔ اور ۸ فروری ۱۹۴۸ء کو کراچی میں انتقال کر گئے (۱۷)

سید محمد علی شاہ کے چار بیٹے تھے الٰہند وشاہ عرف سید ظفر علی شاہ، سید منور علی شاہ، سید انور علی شاہ اور سید احمد علی شاہ۔ ان میں سے سوائے سید احمد علی شاہ کے، سبھی سیاست کے میدان میں نمایاں رہے۔

سید ظفر علی شاہ ۲۰ نومبر ۱۹۳۲ء کو ضلع نواب شاہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۹۵۶ء میں پہلی مرتبہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے مگر کم عمری کی وجہ سے ان کا انتخاب کالعدم قرار دے دیا گیا۔ وہ ۱۹۶۲ء میں ایک مرتبہ پھر مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے بعد میں وہ ڈپٹی اسپیکر بنائے گئے۔ ان کا شمار ون یونٹ کے کٹر ترین مخالفین میں ہوتا تھا۔ ۱۹۶۵ء کے عام انتخابات میں وہ کامیاب نہ ہو سکے لیکن ۱۹۶۷ء میں منعقد ہونے والے ایک ضمنی انتخاب میں وہ ایک مرتبہ پھر مغربی پاکستان اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۷۰ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کے انتخاب میں غلام مصطفیٰ جتوئی شکست کھائی لیکن صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں وہ سندھ اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱۸)

۱۹۷۷ء میں انہوں نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور رکن اسمبلی بننے میں کامیاب رہے۔ (۱۹)

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخاب میں سید ظفر علی شاہ پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے سید منظور حسین شاہ کو شکست دی۔ بعد ازاں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور وفاقی وزیر صنعت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ (۲۰)

۱۹۸۸ء میں جونیجو حکومت کے خاتمہ کے بعد ظفر علی شاہ ایک مرتبہ پھر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ پیپلز پارٹی نے انہیں غلام مصطفیٰ جتوئی کے مقابلے میں قومی اسمبلی کا ٹکٹ جاری کر دیا۔ اس انتخاب میں ظفر علی شاہ نے غلام مصطفیٰ جتوئی کے مقابلے میں اسمبلی کا ٹکٹ جاری کر دیا۔ اس انتخاب میں ظفر علی شاہ نے غلام مصطفیٰ جتوئی کو تقریباً ۴۱ ہزار ووٹوں سے شکست دے کر سبھی سیاسی قیافہ شناسوں کو انگشت بدنداں کر دیا (۲۱) بعدازاں وہ وفاقی کابینہ میں پانی اور بجلی کے وزیر مملکت بنائے گئے۔ (۲۲)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں بھی سید ظفر علی شاہ نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کے دیرینہ حریف غلام مصطفیٰ جتوئی ملک کے نگران وزیر اعظم تھے اور ان کے بھائی غلام

مجتبیٰ جتوئی ظفر علی شاہ کے مدمقابل تھے۔ ظفر علی شاہ یہ انتخاب جیتنے میں بھی کامیاب رہے اور انہوں نے غلام مجتبیٰ جتوئی کو تقریباً ساڑھے پانچ ہزار ووٹوں سے شکست دے دی۔ (۲۳)

سید ظفر علی شاہ نے ۱۹۹۳ء میں بھی پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کے مدمقابل امیدواروں میں غلام مجتبیٰ جتوئی کے علاوہ خالد میاں راجپر بھی شامل تھے۔ سید ظفر علی شاہ نہ صرف اس انتخاب میں کامیاب ہوئے بلکہ بعد ازاں قومی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کے منصب پر بھی فائز ہوئے (۲۴)

۱۹۹۷ء میں سید ظفر علی شاہ نے پاکستان پیپلز پارٹی (شہید بھٹو گروپ) کی جانب سے قومی اور صوبائی، دونوں نشستوں پر انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا، قومی اسمبلی کے انتخابات میں وہ اصغر علی شاہ سے بُری طرح شکست کھا گئے۔ جب کہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں انہیں منظور حسین شاہ نے شکست دی (۲۵)

۲۰۰۲ء کے انتخابات سے قبل انہوں نے سجدہ سہو ادا کیا اور پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹیرین میں دوبارہ شامل ہو گئے۔ ان انتخابات میں وہ نیشنل الائنس کے خالد اختر جتوئی کو شکست دے کر پانچویں مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۲۶)

سید ظفر علی شاہ کے ایک بھائی سید منور علی شاہ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۸ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے علی نواز دھراج کو تقریباً ۱۸ ہزار ووٹوں سے شکست دی تھی۔ (۲۷) جبکہ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے سید منظور حسین شاہ کو تقریباً ۱۵ ہزار ووٹوں سے ہرایا (۲۸) منور علی شاہ نے اسی حلقہ سے ۱۹۹۰ء میں بھی انتخاب لڑا تھا مگر اس مرتبہ وہ سید آفتاب شاہ سے شکست کھا گئے تھے۔ (۲۹) ۱۹۹۳ء میں وہ پی ایس ۱۷ نوشہرو فیروز سے سندھ اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۳۰)

سید ظفر علی شاہ کے ایک اور بھائی سید انور علی شاہ ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا اور اپنے رشتے کے بھتیجے سید مراد علی شاہ سے شکست کھائی تھی۔ (۳۱) ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پی ایس ۱۶ نوشہرو فیروز ۲ سے کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے لیکن بعد ازاں دستبردار ہو گئے تھے (۳۲) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے یہی عمل ایک مرتبہ پھر دہرایا اور اس مرتبہ بھی ان کی دلچسپی فقط کاغذات نامزدگی داخل کروانے تک ہی محدود رہی (۳۳)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں سید منور علی شاہ اور سید انور علی شاہ دونوں نے ایک ہی حلقہ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر دونوں ہی سید مراد علی شاہ کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے منور علی شاہ کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی (شہید بھٹو گروپ) سے تھا جب کہ انور علی شاہ نے نیشنل پیپلز پارٹی (ورکرز گروپ) کی طرف سے انتخاب لڑا تھا۔ (۳۴)

حوالہ جات

۱۔ ادارہ۔ دی رولنگ کلاس۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۱۹۸۸ء۔ ص ۱۱۹، ۱۲۰

۲۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ حیدر آباد۔ جلد دوم۔ ص ۲۶۲، ۲۶۳

۳۔ تہور علی خاں۔ بائیوگرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ لاہور۔ ص ۳۰۸

۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ مورخہ ۲۸/مارچ ۱۹۸۰۔ ص ۲۴۷۶

۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۳۹

۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز۔ ۱۹۹۰۔ جلد دوم۔ ص ۳۱۵

۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹ مارچ ۱۹۹۲ء۔

۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۵۶

۹۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء۔ (جلد اوّل)۔ لاہور۔ ص ۱۷۹

۱۰۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ کراچی۔ ص ۹۰

۱۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۵۹۲

۱۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۵۱۴

۱۳۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۱۸۰

۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۲۳۹

۱۵۔ رضوان احمد طارق۔ سید میر مراد علی شاہ سے خصوصی گفتگو۔ مڈ ویک ایڈیشن۔ روزنامہ جنگ کراچی ۲۲/فروری ۲۰۰۶ء

۱۶۔ ادریس بختیار، علی حسن۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ۔ الیکشن اسپیشل ۹۰ء۔ ص ۸۳

۱۷۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین۔ حیدر آباد۔ ص ۲۶۳

۱۸۔ کریم بخش خالد۔ عوامی دور۔ کراچی۔ ص۔ ۸۹، ۹۰

۱۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء

۲۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۳۳۸

۲۱۔ ایضاً۔ ص ۳۳۸

۲۲۔ ڈوگر سنز۔ ہواز ہو اینڈ وہاٹ از وہاٹ۔ لاہور۔ ص ۵

۲۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء جلد دوم۔ ص ۷۳

۲۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۹۳ء

۲۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ ۔ جلد دوم۔ ص ۱۲۰، ۴۴۶

۲۶۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۷۵

۲۷۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص۔۳۶۳

۲۹۔ سمیع الوری و رانا عبدالستار شاکر۔ نوشہرو فیروز میں پیپلز پارٹی کی نئی حکمت عملی۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۵ر ستمبر ۱۹۹۳ء

۳۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۵۷

۳۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص۔۳۶۳

۳۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۲۶

۳۳۔ ایضاً۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۵۶

۳۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۔۱۹۹۷ء جلد دوم۔ ص ۴۴۵

وسان

وسان سندھ کے مشہور سمہ قبیلے کی ایک شاخ ہے جو زیریں سندھ میں آباد ہے ابتدا میں یہ لوگ دریائے ہاکڑہ کے کناروں پر رہائش پذیر تھے جو مشرقی سندھ کے صحرا میں بہتا تھا۔ پھر یہ لوگ سندھ کے مختلف علاقوں تک پھیل گئے۔ ۱۹۳۱ء میں سکھر بیراج کی تعمیر کے بعد ان کی زندگی میں انقلاب آیا اور ان کی زمینیں جو تھرپارکر اور سانگھڑ کے علاقے میں واقع تھیں' سیراب ہونے لگیں۔ (۱)

بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان کے مدیر کے مطابق وسان' سندھ کے مشہور اور ہر دلعزیز سمہ حاکم جام نظام الدین عرف جام نندہ کی اولاد ہیں۔ جام نندہ نے سندھ پر ۱۴۶۱ء سے ۹۔۱۵۰۸ء تک حکومت کی تھی۔ تالپوروں کے عہد میں اس قبیلے کے سردار غازی خاں وسان تھے۔ انہی کی اولاد میں پنو خاں وسان تھے جو ایک معروف آدمی تھے۔ پنو خان کے بیٹے محمد ہاشم کئی برس بنچ مجسٹریٹ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے رکن رہے۔ انہیں انگریزوں نے اعلیٰ خدمات کے عوض جاگیر اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۲۳ء میں ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے غلام محمد وسان (پ ۱۹۱۰ء) ان کے جانشین ہوئے۔ وہ اپنے قبیلے کے پہلے شخص تھے جنہوں نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔

غلام محمد وسان نے اپنی سیاست کا آغاز ضلعی سطح سے کیا۔ ۱۹۳۸ء میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور مسلم لیگ کی صوبائی شاخ کے رکن بن گئے۔ ۱۹۴۵ء میں وہ ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ' تھرپارکر کے صدر بنے۔ (۲) ۱۹۴۶ء میں انہوں نے سندھ اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا۔ جی ایم سید ان کی بجائے غلام حیدر شاہ کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دینا چاہتے تھے۔ جب جی ایم سید اپنی کوشش میں ناکام ہوئے تو انہوں نے اس اختلاف کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا اس انتخاب میں غلام محمد وسان کامیاب ہوئے اور جی ایم سید کے امیدوار غلام حیدر شاہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ (۳)

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء میں جب محمد ایوب کھوڑو نے پاکستان مسلم لیگ سے اختلافات

کے بعد اپنی جداگانہ سندھ مسلم لیگ بنائی تو اس میں غلام محمد وسان بھی اس کے ساتھ تھے۔ چنانچہ اسی برس جب سندھ اسمبلی کے انتخاب ہوئے تو وہ مسلم لیگ اور پیر صاحب پگارا کی مخالفت کی وجہ سے اسمبلی کے رکن منتخب نہ ہو سکے اور ان کے مد مقابل خان بہادر غلام قادر ناریجو ایم پی اے بننے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ غلام محمد وسان نے اس انتخاب میں حصہ لیا اور اس مرتبہ ایم پی اے بننے میں کامیاب ہو گئے۔ اسمبلی میں وہ ایوب کھوڑو کے ساتھ ساتھ اپوزیشن میں رہے۔ ۱۹۵۷ء میں انہوں نے حیدر آباد میں قائم ہونے والے اینٹی ون یونٹ محاذ میں شمولیت اختیار کی۔

غلام محمد وسان ۱۹۶۲ء میں پیر صاحب پگارا کی مخالفت کے باوجود قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب رہے۔ غلام محمد وسان اور امیر حیدر شاہ سندھ کے ایسے دو ارکان اسمبلی تھے جو حزب اختلاف میں بیٹھتے تھے۔

غلام محمد وسان، مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ کے عقیدت مندوں میں شامل تھے۔ مگر مخدوم صاحب پیر صاحب پگارا کے ساتھ ساتھ حکومتی پارٹی کے حمایتوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہی دنوں محمد خان جونیجو صوبہ مغربی پاکستان کے وزیر بن گئے اور اس زمانے کے قانون کے مطابق انہیں اپنی نشست سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس نشست پر ضمنی انتخابات منعقد ہوئے تو محمد حیات جونیجو کے بیٹے اس نشست پر امیدوار ہوئے۔ اب پیر پگارا اور مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ دونوں نے غلام محمد وسان پر زور ڈالا کہ وہ اس کی کامیابی کے لئے کوششیں کریں۔ مخدوم صاحب کے مجبور کرنے پر غلام محمد وسان نے محمد حیات جونیجو کے صاحبزادے کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ مگر خود حکومتی پارٹی میں آخر تک شامل نہیں ہوئے۔

۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخاب میں غلام محمد وسان نے محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعد ازاں انہوں نے آزاد امیدوار کے طور پر قومی اسمبلی کا انتخاب بھی لڑا اور سندھ مسلم لیگ کے صدر پیر غلام رسول شاہ کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۴)

غلام محمد وسان ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں بھی قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے مگر اس مرتبہ وہ کامیاب نہ ہو سکے اور پیپلز پارٹی کے امیدوار علی بخش تالپور سے شکست کھا گئے۔ (۵)

غلام محمد وسان کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ انہوں نے تمام عمر مسلم لیگ میں گزاری تھی۔ مگر ان کے بھتیجے نیاز محمد وسان نے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز پاکستان پیپلز پارٹی سے کیا۔ ۱۹۷۷ء میں انہوں نے این اے ۱۷۵ تھرپارکر ۳ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے۔ انہی

انتخابات میں ان کے کزن غلام حیدر وسان نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور وہ بھی کامیاب رہے۔(۶)

نیاز محمد وسان انتخاب میں کامیابی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی آخری کابینہ میں وزیر اعظم کے معاون خصوصی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مگر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جب جنرل ضیاء الحق نے اس کابینہ کو برطرف کیا تو نیاز محمد وسان کے سیاسی کیریر کا بھی خاتمہ ہو گیا۔(۷)

۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی نے اس قبیلے کے نوجوان سیاستدان منظور احمد وسان کو حلقہ پی ایس ۲۷ خیر پور۴ سے ٹکٹ دیا اور وہ دونوں مرتبہ کامیاب ہوئے۔(۸) ۱۹۸۸ء کے انتخابات کے بعد وہ وزیر اعلیٰ سندھ کے مشیر بنائے گئے تھے۔ ان کے پاس جیل کا قلمدان تھا۔(۹) ۱۹۹۳ء میں انہیں صوبائی اسمبلی کی بجائے قومی اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا۔ انہوں نے این اے ۱۶۲ خیر پور ا سے سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ غوث علی شاہ کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہے (۱۰)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں منظور حسین وسان نے پی ایس ۲۷ خیر پور کم سکھر سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے (۱۱) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ این اے ۲۱۵ خیر پور ا سے قومی اسمبلی کے رکن بنے (۱۲)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں منظور حسین وسان کے بڑے بھائی رئیس رحیم بخش وسان نے پی ایس ۲۵ خیر پور ۲ سے انتخاب لڑا مگر وہ پیر صاحب پگارا کے صاحبزادے صدرالدین راشدی سے شکست کھا گئے (۱۳) ۱۹۹۷ء میں رحیم بخش وسان نے پی ایس ۲۷ خیر پور کم سکھر سے کاغذات نامزدگی جمع کروائے مگر انتخابات میں باقاعدہ حصہ نہیں لیا (۱۴) ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

اسی قبیلے کے ایک فرد میر محمد وسان بھی ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء تینوں انتخابات میں سانگھڑ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ۱۹۸۸ء میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے تاہم وہ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۰ء دونوں انتخاب جیتنے میں کامیاب رہے۔ ۱۹۸۵ء میں ان کا حلقہ انتخاب پی ایس ۷۰ سانگھڑ ۵ تھا جبکہ ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء میں انہوں نے پی ایس ۶۸ سانگھڑ ۵ سے انتخاب لڑا تھا۔(۱۵)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں اسی قبیلے کے نواب علی وسان پی ایس ۳۲ خیر پور۴ اور ماہی خان وسان پی ایس ۸۳ سانگھڑ۴ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ہیں (۱۶)

حوالہ جات

۱۔ ادارہ۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن ۸۸ء۔ اسپیشل ایشو۔ ص ۲۳؛

۲۔ تہور علی خاں۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن۔ ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ لاہور۔ ص

۱۹

۳۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار۔ لاہور۔ ص ۲۸۸ تا ۳۹۱

۴۔ جی ایم سید۔ جنب گزاریم جن سین (جلد دوم) حیدر آباد۔ ص ۲۶۶ تا ۲۶۹

۵۔ ادارہ۔ پولیٹیکل فیملیز آف سندھ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن ۸۸ء۔ اسپیشل ایشو۔ ص ۱۲۳

۶۔ ایضاً۔ ص ۱۲۳

۷۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۸۸

۸۔ گزٹ آف پاکستان اسلام آباد۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۶۷۶۔ ۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء ص ۹۳۳۱

۹۔ طاہر محمود ڈوگر۔ ہواز ہو اینڈ وہاٹ از وہاٹ (ایڈیشن ۱۹۸۹ء)۔ لاہور۔ ص ۸

۱۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۰۴

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۵۶

۱۲۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۷۶

۱۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴۶۲

۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۴۵۶

۱۵۔ دی گزٹ آف پاکستان اسلام آباد۔ ۲۸/مارچ ۱۹۸۶ء۔ ص ۲۶۰۶' ۳/دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۶۸۸' ۱۱/نومبر ۱۹۹۰ء' ص ۹۳۴۴

۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۲۴۵' ۲۶۵

ہارون

کراچی کا ہارون خاندان پاکستان کا ایک سربر آوردہ اور انتہائی بارسوخ خاندان ہے۔ انہیں پاکستان کی سیاست میں جو اختیار و اقتدار حاصل ہوا اس کی ایک وجہ دولت تھی اور دوسرے خاندان کے سربراہ سر حاجی عبداللہ ہارون کی بصیرت۔ جنہوں نے لڑکپن میں اپنے کاروبار کا آغاز بازار میں سودا سلف بیچنے والے کی حیثیت سے کیا تھا اور جب ان کا انتقال ہوا تو وہ نہ صرف کروڑپتی شخص بن چکے تھے بلکہ سیاست کے باعث انہیں "سر" کا خطاب بھی حاصل ہو چکا تھا۔ (ا)

سر عبداللہ ہارون ۱۸۷۲ء میں سندھ کے ایک درمیانے درجے کے میمن خاندان میں پیدا ہوئے۔

اس برادری نے برعظیم کی سیاست میں جدوجہد آزادی سے بھی پیشتر یعنی ۱۸۴۲ء کے قریب عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ میمن برادری کے لوگ چونکہ شروع ہی سے تاجر پیشہ ہونے کے باعث ہندو بنیوں کی معاشی چالاکیوں اور ان لوگوں کی دوراندیشیوں سے بخوبی آگاہ تھے اس لئے انہوں نے ہندو کی معاشی ذہنیت کو بھی اچھی طرح سے بھانپ لیا تھا۔ ہندوؤں کے پیش نظر ہمیشہ یہی رہتا تھا کہ ہندوؤں کے علاوہ باقی تمام اقوام معاشی طور پر انہی کی دست نگر رہیں، لیکن ان ہندوؤں کی اس سوچ کے برخلاف میمن قوم نے اپنی ذاتی کوششوں اور اعلیٰ پالیسیوں اور عمدہ حکمت عملی کے باعث تجارت اور لین دین کے معاملات میں بہتر مقام حاصل کر لیا تھا لہٰذا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ان لوگوں نے سندھ کے اندر بھی اپنی تجارت بڑھائی تھی۔ اس سے پیشتر انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کے لئے یہاں کے میمن لوگوں کو خصوصی طور پر تہہ تیغ کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ اس کے بعد انگریزوں نے بمبئی اور سندھ کو مدتوں ایک ہی صوبے کے تحت اپنی حکومت میں شامل رکھا۔ بمبئی پریذیڈنسی میسور سے لے کر بلوچستان تک پھیلی ہوئی تھی، اس دور میں میمن اور بوہرے تجارت میں خاصی شہرت کے مالک

تھے۔ بہرصورت انگریز دور حکومت میں بھی میمن لوگوں نے اپنا وجود منوایا اور تحریک آزادی کے لئے کسی نہ کسی سطح پر کام جاری رکھا۔ یہی نہیں بلکہ ان لوگوں نے تو افریقہ میں بسنے والے بعض مسلمانوں کے حقوق کے لئے بھی احسن خدمات انجام دیں۔

سیٹھ عبداللہ ہارون کا خاندان چونکہ نہایت متمول تھا اس لئے بچے کی تعلیم و تربیت پر شروع سے آخر تک خصوصی توجہ دی گئی۔ سیٹھ عبداللہ ہارون ابھی نوجوانی کے عالم ہی میں تھے کہ انہوں نے برعظیم پاک و ہند کی سیاسی صورت حال کا گہری نظر سے مشاہدہ اور مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ سرسید احمد خان نے جو تعلیمی تحریک شروع کر رکھی تھی سیٹھ عبداللہ ہارون نے اس کا بھی خاصا اثر قبول کیا پھر بیسویں صدی کے طلوع ہونے سے پہلے برعظیم کے مسلمانوں کی جو صورت حال تھی کہ جس میں وہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں مسلمانان ہند کی سماجی اور سیاسی صورت حال پر غور و خوض کرنے لگے تھے۔ اس کا انہیں بخوبی احساس اور شعور تھا۔ ان کے آباؤاجداد میں بعض لوگ کانگرس میں شریک ہو کر پہلے ہی سے برعظیم کی سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔

۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک سیٹھ عبداللہ ہارون نے ملکی سیاست کا بڑی زیرک نظری سے جائزہ لیا تھا۔ اس دوران وہ بعض اوقات براہ راست بعض معاملات میں بالواسطہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے قریباً پورے برعظیم میں اپنی معاشی اور اقتصادی ذہانت اور بصیرت کا لوہا منوا لیا تھا یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ خود ایک بڑے تاجر اور مسلمانوں کے ہمدرد ماہر اقتصادیات کے طور پر پورے ملک میں مشہور ہو گئے تھے۔ کراچی ان کی تجارتی اور اقتصادی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنی مالی سرگرمیوں کو اب عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بھی استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ کئی علمی مدارس اور فلاحی کاموں میں ان کی مالی اعانت اور بے پناہ دلچسپی کے باعث وہ عوام الناس اور حکومتی حلقوں میں بھی ہردلعزیز اور مقبول ہو گئے تھے۔ ان کی کوششوں سے ایک حوالے سے مسلمانان سندھ کی معاشی اور تجارتی صورت حال میں بھی استحکام اور مضبوطی پیدا ہونے لگی تھی۔

جوں جوں سندھ میں معاشی اور تجارتی استحکام پیدا ہو رہا تھا اسی رفتار سے سندھ کے مسلمان انتظامی طور پر اس صوبہ کو ایک جداگانہ اور علیحدہ حیثیت دینے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ سندھ کو ایک الگ صوبہ بنوانے کے لئے سندھ کے مسلمانوں نے تنسیخ بنگال کے بعد سے ایک باقاعدہ تحریک کا آغاز کر دیا تھا۔ سندھ کی صورت حال یہ تھی کہ ۱۸۴۷ء کے بعد سندھ کے صوبے کو بمبئی کا حصہ بنا دیا گیا تھا اس سے پہلے یہ ایک علیحدہ صوبہ تھا' اور اس کی گورنری الگ ہوا کرتی تھی۔

سندھ کو ایک الگ صوبہ بنوانا دوررس سیاسی اہمیت کا حامل تھا لہٰذا اس مقصد کے لئے تمام

مسلمان زعماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مثلاً حاجی سر عبداللہ ہارون، سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر شاہنواز بھٹو، شیخ عبدالمجید سندھی، محمد ایوب کھوڑو، سید میراں محمد شاہ، جمشید نسروان جی، پیر علی محمد راشدی، سید علی مرتضیٰ شاہ، رئیس غلام محمد بھرگڑی، کے ساتھ ساتھ قائداعظم محمد علی جناحؒ، سر سلطان محمد آغا خان، میاں سر محمد شفیع، جناب شفاعت احمد خان، سر عبدالقیوم وغیرہ بھی اس تحریک میں پیش پیش تھے۔

اس طرح جب برطانیہ نے لندن میں گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا تو بھی ان کانفرنسوں میں شریک ہونے والے مسلمان رہنماؤں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ آئینی حوالے سے سندھ کا صوبہ الگ بنانے کے لئے نمائندگی کریں۔ حاجی سر عبداللہ ہارون، محمد ایوب کھوڑو اور جی ایم سید نے تو اس موقع پر قائداعظم محمد علی جناحؒ سے درخواست کی تھی کہ وہ گول میز کانفرنس کے دوران سندھ کی علیٰحدگی کا مسئلہ بھی زیر بحث لائیں چنانچہ قائداعظم محمد علی جناح نے سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیٰحدہ صوبہ بنانے کا پرزور مطالبہ کیا۔

پھر جب حکومت برطانیہ نے محسوس کر لیا کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہیں نزاکت اور شدت اختیار نہ کر جائے تو بالآخر ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک جداگانہ اور علیٰحدہ صوبہ بنا دیا گیا۔

سر عبداللہ ہارون نے پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی طرح سندھ میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی صوبہ سندھ کے قیام کے بعد تشکیل دی۔ یونینسٹ پارٹی میں تو ہندو اور دوسرے مذاہب اور قومیتوں کے لوگ شامل ہو سکتے تھے لیکن سندھ یونائیٹڈ پارٹی میں اکثریت مسلمانوں ہی کی تھی۔

سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے کرتا دھرتا اور بانیوں میں سر عبداللہ ہارون کا نام سب سے اول لیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ سر شاہنواز بھٹو بھی خاصے فعال تھے۔ لہٰذا جب ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت انتخابات ہوئے تو سندھ یونائیٹڈ پارٹی نے صوبے میں ساٹھ نشستوں میں سے چالیس نشستیں جیت لی تھیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس پارٹی کے دونوں سرکردہ رہنما سر سیٹھ عبداللہ ہارون اور سر شاہنواز بھٹو اپنی اپنی نشست پر شکست کھا گئے تھے، کانگرس بمشکل سات نشستیں حاصل کر سکی تھی۔ عارضی طور پر سر غلام حسین ہدایت اللہ نے وزارت بنالی لیکن جلد ہی وہ ناکام ہو گئے تو خان بہادر اللہ بخش نے کانگرس کے بے پناہ اشتراک و تعاون سے نئی وزارت بنالی تھی۔

سر سیٹھ عبداللہ ہارون اس سے پیشتر ۱۹۲۶ء سے کئی برسوں تک سندھ لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے رہے تھے لیکن اس بار کانگرس کے زور کے باعث وہ ناکام ہو گئے تھے۔ اس دوران سر سیٹھ عبداللہ ہارون نے اپنی وابستگیاں مسلم لیگ کے ساتھ بڑھالی تھیں۔ انہوں نے مسلم لیگ کی مرکزی کونسل سے بھی رابطہ کر رکھا تھا۔ سر عبداللہ ہارون مسلمانوں میں بے پناہ

مقبول اور مسلمانوں کے مسائل سے بخوبی آگاہ تھے اس لئے اس وقت تک مسلم لیگ نے بھی ان کی رائے اور خیالات کو اہمیت دینی شروع کر دی تھی۔ یہی نہیں بلکہ سر سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون نے سندھ میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں پر پوری توجہ مرتکز کر دی تھی۔ وہ اس صوبے میں مسلم لیگ کی قوت بڑھانے اور اس جماعت کے استحکام کے لئے بھی اہم خدمات انجام دینے لگے تھے۔

سر عبداللہ ہارون کی کوششوں اور مسلم لیگ کی مرکزی مجلس کے اشتراک و تعاون سے ۷ تا ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو ایک عظیم الشان کانفرنس کراچی کے عیدگاہ میدان (بندر روڈ) میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی صدارت کے فرائض قائداعظم محمد علی جناح نے ادا کئے' اس کانفرنس کا بنیادی مقصد یہی تھی کہ مسلمانان برعظیم کے لئے آئندہ کے لئے کوئی بہتر اور مستحسن لائحہ عمل ترتیب دیا جائے۔ کراچی میں منعقدہ اس کانفرنس میں سندھ کے سیاسی رہنماؤں کے علاوہ بنگال' سرحد' آسام' بہار' یو پی' انبالہ' ناگپور' میرٹھ اور پنجاب کے سرکردہ مسلم لیگی رہنماؤں نے شرکت کی تھی۔

اس کانفرنس میں کانفرنس کے روح رواں سر حاجی عبداللہ ہارون نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں سابقہ برسوں میں سندھ میں ہونے والے انتخابات اور ان کے نتائج کے حوالے سے بات چیت کی۔ انہوں نے سندھ کے مسلمانوں کے مستقبل کے پروگراموں اور منصوبوں کا ذکر بھی کیا۔

سر حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون کے اس استقبالیہ کے بعد مزید تقاریر اور بحث مباحثہ کے بعد آخری دن سندھ مسلم لیگ کانفرنس میں ایک اہم قرارداد منظور ہوئی کہ "اس برعظیم میں ہر طرح کے امن و امان' لوگوں کی سماجی' اقتصادی اور سیاسی ترقی اور بھلائی کے لئے ضروری ہے کہ دونوں بڑی قوموں' ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنا مستقبل خود متعین کرنے کا موقع دیا جائے۔ دونوں قوموں کو یہ سہولت فراہم کی جائے کہ وہ ہندوستان کے لئے بہتر اور مفید آئین کے لئے کام کر سکیں' اور دونوں قومیں اس خطہ میں اپنا جائز قانونی حق حاصل کر سکیں۔ یہ کانفرنس آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ ایسی آئینی اسکیم تیار کرے کہ جس کے تحت مسلمان اپنی آزادی اور خود مختاری حاصل کر لیں۔"

سندھ مسلم لیگ کانفرنس میں واشگاف الفاظ میں اس امر کا اظہار بھی کیا گیا کہ ہندوستان کو "مسلم ہندوستان" اور "ہندوستان" میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ مسلمان اپنے ملک میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کر سکیں۔ اس کے علاوہ مسلم وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کے لئے پورے پورے آئینی حقوق کا اہتمام کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ غیر مسلم یعنی ہندو وفاق میں مسلم اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی ضمانت موجود ہو۔

یہ قرارداد اصل میں شیخ عبدالمجید سندھی نے پیش کی تھی۔ یہاں پر ایک قرارداد نواب مشتاق احمد گورمانی نے بھی پیش کی تھی۔ دونوں قراردادوں پر سب سے پہلے سر سیٹھ عبداللہ ہارون نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان کی بھرپور تائید و حمایت کی۔ ان قراردادوں کو سندھ اسمبلی کے تمام ارکان اور کانفرنس کے دیگر شرکاء نے بھاری اکثریت سے منظور کر لیا تھا۔

مسلم لیگ کی اس کانفرنس میں اور بھی کئی قراردادیں اور اسکیمیں پیش کی گئی تھیں۔ ان میں ایک اسکیم "سرعبداللہ ہارون کمیٹی اسکیم" بھی تھی۔ اس اسکیم کے تحت بر عظیم میں مسلمانوں کی دو ریاستوں کے قیام کا ذکر کیا گیا تھا۔ ایک ریاست شمال مغرب میں کہ جہاں مسلمانوں کی تریسٹھ فیصد آبادی ہے' اور دوسری ریاست شمال مشرق میں کہ جہاں چون فیصد مسلمان ہیں' بنانے کی تجویز کی گئی تھی۔

پاکستان کی تاریخ میں مسلم لیگ کی اس کانفرنس اور اس میں پیش کی گئی قراردادوں کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس کانفرنس کے انعقاد' اس کے لئے خط و کتابت' قراردادوں کی تیاری اور کانفرنس کے بعد اہم تقاریر کی نقول تیار کر کے ہندوستان بھر کے دیگر اہم اور سرکردہ مسلمان رہنماؤں کو بھجوانے تک ہر مرحلے پر سرعبداللہ ہارون نے نہایت اہم اور بنیادی فرائض انجام دیئے۔

۲۲ر سے ۲۴ر مارچ ۱۹۴۰ء تک آل انڈیا مسلم لیگ کا ۲۷واں سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ اس تاریخی اجلاس میں قائداعظم محمد علی جناح نے تفصیلی تجزیئے کے ساتھ ہندوستان کی پوری تاریخ کا ایک جائزہ پیش کیا۔ اس تاریخ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے کردار اور دونوں قوموں کے جداگانہ تصورات' ثقافت' تہذیب و تمدن' مذہب و ملت اور سیاسی و سماجی رجحانات کا ذکر کیا۔

اس قرارداد کی سب سے پہلے چودھری خلیق الزماں اور بعد میں مولانا ظفر علی خان' حاجی سرعبداللہ ہارون' سردار اورنگ زیب' نواب اسماعیل' خاں' قاضی محمد عیسیٰ اور آئی آئی چندریگر نے حمایت و تائید کی۔ اس موقع پر حاجی سرعبداللہ ہارون نے اپنی تائیدی تقریر میں کہا تھا کہ یہ ایک امر واقعہ ہے اور سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ مسلمان سندھ کے راستے سے ہندوستان میں آئے۔ سندھ کے مسلمانوں کے سامنے سب سے پہلے یہ مسئلہ آیا تھا' جو اب مسلم لیگ کے سامنے ہے۔ ۱۹۳۸ء میں سندھ صوبائی مسلم لیگ نے شمال مغربی اور مشرقی مسلم اکثریتی حلقوں میں آزاد ریاستوں کے قیام کے لئے ایک قرارداد منظور کی تھی۔ اس کے بعد آج تک مختلف دستوری اسکیمیں اور تجویزیں بنائی گئیں جن پر غور ہوتا رہا اور آخرکار آج کی قرارداد پیش ہوئی ہے۔ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اسے بغیر کسی روک ٹوک کے منظور کر لیں۔"

سرعبداللہ ہارون مسلم لیگ کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بھی رہے اور ۱۹۲۶ء کے بعد گاہے گاہے لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوتے رہے۔ وہ "ڈیلی گزٹ" کے ڈائریکٹر کے طور پر

فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں حکومت برطانیہ نے انہیں سر کے خطاب سے نوازا تھا۔
اگست ۱۹۴۱ء میں وائسرائے ہند کی ڈیفنس کونسل کے لئے وزراء کا انتخاب عمل میں آ رہا تھا۔ مسلم لیگ اس کونسل کے لئے اپنے نمائندے بھجوانے کے لئے پس و پیش سے کام کر رہی تھی۔ انہی دنوں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا بمبئی میں ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اس وقت حاجی عبداللہ ہارون اور سردار اورنگ زیب مسلمانوں میں مفاہمت اور اتحاد کی کوششیں کرنے میں مصروف رہے۔ انہوں نے اس امر کا اظہار کیا کہ مسلم وزراء کی یہ گزارش تھی کہ انہیں ڈیفنس کونسل میں شامل ہونے پر وزراء کے طور پر لے لیا گیا ہے اس لئے انہوں نے ممبری قبول کرنے میں مسلم لیگ کے کسی فرمان کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ بہرصورت مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اس منطق پر قائل نہیں ہوئی تھی۔

سر عبداللہ ہارون مسلم لیگ میں اہم حیثیت کے مالک تھے اور قائداعظم محمد علی جناح کے معتمد تھے۔ قائداعظم ان پر بھرپور بھروسہ کرتے تھے۔ اس بھروسے ہی کے حوالے سے اگست ۱۹۴۱ء میں ایک اخبار نے لکھا تھا کہ "سیاست دان دھڑا دھڑ اپنی رائے بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا بعض کی رائے پہلے کچھ اور تھی اور اب کچھ اور ہے۔ مسلمانان ہند میں ایک گروہ ایسے اصحاب پر مشتمل ہے جن کے خلوص، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور بے نفسی پر زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً سیٹھ عبداللہ ہارون یا خلیق الزماں۔"

حاجی سر عبداللہ ہارون نے باقاعدہ طور پر عملی سیاست میں تحریک خلافت کے دوران حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد ملک میں آزادی کی خاطر جو بھی تحریکیں اٹھتی رہیں وہ ان میں باقاعدہ حصہ لیتے رہے۔ اسی حوالہ سے ان کے علی برادران سے بڑے قریبی روابط پیدا ہو گئے تھے۔ علامہ اقبال اور دوسرے کئی ممتاز رہنماؤں سے بھی ان کے قریبی اور ذاتی تعلقات تھے۔ کراچی میں ان کی رہائش گاہ ہندوستان بھر کے ممتاز قائدین کی مہمان گاہ اور قومی و سیاسی جدوجہد کا مرکز تھی۔

شریف الدین پیرزادہ اپنی تصنیف "پاکستان منزل بہ منزل" میں سر عبداللہ ہارون کے بارے میں لکھتے ہیں کہ سر عبداللہ ہارون ایک بے تاج بادشاہ اور تاجر ہی نہیں بلکہ "سیاسی قطب" بھی تھے۔ انہوں نے تحریک خلاف میں حصہ لیا اور بمبئی پریذیڈنسی سے سندھ کی علیحدگی کے معاملے میں جلیل القدر کارنامے انجام دیئے۔ سندھ صوبائی مسلم لیگ کے صدر اور قائداعظم کے انتہائی مخلص اور عقیدت مند پیرو تھے۔ ۸؍ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کے خطبہ استقبالیہ میں سر عبداللہ ہارون نے صوبوں کے واقعات کا حوالہ دینے کے بعد جہاں کانگرس برسراقتدار تھی، یہ کہا "مسلم فرقے کی ثقافت، اس کا مذہب اور خود اس کا اپنا وجود خطرے میں تھا اور وہ اکثریتی فرقے سے کسی عدل و انصاف کی توقع نہیں رکھتے تھے۔"

حاجی سر عبداللہ ہارون کانگریس کی پالیسیوں اور ان کے رویے سے ہمیشہ غیر مطمئن رہے۔ ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کو وہ بے کار اور ایک سراب سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہ مسلمانوں کی جداگانہ شناخت اور تشخص کے لئے کام کرتے رہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے ایک خط میں سر عبداللہ ہارون کو لکھا تھا کہ وہ سندھ کے مسلمانوں کی ترقی اور سیاسی استحکام کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں' اس سے وہ مطمئن ہیں۔ اسی طرح ۱۲ر جنوری ۱۹۴۲ء کے اپنے ایک مکتوب میں قائداعظم محمد علی جناح نے سر عبداللہ ہارون کو لکھا تھا کہ وہ سندھ کے مسلمانوں کو متحد اور منظم کرنے کے لئے کام کرتے رہیں۔

مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ سر عبداللہ ہارون ایک جامع الصفات شخصیت کے ملک تھے' انہوں نے تحریک آزادی اور تحریک پاکستان میں نمایاں اور اہم خدمات انجام دیں۔ وہ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا تنظیم کانفرنس کے' ۱۹۳۱ء میں آل انڈیا مسلم پوسٹل اینڈ آر ایم ایس یونین کے' ۱۹۳۲ء میں آل انڈیا مسلم یوتھ کانفرنس کے اور ۱۹۴۱ء میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ علاوہ ازیں انہوں نے برعظیم کی تحریک آزادی کے لئے ہمہ پہلو کوششیں کیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے عراق' افغانستان' ایران' شام' نجد' حجاز' مصر' مراکش' چین' الجزائر اور تیونس کے اخبارت کے نام کئی وضاحتی خطوط ارسال کئے اور ان خطوط میں ہندوستان کے مسلمانوں کے موقف کی موثر انداز میں نمائندگی کی۔ اس طرح مسلمانان ہند کے نقطۂ نظر کو بیرون ملک بھی خاصی شہرت اور وسعت ملی۔ (۲)

قائداعظم محمد علی جناح کی دعوت پر سر حاجی عبداللہ ہارون نے سندھ مسلم لیگ کی ترتیب و تنظیم اور پاکستان کی آزادی کے لئے بھرپور کوششوں کا آغاز کر دیا تھا۔ پھر اسی تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کی جدوجہد میں وہ ۲۷ر اپریل ۱۹۴۲ء کو داعئی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ (۳)

سر عبداللہ ہارون کی وفات کے بعد ان کا سیاسی ورثہ ان کے صاحبزادگان یوسف ہارون' محمود ہارون اور سعید ہارون نے سنبھالا۔

یوسف ہارون ۱۹۱۷ء میں کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی زندگی ہی میں عملی سیاست میں قدم رکھ دیا تھا' اور ۱۹۴۲ء میں جبکہ ان کی عمر فقط ۲۵ برس تھی' وہ ہندوستان کی مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے اسی دوران وہ کراچی کی مقامی سیاست میں بھی نمایاں ہونے کی کوشش کرتے رہے اور ۱۹۴۰ء میں کراچی میونسپل کارپوریشن کے رکن اور ۱۹۴۴ء میں میئر بننے میں کامیاب ہوئے۔ (۴)

یوسف ہارون نے اصل شہرت ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں کمائی۔ ان انتخابات میں وہ مسلم لیگ کی جانب سے صوبہ سندھ کی واحد سیٹ پر مرکزی مجلس قانون ساز کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ ان کے مدمقابل پیر علی محمد راشدی تھے جنہیں جی ایم سید کی حمایت حاصل تھی۔ یوسف

ہارون نے اس مقابلہ میں راشدی کو تقریباً ۹ ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ (۵)

قیام پاکستان کے بعد جب سندھ میں اکھاڑ پچھاڑ کا عمل شروع ہوا تو ۱۹۴۹ء میں یوسف ہارون سندھ کے وزیر اعلیٰ بنا دیئے گئے۔ وہ ضلع سکھر سے ایک ضمنی انتخاب کے ذریعے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔

یوسف ہارون کی وزارت اعلیٰ کا یہ دور بڑی مختصر مدت تک جاری رہا۔ وہ بہت جلد مستعفی ہو گئے اور ہائی کمشنر کے عہدے پر فائز ہو کر آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں پاکستان کی نمائندگی کرنے لگے۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۵۴ء تک کام کرتے رہے۔ (۶)

۱۹۵۵ء میں پاکستان کی مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ اور آئی آئی چندریگر کے مختصر دور حکومت میں ۱۸ر اکتوبر ۱۹۵۷ سے ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۷ء تک' فقط ۵۵ دنوں کے لئے مرکزی کابینہ میں وزارت پر فائز رہے۔ ان کے پاس امور کشمیر اور پارلیمانی امور کا قلمدان تھا۔ (۷)

ایوب خان کے دور حکومت میں یوسف ہارون' ایبڈو کی پابندیوں کے تحت سیاست سے دور رہے تاہم ایوب خان کے آخر ایام میں وہ صرف چند یوم کے لئے مغربی پاکستان کے گورنر بنائے گئے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں انہوں نے یحییٰ خان' بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن میں سیاسی اختلافات ختم کروانے اور پاکستان کا بحران دور کرنے کے لئے بڑی مخلصانہ کوششیں کیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن ان کا بڑا احترام کرتا تھا اور ان کی ایک بیمہ کمپنی کا ملازم رہ چکا تھا مگر یہ کوششیں بار آور ثابت نہ ہو سکیں۔

۱۹۷۱ء میں یوسف ہارون' امریکہ چلے گئے اور تاحال وہیں مقیم ہیں۔ وہ گاہے گاہے پاکستان آتے ہیں اور جب بھی آتے ہیں' سیاسی تبدیلیوں کی افواہیں زور پکڑ لیتی ہیں۔

محمود ہارون ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو کراچی میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ڈی جے کالج اور ایس سی شاہانی لاء کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ گھر کے ماحول کے باعث وہ بھی جلد سیاست کے میدان میں نمایاں ہو گئے۔

۱۹۳۷ء میں محمود ہارون کو قائداعظم کا اے ڈی سی بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں وہ پاکستان مسلم لیگ کونسل کے رکن بنے اور ۱۹۴۴ء میں کراچی پراونشل مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ ایک برس بعد وہ کراچی ہاربر یونین کے صدر بھی منتخب ہوئے تاہم ان کے سیاسی کردار کا آغاز ۱۹۴۵ء میں اس وقت ہوا جب وہ سندھ لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس رکنیت پر وہ ۱۹۵۰ء تک فائز رہے۔

۱۹۵۳ء میں وہ کراچی میونسپل کارپوریشن کے رکن اور میئر منتخب ہوئے تاہم ان کی میئر شپ فقط ایک برس جاری رہی۔ ۱۹۵۶ء میں ایک مرتبہ پھر مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن

منتخب ہوئے۔ ان کی یہ رکنیت ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کی آمد تک جاری رہی۔ (۹)

۱۹۶۵ء کے عام انتخابات میں محمود ہارون نے کراچی سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ انتخابات میں کامیابی کے بعد انہیں نواب کالاباغ نے مغربی پاکستان کی کابینہ میں شمولیت کی دعوت دی۔ محمود ہارون نے یہ دعوت قبول کرلی۔ مگر اس کے لئے انہیں اس وقت کے قانون کے مطابق اپنی قومی اسمبلی کی نشست خالی کرنا پڑی۔

۱۹۶۶ء میں اس نشست پر ضمنی انتخابات منعقد ہوئے تو محمود ہارون نے ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کے نمائندے کی حمایت کرنے سے انکار کردیا اور یوں اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ایوب خان نے محمود ہارون کی اس حرکت کا سخت برا منایا اور بہت جلد انہیں صوبائی کابینہ سے فارغ کردیا گیا۔

۱۹۶۸ء میں محمود ہارون لندن میں پاکستان کے ہائی کمشنر بنا دیئے گئے۔ (۱۰) صدر یحییٰ خان کے دور حکومت میں وہ مرکزی کابینہ کے رکن بنے اور ۱۵ر اگست ۱۹۶۹ء سے ۲۲ر فروری ۱۹۷۱ء تک اس کابینہ میں شامل رہے۔ ان کے پاس زراعت اور تعمیرات کا قلمدان تھا۔ (۱۱)

یوسف ہارون اور محمود ہارون کے سیاست میں دلچسپی لینے کے باعث ان کا کاروبار خاصا متاثر ہوا۔ پہلے ایوب خان کے دور حکومت میں انہیں جنرل موٹرز کے معاملے میں نقصان اٹھانا پڑا ایوب خان کے دور حکومت میں اس ادارے میں سے ہارون خاندان کے حصص ختم کردیئے گئے اور اس پر جنرل حبیب اللہ کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد جنرل ایوب خان نے محمود ہارون کو انٹر کانٹی نینٹل ہوٹلز کے مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدے سے بھی ہٹا دیا جو دراصل ہارون اور پان امریکن کا مشترکہ کاروبار تھا۔

۱۹۷۰ء میں ہارون خاندان نے شیخ مجیب الرحمٰن کی حمایت اور اعانت کی تھی جس کے باعث اس خاندان کو بھٹو دشمنی کا نشانہ بننا پڑا۔ بھٹو برسراقتدار آئے تو انہوں نے پہلے ڈان کے مدیر الطاف گوہر کو گرفتار کیا' جو ہارون خاندان کا اخبار تھا' پھر اخبار کے اشتہار بند کئے گئے بلکہ پرائیویٹ اداروں پر بھی زور ڈالا گیا کہ وہ ڈان کو اشتہار نہ دیں۔ ان کے نیوز پرنٹ کوٹے میں بھی پہلے تو کمی کردی گئی پھر اس کی فراہمی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردی گئیں۔ (۱۲) رفتہ رفتہ ہارون خاندان سیاست کے میدان سے خاصا دور چلا گیا۔

۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء کے مارشل لاء کی آمد کے بعد محمود ہارون ایک مرتبہ پھر سیاسی افق پر نمایاں ہوئے۔ جنرل ضیاء نے انہیں ۵ر جولائی ۱۹۷۹ء کو اپنی کابینہ میں بطور وزیرداخلہ شامل کیا' اور نومبر ۱۹۸۴ء تک وہ جنرل ضیاء کی ہر کابینہ کے رکن رہے۔ (۱۳)

جونیجو اور بے نظیر کے دور حکومت میں محمود ہارون سیاسی افق سے غائب رہے۔ تاہم اس دوران وہ ۱۹۸۸ء میں ایک مختصر مدت کے لئے وفاقی نگران کابینہ میں وزیر دفاع کے طور پر شامل ہے۔

۶/اگست ۱۹۹۰ء کو جب غلام اسحٰق خان نے بے نظیر حکومت کو رخصت کر کے نگران حکومتیں تشکیل دیں تو محمود ہارون کو سندھ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ محمود ہارون اس عہدے پر غلام اسحٰق خان اور نواز شریف کی رخصتی تک فائز رہے اور ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء کو رخصت ہوئے (۱۴) بے نظیر بھٹو کے وزیراعظم بننے کے بعد ۲۳ جنوری ۱۹۹۴ء کو جناب محمود ہارون ایک مرتبہ پھر سندھ کی گورنری پر فائز ہو گئے (۱۵) وہ اس عہدے پر ۲۲/مئی ۱۹۹۵ء تک فائز رہے (۱۶)

یوسف ہارون اور محمود ہارون کے تیسرے بھائی سعید ہارون بھی مختصر عرصہ کے لئے سیاست کے میدان میں آئے۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء میں قومی اسمبلی کا انتخاب بھی لڑا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ ۱۹/نومبر ۱۹۸۱ کو ان کا انتقال ہو گیا۔

سر عبداللہ ہارون کی پانچ صاحبزادیاں تھیں۔ جن میں سے تین دولت خانم، شوکت خانم اور لیلیٰ کی شادیاں سیاسی خاندانوں میں ہوئی ہیں۔ دولت خانم سندھ کے سابق گورنر غلام حسین ہدایت اللہ کے صاحبزادے انور حسین ہدایت اللہ کی اہلیہ تھیں۔ ان کا انتقال ۷/مارچ ۲۰۰۴ء کو ہوا (۱۷) شوکت خانم کی شادی قیام پاکستان سے قبل پنجاب اسمبلی کے رکن میر مقبول محمود سے ہوئی۔ میر مقبول محمود نے ۱۹۴۹ء میں ایک ہوائی حادثے میں وفات پائی جب کہ سر عبداللہ ہارون کی سب سے چھوٹی صاحبزادی لیلیٰ چیف آف مردان کے صاحبزادے عزیز سرفراز سے بیاہی گئی ہیں (۱۸) اور یوں میر افضل خان ان کے برادر نسبتی ہوتے ہیں۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں سر عبداللہ ہارون کے پوتے اور سعید ہارون کے صاحبزادے حسین عبداللہ ہارون بھی سیاست کے میدان میں نمایاں ہوئے۔

وہ ۱۹۸۳ء میں کراچی میونسپل کارپوریشن کی میئر شپ کے امیدوار تھے مگر جماعت اسلامی کے امیدوار عبدالستار افغانی سے شکست کھا گئے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں وہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور سندھ اسمبلی کے اسپیکر بننے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اسمبلی کو غیر جانبدارانہ طریقے سے چلانا چاہا مگر جلد ہی صوبائی وزیر اعلیٰ غوث علی شاہ سے ان کے اختلافات نمایاں ہونے شروع ہو گئے۔ نتیجہ حسین عبداللہ ہارون کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس تحریک کے حق میں ۸۸ اور مخالفت میں فقط ۲ ووٹ آئے اور نتیجے میں حسین عبداللہ ہارون کو اسپیکر شپ سے رخصت ہونا پڑا۔ (۱۸) (۱۹)

حسین عبداللہ ہارون نے باقی ماندہ عرصہ قائد حزب اختلاف کے طور پر گزارا۔ (۲۰)

انہوں نے ۱۹۸۸ء میں بھی اسی حلقے سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ ایم کیو ایم کے شیخ اسمٰعیل عظیم سے بُری طرح شکست کھا گئے (۲۱)

حوالہ جات

۱۔ ایماڈنکن ۔ بریکنگ دی کرفیو۔ برطانیہ۔ص۔۱۷۲

۲۔ محمد علی چراغ۔ اکابرین تحریک پاکستان۔ لاہور۔ص۔۳۸۹ تا۳۹۹

۳۔ الحاج میاں احمد شفیع۔ حاجی سر عبداللہ ہارون۔ کراچی۔ص ۲۳۸

۴۔ تہور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان۔ ایڈیشن۔ ۷۰۔۱۹۶۹ء لاہور۔ص ۳۷۸

۵۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ص۔۳۷۱

۶۔ کریگ بیکسٹر (مدیر)۔فرام مارشل لاءٹو مارشل لاء۔ نیو یارک۔ص۔۳۳۰

۷۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ص۔۴۷۵

۸۔ کریگ بیکسٹر (مدیر)۔فرام مارشل لاءٹو مارشل لاء۔ نیو یارک۔ص۔۳۳۰

۹۔ محمود ہارون سے منیر احمد منیر کا انٹرویو۔ پندرہ روزہ کھیل اور کھلاڑی۔ لاہور اکتوبر ۱۹۸۷ء۔ص ۹

۱۰۔ کریگ بیکسٹر (مدیر)۔فرام مارشل لاءٹو مارشل لاء۔ نیو یارک۔ص ۳۳۰

۱۱۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ص ۴۸۱

۱۲۔ ایماڈنکن ۔ بریکنگ دی کرفیو۔ برطانیہ۔ص۔۱۷۲،۱۷۳

۱۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ص۔۴۹۰ تا ۴۹۴

۱۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹ جولائی ۱۹۹۳ء

۱۵۔ ایضاً۔۲۴ جنوری ۱۹۹۴ء

۱۶۔ ایضاً۔۲۳ مئی ۱۹۹۵ء

۱۷۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸/مارچ ۲۰۰۴ء

۱۸۔ آنسہ عابدہ ریاست رضوی۔ اوراق زریں۔ کراچی۔ص ۹۸ تا ۱۱۳

۱۹۔ اقبال جعفری۔ تھرونگ اے اسپیکر آؤٹ۔ہفت روزہ دیو پوائنٹ لاہور۔ ۱۰ اپریل ۱۹۸۶ء۔ ص۔۷

۲۰۔ ایس محمد رضا۔ پرسنز ہوشیپ آورڈیسٹنی۔ کراچی۔ص۔۲۱۵

۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز جلد دوم۔ص۔۹۴۷

چوتھا حصّہ

صوبہ بلوچستان

اچکزئی

اچکزئی بلوچستان میں آباد ایک افغان قبیلہ ہے۔ اس قبیلے کے افراد پاکستان کے ساتھ ساتھ افغانستان میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔

ملک صالح محمد خاں لہڑی اپنی کتاب بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے) میں رقم طراز ہیں:

"ایک مورخ حیات خان نے عبدل اچکزئی قبیلے کو اپنی کتاب تاریخ افغانستان میں بور ترین قبیلہ سے ملایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ قبیلہ وہاں ابدال کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی دو شاخیں زیرک اور پنج پائی مشہور ہیں۔ اول الذکر میں پوپلزئی' بارکزئی اور الکوزئی اور موخر الذکر میں نورزئی' علیزئی' اسحاق زئی' خاکوانی اور ماکو شامل ہیں۔ (۱)

بارکزئی قبیلے کی ایک ذیلی شاخ اچکزئی کہلاتی ہے۔ اس شاخ کے افراد احمد شاہ درانی کے ہمراہ برصغیر آئے اور پھر موجودہ بلوچستان کے علاقے میں بس گئے جہاں وہ کوئٹہ اور پشین کے علاقوں میں آباد ہوئے۔

جب ۱۸۳۹ء میں افواج سندھ درہ خوجک سے گزریں تو اچکزئیوں نے مشکلات پیدا کیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد ان میں سے کئی اس بے قاعدہ فوج میں بھرتی کر لئے گئے جو قلعہ عبداللہ میں تیار کی گئی تھی۔ اس وقت ان کے معتبرین میں سے دو' حاجی سربلند خان ابن یار محمد اور عبداللہ خان تھے۔ موخر الذکر قلعہ عبداللہ خان کا موسس تھا۔ حاجی سربلند خان اور اس کا بھتیجا صالح محمد خان بحال کردہ سدو زئی خاندان کے طرفدار تھے اور آخر جنگ تک انگریزوں سے مخلص رہے۔ عبداللہ خان بارکزئیوں کا حامی تھا اور کابل میں انگریزوں کا ایک زبردست دشمن تھا۔ وہ اور اس کے دو بیٹے ۲۳ر ستمبر ۱۸۴۱ء کی جنگ میں کام آئے۔ اچکزئیوں نے دوسری جنگ افغانستان ۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۰ء کے ابتدائی مراحل میں پھر سر اٹھایا۔ چنانچہ ستمبر ۱۸۸۰ء میں چمن سے ایک لشکر جرار جنرل بیکر کی قیادت میں توبہ کی سطح مرتفع کو روانہ ہوا جس کے باشندوں نے پشین میں چھاپے مارنے کے علاوہ درہ خوجک بند کرنے کی کوشش کی تھی اور ٹیلی گراف کی تار کاٹ بھی

دی تھی اور اٹھا کر بھی لے گئے تھے۔ انہوں نے اطاعت قبول کر لی اور درہ خوجک کے پار چمن اور گلستان کی درمیانی چوکیوں کی حفاظت پر مامور کر دیئے گئے۔ اس ملازمت میں ۱۸۸۱ء میں توسیع کر دی گئی اور ان کے سردار، حاجی سربلند خان کو تاحیات پنشن دے دی گئی۔ ۱۸۸۲ء میں اچکزئی لوٹ مار کی شکایات پر توبہ کے ملوک کے ساتھ مذاکرات کئے گئے اور ایک لشکر اس علاقے کی گشت پر بھیجا گیا اور ۱۸۸۳ء میں لیوی سروس کو از سر نو تقسیم کیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں اچکزئیوں سے مالیہ وصول کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ۹۶-۱۸۹۵ء میں افغانستان کا وہ حصہ جو اب کوئٹہ پشین میں شامل ہے، افغان باؤنڈری کمیشن نے قطعی طور پر افغانستان سے الگ کر دیا۔ (۲)

۱۹۸۳ء میں اچکزئی قبیلے کے سربراہ غازی محمد خاں روی زئی نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ پاکستان میں اچکزئیوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے ان میں سے دو تہائی کوئٹہ میں، ۵۰ ہزار کے لگ بھگ چمن میں اور باقی کوئٹہ کے اطراف میں آباد ہیں ان کے علاوہ اچکزئیوں کی ایک مختصر تعداد افغانستان میں بھی موجود ہے۔ افغانستان میں بسنے والے اچکزئی کچھ نہ کچھ زمین پاکستان میں بھی رکھتے ہیں اور اس طرح ان کی وابستگی دونوں ممالک سے قائم رہتی ہے۔ (۳)

اچکزئی قبیلے کے جس پہلے فرد نے سیاسی میدان میں قدم رکھا وہ خان عبدالصمد خان اچکزئی تھے۔ انہوں نے ایک ایسے وقت میں اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا جب بلوچستان میں برطانوی سامراج کا تسلط اور بالادستی عروج پر تھی۔ انہوں نے میر عبدالعزیز کرد، نواب یوسف عزیز مگسی، میر گل خان نصیر اور میر غوث بخش بزنجو جیسی شخصیات کے دوش بدوش انگریزی طاقت کو چیلنج کر کے بلوچستان میں سیاسی شعور اور بیداری پیدا کی اور اپنے وطن میں بسنے والوں کو انقلابی تصورات سے روشناس کروایا۔

دسمبر ۱۹۳۲ء میں نواب یوسف عزیز مگسی کی انتھک محنت اور کوششوں کی بدولت جیکب آباد میں آل انڈیا بلوچ کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت خان عبدالصمد خاں اچکزئی نے کی۔ اس کانفرنس میں بلوچستان میں ایک آزاد حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ (۴)

یہ بلوچوں کو یکجا و متحد کرنے کی اولین سیاسی کوشش تھی جس نے بلوچستان کو ایک انتظامی وحدت کی حیثیت دے کر بلوچوں کو منظم و متحد کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔ (۵)

۲۹ر جنوری ۱۹۳۴ء کو عبدالصمد خاں اچکزئی کو کراچی کے ایک عوامی جلسہ میں تقریر کرنے اور بلوچستان سے باہر کے اخبارات میں مضامین شائع کرانے کے الزام میں گرفتار کر کے مچھ جیل بھیج دیا گیا۔ (۶) دو برس بعد عبدالصمد خان اچکزئی جیل سے رہا ہوئے تو انہوں نے ایک سیاسی جماعت قائم کرنے اور ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنے کی ٹھانی۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ سرمائے کی فراہمی تھا۔ یہ مسئلہ میر احمد یار خاں، خان آف قلات اور اس کے رفیق جرگہ کے بلوچ قبائلی سرداروں نے حل کیا اور یوں عبدالصمد خان اچکزئی نے کوئٹہ سے استقلال کے نام سے ایک ہفتہ

وار اخبار جاری کیا اور انجمن وطن کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی۔ جو اگرچہ انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ تو نہ تھی البتہ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل رکھ کر آزادی وطن کی داعی ضرور تھی۔ (۷)

"انجمن وطن" کا حلقہ اثر برٹش بلوچستان اور اس پر مشتمل بلوچ قبائلی اور مستجار علاقوں تک محدود تھا۔ انجمن وطن کا بنیادی مقصد آزادی وطن کے لئے جدوجہد کے علاوہ بلوچستان کو بشمول ریاست ہائے ایک صوبہ کی حیثیت دے کر اس میں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح اسمبلی کا قیام تھا۔ (۸)

قیام پاکستان سے پہلے عبدالصمد خان اچکزئی نے کوشش کی وہ بلوچستان کے شاہی جرگے کی جانب سے مجلس دستور ساز کے لئے نامزدگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں مگر بلوچستان میں میر جعفر خان جمالی اور قاضی عیسیٰ جیسے اکابرین کے باعث ان کی بات نہ بنی اور نواب محمد خان جوگیزئی دستور ساز اسمبلی کے لئے بلوچستان کے نمائندے نامزد ہو گئے۔ (۹)

الطاف حسن قریشی کے لفظوں میں قیام پاکستان کے بعد خان عبدالصمد خان اچکزئی نے پاکستان کے قیام کو دل سے تسلیم نہ کیا اور اس کے خلاف ریشہ دوانیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ (۱۰) نتیجہ ان کی قید و بند کی صورت میں برآمد ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی قید و بند کا تعلق اس جمہوری جدوجہد سے تھا جو وہ نئی مملکت کو عوام دوست، خوشحال اور جمہوری ملک بنانے کے لئے کر رہے تھے۔ انہوں نے شروع میں ہی کئے جانے والے حکومت کے آمرانہ اقدامات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور عوام کے حقوق کی خاطر طویل قید و بند کی بھی پروا نہ کی اور کراچی میں عبدالغفار خان اور جی ایم سید کے ساتھ مل کر پاکستان پیپلز پارٹی تشکیل دی۔ لیکن جلد ہی گرفتار ہو گئے۔ ۱۹۵۴ء میں جب وہ سات سال کی مسلسل قید کے بعد رہا ہوئے تو انہوں نے ور ور پشتون کے نام سے ایک سیاسی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ جس کے رہنما اصولوں میں جمہوری اور آئینی ذرائع کے ذریعہ جدوجہد اور عدم تشدد شامل تھے۔

ور ور پشتون نے پاکستان میں پشتونوں کے لئے لسانی، نسلی اور جغرافیائی بنیادوں پر جداگانہ صوبہ قائم کرنے کا مطالبہ کیا اور تجویز پیش کی کہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے پشتون علاقوں کو ملا کر ایک نئے صوبے کی تشکیل عمل میں لائی جائے۔ اس صوبے کا نام پشتونستان یا کوئی اور ایسا نام، جس سے ان کی قومیت کا اظہار ہو، رکھ دیا جائے۔ (۱۱)

۱۹۵۵ء میں جب ون یونٹ کا قیام عمل میں آیا تو عبدالصمد خان اچکزئی اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے وہ کراچی میں جی ایم سید کی قیام گاہ پر عبدالغفار خان کی صدارت میں منعقد ہونے والی اینٹی ون یونٹ کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ (۱۲)

۱۹۵۶ء میں خان عبدالصمد خان اچکزئی نے پاکستان کے دیگر ترقی پسند، جمہوری اور ترقی پسند

رہنماؤں کے ساتھ مل کر پاکستان نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی اور اپنی پارٹی ورور پشتون اس پارٹی میں ضم کر دی۔ (۱۳) ۱۹۵۷ء میں مولانا عبدالحمید بھاشانی بھی اس پارٹی میں شامل ہو گئے چونکہ وہ عوامی لیگ سے آئے تھے اس لیے پاکستان نیشنل پارٹی کا نام نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) رکھ دیا گیا۔ (۱۴)

۱۹۵۸ء میں ایوب خان کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد خان عبدالصمد اچکزئی نے تقریباً دس برس کا عرصہ پس دیوار زنداں گزارا۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں جب وہ رہا ہوئے تو کوئٹہ میں ان کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ جلوس شہر کے بارونق بازاروں سے گزرا تو سیاسی کارکنوں نے دیگر نعروں کے علاوہ پشتونستان زندہ باد اور پنجابی سامراج مردہ باد کے نعرے لگائے۔ اس پر پولیس حرکت میں آگئی اور خان عبدالصمد خاں اچکزئی سمیت ۱۶ افراد حراست میں لے لئے گئے۔ یہ جلوس چونکہ پشتون کارکنوں اور پشتون اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے تحت نکالا گیا تھا' اس لئے یہیں سے بلوچ پشتون اختلافات کی پہلی بار نشاندہی ہوئی اور یہی اختلاف علیٰحدگی میں تبدیل ہو تا گیا۔ یہاں تک اس نے نیشنل عوامی پارٹی کو واضح طور پر دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو ون یونٹ کا خاتمہ ہوا۔ اس اقدام کا بلوچستان کے طول و عرض میں بڑے جوش و خروش اور والہانہ انداز میں خیر مقدم کیا گیا لیکن اس میں چونکہ لسانی بنیادوں پر صوبوں کی از سرنو تشکیل کا اصول شامل نہ کیا گیا تھا اس لئے پشتون قیادت نے نئے صوبے کی موجودہ شکل میں مخالفت کی۔ یہ بات نیشنل عوامی پارٹی کی اعلیٰ قیادت (بشمول ولی خان) کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس مرحلے پر اختلافی مسائل کو نہ چھیڑا جائے کیونکہ اس وقت تو جمہوریت کی بحالی اور ون یونٹ کا خاتمہ ہی بڑی کامیابی ہے۔ لیکن خان عبدالصمد خاں اچکزئی اس بات پر متفق نہ ہوئے چنانچہ انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی سے علیٰحدگی اختیار کر کے پشتونخواہ نیشنل عوامی پارٹی کے نام سے اپنی جماعت بنا ڈالی۔ تاہم بعض پشتون اور بلوچوں کی اکثریت نیشنل عوامی پارٹی ہی میں رہی۔ (۱۵)

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں خاں عبدالصمد خان اچکزئی نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۷۳ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے نیپ' جمعیت کو مخلوط حکومت کو برطرف کیا تو خان عبدالصمد خان اچکزئی نے مسٹر بھٹو کے اس عمل کی اعلانیہ حمایت کی۔ ۲ دسمبر ۱۹۷۳ء کو خان عبدالصمد خان اچکزئی کو بم مار کر شہید کر دیا گیا۔ (۱۶)

۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء کے عرصہ کے دوران پشتون اور بلوچ کی قیادت میں اختلافات کی شدت کے باعث بلوچستان میں بلوچوں اور پشتونوں کے درمیان نفرت اور تعصب کی سیاست کو فروغ ملا لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ خان عبدالصمد خان اچکزئی اپنی عدم تشدد' پرامن اور آئینی ذرائع سے جدوجہد سے کبھی بھی دست بردار نہیں ہوئے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے قتل

کے بعد نیپ پشتونخواہ میں انتہا پسند، مہم جویانہ انداز سیاست پر یقین کرنے والی قیادت کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ (۱۷)

خان عبدالصمد اچکزئی کے قتل کے وقت ان کے بیٹے محمود خان اچکزئی صوبائی اسمبلی کے رکن تھے۔ (۱۸) اس سے قبل ۱۹۶۲ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر میر عطا اللہ مینگل کے ہاتھوں شکست کھا گئے تھے (۱۹) ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ان کا حلقہ انتخاب تھا این اے ۱۹۵ کوئٹہ ۲۔ اس حلقے میں ان کے مدمقابل پاکستان پیپلز پارٹی کے یحییٰ بختیار تھے۔ ان انتخابات میں محمود خان اچکزئی کی پوزیشن خاصی مستحکم تھی اور یحییٰ بختیار کی شکست بڑی نمایاں نظر آ رہی تھی۔ خود پاکستان پیپلز پارٹی کے رسالے الفتح نے بلوچستان کے انتخابی جائزے میں تحریر کیا تھا کہ یحییٰ بختیار کو اس حلقے سے کوئی "معجزہ" ہی کامیاب کروا سکتا ہے۔ (۲۰) مگر جب انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو یہ معجزہ رونما ہو چکا تھا اور یحییٰ بختیار ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ ووٹوں کی اکثریت سے انتخاب جیت چکے تھے۔ (۲۱)

۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران کوئٹہ میں چند پولیس والوں کے قتل کے بعد حکومت نے محمود خان اچکزئی پر کئی فوجداری مقدمے قائم کر دیئے۔ نتیجتہً انہیں افغانستان جلاوطن ہونا پڑا (۲۲) ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں وہ خود تو انتخاب میں حصہ نہیں لے سکے البتہ ان کے ہم قبیلہ محمد قاسم خان اچکزئی ضرور قومی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے (۲۳) (اسی انتخاب میں اچکزئی قبیلے کے نصیر احمد باچہ بھی پی بی ۸ پشین ۴ سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے مگر بعد ازاں وہ اپنے والد برات خاں اچکزئی کے قتل کی وجہ سے عملی سیاست میں حصہ نہیں لے سکے تھے) ۱۹۸۸ء میں بھی محمود خان اچکزئی نے انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ اس انتخاب میں ان کی پارٹی، پختون خواہ ملی عوامی پارٹی کا کوئی امیدوار قومی اسمبلی کے انتخاب میں تو کامیاب نہیں ہو سکا البتہ ان کی پارٹی کے دو امیدوار بلوچستان اسمبلی تک ضرور پہنچ گئے۔ (۲۴)

۱۹۹۰ء کے انتخابات میں محمود خان اچکزئی نے پختون خواہ ملی عوامی پارٹی کی جانب سے پانچ امیدواروں کو قومی اسمبلی کے لئے ٹکٹ دیا مگر ان کے اپنے علاوہ ان کی پارٹی کا کوئی اور امیدوار قومی اسمبلی تک نہیں پہنچ سکا۔ البتہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں ان کی پارٹی کے تیرہ امیدواروں میں سے تین امیدوار ڈاکٹر کلیم اللہ، جناب عبدالقادر اور جناب عبدالحمید خان اچکزئی بلوچستان اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ (۲۵)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں محمود خان اچکزئی دو حلقوں این اے ۱۹۷ء کوئٹہ و چاغی اور این اے ۱۹۸ء پشین و قلعہ عبداللہ سے ایم این اے منتخب ہوئے (۲۶) جب کہ ان کے عزیز عبدالحمید اچکزئی (تاریخ وفات: ۸/ جنوری ۲۰۰۰ء) پی بی ۹ قلعہ عبداللہ سے اور ان کی پارٹی کے دیگر ارکان ڈاکٹر کلیم اللہ خان، عبدالقہار خان داون اور عبید اللہ جان، بالترتیب پی بی ۱ اور پی بی ۸ اور پی بی ۱۱ سے

نہ صرف بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۷) بلکہ تمام کے تمام افراد صوبائی کابینہ میں بھی شامل کر لیے گئے (۲۸) محمود خان اچکزئی نے بعد ازاں این اے ۱۹۸ کی نشست خالی کر دی جس پر ضمنی انتخاب میں ان کے بھائی ڈاکٹر حامد اچکزئی ایم این اے منتخب ہوگئے (۲۹)

۱۹۹۷ء میں محمود خان اچکزئی نے حسب سابق این اے ۱۹۷ اور این ۱۹۸ سے انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ وہ دونوں نشستوں پر شکست کھا گئے (۳۰)

محمود اچکزئی نے ۲۰۰۲ء میں بھی قومی اسمبلی کی دو نشستوں پر انتخاب لڑا۔ این اے ۲۸۹ کوئٹہ پر وہ متحدہ مجلس عمل کے مولوی نور محمد سے شکست کھا گئے تاہم این اے ۲۶۴ قلعہ عبد اللہ سے وہ اپنی نشست بچانے میں کامیاب ہوگئے (۳۱)

محمود اچکزئی کے بھائی ڈاکٹر حامد اچکزئی نے ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء دونوں مرتبہ بلوچستان اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ۱۹۹۷ء میں وہ انتخاب میں ناکام رہے مگر انہوں نے اپنی ناکامی کو عدالت عالیہ میں چیلنج کر دیا۔ جس پر ایک طویل عدالتی عمل کے بعد ۱۶راگست ۱۹۹۹ء کو انہیں صوبائی اسمبلی کا رکن قرار دے دیا گیا (۳۲) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ متحدہ مجلس عمل کے حافظ حمد اللہ کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۳۳)

۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر حامد اچکزئی کے صاحبزادے عبد المجید اچکزئی نے بھی سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور پی بی ۱۳ قلعہ عبداللہ ۳ سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۳۴)

اچکزئی قبیلے کے جو دیگر افراد عملی سیاست میں ہیں ان میں مولانا محمد زمان خان اچکزئی کا نام بڑا معروف ہے۔ وہ جمعیت العلمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) میں مولانا فضل الرحمٰن کے بعد دوسری بڑی سیاسی شخصیت سمجھے جاتے ہیں (۳۵) ۱۹۷۳ء میں وہ پاکستان کی پہلی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے (۳۶) ضیاء الحق کے مارشل لا کے دوران وہ ۲۱راپریل ۱۹۷۸ء سے ۲۳راگست ۱۹۷۸ء تک مرکزی وزیر رہ چکے ہیں (۳۷) ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پی بی ۷ پشین ۲ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر ناکام رہے (۳۸)

اچکزئی قبیلہ کے ایک اور فرد جو عملی سیاست میں متحرک ہیں، ڈاکٹر نور محمد اچکزئی ہیں۔ انہوں نے اپنی سیاست کا آغاز زمانہ طالب علمی میں طلبہ سیاست سے کیا وہ پنجاب میں ویٹرنری کالج کے طالب علم تھے اور اسی زمانے میں پی ایس ایف پنجاب کے صدر تھے۔ ایوب خان کے دور حکومت میں وہ جیل گئے اور یحییٰ خان کے دور میں رہا ہوئے۔ نیپ اور پیپلز پارٹی کے تصادم کے نتیجے میں وہ افغانستان چلے گئے اور وہاں چار سال رہے۔ پھر پاکستان آئے، حیدر آباد سازش کیس میں گرفتار ہو کر جیل چلے گئے۔ ۱۹۷۸ء میں رہا ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں ایل ایل بی کیا اور وکالت کے پیشے سے منسلک ہوگئے۔ وہ پی این پی کے صوبائی جنرل سیکرٹری رہے پھر اختلاف کی بناء پر علیحدگی اختیار کر لی۔ ۱۹۹۰ء

کے اواخر میں نواب اکبر بگٹی کی جمہوری وطن پارٹی میں شامل ہوگئے۔ اور اس پارٹی کے صوبائی جنرل سکریٹری کے منصب پر فائز ہوئے (۳۹)

اچکزئی قبیلے کے ایک اور سیاسی رہنما حاجی برات خان اچکزئی تھے۔ ان کا تعلق نیشنل عوامی پارٹی سے تھا۔ وہ ۱۹۷۴ء کے ضمنی انتخابات اور ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں شریک ہوئے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۷۳ء میں جب عبدالصمد اچکزئی شہید ہوئے تو حاجی برات خان اچکزئی ان کے قتل کے الزام میں گرفتار کیے گئے تھے مگر بعد ازاں عدم ثبوت کی بنا پر رہا کر دیئے گئے تھے۔

۱۹۸۳ء میں حاجی برات خان اچکزئی قتل کر دیئے گئے جس کے بعد ان کے صاحبزادے حاجی نصیر احمد باچا خان نے ۱۹۸۵ء کے صوبائی انتخابات میں حصہ لیا اور پی بی ۸ پشین ۵ سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۴۰)

حوالہ جات

۱۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔ کوئٹہ۔ ص ۵۳

۲۔ پروفیسر ایم انور رومان۔ بلوچستان کے قبائل (ضلعی گزیٹیر سے انتخاب) حصہ اول۔ کوئٹہ۔ ص ۴۷ تا ۵۱

۳۔ بلوچستان بائی ویز۔ اے اسٹار اسپیشل رپورٹ۔ اسٹار۔ کراچی۔ ۱۷ر نومبر ۱۹۷۳ء۔ ص ۱۰، ۱۱

۴۔ طاہر بزنجو۔ بلوچستان۔ سیاست میں اتار چڑھاؤ۔ کوئٹہ۔ ص ۴۵

۵۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۰۴

۶۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص: ۴۳۵

۷۔ ایضاً۔ ص ۴۴۱

۸۔ طاہر برنجو۔ بلوچستان۔ سیاست میں اتار چڑھاؤ۔ کوئٹہ۔ ص ۴۶

۹۔ الطاف حسن قریشی۔ بلوچستان کی سچی کہانی۔ اردو ڈائجسٹ۔ ستمبر ۱۹۶۹ء۔ ص ۴۴ تا ۴۷

۱۰۔ الطاف حسن قریشی۔ بلوچستان کے بائیس برس۔ اُردو ڈائجسٹ۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء۔ ص ۳۱۰

۱۱۔ طاہر برنجو۔ بلوچستان۔ سیاست میں اتار چڑھاؤ۔ کوئٹہ۔ ص ۴۶، ۴۷

۲۱۔ جی ایم سید۔ ''کجھ خط'' (سندھی)۔ حیدر آباد۔ ص ۴۱

۱۳۔ طاہر برنجو۔ بلوچستان سیاست میں اتار چڑھاؤ۔ کوئٹہ۔ ص ۴۷

۱۴۔ جی ایم سید۔ کجھ خط (سندھی)۔ حیدر آباد۔ ص ۴۱

۱۵۔ طاہر محمد خان۔ سیاسیات بلوچستان۔ کوئٹہ ص ۲۰۶، ۲۲۸، ۲۳۲، ۲۳۳

۱۶۔ طاہر بزنجو۔ بلوچستان۔ سیاست میں اتار چڑھاؤ۔ کوئٹہ۔ ص ۴۸

۱۷۔ ایضاً۔ص ۴۸
۱۸۔ اختر ندیم۔ آیئے ہم آپ کو بلوچستان کی سیر کراتے ہیں۔ صحافت لاہور۔ بلوچستان نمبر۔۱۶/ فروری تا ۲۲/فروری، ۲۴/فروری تا ۳/مارچ ۱۹۷۸ء۔ص ۶۰
۱۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔۳۰/اپریل ۱۹۲۶ء
۲۰۔ ابو سفیان۔ بلوچستان میں انتخابی سرگرمیوں کا جائزہ۔ہفت روزہ الفتح کراچی۔۴/۱۱/ مارچ ۱۹۷۷ء۔ص ۲۷
۲۱۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ص ۳۱۲
۲۲۔ ماہنامہ ہیرالڈ۔نومبر ۱۹۸۸ء۔ کراچی ص ۱۲۶
۲۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ لاہور۔ص ۵۰۶
۲۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ لاہور۔ص ۳۹۴
۲۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۳۵، ۵۰۷
۲۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔۱۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۳۲۰، ۱۳۲۱
۲۷۔ ایضاً۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ص ۱۹۳۶
۲۸۔ منصور اکبر کنڈی۔ پی کے ایم اے پی، گیننگ پولیٹیکل گراؤنڈ۔ ویک اینڈ پوسٹ (روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ) لاہور۔۱۳/مئی ۱۹۹۴ء
۲۹۔ روزنامہ جنگ کراچی۔۴/دسمبر ۱۹۹۳ء
۳۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ جلد دوم۔ص ۱۵۴، ۱۵۵
۳۱۔ ایضاً۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ص ۹۷، ۹۸
۳۲۔ پروفیسر عرفان احمد بیگ، بلوچستان میں پارلیمانی سیاست کا آغاز تاخیر سے ہوا۔ روزنامہ جنگ کراچی۔سنڈے میگزین۔۲۱/اگست ۲۰۰۵ء
۳۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد دوم۔ص ۳۴۹
۳۴۔ ایضاً۔ص ۳۴۹
۳۵۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان (حصہ اول)۔ کراچی۔ص ۳۹
۳۶۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ نوائے وقت کراچی۔۲۰/مئی ۱۹۸۷ء
۳۷۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ص ۴۹۱
۳۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ص ۴۷۳

۳۹۔ امان اللہ شادیزئی ۔ ہم افغانستان کیوں گئے؟ (ڈاکٹر نور محمد اچکزئی کا انٹرویو) ۔ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۸/تا ۱۴/فروری ۱۹۹۲ء ۔ص/۲۱
۴۰۔ اختر علی بلوچ ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد دوم) ۔کراچی ص ۲۷۷ تا ۲۸۴

بزنجو

بزنجو، جسے وہ خود بیزنجو کہتے ہیں، جھالاوان کا ایک معروف قبیلہ ہے۔ لالہ ہتو رام نے اپنی معروف کتاب تاریخ بلوچستان میں لکھا ہے کہ بزنجو اصل میں رند بلوچوں۔ تے تعلق رکھتے ہیں اور شروع شروع میں میر چاکر رند کے ہمراہ بلوچستان آئے تھے۔ (۱) بعض دوسرے مورخین مثلاً صالح محمد خاں لہڑی بھی اس خیال کی تائید کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جب میر چاکر رند سبی اور کچھی کی طرف نقل مکانی کر گئے تو یہ قبیلہ (یعنی بزنجو) مینگلوں کے ساتھ وڈھ اور نال (جھالاوان) میں آباد ہو گئے۔ (۲) تاہم بلوچستان کے ایک اور اہم مورخ میر گل خاں نصیر اس خیال کی تردید کرتے ہیں اور اسے بالکل بے بنیاد اور غلط قرار دیتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ جب تمام براہوی قبائل کے سردار اعلیٰ میر بجار میروانی اور جدگالوں کے درمیان لڑائی ہوئی تو بزنجو قبیلے کے سردار خیل طائفے حملانی کے مورث اعلیٰ میر حمل نے میر بجار کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جب میر بجار فتح یاب ہوا اور اس نے جدگالوں کو جھالاوان سے نکال باہر کیا تو اس نے جھالاوان کے مفتوحہ علاقے کو اپنے براہوی قبائل میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم میں نال کا علاقہ میر حمل کے حصے میں آیا۔ جس پر وہ آج تک قابض ہے۔ بالفاظ دیگر حملانی جو بیزنجو قبیلے کا سردار خیل طائفہ ہے۔ رند و لاشار کی جھالاوان آمد سے پہلے ہی اس سرزمین پر قدم رکھ چکا تھا (۳)

میر گل خان نصیر مزید لکھتے ہیں۔

دوسرے بلوچ قبائل کی طرح بیزنجو بھی خالص یک جدی قبیلہ نہیں ہے۔ اس میں تمرانی اور چنال شامل ہیں جو بنیادی طور پر جدگال ہیں، سیاہیاد اور ہومرانی بھی شامل ہیں جو رخشانی ہیں۔ اس طرح کئی دوسرے طائفے ہیں جن سے مل کر بیزنجو قبیلہ بنا ہے۔

جہاں تک نام بیزنجو کا تعلق ہے۔ مسلمہ اصول کے مطابق یہ قبیلے کے مورث اعلیٰ یا جد امجد کا نام ہے جس کے معنی ہیں بیزن کی اولاد۔ لفظی بندش کے لحاظ سے یہ نام بنگالی ہے لیکن

اس کا شمار براہوئی قبائل میں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ یقینی طور پر بیزن کی اولاد ہیں لیکن قبیلے کی ذیلی شاخوں کی نسبت سے خصوصیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے بیزن کی بنیاد سے کون ہے لیکن علاقے میں قدیم سکونت اور دوسرے کوائف سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تمرانی طائفہ اصل بیزنجو ہے اور حملائی' زرک زئی اور نوشیروانی کی طرح میر بجار کے براہوئی قبائل سے آکران میں شامل ہوا ہے۔ یہ رائے تشریح طلب ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ بیزن وہ تورانی پہلوان ہے جو توران (موجودہ جھالاوان) کے بادشاہ افراسیاب کی بیٹی مشیزہ کا عاشق تھا اور جسے افراسیاب نے گرفتار کرکے چاہ زنداں میں ڈال دیا تھا اور مشیزہ کو اپنے محل سے نکال دیا۔ مشیزہ' بیزن کے عشق میں گرفتار دربدر اور خاک بسر پھرتی رہی تاآنکہ رستم بن ذال کے پاس پہنچی اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ رستم نے اس کی حالت پر رحم کھا کر بیزن کو زندان سے رہائی دلا دی۔ بیزنجو' اسی بیزن کو اپنا مورث اعلیٰ کہتے ہیں۔ (۴)

جن دنوں وسط ایشیائی تجارت جھالاوان کے راستے سے ہوتی تھی تو بزنجو نال اور لسبیلہ کی سرحد کے درمیان کے راستے کے محافظ تھے۔ میر محمود خان اول (۹۴-۱۷۹۳ء) کے وقت ایک افغان قافلہ لوٹا گیا اور افغانوں نے خضدار میں خان سے شکایت کی' بزنجو سردار' میر کھیرا نے صلح نہ کی' چنانچہ اس کے اور خان کے سپاہیوں کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں وہ خود اور اس کے ۷۰ رفقاء میری بھٹ ڈھیری پر مارے گئے۔ بعد میں خان نے سردار کو مشکے میں بینٹ کی زمین بطور معاوضہ دی اور اس کے نابالغ بیٹے فقیر محمد کو قبیلہ کا سردار تسلیم کرلیا۔

بزنجو ہمیشہ خان قلات سے اچھا رویہ رکھتے ہیں۔ جلاوطنی کے دوران میر نصیر خان دوم کو بزنجوؤں نے نال میں پناہ دی اور جب شیر دل خان نے میر خداداد خان کو تخت سے محروم کر دیا تو اسے بھی پناہ دی۔ جب میر خداداد خان اپنے ابتدائی دور میں ساراوان اور جھالاوان کے سرداروں سے متصادم تھا تو بزنجو سردار نے ہمیشہ صلح کا کردار ادا کیا۔ (۵)

میر خداداد خان جب دوبارہ قلات کی گدی پر بیٹھے تو انہوں نے بزنجو سردار' سردار فقیر محمد خان بزنجو کو کیچ مکران کا نائب مقرر کیا۔ وہ تقریباً ۴۵ برس اس عہدے پر فائز رہا اس نے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیئے اور مکران کو ہر لحاظ سے پرامن اور مطمئن رکھا۔ یہ اسی کے تدبر کا نتیجہ تھا کہ خان میر خداداد خان کے خلاف بلوچستان کی ہمہ گیر بغاوت میں مکران نے کوئی حصہ نہ لیا۔

۱۸۷۲ء میں میر خداداد خان نے داروغہ عطا محمد کو کیچ کی حکومت پر مامور کیا جس سے دل شکن ہو کر سردار فقیر محمد خان مکران چھوڑ کر آواران اور جھاؤ چلا گیا۔ مگر اس کے مکران سے نکلتے ہی کیچ میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اب میر خداداد خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس

نے داروغہ عطا محمد کو واپس بلا کر مکران کی حکومت پھر سردار فقیر محمد بزنجو کے سپرد کر دی۔ (۶)
سردار فقیر محمد خان بزنجو نے ۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد قبیلے کی سرداری اس کے بیٹے میر کھیرا کے ہاتھ آئی جس نے نال میں رہائش اختیار کی۔ جبکہ اس کے دوسرے بیٹے میر صفر خان نے جھاؤ کو اپنا مسکن بنایا۔ (۷)
۱۹۱۷ء میں میر صفر خان کے ایک بیٹے نے جنم لیا۔ جس کا نام غوث بخش رکھا گیا۔ اسی غوث بخش نے آگے چل کر میر غوث بخش بزنجو کے نام سے شہرت پائی اور بلوچستان کی سیاسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔
غوث بخش بزنجو ابھی بہت چھوٹے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ ان کی جائیداد کو کورٹ آف وارڈ میں لے لیا گیا۔ اس وقت کے پولیٹیکل ایجنٹ نے ان پر خاص توجہ دی اور انہیں کوئٹہ میں سنڈیمن اسکول میں اور پھر کوئٹہ کے زلزلے کے بعد کراچی میں سندھ مدرسہ میں تعلیم دلوانے کا بندوبست کیا۔
میر غوث بخش بزنجو فٹ بال کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔ چنانچہ جن دنوں وہ سندھ مدرسہ میں زیر تعلیم تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایک فٹ بال ٹیم کراچی کھیلنے کے لئے آئی۔ غوث بخش بزنجو اس ٹیم کے خلاف اتنا اچھا کھیلے کہ ٹیم کے نگراں ڈاکٹر ضیاء الدین کے اصرار پر انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔
ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی برصغیر کی سیاست کا بیرومیٹر تھی۔ میر غوث بخش بزنجو بھی جو اگرچہ ایک مکمل اسپورٹس مین کی حیثیت سے وہاں گئے تھے، اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ انہیں کانگریس کے نظریات نے متاثر کیا اور وہ اس کے کارکن بن گئے۔ ۱۹۳۸ء کے اوائل میں وہ کراچی واپس آ گئے اور یہاں بلوچ لیگ نامی ایک تنظیم سے وابستہ ہو گئے۔ (۸)
تقریباً اسی زمانے میں ریاست قلات کے نوجوان کارکنوں نے میر عبدالعزیز کُرد کی قیادت میں ایک سیاسی جماعت تشکیل دی تھی جس کا نام قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی تھا۔ میر گل خاں نصیر اس پارٹی کے نائب صدر اور ملک فیض محمد خان یوسف زئی اس پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ میر غوث بخش بزنجو کو جب اس تنظیم کے بارے میں علم ہوا تو وہ بھی اس میں شامل ہو گئے اور بہت جلد پارٹی کے اہم رہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔
۱۹۴۵ء میں بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ساتھ الحاق کر لیا۔ ۱۹۴۷ء میں میر غوث بخش بزنجو ریاست قلات کی پارلیمنٹ کے ایوان عام کے رکن منتخب ہو گئے۔ اس حیثیت میں انہوں نے پاکستان سے قلات کے الحاق کے سوال پر وہ شہرۂ آفاق تقریر کی جو تاریخ کا ایک حصہ بن گئی۔ اس تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ

میں پاکستان کے ساتھ الحاق کی مخالفت کی اور بلوچستان کے آزادانہ وجود برقرار رکھنے کی حمایت کی۔

میر غوث بخش بزنجو کی اس تقریر کی تائید بعد ازاں دیوان عام اور دیوان خاص کے دیگر ارکان نے بھی کی اور دونوں ایوانوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کو نامنظور کر دیا۔ اس فیصلے سے حکومت پاکستان کے ارباب اقتدار کو مایوسی ہوئی اور انہوں نے ایک ایسی پالیسی پر عملدر آمد شروع کر دیا جس سے وہ دوستانہ فضا جو خان قلات اور حکومت پاکستان کے درمیان قائم چلی آ رہی تھی، مکدر ہونے لگی۔

۱۷ر مارچ ۱۹۴۸ء کو پاکستان نے خاران، لسبیلہ اور مکران کے علاقوں کو قلات سے جداگانہ ریاستی حیثیت دے کر پاکستان کے ساتھ ان کے الحاق کی منظوری کا اعلان کر دیا اور قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کو پاکستان بھر میں خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ (۹) اور میر غوث بخش بزنجو اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار کر لئے گئے۔

ان اقدامات کے بعد قلات کی پاکستان میں شمولیت کے سلسلہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی اور ۲۷ر مارچ ۱۹۴۸ء خان قلات نے پاکستان میں شمولیت کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ (۱۰)

جولائی ۱۹۵۵ء میں شہزادہ عبدالکریم اور محمد حسین عنقا نے کالعدم قلات نیشنل پارٹی کے اراکین کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں استمان گل یعنی عوامی جماعت کے نام سے ایک سیاسی جماعت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ (۱۱) میر غوث بخش بزنجو بھی اس جماعت کے قیام میں پیش پیش تھے۔

۱۹۵۶ء میں استمان گل چھ سیاسی جماعتوں کے اتحاد پاکستان نیشنل عوامی پارٹی میں شامل ہو گئی۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک اس پارٹی نے صوبائی خودمختاری اور قوموں کے حقوق کے لئے سر توڑ جدوجہد کی جس پر بزنجو صاحب نے پاکستان کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور مختلف مقدمات میں عدالتوں میں پیشیاں بھگتتے نظر آئے۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں اس پارٹی نے صوبہ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں اکثریتی نشستیں حاصل کیں اور جمعیت العلمائے اسلام (مفتی گروپ) کے ساتھ مل کر دونوں صوبوں میں حکومتیں بنالیں۔ بلوچستان میں میر غوث بخش بزنجو گورنر اور سردار عطاء اللہ مینگل وزیر اعلیٰ بنے۔ صوبہ سرحد میں نیپ کے ایک رکن ارباب سکندر خان گورنر اور جمعیت کے مولانا مفتی محمود وزیر اعلیٰ بنے لیکن ابتدا ہی سے یہ دونوں حکومتیں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اور مرحوم شاہ ایران کو پسند نہ آئیں لہٰذا مختلف طریقوں سے ان حکومتوں کے خلاف مرکز کی ایماپر سازشیں کی گئیں غالباً دس ماہ کی حکومت کے بعد غیر آئینی غیر جمہوری اور غیر قانونی طور پر نہ صرف بلوچستان کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا بلکہ نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی بھی عائد کر دی نہ صرف یہ بلکہ

عراقی سفارت خانے میں اسلحہ کا اسکینڈل بنا کر نیشنل عوامی پارٹی کی لیڈروں کی اعلیٰ قیادت پر نام نہاد ملک دشمنی کا الزام لگا کر پہلے انہیں سہالہ ریسٹ ہاؤس اور پھر حیدر آباد جیل میں بند کر دیا گیا اور بلوچستان میں آگ و خون کا ابلیسی کھیل شروع کر دیا گیا۔ سرحد میں مولانا مفتی محمود نے اس غیر آئینی اقدام پر احتجاج کرتے ہوئے اپنی حکومت کا استعفیٰ پیش کر دیا۔ دراصل اس دور کی حکومت خصوصی عدالتوں کے ذریعے ان تمام حضرات کو سنگین سزائیں دے کر ان سے ہمیشہ کیلئے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی مگر اچانک جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لا لگا کر اولین اقدام کے طور پر فوری طور پر بلوچستان میں فوجی آپریشن بند کروا دیا اور پہاڑوں پر مورچہ بند ہو کر مسلح مزاحمت کرنے والوں کیلئے عام معافی اور نقصانات کے معاوضہ کا اعلان کر دیا۔ چند ماہ کے بعد ان لیڈروں کے خلاف غداری کا نام نہاد کیس سماعت کرنے والے حیدر آباد ٹریبونل کو توڑ کر میر غوث بخش بزنجو اور نیپ کے جملہ قیدیوں کو رہا کر دیا۔ قید سے رہا ہونے کے بعد میر صاحب نے اپنے رفقاء کے ساتھ سردار شیر باز مزاری کی نیشنل ڈیمو کریٹک پارٹی میں شمولیت اختیار کی لیکن یہ سلسلہ بعض تضادات کے سبب چل نہ سکا چنانچہ انہوں نے پاکستان نیشنل پارٹی کے نام سے اپنی الگ پارٹی تشکیل دی جس کے وہ تادم مرگ سربراہ رہے۔ (۱۲)

میر غوث بخش بزنجو اور ان کی پارٹی نے ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں تو حصہ نہیں لیا تاہم ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں انہوں نے دو حلقوں این اے ۲۰۵ خضدار اور این اے ۲۰۷ تربت پنجگور سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ بدقسمتی سے وہ دونوں حلقوں سے کامیاب نہ ہو سکے اور دونوں حلقوں میں انہیں بی این اے کے امیدواروں میر محمد عارف جان محمد حسنی اور میر منظور احمد گچکی نے ہرا دیا۔ اس انتخاب کی ایک افسوسناک بات یہ بھی تھی کہ این اے ۲۰۵ خضدار کے حلقے میں سردار عطاء اللہ مینگل کا آبائی گاؤں وڈھ بھی آتا ہے مگر ان انتخابات میں سردار عطاء اللہ مینگل نے میر غوث بخش بزنجو سے نظریں چرا لیں اور ان کی شکست کا ایک اہم سبب بنے۔ (۱۳)

میر غوث بخش بزنجو اپنی اس شکست سے بہت دلبرداشتہ ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے چند ہی ماہ بعد ۱۱ اگست ۱۹۸۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۱۴)

میر غوث بخش بزنجو پاکستان کے ممتاز ترقی پسند اور جمہوریت نواز قومی رہنما تھے ان کا شمار دور حاضر کے صف اول کے چند لیڈروں میں ہوتا تھا انہوں نے بلوچستان میں فرسودہ سرداری و نوابی نظام کی چیرہ دستیوں کے خلاف ایسی شاندار اور تاریخ ساز جدوجہد کی کہ کم از کم بلوچستان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ بلوچستان کے عوام کو برطانوی سامراج سے اور قیام پاکستان کے بعد عوام دشمن سرداروں اور رجعت پسند عناصر سے نجات دلانے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے قبائلی معاشرے میں شعور و آگہی کی روح پھونکی اور فکر عطا کی۔ وہ ایک خوشحال

معاشرے کے لیے ہر جبر وظلم وستم کا ہر دور حکومت میں مقابلہ کرتے اور ٹکر لیتے رہے۔
اس شخص نے بلوچستان میں سیاست کی داغ بیل اس وقت ڈالی جب کہ ذرائع آمد ورفت محدود تھے۔ انہوں نے عوامی رابطے کے لئے مہینوں گھوڑوں اور اونٹوں پر سفر جاری رکھ کر دشوار گزار سفر اختیار کئے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا۔ انہوں نے ہمیشہ بھوک وغربت برداشت کی عمر بھر معاشی بدحالی ان پر سایہ فگن رہی مگر اپنی خودداری اور انا کو ہمیشہ اونچا رکھا۔ کڑے سے کڑے وقت میں بھی ان کے عزم اور ہمت میں کمی نہ آ سکی بڑی سے بڑی سیاسی رشوت، اعلیٰ عہدوں کی پیش کش اور بصورت دیگر پھانسی تک دھمکیاں بھی انہیں متاثر نہ کر سکیں۔ میر صاحب کے بعض ساتھی حالات سے مغلوب ہو کر اقتدار کے دامن سے جا چمٹے اور دولت مند بن گئے۔ مگر میر صاحب کے سامنے چونکہ ایک مقصد تھا اور ان کی ہمت وخود اعتمادی حصول مقصد کے لئے چلتن کے پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط ثابت ہوئی۔ ان کا پچاس سالہ دور سیاست اکثر وبیشتر قید وبند کی صعوبتوں اور قربانیوں پر مشتمل تھا۔ (۱۵)

میر غوث بخش بزنجو کے انتقال کے بعد ان کی سیاسی وراثت ان کے بیٹے میر بزن بزنجو نے سنبھالی اور وہ پاکستان نیشنل پارٹی (پی این پی) کے سربراہ بن گئے۔ ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے قومی اسمبلی کے انہی دونوں حلقوں پر انتخاب لڑا جن پر ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں ان کے والد دو غیر اہم امیدواروں سے شکست کھا چکے تھے اب دونوں حلقوں کے ووٹرز کا رویہ بدل چکا تھا اور وہ ۱۹۸۸ء میں میر غوث بخش بزنجو کے شکست کھا جانے اور بعدازاں اسی دکھ کے سبب انتقال کر جانے کے باعث ملول تھے چنانچہ انہوں نے دونوں نشستوں پر میر بزن بزنجو کو کامیاب کر کے اپنا فرض اتار دیا ورنہ بقول ایک مبصر کے میر بزن بزنجو کسی بھی طور کوئی بھی انتخاب جیتنے کی پوزیشن میں نہ تھے (۱۶)

میر بزن بزنجو نے بعد ازاں این اے ۲۰۷ کی نشست برقرار رکھی اور این اے ۲۰۵ پر اپنے چھوٹے بھائی میر حاصل بزنجو کو اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ جو ضمنی انتخاب میں یہ نشست بآسانی جیت گئے۔ (۱۷) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں میر بزن برنجو نے این اے ۲۰۷ تربت و پنج گور سے اور میر حاصل بزنجو نے این اے ۲۰۵ خضدار اور ان سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر دونوں بھائیوں کو پی این ایم (حئی گروپ) کے امیدواروں سے شکست اٹھانی پڑی۔ میر بزن بزنجو کو ڈاکٹر محمد یاسین نے ہرایا جب کہ میر حاصل بزنجو کو محمد ایوب جاتک نے شکست سے ہمکنار کیا۔ (۱۸)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں میر بزن برنجو کا نام نظر نہیں آیا تا ہم میر حاصل بزنجو نے این اے ۲۰۵ اور این اے ۲۰۶ دونوں حلقوں سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور این اے ۲۰۵ سے میر ایوب جاتک کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۹)

۲۰۰۲ء میں میر بزن بزنجو نے این اے ۲۷۰ آوران کم لسبیلہ سے قومی اسمبلی کا اور پی بی ۴۱ آوران سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر دونوں میں کامیاب نہ ہو سکے (۲۰) ان انتخابات میں میر

حاصل بزنجو کا نام نظر نہیں آیا۔

بزنجو قبیلے کے ایک اور فرد عبد المجید بزنجو بھی عرصہ دراز سے سیاست کے میدان میں ہیں۔ وہ ۱۹۸۵ء ۱۹۸۸ء ۱۹۹۰ اور ۱۹۹۳ چاروں انتخابات میں پی بی ۳۲ خضدار ۳ سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے ہیں۔ (۲۱) ۱۹۸۵ء کا انتخاب انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑا تھا جب کہ ۱۹۹۸ء اور ۱۹۹۰ء دونوں انتخابات میں انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی اور ۱۹۹۳ء کے انتخاب میں انہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حمایت حاصل تھی۔ (۲۲)

میر عبد المجید بزنجو ۲ ردسمبر ۱۹۸۸ء سے ۶ رفروری ۱۹۸۹ء تک اور پھر ۱۷ رنومبر ۱۹۹۰ء سے ۴ ر اکتوبر ۱۹۹۲ء تک بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کے منصب پر بھی فائز رہے (۲۳)

۱۹۹۰ء میں عبد المجید بزنجو نے این اے ۲۰۵ خضدار سے میر بزن بزنجو کی خالی کردہ نشست پر ضمنی انتخاب میں حصہ لیا تھا۔ مگر وہ یہ انتخاب میر حاصل بزنجو سے تقریباً ساڑھے انیس ہزار ووٹوں کے فرق سے ہار گئے تھے۔ (۲۴) وہ ۱۹۹۳ء میں بھی اس نشست پر امیدوار تھے مگر بعد ازاں انتخابی عمل سے دستبردار ہوگئے تھے۔ میر عبد المجید بزنجو بعد ازاں صوبائی کابینہ میں بھی شامل کیے گئے ان کے پاس حیوانات کا قلم دان تھا (۲۵)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں، وہ اسی نشست پر، جن پر وہ پہلے چار مرتبہ کامیاب ہو چکے تھے، محمد اسلم گچکی سے شکست کھا گئے (۲۶) ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں ان کے صاحبزادے عبد القدوس بزنجو، بلوچستان اسمبلی کے رکن بنے اور صوبائی کابینہ میں بھی شامل کیے گئے۔ (۲۷)

۱۹۹۰ء ہی میں غوث بخش بزنجو کے داماد میر اسلم بزنجو بھی پاکستان نیشنل پارٹی کے ٹکٹ پر پی بی ۳۱ خضدار ۲ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۸) انہوں نے اسی حلقے سے ۱۹۸۸ء میں بھی انتخاب لڑا تھا مگر اختر مینگل کے ہاتھوں شکست کھا گئے تھے (۲۹) وہ میر تاج محمد جمالی کی کابینہ میں بھی شامل تھے ان کے پاس وزارت محنت کا قلمدان تھا۔ (۳۰) ۱۹۹۳ء میں وہ میر ذوالفقار علی مگسی کی کابینہ میں شامل ہوئے اس مرتبہ انہیں وزارت مواصلات کا قلمدان ملا۔ (۳۱) انہوں نے اکتوبر ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ مگر اختر مینگل کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۳۲) ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔ البتہ ۲۰۰۱ء میں وہ خضدار کے ضلعی ناظم بننے میں ضرور کامیاب ہوئے تھے (۳۳)

حوالہ جات

۱۔ رائے بہادر لالہ ہتو رام۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۴۳۶

۲۔ ملک صالح محمد خاں لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔ کوئٹہ۔ ص ۴۵

۳۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۷۳، ۱۷۴

۴۔ ایضاً۔ ص ۱۷۴، ۱۷۵

۵۔ پروفیسر ایم انور رومان۔ بلوچستان کے قبائل (ضلعی گزیٹیر سے انتخاب)۔ حصہ اول۔ کوئٹہ۔ ص ۳۳۰، ۳۳۱

۶۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان۔ اول، دوئم۔ کوئٹہ۔ ص ۳۲۰

۷۔ رائے بہادر لالہ ہتورام۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۴۳۶

۸۔ مجاہد بریلوی۔ جمہوریت کا سفر۔ کراچی۔ ص ۲۱ تا ۲۴

۹۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۳۲۱ تا ۳۳۳

۱۰۔ مجاہد بریلوی۔ جمہوریت کا سفر۔ کراچی۔ ص ۲۹

۱۱۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۳۳۷

۱۲۔ سید غلام شاہ مسافر۔ میر غوث بخش بزنجو۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۶/ تا ۲۲/ جولائی ۱۹۹۰ء۔ ص ۱۷

۱۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۰۴، ۴۰۵

۱۴۔ سلیگ ہیر۔ یسن۔ بلوچ قومی تحریک۔ ترجمہ مسعود بخاری۔ کوئٹہ۔ ص ۲۷

۱۵۔ سید غلام شاہ مسافر۔ میر غوث بخش بزنجو۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۶/ تا ۲۲/ جولائی ۱۹۹۰ء۔ ص ۱۷

۱۶۔ اختر بلوچ۔ مکتوب کوئٹہ۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۵/ تا ۱۱/ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۱۴

۱۷۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰/ جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص ۶۹

۱۸۔ ایضاً۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۳۲۵، ۱۳۲۶

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۶۱

۲۰۔ ایضاً۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۱، ۳۵۹

۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸/ مارچ ۱۹۸۵ء ص ۲۶۳۵، ۳/ دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۳۷۴۹۔ ۱۱/ نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۹۳۸۷، ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۵۵۶۔

۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔ جلد دوم۔ ص ۷۰۰

۲۳۔ وحید زہیر، بلوچستان جمہوریت کا سفر، کوئٹہ۔ ص ۴۳

۲۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۰/ جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص ۶۹

۲۵۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ۔ ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان ۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ ۔ جلد دوم ۔ص ۶۷۲

۲۷۔ ویب سائٹ www.baluchistan.gov.pk

۲۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۔ جلد دوم ۔ص ۴۸۳

۲۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ ۔ لاہور۔ ۴۱۶، ۴۱۷

۳۰۔ موسیٰ خان جلال زئی۔ کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟ لاہور۔ص ۴۹۰

۳۱۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ ۔ ۲۶/ جون ۱۹۹۳ء

۳۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء ۔ص ۱۵۵۶

۳۳۔ ویب سائٹ www.nrb.gov.pk

بگٹی

بگٹی بلوچستان کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ یہ حسی و نسبی بلوچ ہے اور اس کے افراد سبی' قلات' لسبیلہ' خاران میں اکثریت سے آباد ہیں۔ یہ قبیلہ مندرجہ ذیل قبائل پر مشتمل ہے۔

(ا) راہیجہ: یہ قبیلے کا سردار خیل ہے۔ قبیلے کی سرداری اسے حاصل ہے۔ (۲) نوتھانی (۳) مسوری (۴) کھلپر (۵) نوحکانی (۶) مندرانی اور (۷) شبنانی۔

ان میں سے ہر ذیلی قبیلہ دوسرے کئی ذیلی طائفوں یا پھلیوں پر مشتمل ہے۔ ڈیرہ بگٹی اس قبیلے کا صدر مقام ہے۔ (ا)

رائے بہادر لالہ ہتورام لکھتا ہے کہ "بگٹی خود کو خاندان رند عالی کی اولاد' پہلوان زئی مالیانی لغاری سے ملحق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حلب سے ہجرت کے وقت چونکہ وہ علاقہ بگ میں رہتے تھے اس لئے ان کا نام "بگ ٹی" پڑ گیا۔ میر جلال خان کے چوالیس بولکوں یا قبائل میں سے ایک بولک ان کا تھا۔ جب میر چاکر رند ہندوستان گیا تو بگٹی اس کے ساتھ نہیں گئے۔ اس وقت وہ نرمک اور اسپلنجی کے کوہستان تعاقہ بولان میں رہتے تھے۔ پھر گودری رندوں کے ساتھ دشمنی پیدا ہونے کی وجہ سے وہاں سے کوچ کر کے کوہستان سیاہ آف میں آئے جہاں وہ اب سکونت رکھتے ہیں۔" (۲)

میر گل خان نصیر لالہ ہتو رام کی اس رائے سے متفق نہیں' وہ اپنی کتاب "بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں" میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک علاقہ بگ میں رہنے کی وجہ سے اس قبیلے کا بگٹی کے نام سے موسوم ہونے کا تعلق ہے' یہ صحیح نہیں کیونکہ بلوچی میں اسم صفت ایسے نہیں بنتا۔ بلوچی قاعدے کی رو سے بگ کے رہنے والوں کو بگی ہونا چاہئے جیسا کہ لاشار کے رہنے والے لاشاری اور قلات کے رہنے والے قلاتی وغیرہ اسم صفت بنتا ہے۔ درآنحالیکہ "ٹی" ایک علیحدہ اسم ہے جو غلام کے لئے بولا جاتا ہے اور کسی صورت میں بھی ایک ایسے بااثر و باثروت قبیلے کے لئے نہیں بولا جا سکتا۔ البتہ

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قبیلے کا نام بگٹ تھا اور اسم صفت کے لئے "ی" کا ملحقہ بڑھا کر اسے بگٹی بنا دیا گیا ہو تو یہ الگ بات ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔

تاریخ کردستان میں بکتائی نام کے ایک قبیلہ کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح براخوئی بھی ایک کرد قبیلہ بتلایا گیا ہے اور یہ کہ دونوں قبائل بلوچستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ بکتائی کو ہم بگٹائی یا بگٹی اور براخوئی کو براہوئی کے مترادف قرار دے سکتے ہیں۔

قدیم تواریخ اور بالخصوص فردوسی کے شاہنامہ کے بعض بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بلوچستان میں کرد بہت قدیم عرصے سے آباد چلے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایران کے بادشاہ کیکاؤس کے دور میں بھی فردوسی کوہ چلتن اور وادی دشت میں کردوں اور بلوچوں کی آبادی کا ذکر کرتا ہے۔" (۳)

میر گل خاں نصیر مزید لکھتے ہیں:

"ہتو رام کے اس بیان میں کوئی شک نہیں کہ "ابتداء میں بگٹی علاقہ نرمک، اسپلنجی اور تعلقہ بولان کے کوہستان میں آباد تھے۔" یہی وہ علاقہ ہے جو دشت تک پھیلا ہوا ہے اور جس میں آج بھی کرد قبیلہ آباد ہے۔ ایک عرصے کے بعد جبکہ بلوچستان میں بارشیں بہت کم ہونے لگیں اور چراگاہیں خشک ہوتی گئیں، کرد مال داروں (گلہ بانوں) نے اسی کوہستان کے ساتھ ساتھ ڈیرہ جات کی طرف نقل مکانی شروع کر دی۔ ان میں سے کچھ تو علاقہ سیاہ آف کے پہاڑوں میں رہ گئے جو اب ڈیرہ بگٹی کہلاتا ہے اور کچھ آگے بڑھ گئے اور دوسرے بلوچ قبائل میں گھل مل گئے۔ جیسا کہ مزاری قبیلہ میں کردوں کا ایک بہت بڑا طائفہ شامل ہے۔ یہاں پر واضح ہو کہ بلوچی میں نام کرد کے لئے کور دیا کیرد مستعمل ہے، کرد نہیں بولا جاتا۔

آثار و قرائن کے مطابق بگٹی دراصل کرد ہیں جو کردستانی کردوں کی بکتائی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ رند اور لاشار کے ساتھ ان کے نقل مکانی کر کے اس سرزمین پر آنے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ سردار جلال خان کے چوالیس بولک جو جغین سے اس کے ساتھ مکران میں آئے ان میں سے ہر ایک کی باقیات مکران میں ملتی ہیں لیکن بگٹی اور مری کا وہاں پر کوئی نشان نہیں ملتا۔ سردار شیہک رند اور میر گواہرام لاشاری کے ساتھ رند، کرائی، ہوت، لاشاری، جتوئی اور ان کے متعلقہ ذیلی قبائل مکران سے نقل مکانی کر کے کچھی آئے تھے۔ بگٹی ان میں سے نہ کسی کا ذیلی قبیلہ ہے اور نہ ہی پھلی ہے۔ یہ ایک خالص بکتائی کرد قبیلہ ہے جو اپنے کو زرکھان کہتا ہے۔ گو کہ بقول ہتورام "سردار ڈومبکی کہتا ہے کہ آگیف نامی ایک شخص راہیجہ ان کا نائب تھا جسے نوتھانیوں پر نائب مقرر کر کے پہاڑ پر بھیجا گیا۔ —————— وہاں پر اس نے رفتہ رفتہ نوتھانیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنی جداگانہ سرداری قائم کر لی اور اس طرح بگٹیوں کی ڈومبکیوں سے جداگانہ سرداری وجود میں

آئی-" سردار ڈومبکی غالباً بگٹیوں کو اپنے قبیلہ ڈومبکی کا ایک طائفہ سمجھتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے- بگٹی ابتداء سے ہی ایک جداگانہ کرد قبیلہ چلا آتا ہے-"

بگٹی بلوچوں کا ایک بہادر اور جنگجو قبیلہ ہے- سندھ اور پنجاب کی سرحدوں پر انہوں نے انگریزوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا-"(۴)

بگٹی قبائل کا تعلق انگریزی عملداری سے ۱۸۳۹ء میں ہوا- اس وقت برطانوی افواج کی افغانستان سے آمدورفت کے سلسلے میں بلوچوں نے بلوچستان کی صورت حال کو نہایت خطرناک بنا دیا تھا اور برطانوی افواج کی رسد رسانی کے اکثر سلسلے منقطع ہو چکے تھے- چنانچہ ان حالات کے پیش نظر اکتوبر ۱۸۳۹ء میں میجر بلیمور کی کمان میں انگریزوں نے ایک فوجی دستہ بھیجا تاکہ فوجی نقل و حمل میں مزاحمت کرنے والوں کو سزا دی جا سکے- چنانچہ جب انگریزی فوج کا یہ دستہ چیلجی کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ کچھی کو لوٹنے اور راستوں کو مسدود کرنے والے وہاں سے چلے گئے ہیں اور علاقہ بگٹی کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہو گئے ہیں- انگریزی فوجی دستے نے ان کا تعاقب جاری رکھا- میجر بلیمور نے ڈیرہ بگٹی پہنچ کر وہاں قیام کیا اور فوج ترتیب دی گئی- سردار اور قبائلی معتبرین نے میجر بلیمور کو بلوچی رواج کے مطابق خوش آمدید کہا- مگر جب انہیں فوجی مداخلت کا اصل سبب بتایا گیا- کہ بگٹی قبائل کی سرکوبی اور علاقہ بگٹی کو تاخت و تاراج کر کے قبائل کو زیر اطاعت لانا مقصود ہے- تو چند بہادر بگٹی قبائل اپنے بلوچی ہتھیار سنبھال کر انگریزی فوج کے مقابلے کے لئے میدان میں نکل آئے- انگریزی فوج ساز و سامان حرب سے خوب مسلح تھی- میجر بلیمور نے پوری طاقت سے دو طرف سے ان پر حملہ کیا- بگٹی قبائل آخر پسپا ہو گئے- اور انہیں بہت نقصان برداشت کرنا پڑا- علاوہ ازیں بگٹی سردار بیرک بھی گرفتار کر لیا گیا اور اسے سندھ میں نظربند کر دیا گیا-

میجر بلیمور تقریباً تین ماہ تک انگریزی فوجی دستوں کے ساتھ بگٹی کی پہاڑیوں میں بگٹی قبائل کو تاخت و تاراج کرنے میں مصروف رہا اور پھر موسم سرما میں نافسک کے درہ سے واپس ہو گیا- ۱۸۴۰ء میں لیفٹیننٹ کلارک نے پھر ۱۸۰ مسلح سپاہیوں سے کھلپر بگٹیوں کی ایک جماعت پر شبخون مارا- مگر کامیاب نہ ہو سکا-

۱۸۴۵ء میں پھر بگٹیوں اور ڈومبکیوں کی متفقہ مخالفانہ سرگرمیوں کی بنا پر سر چارلس نیپیر کی زیر کمان سات ہزار مسلح دستوں پر مشتمل ایک انگریزی فوج علاقہ بگٹی میں بھیجی گئی- بگٹیوں پر اس فوج نے دو طرف سے حملہ کیا- ایک محاذ اوچ کی طرف سے قائم کیا گیا- جہاں سے سوری کشتک اور جاؤنک کے سلسلہ ہائے کوہ کو عبور کر کے حملہ کیا گیا اور دوسرا محاذ پھلیجی کی طرف سے قائم کر کے بگٹی قبائل کو گھیر لیا گیا- شمال کی طرف سے بگٹیوں کے لئے پہلے ہی راستہ بند کر دیا گیا تھا- اس لئے ڈومبکیوں کو سب سے پہلے تراکی کی طرف دھکیل دیا گیا- تاکہ

بگٹی قبائل ان سے کٹ جائیں مگر بگٹیوں کی ایک کثیر تعداد علاقہ کھیتران میں چلی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے انگریزی افواج نے بگٹی علاقے کے ایک وسیع رقبہ کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ مگر سر چارلس کی یہ مہم صرف وقتی کامیابی کی مظہر تھی۔ چنانچہ جونہی انگریزی افواج واپس ہوئیں۔ بگٹی قبائل بھی اپنے اپنے مسکن کو لوٹ آئے۔ ڈو ںکیوں نے البتہ اس موقع پر انگریزوں کی اطاعت قبول کرلی۔

بگٹیوں نے اپنے علاقہ میں واپس پہنچ کر اپنی مخالفانہ سرگرمیوں کو سندھ اور علاقہ کچھی میں پہلے سے بھی زیادہ تیز تر کر دیا۔ ۱۸۴۶ء میں بارہ سو بگٹی افراد پر مشتمل ایک لشکر سندھ کے میدانوں میں گھس گیا اور ۱۶ میل تک میرپور کے نواحی علاقہ اور شکارپور شہر تک کو خوب لوٹا اور غارتگری کا بے شمار سامان اور پندرہ ہزار جانور اپنے ساتھ لے گئے۔

بگٹیوں نے اکتوبر ۱۸۴۷ء میں پھر کچھی میں کندرانی کی بستی پر حملہ کر دیا۔ لیفٹیننٹ میری ویدر جو سرولیم کے نام سے مشہور تھا۔ پہلی بار سندھ ہارس کمپنی کے ۱۳۰ سواروں کے ساتھ حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا اور نومبر کے پہلے ہفتے میں علاقہ بگٹی پر پوری طاقت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ اس دفعہ بگٹیوں کے پانچ سو آدمی نہایت بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے اور ایک سو بیس گرفتار کر لئے گئے۔ بگٹیوں کو چونکہ اس حملے سے بڑی بھاری جانی اور مالی قربانی دینی پڑی تھی۔ اس لئے وہ کمزور ہو گئے تھے۔ مریوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر ان پر حملہ کر دیا اور بگٹیوں کے ایک وسیع علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات اور واقعات کے پیش نظر تمام بگٹی اقوام نہایت دلبرداشتہ ہو گئیں اور مجبوراً گھر بار چھوڑ کر کھیتران سردار کے پاس چلی گئیں۔

میر حاجی سردار کھیتران کی ہمشیرہ کا رشتہ بگٹی سردار کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔ کھیتران سردار نے بگٹی سردار کو ہر طرح امداد کا یقین دلایا۔ چنانچہ ایک بھاری جمعیت سے اس سال مریوں پر حملہ کر دیا گیا۔ نتیجتہً ۷۰ مری مارے گئے۔ اور ان کے اونٹوں اور مالی مویشی پر بھی بگٹیوں نے قبضہ کر لیا۔

بگٹیوں نے موسیٰ خیل کے پٹھانوں کا تعاون حاصل کر کے مریوں پر اسی سال دوبارہ حملہ کیا اور پرب تک کا علاقہ مریوں سے لے لیا۔ اس لڑائی میں بگٹیوں کے پانچ سو آدمی کام آئے پٹھان قبائلیوں کے بھی بہت سے آدمی مارے گئے۔ مریوں کو اس لڑائی میں بہت جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

۱۸۴۷ء کے آخر میں اسلام خان بگٹی سردار نے میجر جیکب کی اطاعت قبول کر لی اور ۸۶۸ بگٹی مرد اور عورتیں بچے لاڑکانہ (سندھ) میں سکونت پذیر ہو گئے مگر ان کی اکثریت نے جو پہاڑوں میں چلی گئی تھی بدستور اپنے حملے جاری رکھے۔ چنانچہ کچھی و سندھ میں ان کے حملے زیادہ

کثرت سے جاری رہے۔ ۱۸۵۸ء میں جب سردار غلام مرتضیٰ خان اپنے باپ سردار اسلام خان کے بعد بگٹی قبائل کا سردار منتخب کیا گیا تو اس نے مریوں پر سات سو کے ایک لشکر سے حملہ کر دیا۔ کاہان کے راستے بجارانیوں کے ساتھ جو کوہلو میں خیمہ زن تھے۔ دست بدست لڑائی ہوئی جس میں فریقین کے تیرہ آدمی مارے گئے اور بگٹیوں نے کافی تعداد میں ان کی بھیڑ بکریاں اور اونٹ اپنے قبضہ میں کر لئے۔ مگر بگٹیوں کو گزبر کے راستے سے واپس لوٹتے ہوئے مریوں نے روک لیا اور دونوں قبیلے ایکدوسرے کے بالمقابل شام کے میدان کی شمالی جانب جمع ہو گئیں۔ اسلام خان اور کچھ بگٹی سرداروں نے اگرچہ یہ تجویز کی کہ ان کے مال مویشی واپس کر دیئے جائیں۔ مگر غلام مرتضیٰ خان بگٹی نے انکار کر دیا۔

آخر چھبرہی کے مقام پر بگٹیوں نے مریوں پر حملہ کر دیا۔ خوب معرکے کی لڑائی ہوئی۔ مری قبائل کے ایک سو تیس آدمی مارے گئے اور کافی زخمی ہوئے۔ جن میں سے بہت سے زخموں کی تاب نہ لا کر بعد میں مر گئے۔ اس لڑائی میں بگٹیوں کے چالیس آدمی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ بہت سے جانور اور مریوں کا بہت سا اسلحہ بگٹیوں کے ہاتھ آیا۔ اس فتح سے بگٹیوں نے پرب کی شکست کا کسی حد تک مریوں سے بدلہ لے لیا' چھبرہی کی لڑائی کے بعد مختلف اوقات میں مریوں اور بگٹیوں میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخرکار سر رابرٹ سنڈیمن نے اپنے اثر و اختیار سے کام لے کر ان کی باہمی کشمکش کو بہت حد تک ختم کر دیا۔

۱۸۶۱ء کے آخر میں سردار غلام مرتضیٰ بگٹی نے گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ اپنے تعلقات دوستانہ طور پر استوار کر لئے تھے اور اپنی قوم کے مختلف گروہوں کو بھی پورے طور سے کنٹرول میں کر لیا تھا اور نواحی علاقے میں پوری طاقت سے دو تین مرتبہ مری قبائلی مخالفین کی سرگرمیوں کو دبا دیا تھا۔ چنانچہ بگٹی علاقہ کے نچلے حصوں میں مریوں کی رہی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ اسی سال ۱۸۶۱ء میں سردار غلام مرتضیٰ کا دماغ نمونیہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی طبیعت میں حد سے زیادہ غصہ اور انتشار پیدا ہو گیا اور بگٹی قوم نے خان قلات کے سامنے اسے سرداری سے برطرف کرنے کی تجویز پیش کی۔ مگر خان قلات نے کوئی توجہ نہ دی اور فیصلہ نہ ہو سکا۔

اس طرح انفرادی کنٹرول سے بگٹی قبیلہ جلد ہی مختلف فرقوں میں منقسم ہو گیا اور ہر فرقے کی اس کے معتبر اور سردار نے الگ الگ رہنمائی شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قبیلہ بگٹی میں مکمل طور پر انتشار پیدا ہو گیا۔

۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ برطانیہ کو بگٹی علاقے کا ایک حصہ سلطنت انگریزی کی حدود میں شامل کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ لیکن سندھ کی حکومت نے اس کی مخالفت کی اور یہ تجویز پیش کی کہ اس قوم کو خان آف قلات کے ذریعے قابو میں رکھا جائے۔ کیونکہ بگٹی قبائل قلات کی رعایا ہیں۔

۱۸۶۷ء میں مری اور بگٹی نے ایک دوسرے کے تعاون سے مقدم غلام حسین کی زیر کمان

جو مسوری قبیلہ کا معتبر تھا ہڑند پر حملہ کر دیا۔ مگر ۵ پنجاب کیولری کے دستوں اور گورچانی قوم کے افراد سے شکست کھائی۔ اس لڑائی میں مری بگٹی اقوام کے دو سو آدمی ان کے مقدم غلام حسین سمیت مارے گئے۔

۳ر فروری ۱۸۷۱ء کو مٹھن کوٹ (پنجاب) میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کی رو سے مری بگٹی قبائل کا انتظام پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ بالائی سندھ اور ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خان کے ہاتھوں میں دے دیا گیا مگر بعد میں ڈپٹی کمشنر مذکور کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا۔ پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ مذکور نے آخر کار لیوی کا تعین کر کے علاقہ بگٹی کا انتظام وہاں کے سرداروں کے سپرد کر دیا اور لیوی کی نفری میں وقتاً فوقتاً حسب ضرورت اضافہ ہوتا رہا۔

۱۸۷۶ء میں مسوری قبیلہ کے کچھ افراد نے کوہلو کے زرکون گھرانوں کو لوٹ لیا۔ جن کا تعاقب کیا گیا اور ان کے چودہ اشخاص مارے گئے۔ چند ماہ بعد بگٹیوں کے ایک گروہ نے زرکون قبائل سے اپنے سردار کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے حملہ کیا۔ مگر زرکون قبائل نے ان پر حملہ کر کے ان کے رہنما حیدر خان کو ۲۸ بگٹیوں سمیت قتل کر دیا۔ حیدر خان کے مارے جانے پر جو بلوچوں میں نہایت بہادر اور قابل ترین شخص سمجھا جاتا تھا۔ بگٹیوں میں سخت غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے فوراً زرکون کے خلاف ایک مہم تیار کی اور مریوں نے اپنے علاقے سے گزرنے کے لئے راستہ دے دیا۔ یہ مہم تقریباً بگٹیوں کے ہی افراد پر مشتمل تھی اور اس کی کمان ان کے سردار نے خود سنبھالی۔ یہ لشکر کوہلو کی وادی میں سے گزر کر اوریانی کی بستی کے نزدیک جا پہنچا۔ زرکون قبائل نے ان کا سخت مقابلہ کیا۔ مگر تاب نہ لا سکے اور بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ بگٹیوں نے ان کی بستی تاخت و تاراج کر کے لوٹ لیا اور بعد میں تمام وادی کو بھی تباہ و برباد کر ڈالا زرکون کے ستر آدمی کام آئے۔

۱۸۸۲ء میں بگٹی علاقے کا انتظام تھل چٹیالی کے پولیٹیکل ایجنٹ کے سپرد کیا گیا اور ۱۸۸۷ء میں سردار غلام مرتضٰی خان نے آخر کار اپنی سرداری سے استعفٰی دے دیا اور اس کا لڑکا شہباز خان سردار اور تمندار مقرر ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں اسے سرکار انگریزی نے نواب کا خطاب دے دیا اور ۱۹۰۱ء میں کے۔ سی۔ ای کا خطاب عطا کیا۔ شہباز خان ایک نہایت قابل سردار تھا۔ اس نے اپنی طاقت کا سکہ دوسرے قبائلی افراد سے بھی منوایا۔ اس کی اپنی قوم کا سلوک اس سے نہایت اچھا رہا اور تمام بگٹی قبائل اس کے اشارے پر ہر وقت مر مٹنے کو تیار تھے۔

۱۹۱۵ء میں پھر بگٹیوں کے خاندانی معاملات میں ایک زمین کے تنازعہ پر کچھ تبدیلی واقع ہوئی۔ یہ تنازعہ عرصہ سے ایک قطعہ اراضی کے متعلق چلا آ رہا تھا۔ جس کا تصفیہ اس سال ہو گیا اور نواب بگٹی اور اس کے بھائی خان بہادر میر گوہر خان نے اپنی جائیداد کی تقسیم کو درست تسلیم کر لیا۔ مگر نواب بگٹی کے زمانہ علالت میں میر گوہر خان نے پھر وہی وراثت اور جائیداد کی غلط

تقسیم کا تنازعہ شروع کر دیا۔ جس کا آخر کار فیصلہ ہو گیا۔

۱۵ر جنوری ۱۹۱۷ء کو نواب سر شہباز خان کے۔ سی۔ آئی۔ ای بگٹی سردار جیکب آباد میں فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا سردار بہادر سردار میر محراب خان بگٹی سردار تسلیم کر لیا گیا۔

۱۹۱۸ء تک نواب بگٹی نہایت امن سے اپنے قبائل کی قیادت میں مصروف رہا۔ اور بگٹی قبائل کے تمام معاملات نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا رہا۔ چنانچہ گورنمنٹ برطانیہ نے اسے پانچ صد ایکڑ زمین لوئر باری دو آب (پنجاب) میں عطا کی۔ نواب نے انگریزوں اور مریوں کی ۱۹۱۷ء کی لڑائی میں اپنی قوم کو غیر جانبدار رکھا۔ جس سے متاثر ہو کر حکومت برطانیہ نے ۱۹۱۹ء میں نواب محراب خان کو سی۔ بی۔ ای کا خطاب دیا۔

۲۱-۱۹۲۰ء میں جب کہ ہندوستان میں خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ نواب بگٹی نے انگریزوں سے پورا پورا تعاون کیا اور اپنی تمام رعایا میں امن و امان قائم رکھا۔

جون ۱۹۲۲ء میں نواب بگٹی کو اس کی اچھی خدمات کے صلے میں حکومت برطانیہ نے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا۔ نواب کے تعلقات نہ صرف اپنے بگٹی قبائل کے ساتھ اچھے تھے۔ بلکہ مری قبائل بھی اس کے گرویدہ بن گئے تھے۔ (۵)

نواب محراب خان بگٹی کے برعکس اس کا بڑا بیٹا نوابزادہ عبدالرحمٰن بگٹی انگریزوں کا سخت دشمن اور آزادی کا متوالا تھا۔ اس کا شمار میر یوسف علی مگسی، میر عبدالعزیز کرد اور میر محمد امین کھوسو جیسے مجاہدین آزادی میں ہوتا تھا۔ (۶) نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں کی ایما پر ایک قبائلی جرگے نے نوابزادہ عبدالرحمٰن بگٹی کو نواب محراب خان بگٹی کی جانشینی سے محروم کر دیا۔ (۷)

عبدالرحمٰن بگٹی نے آزادی کی خاطر قبیلے کی سرداری بھی چھوڑی اور نظربندی کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ان کو آزاد کروانے کے لئے سیوی مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو ۶، ۷ر فروری ۱۹۴۲ء کو منعقد ہوا تھا ایک قرارداد بھی پیش کی گئی تھی جس کی تائید کرتے ہوئے میر جعفر خان جمالی نے فرمایا تھا کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم نواب زادہ عبدالرحمٰن بگٹی کی رہائی کے لئے مل کر جدوجہد کریں۔ وہ ہمارا مسلمان بھائی ہے۔ اگر اس کی آزادی کے لئے ایک لاکھ روپے کی ضمانت کی ضرورت ہو تو میں دینے کے لئے تیار ہوں (۸) نواب محراب خاں بگٹی کی وفات (۱۹۳۹) کے بعد ان کے دوسرے بیٹے محمد اکبر خاں بگٹی ان کے جانشین بنے۔ والد کی وفات کے وقت ان کی عمر فقط ۱۲ برس تھی اس وقت وہ چیفس کالج لاہور میں تعلیم پا رہے تھے۔ اکبر خاں کی کم عمری کے پیش نظر خان بہادر جمال خاں بگٹی قبیلے کے نگراں سردار مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں جب اکبر خاں سرداری سنبھالنے کی عمر کو پہنچے تو انہیں تمندار تسلیم کر کے تمام اختیارات سونپ دیئے گئے۔

۱۹۴۹ء میں سردار اکبر خاں بگٹی نے پاکستان سول سروس کے ایک کورس میں شمولیت اختیار

کی اور ۱۹۵۱ء میں ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل بلوچستان کے مشیر مقرر ہوئے۔ انہیں بحالیات، تعلیم، صحت اور پبلسٹی کے محکمے سونپے گئے۔ (۹)

۱۹۵۵ء میں بلوچستان کو ون یونٹ میں ضم کر دیا گیا۔ ون یونٹ کے قیام کے بعد جو قومی اسمبلی وجود میں آئی اس میں بلوچستان کی صرف ایک نشست تھی۔ اس نشست کا انتخاب شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے کونسلروں کو کرنا تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب کا مقابلہ سردار انور خان کیتھران نے کیا مگر ڈاکٹر خان صاحب کی پشت پر اے جی جی اور ڈپٹی کمشنر تھے جنہوں نے شاہی جرگہ کے سرداروں کو ڈاکٹر خان صاحب کے حق میں کر لیا۔ یوں اس نشست پر ڈاکٹر خان صاحب کامیاب قرار پائے۔ ڈاکٹر خان صاحب کے انتخاب کے خلاف عذرداری دائر کی گئی جس کے نتیجے میں ڈاکٹر خان صاحب کا انتخاب ناجائز قرار دے دیا گیا۔ اب کہا گیا کہ چونکہ یہ نشست قومی اسمبلی کے مغربی حصے سے کم ہوئی ہے اس لئے اس کا انتخاب اسمبلی کے مغربی حصے کے ارکان اپنے ووٹوں سے کریں گے۔ اس مرتبہ ڈاکٹر خان صاحب کا مقابلہ اکبر بگٹی نے کیا۔ مگر وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود فقط دو ووٹوں سے ہار گئے۔

ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کے بعد یہ نشست ایک مرتبہ پھر خالی قرار پائی۔ اس مرتبہ اس نشست پر اکبر بگٹی بلامقابلہ منتخب ہو گئے۔ وہ کچھ دنوں کے لئے مرکزی کابینہ کے رکن بھی رہے۔

ایوب خان کے دور حکومت کے آغاز سے ہی بلوچستان میں فوج کشی شروع ہو چکی تھی۔ اس فوج کشی کے نتیجے میں جو لوگ گرفتار ہوئے اور بدنام زمانہ قلی کیمپ میں رکھے گئے، ان میں میر غوث بخش بزنجو اور نواب خیر بخش مری کے علاوہ سردار اکبر بگٹی بھی شامل تھے۔ (۱۰) سردار اکبر بگٹی پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے اپنے بھائی احمد نواز بگٹی کے خسر حاجی ہیبت خان کو قتل کیا ہے۔ اس الزام میں اکبر بگٹی کو موت کی سزا سنائی گئی جو بعد میں رحم کی اپیل پر عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ تین برس بعد رحم کی ایک اور اپیل پر وہ رہا ہو گئے اور ایک قبائلی روایت کی بنا پر انہوں نے مقتول کے بیٹے کو پچاس ہزار روپیہ خوں بہا ادا کیا۔ (۱۱) سردار شیر باز خاں مزاری نے حال ہی میں اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ اکبر بگٹی کی موت کی سزا ختم کروانے والوں میں ذوالفقار علی بھٹو بھی پیش پیش تھے۔ (۱۲)

۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں اکبر بگٹی حصہ نہیں لے سکے کیونکہ ان دنوں وہ ایبڈو کی پابندیوں کی زد میں تھے (۱۳) تاہم اس انتخاب میں ان کے چھوٹے بھائی احمد نواز بگٹی مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۱۴)

انتخابات کے بعد بلوچ نمائندوں نے ایک جانب تو اسمبلیوں میں حکومت کے مظالم بے نقاب کرنا شروع کئے اور دوسری جانب سیاسی جلسوں میں عوام کو اس بارے میں آگاہ کرنا شروع

کیا۔ یہ دور وہ تھا جب ایوب خان ملک کے صدر اور نواب کالا باغ مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ ظاہر ہے یہ صورتحال زیادہ دیر تک کس طرح جاری رہ سکتی تھی۔ چنانچہ نواب خیر بخش مری اور سردار عطا اللہ مینگل کے ساتھ ساتھ سردار اکبر بگٹی ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لئے گئے اور ان کی سرداریاں بھی ختم کر دی گئیں۔ (۱۵)

ایوب خاں نے اکبر بگٹی کی جگہ میر غلام حیدر بگٹی کو قبیلے کا سردار مقرر کیا مگر اہل قبیلہ نے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کیا اور غلام حیدر بگٹی کو اس کے اپنے گھر میں چائے پیتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔ (۱۶)

سردار اکبر بگٹی ۱۹۶۹ء تک پس دیوار زنداں رہے۔ ۱۹۶۹ء میں انہیں اس شرط پر رہائی ملی کہ وہ پانچ سال تک کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیں گے۔ بعد میں حکومت نے اس شرط میں کچھ نرمی پیدا کی اور کہا کہ اگر پابندی زدہ سیاستدان حکومت سے پابندی ہٹانے کی درخواست کریں تو ان پر سے یہ پابندی ختم کی جا سکتی ہے۔ بلوچستان ہی کے ایک دو چوٹی کے سیاست دانوں نے جن پر اسی نوعیت کی پابندی عائد تھی، اس نوع کی درخواست دے کر انتخاب میں حصہ لیا لیکن سردار اکبر خاں بگٹی کے لئے اس قسم کی درخواست پیش کرنا بعید از قیاس تھا ساتھ ہی انہیں یہ امید ضرور تھی ان کا کوئی رفیق اس معاملے کو اس وقت کی حکومت کے سامنے اٹھائے گا مگر جب اس ضمن میں ان کے رفیقوں نے خاموشی اختیار کئے رکھی تو نواب بگٹی کے دل میں یہ احساس پختہ ہوا کہ ان کے ساتھی شاید انہیں عملی سیاست سے علیحدہ رکھنے کے متمنی ہیں۔ اسی احساس کے پیش نظر انہوں نے انتخابات کے دوران اپنی ایک الگ لابی بنانے کی بنیاد بھی رکھی۔ سردار احمد نواز خان بگٹی اور سردار چاکر خاں ڈومبکی کا بحیثیت آزاد امیدواروں کے انتخابات میں حصہ لینے کا سبب یہی تھا۔ اس آزاد گروپ کے ذریعہ سردار بگٹی غالباً صوبائی اسمبلی اور پارٹی میں اپنے بااثر وجود کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ بعد میں بوقت ضرورت انہوں نے اپنے ان دونوں کامیاب شدہ امیدواروں کے ذریعہ اپنے رفقاء پر اپنی اہمیت اور اثر ثابت کرنے کی کوشش بھی کی لیکن جب ان دونوں امیدواروں نے اپنا وزن نیپ کے پلڑے میں ڈال دیا تو یہی بات سردار بگٹی اور ان کے رفقاء کے درمیان موجود فاصلوں کو مزید بڑھانے کا سبب بن گئی۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے انعقاد تک سردار بگٹی نیشنل عوامی پارٹی کے باقاعدہ رکن نہ ہونے کے باوجود اس کے ہر اہم اجلاس میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے اور پارٹی کے ہر اہم فیصلے کے سلسلے میں ان کی رضامندی ضروری سمجھی جاتی تھی لیکن انتخابات منعقد ہو جانے کے بعد نیپ کے چند صوبائی قائدین کو یہ خیال آیا کہ ان کے اجلاسوں میں ایک غیر متعلقہ شخص کی موجودگی مناسب نہیں ہے۔ اس بات سے نواب بگٹی کا نفسیاتی طور پر اپنے رفقاء سے آزردہ ہو جانا ایک فطری بات تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان میں رسمی تعلق باقی رہا۔

بھٹو کی جانب سے سردار غوث بخش رئیسانی کو بلوچستان کا گورنر مقرر کئے جانے کے خلاف نواب بگٹی کے زیراہتمام نیپ کی جانب سے احتجاجی جلوسوں سے نیپ کی صوبائی قیادت کے اظہار لاتعلقی اور مذکورہ جلوسوں کو بگٹی باہنی کا نام دیئے جانے پر نواب بگٹی نے اپنے رفقا کی سیاسی رفاقت سے یکسر علیحدگی اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ اس طرح ان کے مابین رسمی سا تعلق بھی ٹوٹ گیا۔

نواب بگٹی یقیناً یہ بات سوچتے ہوں گے کہ بلوچستان میں نیپ کی کامیابی میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ اس لئے کامیابی کے ثمرات سے وہ بھی بہرہ مند ہوں گے مگر اس مرحلے پر ان کے رفقا نے ان کو اس طرح اپنی صفوں سے نکال باہر کرنے کا اہتمام کیا۔ جس طرح دودھ سے مکھی کو نکال دیا جاتا ہے۔ اس سے ان کا ردعمل سوائے اس انتقام کے اور کیا ہو سکتا تھا' جس کا انہوں نے بعد میں مظاہرہ کیا۔ لیکن یہاں نواب بگٹی نے بلوچوں کے ایک ایسے قائد کی بجائے جس کا بلوچوں کی جدوجہد کی تحریک میں ایک نمایاں حصہ تھا۔ محض نواب اکبر خان کے خول میں رہ کر سوچا اور عمل کیا۔

ان کی رفاقت ان کے سابقہ رفقا سے ٹوٹ گئی تھی تو اس کے ذمہ دار بھی ان کے رفیق یا وہ خود تھے۔ بلوچوں کا ان کی رفاقت کو رقابت میں بدلنے میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ ان کو اگر کسی قسم کا انتقام لینا تھا تو وہ اپنے سابقہ رفقا سے ہی لیتے' مگر انہوں نے جس انداز میں اپنی دشمنی کا اظہار کیا۔ اس نے پوری بلوچ قوم کو تباہی و بربادی کے ایسے راستے پر ڈال دیا جس سے بچاؤ کی بعد میں وہ خود بھی کوئی تدبیر نہ کر سکے۔ بلوچستان میں بلوچ ہونا پھر احساس محرومی اور جرم کے مترادف بن گیا اور جس طویل جدوجہد کے نتیجے میں ایک کامیابی سی حاصل ہوئی تھی۔ اس کو اسی جدوجہد کے ایک قائد نے ناکامی میں بدلنے کا الزام اپنے سر لے لیا۔ بھٹو شاید بلوچستان کی منتخبہ صوبائی حکومت کو ویسے ہی کسی نہ کسی بہانے سے ختم کر ہی ڈالتا۔ لیکن اگر نواب بگٹی اس کے معاون نہ بنتے تو اس کو ایسا انتہائی غیر آئینی قدم اٹھانے کے لئے کئی بار مزید سوچنا پڑتا اس طرح گویا نواب بگٹی کے انتقام کی زد میں ان کے رفقا سمیت تمام بلوچ بھی آ گئے۔ (۱۷)

اس واقعہ کی تفصیلی اجمال یہ ہے کہ جن دنوں بزنجو بلوچستان کے گورنر اور مینگل وزیر اعلیٰ تھے۔ سردار بگٹی ایک غیر ملکی دورے میں بھٹو کے ساتھ گئے اور واپسی پر لندن میں ٹھہر گئے۔ انہی دنوں پاکستان میں عراقی سفارتخانے سے اسلحہ کی برآمدگی کا اسکینڈل منظر عام پر آیا۔ اور تاثر یہ دیا گیا کہ یہ اسلحہ بلوچستان کے علیحدگی پسندوں میں تقسیم کے لئے منگوایا گیا تھا۔ اب بھٹو نے اکبر بگٹی کو لندن سے بلوایا جن کی حفاظت اور پیشوائی کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ اکبر بگٹی نے پاکستان پہنچتے ہی یہ شور مچانا شروع کیا کہ بلوچستان کی حکومت اور نیشنل عوامی پارٹی پاکستان کے خلاف بیرونی ممالک سے اسلحہ منگوا رہے ہیں اور بلوچستان کے مختلف علاقوں میں چھاپہ مار ٹریننگ

کے کیمپ کھلے ہوئے ہیں۔

یہ سارا ڈرامہ بھٹو کی ایما پر رچایا گیا تھا چنانچہ بھٹو نے فوراً ہی اس صورتحال کا فائدہ اٹھایا اس نے سردار اکبر بگٹی کے بیانات کا سہارا لیتے ہوئے بلوچستان کی حکومت برخواست کر دی اور سردار اکبر بگٹی کو ہی بلوچستان کا گورنر بنا دیا۔ (۱۸)

بھٹو نے شروع شروع میں اکبر بگٹی کو خاصے اختیارات دیئے مگر بعد میں بھٹو بقول اکبر بگٹی کے "ڈائریکٹ ڈائلنگ کرنے لگے اور کبھی چیف سیکرٹری، کبھی ہوم سیکرٹری اور کبھی کسی اور سیکرٹری سے براہ راست بات چیت کرنے لگے" ظاہر ہے یہ صورتحال اکبر بگٹی جیسے انا پرست سیاستدان کے لئے کیسے قابل قبول ہو سکتی تھی چنانچہ کچھ دن تو انہوں نے برداشت کیا اور پھر گورنری سے استعفیٰ دے دیا۔ (۱۹) مگر بقول طاہر بزنجو کے "نواب صاحب کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔" (۲۰)

گورنری سے مستعفی ہونے کے اکبر بگٹی کچھ دن سیاسی افق سے غائب رہے۔ انہوں نے ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں بھی حصہ نہیں لیا۔ تاہم ۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت کے خاتمے کے کچھ عرصہ بعد وہ ایئر مارشل اصغر خان کی تحریک استقلال میں شامل ہو گئے۔ اکبر بگٹی ۱۹۵۸ء میں کچھ عرصہ کے لئے ری پبلکن پارٹی میں شامل رہے تھے۔ تاہم ۱۹۵۸ء کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا جب وہ کسی سیاسی پارٹی کے باقاعدہ رکن بنے ہوں۔ (۲۱) مگر یہاں بھی بگٹی صاحب فقط چند ماہ ہی گزار سکے اور بہت جلد انہوں نے تحریک استقلال کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ مارشل لاء کے زمانے میں سردار اکبر بگٹی اخباری کالموں میں نمایاں رہے انہوں نے صوبائی خودمختاری کے مطالبہ کی آڑ میں اردو کا بھی بائیکاٹ کر دیا۔

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں بھی جناب اکبر بگٹی شریک نہیں ہوئے۔ البتہ ان کے بھائی میر احمد نواز بگٹی اور بیٹے سلیم اکبر بگٹی دونوں نے اس انتخاب میں حصہ لیا۔ ۱۹۸۸ء میں عام انتخابات سے کچھ عرصہ قبل سردار اکبر بگٹی نے بلوچستان نیشنل الائنز (بی این اے) کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل دی۔ جس نے ان انتخابات میں قومی اسمبلی کی تین اور صوبائی اسمبلی کی چھ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ (۲۲)

ان انتخابات کے بعد میر ظفر اللہ جمالی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ اور جناب اکبر بگٹی قائد حزب اختلاف بنے۔ میر ظفر اللہ جمالی کو ایوان میں واضح اکثریت حاصل نہیں تھی اور اس سے قبل کہ وہ اعتماد کا ووٹ حاصل کرتے انہوں نے ۱۵؍ دسمبر ۱۹۸۸ء کو اسمبلی ہی توڑ ڈالی۔ جناب اکبر بگٹی نے اس اقدام کو عدالت عالیہ میں چیلنج کیا اور عدالت عالیہ نے اسے غیر قانونی اور غیر آئینی قرار دے کر اسمبلی بحال کر دی۔ اب سردار اکبر بگٹی نے اپنی جماعت بی این اے، جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) اور اسلامی جمہوری اتحاد کے ارکان سے مل کر مخلوط وزارت تشکیل

دی اور پاکستان پیپلز پارٹی بلوچستان اسمبلی میں اپوزیشن جماعت بن گئی۔ (۲۳)
اکبر بگٹی کی یہ وزارت ڈیڑھ سال تک جاری رہی اور جب ۶ر اگست ۱۹۹۰ء کو صدر غلام اسحٰق خان نے تمام اسمبلیاں توڑ دیں تو سردار اکبر بگٹی کے داماد میر ہمایوں خاں مری کو بلوچستان کا نگراں وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ (۲۴)

وزارت اعلیٰ کے خاتمے کے دس دن بعد یعنی ۱۶ر اگست ۱۹۹۰ء کو محمد اکبر بگٹی نے ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کا اعلان کیا جس کا نام جمہوری وطن پارٹی رکھا گیا۔ اس پارٹی نے ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں اسلامی جمہوری اتحاد کے اشتراک کے ساتھ حصہ لیا (۲۵) اور قومی اسمبلی کی دو اور صوبائی اسمبلی کی دس نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ نواب اکبر بگٹی اس انتخاب میں بلا مقابلہ کامیاب ہوئے۔ (۲۶) انتخابات کے فوری بعد خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ جمہوری وطن پارٹی، اسلامی جمہوری اتحاد کے اشتراک سے وزارت بھی تشکیل دے گی۔ جس کے سربراہ سردار محمد اکبر بگٹی ہوں گے۔ مگر اس تاثر کو سب سے پہلے آئی جے آئی کے سربراہ محمد نواز شریف کے اس بیان سے ضعف پہنچا کہ چاروں صوبوں میں آئی جے آئی کی حکومتیں قائم ہوں گی۔ اس پر بلوچستان آئی جے آئی کے رہنما اور ارکان اسمبلی فوراً حرکت میں آ گئے۔ (۲۷) انہوں نے پی این پی، پشتونخواہ ملی عوامی پارٹی، پی ڈی اے، جے یو آئی، بی این ایم اور آزاد ارکان کے اشتراک سے مخلوط وزارت تشکیل دے ڈالی اور یوں میر تاج محمد جمالی صوبہ کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ (۲۸)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں نواب محمد اکبر بگٹی نے صوبائی اسمبلی کی بجائے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا حلقہ انتخاب تھا این اے ۲۰۲ جہاں سے وہ بڑی آسانی سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۲۹) ۱۹۹۷ء میں بھی وہ اسی نشست پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۳۰)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ گریجویشن کی شرط کی وجہ سے حصہ نہیں لے سکے (۳۱) ان کی نشست پر جمہوری وطن پارٹی نے ان کے بھانجے اور حاجی میر مٹھا خان بگٹی کے صاحبزادے میر غلام حیدر بگٹی کو نامزد کیا جو یہ نشست حاصل کرنے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہو گئے (۳۲)

سردار محمد اکبر بگٹی کے چھوٹے بھائی میر احمد نواز بگٹی نے بھی ایک طویل عرصہ سیاسی میدان میں گزارا۔ وہ ۲ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو ڈیرہ بگٹی میں پیدا ہوئے اور انہوں نے گرامر سکول کراچی اور ایچی سن چیفس کالج لاہور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی (۳۳)

میر احمد نواز بگٹی کے سیاسی کیریئر کا آغاز ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کی رکنیت سے ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب ان کے بڑے بھائی، اکبر بگٹی ان کے سسر حاجی میر ہیبت خان بگتی کے قتل کے الزام میں پابند سلاسل تھے اور ان پر ایبڈو کی پابندیاں بھی عائد تھیں۔

میر احمد نواز بگٹی نے مغربی پاکستان اسمبلی میں اہل بلوچستان کا موقف بڑی دلیری اور

جراتمندی سے پیش کیا۔ ۲۳؍جون ۱۹۶۲ء کو انہوں نے اسمبلی کے بجٹ سیشن میں جو تقریر کی تھی وہ لوگوں کی یادداشتوں میں آج تک محفوظ ہے۔ (۳۴)

میر احمد نواز بگٹی ۱۹۶۵ء میں کسی اسمبلی میں منتخب نہیں ہو سکے البتہ ۱۹۷۰ء میں وہ سردار اکبر بگٹی کے نامزد کردہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد میں انہوں نے اپنی وفاداری تبدیل کر لی اور نیپ کی کابینہ میں وزیر بن گئے۔ اکبر بگٹی نے اس موقع پر اپنے بیٹے سلیم اکبر بگٹی کو ۵۰ سے زیادہ بگٹیوں کو مسلح کر کے بلوچستان سیکرٹیریٹ بھیجا تاکہ اپنے بھائی کی سیاسی وفاداری تبدیل کر سکیں مگر انہیں ناکامی ہوئیں۔ (۳۵)

میر احمد نواز بگٹی نے ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں این اے ۲۰۲ سبی سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور تقریباً ۵۰ ہزار ووٹ لے کر کامیاب رہے۔ ۱۹۸۸ء میں سردار اکبر بگٹی نے بلوچستان نیشنل الائنز تشکیل دیا اور میر احمد نواز بگٹی کی محفوظ نشست پر سلیم اکبر بگٹی کو نامزد کیا۔ جبکہ سلیم اکبر بگٹی کی صوبائی نشست پر انہوں نے خود الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اب احمد نواز بگٹی کے لئے دو ہی راستے تھے یا تو وہ انتخابات میں حصہ لیں یا پھر کسی اور حلقے سے انتخاب لڑیں۔ چنانچہ انہوں نے آخر الذکر راستہ منتخب کیا اور این اے ۱۹۷ کوئٹہ چاغی سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ انہیں غوث بخش بزنجو کی پارٹی پاکستان نیشنل پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ اس نشست پر جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات حافظ حسین احمد کامیاب ہوئے اور احمد نواز بگٹی چھٹے نمبر پر آئے۔ (۳۶)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں میر احمد نواز بگٹی نے حصہ ہی نہیں لیا۔ ان کا نام ملکی سیاسیات میں دوبارہ اس وقت سامنے آیا جب ان کے سمدھی سردار بلخ شیر مزاری ملک کے نگراں وزیراعظم بنے۔ میر احمد نواز بگٹی کی صاحبزادی کی شادی سردار بلخ شیر مزاری کے بیٹے طارق مزاری سے ہوئی ہے اور سردار بلخ شیر مزاری کے چھوٹے بھائی سردار شیر باز خاں مزاری میر احمد نواز بگٹی اور سردار اکبر بگٹی کے بہنوئی ہیں۔ (۳۷) میر احمد نواز بگٹی سردار بلخ شیر مزاری کی کابینہ میں خصوصی تعلیم اور سماجی بہبود کے وزیر بنے۔ (۳۸) مگر یہ وزارت ۲۶؍مئی ۱۹۹۳ء کو اس وقت دم توڑ گئی جب سپریم کورٹ نے نواز شریف حکومت کو بحال کر دیا۔ (۳۹)

اس کے بعد انہوں نے کسی انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ ۲۲؍جون ۲۰۰۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا (۴۰)

سردار محمد اکبر خاں بگٹی کے سب سے بڑے صاحبزادے سلیم اکبر بگٹی نے بھی ایک طویل عرصہ سیاست کے میدان میں گزارا۔ وہ قیام پاکستان ٹھیک دس دن بعد ۲۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو ڈیرہ بگٹی میں پیدا ہوئے تھے (۴۱)

ان کا نام قومی سیاست میں پہلی مرتبہ اس وقت سامنے آیا جب انہوں نے ۱۹۷۱ء میں این ڈبلیو ۱۳۶، کوئٹہ ۲ سے قومی اسمبلی کے لئے ضمنی انتخاب میں حصہ لیا۔ یہ نشست سردار خیر بخش مری نے خالی کی تھی کیونکہ وہ صوبائی اسمبلی کی نشست برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ سلیم اکبر بگٹی کے حریف میر تاج محمد جمالی

تھے، جنہیں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی چنانچہ اس نشست پر میر تاج محمد جمالی ۴۰۸، ۷ دونوں کی اکثریت سے جیت گئے۔ (۴۲)

سلیم اکبر بگٹی ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور قائد حزب اختلاف کے منصب پر فائز ہوئے۔ (۴۳) ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء دونوں عام انتخابات میں انہوں نے این اے ۲۰۲ سبی، کوہ، ڈیرہ بگتی، زیارت کی نشست پر حصہ لیا اور دونوں مرتبہ کامیاب ہوئے (۴۴) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایک عرصہ بعد صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ وہ اس انتخاب میں بھی کامیاب ہوئے (۴۵) اور بعد ازاں کچھ عرصہ صوبائی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کے منصب پر بھی فائز رہے۔ (۴۶)

سلیم اکبر بگٹی نے اپنی کامیابی کا یہ تسلسل ۱۹۹۷ء میں بھی جاری رکھا۔ اس مرتبہ وہ پہلی بار حکومتی حلقے میں بھی نظر آئے اور انہیں تعلیم، صحت اور قانون اور پارلیمانی امور کا صوبائی وزیر بنایا گیا (۴۷) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے انتخابی عمل میں حصہ نہیں لیا اور ان کی نشست پر نواب اکبر بگٹی کے بھتیجے اور عبدالرحمٰن بگٹی کے صاحبزادے جمعہ خاں بگٹی بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۴۸)

سلیم اکبر بگٹی نے ۲۶/جون ۲۰۰۳ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے وفات پائی وہ میر محراب خان کے نام سے مشہور تھے اور میر نبی بخش زہری کے داماد تھے (۴۹)

سردار اکبر بگٹی کے تین داماد بھی عملی سیاست میں ہیں۔ ان میں ایک سردار میر ہمایوں خاں مری ہیں۔ جو سردار نواب خیر بخش مری کے بھتیجے ہیں۔ میر ہمایوں خاں مری پی بی ۱۸ کوہلو سے ۱۹۸۵ء میں ایم پی اے منتخب ہوئے۔ بعد ازاں وہ وزیر اعلیٰ جام غلام قادر کی کابینہ میں وزیر خزانہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ بلوچستان کابینہ کے واحد وزیر تھے جنھوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں بھی وہ آزاد اُمیدوار کے طور پر کامیاب ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں بلوچستان اسمبلی کی تحلیل کے بعد وہ بلوچستان کے نگراں وزیر اعلیٰ بنائے گئے۔ (۵۰) ۱۹۹۰ء میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں تیسری مرتبہ کامیابی حاصل کر کے اپنی کامیابیوں کی ہیٹ ٹرک مکمل کی۔ اس مرتبہ انہیں جمہوری وطن پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ (۵۱)

۱۹۹۰ء کے بعد انہوں نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب نہیں لڑا۔ اس کے بعد یہ نشست نواب خیر بخش مری کے صاحبزادگان کے حلقہ انتخاب بن گئی اور ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء میں اس نشست پر ان کے تین صاحبزادگان سردار گزین خان مری، میر حیر بیار خان مری اور نوابزادہ میر بالاچ مری، باری باری بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۵۲)

میر ہمایوں خاں مری ۱۹۹۷ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے اور اس ایوان کے ڈپٹی چیئرمین کے منصب پر فائز ہوئے (۵۳)

سردار محمد اکبر بگٹی کے دوسرے داماد میر چاکر خاں ڈومبکی ہیں۔ وہ پہلی مرتبہ ۱۹۷۰ء میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد ازاں وہ نیپ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۷ء میں وہ پبلک ہیلتھ اور بہبود آبادی کے صوبائی وزیر بھی رہے (۵۴)

وہ گریجویشن کی شرط کی وجہ سے ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے۔ اس انتخاب میں ان کی نشست پر ان کے صاحبزادے میر بختیار خاں ڈومبکی بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۵۵)

سردار اکبر بگٹی کے ایک اور داماد شاہد حسن بگٹی ہیں جو ان کے بھانجے بھی ہیں وہ جمہوری وطن پارٹی کے سیکریٹری جنرل کے منصب پر بھی فائز ہیں اور ۲۰۰۲ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے ہیں (۵۶)

سردار اکبر بگٹی کے ایک اور بھانجے میر طارق محمود کا تعلق ضلع لورالائی کے کھیتران قبیلے سے ہے۔ وہ ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۳ء میں بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۵۷)

سردار اکبر بگٹی کی ایک وجہ شہرت ان قبائلی دشمنیاں بھی ہیں جن میں اب تک کئی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ ماضی میں یہ سلسلہ ۷رمئی ۱۹۹۲ء کو سردار امیر حمزہ بگتی کے قتل سے دوبارہ شروع ہوا جو بگٹی قبیلے کی کلپر شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور جنھوں نے ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں سردار اکبر بگٹی کے مقابلے میں انتخاب لڑنے کی جرات کی تھی۔ ان کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی سے تھا۔ (۵۸)

سردار امیر حمزہ بگٹی کے قتل کے بعد ان کے والد وڈیرہ خان محمد نے سر عام قسم کھائی کہ وہ اور ان کے بیٹے جب تک اپنے دشمن سے عبرتناک انتقام نہیں لے لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ مبینہ طور پر ان کا دشمن سردار اکبر بگٹی اور ان کا بڑا صاحبزادہ سلیم اکبر بگٹی تھا۔ جس کا نام بھی ایف آئی آر میں درج کروایا گیا تھا مگر بعض قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ ان کا اصل ہدف شروع دن سے اکبر بگٹی کا سب سے چہیتا بیٹا سلال بگٹی تھا جس کا نام دانستہ طور پر اس لئے نہیں اچھالا گیا تھا کہ وہ حفاظتی تدابیر سے غافل ہو کر آزادانہ گھومتا پھرے اور نسبتاً آسانی سے ہدف بن سکے (۵۹) اور پھر ہوا بھی یہی۔ ۲رجون ۱۹۹۲ء کو چند نامعلوم افراد نے سلال بگٹی کو اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جب کوئٹہ کی معروف شاہراہ جناح روڈ پر اپنے باڈی گارڈز اور سیکرٹری کے ہمراہ کار چلا رہے تھے۔ (۶۰)

سلال بگٹی، سردار اکبر بگٹی کے سب سے چھوٹے، سب سے چہیتے اور سب سے لاڈلے بیٹے تھے۔ اکبر بگٹی ان کی تربیت خاص اہتمام سے کر رہے تھے اور انہیں اپنے والد کا سیاسی جانشین سمجھا جاتا تھا۔

بگٹی خاندان کے لیے ۲۷راگست ۱۹۹۴ء کا دن ایک اور المناک دن ثابت ہوا۔ اس دن بلوچستان کے متعدد قبائلی عمائدین، جن میں نوابزادہ سلیم اکبر بگٹی، خان آف قلات میر محمد داؤد خان، نواب اسلم رئیسانی، حاجی لشکری رئیسانی اور چاکر خان ڈومبکی شامل تھے، ایک قبائلی شخصیت میر شیر باز خان بنگل زئی کی قل کی تقریب میں شریک تھے۔ اس تقریب کے دوران اچانک کسی بات پر بگٹیوں

اور رئیسانیوں کے مسلح باڈی گارڈز کے درمیان تکرار ہوگئی۔ اس تکرار نے دیکھتے ہی دیکھتے مسلح تصادم کی شکل اختیار کر لی۔ اس تصادم میں کئی گھنٹے تک خود کار اسلحے کا آزادانہ استعمال ہوا۔ جس کے نتیجے میں ۹ افراد ہلاک ہو گئے۔ ان ہلاک شدگان میں نواب اکبر بگٹی کے تین جواں سال نواسے بھی شامل تھے۔ ان میں سے دو نواسے سالار ڈومبکی اور دینار ڈومبکی، چاکر خاں ڈومبکی کے اور ایک نواسے شہر یار بگٹی، شاہد حسن بگٹی کے صاحبزادے تھے۔ (۶۱)

نواب اکبر بگٹی کے دور سرداری میں بگٹی قبیلے اور بگٹی علاقے نے کئی تبدیلیاں دیکھیں اس نے حکومتی مہربانیاں بھی دیکھیں اور ریاستی قہرمانیوں کا بھی مشاہدہ کیا۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان پٹرولیم لمیٹڈ کے ساتھ ایک معاہدے کے نتیجے میں اس علاقے میں سوئی کے مقام پر قدرتی گیس کی ایک وافر مقدار دریافت ہوئی جسے پائپ لائنوں کے ذریعے ملک کے بڑے شہروں اور قصبوں تک پہنچا دیا گیا۔ پاکستان کی معیشیت میں تو اس سے ایک انقلاب آ گیا لیکن خود بگٹی علاقے میں کوئی تبدیلی یا ترقی دیکھنے میں نہیں آئی اور نہ ہی بگٹی قبیلے کو کوئی خاص فائدہ ہوا۔ صوبائی دارالحکومت کوئٹہ کو بھی یہ گیس ۱۹۸۴ء میں اس وقت نصیب ہوئی جب کویت نے اس کے لیے رقم فراہم کی۔ ڈیرہ بگٹی، قدرتی گیس کے ذخائر کی بدولت ملک کا ایک امیر ترین علاقہ ہے لیکن اس کا شمار اب بھی پسماندہ ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ (۶۲)

۲۰۰۳ء میں سوئی میں چھاؤنی کے قیام کے فیصلے نے فوجی حکومت اور بگٹی قبیلے میں کشیدگی میں اضافہ کیا۔ بعض نامعلوم افراد نے گیس کی تنصیبات پر یکے بعد دیگرے کئی حملے کیے جس سے پورے پاکستان میں سوئی گیس کی فراہمی میں خلل پڑا اور سینکڑوں کارخانے بند ہو جانے کا امکان پیدا ہو گیا (۶۳)

حکومت نے اس صورت حال کا سختی سے نوٹس لیا اور پنجاب اور وفاق کی فورسز نے موقع پر پہنچ کر حالات پر قابو پایا۔ ابھی کشیدگی کی یہ صورت حال جاری تھی کہ جنوری ۲۰۰۵ء میں سوئی میں پی پی ایل کی فیلڈ میں مقیم ایک خاتون ڈاکٹر، ڈاکٹر شازیہ خالد کے ساتھ زیادتی کا ایک واقعہ پیش آیا۔ غیور بلوچوں نے اس واقعہ کو اپنی عزت و ناموس پر حملہ قرار دیا اور سوئی کا علاقہ ایک مرتبہ پھر تصادم کی لپیٹ میں آ گیا۔ بلوچستان کی حکومت امن و امان قائم کرنے میں بے بس اور ناکام ہوگئی اور وفاق کو ان معاملات میں ایک مرتبہ پھر مداخلت کرنی پڑی (۶۴)۔ ابھی بگٹی قبیلے اور حکومتی سیکیورٹی فورسز کے درمیان مزاحمت کا سلسلہ جاری تھا کہ ۲۶ راگست ۲۰۰۶ء کو سردار اکبر بگٹی کی ہلاکت کی اطلاع آ گئی۔

حکومتی ذرائع کے مطابق سردار اکبر بگٹی نے اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ ایک غار میں پناہ لے رکھی تھی۔ اس غار سے ۲۳ راگست ۲۰۰۶ء کو پاکستان آرمی کے دو ہیلی کاپٹروں پر فائرنگ کی گئی تھی۔ اس فائرنگ کے بعد پاکستان آرمی کے پیراملٹری دستوں نے اس علاقے کا محاصرہ کرلیا اور فائرنگ کرنے والوں کو گرفتار کرنے کے لیے غاروں کی تلاشی کا کام شروع کردیا۔ جب یہ دستے اس

غار کے نزدیک پہنچے جس میں سردار اکبر بگٹی نے پناہ لی ہوئی تھی تو غار میں موجود مسلح افراد کی جانب سے شدید فائرنگ کی گئی جواب میں پیراملٹری دستوں نے بھی فائرنگ کی۔ فائرنگ کے اس تبادے کے نتیجے میں غار کی چھت اچانک منہدم ہو گئی اور سردار اکبر بگٹی اپنے متعدد ساتھیوں سمیت جاں بحق ہو گئے۔(۶۵)

چند روز بعد جب سردار اکبر بگٹی کی لاش بازیاب ہوئی تو حکومت نے اسے ایک صندوق میں بند کر کے سپرد خاک کردیا۔ سردار بگٹی کی اس تدفین میں ان کے خاندان کا کوئی فرد شریک نہیں ہوا۔ جس کی وجہ سے علاقے میں اب تک کشیدگی کی فضا موجود ہے۔(۶۶)

حوالہ جات

۱۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔کوئٹہ۔ص ۷۱

۲۔ لالہ ہتو رام۔ تاریخ بلوچستان۔کوئٹہ۔ص ۱۰۰

۳۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔کوئٹہ۔ص ۱۶

۴۔ ایضاً۔ص ۱۶۱،۱۶۲

۵۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔کوئٹہ۔ص ۷۳ تا ۷۹

۶۔ طاہر محمد خان۔ سیاسیات بلوچستان۔کوئٹہ۔ص ۱۶۰

۷۔ ملک صالح محمد خاں لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔کوئٹہ۔ص ۷۹

۸۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار۔ لاہور۔ص ۸۰

۹۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔کوئٹہ۔ص ۸۰،۸۱

۱۰۔ نذیر لغاری۔ سیاست دوراں۔ کراچی۔ص ۷۷ تا ۸۳

۱۱۔ الیاس شاکر، میں اکبر بگٹی ہوں (انٹرویو)۔ہفت روزہ صحافت لاہور۔ بلوچستان نمبر، ۱۷/ فروری تا ۲۳/فروری، ۲۴/فروری تا ۳/مارچ ۱۹۷۸ء۔ص ۵۵

۱۲۔ نذیر لغاری۔ سیاست دوراں۔ کراچی۔ص ۵۷

۱۳۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ص ۷۷

۱۴۔ طاہر محمد خاں۔ سیاسیات بلوچستان۔کوئٹہ۔ص ۲۱۲

۱۵۔ ایضاً۔ص ۲۱۴

۱۶۔ نذیر لغاری۔ سیاست دوران۔ کراچی۔ص ۵۵

۱۷۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں، کوئٹہ۔ص ۲۵۰ تا ۲۵۳

۱۸۔ مجاہد بریلوی۔ جمہوریت کا سفر۔ کراچی۔ص ۱۶۵

۱۹۔ نذیر لغاری ۔ سیاست دوراں ۔ کراچی ۔ ص ۸۴، ۸۵

۲۰۔ طاہر بزنجو ۔ بلوچستان ۔ سیاست میں اتار چڑھاؤ ۔ کوئٹہ ۔ ص ۴۹

۲۱۔ الیاس شاکر ۔ میں اکبر بگٹی ہوں (انٹرویو) ہفت روزہ صحافت لاہور ۔ بلوچستان نمبر ۱۶ر فروری تا ۲۳ر فروری، ۲۴ر فروری تا ۳ر مارچ ۱۹۷۸ء ۔ ص ۵۷

۲۲۔ طارق اسمٰعیل ۔ الیکشن ۸۸ ۔ ص ۴۱۳، ۳۹۴

۲۳۔ ایضاً ۔ ص ۴۳۱

۲۴۔ تجمل حسین انجم ۔ پاکستان تاریخی و سیاسی جائزہ ۔ لاہور ۔ ص ۶۶۸

۲۵۔ ادارہ ۔ پارٹی ٹائم ۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی ۔ الیکشن ۹۰ اسپیشل (اکتوبر ۱۹۹۰ء) ۔ ص ۲۹

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد ۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء ۔ جلد دوم ص ۱۳۱، ۴۹۱، ۴۷۷

۲۷۔ اختر بلوچ ۔ مکتوب کوئٹہ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی ۔ ۱۲ر تا ۱۸ر نومبر ۱۹۹۰ء ۔ ص ۱۴

۲۸۔ اختر بلوچ ۔ مکتوب کوئٹہ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی ۔ ۱۹ر تا ۲۵ر نومبر ۱۹۹۰ء ۔ ص ۱۴

۲۹۔ دی گزٹ آف پاکستان ۔ اسلام آباد ۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء ۔ ص ۱۳۲۳

۳۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد ۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ ۔ جلد دوم ص ۱۵۹

۳۱۔ شفقت تنویر مرزا ۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان لاہور ۔ ص ۔ ۲۳۰

۳۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد، جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ ۔ جلد دوم ص ۹۹

۳۳۔ تہور علی خاں ۔ بائیوگرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان ۔ ۵۶۔۱۹۵۵ ایڈیشن ۔ ص ۱۳۷

۳۴۔ احمد سلیم ۔ بلوچستان، صوبہ مرکز تعلقات ۔ لاہور ۔ ص ۱۶۵ تا ۱۶۷

۳۵۔ ایضاً ۔ ص ۲۲۸

۳۶۔ طارق اسمٰعیل ۔ الیکشن ۸۸ ۔ ص ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۸، ۳۹۹

۳۷۔ محمود غزنوی ۔ قبضہ گروپ کی کابینہ (خصوصی رپورٹ) ۔ ہفت روزہ حرمت، اسلام آباد ۔ ۱۴ر تا ۲۰ر مئی ۱۹۹۳ء ۔ میں ص ۱۴

۳۸۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی ۔ ۱۰ر تا ۱۶ر مئی ۱۹۹۳ ۔ ص ۸

۳۹۔ پروفیسر غفور احمد ۔ نواز شریف کا پہلا دور حکومت ۔ لاہور ۔ ص ۔ ۵۲۵ تا ۵۲۷

۴۰۔ کامران اعظم، بگٹی قبیلہ، تاریخ و تہذیب کے تناظر میں لاہور ۔ ص ۳۹۱

۴۱۔ ایضاً ۔ ص ۳۹۲

۴۲۔ افتخار احمد ۔ پاکستان جنرل الیکشنز ۱۹۷۰ء ۔ لاہور ۔ ص ۔ ۱۳۴

۴۳۔ طارق اسمٰعیل ۔ الیکشن ۸۸ ۔ لاہور ۔ ص ۴۰۲

۴۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۳/دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۵۸۴۔ ۱۱/نومبر ۱۹۹۰۔ ص ۹۲۴۵
۴۵۔ ایضاً۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۵۵۰۔
۴۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۵/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ۵/جون ۱۹۹۴ء
۴۷۔ وحید زہیر۔ بلوچستان، جمہوریت کا سفر۔ کوئٹہ۔ ص ۲۸، ۲۹
۴۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۵۳
۴۹۔ کامران اعظم، بگٹی قبیلہ، تاریخ وتہذیب کے تناظر میں۔ لاہور۔ ص ۳۹۳
۵۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۱۲
۵۱۔ اختر بلوچ۔ متوب کوئٹہ۔ ہفت روزہ اخبار جہاں۔ ۵/تا ۱۱/نومبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۱۴
۵۲۔ (i) وحید زہیر۔ بلوچستان جمہوریت کا سفر۔ کوئٹہ۔ ص ۸۹، ۹۴
(ii) الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد، جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۵۳
۵۳۔ پارلیمنٹ ہاؤس، اسلام آباد، سینٹ آف پاکستان، ڈائرکٹری آف ممبرز، چوتھا ایڈیشن۔ ص ۳۰
۵۴۔ وحید زہیر۔ بلوچستان جمہوریت کا سفر۔ کوئٹہ۔ ص ۲۹
۵۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد، جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد دوم۔ ص ۳۵۲
۵۶۔ شاہد بگٹی کی ای میل بنام مصنف۔ مورخہ ۱۴/جون ۲۰۰۶ء
۵۷۔ وحید زہیر۔ بلوچستان جمہوریت کا سفر۔ کوئٹہ۔ ص ۷۸، ۸۹
۵۸۔ محمد ریاض۔ قتل کی سیاست۔ ماہنامہ مطالعہ پاکستان کراچی (معلومات ۷) ستمبر ۱۹۹۲ء ص ۴۸ تا ۵۰
۵۹۔ اختر بلوچ۔ مکتوب کوئٹہ۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۵/تا ۲۱/جون ۱۹۹۲ء۔ ص ۱۱
۶۰۔ احمر مستی خان۔ ٹرائب ورسس ٹرائب۔ ماہنامہ نیوز لائن کراچی۔ جون ۱۹۹۳ء ص ۸۱
۶۱۔ ادارہ۔ سانحہ ۲۷/اگست، روزے پس فردا بودے۔ مشمولہ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔ ستمبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۱، ۲
۶۲۔ لالہ ہتورام، پروفیسر عزیز محمد بگٹی، بلوچ قبائل، کوئٹہ۔ ص ۷۹، ۸۰
۶۳۔ عزیز محمد بگٹی۔ بگٹی قبیلہ، کوئٹہ۔ ص ۹۴
۶۴۔ کامران اعظم، بگٹی قبیلہ، تاریخ وتہذیب کے تناظر میں۔ لاہور۔ ص ۱۷۵ تا ۱۹۴
۶۵۔ ڈاکٹر چشتی مجاہد۔ نواب اکبر بگٹی کی ہلاکت۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی ۴/تا ۱۰/ستمبر ۲۰۰۶ء۔ ص ۳۹ تا ۴۱۔
۶۶۔ ڈاکٹر چشتی مجاہد۔ نواب اکبر بگٹی کی ہلاکت اور تدفین کا معمہ کیسے حل ہوگا ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۱/تا ۱۷/ستمبر ۲۰۰۶ء۔ ص ۱۲

جام

بلوچستان کی سابق ریاست لسبیلہ کا حکمران "جام" خاندان بنیادی طور پر علیانی قبیلے کی جاموٹ شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ (۱)

بلوچستان میں جٹ، جاموٹ اور جدگال ایک ہی نسل کے لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جٹ وہ لوگ ہیں جن کو عرب روزنامچہ نویسوں نے زط لکھا ہے اور بلوچ جن کو جت بولتے ہیں۔ یہ مال دار (گلہ بان) لوگ تھے جو اونٹوں کے گلے پالتے تھے لہٰذا پیشے کی مناسبت سے بلوچی میں جت کے معنی ساربان یا اونٹ پالنے والے کے ہوئے۔ جدگال جسے غلط العام میں جگدال بھی کہتے ہیں اسی نام جت کا صیغہ جمع ہے جو "جت گل" بنتا ہے یعنی جتوں کی ٹولی یا گروہ، یہی نام جت گل "عام زبان میں "جدگال" کہا جانے لگا۔

جام کے معنی بلوچی میں تنومند اور قومی کے ہوتے ہیں لیکن بسا اوقات بڑے یا معتبر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس سے نام جاموٹ بنا جو جٹ قبیلے کے بڑے یعنی معزز و معتبر طائفے کے لئے استعمال ہوا۔ جاموٹوں کے سردار کے لئے جام کا لقب اسی سے مشتق ہے۔

یہ جٹ، جاموٹ، جت یا جدگال جو ایک ہی نام ہے ہمیشہ بلوچوں کے ساتھ رہے ہیں لیکن بلوچ ان کو اپنے سے کمتر خیال کرتے رہے ہیں۔ مکران سے جب سردار شیہک کی سرکردگی میں بلوچوں نے نقل مکانی کی تو راہپی یعنی خدمتگار طائفے کی حیثیت سے جت اور نقیب بھی ان کے ساتھ تھے۔ (۲)

لسبیلہ کے باشندوں کی غالب اکثریت جٹ اور گجر قبائل پر مشتمل ہے جو پانچویں صدی عیسوی کے لگ بھگ بلوچستان میں وارد ہوئے تھے اور جنوبی بلوچستان کے اصل باشندوں کو جو ساکا نژاد قبائل پر مشتمل تھے، زیر کرنے کے بعد ان کے تمام وسائل پر قابض ہو گئے تھے۔ یہ قدیم قبائل یا تو سندھ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے یا پھر ان ہی جٹ اور جاموٹ قبیلوں کی قومیت میں مدغم ہو کر زندگی بسر کرنے لگے۔

میں سے پہلا "جام دینا" اور دوسرا "جام ابراہیم" تھا۔ ابراہیم کے متعلق ایک مورخ نے لکھا ہے کہ اس کے پاس پندرہ سو سوار تھے جن کی مدد سے اس نے سیوستان، سندھ اور مکران پر حملہ کیا اور ایک دفعہ اس نے نگہار کے علاقہ کو لوٹ کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ "ابراہیم" کو اس کے قبیلے کے ایک سردار نے قتل کر دیا تھا۔ نگہار علاقہ جھالاوان میں سوراب کے قریب جگہ تھی۔ اس کے کا بدلہ لینے کے لئے اس کے ماموں پہاڑ خان نے جو "برفت" قبیلے کا سردار تھا۔ علاقہ "گونگہ" کو جو اوتھل کے نواح میں واقع تھا۔ خوب تاخت و تاراج کیا اور بیلہ کو اپنی حکمرانی میں لے لیا۔ پہاڑ خان کے فوت ہو جانے کے بعد میر عزت خان اور اس کے بیٹے کو لسبیلہ کی سرداری منتقل ہوئی۔ میر عزت خان کا لڑکا اس وقت نابالغ تھا اس لئے لسبیلہ کی باگ دوڑ اس کی ماں بی بی جاگلی نے سنبھال لی۔ ان دنوں جاموٹ قبیلہ کا سردار جام عالی کھتوریہ تھا۔ جام عالی کھتوریہ نے دیگر تمام قبائل کے اصرار پر اور میر محبت خاں والی قلات کی عسکری امداد سے بیلہ پر حملہ کیا اور بی بی جاگلی کو شکست دے کر لسبیلہ پر حکمرانی کا آغاز کیا۔ یہ واقعہ ۱۷۴۲ء کا ہے۔ اس وقت سے قیام پاکستان تک لسبیلہ پر یہی خاندان حکمران رہا۔

جام عالی کھتوریہ نے ۱۷۶۶ء میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جام غلام شاہ لسبیلہ کا حکمران مقرر ہوا۔ جام غلام شاہ کی شادی میر نصیر خان اعظم کی دختر بی بی سلطان خاتون سے ہوئی۔ اور میر نصیر خان نے گوادر بندر اپنی بیٹی کو جہیز میں دے دی اور اس طرح گوادر کی بندرگاہ جام غلام شاہ کے قبضے میں آ گئی۔

۱۷۷۶ء میں جام غلام شاہ بعارضہ چیچک قلات میں فوت ہو گیا کیونکہ اس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے میر نصیر خان والئے قلات نے اس کے چھوٹے بھائی جام میر خان اول کو لسبیلہ کا حکمران مقرر کر دیا۔ جام میر خان نے جام غلام شاہ کی بیوہ بی بی سلطان خاتون سے شادی بھی کر لی جام میر خاں ایک بڑا کامیاب اور قابل منتظم تھا۔ وہ ۱۸۱۸ء تک لسبیلہ کا حکمران رہا اور اس کے بعد اس کا بیٹا جام عالی خان دوم اس کا جانشین مقرر ہوا۔

جام عالی خان دوم کا دور حکمرانی ۱۲ سال پر محیط رہا۔ اس نے ۱۸۳۰ء میں وفات پائی اور اس کے بعد اس کا بیٹا جام میر خاں لسبیلہ کی گدی پر متمکن ہوا۔ اس کی شادی خان آف قلات کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی مگر اس کے باوجود وہ ہمیشہ خان آف قلات سے نبرد آزما رہا۔ اس نے تین مرتبہ قلات پر حملہ کیا اور اس سلسلے میں جھالاوان اور خاران کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ جام عالی خاں دوم نے تینوں مرتبہ شکست کھائی اور آخر کار فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔

۱۸۷۶ء میں سر رابرٹ سنڈیمن کے عہد میں خان خداداد خاں والی قلات اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جو معاہدۂ مستونگ کے نام سے معروف ہے۔ اس معاہدے میں ساراوان اور جھالاوان کے سرداروں کے ساتھ ساتھ جام خاں بھی شامل تھا۔ اس موقع پر

اس بات پر تمام مورخ متفق ہیں کہ ایشیائی ممالک پر جب سفید ہنوں (منگ) کے حملے شروع ہوئے تو ان کے ساتھ جٹ اور گجر بھی شامل تھے۔ سفید ہن (منگ) بلوچستان میں پانچویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف کے دوران داخل ہو گئے تھے۔ سفید ہنوں اور جٹ کا باہمی خون کا رشتہ غیرواضح ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ لوگ کہاں ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے تھے۔ اکثر مورخین جٹ قبائل کا نسلی رشتہ کلاسیکی مصنفین کی اس قوم کے ساتھ ملاتے ہیں جو مشرقی ایران میں "مسہ جٹو" کے نام سے شہرت رکھتا ہے اور یہ لوگ باختر کے جٹ نامی علاقے میں کثیر تعداد میں بود و باش رکھتے تھے۔ یہی علاقہ گجر قبائل کا بھی وطن تھا جن کو ایرانی "گاؤدار" کے نام سے پکارتے تھے۔ غالباً سفید ہنوں کی شکست اور ایرانی شہنشاہ نوشیروان کے ہاتھ ان کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہ لوگ بھی سفید ہنوں کے ساتھ شامل ہو کر ہندوستان اور ایران وغیرہ ممالک میں داخل ہو گئے۔

ان قبائل کا سیاسی پس منظر کچھ بھی ہو، جب یہ لوگ بلوچستان میں داخل ہو گئے تو ان کی سوسائٹی تین طبقوں پر مشتمل تھی۔ سب سے اونچا طبقہ سفید ہنوں کا تھا جو منگ کہلاتے تھے اور زبردست جنگی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ بڑے بہادر، جری اور نڈر واقع ہوئے تھے۔

دوسرا درمیانی طبقہ جٹ اور گجر قبائل پر مشتمل تھا جو زراعت کے ساتھ ساتھ پرورش حیوانات (مال داری) یعنی مویشیوں کی پرورش کے ساتھ گہری دلچسپی رکھتا تھا اور ان کی معیشت کا دارومدار بھی ان ہی دو امور پر تھا۔

تیسرے اور سب سے نچلے طبقے میں نقیب شامل تھے جو خیمہ برداروں کی حیثیت سے متذکرہ بالا دو طبقوں کے ساتھ شامل ہو کر آئے تھے اور یہ ان کا خدمتگار طبقہ تھا۔

جب بلوچستان میں خشک سالی کا طویل دور شروع ہو گیا اور چراگاہوں کی وسعت میں تنگی آ گئی تو اس کے نتیجے میں ایک طرف براہوئی قبائل اور دوسری طرف جٹ قبائل کے درمیان چراگاہوں کے مسئلہ پر شدید لڑائیاں شروع ہوئیں اور جٹ قبائل کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور ان کا معتدبہ حصہ خاران اور جھالاوان سے سندھ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گیا اور جو لوگ باقی رہ گئے وہ بلوچ اور براہوئی آبادی میں مدغم ہو گئے۔ لیکن ان جٹ قبائل نے لس بیلہ کے علاقے میں اپنی حیثیت برقرار رکھی اور یہی علاقہ ان کا مرکز بن گیا۔ (۳)

کہا جاتا ہے کہ گجر، رونجہ، گونگہ اور برفت قبائل جو اب تک لسبیلہ میں آباد ہیں۔ انہوں نے بھی کچھ عرصہ مشترکہ طور پر لسبیلہ میں ایک آزاد حکومت قائم کی تھی اور ان کے بعد علیانی خاندان کی جاموٹ اقوام نے لسبیلہ پر قبضہ کر لیا، جن کی نسل سے آج تک بیلہ کے حکمران جام کے نام سے مشہور چلے آتے ہیں۔

بیلہ کی تاریخ میں جاموٹ خاندان سے متعلق ہمیں دو حکمرانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان حکمرانوں

ساراوان اور جھالاوان کے سرداروں کی درخواست اور سفارش پر خان خداداد خان والی قلات نے جام میر خان کو معاف کر دیا اور اس کی گدی بحال کر دی۔

گدی پر بحال ہونے کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جام میر خان اپنے بیٹے کا شکر گزار ہوتا۔ مگر ہوا یہ کہ بعض معاملات پر دونوں باپ بیٹوں کے اختلافات اتنے بڑھ گئے کہ باپ نے بیٹے کو نہ صرف جلاوطن کر دیا بلکہ اسے اپنی وراثت سے بھی محروم کر دیا۔ تاہم جام میر خان کی وفات کے بعد جام عالی خاں سوم نے ایجنٹ گورنر جنرل کی وساطت سے گورنمنٹ آف انڈیا سے اپیل کی جس کے نتیجے میں ۲۱ر جنوری ۱۸۸۹ء کو اس کی گدی بحال ہو گئی (۴)

جام میر عالی خاں سوم کا عہد حکومت مختصر تھا مگر اس نے رفاہ عامہ کے متعدد کام کئے اس نے اپنی ریاست میں متعدد اسکول اور ہسپتال قائم کئے۔ فوج کو باقاعدہ طور پر منظم کیا اور سالانہ آمدنی و خرچ کے لئے بجٹ تیار کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ (۵)

جام میر عالی خاں سوم کو انگریزی حکومت نے سی آئی ای کا خطاب دیا۔ اس نے ۱۴ر جنوری ۱۸۹۶ء کو وفات پائی اس کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا جام میر کمال خاں گدی نشین ہوا۔ جام میر کمال خاں بھی اپنے باپ کی طرح انگریزوں کا منظور نظر رہا۔ ۱۹۰۳ء میں جب لارڈ کرزن نے بمبئی میں شاہی دربار منعقد کیا تو جام میر کمال خان نے اس میں تمام سرداروں اور معتبرین لسبیلہ کے ہمراہ شرکت کی (۶)

وہ ان معدودے چند والیان ریاست میں شامل تھا۔ جنہیں ۱۹۱۱ء میں شاہ ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاج پوشی منعقدہ دہلی میں شہنشاہ نے بہ نفس نفیس شرف ملاقات عطا کیا تھا (۷) اسے بھی انگریزی حکومت نے سی آئی ای کا خطاب دیا تھا اور اسے نو توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔

جام میر کمال خاں نے ۲۶ر جون ۱۹۲۱ء کو کوئٹہ میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جام میر غلام محمد خاں ریاست لسبیلہ کا حکمراں ہوا۔ اس کی رسم تاج پوشی جنوری ۱۹۲۲ء میں ادا ہوئی۔

جام میر غلام محمد نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور اس کا اکثر وقت سیر و شکار میں بسر ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بزرگ نے میر غلام محمد خان کو شکار کھیلنے سے منع کیا تھا اور کہا تھا شکار کھیلنے سے اس کے خود شکار ہو جانے کا اندیشہ ہے مگر اس نے اس کی پروانہ کی اور بالآخر ۱۹۳۷ء میں ایک شکار کے دوران اپنے ایک ساتھی کی گولی لگنے سے ہلاک ہوا۔ (۸)

جام میر غلام محمد کی وفات کے بعد ان کے بیٹے جام میر غلام قادر خاں لسبیلہ کا حکمراں بنے۔ قیام پاکستان کے وقت وہی لسبیلہ کے حکمراں تھے۔ اور ۲۱ر مارچ ۱۹۴۸ء کو انہی نے لسبیلہ کی پاکستان میں شمولیت کی دستاویز پر دستخط کئے تھے۔ جام میر غلام قادر خاں کے ہمراہ خاران اور مکران کے حکمرانوں نواب حبیب اللہ خاں اور نواب میر بھائی خان نے بھی پاکستان میں شمولیت

اختیار کی اور یوں قلات کو بھی پاکستان میں شامل ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ (۹)

جام میر غلام قادر خاں نے بعد ازاں ایک انٹرویو میں بتایا کہ انہیں اطلاع ملی تھی کہ چند دنوں میں ایک بیرونی ملک کا فوجی بیڑہ ------پستی اور جیوانی اور جیوانی میں لنگر انداز ہو کر قلات کو تحفظ دینا چاہتا ہے اور اس کا مقصد پاکستان کے اندر ایک ریاست قائم کرنا ہے۔ جام میر غلام قادر خان نے یہ اطلاع قائد اعظم کو پہنچائی جنہوں نے فوراً اس اطلاع کی تصدیق کی اور لسبیلہ، خاران اور مکران کے الحاق کو تسلیم کر لیا۔

جام میر غلام قادر خان نے مزید کہا کہ "ہم نے یا خاران و مکران کے حکمرانوں نے ایسا کر کے پاکستان پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ میں تو ہمیشہ سے یہ کہتا رہا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ ہمیں جو کچھ مقام و منزلت اور سرفرازی حاصل ہے وہ درحقیقت پاکستان ہی کی مرہون منت ہے۔ میرے لئے تو یہ مقام، فخر کے ساتھ ساتھ سپاس گزاری کا بھی موجب ہے ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکرگزار ہیں کہ اس نے ہمیں اس نازک مرحلہ پر بصیرت بخشی کہ ہم نے ایک صحیح راستہ اختیار کیا اور ملک و ملت کی خدمت کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔" (۱۰)

جام میر غلام قادر خان نے ایک طویل عرصہ عملی سیاست میں بسر کیا۔ ۶ر مئی ۱۹۴۹ء کو انہیں بلوچستان ریاستی یونین کی جانب سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا۔ جام صاحب نے ۱۹۵۴ء تک یہ خدمات نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیں۔ (۱۱) ۱۹۵۶ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن اور صوبائی کے وزیر بنے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ کراچی سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۲) اسی برس وہ نواب کالا باغ کی کابینہ میں وزیر بنے۔ ان کے پاس وزارت اوقاف اور جیل خانہ جات کا قلمدان تھا۔ (۱۳) ۱۹۶۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس مرتبہ بھی وہ صوبائی وزارت پر فائز ہوئے۔ (۱۴) ۱۹۷۰ء میں انہوں نے قیوم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر بلوچستان اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب رہے۔ عطاء اللہ مینگل کی برطرفی کے بعد ۲۷ر اپریل ۱۹۷۳ء سے ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۵ء تک وہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ رہے۔ بعد ازاں انہوں نے گورنر بلوچستان کے سینئر مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے بعد انہیں بلوچستان اسمبلی کا اسپیکر منتخب کیا گیا اور مارشل لاء کے قیام تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ (۱۵)

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں جام میر غلام قادر خان نے صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں اور ان کے بیٹے شہزادہ جان محمد یوسف نے قومی اسمبلی کے انتخاب میں کامیابی حاصل کی۔ (۱۶) ۱۰ر اپریل ۱۹۸۵ء کو وہ ایک مرتبہ پھر صوبہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ (۱۷) وہ مئی ۱۹۸۸ء میں بلوچستان اسمبلی کی برخواستگی تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اسی برس ۱۰ر ستمبر ۱۹۸۸ء کو ان کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ (۱۸)

بلوچستان کی سیاسیات پر جام میر غلام قادر خان کے اثرات بڑے گہرے تھے، انہی کی کوششوں سے لسبیلہ کے علاوہ خاران اور مکران کی ریاستیں پاکستان میں شامل ہوئیں۔ یہ ایک ایسا قدم تھا جس سے خان آف قلات بھی پاکستان میں شامل ہونے پر مجبور ہوئے۔ اگر جام غلام قادر خان یہ قدم نہ اٹھاتے تو شاید آج بلوچستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ (۱۹)

جام غلام قادر خان کی وفات کے بعد ان کی سیاسی وراثت ان کے صاحبزادے شہزادہ محمد یوسف نے سنبھالی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وہ ۱۹۸۵ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ تاہم ۱۹۸۸ء میں انہوں نے قومی کی بجائے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور پی بی ۳۴ لسبیلہ ا سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت حاصل تھی۔ (۲۰)

۱۹۹۰ء میں انہوں نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب لڑا اور دونوں ہی میں کامیاب رہے (۲۱) بعد ازاں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی اور قومی اسمبلی کی نشست برقرار رکھی۔ ۱۹۹۱ء میں انہوں نے جناب محمد نواز شریف کی کابینہ میں پانی اور بجلی کے وزیر کی حیثیت سے حلف اٹھایا (۲۲) ۱۹۹۳ء تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی دونوں نشستوں کا انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی کے انتخاب میں تو وہ کامیاب نہ ہو سکے (۲۳) البتہ صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب ہو کر وہ ایک مرتبہ پھر نہ صرف بلوچستان اسمبلی کے رکن بن گئے (۲۴) بلکہ بلوچستان کی کابینہ میں بھی سینئر منسٹر کی حیثیت سے شریک کر لیے گئے (۲۵)

۱۹۹۷ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا اور دونوں میں کامیاب ہوئے (۲۶)

۲۰۰۲ء میں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر بلوچستان اسمبلی کا انتخاب لڑا اور نہ صرف یہ کہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے بلکہ بعد ازاں بلوچستان کے وزیر اعلیٰ کے منصب پر بھی فائز ہوئے (۲۷)

جام محمد یوسف کے چھوٹے بھائی شہزادہ علی اکبر ہیں جو ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۷ء کے ضمنی انتخابات میں، جام محمد یوسف کی خالی کردہ نشستوں پر بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے (۲۸) جب کہ جام محمد یوسف کے صاحبزادے جام کمال ۲۰۰۵ء میں لسبیلہ کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے ہیں (۲۹)

جام میر غلام قادر اور بلوچستان کے سابق وزیر اعلیٰ سردار عطا اللہ مینگل آپس میں ہم زلف ہیں اور وہ یوں کہ جام میر غلام قادر کی اہلیہ (جو جام محمد یوسف کی والدہ ہیں) اور سردار عطا اللہ مینگل کی اہلیہ (جو اختر مینگل کی والدہ ہیں) آپس میں سگی بہنیں ہیں۔ ان کے بھائی سردار محمد اسلم گچکی تھے جو خود سردار بلوچ خان کے داماد تھے اور سردار عارف جان گچکی کے بہنوئی تھے (۳۰)

ادھر جام محمد یوسف خان آف قلات میر احمد یار خان کے داماد ہیں اور خان آف قلات میر احمد یار کے صاحبزادے شہزادہ محی الدین بلوچ، جام محمد یوسف کے بہنوئی ہیں (۳۱)

بلوچستان کی ایک خاتون سیاستدان فضیلہ عالیانی، جام میر غلام قادر خان کے چچا زاد بھائی جام نور کی صاحبزادی ہیں (۳۲) وہ امان اللہ کنڈی کی دوسری بیوی ہیں جو صوبہ سرحد کے وزیر رہ چکے ہیں امان اللہ کنڈی کی پہلی بیوی جسٹس فیض اللہ کنڈی کی صاحبزادی ہیں (۳۳)

محترمہ فضیلہ عالیانی بلوچستان اسمبلی کی رکن اور بلوچستان کی وزیر تعلیم رہ چکی ہیں۔ وہ ان دونوں مناصب پر فائز ہونے والی بلوچستان کی پہلی خاتون تھیں (۳۴)

حوالہ جات

۱۔ ادارہ۔ دی رولنگ کلاس۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ الیکشن اسپیشل ۱۹۸۸ء۔ص ۱۲۸

۲۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ص ۱۹۴، ۱۹۵

۳۔ روزنامہ جنگ، کوئٹہ۔ ۱۸/دسمبر ۱۹۷۵ء

۴۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔کوئٹہ۔ص ۱۶۲ تا ۱۷۱

۵۔ مولائی شیدائی۔ اے شارٹ ہسٹری آف بلوچستان۔سکھر۔ص ۹۵

۶۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔کوئٹہ۔ص ۱۷۲ تا ۱۷۵

۷۔ سید ظہور الحسن۔ تاریخ دربار دہلی۔ دہلی۔ص ۶۵

۸۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔کوئٹہ۔ص ۱۷۶

۹۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار۔ لاہور۔ص ۳۵۷، ۳۵۸

۱۰۔ سید فاروق احمد۔ تحریک پاکستان اور بلوچستان۔ کراچی۔ص ۱۲۸، ۱۲۹

۱۱۔ ملک صالح محمد خاں لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔کوئٹہ۔ص ۱۷۸

۱۲۔ افتخار احمد۔ پاکستان جنرل الیکشنز ۱۹۷۰ء۔ لاہور۔ص ۱۲۳

۱۳۔ عبداللہ الاثری۔ عالمی معلومات۔ لاہور۔ص ۴۰

۱۴۔ ایم آئی صدیقی رزم۔ ہمارے نمائندے۔ لاہور۔ص ۳۸

۱۵۔ اردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ لاہور۔ جلد دوم۔ص ۱۰۳۷

۱۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ص ۴۱۷، ۴۱۸

۱۷۔ شبیر ابن عادل۔ جنرل ضیاء کے دس سال۔ کراچی۔ص ۱۲۲

۱۸۔ شبیر ابن عادل۔ عالمی المانک ۸۹ء۔ کراچی۔ص ۲۰۳

۱۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ص ۴۱۸

۲۰۔ ایضاً۔ص ۴۱۷

۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان ۔ اسلام آباد ۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۔ جلد دوم۔ ص ۹۴،۴۸۴

۲۲۔ موسیٰ خاں جلال زئی۔کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟ ۔لاہور۔ص ۴۸۶

۲۳۔ گزٹ آف پاکستان ۔اسلام آباد۔۱۴/اکتوبر۱۹۹۳ء ۔ص ۱۳۲۵

۲۴۔ ایضاً ۔۱۷/اکتوبر۱۹۹۳ء ۔ص ۱۵۵۷

۲۵۔ روزنامہ جنگ کراچی ۔۲۶/اکتوبر۱۹۹۳ء

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان ۔ اسلام آباد ۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ ۔ جلد دوم۔ ص ۱۶۲، ۶۷۴

۲۷۔ شفقت تنویر مرزا ۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان ۔ لاہور، ص ۶۳

۲۸۔ (i) الیکشن کمیشن آف پاکستان ۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء ۔ جلد دوم ۔ص ۵۴۶

(ii) ایضاً ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ ۔ جلد دوم۔ ص ۳۴۲

۲۹۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی ۱۷/تا ۲۳/اکتوبر ۲۰۰۵ء ۔ ص ۱۶

۳۰۔ عدنان عادل ۔ بلوچ سردار، کون کس کا رشتہ دار ۔ بی بی سی اردو ڈاٹ کام لاہور۔ ۲۶/فروری ۲۰۰۵ء

۳۱۔ چاکر خان بلوچ ۔ یاروں کے روبرو کیسے ۔ ملتان ۔ص ۱۶۲

۳۲۔ اختر علی خان بلوچ ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد سوم) ۔ کراچی ۔ص ۳۷۶

۳۳۔ ایم ۔ ریاض پاکستان کا سدا بہار خاندان جو ہمیشہ اقتدار کے مزے لوٹتا ہے۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۵ء

۳۴۔ اختر علی بلوچ ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد سوم) کراچی ۔ص ۳۷۶

جمالی

جمالی ایک رند قبیلہ ہے۔ جس کے افراد بلوچستان میں سبی، نصیر آباد، قلات، لسبیلہ اور خاران سے لے کر صوبہ سندھ میں جیکب آباد اور زیریں سندھ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

مقامی روایت کے مطابق یہ میر چاکر کے ساتھ اس علاقے میں آئے۔ یہ علاقہ خان قلات کے نصیر آباد سب ڈویژن کو برطانوی حکومت کو پٹے پر دینے سے پہلے قلات کے زیر حکومت تھا۔ برطانوی حکومت کی طرف سے کیرتھر بیراج کے کھولنے سے اس سب ڈویژن میں زراعت کے لئے پانی کی کافی مقدار مہیا ہوگئی جس سے جمالیوں کے علاوہ اس علاقے کے دوسرے قبائل کو بھی بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ یہ لوگ زراعت کے ماہر ہیں۔ انہوں نے خانہ بدوشی کو خیر باد کہہ دیا ہے اور بہت سے دیہات آباد کر کے ان میں رہنے لگے ہیں۔ (۱)

میر گل خاں نصیر اپنی کتاب "بلوچستان، قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں" لکھتے ہیں۔

"یہ قبیلہ خود کو لغاری بلوچ قبیلے کی ایک ذیلی شاخ سمجھتا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر بگدار تھے۔ یعنی اونٹوں کے گلے پالتے تھے۔ لیکن جب خان قلات میر خدا داد خان کو ان کے چچا زاد بھائی میر شیر دل خان نے سرداروں کی سازش سے شدید زخمی کر کے قلات کی حکومت پر قبضہ کر لیا تو میر خدا داد خان کو ان کے حمایتی نوروواہ لے گئے جہاں پر جمالیوں نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی اور اس وقت تک ان کو اپنے پاس رکھا جب تک کہ میر شیر دل خان کو موت کے گھاٹ اتروا کر میر خدا داد خان پھر خان نہیں بن گئے۔ جمالی قبیلہ کی ان وفادارانہ خدمات کے عوض میں میر خداداد خان نے نصیر آباد کا تمام علاقہ ان کو عطا کر دیا۔

نصیر آباد ان دنوں ایک خشک علاقہ تھا لیکن انگریزوں کی حکومت نے دریائے سندھ سے کیرتھر بیراج بنوا کر اسے سرسبز و شاداب کرا دیا اور جمالی قبیلہ جو اس زیر آب اراضی کے بیشتر حصے کا مالک تھا، خوب آباد ہوگیا۔ (۲)

جمالی خاندان کے جد امجد میر درمحمد خان جمالی تھے جن کی سخاوت کے چرچے سندھ اور

بلوچستان میں زبان زد عام ہیں۔ میر در محمد خان جمالی اپنے قبیلے کے وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے علاقے میں زمینوں پر ملکیت کے حوالے سے اس وقت کے انگریز حکمرانوں سے معاملات طے کرنے کے لیے قانون کا سہارا لیا۔ دہلی جا کر وائسرائے سے بھی ملاقاتیں کیں۔ اپنی سخاوت اور سماجی خدمات کی وجہ سے انہیں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ ان کی وفات کے بعد روجھان جمالی میں ان کا شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا جو طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

میر در محمد خان جمالی کے دو فرزند ہوئے جن کے نام میر تاج محمد خان جمالی اور میر خان محمد خان جمالی رکھے گئے۔ میر تاج محمد خان جمالی کے تین بیٹے ہوئے جن کے نام میر جعفر خان جمالی، میر قیصر خان جمالی اور میر شاہنواز خان جمالی تھے۔ جب کہ میر خان محمد خان جمالی کو اللہ نے دو فرزند عطا کیے جن کے نام میر عطا محمد خان جمالی اور میر محمد مراد خان جمالی رکھے گئے۔

سخی میر در محمد خان جمالی کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادوں میر تاج محمد خان جمالی اور میر خان محمد خان جمالی نے اپنے والد کی طرح علاقے کے عوام کی خدمت کرتے ہوئے خوب شہرت پائی مگر جو مقام میر تاج محمد خان کے بڑے فرزند میر جعفر خان جمالی نے پایا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ انہوں نے تحریک آزادی اور پاکستان کی تعمیر نو کے سلسلے میں بڑا فعال کردار ادا کیا (۳)

میر جعفر خان جمالی ۱۴ر فروری ۱۹۰۸ء کو روجھان سے دو میل کے فاصلے پر تاج پور کے مقام پر پیدا ہوئے تھے ان کے والد کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۱۶ برس تھی۔ میر جعفر خان جمالی نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کانگریس سے کیا۔ ان کے اوائل سیاست کے ساتھیوں میں خان عبدالصمد خاں اچکزئی، جام نور اللہ خاں، مولوی غلام حیدر خاں اور سردار یوسف علی مگسی جیسے اکابر سیاستدان شامل تھے۔

۱۹۲۸ء میں ان کی زمینوں پر حکومت نے غاصبانہ قبضہ کر لیا جس پر میر جعفر خان جمالی نے حکومت ہند کے خلاف اسپیشل کورٹ میں مقدمہ کرایا۔ یہ مقدمہ تقریباً آٹھ برس جاری رہا اور اس کا فیصلہ میر جعفر خان جمالی کے حق میں ہوا۔ حکومت نے اس فیصلے کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل کی۔ اس مقدمے کے سلسلے میں میر جعفر خاں جمالی نے قائداعظم محمد علی جناح کی خدمات حاصل کیں۔ قائداعظم نے یہ مقدمہ بلا معاوضہ لڑا اور بالآخر پریوی کونسل نے اس مقدمے کو تصفیہ کے لیے خان آف قلات کے پاس بھیج دیا۔ خان آف قلات نے فیصلہ میر جعفر خان جمالی کے حق میں دیا۔ یوں ۱۹۴۵ء میں میر جعفر خان جمالی کو ان کی ڈیڑھ لاکھ ایکڑ زمین واپس مل گئی۔ (۴)

اس مقدمے کے سلسلے میں قائداعظم میر جعفر خان جمالی کی جس طرح مدد کی تھی، جعفر خان جمالی اس سے بہت متاثر ہوئے اور پھر ہمیشہ کے لیے ان کے گرویدہ بن کر رہ گئے۔ قائداعظم سے میر جعفر خاں جمالی کا یہ قلبی لگاؤ بلوچستان میں مسلم لیگ کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کا سبب بنا۔

۱۹۳۸ء میں انہوں نے قائداعظم کو جیکب آباد کا دورہ کرنے کی دعوت دی اس موقع پر علاقے کے عمائدین نے کانگریس کے اثر رسوخ کے باعث قائداعظم کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن میر جعفر خان جمالی کارکنوں کے ہمراہ ایک بڑے جلوس کی شکل میں ریلوے اسٹیشن پہنچے اور قائداعظم کا شایان شان استقبال کیا۔

اس موقع پر قائداعظم کے ہمراہ سر عبداللہ ہارون، محمد ہاشم گزدر اور راجہ صاحب محمود آباد موجود تھے۔ اس کے بعد میر جعفر جمالی آل انڈیا مسلم لیگ سے باضابطہ طور پر منسلک ہو گئے اور ان کا یہ تعلق ان کی وفات تک جاری رہا (۵) قائداعظم اور مسلم لیگ کے ساتھ میر جعفر خان جمالی کے اس پر خلوص رویے کی بنا پر میر جعفر خان جمالی کو بلوچستان میں مسلم لیگ کے داخلے کا دروازہ کہا کرتے تھے۔ (۶) میر جعفر خان جمالی نے قائداعظم کی ہدایت پر نہ صرف بلوچستان، بلکہ سندھ میں بھی مسلم لیگ کو منظم کیا اور متعدد مواقع پر دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح مسلم لیگ کی خدمت کی۔

۱۹۴۶ء میں میر جعفر خان جمالی نے بلوچستان کو پاکستان میں شامل کروانے میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ صورتحال یہ تھی کہ بلوچستان مسلمانوں کی غالب اکثریت کا علاقہ تھا مگر پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ بلوچستان کے شاہی جرگے اور میونسپل کمیٹی کوئٹہ کے اراکین کو کرنا تھا۔ کانگریس نے اپنا دام بچھایا اور شاہی جرگہ کے اراکین کو خریدنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف انگریزوں نے خان آف قلات خان احمد یار خان کو پیشکش کی کہ اگر وہ پاکستان میں شامل نہ ہوں تو گوادر کی بندرگاہ خان آف قلات کے سپرد کر دی جائے گی اور انگریز اسے ترقی دیں گے۔ تیسری جانب بلوچستان میں قبائلی عصبیت کو بھی ابھارا جا رہا تھا اور پٹھان اور بلوچ سوال بھی پیدا کیا جا رہا تھا۔

ایسے میں چند صاحب دل رہنماؤں نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا۔ جن میں میر جعفر خان جمالی اور نواب محمد خان جوگیزئی پیش پیش تھے۔ انہوں نے شاہی جرگے کے اراکین کو پاکستان کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا اور ان پر یہ حقیقت آشکار کی کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے حفظ و بقا کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ رفتہ رفتہ میر جعفر خاں جمالی اور ان کے ساتھیوں کی مساعی کامیاب ہوئیں اور شاہی جرگے نے اتفاق رائے سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ صادر کر دیا۔ (۷)

یہی نہیں میر جعفر خان جمالی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور جب شاہی جرگے کو ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں ایک نمائندہ بھیجنے کا اختیار دیا گیا تو وہ نواب محمد خان جوگیزئی کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ یوں انہوں نے ثابت کر دیا کہ قومی مفاد کے آگے ذاتی مفاد کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

تحریک پاکستان کے دنوں میں میر جعفر خان جمالی نے ایک ہفت روزہ بھی جاری کیا تھا جس کا نام تنظیم تھا، اس رسالے کے مدیر نسیم حجازی اور نائب مدیر رشید بھٹی تھے۔ تنظیم نے بلوچستان کی سیاست میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ بظاہر یہ ہفت روزہ تھا لیکن اس کے ضمیمے بعض اوقات ایک دن میں

کئی کئی بار نکلتے تھے۔ (۸)

قیام پاکستان کے بعد بھی میر جعفر خان جمالی سیاسی میدان میں پیش پیش رہے۔ پاکستان بننے کے قریباً ڈیڑھ سال بعد مسلم لیگ اور خان آف قلات کے مابین جو بات چیت ہوئی اور جس کے نتیجے میں خان آف قلات نے قلات کو پاکستان میں شامل کرنے کا اعلان کیا اس کے پس پردہ بھی میر جعفر خان جمالی ہی کی کوشش تھیں۔ (۹)

جس زمانے میں جنرل ایوب خان پاکستان کی بری فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ ان کی میر جعفر خان جمالی سے بڑی گہری دوستی تھی وہ اکثر شکار کھیلنے کے لئے جیکب آباد جاتے اور میر جعفر خان کے مہمان ہوتے۔ مگر جب اسکندر مرزا نے خان آف قلات کے خلاف فوجی کارروائی اور اس کی آڑ لے کر پورے پاکستان پر مارشل لاء نافذ کر دیا تو میر جعفر خان جمالی اس کے نکتہ چینوں میں پیش پیش تھے۔ میر جعفر خان کی یہ حق گوئی ارباب اقتدار پر بڑی گراں گزری چنانچہ ایوب خان کے دور میں ان ایبڈو کے سلسلہ میں مقدمہ چلایا گیا۔ حالانکہ میر جعفر خان جمالی کبھی اقتدار میں شریک ہی نہیں رہے تھے۔ میر جعفر خان جمالی اس قسم کے ہتھکنڈوں سے مرعوب ہونے والے انسان نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان اقدامات کا عدالت میں مقابلہ کیا اور سرخرو ہوئے۔

۱۹۶۴ء کے اواخر میں جب صدر ایوب خان نے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو میر جعفر خان جمالی ان اکابر میں شامل تھے جن کی کوششوں سے محترمہ فاطمہ جناح اس انتخاب میں صدر ایوب خان کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہوئیں۔ میر جعفر خان جمالی نے محترمہ فاطمہ جناح کی کامیابی کے لئے شب و روز ایک کر دیئے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایوب خان صدارتی مہم کے سلسلہ میں جیکب آباد پہنچے تو انہوں نے جلسہ عام میں میر جعفر خان جمالی کی ناراضی کا شکوہ کیا۔

۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو میر جعفر خان جمالی صدر ایوب سے تمام اختلافات بالائے طاق رکھتے ہوئے ان سے ملنے پہنچے اور انہیں اپنی اور اپنے تمام قبیلے کی خدمات پیش کر دیں (۱۰)

۱۷/اپریل ۱۹۶۷ء کو میر جعفر خاں جمالی وفات پا گئے ....ان کے انتقال کی خبر سن کر مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے بے ساختہ کہا تھا "آج میرا دوسرا بھائی بھی میرا ساتھ چھوڑ گیا"۔ والی قلات خان اعظم میر احمد یار خان نے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا "اب کوئی بلوچ ماں میر جعفر خاں جمالی جیسا غیور، نڈر، بہادر اور جرأت کا پیکر جنم نہیں دے سکے گی"۔ قوم نے انہیں فدائے ملت کا خطاب دیا (۱۱)

میر جعفر خان جمالی دسمبر ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اس کے بعد وہ ۱۹۵۳ء میں دوبارہ سندھ اسمبلی کے رکن بنے تاہم اس کے بعد ان کا نام کسی انتخاب میں

نظر نہیں آیا (۱۲)

میر جعفر خاں جمالی کی وفات کے بعد ان کا سیاسی ورثہ ان کے صاحبزادے میر تاج محمد جمالی نے سنبھالا۔ انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے کیا۔ انہوں نے این اے ۱۳۶ کوئٹہ ۲ سے کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر نیپ کے سردار خیر بخش مری سے مقابلہ کیا۔ (۱۳) مگر کامیاب نہ ہو سکے تاہم کچھ عرصہ بعد وہ ایک ضمنی انتخاب میں نواب اکبر بگٹی کے صاحبزادے سلیم اکبر بگٹی کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۱۴)

۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۴ء کو میر تاج محمد جمالی نے ذوالفقار علی بھٹو کی کابینہ میں وزیر مملکت کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۵ر فروری ۱۹۷۶ء کو مکمل وزیر بنا دیئے گئے۔ انہیں محنت اور افرادی قوت کا قلمدان سونپا گیا۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں میر محمد جمالی نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر این اے ۱۹۷ سی اسے سلیم اکبر بگٹی کو شکست دے کر کامیابی حاصلی کی اور ذوالفقار علی بھٹو کی آخری کابینہ میں صحت اور منصوبہ بندی کے وفاقی وزیر بنے۔ اس انتخاب میں ان کے ہم قبیلہ عبد النبی جمالی بھی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۵)

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد میر تاج محمد جمالی ایک طویل عرصہ تک سیاسی میدان سے دور رہے پھر انہوں نے اپنی سیاسی وابستگی تبدیل کی اور پاکستان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ البتہ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں وہ این اے ۱۵۶ جیکب آباد سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ انہیں آئی جے آئی کی حمایت حاصل تھی لیکن وہ اس انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکے اور سردار محمد مقیم خان کھوسو کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۱۶) ۱۹۹۰ء کے عام انتخاب میں انہوں نے آئی جے آئی کے ٹکٹ پر پی بی ۲۱ جعفر آباد ۲ سے صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا اور نہ صرف صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب رہے بلکہ انتخابات کے بعد صوبہ کی وزارت اعلیٰ پر بھی متمکن ہو گئے۔ (۱۷) اپریل ۱۹۹۳ء میں جب مرکز میں نواز شریف حکومت کو برطرف کیا گیا تو میر تاج محمد جمالی کی پوزیشن پر بھی اثر پڑا کیونکہ وہ صدر مملکت کے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ۸ر مئی ۱۹۹۳ء کو ان کے خلاف بلوچستان اسمبلی میں تحریک عدم اعتماد پیش کی گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس تحریک پر ووٹنگ ہوئی انہوں نے ۲۲ر مئی ۱۹۹۳ء کو اپنے عہدے سے استعفیٰ ہی دے دیا (۱۸)

۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا ۲۰۰۲ء میں انہوں نے قومی اسمبلی کے دو خلقوں این اے ۲۵۹ اور این اے ۲۶۵ سے نیشنل الائنس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ تاہم دونوں حلقوں میں بمشکل ساتویں، ساتویں پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے (۱۹)

میر تاج محمد جمالی کے ایک بھتیجے میر جان محمد خان جمالی ہیں۔ وہ ایچی سن کالج لاہور کے فارغ التحصیل ہیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ پاک فوج میں بھی گزارا۔ پھر فوج سے ریٹائرمنٹ لے کر ۱۹۸۳ء میں بلدیاتی انتخابات سے عملی سیاست کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۳ء میں وہ اوستا محمد میونسپل کمیٹی کے کونسلر اور ۱۹۸۷ء میں چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۸ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جون ۱۹۹۰ء میں وہ پہلی مرتبہ صوبائی کابینہ میں بطور وزیر صحت شامل ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑا اور ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب رہے۔ انتخابات کے بعد ان کے تایا تاج محمد جمالی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بنے تو میر محمد جمالی ان کی کابینہ میں سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن کے وزیر کے طور پر شامل ہو گئے۔ وہ پاکستان کے پہلے صوبائی وزیر تھے جنہیں یہ قلمدان سونپا گیا تھا۔ ۱۹۹۱ء میں ان کا قلمدان تبدیل ہوا اور وہ اطلاعات اور کھیل کے وزیر بنا دیئے گئے (۲۰)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا تاہم ۱۹۹۷ء میں وہ نہ صرف بلوچستان اسمبلی کے رکن بنے بلکہ ۱۹۹۸ء میں اختر مینگل کے استعفیٰ کے بعد ۱۳/اگست ۱۹۹۸ء کو بلوچستان کے وزیر اعلیٰ کے منصب پر بھی فائز ہو گئے (۲۱)

وہ میر ظفر اللہ جمالی اور تاج محمد جمالی کے بعد جمالی قبیلے کے تیسرے فرد تھے جو گزشتہ دس برس میں اس منصب پر فائز ہوئے تھے۔

۲۰۰۲ کے عام انتخابات میں میر جان محمد جمالی پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر ایک مرتبہ پھر بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۲) ۲۰۰۲ء میں انہوں نے سینٹ کے انتخابات میں حصہ لیا اور نہ صرف سینیٹر بننے میں بلکہ سینٹ آف پاکستان کے ڈپٹی چیئرمین بننے میں بھی کامیاب رہے جبکہ ان کی خالی کردہ نشست پر ۲۳/اپریل ۲۰۰۲ء کو ضمنی انتخاب منعقد ہوئے جن میں میر حیدر علی جمالی بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۲۳)

میر جان محمد خان جمالی، میر جعفر خان جمالی کے بھتیجے اور میر قیصر خان جمالی کے صاحبزادے میر عبدالغفار جمالی کے داماد ہیں۔ میر عبدالغفار جمالی کا انتقال ۲۹/مئی ۲۰۰۲ء کو ہوا تھا (۲۴)

میر عبد الغفار جمالی کے صاحبزادے میر فائق علی جمالی تھے۔ وہ ۱۹۹۷ء میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور کچھ دن صوبائی وزیر بھی رہے تھے (۲۵) میر جعفر خان جمالی اور میر قیصر خان جمالی کے سب سے چھوٹے بھائی میر شاہنواز جامی تھے جن کے صاحبزادگان میر ظفر اللہ جمالی اور میر عبدالرحمٰن جمالی نے پاکستان کی سیاست میں بڑا فعال کردار ادا کیا ہے۔ میر ظفر اللہ جمالی یکم جنوری ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں انہیں جبل (پہاڑ) کہا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے سیاسی کیرئیر کا آغاز ۱۹۷۰ء میں بلوچستان اسمبلی کے عام انتخابات سے کیا تھا۔ تاہم وہ

اس انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکے اور سردار محمد اکبر بگتی کے داماد میر چاکر خان ڈومبکی کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔(۲۶)

۱۹۷۷ء میں ان کے مقدر کا ستارہ چمکا اور وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر نہ صرف صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے بلکہ وہ محمد خان باروزئی کی کابینہ میں بھی شامل کر لئے گئے انہیں قانون اور پارلیمانی امور کے علاوہ اطلاعات اور خوراک کے قلم دان بھی سونپے گئے تھے۔(۲۷)

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد میر ظفر اللہ جمالی کچھ دن تو سیاسی میدان سے دور رہے .... پھر اچانک جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں پہلے وزیر مملکت اور پھر مکمل وزیر کے طور پر شامل ہو گئے۔(۲۸) ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حلقہ این اے ۲۰۳ نصیر آباد سے کاغذات نامزدگی داخل کروائے اور اپنی کامیاب حکمت عملی کے باعث بلا مقابلہ رکن اسمبلی منتخب ہو گئے۔ وہ ملک کی وزارت عظمیٰ کے متمنی تھے مگر قرعہ فال محمد خان جونیجو کے نام نکلا۔ اگرچہ انہیں جونیجو حکومت میں پہلے وفاقی وزیر بنایا گیا مگر انہوں نے وزیراعظم بننے کے لئے جدوجہد جاری رکھی۔ جس کے باعث انہیں وفاقی کابینہ کی از سر نو تشکیل کے وقت نظر انداز کر دیا گیا۔(۲۹)

میر ظفر اللہ جمالی جنرل ضیاء الحق کے قریبی آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ۳۰ رمئی ۱۹۸۸ء کو بلوچستان اسمبلی توڑی گئی تو میر ظفر اللہ جمالی ہی کو بلوچستان کا نگران وزیر اعلیٰ بنایا گیا تھا۔(۳۰)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں میر ظفر اللہ جمالی قومی اور صوبائی دونوں ہی نشستوں پر کامیاب ہوئے مگر بعد ازاں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی نشست برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا اور بڑی جوڑ توڑ کے بعد صوبائی وزیر اعلیٰ بن گئے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ ایوان سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرتے ان کی اکثریت مشکوک ہوگئی چنانچہ انہوں نے گورنر کو اسمبلی توڑنے کا مشورہ دے کر اسمبلی ہی تڑوا دی۔

بلوچستان اسمبلی ٹوٹنے سے پورے ملک میں شور مچ گیا۔ ۱۳ دن پہلے ہی محترمہ بے نظیر بھٹو کی وزارت عظمیٰ کے تحت ایک نئے جمہوری دور کا آغاز ہوا تھا۔ یہ اقدام اگرچہ وزیر اعلیٰ ظفر اللہ جمالی کے کہنے پر کیا گیا تھا لیکن مبینہ طور پر اس ساری کارروائی میں انہیں وفاقی حکومت کی تائید وحمایت حاصل تھی تاہم وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے اس بات کی تردید کی اور کہا کہ نہ وزیر اعلیٰ ہمارا نہ گورنر۔ ہم ایسا کیوں کرتے۔ جسے اس اقدام سے اختلاف ہو وہ عدالت میں جائے اور اگر یہ بھی نہیں ہوسکتا تو عوام کی عدالت میں پیش ہو۔ اس بیان پر حزب مخالف نے شدید ردعمل کا اظہار کیا اور کہا کہ جب تک بلوچستان اسمبلی بحال نہیں ہوتی اپوزیشن قومی اسمبلی کی کسی کارروائی میں حصہ نہیں لے گی۔ بعد میں یہ معاملہ سینٹ تک پہنچا۔ ۲۲ ردسمبر کو سینٹ نے غیر آئینی وزیر اعلیٰ کی سفارش پر اسمبلی توڑنا آئین کی خلاف ورزی قرار دے دیا۔

اس اثناء میں ایک طرف گورنر نے نئے انتخابات کا اعلان کر دیا تھا دوسری طرف اس فیصلے کے خلاف اسمبلی کی بحالی کے لئے بلوچستان ہائی کورٹ میں رٹ درخواست دائر کر دی گئی۔ رٹ درخواست کی سماعت ۱۹ر جنوری ۸۹ء کو کراچی میں شروع ہوئی اور چیف جسٹس مسٹر جسٹس عبدالقدیر چودھری، مسٹر جسٹس میر ہزار خان کھوسہ، مسٹر جسٹس منور احمد مرزا اور مسٹر جسٹس امیر الملک مینگ پر مشتمل ہائی کورٹ کے فل بنچ نے رٹ منظور کرتے ہوئے اپنے متفقہ فیصلے میں اسمبلی بحال کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ فیصلے میں کہا گیا تھا کہ میر ظفر اللہ جمالی کو اسپیکر کے کاسٹنگ ووٹ کی بنیاد پر ایوان میں اکثریت کی حمایت حاصل ہوئی تھی مگر حقیقت میں اس تاریخ کو اسپیکر کے ووٹ سمیت انہوں نے ۲۲ ووٹ حاصل کئے جس سے اسمبلی میں ان کی اکثریت نہیں بنتی۔ ان تسلیم شدہ حقائق کے پیش نظر میر ظفر اللہ جمالی کو دفعہ ۱۰۳ (۳) کے تحت صوبائی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا تھا۔ اس لئے آئینی طور پر وہ اسمبلی توڑنے کا مشورہ دینے کے اہل نہیں تھے۔ اس لئے اسمبلی کا توڑا جانا غیر آئینی اور بلا کسی قانونی اختیار کے ہے لہٰذا بلوچستان کی صوبائی اسمبلی بحال کی جاتی ہے۔

بلوچستان ہائی کورٹ کے اس فیصلے کا وفاقی حکومت سمیت ملک بھر کے سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں نے خیر مقدم کیا۔ وفاقی حکومت نے صوبائی ایڈووکیٹ جنرل کو بلوچستان اسمبلی کی بحالی کے خلاف عدالت میں نہ جانے کی ہدایت کر کے سچے جمہوری جذبے کا مظاہرہ کیا۔ نوابزادہ نصر اللہ نے کہا کہ اس فیصلے نے جہاں عدلیہ کا وقار بلند کر دیا ہے وہیں منتخب جمہوری ادارے کے تقدس کو بھی بحال کیا ہے۔ نواب اکبر بگٹی نے اس فیصلے کو جمہوریت اور بلوچستان کے عوام کی فتح قرار دیا۔ (۳۱)

اکتوبر ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں میر ظفر اللہ جمالی نے فقط قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا۔ مگر اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہیں کر سکے اور وہ پی ڈی اے کے میر نبی بخش کھوسہ سے تقریباً ساڑھے چار ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۳۲)

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں میر ظفر اللہ جمالی نے این اے ۲۰۳ جعفر آباد و نصیر آباد سے آزاد امیدوار کے طور پر حصہ لیا۔ ان کے مد مقابل ان کے پرانے حریف نبی بخش کھوسو تھے جنہیں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ یہ معرکہ میر ظفر اللہ جمالی نے تقریباً ۴ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے جیت لیا (۳۳)

نومبر ۱۹۹۶ء میں جب فاروق لغاری نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر قومی اور چاروں صوبائی حکومتوں کو برطرف کرنے کا اعلان کیا تو امکان تھا کہ وہ میر ظفر اللہ جمالی کو نگراں وزیر اعظم بنائیں گے اگر انہوں نے یہ عہدہ جناب معراج خالد کے حوالے کیا اور میر ظفر اللہ جمالی کو بلوچستان کا نگراں وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ جنہوں نے ۹ر نومبر ۱۹۹۶ء کو اپنے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ (۳۴)

اس عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے وہ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے تاہم

اس برس وہ سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہو گئے (۳۵)

۲۰۰۲ء میں میر ظفر اللہ جمالی نے ایک مرتبہ پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اور نہ صرف یہ انتخاب جیتے بلکہ پاکستان کے وزیر اعظم بننے میں بھی کامیاب ہو گئے میر ظفر اللہ جمالی پاکستان مسلم لیگ (قائداعظم) ایم کیو ایم، ملت پارٹی، پاکستان پیپلز پارٹی (پیٹر یاٹس) اور دیگر کئی پارٹیوں کے ووٹوں کے باوجود محض ایک ووٹ کی اکثریت سے وزیر اعظم بنے تھے (۳۶) پھر ملک کی صدارت بھی ایک باوردی صدر کے ہاتھ میں تھی اس لیے انہیں بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑا۔ ایک مرحلے پر تو انہیں صدر پرویز مشرف کو اپنا باس بھی کہنا پڑا۔ مگر ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود ان کی حکومت محض ۱۹ ماہ جاری رہ سکی اور ۲۶ر جون ۲۰۰۴ء کو انہیں اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑ گیا۔ میر ظفر اللہ جمالی نے اپنا یہ عہدہ ۲۱ نومبر ۲۰۰۲ء کو سنبھالا تھا (۳۷)

میر ظفر اللہ جمالی کے صاحبزادے میر فرید اللہ جمالی ہیں وہ ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ میر فرید اللہ جمالی ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو جعفر آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایچی سن کالج اور گورنمنٹ کالج کے فارغ التحصیل ہیں۔ انہوں نے کیلیفورنیا اسٹیٹ یونیورسٹی (لاس اینجلز) سے بی بی اے کیا ہے۔ (۳۸)

میر ظفر اللہ جمالی کے دو دیگر صاحبزادگان پاکستان کی بری فوج میں فرائض انجام دے رہے ہیں جب کہ ان کی اکلوتی صاحبزادی کی شادی کوئٹہ کے سابق میئر ایوب وردگ کے صاحبزادے ہمایوں وردگ سے ہوئی ہے (۳۹)

میر ظفر اللہ جمالی کے چھوٹے بھائی میر عبدالرحمٰن جمالی ہیں۔ وہ ۱۹۸۵ء میں پہلی مرتبہ سینٹ کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں اُن کی رکنیت ختم ہو گئی تو وہ ایک مرتبہ پھر سینٹ کے رکن بنے۔ ۱۹۹۱ء میں انہیں مزید چھ سال کے لیے سینٹ کا رکن منتخب کیا گیا۔ (۴۰) ۱۹۹۳ء میں نواز شریف حکومت خاتمہ کے بعد وہ ایک مختصر دورانیے کے لیے وزیر مملکت کے منصب پر فائز رہے۔ ان کے پاس خوراک اور زراعت کے قلم دان تھے (۴۱) ۱۹۹۷ء کے انتخابی عمل میں انہوں نے حصہ نہیں لیا تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر پی بی ۲۶ نصیر آباد ۲ سے بلوچستان اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۴۲)

جمالی خاندان کے جو دیگر افراد عملی سیاست میں فعال رہے ہیں ان میں ایک میر عبدالنبی خان جمالی تھے۔ وہ میر ظفر اللہ خان جمالی کے ماموں زاد بھائی تھے۔

میر عبدالنبی جمالی ۱۹۷۳ء میں پاکستان کی پہلی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں وہ این اے ۱۹۸ سبی ۲ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۴۳) ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پی بی ۲۰ نصیر آباد ا سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیتا (۴۴) اور صوبائی وزارت

حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں میر عبدالنبی جمالی نے ایک مرتبہ پھر پی بی ۲۰ جعفر آباد سے انتخاب لڑا اور اور اس مرتبہ نہ صرف صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے (۴۵) بلکہ صوبائی کابینہ میں بھی شمولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے انہیں پبلک ہیلتھ کا قلمدان سونپا گیا (۴۶) ۲۷/مارچ ۲۰۰۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا (۴۷)

میر جعفر خان جمالی کے چچا زاد بھائی اور میر ظفر اللہ جمالی کے ماموں سیاست میں بڑے متحرک رہے ہیں جب تک وہ زندہ تھے انہیں میر جعفر خان جمالی کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ وہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء کے دوران مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن رہے تھے (۴۸) وہ بلوچستان مسلم لیگ کے صدر بھی رہے تھے۔

۱۹۷۸ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے بلوچستان میں صوبائی کابینہ تشکیل دینا چاہی تو کابینہ کے مجوزہ نمائندوں میں میر مراد خاں جمالی کا نام بھی شامل تھا۔ میر مراد خان جمالی ایک صلح جو اور امن پسند شخص تھے اور اپنی ان خوبیوں کی بدولت بلوچستان میں بڑے مقبول تھے۔ ان کی یہ مقبولیت ہی ان کی موت کا سبب بن گئی اور ۲۱/جولائی ۱۹۷۸ء کو کوئٹہ کی مصروف ترین سڑک پر نامعلوم قاتلوں نے انہیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ (۴۹)

ان کے قتل کے بعد ان کے نام کی نسبت سے ٹمپل ڈیرہ نامی ایک گاؤں کو ڈیرہ مراد جمالی کا نام دے کر نصیر آباد ڈویژن کا صدر مقام بنایا گیا۔ (۵۰)

میر مراد خاں جمالی کے صاحبزادے حاجی محمد خان جمالی ۱۹۹۳ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور صوبائی وزارت پر فائز ہوئے تھے (۵۱)

انہوں نے ۱۹۹۷ء میں بھی صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر میر فائق علی جمالی شکست کھا گئے تھے (۵۲) ۲۰۰۱ء میں وہ جعفر آباد کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے تھے۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں وہ دوسری مرتبہ جعفر آباد کے ضلعی ناظم منتخب ہو گئے۔ (۵۳)

جمالی خاندان کی ایک شاخ صوبہ سندھ میں بھی آباد ہے۔ جس کے حاجی محمد بخش جمالی پرانے پارلیمنٹیرین ہیں اور پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ (۵۴)

وہ ۱۹۷۶ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے ۱۹۸۵ء میں انہوں نے انتخابی عمل کا بائیکاٹ کیا تاہم ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۷ء تک انہوں نے ہر انتخاب میں حصہ لیا اور ۴ مرتبہ مسلسل قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۵۵) ۲۰۰۲ء میں ان کے صاحبزادے رفیق احمد جمالی پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے ہیں (۵۶)

حوالہ جات

۱۔ جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری۔ بلوچستان تاریخ کے آئینے میں۔ مترجم پروفیسر سعید احمد رفیق۔ کوئٹہ۔ ص ۵۱۶
۲۔ میر گل خاں نصیر۔ بلوچستان۔ قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۷۱۔۱۷۲
۳۔ نعیم اختر، تحریک پاکستان میں جمالی قبیلے کا کردار، تاریخ کے آئینے میں
نوائے وقت، سنڈے میگزین، ۹رفروری ۲۰۰۳ء۔ ص ۴
۴۔ جی ایم سید، میرے دوست میرے ساتھی، (ترجمہ: نسرین انجم بھٹی)۔ لاہور۔ ص ۳۷۸، ۳۷۹
۵۔ پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر، میر جعفر خان جمالی کی ڈائری کے چند اوراق، کوئٹہ۔ ص ۱۷
۶۔ نعیم اختر، تحریک پاکستان میں جمالی قبیلے کا کردار، تاریخ کے آئینے میں،
نوائے وقت، سنڈے میگزین، ۹رفروری ۲۰۰۳ء۔ ص ۴
۷۔ حکیم آفتاب احمد قرشی۔ کاروان شوق۔ لاہور ص ۲۲۸
۸۔ الطاف حسن قریشی۔ بلوچستان کی سچی کہانی۔ اردو ڈائجسٹ لاہور۔ ستمبر ۱۹۶۹ء۔ ص ۴۷
۹۔ محمدی علی چراغ۔ اکابرین تحریک پاکستان۔ لاہور۔ ص ۵۹۷
۱۰۔ حکیم آفتاب احمد قرشی۔ کاروان شوق۔ لاہور۔ ص ۲۳۰ تا ۲۳۳
۱۱۔ نعیم اختر، تحریک پاکستان میں جمالی قبیلے کا کردار، تاریخ کے آئینے میں
نوائے وقت سنڈے میگزین، ۹رفروری ۲۰۰۳ء۔ ص ۴
۱۲۔ وکیل انجم۔ سیاستدانوں کی قلابازیاں (حصہ اول)۔ لاہور۔ ص ۱۰۴، ۲۱۰
۱۳۔ الطاف حسن قریشی۔ بلوچستان اور سندھ کا انتخابی جائزہ۔ ہفت روزہ زندگی۔ لاہور۔
۲۳رتا ۲۹رنومبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۰
۱۴۔ افتخار احمد۔ پاکستان جنرل الیکشنز ۱۹۷۰ء۔ لاہور۔ ص ۱۲۸، ۱۳۴
۱۵۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۸۵، ۴۸۶، ۳۱۷، ۴۸۸
۱۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۸۸۔ جلد ۳۔ ص ۴۹
۱۷۔ محمد ریاض۔ بلوچستان نوٹ بک۔ دی فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۲۰ر۔ ۲۶ر دسمبر ۱۹۹۰ء ص ۳
۱۸۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹رمئی ۱۹۹۳ء، ۲۳رمئی ۱۹۹۳ء۔
۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۹۷، ۹۹
۲۰۔ خالد حسین۔ اے مین آف دی پیوپل میر جان محمد جمالی۔ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۱ تا ۱۷رفروری ۱۹۹۳ء۔ ص ۸

۲۱۔ پروفیسر غفور احمد۔ نواز شریف، اقتدار سے عتاب تک۔ لاہور۔ ص ۴۰۱، ۴۰۲
۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء، رپورٹ (جلد دوم)۔ ص ۳۵۳
۲۳۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۱۳/مارچ ۲۰۰۶ء، ۲۴/اپریل ۲۰۰۶ء
۲۴۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۳۱ رمئی ۲۰۰۶ء
۲۵۔ وحید زہیر۔ بلوچستان، جمہوریت کا سفر، کوئٹہ۔ ص ۹۴
۲۶۔ دی رولنگ کلاس۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی۔ نومبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۱۲۸
۲۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۸/اپریل ۱۹۷۷ء
۲۸۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۹۷
۲۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۰۳
۳۰۔ شبیر ابن عادل۔ عالمی المانک ۱۹۸۹ء۔ کراچی۔ ص ۲۶
۳۱۔ احمد سلیم۔ ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیورو کریسی۔ لاہور۔ ص ۳۳۶، ۳۳۷
۳۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ اسلام آباد۔ ص ۹۳
۳۳۔ نوید ظفر، اشتیاق حسین۔ الیکشن ۱۹۹۳ء اسلام آباد۔ ص ۶۸۷
۳۴۔ عامر الیاس رانا، احمد لطیف۔ سابق وزیر اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی سے بات چیت۔ سنڈے ایکسپریس، کراچی، ۲/اپریل ۲۰۰۶ء۔ ص ۵
۳۵۔ پارلیمنٹ ہاؤس، اسلام آباد، سینٹ آف پاکستان، ڈائرکٹری آف ممبرز (چوتھا ایڈیشن) ص ۴۵، ۴۶
۳۶۔ عابد تہامی۔ الیکشن ۰۲ء۔ لاہور۔ ص ۱۶
۳۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۷/جون ۲۰۰۴ء۔
۳۸۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۲۲۳
۳۹۔ ماہنامہ نیوز لائن کراچی، دسمبر ۲۰۰۲ء
۴۰۔ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائریکٹری آف ممبرز۔ جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۴
۴۱۔ روزنامہ جنگ کراچی ۱۶/مئی ۱۹۹۳ء
۴۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد، جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۲۵۴
۴۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۳۹، ۳۱۷
۴۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸/مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۶۳۲
۴۵۔ ایضاً۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۵۱

۴۶۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ۔ ۲۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء

۴۷۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۵۳۴، ۵۳۵

۴۸۔ وحید زہیر۔ بلوچستان جمہوریت کا سفر۔ کوئٹہ۔ ص ۵۵

۴۹۔ عبدالکریم خالد۔ بلوچستان کیا سوچ رہا ہے؟ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور۔ ستمبر ۱۹۷۸ء۔ ص ۱۵

۵۰۔ اختر علی خان بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد دوم) کراچی۔ ص ۱۱۱

۵۱۔ احمد سلیم۔ پاکستان کے سیاسی قتل۔ اسلام آباد۔ ص ۶۱

۵۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۶۶۱

۵۳۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء

۵۴۔ علی حسین جمالی۔ میر جعفر خان جمالی۔ کراچی۔ ص ۱۰۲

۵۵۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۱۹۸

۵۶۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان لاہور۔ ص ۶۵

جوگیزئی

جوگیزئی قبیلہ کاکڑ قبیلے کی ایک اہم شاخ ہے جو بلوچستان میں آباد ایک مشہور پختون قبیلہ ہے۔ اس قبیلے کے افراد زیادہ تر ژوب' کوئٹہ' پشین یا لورالائی کے اضلاع میں آباد ہیں۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں احمد شاہ ابدالی نے سردار بیکر خان کو نواب کا خطاب اور ایک سند عطا کی جس میں اسے ژوب کا حکمران اعلیٰ تسلیم کیا گیا تھا۔ سردار بیکر خان کے مورث اعلیٰ کا نام جوگی تھا اور اس حوالے سے وہ اپنے نام کے ساتھ جوگیزئی لکھتے تھے۔ اس خاندان کو انگریزوں کی آمد تک ایک خاص فوقیت اور شہرت حاصل رہی۔ (۱)

شجرہ نسب کے لحاظ سے جوگی کا رشتہ ۲۳ ویں پشت میں قیس عبدالرشید سے ملتا ہے۔ قیس عبدالرشید وسط ایشیا سے ترک سکونت کرتے ہوئے شمال مغربی ہند میں داخل ہوئے اور کوہ سلیمان کے مغرب میں اپنا مسکن بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی قیس عبدالرشید ہیں جنہیں بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ (۲)

جوگی کی نسل کے مختلف گروہ تھے۔ جن میں "مقام" (بیکرنکا کا لڑکا) اور اس کے دوسرے فرزندان اسحاق کھول اور نواب کھول زیادہ مشہور تھے۔ ان ہر دو کے چھ فرزند تھے جن میں شاہجہان خان زیادہ بااختیار تھا اور صاحب کرامت و درویش طبیعت ہونے کی وجہ سے سنزر خیل کاکڑ قبیلہ کی نظر میں اس کی خصوصاً عزت و منزلت تھی۔ ۱۸۶۹ء میں شاہجہان خان نے انگریزوں کے فوجی دستہ پر جو براستہ تھل چٹیالی (لورا لائی) افغانستان سے واپسی پر گزر رہا تھا۔ ساڑھے چار ہزار کے ایک کاکڑ قبائل پر مشتمل لشکر سے حملہ کر دیا۔ مگر اس کا لشکر پسپا ہو گیا اور شاہجہان خان کے اس رویئے سے حکومت ہند کاکڑ قبائل کی بڑھتی ہوئی مخالفانہ سرگرمیوں سے بروقت آگاہ ہو گئی:۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء میں سر رابرٹ سنڈیمن ایجنٹ گورنر جنرل بلوچستان ایک انگریزی فوجی دستے کو اپنے ساتھ لے کر کمانڈر انچیف انڈین آرمی کی معیت میں خود مرغہ' موسیٰ خیل اور مینا بازار پہنچا اور وہاں کے نیچے زئی اور عبداللہ زئی

سرداروں کو اطاعت پر مجبور کر لیا اور بعد میں وہاں کے مندوخیل قبیلہ کے سردار نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ ۱۸۹۰ء میں پھر سر رابرٹ سنڈیمن ایجنٹ گورنر جنرل بلوچستان نے سر جارج وائٹ کو ایک فوجی دستے کے ساتھ ژوب کے شیرانی قبائل کو زیر اطاعت لانے کے لئے اس طرف روانہ کر دیا۔ ژوب کے سرکردہ سرداران دوست محمد خان جوگیزئی اور اس کے بیٹے بنگل خان جوگیزئی کو جب اس انگریزی فوجی دستہ کی آمد کی خبر ہوئی۔ وہ افغانستان کی طرف چلے گئے تھے اور انگریزوں نے ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۹۳ء میں دوست محمد خان جوگیزئی نے بنگل خان جوگیزئی کے ساتھ انگریزوں سے معافی مانگ لی اور وفاداری کا حلف اٹھا لیا۔ سردار بنگل خان نے ۱۸۹۴ء میں سر ہنری میکموہن کے ساتھ افغان بلوچ باؤنڈری کمیشن میں اہم حصہ لیا اور کمیشن کی ہر لحاظ سے امداد کی پھر سیستان ثالثی کمیشن ۵-۱۹۰۲ء میں بھی اس نے ایک اہم حصہ لیا اور ان خدمات کے صلے میں سرکار انگریزی نے سردار بہادر بنگل خان کو ۱۹۰۶ء میں نواب کا خطاب دیا۔

مئی ۱۹۰۶ء میں ایک خاندانی جھگڑے میں نواب بنگل خان جوگیزئی، گولی لگنے سے راہئ ملک عدم ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء میں انگریزوں نے نواب بنگل خان کے بیٹے محمد خان جوگیزئی کو اس کا جانشین اور قبیلے کا حکمران تسلیم کر لیا۔ (۳)

نواب محمد خان جوگیزئی ۱۸۸۴ء کے لگ بھگ ژوب کے مقام پر پیدا ہوئے۔ تحریک پاکستان کو بلوچستان میں جن قائدین کی کوششوں کی وجہ سے کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوئی ان میں نواب محمد خان جوگیزئی کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے علاقے میں خاصا اثر رکھتے تھے اور قومی و اجتماعی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں جب بلوچستان میں مسلم لیگ کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔ تو اسے قاضی محمد عیسیٰ اور میر احمد یار خان کے تعاون کے ساتھ ساتھ نواب محمد خان جوگیزئی کا تعاون بھی حاصل ہو گیا۔ وہ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن بن گئے اور تحریک پاکستان میں اس حد تک پرجوش اور سرگرم ہو گئے کہ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد انہوں نے اسے عام کرنے اور عوام الناس تک پہنچانے کے لئے بلوچستان میں باقاعدہ جلسہ عام منعقد کئے اور بلوچستان میں پاکستان کے حق میں فضا سازگار کی۔

نواب محمد خان جوگیزئی کو بہت جلد قائداعظم کا اعتماد حاصل ہو گیا اور ۱۹۴۶ء میں وہ کانگریس کے امیدوار عبدالصمد اچکزئی کو شکست دے کر بلوچستان سے مرکزی مجلس دستور ساز کے رکن منتخب ہو گئے۔ ان کا انتخاب شاہی جرگہ کے ووٹوں کے ذریعہ عمل میں آیا تھا۔ نواب محمد خان جوگیزئی کی یہ کامیابی بلوچستان میں تحریک پاکستان کی کامیابی کا سنگ بنیاد ثابت ہوئی۔

جون ۱۹۴۷ء میں جب بلوچستان میں پاکستان میں شمولیت یا عدم شمولیت کے سوال پر شاہی جرگے کے اراکین کے درمیان رائے شماری ہوئی تو اس میں نواب محمد خان جوگیزئی اور ان کے ساتھیوں میر جعفر خاں جمالی، سردار غلام محمد خان ترین، عبدالغفور درانی، حاجی جہانگیر خاں جوگیزئی، مسعود کھدر پوش اور نسیم حجازی نے پاکستان کے حق میں فیصلہ کروانے کے حق میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ (۴)

اس واقعہ کی تفصیلات کچھ یوں ہیں کہ ۲۹ر جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ۳ر جون کے اعلان کے مطابق بلوچستان کے سرداروں کے درمیان ریفرنڈم ہونا تھا کہ وہ پاکستان کے حق میں فیصلہ دیتے ہیں یا ہندوستان کے حق میں اور یا وہ انگریزوں کے زیر تسلط خودمختاری قبول کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے کانگریس بھی پوری توانائی کے ساتھ شاطرانہ چالیں چل رہی تھی اور انگریز بھی اس کے ساتھ ملی بھگت کئے ہوئے تھے۔۔۔ ۲۸ر جون ۱۹۴۷ء کو بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ مسٹر جافرے پرائر نے اعلان کیا کہ ۲۹ر جون کو ریفرنڈم نہیں ہو گا۔ بلکہ صرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ۳ر جون والا اعلان پڑھ کر سنایا جائے گا اور اس کے ۲۴ گھنٹے بعد ۳۰ر جون کو سرداروں کی رائے لی جائے گی۔ مگر ادھر نواب محمد خان جوگیزئی اور ان کے ساتھیوں نے جافرے پرائر کی اس سازش کو ناکام بنانے کا تہیہ کیا ہوا تھا چنانچہ جونہی جافرے پرائر نے شاہی جرگے کے سامنے ماؤنٹ بیٹن کا اعلان پڑھ کر سنایا۔ نواب محمد خاں جوگیزئی بڑے اعتماد سے اٹھے اور جیفرے پرائر سے مخاطب ہو کر بولے۔

"ہم یہ بیان پہلے پڑھ چکے ہیں۔ ہمیں فیصلہ کرنے کے لئے مزید وقت نہیں چاہئے کیونکہ شاہی جرگہ کے سردار پاکستان کی حمایت میں فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا نمائندہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں بیٹھے گا۔ وہ حضرات جو اس فیصلے کے خلاف ہیں، ایک طرف ہو جائیں۔"

نواب محمد خان جوگیزئی کے اس اعلان پر کوئی بھی سردار مخالفت میں کھڑا نہیں ہوا اور یوں بلوچستان پاکستان میں شامل ہو گیا۔ صرف چند ریاستیں، جنہیں ۳ر جون کے اعلان کے تحت اختیار دیا گیا تھا، اس فیصلے سے مستثنیٰ رہیں۔ (۵)

قیام پاکستان کے بعد نواب محمد خان جوگیزئی شاہی جرگے کے فیصلے کے مطابق پاکستان کی مرکزی دستور ساز اسمبلی کے رکن بنے۔ تاہم بعد میں انہوں نے خود کو صوبائی سیاست تک محدود کر لیا اور ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے۔ (۶) ۱۹۷۰ء میں انہوں نے این ڈبلو ۱۳۵ کوئٹہ کے حلقہ سے قیوم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ تاہم اس مرتبہ وہ کامیاب نہ ہو سکے (۷) عمر کا آخری حصہ انہوں نے عزلت نشینی میں بسر کیا اور ۱۳ر نومبر ۱۹۷۸ء کو وفات پائی (۸)

نواب محمد خان جوگیزئی کے دو بیٹوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ نوابزادہ تیمور شاہ جوگیزئی اور نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی ۔ نوابزادہ تیمور شاہ جوگیزئی نے اپنی سیاست بلوچستان اسمبلی تک محدود رکھی۔ پہلی مرتبہ وہ ۱۹۷۷ء میں اس اسمبلی کے رکن بنے (۹)

۱۹۸۵ء میں وہ ایک مرتبہ پھر بلوچستان اسمبلی کے رکن بنے۔ (۱۰) مگر اس سے قبل کہ ان کی رکنیت کا دور مکمل ہوتا۔ وہ ۱۴ رجنوری ۱۹۸۸ء کو انتقال کر گئے۔ وفات کے وقت وہ حکومت بلوچستان کے وزیر صحت تھے۔ (۱۱)

نوابزادہ تیمور شاہ جوگیزئی کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نوابزادہ یوسف خان جوگیزئی بلوچستان اسمبلی کے رکن بنے ۔ (۱۲) انہوں نے ۱۹۸۸ء میں بھی اسی نشست پر انتخاب لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے (۱۳) ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں انہوں نے محض کاغذات نامزدگی جمع کروائے مگر انتخابات سے پہلے انتخابات سے دستبردار ہو گئے (۱۴) اس کے بعد کسی بھی انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

نواب محمد خان جوگیزئی کے دوسرے صاحبزادے نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی ابتدا ہی سے سول سروس کے رکن رہے اور مختلف عہدوں پر ملک و قوم کی خدمت انجام دیتے رہے۔ انہوں نے قیام پاکستان سے قبل بلوچستان کو پاکستان کا حصہ بنوانے کی تحریک میں اپنے والد کے دوش بدوش بڑا فعال کردار ادا کیا مگر ۱۹۴۷ء کے بعد وہ اپنی ملازمت کے باعث سیاست میں بھر پور حصہ نہ لے سکے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۸۵ء میں وہ بلوچستان کی مخصوص نشستوں پر سینٹ آف پاکستان کے رکن بنے (۱۵)

جوگیزئی قبیلے ہی کے ایک اور فرد نواب محمد ایاز خان جوگیزئی ہیں جو سعد اللہ خان جوگیزئی کے صاحبزادے اور نواب محمد خان جوگیزئی کے پوتے ہیں وہ نواب تیمور شاہ جوگیزئی کی وفات کے بعد نواب جوگیزئی بنے تھے (۱۶) ۱۹۹۰ء میں انہوں نے این اے ۲۰۰ ژوب سے پختون خواہ ملی عوامی پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا تھا لیکن جمعیت علمائے اسلام (ف) کے مولانا محمد خان شیرانی سے تقریباً چھ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے تھے۔ (۱۷) ۱۹۹۳ء میں بھی انہوں نے پختون خواہ ملی عوامی پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ بھی ان کے حریف مولوی محمد خان شیرانی تھے مگر اس مرتبہ یہ معرکہ نواب ایاز خان جوگیزئی نے سر کیا اور انہوں نے اپنے حریف کو تقریباً ایک ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ (۱۸)

نواب محمد ایاز خان جوگیزئی نے ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں حصہ لیا مگر دونوں مرتبہ مولوی محمد خان شیرانی کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۱۹) ۲۰۰۳ء میں وہ پختون خواہ ملی عوامی پارٹی کے ٹکٹ پر سینٹ آف پاکستان رکن منتخب ہوئے ہیں۔ (۲۰)

جوگیزئی قبیلے کے جو دیگر افراد عملی سیاست کے میدان میں ہیں ان میں ایک نام سردار محمد عثمان خان جوگیزئی کا ہے۔ انہیں قائد اعظم کا بڑا قرب حاصل تھا اور قائد اعظم انہیں جوگیزئی کے بجائے جوگ شاہی کہا کرتے تھے ۔۲۳ / مارچ ۱۹۴۰ء کو قرار داد پاکستان کی منظوری کے بعد قائد اعظم نے انہیں پورے بلوچستان میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنے کی ہدایت کی تھی (۲۱) سردار محمد عثمان جوگیزئی اس شاہی جرگے کے رکن بھی تھے جس نے بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے ۶ / فروری ۱۹۹۶ء کو وفات پائی۔ (۲۲)

سردار عثمان خان جوگیزئی کے ایک صاحبزادے سردار وزیر احمد خان جوگیزئی بھی طویل عرصہ سے میدان سیاست میں ہیں۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر این اے ۱۹۶ کوئٹہ ۳ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا۔ ان کا مقابلہ نیپ پشتون خواہ کے مولوی رحمت اللہ اور جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) کے سابق رکن قومی اسمبلی مولوی عبد الحق سے تھا۔ خود پاکستان پیپلز پارٹی کے ترجمان ''الفتح'' کے نامہ نگار کے مطابق ان مولویوں کے مقابلے میں وزیر احمد خاں جوگیزئی کی پوزیشن خاصی کمزور تھی۔ تاہم اس نے لکھا تھا کہ اگر یحییٰ بختیار، محمود خان اچکزئی کو ہرا سکتے ہیں تو پھر وزیر احمد خاں جوگیزئی کو بھی کامیاب سمجھا جا سکتا ہے ۔ (۲۳) اور یہی ہوا بھی ۔ جب انتخاب کے نتائج سامنے آئے تو یحییٰ بختیار بھی جیت چکے تھے اور وزیر احمد خاں جوگیزئی بھی کامیاب قرار دیئے جا چکے تھے۔ (۲۴)

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں سردار وزیر احمد خان جوگیزئی نے آزاد امیدوار کے طور پر حصہ لیا۔ وہ این اے ۲۰۰ ژوب سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد ازاں وہ بلا مقابلہ ڈپٹی اسپیکر بھی بنے اور قومی اسمبلی ٹوٹنے کے بعد نگراں حکومت میں وزیر تعلیم کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ ۱۹۸۸ء کے انتخاب میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۲۵) ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔ تاہم ۱۹۹۳ء میں جو صدر غلام اسحٰق خان نے نواز شریف کابینہ کو برطرف کیا تو وہ میر بلخ شیر مزاری کی نگراں حکومت میں وزیر بنا دیئے گئے ان کے پاس ویمن ڈویلپمنٹ کا قلم دان تھا۔ (۲۶) ان کی یہ وزارت میر بلخ شیر مزاری کی وزارت کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔

۱۹۹۷ء میں انہوں نے جمعیت علمائے اسلام (سمیع الحق گروپ) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے (۲۷)

جوگیزئی قبیلے کی ایک شاخ لورالائی میں بھی آباد ہے۔ اس شاخ کے سردار سردار باز محمد خان جوگیزئی سردار باز محمد خان جوگیزئی نے ۳۰ / اکتوبر ۱۹۸۹ کو وفات پائی (۲۸) بھی اس شاہی جرگے کے رکن تھے جس نے تقسیم کے وقت بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کے

صاحبزادے گل محمد خاں جوگیزئی ہیں۔ وہ جنرل ضیا الحق کی کابینہ میں ۵/ جولائی ۱۹۷۸ء سے ۲۳/ اگست ۱۹۷۸ء تک پانی اور بجلی کے وفاقی وزیر رہ چکے ہیں (۲۹) ۱۹۸۵ء میں انہوں نے پی بی ۱۰ لور الائی ۳ سے بلوچستان اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور جناب عصمت اللہ موسیٰ خیل کے ہاتھوں فقط ۱۰۳ ووٹوں سے شکست کھا گئے (۳۰) ۱۹۹۱ء میں جنرل موسیٰ خان کی وفات کے بعد انہیں بلوچستان کا گورنر مقرر کیا گیا (۳۱) ۱۸/ جولائی ۱۹۹۳ء تک وہ اسی عہدے تک فائز رہے۔ (۳۲)

لور الائی ہی میں آباد جوگیزئی قبیلے کی شاخ کے ایک رکن ڈاکٹر نصیر الدین جوگیزئی تھے جو حاجی علی خان جوگیزئی کے صاحبزادے تھے۔ وہ جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں ۹/ مارچ ۱۹۸۱ء سے ۲۰/ مارچ ۱۹۸۸ء تک وفاقی وزیر صحت رہے (۳۳) ۱۹۸۸ء میں انہوں نے پی بی ۱۱ اور لور الائی ۲ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے (۳۴) ۱۹۹۱ء میں وہ سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے۔ (۳۵) ۱۴/ جون ۱۹۹۲ء کو کینسر کے مرض میں ان کا انتقال ہوگیا۔ (۳۶)

حوالہ جات

۱۔ ملک صالح محمد خاں لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔ کوئٹہ۔ ص ۵۲
۲۔ سید محمد فاروق احمد۔ تحریک پاکستان اور بلوچستان۔ کراچی۔
۳۔ ملک صالح محمد خاں لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔ کوئٹہ۔ ص ۵۲، ۵۳، ۲۲۹
۴۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار۔ لاہور۔ ص ۳۱۲
۵۔ ایضاً۔ ص ۳۰۷ تا ۳۱۱
۶۔ (i) عبد اللہ الاثری۔ عالمی معلومات۔ لاہور۔ ص ۴۵
(ii) ایم آئی صدیقی رزم۔ ہمارے نمائندے۔ لاہور۔ ص ۲۰۱
۷۔ روزنامہ حریت کراچی۔ ۸/ دسمبر ۱۹۷۰ء
۸۔ اردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ لاہور۔ جلد اول۔ ص ۴۹۲
۹۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴/ مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۳۶۹
۱۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص ۵۱۰
۱۱۔ محمد اسلم۔ وفیات اعیان پاکستان۔ لاہور۔ ص ۱۸
۱۲۔ وحید زہیر۔ بلوچستان و جمہوریت کا سفر۔ کوئٹہ۔ ص ۷۱
۱۳۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۱۱
۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔ جلد دوم۔ ص ۶۸۴
۱۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور ص ۳۱۷، ۳۱۸

۱۶۔ اختر علی خان بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد چہارم)۔ کراچی۔ ص ۱۶۶
۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۹۲
۱۸۔ ماہنامہ دی ہیرالڈ کراچی۔ ۷۔ ۲۰۷۔ کلرز آف وکٹری۔ دسمبر ۱۹۹۳ء
۱۹۔ (i) الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۵۷
(ii) ایضاً۔ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۹۹
۲۰۔ ایضاً۔ جلد اول۔ ص ۲۹۱
۲۱۔ رضوان احمد۔ ''تحریک آزادی کی جھلکیاں'' روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۶/مارچ ۱۹۸۷ء۔ ص ۳، ۱۰
۲۲۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ، وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۵۴۲
۲۳۔ ابوسفیان۔ بلوچستان میں انتخابی سرگرمیوں کا جائزہ ہفت روزہ ''الفتح'' کراچی۔ ۴/تا ۱۱/مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۲۹
۲۴۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۳۱۲
۲۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۰۱
۲۶۔ محمود غزنوی۔ قبضہ گروپ کی کابینہ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد۔ ۲۰/مارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵
۲۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۵۷
۲۸۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ، وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۱۹۱
۲۹۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۹۰
۳۰۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸/مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۶۲۹
۳۱۔ اکبر خان۔ دی سردار فیکٹر۔ ماہنامہ نیوز لائن کراچی ستمبر ۱۹۹۳ء الیکشن ۹۳ء سپیشل
۳۲۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۹/جولائی ۱۹۹۳ء
۳۳۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۹۵
۳۴۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۰۹، ۴۱۰
۳۵۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۱۵/مارچ ۱۹۹۱ء
۳۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۵/جون ۱۹۹۲ء

خان (آف قلات)

تقسیم سے پہلے قلات حیدر آباد (دکن) اور بھوپال کے بعد برصغیر کی تیسری بڑی ریاست شمار ہوتی تھی۔ جس کا رقبہ ۷۳۲۷۸ مربع میل اور آبادی ساڑھے تین لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ پھر اس کا جغرافیائی محل وقوع بھی بڑا اہم تھا۔ ایک طرف اس کی سرحدیں برٹش بلوچستان سے ' دوسری طرف ایران سے تیسری طرف بحیرہ عرب سے اور چوتھی جانب سندھ سے ملتی تھی۔

سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں قلات مغلوں کے تسلط میں آیا مگر بلوچوں نے بہت جلد انہیں مار بھگایا۔ اور میر حسن خان' خاں بلوچ کے لقب سے تخت قلات پر مسند نشین ہوئے۔ ان کا تعلق میروانی خاندان سے تھے۔ میر حسن خان لاولد فوت ہوئے۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد بلوچ معززین اور سرداروں نے اپنے قدیم سالار قافلہ میر قمر خان کے خانوادے قمبرانی کے چشم و چراغ' میر احمد خان کو اپنا دوسرا بلوچ منتخب کر لیا۔ یوں قلات پر احمد زئی خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ یہ ۱۶۶۶ء کی بات ہے۔(۱)

میر احمد خان نے قلات پر ایک بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی وہ زندگی بھر سبی کے باروزئی افغانوں' سندھ کے کلہوڑوں اور قندھار کے مغلوں سے لڑتے اور اپنی حدود مملکت کو وسعت دیتے رہے۔

میر احمد خان اول کے بعد ان کے خاندان نے ۱۸۹۳ء تک پورے بلوچستان پر بلا شرکت غیرے حکومت کی۔ اس خاندان نے بلوچستان کی تاریخ میں بڑے عظیم حکمران پیدا کئے جن میں میر سمندر خان (۱۷۱۴ء-۱۶۷۹ء) میر عبداللہ خان قہار (۱۷۳۱ء- ۱۷۱۶ء)- میر نصیر خان نوری اول (۱۷۹۴ء-۱۷۴۹ء)- میر محراب خان دوم شہید (۱۸۳۹ء- ۱۸۱۷ء) میر نصیر خان دوم غازی (۱۸۵۷ء- ۱۸۴۱ء) اور میرا خدادا خان اسیر فرنگ (۱۸۹۳ء-۱۸۵۷ء) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

۱۸۳۸ء میں انگریزوں نے بلوچستان کے معاملات میں براہ راست دخل دینے کا فیصلہ کیا۔ انگریز شاہ شجاع الملک کو جو ان کی پناہ میں تھا افغانستان پر دوبارہ مسلط کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ قندھار جانے کے لئے ان کی افواج کو درہ بولان میں سے ہو کر گذرنا تھا اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز عملداروں نے بلوچستان کے حکمران میر محراب خان دوم کو اپنے دام تزویر میں پھنسانے کی خفیہ سازشیں اور بلوچستان پر قبضہ جمانے کی اعلانیہ دست درازیاں شروع کر دیں۔ میر محراب خان دوم اگرچہ ان کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتے تھے لیکن افغانستان پر دھاوا بولنے کے لئے درہ بولان سے انگریزوں کے لاؤ لشکر کو راہگذر دینے پر رضا مند بھی نہ تھے۔

درہ بولان کے گرد و نواح میں آباد بلوچ قبائل جس طرح ان سے ممکن ہو سکا' قندھار کی طرف انگریزی سپاہ کی پیش قدمی میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوششیں کرتے رہے لیکن مقامی غدار' انگریزوں کی شہ پر اپنے حکمران کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے اور میر محراب خان کے لئے مشکلات پیدا کر رہے تھے۔

میجر جنرل سر ٹامس ولشائر' قندھار میں افغانوں سے منہ کی کھانے کے بعد جب واپس کوئٹہ پہنچا تو لارڈ آک لینڈ گورنر جنرل ہندوستان کی طرف سے اسے بلوچستان کے حکمران جام میر محراب خان کو گرفتار کرنے کا حکم ملا۔

۳ نومبر ۱۸۳۹ء کو جنرل ولشائر نے ایک بڑی فوج کے ساتھ قلات کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ ۱۳ نومبر ۱۸۳۹ء کے دن قلات میں میر محراب خان نے انگریزی افواج کے خلاف ایک خونیں لڑائی لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ انگریزوں نے میر محبت خان کے پڑپوتے اور احمد یار خان کے بیٹے میر شاہنواز خان کو جو انگریزوں کا پروردہ تھا قلات کے تخت پر بٹھا دیا اور لوڈے (Lovday) نامی ایک انگریز افسر کو جو بلوچوں میں لبدین کے نام سے مشہور ہوا اس کا مشیر مقرر کر کے قلات میں بٹھا دیا۔

میر محراب خان نے جنرل ولشائر کے قلات پہنچنے سے قبل اپنے بیٹے نصیر خان کو داروغہ گل محمد کے ساتھ وفادار قبائل سے لشکر جمع کرنے کے لئے نوشکی کے ذگر مینگلوں کے پاس روانہ کر دیا تھا۔ میر نصیر خان نے نوشکی اور خاران سے ایک لشکر جمع کر کے قلات کا رخ کیا۔ سردار میر آزاد خان نوشیروانی نے نہایت جوانمردی اور خلوص سے ان کا ساتھ دیا۔

اس سے قبل کہ میر نصیر خان کا لشکر قلات پہنچتا' ساراوان کے سرداروں نے سردار محمد خان شاہوانی کی قیادت میں مستونگ سے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ابتداء کر دی۔

بالاخر میر نصیر خان نے تمام قبائل کو مجتمع کر کے قلات پر حملہ کر دیا اور ایک ہی ریلے میں قلات پر قبضہ کر لیا۔ لبدین کو گرفتار کر لیا گیا' میر شاہنواز خان جان بچا کر جھالاوان سے ہوتا ہوا سندھ کی طرف چلا گیا۔

قلات پر قبضہ کرنے کے بعد میر نصیر خان نے کچھی کا رخ کیا۔ ڈھاڈر اور کنبی کے مقام پر انگریزوں کے خلاف شدید لڑائیاں لڑیں۔ اسی دوران قاسونامی ایک شخص نے لبدین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

تمام بلوچستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ بالاخر انگریزوں نے مجبور ہو کر کرنل سیسی کے ذریعے میر نصیر خان کے ساتھ صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی جو نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ انگریزوں نے میر نصیر خان کو بلوچستان کا حکمران تسلیم کر لیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی تمام افواج کو بلوچستان سے نکالنے کا وعدہ کیا۔

۶ اکتوبر ۱۸۴۱ء کو قلات میں میر نصیر خان دوم کی رسم تاجپوشی ادا کی گئی جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے میجر اوٹ رم، برگیڈیئر انگلینڈ اور کرنل سیٹسی نے شرکت کی۔

انگریزوں کو افغانستان اور پھر بلوچستان میں جو ذلتیں اٹھانی پڑیں، اس سے ان کی فارورڈ پالیسی میں بڑی تبدیلی آئی۔ اب محض فوجی طاقت کے بل پر اترانے اور فتوحات حاصل کرنے کی بجائے انہوں نے مقامی چاپلوسوں، غداروں، نمک حرام ملازموں اور خان سے کبیدہ خاطر اور خود غرض سرداروں سے اپنی مطلب براری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جب تک میر نصیر خان دوم زندہ رہے انگریزوں کی سازشیں بارور نہیں ہو سکیں کیونکہ میر نصیر خان دوم ایک شریف النفس، موقع شناس اور نڈر حکمران تھے۔ ان کو بلوچستان کے تمام قبائل کی بھرپور حمایت حاصل تھی، کسی سردار کو ان کے خلاف سر اٹھانے کی تو کیا، لب کشائی کی جرات نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ انہوں نے خان گڑھ (جیکب آباد) کا علاقہ انگریزوں کو ایک چھاؤنی کے لئے پٹہ پر دے دیا تھا لیکن بلوچستان کے اندرونی معاملات میں ان کی مداخلت پر پابندی عائد کر رکھی تھی اور سازشیوں کی گو شمالی کرنے میں انتہائی طور پر سخت گیر واقع ہوئے تھے۔

میر نصیر خان دوم کے فوت ہوتے ہی بلوچستان میں سازشوں، دغابازیوں اور غداریوں کا ایک لاوا پھوٹ پڑا، خان میر خداداد خان جو میر نصیر خان دوم کے بعد بلوچستان کے تخت پر بیٹھے، دیکھتے ہی دیکھتے سازشیوں کے ایک ایسے گرداب میں پھنس گئے جس سے وہ آخر دم تک نہ نکل سکے۔

یہ زمانہ جس میں میر نصیر خان دوم اور ان کے جانشین میر خداداد خان نے بلوچستان کی حکومت سنبھالی، ایشیا کی تاریخ کا ایک پر آشوب دور تھا، انگریز بلوچستان اور اس کی ہمسایہ مملکتوں افغانستان اور ایران میں اپنے پاؤں پھیلا رہے تھے۔ ہر جگہ ان کی ریشہ دوانیاں جاری تھیں۔ امن و چین کی زندگی مفقود تھی۔ باہمی مناقشوں، بد اعتمادیوں اور خانہ جنگیوں کا دور دورہ تھا۔

میر خداداد خان کے سریر آرائے سلطنت ہوتے ہی قبائلی سرداروں نے انگریزوں کی شہ پا کر ان کے خلاف سر اٹھانا شروع کیا اور مطالبہ کیا کہ:۔

(۱) نوری نصیر خان اول کے آئین اور رسوم و رواج کے مطابق حکومت کی جائے۔

(۲) نصیر خان نے جو باضابطہ فوج قائم کی ہے اسے توڑ دیا جائے۔
(۳) نظام حکومت چلانے کے لئے وزیر مقرر کرنے کا حق سرداروں کو حاصل ہو۔
(۴) ملک کے سول اور فوجی معاملات میں سرداروں کی رائے کو دخل ہو۔
(۵) وزیر دربار گل محمد کو برطرف کر دیا جائے۔

یہاں پر واضح رہے کہ داروغہ گل محمد ہی وہ شخص تھا جس نے میر نصیر خان دوم کی رہنمائی کرتے ہوئے بلوچستان کے قبائل کو انگریزوں کے خلاف منظم کیا اور پھر انہیں پے در پے شکستیں دے کر بلوچستان سے باہر دھکیل دیا تھا۔

سرداروں کے مطالبات جیسا کہ ظاہر ہے انگریزوں کے تیار کردہ تھے۔ اس پر آشوب دور میں جبکہ انگریزوں کا بھوت سر پر منڈلا رہا تھا' میر خداداد خان انہیں تسلیم نہیں کر سکتا تھا لہٰذا خان اور سرداروں کے درمیان جیسا کہ جیکب آباد میں بیٹھے ہوئے انگریز بہادر چاہتے تھے خانہ جنگی کی ابتدا ہوئی جس میں انگریز کبھی خان کی اور کبھی سرداروں کی پشت پناہی کرتے رہے۔

الغرض اکیس سال تک خان میر خداداد خان اور بلوچستان کے قبائلی سرداروں کے درمیان کشت و خون کا بازار گرم رہا تا آنکہ فریقین میں لڑنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ اب انگریزوں نے جو انہیں لڑاتے رہے مناسب سمجھا کہ ان کے درمیان کوئی ایسا سمجھوتہ کرادیا جائے جس میں بالا دستی ان میں سے کسی فریق کو حاصل ہونے کی بجائے انگریزوں کو حاصل ہو۔

چنانچہ ۸ دسمبر ۱۸۷۵ء کو لیفٹیننٹ رابرٹ سنڈیمن نامی ایک انگریز افسر جو بعد میں فاتح بلوچستان سر رابرٹ سنڈیمن کے نام نامی سے مشہور ہوا' پنجاب کے دو چار بلوچ سرداروں کی معیت میں بلوچستان آیا۔ سبی کے مقام پر اس نے بلوچستان کے باغی سرداروں سے ملاقات کی اور پھر کوئٹہ سے ہوتا ہوا قلات گیا اور خان میر خداداد خان سے ملا۔

گو اس دفعہ رابرٹ سنڈیمن اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوا اور سردار نوردین مینگل کو جو باغی سرداروں سے کٹ کر خان کا طرفدار بن چکا تھا' خان کے ہاتھوں مروانے کے علاوہ اسے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ لیکن ۱۸۷۶ء میں جب وہ پھر بلوچستان آیا تو انگریزوں کا طوق غلامی' بلوچوں کے گلے میں ڈالنے میں اسے غیر متوقع پر کامیابی ہوئی۔

۳۱ مئی ۱۸۷۶ء کو بلوچستان کے حکمران میر خداداد خان قلات کی میری سے اترے اور رابرٹ سنڈیمن کی زیر صدارت سرداروں کے اجلاس میں شمولیت کرنے کو مستنگ روانہ ہوئے۔ جہاں پر ڈیرہ غازی خان سے لے کر ایرانی اور افغانی سرحد تک کے بلوچ سردار رابرٹ سنڈیمن کے سایہ عاطفت میں موجود تھے۔ مستنگ کا یہ دربار صحیح معنوں میں بلوچوں کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالنے کی تقریب ثابت ہوا۔ بلوچستان کے خان کا تاج رابرٹ سنڈیمن کے قدموں پر اور بلوچستان اس کی مٹھی میں تھا۔

۱۳ر جولائی ۱۸۷۶ء کو خان اور قبائلی سرداروں کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا وہ زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہو سکا۔ بالاخر سر جیمز براؤن نے جو سنڈیمن کے بعد بلوچستان کا ایجنٹ گورنر جنرل بن کر آیا تھا۔ مارچ ۱۸۰۳ء میں خان میر خداداد خان کو کوئٹہ طلب کر کے گرفتار کرلیا اور پھر ایک خود ساختہ سرداری جرگہ کے ذریعے انہیں معزول و محبوس کر کے لورالائی بھجوا دیا۔ ۱۹۰۲ء میں ان کو لورالائی سے پشین لایا گیا جہاں ۱۳ر مئی ۱۹۰۹ء کو خان میر خداداد خان اسیر فرنگ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کی وصیت کے مطابق پشین میں ہی ان کو سپرد خاک کیا گیا۔

خان میر خداداد خان کی معزولی کے بعد ان کے ولی عہد میر محمود خان' قلات کے تخت پر بیٹھے۔ مگر ان کی حکومت صرف نیابت قلات تک محدود تھی۔ (۳)

خان محمود خان کی کوئی وارث اولاد نرینہ نہ تھی۔ وہ جب آخری عمر میں عالم نابینائی میں اپنی زندگی کے بقیہ ایام میری (قلات کا شاہی محل) میں گزار رہے تھے۔ تو ان کی جانشینی کا مسئلہ سامنے آیا۔ بلوچی رسم و روایات کے مطابق ان کی جانشینی کے حقدار ان کے چھوٹے بھائی شہزادہ اعظم جان تھے۔ جن کو بلوچوں کے تعلیم یافتہ حلقوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خان محمود خان کے حاکمانہ اختیارات کے عملی مالک ان کے وزیراعظم سر شمس شاہ کی جابریت کے خلاف بلوچوں کی سیاسی جدوجہد کو شہزادہ اعظم جان کی حمایت حاصل تھی۔ اس طرح اس وقت بلوچوں کی اولین اور واحد سیاسی تنظیم انجمن اتحاد بلوچاں اور نوابزادہ یوسف عزیز مگسی جیسے بیدار مغز سردار' خان محمود خان کے بعد شہزادہ اعظم جان کو خان بنانے کے لئے کوشاں تھے۔ اس طرح یہ بات واضح تھی کہ محمود خان کے بعد اعظم جان ہی قلات کے نئے خان ہوں گے۔ (۴)

نومبر ۱۹۳۱ء میں میر محمود خان جو برس ہابرس سے احتجاجاً" حکومت سے دست کش تھے انتقال کر گئے اور ان کی جگہ میر محمود اعظم جان "خان بلوچ" کے منصب جلیلہ کے ساتھ تخت قلات پر رونق افروز ہوئے۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۳۳ء کو لارڈ ولنگٹن وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ رسم تاجپوشی کی۔ خان بلوچ میر محمد اعظم جان اعلیٰ شاہ سوار اور بہترین توپچی تھے ان کی خوبیوں کا پہلے سے ہی چرچا تھا۔ ان کے خان بلوچ بننے پر ہر طرف خوشی کا اظہار کیا گیا۔ وہ اپنے والد میر خداداد خان کے ساتھ اوائل عمر کا بیشتر حصہ قید و بند میں گذار چکے تھے۔ پیہم صدمات و تفکرات نے انہیں بے حد منکسرالمزاج بنا دیا تھا۔

انہوں نے خان بلوچ کا منصب سنبھالتے ہی اپنے پیشرو کے وقت کی اہانت آمیز روایت کو ختم کرنے اپنی قوم کے زخمیوں کا مداوا کرنے اور انگریز حاکموں سے وطن کی سرزمین کو پاک کرنے کے عزائم باندھے۔ انہوں نے امور سلطنت میں فعال حیثیت سے حصہ لینا شروع کیا۔ انہیں بین الاقوامی سیاسیات سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ پختہ عقیدے کے باعمل متشرع مسلمان تھے۔ وہ

اکثر کہا کرتے تھے کہ بالشویک تحریک اسلامی اقتصادی نظام یعنی "مساوات" سے لی گئی ہے۔ جب ۱۹۳۰ء میں نواب زادہ میر یوسف علی خان مگسی کی زیر قیادت ان کے سیاسی رفقاء میر عبدالعزیز کرُد، ملک فیض محمد یوسف زئی، محمد حسین عنقا، ڈاکٹر فیض محمد خان شاہوانی، میر محمد امین خان کھوسو، اور نواب زادہ میر عبدالرحمٰن خان بگٹی وغیرہم نے بلوچوں کو انگریزی سحر سامری سے بیدار کرنے کے لئے ملکی سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔ تو بیدار مغز خان نے ان کے خیالات کی قدر کی اور نہ صرف ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی بلکہ نواب میر مہراللہ خان مری کو بھی ان کا ہم خیال بنایا۔ علی برادران کے ساتھ خان بلوچ کا سیاسی رشتہ قائم تھا اور وہ سب خان صاحب کے ساتھ باہمی مشاورت کرتے تھے اور ہر ممکن تعاون حاصل کرتے تھے۔ خان بلوچ میر محمد اعظم جان نڈر انسان تھے۔ ایک دفعہ جب انگریز حاکم نے مستوفی فقیر محمد وغیرہ کے قتل کے بعد خان سے یہ کہہ کر مصافحہ نہیں کیا کہ:

"ان ہاتھوں سے خون کی بو آتی ہے"

تو خان بلوچ نے فی الفور اپنے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا کہ:

"میں تو ان ہاتھوں کا بوسہ لیتا ہوں کہ جنہوں نے بلوچی ناموس کے ایک دشمن اور غدار کا خون کیا ہے ------"

خان بلوچ میر محمد اعظم جان اپنی قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے ان کی آزادی اور خود مختاری کے لئے منصوبہ بندی کر رہا تھا اور اس مقدس مشن کے لئے باصلاحیت دماغ اور قوم و ملک کے لئے سچی تڑپ رکھنے والے افراد کی جستجو میں تھا کہ وقت آخر آپہنچا اور وہ ۹ر ستمبر ۱۹۳۳ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (۵)

ادھر انگریزی حکومت نے نہایت دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی سلطنت کے مفاد میں یہ فیصلہ کیا کہ بلوچوں کے مستقبل کے خان کو ابتدا سے ہی اپنی انتظامی مشنری کا ایک پرزہ بنا کر اس کی اس طرح سے تربیت کی جائے کہ وہ خود کو اپنی قوم کا ایک آزاد حکمران سمجھنے کی بجائے شعوری و لاشعوری طور پر برطانوی حکومت کا وفادار کارندہ سمجھنے لگے۔ (۴) اس منصوبے کی تکمیل کی غرض سے میر احمد یار خان کو بلوچستان میں انگریزی حکومت کے تحت مختلف سروسوں میں خدمات سونپی گئیں۔ انہوں نے زیادہ تر فوج اور ملیشیا میں خدمات سرانجام دیں۔ کچھ عرصے کے لئے وہ اے جی جی کے پرسنل اسسٹنٹ بھی رہے، دوران ملازمت انہوں نے انگریزی حکومت کے لئے جاسوسی کارنامے بھی سرانجام دیئے۔ جس کا اعتراف انہوں نے اپنی خود نوشت "قوم بلوچ و خوانین بلوچ" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے میر امان اللہ خان حاکم افغانستان کے خفیہ عزائم کے بارے میں انگریزی حکومت کو معلومات بہم پہنچائیں۔ (٦)

اس طرح انگریزی حکومت کی ملازمت نے ان کو گویا ذہنی اعتبار سے غیر ملکی حکومت کا ایک

کل پرزہ بنا دیا۔ جس میں ان کے آزادانہ تشخص کے ابھرنے کی صلاحیت تقریباً مفقود ہو گئی۔ یہ شاید اسی کا اثر تھا کہ وہ بعد میں بلوچوں کے خان بن کر بھی زندگی بھر کوئی آزادانہ فیصلہ نہ کر سکے وہ ہمیشہ سایوں اور سہاروں کے متلاشی رہے وہ جو اپنے مرتبے کے لحاظ سے اپنی قوم کے لئے باعث تقویت اور سہارا ہوا کرتے تھے۔ خود ہی بیساکھیوں کے متلاشی ہو کر اپنی قوم کی توانیوں کو بھی ناتوانی اور بے بسی میں بدل گئے۔

خان اعظم جان کے نہایت مختصر دور حکومت کے بعد ستمبر ۱۹۳۳ء میں میر احمد یار خان کو بلوچوں کا خان بننے کا اعزاز نصیب ہوا۔ جس کو وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے لئے سب سے بڑا اعزاز سمجھتے رہے۔ ایک مرتبہ بلوچستان یونیورسٹی میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ میرے لئے گورنری کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ بلکہ میرے لئے تو بلوچوں کا خان ہونا ہی دراصل بہت بڑا اعزاز ہے۔ بلوچوں کا خان ہونا فی الحقیقت ان کے لئے بہت بڑے اعزاز اور فخر کی بات تھی۔ لیکن وہ اپنے اس اعزاز کے تقدس کو کس حد تک قائم رکھ سکے۔ وہ کہاں تک اپنی قوم کی روایات عزت و وقار کا تحفظ کر سکے۔ یہ سب حقائق ان کے دور حیات کے واقعات کا تجزیہ کرتے وقت ازخود آشکار ہو جائیں گی۔

بحیثیت خان کے وہ اپنے تمام پیشروؤں کی نسبت روشن خیال تھے۔ وہ بلوچستان کے تمام بلوچ علاقوں کو ایک سیاسی وحدت کی شکل دینے کے لئے کوشاں رہے۔ وہ بھی اپنے دادا خان میر خداداد خان کی طرح ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ جس کے تحت خان کو براہ راست بلوچ عوام تک رسائی حاصل ہو اور وہ اس سلسلے میں انگریز پولیٹیکل ایجنٹ اور سرداروں کے واسطے کا محتاج نہ ہو۔ لیکن ان میں خداداد خان والے حوصلے نہ تھے۔ یا پھر ان کے دور کے تقاضے کچھ مختلف تھے وہ ان مقاصد کے حصول کے لئے سیاسی داؤ پیچ استعمال کرتے رہے اور بالاخر حوصلوں سے عاری سیاست ان کی مکمل شکست و ریخت پر منتج ہوئی۔

ابتدائی دور میں بلوچ قوم پرست حلقوں سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ میر یوسف عزیز مگسی، میر عبدالعزیز کرد اور میر گل خان نصیر کے ساتھ ان کی قریبی رفاقت تھی اور ان کے ذریعے وہ بلوچستان میں ایک مثبت سیاسی عمل کے ذریعے اصلاحات و ترقی کے خواہاں تھے وہ ایک سیاسی پلیٹ فارم کے ذریعے بلوچستان میں ایک ایسی مضبوط بلوچ حکومت کے قیام کے آرزومند تھے۔ جو قبائلی سرداروں کے سامنے بے بس محض نہ ہو اور نہ ہی خان انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کی ایک مہر کی حیثیت میں استعمال ہو بلکہ وہ انگریز نمائندوں اور اپنے قبائلی سرداروں کو اپنی حاکمیت کے تحت لانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک روایتی ریاست کا حکمران ہونے کے باوجود اپنی ریاست میں سیاسی سرگرمیوں کی نہ صرف اجازت دی بلکہ خود ہی ان کو متحرک و فعال بنایا اور ریاست کی ترقی پسندانہ سیاست کو ان کی مکمل پشت پناہی حاصل رہی۔

ریاست قلات کے اس دور کا سیاسی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ کہ خان احمد یار خان کے خیالات اور انجمن اتحاد بلوچوں یا قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے منشور اور پروگرام کے مابین کوئی فرق نہیں تھا۔ مثلاً انجمن اتحاد بلوچاں اور پھر قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے منشور میں ان تمام علاقوں کو جنہیں برطانوی حکومت وقتاً فوقتاً خوانین قلات سے اجارے پر حاصل کرتی رہی تھی۔ دوبارہ ریاست قلات میں شامل کرنا اور قلات کی مرکزی بلوچ حکومت کو بااختیار بنانے کی بات شامل تھی۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہی مسائل خود میر احمد یار خان نے سرکاری سطح پر انگریزی حکومت کے سامنے پیش کئے تھے۔

اس طرح گویا میر احمد یار خان کو بلوچی ریاست کی مرکزی حکومت کو مستحکم اور بااختیار بنانے اور انگریزوں کے ہاتھوں اپنے مستجار علاقے واپس لینے کی غرض سے ایک سیاسی پلیٹ فارم سے ایک منظم صورت میں ان مطالبات کو پیش کرنا تھا تاکہ انگریزی حکومت پر سیاسی دباؤ ڈالا جاسکے۔ دوسری جانب سیاسی تنظیم اور عمل کے ذریعے خان اپنے سرداروں کے غلبے سے بھی آزاد ہو جانا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ اپنی ریاست کے ایک بااثر اور مقتدر حکمران بن سکیں۔ میر گل خان نصیر جو انجمن اسلامیہ قلات کے صدر اور پھر قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے نائب صدر مقرر ہوئے تھے۔ اپنی کتاب تاریخ بلوچستان میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان سیاسی تحریکوں کی پشت پر میر احمد یار خان کا ہاتھ تھا۔

اگر قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو وہ بھی ان ہی مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی رہی اور یہ بہرحال نیشنل پارٹی کے قائدین کی فہم و فراست تھی کہ انہوں نے اپنے بعض مقاصد میں کامیابی حاصل کرلی۔ اگرچہ مستجار علاقے واپس نہیں لئے جا سکے لیکن خان کی سیاسی حیثیت و اہمیت میں اضافہ ضرور ہوا۔ وہ اس طرح کہ سردار اور ان کے علاقے بھی کسی حد تک خان کی مرکزی حکومت کے دائرۂ اختیار میں آگئے وگرنہ اس سے قبل خان اپنی ہی ریاست میں قبائلی سرداری علاقوں میں براہ راست کسی قسم کی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔

اس عرصے کے دوران میر احمد یار خان نے مطلق العنان خان بننے کی بجائے اپنی حکومت میں نیشنل پارٹی کی شمولیت کا اہتمام کر کے اپنی حکومت کو قومی حکومت کا رنگ دے کر بلوچوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ریاست کی حکومت اور انتظامی مشینری میں تعلیم یافتہ بلوچوں کو شامل کر کے قلات کو ترقی کے جدید دور میں لانے کی کوششیں کیں۔ تاکہ باشعور مقامی افراد کے ذریعے حکومت کو قومی امنگوں سے ہم آہنگ بنایا جاسکے۔ اس مقصد میں اسے بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ انہوں نے اپنی ریاست میں دیوان عام اور دیوان خاص کے نام سے جمہوری ادارے قائم کر کے لوگوں کی رائے کے ساتھ ان کے منتخب نمائندوں کو کسی حد تک

حکومتی معاملات میں شامل کر لیا۔ اگرچہ دیوان خاص سرداروں پر مشتمل ادارہ تھا۔ لیکن دیوان عام کے باعث اور اس کے نمائندوں کی براہ راست لوگوں تک رسائی ہونے کے سبب وہ بھی حکومت کے معاملات میں کسی حد تک سرداروں کے ہم پلہ بن گئے تھے۔ خان بھی بسا اوقات عوامی نمائندوں کو سرداروں پر ترجیح دیتے۔ یہ بات سرداروں کے لئے قطعاً ناقابل قبول تھی۔ انگریزی حکومت بھی نہیں چاہتی تھی کہ احمد یار خان قلات کی حکومت کو ایک قومی بلوچی حکومت بنانے میں کامیاب ہوں۔ جس میں بلوچ قوم پرستوں کا عمل دخل ہو۔ اس لئے اس نے اپنے وفادار سرداروں کے ذریعے قلات میں قائم ہونے والی ہر سیاسی تحریک کو ختم کرنے کی تدبیریں کیں اور ان کو انتہائی چالاکی کے ساتھ کچلتے رہے اور خان احمد یار خان کے بلند ارادوں اور کمزور حوصلوں کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی پشت پناہی میں قائم ہونے والی ہر سیاسی تحریک کو انگریز حکمرانوں کے دباؤ کے تحت خود ہی ختم کرنے کا اہتمام کرتے رہے۔ پہلے انجمن اتحاد بلوچاں پر وار کر کے اس کو منتشر کر دیا گیا۔ پھر انجمن اسلامیہ قلات کے ارکان کو منتشر کر کے اس کی تباہی کا اہتمام کیا گیا اور آخر میں بلوچستان کی سب سے منظم سیاسی جماعت قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کو انگریزی حکومت اور قبائلی سرداروں کے دباؤ کے تحت خلاف قانون قرار دے کر اس کی سرگرمیوں پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ اس طرح خان احمد یار خان اپنی ہی سیاسی تحریکوں کو اپنے ہی ہاتھوں بربادی سے دوچار کرتے رہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ذرا عزم و حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اثر و رسوخ کو ان تحریکوں کی تقویت کے لئے استعمال کرتے تو ہندوستان کی برطانوی حکومت کے لئے بلوچوں کی ایسی مقبول عام سیاسی تحریکوں کا مقابلہ کرنا کچھ آسان نہ رہتا۔ مگر اس نے ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے ایسی تحریکوں کو خود ان کے ہی خان کے ہاتھوں ختم کرایا اور ان ہی کے سرداروں کو اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے خان پر دباؤ ڈالنے کا اہتمام کیا اور خان اس دو طرفہ دباؤ کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور اس تحریک کو بھی المناک انجام سے دوچار کر دیا جس کی انہوں نے خود اس امید پر قائم کرنے میں اعانت کی تھی کہ شاید اس کے ذریعے بلوچ حکومت کے ایک جدید دور کا آغاز ممکن ہو سکے۔

اس تحریک کی ناکامی کا ایک سبب اس کے چند قائدین کی ذاتی مصلحتوں پر مبنی سیاست بھی تھی۔ مثال کے طور پر جب نیشنل پارٹی کو ریاست قلات میں خلاف قانون قرار دے کر اس کے کارکنوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری تھا اور اس کے خلاف بطور احتجاج اس کے چند قائدین اور اراکین نے حکومت قلات کی ملازمتوں سے استعفیٰ دے دیا تو اس کے بعض اعلیٰ عہدیدار بدستور اپنے سرکاری مناصب کے ساتھ چمٹے رہے۔ (۷) اس حقیقت کو میر گل خان نصیر نے جو اس وقت اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے نائب صدر بھی تھے اپنی کتاب "تاریخ بلوچستان" میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"جب حکومت قلات کی طرف سے پارٹی کے خلاف تادیبی کاروائی کی جانے لگی۔ تو ریاست قلات کے اندر سے ان آزادی دشمن طاقتوں کے خلاف میر محمد فاضل خان محمد شئی وزیر تعلیم اور ملک فیض محمد خان یوسف زئی اسسٹنٹ مستونی بھاگ کے اپنی ملازمتوں سے احتجاجاً استعفیٰ داخل کرنے کی خبر کے سوا اور کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ ان دو عالی حوصلہ نوجوانوں کے علاوہ پارٹی کے دوسرے تمام ملازم ممبروں نے چپ سادھ لی۔ یہاں تک کہ پارٹی کے وہ پرانے ملازم کارکن جن کو یہ عہدے اور افسریاں نیشنل پارٹی کے ہی دم قدم سے ملیں تھیں اپنی کرسیوں سے چمٹے رہے۔" (۸)

بہرحال تعلیم یافتہ ترقی پسند باشعور بلوچوں کی عوامی سطح پر منظم سیاسی تحریکوں کو ختم کر ڈالنے کے بعد خان احمد یار خان کے لئے انگریزوں کے روایتی وفادار سرداروں کا سہارا لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا اور انہوں نے سرداری جماعت بنا کر ان کے ذریعے اپنی حکومت کو سرداری ستونوں یا بیساکھیوں پر استوار کرنے کی کوشش کی۔ جن کو انگریزی وفاداری کی دیمک نے اتنا کھوکھلا بنا دیا تھا کہ وہ ازخود کسی قسم کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہ رکھتی تھیں۔ اس طرح قلات کی حکومت اور سیاست پر پھر جمود طاری ہو گیا۔ وگرنہ ایک مرحلے پر کچھ یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ برصغیر کی سب سے پسماندہ ریاست سیاسی شعور کے اعتبار سے کئی ترقی یافتہ ریاستوں سے آگے تھی، حتیٰ کہ انگریزی حکومت جو کہ ہر جگہ جمہوری اقدار کو فروغ دینے کی دعویٰ دار تھی۔ اس کے براہ راست زیر انتظام برطانوی بلوچستان میں تو کسی قسم کی سیاسی سرگرمی سنگین جرم تصور کی جاتی تھی۔ جبکہ اسی بلوچستان کی بلوچ ریاست میں سیاسی سرگرمیاں ریاستی معاملات کا حصہ بنی ہوئی تھیں اور سیاسی تحریک بھی زوروں پر تھی۔ اسی سے متاثر ہو کر برطانوی بلوچستان میں سیاسی تحریکوں کو آغاز ہوا اور انجمن وطن کے نام سے وہاں اولین سیاسی جماعت قائم ہوئی۔

اس عرصے کے دوران میر احمد یار خان نے ریاست قلات کے معاملے کو آئینی و قانونی طریقے پر ہندوستان کی برطانوی حکومت کے سامنے پیش کر کے بلوچستان کو ۱۸۴۱ء اور ۱۸۷۶ء میں طے پانے والے معاہدات کے مطابق آزادی دلانے کی غرض سے ہندوستان کے مسلمان رہنما قائداعظم محمد علی جناح سے صلاح و مشاورت کی اور ان کو ریاست کا آئینی مشیر بنایا تو انہوں نے خان سے مکمل اتفاق رائے کرتے ہوئے ان کے کیس کو بھرپور بنانے کے لئے کوششیں کیں اور اس بات کو تسلیم کر لیا کہ ریاست قلات کی حیثیت ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے قطعی مختلف ہے اور ہندوستان سے برطانوی اقتدار اعلیٰ کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی قلات کی سابقہ آزاد حیثیت بحال ہو جائے گی۔

کیبنٹ مشن کے ڈیلی گیشن کے دورہ ہندوستان کے موقع پر قائداعظم نے ریاست قلات کے کیس کو حتمی رنگ دے کر خان میر احمد یار خان کی موجودگی میں ایک ضیافت میں ڈیلی گیشن

کے اراکین کو پیش کر دیا۔ جس میں ریاست قلات کی آزاد حیثیت کو اجاگر کیا گیا تھا۔

اسی نقطہ نظر کے تحت جب خان احمد یار خان جون ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی مجوزہ آزادی کے بعد بلوچستان کے مستقبل کے سوال پر گفت و شنید کے لئے دہلی گئے تو وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن، خان میر احمد یار خان اور اعلیٰ مسلم لیگی زعما کے درمیان بات چیت کے بعد متفقہ طور پر قلات کی آزادی کو تسلیم کیا گیا۔ جس کے بموجب برصغیر کی آزادی کے ساتھ ہی میر احمد یار خان نے ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو قلات کی آزادی کا باضابطہ اعلان کر دیا۔

یہاں سے مسلمانوں کی نو آزاد مملکت پاکستان کے ساتھ بلوچستان کے تعلقات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جس میں بلوچوں کے ساتھ ایسی پالیسی اور سلوک روا رکھا گیا۔ جس کی یاد ایک مستقل تلخی کے اثرات باقی چھوڑ گئی اور جس کی نفسیاتی شدت کو کبھی بھی مٹانے یا کم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ ہمیشہ تازہ رکھنے کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا رہا۔

قیام پاکستان کے بعد جبکہ ہندوستان سے برطانوی تسلط کا خاتمہ ہو چکا تھا تو میر احمد یار خان کو یہ قوی امید تھی کہ اب جبکہ نو آزاد مسلمان ملک پاکستان کی باگ ڈور کلی طور پر خود قائداعظم کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ ریاست قلات کے اس آئینی و قانونی حیثیت کو تسلیم کر لیں گے۔ جس کے لئے وہ خود برطانوی حکومت کے سامنے قلات کے کیس کی نمائندگی کر چکے تھے۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد قائداعظم نے مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر خان قلات کو یہ مشورہ دیا کہ پہلے ریاست قلات کو غیر مشروط طور پر پاکستان میں شامل کیا جانا چاہئے۔ بقیہ تمام معاملات پر اس کے بعد ہی غور کیا جا سکتا ہے۔ اس پر خان احمد یار خان نے اپنے آپ کو ایک عجیب سی حالت میں پایا کہاں تو ان کا یہ خیال کہ اب وہ انگریزی تسلط سے نجات حاصل کر چکے ہیں اور ابھی وہ پاکستان کی مسلمان مملکت کے ساتھ جس کے قیام میں ان کی معاونت بھی کسی حد تک شامل تھی۔ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۷۶ء کے معاہدات کی بنیاد پر تعلقات استوار کر کے اس کے ساتھ چند شرائط پر الحاق کر سکیں گے اور کہاں یہ کیفیت کہ ان کو برطانوی حکومت کے جانشین ہونے کی حیثیت میں ان ہی کے دور کی سیاسی و انتظامی گرفت کے ساتھ الحاق کے لئے کہا جا رہا تھا۔

قیام پاکستان سے لے کر مارچ ۱۹۴۸ء تک الحاق کے بارے میں ریاست قلات اور حکومت پاکستان کے مابین بات چیت ہوتی رہی۔ اس دوران ایک مرتبہ خان احمد یار خان قائداعظم کے طلب کرنے پر خود کراچی چلے گئے جبکہ فروری ۱۹۴۸ء میں قائداعظم خود اس سلسلے میں سبی آئے اور خان کے ساتھ ڈھاڈر میں ان کی ملاقات ہوئی جس میں الحاق کے مسئلے پر قائداعظم اور خان معظم کے مابین آخری بار براہ راست گفتگو ہوئی۔ (۹) خان کی اپنی کتاب "قوم بلوچ و خوانین بلوچ" کے بموجب خان نے الحاق کے سلسلے میں قائداعظم سے یہ تحریری ضمانت مانگی کہ بلوچوں کے قدیم تاریخی اور روایتی رسم و رواج میں ان کی مرضی و منشا معلوم کئے بغیر کوئی تغیر و تبدل

نہیں کیا جائے گا۔ حفظ ماتقدم اور گارنٹی کے طور پر ایک دستاویز پر قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان اور خان میر احمد یار خان والئی قلات دستخط کردیں۔ لیکن ان کی کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بنیاد پر کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ (۱۰)

جب تک ریاست قلات کے الحاق کا معاملہ براہ راست قائداعظم کے اپنے ہاتھ میں رہا وہ مشفقانہ انداز میں میر احمد یار خان سے اس ضمن میں بات چیت اور ان کو الحاق پر آمادہ کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ لیکن جب بعد میں اس مسئلے کو طے کرنے کا اختیار پاکستان کی وزارت خارجہ کی فہم و فراست سے نابلد اور بصیرت سے عاری افسران شاہی کے ہاتھ میں دیا گیا۔ تو وہ تہذیب و شائستگی اور اقدار کا وہ روایتی مظاہرہ نہ کرسکے۔ جو اب تک انگریز حاکم بلوچوں کی قومی نفسیات کے مطابق ان کے ساتھ اختیار کرتے آئے تھے۔ (۱۱)

جناب احمد سلیم اپنی کتاب "سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں" میں لکھتے ہیں:

"اب براہ راست خطرناک دھمکیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا قلات کے وزیر دربار کے مطابق "وزیراعظم قلات نے مزید کہا کہ اسے اے جی جی (بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ) نے بتایا ہے کہ اگر خان اعظم نے یکم اپریل ۱۹۴۸ء تک الحاق نامہ پر دستخط نہ کئے تو حکومت پاکستان قلات کے خلاف پولیس ایکشن لے گی۔" خود خان قلات کا کہنا ہے کہ "کوئٹہ کے بریگیڈیئر کو حکومت پاکستان نے حکم دیا کہ وہ قلات کے خلاف کاروائی کیلئے تیار رہیں اے جی جی بلوچستان قلات کے خلاف پولیس ایکشن کی تیاری کر رہا تھا مجھے خوفناک تصادم قریب تر محسوس ہونے لگا....."

اسی دوران حکومت پاکستان نے قلات نیشنل پارٹی پر وار کر دیا۔ ۱۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو حکومت نے خاران، لس بیلہ اور مکران کے علاقوں کو قلات سے جداگانہ ریاستی حیثیت دے کر پاکستان کے ساتھ ان کے الحاق کی منظوری کا اعلان کیا اس کے فوراً بعد ایک خاص اعلان کے ذریعے قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کو پاکستان بھر میں خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر اور دوسرے چوٹی کے تمام رہنماؤں اور اراکین کو گرفتار کر لیا گیا۔ چونکہ دیوان عام میں قلات نیشنل پارٹی کی اکثریت تھی اور قلات اسمبلی نے خودمختار قلات کا نعرہ بلند کر رکھا تھا اس لئے پارٹی پر پابندی عائد کرنے، اس کے رہنماؤں اور اراکین کو گرفتار کرنے کے ساتھ ساتھ دیوان عام اور دیوان خاص کے اجلاس طلب کرنا بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ خان قلات نے مجبور ہو کر یکم اپریل سے چار روز قبل ۲۷ مارچ کو پاکستان کے ساتھ اپنے الحاق کا اعلان کر دیا۔ مسلم لیگ اور قائداعظم کے لئے خان قلات کی وفاداریوں اور قربانیوں کا یہ ایک نامناسب صلہ تھا جس کا خان کو بے حد رنج ہوا۔ سنا ہے پاکستانی فوج کے گریژن کمانڈر جنرل اکبر نے الحاق کے کاغذات پر دستخط کرانے کے لئے خان قلات کو نظربند کر رکھا تھا۔

بلوچستان میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ قلات نیشنل پارٹی جو آٹھ سال تک خلاف قانون

رہی تھی۔ دوبارہ زیرزمین سرگرمیوں کے لئے مجبور ہو گئی۔ خان قلات کا چھوٹا بھائی اور ریاست مکران کا گورنر شہزادہ عبدالکریم اپنے سینکڑوں ساتھیوں سمیت سرحد پار افغانستان میں داخل ہو گیا۔ اس نے خان کے غیر مشروط الحاق کے مسودے کو رد کرتے ہوئے ریاست کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ تاہم کالعدم قلات نیشنل پارٹی کے گل خان نصیر، غوث بخش بزنجو اور بعض دوسرے رہنما اس خیال سے بغاوت میں شریک نہ ہوئے کہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔ مئی ۱۹۴۸ء میں باغیوں نے پاکستانی فوج کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں کا آغاز کیا۔ مقابلے پر جنرل اکبر خان کی ساتویں رجمنٹ تھی۔ مبینہ طور پر پاکستانی فوج کے افسروں نے پربوٹی کے مقام پر قرآن پر حلف اٹھا کر باغیوں کے لئے عام معافی کا اعلان کیا لیکن پرنس کریم اور اس کے دو سو ساتھیوں کو قلات واپس آتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔ ۴ دسمبر ۱۹۴۸ء کو جرگہ نے تمام باغیوں کو دفعہ ۱۲۱۔ اے کے تحت طویل قید اور جرمانے کی سزائیں سنائیں۔

۱۵/ اپریل ۱۹۴۸ء کو خان قلات کا اپنی ریاست سے قانونی تعلق ختم کر دیا گیا۔ بقول خان "الحاق کے پندرہ دن بعد اے۔ جی۔ جی بلوچستان نے قلات پہنچ کر مجھے قائداعظم کا حکم سنایا کہ قلات کی برطانوی دور کی حیثیت برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ قلات کے لئے ایک پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کر دیا گیا ہے جو اے۔ جی۔ جی بلوچستان کے ماتحت ہو گا۔ امور داخلہ کے لئے وزیر اعلیٰ کو پولیٹیکل ایجنٹ سے ہدایات لینا ہوں گی۔ امید کی جاتی ہے کہ خان معظم کو اس تجویز سے اختلاف نہ ہو گا یہ حکم میرے لئے غیر متوقع تھا۔ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ایسی ہی پابندیوں سے نجات پانے کے لئے میں نے ۱۹۳۶ء میں قائداعظم کو ریاست قلات کا آئینی مشیر مقرر کیا تھا۔ قلات پر اب حکومت پاکستان براہ راست حکومت کرنے لگی تھی۔ بلوچ پارلیمنٹ اور بلوچ کانفیڈریسی مفلوج ہو گئے تھے۔" (۱۲)

حکومت پاکستان، بلوچستان کو مختلف بے مصرف وحدتوں میں تقسیم کرنا انتظامی لحاظ سے مناسب اور موزوں نہیں سمجھتی تھی۔ اور تمام بلوچستان کو ایک وحدت یا صوبے کی شکل دینا چاہتی تھی۔۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بلوچستان ریاستی یونین کا قیام عمل میں لایا گیا۔ قلات، لس بیلہ، خاران اور مکران کی ریاستوں کو متحد کر کے اسے ریاست ہائے متحدہ بلوچستان یا ریاستی یونین (Baluchistan States Union) کا نام دیا گیا اور چاروں والیان ریاست پر مشتمل حکمرانوں کی ایک کونسل تشکیل دی گئی۔ خان قلات میر احمد یار خان کو تازیست اس کونسل کا صدر تسلیم کیا گیا، البتہ اعلامیہ میں اس امر کی وضاحت کی گئی کہ میر احمد یار خان کے بعد یہ کونسل ہر چار سال کے لئے ایک صدر منتخب کیا کرے گی جو بالترتیب ان ہی والیان ریاست میں سے ہو گا اور جو امیر کہلائے گا لیکن خان، میر احمد یار خان امیر کی بجائے خان معظم کہلائیں گے۔

ریاستی یونین کی کونسل حکمرانان ایک سال تک نہ تو موجودہ اسمبلی کے لئے انتخابات کرا سکی

اور نہ ہی ملکی معاملات کو سلجھانے اور عوام کو مطمئن کرنے کی کسی قسم کی کارروائی کر سکی۔ البتہ والیان ریاست کی آپس میں بداعتمادی اور خودغرضی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔

۱۶ر فروری ۱۹۵۴ء کو سبی کے دربار کے موقع پر بلوچستان ریاستی یونین کے سرداروں نے بلوچستان کے ایجنٹ گورنر جنرل کو ایک درخواست پیش کی جس میں بلوچستان ریاستی یونین کو ختم کر کے متحدہ بلوچستان کو ایک صوبے کی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ غیر ریاستی بلوچستان کے سرداروں نے بھی ایک علیٰحدہ درخواست کے ذریعے ریاستی یونین کے سرداروں کے اقدام کو سراہتے ہوئے ریاستی یونین کے غیر ریاستی بلوچستان میں ادغام کی حمایت کی۔

اس دوران پاکستان کی مرکزی حکومت کو اس امر کا احساس ہوا کہ بلوچستان میں حالات سازگار نہیں رہے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں اکثریت کی حکومت کا جو سوال اٹھ رہا تھا اس نے بھی مرکزی حکومت کے زمامداروں کو پریشان کر رکھا تھا۔ لہٰذا مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو ایک وحدت میں مربوط کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان میں ون یونٹ یا وحدت مغربی پاکستان قائم ہوئی جس میں ریاستی اور غیرریاستی بلوچستان کی تفریق مٹ گئی۔ والیان ریاست اپنے حقوق حکمرانی سے دستبردار ہو گئے اور اس طرح بلوچستان کی وہ قدیم حکومت جس کی بنیاد ۱۵۱۱ء میں میر عمر دانی نے ڈالی اور جس کی حدود مملکت کو میر احمد خان اول، میر عبداللہ خان قہار اور میر نصیر خان نوری نے مشرق میں ڈیرہ غازی خان، مغرب میں سیستان و کرمان، شمال میں تاحد قندھار اور جنوب میں کراچی سے بندر عباس تک پھیلا دیا تھا اور جس کی آبیاری میر محراب خان شہید، میر نصیر خان غازی اور میر خداداد خان اسیر فرنگ نے اپنے خون پسینے سے کی تھی، ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ میں مدغم ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ (۱۳)

اس کے بعد خان کا بلوچستان کے انتظامی معاملات میں کسی قسم کا قانونی تعلق باقی نہیں رہا۔ جہاں تک معاشرتی و روایتی وابستگیاں تھیں۔ وہ البتہ قوانین و جبر کے ذریعے ختم نہیں ہو سکتیں۔ وہ صرف کردار کے ذریعے ہی باقی رہتی ہیں یا ختم ہو جاتی ہیں اور خان احمد یار خان کے معاملے میں ایسا ہی ہوا۔

اس کے بعد پھر وہ اس وقت بلوچستان کے معاملات میں عملاً شامل ہو گئے جب صدر اسکندر مرزا کے دور میں انہوں نے ریاست قلات کی بحالی کے لئے دوبارہ کوششوں کا آغاز کیا اور اس سلسلے میں تمام بلوچ سرداروں کو بشمول ڈیرہ غازی خان اور جیکب آباد کے بلوچ سرداروں کے اپنا ہمنوا بنا لیا۔ صدر مرزا نے بظاہر ان سے ہمدردی کا اظہار کیا مگر دراصل وہ کچھ اور ہی ارادہ کئے ہوئے تھا۔

خان نے سرداروں کی حمایت حاصل ہو جانے کے بعد بلوچ عوام کو ریاست کی بحالی کی مہم میں اس طرح ابھارنے کی مہم شروع کی تاکہ حکومت پاکستان پر یہ واضح ہو جائے کہ تمام بلوچ

قدیم بلوچی ریاست کی بحالی کے مطالبے کی پشت پر ہیں۔ اس مہم کے دوران ہی ۶؍ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو فوجی دستوں نے اچانک قلات پر حملہ آور ہو کر میر احمد یار خان کو گرفتار کر لیا اور بلوچستان میں ایک بار پھر جبر و تشدد کے خونیں سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ (۱۴) اس واقعے کو خان احمد یار خان خود اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"اس باب کا آغاز ۶؍ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ایک خون آشام صبح کو ہوتا ہے۔ جب اذان کی روح پرور گونج خدا پرست پاکستانی بلوچوں سے لبیک وصول کر رہی تھی کہ ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور چیختے چنگھاڑتے مٹیالی رنگت کے ٹرکوں کی حشر سامان گڑگڑاہٹ نے ناگاہ سجدہ عبودیت کے لئے تیاری کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قلات شہر کو تین اطراف سے گھیرے میں لے لیا گیا۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی سادہ لوح بلوچوں نے دیکھا کہ قلات سے کوئٹہ ایئرپورٹ تک طویل سڑک پر فوج ہی فوج ایستادہ ہے۔ لوگ حیرت و استعجاب میں غرق سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ لشکر عظیم یہاں اچانک کیسے وارد ہوا کہیں ۱۳؍ نومبر ۱۸۳۹ء کی یاد تو تازہ نہیں کی جا رہی مگر کیوں کر۔۔۔؟ اس وقت تو خان میر محراب خان شہید پر انگریزی سپاہ نے شب خون مارا تھا۔ مگر آج تو انگریز نہیں ہے۔ یہ فوج تو پاکستانی ہے۔ یہ شہر بھی پاکستانی ہے اور اس شہر کا شہریار بھی پاکستانی ہے۔ پھر یہ ہولناک منظر کیوں؟ قلات نصیری کے باشندے کچھ بھی نہ سمجھ پائے کہ توپ کے ایک گولے نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ شاہی مسجد کے مینار پر گولے برسائے جا رہے تھے۔" (۱۵)

وہ شخص جس نے تحریک پاکستان کے دوران بانی پاکستان کو سونے چاندی میں تول کر اتنی گراں قدر معاونت کی تھی اسے گویا زنجیروں اور بیڑیوں میں ڈال کر حساب بیباق کیا گیا۔ یہ ہماری آزادی کی تاریخ کی ایک عجیب ستم ظریفی تھی اور یہ بھی ایک مذاق ہی تھا کہ جس شخص کو بغاوت اور غداری کے الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اسی شخص کو اسی حکومت نے بلوچستان کے معاملات میں اپنا مشیر مقرر کر لیا۔

یہیں سے میر احمد یار خان کی شخصیت کے ایک دوسرے دور کا آغاز ہوا۔ جو ایک مختلف روپ کا حامل تھا۔ جب تک انہوں نے اپنے آپ کو بلوچوں کے جذبات و تکالیف میں شامل رہنے کا احساس دلایا۔ اس وقت تک وہ وابستگیوں کا مرکز بنے رہے۔ مگر جیسا کہ ان کا مستقل المیہ تھا کہ ان میں عزم و حوصلوں کا فقدان تھا۔ ایوبی مارشل لاء میں جب ان کو اسیر بنا کر بلوچستان میں جبر و تشدد کے ایک نئے دور کا آغاز کر کے باقی ماندہ کسر بھی پوری کر دی گئی تو اس کے ساتھ ہی مزاحمتی جدوجہد بھی ایک نئی شدت کے ساتھ شروع ہو گئی۔ اس مرحلے پر خان احمد یار خان کا کردار یکسر بدل گیا۔ وہ اس وقت کے مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ خان کے مشیر بن کر بلوچستان پر جبر و تشدد کرنے والوں کے رفیق و معاون بن گئے اور پھر بعد کی تمام تر تاریخ

ان قوتوں کی رفاقت و معاونت کی تاریخ ہے۔ جو بلوچوں کو بہرصورت اور بہرقیمت کچل دینا چاہتے تھے اور جب ان کے تعارف کا یہ رنگ ہو گیا تو صورت حال یہ ہو گئی کہ اس کے اپنے فرزند ۱۹۷۰ء کے منعقدہ عام انتخابات میں اپنی ہی سابقہ ریاست کے ایک غریب کسان کے بیٹے اور سیاسی کارکن کے مقابلے میں بری طرح شکست سے دوچار ہوئے۔

بعد میں پھر ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں ایک ایسے وقت میں جبکہ بلوچوں پر ظلم' تشدد اور بربریت کے نئے تجربے کئے جا رہے تھے۔ خان میر احمد یار خان کو بلوچستان کا گورنر بنایا گیا۔ جس پر وہ اس وقت تک فائز رہے جب تک کہ ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کو ملک مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ان کو گورنری سے برطرف نہیں کیا گیا۔

گورنری کے اس دور میں میر احمد یار خان ایک نئے روپ کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے آئے۔ ایوبی کاروائی کے وقت قلات میں چھ بلوچوں کی ہلاکت پر وہ اپنی کتاب میں انتہائی رنج و غم کی کیفیت بیان کرتے ہیں مگر اب ان ہی کی حاکمیت میں بلوچوں پر سفاکی اور قتل و غارتگری کی تمام سابقہ روایات توڑی جا رہی تھیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی۔ کہ ان کی تمام تر تگ و دو بلوچوں کے لئے ہرگز نہ تھی۔ بلکہ ریاست قلات میں اپنی حاکمیت کو مستحکم تر کرنے کی خاطر تھی اور جب قلات کے ساتھ ان کو پورے بلوچستان کی حاکمیت مل گئی تو گویا ان کو ان کی منزل مقصود مل گئی تھی اس دور میں جبکہ بھٹو حکومت کے پیش نظر بلوچستان میں بنیادی پالیسی اور کام صرف بلوچوں کو کچلنا تھا۔ خان معظم میر احمد یار خان نے بحیثیت گورنر اپنی قوم کو راہ راست پر لانے اور سبق سکھانے میں بھٹو حکومت سے ہر طرح کی معاونت کی اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ وہ جو بلوچوں کا خان ہونے کو دنیا کے ہر دوسرے اعزاز پر ترجیح دیتے ہیں۔ اب کیسے گورنری کو بلوچوں کی جان' مال اور آن پر ترجیح دے رہے ہیں۔ وہ بلوچوں کے خون پر عہدۂ گورنری پر براجمان رہے اور ایک لمحے کے لئے بھی اپنی قوم کو مارنے کے ارادے پر متاسف نہیں ہوئے۔ وگرنہ وہ اگر اسے روک نہیں سکتے تھے تو کم از کم معاونت تو نہ کرتے۔

خان میر احمد یار خان بلوچوں کے احمد زئی خاندان کے آخری حکمران تھے۔ ذاتی شرافت' اخلاص اور بردباری کے اوصاف کے باوجود اس میں ایک روایتی بلوچ کی خوبیاں نہ تھیں۔ نہ اس میں بلوچوں کی روایتی شجاعت تھی۔ نہ عزم و حوصلے اور ان ہی اوصاف کے نہ ہونے کے باعث وہ زندگی بھر اپنے ارادوں اور منصوبوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی زندگی کی جدوجہد کا خلاصہ دو فقروں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ قیام پاکستان تک ریاست قلات میں خان کی حاکمیت کی برتری کو قائم کرنا اور قلات کے پاکستان میں شامل ہو جانے کے بعد ریاست قلات کی بحالی کی جدوجہد اور ان دونوں میں سے کوئی جدوجہد بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

وہ بہ یک وقت ایک کامل مسلمان اور ایک روایتی پکا بلوچ بننے کی سعی کرتے رہے اور ہر دو

جامع تشخص کو اپنی شخصیت میں سمونے کی خواہش کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ بلوچوں نے ان کو ایک روایتی بلوچ کی حیثیت میں تسلیم کیا نہ ہی ان کو ملک کے پاکستانی واسلامی ذہن نے ایک سچے مسلمان رہبر کے طور پر تسلیم کیا۔ وہ اس کشمکش میں اس مصرعے کی عملی تعبیر بن کر رہ گئے۔

ے نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

ان کی زندگی کی آخری سانسیں بلوچستان سے بہت دور پوری ہوئیں۔ ان کی پیدائش بھی بلوچ علاقے سے باہر ہوئی تھی اور وفات بھی بلوچستان سے باہر راولپنڈی میں پائی۔ بہرحال ان کے تذکرے کے بغیر بلوچ تاریخ کے کئی باب ادھورے رہیں گے۔ وہ بلوچستان کو بہت کچھ بنانے کی خواہشوں کے باوجود اسے کچھ بھی نہ بنا سکے۔ وہ نہ میر نصیر خان نوری بنے اور نہ ہی میر محراب خان شہید بن سکے۔ وہ تمام عمر ریت کے گھروندے بنا کر بالاخر ان ہی میں دفن ہو گئے۔ (۱۶)

میر احمد یار خان کو مارشل لاء حکومت نے ان کے عہدے سے ہٹایا تھا اور اس کے فقط ساڑھے تین ماہ بعد ۲۰/اکتوبر ۱۹۷۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ (۱۷)

یہ احمد یارخان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند میر داؤد خان ان کے جانشین بنے۔ ۲ رجنوری ۱۹۹۸ء کو میر داؤد خان بھی وفات پا گئے تو ان کے فرزند میر سلیمان جان کی دستار بندی کی گئی جواب خاندان کے سب سے محترم بزرگ ہیں (۱۸)۔

میر داؤد خان کے ایک اور صاحبزادے پرنس فیصل داؤد احمدزئی ہیں انہوں نے ۱۹۹۷ء میں قلات سے جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر میر اسرار اللہ خان زہری سے شکست کھا گئے تھے (۱۹) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے ایم ایم اے کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور نہ صرف بلوچستان اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہوئے بلکہ صوبائی کابینہ میں وزیر تعمیرات کے منصب پر بھی فائز ہوئے (۲۰)۔

تاہم میر احمد یارخان کی وفات کے فوراً بعد ان کے خاندان کے جو فرد عملی سیاست کے میدان میں نمودار ہوئے وہ ان کے فرزند پرنس محی الدین بلوچ تھے پرنس محی الدین بلوچ اپنے والد کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد جنرل ضیاالحق کی کابینہ میں بیٹھے نظر آئے۔ پرنس محی الدین بلوچ جو جام آف لسبیلہ کے داماد بھی ہیں۔ فروری ۱۹۸۵ء تک جنرل ضیاء کی ہر کابینہ میں شامل رہے اور ان کے پاس مستقلاً مواصلات کا قلم دان رہا۔ (۲۱)

پرنس محی الدین بلوچ نے ۱۹۷۰ء میں قیوم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا۔ مگر غوث بخش بزنجو کے ہاتھوں شکست کھا گئے تھے۔ (۲۲) ۱۹۷۷ء میں انہوں نے این اے ۱۹۹ قلات اسے انتخاب لڑا اور بلا مقابلہ کامیابی حاصل کی (۲۱) ۱۹۸۵ء میں وہ این ۲۰۴ قلات رخاران کی نشست

سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار ہوئے اور اس مرتبہ بھی کامیاب ہوئے (۲۴) انتخاب میں کامیابی کے بعد محمد خان جونیجو کی کابینہ میں بھی شامل ہوئے مگر جلد ہی ان کے خلاف تولیہ برآمد کرنے کا ایک اسکینڈل منظر عام پر آیا۔ جس کے باعث ۳۰/اکتوبر ۱۹۸۶ء کو انہیں وزارت سے برطرف کردیا گیا۔(۲۵)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں پرنس محی الدین بلوچ کو اسلامی جمہوری اتحاد کا ٹکٹ حاصل تھا۔ مگر چونکہ انہوں نے ۱۹۸۵ء کے بعد علاقے کے عوام سے رابطہ میں تساہل سے کام لیا تھا اس لیے اس مرتبہ انہیں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا اور علاقے کے دس امیدواروں میں وہ بمشکل ساتویں پوزیشن حاصل کرپائے۔ (۲۶) ۱۹۹۰ء کے انتخاب سے قبل انہوں نے جمہوری وطن پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ مگر یہ نئی سیاسی وابستگی بھی انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچاسکی اور اس انتخاب میں بھی انہوں نے جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کے سید محمد صدیق شاہ اور پاکستان نیشنل پارٹی کے نواب محمد اسلم رئیسانی سے کم ووٹ حاصل کیے۔ (۲۷) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں پرنس محی الدین بلوچ نے ایک مرتبہ پھر آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ بھی وہ بمشکل پانچویں پوزیشن حاصل کرسکے (۲۸) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں پرنس محی الدین بلوچ کے صاحبزادے پرنس احمد علی احمد زئی نے بھی انتخابی سیاست کے میدان قدم رکھا۔ انہوں نے پی بی ۳۵ لسبیلہ۲ سے انتخاب لڑا۔ مگر سردار محمد صالح خاں بھوتانی سے تقریباً چھ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔(۲۹)

پرنس محی الدین بلوچ کے چھوٹے بھائی پرنس یحیٰی خان بھی ایک طویل عرصہ سے انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔ مگر ان کا انتخابی ریکارڈ بھی کوئی زیادہ اچھا نہیں۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں وہ این اے ۱۳۷ قلات ا سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے مگر اس انتخاب میں اپنے مدمقابل نیشنل عوامی پارٹی کے ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ سے شکست کھا گئے تھے (۳۰) ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں وہ پی بی ۲۸ قلات ۲ سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۳۱) تاہم ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں انہیں اسی حلقہ سے جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کے محمد عطاء اللہ سے شکست اٹھانی پڑی (۳۲) ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ ہی نہیں لیا۔

پرنس یحیٰی خان بلوچ کی اہلیہ ریحانہ یحیٰی بلوچ ہیں جو ۲۰۰۶ء میں سینٹ آف پاکستان کی رکن بنی ہیں (۳۳)

پرنس محی الدین بلوچ اور پرنس یحیٰی خان کے ایک اور بھائی پرنس موسیٰ جان ہیں جو ۱۹۹۷ء میں پی بی ۲۸ قلات کم مستونگ سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے یہ انتخاب بلوچستان نیشنل پارٹی کے ٹکٹ پر لڑا تھا (۳۴)۔

حوالہ جات

۱۔ سر فرانس لو (مدیر)۔ دی انڈین ایربک اینڈ ہواز ہو ۱۹۴۷ء۔ بمبئی۔ ص ۱۲۸۸، ۱۳۴۶
۲۔ میر احمد یار خاں بلوچ۔ مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ۔ کوئٹہ۔ ص ۳۵، ۳۶
۳۔ میر گل خاں نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۷۴ تا ۲۸۰
۴۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان۔ شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۱۶، ۲۱۷
۵۔ خان بلوچ۔ بلوچ قوم کے نام خان بلوچ کا پیغام۔ کراچی۔ ص ۲۳۔۲۴
۶۔ میر احمد یار خاں بلوچ۔ مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ۔ کوئٹہ۔ ص ۶۷، ۶۸
۷۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان۔ شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۱۷ تا ۲۲۴
۸۔ میر گل خاں نصیر۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ حصہ دوم۔ ص ۴۶۷
۹۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۲۵ تا ۲۲۹
۱۰۔ میر احمد یار خاں بلوچ۔ مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ۔ کوئٹہ ص ۹۶ تا ۹۹
۱۱۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۲۹، ۲۳۰
۱۲۔ احمد سلیم۔ سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں۔ لاہور۔ ص ۱۹۰، ۱۹۱
۱۳۔ میر گل خاں نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۸۱، ۲۸۲
۱۴۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۳۴، ۲۳۵
۱۵۔ میر احمد یار خاں بلوچ۔ مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ۔ کوئٹہ۔ ص ۱۷۹
۱۶۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان۔ شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۲۶ تا ۲۴۰
۱۷۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات مشاہیر پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۱۷
۱۸۔ لالہ ہتورام، پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ بلوچ قبائل۔ کوئٹہ۔ ص ۴۸
۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم ص ۶۶۹
۲۰۔ پروفیسر عرفان احمد بیگ۔ بلوچستان میں پارلیمانی سیاست کا آغاز تاخیر سے ہوا۔ روزنامہ جنگ سنڈے میگزین، ۲۱/اگست ۲۰۰۵۔ ص ۴
۲۱۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۴۹۰ تا ۴۹۴
۲۲۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰/مئی ۱۹۸۷ء
۲۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۱/مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۲۸۸
۲۴۔ کے ایچ اعوان۔ الیکشن ان پاکستان۔ کراچی۔ ص ۳۱۹
۲۵۔ وکیل انجم۔ سیاست کے فرعون۔ لاہور۔ ص ۹۶

۲۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص۴۶۶

۲۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص۹۴

۲۸۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ ۱۴/اکتوبر۱۹۹۳ء۔ ص۱۳۲۴

۲۹۔ ایضاً۔ ۱۷/اکتوبر۱۹۹۳ء۔ ص۱۵۵۷

۳۰۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰/مئی ۱۹۸۷ء

۳۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸/مارچ ۱۹۸۵ء۔ ص۲۶۳۴

۳۲۔ ایضاً۔ ۳/دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص۳۷۴۸

۳۳۔ الیکشن کمیشن آپ پاکستان۔ نوٹیفیکیشن ۹/ مارچ ۲۰۰۶ء

۳۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشن رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۶۶۸

ڈومبکی

ڈومبکی بلوچوں کا ایک معتبر قبیلہ ہے جو بلوچستان کے سابق ضلع کچھی اور موجودہ ضلع بولان میں واقع ہے۔ اس سرزمین سے رند دلاشار کی مشہور تیس سالہ جنگ اور بیسیوں تاریخی اور ثقافتی روایت کے علاوہ رزم اور بزم کی بہت سی داستانیں منسوب ہیں۔

ڈومبکی قبیلے کا سلسلۂ نسب بلوچ تاریخ کے نام اور جرنیل امیر چاکر خان رند سے ملتا ہے۔ جن کے بیٹے میر جلال خان ڈومبکیوں کے مورث اعلیٰ تھے۔

اس قبیلے کو ڈومبکی کیوں کہا جاتا ہے، اس سلسلے میں کئی روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ ان کا تعلق ڈومبک نام کی ایک شاداب بستی سے ہے۔ (۱) دوسری روایت یہ ہے کہ امیر چاکر خان نے ایک ڈوم کی بیٹی سے شادی کی تھی جس کی اولاد میر جلال خان ہوئے اور ان کی نسل ڈومبکی کہلائی۔ تیسری روایت بتاتی ہے کہ امیر چاکر خان کی جس بیوی سے میر جلال خان پیدا ہوئے اس کے والد کا نام ڈومب تھا اور یوں میر جلال خان کی اولاد کو ڈومبکی کہا جانے لگا (۲)

ماہرین انساب کے مطابق میر جلال خان، اپنے نامور میر چاکر خان رند کی زندگی میں، کچھی (موجودہ ضلع بولان) واپس لوٹ آئے تھے اور انہوں نے اپنے ویران گھروں اور چراگاہوں کو دوبارہ آباد کر لیا تھا۔ انہی میر جلال خان کی اولاد میں ایک سردار بلوچ خان ڈومبکی تھے سردار بلوچ خان ڈومبکی کے دو بیٹے ہوئے۔ جن کے نام سردار سہراب خان ڈومبکی اور سردار میرو خان ڈومبکی تھے۔ ان دونوں سرداروں کی اولاد بالترتیب سہراب زئی اور میرو زئی کہلائی۔

ڈومبکی قبیلے کے موجودہ سردار، سردار چاکر خان ڈومبکی کا تعلق سہراب زئی سے ہے اور سردار سہراب خان ڈومبکی کی چوتھی نسل ہیں۔ سردار چاکر خان ڈومبکی کے والد سردار بختیار خان ڈومبکی تھے۔ جن کا انتقال ۲۴؍ اپریل ۱۹۷۰ء کو ہوا۔ ان کی وفات کے تین دن بعد ۲۷؍ اپریل ۱۹۷۰ء کو میر چاکر خان ڈومبکی کی دستار بندی ہوئی اور وہ سہراب زئی ڈومبکیوں کے سردار بن گئے۔ سردار چاکر خان ڈومبکی، ۲۹؍ اگست ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کی شادی سردار اکبر بگٹی کی صاحبزادی سے ہوئی

ہے۔(۳)

سردار چاکر خان ڈومبکی ۱۹۷۰ء میں پہلی مرتبہ بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء میں مسلسل صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے رہے اور یوں انہوں نے مسلسل سات مرتبہ بلوچستان اسمبلی کا رکن منتخب ہو کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا جو پاکستان کی کسی بھی اسمبلی میں مسلسل کامیاب ہونے کا ایک منفرد ریکارڈ ہے۔ سوائے ۱۹۷۷ء کے انہوں نے ہر انتخاب آزاد حیثیت میں جیتا ......۱۹۷۷ء کے انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی تھی (۴)

سردار چاکر خان ڈومبکی کے دو صاحبزادگان سالار ڈومبکی اور دینار ڈومبکی، ۲۸ راگست ۱۹۹۴ء کو بگٹیوں اور رئیسانیوں کے ایک تصادم میں لقمہ اجل بن گئے تھے۔ جن کی تفصیل اسی کتاب میں بگٹی قبیلے کے ذیل میں رقم کی جا چکی ہے۔

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں سردار چاکر خان ڈومبکی، گریجویشن کی شرط کی وجہ سے حصہ نہیں لے سکے۔ ان انتخابات میں ان کے صاحبزادے میر بختیار خان ڈومبکی نے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی کے انتخاب میں تو وہ کامیاب نہیں ہو سکے اور جمہوری وطن پارٹی کے حیدر بگٹی سے شکست کھا گئے لیکن صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں وہ نہ صرف کامیاب ہوئے (۵) بلکہ بلوچستان کی صوبائی کابینہ میں بھی شامل کیے گئے۔ انہیں جنگل اور جنگلی حیات کا قلم دان سونپا گیا (۶)

سردار چاکر خان ڈومبکی کے دو بھائی میر حضور بخش ڈومبکی اور میر نبی بخش ڈومبکی بھی سیاست کے میدان میں رہے ہیں۔ میر حضور بخش ڈومبکی ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء تک سینٹ آف پاکستان کے رکن رہے (۷) میر حضور بخش ڈومبکی کے ایک صاحبزادے دوستین خان ڈومبکی نے جمہوری وطن پارٹی کے ٹکٹ پر ۲۰۰۲ء کے صوبائی انتخاب میں بھی حصہ لیا مگر اپنے تایا زاد بھائی میر بختیار خان ڈومبکی سے شکست کھا گئے (۸) ان کے بھائی علی مردان ڈومبکی نے ۲۰۰۵ء کے بلدیاتی انتخاب میں حصہ لیا اور سبّی کے ضلعی ناظم کے منصب پر فائز ہوئے۔(۹)

سردار چاکر خان ڈومبکی اور میر حضور بخش ڈومبکی کے تیسرے بھائی میر نبی بخش ڈومبکی ہیں جو ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۴ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے تھے وہ جمہوری وطن پارٹی کے امیدوار تھے۔ (۱۰)

ڈومبکیوں کی ایک شاخ سندھ کے ضلع جیکب آباد میں بھی آباد ہے اور اس شاخ کے چند سرکردہ افراد بھی سندھ کی صوبائی سیاست میں فعال رہے ہیں۔

سندھ کے ڈومبکیوں کے جو پہلے فرد سیاست کے میدان میں نمایاں ہوئے وہ علی بلاول خان

ڈومبکی تھے۔وہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۳ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب بنے (۱۱) ۱۹۵۶ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن ہے (۱۲) تاہم ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور سندر خان سندرانی کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۱۳) اس کے بعد ان کا نام کسی انتخابی مہم میں نظر نہیں آیا۔ ۱۹۸۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا (۱۴)

علی بلاول خان ڈومبکی کی زندگی ہی میں ان کے صاحبزادے میر شاہ علی ڈومبکی نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ۱۹۷۷ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۵) میر شاہ علی خان ڈومبکی نے ۱۹۵۸ء کے غیر جماعتی انتخاب میں بھی حصہ لیا مگر سلیم جان مزاری کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے اور سردار سلیم جان مزاری نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لیا۔ یہ معرکہ میر شاہ علی خان ڈومبکی نے سر کیا اور اپنے حریف کو تقریباً ساڑھے چھ ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ ابھی ان کا دور رکنیت جاری تھا کہ ۱۹۹۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (۱۶)

میر شاہ علی ڈومبکی کے بعد قبیلے کی سرداری ان کے صاحبزادے میر غالب حسین ڈومبکی نے سنبھالی اکتوبر ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہیں پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنا امیدوار نامزد کیا۔ میر غالب حسین ڈومبکی کے مخالف امیدوار سلیم جان مزاری تھے۔ جو اس انتخاب میں آزاد امیدوار کے طور پر حصہ لے رہے تھے۔ یہ مقابلہ سلیم جان مزاری نے سر کیا اور غالب حسین ڈومبکی تقریباً بارہ ہزار ووٹ سے شکست کھا گئے۔

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں بھی میر غالب حسین ڈومبکی نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لیا۔ وہ نہ صرف انتخابات میں کامیاب ہوئے بلکہ بعد ازاں صوبائی کابینہ میں بھی شامل کیے گئے ان کے پاس ثقافت اور نوجوانوں کے امور کا قلم دان تھا اور وہ صوبائی کابینہ کے سب سے کم عمر رکن تھے (۱۷)

اس کے بعد میر غالب حسین ڈومبکی نے ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں بھی حصہ لیا ......مگر وہ ان دونوں انتخابات میں سردار سلیم جان مزاری سے شکست کھا گئے۔ میر غالب حسین ڈومبکی نے ۱۹۹۷ء کا انتخاب یونائیٹڈ نیشنل الائنس کے ٹکٹ پر لڑا تھا (۱۸) جبکہ ۲۰۰۲ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹیرین کے امیدوار تھے (۱۹)

حوالہ جات

۱۔ اختر علی خان بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد دوم)۔ کراچی۔ ص ۲۱۸

۲۔ شیخ صادق علی شیر علی انصاری، مسلم ریسز فاؤنڈ ان سندھ، بلوچستان اینڈ افغانستان۔ کراچی۔ ص ۱۸

۳۔ اختر علی خان بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد چہارم) کراچی۔ص ۳۲۵

۴۔ وحید زہیر۔ بلوچستان، جمہوریت کا سفر۔کوئٹہ۔ص ۶۴ تا ۹۵

۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔جلد دوم ص ۹۹، ۳۵۲

۶۔ ویب سائٹ www.baluchistain.gov.pk

۷۔ سینٹ آف پاکستان۔ڈائرکٹری آف ممبرز (چوتھا ایڈیشن)۔اسلام آبا۔ص ۲۱۳ تا ۲۱۵

۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد، جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔جلد دوم۔ص ۳۵۲

۹۔ ویب سائٹ www.ecp.gov.pk

۱۰۔ سینٹ آف پاکستان۔ڈائرکٹری آف ممبرز (چوتھا ایڈیشن)۔اسلام آباد۔ص ۳۹، ۲۱۹

۱۱۔ وکیل انجم۔سیاستدانوں کی قلا بازیاں۔(حصہ اول)۔لاہور۔ص ۲۰۸

۱۲۔ پنجاب پراونشل اسمبلی سکریٹریٹ۔دی پنجاب لیجسلیچرز۔لاہور۔ص ۲۷

۱۳۔ وکیل انجم۔سیاستدانوں کی قلابازیاں (حصہ اول)۔لاہور۔ص ۵۹۱

۱۴۔ نصیر احمد سلیمی۔ میر غالب حسین ڈومبکی کے انکشافات۔ہفت روزہ زندگی، لاہور۔ ۸ تا ۱۴ رجولائی ۱۹۹۴۔ص ۱۹

۱۵۔ دی گزٹ آف پاکستان، اسلام آباد۔۲۴ رمارچ ۱۹۷۷ء۔ص ۳۳۶۵

۱۶۔ نصیر احمد سلیمی۔میر غالب حسین ڈومبکی کے انکشافات۔ہفت روزہ زندگی۔لاہور۔ ۸ تا ۱۴ر جولائی ۱۹۹۴۔ص ۱۹، ۲۰

۱۷۔ ایضاً۔ص ۲۰

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔جلد دوم۔ص ۴۳۹

۱۹۔ ایضاً۔جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔جلد دوم۔ص ۲۳۸

رند

بلوچوں میں رندوں کے تعارف کی مطلق ضرورت نہیں، کیونکہ میر جلال خان رند کی سرکردگی میں بلوچوں کے چوالیس مختلف قبیلے سیستان سے مکران آئے تھے اور وہاں سے وہ بلوچستان، سندھ، پنجاب اور گجرات میں پھیل گئے تھے۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ میر چاکر کے زمانے تک جب تک یہ منظم رہے، من حیث الکل بلوچوں کی سرداری رندوں ہی میں رہی، لاشاریوں سے تیس سالہ جنگ کے بعد اور پھر پنجاب میں دودائیوں سے لڑائی کے بعد بلوچوں کی تنظیم منتشر ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سرداری بھی تقسیم ہو کر رہ گئی اور ہر قبیلہ نے نیم خود مختارانہ حیثیت حاصل کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے زمانے میں قبیلے کی کمزوری کی وجہ سے رندوں کی سرداری منقسم ہو گئی۔ جب میر بجار پڑ رند پنجاب میں میر چاکر سے علیحدہ ہوا اور دودئی قبیلے سے لڑائی شروع کی تو اس نے اپنے آپ کو "رندوں کا بادشاہ" کہلوانا شروع کر دیا۔ میر چاکر جان اور بلوچوں کے دوسرے مشہور رہنما سب کے سب رندوں کے پڑ گروہ سے متعلق تھے۔ غرض اس طرح بلوچوں میں قبائلیت اور علیحدگی کی ابتدا ہوئی۔ بلوچوں میں یہ ایک عام دستور سا ہو گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک قبیلہ رند ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا رند ہونے سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔ رندوں کی شمشیر زنی کی شہرت اور اس قبیلہ میں عظیم شخصیتوں اور ہستیوں کی موجودگی کی وجہ سے اس قبیلہ سے اپنے آپ کو متعلق کر لینا یقیناً قابل عزت بات ہے۔ تقریباً آدھے رند پنجاب میں مقیم ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد میر چاکر رند کے ساتھ وہاں گئے تھے۔ میر چاکر رند نے وہیں ضلع ساہیوال میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ بہر حال رندوں کی ایک خاص تعداد نے میر چاکر سے علیحدہ ہو کر میر بجار رند کو اپنا سردار مان لیا۔ میر بجار رند نے پنجاب میں دودائیوں کے خلاف بہت سی لڑائیاں لڑیں اور اس کے بعد وہ سندھ سے ہوتا ہوا بلوچستان واپس آ گیا۔ اس کے بہت سے پیرووں اور ساتھیوں نے ڈیرہ غازی خاں، سندھ اور بلوچستان میں سکونت اختیار کر لی اور اپنے آپ کو مختلف قبائلی ناموں سے موسوم کیا، لیکن وہ ہمیشہ اپنے رند ہونے پر فخر کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں۔ (۱)

بلوچستان کے علاقہ کچھی میں قبیلہ ڈومبکی کے علاوہ رند کے نام سے جو قبیلہ آباد ہے اس کی کل تعداد نصف لاکھ نفوس کے لگ بھگ ہے۔ شوران ان کا صدر مقام ہے۔ خوانین قلات کے دور میں اس کا شمار ساراوان کے قبائل میں ہوتا تھا۔ (۲)

چار پشت پہلے اس قبیلے کی سربراہی سردار شیر محمد رند کے پاس تھی۔ جو خان آف قلات میر محراب خان کے ساتھ ایک چپقلش کے نتیجے میں مارے گئے۔ سردار شیر محمد رند کے بعد ان کے صاحبزادے سردار خان رند ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے اپنے حلیف ساتھیوں کے قتل کا بدلہ لیا۔

سردار خان رند کے دو صاحبزادے تھے۔ جن کے نام سردار امام بخش خان رند اور سردار شیر محمد خان رند تھے۔ ان دونوں بھائیوں میں کسی بات پر شکر رنجی ہوگئی تو سردار شیر محمد خان رند نواب شاہ جا کر آباد ہو گئے۔

اسی دوران سردار امام بخش خاں رند وفات پا گئے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے سردار تاج محمد رند کو قبیلے کا سردار بننا تھا مگر ان کی کم سنی کے باعث قبیلے کی قائم مقام سرداری سردار شیر محمد خان رند نے سنبھالا۔ اب وہ گاہے گاہے شوران میں بھی قیام کرنے لگے اور قبائلی امور نمٹانے لگے۔ یہ سلسلہ تاج محمد رند کے بڑے ہونے اور سردار کا منصب سنبھالنے تک جاری رہا۔ (۳)

۶۲۔۱۹۶۱ء کے لگ بھگ سردار شیر محمد خان رند کی وفات کے بعد ان کا منصب ان کے اکلوتے فرزند سردار خان رند نے سنبھال لیا...... انہوں نے پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے ٹکٹ پر ۱۹۷۰ء میں بلوچستان اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر سردار غوث بخش رئیسانی کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۴) سردار خاں رند نے عین عالم جوانی میں ۲رجنوری ۱۹۷۲ء کو ایک ٹریفک حادثے میں وفات پائی سردار خان رند کی ایک وجہ شہرت یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنے زمانے کی دو مشہور اداکاراؤں شمیم آرا اور حسنہ سے شادی کی تھی۔ (۵)

سردار خان رند کے دو صاحبزادے ہیں۔ یار محمد رند اور شیر محمد رند۔ یہ دونوں صاحبزادے اپنے والد کی وفات کے وقت بہت کم عمر تھے اس لیے قبیلے کی سرداری کے امور سردار تاج محمد رند ہی نمٹاتے رہے۔ ویسے بھی قبیلے کی سرداری پر ان کا تفوق زیادہ تھا۔

سردار تاج محمد رند نے ۱۹۸۵ء میں قومی اسمبلی کے انتخاب میں بھی حصہ لیا اور کچھی سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۶) ۱۳راپریل ۱۹۹۲ء کو سردار تاج محمد رند ایک قاتلانہ حملے میں ہلاک کر دیئے...... ان کے ہمراہ ان کے سات محافظ بھی مارے گئے...... اس قتل کی وجہ پرانی قبائلی دشمنی بتائی گئی تھی۔ (۷) جناب تاج محمد رند کے قتل کے چند ماہ بعد ان کی بیوہ نے ایک پریس کانفرنس میں جناب تاج محمد رند کے قتل کا الزام براہ راست یار محمد رند اور ان کی بھائی شیر محمد رند پر عائد کیا۔ اس الزام پر یار محمد رند کا کہنا تھا کہ تاج محمد رند کے قتل کے ذمہ دار وہ نہیں بلکہ نواب اسلم رئیسانی ہیں جو تاج محمد رند

کو اپنے باپ سردار غوث بخش رئیسانی کا قاتل سمجھتے ہیں۔ یار محمد رند نے یہ بھی کہا کہ اسلم رئیسانی سمجھتے ہیں کہ سردار غوث بخش رئیسانی کو تاج محمد رند نے سردار اکبر خاں بگٹی کے ایما پر قتل کیا تھا (۸) بعد ازاں جناب اسلم رئیسانی نے اس مبینہ الزام کی تردید کی اور کہا کہ دو بگٹی لیڈروں (حمزہ بگٹی اور سلال بگٹی) اور سردار تاج محمد رند کے قتل کے سلسلہ میں نہ تو جمہوری وطن پارٹی نے اور نہ ہی سردار یار محمد خاں یا سردار تاج محمد رند کی بیوہ نے انہیں ملوث قرار دیا ہے اور نہ ہی وہ نواب اکبر بگٹی کو اپنے والد کے قتل میں ملوث یا اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ (۹)

سردار تاج محمد کی رند کی بیوہ نے اسی پریس کانفرنس میں اپنے بیٹے امام بخش رند کو سردار بنانے کا اعلان کیا۔ جس کے بعد رند قبیلہ واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ سردار تاج محمد رند کی زندگی ہی میں یار محمد رند اپنی سیاسی زندگی کا بھی آغاز کر چکے تھے اب انہوں نے باقاعدہ طور پر قبیلے کی سرداری بھی سنبھال لی۔

سردار یار محمد رند ۱۹۸۵ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے تھے۔

سینٹ میں یار محمد رند کی رکنیت ۱۹۸۸ء تک جاری رہی۔ ۱۹۸۸ء میں وہ سینٹ کے رکن منتخب ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۰)

۱۹۹۰ء میں جناب یار محمد رند این اے ۲۰۱ کچھی سے جمہوری وطن پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے انہیں آئی جے آئی بھی حاصل تھی۔ ان کا مقابلہ بی این ایم کے ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ پی ڈی اے کے عبدالحئی بنگل زئی اور جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ سے تھا)۔ مگر جناب یار محمد رند کے تینوں اہم مد مقابل مجموعی طور پر بھی یار محمد رند کے برابر ووٹ نہ لے سکے۔ اور یوں یار محمد رند قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۱۱) ۱۹۹۳ء میں بھی کم و بیش یہی صورت حال رہی۔ اس مرتبہ یار محمد رند کے مقابلے میں ڈاکٹر عبدالحئی، سردار دھنی بخش مولانا محمد عبدالحئی مالک شاہ کے علاوہ نواب ذوالفقار علی مگسی نے بھی کاغذات نامزدگی داخل کروائے تھے۔ مگر بعد میں انہوں نے اپنے کاغذات واپس لے لیے۔ ۱۹۹۳ء میں بھی سردار یار محمد رند نے جمہوری وطن پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور ۱۳۳۵۲ ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی جب کہ ان کے قریب ترین امیدوار بی این ایم (حئی گروپ) کے ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ نے ۱۹۸۴ ووٹ حاصل کئے (۱۲) ۱۹۹۷ء میں بھی انہوں نے جمہوری وطن پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ ان کا میر طارق حسین مگسی سے ون ٹو ون مقابلہ ہوا جنہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حمایت حاصل تھی۔ یہ معرکہ یار محمد رند نے ہی سر کیا اور میر طارق حسین مگسی کو چھ ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دے دی (۱۳) ۲۰۰۲ء کا انتخاب انہوں نے نیشنل الائنس کے ٹکٹ پر لڑا اور نواب محمد اسلم رئیسانی اور ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ جیسے مضبوط امیدواروں کو شکست دے کر نہ صرف چوتھی مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۴) بلکہ وفاقی کابینہ میں بھی شامل کیے گئے۔

(۱۵)

ابھی ان کی وزارت کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ انہوں نے رکن قومی اسمبلی عائلہ ملک سے شادی کر کے ایک اور دھماکہ کر دیا۔ عائلہ ملک، سابق گورنر مغربی پاکستان نواب کالا باغ ملک امیر محمد خان کی پوتی اور سابق صدر پاکستان سردار فاروق احمد لغاری کی بھانجی ہیں (۱۶)

سردار یار محمد رند کی صاحبزادے خان محمد رند ہیں جو ۲۰۰۱ء میں بولان کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے تھے۔ ۲۰۰۵ء میں وہ اس عہدے کے لیے دوسری مرتبہ منتخب ہوئے (۱۷)

سردار یار محمد رند کے بھائی سردار شیر محمد رند نواب شاہ میں قیام پزیر ہیں اور سندھ میں آباد رند بلوچوں کے سردار ہیں (۱۸)

بلوچستان میں رند قبیلے کے ایک اور فرد محمد علی رند بھی خاصے عرصہ سے صوبائی سیاست میں متحرک ہیں۔

وہ ۱۹۸۵ء میں پی بی ۳۹ تربت ۳ سے صوبائی اسمبلی کے امیدوار تھے مگر بد قسمتی سے عام انتخابات میں تو کامیاب نہ ہو سکے البتہ ضمنی انتخاب میں صوبائی اسمبلی تک پہنچنے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ بعد ازاں وہ صوبائی کابینہ کے رکن بھی رہے۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر بد قسمتی سے وہ اس مرتبہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۹)

۱۹۹۰ء میں وہ ایک مرتبہ پھر اسی حلقے سے صوبائی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار بنے۔ اس مرتبہ انہیں پاکستان نیشنل پارٹی (پی این پی) کا ٹکٹ حاصل تھا اس انتخاب میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر نہ صرف صوبائی اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی بلکہ صوبائی وزیر بھی بنے۔ (۲۰) تاہم ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے اور اپنے حریف محمد اکرم سے، جنہیں بلوچستان نیشنل مومنٹ نے ٹکٹ دیا تھا، ۳۹۸ ووٹوں سے شکست کھا گئے (۲۱)

۱۹۹۷ء میں محمد علی رند ایک مرتبہ پھر بلوچستان اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے (۲۲) تاہم ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

اکتوبر ۲۰۰۵ء میں محمد علی رند کے صاحبزادے عبدالرؤف رند تربت کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے ہیں (۲۳)

حوالہ جات

۱۔ جسٹس میرا خدا بخش بجارانی مری۔ بلوچستان تاریخ کے آئینے میں۔ ترجمہ پروفیسر سعید احمد رفیق۔ کوئٹہ۔ ص ۵۲۵، ۵۲۶

۲۔ میر گل خاں نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۶۸

۳۔ اختر علی خاں بلوچ، بلوچستان کی نامور شخصیات۔ جلد اول۔ کراچی۔ ص ۱۶۶ تا ۱۶۷

۴۔ وکیل انجم۔ سیاستدانوں کی قلابازیاں۔ (حصہ اول)۔ لاہور۔ ص ۶۰۲

۵۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۳۵۴

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰ رمئی ۱۹۸۷ء

۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۴ راپریل ۱۹۹۲ء

۸۔ اختر بلوچ۔ مکتوب کوئٹہ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۰ تا ۱۶ راگست ۱۹۹۲ء۔ ص ۱۲

۹۔ ادارہ۔ وضاحت و معذرت۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۳۱ راگست تا ۶ رستمبر ۱۹۹۲ء۔ ص ۱۴

۱۰۔ روزنامہ جنگ۔ کراچی ۴ رمارچ ۱۹۸۸ء

۱۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۹۳

۱۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ راکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۲۳

۱۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۵۸

۱۴۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم ص ۱۰۰

۱۵۔ پلڈاٹ۔ پاکستان کی ۱۲ ویں قومی اسمبلی کے اراکین کی ڈائرکٹری۔ لاہور۔ ص ۵۴۱

۱۶۔ اٹس آل اے فیملی افیئر۔ پاکستان پنچ (انٹرنیٹ ایڈیشن)

۱۷۔ قومی تعمیر نو بیورو کی ویب سائٹ www.nrb. gov.pk

۱۸۔ ارشاد امین۔ پارلیمنٹ بک ۹۷ء (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۲۲۱

۱۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور ص ۴۱۹

۲۰۔ عزیز بھٹی۔ بلوچستان اسمبلی کا انتخابی جائزہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی ۲۸ راگست ۱۹۹۳ء

۲۱۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ راکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۵۹

۲۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ (جلد دوم) ص ۶۷۹

۲۳۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۷ راکتوبر ۲۰۰۵ء

رئیسانی

رئیسانی ایک براہوی قبیلہ ہے جو اپنی مورث اعلیٰ رئیس کی نسبت سے رئیسانی کہلاتا ہے۔ یہ قبیلہ افغان قوم تورترین سے تعلق رکھتا ہے جو قندھار سے نکل کر پشین کے راستے ہرنائی پہنچا۔ وہاں سے اس قبیلے کا مورث اعلیٰ قلات چلا گیا۔ چنانچہ اب تک اس خاندان کے کچھ افراد قندھار میں اور کچھ لوگ ہرنائی میں رہتے ہیں۔

رئیس کے چار بیٹے تھے۔ سیاہی' راؤسین' روستم اور سراج۔ رئیس کی اولاد ہونے سے ان کی قوم رئیسانی ہو گئی اور ان چار بھائیوں کی اولاد سیاہی زئی' راؤسین زئی' روستم زئی اور سراج زئی کہلانے لگی۔

قوم رئیسانی میں شروع شروع میں کوئی طریق سرداری رائج نہ تھا۔ میر نصیر خان کے زمانے میں' ہر قبیلے کا الگ الگ معتبر یا سرکردہ مقرر ہوئے اور یوں رئیسانی قوم کی سرداری راؤسین زئی کے کھیرا نامی شخص کے ہاتھ آئی۔ اس کے بعد یہ سرداری سراج زئی خاندان میں آ گئی اور سردار عمر خان رئیسانی قوم کے سردار بن گئے۔

سردار عمر خان کا پوتا سردار عبدالنبی خان تھا۔ اس کے زمانے میں براہوی اور بلوچوں کو دو دستوں میں تقسیم کیا گیا۔ قلات سے شمال میں رہنے والے قبیلوں کو سراوان اور جنوب میں آباد قبیلوں کو جھلاوان کا نام دیا گیا اور سردار عبدالنبی خان کو جو رئیسانی قوم کے سردار تھے۔ چیف آف سراوان' یعنی سراوان قبیلوں کا سردار کلاں بنا دیا گیا۔ (۱)

یوں خان آف قلات کے دربار میں رئیسانی قبیلے کے سردار کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ ۱۸۳۹ء میں جب انگریزوں نے خان قلات میر محراب خاں دوم کو شہید کر کے میر شاہنواز خاں کو اس کی گدی پر بٹھایا تو اس کی بیوی خدیجہ خاتون نے رئیسانی قبیلے کے سردار ملا محمد رئیسانی کے ہاں جو ان دنوں ملا محمد رئیسانی تھے' پناہ حاصل کی اور اسی عالم میں جنوری ۱۸۴۰ء میں ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام خداداد خان رکھا گیا۔ (۲)

۱۸۵۷ء میں میر خداداد خان اپنے سوتیلے بھائی میر نصیر خاں دوم کی وفات کے بعد خان قلات مقرر ہو گئے۔ ان کی تخت نشینی میں سردار سراوان سردار ملا محمد رئیسانی اور سردار جھالاوان سردار تاج محمد زرک زئی نے بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ (۳)

میر خداداد خان نے خاصی کم عمری میں ایک بڑا منصب سنبھالا۔ چنانچہ وہ اس منصب کا اہل ثابت نہ ہو سکا اور بہت جلد اپنے محسنوں کو اپنا دشمن بنا ڈالا۔ یوں ملا محمد رئیسانی کو ایک عرصہ تک غربت، جلاوطنی اور دربدری کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۶ء تک سردار ملا محمد رئیسانی نے میر خداداد خان کے خلاف متعدد بغاوتوں کی رہنمائی کی اور سخت لڑائیاں لڑیں۔ لیکن کسی موقع پر خان کے خلاف فیصلہ کن کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ بسا اوقات اس کے دوسرے ساتھی سرداروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ یکہ و تنہا بلوچستان کے منتخب علاقوں اور قندھار میں بھٹکتا رہا لیکن اس کا عزم متزلزل نہیں ہوا اور نہ کبھی اس نے اپنے مقصد کو نظرانداز کیا حتیٰ کہ انگریزی حکومت کی مداخلت پر اس نے خان میر خداداد خان پر غلبہ حاصل کر لیا۔ یہی اس کا منتہائے مقصد تھا۔ جسے حاصل کرنے کے بعد وہ اسی دن اپنے بڑے بیٹے میر اسد خاں کے حق میں اپنی مرضی و منشاء سے اپنی سرداری سے دستبردار ہو گیا اور باقی تمام عمر گوشہ نشینی میں بسر کی (۴)

یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو سر رابرٹ سنڈیمن بلوچستان میں گورنر جنرل کا پہلا ایجنٹ مقرر ہوا۔ رابرٹ سنڈیمن نے عہدہ سنبھالتے ہی خوانین اور سرداروں کی دوستی اور اعتماد حاصل کیا۔ بین القبائلی تنازعات کو منصفانہ طور پر جرگوں کے ذریعے فیصل کروایا اور مختلف قبائل کی باہمی دشمنیوں کو ختم کرنے کی حتی الوسع کوششیں کیں۔ (۵)

رابرٹ سنڈیمن نے اپنے عہد میں سردار اسد خان رئیسانی کو اپنا دست راست بنایا وہ ہر دورہ اور ہر مہم میں سردار اسد خان رئیسانی کو اپنے ہمراہ رکھتا تھا اور صلاح و مشورہ کیا کرتا تھا۔ انہی خدمات کے باعث سردار رئیسانی کو سی آئی ای کا خطاب عطا ہو اور جیکب آباد سندھ میں ایک جاگیر بخشی گئی۔ (۶)

رابرٹ سنڈیمن کی وفات (۲۹ر جنوری ۱۸۹۲ء) کے بعد بھی سردار اسد خان رئیسانی کی ان خدمات کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ رائے بہادر لالہ ہتو رام نے اپنی کتاب تاریخ بلوچستان میں لکھا ہے کہ اسی کے مشورے سے میر خداداد خان قلات کے تخت سے معزول ہوا اور میر محمود خان، جو کسی بھی طور پر اس کی جانشینی کا اہل نہیں تھا، اس کا جانشین بنا۔ جنوری ۱۸۹۴ء میں گورنر جنرل کے ایجنٹ سر جیمس براؤن نے اسے کے سی آئی ای کے تمغہ سے سرفراز کیا۔ اسی برس ستمبر کے مہینے میں وہ ایک مختصر عرصے کے بعد انتقال کر گیا۔ (۷)

اسد خاں رئیسانی کے بعد اس کا بیٹا میر غوث بخش سراوان کا سردار بنا۔ مگر اس کی کم عمری

کے باعث اس کے چچا میر مہر اللہ خاں رئیسانی کو اس کا نگراں مقرر کیا گیا۔ (۸) میر مہر اللہ خان رئیسانی بڑا باتدبیر، دلیر اور معاملہ فہم شخص تھا۔ ۱۸۹۷ء میں اس نے سراوان کے بعض دوسرے سرداروں اور قبائلی معتبرین کو اپنے ساتھ ملا کر انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی ایک اسکیم بنائی۔ لیکن اس بغاوت کا راز قبل ازوقت فاش ہونے کے باعث اسے گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ عرصے بعد میر مہر اللہ خاں رئیسانی کو میر محمود خان، خان قلات کی مداخلت پر رہائی ملی مگر بہت جلد اسے مکران کا ناظم الحکومت بنا کر روانہ کر دیا گیا۔ (۹)

میر غوث بخش رئیسانی کے بعد ان کا بیٹا میر اسد اللہ خان رئیسانی سراوان کا سردار بنا۔ ۱۹۲۲ء میں اسے نواب کا خطاب عطا ہوا۔ (۱۰) ۱۹۳۱ء میں جب میر یوسف علی خان مگسی نے "انجمن اتحاد بلوچاں" کی داغ بیل ڈالی تو میر اسد اللہ رئیسانی نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ (۱۱) میر اسد اللہ رئیسانی غیر منقسم ہندوستان کی کونسل آف اسٹیٹ کے رکن بھی تھے۔ (۱۲) قیام پاکستان کے وقت وہ بلوچستان دار الامراء کے رکن تھے۔ (۱۳)

۱۹۴۹ء میں میر اسد اللہ رئیسانی کی وفات کے بعد ان کی وراثت ان کے بیٹے میر غوث بخش رئیسانی نے سنبھالی۔ میر غوث بخش رئیسانی ۶ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو کنگ کے مقام پر پیدا ہوئے انہوں نے برصغیر کے بہترین تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے فوج سے ریٹائرمنٹ حاصل کی اور اپنے قبیلے کی سرداری سنبھالی۔ (۱۴)

تحریک پاکستان کے دنوں میں سردار غوث بخش رئیسانی، پاکستان کے زبردست حامی تھے۔ وہ بلوچستان مسلم لیگ کے فعال رکن تھے اور بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کے زبردست حامی تھے۔ (۱۵)

۱۹۵۶ء میں سردار غوث بخش رئیسانی مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس حیثیت میں انہوں نے مختلف مشاورتی کمیٹیوں میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں وہ بلوچستان اسمبلی کے رکن بنے۔ ۱۹۷۱ء میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ۲۹ر دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۲ر اپریل ۱۹۷۲ء تک بلوچستان کے پہلے سول گورنر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۷ر مئی ۱۹۷۲ء کو انہیں وفاقی وزیر خوراک و زراعت بنا دیا گیا۔ ۱۳ر فروری ۱۹۷۳ء تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ اسی سال انہیں پیپلز پارٹی بلوچستان کا صدر مقرر کیا گیا اور صوبائی کابینہ میں سینئر وزیر کا درجہ مل گیا۔ (۱۶) ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں وہ ایک مرتبہ پھر پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور محمد خان باروزئی کی کابینہ میں سینئر وزیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ (۱۷)

۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد وہ کچھ دن نظر بند رہے۔ پھر ایک طویل عرصہ تک

سیاست کے میدان سے دور رہے۔ ۱۹۸۳ء کے بلدیاتی انتخابات میں ان پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے اپنے مخالف رند قبیلہ کے ۸ افراد کو قتل کروایا ہے۔ چنانچہ اس الزام کے پیش نظر انہوں نے کچھ عرصہ افغانستان میں عالم جلا وطنی میں گزارا۔ (۱۸)

۱۹۸۶ء میں انہوں نے غلام مصطفیٰ جتوئی کی نیشنل پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور اس کی بلوچستان شاخ کے صدر بن گئے۔ ۲۶ رمئی ۱۹۸۷ء کو جب وہ کوئٹہ جا رہے تھے۔ ایک قاقلانہ حملے میں انہیں، ان کے پانچ محافظوں سمیت گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ (۱۹)

سردار غوث بخش رئیسانی کی ناگہانی وفات کے بعد ان کا ورثہ ان کے صاحبزادے محمد اسلم رئیسانی نے سنبھالا۔ وہ ۵ رجولائی ۱۹۵۵ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۷۹ء میں گریجویشن کیا اور پھر کئی اداروں میں ملازمت کی۔ ۱۹۸۳ء میں انہوں نے اپنے والد کے ہمراہ کچھ عرصہ جلا وطنی میں گزارا۔ ۱۹۸۷ء میں وہ اپنے والد کے قتل کے بعد چیف آف سراوان بنے۔

۱۹۸۸ء میں انہوں نے پاکستان نیشنل پارٹی کے ٹکٹ پر پی بی ۲۷ قلات ا سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۹۰ء میں وہ کچھ عرصہ کے لئے نگراں کابینہ میں زراعت اور لائیو اسٹاک کے محکموں کے وزیر رہے۔ (۲۰) ۱۹۹۰ء میں انہوں نے این اے ۲۰۴، قلات خاران سے قومی اسمبلی کا اور پی بی ۲۷ قلات ا سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی کے انتخاب میں وہ جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کے سید محمد صدیق شاہ سے شکست کھا گئے۔ لیکن صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں وہ اپنی نشست برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ (۲۱) ان انتخابات کے بعد جب میر تاج محمد جمالی نے صوبائی کابینہ تشکیل دی تو جناب اسلم رئیسانی اس کابینہ میں بطور وزیر خزانہ شامل ہوگئے۔ (۲۲) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں نواب محمد اسلم رئیسانی نے پی بی ۲۷ مستونگ سے اور ان کے بھائی میر لشکری خان رئیسانی نے پی بی ۲۴ بولان سے انتخاب لڑا اس انتخاب میں نواب اسلم رئیسانی کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا البتہ میر لشکری رئیسانی پہلی مرتبہ صوبائی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے (۲۳)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں میر لشکری رئیسانی اور نواب اسلم رئیسانی، دونوں ہی ناکام ہوئے (۲۴) ۲۰۰۶ء میں نواب اسلم رئیسانی نے قومی اور صوبائی، دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی کے انتخاب میں وہ سردار یار محمد رند سے شکست کھا گئے۔ تاہم صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ نواب اسلم رئیسانی نے یہ انتخابات پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹرین کے ٹکٹ پر لڑے تھے (۲۵)

حوالہ جات

ا۔ رائے بہادر لالہ ہتو رام۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۳۷۹ تا ۳۸۲

۲۔ ملک صالح محمد خاں لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے) کوئٹہ۔ ص ۴۳

۳۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۱۸۸
۴۔ ایضاً۔ ص ۳۱۸
۵۔ ایضاً۔ ص ۳۲۵، ۳۲۶
۶۔ رائے بہادر لالہ ہتو رام۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۳۸۵
۷۔ ایضاً۔ ص ۳۸۶
۸۔ ایضاً۔ ص ۳۸۶
۹۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۴۰۸، ۴۰۹
۱۰۔ ملک صالح محمد خاں لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے) کوئٹہ۔ ص ۱۵۳
۱۱۔ میر گل خاں نصیر۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۴۲۱
۱۲۔ تہور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ لاہور۔ ص ۱۴۴
۱۳۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ۔ کوئٹہ۔ ص ۸۰
۱۴۔ اردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ جلد اول۔ لاہور۔ ص ۶۸۹
۱۵۔ تہور علی خان۔ بائیوگرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ لاہور۔ ص ۱۴۴
۱۶۔ اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ جلد دوم۔ لاہور۔ ص ۱۰۴۲
۱۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۸/اپریل ۱۹۷۷ء
۱۸۔ خالد حسن۔ دی لبرل چیف آف ساراوان (نواب محمد اسلم رئیسانی)۔ فرائیڈے ٹائمنر۔ لاہور۔ ۱۸ تا ۲۴/فروری ۱۹۹۳ء۔ ص ۸
۱۹۔ اردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ جلد دوم۔ لاہور۔ ص ۱۰۴۲
۲۰۔ خالد حسن۔ دی لبرل چیف آف ساراوان (نواب محمد اسلم رئیسانی) فرائیڈے ٹائمنر۔ لاہور۔ ۱۸ تا ۲۴/فروری ۱۹۹۳ء۔ ص ۸
۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۹۴
۲۲۔ خالد حسن۔ دی لبرل چیف آف ساراوان (نواب محمد اسلم رئیسانی)۔ فرائیڈے ٹائمنر۔ لاہور۔ ۱۸/ تا ۲۴/فروری ۱۹۹۳ء۔ ص ۸
۲۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۵۵۳، ۱۵۵۴
۲۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ، جلد دوم۔ ص ۶۶۴، ۶۶۷
۲۵۔ ایضاً۔ رپورٹ آف دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء جلد دوم ص ۱۰۰، ۷۵۷

زہری

آبادی کے لحاظ سے زہری بلوچستان کا دوسرا بڑا قبیلہ ہے لیکن درجے کے لحاظ سے ان کے سردار کو جھالاوان کے تمام سرداروں میں اولیت حاصل ہے۔ اسے سر سرداران جھالاوان کا خطاب حاصل ہے اور جھالاوان کا زرد رنگ کا بیرق یا جھنڈا اس کے سر پر لہراتا ہے۔ زرک زئی اس قبیلے کا سردار خیل طائفہ ہے۔ روایت کے مطابق براہوئی اقتدار سے قبل قبیلے کی سرداری ذیلی قبیلہ موسیانی کے پاس تھی جو اس علاقے کے قدیم باشندے متصور ہوتے ہیں لیکن جب خوانین قلات نے اس علاقہ زہری پر قبضہ کر لیا تو اپنے ایک معتمد سردار میر زرک کو قبیلہ زہری کی سرداری پر فائز کر دیا۔ سردار زرک کی اولاد زرک زئی مشہور ہوئی اور جن کا سربراہ اب تک قبیلہ زہری کا سردار مقرر ہوتا چلا آ رہا ہے۔

زہری، بلوچوں کا وہ واحد قبیلہ ہے جو اپنے جد یا مورث اعلیٰ کی بجائے اپنے زیر سکونت علاقے کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح اس قبیلے کے بعض ذیلی قبائل مثلاً نیچاری، پندرانی اور ساسولی وغیرہ بھی علاقے کی نسبت ہی سے پکارے جاتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس سرزمین کے جس پر وہ اب بھی آباد ہیں، قدیم باشندے ہیں۔ مینگلوں یا رند و لاشار کی طرح وسط ایشیا یا اور کسی طرف سے آئے ہوئے لوگ نہیں ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بلوچوں کی آمد سے قبل اس سرزمین پر جسے ہم سطح مرتفع قلات کہتے ہیں ایک کوشانی خاندان کی حکومت تھی جو مش وارا (مشوا، شیوا یا سیوا جو ایک ہی نام مش وارا کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں) کے پرستار تھے۔ اس لئے شیوائی یا سیوائی کہلاتے تھے۔ سیوا ایک شخص کا نام نہیں بلکہ کوشانی حکمرانوں کا لقب تھا۔ آخری سیوا حکمران یا بادشاہ کا ایک قلعہ قلات کی پہاڑی پر تھا جو احمد زئی خاندان کے برسراقتدار آنے تک قلات سیوا کہلاتا تھا۔ دوسرا قلعہ نیچارہ میں تھا جو غالباً صدر مقام تھا اور تیسرا قلعہ زہری میں تھا جو سنگین قلات (پتھروں کا قلعہ) کہلاتا تھا اور جس میں سیوا کا ولی عہد شہزادہ مہر گل رہائش رکھتا تھا اور خضدار تک کے تمام علاقہ

اور درہ مولہ کا نگران اور حکمران تھا۔

ان تاریخی شواہد کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قبیلہ زہری دراصل ان قدیم کوشانیوں کی نسل سے بنا ہے جو سیوائی دور میں بھی یہاں پر آباد تھے۔

بلوچستان کے حکمران میر نصیر خان اول نے جب ساراوان اور جھالاوان کے قبائل کو لشکری بنیادوں پر منظم کیا تو دستہ جھالاوان کا زرد رنگ کا بیرق (جھنڈا) زہری کے سردار کو تفویض ہوا۔ خان کے دربار میں سردار زہری' خان کے بائیں ہاتھ پر جھالاوان کے سرداروں کی صف میں پہلا سردار ہوتا تھا اور سر سرداران جھالاوان کہلاتا تھا۔ (۱)

بلوچستان کی سیاست میں زہری قبیلے کو صحیح معنوں میں عروج میر نصیر خاں دوم کے عہد میں ہوا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ زہری قبیلے کے سردار سردار تاج محمد زرک زئی کی ہمشیرہ بی بی مراد بی بی کی شادی میر نصیر خاں دوم سے ہوئی تھی۔ اس رشتے کے باعث سردار تاج محمد زرک زئی نے میر نصیر خاں دوم کے دربار میں کافی اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔

میر نصیر خان دوم نے ۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا سوتیلا بھائی خان میر خداداد خان' خان آف قلات بنا۔۔ خان میر خداداد خان کی منگنی سردار تاج محمد زرک زئی کی بیٹی بی بی جان بی بی سے ہوئی تھی تاہم ۱۸۶۱ء میں میر خداداد خان نے اپنے سوتیلے بھائی میر نصیر خاں دوم کی بیوہ اور سردار تاج محمد زرک زئی کی ہمشیرہ بی بی مراد بی بی سے شادی کر لی۔ خداداد خان کی اس حرکت کا تاج محمد زرک زئی نے بہت برا منایا اور اسے اپنی بے عزتی پر محمول کیا۔ بعض دوسرے سرداروں نے بھی اس مسئلے میں سردار تاج محمد زرک زئی کی حمایت کا اعلان کر دیا یوں میر خداداد خان کے خلاف ایک بغاوت کی سی کیفیت کا آغاز ہو گیا۔

اس بغاوت کے نتیجے میں میر خداداد خان کچھ عرصہ کے لئے تخت سے معزول بھی ہوا مگر ۱۸۶۴ء میں وہ اپنا کھویا ہوا تخت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی اثناء میں بی بی مراد بی بی کا انتقال ہو چکا تھا چنانچہ میر خداداد خاں نے سردار تاج محمد زرک زئی کی بیٹی بی بی جان بی بی سے شادی کر لی۔ مگر میر خداداد خاں اور سردار تاج محمد زرک زئی کے تعلقات میں جو گرہ پڑ چکی تھی وہ اخیر دم تک جاری رہی۔

خان میر خداداد خان کی معزولی میں بھی اسی کی سازش کار فرما تھی۔ ۱۸۶۶ء میں اس نے ایک مرتبہ پھر میر خداداد خان کو قتل کرنے کی سازش تیار کی۔ مگر اس مرتبہ بھی ستارے میر خداداد خان کے حق میں تھے اس بار سردار تاج محمد زرک زئی گرفتار ہوا اور حالت قید ہی میں ۱۸۶۷ء میں فوت ہوا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسے خان میر خداداد خان کے حکم سے ہی گلا گھونٹ کر مروا دیا گیا۔ اس کی موت پر انگریزی حکومت کے نمائندے متعینہ قلات مسٹر ایچ گرین نے حکومت ہند کو لکھا "ایک چیز شک سے بالاتر ہے کہ سردار تاج محمد جیسا خطرناک' سازشی اور اپنی حکومت کا

غدار' ایشیا کے کسی دربار میں نہیں ہے۔ جب تک وہ زندہ رہتا' خان کی پوزیشن کبھی محفوظ نہ رہتی۔" (۲)

سردار تاج محمد زرکزئی کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے اس کی وفات کے بعد میر خداداد خان نے چاہا کہ میر خداداد خان کا بیٹا مصطفیٰ خاں جو تاج محمد زرکزئی کا نواسا تھا' اس کا جانشین بن جائے۔ مگر مصطفیٰ خان کی کم سنی اور تاج محمد زرکزئی کے رشتہ کے بھتیجے سردار گوہر خان زرک زئی کے دعوئ وراثت کے باعث یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ ۱۸۷۱ء میں گوہر خان نے قبیلہ زہری پر اپنی سرداری کا اعلان کر کے خان میر خداداد خان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

میر گوہر خان نے ۱۸۷۶ء تک خان میر خداداد خان کے خلاف پیہم لڑائیاں لڑیں تاآنکہ ۱۳؍ جولائی ۱۸۷۶ء کو سمجھوتہ مستونگ کی رو سے جو انگریزی حکومت کے نمائندے رابرٹ سنڈیمن کی کوششوں سے خان میر خداداد خان اور سرداران بلوچستان کے درمیان عمل میں آیا تھا۔ خان میر خداداد خاں نے اسے قبیلہ زہری کا سردار اور جھالاوان کا سر سرداران تسلیم کر لیا۔

سردار گوہر خان زرک زئی ایک بہادر بلوچ اور آزادی کا متوالا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنے حق کے لئے خان میر خداداد خان کے خلاف بغاوت کی اور پانچ سال تک مسلسل اس سے نبرد آزما رہا لیکن اس کے باوجود ایک بہادر بلوچ کی طرح اس کے دل میں خان کے لئے عزت و احترام کا جذبہ بدرجہ اتم موجود رہا۔ چنانچہ جب انگریزی حکومت نے خان میر خداداد خان کو گرفتار کر کے معزول کیا تو بلوچستان بھر میں سردار گوہر خان زرک زئی ہی پہلا شخص تھا جس نے انگریزی حکومت کے اس اقدام کو اپنی قومی توہین خیال کر کے اس کے خلاف نہ صرف صدائے احتجاج بلند کی۔۔ بلکہ شمشیر بکف ہو کر میدان جہاد میں کود پڑا۔ (۳)

سردار گوہر خان زرک زئی کے اس اقدام پر جھالاوان کے کسی بڑے سردار نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ اس کے برعکس میجر ٹیمپل پولیٹیکل ایجنٹ قلات کے گرد جمع ہو کر اس مرد مجاہد اور شمع آزادی کے پروانے کے خلاف کمربستہ ہوئے۔ (۴) انگریزی حکومت کے نمائندوں نے سردار گوہر خان کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے طرح طرح کے لالچ دیئے مگر جب اس پر انگریزوں کے کسی دام کا اثر نہیں ہوا تو انگریزوں نے اسے سرداری سے معزول کر کے اس کے بیٹے میر یوسف خان کو قبیلہ کا سردار مقرر کر دیا۔ میر یوسف خان چونکہ کمسن تھا اس لئے انگریزوں نے اسے تعلیم کے بہانے علی گڑھ بھیج دیا اور اس کے نام سے قبیلہ زہری کا انتظام انگریزوں کے مقرر کردہ افسران کے سپرد کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سردار گوہر خان کے اپنے خاندان اور قبیلہ کے معتبر اور لالچی افراد اس سے کٹ گئے یہاں تک کہ اس کا حقیقی بھائی میر پسند خاں بھی سرداری کے لالچ میں آکر اس کے خلاف انگریزی حکومت کے نمائندوں سے مل گیا۔

سردار گوہر خان اب انگریزی حکومت کے مقابلے میں تقریباً اکیلا رہ گیا تھا لیکن اس کے

باوجود اس کے پائے ثبات میں لغزش تک نہیں آئی اور اس کا سر انگریزی اقتدار کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں ہوا۔

انگریزی حکومت کے خلاف سردار گوہر خان کی سرگرمیاں کم ہونے کی بجائے جب اور زیادہ بڑھ گئیں تو انگریزوں نے ایک سیاسی حربے کے طور پر اس کے بیٹے میر یوسف خان کو علی گڑھ سے واپس طلب کیا اور اسے قبیلہ زہری کا سردار مقرر کر کے مارچ ۱۸۹۴ء میں زہری بھیج دیا۔ لیکن زہری پہنچ کر میر یوسف خاں انگریزی حکومت کا آلہ کار بننے کی بجائے اپنے مجاہد باپ سے جاملا اور اس طرح سردار گوہر خان کے خلاف انگریزی حکومت کا یہ وار بھی خالی گیا۔

انگریزوں کے پاس اب میر پسند خان ایک آخری ہتھیار تھا جسے وہ کامیابی کے ساتھ سردار گوہر خان کے خلاف استعمال کر سکتے تھے چنانچہ جولائی ۱۸۹۵ء میں میر پسند خان کو سردار مقرر کر کے انگریزی فوج کی معیت میں زہری روانہ کر دیا۔ میر پسند خان نے انگریزی فوج کی امداد سے اپنے بھائی اور بھتیجے کے خلاف متعدد لڑائیاں لڑیں۔ حتیٰ کہ گرماپ کے مقام سے انگریزی فوج اور اس کے حامی قبائلی لشکر نے میر گوہر خان اور اس کے بیٹے میر یوسف خان کو گھیر کر شہید کر دیا۔ (۵)

اب میر پسند خان جھالاوان کا سردار بنا۔ وہ کسی طرح بھی اتنی بڑی سرداری کا اہل نہیں تھا اور تمام امور انگریزوں کے اشاروں پر سر انجام دیتا تھا۔ بالاخر ایک وقت وہ آیا جب اس کا اپنا بیٹا میر خان محمد زرکزئی اس کے خلاف ہو گیا۔ علاقے کے دوسرے سرداروں نے بھی میر خان محمد کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ سردار پسند خان کو بھی میر خان محمد کے حق میں دستبردار ہونا پڑا یوں یکم نومبر ۱۹۱۱ء کو انگریزی حکومت نے میر خان محمد زرکزئی کو قبیلہ زہری کا سردار مقرر کر دیا اور ایک سال بعد اسے نواب کا خطاب بھی عطا کر دیا۔

سردار خان محمد انگریزوں کا شدید دشمن تھا۔ وہ اپنے تایا سردار گوہر خان زرک زئی کی طرح آزادی کا متوالا تھا۔ انگریز سمجھتے تھے کہ اسے سرداری اور خطاب کے ذریعہ اپنے دام میں لے آئیں گے مگر ان کا یہ خواب خواب ہی رہا۔

سردار خان محمد نے کچھ ہی عرصہ میں بلوچوں کو انگریزوں کے خلاف منظم کرنا شروع کیا۔ اس نے جھالاوان میں اسلحہ سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا جس میں ملکی ساخت کی توپیں اور بندوقیں بننے لگیں۔ (۶) رفتہ رفتہ سردار خان محمد کے گرد تقریباً دس ہزار بلوچوں کا ایک لشکر جمع ہو گیا۔ اس لشکر کے ساتھ نواب خاں نے قلات کا رخ کیا۔ اس کا ارادہ قلات کو فتح کر کے بلوچستان کی آزادی کا اعلان کرنے کا تھا۔ (۷) مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

۲۴ر اگست ۱۹۱۵ء کو نواب خان محمد نے گٹ زہری سے چند میل کے فاصلے پر کیمپ کیا' ان کا بھائی میر نوروز خان جو ان کو بہت عزیز تھا اور سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہا کرتا تھا' درپردہ

انگریزی حکومت کے ایجنٹوں کا آلہ کار بن چکا تھا۔ میر خان محمد کو اپنے بھائی کی غداری کا علم نہ تھا۔ اسی رات جبکہ دونوں بھائی ایک ہی خیمے میں سوئے ہوئے تھے۔ میر نوروز خاں نے اپنے مجاہد اور لشکر آزادی کے سالار بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود بھاگ کر زہری خاں موسیانی کے پاس بلبل کے قلعے میں چلا گیا۔ سردار زہری خاں موسیانی انگریزوں کے ساتھ ملا ہوا تھا اور میر نوروز خان کو نواب خان محمد کے خلاف اکسانے میں اس کا ہاتھ تھا۔

نواب خان محمد کی شہادت سے مجاہدین آزادی کی صفوں میں افراتفری مچ گئی۔ نوروز خان نے صرف اپنے عزیز بھائی کو شہید نہیں کیا بلکہ غلام بلوچستان کو ایک مرد مجاہد غازی اور جذبہ آزادی سے سرشار ایک ایسی ہستی سے محروم کر دیا جس کا نعم البدل مادر بلوچستان ابھی تک پیدا نہیں کر سکی۔ نواب خان محمد کی شہادت سے انگریزوں کو جو تقویت حاصل ہوئی اس کا اندازہ انگریز کرنل ڈیو کے اس جملے سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے نواب کی شہادت کی خبر سنتے ہی ادا کیا تھا۔ اس نے کہا تھا "آج بلوچستان ہمارا ہے" (۸)

سردار خان محمد زرکزئی کی شہادت کے بعد سردار رسول بخش زرکزئی جھالاوان کے سر سرداران کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں جب ریاست قلات کے وزیر اعظم سر میر شمس شاہ نے میر محمود شاہ کی جانشینی کے سوال پر میر محمد انور خان کی حمایت کی اور ان کے مخالفین انجمن اتحاد بلوچاں کے سرگرم اراکین میر یوسف علی خان عزیز مگسی، میر عبدالرحمٰن بگٹی، میر عبدالعزیز کورد، ملک فیض محمد یوسف زئی، محمد حسین عنقا اور ان کے رفقا نے میر محمد اعظم جان کو جانشین بنانے کے سوال پر تحریک چلائی تو پورے بلوچستان کے سردار دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان میں جو سردار شمس شاہ کے ساتھ تھے ان میں سردار رسول بخش زرک زئی کا نام سرفہرست تھا۔ یہ معرکہ میر محمد اعظم جان کے ہاتھ رہا اور جس دن وہ خان قلات کے عہدے پر فائز ہوئے اسی دن قلات کے عوام کی جاں شمس شاہ سے چھوٹ گئی۔ (۹)

یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا کہ سردار رسول بخش زرک زئی، رشتے میں میر یوسف علی خان عزیز مگسی کے ماموں تھے، اور اس جرگے کے بھی رکن تھے، جس نے میر یوسف علی خان کو ریاست قلات میں بغاوت پھیلانے کا مجرم قرار دیا تھا اور انہیں کچھ عرصے کے لئے گٹ زہری میں اپنے ماموں ہی کی نگرانی میں نظربند کر دیا تھا۔ (۱۰)

سردار رسول بخش زرک زئی کی وفات کے وقت ان کے بیٹے دودا خان کی کم عمری کے باعث سردار نوروز خان زرک زئی قبیلے کے نگراں سردار بنے۔ (۱۱) قیام پاکستان کے وقت وہ قلات اسٹیٹ اسمبلی کے دارالامراء کے رکن تھے اور انہوں نے پاکستان میں قلات کی شمولیت یا الحاق کی مخالفت میں تقریر بھی کی تھی (۱۲) کچھ عرصہ بعد دودا خان زرکزئی بالغ ہو گئے اور انہوں

نے قبیلے کی سرداری سنبھال لی (۱۳)
سردار نوروز خان زرک زئی نے اس وقت بڑی شہرت پائی جب ۱۹۵۸ء میں حکومت پاکستان نے خان آف قلات کے خلاف فوجی ایکشن کیا اور انہیں بغاوت کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ اسی اثناء میں تمام ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا اور فوجی حکومت نے جھالاوان پر باقاعدہ چڑھائی کر دی۔ اس واقعہ کی تفصیل خود خان آف قلات کی زبانی سنئے جو انہوں نے اپنی سوانح "مختصر تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ" میں رقم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"نواب نوروز خاں مرحوم نے اپنے جنگجو قبائل کے ساتھ سپاہیانہ شان و شوکت کے ساتھ زہری کے مشہور تاریخی مقام میر گھاٹ کو اپنا مستقر بنالیا۔ نواب نوروز خاں میں بلا کی خوداعتمادی اور استقلال تھا۔ ان کی عمر اگرچہ نوے سال سے متجاوز تھی۔ مگر عزم و ہمت میں وہ چٹان کی طرح مضبوط و مستحکم تھے۔ زہری چھوڑنے سے پیشتر انہوں نے فوجی حکام کو ایک یادداشت ارسال کی۔ کہ جب تک خاں اعظم کو باعزت واپس قلات نہیں لایا جاتا۔ اس وقت تک میں اور میرے قبائل ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی دیتے رہیں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ نواب کے مکان کو توپوں سے اڑا دیا گیا اور اس کا سامان اور تمام اثاثہ برباد کر دیا گیا۔ نواب نوروز خان' ایوبی آمریت کے خلاف بلوچ مجاہدین کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو غاروں میں پوشیدہ رکھ کر دشمن کا انتظار کرنے یا قوم پرست بلوچوں میں گھل مل جانے کیلئے بھیجتا رہا تاکہ موقع ملتے ہی وہ گوریلا قسم کی کارروائیاں کر سکیں۔ ایک اندازہ کے مطابق پہلے پہل ان کے ساتھ صرف چھ سو افراد تھے۔ مارشل لاء حکام کے لئے بلوچوں کی یہ مسلح کاروائیاں سخت تشویش کا باعث بن رہی تھیں۔ اس لئے انہوں نے قرآن حکیم کا واسطہ دے کر چند قبائلی سرداروں کو نواب موصوف کے پاس مع قرآن عظیم الشان بھیجا۔ کہ آپ کے تمام مطالبات پورے کئے جائیں گے اور آپ اس وقت ہمارے پاس بحیثیت ایک مہمان کے آ جائیں۔ چنانچہ قرآن حکیم کا یہ شیدائی مسلمان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ فوجی افسروں سے ملنے چلا آیا اور ان فوجیوں نے نواب نوروز خان اور اس کے رفقاء کو دھوکے سے راتوں رات فوجی پہرہ میں کوئٹہ کے رسوائے زمانہ قلی کیمپ میں دھکیل دیا۔" (۱۴)

خان آف قلات نے آگے چل کر قلی کیمپ کے اذیت کدے کا احوال بھی رقم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"نازی کیمپوں (کانسنٹریشن کیمپس) کی طرز پر کوئٹہ چھاؤنی میں رسوائے روزگار قلی کیمپ قائم کیا گیا قلی کیمپ میں رات دن بیدار رکھتے۔ رات بھر تھکائے رکھتے۔ بال اکھیڑنے' برف پر لٹانے' بجلی کے شاک دینے' چارپائی کے نیچے ہاتھ داب کر اذیت دینے' زدوکوب کر کے بے ہوش کرنے' اکڑوں کرنے' ڈاڑھی نوچنے' آنکھوں میں مرچیں چھڑکنے' پانی کے نلکے منہ میں ٹھونس کر تیز پانی چھوڑنے اور غلاظت منہ میں ڈالنے ایسی لرزہ خیز انسانیت سوز

اذیتیں دی جاتی رہیں اور انہیں مجبور کیا جاتا رہا کہ وہ بیان دیں کہ "خان پاکستان کے خلاف بغاوت کی تیاری کر رہا تھا۔ خان پاکستان کا غدار ہے اسے فلاں ملک سے امداد مل رہی تھی فلاں فلاں اس کے ساتھی تھے وغیرہ وغیرہ۔"

غیور اور باہمت بلوچوں نے اذیتیں سہیں موت کے منہ میں جاتے رہے۔ شرم ناک سزائیں جھیلتے رہے مگر ظالموں کے کہنے پر وہ جھوٹے افسانے نہ تراش سکے۔ اس کیمپ کی اذیتوں کی تاب نہ لا کر میرے کئی بھائی اللہ کو پیارے ہو گئے' مفلوج و معذور ہو گئے اندھے بہرے اور گونگے ہو گئے اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو گئے اس کیمپ میں جو میرے بھائی بچے اور ساتھی ابتلاء آزمائش میں پڑے ان نامور شخصیتوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں مجھے ان پر فخر ہے پوری قوم کو فخر ہے بلوچوں کی تاریخ کو فخر ہے اور ---- پاکستان کو بھی فخر ہے کہ بلوچوں نے اپنی قیمتی جانیں موت کے حوالے کر کے کروڑوں انسانوں کو آمریت کے خلاف صف آرا کر دیا اور ملک و قوم کو تباہ کن نحوستوں سے نجات دلائی۔" (۱۵)

حکومت پاکستان کے خلاف مسلح بغاوت کے الزام میں نواب نوروز خان زرک زئی کے بیٹے اور چھ دیگر افراد میر سبزل خان زرکزئی' میر بہاول خان زرک زئی' میر ولی محمد زرکزئی' میر ٹبے خان زرک زئی' میر جمال خاں نیچاری' مستی خان موسیانی اور میر غلام رسول نیچاری کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا اور یہ تمام کے تمام بلوچستان زندہ باد کا نعرہ بلند کرتے ہوئے پھانسی پر جھول گئے۔ (۱۶)

کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی گردن کے ساتھ قرآن مجید باندھا ہوا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ اگر ہمیں پھانسی دی جائے گی تو پھر قرآن کو بھی ضرور پھانسی دی جائے گی کیونکہ حکومت نے قرآن پر عہد کر کے اسے توڑا ہے۔ نوے سالہ نوروز خاں کو عمر قید کی سزا ملی تاہم وہ اپنی سزا مکمل ہونے سے پہلے ہی قید خانے میں چل بسا۔ مبینہ طور پر اس پر فوج نے تشدد کیا تھا (۱۷) اس واقعہ کے ایک طویل عرصہ بعد نواب خیر بخش مری نے ایک گفتگو کے دوران کہا۔

"جب نوروز خان پہاڑوں پر گیا تو وہ کیا چاہتا تھا؟ عبدالکریم کی طرح یقیناً مقصد مبہم تھا لیکن یہ بھی بلوچ ریاست کے قیام کی خواہش تھی۔ اس نے تکلیفیں جھیلیں اور ان کے "امان اور عام معافی" کے وعدوں پر یقین کیا لیکن کیا نتائج سامنے آئے؟ جو اس پر بیتی اس کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور آنے والی نسلوں پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ وہ پہاڑوں پر چلے گئے اور دوسرے قبائل نے ان کی تقلید بھی کی لیکن مجھے حیرت ہے کہ نوروز خان کے ذہن میں کیا تھا۔؟ وہ قوم پرستی کی اصطلاح میں تو شاید اس کی وضاحت نہیں کر سکتا تھا لیکن بہرحال یہ سب اس کی ثقافت اور شناخت کی حفاظت کے لئے تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ ضرور تھا کوئی خیال' کوئی تصویر' بلوچوں کی آزادی کے لئے۔" (۱۸)

ادھر نواب نوروز خان زرکزئی تو بلوچوں کی آزادی کے لئے موت کو گلے لگا رہے تھے۔ ادھر ان کے قبیلے کے سردار میر دودا خان زرک زئی' ایوب حکومت کے اشارے پر کام کر رہے تھے۔ انہیں ایوب حکومت کی مکمل سرپرستی حاصل تھی اور اسی سرپرستی کے باعث وہ ۱۹۶۲ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے تھے (۱۹) ۱۹۶۵ء میں وہ قلات حلقہ نمبر۵ سے میر غوث بخش بزنجو کو نوے ووٹوں سے شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن بھی بن گئے۔ (۲۰)

۱۹۷۰ء کی اسمبلی میں تو سردار میر دودا خان زرک زئی کا نام نظر نہیں آتا۔ تاہم ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں وہ پی پی ۳۰ قلات وخضدار سے بلوچستان اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب رہے (۲۱) ان کا نام اس مجلس شوریٰ کے ارکان میں نظر آتا ہے جسے جنرل ضیاء الحق نے ۲۴ر دسمبر 1981ء کو نامزد کیا تھا (۲۲) چند ماہ بعد ۸ر جون ۱۹۸۲ء کو ایک حادثہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (۲۳)

سرادار دودا خان زرک زئی کے بعد ان کے بیٹے میر رسول بخش زرک زئی قبیلے کے سردار بنے۔ مگر انہیں ۱۹۸۴ء میں کوئٹہ میں واقع زہری ہاؤس میں اُس وقت موت کی گھاٹ اتار دیا گیا جب وہ اپنے خاندان کے مخالف افراد کے ساتھ صلح کی گفتگو کر رہے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے میر قطب کو قبیلہ کا سردار بنایا گیا مگر اس کی کم عمری کے پیش نظر ان کے نانا میر احمد خان زرکزئی کو نگران سردار بنا دیا گیا۔ (۲۴)

میر احمد خان زرکزئی' سردار نوروز خاں زرکزئی کے صاحبزادے ہیں وہ ۱۹۸۵ء میں پی پی ۲۹ قلات بشمول خضدار سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تاہم ۱۹۸۸ء میں وہ جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمٰن گروپ کے مولوی غلام مصطفیٰ زہری سے شکست کھا گئے (۲۵) میر احمد خان زرکزئی نے بعد ازاں بلوچستان نیشنل موومنٹ میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۹۰ء میں ایک مرتبہ پھر اسی حلقہ سے صوبائی اسمبلی کیلئے امیدوار بنے۔ تاہم اس مرتبہ بھی وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے اور اس حلقے سے ان کے ہم قبیلہ اور سردار دودا خان کے صاحبزادے میر اسرار اللہ زہری کامیاب ہو گئے۔ (۲۶) ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں بھی اسرار اللہ زہری نے کامیابی حاصل کی ان کا حلقہ انتخاب وہی پرانا یعنی پی پی ۲۹ قلات تھا۔(۲۷) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں بھی اسرار اللہ خان زہری اسی حلقے سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۸) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا تاہم مارچ ۲۰۰۶ء میں وہ بلوچستان کی جنرل نشستوں پر سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے ہیں(۲۹)

میر اسرار اللہ زہری کے بڑے بھائی میر ثنا اللہ زہری اس وقت قبیلے کے سردار ہیں (۳۰)وہ خضدار سے ۱۹۸۸ء' ۱۹۹۰ء' ۱۹۹۳ء' اور ۲۰۰۲ ء میں بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۸ء کا انتخاب انہوں نے آزاد امیدوار کے طور پر لڑا تھا(۳۱) ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء میں انہیں پاکستان نیشنل پارٹی (پی این پی) کی حمایت حاصل تھی (۳۲) جبکہ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں انہوں نے

بلوچستان نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی (۳۳)

۱۹۹۰ء کے انتخابات کے بعد قائم ہونے والی میر تاج محمد جمالی کی کابینہ میں میر ثناء اللہ زہری بلدیاتی امور کے وزیر کی حیثیت سے شامل تھے۔ جبکہ ان کے چھوٹے بھائی اسرار اللہ زہری کے پاس صحت کا قلم دان تھا۔ (۳۴)

مئی ۱۹۹۳ء میں جب میر تاج محمد جمالی نے وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دیا تو اسمبلی کے جن ارکان کے نام متوقع وزرائے اعلیٰ کے طور پر لئے جا رہے تھے ان میں ثناء اللہ زہری بھی شامل تھے مگر جب یہ ہما نواب ذوالفقار علی مگسی کے سر پر بیٹھا تو ابتدائی رائے شماری میں تو ثناء اللہ زہری نے ان کے حق میں ووٹ نہیں دیا (۳۵) مگر جب ۱۵ر جون ۱۹۹۳ء کو ذوالفقار مگسی نے ایوان سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا تو انہیں ووٹ دینے والوں میں ثناء اللہ زہری کا نام بھی شامل تھا۔ (۳۶) ۱۹۹۳ء کے انتخابات کے بعد ثناء اللہ زہری اور اسرار اللہ زہری دونوں وزارت پر فائز ہو گئے انہیں بالترتیب بلدیات اور زراعت کے قلمدان سونپے گئے (۳۷)

میر ثنا اللہ زہری نے ۱۹۹۷ء کے انتخاب میں بی این پی کے ٹکٹ پر حصہ لیا تھا مگر جمیعت علمائے اسلام (افضل الرحمن گروپ) کے عبدالخالق سے شکست کھا گئے (۳۸) اسی برس وہ چھ برس کے لئے سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے (۳۹)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں میر ثنا اللہ زہری نے قومی اسمبلی کا انتخاب بھی لڑا تھا مگر اس انتخاب میں وہ متحدہ مجلس عمل کے مولانا عبد الغفور حیدری سے بری طرح شکست کھا گئے تھے (۴۰) تاہم جیسا کہ اوپر بیان کی جا چکا ہے ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ نہ صرف صوبائی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوئے بلکہ صوبائی کابینہ میں بھی شامل کئے گئے (۴۱)

میر ثنا اللہ زہری نے ۲۰۰۵ کے لوکل باڈیز انتخابات میں اپنے دو بھائیوں میر نعمت اللہ زہری اور میر ظفر اللہ کو بھی ضلعی ناظم کا انتخاب لڑوایا۔ ان میں سے میر نعمت اللہ زہری، خان آف قلات کے چھوٹے بھائی کو شکست دے کر دوبارہ قلات کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے جبکہ میر ظفر اللہ زہری خضدار کی نشست پر سردار نصیر احمد موسیٰنی سے شکست کھا گئے (۴۲)

زہری خاندان ہی کے ایک اور فرد میر نبی بخش زہری نے بھی ایک طویل عرصہ سیاست میں گزارا۔ وہ سنگ مرمر کے بہت بڑے ایکسپورٹر تھے اور کنگ آف ماربل کہلاتے تھے۔ وہ پہلی بار ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اسمبلی میں ڈپٹی لیڈر بھی رہے۔ ۱۹۶۵ء میں وہ قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ ۱۹۷۳ء میں وہ پاکستان کی پہلی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں وہ ایک مرتبہ پھر سینیٹر بننے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ۱۹۹۱ء تک اس نشست پر فائز رہے (۴۳) میر نبی بخش زہری، سردار محمد اکبر بگٹی کے سمدھی اور سلیم اکبر بگٹی کے سسر تھے۔ (۴۴) جبکہ ۱۹۹۷ء میں این

اے ۱۹۷۱ء کوئٹہ چاغی سے کامیاب ہونے والے سردار عاطف علی سنجرانی ان کے نواسے تھے (۴۵)
۸ر نومبر ۲۰۰۱ء کو میر نبی بخش زہری کا انتقال ہو گیا (۴۶)

حوالہ جات

۱- میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۴۹ تا ۱۵۲
۲- میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (اول، دوئم)۔ کوئٹہ۔ ص ۱۸۷ تا ۲۱۰، ۳۱۷، ۳۱۸
۳- ایضاً۔ ص ۲۳۲، ۲۳۳
۴- میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۸۸
۵- میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (اول، دوئم)۔ کوئٹہ۔ ص ۳۴۳
۶- ایضاً۔ ص ۳۷۶، ۳۷۸
۷- میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۹۷
۸- میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (اول، دوئم)۔ کوئٹہ۔ ص ۳۸۱، ۳۸۲
۹- ایضاً۔ ص ۴۲۰، ۴۲۲
۱۰- میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۳۰۸، ۳۰۹
۱۱- عزیز بھٹی۔ قبائلی شخصیات کا قتل، تشویشناک صورتحال۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۱۹ر جون ۱۹۹۲ء
۱۲- احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ۔ کوئٹہ۔ ص ۸۰، ۱۲۴، ۱۲۵
۱۳- الطاف حسن قریشی۔ بلوچستان کے بائیس برس۔ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۲۷
۱۴- احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ۔ کوئٹہ۔ ص ۱۸۴
۱۵- ایضاً۔ ص ۱۸۶
۱۶- ایضاً۔ ص ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۰
۱۷- احمد سلیم۔ بلوچستان، صوبہ مرکز تعلقات۔ لاہور۔ ص ۲۷
۱۸- سلیگ ہیریسن بلوچ قومی تحریک۔ مترجم مسعود بخاری۔ کوئٹہ۔ ص ۶۶
۱۹- راشد سعید۔ سیاسی زندان نامہ۔ لاہور۔ ص ۱۱۳
۲۰- روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۶۵ء
۲۱- گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۴ر مارچ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۳۶۸
۲۲- روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۵ر دسمبر ۱۹۸۱ء

۲۳۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات مشاہیر پاکستان۔ اسلام آباد۔ ص ۷۸
۲۴۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ، روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰رمئی ۱۹۸۷ء
۲۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۱۶
۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۴۸۲
۲۷۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷راکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۵۵
۲۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۶۶۹
۲۹۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۱۰رمارچ ۲۰۰۲ء
۳۰۔ اختر علی خان بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد سوم)۔ کراچی۔ ص ۱۱۶
۳۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء لاہور۔ ص ۴۱۶
۳۲۔ عزیز بھٹی۔ بلوچستان اسمبلی کا انتخابی جائزہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۶راگست ۱۹۹۳ء
۳۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد دوم۔ ص ۳۵۶
۳۴۔ موسیٰ خان جلال زئی۔ کون کون ہے اور کیا کیا ہے؟ لاہور۔ ص ۴۸۹
۳۵۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ۔ ۳۱رمئی ۱۹۹۳ء
۳۶۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۶رجون ۱۹۹۳ء
۳۷۔ ڈوگر برادرز۔ پاکستان اور دنیا میں کون کیا ہے ۱۹۹۴ء۔ لاہور۔ ص ۶۴
۳۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۶۷۰
۳۹۔ پارلیمینٹ ہاؤس، اسلام آباد، سینٹ آف پاکستان، ڈائرکٹری آف ممبرز (چوتھا ایڈیشن) ص ۴۲۔
۴۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۰
۴۱۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص ۳۱۶
۴۲۔ روزنامہ ڈان کراچی، ۷ راکتوبر ۲۰۰۵ء
۴۳۔ پارلیمینٹ ہاؤس۔ اسلام آباد۔ سینٹ آف پاکستان۔ ڈائریکٹری آف ممبرز (اشاعت اول) ۱۹۹۱ء۔ ص ۲۵
۴۴۔ محمود غزنوی۔ قبضہ گروپ کی کابینہ (خصوصی رپورٹ) ہفت روزہ حرمت، اسلام آباد، ۱۴رتا ۲۰ر مئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۴
۴۵۔ ارشاد امین۔ پارلیمینٹ بک ۹۷ء، (جلد اول)۔ لاہور۔ ص ۲۱۷
۴۶۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ۔ وفیات ناموران پاکستان۔ لاہور۔ ص ۸۷۳

کھوسہ

کھوسہ رند بلوچوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ وہ میر جلال خان کے ایک بیٹے ہوت کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور بلوچستان کے علاوہ سندھ اور پنجاب میں بھی آباد ہیں۔ (۱) بلوچستان میں وہ زیادہ تر سبی، قلات، مکران، لسبیلہ اور لورالائی میں پائے جاتے ہیں (۲)۔

ان کی وجہ تسمیہ کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ یہ "کوہ ساغ" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس کے لغوی معنے پہاڑی کتے کے ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ قبیلہ پہاڑوں میں رہزنی کر کے اپنی گزر اوقات کرتا تھا اس لئے انہیں یہ خطاب عطا ہوا۔ رفتہ رفتہ کوہ ساغ کھوسہ میں بدل گیا۔ مگر خود کھوسہ قبائل کے لوگ اس تاویل کو درست نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے ان کے قبیلے کا اصل نام "کوہ سر" تھا۔ جس کے معنے ہیں "پہاڑوں کے بلند ترین مقام پر رہنے والا۔" یہی کوہ سر مرور زمانہ سے کھوسہ ہو گیا۔ (۳) پروفیسر انور رومان نے بلوچستان کے قبائل میں لکھا ہے کہ "کوہ سر" اس قبیلے کے بانی کا نام تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ انہیں کبھی کبھی مہانا (کشتی بان) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں سے چند نے کسی وقت میر چاکر کو اپنی کشتیوں پر دریائے سندھ عبور کروایا تھا۔ کھوسہ قبیلے کی تین شاخیں ہیں بلیلانی، خلولانی اور عمرانی۔ (۴)

بلوچستان میں آباد کھوسہ قبیلے کے افراد ملکی سیاست میں بہت زیادہ فعال نہیں۔ اس قبیلے کے اقبال احمد کھوسہ ۱۹۸۵ء میں اور میر نبی بخش کھوسہ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۵ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ اس انتخاب میں اقبال احمد کھوسہ کا جھکاؤ کھوسوں سے کہیں زیادہ جمالیوں کی طرف تھا۔ جبکہ میر نبی بخش کھوسہ کا مقابلہ جماعت اسلامی کے صوبائی سیکرٹری جنرل امان اللہ خان بلوچ نے کیا تھا۔ (۵)

میر نبی بخش کھوسہ نے ۱۹۸۵ء میں انتخاب آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑا تھا مگر بعد میں وہ مسلم لیگ میں چلے گئے۔ ۲۹ر مئی ۱۹۸۸ء کو اسمبلیوں کی تحلیل اور میر ظفر اللہ جمالی کے نگراں وزیر اعلیٰ بننے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے علاقائی حریف میر ظفر اللہ جمالی انہیں اس

علاقے کی نمائندگی سے محروم کردیں گے۔ چنانچہ انہوں نے مسلم لیگ کو چھوڑا اور پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کردیا۔ پیپلزپارٹی نے انہیں قومی اسمبلی کی نشست این اے ۲۰۳ جعفر آباد تمبو پر اپنا نمائندہ نامزد کردیا۔ یہ انتخاب میر ظفراللہ جمالی جیت گئے۔ مگر جب انہوں نے بلوچستان کی وزارت اعلیٰ کے حصول کے لئے قومی اسمبلی کی نشست خالی کی اور اس نشست پر ضمنی انتخاب منعقد ہوا تو اس موقع پر میر نبی بخش کھوسہ قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۶)

میر نبی بخش کھوسہ نے ۱۹۸۵ء میں انتخاب آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑا تھا مگر بعد میں وہ مسلم لیگ میں چلے گئے۔ ۲۹رمئی ۱۹۸۸ء کو اسمبلیوں کی تحلیل اور میر ظفراللہ جمالی کے نگراں وزیر اعلیٰ بننے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے علاقائی حریف میر ظفراللہ جمالی انہیں اس علاقے کی نمائندگی سے محروم کردیں گے۔ چنانچہ انہوں نے مسلم لیگ کو چھوڑا اور پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کردیا۔ پیپلز پارٹی نے انہیں قومی اسمبلی کی نشست این اے ۲۰۳ جعفر آباد تمبو پر اپنا نمائندہ نامزد کردیا۔ یہ انتخاب میر ظفراللہ جمالی جیت گئے۔ مگر جب انہوں نے بلوچستان کی وزارت اعلیٰ کے حصول کے لیے قومی اسمبلی کی نشست خالی کی اور اس نشست پر ضمنی انتخاب منعقد ہوا تو اس موقع پر میر نبی بخش کھوسہ قومی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ (۶)

میر نبی بخش کھوسہ نے ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں بھی پی ڈی اے کے ٹکٹ پر حصہ لیا۔ اس مرتبہ بھی ان کے مضبوط ترین حریف ظفراللہ جمالی ہی تھے۔ میر نبی بخش کھوسہ غیر متوقع طور پر یہ انتخاب تقریباً ساڑھے چار ہزار ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے۔ (۷) یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ ۱۹۸۸ء کے ضمنی انتخابات کے موقع پر نبی بخش کھوسہ نے ایک قبائلی جرگہ کے سامنے عہد کیا تھا کہ اگر ظفراللہ جمالی انہیں ضمنی انتخابات میں کامیاب ہونے کا موقع فراہم کردیں تو وہ آئندہ انتخاب میں جمالی صاحب کے مقابلے میں کھڑے نہیں ہوں گے مگر اس کے برعکس جب وہ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں دوبارہ کھڑے ہو گئے تو جرگہ نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔ میر نبی بخش کھوسہ نے کہا انہیں ان کا وعدہ یاد ہے۔ مگر اس کے ایفا کی شرط یہ ہے جمالی صاحب پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوجائیں۔ چونکہ جمالی صاحب کو یہ عجیب شرط قبول نہ تھی اس لیے یہ روایتی حریف ایک مرتبہ پھر انتخابی میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ (۸) اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا' یہ معرکہ کھوسہ صاحب کے ہاتھ رہا۔ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں یہ دونوں روائتی حریف ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کے مدمقابل آئے۔ اس مرتبہ ظفراللہ جمالی آزاد امیدوار کی حیثیت سے اور میر نبی بخش کھوسہ حسب سابق پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑرہے تھے۔ (۹) یہ معرکہ ظفراللہ جمالی نے جیتا (۱۰) اور یوں تین سال پرانی شکست کا حساب چکا دیا۔

۱۹۹۷ء کے انتخابات سے پیشتر ۱۳رجنوری ۱۹۹۷ء کو میر نبی بخش کھوسہ انتقال کرگئے اور یوں ان

کا سیاسی سفر اپنے اختتام کو پہنچا(۱۱)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں این اے ۲۰۳ جعفر آباد کم نصیر آباد سے میر نبی بخش کھوسہ کی نشست پر پی این پی کے ٹکٹ پر اظہار حسین کھوسہ نے جمعیت علمائے اسلام (ف) کے ٹکٹ پر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کھوسہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر محمد صادق عمرانی نے جمہوری وطن پارٹی کے ٹکٹ پر منظور احمد کھوسہ نے انتخاب لڑا مگر تمام امیدوار میر ظفراللہ جمالی کے صاحبزادے فرید اللہ خان جمالی سے شکست کھا گئے (۱۲) واضح رہے کہ اس وقت میر ظفراللہ خان جمالی بلوچستان کے نگراں وزیراعلیٰ تھے(۱۳) ۲۰۰۲ء میں اس نشست پر خود میر ظفراللہ جمالی جیتے اور دوسرے نمبر پر منور علی کھوسہ آئے جو پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے(۱۴)

جب میر نبی بخش کھوسہ نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنا شروع کیا تو ان کی صوبائی نشست پی بی ۲۲، جعفر آباد تمبو پر میر ظہور حسین کھوسہ نے کامیاب ہونا شروع کردیا۔ انہوں نے اس نشست پر ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء تینوں انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ پہلی مرتبہ انہیں بلوچستان نیشنل الائنس کی (۱۵) اور دوسری اور تیسری مرتبہ جمہوری وطن پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ (۱۶) مئی ۱۹۹۳ء میں میر تاج محمد جمالی کے استعفیٰ کے بعد میر ظہور حسین کھوسہ کا نام اپوزیشن کی جانب سے وزارت اعلیٰ کے متوقع امیدواروں میں شامل تھا۔ تاہم یہ بازی ذوالفقار علی مگسی نے بلامقابلہ جیت لی۔(۱۷)

۱۹۹۷ء میں اس نشست پر ظہور حسین کھوسہ جیتے (۱۸) ۲۰۰۲ء میں میر منظور احمد کھوسہ کے صاحبزادے سلیم احمد کھوسہ نے پی بی ۲۷ نصیر آباد ۳ سے بلوچستان اسمبلی کا انتخاب جیتا۔ ان کا تعلق جمہوری وطن پارٹی سے تھا(۱۹)۔

کھوسہ قبیلے کے ایک اور فرد سہراب خان کھوسہ بھی سیاست کے میدان میں ہیں۔ وہ ڈسٹرکٹ کونسل کے چیئرمین رہ چکے ہیں اور ۱۹۸۸ء میں سینٹ کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۲۰)

جعفر آباد، تمبو کے علاقے میں کھوسہ قبیلے کی شاخ عمرانی کے بعض افراد بھی سیاست میں پیش پیش رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نام سردار فتح علی عمرانی اور محمد صادق عمرانی کے ہیں جو پی بی ۲۳ تمبو کو اپنی معرکہ آرائی کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ سردار فتح علی عمرانی نے ۱۹۸۵ء میں اس نشست پر آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب رہے۔ بعد میں وہ پاکستان مسلم لیگ میں چلے گئے(۲۱) ۱۹۸۸ء میں انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت حاصل تھی مگر اس مرتبہ وہ اس نشست پر اپنے ہم قبیلہ محمد صادق عمرانی کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ جو لڑے تو آزاد امیدوار کی حیثیت سے تھے مگر انہیں واضح طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی (۲۲) ۱۹۹۰ء میں سردار فتح علی عمرانی نے جمہوری وطن پارٹی اور محمد صادق عمرانی نے پی ڈی اے کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لیا۔ اس مرتبہ یہ معرکہ سردار فتح علی عمرانی کے ہاتھ رہا۔ اور وہ بآسانی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے (۲۳)

سردار فتح علی عمرانی نے کچھ عرصہ بعد بعض اختلافات کی بنا پر جمہوری وطن پارٹی سے استعفیٰ دے دیا تھا اور صوبائی وزارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تاہم میر تاج محمد جمالی کے مستعفی ہونے کے بعد وہ دوبارہ جمہوری وطن پارٹی میں چلے گئے۔ میر ذوالفقار علی مگسی کے اعتماد ووٹ دینے والوں میں وہ بھی شامل تھے۔ (۲۴) ۱۹۹۳ء میں سردار فتح علی عمرانی اور سردار صادق عمرانی ین ایک مرتبہ دوسرے کا مقابلہ کیا۔ اس مرتبہ معرکہ صادق عمرانی کے ہاتھ رہا (۲۵) جو پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے۔

۱۹۹۷ء میں محمد صادق عمرانی نے حسب سابق پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر جیسا کہ اوپر بیان ہوا وہ اس وقت کے نگراں وزیراعلیٰ میر ظفراللہ خان جمالی کے صاحبزادے فرید اللہ خان جمالی کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ وہ صوبائی اسمبلی کی نشست پر بھی امیدوار تھے مگر اس نشست پر بھی وہ سردار فتح علی خان عمرانی کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے (۲۶)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں محمد صادق عمرانی دو حلقوں سے صوبائی اسمبلی کی نشست کے امیدوار تھے مگر ایک پر وہ جمہوری وطن پارٹی کے سید ممتاز حسین شاہ سے بری طرح شکست کھا گئے جبکہ دوسری نشست پر انہیں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے عبدالغفور لہڑی نے ہرادیا (۲۷)

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر ایم انور رومان۔ بلوچستان کے قبائل (ضلعی گزیٹر سے انتخاب)۔ حصہ دوم۔ کوئٹہ۔ ص ۱۴۹

۲۔ ملک صالح محمد خاں لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔ کوئٹہ۔ ص ۳۹

۳۔ شیخ صادق علی شیر علی انصاری۔ دی مسلمان ریسز فاؤنڈ ان سندھ بلوچستان اینڈ افغانستان کراچی۔ ص ۲۴

۴۔ پروفیسر ایم انور رومان۔ بلوچستان کے قبائل (ضلعی گزیٹر سے انتخاب)۔ حصہ دوم۔ کوئٹہ۔ ص ۱۴۹۔ ۱۵۰

۵۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰ مئی ۱۹۸۷ء

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۴۰۲، ۴۳۱

۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۹۳

۸۔ اختر بلوچ۔ انتخابی معرکہ میں زور آزمائی کا مرحلہ (مکتوب کوئٹہ)۔ ہفت روزہ اخبار جہاں۔ کراچی۔ ۲۴ تا ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۶۳

۹۔ فیاض حسین سجاد۔ مقابلہ سخت ہوگا۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۰۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۳۲۴

۱۱۔ حافظ نسیم الدین، پاکستان کے ماہ وسال، کراچی۔ ص۴۰۷

۱۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم، ص ۱۶۰

۱۳۔ وحید زہیر۔ بلوچستان جمہوریت کا سفر۔ کوئٹہ۔ ص ۳۸

۱۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۹۹

۱۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص۴۱۴

۱۶۔ عزیز بھٹی۔ بلوچستان اسمبلی کا انتخابی جائزہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی ۲۴ر اگست ۱۹۹۳ء

۱۷۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ۔ ۳۱ر مئی ۱۹۹۳۔

۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشن رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۶۶۲

۱۹۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۳۵۴

۲۰۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء لاہور۔ ص۴۳۲

۲۱۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰ر مئی ۱۹۸۷ء

۲۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء لاہور۔ ص۴۱۵

۲۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم۔ ص ۴۷۹

۲۴۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ۔ ۳۱ر مئی ۱۹۹۳ء

۲۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص۱۵۵۲

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپوٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۶۰، ۶۶۳

۲۷۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز، ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۳۵۴، ۳۵۵

کھیتران

بلوچستان میں آباد کھیتران قبیلہ کوئی بڑا قبیلہ تو نہیں، تاہم سیاسی میدان میں ہمہ وقت موجود رہنے کے باعث یہ قبیلہ خاصا مشہور ضرور ہے۔

کھیتران مخلوط النسل لوگ ہیں اور ان میں افغان اور بلوچوں کے علاوہ پنجاب کے جاٹ عناصر بھی شامل ہیں۔ (ا) جسٹس میر خدا بخش خان مری اپنی کتاب "بلوچستان تاریخ کے آئینے میں" میں لکھتے ہیں۔

"یہ قبیلہ ضلع لورالائی کے سب ڈویژن بارکھان میں تیرہ سو مربع میل علاقہ میں بسا ہوا ہے۔ اس علاقے کے ایک طرف مری قبیلہ کی تحصیل کوہلو ہے اور دوسری طرف بگٹی قبیلہ، ضلع لورالائی کا موسیٰ خیل قبیلہ اور پنجاب میں ڈیرہ غازی خاں کے گورشانی اور بزدار قبائل آباد ہیں۔ دوسرے بلوچ قبائل کی طرح یہ قبیلہ بھی مختلف گروہوں سے مل کر بنا ہے۔ کچھ پٹھان بھی اس قبیلہ میں شامل ہو گئے ہین اور کچھ وہ لوگ بھی جن کے آباؤ اجداد اصل میں ہندوستان کے رہنے والے تھے۔ اس قبیلہ کا حسنی فرقہ بنیادی طور پر رند ہے۔ تقریباً ۱۷۷۱ء میں چند لڑائیوں کے بعد بجارانیوں مریوں نے انہیں مری کے علاقہ وادی ماوند سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد یہ طاقت ور اور منظم قبیلہ منتشر ہو گیا اور اب یہ لوگ بلوچستان کے تین مختلف اضلاع میں رہتے ہیں۔ ان میں کچھ ضلع لورالائی کی تحصیل دکی میں ترین پٹھانوں کے ساتھ، کچھ کھیتران قبیلہ کے ایک حصہ کے طور پر بارکھان میں اور باقی سبی تحصیل کے علاقہ تلی میں قیام پذیر ہیں۔ جہاں تک چچہ گروہ کا تعلق ہے یہ دودائی بلوچوں کا ایک حصہ تھے اور غازی خاں دوم کے زوال کے وقت یہ اس علاقے سے نکال دیئے گئے تھے۔ اور انہوں نے بارکھان کے علاقے میں پناہ حاصل کی تھی۔ مری اور بگٹی قبائل کے قریب رہنے کی وجہ سے کھیتران قبیلہ کے زیادہ تر لوگ دو زبانیں یعنی بلوچی اور کھیترانی بولنے لگے۔ موخر الذکر ہندوستانی زبان ہے جو سرائیکی سے ملتی جلتی ہے۔ سرائیکی زبان ملتان اور بہاولپور کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ یہ لوگ بہت اچھے زراعت پیشہ

اور تاجر ہیں۔" (۲)

قیام پاکستان کے وقت اس قبیلے کے افراد کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان دنوں اس قبیلے کے سردار انور جان کھیتران تھے۔ (۳) انہوں نے ۱۹۴۷ء کے ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ جس وقت بلوچستان کے شاہی جرگہ کے ارکان کو پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کا مرحلہ آیا تو سردار صاحب کوئٹہ کے ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ اس وقت کانگرس کی طرف سے بلوچستان کے شاہی جرگہ کے امکان کو مالی لالچ دینے کی بھی کوششیں کی گئیں۔ کہا جاتا ہے اس سلسلہ میں عبدالصمد اچکزئی مرحوم اس ہوٹل میں، جس میں سردار صاحب قیام پذیر تھے، سردار صاحب سے ملنے کے لئے آئے اور انہوں نے انہیں پاکستان کے خلاف ووٹ دینے کے سلسلہ میں بھاری رقم کی بھی پیشکش کی اس پر سردار صاحب نے سخت لب و لہجہ استعمال کرتے ہوئے اچکزئی مرحوم کو دھکے دے کر ہوٹل کے کمرے سے باہر نکال دیا۔۔۔۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں سردار انور جان کھیتران قیوم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۴) انہوں نے ۱۹۷۷ء کے صوبائی انتخابات میں بھی حصہ لیا تھا اور میر طارق محمود کھیتران کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ (۵)

انور جان کھیتران کے بعد عملی سیاست ان کے قبیلے کی نمائندگی کا فریضہ ان کے بھائی سردار احمد شاہ کھیتران نے سنبھالا۔ وہ ۱۹۸۵ء میں میرباز محمد کھیتران اور میر طارق محمود کو شکست دے کر پی بی ۱۲ اورلالائی ۳ سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۶) انتخابات سے پہلے وہ تحریک استقلال میں شامل تھے۔ (۷) جبکہ انتخاب جیتنے کے بعد انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور جام میر غلام قادر خان کی کابینہ میں وزیر بلدیات بنا دیئے گئے۔

۱۹۸۸ء میں سردار احمد شاہ کھیتران نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر ایک مرتبہ پھر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس مرتبہ بھی ان کے مدمقابل میرباز محمد خان کھیتران اور میر طارق محمود کھیتران ہی تھے۔ میرباز محمد خان کھیتران کو پاکستان پیپلز پارٹی کی اور میر طارق محمود کھیتران کو بلوچستان نیشنل الائنس کی حمایت حاصل تھی۔ یہ معرکہ میر طارق محمود کھیتران کے ہاتھ رہا۔ (۸)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات سے پہلے سردار احمد شاہ کھیتران جمہوری وطن پارٹی میں شمولیت اختیار کر چکے تھے۔ مگر اس مرتبہ بھی وہ صوبائی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس مرتبہ پی ڈی اے کے امیدوار میرباز محمد خاں کھیتران انہیں اور میر طارق محمود کھیتران دونوں کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۹) ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا (۱۰)

اس قبیلے کے میر طارق محمود کھیتران بھی سیاسی میدان میں عرصہ سے سرگرم عمل ہیں۔ وہ نواب محمد اکبر بگٹی، میر احمد نواز بگٹی اور سردار شیر باز خان مزاری کے بھانجے ہیں۔ انہوں نے پہلی مرتبہ ۱۹۷۷ء میں صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا اور سردار انور جان کھیتران سے شکست کھائی۔ (۱۱) ۱۹۸۵ء میں انہوں نے سردار انور جان کھیتران کے چھوٹے بھائی سردار احمد شاہ کھیتران کا مقابلہ کیا۔ اس مرتبہ وہ فقط ۴۹۹ ووٹ کم ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ (۱۲)

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں میر طارق محمود کھیتران کو اپنے ماموں نواب محمد اکبر بگٹی کی سیاسی پارٹی بلوچستان نیشنل الائنس کی حمایت حاصل تھی۔ (۱۳) اس مرتبہ بھی ان کے مدمقابل سردار احمد شاہ کھیتران ہی تھے مگر اب صورت حال خاصی تبدیل ہو چکی تھی۔ اس لئے میر طارق احمد کھیتران انہیں تقریباً پونے پانچ ہزار ووٹوں سے شکست دے کر نہ صرف صوبائی اسمبلی کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ بلکہ اپنے ماموں نواب اکبر بگٹی کی کابینہ میں بھی شامل کر لئے گئے۔ (۱۴)

میر طارق محمود کھیتران نے ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ مگر اس مرتبہ صورتحال یہ بنی کہ میر باز خان کھیتران، جو ۱۹۸۸ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ صوبائی نشست پر پوری طرح خم ٹھونک کر سامنے آ گئے۔ میر باز کھیتران نے اس نشست پر ۱۹۸۸ء میں بھی کاغذات نامزدگی داخل کروائے تھے مگر ان کا اصل ہدف قومی اسمبلی کی نشست تھی۔ چنانچہ میر طارق محمود کھیتران کو جنہیں ۱۹۸۸ء میں انتخاب جیتنے میں زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ اس مرتبہ میر باز محمد کھیتران سے فقط ۱۳۶ ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۵) بہر حال مقابلہ پھر پی بی ۱۲ لورالائی ۳ بارکھان سے انتخاب لڑا اور جمہوری وطن پارٹی کے سردار عبد الرحمٰن کھیتران کو شکست دے کر بلوچستان اسمبلی تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کر لی (۱۶)

۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء دونوں عام انتخابات میں میر طارق محمود کھیتران کامیاب نہ ہو سکے ۱۹۹۷ء میں انہیں سردار عبد الرحمٰن کھیتران نے شکست دی (۱۷) اکتوبر ۱۹۹۹ء میں ملک میں فوجی حکومت قائم ہوئی تو میر عبد الرحمٰن کو بدعنوانی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور احتساب عدالت نے انہیں کسی بھی عوامی نمائندگی کے عہدے کے لیے نااہل قرار دے دیا۔ چنانچہ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں ان کی جگہ، ان کی اہلیہ، بیگم نسرین رحمٰن نے انتخاب لڑا انہوں نے میر طارق محمود کھیتران کو شکست دی اور یوں وہ بلوچستان کے کسی بھی عام حلقے سے کامیاب ہونے والی پہلی خاتون بن گئیں (۱۸) میر طارق محمود کھیتران نے ۲۰۰۲ء میں قومی اسمبلی کا انتخاب بھی لڑا مگر وہ اس انتخاب میں بھی شکست کھا گئے (۱۹)

میر باز محمد کھیتران قبیلے کی دگا شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ۱۹۵۷ء میں کوہلو میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں انہوں نے ذاتی کاروبار کا آغاز کیا۔ بعد ازاں وہ سیاست کے میدان میں آئے اور پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ صفحہ نمبر 920 سے 923

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب

لڑا اور اپنے قبیلے کے سردار سردار احمد شاہ کھیتران کی مدد سے انتخاب جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ بے نظیر بھٹو کی کابینہ میں وہ وزیر مملکت بنائے گئے ان کے پاس ماحولیات کا قلمدان تھا۔

اس دوران انہیں اکبر بگٹی کی جانب سے خاصی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اکبر بگٹی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ تھے اور میر باز محمد کھیتران ان کے بھانجے طارق محمود کھیتران ان کے انتخابی حریف تھے۔ ۱۹۹۰ء میں بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد انہیں بدعنوانیوں کے ایک ریفرنس کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں وہ گرفتار بھی ہوئے تاہم ہائی کورٹ نے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا۔ (۲۰)

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں انہوں نے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی کے انتخاب میں تو وہ آئی جے آئی کے امیدوار سردار محمد یعقوب سے شکست کھا گئے۔ تاہم صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں وہ ایک مرتبہ پھر طارق محمود کھیتران کو ہرانے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے اس انتخاب میں سردار احمد شاہ کھیتران کو بھی شکست دی جو ۱۹۸۸ء کے برخلاف اس مرتبہ ان کے خلاف کام کر رہے تھے۔ (۲۱)

انتخاب میں کامیابی کے بعد وہ بلوچستان اسمبلی میں پاکستان پیپلز پارٹی کی تین رکنی پارلیمانی پارٹی کے سربراہ بھی بنے تاہم بعد ازاں وہ میر تاج محمد جمالی کابینہ میں شامل ہو گئے انہیں ماحولیات اور رابطے کا قلمدان سونپا گیا۔ (۲۲)

۱۹۹۳ء میں جب صدر غلام اسحٰق خان نے قومی اسمبلی توڑی اور نواز شریف حکومت کو برطرف کیا تو صوبہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ میر تاج محمد جمالی کو بھی استعفیٰ دینا پڑ گیا۔ پی ڈی اے ان کی جگہ میر باز محمد خاں کھیتران کو وزیر اعلیٰ بنانا چاہتی تھی اور اس نے اس سلسلہ میں نواب اکبر بگٹی کی حمایت بھی حاصل کر لی تھی (۲۳) مگر بعد میں ان کا نام پس پشت ڈال کر ذوالفقار مگسی کو آگے لایا گیا اور تاج محمد جمالی کے بعد وہی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بنے۔ (۲۴) ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں میر باز محمد کھیتران نے ایک مرتبہ پھر پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر این اے ۱۹۹ لورالائی، موسیٰ خیل، بارکھان کے حلقہ سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ ان کے ستارے یاوری نہ کر سکے اور وہ جمعیت علمائے اسلام (ف) کے امیدوار حاجی گل محمد سے شکست کھا گئے (۲۵) ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں بھی ناکامی ان کا مقدر بنی اور دونوں انتخابات میں انہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سردار محمد یعقوب خان ناصر کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی (۲۶)

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر ایم انور رومان۔ بلوچستان کے قبائل (ضلعی گزیٹیر سے انتخاب) حصہ دوم۔ کوئٹہ۔ ص ۷۰، ۷۱

۲۔ جسٹس میر خدا بخش خان بجارانی مری۔ بلوچستان تاریخ کے آئینے میں۔ ترجمہ پروفیسر سعید

احمد رفیق ۔ کوئٹہ ۔ ص ۵۱۶، ۵۱۷

۳۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے) ۔ کوئٹہ۔ ص ۴۰

۴۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی ۔ ۲۰/ مئی ۱۹۸۷ء

۵۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ ص ۴۱۰

۶۔ دی گزٹ آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۲۸/ مارچ ۱۹۸۵ء ۔ ص ۲۶۲۹

۷۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰/ مئی ۱۹۸۷ء

۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء ۔ لاہور۔ ص ۴۱۰

۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد ۲ ۔ ص ۴۷۵

۱۰۔ عزیز بھٹی ۔ بلوچستان اسمبلی کا انتخابی جائزہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی ۔ ۲۱/ اگست ۱۹۹۳ء

۱۱۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور ۔ ص ۴۱۰

۱۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۲۸/ مارچ ۱۹۸۵ء ۔ ص ۲۶۲۹

۱۳۔ طارق اسمٰعیل ۔ الیکشن ۸۸ ۔ لاہور۔ ص ۴۱۰

۱۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۳/ دسمبر ۱۹۸۸ء ۔ ص ۳۷۴۲

۱۵۔ ایضاً ۔ ۱۱/ نومبر ۱۹۹۰ء ۔ ص ۹۳۸۲

۱۶۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء ۔ ص ۱۵۴۷

۱۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ ۔ جلد دوم ۔ ص ۶۵۲

۱۸۔ بلوچ قبائل ۔ لالہ ہتو رام، پروفیسر عزیز محمد بگٹی ۔ کوئٹہ ۔ ص ۱۱۲

۱۹۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان ۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء ۔ جلد دوم ۔ ص ۹۸

۲۰۔ خالد حسین۔ دی ہنٹر ٹرنڈ پولیٹیشن۔ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۸ تا ۲۴/ مارچ ۱۹۹۳ء ۔ ص ۸

۲۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم ۔ ص ۹۲، ۴۷۵

۲۲۔ خالد حسین ۔ دی ہنٹر ٹرنڈ پولیٹیشن۔ ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔ ۱۸/ تا ۲۴/ مارچ ۱۹۹۳ء ۔ ص ۸

۲۳۔ روزنامہ جنگ کراچی ۔ ۱۴/ مئی ۱۹۹۳ء

۲۴۔ روزنامہ جنگ کراچی ۔ ۳۱/ مئی ۱۹۹۳ء

۲۵۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۳ء ۔ ص ۱۳۲۲

۲۶۔ (i) الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ ۔ جلد دوم ۔ ص ۱۵۶
(ii) ایضاً ۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ ۔ جلد دوم۔ ص ۹۸

محمد حسنی

محمد حسنی، جنہیں ماسنی یا ماماسانی بھی کہا جاتا ہے، بلوچستان کا ایک اہم قبیلہ ہے۔ (۱) ان کی زبان فارسی تھی اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ایران سے آئے تھے۔ وہ حضرت امام حسینؓ کے پیروکار تھے اس لئے محمد حسینی کہلاتے تھے اور غلط العام میں اب محمد حسنی کہلاتے ہیں۔ (۲) لوک گیتوں کے مطابق شیراز کے حکمران سے ان کی لڑائی ہوئی اور وہ ہجرت کر کے سیستان آ گئے اور وہاں سے اپنے موجودہ علاقے جھالاوان میں آ کر بس گئے۔ یہ ایک کافی بڑا قبیلہ تھا ان کے سیستان سے مکران اور بلوچستان آنے کے قصے بہت حد تک بلوچوں کے قصوں سے ملتے جلتے ہیں۔

اس قبیلہ کے اکثر افراد قد آور، مضبوط دست و بازو رکھنے والے تنومند ہوتے تھے گو کہ آجکل ان کا وہ تن و توش باقی نہیں رہا، پھر بھی اس لحاظ سے اپنے ہمسایہ رخشانی قبائل سے ممتاز نظر آتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ رستم بن ذال، سیستان کے اسی محمد حسنی قبیلے سے تھا۔ اس قبیلے کا ایک دوسرا مشہور پہلوان عیدو گزرا ہے جو چاغی کا باشندہ تھا اور ۱۹۲۰ء تک زندہ تھا۔ بلوچستان کے انگریز لاٹ نے اسے کوئٹہ طلب کر کے دربار میں اس کی پہلوانی کا مظاہرہ کرایا تھا اور اس کے گزارہ کے لئے ایک حقیر سے پنشن یا وظیفہ مقرر کیا تھا۔ زور بند عیدو کی پہلوانی کے قصے افسانوی انداز میں اب بھی ان علاقوں میں بیان کئے جاتے ہیں۔

ایران کی قدیم تاریخ میں ماسنی، ماشی، پرکانی اور سرپرہ قبائل کا بار بار ذکر ملتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبائل ایک ہی نسل کے لوگ تھے جو ناروئی بلوچوں سے میل جول رکھتے تھے محمد حسنی قبیلے کی اکثریت اب بھی گرم سیل اور سیستان کے علاقوں میں آباد ہے۔ وہاں پر ان کی چھوٹی بڑی سرداریاں بھی قائم ہیں لیکن سارے قبیلے کا لس سردار جھالاوان کی تحصیل مشکے کے مقام جیبری میں رہتا ہے۔ محمد حسنی چاہے ایران میں ہوں یا افغانی بلوچستان میں، اسے اپنا سردار اعلیٰ مانتے ہیں۔ اس کا تعلق کلملی زئی سے ہوتا ہے جو محمد حسنی قبیلے کا سردار خیل طائفہ ہے (۴)

محمد حسنی ایران میں اپنی قانون شکنی کی وجہ سے بدنام ہیں لیکن جھالاوان میں وہ نسبتاً پرامن زندگی گزارتے ہیں۔ ایک دفعہ میر محراب خان کے وقت ان کا اپنے ہمسایوں یعنی گریشہ کے ساجدیوں کے ساتھ جھگڑا ہوا جب محمد حسنی سردار رستم خان مارا گیا۔ اس سے مزید دھاوے اور مویشی چوری کے واقعات ہوئے اور محمد حسنیوں نے یوسف خان کا بھائی موسیٰ خان بھی کھو دیا۔ جبکہ ساجدی سردار حیات خان اور اس کا عمزاد شیر علی مارے گئے۔ بزنجو اور مینگل سرداروں کی مداخلت سے صلح ہوئی۔ خوانین قلات کے ساتھ وہ ٹھیک رہے لیکن زہری' سردار تاج محمد اور میر خداداد خان کے درمیان لڑائی میں محمد حسنی سردار یوسف خان کے بھائی کمال خان نے خان قلات کے خلاف جام اور مینگلوں کا ساتھ دیا۔ پرانے وقتوں میں محمد حسنی ۵۰۰ جنگجو بطور سان دیتے تھے اور پاچ (گنداوا) میں کچھ زمین و آب کے مالک تھے جنہیں میر خداداد خان نے ضبط کر لیا۔ محمد حسنیوں نے ۹۸-۱۸۹۷ء میں ان انعامی زمینوں کی بحالی کا مطالبہ کیا لیکن ضبطی ۱۸۷۶ء کے معاہدۂ مستونگ سے پہلے ہونے کی وجہ سے سیاسی حکام ان کی مدد کی کوئی سبیل نہ نکال سکے۔ (۵)

بلوچستان کی سیاست میں محمد حسنی قبیلے کے افراد ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں پہلی مرتبہ بھرپور طریقے سے ابھر کر سامنے آئے۔ ان انتخابات میں جہاں ایک جانب کوئٹہ چاغی سے فتح محمد محمد حسنی قومی اسمبلی کے رکن بنے وہیں دوسری جانب خضدار سے محمد عارف جان محمد حسنی بلامقابلہ اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

فتح محمد محمد حسنی کی کامیابی میں سخی دوست محمد اور بعض دیگر بلوچ سرداروں نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا اور مدمقابل سعید احمد ہاشمی کی جو مائن اونرز ایسوسی ایشن بلوچستان کے سیکرٹری جنرل تھے' محض اس لئے مخالفت کی تھی کہ ان کا تعلق بلوچستان سے نہیں تھا۔ جب سردار فتح محمد محمد حسنی کامیاب ہوئے تو ۱۹۸۵ء کے انتخابات کے بائیکاٹ کے حامی بعض بلوچ سرداروں نے بھی انہیں مبارکباد پیش کی تھی اور اس بات پر اظہار مسرت کیا تھا کہ ایک بلوچ نے ایک پنجابی کو شکست سے دوچار کر دیا ہے۔ (۶)

فتح محمد محمد حسنی بعد ازاں وفاقی کابینہ میں وزیر مملکت کے طور پر شامل ہوئے۔ انہیں مواصلات کا قلمدان دیا گیا تھا۔ (۷)

۱۹۸۸ء میں فتح محمد محمد حسنی نے آئی جے آئی کے ٹکٹ پر دوبارہ انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ ان کے مدمقابل جمعیت علمائے اسلام (الیف) کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات حافظ حسین احمد تھے چنانچہ سردار فتح محمد محمد حسنی تقریباً ڈیڑھ ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۸)

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں شکست کھانے کے بعد سردار فتح محمد' محمد حسنی نے قلابازی کھائی اور نہ صرف پاکستان پیپلزپارٹی میں شامل ہو گئے بلکہ اس کی بلوچستان شاخ کے صدر بھی بن گئے۔

(۹) ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ہی انتخاب لڑا اور اپنے سابقہ حریف حافظ حسین احمد کو تقریباً ساڑھے تین ہزار ووٹوں سے شکست دے کر اپنی کھوئی ہوئی نشست دوبارہ حاصل کر لی۔ (۱۰)

۱۹۹۰ء کے انتخابات میں سردار فتح محمد محمد حسنی پی بی ۵ چاغی سے صوبائی اسمبلی کے رکنیت کے بھی امیدوار تھے۔ مگر قومی اسمبلی کا انتخاب جیتنے کے باوجود وہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیتنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور جمہوری وطن پارٹی کے علی محمد نوتے زئی سے تقریباً ساڑھے تین ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ (۱۱)

۱۹۹۳ء میں جب صدر غلام اسحٰق خان نے نواز شریف حکومت کو برطرف کر کے نگراں کابینہ تشکیل دی تو سردار فتح محمد محمد حسنی اس میں شامل ہو گئے۔ انہیں پیداوار کا قلمدان سونپا گیا تھا۔ (۱۲)

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں سردار فتح محمد محمد حسنی نے این اے ۱۹۷ کوئٹہ و چاغی سے قومی اور پی بی ۵ چاغی سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ مگر دونوں میں کامیاب نہ ہو سکے قومی اسمبلی کے انتخاب میں انہیں محمود خان اچکزئی نے (۱۳) اور صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں انہیں حاجی سخی دوست محمد نوتیزئی نے شکست سے ہم کنار کیا۔ (۱۴)

۱۹۹۷ء میں انہیں قومی اسمبلی کی نشست پر میر عاطف علی سنجرانی کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی جب کہ صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں انہیں حاجی علی محمد نوتیزئی نے شکست دی (۱۵)

۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہیں پاکستان پیپلز پارٹی نے ٹکٹ نہیں دیا چنانچہ انہوں نے پی بی ۶ کوئٹہ ۶ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر صرف ۱۲۶ ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے (۱۶)

۱۵/اپریل ۲۰۰۵ء کو سردار فتح محمد حسنی نے پاکستان پیپلز پارٹی چھوڑ کر پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کرنے کا اعلان کیا (۱۷) اور ۲۸ رمئی ۲۰۰۵ء کو این اے ۲۷۱ خاران کم پنج گور سے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر ضمنی انتخاب میں حصہ لیا اور پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز، پاکستان مسلم لیگ (ن) اور بلوچ قوم پرست تنظیموں کے مشترکہ امیدوار عبدالحق بلوچ اور متحدہ مجلس عمل کے امیدوار حافظ محمد اعظم بلوچ کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے ۔ یہ نشست متحدہ مجلس عمل کے مولانا رحمت اللہ بلوچ کے انتقال کے باعث خالی ہوئی تھی (۱۸)

ادھر خضدار میں محمد حسنی قبیلے کے سربراہ محمد عارف جان محمد حسنی جو ۱۹۸۵ء میں بلا مقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے بلوچستان نیشنل الائنز میں شامل ہو گئے اور اسی کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لیا۔ ان کے مدمقابل پی این پی کے صدر میر غوث بخش بزنجو تھے۔ جنہیں پیپلز پارٹی کی بھی مکمل حمایت حاصل تھی۔ مگر یہ حمایت بھی انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی اور وہ سردار محمد عارف جان محمد حسنی کے ہاتھوں شکست کھا گئے ۔ (۱۹)

۱۹۹۰ء کے انتخابات میں محمد عارف جان محمد حسنی نے خود تو قومی اسمبلی کا انتخاب نہیں لڑا۔ تاہم ان کی حمایت ان کے داماد سردار اختر مینگل کے ہم قبیلہ میر محمد نصیر مینگل کو حاصل تھی؛ جو ان کی حمایت کے باوجود میر غوث بخش بزنجو کے صاحبزادے میر محمد بزن بزنجو سے شکست کھا گئے۔ (۲۰) یکم مئی ۱۹۹۲ء کو جب وہ بلدیاتی انتخابات کے سلسلے میں ایک انتخابی مہم کے لئے مشکے سے جھل جھاؤ جا رہے تھے انہیں پہاڑوں میں موجود پہلے سے مورچہ بند افراد نے فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ قتل کا سبب پرانی دشمنی تھی (۲۱) خاران سے محمد حسنی قبیلے کے ایک اور فرد دوست محمد، محمد حسنی بھی ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء تینوں انتخابات میں پی بی ۳۳ خاران سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑ چکے ہیں ۱۹۸۸ء میں وہ صوبائی اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوگئے تھے (۲۲) ۱۹۹۰ء میں وہ جمہوری وطن پارٹی کے میر عبد الکریم نوشیروانی سے شکست کھا گئے۔ (۲۳) جب کہ ۱۹۹۳ء میں میر دوست محمد محمد حسنی اور میر عبدالکریم نوشیروانی میں یہ معاہدہ طے پایا کہ میر عبدالکریم نوشیروانی این اے ۲۰۴ سے قومی اسمبلی کا اور دوست محمد محمد حسنی پی بی ۳۳ خاران سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑیں گے۔ مگر ان کا اتحاد ثمر آور ثابت نہ ہو سکا اور میر عبد الکریم نوشیروانی اور میر دوست محمد محمد حسنی دونوں ہی اپنا اپنا انتخاب ہار گئے۔ میر عبد الکریم نوشیروانی کو مولوی عبدالغفور حیدری نے (۲۴) اور میر دوست محمد محمد حسنی کو سردار محمد حسین نے شکست سے ہمکنار کیا۔ (۲۵) دوست محمد محمد حسنی نے ان تینوں انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں دوست محمد محمد حسنی نے بی این پی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا مگر اس مرتبہ بھی انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا (۲۶) ۲۰۰۲ء میں دوست محمد محمد حسنی نے خود انتخابی عمل میں حصہ نہیں لیا اور نیشنل الائنس ۔ کے ٹکٹ پر اپنے بیٹے میر حبیب الرحمٰن محمد حسنی کو انتخاب لڑوایا جو ایک سخت مقابلے کے بعد یہ انتخاب جیت گئے (۲۷) میر حبیب الرحمٰن محمد حسنی ۲۰۰۵ء میں واشک کے ضلعی ناظم بھی منتخب ہوئے ہیں (۲۸)

خضدار کے سردار عارف جان محمد حسنی کے صاحبزادے سردار رستم خان سردار عطاء اللہ خان مینگل کے داماد ہیں جب کہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ عطاء اللہ مینگل کے صاحبزادے اور ممکنہ سیاسی جانشین اختر مینگل عارف جان محمد حسنی کے داماد ہیں (۲۹)

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر محمد انور رومان ۔ بلوچستان کے اہم قبائل (ضلعی گزیٹیر سے انتخاب) حصہ اول۔ کوئٹہ۔ ص ۳۲۴

۲۔ رائے بہادر لالہ ہتو رام۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۴۴۲

۳۔ جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری۔ بلوچستان تاریخ میں آئینے میں ۔ مترجم پروفیسر سعید احمد

رفیق، کوئٹہ۔ ص ۵۲۴

۴۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید کی روشنی میں۔کوئٹہ۔ص ۱۶۳،۱۶۴

۵۔ پروفیسر محمد انور رومان۔ بلوچستان کے اہم قبائل (ضلعی گزیٹیر سے انتخاب) حصہ اول۔ کوئٹہ۔ ص ۳۲۵،۳۲۶

۶۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۳۰رمئی ۱۹۸۷ء

۷۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳۰رمارچ ۱۹۸۷ء

۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۳۹۸،۴۶۴،۴۶۵

۹۔ طارق اسمٰعیل ساگر الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۵۷۴

۱۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ حصہ دوم۔ ص ۹۱

۱۱۔ ایضاً ص ۴۷۲

۱۲۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۱۰رتا ۱۶رمئی ۱۹۹۳ء۔ ص ۸

۱۳۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴را کتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۳۲۰،۱۳۲۱

۱۴۔ ایضاً۔ ۱۷را کتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۴۳

۱۵۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۱۵۴،۶۴۴

۱۶۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۳۴۶

۱۷۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۱۶راپریل ۲۰۰۵ء

۱۸۔ ایضاً۔ ۳۰رمئی ۲۰۰۵ء

۱۹۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸۔ لاہور۔ ص ۴۰۴

۲۰۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور۔ ص ۵۷۸،۵۷۹

۲۱۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳رمئی ۱۹۹۲ء

۲۲۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۳ردسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۷۴۹

۲۳۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ حصہ دوم ص ۴۸۳

۲۴۔ دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۴را کتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۲۴

۲۵۔ ایضاً۔ ۱۷را کتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۴۳

۲۶۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۶۷۳

۲۷۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ص ۳۶۱ رپورٹ
۲۸۔ روزنامہ ڈان کراچی۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء
۲۹۔ عدنان عادل، بلوچ سردار، کون کس کا رشتہ دار۔ بی بی سی اردو ڈاٹ کام۔ لاہور ۲۶/فروری ۲۰۰۵ء

مری

آبادی کے لحاظ سے مری بلوچوں کا تیسرا بڑا قبیلہ ہے۔ اس کی کل آبادی مندرجہ ذیل چار ذیلی قبائل پر مشتمل ہے۔

(ا) گزینی: قبیلے کی سرداری اس ذیلی قبیلے کے طائفہ بھاؤ لان زئی کو حاصل ہے۔ کاہان قبیلے کا صدر مقام ہے۔

(۲) بجارانی: قبیلے کا بڑا اور زیادہ معروف طائفہ ہے۔

(۳) لوہارانی۔

(۴) مزارانی۔

مری قبیلے سے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلوچستان کے حکمران نصیر خان اول کے بعد اس قبیلے نے آج تک کسی اور بالائی اقتدار کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ خوانین قلات نے میر خداداد خان کے عہد (۹۳-۱۸۵۷ء) تک بارہا ان پر لشکر کشی کی اور وقتی طور پر انہیں اطاعت پذیر ہونے پر مجبور بھی کر دیا لیکن بلوچستان کے دوسرے قبائل کی طرح دائمی طور پر انہیں رام نہیں کر سکے۔ انگریزوں سے بھی اس قبیلے نے خوب ٹکر لی اور ان کے خلاف کئی دست بدست لڑائیاں لڑیں۔ یہاں تک کہ سر چارلس نیپیئر نے ۱۸۴۶ء میں ایک اعلان عام کے ذریعے مشتہر کر دیا کہ جو شخص کسی مری کا سر کاٹ کر لائے گا اسے دس روپے فی سر کے حساب سے انعام دیا جائے گا لیکن اس کے باوجود کامیاب نہیں ہوئے تاآنکہ انگریزوں نے عاجز آ کر ان کے ساتھ صلح کر لی، ان کی جداگانہ قبائلی حیثیت تسلیم کر لی اور قبیلے کے اندرونی معاملات میں دخل دینے سے حتی الوسع گریز کیا۔ اس طرح اگر ایک طرف قبیلے کی نیم آزاد حیثیت قائم رہی تو دوسری طرف تعلیمی، معاشی اور معاشرتی طور پر یہ قبیلہ ان تمام سہولتوں سے کلیتاً" محروم رہا جن سے انگریزی حکومت کے زیر اثر بلوچستان کے دوسرے قبائل اور عوام کسی نہ کسی حد تک مستفیض ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مری قبیلے کو بلوچستان کا پسماندہ ترین قبیلہ سمجھا جاتا ہے۔

مری، بلوچستان میں کب اور کس دور میں آئے، یہ مسئلہ غیر واضح اور توجہ طلب ہے۔ عام طور پر مری کہتے ہیں کہ وہ رند و لاشار کے ساتھ اس سرزمین پر آئے۔ اس وقت ان کے قبیلے کو مری نہیں کہتے تھے بلکہ اپنے سردار بجارانی کے نام سے بجارانی کہلاتے تھے۔ میر چاکر رند نے ہندوستان جانے کا قصد کیا تو سردار بجار نے بلوچستان چھوڑ کر میر چاکر کے ساتھ ہندوستان جانے سے انکار کر دیا۔ میر چاکر نے ناراض ہو کر سردار بجار کو مری کہا۔ (ا) لالہ ہتو رام لکھتا ہے کہ "مری کے معنی بلوچی میں جن کے ہیں جیسا کہ ملکی زبان میں عام رواج ہے کہ جو کوئی کسی کا کہنا نہیں مانتا بلکہ اس کے برعکس عمل کرتا ہے تو اس کو جن کہتے ہیں، یعنی آدمی نہیں جن ہے۔ یوں رفتہ رفتہ یہ نام (مری) سارے قبیلے پر حاوی ہو گیا اور بجارانی مری کے نام سے مشہور ہو گیا۔ (میر چاکر سے کٹ کر) بجار خان کاہان میں آ کر مقیم ہوا۔ اس وقت تقریباً ایک سو افراد بجار خان کے ہمراہ ہوں گے۔" (۲)

میر گل خان نصیر اپنی کتاب "بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں" میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک اس رائے کا تعلق ہے کہ مری، سردار شیہک رند اور میر گوہرام لاشاری کے ساتھ آئے ہیں، رند و لاشار کے قدیم رزمیہ اشعار و روایات سے اس کی سند نہیں پیش کی جا سکتی۔ مری جیسا ایک جری قبیلہ رند و لاشار کے جلو میں گمنام نہیں رہ سکتا تھا۔ بلاشبہ میر بجار کا ذکر ملتا ہے لیکن اس دور کی منظومات میں جب میر چاکر کچھی اور سبی میں تھے اور یہ بھی اصولاً صحیح نہیں کہ ایک ذیلی قبیلہ (نی) جو اب تک اپنی اسی حیثیت (بجارانی) سے قائم ہے، پورے قبیلے کے نام کو تو بدل دے لیکن خود اپنی ذیلی حیثیت (نی) کو بھی قائم رکھے۔ اسی طرح ہتو رام صاحب کا بلوچی زبان میں مری کو جن کے معنی سے تعبیر کرنا بھی صحیح نہیں۔ البتہ مری ایک بیماری کا بلوچی نام ضرور ہے لیکن اسے مری قبیلہ پر منطبق کر دینا غلط ہے۔ (۳)

مری سے متعلق ایک اور رائے میر سردار خان بلوچ جیسے مقتدر مورخ اور بعض دوسرے تعلیم یافتہ اور قوم پرور مری نوجوان پیش کرتے ہیں۔ وہ مری بلوچوں کو عربی النسل المری سے ملاتے ہیں جن کی کسی زمانے میں ایک مشہور و معروف سلطنت رہی ہے۔ (۴) ممکن ہے ایسا ہو، لیکن فی الوقت ہم اسے ایک مفروضے سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے جو غالباً الفاظ کی صوتی ہم آہنگی سے پیدا ہوا ہے علاوہ ازیں اس کی باقی کڑیاں بھی نہیں ملتیں۔ مثلاً مری سلطنت کے زوال کے بعد یہ لوگ بلوچستان میں کیسے آئے، کس راستے سے آئے اور کس صدی میں آئے۔ جہاں تک المری کا سوال ہے ان کی تاریخ واضح ہے کہ وہ عرب تھے۔ اب بھی عربستان میں ان کی نسل موجود ہے اور عربی بولتے ہیں۔ تب یہ کیونکر ممکن ہوا

کہ ان کا ایک طائفہ ہجرت کر کے بلوچستان میں آیا اور یہاں آ کر وہ قدیم بلوچی بولنے لگا جو بحر کیسپین کے نواح میں آباد قبائل کی زبان تھی۔

اس ضمن میں ایک اور رائے محمد عالم صاحب راقب اور بعض دوسرے مورخوں نے پیش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مری دراصل موری ہے جو موریا بھی تلفظ ہوا ہے اور اس طرح وہ چندر گپت موریا کو اسی قبیلے کا ایک فرد اور بادشاہ مانتے ہیں۔

موریا، موری اور مری دراصل ایک ہی نام ہے جو ایک عرصہ بعد ماہرین السنہ کے مطابق (ر) اور (ل) کی تبدیلی سے جو عموماً ہوتی رہتی ہے مولی اور ملی بنا۔ ملتان بھی اسی نام سے مشتق ہے جو ملی استان سے ملتان بنا ہے۔ "سکندر اعظم کے حملے کے وقت موجودہ ملتان جو دراصل ملی استان ہے، پنجاب کے ملی قبیلہ کا صدر مقام تھا۔"

بعض تاریخی شواہد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ جو مری یا ملی کہلاتے تھے پار تھین نسل کے لوگ تھے جو تقریباً دو ہزار سال قبل بحر کیسپین کے نواح سے ہجرت کر کے ہندوستان کی سرحد پر پہنچے تھے۔ یہ بڑے بہادر، جنگجو اور جفاکش لوگ تھے۔ بلوچستان کے مری ان ہی کی باقیات میں سے ہیں اور ان میں اب تک پار تھین اثرات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مری جو بلوچی اب تک بولتے ہیں وہ تقریباً وہی زبان ہے جو ایران کے کتبات بہتون میں کندہ ملتی ہے اور ماہرین السنہ کی رائے میں یہ قدیم پار تھین زبان ہے۔ اس میں بعض حروف جیسا کہ "ث" اور "ذ" کا تلفظ جو مری کرتے ہیں دوسرے بلوچ نہیں کر سکتے۔

ماضی بعید کے گ، کو "ج" میں بدل دینا جیسا کہ "جنگ بیت" (مارا جائے گا) کو "جن جیت" صرف مری بولتے ہیں جو قدیم پار تھین ترکیب ہے۔ دوسرے بلوچ ایسا نہیں بولتے۔

مورخین نے انکشاف کیا ہے کہ لڑائی کے میدان میں پار تھین (سر دھڑ کی بازی لگانے کو) اپنے گھوڑوں سے اتر کر پیدل لڑتے تھے۔ یہی حال مریوں کا ہے جو طاقتور غنیم کے مقابلے میں اپنے گھوڑوں سے اتر کر لڑتے رہے ہیں۔

مری اپنے لباس پر ایک فرغل نما جامہ پہنتے ہیں جسے کرتی کہتے ہیں۔ یہ بھی قدیم پار تھین اور کوشانیوں کے لباس کا ایک جزو رہا ہے۔

لہٰذا مری قبیلہ ایک قدیم ترین بلوچ قبیلہ ہے جو رند و لاشار سے ہزاروں سال قبل بحر کیسپین کے نواح سے ہجرت کر کے اس سرزمین میں آئے اور ہندوستان کی تاریخ میں اپنا حصہ ادا کرنے کے بعد اس طرح زوال پذیر ہوئے کہ اب بلوچستان میں ایک قبیلے کے علاوہ ان کا اور کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے۔ (۵)

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مری قبیلے نے آج تک کسی بالائی قبیلے کے اقتدار کو دل

سے تسلیم نہیں کیا۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں کی بلوچستان آمد کے ساتھ ساتھ ہی مریوں نے ان سے مزاحمت کا آغاز کیا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچتی گئی۔ (۶)

۱۸۸۰ء میں مری قبائل کے ایک دستے نے کچالی کے قریب انگریزی فوج کے ایک دستے پر حملہ کر کے اس کے ۴۲ افراد ہلاک کر دیئے اور سوا لاکھ روپے بطور مال غنیمت اڑا لے گئے۔ انگریزوں نے فوری طور پر جوابی کاروائی کی۔ جس کے رد عمل میں اس وقت کے مری سردار، سردار مہر اللہ خان نے اطاعت قبول کی اور ۲ لاکھ روپے تاوان دے کر اپنی اور اپنے قبیلے کی جان بچائی۔

سردار مہر اللہ خان نے ۱۵ر مارچ ۱۹۰۲ء کو وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا میر خیر بخش مری قبائل کا سردار تسلیم کیا گیا یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو انگریزوں نے اسے نواب کا خطاب عطا کیا (۷) ۱۹۱۵ء میں اسے سی آئی ای بنا دیا گیا مگر سردار خیر بخش مری پر ان پرشکوہ خطابات اور نوازشات کا کوئی اثر نہیں ہوا (۸) اور مری قبائل اور انگریزوں کے تعلقات اس وقت پھر بگڑ گئے جب پہلی جنگ عظیم کے دوران بلوچستان میں گورنر جنرل کے نمائندے سر جے ریمز نے طاقتور قبائل کو جبری بھرتی کا حکم دیا۔

بڑے بڑے قبائل نے متفقہ طور پر بھرتی دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد جب بھرتی کے لئے حکومت کا دباؤ سخت بڑھ گیا تو مری قبیلے کے سردار خیر بخش خان مری کے انکار میں سختی آتی گئی اور اسی سخت انکار نے انہیں بلوچوں کو انگریزی فوج میں کرایہ کے فوجی کی حیثیت سے بھرتی نہ ہونے دینے کی تحریک کا سرغنہ و قائد بنا دیا۔ دیگر سرداروں نے بھرتی کے سوال کو نواب خیر بخش خان کی طرف سے بھرتی دینے سے مشروط کر دیا۔ اس طرح ان کو ازخود اس ضمن میں بنیادی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس لئے انگریزی حکومت کے لئے نواب خیر بخش خان کو راہ راست پر لانا سخت ضروری ہو گیا۔ اس کے لئے ان پر لالچ، دباؤ اور خوف کا ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ لیکن ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔

ابھی دھونس اور دباؤ کا سلسلہ جاری تھا کہ مری قبیلے کے کچھ لوگوں نے اپنی برہمی کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے انگریزی حکومت کے خلاف بلوچی جنگ کا آغاز کر دیا اور کوہلو کے تھانے پر حملہ کر کے گمبند کی لیوی چوکی کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس طرح فرنگی حکومت کے خلاف گویا جہاد کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد مری قبیلے نے جمع ہو کر گمبند کے قلعے پر، جہاں انگریزی فوج مقیم تھی۔ فروری ۱۹۱۷ء میں حملہ کر دیا۔ قلعے پر قبضہ کرنے کے لئے مری لشکر نے سخت جان فشانی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن انگریزی توپوں اور جدید اسلحہ کے سبب سینکڑوں مریوں نے جام شہادت نوش کیا اور مری لشکر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوا۔ اس لڑائی کے بعد مریوں نے انگریزی حکومت کے

خلاف گوریلا لڑائی چھیڑ دی۔ جس سے انگریزی فوج کو سخت زک اٹھانا پڑی۔ اگر بلوچی لشکر لڑائی کا یہ اپنا روایتی طریقہ جاری رکھتا تو شاید ایک عرصے تک انگریزی فوج کو پریشان کئے رکھتا۔ مگر اپنے ہی چند نافہم سرکردہ افراد کے غلط مشورے اور اصرار پر انہوں نے انگریزی فوج کے خلاف کھلی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہڑب کے مقام پر مری لشکر نے انگریزی افواج کا راستہ روک کر لڑائی چھیڑ دی۔ تمام دن لڑائی ہوتی رہی۔ خود انگریزوں کی یہی خواہش تھی کہ بلوچ لشکریوں ان کے سامنے آ جائے تاکہ اپنے جدید ہتھیاروں کے بل بوتے پر ان کی قوت کو ایک ہی جگہ ختم کر سکیں اور مریوں نے خود ہی ان کو یہ موقع فراہم کر دیا۔ مری نہایت ہی بہادری سے لڑے لیکن تین سو سے زائد جانباز شہید اور سات سو سے زائد افراد زخمی ہو جانے کے بعد ان کی قوت کچھ اس طرح منتشر ہوئی کہ اس کے بعد کوئی لڑائی لڑی نہ جا سکی اور سردار خیر بخش خان مری نے اپنا معاملہ انگریزی حکومت پر چھوڑ دیا اور ان کے ہر فیصلے کی پابندی قبول کر لی۔

جون ۱۹۱۸ء میں ایک اسپیشل جرگے کے فیصلے کے بموجب جو کہ انگریزوں کے منظور نظر افراد پر مشتمل تھا۔ سردار خیر بخش مری اور مری قبیلے کے خلاف سخت اقدامات کئے گئے۔ لڑائی کے مجرموں کو گرفتار کر کے قید سخت کی سزائیں دی گئیں تاہم ایک سال بعد تمام سزاؤں کو موقوف کر کے سردار خیر بخش مری اور ان کے قبیلے کو عام معافی دے دی گئی۔ کیونکہ اس وقت تک عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی اور اب فرنگی فوج کے لئے سپاہی بھرتی کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ (۹)

سردار خیر بخش مری' بلوچ تاریخ کی ایک ایسی شخصیت ہیں جن کی عظمت کے نقوش کبھی نہیں مٹ سکتے۔ انہوں نے اپنی راست بازی اور مردانگی سے نہ صرف اپنے قبیلے مری بلکہ بلوچستان بھر میں عزت و ناموری کا ایک ایسا مقام حاصل کیا' جس کی نظر اقوام کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔

کہتے ہیں کہ جب انگریز حکومت نے سردار خیر بخش مری کو معافی دے کر ان کی سرداری مکمل طور پر بحال کر دی۔ تو دربار میں انگریز حکمران نے اس کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین ہے۔ آئندہ سردار خیر بخش مری سرکار برطانیہ کے وفادار رہ کر کبھی اس کی قوت سے ٹکرانے کی نہیں سوچیں گے۔ اس پر سردار خیر بخش مری نے جواب دیا کہ جناب والا مجھے بھی یقین ہے کہ آئندہ سرکار برطانیہ کبھی بلوچوں سے بھرتی کا تقاضہ نہیں کرے گی۔ (۱۰)

اسی طرح سبی دربار کا وہ مشہور تاریخی واقعہ ہے جس میں بلوچستان کے تمام قبائلی سردار بلوچستان میں انگریز گورنر جنرل کے نمائندہ کی بگھی کو ریذیڈنسی سے ریلوے اسٹیشن

تک کھینچ کر لائے۔ سردار خیر بخش مری نے جرات رندانہ کا ثبوت دیا۔ کہتے ہیں کہ جب بلوچستان میں گورنر جنرل کے نمائندہ نے شاہی جرگہ کے تمام سرداروں سے کہا کہ اس کی بگھی کو اسٹیشن تک کھینچ کر لے جائیں تو سردار خیر بخش ہی اکیلے سردار تھے جس نے نہ صرف اس ذلت آمیز حرکت سے انکار کیا بلکہ بلوچستان میں گورنر جنرل کے نمائندہ کو سختی سے ڈانٹ بھی دیا سردار خیر بخش کے اس دلیرانہ انکار کا بلوچ قبائل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ہر بلوچ اس کا مداح بن گیا۔ چنانچہ ملا مزار بگل زئی اپنی مشہور بلوچی نظم میں سردار خیر بخش مری کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے (ترجمہ)

تجھے آفریں باد خیر بخش مری ہے آنکھوں میں تیری جو غیرت بھری
ہے تجھ پر حلال دودھ بھی مادری تیری عمر جتنی ہو کوہ چھلگری

بلوچستان کا یہ مرد مجاہد' سادہ دل و راست باز سردار نواب خیر بخش مری ۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو بمقام سبی فوت ہو گیا۔ اس کی لاش کو کاہان لے جا کر دفنایا گیا۔ (۱۱)

سردار نواب خیر بخش مری کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سردار مہر اللہ خان مری سردار تسلیم کیا۔ اس نے سرداری سنبھالتے ہی ملک میں بدامنی کا قلع قمع کر دیا لیکن ۸ برس بعد ۱۹۳۳ء میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ سردار مہر اللہ خاں مری کی وفات کے وقت اس کا بیٹا میر خیر بخش خان مری خاصا کم عمر تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک اس کے چچا میر دودہ خان مری نے سرداری کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۵۰ء میں میر خیر بخش مری کو سردار تسلیم کر لیا گیا اور تمام اختیارات اسے منتقل ہو گئے۔ (۱۲)

سردار خیر بخش مری نے سیاست کے میدان میں ۱۹۵۶ء میں قدم رکھا اور ۱۹/ جنوری ۱۹۵۶ء کو سبی سے مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۱۳) ۱۹۶۲ء میں وہ سردار عطاء اللہ مینگل کے ہمراہ قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ اس اسمبلی میں بلوچستان سے فقط دو نمائندے لئے گئے تھے۔ (۱۴) دونوں ہی ارکان نے اس اسمبلی میں بلوچستان کے عوام کا مقدمہ بڑی جرات کے ساتھ پیش کیا اور سخت تند و تیز مگر حقائق پر مبنی تقریریں کیں۔ ان رہنماؤں نے جب قومی اسمبلی میں بلوچستان میں کی جانے والی بربریت اور مظالم کی خوں چکاں داستانیں سنائیں تو سارا ایوان دم بخود رہ گیا۔ ایوبی آمریت ان نوکیلے حقائق کی متحمل نہ ہو سکتی تھی اس لئے ان تقریروں کی اخبارات میں اشاعت ممنوع قرار دے دی گئی۔ (۱۵)

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں سردار خیر بخش مری نیشنل عوامی پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کے علاوہ جو تین دیگر افراد بلوچستان سے قومی اسمبلی کے رکن بنے تھے ان میں مولوی عبدالحق' ڈاکٹر عبدالحیٔ اور میر غوث بخش بزنجو شامل تھے۔ (۱۶) سردار خیر بخش مری کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحیٔ اور میر غوث بخش بزنجو کا تعلق بھی نیپ

سے تھا۔ جبکہ مولوی عبدالحق جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) سے تعلق رکھتے تھے۔
۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جمعیت علمائے اسلام اکثریتی پارٹی کے طور پر ابھریں۔ چنانچہ مارچ ۱۹۷۲ء میں پاکستان پیپلز پارٹی' نیپ اور جمعیت کے درمیان ایک سہ فریقی معاہدہ پر دستخط ہوئے جس کے نتیجے میں سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط حکومتیں قائم کر دی گئیں۔ بلوچستان میں غوث بخش بزنجو گورنر بنے' عطاء اللہ مینگل وزارت اعلیٰ پر فائز ہوئے اور سردار خیر بخش مری نے جو قومی اسمبلی کی نشست پہلے ہی خالی کر چکے تھے بلوچستان اسمبلی میں نیپ کی قیادت سنبھال لی۔ (۱۷)

تھوڑے ہی دنوں میں پیپلز پارٹی اور نیپ کے اختلافات کھل کر سامنے آنے لگے اور ایک سال کے اندر اندر ہی صدر بھٹو نے بلوچستان کی صوبائی حکومت کو توڑ کر صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا۔۔۔ صوبہ سرحد کی حکومت اس غیر آئینی اقدام کے خلاف احتجاجاً" مستعفی ہو گئی۔ (۱۸)

بھٹو کے اس اقدام کے نتیجے میں بڑے پیمانے میں فوجی ایکشن کا آغاز ہوا۔ بلوچی عوام نے اس فوجی ایکشن کی مزاحمت کی اور نتیجتہ" مری اور دوسرے قبیلوں کے کم و بیش آٹھ ہزار افراد افغانستان ہجرت کر جانے پر مجبور ہو گئے۔ (۱۹)

۸ر فروری ۱۹۷۵ء کو پشاور میں صوبہ سرحد کے گورنر اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ممتاز رہنما جناب حیات محمد خاں شیرپاؤ قتل کر دیئے گئے۔ یہ واقعہ نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی عائد کرنے کا ایک سبب بن گیا۔ نیپ کے تمام بڑے رہنما اور ارکان اسمبلی جن میں سردار خیر بخش مری بھی شامل تھے' گرفتار کر لئے گئے۔ حیدر آباد سینٹرل جیل میں ان تمام گرفتار شدگان کے خلاف بغاوت اور پاکستان دشمنی کے مقدمات کی سماعت شروع ہوئی۔ جو دو سال جاری رہی۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء آگیا اور جنرل ضیاء الحق نے یہ مقدمہ واپس لے کر ان تمام "باغیوں" کو رہا کر دیا۔ (۲۰)

پروفیسر عزیز محمد بگٹی' تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں' میں لکھتے ہیں۔
"حیدر آباد کیس کے دوران وہ (سردار خیر بخش مری) ذہنی اور شعوری طور پر اپنی پارٹی کے دیگر اعلیٰ قائدین سے کٹ گئے جس کا عملی اظہار رہائی کے بعد ہوا۔ جب میر غوث بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ خان مینگل نے نیپ کی جانشین پارٹی نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تو نواب مری اس سے یکسر الگ رہے۔ یہیں سے ان کی سوچ کے زاویئے میر غوث بخش بزنجو سے مختلف ہو گئے اور اس کے بعد سے بلوچ سیاست میں ان کی راہیں اور سوچ الگ ہو گئیں۔" (۲۱)

نواب مری نے ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ پاکستان کو خیرباد کہا۔ اس وقت جنرل رحیم الدین بلوچستان کے گورنر تھے۔ (کہا جاتا ہے کہ جنرل رحیم ہی نے نواب مری کو ملک سے باہر جانے کا موقع فراہم کیا تھا) کچھ عرصہ فرانس میں گزارنے کے بعد نواب مری نے کابل کا رخ کیا۔ دریں اثنا انہوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو بھی کابل آنے کا حکم دیا۔ اُن کے اس بلاوے پر ہزاروں مری پاک سرحد پار کر کے افغانستان پہنچ گئے۔ افغانستان کے ضلع ہلمند کا صدر مقام لشکر گاہ ان کی پہلی منزل ثابت ہوا اور وہ وہاں عرصہ دراز تک مقیم رہے۔ مری قبیلے کے کچھ لوگ کابل اور قندھار کے نواحی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ نواب مری نے مستقل طور پر کابل میں رہائش اختیار کر لی لیکن وہ وقتاً" فوقتاً" افغانستان میں پھیلے ہوئے اپنے قبیلے کے لوگوں سے ملتے رہتے تھے۔ افغانستان میں قیام کے دوران ہی سابقہ بغاوت کے اہم رہنماؤں کے درمیان کئی اختلافات پیدا ہو گئے اور کچھ رہنماؤں نے اپنے موروثی سردار نواب مری سے علیحدگی اختیار کر لی۔

ان منحرفین کا تعلق بجارانی قوم سے تھا۔ منحرفین نے ۱۳ دسمبر ۱۹۹۱ء کو کوہلو کے مقام پر اپنا ایک قبائلی جرگہ منعقد کیا اور اعلان کیا کہ اب ہم اپنے قبائلی سردار کے اثر سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اسی مہینے کوئٹہ منحرفین کے رہنماؤں میر نہلان خان' میر بہرام خان میر یعقوب خان نے جرگہ کے فیصلے کے بارے میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ اس پریس کانفرنس کے بعد لشکر گاہ میں مقیم مری قبیلے کے ایک اور رہنما میر ہزار خان نے پاکستان آکر یہ باضابطہ اعلان کیا کہ مری قبیلہ دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ میر ہزار خان کے اس بیان کی میر یعقوب خان نے حمایت کی جو قندھار سے منتقل ہو کر ڈوکی (ضلع لورالائی) میں رہائش اختیار کر چکے ہیں۔ کچھ دنوں بعد بجارانی قبیلے کے بزرگوں نے اپنے قبیلے کی مجلس منعقد کی تاکہ اپنے آپ کو روایتی قبائلی نظام سے الگ ہونے کا اعلان کیا جا سکے۔ (۲۲)

مری قبیلے کی بجارانی اور گزینی شاخ میں وجہ اختلاف سیاسی سے زیادہ معاشی تھی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ اب سے کوئی بیس برس پہلے مری علاقے میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر برآمد ہوئے تھے۔ مگر سردار خیر بخش مری نے ان ذخائر کی برآمدگی کے لئے کسی کمپنی کو این او سی جاری ہونے نہ دیا اور ان کے قبیلے کے افراد ہر اس کوشش کی مزاحمت کرتے رہے جو اس علاقے سے تیل یا گیس نکالنے کے لئے کی گئی۔ بجارانی شاخ کے عمائدین کا کہنا تھا کہ نہ صرف یہ کہ تیل اور گیس کے ذخائر نکالنے کی کوشش تیز تر کرنی چاہئے بلکہ اس میں سے بجارانیوں کو بھی حصہ ملنا چاہئے کیوں وہ علاقہ جہاں یہ ذخائر موجود ہیں۔ بجارانیوں کا علاقہ ہیں۔ اس مسئلے پر سردار خیر بخش مری اور میر شیر محمد مری کے درمیان بھی شدید اختلافات پیدا ہوئے کیونکہ میر شیر محمد مری کا تعلق قبیلے کی بجارانی شاخ سے تھا۔ (۲۳)

سردار خیر بخش مری اپنی جلا وطنی ختم کر کے جون ۱۹۹۲ء میں وطن واپس لوٹے، انہیں وطن واپس لانے کے لئے ایک بائیس رکنی قبائلی جرگہ کابل گیا تھا۔ جس میں بلوچستان کی تمام اہم سیاسی جماعتوں کے نمائندے شامل تھے۔ سردار خیر بخش مری اس جرگے کے ساتھ کوئٹہ تشریف لائے مگر انہوں نے اپنے سیاسی لائحہ عمل کا اعلان نہیں کیا (۲۴)۔ ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں سردار خیر بخش مری کے دو صاحبزادوں نوابزادہ چنگیز خان مری اور سردار گزین خان مری نے بالترتیب پی بی ۱۶ سبی اور پی بی ۱۸ کوہلو سے انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی (۲۵) دونوں نے یہ انتخاب آزادانہ حیثیت سے لڑا تھا۔ انتخابات کے بعد جب نواب ذوالفقار مگسی نے اپنی کابینہ تشکیل دی تو یہ دونوں بھائی اس کابینہ میں موجود تھے۔ گزین مری کو داخلہ اور قبائلی امور کا اور چنگیز مری کو مواصلات اور ورکس کا قلمدان سونپا گیا تھا۔ (۲۶)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں چنگیز مری اپنی نشست برقرار نہ رکھ سکے اور جمہوری وطن پارٹی کے میر عبدالجبار کے ہاتھوں شکست کھا گئے (۲۷) ۲۰۰۲ء کے انتخابی عمل میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

گزین مری والی نشست پر ۱۹۹۷ء میں ان کے بھائی نوابزادہ میر حیر بیار مری (۲۸) اور ۲۰۰۲ء میں ایک اور بھائی نوابزادہ میر بالاچ مری بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۲۹)

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ نواب خیر بخش مری کے صاحبزادے میر گزین مری کی اہلیہ سابق وزیر اعلیٰ بلوچستان، نواب ذوالفقار مگسی کی سوتیلی بہن ہیں جبکہ ان کی ایک صاحبزادی کی شادی سردار عطا اللہ مینگل کے صاحبزادے جاوید مینگل سے ہوئی ہے (۳۰)

نواب خیر بخش مری کے ایک بھائی میر قیصر خان مری بھی ایک مختصر دورانیے کے لیے سیاست میں رہے ہیں وہ ۱۹۷۷ء میں پی بی ۱۸ کوہلو ا سے بلا مقابلہ بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ یہ وہی نشست ہے جو پر ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء میں میر ہمایوں خان مری، صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔

میر ہمایوں خان مری، نواب خیر بخش مری اور میر قیصر خان مری کے بھتیجے، سردار میر احمد شاہ کے صاحبزادے اور نواب اکبر بگتی کے داماد ہیں۔ (۳۱)

سردار خیر بخش مری کے ایک دیرینہ ساتھی میر شیر محمد مری تھے۔ میر شیر محمد مری کی شہرت کا آغاز ۱۹۴۶ء میں اس وقت ہوا جب انہوں نے میر نہالان خان بجارانی کے ساتھ مل کر مظلوم پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ جس کا بنیادی مقصد ان سرداری ٹیکسوں سے قبیلے کو نجات دلانا تھا جو لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ انکے علاوہ اس کا دوسرا مقصد سردار اور سرکاری معتبرین کی چیرہ دستیوں کے خلاف جدوجہد کرنا تھا۔ انہوں نے کوہلو کے مقام پر پارٹی کا پہلا کنونشن منعقد کیا جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ پارٹی کی مقبولیت سے گھبرا کر حکومت نے دونوں رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ (۳۲)

۱۹۵۰ء میں جب سردار خیر بخش مری قبیلہ کے سردار مقرر ہوئے تو انہوں نے شیر محمد مری کے کہنے پر بیشتر سرداری ٹیکس ختم کر دیئے۔ یوں ان دونوں کی اس سیاسی دوستی کا آغاز ہوا جس نے قیام پاکستان کے بعد بلوچ فوجی تحریک کے سلسلے میں اہم خدمات سرانجام دیں۔

ایوب خان کے دور کے اوائل میں جب بلوچستان پر فوج کشی کے خلاف مسلح جدوجہد ہوئی تو شیر محمد مری نے مشرقی بلوچستان میں اس کی قیادت کی۔ جس پر سردار اکبر بگتی نے انہیں ''جنرل شیروف'' کا خطاب دیا۔ (۳۳)

۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۳ء کے دوران شیر محمد مری اور ان کے بیس قریبی رفقا نے بڑی خاموشی سے اپنے منصوبے وضع کیئے۔ وہ غیر منظم طریقے سے ہونے والی چھاپہ مار کاروائیوں کو سائنسی بنیادوں پر چھاپہ مار جنگ میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پہلے انہوں نے بنیادی کیمپوں کا ایک جال بچھا دیا۔ (جولائی ۱۹۶۳ء تک انہوں نے ۴۵ ہزار مربع میل علاقہ میں ۲۳ کیمپ قائم کر لئے تھے) تاہم انہوں نے فوج کے ساتھ بڑے تصادموں سے گریز کیا۔ وہ کلاسیکی چھاپہ مار انداز میں گھات لگا کر فوجی قافلوں پر حملہ کرتے ٹرینوں کو بموں سے اڑاتے' سنتریوں پر فائرنگ کرتے اور فوجی کیمپوں کو نشانہ بناتے۔ پاکستانی فوج نے جوابی کاروائی کے طور پر ہوائی حملوں کا آغاز کیا جس سے چھاپہ ماروں کے لئے عوامی حمایت میں اضافہ ہوا۔ اس نوع کا پہلا حملہ اس طرح ہوا کہ فوج نے شیر محمد مری اور اس کے رشتہ داروں کے تیرہ ہزار ایکڑ پر پھیلے ہوئے بادام کے درختوں کو بلڈوزر پھیر کر جڑوں سے اکھاڑ دیا۔ یہ باغات مری باغات والے سب سے زرخیز علاقے میں واقع تھے۔ اس اقدام کے نتیجے میں دسمبر ۱۹۶۴ء میں ایک بڑے تصادم کے شعلے بھڑک اٹھے جب پانچ سو فراریوں (پراریوں) نے ایک فوجی کیمپ پر دھاوا بول دیا۔ جس میں دونوں جانب کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ (۳۴)

دسمبر ۱۹۶۵ء میں ایک اور فوجی کاروائی میں دو سو پاکستانی فوجی مارے گئے۔ اس لڑائی میں پاکستان ائیر فورس کو بھی استعمال کیا گیا۔ ان کاروائیوں میں مسلسل جانی نقصان اور پاکستانی مسلح دستوں کی پسپائی کے پیش نظر ستمبر ۱۹۶۶ء میں مری بگٹی علاقہ میں تین اطراف سے مزید دستے روانہ کئے گئے لیکن ہر طرف سے ان کا راستہ بھرپور طریقہ سے روکا گیا۔

جب مسلح فوجی کاروائیاں نتیجہ خیز ثابت ہوئی نظر نہ آئیں تو ۲۸ر جنوری ۱۹۶۷ء کو حکومت پاکستان نے عام معافی کا اعلان کر کے بات چیت کے ذریعہ مسئلہ کے حل کی کوششیں شروع کی۔ چنانچہ اس بات چیت کے نتیجے میں یہ طے پایا کہ سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے گا اور سرداروں کی سرداریاں بحالی کر کے تمام سرکاری مراعات بھی بحال کی جائیں گی۔ چنانچہ بلوچستان میں فوجی کاروائیوں کا ایک سلسلہ جو ۱۹۵۸ء میں شروع ہوا تھا' وقتی طور پر روک دیا گیا۔ (۳۵) یہ میر شیر محمد مری کی ایک اہم کامیابی تھی۔

۱۹۷۳ء میں جب نیپ کی حکومت برطرف ہوئی اور حیدر آباد جیل میں نیپ کے خلاف بغاوت کے ریفرنس کا آغاز ہوا تو میر شیر محمد مری بھی گرفتار شدگان میں شامل تھے۔ تاہم اس سے پہلے کہ عدالت کسی نتیجے پر پہنچتی، بھٹو حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور جنرل ضیاء الحق نے مقدمہ واپس لیکر تمام گرفتار شدگان کو رہا کر دیا۔ ان رہا ہونے والوں میں میر شیر محمد مری بھی شامل تھے۔ ان کی رہائی ۵ر فروری ۱۹۷۸ء کو عمل میں آئی۔ (۳۶) رہائی کے بعد بھی میر شیر محمد مری کے مصائب ختم نہیں ہوئے اور انہیں دو برس کا عرصہ نظر بندی میں گزارنا پڑا۔ اسی دوران ان پر ہارٹ اٹیک ہوا۔ جس کے بعد ۱۹۸۰ء میں وہ دل برداشتہ ہو کر کابل چلے گئے۔ (۳۷) وہیں ان کے قبیلے کے سردار، سردار خیر بخش مری بھی مقیم تھے۔ مگر آخری ایام میں ان دونوں دیرینہ ساتھیوں میں بعض اختلافات پیدا ہوئے۔ چنانچہ جب جون ۱۹۹۲ء میں سردار خیر بخش مری کو وطن واپس لانے کےء ایک قبائلی جرگہ کابل پہنچا تو شیر محمد مری اس سے پہلے ہی دہلی روانہ ہو چکے تھے۔ جہاں سے وہ اپنے طور پر وطن واپس لوٹے (۳۷) وطن واپسی کے بعد میر شیر محمد مری سیاست سے الگ تھلگ رہے۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں وہ اپنے صاحبزادے میر یوسف مری کے ہمراہ علاج کی غرض سے دہلی چلے گئے۔ جہاں ۹ر مئی ۱۹۹۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (۳۸)

میر شیر محمد مری نظریئے کے حوالے سے کٹر مارکسٹ تھے۔ وہ انگریزی، روسی، فارسی، پشتو، سندھی، سرائیکی، بلوچی اور براہوی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ (۳۹)

میر شیر محمد مری کی وفات کے بعد ان کے بھائی میر بہرام خاں مری نے ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر دونوں مرتبہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک مرتبہ انہیں سردار گزین مری نے ہرایا اور دوسری مرتبہ انہیں میر جیر بیار نے شکست سے ہمکنار کیا۔ (۴۰)

میر شیر محمد مری کے ایک عزیز میر نہالان خان مری بھی تھوڑے عرصہ کیلئے سیاست کے میدان میں رہے ہیں۔ وہ حاجی میر مراد خان جمالی کے دست راست اور سیاسی ہم سفر تھے۔

۱۹۷۰ء میں انہوں نے پاکستان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر میر احمد نواز بگٹی کے مقابلے میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ وہ اس مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن انہوں نے اپنے علاقے کے ووٹرز میں سیاسی شعور بیدار کیا۔

۱۹۸۱ء میں وہ ایک مختصر دورانیے کیلئے جنرل ضیاء الحق کی تشکیل کردہ مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۹۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (۴۱)

حوالہ جات

۱۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان، قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۵۴ تا ۱۵۵

۲۔ رائے بہادر ہتو رام۔ تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۸۰
۳۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان' قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۴۵۱'
۴۔ محمد سردار خان بلوچ۔ بلوچ قوم کی تاریخ۔ ترجمہ پروفیسر ایم انور رومان۔ حصہ دوم۔ س ۵۳۱
۵۔ میر گل خاں نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۵۵ تا ۱۵۷
۶۔ جسٹس میر خدا بخش خان بجارانی مری۔ بلوچستان تاریخ کے آئینے میں۔ ترجمہ پروفیسر سعید احمد رفیق۔ کوئٹہ۔ ص ۵۲۰ تا ۵۲۲
۷۔ ملک صالح محمد خاں لڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔ کوئٹہ۔ ص ۶۴ تا ۶۶
۸۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (اول' دوئم)۔ کوئٹہ۔ ص ۴۱۳
۹۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان' شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۸۱ تا ۱۸۳
۱۰۔ ایضاً۔ ص ۱۸۴
۱۱۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (اول' دوئم) کوئٹہ۔ ص ۴۱۳' ۴۱۴
۱۲۔ ملک صالح محمد خاں لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے) کوئٹہ۔ ص ۶۹' ۷۰
۱۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۵۶ء
۱۴۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۶۳ء
۱۵۔ نمائندہ خصوصی۔ بلوچ سردار جب سردار چلے۔ ہفت روزہ زندگی۔ لاہور۔ ۲۲ر دسمبر ۱۹۶۹ء
۱۶۔ افتخار احمد۔ پاکستان جنرل الیکشنز ۱۹۷۰ء۔ لاہور۔ ص ۱۲۸
۱۷۔ احمد سلیم۔ ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیوروکریسی۔ لاہور۔ ص ۲۹۰
۱۸۔ احمد سلیم۔ آزادی اور عوام' لاہور۔ ص ۱۶۶
۱۹۔ ایضاً۔ ص ۱۶۶' ۱۶۷
۲۰۔ احمد سلیم۔ ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیوروکریسی۔ لاہور۔ ص ۲۹۱' ۲۹۲
۲۱۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۲۵۴' ۲۵۵
۲۲۔ محمد ریاض۔ مری قبائل کی واپسی۔ ماہنامہ پاکستان (معلومات) کراچی اکتوبر، نومبر ۱۹۹۲ء۔ ص ۵۲' ۵۳
۲۳۔ اختر بلوچ۔ مکتوب کوئٹہ۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۶ر تا ۱۳ر جولائی ۱۹۹۲ء۔
۲۴۔ امان اللہ شادیزئی۔ مکتوب کوئٹہ۔ ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۹۲ء
۲۵۔ گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۵۷۳
۲۶۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ۔ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء
۲۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔

ص ۶۵۶، ۶۵۸

۲۸۔ ایضاً۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد دوم۔ ص ۳۵۳

۲۹۔ ادارہ قومی تعمیر نو کی ویب سائٹ www.nrb.gov.pk

۳۰۔ عدنان عادل۔ بلوچ سردار کون کس کا رشتے دار۔ بی بی سی اردو ڈاٹ کام۔ ۲۶ر فروری ۲۰۰۵ء

۳۱۔ ایضاً۔

۳۲۔ منیر احمد مری۔ بلوچستان، سیاسی کشمکش مضمرات و رجحانات۔ کوئٹہ۔ ص ۸۳

۳۳۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ۔ ۱۳ر مئی ۱۹۹۳ء

۳۴۔ احمد سلیم۔ بلوچستان، صوبہ مرکز تعلقات۔ لاہور۔ ص ۳۰، ۳۱

۳۵۔ منیر احمد مری۔ بلوچستان، سیاسی کشمش، مضمرات و رجحانات۔ کوئٹہ۔ ص ۹۷، ۹۸

۳۶۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ۔ ۱۲ر مئی ۱۹۹۳ء

۳۷۔ ادارہ ''جنرل شیروف کی واپسی''۔ (انٹرویو کے اقتباسات)۔ ماہنامہ مطالعہ پاکستان کراچی (معلومات)۔ شمارہ ۶۔ ص ۸۳

۳۸۔ اختر بلوچ۔ مکتوب کوئٹہ۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔ ۲۹ر جون تا ۵ر جولائی ۱۹۹۲ء۔ ص ۱۴

۳۹۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ۔ ۱۲ر مئی ۱۹۹۳ء

۴۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص ۶۵۸

۴۱۔ اختر علی خان بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات۔ جلد چہارم۔ کراچی ص ۲۱۰ تا ۲۱۲

مگسی

مگسی، لاشاری بلوچوں کا ایک قبیلہ ہے جس کے بیشتر افراد جھل (کچھی) اور اس کے مضافات میں بستے ہیں جبکہ کچھ افراد مظفر گڑھ، لیہ جنگ شاہی، لاڑکانہ، خیرپور، میہڑ، جیکب آباد، گھوٹکی، شکارپور اور خان پور میں بھی آباد ہیں۔

مگسیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ایران سے آئے ہیں جہاں ان کا مرکز مگس کے مقام پر تھا۔ جب یہ بلوچستان آئے تو رندوں اور لاشاریوں کے درمیان محاذ آرائی عروج پر تھی۔ مگسیوں نے اس معرکہ آرائی میں لاشاریوں کا ساتھ دیا اور لاشاریوں کے ساتھ ساتھ خود بھی بہت نقصان اٹھایا۔ میر محمود خان اول کے دور میں جب رندوں کو کامل فتح نصیب ہوئی اور لاشاری ملک چھوڑ کر چلے گئے تو مگسیوں نے جھل کے مضافات کو اپنا مسکن بنایا کیونکہ کہ اس سے پہلے ہی میر نصیر خان اول کے عہد میں جب ملک سراوان اور جھالاوان میں تقسیم ہوا تھا تو مگسی جھالاوان کے زیرِ انتظام آ چکے تھے۔ (۱)

میر محمود خاں اول کی وفات کے بعد مگسیوں نے ایک مرتبہ پھر بغاوت کرنا چاہی اور میر محمود خاں کے بیٹے محراب خان کی بجائے اس کے چچازاد بھائی میر احمد یار خاں کو امیر خان تسلیم کیا مگر بعد جب محراب خان نے میر احمد یار خان کو قتل کروا دیا تو مگسی ایک مرتبہ پھر محراب خان کی اطاعت کرنے لگے۔ (۲)

بیسویں صدی کے آغاز کے وقت لاشاریوں کا سردار نواب قیصر خان تھا۔ یہ بہت بااثر شخص تھا اور ۱۹۰۳ء میں اسے حکومت نے نواب کا خطاب عطا کیا تھا۔ (۳) یہ وہ زمانہ تھا جب بلوچوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز بلوچستان پر قابض ہو چکے تھے۔ خان آف قلات میر محمود خان، دنیا مافیہا سے بے خبر داد عیش دے رہے اور کم ہمت اور ہوس پرست قبائلی سردار گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہو چکے تھے۔ جہاں کہیں کوئی غیور بلوچ سر اٹھاتا تھا، سردار کی لاٹھی بلائے بے درماں بن کر اس کے سر پر پڑتی تھی اور بلوچستان کی مردم خیز سرزمین اپنے

فرزندوں سے خالی، اجاڑ اور ویران نظر آنے لگی تھی۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بلوچ قوم طبعاً خاموش اور مشاہیر پرست واقع ہوئی ہے۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی بلوچ قبیلہ نے اپنے سردار کے خلاف بغاوت کی ہو یا قبائل اور سرداروں نے مل کر خان کے اقتدار اعلیٰ کو للکارا ہو۔ بیشک بلوچوں کی تاریخ میں صرف خان میر خداداد خان کے خلاف ایک ایسی بغاوت ہوئی لیکن اس سے بھی انگریزی حکومت کی پیہم انگیخت کے باوجود میر خداداد خان کو قلات کے تخت سے ہٹانا مقصود نہیں تھا۔ بلکہ ان کے ہاتھوں سے اپنے حقوق کی بازیافت اور تحفظ مقصود تھا۔ علاوہ ازیں زیادہ واضح الفاظ میں یہ فتنہ بھی ایک غیر ملکی طاقت یعنی انگریزی حکومت کا کھڑا کیا ہوا تھا کیونکہ ایسا کرانے کے بغیر اسے بلوچستان پر اپنا اثر و اقتدار قائم کرنا مشکل نظر آتا تھا۔

بلوچستان پر مکمل قبضہ کر لینے کے بعد انگریزی حکومت نے بلوچوں کی اس طبعی کمزوری یعنی مشاہیر پرستی سے حسب منشا فائدہ اٹھایا۔ قبائل پر سرداروں کو آمرانہ اختیارات دینے سے انگریزوں کو بلوچستان میں اپنی حکومت کی بنیادیں استوار کرنے میں بہت بڑی مدد ملی۔ سرداروں نے قبائل کو رشتوں، جرمانوں، بیگار، مالی، بجار اور پرسی وغیرہ کی گوناگوں ناجائز وصولیوں سے نڈھال اور کمزور کر دیا اور اس طرح ان پر انگریزی حکومت کے کارندوں کے لئے حکومت کرنا آسان بنا دیا۔ البتہ انگریزی حکومت نے جہاں سرداروں کو قبائل پر مکمل اختیارات دیئے وہاں حکومت کے ساتھ سلوک میں ان کو ذرہ بھر خودسر نہیں چھوڑا اور ان میں اس قدر جان رہنے نہیں دی کہ کسی وقت طاقت کے نشہ میں اپنے آقاؤں کو بھی آنکھیں دکھانے کی جرات کر سکیں سرداروں کی گوشمالی اور سرزنش کے لئے پولیٹکل ایجنٹ اور وزیراعظم مامور تھے جو معمولی معمولی باتوں اور خفیف سے خفیف حرکت پر جو بشرطیکہ انگریزی حکومت یا اس کے کارندوں کے خلاف ہوتی بڑے سے بڑے سردار کو ناک رگڑنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

الغرض ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۰ء تک کا زمانہ بلوچستان اور بالخصوص ریاست قلات کا تاریک ترین دور تھا۔ میر محمود خان، خان قلات شب و روز کی عیاشیوں میں پڑ کر اپنی بینائی کھو چکے تھے۔ سر شمس شاہ وزیراعظم سیاہ و سفید کا مالک بن کر نادری حکم چلا رہا تھا۔ اس کے خلاف ریاست کے کسی شخص کو لب کشائی کی جرات نہیں ہو سکتی تھی سرداروں کے مظالم اور جرگہ کی ستم رانیاں پورے عروج پر تھیں۔ بلوچستان کے شاہی خاندان احمد زئی کے باقی افراد جلاوطنی کے عالم میں کوئٹہ میں حسرت و یاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بلوچ قوم جہالت میں مبتلا، افلاس و نکبت کا شکار، عمالان حکومت کی دستبرد سے نالاں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا تھی۔

اگرچہ ایک طرف بلوچستان پر انگریزی حکومت کی گرفت مضبوط پڑ رہی تھی مگر دوسری طرف ہمسایہ مملکت ہند میں کانگریسی مجاہدین کی پیہم یلغاروں سے برطانوی سامراج شاہی کی چولیں

ڈھیلی پڑ رہی تھیں۔ جس کا بلوچستان پر بھی اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ گو کہ بلوچستان کی انگریزی حکومت نے ہرچند کوشش کی کہ کانگریس کی مسموم ہوا اس ملک تک نہ پہنچ سکے لیکن اس کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ انگریز شاہی کے خلاف کانگریس کی مجاہدانہ سرگرمیوں' کارناموں اور فلک شگاف نعروں کی گونج ان لٹے پٹے سرداروں کے شکنجے میں کسے اور قبائلی تنازعوں میں مبتلا بلوچوں کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ جس پر بلوچستان میں سب سے پہلے میر یوسف علی خان مگسی نے لبیک کہا اور اپنی خوابیدہ اور بے خبر قوم کو جگانے اور خبردار کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ (۴)

میر یوسف علی خان عزیز مگسی ' مگسی قبیلے کے سردار نواب قیصر خان مگسی کا منجھلا بیٹا تھا۔ یہ ایک خوشگوار اتفاق ہی تھا کہ میر یوسف مگسی کو عالم جوش و جوانی میں ریاستی جمود کی کیفیت سے نکل کر ایک ایسی جگہ منتقل ہونا پڑا جہاں سیاسی ہلچل اور جدوجہد اپنے عروج پر تھی۔

۱۹۲۳ء میں یوسف مگسی کے والد نواب قیصر خاں مگسی کو شمس شاہی احکامات کے تحت اپنے قبیلے کی سرداری سے ہٹا کر اس کے بڑے بیٹے نوابزادہ گل محمد مگسی کو قبیلے کا سردار بنا دیا گیا اور نواب قیصر خان مگسی کو یوسف مگسی سمیت بلوچستان سے جلاوطن کر دیا گیا۔ باپ بیٹے ۱۹۲۹ء تک ملتان میں جلاوطن رہے۔ (۵)

یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان بھر میں انگریزی حکومت نے کانگریس کی تحریک ایک ولولہ انگیز قومی جدوجہد کی شکل اختیار کر چکی تھی اور اس کے اثرات برصغیر کے دور افتادہ مقامات تک پہنچ چکے تھے۔ انہی دنوں تحریک خلافت کے ذریعہ برصغیر کے مسلمان بھی انگریز حکومت کے خلاف پہلی مرتبہ متحرک ہوئے اس تحریک میں کانگریس بھی مسلمانوں کے ساتھ تھی۔

تحریک خلافت نے پنجاب میں بھی جوش و ولولہ پیدا کیا۔ نواب زادہ یوسف عزیز مگسی جیسے نوجوان کے لئے ایسے سیاسی ماحول سے متاثر نہ ہونا ناممکن سی بات تھی۔ چنانچہ انہوں نے بلوچستان کے حالات کو بھی اس سیاسی جدوجہد کا حصہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ (۶)

وہ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء کا تاریخی دن تھا جب لاہور کے ایک اخبار ہمدرد میں "فریاد بلوچستان" کے عنوان سے نوابزادہ یوسف عزیز مگسی کا ایک مضمون شائع ہوا۔

اپنے اس تاریخی مضمون میں بلوچستان کے باشندوں سے خطاب کرتے ہوئے میر یوسف علی خان نے لکھا۔ "آج ساری دنیا شاہراہ ترقی پر گامزن ہے مگر بلوچستانی کچھ ایسے سوئے ہوئے ہیں کہ جاگنا حشر کو معلوم ہوتا ہے۔ بلوچستانیوں سے ہماری مخلصانہ درخواست ہے کہ خدا کے لئے ساری دنیا کو ہنسنے کا موقع نہ دیجئے۔ یہی وقت ہے اگر اسلاف کا خون آپ میں اب تک موجود ہے تو اٹھیئے اور اس طرح اٹھیے جس طرح آپ کے اسلاف اٹھا کرتے تھے۔ سیاسی غلامی کی زنجیریں ایک نعرۂ حریت لگا کر توڑ ڈالئے اور قوموں کے لئے مشعل راہ بن جائیے۔ باہمی حسد و رقابت اور ان لغویات کی بیخ کنی کیجئے اور صرف اس آتش رقابت سے اپنے سینوں کو مشتعل

کیجئے کہ جنگ آزادی میں تم سے زیادہ کوئی بہادر نہ نکلے اور تم سے پہلے وہ جام شہادت نوش نہ کرے خدا کے لئے بزدلانہ اور رجعت پسندانہ ذہنیت کو مٹائیے اور دیکھئے تاریخ کیا کہتی ہے۔ مادر وطن کی قربانیوں سے سبق لیجئے۔" (۷)

میر یوسف عزیز مگسی کے اس مضمون کا چھپ کر بلوچستان پہنچنا تھا کہ ایوان حکومت میں ہلچل مچ گئی۔ ان دنوں بلوچستان میں اخبارات و رسائل کی اشاعت تو کجا ان کا مطالعہ تک جرم سمجھا جاتا تھا اور کسی بلوچ کے لئے برصغیر کے کسی اخبار میں بلوچستان کے معاملات پر مضمون شائع کروانا اس سے بھی سنگین جرم تھا۔ چنانچہ یوسف عزیز مگسی کو بھی اس جرم کی سزا مل کر رہی اور وہ جب ۱۹۳۰ء کے آغاز میں ممبئی آئے تو انہیں ریاست قلات کے وزیراعظم شمس شاہ کے ایماء پر جس کی جابرانہ حکومت ہی یوسف عزیز مگسی کا اصل ہدف تھی' انگریز حکومت نے گرفتار کر لیا اور ریاست قلات کی حکومت کے حوالے کر دیا۔ (۸)

حکومت قلات نے فوراً چند سرداروں (سردار محمد خان شاہوانی' سردار سمندر خان محمد شئی' سردار بہرام خان لہڑی' سردار رسول بخش زرک زئی اور سردار رسول بخش مینگل) پر مشتمل ایک جرگہ تشکیل دیا جس نے رائے دی کہ میر یوسف مگسی کا مضمون نادرست اور غلط ہے اور اس قسم کے مضمون کی اشاعت ہرگز نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ بطور سزا اسے ایک سال قید' بارہ ہزار نو سو روپے جرمانہ اور دس ہزار روپے کی ضمانت نیک چلنی داخل کرنے کی سزا سنا دی گئی۔ (۹)

میر یوسف مگسی کی قید کا زمانہ ان کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ اس قید کے دوران ان کا رابطہ میر عبدالعزیز کرد کے ساتھ قائم ہوا۔ جن کے والد مستونگ جیل کے نگران تھے۔ میر عبدالعزیز کرد اپنے رفقا کے ہمراہ ایک خفیہ تنظیم "انجمن اتحاد بلوچاں" کے نام سے قائم کر چکے تھے۔

میر عبدالعزیز کرد ایک سال تک میر یوسف علی خان کو ہر ممکن لٹریچر بہم پہنچاتے رہے اور جب جولائی ۱۹۳۱ء میں میر یوسف مگسی ایک سال کی قید گزارنے کے بعد رہا ہوئے تو انجمن کے اراکین نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ (۱۰)

ان دنوں قلات کے نابینا حکمران میر محمود خان دوم قلات کی میری میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ایک طرف شہزادہ میر محمد اعظم جان اپنا آبائی تخت حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف قلات کے وزیراعظم سر شمس شاہ جو ذاتی طور پر شہزادہ میر محمد اعظم جان کے مخالف تھے۔ میر محمود خان دوم کے بیٹے میر محمد انور جان کو ان کا جانشین مقرر کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ قبائلی سردار جن کی قومی بنیادوں پر سوچنے' سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیتیں انگریزوں کی غلامی میں رہنے سے تقریباً سلب ہو چکی تھیں۔ حیران و پریشان کبھی

بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کے دروازے پر اور کبھی سر شمس شاہ وزیر اعظم کی چوکھٹ پر رہنمائی کی استدعا کرتے پھرتے تھے۔

اِن حالات میں میر یوسف علی خان اور ان کے بیدار مغز ساتھیوں نے جن میں میر عبدالعزیز کرد، نواب زادہ میر عبدالرحمٰن بگتی، محمد حسین عنقا، ملک فیض محمد یوسف زئی، محمد نسیم تلوی اور محمد حسن نظامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ "انجمن اتحاد بلوچاں" کے نام کو اپنا کر ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے اس کا اعلان کر دیا۔ میر یوسف علی خان جماعت کے صدر اور میر عبدالعزیز جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔

قلات کے وزیر اعظم نے میر یوسف علی خان کو پھر گرفتار کرنے کے وارنٹ جاری کر دیئے لیکن میر یوسف علی خان قبل از وقت اطلاع پا کر جیکب آباد چلے گئے، جہاں سے مشہور مگسی ایجی ٹیشن شروع کر دی گئی۔

اسی دوران میں ۲، ۳ نومبر کی رات کو میر محمود خان دوم، خان قلات ہو گئے۔ انجمن اتحاد بلوچاں نے "ذمہ دار حکومت" قائم کرنے کی شرط پر سمجھوتہ کر کے شہزادہ میر محمد اعظم جان کی حمایت کا اعلان کر دیا جس میں اسے خلاف توقع کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ شہزادہ میر اعظم جان خان قلات منتخب ہوئے اور سر شمس شاہ وزیر اعظم ملازمت سے سبکدوش کر دیئے گئے۔

میر یوسف علی خان کی تحریک پر دسمبر ۱۹۳۲ء میں ایک کل ہند بلوچ کانفرنس جیکب آباد میں منعقد ہوئی جس میں عبدالصمد خان اچکزئی اور بلوچستان کے بعض دوسرے زعماء نے شرکت کی۔

میر یوسف علی خان مگسی ایک اچھے ادیب اور مقرر ہونے کے علاوہ فارسی اور اردو زبانوں کے ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ عزیز تخلص کرتے تھے۔ ان کے بعض انقلابی اشعار اب تک کافی مشہور اور زبان زدعام ہیں۔

۱۹۳۳ء میں سردار گل محمد خان مگسی کو جو میر یوسف علی خان عزیز کے بڑے بھائی اور نواب قیصر خان کے بعد مگسی قبیلہ کے سردار مقرر ہوئے تھے۔ نااہلیت کی بناء پر سرداری سے ہٹا کر مگسی قبیلہ نے متفقہ طور پر میر یوسف علی خان کو اپنا سردار منتخب کر لیا۔ (۱۱)

انگریز حکومت کا خیال تھا کہ سردار بن جانے کے بعد میر یوسف مگسی کے مفادات اور ترجیحات بدل جائیں گی اور سرداری مفادات و اغراض اسے انگریزی حکومت کی قربت اختیار کرنے پر مجبور کر دیں گی۔ اس طرح وہ بلوچ قومی سیاست و تحریک سے الگ ہو جائیں گے۔ اسی سوچ کے تحت ہی ان کو اپنے قبیلے کی سرداری دی گئی تھی۔ لیکن انگریز حکومت کی یہ توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ یوسف عزیز مگسی ایک مختلف قسم کے سردار ثابت ہوئے۔ سردار بن جانے کے بعد اس نے اپنے ترقی پسندانہ خیالات کو اپنے قبیلے کی حد تک عملاً نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جھل میں "جامعہ یوسفیہ" کے نام سے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ آبپاشی کے نظام

کو بہتر بنانے کے لئے یرتھر نہر کی بنیاد رکھی۔ کوٹ یوسف مگسی کے نام سے ایک نیا قصبہ آباد کر کے وہاں بھی ایک اسکول قائم کیا اور لوگوں کے علاج معالجے کی خاطر ایک شفاخانہ قائم کیا۔

انہوں نے اپنے آپ کو صرف اپنے قبیلے تک محدود نہیں رکھا اور بدستور انجمن اتحاد بلوچاں کے ذریعے بلوچستان میں اصلاحات کے لئے کوشاں رہے۔ جب ۲۰ ستمبر ۱۹۳۳ء کو میر احمد یار خان نے خان کی حیثیت سے عنان حکومت سنبھال لی تو نواب یوسف علی خان مگسی نے بحیثیت ایک قبائلی سردار اور قومی قائد کے ان کے ساتھ مکمل تعاون کر کے بلوچوں کے روایتی مرکزی مقتدر کو بااختیار اور اس کے ذریعے بلوچستان کو آزاد حیثیت دینے کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا تاکہ انگریز حکومت کے دائرہ اختیار کو ان حدود کے اندر رکھا جا سکے۔ جو برطانوی حکومت اور بلوچستان کے درمیان ہونے والے مختلف معاہدات کے ذریعے طے پا چکے تھے۔ خان احمد یار خان کی جانب سے بھی انجمن اتحاد بلوچاں کو مکمل تائید و پشت پناہی حاصل تھی۔

جب انجمن اتحاد بلوچاں نے جس کے صدر اب بھی نواب یوسف علی خان مگسی تھے۔ ریاست قلات میں تمام بلوچ علاقوں بشمول انگریزوں کی جانب سے حاصل کردہ مستجار علاقوں کو واپس ریاست میں شامل کر کے بلوچستان کو اس کی قدیم حیثیت میں صوبائی درجہ دے کر اس کی آزادی کی تحریک کا آغاز کیا تو یہ بات ہندوستان کی انگریزی حکومت کے برداشت سے باہر تھی۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ ابھی تک سندھ اور سرحد کو بھی صوبائی درجہ نہیں ملا تھا۔ وہ بلوچستان کو ایسی حیثیت دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے خان احمد یار خان پر دباؤ ڈال کر اس کے ذریعے انجمن اتحاد بلوچاں پر ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ اس تنظیم کے تمام تر قائدین سوائے نواب یوسف عزیز مگسی کے گرفتار یا جلاوطن کر دیئے گئے۔ (۱۲)

۱۹۳۴ء میں سردار میر یوسف علی خان یورپ گئے اور آٹھ دس ماہ وہاں رہے۔ ۳۱ر جنوری ۱۹۳۵ء کو واپس وطن آئے اور ایک نئے ولولہ اور جوش کے ساتھ نئی بنیادوں پر بلوچستان میں ہمہ گیر تحریک چلانے کے لئے سرگرمیاں شروع کر دیں لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

۳۰، ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات کو جب کہ وہ کوئٹہ کے ڈاک بنگلہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، کوئٹہ کا قیامت خیز زلزلہ وقوع پذیر ہوا اور سردار میر یوسف علی خان عزیز مگسی ڈاک بنگلہ کے ملبہ میں دب کر واصل حق ہو گئے۔ (۱۳)

میر یوسف عزیز مگسی کی تمام تر سیاست ترقی پسندانہ تھی اور بلوچستان اور بلوچوں کی ترقی اور خوشحالی ان کا نصب العین تھا۔ انہوں نے بلوچوں کو یکجا کر کے ان کے اتحاد کی قوت کے ذریعے بلوچستان کو انگریزی تسلط سے ہر ممکن حد تک آزاد رکھنے کی کوشش کی۔ مگر ان کے ساتھ سب سے بڑی بے وفائی ان کی عمر نے کی اور وہ محض ۲۷ سال کی عمر میں اپنی قوم کو داغ مفارقت دے گئے، اگر وہ کچھ عرصہ مزید زندہ رہتے تو بلوچستان میں سیاسی پیش رفت کی رفتار کہیں تیز ہوتی اور

شاید ستر کی دہائی کا سفر چالیس کی دہائی میں ہی طے ہو چکا ہوتا۔ (۱۴)

میر یوسف عزیز مگسی کی وفات کے بعد ان کے بھائی میر محبوب علی مگسی قبیلے کے سردار بنے۔ میر محبوب علی مگسی بھی ایک بڑے اچھے اور قابل منتظم تھے۔ ان کا تمام تر وقت ان کے قبیلے کی بہتری کے لیے گزرتا تھا۔ وہ اپنے عوام کی فلاح و بہبود کا کس قدر خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جب ریاست قلات میں طاعون کی وبا بری طرح پھیلی تھی، تو جھل مگسی میں اس وبا سے فقط ایک فیصد لوگ ہلاک ہوئے کیونکہ میر محبوب مگسی نے اپنی ریاست میں دواؤں اور ڈاکٹروں کا بہترین انتظام کیا ہوا تھا (۱۵) قیام پاکستان کے وقت جب قلات اسمبلی کا قیام عمل میں آیا تو میر محبوب علی مگسی اس اسمبلی کے دارالامراء کے رکن بنائے گئے تھے۔ (۱۶)

میر محبوب علی مگسی کے خاندان کے تقریباً سبھی افراد پاکستان کی سیاست میں متحرک رہے۔ ان کے بڑے بیٹے میر سیف علی مگسی تھی۔ وہ ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۱۹۵۳ء میں سندھ اسمبلی کی رکنیت سے اپنا سیاسی کیریئر کا آغاز کیا۔ انہوں نے سندھ اور بلوچستان میں مسلم لیگ کو منظم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ (۱۷) وہ اپنے والد کے متوقع جانشین تھے، مگر ۱۲/اپریل ۱۹۶۹ء کو اپنے والد کی زندگی ہی میں قتل کر دیئے گئے (۱۸)

میر سیف علی مگسی کے چھوٹے بھائی میر یوسف مگسی ۱۹۶۵ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۹) پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد انہوں نے بلوچستان میں اس پارٹی کو منظم کیا۔ مگر ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے پہلے ہی اس پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ (۲۰) اور ۱۹۷۰ء کے صوبائی انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لے کر کامیاب ہوئے۔ (۲۱) ۱۹۸۵ء میں وہ صوبہ بلوچستان سے سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے۔ (۲۲) اور ۱۹۹۱ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ میر یوسف علی مگسی آغا عبدالکریم کے داماد ہیں جو خان آف قلات میر احمد یار خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ (۲۳)

میر محبوب علی مگسی نے ۱۹۹۲ء میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے میر یوسف علی مگسی قبیلے کے سردار بنے۔ کیونکہ اس وقت ان کے بڑے بیٹے میر سیف علی مگسی حیات نہیں تھے مگر یہ فیصلہ میر سیف علی مگسی کے بیٹے میر ذوالفقار علی مگسی نے قبول نہیں کیا اور وہ بھی قبیلے کی سرداری کے دعوے دار بن گئے۔ ۱۹۸۵ء سے اب تک سرداری کے اس تنازع میں درجنوں افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں (۲۴)

میر سیف علی مگسی نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ان کے ایک بیٹی ہوئی۔ دوسری بیوی سے ان کے پانچ بیٹے ہوئے جن کے نام ذوالفقار، طارق، اکبر، خالد اور ظفر مگسی ہیں۔ تیسری بیوی سے ان کے مزید دو بیٹے ہوئے۔ جن کے نام میر نادر علی مگی اور عامر مگسی ہیں۔ (۲۵)

میر ذوالفقار علی مگسی نے ۱۹۸۵ء ۱۹۸۸ء ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء پانچ عام انتخابات میں پی بی ۲۶ کچھی ۳ سے انتخاب لڑا اور پانچوں ہی میں کامیابی حاصل کی۔ (۲۶) ۱۹۸۸ء میں وہ میر ظفر علی جمالی کی نگراں کابینہ میں وزیر رہے۔ ۱۹۹۰ء میں وہ میر تاج محمد جمالی کی کابینہ میں وزارت داخلہ پر فائز رہے۔ (۲۷) ۱۹۹۳ء میں جب میر تاج محمد جمالی نے وزیر اعلیٰ کے عہدے سے استعفیٰ دیا تو وہ بلوچستان کے دسویں وزیر اعلیٰ منتخب ہوے۔ (۲۸) وہ نگران حکومتوں کے قیام تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں جب ملک بھر میں دوبارہ انتخابات منعقد ہوئے اور تمام صوبوں میں نئی وزارتیں تشکیل دی گئیں تو میر ذوالفقار علی مگسی ایک مرتبہ پھر صوبہ کے وزیر اعلیٰ منتخب ہو گئے۔ میر ذوالفقار علی مگسی، مرحوم جام آف لسبیلہ، میر غلام قادر خاں کے بعد دوسرے شخص ہیں، جو اس منصب پر دوسری مرتبہ فائز ہوئے تھے۔ (۲۹) وہ اس عہدے پر ۱۰ ار نومبر ۱۹۹۶ء تک فائز رہے (۳۰) ۲۰۰۲ کے عام انتخابات میں وہ احتساب عدالت میں مقدمے کے باعث حصہ نہ لے سکے۔ انہوں نے اپنی نشست پر اپنی اہلیہ پروین مگسی کو کھڑا کیا جو ان کے بھائی طارق مگسی سے شکست کھا گئیں (۳۱) انتخابات کے بعد پروین مگسی خواتین کی مخصوص نشستوں پر بلوچستان اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں (۳۲) اور بعد ازاں صوبائی کابینہ کی رکن بھی بنیں۔ ان کا تعلق خان آف قلات کے خاندان سے ہے اور ان کی میر عطا اللہ مینگل سے بھی رشتہ داری ہے۔ (۳۳)

میر ذوالفقار علی مگسی کے بھائی میر طارق حسین مگسی ۱۹۷۷ء میں بلوچستان اسمبلی کے رکن بنے۔ ۱۹۸۸ء میں وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے این اے ۲۰۱ کچھی سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ (۳۴) وہ بے نظیر کے دور حکومت میں مرکزی وزیر مملکت بھی رہے۔ ۱۹۹۰ء میں انہوں نے عام انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔ تاہم ان کی حمایت سردار یار محمد رند کو حاصل رہی جو ان کے حلقے سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (۳۵) طارق حسین مگسی ۱۹۹۱ء میں سینٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ (۳۶) ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے این اے ۲۰۱ بولان، کم جھل مگسی (کچھی) سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ انہیں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حمایت حاصل تھی لیکن وہ جمہوری وطن پارٹی کے یار محمد رند سے شکست کھا گئے۔ (۳۷) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، وہ اپنے بھائی، ذوالفقار مگسی کی نشست سے بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ہیں۔

ذوالفقار علی مگسی اور طارق حسین مگسی کے تیسرے بھائی میر خالد علی مگسی ڈسٹرکٹ کونسل کچھی کے چیئر مین رہ چکے ہیں اور ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۵ء میں بھی جھل مگسی کے ضلعی ناظم منتخب ہوئے ہیں (۳۸)۔

میر سیف علی مگسی کے دو صاحبزادوں میر نادر علی مگسی اور میر حامد علی مگسی نے اپنی سیاست کے لیے صوبہ سندھ کو منتخب کیا۔ میر نادر علی مگسی ۱۹۸۵ء میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کا حلقہ انتخاب تھا این اے ۱۶۶ لاڑکانہ ۳ انتخاب میں کامیابی کے بعد انہوں نے

مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ تاہم ۱۹۸۸ء کے انتخابی عمل کے آغاز سے پہلے ہی وہ پاکستان پیپلز پارٹی ہو گئے اور ۱۹۸۸ء ۱۹۹۰ء ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء چاروں عام انتخابات میں پی ایس ۲۹ لاڑکانہ ا سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۳۹) تاہم ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔

میر عامر علی مگسی نے ۱۹۹۱ء میں صوبہ سندھ سے سینٹ کا انتخاب لڑا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی (۴۰)

میر محبوب علی مگسی کے چھوٹے بیٹے میر یوسف علی خاں مگسی نے ۱۹۹۳ء میں پی بی ۲۶ جھل مگسی سے انتخاب لڑا تھا مگر اپنے بھتیجے ذوالفقار مگسی سے شکست کھا گئے تھے (۴۱)

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر ایم انور رومان، بلوچستان کے قبائل (ضلعی گزیٹر سے انتخاب) حصہ اول۔ کوئٹہ۔ ص ۲۲۸ تا ۲۳۱

۲۔ رائے بہادر لالہ ہتو رام، تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۱۹۴

۳۔ پروفیسر ایم انور رومان، بلوچستان کے قبائل (ضلعی گزیٹر سے انتخاب) حصہ اول۔ کوئٹہ۔ ص ۲۳۱

۴۔ میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۴۰۳، ۴۰۴

۵۔ ایضاً۔ ص ۵۴۵

۶۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۹۵، ۱۹۶

۷۔ میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۴۰۴

۸۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۹۷، ۱۹۸

۹۔ میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۴۰۴، ۴۰۵

۱۰۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی، تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۹۹

۱۱۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان' کوئٹہ۔ ص ۵۴۵'۵۴۶

۱۲۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ تاریخ بلوچستان' شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ ص ۲۰۶ تا ۲۰۸

۱۳۔ میر گل خان نصیر' تاریخ بلوچستان۔ کوئٹہ۔ ص ۵۴۷

۱۴۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی' تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ کوئٹہ ص ۲۱۴

۱۵۔ مہتابش داس کھوسہ۔ ناردرن انڈیا ہو از ہو۔ حصہ دوم (سندھ اینڈ بلوچستان) لاہور۔ ص ۱۰۹۔

۱۶۔ میر احمد یار بلوچ' مختصر تاریخ' قوم بلوچ وخوانین بلوچ۔ کوئٹہ۔ ص ۸۰

۱۷۔ تہور علی خان' بائیو گرافیکل انسائیکلوپیڈیا آف پاکستان ۵۶۔۱۹۵۵ء۔ ص ۴۶

۱۸۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۴؍اپریل ۱۹۶۹ء

۱۹۔ ایم آئی صدیقی رزم' ہمارے نمائندے۔ لاہور۔ ص۹۹
۲۰۔ الطاف حسن قریشی' بلوچستان اور سندھ کا انتخابی جائزہ۔ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۲۳ر تا ۲۹ر نومبر ۱۹۷۰ء۔ ص۱۰
۲۱۔ طارق اسمٰعیل بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰ر مئی ۱۹۸۷ء
۲۲۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۵ء۔ لاہور۔ ص۳۱۸
۲۳۔ چاکر خان بلوچ' یاروں کے روبرو کہیے۔ ملتان۔ ص۱۶۱' ۱۶۲
۲۴۔ احمر مستی خان' ٹرائب ورسز ٹرائب (انگریزی)۔ ماہنامہ نیوز لائن' کراچی۔ جون ۱۹۹۳ء۔ ص۸۱
۲۵۔ اکرام ہوتی۔ اپنے نمائندوں سے ملئے (میر نادر علی مگسی) دی فرائیڈے ٹائمز لاہور ۱۶۔ ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۳ء۔ ص۶
۲۶۔ (i) دی گزٹ آف پاکستان' اسلام آباد۔ ۲۸ر مارچ ۱۹۸۵ء ص۲۶۳۳'
(ii) الیکشن کمیشن آف پاکستان' اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۶۶۶
۲۷۔ ٹی ایم ڈوگر' ہواز ہو اینڈ وہاٹ از وہاٹ' لاہور۔ ص۹
۲۸۔ روزنامہ جنگ' کوئٹہ۔ ۳۱ر مئی ۱۹۹۳ء
۲۹۔ عامر رضوان۔ بلوچستانز مسٹر کلین۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور ۲۸ر اکتوبر۔ ۳ر نومبر ۱۹۹۳ء ص۵
۳۰۔ وحید زہیر' بلوچستان' جمہوریت کا سفر' کوئٹہ۔ ص۳۸
۳۱۔ شفقت تنویر مرزا۔ ہمارے سیاستدان اور ان کی داستان۔ لاہور۔ ص۴۷
۳۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص۳۶۱
۳۳۔ روزنامہ پاکستان ٹائمز۔ ۵ر مارچ ۲۰۰۵ء
۳۴۔ ایس محمد رضا (مدیر)۔ پرسنز ہو شیپ اور ڈیسٹنی (انگریزی)۔ کراچی۔ ص۲۵۱
۳۵۔ طارق اسمٰعیل ساگر۔ الیکشن ۹۰ء۔ لاہور ص۵۷۶
۳۶۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۱۵ر مارچ ۱۹۹۱ء
۳۷۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ء جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۱۵۸
۳۸۔ ہفت روزہ اخبارِ جہاں کراچی۔ ۱۷ر تا ۲۳ر اکتوبر ۲۰۰۵ء ص۱۶
۳۹۔ (i) اکرام ہوتی۔ اپنے نمائندوں سے ملے (میر نادر علی مگسی)۔ دی فرائیڈے ٹائمز لاہور۔ ۱۶۔ ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۳ء۔ ص۶
(ii) الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ۔ جلد دوم۔ ص۴۵۸
۴۰۔ روزنامہ جنگ۔ لاہور ۱۵ر مارچ ۱۹۹۱ء
۴۱۔ دی گزٹ آف پاکستان' اسلام آباد' ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ ص۱۵۵۴

مینگل

مینگل بلوچستان میں براہوی بلوچوں کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ اس قبیلے کی مربوط آبادی نوشکی میں افغانستان کی سرحد سے جنوب مشرقی سمت میں کراچی تک تقریباً پچاس میل چوڑی اور سات سو میل لمبی پٹی میں پھیلی ہوئی ہے۔ افغانستان میں نوشکی سے گرم سیل تک کے ریگستانی علاقے اور دریائے ہیلمند کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ تقریباً تیس ہزار مینگل آباد ہیں۔ اسی طرح بلوچستان کی مغربی اور ایران کی مشرقی سرحد پر بھی گمشاو زئی' باران زئی' امیر زئی' یاجے زئی اور کئی دوسرے مینگل قبائل آباد ہیں جن کی مجموعی تعداد ایران کی سرحد پر تقریباً ایک لاکھ افراد تک ہو گی۔

بعض مورخین کی رائے میں مینگل سفید ہنوں کا وہ قبیلہ ہے جو من یا منگ کہلاتا تھا۔ گل کوشانی دراوڑی اور بلوچی کا ایک مشترک لفظ ہے جو صیغہ جمع کے لئے بولا جاتا ہے جیسے بزگل "بکریوں کا ریوڑ" جت گل "سارہانوں کا گروہ" وغیرہ۔ جب یہ من یا منگ نقل مکانی کر کے اس سرزمین میں وارد ہوئے جہاں پر اس زمانے میں کوشانی آباد تھے تو مقامی زبان میں یہ لوگ "من گل" یا "منگ گل" یعنی منوں کی ٹولی یا طائفہ کہلائے۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ لوگ مِنگل منگل اور مینگل مشہور ہوئے۔

مورخ کہتے ہیں کہ اس سرزمین پر آکر ان منگوں کا ایک طائفہ شمال مشرق کی طرف کے کوہستان میں برابر آگے بڑھتا رہا۔ چنانچہ پاراچنار اور اس سے متصل افغانستان کے علاقے میں جو قبیلہ منگل کہلاتا ہے وہ اسی طائفے کے لوگ ہیں۔

ان کا ایک دوسرا طائفہ برابر جنوب مشرق کی طرف آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ راجپوتانہ پہنچ گیا۔ وہاں پر آباد ہوا اور اب من ہاس یا منہاس کہلاتا ہے۔

یہاں پر یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہو گا کہ راجپوتوں کا ایک طائفہ ایسا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ترکستان سے آیا ہے۔ گجرات کا آخری راجہ کرن باگھیلا' جس نے سلطان علاؤ

الدین خلجی سے کئی لڑائیاں لڑیں، اسی طائفے سے تھا۔ مینگل بھی خود کو ترکستان سے آنے والے ترک کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سفید ہن بھی ترک تھے۔

مینگلوں کا جو طائفہ بلوچستان میں رہ کر آباد ہو گیا ان کے متعلق بعض مورخین کہتے ہیں کہ یہ وہ منگ ہیں جو کوہ البرز کی وادیوں میں آکر آباد ہوئے تھے اور مقامی باشندے ان کو کوچ اور بلوچ کہتے تھے۔ یہ لوگ جنگجو اور لوٹ مار کرنے کے عادی تھے جن کی لوٹ مار سے ایران کے بادشاہ تنگ آچکے تھے۔ بالآخر نوشیروان نے ان پر فوج کشی کی اور ان کا قتل عام کر کے ان کو وہاں سے نکال دیا۔ تب وہ قلات کے کوہستان میں آکر آباد ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ قلات کی سیوائی حکومت پر قابض ہو کر وہاں پر اپنی حکومت قائم کر دی۔(۱)

جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری اپنی کتاب "بلوچستان تاریخ کے آئینے میں" میں مینگل قبیلے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"یہ قبیلہ تین جتھوں شاہی زئی، ذگر اور سالانی پر مشتمل ہے۔ شاہی زئی مینگل ضلع قلات کے جھالاوان پہاڑ میں وڈھ کے مقام پر رہتے ہیں۔ ذگر مینگل ضلع چاغی میں رہائش پذیر ہیں اور سالانی خانہ بدوش ہیں اور کچھی، خاران اور چاغی کے ضلعوں میں نئی نئی چراگاہوں کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں۔ مینگل رند بلوچوں کی ایک شاخ ہیں اور اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ جب میر چاکر اور اس کے ساتھی رندوں نے قلات کو فتح کیا تھا، تو مینگل اس کی فوج کا باقاعدہ ایک حصہ تھے اور جب میر چاکر کو قلات سے نکلنا پڑا، تو مینگل اور دوسرے بہت سے بلوچ قبائل قلات ہی کے علاقے میں رہ گئے۔ لیکن جب بجار میروانی بروہی نے قلات پر قبضہ کر لیا اور میر چاکر کے مقرر کردہ گورنر کو وہاں سے ہٹا دیا یا قتل کر دیا، تو مینگلوں نے اس نئے بروہی حکمران سے صلح کر لی اور بزور شمشیر بزنجو قبیلہ سے وڈھ اور وہیر کے علاقے چھین لئے۔ مینگل ضلع قلات کے جھالاوان علاقے کا ایک بڑا قبیلہ اور بزنجو قبیلہ کا پڑوسی ہے۔ اس کے مختلف گروہوں مثلاً لہڑی، عمرانی، حمل زئی، یاران زئی گورانی اور احمدان زئی کے ناموں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچوں کے بعض دوسرے بڑے بڑے قبیلوں کی طرح یہ بھی بہت سے بلوچ قبیلوں کا جتھا ہے۔ اس قبیلے کی زبردست اکثریت جھالاوان کی پہاڑیوں میں عرصہ دراز سے رہنے کی وجہ سے اب عموماً بروہی زبان بولتی ہے۔" (۲)

انیسویں صدی میں مینگل قبیلے کے جس سردار نے سب سے پہلے سیاسی افق پر ناموری حاصل کی۔ وہ سردار نور دین مینگل تھا۔ وہ انگریزوں کا سخت دشمن تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خان قلات میر خداداد خان کے مخالفین میں بھی شامل تھا۔ لیکن جب کبھی انگریزی حکومت اور خان کے مقابلے کی بات آتی تھی۔ وہ ہمیشہ خان کا ساتھ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بلوچ سرداروں نے میر خداداد خان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو وہ ان سرداروں کے ساتھ ساتھ تھا مگر جب

ان سرداروں کو رابرٹ سنڈیمن کی امداد حاصل ہوئی اور سردار نور دین مینگل نے محسوس کیا اس طرح بلوچ سردار انگریزوں کے ہاتھوں استعمال ہو کر خود اپنی سرزمین سے دشمنی کر رہے ہیں تو وہ میر خداداد خان سے جاملا اور اس کا ساتھ دینے کا حلفیہ سمجھوتہ کر لیا۔

رابرٹ سنڈیمن اور بلوچ سرداروں کو سردار نور دین مینگل کا یہ اقدام ایک آنکھ نہ بھایا اور انہوں نے سازش کر کے ۶ر جنوری ۱۸۷۶ء کو سردار نور دین مینگل کو خان میر خداداد خان کے ہاتھوں قتل کروا دیا۔ (۳)

سردار نور دین مینگل کے بعد اس کا کمسن بیٹا میر شکر خان مینگل قبیلہ مینگل کا سردار اور اس کا بھائی حاجی محمد ابراہیم خان مینگل اس کا سربراہ مقرر ہوا۔

۱۸۹۳ء میں جب انگریزوں نے میر خداداد خان کو معزول کر کے گرفتار کیا تو حاجی محمد ابراہیم خان مینگل نے تو انگریزوں کے خلاف لڑنے سے انکار کیا کیونکہ وہ میر خداداد خان کو اپنے بھائی کا قاتل سمجھتا تھا مگر میر شکر خان مینگل بلوچوں کے عظیم تر مفاد کی خاطر اپنے باپ کی طرح میر خداداد خان کی حمایت میں انگریزوں کے خلاف کمربستہ ہو گیا۔

حاجی میر ابراہیم خان مینگل اور میر شکر خان مینگل کے اس اختلاف رائے کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا اور انہوں نے میر شکر خان مینگل کو معزول کر کے حاجی میر ابراہیم خان کے بیٹے میر ولی محمد کو قبیلے کا سردار بنا دیا۔ انگریزوں کے اس اقدام کو مینگلوں نے پسند نہیں کیا اور انہوں نے اس کی مزاحمت کی۔ انگریز گورنر جنرل کے ایجنٹ نے اس صورت حال سے گھبرا کر میر ابراہیم خان مینگل اور میر ولی محمد مینگل کو کوئٹہ میں نظر بند کر دیا اور سردار شکر خان مینگل کو ایک مرتبہ پھر قبیلے کا سردار مقرر کر دیا۔

سردار شکر خان مینگل اپنی بحالی کو اپنے قبیلے کا احسان سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے اہل قبیلہ کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ نہ کسی بات پر ان کو ٹوکتے اور نہ ان کی کسی بات کی مخالفت کرتے۔ مینگلوں کا جو جی چاہے کر گزرتے۔ اس طرح مینگلوں کے علاقے میں لاقانونیت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ جس کا نتیجہ ایک مرتبہ پھر میر شکر خان مینگل اور اس کے بیٹے میر نور دین مینگل (جو وڈھ کا تھانیدار تھا) کی معزولی اور گرفتاری کی صورت میں برآمد ہوا۔ یہ فیصلہ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے اشارے پر سرداروں کے ایک جرگہ نے کیا تھا۔ اس جرگے نے پہلے میر ابراہیم خان مینگل کو اور پھر اس کی کبرسنی اور علالت کے باعث ایک مرتبہ پھر اس کے بیٹے میر ولی محمد خان مینگل کو قبیلے کا سردار بنا دیا۔ (۴)

مینگلوں کو یہ صورتحال اس مرتبہ بھی پسند نہ آئی اور انہوں نے میر حمزہ پہلوان زئی کے بیٹے نور محمد کی قیادت میں، جو نورا مینگل کے نام سے مشہور ہوا، علم بغاوت بلند کر دیا۔

۱۹۰۸ء سے دسمبر ۱۹۱۷ء تک تقریباً نو برس تک نورا مینگل انگریزی حکومت کے خلاف لڑتا

رہا۔ بالاخر دسمبر ۱۹۱۷ء میں اسے ایک بلوچ سردار میر حبیب اللہ خان نوشیروانی نے اپنے مہمان خانے سے گرفتار کروا کر انگریز حکومت کے سپرد کیا۔ (اس خدمت کے صلے میں انگریزی حکومت سے میر حبیب اللہ خان نوشیروانی کو نواب کا خطاب عطا ہوا) ۹ر اگست ۱۹۱۹ء کو سرداری جرگہ نے نورا کو عمر قید کی سزا سنائی مگر اس آزاد منش جنگ جو اور دلیر جوان کے لئے جیل میں زندگی گزارنی مقدر نہ تھی چنانچہ ۲۰ر نومبر ۱۹۲۱ء کو جیل میں ہی اس کی روح قفس عنصری سے آزاد ہو کر پرواز کر گئی۔ (۵)

اسی دوران انگریز پولیٹیکل ایجنٹ پر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو گئی تھی کہ مینگل سردار ولی محمد کو پسند نہیں کرتے اور اس کے مقابلے میں سردار شکر خاں مینگل اور نور دین مینگل کا طرفدار گروہ زیادہ مضبوط اور طاقتور ہے چنانچہ اس نے سردار ولی محمد کو شکر خان کے حق میں سرداری سے دستبردار ہونے پر رضامند کر لیا۔ اور ۲۳ر اپریل ۱۹۱۲ء کو سردار شکر خان کو پھر سرداری پر بحال کر کے میر نور دین کو بھی اس کے ساتھ رہا کر دیا۔

سردار شکر خان، میر نور دین اور میر ولی محمد کوئٹہ سے براستہ کراچی لسبیلہ گئے۔ شکر خان اور میر ولی محمد کچھ دنوں کے لئے لسبیلہ میں ٹھہرے لیکن میر نور دین بلا توقف وڈھ پہنچا۔ جہاں پر میر علم خان کی سرکردگی میں تمام مینگلوں نے جمع ہو کر اسے اپنا سردار منتخب کر لیا اور اپنے اس فیصلہ سے انگریزوں کو بھی مطلع کر دیا۔ سردار شکر خان کو جب اپنے قبیلے کے اس فیصلے کا علم ہوا تو اس نے بھی اس فیصلے کی تائید کی۔ انگریزی حکومت کے لئے اب نور دین کو سردار تسلیم کرنے کے سوائے اور کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ ۱۹ر اگست ۱۹۱۲ء کو قلات کے پولیٹیکل ایجنٹ نے وڈھ جا کر میر نور دین کے سردار مینگل ہونے کا اعلان کر دیا۔ (۶)

سردار نور دین ایک خاموش طبع، بہادر اور سخی نوجوان تھا۔ اسے اپنی کوئی چیز یہاں تک کہ اپنی ذات بھی مینگلوں سے عزیز نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مینگل پروانوں کی طرح اس کے اردگرد جمع تھے۔

نواب خان محمد زرک زئی کی جنگ آزادی کے موقعہ پر قلعہ خضدار کی حفاظت و نگرانی انگریزی حکومت کی طرف سے سردار نور دین کے سپرد کی گئی۔ لیکن خضدار پہنچ کر سردار نور دین نے نواب خان محمد کے ساتھ تعلقات استوار کر لئے اور دونوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کا حلف اٹھا لیا۔ چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق سردار نور دین کے آدمیوں نے خضدار کے قلعہ کو لوٹ لیا اور جنگ آزادی کی ابتدا کی۔

نواب خان محمد زرکزئی کے اپنے غدار بھائی کے ہاتھوں شہید ہونے پر سردار نور دین نے لڑائی جاری رکھی۔ اس کے بہادر قبیلہ نے انگریزی فوج کے خلاف کئی لڑائیاں لڑیں۔ انگریزی حکومت کے تھانوں اور چوکیوں کو لوٹا اور سندھ کے علاقہ میں ڈاکے ڈالتے رہے۔

۸ر مارچ ۱۹۱۶ء کو سردار نور دین' سردار شہباز خان گرگناڑی اور تئیس اور مجاہدوں کے ساتھ ہتھیار اور امداد حاصل کرنے کی غرض سے پنجگور کے راستے سے بلوچستان کے ایرانی مقبوضہ میں داخل ہوئے جہاں سے سردار بہرام خان کے پاس ۔ ھمپور گئے لیکن سردار بہرام خان نے ان کی کوئی امداد نہیں کی اور نہ ہی انہیں اپنے علاقہ میں پناہ دینے پر رضامند ہوا۔

سردار نور دین اور اس کے ساتھی خاران گئے لیکن سردار میر حبیب اللہ خان نوشیروانی نے بھی ان کی امداد سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ بالاخر بادل نخواستہ وہ پھر جھلاوان کے کوہستان میں پہنچے۔ جہاں انگریزی فوج ان کے مقابلہ کے لئے تیار کھڑی تھی۔

سردار نور دین اور اس کے ساتھیوں میں اب انگریزی فوج سے مقابلہ کرنے کی تاب نہیں تھی۔ چنانچہ اگست ۱۹۱۶ء کو فوج کے محاصرہ میں آکر اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سردار نور دین کو گرفتار کر کے قلات لایا گیا۔ جہاں پر ایک خاص جرگہ نے انگریزی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کرنے کے جرم میں اس کے لئے پھانسی یا بصورت دیگر تیس سال قید سخت کی تجویز کی پولیٹیکل ایجنٹ قلات نے قید کی سزا گھٹا کر بارہ سال چھ ماہ کر دی۔

پونا' رانچی اور ہندوستان کے بعض دوسرے جیل خانوں میں قید کی مدت بسر کرنے کے بعد سردار نور دین کو رہا کر دینے کی بجائے چند سال لورالائی میں نظر بند رکھا گیا۔

۱۹۳۵ء میں خان میر احمد خان نے سردار نور دین پر سے تمام پابندیاں اٹھا دیں اور اسے حدود ریاست قلات میں آنے جانے کی آزادی دے دی۔ لیکن نور دین نے بلوچستان میں بود و باش اختیار کرنے کی بجائے کراچی میں منگھو پیر اور دیگر مقامات پر عرصہ تک سکونت اختیار کی۔ (۷)

اس دوران مارچ ۱۹۱۷ء میں سردار نور دین کی گرفتاری اور سزایابی کے بعد انگریزی حکومت نے سردار میر علی محمد مینگل کے بیٹے میر رحیم خان کو قبیلہ مینگل کا سردار مقرر کیا۔ تقریباً ایک سال بعد یعنی فروری ۱۹۱۸ء میں انگریزی حکومت نے قلات کے سرداروں سے فوجی بھرتی دینے کا مطالبہ کیا۔ سردار رحیم خان مینگل نے جب انگریزوں کا یہ مطالبہ اپنے اہل قبیلہ تک منتقل کیا تو وہ بھڑ گئے اور انہوں نے ۸ر مارچ ۱۹۱۸ء کو علی الصبح سردار رحیم خان' خان بہادر میر' علم خان اور کئی اور معتبر مینگلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ (۸)

سردار رحیم خان مینگل کے قتل کے بعد قبیلے کی سرداری سردار رسول بخش مینگل نے سنبھالی۔ یہ وہی سردار رسول بخش مینگل ہیں جو اس تاریخی جرگہ میں بھی شامل تھے جس نے میر یوسف علی خان' عزیز مگسی کے مضمون فریاد بلوچستان کی اشاعت کے بعد اسے ریاستی امور میں خلل اور بدامنی پھیلانے کے جرم کا مرتکب قرار دیا تھا اور اسے نظربندی' جرمانہ اور زرضمانت جمع کرانے کی سزا سنائی تھی۔ (۹)

قیام پاکستان کے وقت یہی سردار رسول بخش مینگل' اپنے قبیلے کے سردار اور دارالامرا

بلوچستان کے رکن تھے۔ (۱۰) ۱۹۴۷ء میں خان قلات نے میر نور دین مینگل کو علاقہ مینگل کا ناظم بنا کر وڈھ بھیجا۔ وہ میر نور دین مینگل کو ایک مرتبہ پھر قبیلہ کا سردار بھی بنانا چاہتے تھے مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ۳۰ر جون ۱۹۵۲ء کو وہ ٹریفک کے ایک حادثہ میں وفات پا گئے۔ (۱۱) اور یوں سردار رسول بخش مینگل کے جانشین ان کے صاحبزادے میر عطاء اللہ مینگل بن گئے۔ میر عطا اللہ مینگل ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز قلات ڈسٹرکٹ کونسل کی چیئرمین شپ سے کیا۔ ۱۹۵۶ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۲)

۱۹۶۲ء میں انہوں نے قلات ڈویژن سے قومی اسمبلی کی واحد نشست پر انتخاب لڑا اور محمود خان اچکزئی کو شکست دے کر قومی اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس انتخاب میں بلوچستان سے دوسری نشست پر سردار خیر بخش مری نے کامیابی حاصل کی تھی۔ (۱۳) ایوب خان کا خیال تھا کہ سرحد' پنجاب اور سندھ کے جاگیرداروں اور سرداروں کی طرح بلوچ سردار بھی ان کی حکومت کی ہاں میں ہاں ملائیں گے اور ان میں حکومت سے اختلاف کا حوصلہ نہیں ہو گا' مگر بلوچ قوم کی مخصوص تاریخ' روایات اور نفسیات سے عدم واقفیت کے باعث اس کا یہ اندازہ غلط نکلا اور جب عبدالباقی بلوچ نے صوبائی اسمبلی میں اور عطاء اللہ مینگل اور خیر بخش مری نے قومی اسمبلی سخت تند و تیز اور زہر میں بجھی ہوئی مگر حقائق پر مبنی تقاریر کیں اور بلوچستان میں کی جانے والی بربریت اور مظالم کی خونچکاں داستانیں سنائیں تو سارا ایوان دم بخود رہ گیا۔

ایوبی آمریت ان حقائق کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے ان تقریروں کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ تقریریں پاکستان کے پریس میں جگہ نہ پا سکیں مگر یہ آکاش وانی اور ریڈیو کابل سے خوب خوب نشر ہوئیں اور ایوب حکومت نے اس پر عطاء اللہ مینگل' خیر بخش مری اور نواب اکبر خان بگٹی کی سرداریاں چھین لیں۔

۱۹۶۳ء میں حکومت نے زبردستی سردار عطاء اللہ مینگل کے والد کے چچا سردار کرم خان کو زبردستی مینگل قبیلے کا سردار نامزد کر دیا۔ اس سے قبل قبائل کے ذمہ دار افراد نے انتظامیہ کو صاف طور پر بتایا کہ "ہمارا سردار صرف عطاء اللہ خان ہی ہو سکتا ہے اگر حکومت کسی وجہ سے عطاء اللہ خان کو پسند نہیں کرتی تو پھر ہم بغیر سردار کے مطمئن ہیں۔ لیکن سردار بنانا ضروری ہی ہو تو پھر عطاء اللہ خاں کے نابالغ بیٹے کو سردار بنا کر کرم خان کی سرپرستی میں دے دیا جائے۔ مینگل قبیلہ کسی بھی صورت میں کرم خان کو سردار تسلیم نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود حکومت نے کرم خان کو سردار چن لیا تو ہم اسے قتل کر دیں گے۔" اور یہی ہوا' سردار کی دستار پہن کر جب کرم خان وڈھ پہنچے تو اسی رات انہیں قتل کر دیا گیا۔ (۱۴)

قتل کے وقت سردار عطاء اللہ مینگل جائے وقوعہ سے بہت دور تھے مگر ایوب خان نے انہیں اس قتل میں ملوث ہونے کے الزام میں جیل میں ڈال دیا۔ دو ماہ بعد انہیں رہا کیا گیا اور

اسلام آباد نے انہیں پھر سردار تسلیم کر لیا۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید آئندہ وہ زیادہ معاون ثابت ہوں گے۔ لیکن اپریل ۱۹۶۳ء میں انہیں باغیانہ بیانات کے الزام میں پھر گرفتار کر لیا گیا اور پھر انہیں جنوری ۱۹۶۷ء تک نہیں چھوڑا گیا۔

چار سالہ قید کے بعد عطا اللہ مینگل سیاسی طور پر زیادہ باشعور ہو چکے تھے اور وہ مری اور بزنجو کے ساتھ مل کر نیشنل عوامی پارٹی کی بلوچستان شاخ کی تنظیم میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے تمام بلوچ علاقوں کو صوبہ بلوچستان میں یکجا کرنے کی مہم شروع کی۔ ان کے اس مطالبہ کو یحییٰ خان نے پذیرائی بخشی اور یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو ون یونٹ کے خاتمے کے بعد بلوچستان کا صوبہ وجود میں آگیا۔ (۱۵)

دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سردار عطاء اللہ مینگل نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان گروپ) کے پلیٹ فارم سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ یکم مئی ۱۹۷۲ء کو انہوں نے جمعیت علمائے اسلام کے اشتراک سے بلوچستان کی وزارت تشکیل دی اور ۱۵ر فروری ۱۹۷۳ء تک صوبہ کی وزارت اعلیٰ پر فائز رہے۔ ۱۵ر فروری ۱۹۷۳ء کو صوبے میں صدر راج کی بنا پر ان کی حکومت معطل کر دی گئی۔ ۹ر فروری ۱۹۷۵ء کو جب نیپ کو کالعدم قرار دیا گیا اور پارٹی کے سرکردہ رہنما گرفتار کر لئے گئے۔ تو ان رہنماؤں میں عطاء اللہ مینگل بھی شامل تھے۔ (۱۶)

جب بھٹو نے مینگل وزارت کو برطرف کیا تو صوبہ بلوچستان میں بغاوت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس بغاوت میں مری اور مینگل دونوں ہی قبیلے پیش پیش تھے لیکن مینگل مریوں کی بہ نسبت زیادہ متحد نہ رہ سکے۔ مینگل کے پانچ بھائیوں میں کئی نے ان کوششوں کو سبوتاژ کیا کہ قبیلے کو حکومت کے خلاف حرکت میں لایا جائے۔

عطا اللہ مینگل کو اس جدوجہد کے دوران اس وقت ذاتی المئے سے دوچار ہونا پڑا جب ان کے بیٹے اسد اللہ مینگل کو کراچی میں دن دہاڑے گولی مار دی گئی۔ سلیگ ہیریسن نے اپنی کتاب بلوچ قومی تحریک میں اس واردات کا ذمہ دار ذوالفقار علی بھٹو کے ایجنٹوں کو ٹھہرایا۔ اس نے لکھا کہ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد جنرل ضیاء نے مینگل سے وعدہ کیا تھا کہ وہ قاتلوں کو تلاش کر کے سزا دیں گے لیکن ضیاء نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور کہا کہ اس سلسلہ میں تمام شہادتیں ضائع ہو چکی ہیں۔ بھٹو کے سابق ساتھیوں کی فراہم کردہ اطلاعات پر مینگل نے الزام لگایا کہ ضیاء الحق کے وعدہ پورا نہ کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس واقعہ میں ایک بریگیڈیئر سمیت فوج کے لوگ ملوث تھے۔ (۱۷)

بھٹو نے جب مینگل کو قید کیا ہوا تھا تو مینگل جیل میں عارضہ قلب کا شکار ہو گئے ان کے معالجین کا خیال تھا کہ مینگل کو آپریشن کی ضرورت ہے۔ اور اس آپریشن کے لیے ان کا امریکا جانا بے حد ضروری ہے مگر جب تک بھٹو برسراقتدار رہے، مینگل کو قید سے رہائی نصیب نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ فوجی حکومت

نے برسراقتدار آ کر مینگل کو رہا کیا اور وہ اپنے علاج کی غرض سے امریکا چلے گئے۔(۱۸)

عطاء اللہ مینگل اپنا کامیاب آپریشن کروانے کے بعد وطن واپس آئے مگر جلد ہی ایک مرتبہ پھر وطن سے باہر چلے گئے۔ اس مرتبہ ان کی منزل لندن تھی۔ قیام لندن کے دوران انہوں نے ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ کے ساتھ مل کر سندھی، بلوچی، پختون فرنٹ کی بنیاد رکھی اور کنفیڈریشن کا نعرہ بلند کیا۔

انہوں نے اصرار کیا کہ بلوچ صرف ایک ایسی کنفیڈریشن میں ہی خود کو محفوظ سمجھیں گے جو چاروں صوبوں کے درمیان ان کے رقبے اور آبادی سے قطع نظر مکمل مساوات پر مبنی ہو۔ مینگل نے کہا کہ چونکہ پنجابی ہمیشہ ہم پر حاوی رہیں گے فرض کیجئے کہ ہمیں حقوق مل بھی جائیں تو بھی ۳۰۰ ارکان کی اسمبلی میں ہمارے صرف نو آدمی ہوں گے۔ ان کا مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان پیرٹی کے اصول پر اس وقت اصرار تھا جب یہ ان کے مفاد میں تھا اور جب بنگالیوں کی تعداد مغربی حصے کے مقابلے میں زیادہ تھی اس وقت ان کا کہنا تھا کہ یہ اصول بنگالیوں کو ملک کو متحد رکھنے کے لیے ٹھیک ہے اب ان کو قربانی دینی چاہیے۔

ان کی مجوزہ کنفیڈریشن میں مسلح افواج اور سول سروسز میں ہر صوبے کو مساوی نمائندگی حاصل ہوگی۔ مرکزی حکومت کے ٹیکس لگانے کے بیشتر اختیارات صوبوں کو منتقل کردیئے جائیں گے۔ اس طرح زیادہ آبادی والے صوبوں کو بھی منصفانہ اور معقول آمدنی یقینی ہوجائے گی جبکہ اقلیتی صوبوں کے اپنے قدرتی وسائل کے عطیات سے فائدہ پہنچے گا۔(۱۹)

سردار عطاء اللہ مینگل کی جلاوطنی کے زمانے میں ان کے صاحبزادے منیر احمد مینگل، قبیلے کے قائم مقام سردار ہوتے تھے مگر ان کی ناگہانی موت کے بعد سردار عطاء اللہ مینگل کے ایک اور صاحبزادے محمد اختر مینگل قبیلے کے قائم مقام سردار بن گئے(۲۰)۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات انہوں نے پی پی ۳۱ خضدار ۲ سے بلوچستان نیشنل الائنس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں انہوں نے کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے تاہم بعدازاں وہ انتخابی عمل میں شریک نہیں ہوئے۔ (۲۹) البتہ ۱۹۹۲ء کے انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر بی این ایم (مینگل گروپ) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور بلوچستان اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ بلکہ کچھ عرصہ بعد بلوچستان اسمبلی کے قائد حزب اختلاف کے منصب پر بھی فائز ہوئے۔(۲۲)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں انہوں نے بی این پی کے ٹکٹ پر این اے ۲۰۴ قلات کم مستونگ کم خاران سے قومی اسمبلی کا اور پی بی ۳۱ خضدار ۲ سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور دونوں نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ بعد میں انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست خالی کردی اور بلوچستان کے وزیراعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے (۲۳) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں انہوں نے حصہ نہیں لیا تاہم

۱۹۹۷ء میں ان کی جیتی ہوئی دونوں نشستوں پر بی این پی کے امیدوار ہی کامیاب ہوئے۔ ان انتخابات میں قومی اسمبلی کی نشست عبدالرؤف مینگل نے جیتی اور صوبائی اسمبلی کی نشست پر محمد اکبر مینگل کامیاب ہوئے (۲۴)

سردار عطاء اللہ مینگل ایک اور صاحبزادے جاوید مینگل ہیں جو ۱۹۹۴ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے تھے (۲۵)۔

سردار عطاء اللہ مینگل بلوچستان اور سندھ کے بعض دیگر سرداروں سے بھی رشتہ داریوں میں بندھے ہوئے ہیں۔

مثلاً سردار عطاء اللہ مینگل کی والدہ سردار بلوچ خان محمد حسنی کی بہن تھیں جبکہ سردار بلوچ محمد حسنی کی اہلیہ (یعنی عطاء اللہ خان مینگل کی ممانی) خان آف قلات احمد یار خان کی بہن تھیں۔

سردار عطاء اللہ مینگل کی پہلی بیوی اسلم گچکی کی بہن تھیں جو وفات پا چکی ہیں اسلم گچکی کی ایک اور بہن جام میر غلام قادر خان آف لسبیلہ کو بیاہی تھیں۔ یوں سردار عطاء اللہ مینگل جام میر غلام قادر خان کے ہم زلف اور جام محمد یوسف کے خالو ہوتے ہیں۔ سردار اسلم گچکی خود سردار بلوچ خان محمد حسنی کے داماد تھے اور سردار عارف جان محمد حسنی کے بہنوئی تھے۔

سردار عطاء اللہ مینگل کی دوسری بیوی محمد صالح بھوتانی اور اسلم بھوتانی کی بہن ہیں۔ سردار صالح بھوتانی اور اسلم بھوتانی کی رشتہ داری دادو کے ضلعی ناظم ملک سکندر اور اس کے کزن ملک علاء الدین سے ہے۔ ملک سکندر صالح بھوتانی کے بھانجے اور داماد ہیں یوں بالواسطہ طور پر دادو کے ضلعی ناظم کی سردار عطاء اللہ مینگل سے رشتہ داری ہے۔ ملک علاء الدین پولیس کے ایک ریٹائرڈ آفیسر ہیں اور جام آف ملیر جام مراد کے داماد ہیں۔ جام مراد کے ایک بیٹے سردار عطاء اللہ مینگل کے داماد ہیں اور دوسرے نواب اکبر بگٹی کے۔

سردار عطاء اللہ مینگل کی دو پشتوں پر حاصل بزنجو اور ان کے والد غوث بخش بزنجو سے بھی رشتہ داری بنتی ہے اور وہ یوں کہ ان کے دادا سردار رحیم مینگل کے بھائی کرم خان مینگل کی شادی غوث بخش بزنجو کی بہن سے ہوئی تھی۔

سردار عطاء اللہ مینگل کے صاحبزادگان کی شادیاں بھی مختلف سرداروں کے گھرانوں میں ہوئی ہیں۔ سردار عطاء اللہ مینگل کے بیٹے منیر کی شادی عارف جان محمد حسنی کی بیٹی سے' اختر مینگل کی شادی سردار اسلم گچکی کی بیٹی سے اور جاوید مینگل کی شادی نواب خیر بخش مری کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ جبکہ ان کی ایک صاحبزادی میر عارف جان محمد حسنی کے صاحبزادے سردار رستم خان سے بیاہی ہیں یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ کہ سردار عطاء اللہ مینگل کی ایک سوتیلی والدہ جام آف لسبیلہ جام غلام قادر کی بہن تھیں۔ (۲۶) میر محمد اسلم گچکی ۱۹۹۷ء میں بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے انہیں ۹

جون ۲۰۰۲ء کو قتل کر دیا گیا تھا۔ (۲۷) ۳۰ جنوری ۲۰۰۶ء کو کراچی میں پولیس تحویل میں وفات پانے والے میر حسن گچکی بھی سردار عطاء اللہ مینگل کے داماد اور اختر مینگل کے بہنوئی تھے۔ وہ لسبیلہ ڈیویلپمنٹ اتھارٹی کے چیف ایگزیکٹو بھی رہے تھے۔ (۲۸)

سردار عطاء اللہ مینگل کی خود ساختہ جلاوطنی کے دوران ان کے بھائی سردار مہراللہ مینگل نے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا اور خضدار کی ڈسٹرکٹ کونسل کے چیئرمین رہے۔ وہ بلوچستان کے سابق گورنر جنرل رحیم الدین کے دوستوں میں شامل تھے۔

.۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں سردار عطاء اللہ خان مینگل اور ان کے اہل خانہ نے حصہ نہیں لیا چنانچہ اس انتخاب میں ان کے سیاسی حریف میر نیک محمد مینگل کے صاحبزادے میر محمد نصیر مینگل پی بی ۳۱ خضدار ۲ سے بلامقابلہ صوبائی اسمبلی کی رکن منتخب ہوگئے۔ بعدازاں وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور بلوچستان کابینہ کے وزیر بننے میں کامیاب ہو گئے۔(۲۹) میر محمد نصیر مینگل نے ۱۹۸۸ء کے انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں وہ این اے ۲۰۵ خضدار سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے مگر میر بزن بزنجو کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ (۳۰) ۱۹۹۳ء میں جب بلوچستان میں نگران حکومتیں وجود میں آئیں نصیراللہ مینگل نے ۱۹/جولائی ۱۹۹۳ء سے انتخابات کے عمل تک صوبہ کے نگران وزیراعلیٰ کے فرائض انجام دیئے۔ (۳۱)

۲۰۰۳ء میں میر نصیراللہ مینگل سینٹ آف پاکستان کے رکن بن گئے جبکہ ۲۰۰۲ء میں صوبائی اسمبلی نشست پر کامیاب ہونے والے امیدوار محمد اکبر مینگل' میر نصیراللہ مینگل کے بھائی ہیں۔(۳۲)

مینگل قبیلے ہی کی ایک اور شاخ زگر مینگل ہے۔ اس قبیلے کا اپنا سردار ہے۔ اس قبیلے کے میر گل خان نصیر بلوچستان کے ممتاز اہل قلم' مورخ' دانش ور اور سیاستدان تھے۔ انہوں نے بلوچی عوام' ادب اور ثقافت کی بے مثال خدمت کی۔ انہوں نے بلوچستان کی تاریخ کو یکجا کیا اور اس کے ادب میں اور خصوصاً شاعری میں نیا آہنگ پیدا کیا۔

میر گل خاں نصیر ۱۹۱۴ء میں نوشکی کے ایک زمیں دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے کسٹم کے محکمے سے ملازمت کا آغاز کیا اور بعدازاں قلات کے ریونیو منسٹر ہو گئے۔ (۳۳) ۱۹۳۷ء میں انہوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا اور بلوچستان کی مشہور سیاسی جماعت قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے نائب صدر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے اپنی جماعت کی ایما پر وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور جملہ وقت جماعتی امور کی انجام دہی میں گزارنے لگے۔ (۳۴)

۱۹۷۲ء میں جب بلوچستان میں نیپ کی حکومت قائم ہوئی تو وہ بلوچستان کے صوبائی وزیر تعلیم اور صحت بنے۔ ۱۹۷۵ء میں انہیں نیپ کے سرکردہ رہنماؤں کے ہمراہ بغاوت کے مقدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر آزاد بلوچستان کا نقشہ تیار کرنے اور اس کا قومی ترانہ تحریر کرنے کا الزام تھا۔(۳۵)

جب ۱۹۷۷ء میں ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا تو اس وقت میر گل خاں نصیر نے اس وقت کے گورنر بلوچستان جنرل رحیم الدین سے دوستی کی بنیاد پر مارشل لاء حکومت کی حمایت کر کے ملک کے باخبر سیاسی حلقوں کو چونکا دیا تھا۔ بلکہ ان کا ساتھ دینے والوں میں سردار عطا اللہ مینگل کے بھائی مہر اللہ مینگل اور گوہر خان زرکزئی بھی شامل تھے۔ (۳۶)

سردار گل خاں نصیر نے متعدد کتابیں تحریر کیں اور متعدد کتابوں کو بلوچی اور اردو زبان میں منتقل کیا۔ تاریخ بلوچستان، بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں، کوچ وبلوچ اور بلوچستان کی کہانی، شاعروں کی زبانی ان کی اہم تصانیف ہیں۔ انہوں نے جنرل ڈائر کی کتاب بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار اور اخوند محمد صدیق ومرزا احمد علی احمد کی کتاب اخبار الاخبار (تاریخ خوانین قلات) کو بھی اردو میں منتقل کیا۔ علاوہ ازیں وہ فیض احمد فیض کی شاعری کو بلوچی زبان میں ترجمہ بھی کر چکے تھے۔ (۳۷)

سردار گل خاں نصیر نے ۶ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو وفات پائی۔ (۳۸)

ان کے بھائی میر لال خان بھی سیاسی میدان میں متحرک رہے ہیں اور سندھی بلوچی پشتون فرنٹ کے صوبہ بلوچستان کے آرگنائزر رہ چکے ہیں۔ (۳۹)

حوالہ جات

۱۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۱۴۲ تا ۱۴۴

۲۔ جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری۔ بلوچستان تاریخ کے آئینہ میں۔ مترجم پروفیسر سعید احمد رفیق۔ کوئٹہ۔ ص ۵۲۳

۳۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (اول، دوئم)۔ کوئٹہ۔ ص ۳۱۹، ۳۲۰

۴۔ ایضاً۔ ص ۳۶۸ تا ۳۷۴

۵۔ ایضاً۔ ص ۴۱۴، ۴۱۵

۶۔ ایضاً۔ ص ۳۷۷

۷۔ ایضاً۔ ص ۴۱۰، ۴۱۱

۸۔ ایضاً۔ ص ۳۹۱، ۳۹۲

۹۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۳۰۹

۱۰۔ احمد یار بلوچ۔ مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ۔ کوئٹہ۔ ص ۸۰

۱۱۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (اول، دوئم) کوئٹہ۔ ص ۴۱۱

۱۲۔ اردو جامع انسائیکلوپیڈیا۔ جلد دوم۔ لاہور۔ ص ۹۹۹

۱۳۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۶۲ء

۱۴۔ نمائندہ خصوصی۔ بلوچ سردار جب سردار چلے۔ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور۔ ۲۲/ دسمبر ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۷

۱۵۔ سلیگ ہیریسن۔ بلوچ قومی تحریک۔ مترجم مسعود بخاری۔ کوئٹہ۔ ص ۸۵٬۸۴

۱۶۔ اردو جامع انسائیکلوپیڈیا۔ جلد دوم۔ لاہور۔ ص ۹۹۹

۱۷۔ سلیگ ہیریسن۔ بلوچ قومی تحریک۔ مترجم مسعود بخاری۔ کوئٹہ۔ ص ۸۵

۱۸۔ صحافت رپورٹ۔ عطاء اللہ مینگل خاموش ہیں۔ہفت روزہ صحافت لاہور۔ بلوچستان نمبر ۱۶/فروری تا ۲۳/فروری٬ ۲۴/فروری تا ۳/مارچ ۱۹۷۸ء۔ جلد ۲ شمارہ ۲۱٬ ۲۲۔ ص ۷۰

۱۹۔ سلیگ ہیریسن۔ بلوچ قومی تحریک۔ مترجم مسعود بخاری۔ کوئٹہ۔ ص ۹۲

۲۰۔ اختر علی خان بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات۔ جلد دوم۔ کراچی۔ ص ۸۷٬۸۶

۲۱۔ عزیز بھٹی۔ بلوچستان اسمبلی کا انتخابی جائزہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۶/اگست ۱۹۹۳ء

۲۲۔ (i) دی گزٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۳ء ص ۱۵۵۶
(ii) روزنامہ جنگ کراچی ۵/جون ۱۹۹۴ء

۲۳۔ وحید زہیر۔ بلوچستان جمہوریت کا سفر۔ کوئٹہ۔ ص ۲۵

۲۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۰٬ ۳۵۶

۲۵۔ سینٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ ڈائرکٹری آف ممبرز٬ چوتھا ایڈیشن۔ ص ۲۲۳

۲۶۔ عدنان عادل٬ بلوچ سردار٬ کون کسی کا رشتے دار۔ بی بی سی اردو ڈاٹ کام۔ لاہور۔ ۲۶/فروری ۲۰۰۵ء

۲۷۔ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ ، وفیات نامورانِ پاکستان۔ لاہور۔ ص ۱۲۷

۲۸۔ روزنامہ ڈان کراچی ۔ ۳۱ جنوری ۲۰۰۶ء

۲۹۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰/مئی ۱۹۸۷ء

۳۰۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم ص ۹۴

۳۱۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۰/جولائی ۱۹۹۳ء

۳۲۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ جنرل الیکشنز ۲۰۰۲ء رپورٹ جلد دوم۔ ص ۲۹۱٬ ۲۵۸۔

۳۳۔ صحافت رپورٹ۔ گل خان نصیر نے کہا...... ہفت روزہ صحافت۔ لاہور۔ بلوچستان نمبر۔ ۱۶/فروری تا ۲۳/فروری٬ ۲۴/فروری تا ۳/مارچ ۱۹۷۸ء۔ جلد ۲٬ شمارہ ۲۱٬ ۲۲۔ ص ۵۸

۳۴۔ گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ کوئٹہ۔ ص ۳۲۱٬ ۳۲۴

۳۵۔ صحافت رپورٹ۔گل خاں نصیر نے کہا.....ہفت روزہ صحافت لاہور۔ بلوچستان نمبر ۱۶/فروری تا ۲۳/فروری' ۲۴/فروری تا ۳/مارچ ۱۹۷۸ء۔ جلد۲' شمارہ ۲۱' ۲۲۔ص ۵۸

۳۶۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰/مئی ۱۹۸۷ء

۳۷۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔کوئٹہ۔ ڈسٹ کور۔ مع ہفت روزہ صحافت لاہور۔ بلوچستان نمبر۔ص۴۲'۵۸

۳۸۔ پروفیسر محمد اسلم۔ وفیات مشاہیر پاکستان۔ اسلام آباد۔ص۲۰۲

۳۹۔ طارق اسمٰعیل۔ بلوچستان کا سیاسی مشاہدہ۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی۔ ۲۰/مئی ۱۹۸۷ء

نوشیروانی

بلوچستان کی سابق ریاست خاران کے نوشیروانی حکمران عظیم سلطنت فارس یا ایران کو اپنے آباؤ اجداد کا وطن قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنا رشتہ شہنشاہ نوشیروان عادل کے خانوادہ کی باقیات اور زرتشت اعظم کے ان پیروکاروں سے جوڑتے ہیں جو اسلام کی آمد کے فوراً بعد مسلمان ہوئے تھے (۱) خاران کے ڈسٹرکٹ گزیٹیئر کے مطابق نوشیروانی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ کیانی ملوک ہیں تاہم ان کا یہ دعویٰ دلائل و براہین سے ثابت نہیں کیا جا سکتا تاہم خاران بھر میں کیانیوں کے آثار ان کے اس دعویٰ کو مکمل طور پر مسترد بھی نہیں کرتے (۲)

اسی گزیٹیئر نے آگے چل کر لکھا ہے:

''نوشیروانی بحیثیت نسل مضبوط اور جی دار لوگ ہیں۔ بہت خوب صورت خدو خال کے مالک اور جسمانی طور پر شہ زور۔ کردار میں وہ مستقل مزاج، لائق و فائق اور خطر آزما ہیں۔ سرحدی افسران کی پرانی نسل انہیں ایسے لٹیرے قرار دیتی تھی جسے کسی بات سے تسلی نہ ہوتی ہو جب کہ سر ٹامس ہولڈچ کے بقول وہ لڑنے اور حملہ کرنے میں پوری سرحد پر اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان کے سرداروں میں انصاف کا تحکمانہ جذبہ بھی ہے اور گاہے گاہے ظالم اور سنگدل ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم اپنے وفاداروں کے حق میں وہ ہمیشہ مہربان اور خدمت کا صلہ دینے پر آمادہ رہتے ہیں۔''(۳)

نوشیروانیوں کے موجودہ امیر، سردار امیر عبدالرحمٰن نوشیروانی، میر نوشیروان کی بیسویں پشت میں ہیں تاہم خاران میں نوشیروانیوں کی حکمرانی کا باقاعدہ آغاز میر پُردل خان سے ہوا جو میر نوشیرواں کی دسویں پشت میں تھے۔

۱۷۳۱ء میں جب نادر شاہ، افغانستان کو فتح کرنے کے لیے یہاں سے گزرا تو اس نے میر پردل خان کو ملاقات کے لیے بلایا تھا اس کا ارادہ تھا کہ وہ پردل خان سے افغانستان کی مہم کے لیے فوجی امداد حاصل کر سکے گا مگر پردل خان کو یہ دعوت بہت تاخیر سے ملی۔ پردل خان نادر شاہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکا اور یوں نادر شاہ اس سے ناراض ہو گیا۔

۱۷۴۰ء میں نادر شاہ نے میر پر دل خان کے علاقے پر حملہ کیا تو میر پر دل خان نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ نادر شاہ کو جب علم ہوا کہ میر پر دل خان نوشیرواں کی اولاد میں سے ہے تو اس نے میر پُردل خان کی تکریم کی اور اس کی جاگیر اسے واپس لوٹا کر اس کی مراعات میں اضافہ کر دیا بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۷۳۰ء کے لگ بھگ میر پُردل خان نے شہزادہ اشرف کو شکست دے کر کوہ نور ہیرا بھی اپنے قبضے میں لے لیا تھا جسے ایک روایت کے مطابق اس نے فروخت کر دیا تھا۔

امیر پر دل خان کا بڑا بیٹا میر شاہو خان تھا مگر وہ میر پُردل خان کی زندگی میں ہی وفات پا گیا تھا اس لیے پر دل خان کی وفات کے بعد کچھ وقت کے لیے خاران کی حکمرانی پُردل خان کے بھائی شاہداد خان نے سنبھالی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا دولت خان بھی کچھ وقت کے لیے خاران کا امیر بنا۔ مگر اس دوران میر شاہو خان کا بیٹا میر عباس دوم بڑا ہو چکا تھا اس لیے اس نے حکومت کا انتظام خود سنبھال لیا۔

اس دوران خاران اور قلات پر احمد شاہ ابدالی نے بھی حملہ کیا مگر پھر شاہداد خان اور میر نصیر خان اول دونوں نے مل کر احمد شاہ ابدالی سے سمجھوتہ کر لیا(۴)

میر عباس دوم کی وفات کے بعد میر جہانگیر خان اور میر عباس خان سوم خاران کے حکمران ہوئے مگر ان دونوں کی بہ نسبت میر عباس خان سوم کے جانشین میر آزاد خان نے نسبتاً زیادہ شہرت کمائی وہ ۱۸۳۱ء اور ۱۸۳۸ء کے دوران حکمران بنا تھا (۵)

اس کے دور حکمرانی میں ۱۸۳۹ء میں قلات کے حکمران میر محراب خان کی شہادت کے بعد جب ان کے جانشین میر نصیر خان دوم دربدر ہوئے تو میر آزاد خان نے نہ صرف انہیں بے حد عزت و تکریم کے ساتھ اپنے پاس رکھا بلکہ اپنی ایک صاحبزادی بی بی ماہ نور کی شادی بھی میر نصیر خان دوم سے کر دی۔ یہ میر آزاد خان نوشیروانی ہی تھے جن کی بھرپور امداد کی وجہ سے میر نصیر خان دوم ۱۸۴۱ء میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی میں کامیاب ہوئے۔

میر نصیر خان دوم اگلے ۱۶ برس تک قلات کے حکمران رہے مگر یہ پورا زمانہ انگریزوں سے الجھنے اور اپنے چچا میر اعظم خان کے ساتھ خانہ جنگیوں میں بسر ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں سنگ مثانہ (پتھری) کی بیماری میں اس کا انتقال ہوا اس کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بھائی خان میر خداداد خان اس کا جانشین ہوا۔ میر خداداد خان نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنی بھاوج بی بی مہ ناز سے شادی کرنا چاہی مگر بی بی مہ ناز نے یہ معاملہ اپنے والد میر آزاد خان پر چھوڑ دیا۔ میر آزاد خان قلات پہنچا اور اپنی بیٹی کو واپس خاران لے گیا۔ (۶)

میر خداداد خان نے میر آزاد خان کے اس اقدام کو اپنی توہین سمجھا اور وقتاً فوقتاً خاران پر کئی حملے کیے بالآخر ۱۸۸۴ء سر رابرٹ سنڈیمن کی مداخلت سے میر آزاد خان اور میر خداداد خان میں صلح

نامہ ہو گیا۔ اس وقت میر آزاد خان کی عمر ۹۸ برس تھی۔ دو برس بعد ۱۸۸۶ء میں میر آزاد خان کا انتقال ہو گیا (۷)

میر آزاد خان ایک نہایت منصف مزاج اور رحم دل سردار تھا، وہ غلط روی پر کسی کو معاف کرنا گناہ عظیم خیال کرتا تھا مگر اچھے کام اور راست روی پر نہایت خوش ہوتا۔ اس نے افغانستان کی بہ نسبت انگریزوں سے تعلقات بہتر رکھنے پر زیادہ توجہ دی یہی وجہ تھی کہ انگریز اس کے ریاستی معاملات میں نہ صرف مداخلت نہیں کرتے تھے بلکہ اسے چھ ہزار روپے سالانہ الاؤنس بھی دیتے تھے۔ (۸)

میر آزاد خان نوشیروانی کی زندگی کے آخری آیام میں اس کے بیٹوں میں اقتدار کے حصول کی جنگ چھڑ گئی۔ میر آزاد خان نوشیروانی نے اپنے بڑے بیٹے میر نوروز خان شیروانی کی حمایت کی اور اس کی وفات کے بعد وہی سردار بھی بنا۔ مگر اس کے ایک سوتیلے بھائی میر عظیم خان نے سرداری کے حصول کی ریشہ دوانیاں جاری رکھیں جس کا نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں برآمد ہوا (۹)

میر نوروز خان نوشیروانی نے سرداری سنبھالنے کے بعد اپنے باپ کی طرح انگریزوں سے بنائے رکھنے میں عافیت سمجھی۔ اس نے بلوچستان اور ایران کی سرحدوں کے تعین کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا کے کمیشن کی بھرپور مدد کی اور لسبیلہ کے جام، جام عالی کو گرفتار کروانے میں بھی اعانت کی جس کے صلے میں انگریزوں نے اسے نائیٹ کمانڈر آف دی انڈین ایمپائر اور سر کے خطابات عطا کیے۔

۲رجون ۱۹۰۹ء کو سر میر نوروز خان نوشیروانی بیمار ہو کر خاران میں وفات پا گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا میر یعقوب خان نوشیروانی، خاران کا سردار بنا۔ ۲۷رستمبر ۱۹۰۹ء کو کوئٹہ میں منعقد ہونے والے ایک دربار میں میر یعقوب خان نوشیروانی کی دستار بندی کی رسم انجام پائی۔ اس موقع پر انگریزی حکومت نے اسے ایک قیمتی خلعت بھی عطا کیا۔ (۱۰)

میر نوروز خان نوشیروانی انگریزی حکومت کا فرمانبردار قسم کا وفادار تھا اس لئے انگریزی حکومت نے اسے سر کا خطاب دے دیا تھا۔ مگر اس کے بیٹے میر یعقوب خان کی طبیعت اور سوچ اپنے باپ سے یکسر مختلف تھی اسے انگریزوں کی خوشنودی سے زیادہ اپنی قوم کی خوشی اور وقار عزیز تھے۔

انگریزوں کا خیال تھا کہ نواب بن جانے کے بعد از خود اغراض و مفادات کا لالچ اسے انگریز حاکموں کی کاسہ لیسی اختیار کرنے پر مائل کر دے گا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے میر یعقوب خان کو خلعت و انعامات کے ذریعے زیردام لانے کی کوششیں کیں لیکن میر یعقوب خان ایک لمحے کے لئے بھی خود کو انگریزوں کی فرمانبرداری پر مائل نہ کر سکے۔ اس کا تعلق بلوچوں سے تھا اور وہ تادم مرگ ایک بلوچ ہی رہا۔ (۱۱)

روایت ہے کہ ایک دفعہ بلوچستان میں گورنر جنرل کے نمائندے نے سردار محمد یعقوب خان کو بہلا پھسلا کر خاران کی سرزمین پر سے سڑک نکالنے کے لیے راس کوہ کے قریب ایک قطعہ زمین دینے

پر رضا مند کر لیا۔ اس اقرار نامہ پر دستخط کرنے کے لیے سردار میر محمد یعقوب خان کوئٹہ آیا مگر ابھی اس نے ریذیڈنسی سے باہر نکل کر گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے پاؤں رکاب میں ڈالا ہی تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے دریافت کیا کہ سردار کیا فیصلہ ہوا؟ کہتے ہیں سردار میر یعقوب خان نے اپنے ساتھی کو کوئی جواب دیئے بغیر اپنا پاؤں رکاب سے کھینچ لیا اور واپس ریذیڈنسی میں داخل ہوا۔ بلوچستان میں گورنر جنرل کا نمائندہ اور پولیٹیکل ایجنٹ ابھی تک کھڑے تھے اور اقرار نامہ میز پر پڑا ہوا تھا۔ سردار میر یعقوب خان نے ان سے کچھ کہے بغیر آگے بڑھ کر اقرار نامہ اٹھا لیا اور اس کے پرزے پرزے کر کے اسے پھینک کر باہر نکل آیا۔

ریذیڈنسی سے نکل کر سردار میر یعقوب خان نے سیدھا خاران کا راستہ لیا۔ راستے میں اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اس سوال نے میری آنکھیں کھول دیں میں نے سوچا کوئٹہ سے خاران تک ہر بلوچ مجھ سے ضرور یہی سوال کرے گا کہ سردار کیا فیصلہ کر آئے ہیں اتنے بلوچوں کو یہ جواب دے کر کہ میں نے خود لکھ کر اپنا وطن انگریزوں کے حوالے کر دیا ہے شرمندہ ہونا برداشت نہیں کر سکتا۔ میں خاران کی ایک انچ زمین بھی انگریزوں کو نہیں دوں گا۔ (۱۲)

بلوچستان کی انگریز حکومت دراصل ایران کی سرحد سے ملحق خارانی علاقے راس کوہ میں اپنا ایک کیمپ بنا کر اور کوئٹہ سے راس کوہ تک ٹیلی گراف لائن بچھا کر ایران کے معاملات پر نظر رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میر یعقوب خان نے اپنے علاقے کا کوئی حصہ انگریزوں کو جاسوسی اور نگرانی کی غرض سے دینے سے انکار کیا اگر انگریزی حکومت اس وقت ایرانی بلوچستان سے ملحق کوئی چوکی قائم کر لیتی تو شاید پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کو ایرانی بلوچستان کی شدید بغاوت کا سامنا کرنا نہ پڑتا۔

میر یعقوب خان بلوچ کی جانب سے معاہدے کی دستاویز کو دستخط ہو جانے کے ساتھ ہی پرزے پرزے کرنے کے باوجود بلوچستان میں انگریزی حکومت نے پولیٹیکل ایجنٹ قلات کے توسط سے اسے اپنے دام اثر میں لانے کی کوششیں کیں۔ مگر یہ کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ میر یعقوب خان نے ہمیشہ اپنی سر زمین اور لوگوں کی آزادی اور وقار کو انگریزی حکومت کی بخشش اور عنایات پر مقدم رکھا۔ گو کہ اس کو بعد میں اس کی بھاری قیمت اپنی جان کی صورت میں دینا پڑی لیکن انہوں نے تاریخ بلوچستان میں اپنے نام کے ان مٹ نقوش چھوڑے۔

انگریزی حکومت کے پولیٹیکل نمائندوں نے کئی بار اس سے مل کر اسے انگریز دربار میں حاضری دینے اور وفاداری کی تجدید کی کوششیں کیں لیکن میر یعقوب خان نے بعد میں کبھی ان کے آستانے پر حاضری نہیں دی۔

۱۹۱۱ء میں وائسرائے ہند کی بلوچستان میں آمد کے موقع پر پولیٹیکل ایجنٹ قلات نے خود، شکیل جا کر اس سے ملاقات کی اور اسے وائسرائے کے دربار میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ لیکن اس نے

مذکورہ تقریب میں شمولیت سے انکار کیا۔

اب انگریز حکومت کو یقین ہو گیا کہ نواب میر یعقوب خان نوشیروانی کسی صورت بھی ان کے مفادات کی خاطر بطور مہرہ استعمال ہونے پر آمادہ نہیں ہے۔ بلکہ انہیں اس بات کا ڈر پیدا ہوا کہ کہیں میرا یعقوب خان کسی غیر ملکی قوت کی مدد حاصل کر کے علاقے میں بغاوت نہ پھیلا دے۔ ان تمام واقعات و خدشات کو پیش نظر رکھ کر انگریز حکومت نے میر یعقوب خان کے کانٹے کو اپنی راہ سے ہٹانے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

انگریزی حکومت قوت کا استعمال کر کے بھی میر یعقوب خان کو ختم یا نوابی سے برطرف کر سکتی تھی۔ مگر اس وقت کے حالات میں جب کہ ایرانی بلوچ بھی بلوچستان کی انگریزی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار تھے خود بلوچستان میں میر محراب خان گچکی کی بغاوت اور انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کے واقعات تازہ تھے۔ کشیدگی کے اس ماحول میں میر یعقوب خان کے خلاف ایک اور فوجی محاذ کھولنے کو انگریزی حکومت نے مناسب خیال نہیں کیا۔ ان کو خدشہ تھا کہ کہیں اس طرح پورا بلوچستان بغاوت کی لپیٹ میں نہ آ جائے۔

انہوں نے میر یعقوب خان کو ختم کرنے کے لئے اپنا روایتی سازش کا طریقہ اپنایا۔ انہوں نے اس کو اپنے مفادات کی راہ سے ہٹانے کے لئے خود اس کے خاندان کو استعمال کیا اور اس کا قریب ترین رشتہ دار میر امیر خان نوشیروانی ہی اس شرمناک سازش میں انگریزوں کا آلہ کار بن گیا۔

میر امیر خان نوشیروانی سردار میر یعقوب خان کا سوتیلا چچا تھا۔ اس کو یہ صدمہ بھی تھا کہ سردار میر یعقوب خان نے اقتدار پر فائز ہونے کے بعد اس کے سگے بھائی میر عظیم خان نوشیروانی کو قتل کروایا تھا چنانچہ اس نے اس انتقام لینے کے ساتھ ساتھ خاران کا نواب بننے کے لالچ میں اس نے ایک ایسے جوانمرد کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا جو نہ صرف اس کے اپنے خاندان کے وقار کی علامت تھا۔ بلکہ جو قومی وقار کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتا تھا، اس وابستگی کو انگریز حکومت کا کسی قسم کا لالچ اور دباؤ ختم نہ کر سکا تھا۔

میر امیر خان نوشیروانی نے اپنے بھتیجے نواب میر یعقوب خان کو ۱۹/اپریل ۱۹۱۱ کی رات کو خاران میں اپنے بیٹے محمد یوسف اور چند دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر شہید کر دیا۔

اس طرح اس نے اپنے خاندان کی ناموس کے ساتھ ایک ایسے بلوچ رہنما کو قتل کر دیا جو اپنی قوم کے ساتھ وابستگی کو ہی مقصودِ حیات سمجھتا تھا۔

وہ دو سال سے بھی کم عرصے کے لئے خاران کا نواب رہا مگر اس مختصر سے عرصے کے دوران اس نے اپنے لوگوں کے دل میں اس طرح گھر کر لیا کہ لوگ اسے ایک روایتی نواب کی بجائے اپنا قومی رہنما خیال کرنے لگے۔ لیکن یہ دور نہایت ہی مختصر رہا۔ اس کی شہادت کے بعد انگریز حکومت نے

اس کے قاتل میر امیر خان نوشیروانی کو اس "خدمت" کے صلے میں خاران کا نواب بنادیا۔ اس طرح خاران کے اس کانٹے کو ہٹا دیا گیا جو انگریزی مفادات کی راہ میں سنگ گراں بنا ہوا تھا۔ اب وہاں میر امیر خان ان کے فرمانبردار نمائندے کی حیثیت میں براجمان تھا۔

میر یعقوب خان کو ایک ایسے وقت میں قتل کیا گیا جب بلوچوں میں انگریز حکومت کے خلاف پائی جانے والی نفرت عام بغاوت کی صورت اختیار کرنے لگی تھی جو پہلی عالمی جنگ شروع ہونے کے ساتھ ہی مسلح بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوگئی اور بلوچستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ ملحقہ ایرانی بلوچ قبائل تک بھی پھیل گئی۔ اگر اس وقت تک میر یعقوب خان زندہ رہتے تو وہ یقیناً اس دوران ایک نہایت متحرک کردار ادا کرتے۔ خاران کے نواب اس سے پیشتر بھی بسا اوقات ایرانی بلوچوں کے ہاں کسی بھی سختی اور تکلیف کے وقت پناہ لیتے رہے تھے اور ان سے مدد بھی حاصل کرتے تھے اب جب کہ خود ایرانی بلوچ انگریزی توسیع پسندی کے خلاف ہتھیار اٹھا چکے تھے تو اس قوت کو زیادہ منظم طریقے پر شدت کے ساتھ استعمال کرنے کے سلسلے میں میر یعقوب خان انتہائی فعال کردار ادا کر سکتے تھے اور انگریز حکومت کے خلاف ان کی شروع سے ہی جو باغیانہ روش تھی اس کو مسلح جدوجہد کی صورت میں قومی آزادی کی جنگ کی حیثیت دے سکتے تھے۔

لیکن یہ انگریز حکومت کی خوش قسمتی ہی تھی کہ اس وقت کے آنے سے قبل ہی میر یعقوب خان نوشیروانی کو راہ سے ہٹایا جا چکا تھا۔

بہر حال میر یعقوب خان کے مختصر ترین دور حکومت کے باوجود بلوچ تاریخ میں ان کو ایک لازوال حیثیت حاصل ہے اور تاریخ بلوچستان میں ان کا نام زندہ رہے گا۔ (۱۳)

سردار محمد یعقوب خان شیروانی کو شہید کر کے جب میر امیر خان نوشیروانی خاران کا سردار بنا تو میر محمد یعقوب کا بڑا بیٹا میر حبیب اللہ خان خاران سے فرار ہو کر نواب پسند خان زرک زئی کی پناہ میں زہری چلا گیا۔ نواب میر پسند خان اور اس کے دلیر بیٹے میر خان محمد نے بلوچی روایت کے مطابق میر حبیب اللہ خان کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے لیے انگریزی حکومت سے بھی ٹکر لینے کو تیار ہو گئے۔

سردار میر محمد یعقوب خان کو موت کے گھاٹ اتار کر انگریزی حکومت کا مدعا پورا ہو چکا تھا لہٰذا اب میر امیر خان اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ نواب پسند خان اور امیر خان محمد کو خوش رکھنے کے لیے انگریزی حکومت نے میر امیر خان اور میر حبیب اللہ خان کو کوئٹہ طلب کر لیا۔ نواب پسند خان اور امیر خان محمد، میر حبیب اللہ خان کو ساتھ لے کر کوئٹہ آئے لیکن میر امیر خان جسے اب انگریزوں کی نیت پر شبہ ہو چکا تھا، کوئٹہ نہیں آیا۔

معاملہ کوئٹہ میں ایک سرداری جرگہ کے سامنے پیش ہوا۔ جرگہ نے جیسا کہ ہوتا آیا ہے پولیٹیکل

ایجنٹ کا اشارہ پا کر فیصلہ میر حبیب اللہ خان کے حق میں دے دیا جسے بلوچستان میں گورنر جنرل کے نمائندے نے منظور کر کے میر حبیب اللہ خان کو خاران کا سردار تسلیم کر لیا۔(۱۴)

۱۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء کو میر حبیب اللہ خان کی دستار بندی ہوئی اس وقت اس کی عمر ۱۱ سال تھی نابالغ ہونے کی وجہ سے میر شاہ غاصی مولا داد کو اس کا سرپرست مقرر کیا اور اس کے ساتھ ایک نیٹو اسسٹنٹ خان بہادر شربت خان کا بھی تقرر کر دیا گیا جو بوقت ضرورت خاران کے انتظام میں شاہ غاصی کو ضروری مشورے دیتا تھا۔

۱۹۱۲ء تک سردار میر محمد یعقوب خان کے قتل کی تحقیقات بھی مکمل ہو گئیں عدالت نے میر امیر خان کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔اسے محض پانچ سال قید کی سزا دی گئی کیونکہ وہ کافی معمر تھا اور سابق سردار میر آزاد خان کا بیٹا تھا تاہم اس کے بیٹے میر یوسف کو گیارہ سال کی سزا سنائی گئی اور دونوں باپ بیٹوں کی تمام موروثی جائیداد میر حبیب اللہ خان کو دے دی گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کی خدمات انجام دینے اور نورا مینگل کی گرفتاری میں مدد دینے کے صلہ میں انگریز حکومت نے میر حبیب اللہ خان نوشیروانی کو سردار بہادر کا خطاب اور خلعت عطا کیا (۱۵)

قیام پاکستان کے وقت یہی میر حبیب اللہ خان نوشیروانی ریاست خاران کے سردار تھے اور قیام پاکستان کے بعد ۱۷ر مارچ ۱۹۴۸ء کو انہی نے پاکستان کے ساتھ الحاق کی دستاویز پر دستخط کیے تھے (۱۶)

۹ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو نواب امیر حبیب اللہ خان نوشیروانی کا انتقال ہو گیا۔ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند میر غلام مصطفیٰ خان نوشیروانی ان کے جانشین بنے۔(۱۷)

میر غلام مصطفیٰ خان نوشیروانی کے بیٹے امیر عبدالرحمٰن خان نوشیروانی ہیں۔انہوں نے ۱۹۸۸ء میں بی پی ۳۳ خاران سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے مگر پھر فعال حصہ نہ لینے کی وجہ سے شکست کھا گئے تھے (۱۸) امیر عبدالرحمٰن خان نوشیروانی خان آف قلات کے داماد ہیں (۱۹) اور ان دنوں یمن میں پاکستان کے سفیر ہیں (۲۰)

امیر عبدالرحمٰن خان نوشیروانی کے تین صاحبزادے ہیں جن کے نام حفیظ نوشیروانی، ریاض نوشیروانی اور مصطفیٰ نوشیروانی ہیں۔

امیر حبیب اللہ خان نوشیروانی کے ایک اور صاحبزادے، نوابزادہ میر بلوچ خان نوشیروانی تھے وہ خان آف قلات کے بہنوئی تھے اور یوں رشتے میں امیر عبدالرحمٰن خان کے چچا اور ان کی بیوی کے پھوپھا تھے۔وہ ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔وہ بلوچستان اسٹیٹس یونین کے رکن بھی رہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ۱۹۵۸ء میں خان آف قلات معزول، گرفتار اور نظر بند نہ

کیے جاتے تو امیر حبیب اللہ خان نوشیروائی کی وفات کے بعد انہی کو نواب آف خاران بننا تھا۔ نوابزادہ میر بلوچ خان نے ۱۹۷۸ء میں وفات پائی (۲۱)

امیر حبیب اللہ نوشیروانی کے ایک اور صاحبزادے نوابزادہ شیر علی خان نوشیروانی نے بھی کچھ وقت سیاست کے میدان میں گزارا وہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء میں بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۷۰ء کا انتخاب انہوں نے نیپ کے ٹکٹ پر لڑا تھا جبکہ ۱۹۷۷ء کے انتخاب میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے (۲۲) ۱۹۹۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا نواب زادہ شیر علی خان نوشیروانی کے دو صاحبزادے ہیں جن کے نام خالد نوشیروانی اور وقار نوشیروانی ہیں (۲۳) خالد نوشیروانی نے ۱۹۹۷ء میں این اے ۲۰۴ قلات، مستونگ، خاران سے آزاد امیدوار کے طور پر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا مگر صرف ۶۹۸ ووٹ حاصل کر سکے تھے (۲۴)

امیر حبیب اللہ خان نوشیروانی کے ایک بھائی نواب زادہ میر شہباز خان نوشیروانی تھے۔ انہوں نے تحریک آزادی میں بڑا فعال کردار ادا کیا اور مسلم لیگ کی آواز بلند کرنے کے لیے ایک ہفت روزہ اخبار بھی جاری کیا تھا۔ (۲۵)

امیر حبیب اللہ خان نوشیروانی کے ایک چچا اور امیر یعقوب خان نوشیروانی کے چھوٹے بھائی امیر محمد اسمٰعیل خان نوشیروانی بھی عملی سیاست کے میدان میں رہے تھے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ جس کی پاداش میں انہیں کوئٹہ کے قندھاری بازار کے ایک ہوٹل میں قتل کروا دیا گیا تھا......اس واقعے کے وقت ان کے فرزند امیر ظفر علی خان نوشیروانی کی عمر صرف دو سال تھی امیر ظفر علی خان ۱۹۷۶ء میں نواب غوث بخش رئیسانی کے اصرار پر عملی سیاست میں آئے مگر جلد ہی اکتا گئے بعد ازاں ان کے جواں سال فرزند امیر محمد اسمٰعیل مسعود نوشیروانی، جام میر غلام قادر آف لسبیلہ کی تحریک پر پاکستان مسلم لیگ (ن) میں شامل ہوئے اور صوبائی مسلم لیگ میں جوائنٹ سیکریٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ (۲۶)

نوشیروانی قبیلے ہی کے ایک اور سیاست دان، جو ۱۹۵۸ء سے بلوچستان کی صوبائی سیاست میں متحرک ہیں، عبدالکریم نوشیروانی ہیں۔

عبدالکریم نوشیروانی ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں پہلی مرتبہ بلوچستان اسمبلی کے رکن بنے (۲۷) اور اسمبلی پہنچنے کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۸۸ء کا انتخاب انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر لڑا مگر آزاد امیدوار میر دوست محمد، محمد حسنی سے تقریباً ڈھائی ہزار ووٹوں سے شکست کھا گئے (۲۸)

۱۹۹۰ء کے انتخابات سے ذرا پہلے وہ جمہوری وطن پارٹی میں شامل ہوئے اور اس کے ٹکٹ پر ایک مرتبہ پھر بلوچستان اسمبلی کے رکن بنے ۱۹۹۲ء میں وہ فلور کراس کر کے میر تاج محمد جمالی سے جا

ملے اور ان کی کابینہ میں وزیر صحت کے منصب پر فائز ہوئے (۲۹) ۱۹۹۳ء میں انہوں نے صوبائی اسمبلی کی بجائے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ یہ انتخاب انہوں نے اپنے سابقہ حریف میر دوست محمد، محمد حسنی کے ساتھ اس مفاہمت کے ساتھ لڑا تھا کہ میر دوست محمد، عبدالکریم نوشیروانی کو قومی اسمبلی کی نشست پر ووٹ دلوائیں گے اور عبدالکریم نوشیروانی، میر دوست محمد کو صوبائی اسمبلی کی نشست جیتنے میں مدد دیں گے۔ (۳۰) مگر ہوا یہ کہ یہ دونوں ہی امیدوار شکست کھا گئے (۳۱)

۱۹۹۷ء کے انتخابات سے پہلے عبدالکریم نوشیروانی بلوچستان نیشنل موومنٹ میں شامل ہو گئے اس مرتبہ ان کے ستاروں نے یاوری کی اور وہ نہ صرف صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے بلکہ ۱۹۹۸ء میں میر جان محمد جمالی کی کابینہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کے صوبائی وزیر بھی بنائے گئے (۳۲) ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں وہ حصہ نہیں لے سکے۔ تاہم انہوں نے اپنی نشست پر اپنے صاحبزادے شعیب خان نوشیروانی کو پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑوایا اور نہ صرف انہیں انتخاب میں کامیاب کروایا بلکہ بلوچستان کی صوبائی کابینہ میں وزیر داخلہ کے منصب پر بھی فائز کروانے میں بھی فعال کردار ادا کیا۔ (۳۳)

حوالہ جات

۱۔ اختر بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد چہارم) کراچی۔ ص۔ ۶۴

۲۔ میجر سی ایف منحن۔ دی گزیٹیئر آف بلوچستان (خاران)۔ کوئٹہ۔ ص ۶۵

۳۔ ایضاً۔ ص ۸۱

۴۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔ کوئٹہ۔ ص۔ ۱۸۰ تا ۱۸۷

۵۔ میجر سی ایف منچن۔ دی گزیٹیئر آف بلوچستان (خاران)۔ کوئٹہ ص ۳۳

۶۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔ کوئٹہ۔ ص۔ ۱۸۹ تا ۱۹۰

۷۔ گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (حصہ اول)۔ کوئٹہ۔ ص ۳۲۱، ۳۲۲

۸۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔ کوئٹہ۔ ص۔ ۱۹۳ تا ۱۹۵

۹۔ محمد اکبر بن ملک جہانگیر۔ قوم بلوچ تاریخ کے آئینے میں۔ دالبندین۔ ص ۲۰۳

۱۰۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)۔ کوئٹہ۔ ص۔ ۱۹۵ تا ۱۹۶

۱۱۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ لاہور۔ ص ۱۱۴

۱۲۔ گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (حصہ دوم) کوئٹہ۔ ص ۴۱۲

۱۳۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی۔ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ لاہور۔ ص ۱۱۴ تا ۱۱۶

۱۴۔ گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (حصہ دوم) کوئٹہ۔ ص ۴۱۲، ۴۱۳

۱۵۔ ملک صالح محمد خان لہڑی۔ بلوچستان (ون یونٹ سے قبلے) کوئٹہ۔ص ۱۹۸، ۱۹۹
۱۶۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار۔ لاہور۔ص ۳۵۷
۱۷۔ فاروق احمد۔ تحریک پاکستان اور بلوچستان۔ کوئٹہ۔ص ۱۴۰
۱۸۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد۔ رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۸۸ء۔ جلد سوم۔ص ۲۸۱
۱۹۔ اختر بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات۔ جلد دوم۔ کراچی۔ص ۱۴۸
۲۰۔ ویب سائٹ www.opf.org.pk
۲۱۔ اختر بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات۔ جلد دوم۔ کراچی۔ص۔ ۱۴۸تا۱۵۶
۲۲۔ وحید زہیر۔ بلوچستان جمہوریت کا سفر۔ کوئٹہ۔ص۔ ۶۵،۶۹
۲۳۔ ادارہ۔ وفیات۔ مشمولہ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ جنوری ۱۹۹۵ء۔ص ۱۶
۲۴۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۹۷ جنرل الیکشنز رپورٹ (جلد دوم) ص ۱۶۱
۲۵۔ اختر بلوچ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات، جلد سوم۔ کراچی۔ص ۲۵
۲۶۔ ایضاً۔ جلد چہارم۔ص ۶۷، ۶۸
۲۷۔ وحید زہیر۔ بلوچستان جمہوریت کا سفر۔ کوئٹہ۔ص ۷۲
۲۸۔ طارق اسمٰعیل۔ الیکشن ۸۸ء۔ لاہور۔ص ۴۱۷
۲۹۔ اختر بلوچ۔ مکتوب کوئٹہ۔ اخبار جہاں۔ ۲۷/اپریل تا ۳/مئی ۱۹۹۲ء۔ص ۱۴
۳۰۔ ماجد قاضی۔ الیکٹورل لینڈ اسکیپ آف بلوچستان روزنامہ دی نیوز۔ کراچی۔ ۷/ستمبر ۱۹۹۳ء
۳۱۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان۔ اسلام آباد رپورٹ آن دی جنرل الیکشنز ۱۹۹۳ء۔ جلد دوم۔ص ۱۹۳، ۷۰۱
۳۲۔ ویب سائٹ: www.paksearch.com/br98/sep/10
۳۳۔ ویب سائٹ: www.baluchistan.gov.pk

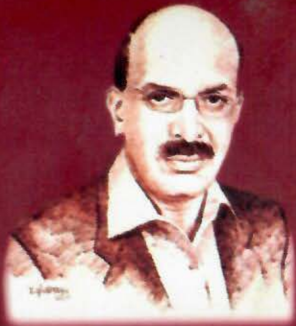
اِشاریہ

(خاندان بہ اعتبارِ حروفِ تہجّی)

راج محل کے اندر اک اک رتنا سن پر
کوڑھی جسم اور نُوری جامے،
روگی ذہن اور گردوں پیچ عمامے
جہل بھرے علامے
مانجھے، گامے،
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جیبھ پہ شہد - اور جیب میں چاقو
نسل ہلاکو!

راج محل کے باہر، سوچ میں ڈوبے شہر اور گاؤں
ہل کی انّی، فولاد کے پنجے،
گھومتے پہیے، کڑیل باہیں،
کتنے لوگ کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں
سکھ کی سیجیں،
لیکن جو ہر راحت کو ٹھکرائیں
آگ پئیں اور پھول کھلائیں

(مجید امجد)



عقیل عباس جعفری کا نام تحقیق کے شعبے میں نیا نہیں۔ انہوں نے ابتداء معلومات عامہ کے شعبے سے کی اور اس حوالے سے کئی کتابیں تحریر کیں جن میں ''366 دن صفر سے سو تک' جہان معلومات' ہے حقیقت کچھ......' ایک سال پچاس سوال' کون بنے گا کروڑ پتی؟ اور قائد اعظم معلومات کے آئینے میں'' شامل ہیں۔

''پاکستان کے سیاسی وڈیرے'' سیاست کے موضوع پر ان کی پہلی کتاب تھی جس نے شائع ہوتے ہی تہلکہ مچا دیا۔ یہی وہ کتاب تھی جس نے سیاست کی دُنیا میں ''سیاسی وڈیرے'' کی اصطلاح کو متعارف کروایا۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ عقیل عباس جعفری اپنی اس کتاب پر مستقل نظرثانی کرتے رہے اور اب یہی نظرثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔

''پاکستان کے سیاسی وڈیرے'' کے علاوہ عقیل عباس جعفری نے سیاست ہی کے موضوع پر کئی اور کتابیں بھی لکھیں جن میں ''پاکستان کی ناکام سازشیں' پاکستان کی انتخابی سیاست' قائداعظم کی ازدواجی زندگی اور لیاقت علی خان سازش کیس'' شامل ہیں۔

عقیل عباس جعفری نے ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن کے لاتعداد پروگرامز کے اسکرپٹس بھی تحریر کیے ہیں جن میں ''سات دن' ٹی وی انسائیکلو پیڈیا' ٹیلی شو' پرائڈ شو' ہم مصطفوی' ایک سال پچاس سوال' سارک کوئز' ملینیم کوئز' یو۔ این کوئز' جو جانے وہ جیتے'' اور اے۔ آر۔ وائی کا پروگرام ''کیا آپ بنیں گے کروڑ پتی؟'' کے نام سرفہرست ہیں۔

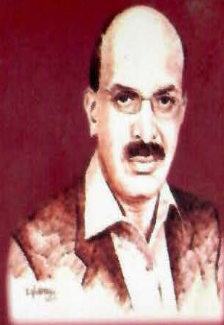
عقیل عباس جعفری ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کی غزلیں ادب کے معتبر جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ وہ 1990ء میں ریڈیو پاکستان کا ''بہترین نعت گو'' اور ''بہترین قومی نغمہ نگار'' کا ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری کا مجموعہ ''راستہ'' کے نام سے اور مذہبی شاعری کا مجموعہ ''تر و تازہ'' کے نام سے زیر اشاعت ہے۔

ان دنوں وہ پاکستان کی تاریخ کو کئی جلدوں میں مرتب کر رہے ہیں۔ یہ کتاب بھی عنقریب شائع ہو رہی ہے۔

جہانگیر بکس
لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدرآباد • کراچی

پاکستان کے سیاسی وڈیرے

عقیل عباس جعفری



عقیل عباس جعفری کا نام تحقیق کے شعبے میں نیا نہیں۔ انہوں نے ابتداء معلومات عامہ کے شعبے سے کی اور اس حوالے سے کئی کتابیں تحریر کیں جن میں "366 دن' صفر سے سو تک' جہانِ معلومات' ہے حقیقت کچھ...... 'ایک سال پچاس سوال' کون بنے گا کروڑ پتی؟ اور قائداعظم معلومات کے آئینے میں" شامل ہیں۔

"پاکستان کے سیاسی وڈیرے" سیاست کے موضوع پر ان کی پہلی کتاب تھی جس نے شائع ہوتے ہی تہلکہ مچا دیا۔ یہی وہ کتاب تھی جس نے سیاست کی دُنیا میں "سیاسی وڈیرے" کی اصطلاح کو متعارف کروایا۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ عقیل عباس جعفری اپنی اس کتاب پر مستقل نظرثانی کرتے رہے اور اب یہی نظرثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔

"پاکستان کے سیاسی وڈیرے" کے علاوہ عقیل عباس جعفری نے سیاست ہی کے موضوع پر کئی اور کتابیں بھی لکھیں جن میں "پاکستان کی ناکام سازشیں' پاکستان کی انتخابی سیاست' قائداعظم کی ازدواجی زندگی اور لیاقت علی خان سازش کیس" شامل ہیں۔

عقیل عباس جعفری نے ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن کے لاتعداد پروگرامز کے اسکرپٹس بھی تحریر کیے ہیں جن میں "سات دن' ٹی وی انسائیکلو پیڈیا' ٹیلی شو' پرائڈ شو' ہم مصطفوی' ایک سال پچاس سوال' سارک کوئز' ملینیم کوئز' یو۔ این کوئز' جو جانے وہ جیتے" اور اے۔ آر۔ وائی کا پروگرام "کیا آپ بنیں گے کروڑ پتی؟" کے نام سرفہرست ہیں۔

عقیل عباس جعفری ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کی غزلیں ادب کے معتبر جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ وہ 1990ء میں ریڈیو پاکستان کا "بہترین نعت گو" اور "بہترین قومی نغمہ نگار" کا ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری کا مجموعہ "راستہ" کے نام سے اور مذہبی شاعری کا مجموعہ "تر و تازہ" کے نام سے زیر اشاعت ہے۔

ان دنوں وہ پاکستان کی تاریخ کو کئی جلدوں میں مرتب کر رہے ہیں۔ یہ کتاب بھی عنقریب شائع ہو رہی ہے۔

جہانگیر بکس

لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدر آباد • کراچی